تاریخِ اسلام
تخریج و اضافہ شدہ ایڈیشن
دار الاندلس
تالیف: مورخ اسلام اکبر شاہ خاں نجیب آبادی رحمۃ اللہ علیہ

عرض ناشر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ ۔ اَمَّا بَعْدُ!

''تاریخ اسلام'' مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی رحمہ اللہ کی تالیف لطیف ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے لے کر زوال خلافت تک کا دور انھوں نے نہایت شاندار انداز میں رقم کیا ہے۔ انداز ایسا دلکش، دلچسپ اور پرسوز ہے کہ قاری جہاں سے بھی پڑھے، پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

یوں تو اسلام کی تاریخ شاندار معرکوں، فتوحات اور غلبۂ اسلام کی پرکیف بہاریں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے لیکن بدقسمتی سے اس کے ساتھ ساتھ باہمی چپقلش، حسد و بغض کی بیماری اور جمل و صفین ایسی لڑائیوں کے داغ بھی اس کے چہرے پر موجود ہیں۔ مؤلف محترم نے قاری کے لیے تصویر کے یہ دونوں رخ پیش کر دیے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے بعد کسی شخص کی رائے حتمی نہیں ہوسکتی سو جہاں ضروری ہوا حاشیہ لگا دیا گیا ہے۔ کتاب کی تخریج کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ ہمارے بھائی عبداللہ ادیب کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے یہ فریضہ سرانجام دے کر کتاب ادارہ دارالاندلس کے سپرد کی، اس سے کتاب کی ثقاہت مزید دوچند ہوگئی ہے۔ وللہ الحمد

کتاب تین جلدوں میں تھی ہم نے اسے دو جلدوں میں کر دیا ہے، عمدہ کمپوزنگ، شاندار ترتیب، تخریج و تحقیق، اعلیٰ کاغذ اور معیاری پرنٹنگ کے ساتھ کتاب اب آپ کے مطالعہ کے لیے پیش خدمت ہے۔ اپنی تاریخ سے سبق حاصل کر کے مستقبل کو سنوارنے کا عزم رکھنے والی قوموں کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ﴾

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت بدلنے کا

اللہ تعالیٰ دین حنیف پر قائم رکھے اور شہادت کی موت عطا فرمائے۔ آمین!

محمد سیف اللہ خالد

مدیر "دار الاندلس"

۱۰ ذیعقعد ۱٤۲٦ھ

تاریخ اسلام جلد دوم

پہلا باب

خلافت عباسیہ

دوسرا باب

تیسرا باب

پانچواں باب

مسلمانوں سے پہلے اندلس کی حالت

چھٹا باب

اندلس میں اسلامی حکومت

ساتواں باب

امیران اندلس

آٹھواں باب

خلفائے اندلس

نواں باب

دسواں باب

گیارہواں باب

دیگر متحارب سلاطین بنوعباد، بنوذوالنون، بنوہود وغیرہ

بارہواں باب

اندلس میں عیسائیوں کی چیرہ دستی

تیرھواں باب

چودھواں باب

پندرھواں باب

سولہواں باب

اٹھارواں باب

قرامطۂ بحرین

انیسواں باب

بیسواں باب

اکیسواں باب

ایران کی اسلامی تاریخ کا اجمالی تتمہ

بائیسواں باب

مصر و شام کی اسلامی تاریخ کا اجمالی تتمہ

تیئیسواں باب

چوبیسواں باب

پچیسواں باب

پہلا باب

خلافت عباسیہ

ابوالعباس عبداللہ سفاح

ابوالعباس عبداللہ سفاح بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم سنہ ۱۰۴ھ میں بمقام حمیمہ علاقہ بلقاء میں پیدا ہوا۔ وہیں پرورش پائی۔ اپنے بھائی ابراہیم امام کا جانشین ہوا۔ اپنے بھائی منصور سے عمر میں چھوٹا تھا۔ ابن جریر طبری کا قول ہے کہ جس روز سے نبی اکرم ﷺ نے اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ تمہاری اولاد میں خلافت آئے گی، اسی وقت سے اولاد عباس خلافت کی امیدوار چلی آتی تھی۔ ①

عبداللہ سفاح خون ریزی، سخاوت، حاضر جوابی، تیز فہمی میں ممتاز تھا۔ سفاح کے عمال بھی خون ریزی میں مشاق تھے۔ سفاح نے اپنے چچا داؤد کو پہلے کوفہ کی حکومت پر مامور کیا پھر اس کو حجاز، یمن اور یمامہ کی امارت پر مامور کیا اور کوفہ پر اپنے بھتیجے عیسیٰ بن موسیٰ بن محمد کو مقرر کیا۔

جب سنہ ۱۳۳ھ میں داؤد کا انتقال ہوگیا تو سفاح نے اپنے ماموں یزید بن عبیداللہ بن عبدالمدان حارثی کو حجاز و یمامہ کی اور محمد بن یزید بن عبداللہ بن عبدالمدان کو یمن کی گورنری پر مامور کیا۔ سنہ ۱۳۲ھ میں سفیان بن عینیہ بلبی کو بصرہ کا عامل بنایا گیا تھا۔ سنہ ۱۳۳ھ میں اس کو معزول کر کے اس کی جگہ اپنے چچا سلیمان بن علی کو سند حکومت عطا کی اور بحرین و عمان بھی اسی کی حکومت

① یہ بنو عباس کے ہم خیال لوگوں کی گھڑی ہوئی روایت لگتی ہے، واللہ اعلم! جبکہ صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث ۴۴۴۷ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مرض الموت میں عباس رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ مجھے تو ایسے آثار نظر آرہے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اس مرض سے صحتیاب نہ ہوسکیں گے۔ آؤ ہم نبی ﷺ کے پاس چل کر پوچھتے ہیں کہ آپ کے بعد خلافت کسے ملے گی؟...... لیکن علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ کی قسم! اگر ہم نے اس وقت نبی ﷺ سے اس کے متعلق پوچھا اور نبی ﷺ نے انکار فرما دیا تو لوگ ہمیں ہمیشہ کے لیے اس سے محروم کر دیں گے۔ میں تو نبی ﷺ سے اس کے متعلق ہرگز کچھ نہیں پوچھوں گا۔

میں شامل کر دیے۔ سنہ ۱۳۲ھ میں سفاح کا چچا اسماعیل بن علی اہواز کا، دوسرا چچا عبداللہ بن علی شام کا، ابوعون عبدالملک بن یزید مصر کا، ابومسلم خراسانی خراسان اور جبال کا گورنر اور خالد بن برمک دیوان الخراج یعنی محکمہ مال گزاری کا افسر تھا۔ سنہ ۱۳۳ھ میں ابومسلم نے اپنی طرف سے محمد بن اشعث کو فارس کا گورنر مقرر کر کے روانہ کیا۔ اسی زمانہ میں سفاح نے اپنے چچا عیسیٰ بن علی کو فارس کی سند گورنری دے کر بھیجا۔ محمد بن اشعث پہلے پہنچ چکا تھا۔ جب عیسیٰ بن علی پہنچا تو محمد بن اشعث نے اول اس کو فارس کی حکومت سپرد کرنے سے انکار کیا، پھر یہ اقرار لے کر کہ کبھی منبر پر خطبہ نہ دے گا اور جہاد کے سوا کبھی تلوار نہ اٹھائے گا، اس کو فارس کی حکومت سپرد کر دی مگر حقیقتاً خود ہی حاکم رہا۔ جب محمد بن اشعث فوت ہو گیا تو سفاح نے اپنے چچا اسماعیل بن علی کو فارس کی حکومت پر بھیجا اور محمد بن صول کو موصل کی حکومت پر بھیجا۔ اہل موصل نے محمد بن صول کو نکال دیا۔ یہ لوگ بنوعباس سے منحرف تھے۔ سفاح نے ناراض ہو کر اپنے بھائی یحییٰ بن محمد بن علی کو بارہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ روانہ کیا۔ یحییٰ بن محمد نے موصل پہنچ کر قصر امارت میں قیام کیا اور اہل موصل کے بارہ سربرآوردہ آدمیوں کو دھوکے سے بلا کر قتل کر دیا۔ اہل موصل میں اس سے سخت اشتعال پیدا ہوا اور وہ جنگ کرنے پر تیار ہو گئے۔ یحییٰ نے یہ حالت دیکھ کر منادی کرا دی کہ جو شخص جامع مسجد میں چلا آئے گا، اس کو امان دی جائے گی۔ یہ سن کر لوگ جامع مسجد کی طرف دوڑ پڑے۔

جامع مسجد کے دروازوں پر یحییٰ نے اپنے آدمیوں کو کھڑا کر رکھا تھا۔ جو جامع مسجد کے اندر جاتا تھا، قتل کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح گیارہ ہزار آدمی قتل کیے گئے، پھر شہر میں قتل عام کیا گیا۔ رات ہوئی تو یحییٰ کے کان میں ان عورتوں کے رونے کی آواز آئی جن کے شوہر، باپ، بھائی اور بیٹے ظلماً قتل کر دیے گئے تھے۔ صبح ہوتے ہی یحییٰ نے حکم دیا کہ عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کر دیا جائے۔ تین روز تک فوج کو اہل شہر کا خون مباح کر دیا گیا۔ اس حکم کو سنتے ہی شہر میں بڑی شدت سے قتل عام جاری ہو گیا۔

یحییٰ کے لشکر میں چار ہزار زنگی بھی تھے۔ زنگیوں نے عورتوں کی عصمت دری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ہزارہا عورتوں کو پکڑ پکڑ کر لے گئے۔ چوتھے روز یحییٰ گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کی سیر کے لیے نکلا۔ ایک عورت نے ہمت کر کے یحییٰ کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا کہ کیا تم بنوہاشم نہیں ہو؟ کیا تم رسول اللہ ﷺ کے چچا کے لڑکے نہیں ہو؟ کیا تم کو یہ خبر نہیں کہ مومنات و مسلمات

سے زنگیوں نے جبراً نکاح کر لیا ہے؟

یحییٰ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور چلا گیا۔ اگلے دن زنگیوں کو تنخواہ تقسیم کرنے کے بہانے سے بلایا۔ جب تمام زنگی جمع ہو گئے تو سب کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔

سفاح کو جب ان حالات کی اطلاع ہوئی تو اس نے اسماعیل بن علی کو موصل بھیج دیا اور یحییٰ کو فارس کی حکومت پر تبدیل کر دیا۔

سنہ ۱۳۳ھ میں قیصر روم نے لمطیہ اور قالیقلا مسلمانوں سے بہ زور شمشیر فتح کر لیے۔ اسی سنہ میں یزید بن عبیداللہ بن عبدالمدان نے مدینہ سے ابراہیم بن حبان سلمی کو یمامہ کی طرف فوج دے کر روانہ کیا۔ وہاں مثنیٰ بن زید بن عمر بن ہبیرہ اپنے باپ کے زمانے سے حاکم تھے۔ اس نے ابراہیم کا مقابلہ کیا اور مارا گیا۔ اسی سال بخارا میں شریک بن شیخ مہری نے ابومسلم کے خلاف خروج کیا اور تیس ہزار سے زیادہ لوگ جمع کر لیے۔ ابومسلم نے زیاد بن صالح خزاعی کو شریک کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ شریک نے مقابلہ کیا اور مارا گیا۔ ابومسلم نے ذوالحجہ سنہ ۱۳۳ھ میں ابوداؤد خالد بن ابراہیم کو بلاد ختل پر چڑھائی کرنے کے لیے روانہ کیا۔ حبش بن شبل بادشاہ ختل کو شکست ہوئی، وہ بھاگ کر فرغانہ ہوتا ہوا ملک چین چلا گیا۔ اسی زمانہ میں اخشید، فرغانہ اور شاش کے بادشاہوں میں لڑائی ہوئی۔ بادشاہ چین نے ان کے جھگڑے میں دخل دے کر شاش وفرغانہ کے بادشاہوں کے خلاف ایک لاکھ فوج بھیج دی۔ ابومسلم نے زیاد بن صالح کو اس طرف روانہ کیا۔ چینی فوج سے زیاد بن صالح کا مقابلہ نہر طراز پر ہو گیا۔ پچاس ہزار چینی قتل ہوئے اور بیس ہزار مسلمانوں نے گرفتار کر لیے۔

سنہ ۱۳۴ھ میں بسام بن ابراہیم نے جو خراسان کا ایک نامور سپہ سالار تھا، علم بغاوت بلند کیا اور مدائن پر قابض ہو گیا۔ سفاح نے خازم بن خزیمہ کو بسام کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ خازم نے بسام کو شکست فاش دی اور میدان جنگ سے بھگا دیا۔ اس کے بعد سفاح نے خازم کو عمان کی طرف خارجیوں سے لڑنے کے لیے روانہ کیا۔ وہاں اس نے خارجیوں کو شکست دے کر ان کے سردار کو قتل کر دیا۔ اسی سال ابوداؤد خالد بن ابراہیم نے اہل کش پر فوج کشی کی اور کش کے بادشاہ کو جو ذمی تھا، قتل کر ڈالا اور اس کے سر کو ابومسلم کے پاس سمرقند میں بھیج دیا اور مقتول بادشاہ کے بھائی طازان کو تخت نشین کر کے بلخ لوٹ آیا۔ ابومسلم نے اسی زمانہ میں اہل صغد اور اہل بخارا کا قتل عام کیا اور بخارا وسمرقند کا حاکم زیاد بن صالح کو بنا کر اور شہر سمرقند کی شہر پناہ بنانے کا حکم دے کر مرو کو واپس

آیا۔ان واقعات کے بعد سفاح کے پاس خبر پہنچی کہ منصور بن جمہور نے سندھ میں بغاوت وعہد شکنی اختیار کی ہے (یہ منصور بن جمہور وہی ہے جو دو مہینے یزید الناقص کے عہد میں گورنر عراق وخراسان بھی رہ چکا تھا اورعبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر کے ساتھیوں میں سے تھا۔ جب عبداللہ بن معاویہ کواصطخر کے قریب داؤد بن یزید بن عمر بن ہبیرہ اورمعن بن زائدہ کے مقابلہ میں شکست فاش حاصل ہوئی تو منصور بن جمہور سندھ کی طرف بھاگ کر چلا آیا تھا اورعبداللہ بن معاویہ ہرات پہنچ کر مالک بن ہیثم خزاعی والی ہرات کے ہاتھ سے ابومسلم کے حکم کے موافق قتل ہوئے تھے)۔ سفاح نے اپنے افسر پولیس موسیٰ بن کعب کوسندھ کی طرف روانہ کیا اوراس کی جگہ مسیّب بن زہیر کومقرر کیا۔موسیٰ اور منصور سے سرحد ہند پر مقابلہ ہوا۔منصور کے ہمراہ بارہ ہزارفوج تھی مگرموسیٰ سے شکست کھا کر بھاگا اور ریگستان میں شدت تشنگی سے مرگیا۔منصور کے گورنر نے جوسندھ میں تھا، یہ سن کرمع اہل وعیال اور اموال بلاد خرز کی طرف کوچ کیا۔ اسی سال یعنی ذوالحجہ سنہ۱۳۴ھ میں سفاح مقام انبار میں آیا اوراسی مقام کودارالخلافہ بنایا۔

سنہ۱۳۵ھ میں زیاد بن صالح نے جوابومسلم کی طرف سے سمرقند وبخارا کا عامل تھا، بغاوت اختیار کی۔ ابومسلم یہ سن کرمرو سے روانہ ہوااورابوداؤد خالد بن ابراہیم نے زیاد کی بغاوت کا حال سن کرنصر بن راشد کوترمذ کی طرف بھیج دیا کہ ترمذ کوزیاد کی دست برد سے بچائے۔نصر بن راشد ترمذ پہنچا ہی تھا کہ چندلوگوں نے طالقان سے نکل کراس کو مار ڈالا۔ ابوداؤد نے یہ سن کرعیسیٰ بن ہامان کو قاتلین نصر کے تعاقب پر مامور کیا۔عیسیٰ نے قاتلین نصر کوقتل کیا۔ اسی اثناء میں ابومسلم مقام آمد میں پہنچ گیا۔اس کے ساتھ سباع بن نعمان ازدی بھی تھا۔ سفاح نے زیاد بن صالح اورسباع بن نعمان ازدی کو یہ سمجھا کرابومسلم کے پاس روانہ کیا تھا کہ اگرموقع ملے تو ابومسلم کوقتل کردینا۔

مقام آمد میں پہنچ کرابومسلم کوکسی ذریعہ سے یہ خبر معلوم ہوئی۔ اس نے فوراً سباع کو آمد میں قید کردیا اوروہاں کے عامل کو یہ حکم دے گیا کہ سباع کوقتل کردینا۔آمد سے ابومسلم بخارا کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں اس کوزیاد بن صالح کے چند سپہ سالار ملے جواس سے منحرف ہوکرابومسلم کی طرف آ رہے تھے۔ زیاد، ابومسلم کے بخارا پہنچنے پرایک دہقان کے گھرمیں جا چھپا۔ دہقان نے اس کوقتل کرڈالا اورابومسلم کی خدمت میں لاکر پیش کردیا۔ ابومسلم نے قتل زیاد کی خبر ابوداؤد کولکھ بھیجی۔ ابوداؤد مہم طالقان میں مصروف تھا، فارغ ہوکرکش واپس آیا اورعیسیٰ بن ہامان کو بسام کی طرف روانہ

کیا مگر اس کو کچھ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اسی زمانہ میں عیسیٰ بن ہامان نے چند خطوط ابومسلم کے ہمراہیوں کے پاس بھیجے تھے، ان خطوط میں ابوداؤد کی برائیاں لکھی تھیں۔ ابومسلم نے ان خطوط کو لے کر ابوداؤد کے پاس بھیج دیا۔ ابوداؤد نے عیسیٰ کو پٹوا کر قید کر دیا۔ چند روز کے بعد جب اس کو رہا کیا تو لشکر اس پر ٹوٹ پڑے اور عیسیٰ کو مار ڈالا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر ابومسلم مرو کی طرف واپس آ گیا۔

سنہ ۱۳۶ھ میں عبداللہ بن علی سفاح کی خدمت میں آیا۔ سفاح نے اس کو لشکر شام اور لشکر عراق کے ساتھ رومیوں کی طرف روانہ کیا۔ سفاح کا بھائی ابوجعفر منصور جزیرہ کا عامل تھا۔ اس نے اس سال سفاح کے اشارے سے حج کا ارادہ کیا اور سفاح سے اجازت طلب کی۔ سفاح نے لکھا کہ تم میرے پاس چلے آؤ، میں تم کو امیر حج بنا کر بھیجوں گا۔ چنانچہ منصور انبار چلا آیا اور حران کی حکومت پر مقاتل بن حکیم مامور کیا گیا۔ بات یہ تھی کہ اسی سال ابومسلم نے بھی سفاح سے حج کی اجازت طلب کی تھی۔ لہٰذا سفاح نے خود ہی اپنے بھائی منصور کو مخفی طور پر اطلاع دی کہ تم فوراً حج کے لیے تیار ہو جاؤ اور درخواست بھیج دو۔ اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ ابومسلم خراسانی نے دعوت عباسیہ کو کامیاب بنانے میں سب سے بڑا کام کیا تھا، جیسا کہ گزشتہ واقعات سے ظاہر ہے۔ اب سفاح کے خلیفہ ہو جانے اور حکومت عباسیہ کے استقلال کے بعد وہ خراسان کا گورنر بنا دیا گیا اور سفاح نے اس کے نام باقاعدہ سند حکومت بھی بھیج دی مگر ابومسلم نے خود حاضر دربار خلافت ہو کر بیعت نہیں کی تھی۔ وہ شروع میں پہلی مرتبہ جب امام ابراہیم کی طرف سے خراسان بھیجا گیا تھا، اسی وقت سے اب تک مسلسل خراسان میں موجود تھا۔ اسی نے خراسان پر قبضہ کیا۔ اسی نے اپنی حکومت قائم کی اور وہی ہر طرح خراسان پر مستولی تھا۔ جب ایک ایک کر کے تمام دشمنوں کا کام تمام ہو گیا تو عبداللہ سفاح کو خیال آیا کہ ابومسلم کی منشاء کے خلاف نہ اس کو کسی صوبہ کی حکومت پر تبدیل کر سکتا تھا نہ اس کے زور قوت کو گھٹا سکتا تھا۔

ابومسلم اپنے آپ کو خلافت عباسیہ کا بانی سمجھتا اور اپنے آپ کو خلیفہ سفاح کا سرپرست جانتا تھا۔ وہ خلیفہ سفاح کو مشورے دیتا اور سفاح اس کے مشوروں پر اکثر عمل کرتا لیکن خراسان کے معاملات میں وہ سفاح سے اجازت یا مشورہ لینا ضروری نہ سمجھتا تھا۔ عثمان بن کثیر عباسیوں کے نقباء میں ایک نامور اور سب سے پرانا نقیب تھا، اس کو ابومسلم نے ذاتی کاوش کی بنا پر قتل کر دیا اور سفاح اس کے متعلق ابومسلم سے کوئی جواب طلب نہ کر سکا اور سفاح، اس کے چچا، اس کے بھائی بھی اپنے

حوصلے بلند رکھنے اور ابومسلم کی اس خودسرانہ حکمرانی کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔

سفاح نے جب اپنے بھائی ابوجعفر منصور کو خراسان کی طرف بیعت لینے کے لیے بھیجا اور اسی کے ہاتھ ابومسلم کے نام سند گورنری بھیجی تو ابومسلم کا برتاؤ ابوجعفر منصور کے ساتھ مؤدبانہ نہ تھا بلکہ اس کی ہر ایک حرکت سے ابوجعفر نے خودسری اور مطلق العنانی محسوس کی تھی۔ چنانچہ ابومسلم اور ابوجعفر کے درمیان دلوں میں ایک کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔ ابوجعفر نے جب یہ تمام حالات سفاح کو سنائے تو وہ اور بھی زیادہ اس فکر میں پڑ گیا کہ ابومسلم کے اقتدار واثر اور اختیار وتسلط کو کس طرح کم کرے۔ چنانچہ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ ابومسلم کا کام تمام کر دیا جائے۔ اسی لیے زیاد بن صالح اور سباع بن نعمان ازدی سے سفاح نے اس کام کی سفارش کی جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ غرض حالت یہ تھی کہ سفاح اور ابومسلم کے دل صاف نہ رہے تھے۔

ابومسلم چونکہ اقتدار پسند اور اولوالعزم شخص تھا۔ اس کو جب خلیفہ سفاح کی طرف سے شبہ پیدا ہوا تو اس نے صرف خراسان ہی پر اپنے اثر واقتدار کو کافی نہ سمجھ کر حجاز وعراق میں بھی اپنا اثر قائم کرنے کی کوشش ضروری سمجھی تاکہ اگر ضرورت پڑے تو وہ عباسیوں کو کچل سکے۔ ایک ایسے شخص کا جو دعوت عباسیہ کو کامیاب بنا چکا تھا، حجاز وعراق اور تمام اسلامی ممالک میں اپنی قبولیت بڑھانے کے کام پر مخفی طریقہ سے آمادہ ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی، لیکن اس کو یہ بات یاد نہ رہی کہ اس کے مقابلہ پر وہ خاندان ہے جس میں محمد بن علی اور ابراہیم بن محمد جیسے شخص یعنی بانی تحریک عباسیہ پیدا ہو سکتے ہیں اور خلافت بنوامیہ کی بربادی سے فارغ ہو کر ابھی اس پر قابض ہوئے ہیں۔ ابومسلم نے اگرچہ سب سے زیادہ کام کیا تھا لیکن وہ اس کام میں عباسیوں کا شاگرد اور عباسیوں ہی کا تربیت کردہ تھا۔

غرض ابومسلم نے سفاح سے حج کی اجازت طلب کی۔ سفاح نے اس کو اجازت دی اور لکھا کہ اپنے ہمراہ پانچ سو آدمیوں سے زیادہ نہ لاؤ۔ ابومسلم نے لکھا کہ لوگوں کو مجھ سے عداوت ہے، اتنے تھوڑے آدمیوں کے ساتھ سفر کرنے میں مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہے۔ سفاح نے لکھا کہ زیادہ سے زیادہ ایک ہزار آدمی کافی ہیں۔ زیادہ آدمیوں کا ساتھ ہونا اس لیے باعث تکلیف ہوگا کہ سفر مکہ میں سامان رسد کی فراہمی دشوار ہے۔ ابومسلم آٹھ ہزار فوج کے ساتھ مرو سے روانہ ہوا اور جب خراسان کی حد پر پہنچا تو سات ہزار فوج کو سرحدی مقامات پر چھوڑ کر ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ دارالخلافہ انبار کی طرف بڑھا۔ سفاح نے اپنے بڑے بڑے نامی سپہ سالاروں کو استقبال کے لیے بھیجا اور جب

دربار میں حاضر ہوا تو اس کی بے حد تعظیم و تکریم کی اور کہا کہ اگر اس سال میرے بھائی ابوجعفر منصور کا ارادہ حج نہ ہوتا تو میں تم ہی کو امیر حج مقرر کرتا۔ اس طرح ابومسلم کی امیر حج ہونے کی خواہش پوری ہونے سے رہ گئی۔ غرض دارالخلافہ انبار سے ابوجعفر منصور اور ابومسلم دونوں ساتھ ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ ابومسلم خراسان سے ایک بڑا خزانہ ہمراہ لے کر آیا تھا۔ منصور کی معیت اس کو پسند نہ تھی کیونکہ وہ آزادانہ بہت سے کام جو کرنا چاہتا تھا، نہیں کر سکا۔ تاہم اس نے مکہ کے راستے میں ہر منزل پر کنوئیں کھدوائے، سرائیں بنوانے اور مسافروں کے لیے سہولتیں بہم پہنچانے کے کام شروع کرا دیے۔ کپڑے تقسیم کیے، لنگر خانے جاری کیے، لوگوں کو بے دریغ انعامات دیے اور اپنی سخاوت و بخشش کے ایسے نمونے دکھائے کہ لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہو گئے۔

مکہ مکرمہ میں بھی اس نے یہی کام وسیع پیمانے پر کیے، جہاں ہر طرف کے لوگ موجود تھے۔ ایام حج کے گزرنے پر ابوجعفر منصور نے ابھی روانگی کا قصد نہ کیا تھا کہ ابومسلم مکہ سے روانہ ہو گیا۔ مکہ سے دو منزل اس طرف آ گیا تھا کہ دارالخلافہ انبار کا قاصد اس کو ملا جو سفاح کے مرنے کی خبر اور ابوجعفر منصور کے خلیفہ ہونے کی خوشخبری لے کر منصور کے پاس جا رہا تھا۔ ابومسلم نے اس قاصد کو دو روز تک ٹھہرائے رکھا اور پھر منصور کے پاس روانہ کر دیا۔ منصور کو ابومسلم کے پہلے ہی روانہ ہونے کا ملال تھا۔ اب اس بات کا ملال اور ہوا کہ ابومسلم نے اس خبر کے سننے پر منصور کو خلافت کی مبارکباد نہیں بھیجی۔ بیعت کے لیے بھی نہیں ٹھہرا حالانکہ سب سے پہلے اسی کو بیعت کرنی چاہیے تھی اور کم از کم منصور کے آنے تک اسی مقام پر قیام کرنا نہایت ضروری تھا کہ دونوں ساتھ ساتھ سفر کرتے۔ ابوجعفر منصور یہ خبر سنتے ہی فوراً مکہ سے روانہ ہو گیا لیکن ابومسلم اس سے آگے سفر کرتا ہوا انبار پہنچا۔ اس کے بعد منصور داخل دارالخلافہ ہوا۔

ابومسلم اور ابوجعفر کو روانہ کرنے کے بعد ابوالعباس عبداللہ سفاح چار برس آٹھ مہینے خلافت کر کے بہ تاریخ ۱۳ ذی الحجہ سنہ ۱۳۶ھ کو فوت ہوا۔ اس کے چچا عیسیٰ نے نماز جنازہ پڑھائی، انبار میں دفن ہوا۔ اس نے مرنے سے پہلے اپنے بھائی ابوجعفر منصور اور اس کے بعد عیسیٰ بن موسیٰ کی ولی عہدی کا عہد نامہ لکھ کر ایک کپڑے میں لپیٹ کر اور اپنے اہل بیعت کی مہریں لگا کر عیسیٰ کے سپرد کر دیا تھا۔ چونکہ منصور موجود نہ تھا، اس لیے عیسیٰ بن موسیٰ نے منصور کی خلافت کے لیے لوگوں سے نیابتاً بیعت لی اور اس واقعہ کی اطلاع کے لیے قاصد مکہ کی طرف روانہ کیا۔

عبداللہ سفاح نے مال و دولت سے اپنی خلافت کے قیام و استحکام میں اسی طرح کام لیا جس طرح بانی خلافت بنوامیہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کام لیا تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی سخاوت کے ذریعہ سے اپنے مخالفوں یعنی علویوں کا منہ بند کر دیا تھا اور ان کو اپنا ہمدرد بنا لینے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اسی طرح بانی خلافت عباسیہ سفاح کے مقابلہ پر بھی علوی ہی دعوے دار خلافت تھے۔ انہوں نے عباسیوں کے ساتھ مل کر بنوامیہ کو برباد کیا تھا اور اب عباسی خاندان میں خلافت کے چلے جانے سے وہ بالکل اسی طرح ناخوش تھے، جیسے کہ خاندان بنوامیہ میں خلافت کے چلے جانے سے ناراض تھے۔ عبداللہ سفاح نے بھی علویوں کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرح بے دریغ مال و دولت دے کر خاموش کر دیا۔ جب سفاح کوفہ میں خلیفہ بنایا گیا تو عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن علی اور دوسرے علوی لوگ کوفہ میں آئے اور کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ خلافت جو ہمارا حق تھا، اس پر تم نے قبضہ کیا۔ یہ عبداللہ بن حسن مثنیٰ ہیں جن کے لڑکے محمد کو بماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۱ھ مکہ میں مجلس کے اندر عباسیوں اور علویوں نے خلافت کے لیے منتخب کیا تھا اور تمام حاضرین مجلس کے ساتھ ابوجعفر منصور نے بھی محمد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ سفاح نے عبداللہ بن حسن مثنیٰ کی خدمت میں دس لاکھ درہم پیش کر دیے حالانکہ یہ رقم سفاح کے پاس اس وقت موجود نہ تھی، ابن مقرن سے قرض لے کر دی۔ اسی طرح ہر ایک علوی کو انعام و اکرام سے مالا مال کر کے رخصت کیا۔ عبداللہ بن حسن ابھی سفاح کے پاس سے رخصت نہ ہوئے تھے کہ مروان بن محمد کے قتل ہونے کی خبر اور بہت سے قیمتی جواہرات و زیورات جو مال غنیمت میں آئے تھے، لے کر قاصد پہنچا۔ سفاح نے وہ تمام قیمتی جواہرات و زیورات بھی عبداللہ بن حسن مثنیٰ کو دے دیے اور اسّی ہزار دینار دے کر وہ زیورات ایک تاجر سے عبداللہ بن حسن نے خرید لیے۔ غرضیکہ عبداللہ سفاح سے اس کام میں ذرا بھی کوتاہی ہوتی تو یقیناً علوی فوراً علانیہ مخالفت پر آمادہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے اور اس وقت ممکن تھا کہ بہت سے نقباء بھی جو کافی اثر رکھتے تھے، ان کا ساتھ دیتے اور عباسیوں کے لیے اپنی خلافت کو قائم رکھنا بے حد دشوار ہو جاتا۔ لہٰذا عبداللہ سفاح کے کاموں میں سب سے بڑا کارنامہ یہی سمجھنا چاہیے کہ اس نے تمام علویوں کو مال و دولت دے کر خاموش رکھا اور کسی کو مقابلہ پر کھڑا نہ ہونے دیا۔ عبداللہ سفاح کی وفات کے بعد ہی علوی خروج پر آمادہ ہو گئے مگر اب خلافت عباسیہ مستحکم ہو چکی تھی۔

ابوجعفر منصور

ابوجعفر عبداللہ منصور بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب کی ماں سلامہ بربریہ لونڈی تھی۔ ابوجعفر منصور سنہ ۹۵ھ میں اپنے دادا کی حیات میں پیدا ہوا۔ بعض روایتوں کی رُو سے وہ سنہ۔۱۰۱ھ میں پیدا ہوا تھا۔ یہ ہیبت وشجاعت و جبروت اور عقل ورائے میں خصوصی امتیاز رکھتا تھا۔ لہوولعب کے پاس نہ پھٹکتا تھا۔ علم وادب کو اچھا خاصا جانتا تھا۔ اس نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو عہدہ قضاۃ سے انکار کرنے کے جرم میں قید کر دیا تھا۔ انہوں نے قید خانہ ہی میں انتقال کیا۔ بعض کا قول ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے منصور پر خروج کرنے کا فتویٰ دیا تھا۔ اس لیے ان کو زہر دلوایا گیا۔ منصور نہایت فصیح و بلیغ اور خوش تقریر شخص تھا۔ حرص وبخل سے اس کو متہم کیا جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام بن عبدالملک اموی نے سنہ۔۱۳۸ھ یعنی منصور کے عہد خلافت میں اندلس کے اندر اپنی حکومت اور خلافت قائم کرلی تھی۔ وہ بھی ایک بربریہ کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ اس لیے لوگ کہتے تھے کہ اسلام کی حکومت بربریوں ہی میں تقسیم ہوگئی۔ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ جب منصور طلب علمی میں ادھرادھر پھرا کرتا تھا، ایک روز کسی منزل پر اترا تو چوکیدار نے اس سے دو درہم محصول کے مانگے اور کہا کہ جب تک محصول نہ ادا کرو گے، اس منزل پر نہ ٹھہر سکو گے۔ منصور نے کہا کہ میں بنو ہاشم میں سے ہوں، مجھے معاف کردو مگر وہ نہ مانا۔ منصور نے کہا کہ میں قرآن مجید جانتا ہوں، مجھے معاف کر دے۔ اس نے پھر بھی نہ سنا۔ منصور نے کہا میں عالم، اور ماہر فرائض ہوں، وہ پھر بھی نہ مانا۔ آخر منصور کو دو درہم دینے ہی پڑے۔ اسی روز سے منصور نے ارادہ کر لیا تھا کہ مال و دولت کو جمع کرنا چاہیے۔ منصور نے ایک مرتبہ اپنے بیٹے مہدی کو نصیحت کی کہ بادشاہ رعایا کی اطاعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اور رعایا بغیر عدل کے اطاعت نہیں کرسکتی۔ سب سے بہتر آدمی وہ ہے جو باوجود قدرت عفو کرے اور سب سے بے وقوف وہ ہے جو ظلم کرے۔ کسی معاملہ میں بلاغوروفکر حکم نہیں دینا چاہیے کیونکہ فکروتامل ایک آئینہ ہے جس میں انسان اپنا حسن وقبح دیکھ لیتا ہے۔ دیکھو! ہمیشہ نعمت کا شکر کرنا، مقدرت میں عفو کرنا، تالیف قلب کے ساتھ اطاعت کی امید رکھنا، فتح یابی کے بعد تواضع اور

رحمت اختیار کرنا۔

عبداللہ بن علی کا خروج:

منصور کے چچا عبداللہ بن علی کو عبداللہ سفاح نے خراسانی وشامی لشکر کے ساتھ اپنی موت سے پہلے صائفہ کی طرف روانہ کر دیا تھا۔محرم سنہ ۱۳۷ھ میں منصور انبار میں پہنچ کر تخت نشین خلافت ہوا تھا۔عیسیٰ بن موسیٰ نے سفاح کی وفات کے بارے میں عبداللہ بن علی کو بھی اطلاع دی تھی اور لکھا تھا کہ سفاح نے اپنے بعد منصور کی خلافت کے لیے وصیت کی ہے۔عبداللہ بن علی نے لوگوں کو جمع کر کے کہا کہ عبداللہ سفاح نے جب مہم حران کے لیے فوج روانہ کرنی چاہی تھی تو کسی کو اس طرف جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ سفاح نے کہا تھا کہ جو شخص اس مہم پر جائے گا، وہ میرے بعد خلیفہ ہوگا۔ چنانچہ اس مہم پر میں روانہ ہوا اور میں نے ہی مروان بن محمد اور دوسرے اموی سرداروں کو شکست دے کر اس مہم میں کامیابی حاصل کی۔ سب نے اس کی تصدیق کی اور عبداللہ بن علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔عبداللہ بن علی نے مقام دلوک سے مراجعت کر کے مقام حران میں مقاتل بن حکیم کا محاصرہ کرلیا۔ چالیس روز تک محاصرہ کیے رہا۔اثناء محاصرہ میں اہل خراسان سے مشتبہ ہوکر ان میں سے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا اور حمید بن قحطبہ کو والی حلب مقرر کر کے ایک خط دے کر روانہ کیا جو زفر بن عاصم گورنر حلب کے نام تھا۔اس خط میں لکھا تھا کہ حمید کو پہنچتے ہی قتل کر ڈالنا۔حمید نے راستے میں خط کھول کر پڑھ لیا اور بجائے حلب کے عراق کی طرف چل دیا۔ادھر منصور جب انبار میں پہنچا تو ابومسلم بھی وہاں پہلے پہنچ چکا تھا۔ابومسلم نے منصور کے ہاتھ پر بیعت کی اور منصور نے اس کے ساتھ عزت افزائی اور دل جمعی کا برتاؤ کیا۔

اسی اثناء میں خبر پہنچی کہ عبداللہ بن علی باغی ہوگیا ہے۔منصور نے ابومسلم سے کہا کہ مجھ کو عبداللہ بن علی کی طرف سے بہت خطرہ ہے۔ابومسلم تو ایسے واقعات کا خواہش مند ہی تھا، فوراً آمادہ ہوگیا کہ اس طرح منصور کو بھی براہ راست احسان مند بنایا جا سکے گا۔ چنانچہ ابومسلم کو عبداللہ بن علی کی سرکوبی پر مامور کیا گیا۔ابن قحطبہ جو عبداللہ بن علی سے ناراض عراق کی جانب آ رہا تھا، وہ ابومسلم سے آملا۔عبداللہ بن علی نے مقاتل بن حکیم کو امان دے دی اور مقاتل نے حران عبداللہ بن علی کے سپرد کر دیا۔عبداللہ بن علی نے مقاتل کو مع ایک خط کے عثمان بن عبدالاعلیٰ حاکم رقہ کے پاس بھیجا۔

عثمان نے مقاتل کو پہنچتے ہی قتل کر دیا اور اس کے دونوں لڑکوں کو گرفتار کر لیا۔ منصور نے ابومسلم کو روانہ کرنے کے بعد محمد بن صول کو آذربائیجان سے طلب کر کے عبداللہ بن علی کے پاس دھوکا دینے کی غرض سے روانہ کیا۔ محمد بن صول نے عبداللہ بن علی کے پاس پہنچ کر یہ کہا کہ میں نے سفاح سے سنا ہے، وہ کہتے تھے کہ میرے بعد میرا جانشین میرا چچا عبداللہ ہوگا۔ عبداللہ بن علی بولا کہ تو جھوٹا ہے۔ میں تیرے فریب خوب سمجھ گیا ہوں۔ یہ کہہ کر اس کی گردن اڑا دی۔ اس کے بعد عبداللہ بن علی نے حران سے روانہ ہو کر نصیبین میں آ کر قیام کیا اور خندق کھود کر مورچے قائم کیے۔ منصور نے ابومسلم کو روانہ کرنے سے پہلے حسن بن قحطبہ والی آرمینیا کو بھی لکھ دیا تھا کہ آ کر ابومسلم کی شرکت اختیار کرے۔ چنانچہ حسن بن قحطبہ بھی موصل کے مقام پر ابومسلم سے آ ملا تھا۔ ابومسلم مع اپنے لشکر کے جب نصیبین کے قریب پہنچا تو نصیبین کا رخ چھوڑ کر شام کے راستے پر پڑاؤ ڈالا اور یہ مشہور کیا کہ مجھ کو عبداللہ بن علی سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں تو شام کی گورنری پر مامور کیا گیا ہوں، شام کو جا رہا ہوں۔ عبداللہ بن علی کے ہمراہ جو شامی لوگ تھے، وہ یہ سن کر گھبرائے اور انہوں نے عبداللہ بن علی سے کہا کہ ہمارے اہل و عیال ابومسلم کے پنجہ ظلم میں گرفتار ہو جائیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم اس کو شام کی طرف جانے سے روکیں۔ عبداللہ بن علی نے ہر چند سمجھایا کہ وہ ہمارے ہی مقابلہ کو آیا ہے، شام میں نہ جائے گا لیکن کوئی نہ مانا۔ آخر عبداللہ بن علی نے اس مقام سے کوچ کیا۔ جب عبداللہ بن علی اس مقام کو چھوڑ کر شام کی طرف روانہ ہوا تو ابومسلم فوراً عبداللہ بن علی کی بہترین لشکر گاہ میں آ کر مقیم ہو گیا اور عبداللہ بن علی کو لوٹ کر اس مقام پر قیام کرنا پڑا، جس میں ابومسلم پہلے مقیم تھا۔ اس طرح ابومسلم نے بہترین لشکر گاہ حاصل کر لی۔ اب دونوں لشکروں میں لڑائی کا سلسلہ جاری ہوا۔ کئی مہینے تک لڑائی ہوتی رہی۔ آخر ۷ جمادی الثانی یوم چہارشنبہ سنہ ۱۳۷ھ کو عبداللہ بن علی نے شکست کھائی اور ابومسلم نے فتح پا کر فتح کا بشارت نامہ منصور کے پاس بھیجا۔ عبداللہ بن علی نے اس میدان سے فرار ہو کر اپنے بھائی سلیمان بن علی کے پاس جا کر بصرہ میں پناہ لی اور ایک مدت تک وہاں چھپا رہا۔

قتل ابومسلم:

جب عبداللہ بن علی کو شکست ہوئی اور ابومسلم نے اس کی لشکر گاہ کو لوٹ لیا اور مال غنیمت خوب ہاتھ آیا تو المنصور نے اس فتح کا حال سن کر اپنے خادم ابوخصیب کو مال غنیمت کی فہرست تیار کرنے

کے لیے روانہ کیا۔ ابو مسلم کو اس بات سے سخت غصہ آیا کہ منصور نے میرا اعتبار نہ کیا اور اپنا آدمی فہرست مرتب کرنے کے لیے بھیجا۔ ابو مسلم کی اس ناراضی و ناخوشی کی اطلاع جب منصور کے پاس پہنچی تو اس کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں ابو مسلم ناراض ہو کر خراسان کو نہ چلا جائے۔ چنانچہ اس نے مصر و شام کی سند گورنری لکھ کر ابو مسلم کے پاس بھیج دی۔ ابو مسلم کو اس سے اور بھی زیادہ رنج ہوا اور وہ سمجھ گیا کہ منصور مجھ کو خراسان سے جدا کر کے بے دست و پا کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ابو مسلم جزیرہ سے نکل کر خراسان کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ سن کر منصور انبار سے مدائن کی طرف روانہ ہوا اور ابو مسلم کو اپنے پاس حاضر ہونے کے لیے بلایا۔ ابو مسلم نے آنے سے انکار کر کے لکھ بھیجا کہ ''میں دور ہی سے اطاعت کروں گا۔ آپ کے تمام دشمنوں کو میں نے مغلوب کر دیا ہے۔ اب جبکہ آپ کے خطرات دور ہو گئے ہیں تو آپ کو میری ضرورت بھی باقی نہیں رہی۔ اگر آپ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیں گے تو میں آپ کی اطاعت سے باہر نہ ہوں گا اور اپنی بیعت پر قائم رہوں گا لیکن اگر آپ میرے درپے رہے تو میں آپ کی خلع خلافت کا اعلان کر کے آپ کی مخالفت پر آمادہ ہو جاؤں گا۔''

اس خط کو پڑھ کر منصور نے ابو مسلم کو نہایت نرمی اور محبت کے لہجہ میں ایک خط لکھا کہ ''ہم کو تمہاری وفاداری اور اطاعت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے تم بڑے کارگزار اور مستحق انعام ہو۔ شیطان نے ہمارے دل میں وسوسے ڈال دیے ہیں۔ تم ان وسوسوں سے اپنے آپ کو بچاؤ اور ہمارے پاس چلے آؤ۔'' یہ خط منصور نے اپنے آزاد غلام ابو حمید کے ہاتھ روانہ کیا اور ان کو تاکید کی کہ منت سماجت سے جس طرح ممکن ہو، ابو مسلم کو میرے پاس آنے کی ترغیب دینا اور اگر وہ کسی طرح نہ مانے تو پھر میرے غصہ سے اس کو ڈرانا۔ یہ خط جب ابو مسلم کے پاس پہنچا تو اس نے مالک بن ہیثم سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ تم ہرگز منصور کے پاس نہ جاؤ، وہ تم کو قتل کر دے گا۔ لیکن ابوداؤد خالد بن ابراہیم کو خراسان کی گورنری کا لالچ دے کر منصور نے بذریعہ خط پہلے ہی اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ ابو مسلم کو جس طرح ممکن ہو، میرے پاس آنے پر آمادہ کرو۔ ابوداؤد کے مشورے سے ابو مسلم، منصور کے پاس جانے پر آمادہ ہو گیا مگر پھر بھی اس احتیاط کو ضروری سمجھا کہ اپنے وزیر ابو اسحاق خالد بن عثمان کو اول منصور کے پاس بھیج کر وہاں کے حالات سے زیادہ واقفیت حاصل کرے۔ ابو اسحاق پر ابو مسلم کو بہت اعتماد تھا۔ چنانچہ اول ابو اسحاق کو روانہ کیا گیا۔ ابو اسحاق جب دربار خلافت کے پاس پہنچا تو تمام سرداران بنو ہاشم اور ارکین دولت استقبال کو آئے۔ منصور نے حد سے زیادہ تکریم ومحبت

کا برتاؤ کیا اور اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اسحاق کو اپنی جانب مائل کر کے کہا کہ تم ابومسلم کو خراسان جانے سے روک کر اول میرے پاس آنے پر آمادہ کر دو تو میں تم کو خراسان کی حکومت اس کام کے صلہ میں دے دوں گا۔ ابواسحاق یہ سن کر آمادہ ہو گیا۔ رخصت ہو کر ابومسلم کے پاس آیا اور اس کو منصور کے پاس جانے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ ابومسلم اپنے لشکر کو حلوان میں مالک بن ہیثم کی افسری میں چھوڑ کر تین ہزار فوج کے ساتھ مدائن کی طرف روانہ ہوا۔ جب ابومسلم مدائن کے قریب پہنچا تو ابومسلم کے پاس منصور کے اشارہ کے موافق ایک شخص پہنچا اور ملاقات کرنے کے بعد ابومسلم سے کہا کہ آپ منصور سے میری سفارش کر دیں کہ وہ مجھ کو کسکر کی حکومت دے دے۔ نیز یہ کہ وزیر السلطنت ابوایوب سے منصور آج کل سخت ناراض ہے، آپ ابوایوب کی بھی سفارش کر دیں۔ ابو مسلم یہ سن کر خوش ہو گیا اور اس کے دل سے رہے سہے خطرات سب دور ہو گئے۔ ابومسلم دربار میں عزت و احترام کے ساتھ داخل ہوا اور عزت کے ساتھ رخصت ہو کر قیام گاہ پر آرام کرنے گیا۔ دوسرے روز جب دربار میں آیا تو منصور نے پہلے سے عثمان بن نہیک، شبیب بن رواح، ابوحنیفہ حرب بن قیس وغیرہ چند شخصیتوں کو پس پردہ چھپا کر بٹھا دیا اور حکم دے دیا تھا کہ جب میں اپنے ہاتھ پر ہاتھ ماروں تو تم نکل کر فوراً ابومسلم کو قتل کر ڈالنا۔ چنانچہ ابومسلم دربار میں حاضر ہوا۔ خلیفہ منصور نے باتوں باتوں میں اس سے ان دو تلواروں کا حال دریافت کیا جو ابومسلم کو عبداللہ بن علی سے ملی تھیں۔ ابومسلم اس وقت انہیں تلواروں میں سے ایک کو اپنی کمر سے لگائے ہوئے تھا۔ اس نے کہا کہ ایک تو یہ موجود ہے۔ منصور نے کہا کہ ذرا میں بھی دیکھوں۔ ابومسلم نے فوراً خلیفہ منصور کے ہاتھ میں تلوار دے دی۔ وہ تھوڑی دیر تک اس کو دیکھتا رہا، پھر اس کو اپنے زانو کے نیچے رکھ کر ابومسلم سے اس کی حرکات کی شکایت کرنے لگا، پھر سلیمان بن کثیر کے قتل کا ذکر کیا اور کہا کہ تو نے اس کو کیوں قتل کیا حالانکہ وہ اس وقت سے ہمارا خیر خواہ تھا جبکہ تو اس کام میں شریک بھی نہ ہوا تھا۔ ابو مسلم اول خوشامدانہ اور عاجزانہ لہجہ میں معذرت کرتا رہا لیکن دم بہ دم منصور کے طیش و غضب کو ترقی کرتے ہوئے دیکھ کر جب اس کو یقین ہو گیا کہ آج میری خیر نہیں تو اس نے جرأت سے جواب دیا کہ جو آپ کا جی چاہے کیجیے۔ میں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ منصور نے ابومسلم کو گالیاں دیں اور ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ تالی کے بجتے ہی عثمان بن نہیک وغیرہ نے نکل کر ابومسلم پر وار کیے اور اس کا کام تمام کر دیا۔ واقعہ ۲۵ شعبان سنہ ۱۳۷ھ کا ہے۔ ابومسلم کے مارے جانے کے بعد وزیر السلطنت

نے باہر آ کر ابومسلم کے ہمراہیوں کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ امیر اس وقت امیرالمومنین کی خدمت میں رہیں گے، تم لوگ واپس چلے جاؤ۔ اس کے بعد عیسیٰ بن موسیٰ نے دربار خلافت میں حاضر ہو کر ابومسلم کے بارے میں دریافت کیا۔ جب اس کے قتل کا حال معلوم ہوا تو اس کی زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون نکل گیا۔ یہ بات منصور کو ناگوار گزری اور اس نے کہا کہ ابومسلم سے زیادہ تمہارا کوئی دشمن نہ تھا، پھر منصور نے جعفر بن حنظلہ کو بلوایا اور ابومسلم کے قتل کی نسبت مشورہ کیا۔ جعفر نے اس کے قتل کی رائے دی۔ منصور نے کہا کہ اللہ تجھے جزائے خیر دے۔ اس کے بعد ابومسلم کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ جعفر نے ابومسلم کی لاش کی طرف دیکھتے ہی کہا کہ ''امیرالمومنین! آج سے آپ کی خلافت شمار کی جائے گی۔'' منصور مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

ابونصر مالک بن ہیثم جس کو ابومسلم اپنا لشکر اور مال سپرد کر آیا تھا، حلوان سے بہ قصد خراسان ہمدان کی طرف روانہ ہو گیا، پھر منصور کی خدمت میں واپس چلا آیا۔ منصور نے اس کو ملامت کی کہ تو نے ابومسلم کو میرے پاس آنے کے خلاف مشورہ دیا تھا۔ اس نے کہا کہ جب تک ابومسلم کے پاس تھا، اس کو نیک مشورہ دیا۔ اب آپ کے پاس آ گیا ہوں تو آپ کی بہتری کے لیے کوشاں رہوں گا۔ منصور نے اس کو موصل کی حکومت پر بھیج دیا۔

خروج سنباد:

ابومسلم کے قتل سے فارغ ہو کر بہ ظاہر منصور کو اطمینان حاصل ہو چکا تھا لیکن اس کے بعد بھی منصور کے لیے مشکلات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ابومسلم کے ہمراہیوں میں ایک مجوسی فیروز نامی جو سنباد کے نام سے مشہور تھا، وہ مسلمان ہو کر ابومسلم کی فوج میں شامل تھا۔ ابومسلم کے قتل کے بعد اس نے ابومسلم کے خون کا معاوضہ طلب کرنے کے لیے خروج کیا اور کوہستان کے لوگوں نے اس کا ساتھ دیا۔ سنباد نے نیشاپور اور رے پر قبضہ کر کے اس تمام مال و اسباب کو جو ابومسلم حج کے لیے روانہ ہوتے وقت رے اور نیشاپور میں چھوڑ گیا تھا، قبضہ کیا۔ سنباد نے لوگوں کے مال و اسباب کو لوٹا اور ان کو گرفتار کر کے باندی غلام بنایا اور مرتد ہو کر اعلان کیا کہ میں خانہ کعبہ کو منہدم کرنے جاتا ہوں۔ نومسلم ایرانیوں کے لیے اس قدر تحریک کافی تھی۔ ان میں جو لوگ مذہب اسلام سے واقف نہ ہوئے تھے، وہ یہ دیکھ کر کہ ہماری ہی قوم وملک کا ایک شخص اسلامی سلطنت کے خلاف اٹھا ہے، اس

کے شریک ہو گئے۔ منصور نے جب اس فتنہ کا حال سنا تو سنباد کی سرکوبی کے لیے جمہور بن مرار عجلی کو مامور کیا۔ ہمدان اور رے کے درمیان لڑائی ہوئی، جمہور نے سنباد کو شکست دی۔ سنباد کے ہمراہیوں میں سے قریباً سات ہزار آدمی مارے گئے۔ سنباد نے فرار ہو کر طبرستان میں پناہ لی۔ وہاں عامل طبرستان کے ایک خادم نے سنباد کو قتل کر دیا۔ منصور نے یہ خبر سن کر عامل طبرستان کو لکھا کہ سنباد کا مال واسباب ہمارے پاس بھیج دو۔ اس نے مال واسباب سے انکار کیا۔ منصور نے عامل طبرستان کی گوشمالی کے لیے فوج بھیجی۔ عامل طبرستان دیلم کی طرف بھاگ گیا۔ ادھر جمہور نے جب سنباد کو شکست دی تھی تو اس کے بہت سے مال واسباب اور قریباً اس کے تمام خزانہ پر اس کا قبضہ ہو گیا تھا۔ ابومسلم کا خزانہ اس کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اس خزانے اور مال واسباب کو جمہور نے منصور کے پاس بھیجا اور رے میں جا کر قلعہ بندی کر کے منصور کی خلع خلافت اور بغاوت کا اعلان کر دیا۔ منصور نے جمہور کے مقابلے پر محمد بن اشعث کو فوج دے کر روانہ کیا۔ جمہور یہ سن کر رے سے اصفہان کی طرف چلا گیا۔ جمہور اصفہان پر اور محمد بن اشعث رے پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد محمد نے اصفہان پر چڑھائی کی، جمہور نے مقابلہ کیا۔ سخت لڑائی کے بعد جمہور شکست کھا کر آذربائیجان کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں جمہور کے ہمراہیوں میں سے کسی نے اس کو قتل کر کے اس کا سر منصور کے پاس بھیج دیا۔ یہ سنہ ۱۳۸ھ کا واقعہ ہے۔

سنہ ۱۳۹ھ میں منصور نے اپنے چچا سلیمان کو حکومت بصرہ سے معزول کر کے اپنے پاس بلایا اور لکھا کہ عبداللہ بن علی کو (جو ابومسلم سے شکست کھا کر بصرہ میں اپنے بھائی سلیمان کے پاس چلا آیا تھا) امان دے کر اپنے ہمراہ میرے پاس لیتے آؤ۔ جب عبداللہ بن علی کو سلیمان نے دربار میں حاضر کیا تو منصور نے اس کو قید کر دیا (بعد میں قتل کرا دیا تھا)۔

فرقہ راوندیہ:

فرقہ راوندیہ کو شیعوں کے فرقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ایران وخراسان کے جاہل لوگوں کا ایک گروہ تھا جو علاقہ راوند میں رہتا اور ان لوگوں میں سے نکلا تھا۔ جن کو ابومسلم خراسانی نے اپنے ساتھ شامل کیا تھا ابومسلم نے جو جماعت تیار کی تھی، اس کو مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ جس

طرح ممکن ہوتا تھا، ان کو سیاسی اغراض کے لیے آمادہ و مستعد کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہ گروہ جس کو راوندیہ کہا جاتا ہے، تناسخ [1] اور حلول کا قائل تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے منصور میں حلول کیا ہے۔ [2] چنانچہ یہ لوگ خلیفہ منصور کو اللہ سمجھ کر اس کی زیارت کرتے تھے اور منصور کے درشن کرنے کو عبادت جانتے تھے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ آدم کی روح نے عثمان بن نہیک میں اور جبرئیل نے ہیثم بن معاویہ میں حلول کیا ہے۔ یہ لوگ دارالخلافہ میں آ کر اپنے ناشدنی اعمال و عقائد کا اعلان کرنے لگے تو منصور نے ان میں سے دو سو آدمیوں کو پکڑ کر قید کر دیا۔ ان کی پانچ چھ سو کی تعداد اور موجود تھی۔ ان کو اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو اس گرفتاری سے اشتعال پیدا ہوا اور قید خانہ پر حملہ کر کے اپنے بھائیوں کو قید سے چھڑا لیا اور پھر منصور کے محل کا محاصر کر لیا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ منصور کو اللہ کہتے تھے اور پھر اس اللہ کی مرضی کے خلاف آمادہ جنگ تھے۔ اس موقع پر یہ بات قابل تذکرہ ہے کہ یزید بن ہبیرہ کے ساتھیوں میں معن بن زائدہ بھی تھا اور جب ابن ہبیرہ کی لڑائیاں عباسیوں سے ہوئی ہیں تو معن بن زائدہ، ابن ہبیرہ کے نامور قہرداروں میں سے ایک تھا۔ معن بن زائدہ ابن ہبیرہ کے بعد دارالخلافہ ہاشمیہ میں آ کر روپوش تھا اور منصور اس کی تلاش و جستجو میں تھا کہ معن بن زائدہ کو گرفتار کرا کر قتل کرے۔ ان بدمذہب راوندیوں نے جب منصور کے محل کا محاصرہ کیا تو منصور پیادہ پا اپنے محل سے نکل آیا اور بلوائیوں کو مارنے اور ہٹانے لگا۔ منصور کے ساتھ بہت تھوڑے آدمی تھے اور حقیقت یہ تھی کہ اس وقت دارالخلافہ میں کوئی جمعیت اور طاقت ایسی موجود نہ تھی کہ ان بلوائیوں کی طاقت کا مقابلہ کر سکتی۔ منصور کے لیے یہ وقت نہایت ہی نازک تھا اور قریب تھا کہ دارالخلافہ، خلافت اور اپنی جان منصور کے ہاتھ سے جائے اور راوندیوں کا قبضہ ہو جائے، اس خطرناک حالت سے فائدہ اٹھانے میں معن بن زائدہ نے کوتاہی نہیں کی۔ وہ فوراً منصور کے پاس

---

1. اسے آواگون کا نظریہ بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک باطل نظریہ ہے جس کے مطابق انسان بار بار جنم لیتا ہے۔ عصر حاضر میں زیادہ تر یہ عقیدہ ہندوؤں کے مذہب کا حصہ ہے۔

2. ایسی خبیث فکر اور عقیدہ سے اللہ کی پناہ! حلول کا نظریہ صوفیاً کا نظریہ ہے، جو انتہائی مشرکانہ اور باطل نظریہ ہے۔ اس گستاخانہ نظریہ میں اللہ تعالیٰ کی از حد توہین موجود ہے۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے عرش عظیم پر استویٰ فرمائے ہوئے ہے اور وہ یکتا ہے۔ ذات، صفات اور اختیارات میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ لیکن اس خبیث نظریہ حلولیہ کے مطابق ...... معاذ اللہ! قلم اس کے تصور سے بھی پناہ مانگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل تصوف نے مذہب کے میدان میں جس قدر زہریلے اور غلیظ افکار و نظریات پھیلائے ہیں، شائد اور کسی حلقہ نے اس قدر نہیں پھیلائے۔

پہنچ گیا اور جاتے ہی بلوائیوں کو مارنے اور ہٹانے میں مصروف ہو گیا۔ اتنے میں اور لوگ بھی آ آ کر منصور کے گرد جمع ہونے لگے لیکن معن بن زائدہ کے حملے بہت ہی زبردست اور کارگر ثابت ہو رہے تھے اور منصور اپنی آنکھ سے اس اجنبی شخص کی حیرت انگیز بہادری دیکھ رہا تھا۔ آخر معن بن زائدہ نے اس لڑائی میں سپہ سالاری کے فرائض خود بہ خود ادا کرنے شروع کر دیے اور نتیجہ یہ ہوا کہ سخت وشدید زور آزمائی و معرکہ آرائی کے بعد ان بلوائیوں کو شکست ہوئی۔ شہر کے آدمی بھی سب اٹھ کھڑے ہوئے اور تمام بلوائیوں کو قتل کر کے رکھ دیا۔ اس ہنگامے کے فرو ہونے کے بعد منصور نے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے جس نے اپنی پامردی و بہادری کے ذریعہ سے اس فتنہ کو فرو کرنے میں سب سے زیادہ کام کیا ہے؟ تب اس کو معلوم ہوا کہ یہ معن بن زائدہ ہے۔ منصور نے اس کو امان دی اور اس کے سابقہ جرموں کو معاف کر کے اس کی عزت و مرتبہ کو بڑھایا۔

ابوداؤد خالد بن ابراہیم ذہلی بلخ کا عامل اور آج کل خراسان کا گورنر تھا۔ اسی عرصہ یعنی سنہ ۱۴۰ھ میں اس کے لشکر میں بغاوت پھوٹی اور اہل لشکر نے اس کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ ابوداؤد مکان کی چھت پر ان باغیوں کو دیکھنے کے لیے چڑھا۔ اتفاق سے پاؤں پھسل کر گر پڑا اور اسی دن مر گیا۔ اس کے بعد اس کے سپہ سالار حصام نے اس بغاوت کو فرو کیا اور خراسان کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر منصور کو اطلاع دی۔ منصور نے عبدالجبار بن عبدالرحمٰن کو گورنر خراسان بنا کر بھیجا۔

عبدالجبار کی بغاوت اور قتل:

عبدالجبار نے خراسان کی حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہی ابوداؤد کے عاملوں کو معزول و بے عزت اور قتل کرنا شروع کیا اور بڑے بڑے سرداروں کو ذرا ذرا سے شبہ میں قتل کر کے تمام ملک میں ہلچل مچا دی۔ یہ خبر منصور کے پاس پہنچی کہ عبدالجبار عباسیوں کے خیر خواہوں کو قتل کر ڈالتا ہے۔ منصور کو تامل تھا کہ عبدالجبار کو خراسان سے کس طرح بہ آسانی جدا کرے کیونکہ اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں وہ علانیہ باغی نہ ہو جائے۔ آخر منصور نے عبدالجبار کو لکھا کہ لشکر خراسان کا ایک بڑا حصہ جہاد روم پر روانہ کر دو۔ مدعا یہ تھا کہ جب لشکر خراسان کا بڑا حصہ خراسان سے جدا ہو جائے گا تو پھر عبدالجبار کا معزول کرنا اور کسی دوسرے گورنر کو وہاں بھیج دینا آسان ہو گا۔ عبدالجبار نے جواباً لکھا کہ ترکوں نے فوج کشی شروع کر دی ہے۔ اگر آپ لشکر خراسان کو دوسری طرف منتقل کر دیں گے تو مجھ کو خراسان

کے نکل جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ جواب دیکھ کر منصور نے عبدالجبار کو لکھا کہ مجھ کو خراسان کا ملک سب سے زیادہ عزیز ہے اور اس کو محفوظ رکھنا نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر ترکوں نے فوج کشی شروع کردی ہے تو میں خراسان کی حفاظت کے لیے ایک لشکر عظیم روانہ کرتا ہوں، تم کوئی فکر نہ کرو۔ اس تحریر کو پڑھ کر فوراً عبدالجبار نے منصور کو لکھا کہ خراسان کے ملک کی آمدنی اس قدر بار عظیم کی متحمل نہ ہو سکے گی۔ آپ کوئی بڑا لشکر نہ بھیجئے۔ یہ جواب دیکھ کر منصور کو یقین ہو گیا کہ عبدالجبار بغاوت پر آمادہ ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً بلا توقف اپنے بیٹے مہدی کو ایک زبردست فوج دے کر روانہ کیا۔ مہدی نے رے میں پہنچ کر قیام کیا اور خازم بن خزیمہ کو عبدالجبار سے لڑنے کے لیے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ دونوں میں لڑائی اور سخت معرکہ آرائی ہوئی۔ آخر عبدالجبار شکست کھا کر بھاگا اور محشر بن مزاحم نے اس کو گرفتار کر کے خازم بن خزیمہ کی خدمت میں پیش کیا۔ خازم بن خزیمہ نے اس کو بالوں کا ایک جبہ پہنا کر دم کی طرف منہ کر کے اونٹ پر سوار کیا اور تشہیر کرا کر مع اس کے گرفتار شدہ ہمراہیوں کے منصور کے پاس بھیج دیا۔ منصور نے ان لوگوں کو قید کر دیا اور سنہ ۱۴۲ھ میں عبدالجبار کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر قتل کرنے کا حکم دیا۔ عبدالجبار پر فتح پانے کے بعد مہدی نے خراسان کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور سنہ ۱۴۹ھ تک وہ خراسان کا گورنر رہا۔

عیینہ بن موسیٰ بن کعب:

موسیٰ بن کعب سندھ کا عامل تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عیینہ عامل سندھ مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے سندھ میں منصور کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ منصور کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ دارالخلافہ سے بصرہ میں آیا اور بصرہ سے عمرو بن حفص بن ابی صفوہ عتکی کو سندھ و ہند کی سند گورنری عطا کر کے جنگ عیینہ پر مامور کیا۔ عمر بن حفص نے سندھ میں پہنچ کر عیینہ کے ساتھ جنگ شروع کی اور بالآخر سندھ پر قبضہ حاصل کر لیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۴۲ھ کا ہے۔ اسی عرصہ میں والی طبرستان نے بغاوت اختیار کی۔ طبرستان کی طرف خازم بن خزیمہ اور روح بن حاتم بھیجے گئے۔ جنہوں نے طبرستان پر قبضہ حاصل کیا اور عامل طبرستان جو ایک ایرانی النسل نو مسلم تھا، خودکشی کر کے مر گیا۔

علویوں کی قید و گرفتاری:

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ مکہ میں بنوامیہ کی حکومت کے آخری ایام میں ایک مجلس منعقد ہوئی تھی۔

اس میں خلیفہ کے تعین اور انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا تھا تو منصور نے جو اس مجلس میں موجود تھا، محمد بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن حسن بن علی کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ سب نے اس رائے سے اتفاق کر کے محمد بن عبداللہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس بیعت میں منصور بھی شریک تھا۔ یعنی منصور، محمد بن عبداللہ حسنی کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر چکا تھا۔ سفاح نے اپنے عہد خلافت میں علویوں کو خاموش رکھا اور انعام واکرام اور بذل مال سے ان کو خوش رکھ کر مخالفت اور خروج پر آمادہ نہ ہونے دیا۔ منصور جب خلیفہ ہوا تو اس نے سفاح کے زمانے کی سخاوت کو باقی نہ رکھا اور سب سے زیادہ محمد بن عبداللہ کے باپ عبداللہ بن حسن جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ وہ سفاح کے پاس آیا تھا اور سفاح نے اس کو بہت سا مال و زر دے کر خوش وخرم واپس کیا تھا۔ جب منصور خلیفہ ہوا تو عبداللہ بن حسن نے اپنے بیٹے محمد اور ابراہیم کو اس خیال سے روپوش کر دیا کہ کہیں منصور ان کو قتل نہ کرا دے۔ اس محمد بن عبداللہ کو جس کے ہاتھ پر منصور نے بیعت کی تھی، محمد مہدی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لہٰذا آئندہ اس کا نام محمد مہدی ہی لکھا جائے گا۔ سنہ ۱۳۶ھ میں جب منصور حج کرنے گیا تھا اور اس نے وہاں سفاح کے مرنے کی خبر سنی تھی تو سب سے پہلے اس نے محمد مہدی کو دریافت کیا۔ اس وقت وہ وہاں موجود نہ تھا مگر لوگوں کو شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ روپوش ہو گیا۔ اس کے ساتھ اس کا بھائی ابراہیم بھی روپوش رہا۔ منصور خلیفہ ہونے کے بعد برابر محمد مہدی کا حال لوگوں سے دریافت کرتا رہتا تھا۔ اس تفحص و تجسس میں اس نے اس قدر مبالغہ کیا کہ ہر شخص کو یہ حال معلوم ہو گیا کہ منصور کو محمد مہدی کی بڑی تلاش ہے۔ عبداللہ بن حسن مثنیٰ کو جب منصور کی طرف سے مجبور کیا گیا کہ اپنے بیٹے کو حاضر کرو تو اس نے منصور کے چچا سلیمان بن علی سے مشورہ کیا۔ سلیمان نے کہا کہ اگر منصور درگزر کرنے کا عادی ہوتا تو اپنے چچا سے درگزر کرتا یعنی عبداللہ بن علی پر سختی وتشدد روا نہ رکھتا۔ عبداللہ بن حسن سن کر اپنے بیٹوں کو روپوش رکھنے میں اور بھی زیادہ مبالغہ کرنے لگا۔ آخر منصور نے حجاز کے چپے چپے میں اپنے جاسوس پھیلا دیے اور جعلی خطوط لکھوا کر عبداللہ بن حسن کے پاس بھجوائے کہ کسی طرح محمد مہدی کا پتہ چل جائے۔ محمد مہدی اور اس کے بھائی ابراہیم دونوں حجاز میں چھپتے پھرے، پھر منصور صرف انہیں کے تجسس و تلاش میں خود حج کے بہانہ سے مکہ میں پہنچا۔ یہ دونوں بھائی حجاز سے بصرہ میں آ کر بنوراہب اور بنومرہ میں مقیم ہوئے۔ منصور کو اس کا پتہ لگا تو وہ سیدھا بصرہ میں آیا لیکن اس کے آنے سے پیشتر محمد مہدی اور ابراہیم بصرہ چھوڑ چکے تھے۔ بصرہ

سے یہ دونوں عدن چلے گئے۔ منصور بصرہ سے دارالخلافہ کو روانہ ہو گیا۔ جب عدن میں بھی ان دونوں بھائیوں کو اطمینان نہ ہوا تو سندھ چلے گئے۔ چند روز سندھ میں رہ کر کوفہ میں آ کر روپوش رہے، پھر کوفہ سے مدینہ منورہ چلے آئے۔ سنہ ۱۴۰ھ میں منصور پھر حج کو آیا۔ یہ دونوں بھائی بھی حج کے لیے مکہ آئے۔ ابراہیم نے قصد کیا کہ منصور کی زندگی کا خاتمہ کر دے مگر اس کے بھائی محمد مہدی نے منع کر دیا۔ منصور کو اس مرتبہ بھی ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ اس نے ان کے باپ عبداللہ بن حسن مثنیٰ کو بلا کر دونوں بیٹوں کو حاضر کرنے کے لیے مجبور کیا۔ جب اس نے لاعلمی بیان کی تو منصور نے اس کو قید کرنا چاہا مگر زیاد عامل مدینہ نے اس کی ضمانت دی، تب وہ چھوٹا۔ چونکہ زیاد عامل مدینہ نے عبداللہ بن حسن کی ضمانت دی تھی، اس لیے منصور اس سے بھی بدگمان ہو گیا اور دارالخلافہ میں واپس آ کر محمد بن خالد بن عبداللہ قسری کو مدینہ کا عامل بنا کر بھیج دیا اور زیاد کو مع اس کے دوستوں کے گرفتار کرا کر بلوایا اور قید کر دیا۔ محمد بن خالد نے مدینہ کا عامل ہو کر محمد مہدی کی تلاش و جستجو میں بڑی کوشش کی اور بیت المال کا تمام روپیہ اسی کوشش میں صرف کر دیا۔ منصور نے محمد بن خالد کے اسراف اور ناکامی پر اس کو بھی معزول کیا اور رباح بن عثمان بن حیان مزنی کو مدینہ کا عامل بنایا۔ رباح نے مدینہ میں پہنچ کر عبداللہ بن حسن کو بہت تنگ کیا اور تمام مدینہ میں ہلچل مچا دی اور مندرجہ ذیل علویوں کو گرفتار کر کے قید کر دیا:

۱۔ عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن علی (محمد مہدی کا باپ)
۲۔ ابراہیم بن مثنیٰ بن حسن بن علی (محمد مہدی کا چچا)
۳۔ جعفر بن حسن بن حسن بن علی (محمد مہدی کا چچا)
۴۔ سلیمان بن داؤد بن حسن مثنیٰ بن علی (محمد مہدی کا چچا زاد بھائی)
۵۔ عبداللہ بن داؤد بن حسن بن حسن بن علی (محمد مہدی کا چچا زاد بھائی)
۶۔ محمد بن ابراہیم بن حسن بن حسن بن علی (محمد مہدی کا چچازاد بھائی)
۷۔ اسماعیل بن ابراہیم بن حسن بن حسن بن علی (محمد مہدی کا چچازاد بھائی)
۸۔ اسحاق بن ابراہیم بن حسن بن حسن بن علی (محمد مہدی کا چچازاد بھائی)
۹۔ عباس بن حسن بن حسن بن علی (محمد مہدی کا چچا)
۱۰۔ موسیٰ بن عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی (محمد مہدی کا حقیقی چچا)

۱۱۔ علی بن حسن بن حسن بن علی (محمد مہدی کا چچا)

ان لوگوں کو گرفتار کر کے منصور کو اطلاع دی گئی تو اس نے لکھا کہ ان لوگوں کے ساتھ محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عثمان بن عفان کو بھی گرفتار کر لو کیونکہ عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی کی ماں ایک ہی ہے یعنی یہ دونوں فاطمہ بنت حسین کے بیٹے ہیں۔ چنانچہ رباح نے اس حکم کی بھی تعمیل کی اور محمد بن عبداللہ بن عمرو کو قید کر لیا۔ انہیں ایام میں گورنر مصر نے علی بن محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی (محمد مہدی کا بیٹا) کو گرفتار کر کے منصور کے پاس بھیجا۔ منصور نے اس کو قید کر دیا۔ اسے اپنے باپ کی طرف سے مصر میں دعوت و تبلیغ کے لیے بھیجا گیا تھا۔

تعمیر بغداد اور تدوین علوم:

سفاح نے انبار کو اپنا دار السلطنت بنایا تھا اور چند روز کے بعد انبار سے متصل اس نے اپنا ایک محل اور ارا کین سلطنت کے مکانات بنوائے۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی الگ قائم ہو گئی تھی۔ اس کا نام ہاشمیہ رکھا گیا تھا۔ منصور ہاشمیہ ہی میں تھا کہ خراسانیوں کا ہنگامہ برپا ہوا۔ سنہ ۱۴۰ھ یا سنہ ۱۴۱ھ میں منصور نے اپنا ایک جدا دار الخلافہ بنانا چاہا اور شہر بغداد کی بنیاد رکھی گئی۔ بغداد کی تعمیر کا کام قریباً نو دس برس تک جاری رہا اور سنہ ۱۴۹ھ میں اس کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ اس روز سے بنو عباس کا دار الخلافہ بغداد رہا۔ اسی عرصہ میں علماء اسلام نے دینی علوم کی تاسیس و تدوین کا کام شروع کیا۔

ابن جریج نے مکہ میں، مالک رحمہ اللہ نے مدینہ میں، اوزاعی رحمہ اللہ نے شام میں، ابن ابی عرویہ اور حماد بن سلمہ نے بصرہ میں، معمر نے یمن میں، سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کوفہ میں احادیث کی کتابیں لکھنے کا کام شروع کیا۔ ابن اسحاق نے مغازی پر، ابوحنیفہ نے فقہ پر کتابیں لکھیں۔[1] اس سے پہلے احادیث و مغازی وغیرہ کا انحصار زبانی روایات پر تھا۔ تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ شروع ہو کر دم بہ دم ترقی کرتا رہا اور اس کے بعد بغداد اور قرطبہ کے درباروں نے مصنفین کی خوب خوب ہمت افزائیاں کیں۔ احادیث کی کتابیں لکھنے اور قوت حافظہ کا بوجھ کتابت و قرطاس پر ڈالنے کا یہی زمانہ سب سے زیادہ موزوں اور ضروری بھی تھا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

علویوں کا قتل:

[1] یہ امام ابوحنیفہ کی ذاتی تالیف نہیں بلکہ یہ کتب ان کے شاگردوں ابو یوسف اور امام محمد نے مرتب کی تھیں، جن میں انہوں نے مسائل دین کی تشریح کرتے ہوئے قرآن کریم اور احادیث کے ساتھ ساتھ امام ابوحنیفہ کے اقوال بھی درج کیے ہیں۔

رباح نے جن بزرگوں کو گرفتار کر کے قید کر دیا تھا، وہ سنہ ۱۴۴ھ کے آخر ایام تک مدینہ میں قید رہے۔ منصور برابر محمد مہدی اور اس کے بھائی ابراہیم کے تجسس و تلاش میں مصروف رہا۔ اس عرصہ میں یہ دونوں بھائی حجاز کے قبائل اور غیر معروف مقامات میں روپوش رہے اور جلد جلد اپنی جائے قیام کو تبدیل کرتے رہے۔ غرض حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی اولاد میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو قید نہ ہو گیا ہو یا اپنی جان بچانے کے لیے چھپا چھپا نہ پھرتا ہو۔ سنہ ۱۴۴ھ کے ماہ ذی الحجہ میں منصور حج کرنے گیا اور محمد بن عمران بن ابراہیم بن طلحہ اور مالک بن انس رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام دے کر اولاد حسن کے پاس قید خانہ میں بھیجا کہ محمد و ابراہیم دونوں بھائیوں کو ہمارے سپرد کر دو۔ ان دونوں کے باپ عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن حسن نے ان دونوں کے حال سے اپنی لاعلمی بیان کر کے خود منصور کے پاس حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ منصور نے کہا کہ جب تک وہ اپنے دونوں بیٹوں کو حاضر نہ کرے، میں عبداللہ بن حسن سے ملنا نہیں چاہتا۔ جب منصور حج سے واپس ہو کر عراق کی جانب آنے لگا تو رباح کو حکم دیا کہ ان قیدیوں کو ہمارے پاس عراق بھیج دو۔ رباح نے ان سب قیدیوں کو قید خانہ سے نکال کر طوق، ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر بغیر کجاوہ کے اونٹوں پر سوار کرایا اور محافظ دستہ کے ساتھ عراق کی جانب روانہ کر دیا۔ راستے میں محمد و ابراہیم دونوں بھائی بدوؤں کے لباس میں اپنے باپ عبداللہ سے آ کر ملے اور خروج کی اجازت چاہی مگر عبداللہ بن حسن نے ان کو صبر کرنے اور عجلت سے کام نہ لینے کی ہدایت و نصیحت کی۔ یہ قیدی جب منصور کے پاس پہنچے تو منصور نے محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عثمان کو اپنے سامنے بلا کر گالیاں دیں اور ڈیڑھ سو کوڑے لگوائے۔ محمد بن عبداللہ بن عمرو کا منصور اس لیے دشمن تھا کہ اہل شام اس کے ہوا خواہ تھے اور ملک شام میں اس کا بہت اثر تھا۔

ان قیدیوں کے عراق میں منتقل ہو جانے کے بعد محمد مہدی نے اپنے بھائی ابراہیم کو عراق و خراسان کی طرف روانہ کر دیا کہ تم وہاں جا کر لوگوں کو دعوت دو اور عباسیوں کی مخالفت پر آمادہ کرو۔ خود محمد مہدی حجاز میں رہا۔ منصور کو اس بات کا یقین تھا کہ محمد مہدی حجاز میں موجود ہے۔ اس نے اس کو دھوکہ دینے اور اس کا پتہ لگانے کی غرض سے جو تدابیر اختیار کیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ مسلسل مختلف شہروں کے لوگوں کی طرف سے محمد مہدی کے خطوط لکھوا لکھوا کر مکہ و مدینہ کے ایسے لوگوں کے پاس بھجواتا رہتا تھا جن کی نسبت اس کو شبہ تھا کہ یہ محمد مہدی کے ہمدرد اور اس کے حال سے باخبر ہیں۔ ان خطوط میں لوگوں کی طرف سے اظہار عقیدت اور منصور کی برائیاں درج ہوتی

تھیں اور خروج کے لیے ترغیب دی جاتی تھی۔ منصور کا مدعا یہ تھا کہ اس طرح ممکن ہے کہ محمد مہدی تک بھی کوئی جاسوس پہنچ جائے اور وہ گرفتار ہو سکے۔ یہ مدعا تو حاصل نہ ہوا لیکن یہ ضرور ہوا کہ محمد مہدی کو ایسے خطوط کی اطلاع اپنے دوستوں کے ذریعہ سے پہنچتی رہی اور اس کو اپنے ہواخواہوں اور فدائیوں کا اندازہ کرنے میں کسی قدر غلط فہمی ہوگئی یعنی اپنی جماعت کا اندازہ حقیقت سے زیادہ کر لیا۔ ادھر اس کے بھائی ابراہیم نے بصرہ، کرمان، اصفہان، خراسان، موصل اور شام وغیرہ کا سفر کر کے جا بہ جا اپنے داعی اور ہمدرد پیدا کر لیے اور منصور کے دارالخلافہ میں آ کر ایک مرتبہ منصور کے دستر خوان پر کھانا کھا گیا اور منصور کو علم نہ ہوا۔ دوسری مرتبہ جب کہ منصور بغداد کی تعمیر کے معائنہ کو آیا تھا، وہ منصور کے آدمیوں میں ملا جُلا اس کے ساتھ موجود تھا۔ منصور نے جاسوسوں کو اطلاع دی کہ ابراہیم یہاں موجود ہے مگر اس مرتبہ بھی منصور اس کو گرفتار نہ کرا سکا۔ اسی طرح محمد مہدی بھی حجاز میں رباح کی سخت ترین کوشش وتلاش کے باوجود اس کے ہاتھ نہ آیا۔ آخر سنہ ۱۴۵ھ میں ابوعون عامل خراسان نے منصور کے پاس ایک تحریر بھیجی کہ خراسان میں مخفی سازش بڑی تیز رفتاری سے ترقی کر رہی ہے اور تمام اہل خراسان محمد مہدی کے خروج کا انتظار کر رہے ہیں۔ منصور نے اس تحریر کو پڑھتے ہی محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عثمان کو قید خانہ سے بلا کر جلاد کے سپرد کیا اور اس کا سر اتروا کر خراسان بھیج دیا۔ اس سر کے ساتھ چند آدمی ایسے بھیجے گئے جنھوں نے جا کر قسم کھا کر شہادت دی کہ یہ سر محمد بن عبداللہ کا ہے اور اس کی دادی کا نام فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ اس طرح اہل خراسان کو دھوکہ دیا گیا کہ محمد مہدی قتل ہوگیا اور یہ اس کا سر ہے، پھر منصور نے محمد بن ابراہیم بن حسن کو ایک ستون میں زندہ چنوا دیا۔ اس کے بعد عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی اور علی بن حسن بن حسن بن علی کو قتل کیا گیا۔ منصور کی یہ سنگ دلی اور قساوت قلبی نہایت حیرت انگیز ہے۔ بنوامیہ علویوں کے مخالف اور دشمن تھے اور عباسی تو اب تک علویوں کے ساتھ شیر وشکر چلے آتے تھے۔ بنوامیہ کی علویوں سے کوئی قریبی رشتہ داری نہ تھی لیکن عباسیوں اور علویوں کا تو بہت ہی قریبی رشتہ تھا۔ علویوں نے بنی امیہ کی سخت مخالفت کی تھی اور بارہا بنوامیہ کے خلاف تیر وتلوار کا استعمال کر چکے تھے لیکن بنوعباس کے خلاف ابھی تک انہوں نے کوئی جنگی مظاہرہ بھی نہیں کیا تھا۔ ان تمام باتوں کو ذہن نشین رکھو اور سوچو کہ بنوامیہ نے کسی علوی کو اس طرح محض شبہ میں گرفتار کر کے قتل نہیں کیا بلکہ ان کے ہاتھ سے وہی علوی قتل ہوئے جو میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مارے گئے مگر منصور نے بالکل بے گناہ

اولادِ حسن کے کتنے افراد کس قساوت قلبی اور بے دردی کے ساتھ قتل کیے ہیں۔ منصور کا یہ قتل جرم و گناہ کے اعتبار سے یزید بن معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے قتل حسین (رضی اللہ عنہ) سے بہت بڑھ چڑھ کر نظر آتا ہے۔ شاید اسی کا نام دنیا ہے جس کی ہوس میں انسان اندھا ہو کر ہر ایک ناشدنی کام کر گزرتا ہے۔

محمد مہدی نفس ذکیہ کا خروج:

جب منصور نے عبداللہ بن حسن اور دوسرے افراد آل حسن کو قتل کرا دیا تو محمد مہدی نے اس خبر کو سن کر زیادہ انتظار مناسب نہ سمجھا۔ اس کو یہ بھی یقین تھا کہ لوگ ہمارا ساتھ دینے اور منصور کی خلع خلافت کرنے کے لیے ہر جگہ تیار ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے مدینہ کے دوستوں سے خروج کا مشورہ کیا۔ اتفاقاً عامل مدینہ ریاح کو جاسوسوں کے ذریعہ سے اس کی اطلاع ہوگئی کہ آج محمد مہدی خروج کرنے والا ہے۔ اس نے جعفر بن محمد بن حسین اور حسین بن علی بن حسین اور چند قریشیوں کو بلا کر کہا کہ اگر محمد مہدی نے خروج کیا تو میں تم کو قتل کر دوں گا۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ تکبیر کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ محمد مہدی نے خروج کیا ہے۔ ابتداء میں اس کے ساتھ صرف ڈیڑھ سو آدمی تھے۔ اس نے سب سے پہلے قید خانہ کی طرف جا کر محمد بن خالد بن عبداللہ قسری اور اس کے بھتیجے تذیر بن یزید بن خالد اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ قید تھے، آزاد کیا، پھر دارالامارۃ کی طرف آ کر ریاح اور اس کے بھائی عباس اور ابن مسلم بن عقبہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اس کے بعد مسجد کی طرف آ کر خطبہ دیا جس میں منصور کی بری عادات اور افعال مجرمانہ کا ذکر کر کے لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف کے برتاؤ کا وعدہ کیا اور ان سے امداد چاہی۔ اس کے بعد مدینہ منورہ کے عہدہ قضا پر عثمان بن محمد بن خالد بن زہیر کو اسلحہ خانہ پر، عبدالعزیز بن مطلب بن عبداللہ مخزومی کو محکمہ پولیس پر، عثمان بن عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر بن خطاب کو مقرر کیا اور محمد بن عبدالعزیز کے پاس ملامتانہ پیغام بھیجا کہ تم کیوں گھر میں چھپ کر بیٹھ رہے۔ محمد بن عبدالعزیز نے امداد کا وعدہ کیا۔ اسماعیل بن عبداللہ بن جعفر نے محمد مہدی کی بیعت نہیں کی۔ اسی طرح اور بھی چند اشخاص نے بیعت سے اعراض کیا۔ محمد مہدی کے خروج اور ریاح کے مقید ہونے کے نو دن بعد منصور کے پاس خبر پہنچی۔ وہ یہ سن کر سخت پریشان ہوا۔ فوراً کوفہ میں آیا اور کوفہ سے ایک خط بطور امان نامہ محمد مہدی کے نام لکھ کر روانہ کیا۔ اس خط میں منصور نے لکھا تھا کہ:

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَیَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَاَرۡجُلُہُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ ذٰلِکَ لَہُمۡ خِزۡیٌ فِی الدُّنۡیَا وَلَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ۙ﴿۳۳﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَیۡہِمۡ ۚ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴾[1]

''میرے اور تمہارے درمیان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا عہد و میثاق اور ذمہ ہے کہ میں تم کو، تمہارے اہل خاندان کو اور تمہارے متبعین کو جان اور مال و اسباب کی امان دیتا ہوں۔ نیز اب تک تم نے جو خون ریزی کی ہو یا کسی کا مال لے لیا ہو، اس سے بھی درگزر کرتا اور تم کو ایک لاکھ درھم اور دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ جو تمہاری اور کوئی حاجت ہوگی، وہ بھی پوری کر دی جائے گی۔ جس شہر کو تم پسند کرو گے، اسی میں مقیم کیے جاؤ گے۔ جو لوگ تمہارے ساتھ شریک ہیں، ان کو امن دینے کے بعد ان سے کبھی مواخذہ نہ کروں گا۔ اگر تم ان باتوں کے متعلق اپنا اطمینان کرنا چاہو تو اپنے معتمد کو میرے پاس بھیج کر مجھ سے عہد نامہ لکھوا لو اور ہر طرح مطمئن ہو جاؤ۔''

یہ خط جب محمد مہدی کے پاس پہنچا تو اس نے جواب میں لکھا کہ:

﴿ طٰسٓمّٓ ۚ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲﴾ نَتۡلُوۡا عَلَیۡکَ مِنۡ نَّبَاِ مُوۡسٰی وَفِرۡعَوۡنَ بِالۡحَقِّ لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳﴾ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ وَجَعَلَ اَہۡلَہَا شِیَعًا یَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَۃً مِّنۡہُمۡ یُذَبِّحُ اَبۡنَآءَہُمۡ وَیَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَہُمۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۴﴾ وَنُرِیۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَنَجۡعَلَہُمۡ اَئِمَّۃً وَّنَجۡعَلَہُمُ الۡوٰرِثِیۡنَ ۙ﴿۵﴾ وَنُمَکِّنَ لَہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَنُرِیَ فِرۡعَوۡنَ وَہَامٰنَ وَجُنُوۡدَہُمَا مِنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَحۡذَرُوۡنَ ﴾[2]

ہم تمہارے لیے ویسا ہی امان پیش کرتے ہیں جیسا کہ تم نے ہمارے لیے پیش کیا ہے۔

---

1. المائدہ ۵: ۳۳ و ۳۴۔
2. القصص ۲۸: ۱ تا ۶۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت ہمارا حق ہے۔ تم ہمارے ہی سبب سے اس کے مدعی ہوئے اور ہمارے ہی گروہ والے بن کر حکومت حاصل کرنے کو نکلے اور اسی لیے کامیاب ہوئے۔ ہمارا باپ علی امام تھا۔ تم اس کی ولایت کے وارث کس طرح ہو گئے؟ حالانکہ ان کی اولاد موجود ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہم جیسے شریف و صحیح النسب لوگوں نے حکومت کی خواہش نہیں کی۔ ہم ملعونوں اور مردودوں کے بیٹے نہیں ہیں۔ بنو ہاشم میں کوئی شخص بھی قرابت و سابقیت وفضیلت میں ہمارا ہمسر نہیں۔ زمانہ جاہلیت میں ہم فاطمہ بنت عمرو کی اولاد سے ہیں اور اسلام میں فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو تم سے برتر و بہتر بنایا ہے۔ نبیوں میں ہمارے باپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو سب سے افضل ہیں اور سلف میں علی رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور ازواج مطہرات میں سب سے پہلے خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے قبلہ کی طرف نماز پڑھی۔ لڑکیوں میں فاطمہ سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا دختر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کو جنت کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ مولودین اسلام میں حسن وحسین رضی اللہ عنہما ہیں جو اہل جنت کے سردار ہیں۔ ہاشم سے علی رضی اللہ عنہ کا دوہرا سلسلہ قرابت ہے اور حسن رضی اللہ عنہ کا عبدالمطلب سے دوہرا سلسلہ قرابت ہے۔ میں بہ اعتبار نسب کے بہترین بنی ہاشم ہوں۔ میرا باپ بنی ہاشم کے مشاہیر میں سے ہے۔ مجھ میں کسی عجمی کی آمیزش نہیں اور نہ مجھ میں کسی لونڈی باندی کا اثر ہے۔ میں اپنے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر تم میری اطاعت اختیار کر لو گے تو میں تم کو تمہاری جان و مال کی امان دیتا ہوں اور ہر ایک بات سے جس کے تم مرتکب ہو چکے ہو، درگزر کرتا ہوں مگر کسی حد کا حدود اللہ سے یا کسی مسلمان کے حق یا معاہدہ کا میں ذمہ دار نہ ہوں گا کیونکہ اس معاملہ میں جیسا کہ تم جانتے ہو، میں مجبور ہوں۔ یقیناً میں تم سے زیادہ مستحق خلافت اور عہد کا پورا کرنے والا ہوں۔ تم نے مجھ سے پہلے بھی چند لوگوں کو امان اور قول دیا تھا۔ پس تم مجھے کون سی امان دیتے ہو؟ آیا امان ابن ہبیرہ کی یا امان اپنے چچا عبداللہ بن علی کی یا امان ابومسلم کی؟''

منصور کے پاس جب یہ خط پہنچا تو اس نے بہت پیچ وتاب کھایا اور ذیل کا خط لکھ کر محمد مہدی کے پاس روانہ کیا:

''میں نے تمہارا خط پڑھا۔ تمہارے فخر کا دارومدار عورتوں کی قرابت پر ہے جس سے جاہل

بازاری لوگ دھوکا کھا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو چچاؤں، باپوں اور ولیوں کی طرح نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے چچا کو باپ کا قائم مقام بنایا ہے اور اپنی کتاب میں اس کو قریب ترین ماں پر مقدم کیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ عورتوں کی قرابت کا پاس ولحاظ کرتا تو آمنہ (مادر رسول اللہ ﷺ) جنت میں داخل ہونے والوں کی سردار ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی کے موافق جس کو چاہا، برگزیدہ کیا اور تم نے جو فاطمہ ام ابی طالب کا ذکر کیا ہے تو اس کی حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے کسی لڑکے اور کسی لڑکی کو اسلام نصیب نہیں کیا۔ اگر اللہ تعالیٰ مردوں میں سے کسی کو بہ وجہ قرابت برگزیدہ کرتا تو عبداللہ بن عبدالمطلب کو اور بے شک وہ ہر طرح بہتر تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے لیے جس کو چاہا، با اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [1] اور جب اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو مبعوث کیا تو اس وقت آپ ﷺ کے چار چچا موجود تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ [2] نازل فرمائی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا اور دین حق کی طرف بلایا۔ ان چاروں میں سے دو نے اس دین حق کو قبول کر لیا، جن میں سے ایک میرا باپ تھا اور دو نے دین حق کے قبول کرنے سے انکار کیا۔ ان میں سے ایک تمہارا باپ (ابوطالب) تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا سلسلہ ولایت آپ ﷺ سے منقطع کر دیا اور آپ ﷺ میں اور ان دونوں میں کوئی عزیز داری اور میراث قائم نہ کی۔ حسن رضی اللہ عنہ کی بابت جو تم نے یہ لکھا ہے کہ عبدالمطلب سے ان کا دوہرا سلسلہ قرابت ہے اور پھر تم کو رسول اللہ ﷺ سے دوہرا رشتہ قرابت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ خیر الاولین والآخرین ہیں۔ ان کو ہاشم وعبدالمطلب سے ایک پدری تعلق تھا۔ تمہارا یہ خیال ہے کہ تم بہترین بنو ہاشم ہو اور تمہارے ماں باپ ان میں زیادہ مشہور تھے اور تم میں عجمیوں کا میل اور کسی لونڈی کا لگاؤ نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم نے کل بنو ہاشم سے اپنے آپ کو زیادہ اچھا بنایا ہے۔ ذرا غور تو کرو، تم پر تف ہے۔ کل اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دو گے۔ تم نے حد سے زیادہ تجاوز کیا اور اپنے آپ کو اس سے بہتر بتایا جو تم سے ذات وصفات میں بہتر

---

[1] القصص ۲۸: ۵۶۔ [2] الشعرآء ۲۶: ۲۱۴۔

ہے یعنی ابراہیم بن رسول اللہ بالخصوص تمہارے باپ کی اولاد میں کوئی بہتر وافضل اور اہل فضل سوائے کنیز زادوں کے نہیں۔ وفات رسول اللہ ﷺ کے بعد تم میں علی بن حسین یعنی امام زین العابدین سے افضل کوئی شخص پیدا نہیں ہوا اور وہ کنیز کے لڑکے تھے اور بلاشبہ تمہارے دادا حسن بن حسن سے بہتر ہیں۔ ان کے بعد تم میں کوئی شخص محمد بن علی کی مانند پیدا نہیں ہوا۔ ان کی دادی کنیز تھیں اور وہ تمہارے باپ سے بہتر ہیں۔ ان کے لڑکے جعفر تم سے بہتر ہیں اور ان کی دادی کنیز تھیں۔ تمہارا یہ کہنا غلط ہے کہ ہم محمد رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ﴾ [1] ہاں تم ان کی لڑکی کے لڑکے ہو اور بے شک یہ قرابت قریبہ ہے مگر اس کو میراث نہیں پہنچ سکتی اور نہ یہ ولایت کی وارث ہوسکتی ہے اور نہ اس کو امامت جائز ہے۔ پس اس قرابت کے ذریعہ سے تم کس طرح وارث ہوسکتے ہو؟ تمہارے باپ نے ہر طرح اس کی خواہش کی تھی۔ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کو دن میں نکالا، ان کی بیماری کو چھپایا اور رات کے وقت ان کو دفن کیا۔ مگر لوگوں نے سوائے شیخین رضی اللہ عنہما [2] کے کسی کو منظور نہیں کیا۔ تمام مسلمان اس پر متفق ہیں کہ نانا، ماموں اور خالہ مورث نہیں ہوتے، پھر تم نے علی رضی اللہ عنہ اور ان کے سابق بالاسلام ہونے کی وجہ سے فخر کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے وفات کے وقت دوسرے [3] کو نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ بعد ازاں لوگ ایک کے بعد دوسرے کو امام بناتے گئے اور ان کو منتخب نہ کیا۔ حالانکہ یہ بھی ان چھ اشخاص میں سے تھے لیکن سبھوں نے ان کو اس امر کے قابل نہ سمجھ کر چھوڑ دیا اور اس معاملہ میں ان کو حق دار نہ سمجھا۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے تو ان پر عثمان رضی اللہ عنہ کو مقدم کر دیا اور وہ اس معاملہ میں متہم بھی ہیں۔ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما ان سے لڑے۔ سعد رضی اللہ عنہ نے ان کی بیعت سے انکار کیا، بعد ازاں معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ اس کے بعد تمہارے باپ نے پھر خلافت کی تمنا کی اور لڑے۔ ان سے ان کے ساتھی جدا ہو گئے اور حکم مقرر کرنے سے پہلے ان کے ہوا خواہ ان کے مستحق ہونے کی بابت

---

1. الاحزاب ۳۳: ۴۰۔
2. یعنی جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔
3. یعنی جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

مشکوک ہو گئے، پھر انہوں نے رضا مندی سے دو اشخاص کو حاکم مقرر کیا۔ ان دونوں نے ان کی معزولی پر اتفاق کر لیا، پھر حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے خلافت کو معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کپڑوں اور درہموں کے عوض فروخت کر ڈالا اور اپنے ہوا خواہوں کو معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا اور حکومت نا اہل کو سونپ دی۔ پس اگر اس میں تمہارا کوئی حق بھی تھا تو تم اس کو فروخت کر چکے اور قیمت وصول کر لی، پھر تمہارے چچا حسین رضی اللہ عنہ نے ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر خروج کیا۔ لوگوں نے تمہارے چچا کے خلاف اس کا ساتھ دیا، یہاں تک کہ لوگوں نے تمہارے چچا کو قتل کیا اور ان کا سر کاٹ کر اس کے پاس لے آئے، پھر تم لوگوں نے بنو امیہ پر خروج کیا۔ انہوں نے تم کو قتل کیا۔ خرما کی ڈالیوں پر سولی دی، آگ میں جلایا، شہر بدر کر دیا۔ یحییٰ بن زید کو خراسان میں قتل کیا، تمہارے ذکور کو قتل کیا، لڑکوں اور عورتوں کو قید کر لیا اور بغیر پردہ کے اونٹوں پر سوار کرا کے تجارتی لونڈیوں کی طرح شام بھیج دیا۔ یہاں تک کہ ہم نے ان پر خروج کیا اور ہم نے تمہارا معاوضہ طلب کیا۔ چنانچہ تمہارے خونوں کا بدلہ ہم نے لے لیا اور ہم نے تم کو ان کی زمین وجائیداد کا مالک بنایا۔ ہم نے تمہارے بزرگوں کو فضیلت دی اور معزز بنایا۔ کیا تم اس کے ذریعہ سے ہم کو ملزم بنانا چاہتے ہو؟ شاید تم کو یہ دھوکا لگا ہے کہ تمہارے باپ کا حمزہ وعباس اور جعفر رضی اللہ عنہم پر مقدم ہونے کی وجہ سے ہم ذکر کیا کرتے تھے۔ حالانکہ جو کچھ تم نے سمجھا ہے، وہ بات نہیں ہے۔ یہ لوگ تو دنیا سے ایسے صاف گئے کہ سب لوگ ان کے مطیع تھے اور ان کے افضل ہونے کے قائل تھے مگر تمہارا باپ جدال وقتال میں مبتلا کیا گیا۔ بنو امیہ ان پر اسی طرح لعنت کرتے تھے جیسے کفار پر نماز فرائض میں کی جاتی ہے۔ پس ہم نے جھگڑا کیا، ان کے فضائل بیان کیے، بنو امیہ پر سختی کی اور ان کو سزا دی۔ تم کو معلوم ہے کہ ہم لوگوں کی بزرگی جاہلیت میں حجاج کے پانی پلانے کی وجہ سے تھی اور یہ بات تمام بھائیوں میں صرف عباس رضی اللہ عنہ ہی کو حاصل تھی۔ تمہارے باپ نے اس کے متعلق ہم سے جھگڑا کیا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ہمارے حق میں فیصلہ کیا۔ پس اس کے مالک جاہلیت اور اسلام میں ہم ہی رہے۔ جن دنوں مدینہ میں قحط پڑا تھا تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے رب سے پانی مانگنے میں ہمارے ہی باپ کے ذریعہ سے توسل کیا تھا

❶ ملاحظہ فرمائیے: صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء، حدیث ۱۰۱۰۔

اور اللہ تعالیٰ نے پانی برسایا تھا۔[1] حالانکہ تمہارے باپ اس وقت موجود تھے، ان کا توسّل نہیں کیا۔ تم جانتے ہو کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو بنی عبدالمطلب میں سے کوئی شخص سوائے عباس رضی اللہ عنہ کے باقی نہ تھا۔ پس وراثت چچا کی طرف منتقل ہو گئی، پھر بنی ہاشم میں سے کئی شخصوں نے خلافت کی خواہش کی مگر سوائے عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد کے کوئی کامیاب نہ ہوا۔ سقایت تو ان کی تھی ہی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث بھی ان کی طرف منتقل ہو گئی اور خلافت ان کی اولاد میں آ گئی۔ غرض دنیا وآخرت اور جاہلیت واسلام کا کوئی شرف باقی نہ رہا، جس کے وارث و مورث عباس رضی اللہ عنہ نہ ہوئے ہوں۔ جب اسلام شائع ہوا تو عباس رضی اللہ عنہ کو بہ اکراہ نہ نکالا جاتا تو ابوطالب وعقیل بھوکے مر جاتے اور عتبہ وشیبہ کے برتن چاٹتے رہتے لیکن عباس رضی اللہ عنہ ان کو کھانا کھلا رہے تھے۔ انہوں نے ہی تمہاری آبرو رکھی، غلامی سے بچایا۔ کھانے، کپڑے کی کفالت کرتے رہے، پھر جنگ بدر میں عقیل کو فدیہ دے کر چھڑایا۔ پس تم ہمارے سامنے کیا تفاخر جتاتے ہو۔ ہم نے تمہارے عیال کی کفر میں بھی خبر گیری کی، تمہارا فدیہ دیا، تمہارے بزرگوں کی ناموس کو بچایا اور ہم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہوئے۔ تمہارا بدلہ بھی ہم نے لیا اور جس چیز سے تم عاجز ہو گئے تھے اور حاصل نہ کر سکتے تھے، اس کو ہم نے حاصل کر لیا...... والسلام۔''

تفاخر نسبی کے معاملہ میں بے شک محمد مہدی کی طرف سے ابتدا ہوئی تھی اور منصور نے جو کچھ لکھا تھا، جواباً لکھا تھا مگر منصور اس جواب میں حد سے بڑھ گیا تھا۔ محمد مہدی نے عباس رضی اللہ عنہ کی نسبت کچھ نہیں لکھا تھا۔ منصور نے بلاوجہ علی رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخانہ الفاظ لکھے۔ منصور نے یہ بھی سخت بہتان باندھا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو خلافت حاصل کرنے کے لیے دن کے وقت باہر نکالا۔ حسن رضی اللہ عنہ کی شان میں بھی منصور نے بڑی بدتمیزی اور گستاخی کی تھی۔ انہوں نے خلافت کو فروخت نہیں کیا بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے دو گروہوں میں جو آپس میں لڑتے تھے، اتفاق اور صلح کو قائم کر کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیش گوئی کو پورا کیا تھا۔[1] عباس رضی اللہ عنہ نے ضرور ابی طالب کی امداد کی تھی اور عقیل کو اپنے پاس رکھ کر پرورش کرتے تھے لیکن ایسی باتوں کا زبان پر لانا اور طعنہ دینا شرفاء کا کام نہیں بلکہ اس قسم کے احسانات کو زبان پر لانا کمینہ پن کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ منصور

---

1. صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث ۳۷۴۶۔

نے ان باتوں کو زبان پر لا کر اپنی روش کا اظہار کر دیا تھا۔

محمد مہدی نے مدینہ کے انتظام سے فارغ ہو کر محمد بن حسن بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر کو مکہ کی طرف روانہ کیا۔ قاسم بن اسحاق کو یمن کی امارت پر اور موسیٰ بن عبداللہ کو شام کی امارت پر مامور کر کے رخصت کیا۔ چنانچہ محمد بن حسن اور قاسم بن اسحاق دونوں مدینہ سے ساتھ ہی روانہ ہوئے۔ عامل مکہ نے مقابلہ کر کے شکست کھائی اور محمد بن حسن نے مکہ پر قبضہ کر لیا۔

منصور نے مندرجہ بالا خط روانہ کرنے کے بعد عیسیٰ بن موسیٰ کو محمد مہدی سے جنگ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ عیسیٰ کے ساتھ محمد بن سفاح، کثیر بن حصین عبدی اور حمید بن قحطبہ کو بھی روانہ کیا۔ روانگی کے وقت عیسیٰ بن موسیٰ اور دوسرے سرداروں کو یہ تاکید کر دی کہ اگر تم کو محمد مہدی پر کامیابی حاصل ہو جائے تو اس کو امان دے دینا اور قتل نہ کرنا اور اگر وہ روپوش ہو جائے تو اہل مدینہ کو گرفتار کر لینا۔ وہ اس کے حالات سے خوب واقف ہیں۔ آل ابی طالب میں سے جو شخص تمہاری ملاقات کو آئے، اس کا نام لکھ کر میرے پاس بھیج دینا اور جو شخص نہ ملے، اس کا مال واسباب ضبط کر لینا۔ عیسیٰ بن موسیٰ جب مقام فید میں پہنچا تو اس نے خطوط بھیج کر مدینہ کے چند اشخاص کو اپنے پاس طلب کیا۔ چنانچہ عبداللہ بن محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب، اس کے بھائی عمر بن محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب اور ابو عقیل محمد بن عبداللہ بن عقیل مدینہ سے نکل کر عیسیٰ کی طرف روانہ ہو گئے۔

محمد مہدی کو عیسیٰ کے آنے کی خبر پہنچی تو اس نے اپنے مصاحبوں سے مشورہ لیا کہ ہم کو مدینہ سے نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے یا مدینہ میں رہ کر مدافعت کرنی چاہیے؟ مشیروں میں اختلاف رائے ہوا تو محمد مہدی نے نبی اکرم ﷺ کی اقتدا و پیروی کے خیال سے اسی خندق کو کھودنے کا حکم دیا جس کو نبی اکرم ﷺ نے غزوہ احزاب میں کھدوایا تھا۔ اسی اثناء میں عیسیٰ بن موسیٰ نے مقام اعوض میں پہنچ کر پڑاؤ کیا۔ محمد مہدی نے مدینہ والوں کو باہر نکل کر مقابلہ کرنے سے منع کر دیا تھا اور کوئی شخص مدینہ سے باہر نہیں نکل سکتا تھا لیکن جب عیسیٰ بن موسیٰ قریب پہنچا تو مدینہ سے نکلنے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ محمد مہدی کی غلطی تھی کہ پہلے حکم امتناعی کو منسوخ کر دیا۔ اہل مدینہ کا ایک جم غفیر مع اہل وعیال نکل کے بہ غرض حفاظت پہاڑوں کی طرف چلا گیا اور مدینہ میں بہت ہی تھوڑے آدمی محمد مہدی کے پاس رہ گئے۔ اس وقت اس کو اپنی غلطی محسوس ہوئی اور ان لوگوں کے واپس لانے کے لیے آدمی بھیجے مگر وہ واپس نہ آئے۔ عیسیٰ نے اعوض سے کوچ کر کے مدینہ منورہ سے چار میل دور پر

قیام کیا اور ایک دستہ فوج کو مکہ کے راستے پر متعین کر دیا کہ بعد ہزیمت محمد مہدی مکہ کی طرف نہ جا سکیں۔اس کے بعد محمد مہدی کے پاس پیغام بھیجا کہ خلیفہ منصور تم کو امان دیتے اور کتاب وسنت کے فیصلہ کی طرف بلاتے ہیں اور بغاوت کے انجام سے ڈراتے ہیں۔

محمد مہدی نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جو قتل کے خوف سے کبھی نہیں بھاگا۔۱۲ رمضان المبارک سنہ ۱۴۵ھ کو عیسیٰ بن موسیٰ آگے بڑھ کر مقام جرف میں آ کر خیمہ زن ہوا۔ ۱۴ رمضان المبارک کو اس نے ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا کہ ''اے اہل مدینہ! میں تم کو امان دیتا ہوں اگر تم میرے اور محمد مہدی کے درمیان حائل نہ ہو اور غیر جانبدار ہو جاؤ۔'' اہل مدینہ اس آواز کو سن کر گالیاں دینے لگے۔عیسیٰ واپس چلا گیا۔دوسرے دن پھر اسی مقام پر لڑائی کے ارادے سے گیا اور اپنے سرداروں کو مدینہ کے چاروں طرف پھیلا دیا۔محمد مہدی بھی مقابلہ کے لیے میدان میں نکلا۔ان کا علم عثمان بن محمد بن خالد بن زبیر (رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ میں اور ان کا شعار ''احد احد'' تھا۔محمد مہدی کی طرف سے ابوغلمش سب سے پہلے میدان میں نکلا اور للکار کر اپنا ہم نبرد طلب کیا۔عیسیٰ کی طرف سے یکے بعد دیگرے کئی نامور بہادر اس کے مقابلہ کو نکلے اور سب مارے گئے۔ اس کے بعد جنگ مغلوبہ شروع ہوئی۔طرفین سے بہادری کے نہایت اعلیٰ اور انتہائی نمونے دکھائے گئے۔ان لڑنے والی دونوں فوجوں کے سپہ سالاروں نے بھی شمشیر زنی اور صف شکنی میں حیرت انگیز جواں مردی کا اظہار کیا۔اس کے بعد عیسیٰ کے حکم سے حمید بن قحطبہ نے پیادوں کو لے کر خندق کے قریب کی دیوار کا رخ کیا۔محمد مہدی کے ہمراہیوں نے تیر بازی سے اس کو روکنا چاہا مگر حمید نے اس تیر بازی میں اپنے آپ کو مستقل رکھ کر پیش قدمی کو جاری رکھا اور بڑی مشکل سے دیوار تک پہنچ کر اس کو منہدم کر دیا اور خندق کو بھی طے کر کے محمد مہدی کی فوج سے دست بہ دست لڑائی شروع کر دی۔

عیسیٰ کو موقع مل گیا، اس نے فوراً خندق کو کئی مقامات سے پاٹ کر راستے بنا دیے اور سواران لشکر خندق کو عبور کر کے محمد مہدی کی فوج پر حملہ آور ہوئے اور بڑے گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ محمد مہدی کی فوج بہت ہی تھوڑی تھی اور حملہ آور لشکر تعداد میں کئی گنا زیادہ اور سامان حرب واسلحہ جنگ سے خوب آراستہ تھا مگر صبح سے لے کر نماز عصر تک برابر تلوار چلتی رہی۔محمد مہدی نے اپنے ہمراہیوں کو عام اجازت دی کہ جس کا جی چاہے، وہ اپنی جان بچا کر چلا جائے۔محمد مہدی کے ہمراہیوں نے بار بار اور بہ اصرار کہا کہ اس وقت آپ اپنی جان بچا کر بصرہ یا مکہ کی طرف چلے

جائیں اور پھر سامان وجمعیت فراہم کر کے میدانی جنگ کریں مگر محمد مہدی نے ہر ایک کو یہی جواب دیا کہ تم اگر اپنی جان بچانا چاہو تو چلے جاؤ لیکن میں دشمن کے مقابلے سے فرار نہیں ہو سکتا۔ آخر محمد مہدی کے ہمراہ کل تین سو آدمی رہ گئے۔ اس وقت اس کے ہمراہیوں میں سے عیسیٰ بن خضیر نے جا کر وہ رجسٹر جس میں بیعت کرنے والوں کے نام درج ہوتے تھے، جلا دیا اور قید خانہ میں آ کر رباح بن عثمان اور اس کے بھائیوں کو قتل کیا۔ محمد بن قسریٰ نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا، وہ بچ گیا۔ یہ کام کر کے عیسیٰ بن خضیر، محمد مہدی کے پاس آ کر پھر لڑنے لگا۔ اب محمد مہدی کے ہمراہیوں نے اپنی سواریوں کے پاؤں کاٹ ڈالے اور تلواروں کی نیامیں توڑ کر پھینک دیں اور مرنے مارنے پر قسمیں کھا کر دشمنوں پر حملہ آور ہوئے۔ یہ حملہ ایسا سخت اور ہیبت ناک تھا کہ عیسیٰ کی فوج شکست کھا کر میدان سے بھاگی مگر اس کی فوج کے چند آدمی پہاڑ پر چڑھ گئے اور پہاڑ کے دوسری طرف اتر کر مدینہ میں آ گئے اور ایک عباسی عورت کی سیاہ اوڑھنی لے کر اس کو مسجد کے منارہ پر پھریرہ کی طرح اڑایا۔ یہ حالت دیکھ کر محمد مہدی کے ہمراہیوں کے اوسان خطا ہو گئے اور یہ سمجھ کر کہ عیسیٰ کی فوج نے مدینہ پر قبضہ کر لیا ہے، پیچھے کو لوٹے۔ عیسیٰ کے مفرور سپاہیوں کو موقع مل گیا۔ وہ سمٹ کر پھر مقابلہ پر آئے اور اس کے لشکر کی ایک جماعت بنو غفار کے محلّہ کی طرف سے مدینہ میں داخل ہو کر مدینہ کی طرف سے محمد مہدی کے مقابلہ کو نکل آئی۔

یہ تمام صورتیں بالکل خلاف امید واقع ہوئیں۔ محمد مہدی کو یہ بھی امید نہ تھی کہ بنو غفار دشمنوں کو راستہ دے دیں گے۔ یہ دیکھ کر محمد مہدی نے آگے بڑھ کر حمید بن قحطبہ کو مقابلہ کے لیے للکارا لیکن حمید مقابلہ پر نہ آیا۔ محمد مہدی کے ہمراہیوں نے پھر ان دشمنوں پر حملہ کیا۔ عیسیٰ بن خضیر بڑی بہادری اور جانبازی سے لڑ رہا تھا۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے آگے بڑھ کر اس کو پکارا اور کہا کہ میں تم کو امان دیتا ہوں، تم لڑنا چھوڑ دو لیکن عیسیٰ بن خضیر نے اس کی بات پر مطلق توجہ نہ کی اور برابر مصروف قتال رہا۔ آخر لڑتے لڑتے زخموں سے چور ہو کر گر پڑا۔ محمد مہدی اس کی لاش پر لڑنے لگا۔ عیسیٰ بن موسیٰ کے لشکری ہر چہار طرف سے حملہ آور تھے اور وہ بڑی بہادری سے حملہ آوروں کو جواب دیتا اور پسپا کر دیتا تھا۔ محمد مہدی نے اس وقت وہ بہادری دکھائی اور اپنی شجاعت وسپہ گری کی وہ دھاک بٹھائی کہ عیسیٰ بن موسیٰ کے لشکر میں کسی کو اس کے مقابلہ کی تاب نہ تھی۔ آخر ایک شخص نے پیچھے سے لپک کر اس کی کمر میں ایک نیزہ مارا، اس زخم کے صدمے سے وہ جوں ہی ذرا جھکا تو حمید بن قحطبہ نے آگے

سے لپک کر اس کے سینہ میں نیزہ مارا۔ آگے اور پیچھے سے دو نیزے جب جسم کے پار ہو گئے تو وہ زمین پر گر پڑا۔ قحطبہ نے فوراً گھوڑے سے اتر کر اس کا سر اتار لیا اور عیسیٰ بن موسیٰ کے پاس لے کر آیا۔ اس شیر نر کے قتل ہوتے ہی مدینہ عیسیٰ بن موسیٰ کے قبضہ وتصرف میں تھا۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے محمد مہدی کا سر اور فتح کا بشارت نامہ محمد بن ابی الکرام بن عبداللہ بن علی بن عبداللہ بن جعفر اور قاسم بن حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب کے ہاتھ منصور کی خدمت میں روانہ کیا۔ یہ حادثہ ۱۵ رمضان المبارک یوم دوشنبہ سنہ ۱۴۵ھ عصر ومغرب کے درمیان وقوع پذیر ہوا۔ محمد مہدی کی لاش کو عیسیٰ بن موسیٰ نے مدینہ وثنیۃ الوداع کے درمیان سولی پر لٹکا دیا۔ اس کی بہن زینب نے اجازت حاصل کر کے اس لاش کو لے کر بقیع میں دفن کر دیا۔

اس لڑائی میں محمد مہدی کا بھائی موسیٰ بن عبداللہ، حمزہ بن عبداللہ بن محمد بن علی بن حسین اور علی پسران زید بن علی بن حسین بن علی اور زید پسران محمد بن زید پسران حسن بن زید بن حسن، محمد مہدی کے ساتھ تھے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ آخر الذکر علی وزید کے باپ حسن بن زید بن حسن، منصور کے مددگار تھے۔ اسی طرح بہت سے ہاشمی وعلوی ایسے تھے کہ باپ ایک طرف مصروف جنگ ہے تو بیٹا دوسری طرف سے لڑ رہا ہے۔ غالباً بنوامیہ کے قتل اور ان کی بربادی کے نظارے دیکھ کر بہت سے علوی سہم گئے تھے۔ جیسا کہ علی بن حسین (زین العابدین) کربلا کا نظارہ دیکھ کر اس قدر متاثر تھے کہ کبھی بنوامیہ کے خلاف کوئی کام نہیں کیا اور بنوامیہ کی حمایت وموافقت ہی کا اظہار فرماتے رہے۔ اسی طرح علویوں کے اکثر بااثر افراد بنوعباس کی مخالفت کو موجب تباہی جاننے لگے تھے۔ محمد مہدی کی شکست وناکامی محض اس وجہ سے ہوئی کہ خود اس کے خاندان والوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا، اہل خاندان کے ساتھ نہ دینے کا یہ اثر ہوا کہ اور بھی بہت سے لوگ اس سے الگ رہے۔ چنانچہ محمد مہدی نے جس وقت مدینہ میں لوگوں سے بیعت لی اور رباح بن عثمان کو قید کر کے اپنی خلافت کا اعلان کیا تو اسماعیل بن عبداللہ بن جعفر کو بھی جو معتبر آدمی تھے، بیعت کے لیے بلوایا۔ انہوں نے جواب میں کہلوا بھجوایا کہ ''بھتیجے! تم مارے جاؤ گے، میں تمہاری بیعت کیسے کروں۔''

اسماعیل بن عبداللہ کے اس جواب کو سن کر بعض اشخاص جو بیعت کر چکے تھے، پھر گئے اور حمادہ بنت معاویہ نے اسماعیل بن عبداللہ کے پاس آ کر کہا کہ آپ کے اس کلام سے بہت سے آدمی محمد مہدی سے جدا ہو گئے ہیں مگر میرے بھائی ابھی تک ان کے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں وہ بھی

نہ مارے جائیں۔ غرض رشتہ داروں اور خاندان والوں کی علیحدگی نے محمد مہدی کو زیادہ طاقتور نہ ہونے دیا اور نہ بہت زیادہ ممکن تھا کہ خلافت پھر حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں آ جاتی۔ اگر محمد مہدی اس وقت طرح دے جاتا اور مدینہ سے بچ کر نکل جاتا یا ابھی خروج میں جلدی نہ کرتا اور اپنے بھائی ابراہیم کے خروج کا انتظار کر کے دونوں بھائی ایک ہی وقت میں نکلتے تو بھی کامیابی یقینی تھی مگر منصور اور خاندان عباسیہ کی خوش قسمتی تھی کہ عباسی لشکر کو محمد اور ابراہیم دونوں کا مقابلہ یکے بعد دیگرے کرنا پڑا اور ان کی طاقت تقسیم ہونے سے بچ گئی۔

ابراہیم بن عبداللہ کا خروج:

منصور جس زمانہ میں بغداد کی تعمیر کے معائنہ کو آیا تھا، اس زمانہ میں ابراہیم بن عبداللہ برادر محمد مہدی پوشیدہ طور پر اس کے ساتھ تھا۔ وہاں سے وہ صاف بچ کر کوفہ چلا آیا اور منصور نے اس کی گرفتاری کے لیے بڑی کثرت سے ہر شہر میں جاسوس پھیلا دیے۔ منصور کو جب یہ معلوم ہوا کہ ابراہیم بصرہ میں ہے، تو اس نے بصرہ کے ہر ایک مکان پر ایک ایک جاسوس مقرر کرایا حالانکہ ابراہیم بن عبداللہ کوفہ میں سفیان بن حبان قمی کے مکان پر مقیم تھا۔ یہ بات بھی مشہور تھی کہ سفیان، ابراہیم کا بہت گہرا دوست ہے۔ جاسوسوں کی کثرت دیکھ کر سفیان گھبرایا اور اس نے ابراہیم کو صاف نکال دینے کی یہ ترکیب سوچی کہ منصور کے پاس پہنچا اور کہا کہ آپ میرے اور میرے غلاموں کے لیے پروانہ راہداری لکھ دیں اور ایک دستہ فوج میرے ہمراہ کر دیں۔ میں ابراہیم کو جہاں وہ ہوگا، گرفتار کر کے لے آؤں گا۔ منصور نے فوراً پروانہ راہداری لکھ کر دے دیا اور ایک چھوٹی سی فوج بھی اس کے ساتھ کر دی۔ سفیان اپنے گھر میں آیا اور گھر کے اندر جا کر ابراہیم کو اپنے غلاموں کا لباس پہنا کر اور غلاموں کے ساتھ ہمراہ لے کر مع فوج کوفہ سے چل دیا۔ بصرہ میں آ کر ہر ایک مکان پر دو دو چار چار لشکری مقرر کرتا گیا۔ اس طرح تمام لشکر کے آدمی جب تقسیم ہو گئے اور آخر میں صرف سفیان اور ابراہیم رہ گئے تو ابراہیم کو اہواز کی طرف روانہ کر کے خود بھی روپوش ہو گیا۔

بصرہ میں ان دنوں سفیان بن معاویہ امیر تھا۔ اس کو جب یہ کیفیت معلوم ہوئی تو اس نے لشکریوں کو جو جابجا منتشر و متعین تھے، ایک جگہ جمع کیا اور ابراہیم بن عبداللہ و سفیان بن حبان کی جستجو شروع کی مگر کسی کو نہ پا سکا۔ اہواز میں محمد بن حصین امیر تھا، ابراہیم جب اہواز میں پہنچا تو حسن بن

حبیب کے مکان میں فروکش ہوا۔ امیر اہواز کو اتفاقاً جاسوسوں کے ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ ابراہیم اہواز میں آیا ہوا ہے۔ وہ بھی اس کی تلاش وجستجو میں مصروف رہنے لگا۔ ابراہیم عرصہ دراز تک حسن کے مکان میں چھپا رہا اور لوگوں کو اپنی دعوت میں شریک کرتا رہا۔ سنہ ۱۴۵ھ میں بصرہ سے یحییٰ بن زیاد بن حیان نبطی نے ابراہیم کو اہواز سے بصرہ میں بلوا لیا اور بڑی سرگرمی سے لوگوں کو محمد مہدی کی بیعت کی طرف بلانا شروع کر دیا۔ اہل علم اور بااثر لوگوں کی ایک بڑی جماعت نے بیعت کر لی۔ بصرہ والوں کے چار ہزار افراد کے نام بیعت کے رجسٹر میں لکھے گئے۔ اسی عرصہ میں محمد مہدی نے مدینہ میں خروج کیا اور ابراہیم کو لکھا کہ تم بھی بصرہ میں خروج کرو۔ منصور نے چند سرداروں کو احتیاطاً بصرہ میں بھیج دیا تھا کہ اگر اس طرف بغاوت کا کوئی خطرہ پیدا ہو تو بصرہ کے عامل سفیان بن معاویہ کی مدد کریں۔ اگر ابراہیم محمد مہدی کے لکھنے کے موافق فوراً خروج کر دیتا تو یقیناً منصور کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے اور ابراہیم ومحمد دونوں بھائیوں کو بہت تقویت حاصل ہوتی لیکن اس وقت ابراہیم بصرہ میں بیمار ہو گیا تھا اور بیماری کی وجہ سے اس نے خروج میں تامل کیا۔ منصور جب محمد مہدی کے مقابلے کو لشکر روانہ کر چکا تو یکم رمضان سنہ ۱۴۵ھ کو ابراہیم نے بصرہ میں خروج کیا اور سفیان بن معاویہ اور ان سرداروں کو جو اس کی مدد کے لیے آئے ہوئے تھے، گرفتار کر کے قید کر دیا۔

جعفر ومحمد پسران سلیمان بن علی یعنی منصور کے چچازاد بھائی چھ سو آدمیوں کے ساتھ بصرہ سے باہر پڑے ہوئے تھے۔ یہ بھی منصور کے بھیجے ہوئے تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے ابراہیم کے خروج کا حال سنتے ہی حملہ کیا۔ ان چھ سو آدمیوں کے مقابلہ پر صرف پچاس آدمی بھیجے گئے اور ان پچاس آدمیوں نے چھ سو کو شکست دے کر بھگا دیا۔ ابراہیم نے تمام بصرہ پر قابض ہو کر لوگوں سے بیعت عام لی اور امان کی منادی کرادی، پھر بیت المال سے بیس لاکھ درھم برآمد کرا کر پچاس پچاس درھم ہر ایک ہمراہی کو تقسیم کیے، پھر مغیرہ کو ایک سو پیادوں کے ہمراہ اہواز کی طرف روانہ کیا۔ اہواز کا عامل محمد بن حصین چار ہزار فوج لے کر مقابلہ کو نکلا لیکن ان ایک سو پیادوں نے چار ہزار کے لشکر کو شکست فاش دی اور مغیرہ نے اہواز پر قبضہ کر لیا۔ ابراہیم نے عمرو بن شداد کو فارس کی طرف بھیجا۔ وہاں کے گورنر اسماعیل بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب اور اس کے بھائی عبدالصمد نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور عمرو بن شداد نے صوبہ فارس پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح ہارون بن شمس عجلی کو واسط کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ ہارون نے منصور کے گورنر ہارون ابن حمید ایادی کو شکست دے کر واسط

پر قبضہ کر لیا۔ غرضیکہ جس روز مدینہ میں محمد مہدی اور عیسیٰ بن موسیٰ کے لشکروں میں لڑائی ہوئی اور محمد مہدی شہید ہوا، اس روز تک بصرہ، فارس، واسط اور عراق کا بڑا حصہ منصور کے قبضہ سے نکل چکا تھا۔ شام کا ملک بھی بہت جلد قبضے سے نکلنے والا تھا۔ کوفہ والے بھی ابراہیم کے منتظر بیٹھے تھے اور منصور کی حکومت کے باقی رہنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

ابراہیم نے یکم رمضان کو بصرہ میں خروج کیا تھا، آخر رمضان تک برابر فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ رمضان کے ختم ہوتے ہی ابراہیم کے پاس خبر پہنچی کہ محمد مہدی قتل ہو گیا ہے۔ ابراہیم نے عیدالفطر کی نماز پڑھ کر عیدگاہ میں اس خبر کا اعلان کیا۔ یہی خبر ان لوگوں کے پاس بھی جو دوسرے علاقوں میں منصور کے عاملوں سے لڑنے اور ان کو مغلوب وخارج کرنے میں مصروف تھے، پہنچی۔ اس خبر کا پہنچنا تھا کہ سب کے جوش سرد پڑ گئے اور منصور کے سرداروں اور عاملوں میں ایک تازہ دہشت پیدا ہو گئی۔ بصرہ والوں نے اس خبر کو سن کر محمد مہدی کی جگہ ابراہیم کو جو ان میں موجود تھا، خلیفہ تسلیم کیا اور پہلے سے زیادہ جوش وہمت دکھانے پر آمادہ ہو گئے۔ ابراہیم کے ہمراہیوں میں بہت سے لوگ بصرہ میں کوفہ والے بھی تھے۔ بصرہ والوں کی یہ رائے تھی کہ بصرہ ہی کو دارالخلافہ اور مرکز حکومت قرار دے کر اطراف میں فوجیں بھیجنے اور انتظام کرنے کا کام انجام دیا جائے مگر کوفیوں نے اس سے اختلاف کر کے یہ رائے ظاہر کی کہ ابراہیم کو فوج لے کر خود کوفہ کی طرف حملہ آور ہونا چاہیے۔ کوفہ والے اس کے منتظر اور چشم براہ بیٹھے ہیں۔ ابراہیم نے کوفیوں کی رائے سے اتفاق کیا اور اپنے لڑکے حسن کو کوفہ میں اپنا نائب بنا کر کوفہ کی طرف روانگی کا عزم کیا۔ یہ خبر کوفہ میں منصور کو پہنچی تو وہ بہت مضطرب ہوا اور اس نے فوراً تیز رفتار قاصد عیسیٰ بن موسیٰ کے پاس روانہ کیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو، اپنے آپ کو کوفہ میں پہنچاؤ۔ ساتھ ہی مہدی کو خراسان میں لکھا کہ فوراً فارس پر حملہ کر دو۔ اسی طرح ہر ایک عامل کو جو خطرہ سے محفوظ تھا، اپنی طرف بلایا۔ جس کے قریب ابراہیم کا کوئی سردار تھا، اس کو لکھا کہ تم مقابلہ میں ہمت سے کام لو۔ ہر طرف سے فوجیں بڑی سرعت کے ساتھ منصور کی طرف آنے لگیں۔ یہاں تک کہ ایک لاکھ فوج کوفہ میں آ کر جمع ہو گئی۔ ابراہیم کے حملہ کی خبر سن کر منصور نے پچاس روز تک کپڑے نہیں بدلے اور اکثر مصلے پر ہی بیٹھا رہا۔

ادھر ابراہیم بن عبداللہ ایک لاکھ فوج کے ساتھ کوفہ سے تیس چالیس میل کے فاصلہ پر پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔ ادھر عیسیٰ بن موسیٰ مع اپنی ہمراہی فوج کے وارد کوفہ ہوا۔ منصور نے عیسیٰ بن موسیٰ کو

ابراہیم کی لڑائی پر روانہ کیا اور حمید بن قحطبہ کو مقدمۃ الجیش بنایا۔ ابراہیم کو مشورہ دیا گیا کہ لشکرگاہ کے گرد خندق کھدوالو مگر ابراہیم کے ہمراہیوں نے کہا کہ ہم مغلوب نہیں بلکہ غالب ہیں۔ لہٰذا خندق کھودنے کی ضرورت نہیں۔ ہمراہیوں نے ابراہیم کو مشورہ دیا کہ دستہ دستہ فوج لڑانا چاہیے تاکہ ایک دستہ کے شکست خوردہ ہونے پر دوسرا تازہ دم دستہ مدد کو بھیج دیا جائے مگر ابراہیم نے اس کو ناپسند کر کے اسلامی قاعدہ کے موافق صف بندی کر کے لڑائی کا حکم دیا۔

لڑائی شروع ہوئی، حمید بن قحطبہ شکست کھا کر بھاگا۔ عیسیٰ نے اس کو قسم دے کر روکنا چاہا مگر وہ نہ رکا۔ عیسیٰ بھی مع لشکر مصروف جنگ ہوا اور اس کے اکثر ہمراہی تاب مقاومت نہ لا کر فرار ہونے لگے۔ عیسیٰ ابھی تک میدان میں مقابلہ پر ڈٹا رہا مگر اس کے شکست پانے یا مغلوب ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی کہ یکایک جعفر و محمد پسران سلیمان بن علی ایک لشکر لیے ہوئے لشکر ابراہیم کے عقب سے آ پہنچے۔ ابراہیم کی فوج اس اچانک حملہ سے گھبرا کر ان تازہ حملہ آوروں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ عیسیٰ نے فوراً اپنی جمعیت کو سنبھال کر حملہ کیا اور اس کی فوج کے فراری یہ حالت دیکھ کر سب کے سب لوٹ پڑے۔ حمید بن قحطبہ بھی اپنے ہمراہیوں کو لے کر حملہ آور ہوا۔ اس طرح ابراہیم کا لشکر بیچ میں گھر گیا اور حملہ آوروں نے اس کے لیے میدان کو تنگ کر دیا۔ جس کی وجہ سے ابراہیم کے بہت سے لشکری جی کھول کر مقابلہ بھی نہ کر سکے۔ آخر بے ترتیبی کے ساتھ نکل نکل کر بھاگنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم کے ساتھ صرف چار سو آدمی باقی رہ گئے۔ ان لوگوں کو عیسیٰ، حمید، محمد اور جعفر نے چاروں طرف محیط ہو کر نقطہ پرکار بنا لیا۔ آخر ابراہیم کے گلے میں ایک تیر آ کر لگا جو بہت کاری تھا۔ ہمراہیوں نے گھوڑے سے اتار لیا اور چاروں طرف حلقہ کر کے مقابلہ اور مدافعت میں مصروف رہے۔ حمید بن قحطبہ نے اپنی رکابی فوج کو پوری طاقت سے حملہ کرنے کا حکم دیا اور ابراہیم کے ہمراہیوں کو مغلوب و منتشر کر کے ابراہیم کا سر اتار کر عیسیٰ کی خدمت میں پیش کیا۔ عیسیٰ نے منصور کی خدمت میں بھیج دیا۔ ۲۵ ذیقعدہ سنہ ۱۴۵ھ کو یہ حادثہ وقوع پذیر ہوا۔ اس کے بعد حسن بن ابراہیم بن عبداللہ کو بصرہ سے گرفتار کر کے قید کیا۔ اس کے ساتھ ہی یعقوب بن داؤد کو بھی قید کر دیا گیا۔

مختلف واقعات:

محمد مہدی اور اس کے بھائی کے قتل سے فارغ ہو کر منصور نے بصرہ کی حکومت سالم بن قتیبہ

باہلی کو دی اور موصل کی حکومت پر اپنے لڑکے جعفر کو بھیجا اور اس کے ساتھ حرث بن عبداللہ کو سپہ سالار بنا کر روانہ کیا۔

امام مالک رحمہ اللہ نے مدینہ میں لوگوں کو محمد مہدی کی بیعت کرنے کی ترغیب دی تھی۔ ان کو کوڑوں سے پٹوایا گیا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے عراق میں ابراہیم بن عبداللہ کی حمایت میں فتویٰ دیا تھا۔ اس لیے ان کو منصور نے گرفتار کرا کر بلوایا اور بغداد میں لے جا کر کہ اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری تھا، قید کر دیا۔ اس قید میں اینٹوں کے گنوانے کی خدمت بطور مشقت ان سے لی جاتی تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ منصور نے ان کو عہدہ قضا سپرد کرنا چاہا۔ انہوں نے جب انکار کیا تو منصور نے خشت شماری کا کام ان کے سپرد کیا۔ اسی حالت میں سنہ ۱۵۰ھ تک مصروف ومقید رہ کر وہ فوت ہو گئے۔ ان کے علاوہ اور علماء نے بھی مثلاً ابن عجلان اور عبدالحمید بن جعفر وغیرہ نے محمد مہدی اور ان کے بھائی ابراہیم کی بیعت کے لیے فتوے دیے تھے، ان سب علماء کو بھی اسی قسم کی سزائیں دی گئیں۔

سنہ۱۴۶ھ میں علاقہ خزر کے ترکوں نے علمِ بغاوت بلند کیا اور باب الابواب سے آرمینیا تک مسلمانوں کو قتل وغارت کرتے ہوئے چلے آئے۔ اسی سال جزیرہ قبرص پر مسلمانوں نے بحری حملہ کیا۔ سیستان کے علاقہ میں خارجیوں نے شورش وبغاوت کی تو منصور نے یمن کی گورنری سے تبدیل کر کے معن بن زائدہ کو سیستان کی حکومت پر بھیج دیا۔ وہاں معن بن زائدہ نے تمام شورش وفساد کو فرو کیا، سنہ ۱۵۱ھ تک وہاں رہا، آخر دھوکے سے خارجیوں نے اس کو قتل کر دیا۔

عبداللہ اشتر بن محمد مہدی:

جب محمد مہدی نے خروج کیا تو منصور کی طرف سے سندھ کا گورنر عمر بن حفص بن عثمان بن قبیصہ بن ابی صفرہ ملقب بہ ہزار مرد تھا۔ محمد مہدی نے خروج کر کے اپنے بیٹے عبداللہ معروف بہ اشتر کو اس کے چچا ابراہیم کے پاس بصرہ کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ یہاں پہنچ کر عبداللہ اشتر نے اپنے چچا کے مشورے سے ایک تیز رفتار اونٹنی لے کر سندھ کا قصد کیا کیونکہ عمر بن حفص حاکم سندھ سے اعانت وہمدردی کی توقع تھی۔ عبداللہ اشتر نے سندھ میں پہنچ کر عمر بن حفص کو دعوت دی اور اس نے اس دعوت کو قبول کر کے محمد مہدی کی خلافت کو تسلیم کر لیا اور عباسیوں کے لباس اور نشانات کو چاک کر کے خطبہ میں محمد مہدی کا نام داخل کر دیا۔ اسی عرصہ میں عمر بن حفص کے پاس محمد مہدی کے

مارے جانے کی خبر پہنچی۔ اس نے عبداللہ اشتر کو اس حادثہ سے اطلاع دے کر تعزیت کی۔ عبداللہ اشتر نے کہا کہ اب تو مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہے۔ میں کہاں جاؤں اور کیا کروں؟ سندھ کی حالت اس زمانہ میں یہ تھی کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے راجہ جو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانے میں مسلمان ہو گئے تھے، وہ اپنی اپنی ریاستوں پر فرماں روائی کرتے تھے اور خلیفہ وقت کی سیادت کو تسلیم کر کے تمام اسلامی شعائر کے پابند اور اپنے حقوق حکمرانی پر قائم تھے۔ عمر بن حفص نے عبداللہ اشتر کو مشورہ دیا کہ تم سندھ کے فلاں بادشاہ کی مملکت میں چلے جاؤ۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر قربان ہوتا ہے اور ایفائے عہد میں مشہور ہے۔ یقین ہے کہ تمہارے ساتھ بڑی عزت و محبت سے پیش آئے گا۔ عبداللہ اشتر نے رضامندی ظاہر کی اور عمر بن حفص نے اس بادشاہ سے خط و کتابت کر کے عبداللہ اشتر کی نسبت عہدنامہ لکھوا کر منگوا لیا اور عبداللہ کو اس طرف روانہ کر دیا۔ سندھ کے اس بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی عبداللہ اشتر سے کر دی۔ سنہ ۱۵۱ھ تک عبداللہ اشتر اسی جگہ رہا اور اس عرصہ میں قریباً چار سو عرب اطراف و جوانب سے کھنچ کھنچ کر عبداللہ اشتر کے پاس آ کر جمع ہو گئے۔ منصور کو اتفاقاً یہ حال معلوم ہو گیا کہ عبداللہ اشتر سندھ کے ایک بادشاہ کے یہاں مقیم ہے اور عربوں کی ایک چھوٹی سی جمعیت اس کے پاس موجود ہے۔ منصور نے سنہ ۱۵۱ھ میں عمر بن حفص کو سندھ کی گورنری سے بلا کر مصر کی حکومت پر بھیج دیا اور سندھ کی گورنری پر ہشام بن عمرو تغلبی کو روانہ کیا۔ رخصت کرتے وقت تاکید کی کہ عبداللہ اشتر کو جس طرح ممکن ہو، گرفتار کر لینا۔ اگر سندھ کا بادشاہ اس کے دینے سے انکار کرے تو فوراً اس پر چڑھائی کر دینا۔ ہشام بن عمرو نے ہر چند کوشش کی مگر سندھ کا وہ بادشاہ عبداللہ اشتر کے دینے پر رضامند نہ ہوا۔ آخر طرفین سے لڑائی پر آمادگی ظاہر کی گئی۔ عبداللہ اشتر جس حصہ ملک میں مقیم تھا، اس طرف ہشام بن عمرو کے بھائی سفیح نے فوج کشی کی۔ اتفاقاً ایک روز عبداللہ اشتر صرف دس سواروں کے ساتھ دریائے سندھ کے کنارے سیر کرتا ہوا نکل گیا۔ وہاں سفیح کی فوج یکایک سامنے آ گئی۔ سفیح نے عبداللہ کو گرفتار کرنا چاہا اور عبداللہ اشتر اور اس کے ہمراہیوں نے مقابلہ کیا، لڑائی ہونے لگی۔ آخر عبداللہ اشتر اور اس کے ہمراہی سب کے سب مارے گئے۔ ہشام بن عمرو نے اس کی اطلاع منصور کو دی۔ منصور نے لکھا کہ اس بادشاہ کے ملک کو ضرور پامال کر دیا جائے۔ چنانچہ لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ ہشام نے اس کے تمام ملک پر قبضہ کر لیا۔ عبداللہ اشتر کی بیوی مع اپنے لڑکے کے گرفتار ہو کر منصور کے پاس بھیجی گئی۔ منصور نے عبداللہ اشتر کے لڑکے اور بیوی کو

مدینہ بھیج دیا کہ ان کے خاندان والوں کے سپرد کر دیے جائیں۔

مہدی بن منصور کی ولی عہدی:

عبداللہ سفاح نے مرتے وقت منصور کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا اور منصور کے بعد عیسیٰ بن موسیٰ کو ولی عہد بنایا تھا۔ اب اس وصیت کے موافق منصور کے بعد عیسیٰ بن موسیٰ خلیفہ ہونے والا تھا۔ منصور جب محمد مہدی اور ابراہیم کے خطرات سے مطمئن ہو گیا اور عیسیٰ بن موسیٰ کی امداد کا زیادہ محتاج نہ رہا تو اس نے چاہا کہ بجائے عیسیٰ کے اپنے بیٹے مہدی کو ولی عہد بنائے۔ اول اس کا ذکر عیسیٰ سے کیا۔ عیسیٰ نے اس کو قبول و منظور کرنے سے انکار کیا۔ منصور نے خالد بن برمک اور دوسرے عجمی سرداروں کو شریک مشورہ اور اپنی رائے کا موید بنا کر سنہ ۱۴۷ھ میں عیسیٰ بن موسیٰ کو جو سفاح کے زمانے سے کوفہ کا گورنر چلا آتا تھا، کوفہ کی حکومت سے معزول کر کے محمد بن سلیمان کو کوفہ کا گورنر بنا دیا۔ کوفہ کی گورنری سے معزول ہو کر عیسیٰ کی تمام قوت زائل ہو گئی اور اس کو منصور کی مرضی کے خلاف اظہار رائے کی غلطی محسوس ہوئی۔ غرض عیسیٰ کو بے دست و پا کر کے منصور نے چالاکی و فریب اور دل جوئی و منافقت سے کام لے کر لوگوں سے مہدی کی ولی عہدی کی بیعت لے لی اور مہدی کے بعد عیسیٰ بن موسیٰ کو ولی عہد بنا کر اس کے بھی آنسو پونچھنے کی کوشش کی۔ خالد بن برمک نے یہ شہرت کر دی کہ میرے سامنے عیسیٰ نے ولی عہدی سے دست برداری کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے امیر المومنین نے اپنے بیٹے مہدی کو ولی عہد بنایا ہے۔ اس کام کے لیے منصور نے خلاف عادت روپیہ بھی بہت صرف کیا اور لوگوں کو اس تقریب میں انعام و اکرام دے کر خوش کیا۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے منصور کی حکومت کو مضبوط و مستحکم بنانے اور قائم رکھنے میں سب سے زیادہ خدمات انجام دی تھیں۔ اسی نے محمد مہدی اور ابراہیم کو شکستیں دے کر قتل کرایا اور منصور کو ایک بہت بڑی مصیبت سے بچایا تھا۔ ان خدمات جلیلہ کا اس کو یہ الٹا صلہ ملا کہ وہ ولی عہدی سے بھی معزول کر دیا گیا اور مہدی بن منصور اس پر سابق ہو گیا۔ عیسیٰ بن موسیٰ گورنری کوفہ سے معزول ہونے کے بعد موضع رحبہ علاقہ کوفہ میں سکونت پذیر ہو کر خاموش زندگی بسر کرنے لگا۔

رفتہ رفتہ منصور کے راستے کی تمام مشکلات دور ہو گئیں اور سوائے ایک ملک اندلس کے تمام ممالک اسلامیہ میں سنہ ۱۴۸ھ کے اندر منصور کی حکومت مستحکم طور پر قائم ہو گئی۔ سنہ ۱۴۹ھ میں شہر بغداد کی تعمیر بھی تکمیل کو پہنچ گئی۔ مذکورہ بالا واقعات و حادثات کے سبب سے رومیوں پر جہاد کرنے کا

موقع مسلمانوں کو نہ ملا تھا۔ سنہ ۱۴۹ھ میں عباس بن محمد حسن بن قحطبہ اور محمد بن اشعث نے رومیوں پر چڑھائی کی اور دور تک قتل و غارت کرتے ہوئے چلے گئے۔

خروج استاد سیس:

سنہ ۱۵۰ھ میں استاد سیس نامی ایک شخص خراسان میں مدعی نبوت ہوا۔ خراسان میں ہزار ہا اشخاص نے فوراً اس کی نبوت کو تسلیم کر لیا۔ ہرات، بادغیس اور سیستان وغیرہ کے لوگ اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے اور خراسان کے اکثر حصہ پر اس نے قبضہ کر لیا۔ یہ خبر سن کر منصور بہت فکر مند ہوا۔ مرورود کا حاکم مسمی جثم یہ حالت دیکھ کر استاد سیس پر اپنے پورے لشکر کے ساتھ حملہ آور ہوا اور شکست فاش کھا کر مقتول ہوا۔ اس کے بعد خازم بن خزیمہ نے خدعہ حرب سے کام لے کر استاد سیس کی فوج کو بیچ میں لے کر دو طرف سے حملہ کیا۔ استاد سیس کے ستر ہزار ہمراہی میدان جنگ میں قتل ہوئے اور وہ ۱۴ ہزار ہمراہیوں کے ساتھ ایک پہاڑ میں محصور کر لیا گیا۔ عرصہ تک محاصرہ جاری رہنے کے بعد استاد سیس نے اپنے آپ کو مع ہمراہیوں کے خازم بن خزیمہ کے سپرد کر دیا۔ استاد سیس کی گرفتاری کے بعد منصور کو اطلاع دی گئی۔

تعمیر رصافہ:

جس زمانہ میں استاد سیس نے خروج کیا تو خراسان کا گورنر مہدی تھا۔ وہ مرو میں مقیم تھا۔ خازم بن خزیمہ اسی کے پاس مقیم تھا اور منصور کے حکم کے موافق حملہ آور ہوا تھا۔ اس فتنہ سے فارغ ہو کر مہدی، منصور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت تک فوج کا غالب عنصر عربی قبائل تھے اور ہر ایک معرکہ میں عربوں ہی کی شمشیر خاراشگاف کے ذریعہ سے فتح و فیروزی حاصل ہوتی تھی۔ عجمیوں اور خراسانیوں کو عربوں کی ہمسری کا دعویٰ نہ تھا۔ ان عربی قبائل سے ہمیشہ اندیشہ رہتا تھا کہ اگر یہ مخالفت پر متحد ہو گئے تو حکومت کو ذرا سی دیر میں الٹ دیں گے۔ امام ابراہیم نے سب سے پہلے اس بات کو قبل از وقت محسوس کر کے عجمیوں کو طاقتور بنانے اور ان سے کام لینے کی پالیسی ایجاد کی تھی۔ اس کے جانشین بھی اسی خیال پر قائم رہے۔ چنانچہ عبداللہ سفاح نے ابوسلمہ کو قتل کرا کر خالد بن برمک کو جو بلخ کے آتش کدہ نوبہار کا مغ زادہ نومسلم اور ابومسلم کا ایک فوجی سردار تھا، اپنا وزیر بنایا تھا۔ چند روز کے بعد خالد بن برمک کسی ولایت کا والی بن کر چلا گیا اور ابوایوب اس کی جگہ وزیر ہوا۔ اب

منصور نے دوبارہ اس کو وزارت کا عہدہ عطا کر دیا۔ فوجوں کی سرداریوں اور صوبوں کی حکومتوں پر بھی مجوسی النسل لوگ مامور ہوتے تھے اور بہ تدریج ان کا اقتدار ترقی کر رہا تھا لیکن عربوں کا فوجی عنصر ابھی تک غالب تھا۔

اس موقع پر بے اختیار اکبر بادشاہ ہند کی وہ پالیسی یاد آ جاتی ہے جو اس نے پٹھانوں کی طاقتور اور بااقتدار قوم سے محفوظ رہنے کے لیے ہندوستان میں اختیار کی تھی کہ پٹھانوں کے خطرہ کو بے حقیقت بنانے کے لیے ہندوؤں کی مردہ قوم کو زندہ کرنا اور ان کو طاقتور بنانا ضروری سمجھا۔ حتیٰ کہ مان سنگھ کو ہندوستان کا سپہ سالار اعظم بنایا اور پٹھانوں کو ہر جگہ کمزور وناتواں بنانے کی کوشش کو جاری رکھا۔ عباسیوں نے بھی عربوں کی طاقت کو مٹا کر ان کی جگہ مجوسیوں اور ایرانیوں کو طاقتور بنایا کہ کوئی عربی قبیلہ اور عربی قبائل کی مدد سے کوئی علوی خروج پر آمادہ نہ ہو سکے۔[1]

مہدی کے خراسان سے آنے کے اور منصور کی خدمت میں حاضر ہونے کے موقع پر فوج والوں کے طلب انعام میں بعض ایسی حرکات سرزد ہوئیں جس سے آزاد مزاجی اور خودسری کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ فوج والے سب عربی قبائل پر مشتمل تھے اور مجوسیوں کی طرح ضرورت سے زیادہ اپنے بادشاہ یا خلیفہ کی تعظیم وتکریم کے عادی نہ تھے۔ ان کی یہی بات عباسیوں کو خائف وترساں رکھتی تھی اور غالباً اسی آزاد مزاجی کی وجہ سے وہ ہر ایک نئی تحریک اور نئے مدعی خلافت کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ اس موقع پر لشکر کی یہ حالت دیکھ کر کہ قیم بن عباس بن عبداللہ بن عباس نے عربوں کے قبائل مضر اور قبائل ربیعہ میں چونکہ رقابت پیدا ہوگئی ہے، اس لیے مناسب یہ ہے کہ فوج کے دو حصے کر کے قبائل مضر کو تو مہدی کے ماتحت رکھو کیونکہ اہل خراسان قبائل مضر کے ہمدرد ہیں اور قبائل ربیعہ کو اپنے ماتحت رکھو، تمام یمنی ان کے ہوا خواہ ہیں۔ اس طرح دو جانب دو فوجی مرکز قائم ہو جائیں گے تو ایک کو دوسرے کا خوف رہے گا اور کوئی بغاوت کامیاب نہ ہونے پائے گی۔ منصور نے اس رائے کو پسند کیا اور اپنے بیٹے مہدی کے قیام کے واسطے بغداد کی مشرقی جانب رصافہ کی تعمیر کا سنہ ۱۵۱ھ میں حکم دیا کہ وہاں الگ ایک فوجی چھاؤنی قائم ہو جائے۔ اسی سال یعنی سنہ ۱۵۱ھ میں محمد اشعث نے

---

[1] کس قدر الم انگیز معاملہ ہے کہ کلمہ گو افراد کی بجائے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات پیدا کیے گئے، ان سے دوستی کا دم بھرا گیا اور انہیں طاقتور کیا گیا۔ گویا یہ ان سانپوں کو پالنا تھا۔ پھر بعد میں خلافت اسلامیہ جیسے جیسے کمزور ہوتی گئی، اس کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا۔

بلاد روم کی طرف سے واپس آتے ہوئے راستے میں وفات پائی۔

سنہ ۱۵۳ھ میں منصور نے حکم جاری کیا کہ میری تمام رعایا لمبی ٹوپیاں اوڑھا کرے۔ یہ ٹوپیاں بانس اور پتے سے بنائی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں حبشی ان ٹوپیوں کو اوڑھا کرتے تھے۔ سنہ ۱۵۴ھ میں زفر بن عاصم نے بلاد روم پر حملہ کیا۔ سنہ ۱۵۵ھ میں قیصر روم نے مسلمانوں کے آئے دن کے حملوں سے تنگ آ کر صلح کی درخواست پیش کی اور جزیہ دینے کا اقرار کیا۔

وفات منصور:

سنہ ۱۵۸ھ میں منصور نے عامل مکہ کو لکھا کہ سفیان ثوری اور عباد بن کثیر کو قید کر کے بھیج دو۔ لوگوں کو سخت اندیشہ تھا کہ کہیں ان کو قتل نہ کر دے۔ حج کے دن قریب آ گئے تھے۔ منصور نے خود حج کا ارادہ کیا، اس سے اہل مکہ کو اور بھی تشویش ہوئی کہ یہاں آ کر اللہ جانے کس کس کو گرفتار و قید اور قتل کرے؟ مگر اہل مکہ کی دعائیں قبول ہوئیں اور منصور مکہ تک پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہوا۔ اس اجمال تفصیل کی یہ ہے کہ منصور نے ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۵۸ھ میں بغداد سے بہ عزم حج کوچ کیا۔ بغداد سے رخصت ہوتے وقت اپنے بیٹے مہدی کو بغداد میں اپنا نائب بنا کر چھوڑا اور وصیت کی کہ:

''میری بیاضوں کے صندوقچہ کی بہت حفاظت کرنا اور ضرورتوں کے وقت اپنی مشکلات کے حل کی تدبیریں ان بیاضوں میں تلاش کرنا۔ شہر بغداد کی خوب حفاظت کرنا اور میرے بعد کبھی دارالخلافہ کسی دوسری جگہ تبدیل نہ کرنا۔ میں نے اس قدر خزانہ جمع کر دیا ہے کہ دس دس برس تک خراج کی ایک پائی بھی خزانہ میں داخل نہ ہو تو فوج کی تنخواہیں اور دوسرے تمام مصارف سلطنت کے لیے یہ خزانہ کفایت کرے گا۔ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا، ان کی عزت بڑھانا اور ان کو بڑے بڑے عہدے دینا۔ میں تم کو خراسانیوں کے ساتھ بہ حسن سلوک پیش آنے کی تاکید کرتا ہوں کیونکہ وہ تمہارے قوت بازو اور ایسے مددگار ہیں کہ انہوں نے تمہارے خاندان میں حکومت و سلطنت قائم کرنے کے لیے اپنا جان و مال صرف کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خراسانیوں کے دلوں سے تمہاری محبت کبھی نہ نکلے گی۔ ان کی لغزشوں سے درگزر کرنا، ان کے نمایاں کاموں پر ان کو انعام واکرام سے خوش کرنا۔ خبردار! قبیلہ بنو سلیم کے کسی شخص سے کبھی مدد طلب نہ کرنا۔ عورتوں کو اپنے کاموں میں

دخیل نہ بنانا۔ امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرنا، ناحق خون ریزی نہ کرنا۔ حدود الٰہی کی پابندی کرنا، ملحدین پر حملہ آور بدعتوں کو مٹانا، عدل کو قائم کرنا، اعتدال سے آگے قدم نہ بڑھانا، مال غنیمت لشکریوں کے لیے چھوڑ دینا کیونکہ تمہارے لیے میں کافی خزانہ چھوڑے جاتا ہوں۔ سرحدوں کی پورے طور پر حفاظت کرنا، راستوں میں امن قائم کرنا، رعیت کے مال پر نظر رکھنا، جماعت کا ساتھ نہ چھوڑنا، سوار و پیادے جس قدر ممکن ہو تیار رکھنا۔ آج کا کام کل پر نہ اٹھا رکھنا۔ نزول حوادث کے وقت مستقل مزاج رہنا۔ سستی و کاہلی کو مزاج میں دخیل نہ ہونے دینا۔ لوگوں پر حاضری دربار کو آسان کرنا۔ دربانوں سے خبردار رہنا کہ وہ لوگوں پر سختی نہ کرنے پائیں۔''

بغداد سے روانہ ہوکر منصور کوفہ میں آیا۔ حج و عمرے کا احرام باندھا۔ قربانی کے جانوروں کو آگے روانہ کیا۔ کوفہ سے دو تین منزل سفر کرنے پایا تھا کہ بیمار ہوگیا۔ اس بیماری کی حالت میں اپنے آزاد کردہ غلام ربیع کو جو اس کا حاجب اور افسر باڈی گارڈ تھا، اکثر اپنی مصاحبت میں رکھتا تھا۔ ۶ ذی الحجہ سنہ ۱۵۸ھ بمقام بطن میں جہاں سے مکہ تین چار میل رہ گیا تھا، فوت ہوگیا۔ وفات کے وقت اس کے خاص خدام اور ربیع کے اور کوئی اس کے پاس موجود نہ تھا۔ انہوں نے اس روز منصور کی وفات کو چھپایا۔ اگلے دن عیسیٰ بن علی، عیسیٰ بن موسیٰ بن محمد ولی عہد دوم، عباس بن محمد، محمد بن سلیمان، ابراہیم بن یحییٰ، قاسم بن منصور، حسن بن زید علوی، موسیٰ بن مہدی بن منصور، علی بن عیسیٰ بن ہامان وغیرہ جو اس سفر میں ساتھ تھے، دربار میں بلائے گئے۔ ربیع نے خلیفہ کی وفات کی خبر سنائی۔ ایک کاغذ جو منصور کا لکھا ہوا تھا، پڑھ کر لوگوں کو سنایا، اس میں لکھا تھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، عبداللہ منصور کی طرف سے پس ماندگان بنی ہاشم و اہل خراسان و عامۃ المسلمین کے نام۔ امابعد! میں اس عہدنامہ کو اپنی زندگی یعنی دنیا کے دنوں میں سے آخری دن میں اور آخرت کے دنوں میں سے پہلے دن میں لکھ رہا ہوں۔ میں تم کو سلام کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہوں کہ وہ تم کو فتنہ میں نہ ڈالے اور نہ میرے بعد تم کو کئی فرقوں میں متفرق کرے اور نہ تم کو خانہ جنگی کا مزہ چکھائے۔ میرے بیٹے مہدی کی اطاعت کا تم اقرار کر چکے ہو، اس پر قائم رہو اور بدعہدی و بے وفائی سے بچو۔''

ربیع نے یہ کاغذ سنا کر موسیٰ بن مہدی بن منصور کو اپنے باپ مہدی کی طرف سے نیابتہً بیعت لینے کا اشارہ کیا اور سب سے پہلے حسن بن زید کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ اٹھو! بیعت کرو۔ حسن بن زید نے بیعت کی، اس کے بعد یکے بعد دیگرے سب نے بیعت کی۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے بیعت کرنے سے انکار کیا۔ یہ سن کر علی بن عیسیٰ بن ہامان نے کہا کہ اگر تم بیعت نہ کرو گے تو میں تمہاری گردن تلوار سے اڑا دوں گا۔ چنانچہ مجبوراً عیسیٰ بن موسیٰ نے بھی بیعت کر لی۔ اس کے بعد سرداران لشکر اور عوام الناس نے بیعت کی، پھر عباس بن محمد اور محمد بن سلیمان مکہ مکرمہ گئے اور انہوں نے رکن و مقام کے درمیان لوگوں سے خلافت مہدی کی بیعت لی۔ اس کے بعد عیسیٰ بن موسیٰ نے نماز جنازہ پڑھائی اور حجون و بیر میمون کے درمیان مقبرہ معلاۃ میں منصور کو دفن کر دیا گیا، پھر ربیع نے منصور کی خبر وفات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر و عصا اور خاتم خلافت کو مہدی کی خدمت میں روانہ کیا۔ یہ خبر ۱۵ ذی الحجہ سنہ ۱۵۸ھ کو بغداد میں مہدی کے پاس پہنچی۔ اہل بغداد نے بھی حاضر ہو کر مہدی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ منصور نے ایک ہفتہ کم بائیس سال خلافت کی۔ سات بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی۔ بیٹوں کے نام یہ ہیں: محمد مہدی، جعفر اکبر، جعفر اصغر، سلیمان، عیسیٰ، یعقوب، سالم اور بیٹی کا نام عالیہ تھا، جس کی شادی اسحاق بن سلیمان بن علی کے ساتھ ہوئی تھی۔

خلیفہ منصور سے کسی نے پوچھا کہ کوئی ایسی تمنا بھی ہے جو آپ کی اب تک پوری نہ ہوئی ہو؟ منصور نے کہا کہ صرف ایک تمنا باقی ہے، وہ یہ ہے کہ میں ایک چبوترے پر بیٹھا ہوں اور اصحاب حدیث میرے گرد بیٹھے ہوں۔ دوسرے روز جب وزراء کاغذات اور معاملات کی مثلیں اور قلمدان لے کر اس کے پاس پہنچے تو اس وقت وہ دریافت کرنے والا مصاحب بھی موجود تھا۔ اس نے کہا کہ لیجیے! اب آپ کی یہ تمنا پوری ہوگئی۔ منصور نے کہا: یہ وہ لوگ نہیں ہیں جن کی تمنا مجھے ہے۔ ان لوگوں کے تو کپڑے پھٹے ہوئے، پاؤں برہنہ اور بال بڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور روایت حدیث ان کا کام ہوتا ہے۔

منصور نے امام مالک رحمہ اللہ کو موطا کی تالیف پر آمادہ کیا تو ان سے اس طرح مخاطب ہوا کہ ''اے ابوعبداللہ! تم جانتے ہو کہ اب اسلام میں تم سے اور مجھ سے زیادہ شریعت کا جاننے والا کوئی باقی نہیں رہا۔[1] میں تو خلافت و سلطنت کے ان جھگڑوں میں مبتلا ہوں۔ تم کو فرصت حاصل ہے،

[1] امام مالک رحمہ اللہ اپنے وقت کے جید ترین عالم تھے اور جمع احادیث کی سب سے پہلی کتاب مؤطا امام مالک ہے۔

لہٰذا تم لوگوں کے لیے ایک ایسی کتاب لکھو جس سے وہ فائدہ اٹھائیں۔ اس کتاب میں ابن عباس کے جواز اور ابن عمر کے تشدد و احتیاط کو نہ بھرو اور لوگوں کے لیے تصنیف و تالیف کا ایک نمونہ قائم کرو۔‘‘ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ماشاء اللہ! منصور نے یہ باتیں کیا کہیں تصنیف، ہی سکھا دی۔

عبدالصمد بن محمد نے منصور سے کہا کہ آپ نے سزا دینے پر ایسی کمر باندھی ہے کہ کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ آپ معاف کرنا بھی جانتے ہیں۔ منصور نے جواب دیا کہ ابھی تک آل مروان کا خون خشک نہیں ہوا اور آل ابی طالب کی تلواریں بھی ابھی تک برہنہ ہیں۔ یہ زمانہ ایسا ہے کہ ابھی تک خلفاء کا رعب ان کے دلوں میں قائم نہیں ہوا اور یہ رعب اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا، جب تک وہ عفو کے معانی نہ بھول جائیں اور سزا کے لیے ہر وقت تیار نہ رہیں۔ زیاد بن عبداللہ حارثی نے منصور کو لکھا کہ میری تنخواہ اور جاگیر میں کچھ اضافہ کر دیا جائے اور اس عرض داشت میں اپنی تمام بلاغت ختم کر دی۔ منصور نے جواب دیا کہ جب تونگری اور بلاغت کسی شخص میں جمع ہو جاتی ہے تو اس کو خود پسند بنا دیتی ہے۔ مجھ کو تمہارے متعلق یہی خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ تم بلاغت چھوڑ دو۔ عبدالرحمٰن زیاد افریقی، منصور کا طالب علمی کے زمانہ کا دوست تھا۔ وہ ایک مرتبہ منصور کی خلافت کے زمانہ میں اس سے ملنے آیا۔ منصور نے پوچھا کہ تم بنوامیہ کے مقابلہ میں میری خلافت کو کیسا پاتے ہو؟ عبدالرحمٰن نے کہا کہ جس قدر ظلم و جور تمہارے زمانہ میں ہوتا ہے، اتنا بنوامیہ کے زمانے میں نہ تھا۔ منصور نے کہا کہ کیا کروں مجھ کو مددگار نہیں ملتے۔ عبدالرحمٰن نے کہا کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اگر بادشاہ نیک ہو گا تو اس کو نیک لوگ ملیں گے اور فاجر ہو گا تو اس کے پاس فاجر ہوں گے۔ ایک مرتبہ منصور کو مکھیوں نے بہت تنگ کیا۔ اس نے مقاتل بن سلیمان کو بلایا اور کہا کہ ان مکھیوں کو اللہ تعالیٰ نے کیوں پیدا کیا ہے؟ مقاتل نے کہا کہ ظالموں کو ان کے ذریعہ سے ذلیل کرنے کے لیے۔

منصور کے زمانہ میں سریانی اور عجمی زبانوں سے کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہونے لگا۔ چنانچہ اقلیدس اور کلیلہ ودمنہ کا ترجمہ اسی کے عہد میں ہوا۔ سب سے پہلے منصور نے منجموں کو اپنا جلیس و مقرب بنایا۔[1] اسی کے عہد میں عباسیوں اور علویوں میں تلوار چلی، ورنہ اس سے پہلے علوی

---

[1] اس پر سوائے انا للہ وانا الیہ راجعون کہنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے کہ خلیفۃ المسلمین جس نے مسلمانوں کی اصلاح اور دینی تربیت کے لیے کوشاں ہونا تھا، وہ خود بعض خرافات کا شکار ہو گیا۔

وعباسی متحد ومتفق تھے۔

اپنے اخلاق وعادات اور اپنے اعمال وکارہائے نمایاں کے اعتبار سے منصور عباسی، عبدالملک اموی سے بہت ہی مشابہ ہے۔ وہ بھی خاندان مروان میں دوسرا خلیفہ تھا اور منصور بھی خاندان عباسی کا دوسرا خلیفہ تھا۔ عبدالملک نے بھی خلافت امویہ کو برباد وفنا ہوتے ہوتے بچا لیا۔ اسی طرح منصور نے بھی محمد وابراہیم کے مقابلہ میں خلافت عباسیہ کو برباد ہوتے ہوتے بچا لیا، عبدالملک بھی عالم تھا، اسی طرح منصور بھی عالم تھا۔ عبدالملک بھی کفایت شعار اور بخل سے متہم تھا، اسی طرح منصور بھی کفایت شعاری اور بخل کے ساتھ بدنام تھا۔ حکومت بھی دونوں نے قریباً مساوی مدت تک کی۔ دونوں میں فرق صرف اس قدر تھا کہ منصور نے لوگوں کو امان دینے کے بعد بھی قتل کیا اور بدعہدی کے ساتھ متہم ہوا لیکن عبدالملک اس معاملہ میں بدنام نہیں ہوا۔

مہدی بن منصور

محمد المہدی بن منصور کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ بمقام ایدج سنہ ۱۲۶ھ میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں کا نام ام موسیٰ اردیٰ بنت منصور حمیری تھا۔ مہدی نہایت سخی، ہر دل عزیز، صادق الاعتقاد، محبوب رعایا اور وجیہہ شخص تھا۔ اس کے باپ منصور نے اس کو بہت سے علماء کی شاگردی اور صحبت میں رکھا۔ مہدی کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی کہ منصور نے اس کو عبدالجبار بن عبدالرحمٰن کی بغاوت فرو کرنے کے لیے سنہ ۱۴۱ھ میں خراسان کی طرف بھیجا۔ سنہ ۱۴۴ھ میں یہ خراسان سے واپس آیا تو منصور نے اس کی شادی سفاح کی لڑکی یعنی اپنی بھتیجی سے کی۔ سنہ ۱۴۴ھ میں اس کو ولی عہد اول بنایا اور خراسان کے جنوبی ومغربی حصہ کا عامل بنا کر رے کی طرف روانہ کیا۔ سنہ ۱۵۲ھ میں اس کو امیر الحج مقرر کیا۔ سنہ ۱۵۸ھ میں اپنے باپ کی وفات کے بعد بغداد میں تخت خلافت پر بیٹھا۔ بغداد میں جب لوگوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو اس نے منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا کہ:

> ''تم لوگ جس کو امیرالمومنین کہتے ہو، وہ ایک بندہ ہوتا ہے۔ جب اسے کوئی آواز دیتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے اور جب اس کو حکم دیا جاتا ہے تو وہ بجالاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی امیرالمومنین کا محافظ ہوتا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ ہی سے مسلمانوں کی خلافت کے کام انجام دینے کے لیے

مدد طلب کرتا ہوں۔ جس طرح تم لوگ اپنی زبان سے میری اطاعت کا اظہار کرتے ہو، اسی طرح دل سے بھی موافقت کرو تاکہ دین و دنیا کی بہتری کے امیدوار بن سکو۔ جو شخص تم میں عدل پھیلائے، تم اس کی مخالفت کے لیے تیار نہ ہو۔ میں تم پر سے سختیاں اٹھا دوں گا اور اپنی تمام عمر تم پر احسان کرنے اور جو تم میں مجرم ہو، اس کو سزا دینے میں صرف کر دوں گا۔''

مہدی نے خلیفہ ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ منصور کے قید خانہ میں جس قدر قیدی تھے، سب کو رہا کر دیا۔ صرف وہ قیدی رہا نہیں ہوئے جو باغی، غاصب یا خونی تھے۔ انہیں قیدیوں میں جو رہا ہوئے، یعقوب بن داؤد بھی تھا۔ جو قیدی رہا نہیں ہوئے، ان میں حسن بن ابراہیم بن عبداللہ بن حسن بن حسن بھی تھا۔ حسن اور یعقوب دونوں قتل ابراہیم کے بعد بصرہ سے گرفتار ہو کر ساتھ ہی قید ہوئے تھے، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ یعقوب کا باپ داؤد بنی سلیم کے آزاد غلاموں میں سے تھا۔ وہ خراسان میں نصر بن سیار کا میر منشی تھا۔ داؤد کے دو بیٹے یعقوب اور علی تھے۔ یہ دونوں بڑے عالم و فاضل اور نہایت ہوشیار و عقلمند تھے۔ جب بنو عباس کی حکومت شروع ہوئی تو بنی سلیم کی بے قدری ہوئی، ساتھ ہی یعقوب و علی کی بھی جو بنو سلیم میں شامل تھے۔ کسی نے بات نہ پوچھی حالانکہ اپنی قابلیت کے اعتبار سے وہ مستحق التفات تھے۔ جب محمد مہدی اور ابراہیم نے بنو عباس کے خلاف لوگوں کو دعوت دینی شروع کی تو یعقوب اس دعوت میں شریک ہو گیا اور لوگوں کو محمد مہدی و ابراہیم کی طرف متوجہ کرتا رہا۔ بالآخر حسن بن ابراہیم کے ساتھ قید کر دیا گیا۔ اب قید خانہ سے چھوٹ کر یعقوب کو معلوم ہوا کہ حسن بن ابراہیم قید خانہ سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے اس کی اطلاع خلیفہ مہدی کو کی۔ مہدی نے حسن کو دوسرے قید خانہ میں تبدیل کر دیا مگر حسن وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔ مہدی نے یعقوب کو بلا کر حسن کے متعلق مشورہ کیا۔ یعقوب نے کہا کہ آپ حسن کو امان عطا فرمائیں تو میں اس کو حاضر کر سکتا ہوں۔ مہدی نے حسن کو امان دے دی اور یعقوب نے حسن کو حاضر کر دیا اور اس بات کی اجازت مہدی سے حاصل کر لی کہ حسن وقت بے وقت خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہے گا۔ چنانچہ حسن، مہدی کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مہدی نے حسن کو اپنا دینی بھائی بنا کر ایک لاکھ درہم مرحمت فرمائے۔ چند ہی روز کے بعد مہدی نے اپنے وزیر ابو عبداللہ کو جو عہد ولی عہدی سے وزیر چلا آتا تھا، معزول کر کے یعقوب بن داؤد کو اپنا وزیر بنا لیا۔ یعقوب اور حسن کی عزت افزائی سے مہدی نے اپنی منصف مزاجی

اور قدر شناسی کا ثبوت پیش کیا اور اپنی محبت دشمنوں کے دلوں میں بھی قائم کر دی۔ خلافت عباسیہ کو سب سے زیادہ خطرہ محمد مہدی اور ابراہیم کی جماعت کے لوگوں سے تھا جو یحییٰ بن زید کی جماعت کے ساتھ مل کر زوال بنو عباس کے خواہاں تھے۔ مہدی نے یعقوب کو وزیر بنا کر ان تمام خطرات کا سد باب کر دیا کیونکہ یعقوب ان دونوں جماعتوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو سلطنت میں عہدے دے دے کر مخالفت سے باز رکھا اور ان کے جوش مخالفت کو کم کر دیا۔

حکیم مقنع کا ظہور:

مہدی کی خلافت کے پہلے ہی سال یعنی سنہ ۱۵۹ھ میں مرو کا ایک باشندہ حکیم مقنع جس نے سونے کا ایک چہرہ بنا کر اپنے چہرہ پر لگا لیا تھا، معبود ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کر کے اس کے جسم میں خود حلول کیا ہے۔ اس کے بعد نوح میں پھر ابومسلم اور ہاشم میں۔ اس طرح یہ تناسخ کا قائل تھا اور کہتا تھا کہ میرے اندر اللہ تعالیٰ کی روح ہے یعنی مجھ میں اللہ تعالیٰ نے حلول کیا ہے۔ [1] اس کا یہ عقیدہ درحقیقت وہی تھا جو علاقہ راوند کے لوگوں کا تھا اور جنہوں نے منصور کے زمانہ میں ہاشمیہ کے اندر فساد برپا کیا تھا۔ یہ سب ابومسلم کی جماعت کے لوگ تھے اور ابومسلم ہی کی عجیب در عجیب دعوت و تبلیغ کے کرشمے تھے۔ وہ جس حیثیت اور جس قسم کے لوگ دیکھتا تھا، انہیں کے حسب حال وہ اپنی دعوت کا رنگ تبدیل کر کے ان کے سامنے پیش کرتا تھا۔ یہ تمام گمراہ فرقے دعوت اہل بیت کو مختلف سانچوں میں ڈھالنے کے مختلف نتائج تھے۔ حکیم مقنع کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یحییٰ بن زید مارے نہیں گئے بلکہ روپوش ہو گئے ہیں اور کسی وقت اپنا بدلہ لینے کے لیے ظاہر ہوں گے اور دشمنوں کو ہلاک کریں گے۔ مقنع کے ظہور پر بہت سے خراسانی اس کے متبع ہو گئے اور اس کو سجدہ کرنے لگے۔ مقنع نے قلعہ بسام و سنجردہ (علاقہ ماوراء النہر) میں قیام کیا۔ اہل بخارا، اہل صغد اور ترکوں نے عباسیوں کے خلاف اس کی شرکت و حمایت پر کمر باندھی اور مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح کے عاملوں ابوالنعمان، جنید اور لیث بن نصر بن سیار نے مقابلہ کیا۔ لیث کا بھائی محمد بن نصر اور بھتیجا حسان بن تمیم اس لڑائی میں مارے گئے۔ مہدی کو جب یہ خبر پہنچی تو اس نے جبرئیل بن یحییٰ کو ان لوگوں کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ جبرئیل کے بھائی یزید کو بخارا و صغد کے

---

[1] ایسے غلیظ ترین کفریہ اور شرکیہ عقیدہ سے اللہ کی پناہ! ایسا ہی عقیدہ تصوف کے بعض حاملین کا بھی ہے جو حلول یا حلولیہ نظریہ رکھتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں ماہر القادری کی کتب: سنت و بدعت کی کشمکش، نقش توحید۔

باغیوں کی سرکوبی پر مامور کیا۔ اول اہل بخارا وصغد پر حملہ کیا گیا۔ چار مہینے کی جنگ کے بعد بخارا وغیرہ کے قلعوں کو مسلمانوں نے فتح کیا۔ سات سو باغی مارے گئے، باقی مقنع کی طرف بھاگ گئے۔ مہدی نے ابوعون کو چند روز کے بعد جنگ مقنع کے لیے روانہ کیا تھا مگر ان سرداروں سے مقنع مغلوب نہ ہو سکا تو معاذ بن مسلم کو روانہ کیا گیا تھا۔ معاذ بن مسلم کے مقدمۃ الجیش کا افسر سعید حریشی تھا، پھر عقبہ بن مسلم کو بھی اس لشکر میں شریک ہونے کا حکم دیا گیا۔ ان سرداروں نے مقنع کی فوج پر سخت حملہ کر کے اس کو میدان سے بھگا دیا اور مقنع کا قلعہ بسام میں محاصرہ کر لیا۔ اثناء جنگ میں معاذ وسعید میں کچھ ان بن ہو گئی تھی۔ سعید نے مہدی کو لکھ کر تنہا اپنے آپ مقنع کے استیصال کا کام کرنے کی اجازت حاصل کی۔ مقنع بتیس ہزار آدمیوں کے ساتھ محصور تھا۔ سعید حریشی سے محصورین نے امان طلب کی۔ سعید نے امان دے دی۔ تیس ہزار آدمی قلعہ سے نکل آئے۔ صرف دو ہزار مقنع کے ساتھ باقی رہ گئے۔ مقنع کو جب اپنی ناکامی کا یقین ہو گیا تو اس نے آگ جلا کر اپنے تمام اہل وعیال کو اول آگ میں دھکا دے کر جلا دیا، پھر آپ بھی آگ میں کود پڑا اور مر گیا۔ مسلمانوں نے قلعہ میں داخل ہو کر مقنع کی لاش آگ سے نکال کر اس کا سر کاٹ کر مہدی کے پاس روانہ کیا۔

عمال کا تغیر وتبدل اور عزل ونصب:

سنہ ۱۵۵ھ میں مہدی نے اپنے چچا اسماعیل کو حکومت کوفہ سے معزول کر کے اسحاق بن صباح کندی اشعثی کو مامور کیا۔ بصرہ کی حکومت وامامت سے سعید وعلج اور عبیداللہ بن حسن کو معزول کر کے عبدالملک بن ظبیان نمیری کو مامور کیا۔ اسی سال قثم بن عباس کو یمامہ کی حکومت سے معزول کر کے فضل بن صالح کو اور مطر (منصور کے آزاد کردہ غلام) کو مصر کی حکومت سے معزول کر کے ابوحمزہ محمد بن سلیمان کو اور عبدالصمد بن علی کو مدینہ کی حکومت سے معزول کر کے محمد بن عبداللہ کثیری کو مامور کیا۔ مدینہ کی حکومت سے محمد بن عبداللہ کو بھی جلد معزول کر کے زفر بن عاصم ہلالی کو مدینہ کی حکومت سپرد کی۔ اسی سال معبد بن خلیل کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ حمید بن قحطبہ خراسان کا گورنر تھا، وہ بھی اسی سال سنہ ۱۵۹ھ میں فوت ہوا تو خراسان کی حکومت ابوعون عبدالملک بن یزید کو دی گئی، پھر اسی سال کے آخر میں سعید بن خلیل کے فوت ہونے پر سندھ کی حکومت روح بن حاتم کو دی گئی۔

سنہ ۱۶۰ھ میں ابوعون عبدالملک معتوب ہو کر معزول ہوا۔ اس جگہ خراسان کی حکومت پر معاذ

بن مسلم کو اور سیستان کی حکومت پر حمزہ بن یحییٰ کو اور سمرقند کی حکومت پر جبرئیل بن یحییٰ کو بھیجا گیا۔ جبرئیل نے اپنے عہد حکومت میں سمرقند کا قلعہ اور شہر پناہ تعمیر کرائے۔ اسی سال سندھ کی حکومت پر بسطام بن عمرو کو بھیجا گیا۔ سنہ ۱۶۱ھ میں مہدی نے سندھ کی گورنری نصر بن محمد بن اشعث کو عطا کی۔ اسی سال عبدالصمد بن علی کو جزیرہ پر اور عیسیٰ بن لقمان کو مصر پر اور بسطام بن عمرو تغلبی کو سندھ سے معزول کر کے آذربائیجان پر مقرر کیا۔ اسی سال اپنے بیٹے ہارون کی اتالیقی پر یحییٰ بن خالد بن برمک کو متعین کیا۔ اسی سال سلیمان بن رجاء کو بجائے محمد بن سلیمان کے مصر کی حکومت پر روانہ کیا۔

مہم باربد:

اپنی خلافت کے پہلے ہی سال خلیفہ مہدی نے ایک بحری مہم ہندوستان کی طرف روانہ کی۔ عبدالملک بن شہاب سمعی ایک لشکر لے کر خلیج فارس سے کشتیوں میں سوار ہو کر ساحل ہند کی طرف روانہ ہوا۔ باربد میں ان لوگوں نے اتر کر لڑائی چھیڑ دی۔ اہل باربد بہت سے قتل و غارت ہوئے۔ مسلمانوں کے صرف بیس آدمی مارے گئے لیکن یہاں مسلمان فوج میں وبا پھیل گئی اور ایک ہزار آدمی وبا سے مرے۔ یہاں سے کشتیوں میں سوار ہو کر فارس کی طرف روانہ ہوئے۔ ساحل فارس کے قریب پہنچ کر طوفان باد سے کئی کشتیاں ٹوٹ گئیں اور ایک جماعت سمندر میں غرق ہوئی۔

ہادی بن مہدی کی ولی عہدی:

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، عیسیٰ بن موسیٰ موضع رحبہ متصل کوفہ میں رہتا اور جمعہ یا عید کے روز کوفہ میں نماز پڑھتا تھا اور تمام وقت اپنے گاؤں میں خاموشی و بے تعلقی کے ساتھ بسر کرتا تھا۔ یہ بھی ذکر ہو چکا ہے کہ منصور کے بعد عیسیٰ کو عبداللہ سفاح نے ولی عہد مقرر کیا تھا۔ منصور نے عیسیٰ کو موخر کر کے اپنے بیٹے مہدی کو مقدم کر دیا۔ اب مہدی کے بعد عیسیٰ بن موسیٰ ولی عہد تھا لیکن مہدی کو اس کی خلافت کے پہلے ہی سال میں اس کے ہمدردوں اور مشیروں نے ترغیب دی کہ عیسیٰ بن موسیٰ کی جگہ آپ اپنے بیٹے ہادی کو ولی عہد بنائیں۔ مہدی نے عیسیٰ کو اپنے پاس بغداد میں طلب کیا۔ عیسیٰ نے آنے سے انکار کیا۔ مہدی نے گورنر کوفہ کو تاکیدی حکم دیا کہ عیسیٰ کو تنگ کیا جائے مگر چونکہ عیسیٰ پہلے ہی سے خانہ نشین تھا، اس لیے گورنر کوفہ کو کوئی موقع عیسیٰ کو پریشان کرنے کا نہ مل سکا۔ پھر مہدی نے ایک سخت خط عیسیٰ کو لکھا، اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر مہدی نے اپنے چچا عباس کو عیسیٰ

کے پاس بھیجا کہ اس کو بلا لائے۔عیسیٰ نے پھر بھی انکار کیا۔آخر مہدی نے دو سپہ سالاروں کو عیسیٰ کے لانے پر مامور کیا۔مجبور ہوکر عیسیٰ بغداد میں آیا اور محمد بن سلیمان کے مکان پر فروکش ہوا۔مہدی کے دربار میں آتا جاتا رہا مگر بالکل خاموش جاتا، خاموش رہتا اور خاموش چلا جاتا۔آخر عیسیٰ پر تشدد شروع کیا گیا اور خود محمد بن سلیمان نے اس کو مجبور کرنا چاہا کہ وہ ولی عہدی سے دست بردار ہو جائے۔عیسیٰ نے عہد وقسم کا عذر کیا جو اس سے ولی عہدی کے وقت لی گئی تھی۔مہدی نے فقہاء کو طلب کیا، انہوں نے فتویٰ دیا کہ عیسیٰ قسم کا کفارہ دے کر ولی عہدی سے دست کش ہوسکتا ہے۔ مہدی نے اس کے عوض میں دس ہزار درھم اور زاب وکسکر میں جاگیریں دیں اور عیسیٰ نے ۲۶ محرم سنہ ۱۶۰ھ کو ولی عہدی سے خلع کیا اور ہادی کی ولی عہدی کی بیعت کر لی۔اگلے دن مہدی نے دربار عام کیا۔اراکین سلطنت سے بیعت لی۔ پھر جامع مسجد میں آیا، خطبہ دیا۔عیسیٰ کے معزول اور ہادی کے ولی عہد ہونے کی لوگوں کو اطلاع دی۔عیسیٰ نے اپنی ولی عہدی کے خلع کا اقرار کیا۔لوگوں نے ہادی کی ولی عہدی کی بیعت کر لی۔

مہدی کا حج:

سنہ ۱۶۰ھ کے ماہ ذیقعدہ میں مہدی نے حج کی تیاری کی۔اپنے بیٹے ہادی کو بغداد میں اپنا نائب بنا کر چھوڑا۔ہادی کے ماموں یزید بن منصور کو ہادی کے ساتھ مقرر کیا۔دوسرے بیٹے ہارون کو مع چند اہل خاندان کے ہادی کی مصاحبت پر متعین کیا اور خود مع وزیر یعقوب بن داؤد بن طہان کے مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہوا۔مکہ میں پہنچ کر خانہ کعبہ کے پرانے تمام غلافوں کو جو تہ بتہ چڑھے ہوئے تھے، اتروایا اور ایک نیا قیمتی غلاف چڑھایا۔ڈیڑھ لاکھ غرباء کو کپڑے تقسیم کیے۔مسجد نبوی (ﷺ) کو وسیع کرایا۔واپسی میں انصار کے پانچ سو خاندان اپنے ہمراہ عراق میں لایا۔ان کو یہاں آباد کر کے جاگیریں اور وظیفے مقرر کیے اور اپنی محافظت پر ان کو مامور کیا۔مکہ کے راستے میں مکانات بنوائے۔ ہر مکان میں حوض اور کنویں بھی بنوائے۔ان تمام کاموں کا اہتمام یقطین بن موسیٰ کے سپرد کیا۔مسجد بصرہ کی بھی توسیع کرنے اور اس کے منبر کو چھوٹا کرنے کا حکم دیا۔

اندلس میں چھیڑ چھاڑ:

مہدی کی طرف سے افریقہ کا گورنر عبدالرحمٰن بن حبیب فہری تھا۔اس نے بربریوں کی ایک

جماعت لے کر اندلس کے ساحل مرسیہ میں پہنچ کر اندلس کے صوبہ سرقسط کے گورنر سلیمان بن یقطن کو خلافت عباسیہ کی دعوت دی۔ سلیمان نے اس تحریر کا کوئی جواب نہیں دیا۔ عبدالرحمٰن فہری نے سرقسط پر حملہ کیا۔ سلیمان نے شکست دے کر عبدالرحمٰن فہری کو پیچھے ہٹا دیا۔ اسی اثناء میں امیر عبدالرحمٰن فرماں روائے اندلس فوج لے کر آ پہنچا۔ اس نے سب سے پہلے عبدالرحمٰن فہری کی کشتیوں کو جو ساحل پر کھڑی تھیں، جلوا دیا تاکہ فرار ہو کر نکل نہ جائے۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن فہری کی طرف متوجہ ہوا۔ عبدالرحمٰن پریشان ہو کر بلنسیہ کے پہاڑ پر چڑھ گیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے اعلان کر دیا کہ جو کوئی عبدالرحمٰن بن حبیب فہری کا سر کاٹ کر لائے گا، اس کو ایک ہزار دینار انعام میں دیا جائے گا۔ اس کی خبر کہیں عبدالرحمٰن فہری کے ہمراہی کسی بربری کو بھی ہو گئی۔ وہ غفلت کی حالت میں عبدالرحمٰن کا سر کاٹ کر امیر عبدالرحمٰن کے پاس لے آیا اور انعام لے کر چل دیا۔ امیر عبدالرحمٰن کو عباسیوں کی اس فوج کشی سے اشتعال پیدا ہوا۔ اس نے جواباً ارادہ کیا کہ لشکر لے کر ساحل شام پر حملہ آور ہو اور خلیفہ عباسی کو اس گستاخی کا مزہ چکھائے مگر انہیں ایام میں حسین بن یحییٰ بن سعید بن عثمان انصاری نے سرقسط میں علم بغاوت بلند کیا۔ لہٰذا عبدالرحمٰن اموی فرماں روائے اندلس اس طرف متوجہ ہو گیا اور شام کا قصد ملتوی رہا۔

خلیفہ منصور عباسی کے زمانے سے اندلس میں خاندان بنوامیہ کی حکومت قائم ہو کر ایک الگ اسلامی حکومت کا دوسرا مرکز بن گیا تھا۔ اس وقت چونکہ سلسلہ عباسیہ شروع ہو چکا ہے، لہٰذا خلافت عباسیہ کے فرماں رواؤں کا حال جب تک کہ ان کی فرماں روائی اندلس کے سوا تمام عالم اسلامی پر قائم رہی، اسی سلسلہ میں ختم کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اندلس کی حکومت کا حال اس کے بعد شروع سے الگ بیان کیا جائے گا۔ قارئین کرام منتظر رہیں۔

جنگ روم وحملہ ہارون:

سنہ ۱۶۳ھ میں مہدی نے خراسان اور دوسرے صوبوں سے لشکر فراہم کیا اور رومیوں پر جہاد کی غرض سے یکم رجب سنہ ۱۶۳ھ کو بغداد سے کوچ کیا۔ ۳۰ جمادی الثانی یعنی ایک دن پہلے مہدی کے چچا عیسیٰ بن علی کا انتقال ہو گیا تھا۔ بغداد میں ہادی کو اپنی نیابت پر چھوڑا اور اپنے دوسرے بیٹے ہارون کو اپنے ہمراہ لیا۔ دوران سفر میں موصل وجزیرہ ہو کر گزرا۔ اس صوبہ کے گورنر عبدالصمد بن علی کو معزول کر کے قید کر دیا اور اپنے بیٹے ہارون کو آذربائیجان، آرمینیا اور کل بلاد مغرب کا والی مقرر کیا

اور جزیرہ کی حکومت عبداللہ بن صالح کو عطا کی۔ رومیوں پر چڑھائی کرنے کا سبب یہ تھا کہ سنہ ۱۶۲ھ میں رومیوں نے بلاد اسلامیہ پر چڑھائی کر کے بعض شہروں کو ویران کر دیا تھا۔ اس لیے خلیفہ مہدی نے خود اس طرف لشکر کشی کی۔ اس سفر میں مہدی جب مسلمہ بن عبدالملک کے قصر کے مقابل پہنچا تو مہدی کے چچا عباس بن علی نے مہدی سے کہا کہ ایک مرتبہ آپ کے دادا محمد بن علی اس طرف کو ہو کر گزرے تھے تو مسلمہ نے ان کی دعوت کی تھی اور ایک ہزار دینار نذر کیے تھے۔ مہدی نے یہ سنتے ہی مسلمہ کے لڑکوں، غلاموں اور جملہ متعلقین کو طلب کر کے بیس ہزار دینار مرحمت کیے اور ان کے وظائف مقرر کر دیے۔ مہدی خود حلب میں پہنچ کر ٹھہر گیا اور ہارون کو فوج اور فوجی سرداروں کے ساتھ آگے روانہ کیا۔ ہارون کے ساتھ عیسیٰ بن موسیٰ، عبدالملک بن صالح، حسن بن قحطبہ، ربیع بن یونس، یحییٰ بن خالد بن برمک تھے مگر تمام لشکر کی سرداری اور رسد و غلہ کا انتظام سب ہارون کے ہی سپرد تھا۔ ہارون نے آگے بڑھ کر رومیوں کے قلعوں پر محاصرہ کیا اور یکے بعد دیگرے کئی قلعے فتح کیے۔ اس عرصے میں مہدی نے اطراف حلب کے زندیقوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کیا۔ ہارون فتح و فیروزی کے ساتھ واپس آیا۔ مہدی ہارون کو لے کر بیت المقدس کی زیارت کو گیا۔ مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھی، پھر بغداد کو واپس چلا آیا۔ مہدی نے جب ہارون کو آذربائیجان اور آرمینیا کا گورنر بنایا تھا تو حسن بن ثابت کو اس کا وزیر مال اور یحییٰ بن خالد بن برمک کو اس کا وزیر خارجہ مقرر کیا تھا۔ اسی سال یعنی سنہ ۱۶۳ھ میں خالد بن برمک کا انتقال ہوا۔

رومیوں پر ہارون کی دوسری چڑھائی:

سنہ ۱۶۴ھ میں عبدالکبیر بن عبدالرحمٰن نے رومیوں پر فوج کشی کی تھی مگر بطریق میکائیل اور بطریق طارہ ارمنی نے نوے ہزار کی جمعیت سے مقابلہ کیا۔ عبدالکبیر بلا مقابلہ واپس چلا آیا۔ اس واقعہ سے وہ رعب جو سنہ ۱۶۳ھ کی حملہ آوری سے رومیوں پر قائم ہوا تھا، زائل ہو گیا۔ مہدی نے سنا تو عبدالکبیر کو قید کر دیا اور سنہ ۱۶۵ھ میں اپنے بیٹے ہارون کو جہاد روم پر روانہ کیا اور اپنے امیر، حاجب اور معتمد خاص ربیع کو ہارون کے ہمراہ کر دیا۔ ہارون قریباً ایک لاکھ فوج لے کر رومیوں کے ملک پر حملہ آور ہوا اور برابر شکستیں دیتا، رومیوں کو قتل کرتا، ان کے شہروں کو غارت کرتا ہوا قسطنطنیہ تک پہنچ گیا۔ ان دنوں قسطنطنیہ کے تخت پر ایک عورت مسماۃ غسطہ حکمران تھی، جو قیصر الیوک کی بیگم تھی اور

اپنے نابالغ بیٹے کی طرف سے حکومت کر رہی تھی۔ ستّر ہزار دینار سالانہ جزیہ دینا منظور کر کے تیس برس کے لیے رومیوں نے صلح کر لی اور یہ شرط قبول کر لی کہ قسطنطنیہ کے بازار میں مسلمانوں کی آمدورفت اورخرید وفروخت کی ممانعت نہ کی جائے گی۔ اس صلح نامہ سے پیشتر مسلمانوں نے رومیوں کے پانچ ہزار چھ سو آدمیوں کو گرفتار اور ۵۶ ہزار کو قتل کر دیا تھا۔ اسی سال مہدی نے ہارون کو تمام ممالک مغربیہ کا حاکم و مہتمم مقرر کیا۔

سنہ ۱۶۶ھ میں خلیفہ مہدی نے اپنے بیٹے ہارون کو ہادی کے بعد ولی عہد مقرر کیا اور لوگوں سے ہارون کی ولی عہدی کے لیے بیعت لی اور ہارون کو رشید کا خطاب دیا۔ اسی سال مہدی نے بغداد سے مکہ، مدینہ اور یمن تک خچروں اور اونٹوں کی ڈاک بٹھائی تاکہ روزانہ ان مقامات سے اطلاعات آتی رہیں اور وہاں احکامات پہنچتے رہیں۔ اسی سال مہدی نے ابویوسف کو بصرہ کا قاضی مقرر کیا۔

سنہ ۱۶۷ھ میں عیسیٰ بن موسیٰ نے کوفے میں وفات پائی۔ اسی سال زندیقوں کا جابجا ظہور ہوا اور مہدی نے اول ان کو بحث مباحثہ کے ذریعہ سے ساکت کیا، پھر ان کے قتل پر آمادہ ہوگیا۔ جہاں زندیقوں کا پتہ سنا، وہیں ان کے استیصال کے درپے ہو گیا۔ علاقہ بصرہ میں مابین یمامہ و بحرین زندیقوں نے بڑا زور باندھا۔ مرتد ہو ہو کر نمازیں چھوڑ بیٹھے اور محرمات شرعی کا پاس ولحاظ اٹھا دیا اور لوٹ مار پر آمادہ ہوکر راستہ بند کر دیا۔ خلیفہ مہدی نے جابجا ان کا قتل عام کرایا اور اس طرح ان زندیقوں کے پیچھے پڑا کہ ان کی بیخ کنی ہی کر کے چھوڑی۔ مہدی کے کارہائے نمایاں میں زندیقوں کا استیصال بھی خصوصیت سے قابل تذکرہ ہے۔ اسی سال مہدی نے مسجد حرام میں توسیع کی اور ارد گرد کے مکانات خرید کر مسجد کے احاطہ میں شامل کر دیے۔

جرجان پر ہادی کی یورش:

سنہ ۱۶۷ھ میں خبر پہنچی کہ اہل طبرستان نے علمِ بغاوت بلند کیا ہے۔ خلیفہ نے ان کی سرکوبی کے لیے اپنے ولی عہد ہادی کو روانہ کیا۔ ہادی کے لشکر کا علمِ محمد بن جمیل کے ہاتھ میں تھا۔ ہادی نے طبرستان اور اس کے بعد جرجان میں امن وامان قائم کیا اور باغیوں کو قرار واقعی سزائیں دیں۔

سنہ ۱۶۸ھ میں رومیوں نے اس صلح کو جو مسلمانوں کے ساتھ کی تھی، میعاد صلح کے ختم ہونے سے چار مہینے پہلے توڑ ڈالا۔ علی بن سلیمان والی جزیرہ وقنسرین نے یہ خبر پا کر یزید بن بدر بن بطال کو ایک زبردست فوج دے کر قسطنطنیہ کی طرف روانہ کیا۔ یزید بن بدر وہاں سے بہت سا مال غنیمت

لے کر واپس آیا۔

وفات مہدی:

خلیفہ مہدی کو تجربہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہادی کے مقابلہ میں دوسرا بیٹا ہارون زیادہ قابل اور امور سلطنت کے انصرام کی زیادہ اہلیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے سنہ ۱۶۸ھ میں اس خیال کے پختہ ہونے کے بعد ارادہ کیا کہ ولی عہدی میں ہارون کو ہادی پر مقدم کر دے اور ہادی کو ولی عہدی سے معزول کر کے ہارون کو اس کی جگہ ولی عہد بنا کر لوگوں سے بیعت لے۔ ان دنوں ہادی جرجان ہی میں مقیم تھا۔ مہدی نے اس کی طلبی کے لیے قاصد روانہ کیا۔ اس نے یہ گستاخی و شوخ چشمی دکھائی کہ اس قاصد کو پٹوا کر نکلوا دیا اور باپ کے حکم کی تعمیل میں جرجان سے بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ یہ کیفیت دیکھ کر مہدی خود جرجان کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں مقام باسبذان میں پہنچا تھا کہ ۲۲ محرم سنہ ۱۶۹ھ مطابق اگست سنہ ۷۸۵ء میں انتقال کیا۔ ہارون رشید اس سفر میں باپ کے ساتھ تھا۔ اس نے جنازے کی نماز پڑھائی اور بھائی کے پاس جرجان میں وفات پدر کی خبر بھیجی۔ ہادی نے وہاں اہل لشکر سے اپنی خلافت کی بیعت لی۔ ہارون رشید لشکر کو لیے ہوئے بغداد کی طرف لوٹ آیا۔ یہاں آ کر لوگوں سے اپنے بھائی ہادی کی خلافت کی بیعت لی اور ایک گشتی اطلاع خلیفہ مہدی کے فوت ہونے اور ہادی کے خلیفہ ہونے کی تمام عمال کے پاس روانہ کر دی۔ بیس روز کے بعد ہادی جرجان سے روانہ ہو کر بغداد پہنچا اور تخت خلافت پر بیٹھ کر حاجب ربیع کو خلعت وزارت عطا کی۔ ربیع چند روز کے بعد فوت ہو گیا۔

خلیفہ مہدی عباسیوں میں نہایت نیک طینت، متقی، سخی، خوش مزاج، بہادر اور نیک دل خلیفہ تھا۔ اس نے اپنے باپ کے زمانے میں ان خون ریزیوں کو دیکھا جو علویوں کی ہوئی تھیں۔ وہ ان خون ریزیوں کو اچھا نہیں جانتا تھا۔ وہ اپنے نیک سلوک اور رفاہ رعایا کے کاموں میں کوشش کر کے لوگوں کے دل میں گھر کرنا قیام سلطنت کے لیے ضروری سمجھتا تھا اور خوف و جبر اور تشدد و قہر کو بالکل غیر ضروری جانتا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے ندیموں اور مصاحبوں کی مجلس میں بے تکلف بیٹھنا شروع کیا، ورنہ اس سے پہلے منصور کے عہد میں ندماء اور مصاحبین پردہ کی آڑ میں بیٹھتے تھے اور خلیفہ صرف ان کی آواز سنتا اور وہ خلیفہ کی آواز سنتے۔ آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔

خلیفہ مہدی نے اپنے دور حکومت میں اپنے حکم سے کسی ہاشمی کو قتل نہیں کرایا۔ اس نے قسم کھا لی تھی کہ میں ہاشمی کو قتل نہ کروں گا۔ وہ کشتنی وگردن زدنی ہاشمیوں کو بھی صرف قید کر دیا کرتا تھا۔ زنادقہ کا وہ جانی دشمن تھا اور کسی زندیق کو بغیر قتل کیے نہ چھوڑتا تھا۔

یعقوب بن فضل جو ہاشمی تھا، زندیق ہو گیا اور اس نے اپنے زندیق ہونے کا اقرار بھی کر لیا تھا۔ مہدی نے اس کو قید کر دیا اور اپنے ولی عہد ہادی سے کہا کہ جب تم خلیفہ ہو تو اس کو قتل کر دینا۔ میں اپنی قسم پر قائم رہنے کے سبب سے اس کو قتل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہادی نے خلیفہ ہوتے وقت اس کو قتل کیا۔ مہدی کو اتباع سنت رسول اللہ ﷺ کا بہت خیال تھا۔ اس نے وہ مقصورے جو مساجد میں خلفاء کے لیے بنائے جاتے تھے، خلاف سنت سمجھ کر سب تڑوا دیے۔ جن مسجدوں میں منبر نبی اکرم ﷺ کے منبر سے زیادہ بلند تھے، ان کو پست کرا دیا۔ وہ عبادت بھی بہت کرتا تھا۔ حلیم الطبع اور خوش گفتار تھا۔ اس کے دربار میں ہر شخص بلا روک ٹوک جا سکتا تھا۔ سلطنت کے کاموں میں نہایت مستعد اور ہوشیار تھا۔ وہ اپنے غلاموں اور خادموں کی عیادت کو بھی چلا جاتا تھا۔ بعض اوقات اس پر لوگوں نے قاضی کی عدالت میں دعوے دائر کیے اور وہ قاضی کی عدالت کے حکم نامہ کی تعمیل میں فریق مقدمہ کی حیثیت سے قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا اور عدالت کے فیصلے کو اپنے اوپر تعمیل کرایا۔ اس کے زمانہ کے مشہور عالم شریک اس کے پاس آئے۔ مہدی نے کہا کہ آپ کو تین باتوں میں سے ایک ضرور ماننی پڑے گی: یا تو آپ قاضی کا عہدہ قبول کریں یا میرے لڑکے کو پڑھائیں یا میرے ساتھ کھانا کھائیں۔ قاضی شریک نے سوچ کر کہا کہ ان سب میں کھانا کھانا سب سے زیادہ آسان ہے۔ چنانچہ دستر خوان پر انواع واقسام کے کھانے چنے گئے۔ جب کھانے سے فارغ ہو گئے تو شاہی باورچی نے کہا کہ بس آپ پھنس گئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے عہدہ قضا بھی منظور کیا اور مہدی کے لڑکوں کو بھی پڑھایا۔ مہدی جب کبھی بصرہ میں آتا تو پانچوں وقت کی نماز جامع مسجد میں پڑھایا کرتا۔ ایک روز لوگ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد ایک اعرابی آیا جس کو نماز

---

❶ سنداً یہ واقعہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کہتا ہے کہ ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ (النساء ٤: ١٠٣) ''بے شک نماز مومنوں پر اوقات مقررہ میں فرض ہے۔'' اور یہاں خلیفہ مہدی قرآن کریم سے واضح متصادم حکم دیتا ہے اور وہ بھی صرف ایک شخص کے لیے، پھر اس انداز میں کہ اس شخص کے آنے پر نماز کھڑی کی جائے! اور اس دور کے علماء حق بھی خاموش رہتے ہیں۔ یہ غلط اور عجیب سی بات ہے۔

با جماعت نہ ملی۔ اس نے مہدی سے کہا کہ میں نے ظہر کی نماز تیرے پیچھے پڑھنی چاہی تھی مگر ممکن نہ ہوا۔ مہدی نے حکم دیا کہ اس شخص کا ہر نماز میں انتظار کیا جائے۔ چنانچہ عصر کی نماز کے وقت مہدی محراب میں کھڑا ہوگیا اور جب تک وہ اعرابی نہ آ گیا، تکبیر اقامت کی اجازت نہ دی۔ لوگ یہ دیکھ کر اس کی وسیع الاخلاقی سے متعجب رہ گئے۔ سب سے پہلے مہدی نے بصرے میں اپنے ایک خطبہ کے اندر یہ آیت پڑھی ﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ...... ﴾[1] اس کے بعد خطیبوں نے اس آیت کو خطبوں کا جزو لاینفک قرار دے لیا۔

ہادی بن مہدی

ہادی بن مہدی بن منصور سنہ ۱۴۷ھ میں بمقام رے خیزران کے بطن سے پیدا ہوا۔ خیزران بربر کی رہنے والی ایک مغنیہ تھی جو مہدی کی مملوکہ تھی۔ جب اس کے پیٹ سے ہادی اور ہارون پیدا ہوئے تو مہدی نے اس کو آزاد کر کے اس کے ساتھ سنہ ۱۵۹ھ میں نکاح کر لیا تھا۔ خلیفہ ہادی نے تخت نشین ہو کر اپنے باپ کی وصیت کے موافق زنادقہ کی خوب خبر لی اور ان کے قتل و استیصال میں کمی نہیں کی۔ خلیفہ ہادی کے تخت نشینی کے وقت صوبوں اور ولایتوں کے حاکم اس طرح تھے کہ:

مدینہ منورہ میں عمر بن عبدالعزیز بن عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر بن خطاب، یمن میں ابراہیم بن مسلم بن قتیبہ، مکہ و طائف میں عبداللہ بن قسم، یمامہ و بحرین میں سوید قائد خراسانی، عمان میں حسن بن سلیم حواری، کوفہ میں موسیٰ بن عیسیٰ، بصرہ میں ابن سلیمان، جرجان میں خلیفہ ہادی کا آزاد کردہ غلام حجاج، قومس میں زیاد بن حسان، طبرستان میں صالح بن شیخ بن عمیرہ اسدی، موصل میں ہاشم بن سعید بن خالد۔ ہاشم کو ہادی نے اس کی کج خلقی کے سبب سے معزول کر کے عبدالملک بن صالح بن علی ہاشمی کو موصل کی حکومت پر مامور کیا تھا۔

حسین بن علی کا خروج:

حسین بن علی بن حسن مثلث بن حسن مثنیٰ بن علی بن ابی طالب اور حسن بن محمد بن عبداللہ بن حسن، اس کے چچا یحییٰ بن عبداللہ بن حسن اور دوسرے آل ابی طالب نے مل کر حکومت عباسیہ کے

---

[1] ''بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔'' (الاحزاب ۳۳: ۵۶)

خلاف خروج کی سازش کی تھی اور یہ بات قرار پائی تھی کہ سنہ ۱۶۹ھ کے موسم حج میں خروج کرنا چاہیے مگر ایام حج سے پہلے ہی مدینہ کے عامل عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے ان لوگوں کی کچھ ان بن ہوگئی اورانہوں نے خروج کر کے عامل مدینہ کے مکان کا محاصرہ کر کے حسین بن علی بن حسین مثلث کے ہاتھ پر بیعت کرنی شروع کی اوراہل مدینہ اس بیعت میں شامل ہونے لگے۔ اسی اثنا میں خالد یزیدی دوسوآدمیوں کی جمعیت کے ساتھ آ پہنچا۔ دوسری جانب سے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی محاصرہ سے نکل کراور ایک جماعت کو ہمراہ لے کر مسجد کی طرف جہاں حسین بن علی کے ہاتھ پر بیعت ہورہی تھی، آ پہنچا۔ جو لوگ مسجد میں موجود تھے، انہوں نے مقابلہ کیا۔ اس لڑائی میں خالد یزیدی، یحییٰ اورادریس پسران عبداللہ بن حسن کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کے مارے جاتے ہی سب کو شکست ہوئی اورحسین بن علی کی جماعت نے بیت المال کا دروازہ توڑ کر سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ اگلے دن بنو عباس کے حامیوں نے جمع ہوکر پھر مقابلہ کیا۔ کئی روز تک مدینہ میں لڑائی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر حسین بن علی نے سب کو خارج کر کے مدینہ پر مکمل قبضہ حاصل کیا۔ اکیس روز تک مدینہ میں قیام کر کے مکہ کی جانب کوچ کیا۔ مکہ مکرمہ میں پہنچ کر منادی کرادی کہ جو غلام ہمارے پاس آئے گا، ہم اس کو آزاد کردیں گے۔ یہ سن کر غلاموں کا ایک گروہ حسین بن علی کے گرد فراہم ہوگیا۔

اسی سال سلیمان بن منصور، محمد بن سلیمان بن علی، عباس بن محمد بن علی، موسیٰ واسماعیل پسران عیسیٰ بن موسیٰ وغیرہ عباسی خاندان کے چند آدمی حج کے لیے آئے تھے۔ ان لوگوں کے روانہ ہونے کے بعد ہادی کے پاس حسین بن علی کے خروج کی خبر پہنچی۔ ہادی نے فوراً محمد بن سلیمان کو ایک خط لکھا کہ تم اپنے تمام ہمراہیوں کو لے کر حسین بن علی کا مقابلہ کرو۔ محمد بن سلیمان اپنے ساتھ کچھ فوج بھی لایا تھا۔ محمد بن سلیمان نے مقام ذی طویٰ میں سب کو فراہم کر کے لشکر کو باقاعدہ مرتب کیا اور مکہ مکرمہ میں پہنچ کر عمرہ ادا کیا۔ وہاں مختلف صوبوں اور ملکوں سے جو سرداران عباسیہ حج کے لیے آئے تھے، وہ سب محمد بن سلیمان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ یوم الترویہ کو مقام فخ میں صف آرائی و جنگ آزمائی کی نوبت پہنچی۔ بہت سے آدمی مارے گئے۔ آخر حسین بن علی کو شکست حاصل ہوئی اوران کے ہمراہی فرار ہوگئے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص حسین بن علی کا سر لے کر آیا۔ ان کے ہمراہیوں کے قریباً ایک سو سر جمع کیے گئے۔ انہیں میں سلیمان برادر محمد مہدی کا سر بھی تھا۔ ہزیمت یافتہ لوگ میدان سے بھاگ

کر حجاج میں شامل ہو گئے۔ ادھر محمد بن سلیمان نے امان کی منادی کرا دی تھی۔ حسن بن محمد بن عبداللہ امان کی منادی کے بعد گرفتار ہوا۔ اس نے موسیٰ بن عیسیٰ کے مال واسباب کو ضبط کر لیا۔ اس لڑائی میں ادریس بن عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب برادر محمد مہدی بھی بچ کر نکل گیا تھا۔ وہ وہاں سے فرار ہو کر مصر پہنچا۔ وہاں صالح بن منصور کا آزاد کردہ غلام واضح محکمہ ڈاک کا افسر تھا۔ اس کو آل ابی طالب کے ساتھ ہمدردی تھی۔ اس نے ادریس کو تیز رفتار گھوڑے پر سوار کرا کر بلاد مغرب کی طرف روانہ کر دیا۔ وہاں ادریس شہر دلیلہ مضافات طنجہ میں پہنچا اور بربریوں کو دعوت دینی شروع کی۔ اس کی اولاد کا حال آئندہ جداگانہ بیان ہوگا۔ چند روز کے بعد خلیفہ ہادی کو اس بات کی اطلاع ہوئی کہ واضح نے ادریس کو مغرب کی طرف بھگا دیا ہے۔ چنانچہ ہادی نے واضح اور اس کے ہمراہیوں کو گرفتار کرا کر قتل کرا دیا۔ ادریس بن عبداللہ کا دوسرا بھائی یحییٰ بن عبداللہ مقام فخ سے فرار ہو کر دیلم پہنچا۔

ہادی کی وفات:

ہادی نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی یہ کوشش شروع کی کہ اپنے بھائی ہارون کو ولی عہدی سے معزول کر کے اپنے بیٹے جعفر کو ولی عہد بنائے۔ یحییٰ بن خالد بن برمک، ہارون رشید کا اتالیق و مدارالمہام تھا۔[1] اس نے خلیفہ ہادی کو سمجھانے اور اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ کئی مرتبہ یحییٰ اپنی کوشش میں کامیاب ہو کر ہادی کو اس ارادے سے باز رکھ سکا لیکن ہادی کے دوسرے مصاحب اس کو بار بار اس بات پر آمادہ کرتے رہے کہ وہ ہارون کو معزول کر کے اپنے بیٹے جعفر کو ولی عہد بنائے۔ یحییٰ نے ہادی کو سمجھایا تھا کہ آپ کا بیٹا جعفر ابھی نابالغ ہے۔ اگر آپ آج فوت ہو جائیں تو امرائے سلطنت اس چھوٹے بچے کی خلافت وحکومت کو ہرگز تسلیم نہ کریں گے اور فسادات پیدا ہو جائیں گے۔ ہارون کو آپ کے باپ مہدی نے آپ کے بعد ولی عہد مقرر کیا تھا۔ آپ ہارون کے بعد جعفر کو ولی عہد بنا دیں تو پھر کوئی اندیشہ اور خطرہ باقی نہ رہے گا۔ آپ کی زندگی میں جعفر جس وقت بالغ ہو جائے گا اور اپنی قابلیت کا اظہار کرے گا تو میں ہارون کو اس بات پر رضامند کر دوں گا کہ وہ اپنے حق ولی عہدی سے جعفر کے حق میں دست بردار ہو جائے۔ ان باتوں سے

---

[1] وزیراعظم۔

ہادی کی تشفی ہوگئی تھی مگر امرائے سلطنت جو ہارون کے مخالف تھے، ہادی کو بار بار آمادہ کرتے رہے۔ آخر ہارون پر تشدد کیا گیا۔ یحییٰ نے اس ارادے سے مطلع ہو کر ہارون کو مشورہ دیا کہ وہ شکار کے بہانے سے کہیں چلا جائے اور ہادی سے دور دور رہے۔

چنانچہ ہارون شکار کے لیے اجازت حاصل کر کے قصر مقاتل کی طرف چلا گیا۔ ہادی نے اس کو واپس بلوایا تو اس نے بیماری کا حیلہ کیا اور حاضر نہ ہوا۔ انہیں ایام میں ایک یہ واقعہ پیش آیا کہ ہادی نے اپنی ماں خیزران کو امور سلطنت میں دخل دینے سے بالکل روک دیا اور اس کے ان اختیارات کو جو مہدی کے زمانے سے حاصل تھے، بالکل ضبط کر لیا۔ ماں بیٹوں کی اس کشیدگی نے ایسی ناگواری کی صورت اختیار کر لی کہ ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ خیزران کو جب یحییٰ کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوا کہ ہادی اپنے بیٹے جعفر کی ولی عہدی کے لیے ہارون کی جان کا دشمن ہو گیا ہے تو وہ ہارون کی محبت میں اور بھی زیادہ ہادی کی دشمن بن گئی اور اب بجائے ایک یحییٰ کے دوسری خیزران بھی ہارون کی حامی بن گئی۔ جب ہارون نے ہادی کی خدمت میں حاضر ہونے سے انکار کیا تو اس کے بعد ہادی خود بلاد موصل کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں سے واپسی میں ہارون بھی اس کے ساتھ تھا۔ راستے میں ہادی بیمار ہوا اور تین دن بیمار رہ کر شب یک شنبہ ۱۴ ربیع الاول سنہ ۱۷۰ھ مطابق سنہ ۷۸۷ء مقام عیسیٰ باد قریباً سوا برس حکومت کر کے وفات پائی۔ ہادی کے اس طرح یکا یک فوت ہو جانے سے لوگوں کو یہ خیال کرنے کا موقع ملا کہ خیزران نے ہادی کو اپنی ایک لونڈی کے ذریعہ سے زہر دلوا کر مروا ڈالا تھا۔ چونکہ ہادی بیمار تھا، اس لیے زہر خورانی کا واقعہ افشا نہ ہونے پایا۔ یحییٰ بن خالد اس کام میں خیزران کا مشیر اور شریک کار تھا، واللہ اعلم بالصواب۔

ہادی نے بغداد سے جرجان تک ڈاک بٹھائی تھی۔ ہادی سخی، خوش مزاج اور کسی قدر ظلم پسند تھا۔ سلطنت کے کاموں سے بے پرواہ نہ تھا۔ تنومند اور سپاہی منش تھا۔ اس کی عمر بہت کم اور خلافت کا زمانہ بہت ہی تھوڑا تھا۔ اس لیے اس کے اخلاق کا اچھی طرح اظہار نہیں ہو سکا۔

ابوجعفر ہارون الرشید بن مہدی

ابوجعفر ہارون الرشید بن مہدی بن منصور بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس سنہ ۱۴۸ھ میں

بمقام رے خیزران کے بطن سے پیدا ہوا۔ ایک ہفتہ پہلے یحییٰ بن خالد کا بیٹا فضل بن یحییٰ پیدا ہوا تھا۔ ہارون کی ماں خیزران نے فضل کو اور فضل کی ماں نے ہارون کو دودھ پلایا تھا۔ ہارون الرشید شب یک شنبہ ۱۴ ربیع الاول سنہ ۱۷۰ھ کو اپنے بھائی کے مرنے پر تخت خلافت پر بیٹھا۔ اسی شب اس کا بیٹا مامون پیدا ہوا۔ یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ایک ہی رات میں ایک خلیفہ فوت ہوا، دوسرا تخت نشین ہوا اور تیسرا خلیفہ پیدا ہوا۔ ہارون الرشید کی کنیت پہلے ابوموسیٰ تھی لیکن بعد میں ابوجعفر ہوگئی۔ ہارون الرشید کشیدہ قامت اور خوبصورت آدمی تھا۔

ہارون الرشید نے تخت نشین ہوتے ہی یحییٰ بن خالد برمک کو وزیراعظم بنایا اور قلمدان وزارت کے ساتھ خاتم خلافت اس کے سپرد کر کے تمام مہمات سلطنت میں مختار کل بنا دیا۔ خیزران جو ہادی کے زمانے میں انتظامات سلطنت سے بے تعلق اور معطل کردی گئی تھی، اب یحییٰ بن خالد کے ساتھ مل کر پھر سلطنت کے کام انجام دینے لگی۔ یحییٰ اور خیزران کے اختیارات کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ ہارون الرشید خود سلطنت کے کاموں سے بے خبر اور بے تعلق تھا بلکہ ہارون الرشید کو یحییٰ اور خیزران کی عزت افزائی مقصود تھی اور وہ ان کو اپنا حقیقی خیر خواہ یقین کرتا اور ان کے ہر ایک مشورہ کو قابل اعتماد جانتا اور یحییٰ سے مشورہ لیے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔ ایک بائیس تیئیس سال کے نوجوان خلیفہ کی یہ انتہائی قابلیت اور دانائی سمجھنی چاہیے کہ اس نے وزارت کے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا جو اس عہدہ جلیلہ کے لیے بے حد موزوں اور مناسب تھا۔

تخت خلافت پر متمکن ہونے کے بعد ہارون الرشید کے عمال نے عزل ونصب اور تغیر وتبدل سے نظام حکومت کو پہلے سے زیادہ مستحکم ومضبوط بنانے کی کوشش کی۔ عمر بن عبدالعزیز عمری کو مدینہ منورہ کی گورنری سے معزول کر کے اسحاق بن سلیمان کو مقرر کیا۔ افریقہ کی گورنری پر روح بن حاتم کو بھیجا۔ سرحدی علاقے کو جزیرہ اور قنسرین سے جدا کر کے ایک الگ صوبہ عواصم کے نام سے بنایا۔ خلافت کے پہلے ہی سال جب حج کا موسم آیا تو حج کرنے کے لیے گیا۔ حرمین شریفین میں اس نے اپنی سخاوت اور دریا دلی کا خوب اظہار کیا۔

سنہ ۱۷۱ھ میں بنو تغلب کے زکوٰۃ وصدقات کی وصولی پر روح بن صالح ہمدانی کو مامور کیا۔ روح اور بنی تغلب میں مخالفت ہوگئی۔ روح نے بنی تغلب کی سرکوبی کے لیے لشکر فراہم کیا۔ بنی تغلب نے روح پر شب خون مارا اور اس کو قتل کردیا۔

ادریس بن عبداللہ کا ذکر اوپر آ چکا ہے کہ وہ ہادی کے عہد خلافت میں جنگ فخ سے فرار ہو کر بلاد مغرب کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ وہاں انہوں نے بربریوں میں اپنی امامت کی دعوت شروع کی اور سنہ۱۷۲ھ میں شہر دلیلہ کے اندر خروج کر کے علانیہ لوگوں سے بیعت لی اور ملک مراقش میں اپنی سلطنت قائم کر لی۔ یہ علویوں کی سب سے پہلی حکومت تھی جو مراقش میں قائم ہوئی۔ عالم اسلامی میں اندلس کا ملک خلافت عباسیہ سے نکل گیا۔ ہارون الرشید نے اس خبر کو سن کر سلیمان بن جریر المعروف بہ شماخ کو جو اس کا غلام تھا، مراقش کی جانب تنہا روانہ کیا کہ ادریس بن عبداللہ کا کام تمام کر کے آئے۔ چنانچہ شماخ نے وہاں پہنچ کر ادریس بن عبداللہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ہارون الرشید کی برائیاں بیان کر کے ادریس کی خدمت میں تقرب حاصل کر لیا اور موقع کا منتظر رہا۔ چنانچہ سنہ۱۷۷ھ میں زہر کے ذریعہ سے ادریس بن عبداللہ کا کام تمام کر کے واپس چلا آیا مگر اس سلطنت کا جو ادریس نے قائم کی تھی، سلسلہ اس طرح قائم رہا کہ ادریس بن عبداللہ کی وفات کے بعد ان کی کسی کنیز کے پیٹ سے لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام بھی بربریوں نے ادریس ہی رکھا اور پھر اس کو اپنا امام بنایا۔ ادریسی سلطنت کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ چند روز کے بعد علاقہ تونس میں بھی حکومت عباسیہ براہ راست قائم نہ رہی بلکہ وہاں بھی ایک جدا حکومت قائم ہو کر برائے نام خلافت عباسیہ کی سیادت باقی رہ گئی تھی۔ اس طرح کافی مغربی حصہ حکومت عباسیہ سے خارج ہو گیا۔

سنہ۱۷۳ھ میں محمد بن سلیمان گورنر بصرہ نے وفات پائی۔ ہارون الرشید نے اس کے مال واسباب کو ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیا۔ اس سے پیشتر محمد بن سلیمان کے حقیقی بھائی جعفر بن سلیمان نے مسلمانوں کے شوق اور مال غنیمت کو غصب کر کے بہت سا مال جمع کر لیا۔ اب جبکہ محمد بن سلیمان کی وفات کے بعد جعفر اس کے ترکہ کا مدعی ہوا تو ہارون الرشید نے اسحاق بن سلیمان کو سندھ ومکران کی حکومت پر مامور کیا اور یوسف بن امام ابو یوسف کی زندگی میں عہدہ قضا پر مامور کیا۔

امین کی ولی عہدی:

ہارون الرشید کے بیٹے مامون الرشید کی پیدائش کا ذکر تو اوپر آ چکا ہے کہ ہارون الرشید کی تخت نشینی کے وقت سنہ۱۷۰ھ میں پیدا ہوا تھا مگر مامون الرشید مراجل نامی ام ولد کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا جو مجوسی النسل تھی۔ اسی سال یعنی سنہ۱۷۰ھ میں اس کا دوسرا بیٹا محمد امین اس کی بیوی زبیدہ خاتون

بنت جعفر بن منصور بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ امین کا اتالیق فضل بن یحییٰ بن خالد بن برمک اور مامون کا اتالیق جعفر بن یحییٰ بن خالد بن برمک تھا۔ فضل کی خواہش یہ تھی کہ ہارون الرشید اپنے بیٹے امین کو ولی عہد بنائے اور جعفر اس کوشش میں تھا کہ مامون ولی عہد ہو۔ چونکہ امین ہاشمیہ کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، نیز فضل کے ساتھ زبیدہ خاتون کی کوششیں بھی شامل تھیں جو ہارون الرشید کی بڑی چہیتی بیوی تھی، لہٰذا سنہ ۱۷۵ھ میں جبکہ امین کی عمر صرف پانچ برس کی تھی، ہارون الرشید نے لوگوں سے امین کی ولی عہدی کی بیعت لی۔ اسی سنہ ۱۷۵ھ میں ہارون الرشید نے عباس بن جعفر بن محمد بن اشعث کو خراسان کی گورنری سے معزول کر کے خالد بن عطاء کندی کو مامور کیا۔

یحییٰ بن عبداللہ کا خروج:

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ادریس اور یحییٰ پسران عبداللہ بن حسن برادران محمد مہدی نفس زکیہ جنگ فخ سے فرار ہو گئے تھے۔ ادریس نے بلاد مغرب میں جا کر مراقش پر قبضہ کیا، جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ یحییٰ بن عبداللہ نے دیلم میں خلافت عباسیہ کے خلاف خروج کیا۔ لوگوں نے ہر چہار سمت سے آ آ کر بیعت کرنی شروع کی اور بہت بڑی زبردست طاقت ان کو حاصل ہو گئی۔ ہارون الرشید اس خبر کو سن کر بہت گھبرایا اور پچاس ہزار زبردست فوج کے ساتھ فضل بن یحییٰ کو اس فتنہ کے فرو کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ساتھ ہی فضل بن یحییٰ کو جرجان، طبرستان اور رے وغیرہ کی سند گورنری بھی دے دی۔ فضل بن یحییٰ نے بغداد سے روانہ ہو کر اور طالقان میں پہنچ کر یحییٰ بن عبداللہ کے نام ایک خط لکھا جس میں خلیفہ وقت کی طاعت وعظمت سے ڈرایا اور صلح کر لینے کی حالت میں انعام و جاگیر کی توقع دلائی۔ یحییٰ نے اس کے جواب میں لکھا کہ مجھ کو اس شرط سے صلح منظور ہے کہ ہارون الرشید اپنے قلم سے صلح نامہ لکھے اور اس پر علمائے قضاۃ اور سرداران بنو ہاشم کے دستخط بطور گواہ ثبت ہوں۔ فضل بن یحییٰ نے ان تمام حالات سے ہارون الرشید کو اطلاع دی۔ ہارون الرشید بہت خوش ہوا اور اپنے ہاتھ سے صلح نامہ لکھ کر اور اس پر مندرجہ شرط کے موافق دستخط کرا کر مع تحائف و ہدایا فضل کے پاس بھیج دیا۔ فضل نے یحییٰ بن عبداللہ کے پاس یہ صلح نامہ بھیجا۔ چنانچہ یحییٰ اور فضل دونوں بغداد کی طرف روانہ ہوئے۔ اس صلح میں والی دیلم کو بھی جس نے اپنے قلعہ میں یحییٰ بن عبداللہ کو قیام پذیر

ہونے کا موقع دیا تھا اور ہر طرح ان کا معین و مددگار تھا، دس لاکھ روپیہ اس شرط پر دینا طے کیا گیا تھا کہ وہ عبداللہ کو صلح پر آمادہ کر دے۔ چنانچہ وہ رقم اس کے پاس بھجوا دی گئی۔ یحییٰ اور فضل جب بغداد میں پہنچے تو ہارون الرشید نے نہایت عزت اور تپاک کے ساتھ یحییٰ بن عبداللہ سے ملاقات کی۔ جاگیر مقرر کی، انعامات دیے اور اس کام کے صلہ میں فضل بن یحییٰ کے مرتبہ میں بھی اضافہ کیا گیا اور یحییٰ بن عبداللہ کو فضل بن یحییٰ کے سپرد کیا گیا کہ تم ہی ان کو اپنے پاس رکھو۔ چنانچہ یحییٰ بن عبداللہ آرام سے فضل بن یحییٰ کی نگرانی میں زندگی بسر کرنے لگے اور بغداد میں رہنے لگا۔

سنہ۱۷۶ھ میں ہارون الرشید کے پاس خبر پہنچی کہ مصر کا گورنر موسیٰ بن عیسیٰ دعوت علویہ سے متاثر ہے اور وہ انقلاب خلافت کی تدابیر میں مصروف ہے۔ ہارون الرشید نے ملک مصر کی گورنری کا انتظام جعفر بن یحییٰ برمکی کے سپرد کیا۔ جعفر نے عمر بن مہران کو جس کی کنیت ابوحفص تھی، مصر کی گورنری کے لیے تجویز کیا۔ اس نے اس شرط پر مصر کی گورنری منظور کی کہ میں جب ملک مصر کے کاموں کا انتظام کر چکوں اور خراج مصر کا بقایا سب وصول کر کے داخل خزانہ کر دوں تو پھر مصر سے واپسی میرے اختیار میں رہے کہ جب چاہوں واپس چلا آؤں، اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ ہارون الرشید نے اس شرط کو منظور کر کے سندھ گورنری عمر بن مہران کو لکھ دی۔ اس نے مصر میں جا کر موسیٰ بن عیسیٰ سے چارج لیا اور چند روز میں تمام بقایا وہاں کے لوگوں سے وصول کر کے بغداد واپس چلا آیا اور مصر کی گورنری پر ہارون نے اسحاق بن سلیمان کو روانہ کیا۔

ملک شام میں بدامنی:

سنہ۱۷۶ھ میں ملک شام کے اندر صفریہ و یمانیہ قبائل کی خانہ جنگی نے ترقی کر کے خطرناک صورت اختیار کی۔ دمشق کا گورنر عبدالصمد بن علی اس خانہ جنگی کو فرو کرنے میں ناکام رہا تو ہارون الرشید نے عبدالصمد کو معزول کر کے ابراہیم بن صالح کو مصر کی گورنری پر مامور کیا مگر ابراہیم بن صالح نے یمانیہ قبائل کی در پردہ اعانت وحمایت کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرصہ دراز تک یہ فتنہ فرو نہ ہوا اور قبائل مضر نے دمشق پر قبضہ کر کے کئی مرتبہ حاکم دمشق کو بے دخل اور معطل کیا۔ آخر مجبور ہو کر ہارون الرشید نے جعفر بن یحییٰ برمکی کو شام کی طرف روانہ کیا اور سنہ۱۸۰ھ میں جعفر برمکی اس فساد کو فرو کرنے کے بعد دارالخلافہ بغداد میں واپس آیا۔

اسی سال یعنی سنہ ۱۷۶ھ میں افواج صائفہ کے سردار عبدالرحمٰن بن عبدالملک بن صالح نے رومیوں کے شہر دیسہ کو فتح کیا اور رومی لشکر کو کئی شکستیں دیں۔

عطاف بن سفیان کی بغاوت:

سنہ ۱۷۷ھ میں عطاف بن سفیان ازدی نے علمِ بغاوت بلند کر کے موصل اور اس کی نواحی ولایتوں پر قبضہ کر لیا اور گورنر موصل کو دارالامارت میں محصور و محبوس کر کے چار ہزار جنگ آوروں کو لے کر خراج وصول کرنا شروع کر دیا۔ یہ حالات سن کر ہارون خود بغداد سے فوج لے کر اس طرف گیا۔ عطاف آرمینیا کی طرف بھاگ گیا۔ ہارون نے موصل کی شہر پناہ کو منہدم کرا دیا اور بغاوت مصر اور بغاوت خراسان کی خبر سن کر فوراً بغداد واپس چلا آیا۔ عطاف آرمینیا سے شہر رقہ میں واپس چلا آیا اور یہیں سکونت اختیار کر کے خاموش زندگی بسر کرنے لگا۔ اسی سال عبدالرزاق بن حمید ثعلبی نے بلاد روم پر فوج کشی کی اور رومیوں کو سزا دے کر واپس آیا۔

بغاوت مصر:

سنہ ۱۷۷ھ کے آخر میں خبر پہنچی کہ مصر میں بعض قبائل سرکشی پر آمادہ ہیں۔ مصر کے گورنر اسحاق بن سلیمان نے اس بغاوت کے روکنے کی کوشش کی مگر سنہ ۱۷۸ھ میں باغیوں نے علمِ بغاوت بلند کر کے میدان میں نکل کر اسحاق بن سلیمان کو شکست دی۔ اس زمانہ میں ہرثمہ بن امین فلسطین کا عامل تھا۔ ہارون الرشید نے ہرثمہ کو لکھا کہ تم فوج لے کر مصر کی بغاوت فرو کرنے کے لیے جاؤ۔ ہرثمہ بن امین نے مصر میں جا کر باغیوں کو مغلوب و منقاد کیا۔ ہارون الرشید نے مصر کی گورنری ہرثمہ بن امین کو عطا کی مگر پھر ایک ہی مہینہ کے بعد ہرثمہ بن امین کو مصر کی حکومت سے برطرف کر کے عبدالملک بن صالح کو مصر کی حکومت سپرد کی۔

فتنہ خوارج:

جس زمانہ میں مصر، شام اور موصل وغیرہ میں بغاوتیں ہو رہی تھیں، اسی زمانے میں خراسان کے اندر قیس بن ثعلبہ کے آزاد غلام حصین خارجی نے علمِ بغاوت بلند کر کے بدامنی پھیلا رکھی تھی۔ خراسان کے گورنر خالد بن عطاء کندی نے داؤد بن یزید کو سیستان کا عامل بنایا تھا۔ اس نے عثمان بن عمارہ کو حصین خارجی کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ حصین نے اس کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اس کے بعد

باذغیس کو بوسنج اور ہرات کو لوٹ مار سے غارت کیا۔ اس کے بعد خالد کندی نے بارہ ہزار کا لشکر حصین کی گرفتاری پر مامور کیا۔ حصین نے صرف چھ سو آدمیوں سے اس بارہ ہزار کے لشکر کو شکست فاش دی اور برابر فساد و بدامنی پھیلاتا رہا۔ بارہا لڑائیاں ہوئیں مگر ہر لڑائی میں حصین نے لشکر خراسان کو شکست دی۔ آخر سنہ ۱۷۸ھ کے ابتدائی ایام میں حصین خارجی کے قتل ہونے سے خراسان میں امن وامان قائم ہوا۔ اسی سال یعنی سنہ ۱۷۸ھ میں زفر بن عاصم نے بلاد روم پر فوج کشی کی۔

سنہ ۱۷۹ھ کے ماہ رمضان میں خلیفہ ہارون الرشید نے عمرہ ادا کیا اور اسی احرام سے حج کیا۔ مکہ مکرمہ سے عرفات تک پیادہ سفر کیا۔ اسی سال امام مالک بن انس رحمہ اللہ نے ۷ ربیع الثانی کو بہ عمر ۸۴ سال وفات پائی اور اسی سال یعنی ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۷۹ھ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بیٹے حماد نے وفات پائی۔

سنہ ۱۸۰ھ میں ماوراء النہر کی طرف ترکوں اور مغلوں پر جہاد کرنے کے لیے فوجیں روانہ کی گئیں اور خراسان کی گورنری پر علی بن عیسیٰ بن ہامان کو مامور کیا گیا۔ اس تقرر کو ہارون الرشید کے وزیراعظم یحییٰ بن خالد بن برمک نے ناپسند کیا اور علی بن عیسیٰ کی سخت مزاجی کی طرف توجہ دلائی مگر ہارون نے یحییٰ کے مشورے کو نہیں مانا اور علی بن عیسیٰ کو خراسان روانہ کر دیا۔ یحییٰ بن خالد کو فطرتاً یہ بات پسند نہ تھی کہ اہل خراسان پر جو اس کا آبائی وطن تھا، ظلم و تشدد ہو۔ ادھر خراسان کی آئے دن کی بغاوتیں مجبور کرتی تھیں کہ ہارون کسی سخت گیر شخص کو خراسان کی حکومت سپرد کرے۔ اسی سال یعنی سنہ ۱۸۰ھ میں سخت زلزلہ آیا، جس کے صدمہ سے اسکندریہ کے مینار گر پڑے۔ اسی سال ہشام بن عبدالرحمٰن سلطان اندلس کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا سلطان الحکم تخت نشین ہوا۔ اسی سال ابوبشر عمرو بن عثمان ملقب بہ سیبویہ جو علم نحو کا امام اور شہر بیضا (بلاد فارس) کا رہنے والا تھا، چالیس سال سے کچھ زیادہ کی عمر میں فوت ہوا۔

سنہ ۱۸۱ھ میں خلیفہ ہارون الرشید نے خود بلاد روم پر فوج کشی کی اور قلعہ صفصاف کو بہ زور شمشیر فتح کیا۔ اسی سال عبدالملک بن صالح نے انقرہ تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ اسی سال رومیوں اور مسلمانوں میں اس بات کی تحریک شروع ہوئی کہ رومی اپنے قیدیوں کو مسلمانوں کی قید سے آزاد کرا لیں اور اس کے معاوضہ میں مسلمانوں کو جو ان کی قید میں ہیں، آزاد کر دیں۔ دولت عباسیہ کی یہ سب سے پہلی صلح رومیوں کے ساتھ ہوئی۔ مقام لامس سے جو طرسوس سے بارہ فرسنگ کے فاصلے پر تھا،

علماء واعیان سلطنت اور تیس ہزار فوج مع باشندگان سرحد جمع ہوئے۔ والی طرسوس بھی آیا اور ہارون الرشید کے بیٹے قاسم المعروف بہ موتمن کے زیر اہتمام ایک بڑی شاندار مجلس منعقد ہوئی۔ رومی مسلمان قیدیوں کو جن کی تعداد تین ہزار سات سو تھی، لے کر آئے۔ ان کے معاوضہ میں موتمن نے عیسائی قیدیوں کو ان کے سپرد کر دیا۔ اسی سال ہرثمہ بن اعین افریقہ کی گورنری سے مستعفی ہو کر بغداد آیا اور ہارون الرشید کے رکابی دستہ فوج کا افسر مقرر ہوا اور محمد بن مقاتل بن حکیم افریقہ کی گورنری پر بھیجا گیا۔

مامون کی ولی عہدی:

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ہارون الرشید نے سنہ ۱۷۵ھ میں اپنے بیٹے امین بن زبیدہ خاتون کو ولی عہد بنایا تھا۔ اس وقت امین اور مامون دونوں کی عمر پانچ پانچ سال کی تھی۔ ایسی چھوٹی عمر میں آج تک کوئی ولی عہد کسی مسلمان فرماں روا نے نہیں بنایا تھا۔ اب ہارون نے سنہ۱۸۲ھ میں اپنے بیٹے مامون بن مراجل کو جبکہ اس کی عمر بارہ سال کی تھی، ولی عہد بنایا یعنی لوگوں سے اس بات کی بیعت لی کہ امین کے بعد مامون تخت خلافت کا مالک ہو گا۔ مامون کا اصل نام عبداللہ اور امین کا اصل نام محمد تھا۔ جب محمد کو سنہ ۱۷۵ھ میں ولی عہد بنایا تھا تو اس کو امین کا خطاب دیا تھا اور اب جب عبداللہ کو ولی عہد دوم مقرر کیا تو اس کو مامون کا خطاب دیا اور خراسان نیز اس کے ملحقہ علاقہ یعنی ہمدان تک کی سند گورنری مامون کو عطا کی۔ عیسیٰ بن علی گورنر خراسان کو طلب کیا۔ جب وہ آ گیا تو مامون کی طرف سے اس کو خراسان کی حکومت کی سند دے کر خراسان کی جانب واپس کر دیا۔ اسی سال یعنی ۲۷ رجب سنہ۱۸۲ھ کو امام ابو یوسف نے جن کا نام یعقوب تھا اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد اور بغداد کے رئیس القضاۃ تھے، وفات پائی۔

وہب بن عبداللہ نسائی اور حمزہ خارجی کا خروج:

جبکہ عیسیٰ بن علی مامون الرشید کی تقریب ولی عہدی کے سلسلہ میں بغداد کی طرف آیا تو ابوخصیب وہب بن عبداللہ نسائی نے علم بغاوت بلند کر کے خراسان میں لوٹ مار شروع کر دی۔ جب عیسیٰ بن علی نے واپس جا کر اس کا تعاقب کیا تو وہب نے خائف ہو کر امان طلب کی۔ چنانچہ اس کو امان دے دی گئی اور وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ اس واقعہ کے بعد ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ بلاد باذغیس

میں حمزہ بن اترک خارجی نے خروج کیا ہے اور شہروں پر قبضہ کرتا جاتا ہے۔ ہرات میں ان دنوں عمرو یہ بن یزید ازدی عامل تھا۔ اس نے چھ ہزار سواروں کی جمعیت لے کر حمزہ پر حملہ کیا۔ حمزہ نے اس کو شکست دے کر اس کے بہت سے سواروں کو قتل کر ڈالا اور اسی ہنگامہ میں عمرو یہ بھی کچل کر مر گیا۔ یہ سن کر علی بن عیسیٰ نے اپنے لڑکے حسن بن علی کو دس ہزار فوج دے کر حمزہ کے مقابلہ کو روانہ کیا مگر حسن نے حمزہ کا مقابلہ نہ کیا۔ تب علی بن عیسیٰ نے اپنے دوسرے بیٹے عیسیٰ بن علی کو مامور کیا۔ مقابلہ ہوا اور حمزہ نے عیسیٰ بن علی کو شکست دے کر بھگا دیا۔ علی بن عیسیٰ نے عیسیٰ بن علی کو دوبارہ تازہ دم فوج دے کر پھر حمزہ کے مقابلے پر بھیجا۔ مقام نیشاپور میں معرکہ کارزار گرم ہوا۔ اس معرکہ میں حمزہ شکست کھا کر قہقستان کی طرف گیا۔ عیسیٰ بن علی نے ادق، جوین اوران قصبات ودیہات کی طرف اپنے لشکریوں کو متعین کیا جو حمزہ کی مدد کر رہے تھے اور نہایت بے رحمی سے چن چن کر خوارج کو قتل کیا، یہاں تک کہ تیس ہزار آدمی اس طرح مارے گئے۔ اس کے بعد عیسیٰ نے مقام زرنج میں عبداللہ بن عباس نسفی کو مال غنیمت جمع کرنے کے لیے چھوڑ کر خود کابل وزابلستان تک بڑھتا چلا گیا۔ ابوخصیب وہب بن عبداللہ جو شہر نسا میں امان طلب کرنے کے بعد خاموش بیٹھا تھا، میدان خالی دیکھ کر عہد شکنی پر مستعد ہو گیا اور باغیوں کا ایک کثیر گروہ اپنے گرد جمع کر کے اجیورو، نسا، طوس اور نیشاپور پر قابض ہو گیا۔ ادھر حمزہ نے اپنی مختصر جمعیت سے گاؤں اور قصبوں پر چھاپے مارنے اور راستے لوٹنے شروع کر دیے۔ غرض حمزہ اور وہب نے چار سال تک علی بن عیسیٰ اور اس کے ہمراہیوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ اس عرصہ میں بعض اوقات ابوخصیب نے مرو کا بھی محاصرہ کیا۔ آخر سنہ ۱۸۷ھ میں وہب کے مارے جانے سے خراسان میں امن وامان قائم ہوا اور علی بن عیسیٰ نے اہل خراسان پر سختی وتشدد شروع کیا۔

اسی سال سنہ ۱۸۲ھ میں عبدالرحمٰن بن عبدالملک بن صالح صائفہ کے ساتھ بہ غرض جہاد بلاد روم کی طرف روانہ ہوا۔ اسی زمانہ میں رومیوں نے اپنے بادشاہ قسطنطین کی وفات کے بعد اس کی ماں ملکہ رومی کو عطشہ کے لقب سے تخت نشین کیا۔ ہارون الرشید کے رعب واقتدار کا جو دربار قسطنطنیہ پر چھایا ہوا تھا، یہ نتیجہ ہوا کہ اس رومی ملکہ نے صلح کا سلسلہ جنبانی شروع کیا اور اسلامی سرداروں کے پاس پیغامات بھیج کر ان کو صلح کی جانب مائل کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ فرانس کا بادشاہ شارلمین اٹلی کا ملک فتح کر چکا تھا اور مغربی روم پر قابض ہو کر مشرقی روم یعنی سلطنت قسطنطنیہ پر بھی

دانت رکھتا تھا۔ اس لیے اس رومی ملکہ نے بڑی دانائی کے ساتھ ہارون الرشید کو جزیہ دینا منظور کر کے صلح کر لی اور اپنے آپ کو مغربی خطرہ سے مقابلہ کرنے کے قابل بنا لیا۔

صوبہ آرمینیا کا فساد:

سنہ ۱۸۳ھ میں خاقان بادشاہ خزر کی لڑکی فضل بن یحییٰ کی طرف روانہ کی گئی۔ مقام بروعہ میں پہنچ کر اتفاقاً یہ لڑکی مر گئی۔ اس کے ہمراہیوں نے واپس ہو کر اس کے باپ سے کہا کہ مسلمانوں نے مکر وحیلہ سے اس کو مار دیا ہے۔ خاقان نے یہ سن کر لشکر عظیم فراہم کیا اور بلاد اسلامیہ پر حملہ آوری کی غرض سے باب الابواب سے خروج کیا۔ صوبہ آرمینیا کا عامل سعید بن مسلم تاب مقاومت نہ لا سکا۔ خاقان نے صوبہ آرمینیا میں ایک لاکھ مسلمانوں کو قتل کر دیا اور ہزارہا مسلمانوں اور ان کے عورتوں وبچوں کو گرفتار کر کے ایسی ایسی اذیتیں پہنچائیں جن کے سننے سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عالم اسلامی میں یہ واقعہ ایک حادثہ عظیم سمجھا جاتا ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے یزید بن مزید کو صوبہ آرمینیا کی گورنری پر مامور کر کے روانہ کیا اور وہ اس سے پہلے صوبہ آذربائیجان کا عامل تھا۔ اب صوبہ آرمینیا بھی اس کی حکومت میں شامل کر دیا۔ ادھر خزیمہ بن خازم کو نصیبین میں اہل آرمینیا کی امداد کے لیے متعین کیا۔ یزید وخزیمہ کی فوجوں کے حدود آرمینیا میں داخل ہوتے ہی اہل خزر آرمینیا کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور اسلامی فوج نے دوبارہ اپنا قبضہ وتسلط قائم کیا۔

امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق کو ہارون الرشید نے احتیاطاً بغداد ہی میں قیام رکھنے پر مجبور کیا تھا اور علویوں کے خروج سے خائف ہو کر ان کو بغداد سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اسی سال یعنی ۲۵ ماہ رجب روز جمعہ سنہ ۱۸۳ھ کو امام موسیٰ کاظم فوت ہو کر بغداد میں مدفون ہوئے۔ یہ شیعوں کے ساتویں امام مانے جاتے ہیں۔ ان کی اور امام محمد تقی کی قبر ایک گنبد کے نیچے بغداد میں موجود ہے جو کاظمین کے نام سے مشہور ہے۔

ابراہیم بن اغلب اور شہر عباسیہ:

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ہارون الرشید نے صوبہ افریقیہ کی حکومت پر محمد بن مقاتل بن حکم کو ہرثمہ بن اعین کے مستعفی ہونے کے بعد بھیج دیا تھا۔ یہ محمد بن مقاتل، ہارون الرشید کا رضاعی بھائی تھا۔ اس نے جا کر اہل افریقیہ کی بغاوت کو فرو کیا۔ یہ بغاوت ہرثمہ بن اعین کے افریقیہ سے جدا ہوتے

ہی نمودار ہو گئی تھی۔ محمد بن مقاتل نے نہایت ہوشیاری اور قابلیت کے ساتھ اہل افریقیہ کو مطیع کیا لیکن وہ لوگ طاقت کے آگے مجبور ہو کر خاموش و مطیع تھے۔ دل سے وہ بغاوت پر آمادہ اور محمد بن مقاتل سے ناراض تھے۔ ان لوگوں کی بغاوت و سرکشی کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ وہ ولایت زاب کے عامل ابراہیم بن اغلب سے ہمیشہ مشورے لیتے رہتے تھے اور ابراہیم بن اغلب باغیوں کے سرداروں سے مخفی طور پر ساز باز رکھتا اور ان کو امداد پہنچاتا رہتا تھا۔ صوبہ افریقیہ کی مسلسل بغاوتوں کے سبب سے یہ حالت تھی کہ خزانہ مصر یعنی خراج مصر سے ایک لاکھ دینار سالانہ صوبہ افریقیہ کے مصارف اور اس پر حکومت قائم رکھنے کے لیے دیا جاتا تھا۔ یعنی صوبہ افریقیہ بجائے اس کے کہ سالانہ خراج بھیجے، ایک لاکھ روپے سالانہ خرچ کرا دیتا تھا۔ محمد بن مقاتل نے اگرچہ امن و امان قائم کر دیا لیکن مصر کے خزانہ سے جو روپیہ دیا جاتا تھا، وہ بہ دستور دیا جاتا رہا۔ اب ابراہیم بن اغلب نے درخواست بھیجی کہ مجھ کو صوبہ افریقیہ کا گورنر بنا دیا جائے۔ میں نہ صرف یہ کہ ایک لاکھ سالانہ نہ لوں گا بلکہ چار لاکھ سالانہ خراج خزانہ خلافت میں بھجواتا رہوں گا۔ ہارون الرشید نے اس معاملہ میں مشیروں سے مشورہ کیا تو ہرثمہ بن اعین نے رائے دی کہ ابراہیم بن اغلب کو افریقیہ کی گورنری دے دینے میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ ہارون الرشید نے محرم سنہ ۱۸۴ھ میں ابراہیم کے پاس سند گورنری بھیج دی۔ ابراہیم نے افریقیہ پہنچتے ہی وہاں کے تمام باغی سرداروں کو جن سے ابراہیم خوب واقف تھا، چن چن کر گرفتار کیا اور بغداد بھیج دیا، جس سے تمام شورش یکایک فرو ہو گئی۔ اس کے بعد ابراہیم بن اغلب نے قروان کے پاس ایک شہر آباد کیا اور اس کا نام عباسیہ رکھا۔ اسی عباسیہ کو اس نے دارالحکومت بنایا۔ اس کے بعد اس کی نسل میں عرصہ دراز تک یہاں کی مستقل حکومت رہی جس کا حال آئندہ بیان ہو گا۔

اسی سال سنہ ۱۸۴ھ میں ہارون الرشید نے یمن اور مکہ کی بھی حکومت حماد بربری کو عطا کی اور سندھ کی حکومت پر داؤد بن یزید بن حاتم کو روانہ کیا۔ قہستان کی حکومت یحییٰ حریش کو اور طبرستان کی حکومت مہرویہ رازی کو دی۔

سنہ ۱۸۵ھ میں اہل طبرستان نے یورش کر دی۔ مہرویہ کو مار ڈالا۔ تب اس کی جگہ عبداللہ بن سعید حریشی مامور کیا گیا۔ اسی سال یزید بن مزید شیبانی نے جو آذربائیجان اور آرمینیا کا گورنر تھا، وفات پائی۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا اسد بن یزید مامور کیا گیا۔

سنہ ۱۸۶ھ میں جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، علی بن عیسیٰ خراسان کی تمام بغاوتوں پر غالب آ کر وہاں امن وسکون قائم کر سکا اور وہب بن عبداللہ نسائی مارا گیا۔ علی بن عیسیٰ کو زیادہ دنوں چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ خراسان میں اس کے خلاف ایک اور طوفان برپا ہو گیا۔ اہل خراسان نے علی بن عیسیٰ کی شکایت میں مسلسل دربار خلافت میں عرضیاں بھیجنی شروع کیں۔ یحییٰ بن خالد، علی بن عیسیٰ کی گورنری خراسان سے خوش نہ تھا۔ چنانچہ یحییٰ کے دونوں چھوٹے بیٹوں موسیٰ اور محمد نے جن کو اہل خراسان میں کافی رسوخ حاصل تھا، وہب بن عبداللہ اور حمزہ خارجی کو بغاوت پر اکسا دیا تھا اور انہیں کی در پردہ کوششوں کا نتیجہ تھا کہ خراسان میں مسلسل کئی برس تک بدامنی وفساد کا بازار گرم رہا۔ اس عرصہ میں خلیفہ ہارون الرشید کو یحییٰ وجعفر کی طرف سے کئی مرتبہ توجہ دلائی گئی کہ علی بن عیسیٰ کو خراسان سے معزول کر دیا جائے مگر ہارون الرشید نے کوئی التفات نہیں کیا۔ اب جبکہ تیر وشمشیر کے ہنگامے خراسان میں فرو ہو گئے تو کاغذ کے گھوڑے دوڑنے شروع ہوئے یعنی برمکیوں کی تحریک کا نتیجہ تھا کہ خراسانیوں نے علی بن عیسیٰ کی شکایتوں میں عرضی پر عرضی بھیجنا شروع کر دی۔ جب ان شکایتی عرضیوں کا شمار حد سے متجاوز ہونے لگا اور یہ شکایتیں بھی آنے لگیں کہ علی بن عیسیٰ نہ صرف ظلم وتشدد میں حد سے گزر گیا ہے بلکہ وہ تخت خلافت کو الٹ دینے کی تدابیر میں مصروف ہے تو ہارون نے مجبوراً خود بغداد سے کوچ کیا اور مقام رے میں پہنچ کر قیام کیا۔ علی بن عیسیٰ خلیفہ کے آنے کا حال سن کر مع تحائف وہدایا مرو سے چل کر رے میں آیا اور خلیفہ ہارون الرشید کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی فرماں برداری اور اخلاص کا ثبوت پیش کیا۔ ہارون نے خوش ہو کر اس کو خراسان کی گورنری پر مامور رکھا اور رے، طبرستان، نہاوند، قومس اور ہمدان کی ولایتوں کو بھی اس کی حکومت میں شامل کر دیا۔

موتمن کی ولی عہدی:

اسی سال یعنی سنہ ۱۸۶ھ میں خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے تیسرے بیٹے قاسم کو بھی ولی عہد بنایا یعنی لوگوں سے اس بات کی بیعت لی کہ مامون کے بعد قاسم تخت خلافت کا مالک ہو گا۔ اسی موقع پر قاسم کو موتمن کا خطاب دیا گیا لیکن موتمن کو ولی عہد سوم بناتے ہوئے بیعت میں یہ شرط رکھ دی کہ اگر موتمن لائق ہو تو مامون کا جانشین بنے گا ورنہ مامون کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ وہ اس کو معزول کر کے کسی دوسرے کو اپنا ولی عہد بنائے۔ ولی عہد اول یعنی امین کو عراق، شام اور عرب کے ملکوں کی

حکومت عطا کی، پھر امین سے ایک عہد نامہ لکھوایا، جس کا مضمون یہ تھا کہ میں مامون کے ساتھ ایفائے عہد کروں گا۔ اسی طرح مامون سے ایک عہد نامہ لکھوایا، جس کا مضمون یہ تھا کہ میں امین کے ساتھ ایفائے وعدہ کروں گا۔ ان عہد ناموں پر اکابر علماء، مشاہیر، مشائخ، سرداران لشکر، اراکین سلطنت، مدینہ اور مکہ کے سربرآوردہ لوگوں کے دستخط کرا کر خانہ کعبہ میں آویزاں کرا دیا۔ جو ملک جس بیٹے کو دیا تھا، اسی پر اس کو قناعت کرنے اور کسی دوسرے بھائی کا ملک نہ لینے کا بھی اقرار لیا گیا تھا۔ صرف خلافت میں ترتیب رکھی تھی یعنی اول امین خلیفۃ المسلمین ہوگا اور مامون اس کی فرماں برداری کا اقرار کرے گا لیکن امین کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ مامون کو ان ملکوں کی حکومت سے معزول کر سکے جن کو ہارون نے مامون کی حکومت کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ امین کے بعد مامون خلیفہ ہوگا، وغیرہ۔ یہ سب کچھ اس عہد نامہ میں تصریح تھی جس پر امین و مامون وغیرہ سب کے دستخط واقرار تھے اور جو خانہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا تھا۔ اس طرح ہارون الرشید نے اپنی سلطنت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے آئندہ کے لیے ان میں لڑائی جھگڑے کے پیدا ہونے کا امکان مٹانا چاہا تھا لیکن یہ ہارون الرشید کی کوئی عاقلانہ حرکت نہ تھی۔ غالباً محبت پدری نے اس کو ایک ایسی حرکت اور ایسے کام پر آمادہ کر دیا جس کو کسی طرح بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔

ہارون الرشید کا قابل تذکرہ حج:

خلیفہ ہارون الرشید کو حج کرنے کا بہت ہی شوق تھا۔ وہ کسی سخت مجبوری کے بغیر حج کو نہ چھوڑتا تھا۔ اس کا دستور تھا کہ ایک سال کفار پر جہاد کرتا اور ایک سال حج کے لیے جاتا۔ کسی خلیفہ نے اس قدر حج نہیں کیے جس قدر ہارون الرشید نے کیے ہیں مگر سنہ ۱۸۶ھ کا حج اس لیے خصوصیت کے ساتھ قابل تذکرہ ہے کہ اسی حج کے ایام میں خانہ کعبہ پر وہ عہد نامہ لٹکایا گیا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اور اسی حج سے فارغ ہو کر ہارون الرشید نے خاندان برامکہ کی طاقت کو توڑا۔ ہارون الرشید نے انبار سے بہ قصد حج مکہ مکرمہ کی طرف کوچ کیا۔ اس کے ہمراہ اس کے تینوں بیٹے امین، مامون اور موتمن تھے۔ جعفر بن یحییٰ بھی جو آج کل وزیراعظم تھا، اس کے ساتھ تھا۔ مکہ مکرمہ میں حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ گیا۔ اہل مکہ اور اہل مدینہ کو اپنی داد و دہش اور انعامات سے مالا مال کر دیا۔ اپنی

اور اپنے بیٹوں کی طرف سے ایک کروڑ پانچ لاکھ کی اشرفیاں خیرات میں تقسیم کیں۔ مدینہ منورہ سے فارغ ہو کر واپس آیا اور مقام انبار میں قیام کیا۔ اسی مقام پر جعفر بن یحییٰ برمکی کو محرم سنہ ۱۸۷ھ کی آخری تاریخ میں قتل کرایا۔

برامکہ اور ان کا زوال:

خلیفہ ہارون الرشید کی خلافت کے حالات بیان کرتے ہوئے اس وقت ہم سنہ ۱۸۷ھ تک پہنچ گئے ہیں۔ اس سال کے ابتدائی مہینہ میں ہارون الرشید نے اپنے وزیر جعفر برمکی کو قتل کرایا اور اس کے بھائی فضل اور باپ یحییٰ کو قید کر دیا۔ بادشاہوں اور خلیفوں کے حالات میں کسی وزیر کا قتل ہونا اور کسی وزیر کا قید ہونا کوئی غیر معمولی بات اور بہت ہی عظیم الشان واقعہ نہیں ہوا کرتا۔ فرماں رواؤں کی تاریخ اسی قسم کے واقعات سے لبریز ہوا کرتی ہے۔ بادشاہوں کے کارنامے عموماً خون کی روشنائی سے لکھے جاتے ہیں لیکن برامکہ کے زوال اور جعفر کے قتل کا معمولی واقعہ ہنگامہ پسند اور واقعہ پرست لوگوں اور دروغ بات قصہ گویوں، ناول نویسوں اور عجائب پرست جاہلوں کی بہ دولت ایسی بدنما صورت اختیار کر چکا ہے کہ جس طرح آج محمود غزنوی، اورنگ زیب عالمگیر کی نسبت بہت سے پڑھے لکھے جاہل اور عاقل نما احمق غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ جھوٹ کو جھوٹ ثابت کر کے آئینہ حقیقت نما سامنے رکھ دیا جائے۔ اسی طرح ضرورت ہے کہ قتل جعفر اور زوال برامکہ پر بھی کسی قدر وسیع کلام کر کے دروغ کے فروغ کو مٹا دیا جائے۔ لہٰذا ضرورتاً سنہ ۱۸۷ھ کے اس واقعہ کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے برمکی خاندان کی مختصر تاریخ، اس کے بعد وہ غلط اور سراپا دروغ روایت جو جاہل احمقوں میں شہرت پا چکی اور بہت سے پڑھے لکھوں کی زبان سے ادا ہو چکی ہے، اس کے بعد حقیقت اصلیہ بیان ہو گی، وباللہ التوفیق۔

خاندان برمک

ایرانیوں میں سب سے قدیم مہ آبادی مذہب تھا، جس میں ستارہ پرستی زیادہ اور آتش پرستی کم تھی۔ مہ آباد کے بعد اس کے مذہب کی تجدید کے لیے یکے بعد دیگرے بہت سے پیغمبر بطور مجدد آئے۔ ان سب کے بعد شت وخشور زردشت کا ظہور ہوا۔ زردشت نے جس مذہب [1] کو رواج

---

[1] زردشت نے آتش پرستی یعنی آگ کی پوجا کرنے کا مذہب پھیلایا یعنی خالص شرکیہ مذہب۔ اب یہ پارسی مذہب کہلاتا ہے۔

دیا، اللہ جانے اس کی اصلی صورت کیا ہو گی؟ مگر آج کل جو کچھ پتہ چلتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زردشت کے مذہب میں آتش پرستی زیادہ اور ستارہ پرستی کم تھی۔ زردشت کی زندگی ہی میں اس کا مذہب شاہی مذہب ہوکر ایران کے اکثر حصہ میں پھیل گیا تھا۔ اسفندیار کی پہلوانی دروئین تنی نے افغانستان وپنجاب تک اس مذہب کو پھیلایا اور ہندوستان کے اعلم العلماء وشمس الفضلاء سنگراچہ وبیاس جی نے زردشت کے پاس بلخ میں حاضر ہوکر بیعت کی اور ہندوستان میں واپس آ کرآتش پرستی کی اشاعت شروع کی جس کی یادگار اب تک ہندوؤں کے ہون کی شکل میں نمودار ہے۔زردشت اوراس کے مرید باخلاص تارک السلطنت بادشاہ لہراسپ کی آخری قیام گاہ بلخ ہی تھا۔ بلخ کو دین آتش پرستی کے ساتھ وہی تعلق ہے جو بیت المقدس یا یروشلم کوعیسویت کے ساتھ یا بودھ مذہب کوگیا جی کے ساتھ ہے۔سکندر یونانی نے اصطخر ،سمرقند، کانگڑہ، کراچی اور بابل کا درمیان رقبہ اپنی تاخت وتاراج سے بالکل تہ وبالا کردیا تھا۔ یہی رقبہ کیانی خاندان کی آتش پرست سلطنت کا محکوم ومغلوب رقبہ تھا۔ اسی رقبہ میں آتش پرستی رائج تھی۔ یونانیوں کے سیلاب نے کیانیوں کی حکومت کے ساتھ ہی آتش پرستی کو ٹھنڈا کردیا۔ سینکڑوں برس کے بعد یونانیوں کے شکنجے سے ایرانیوں کی گردنیں چھوٹیں اورساسان اول نے ایرانی طوائف الملوکی کو پھرایک بادشاہی کی شکل میں تبدیل کرکے دین زردشتی کی خاکستری میں سے چنگاریاں نکال کرجا بہ جا آتش کدے روشن کردیے۔ بلخ کو چینیوں نے زردشت ہی کے زمانے میں حملہ کرکے ویران کردیا تھا لیکن بلخ چندروز ہی کے بعد پھرآباد اورآتش پرستوں کا قبلہ تھا۔سکندری سیلاب نے بلخ کی گرم بازاری کوسرد کردیا تھا لیکن راسخ العقیدت زردشتیوں کی وہ بہ دستور امیدگاہ تھا۔ساسانیوں کے عہد میں اس کی عظمت نے دوبارہ عہد شباب پایا۔ جب قادسیہ ونہاوند کے میدانوں میں ساسانی سلطنت کے سانس پورے ہو گئے تو بلخ کے آتش کدے کی رونق اوراَبھی زیادہ بڑھ گئی کیونکہ ایران کا شکست خوردہ بادشاہ اوردربار ایران کے بقیہ مفرور سرداروں کا جمگھٹ بلخ ہی کی طرف متوجہ ہوکر بلخ کے آتش کدہ موسومہ نوبہار میں مصروف یزدان① پرستی ہوا۔

---

❶ آتش پرستوں یعنی مجوسیوں کے دو ''خدا'' تھے: خدائے یزداں اورخدائے اہرمن...... ایک نیکی کا خدا اور دوسرا بدی کا۔ یہ تصور اورنظریہ کس قدر فاسد، لایعنی اورخلاف دین وعقل ہے، وہ ظاہر ہے۔

❷ ایران کے بادشاہ کولوگ شہنشاہ کہتے تھے حالانکہ شہنشاہ تو اللہ وحدہ لاشریک لہ کی ذات جلیل وکمال ہے۔

اس زمانے میں نوبہار کے مغ اعظم کی شان وعظمت قابل دید ہوگی اور وہ دین آتش پرستی کے سرپرست اعظم بادشاہ [۲] ایران کی بربادی و بے کسی دیکھ دیکھ کر سب سے زیادہ متاثر ہوگا۔ وہ سوچتا ہوگا کہ جس دین کے پیشواؤں میں میرا شمار ہے، وہ دین ہی اب ذلیل و برباد ہونے والا ہے اور اس کے ساتھ ہی میری اور میرے خاندان کی عظمت بھی رخصت ہوا چاہتی ہے۔ آتش کدے کے امام یا متولی کو مغ کہتے تھے۔ ان مغوں میں جو سب سے بڑا اور سب کا افسر اور اپنے صوبہ کے تمام آتش کدوں کا مہتمم اور مرکزی آتش کدہ کا مغ ہوتا تھا، وہ برمغ کہلاتا تھا۔ ایران کے چار مرکزی آتش کدوں میں سے ایک آتش کدہ نوبہار تھا۔ اس آتش کدے کو سب سے زیادہ عظمت وشہرت حاصل تھی کیونکہ بلخ لہراسپ کا مقتل اور زردشت کی قیام گاہ اور دین زردشتی کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے نوبہار کے برمغ کی عزت وعظمت آتش پرستوں اور ایرانیوں میں یقیناً بہت بلند ہوگی۔ سنہ ۳۱ھ میں مسلمان فتح مندوں کا سیلاب مرو کی طرف سے بڑھتا، میدانوں کو سمیٹتا اور پہاڑوں کو لپیٹتا ہوا بلخ تک پہنچا اور وہ آگ جس کی نسبت مشہور تھا کہ ہزاروں برس سے برابر روشن چلی آتی ہے، افسردہ ہو گئی۔ نہ آتش پرست رہے، نہ آتش کدہ کی ضرورت رہی۔ نہ برمغ کی عزت وتوقیر کرنے والا کوئی بڑا گروہ تھا، نہ اس کی آمدنی وآسائش کے سامان رہے مگر وہ اپنے اسی خطاب یعنی برمغ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ فتح مند اہل عرب اس نام کو برمک کہنے لگے۔

اس موقع پر یہ خیال کرنا غلطی ہوگی کہ اہل عرب نے نوبہار کو مسمار و منہدم کر کے آتش پرستوں کو عبادت سے روک دیا اور زبردستی مسلمان بنا لیا تھا۔ مسلمان اگر زبردستی آتش پرستوں کو مسلمان بناتے تو سب سے پہلے برمک کو مسلمان بناتے لیکن انہوں نے برمک سے قطعاً کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ آتش پرست خود ہی اسلام میں داخل ہوتے اور اپنے مذہب کو چھوڑتے جاتے تھے، اور اسی تبدیلی مذہب کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ فتوحات حاصل ہوئیں۔ مسلمانوں کا بلخ تک پہنچنا گویا دین اسلام کا بلخ تک پہنچنا تھا، جس کا لازمی نتیجہ آتش کدہ نوبہار کی بربادی اور اس کے مغ کی تباہ حالی تھا۔ برمک چونکہ مذہبی پیشوا تھا، اس لیے اس نے دین اسلام قبول نہ کیا کیونکہ اس ملک میں اسلام کے آنے سے اس کو ہر قسم کا نقصان پہنچا تھا اور وہ مسلمانوں کو طیش وغضب کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ مسلمانوں کے آنے کے بعد سرحد چین کے مغل اور ترک قبائل جو ایرانیوں کی قوم اور مذہب سے کوئی تعلق نہ رکھتے مگر ایرانی بادشاہی کے رعب سے بلخ پر حملہ آور نہ

ہو سکتے تھے، اب بلخ پر چھاپے مارنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہی مغل سردار مسلمانوں کو جزیہ دینے کا اقرار کر کے بلخ پر حکمرانی کرنے لگے اور بعد میں قوت پا کر مسلمانوں کے لیے موجب مشکلات بھی ہونے لگے۔ ان مغلوں نے بلخ میں آتش پرستی کے تمام سامانوں کو مٹایا اور خاندان برمک کو ذلیل کر کے ادنیٰ طبقہ میں پہنچایا۔ عربوں نے پہلی مرتبہ اس طرف آ کر زیادہ دنوں قیام نہیں کیا، اندرونی جھگڑوں نے ان کو سرحدوں کی طرف متوجہ ہی نہ ہونے دیا اور بلخ مغلوں کا تختہ مشق بنا رہا۔

وہ برمک جو نوبہار کا مغ اور مجوسی سلطنت کا زمانہ دیکھے ہوئے تھا، فوت ہو گیا۔ اس کا بیٹا بھی جو دین زردشتی کا پیرو تھا، اسی نام سے مشہور ہوا۔ اس دوسرے برمک نے نوبہار کی بہار کا زمانہ نہیں دیکھا تھا۔ سنہ ۸۶ھ میں جب قتیبہ بن مسلم گورنر خراسان نے بلخ پر چڑھائی کی تو وہاں سے کچھ لونڈیاں بھی گرفتار ہو کر آئیں۔ ان میں ایک اس برمک دوم کی بیوی بھی تھی جو قتیبہ بن مسلم کے بھائی عبداللہ بن مسلم کے حصے میں آئی تھی۔ چند روز کے بعد جب اہل بلخ سے صلح ہوئی تو یہ تمام لونڈیاں اور قیدی واپس کیے گئے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسلم کو بھی یہ عورت واپس کرنی پڑی۔[1] اس عورت نے رخصت ہوتے وقت عبداللہ سے کہا کہ میں تجھ سے حاملہ ہو گئی ہوں۔ برمک کے یہاں پہنچ کر اس عورت کے پیٹ سے لڑکا پیدا ہوا۔ یہی لڑکا جعفر برمکی کا دادا تھا، جس کا نام خالد تھا۔ ممکن ہے کہ یہ روایت بھی اسی قسم کی فرضی کہانی ہو جیسی کہ عجائب پسند اور عجائب پرست لوگ تصنیف کر لیا کرتے ہیں۔ بہرحال برمک دوم کے یہاں سنہ ۸۶ھ یا سنہ ۸۷ھ میں خالد پیدا ہوا۔ سنہ ۱۲۴ھ میں امام ابراہیم عباسی نے ابومسلم خراسانی کو خراسان کے دعاۃ کا افسر و مہتمم بنا کر بھیجا۔ ابومسلم نے خالد بن برمک کو جبکہ اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی، اپنی جماعت میں شامل کیا۔ ابومسلم کو خالد بن برمک کے ساتھ بہت محبت تھی اور خالد کی تربیت اور افزائش مرتبت میں اس کی خصوصی توجہ صرف ہوتی تھی۔

ابومسلم نے جب خراسان سے ایک شخص کو بھیج کر ابوسلمہ خلال معروف بہ وزیر آل محمد کو قتل کرایا تو سفاح کو لکھا کہ آپ اب خالد بن برمک کو اپنا وزیر بنا لیں۔ چنانچہ عبداللہ سفاح پہلے عباسی خلیفہ نے خالد بن برمک کو اپنا وزیر بنا لیا اور سفاح کی وفات تک خالد بن برمک وزیر رہا۔ سفاح کے بعد منصور عباسی تخت نشین ہوا تو اس نے بھی خالد کو وزارت پر قائم رکھا۔ منصور نے اپنی خلافت کے پہلے

---

[1] باوجود خرابیوں کے مسلمانوں کا اخلاقی رویہ بہت بہتر تھا، یہ واقعہ اس کی واضح عکاسی کر رہا ہے۔

سال ہی ابومسلم کو جو خالد کا مربی، ہم خیال اور محسن تھا، قتل کرا دیا۔ خالد نے ابومسلم کے قتل ہونے پر اپنے کسی عمل سے اپنی دلی ناراضی اور ملال کا اظہار نہ ہونے دیا مگر منصور نے پھر بھی احتیاطاً قتل ابو مسلم سے چار پانچ مہینے کے بعد خالد کو کسی بغاوت کو فرو کرنے کے بہانے سے روانہ کر کے ابوایوب کو اپنا وزیر بنا لیا۔ چونکہ خالد سے سرکشی اور بے وفائی کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی تھی، اس لیے خلیفہ منصور نے ایک کارگزار اور قابل شخص سے کام لینے اور فائدہ اٹھانے میں کمی نہیں کی۔ خالد کے آئندہ طرزِ عمل نے منصور کو مطمئن کر دیا۔ چونکہ وہ ابومسلم جیسے سازشی، باہمت اور اولوالعزم شخص کا شاگرد رشید اور سیاسی معاملات میں خوب تجربہ کار تھا، ایرانی عصبیت بھی اس کے دل میں موجود تھی، ابومسلم کا انجام بھی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا، لہٰذا وہ ابو مسلم سے بھی زیادہ گہرا بن گیا اور منصور جیسے چوکس رہنے والے اداشناس خلیفہ سے بھی اپنے اصلی رنگ کو چھپا لینے میں کامیاب ہو گیا۔ موصل کی ولایت کا والی اور منصور کے بیٹے مہدی کا اتالیق رہا اور اپنے وقار و مرتبہ کو آخر عمر تک قائم رکھا۔ وہ اس کے اور اس کے خاندان کے لیے بے حد مفید اور ضروری تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ اس نے خود اس بات کی کوشش کی ہو کہ مہدی کی اتالیقی اس کو مل جائے۔ مہدی کی تخت نشینی اور منصور کی وفات کے بعد بھی خالد زندہ تھا۔ اب اس کے عزت و مرتبہ میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ مہدی کے عہد خلافت یعنی سنہ ۱۶۳ھ میں قریباً ۷۷ سال کی عمر میں خالد کا انتقال ہوا۔ اس کی آخری آدھی عمر سلطنتوں کے بننے بگڑنے کا تماشہ دیکھنے میں صرف ہوئی تھی اور وہ خود سلطنتوں کو برباد کرنے اور نئی سلطنت قائم کرنے کے کام میں شریک غالب کی حیثیت سے کام کر چکا تھا۔

خالد کی وفات کے وقت اس کے بیٹے یحییٰ کی عمر ۴۵ یا ۵۰ سال کی تھی اور اس نے بھی ہوش سنبھالتے ہی یہ تمام تماشے اور ہنگامے دیکھے تھے۔ وہ اپنے باپ سے اس کے تمام عزائم، تمام خیالات، تمام خواہشات، تمام احتیاطیں ورثہ میں پا چکا تھا۔ وہ اپنے باپ دادا کی بربادی، اپنے خاندانی احترام، ایرانی بادشاہی کے افسانے نہایت عقیدت و حسرت کے ساتھ سن چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایرانی قوم کا نمائندہ اور پیشوا سمجھتا اور اس بات کو بہ خوبی جانتا تھا کہ ایک ذرا سی لغزش یا اس رسوخ کو جو خلافت اسلامیہ میں حاصل ہے، ضائع کر کے تحت الثریٰ میں پہنچا سکتی ہے۔ دوسری طرف اس کو اور اس کے باپ کو خاندان خلافت کے اندرونی اور خاندانی معاملات میں بھی دخل تھا۔

صحبت مدام نے اس کے قلب کو رعب سلطنت کے بوجھ سے چور چور اور مرعوب ہونے سے بھی بچا لیا تھا۔ خالد بن برمک نے سب سے بڑا کام اور نہایت گہری تدبیر یہ کی تھی کہ سنہ ۱۶۱ھ میں مہدی کو مشورہ دیا کہ شہزادہ ہارون الرشید کا اتالیق یحییٰ کو بنا دیا جائے۔ مہدی چونکہ خود خالد کی اتالیقی میں رہ چکا تھا، لہٰذا اس نے اپنے بیٹے کو خالد کے بیٹے کی اتالیقی میں سپرد کرنا بالکل بے ساختہ چیز سمجھا۔ اس سے بھی پہلے جبکہ ہارون الرشید بمقام رے خیزران کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا تو خالد، مہدی کے ساتھ رے میں موجود تھا۔ خالد ہی نے ہارون الرشید کو یحییٰ کی بیوی کا اور اپنے پوتے یعنی یحییٰ کے بیٹے فضل کو خیزران کا دودھ پلوا کر فضل اور ہارون کو دودھ شریک بھائی بنوایا تھا۔ خالد کی ان تمام تدابیر کو اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو اس نے نہایت ہی خوبی کے ساتھ اپنے خاندان کی پوری پوری حفاظت کر لی تھی کیونکہ وہ ایک نہایت عظیم الشان کام انجام دینا یعنی ابومسلم کا بدلہ لے کر ایرانیوں میں حکومت وسلطنت کو واپس لانا چاہتا تھا۔

یحییٰ بن خالد نے ہارون کی تعلیم وتربیت کی تھی۔ اس نے ہارون پر یہاں تک اپنا اثر قائم کر لیا تھا کہ ہارون تخت خلافت پر متمکن ہونے کے بعد بھی یحییٰ کو پدر بزرگوار ہی کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور اس کے سامنے بے تکلفانہ گفتگو کرتا ہوا شرماتا تھا۔ خلیفہ ہادی کا عہد خلافت کسی طرح بھی خاندان برمک کے منصوبوں کے موافق نہ تھا اور ہادی پر یحییٰ کا کوئی اثر بھی نہ تھا۔ اگر تھا تو صرف اسی قدر کہ وہ متوسلین میں سے ایک تھا لیکن یحییٰ نے وہ تدابیر اختیار کیں کہ ہادی کی حقیقی ماں خیزران اپنے بیٹے ہادی کی دشمن بن کر اس کی جان کی خواہاں بن گئی اور یحییٰ و خیزران نے مل کر جلد ہی اس کا کام تمام کر دیا اور سال بھر سے زیادہ اس کو حکومت کا موقع نہ مل سکا۔ ہارون کی تخت نشینی کے لیے یحییٰ کا کوشش کرنا ظاہر ہے کہ خود اپنی ہی ذات کے لیے کوشش کرنا تھا۔ ہارون نے خلیفہ ہوتے ہی جیسا کہ توقع تھی، یحییٰ بن خالد کو وزیراعظم اور مدارالمہام خلافت بنا دیا۔ یحییٰ ایسا بیوقوف نہ تھا کہ ہارون کی ماں خیزران کو ناراض رکھتا۔ اس نے ہر ایک کام خیزران کے مشورہ سے کرنا شروع کر دیا یعنی اپنی ہر ایک تجویز کے لیے پہلے خیزران سے مشورہ لے لیتا تھا۔ چند روز کے بعد خیزران فوت ہوگئی اور یحییٰ کو اس تکلف کی بھی ضرورت باقی نہ رہی۔ یحییٰ نے امور خلافت اور مہمات سلطنت میں اس انہماک، دل سوزی اور خوبی سے کام کیا کہ ہارون الرشید کے دل میں یحییٰ کی عزت اور محبت بڑھتی چلی گئی۔ یحییٰ نے یہ بھی احتیاط رکھی کہ ہارون کی آزاد مرضی اور دلی خواہش میں کسی مقام پر بھی یحییٰ کا

اختیار سد راہ محسوس نہ ہونے پائے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یحییٰ کا کام صرف ہارون کی خواہش اور منشاء کو کامیاب بنانے کی سعی بجا لانا ہے اور بس! لیکن یحییٰ نے جو سب سے بڑا کام کیا، وہ یہ تھا کہ اس نے غیر محسوس طریقہ پر اپنے خاندان والوں، اپنے بھائیوں، بھتیجوں اور اپنے ہم خیال ایرانیوں کو ذمہ داری کے عہدوں، اہم ولایتوں کی حکومتوں، فوجوں کی سرداریوں پر مامور و مقرر کرنا شروع کیا۔ اپنے بیٹوں فضل اور جعفر وغیرہ کو اس نے ہارون الرشید کا بھائی بنا ہی دیا تھا، ہارون بھی یحییٰ کے بیٹوں کو اپنا بھائی کہتا اور انہیں سب سے زیادہ اپنا عزیز و رفیق جانتا تھا۔ اپنے بیٹوں کو ہارون نے فضل و جعفر کی اتالیقی میں دے دیا تھا۔ سنہ ۱۷۴ھ میں جبکہ یحییٰ بوڑھا اور ضعیف ہو گیا تھا، ہارون نے اس کے بیٹے فضل کو مہمات وزارت میں اس کا مددگار و شریک بنایا تھا۔

جب یحییٰ بن عبداللہ نے سنہ ۱۷۶ھ میں دیلم میں خروج کیا تو فضل بن یحییٰ ہی نے اس مہم کو طے کیا تھا اور یحییٰ بن عبداللہ کے لیے جاگیر مقرر کرائی تھی۔ چند روز کے بعد ہارون نے یحییٰ بن عبداللہ کو جعفر بن یحییٰ کے سپرد کیا کہ اپنے پاس نظر بند رکھو۔ فضل کو ہارون نے سنہ ۱۷۸ھ میں خراسان، طبرستان، رے اور ہمدان کا گورنر بھی بنا دیا تھا۔ فضل بن یحییٰ کو ہارون نے اپنے بیٹے امین کا اتالیق بنایا تھا۔ یحییٰ نے اپنی گورنری خراسان کے زمانہ میں پانچ لاکھ ایرانیوں کی ایک نہایت زبردست اور آراستہ فوج تیار کی مگر ایک ہی سال کے بعد سنہ ۱۷۹ھ میں ہارون نے اس کو خراسان سے بلا کر مستقل وزیراعظم بنا دیا مگر یحییٰ سے اہم معاملات میں ضرور مشورہ لیا جاتا تھا یعنی وہ بھی بہ دستور مہمات سلطنت میں دخیل رہا۔

یحییٰ کا دوسرا بیٹا جعفر، ہارون الرشید کا مصاحب خاص اور نہایت بے تکلف دوست تھا۔ ہارون سفر و حضر میں اس کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جعفر نہایت خوش مزاج اور سلیقہ شعار تھا۔ سنہ ۱۷۶ھ میں جعفر کو شاہی محلات کی داروغگی کے علاوہ ملک مصر کی گورنری بھی عطا ہوئی تھی۔ جعفر نے اپنی طرف سے مصر کی حکومت پر عمران بن مہران کو روانہ کر دیا تھا اور خود ہارون کی خدمت میں رہتا تھا۔ سنہ ۱۸۰ھ میں دمشق و شام میں فسادات پیدا ہوئے تو جعفر ہی نے جاکر ان کو فرو کیا، پھر ہارون نے جعفر کو خراسان کی گورنری عطا کی مگر ایک مہینہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ خاص بغداد کی حکومت و کوتوالی اس کے سپرد کی۔ جعفر نے یہ کام ہرثمہ بن اعین کے سپرد کیا اور خود بہ دستور ہارون الرشید کا مصاحب رہا۔ ہارون الرشید نے یحییٰ بن خالد کو بلا کر کہا کہ آپ فضل سے کہہ دیں کہ وہ قلمدان وزارت جعفر

کے سپرد کر دیں کیونکہ مجھ کو فضل سے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ وہ وزارت کا کام جعفر کو سپرد کر دیں۔ چنانچہ یحییٰ نے فضل سے ہارون کا منشاء ظاہر کیا اور جعفر وزیراعظم ہوگیا۔ اس بات سے بہ خوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس خاندان کا ہارون پر کسی قدر قوی اثر تھا۔

جعفر بن یحییٰ نے اپنے عہد وزارت میں سلطنت کے تمام عہدوں اور تمام صیغوں پر اس طرح تسلط جما لیا کہ حقیقتاً وہی سلطنت کا مالک اور اصل فرماں روا سمجھا جانے لگا۔ بغداد کی تمام پولیس، بغداد کے بڑے بڑے محلات سب اس کے قبضہ میں تھے۔ ولایتوں کے عامل، صوبوں کے گورنر، فوج کے افسر سب اسی کے آوردے تھے۔ خزانہ کا وہی مالک و مہتمم تھا، حتیٰ کہ ضرورت کے وقت ہارون الرشید کو جعفر ہی سے روپیہ مانگنا پڑتا تھا۔ یحییٰ بن خالد کے اور بھی کئی بیٹے تھے جو بڑی بڑی فوجوں کے افسر تھے۔ اپنے ان اختیارات اور اقتدار سے یحییٰ اور اس کے بیٹوں نے نہایت خوبی کے ساتھ فائدہ اٹھایا یعنی انہوں نے بڑی بڑی جاگیروں اور وظیفوں کی آمدنی کے علاوہ خزانہ سلطنت کے روپیہ کو بھی سخاوت اور داد و دہش میں بے دریغ خرچ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی سخاوت حاتم کی طرح مشہور ہوگئی۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو خاندان برمک کا مداح اور ہواخواہ نہ ہو۔ انہوں نے خوب روپیہ حاصل کیا اور اس کو بلا دریغ خرچ کیا۔ اپنی قبولیت و ناموری خریدی، یہاں تک کہ صرف خراسان و عراق ہی میں نہیں بلکہ شام، مصر، عرب، یمن اور دور دور کے ملکوں میں لوگ ان کی مدح سرائی کرتے اور ان کی سخاوت اور بذل مال کی تعریف میں قصائد لکھتے تھے۔

خاندان برمک کی عزت، قبولیت، اختیار، اقتدار، قوت و طاقت، مال و دولت اور معراج کمال کو پہنچ چکی تھیں، سوائے اس کے کہ وہ تخت خلافت پر نہیں بیٹھتے تھے اور تمام چیزیں ان کو حاصل تھیں۔ وہ ان کے باوجود ہارون الرشید کے منشاء کے خلاف کوئی حرکت نہیں کرتے تھے۔ اس لیے ہارون الرشید کے کسی ہواخواہ کو یہ موقع ہی حاصل نہ تھا کہ ان کے اس اقتدار و عظمت کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھے۔ لیکن اگر اس اقتدار و قوت اور اس اختیار و تسلط کی تہہ میں کوئی بدنیتی یا بغاوت پوشیدہ ہو تو پھر ہارون الرشید کے لیے ان سے بڑھ کر کوئی دوسرا دشمن نہیں ہوسکتا تھا۔ سنہ ۱۸۷ھ کی ابتداء میں یکایک دیکھا گیا کہ ہارون الرشید نے خاندان برمک کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو دشمنوں سے کیا جاتا ہے۔ پس ہم کو اس وقت یہ دیکھنا اور تحقیق کرنا چاہیے کہ آیا برامکہ نے حقیقتاً ہارون الرشید کی سلطنت کے خلاف کوئی منصوبہ اور سازش شروع کر رکھی تھی یا نہیں اور ہارون الرشید ان کے اس مخالف

منصوبے سے واقف ہو گیا تھا یا نہیں؟ اگر واقعی برامکہ، ہارون اور عباسی خلافت کے خلاف کچھ کرنا چاہتے تھے تو ہارون نے ان کے ساتھ جو آخری سلوک کیا، وہ سراسر جائز اور ہر طرح مناسب تھا۔ لیکن اگر برامکہ کا ظاہر اور باطن یکساں تھا اور وہ خلوص کے ساتھ ہارون کے فرماں بردار تھے تو ہارون سے بڑھ کر کوئی ناقدر شناس اور ظالم نہیں ہو سکتا۔ سطحی نگاہ والوں کے نزدیک برامکہ کی بربادی کا مسئلہ ایک عقیدہ لاینحل خیال کیا جاتا ہے اور انہوں نے چانڈو خانے کی بے سروپا باتوں کو اس عقدہ دشوار کے حل کرنے کے لیے ذریعہ بنا کر حقیقت کا جامہ پہنا دیا ہے۔

نادر شاہ ہندوستان میں

ہندوستان میں جب نادر شاہ ایرانی آیا اور صلح و آشتی کے ساتھ ہندوستان کا بادشاہ اس کو مہمان عزیز کی حیثیت سے دہلی میں لایا تو کسی چانڈو خانے میں کسی شخص نے نشہ کی حالت میں کہا کہ ''واہ محمد شاہ پیا! کیا کام کیا ہے کہ قزلباش کو قلعہ میں لا کر قلماقیوں کے ہاتھ سے قتل کرا دیا۔'' یہ بے پر کا کو اڑا اور اس نے اڑتے ہی تمام دہلی میں ایرانیوں کے سر اڑوانے شروع کرا دیے۔ آخر مجبور ہو کر نادر شاہ ایرانی نے قتل عام کا حکم دیا اور دہلی میں وہ قتل عام ہوا جس کی نظیر آج تک دہلی نے نہیں دیکھی۔ بس بالکل اسی قسم کی یہ بات ہے کہ کسی نے جعفر برمکی کے قتل کا سبب اس طرح تصنیف کر کے بیان کیا کہ:

> ''ہارون الرشید عباسی کی بہن اور مہدی کی ایک بیٹی عباسہ تھی۔ ہارون کو اپنی اس بہن سے بہت محبت تھی۔ اسی طرح جعفر بن یحییٰ اس کا وزیر اعظم بھی ہارون کا جلیس و ندیم اور ہمہ اوقات ساتھ رہتا تھا۔ ہارون، جعفر اور عباسہ کے ساتھ مل کر شراب نوشی کیا کرتا تھا۔ ہارون شراب نوشی کے جلسہ میں جس طرح اپنی بہن کو شریک رکھنا چاہتا تھا، اسی طرح اس کو اپنے وزیر اعظم جعفر کا شریک رکھنا بھی ضروری تھا۔ لہٰذا ہارون الرشید نے عباسہ کا نکاح جعفر سے کر دیا تھا کہ ایک دوسرے کا دیکھنا مباح ہو جائے لیکن جعفر و عباسہ دونوں کو یہ تاکید کر دی تھی کہ زن و شوہر کے تعلقات ہرگز نہ ہونے پائیں، مگر جعفر و عباسہ اس امتناعی حکم کی حد میں نہ رہ سکے۔ ہارون کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے جعفر کو قتل کرا کر اس کے تمام خاندان کو

---

1. نشہ کرنے والوں کا ڈیرہ یا ان کی مخصوص جگہ۔

برباد کیا۔"

یہ چانڈو خانے ① کی گپ جب ہمارے زمانے کے ناول نویسوں اور پڑھے لکھے جاہلوں کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے حسب عادت روغن قاز مل کر اس دروغ کو ایسا فروغ دیا کہ آج کل جس اردو دان کو دیکھئے! اس نا معقول دروغ بانی پر آیت و حدیث سے بڑھ کر ایمان رکھتا ہے اور اس کے خلاف کچھ بھی سننا پسند نہیں کرتا۔ ①

یہ افواہ قتل جعفر سے سو برس کے بعد تصنیف ہوئی اور طبری نے اس کا ذکر اپنی تاریخ میں کر دیا۔ بس پھر کیا تھا! واقعہ کی شکل چونکہ عجیب و غریب بیان کی گئی ہے جس کے اندر کافی ندرت موجود ہے، لہٰذا عجائب پسند طبیعتیں اسی طرح زیادہ جھکنے لگیں اور ہر شخص نے ہارون الرشید کے حالات لکھتے ہوئے اس افواہ کو بھی ضرور نقل کیا اور آج مجبوراً ہم کو بھی اس ناگفتنی کہانی کا ذکر کرنا پڑا۔ طبری اور دوسرے مورخین نے قتل جعفر کے دوسرے اسباب بھی بیان کیے ہیں لیکن ان میں سے جھوٹے اور سچے کو الگ الگ انتخاب کرنے کے لیے عقل و درایت سے کام لینے کی کوشش بہت کم لوگوں نے کرنی چاہی ہے:

① ہارون الرشید خلفاء عباسیہ میں پانچواں خلیفہ ہے۔ عباسیوں کو اپنے خاندان کی عظمت اور اہل عرب میں نسب کے اعتبار سے اشرف ہونے کا فخر تھا۔ تمام ملک عرب ان کی خاندانی سیادت و بزرگی کو تسلیم کرتا تھا۔ ان کی خاندانی عظمت ہی تھی جس کے سبب سے وہ بنوامیہ کے خلاف کوشش کرنے پر آمادہ اور پھر اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ اب جبکہ ان کو قریباً تمام عالم اسلام کی خلافت و حکومت بھی حاصل تھی تو ان کا فخر نسبی اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔ عرب کی عصبیت اور ناموس کا پاس و لحاظ بھی عام طور پر سختی کے ساتھ موجود تھا۔ اندریں صورت یہ کیسے ممکن تھا کہ ہارون الرشید خلیفہ اپنی بہن کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دے جس کو وہ نسباً غلام زادہ مجوسی النسل اور ایک نطفہ نا تحقیق شخص کا پوتا سمجھتا تھا۔ یہ مانا کہ وہ جعفر کو اپنا بھائی کہتا تھا اور اس کے باپ کو اپنا اتالیق ہونے کے سبب سے ابا جان کہہ کر پکارتا تھا لیکن بہن کا نکاح کرتے وقت وہ قوم و خاندان اور نسب کو فراموش نہیں کر سکتا تھا اور اگر ہارون الرشید آج کل

---

❶ ناول، افسانے جھوٹ اور سچ کے پلندے ہوتے ہیں۔ ان فرضی یا بعض حقیقی واقعات کو مرچ مصالحہ لگا کر لوگوں کو جس لٹریچر کا عادی بنایا جاتا ہے اور ان میں جیسا مزاج پیدا کیا جاتا ہے، اس سے ایسے ہی "ایمان" کی توقع ہوگی، العیاذ باللہ!

کے لوگوں کی طرح بیاہ شادی کے معاملہ میں بہت ہی زیادہ آزاد خیال ہو گیا تھا تو اس کے خاندان کے لوگ جو یک جدی اور تعداد میں بہت زیادہ موجود تھے، اس نکاح کو اپنی خاندانی بے عزتی سمجھ کر کسی طرح خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ اسی طرح خود عباسہ بھی اپنی ایسی بے عزتی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

② ہارون الرشید جیسا دین پسند شخص جو ایک سال حج اور ایک سال جہاد کرتا تھا اور عالم اسلام کا سردار و خلیفہ تھا، شراب نوشی کی مجلسیں گرم کرے، کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ بنو امیہ میں کسی ایک خلیفہ نے اگر کہیں نبیذ یا شراب استعمال کر لی تو ساری دنیا میں شور مچ گیا اور آج تک مورخین اس کے اس فعل بد کو خصوصیت سے بیان کرتے چلے آئے ہیں لیکن ہارون الرشید جو علماء اور نیک لوگوں کی مجلسوں میں تنہا جا جا کر پھٹے ہوئے بوریے پر بیٹھتا اور ان کی نصیحتیں سن کر زارو قطار روتا ہوا اٹھ کر آتا تھا، وہ بھلا شراب یعنی پیشاب جیسی پلید چیز سے کیا تعلق رکھ سکتا تھا۔ فضیل بن عیاض، ابن سماک، سفیان ثوری رحمہم اللہ جیسے بزرگ اس کے دوست و ہم نشین ہوں، پانچ وقت نماز نہایت پابندی اور خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھتا ہو، بالخصوص نماز فجر بہت ہی اول وقت پڑھنے کا عادی ہو اور پانچ وقت کی نمازوں کے علاوہ سو رکعت نفل روزانہ ادا کرتا ہو! ایسے شخص کو شراب خور بتانا کس قدر بے حیائی اور ظلم ہے۔ جس شخص نے رات کو شراب پی کر مجلس گرم کی ہو، وہ نماز فجر میں کیسے شامل ہو سکتا ہے۔ جس کو شراب پینے کی عادت ہو، اس کی نمازوں میں خشوع و خضوع کہاں پایا جا سکتا ہے۔

③ علماء عراق نے نبیذ کے جواز کا فتویٰ دے دیا تھا اور بعض امراء نبیذ کا استعمال کرتے تھے لیکن اس کو شراب کی بدمستیوں سے کوئی نسبت نہیں۔ ہارون الرشید کی نسبت تو یقینی طور پر یہ بھی ثابت نہیں کہ اس نے کبھی نبیذ کے دور چلائے ہوں اور ایسی مجلسیں گرم کی ہوں جیسی کہ مذکورہ جھوٹی روایت میں مذکور ہیں۔ ہارون الرشید کے زمانے تک عرب کی وہ سادگی اور سپاہیانہ زندگی موجود تھی جس میں شراب خوری کو کوئی دخل نہیں مل سکتا تھا۔ عربی شرافت جس کا ہارون سب سے زیادہ مدعی تھا، ہمیشہ سے شراب خوری کو مذموم اور برا ٹھہراتی تھی، حتیٰ کہ شرفائے عرب عہد جاہلیت میں بھی شراب نہیں پیتے تھے اور اس کو شرفاء کا شیوہ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور بہت سے شرفائے عرب عہد جاہلیت میں بھی

کبھی اس پلید چیز کے پاس تک نہیں گئے۔ ہارون الرشید اس ذلت و پستی کو احکام اسلام سے قطع نظر کر کے بھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔

④ اس بے دینی اور عام بے حمیتی کے زمانے میں بھی جبکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت باقی نہیں اور حکومت موجودہ کی طرف سے کوئی ممانعت نہیں، کوئی بے غیرت سے بے غیرت اور ذلیل سے ذلیل شخص بھی گو وہ کیسا ہی علانیہ شراب کیوں نہ پیتا ہو، یہ کسی طرح پسند نہیں کر سکتا کہ اس کی بہن بھی اس کے ساتھ شراب خوری کرے۔ ہمارے ملک میں چمار اور بھنگی شراب زیادہ پیتے ہیں۔ غالباً ان بھنگیوں اور چماروں سے بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی بہنوں کو لے کر غیر مردوں کے ساتھ شراب کے دور چلائیں، چہ جائیکہ ہارون الرشید عباسی جس کے دربار میں تابعین اور تبع تابعین موجود تھے، ایسی بے حیائی کا ارتکاب کرتا اور غیرت کے مارے مر نہ جاتا۔

⑤ جو لوگ زنا، چوری، شراب خوری کرتے ہیں، وہ عموماً اپنے اہل خاندان کو ان کاموں سے ہمیشہ باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہارون کو یہ پلید عادت ہو ہی گئی تھی تو وہ اپنی بہن کو تو ہرگز شراب خوری پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی چہیتی بیوی زبیدہ جس کے ساتھ اس کی محبت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی، غالباً سب سے پہلے اس شراب خوری میں اس کی شریک ہو سکتی تھی لیکن زبیدہ خاتون کی نسبت تو کسی نے اس قسم کا کوئی اشارہ تک بھی نہیں کیا اور اس کی زندگی کے دامن پر اس پلید چیز کی ذرا سی بھی کوئی چھینٹ نہیں پڑنے پائی۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ زبیدہ خاتون کے محل میں تو ہر وقت قرآن پڑھا جا رہا ہے اور اس کا عاشق خاوند جعفر و عباسہ کے ساتھ مصروف شراب نوشی ہے۔

⑥ مورخین نے یہ واقعہ باوثوق نقل کیا ہے کہ حکیم جبرئیل ایک یہودی طبیب ہارون الرشید کے دربار میں تھا۔ وہ دسترخوان پر خلیفہ کے ساتھ ہوتا اور جب کوئی مضر چیز دیکھتا تو خلیفہ کو اس کے کھانے سے روک دیتا تھا۔ ایک مرتبہ خلیفہ کے لیے مچھلی خوان میں لگ کر آئی۔ خلیفہ نے اس کو کھانے کا ارادہ کیا۔ حکیم نے خلیفہ کو اس کو کھانے سے روک دیا اور خانساماں سے کہا کہ اس کو اٹھا کر لے جاؤ۔ اس کے بعد اتفاقاً خلیفہ کے کسی خادم نے دیکھا کہ اسی مچھلی کو حکیم جبرئیل اپنی قیام گاہ پر جا کر خود نوش فرما رہے ہیں۔ اس وقت یہ حقیقت کھلی کہ حکیم نے مچھلی کو اپنے کھانے کے لیے روکا اور ہارون کو اس کے کھانے سے باز رکھا تھا۔ خادم نے یہ خبر خلیفہ تک پہنچا دی۔

بات تو یہ محض ہنسی کی تھی اور ہارون سوائے ہنسنے کے حکیم کو اور کچھ نہ کہتا لیکن حکیم کو جب معلوم ہوا کہ خلیفہ میری اس حرکت سے مطلع ہو چکا ہے تو اس نے مچھلی کے تین قتلے الگ الگ تین پیالوں میں رکھے۔ ایک پیالے میں گوشت اور دوسری کھانے کی چیزیں جو دسترخوان پر ہارون نے کھائی تھیں، ملا دی تھیں۔ دوسرے قتلے پر برف کا پانی ڈالا تھا۔ تیسرے پیالے میں شراب ڈال دی تھی۔ یہ تینوں پیالے خلیفہ کی خدمت میں پیش کر کے کہا کہ ان دونوں پیالوں میں آپ کا کھانا ہے اور تیسرے پیالے میں میرا کھانا ہے۔ دیکھا تو وہ دونوں قتلے چند ہی گھنٹہ کے بعد سڑ کر بدبو دینے لگے تھے اور جس پیالے میں شراب تھی، اس میں مچھلی کا گوشت پانی ہو کر شراب میں مل گیا تھا۔ اس طرح حکیم نے اپنی شرمندگی دور کی اور خلیفہ کو بتایا کہ میں چونکہ شراب پیتا ہوں، لہٰذا میرے لیے یہ مچھلی نقصان رساں نہ تھی اور آپ چونکہ شراب نہیں پی سکتے، لہٰذا میں نے مچھلی کو روک دیا تھا۔ اس حکایت سے بھی صاف ثابت ہے کہ ہارون الرشید کو شراب سے کوئی تعلق نہ تھا۔

⑦ حقیقت یہ ہے کہ عباسہ کی شادی ہارون نے محمد بن سلیمان سے کر دی تھی۔ جب محمد بن سلیمان کے فوت ہونے پر عباسہ بیوہ ہوگئی تھی تو اس کی دوسری شادی ابراہیم بن صالح بن علی سے کر دی جو ہارون کے قریبی رشتہ دار اور آل عباس تھے۔ ایک ایسی شریف و پاکباز عورت کی نسبت ایسا سفید اور بے سروپا جھوٹ بولنا، جھوٹ بولنے والے کی انتہائی رذالت وکمینہ پن کا ثبوت ہے اور جو شخص اس جھوٹ کو سچ ثابت کرانے کی کوشش کرے، اس کی افتاد فطرت بھی یقیناً بہت ہی پست و ذلیل ہو جاتی ہے۔ پھر سب سے عجیب بات اس سفید جھوٹ میں یہ ہے کہ جعفر و عباسہ کے ایک دوسرے کے چہرے پر نظر ڈالنے کو مباح کرنے میں تو ہارون کو شریعت کی پابندی کا اس قدر زیادہ خیال تھا مگر شراب خوری کرتے ہوئے وہ شریعت کو بھول جاتا تھا۔

استیصال برامکہ کی اصل حقیقت

حکومت وسلطنت ایسی چیز ہے کہ اس کے لیے بھائی بھائی کا اور باپ بیٹے کا دشمن بن جاتا ہے۔ سلطنتوں کی تاریخیں اس پر شاہد ہیں۔ عباسیوں نے بھی جس شخص کو اپنی حکومت وسلطنت کے لیے مضر محسوس کیا، اس کو بلادریغ قتل کر دیا۔ خلیفہ منصور نے ابومسلم کو جب دیکھا کہ وہ حکومت

وسلطنت کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتا ہے تو فوراً اس کا قصہ پاک کر دیا۔ بادشاہوں کی اس عادت اور روش خاص سے کبھی کبھی ان کے مصاحب اور اہل کار ناجائز فائدہ بھی اٹھا لیا کرتے ہیں یعنی جس شخص کو وہ بادشاہ کے ہاتھ سے نقصان پہنچوانا چاہتے ہیں، اس کی نسبت عموماً بغاوت ہی کا الزام ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ منصور کا حاجب یعنی افسر باڈی گارڈ ربیع بن یونس تھا جو عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے غلام کیسان کی اولاد میں سے تھا اور منصور کا سب سے بڑا معتمد تھا۔ منصور نے اس کو اپنا مصاحب ومشیر بھی بنا رکھا تھا۔ منصور کے زمانے میں وہ بہت بڑا اختیار واقتدار رکھتا تھا۔ ابو مسلم کے قتل کا مشورہ دینے والا ربیع ہی سمجھا جاتا تھا۔ خالد بن برمک کی جگہ منصور نے ابو ایوب کو وزیر بنایا تھا لیکن سنہ ۱۵۳ھ میں ربیع بن یونس کو وزیر بنایا مگر یہ حاجب ہی کے لقب سے مشہور رہا۔ منصور کی وفات کے وقت اسی نے خلافت مہدی کی بیعت کا اہتمام کیا۔ مہدی کے زمانے میں ربیع اپنے عہدہ وزارت پر قائم رہا مگر چونکہ وہ حاجب کے لقب سے مشہور تھا، اس لیے مہدی نے اس کے ساتھ ابو عبداللہ معاویہ بن یسار کو بھی وزارت کا عہدہ دے کر سلطنت کے اکثر صیغے اس کے سپرد کر دیے۔ ربیع نے چند روز کے بعد ابو عبداللہ کو معزول ومعتوب کرا کر قید کرا دیا۔ ابو عبداللہ کی جگہ مہدی نے یعقوب بن داؤد کو مامور کیا۔ یعقوب بن داؤد بھی چند روز کے بعد معزول ومعتوب ہوا۔ اس کے بعد مہدی نے فیض بن ابی صالح کو جو نیشاپور کے ایک عیسائی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وزارت کا عہدہ عطا کیا۔ غرض مہدی کے زمانہ میں ربیع بن یونس نے کسی وزیر کو کامیاب ومطمئن نہ ہونے دیا۔ حقیقتاً وہی وزارت کا مالک رہا۔

مہدی کے بعد ہادی کا زمانہ شروع ہوا تو ربیع بن یونس کا اقتدار اور بھی ترقی کر گیا کیونکہ ہادی نے وزارت کے تمام اختیارات اس کو سپرد کر دیے تھے۔ امور سلطنت سے خیزران کے دخل کو دور کرنا بھی ربیع کی تحریک کا نتیجہ تھا۔ ہادی اور ربیع کی وفات قریب ہی قریب واقع ہوئی۔ ربیع کے بیٹے فضل بن ربیع کو توقع تھی کہ مجھ کو ضرور کوئی بڑا عہدہ ملے گا لیکن ہارون نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی سلطنت کا تمام وکمال انتظام یحییٰ بن خالد کے سپرد کر دیا۔ یحییٰ بن خالد ابو مسلم کے گروہ کا آدمی تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، وہ ربیع بن یونس سے سخت عداوت رکھتا تھا کیونکہ ربیع ایک طرف قتل ابو مسلم کا محرک تھا تو دوسری طرف یحییٰ کے باپ خالد بن برمک کو نفرت کی نظر سے دیکھنے اور وزارت سے معزول کرا کر اپنے دوست ابو ایوب کو اس کی جگہ مقرر کرانے والا تھا۔ یحییٰ بن خالد نے

فضل بن ربیع کو کوئی عہدہ نہ دلوایا اور حاجب کے عہدے پر قائم رکھ کر اس عہدے کے تمام اختیارات چھین کر فضل بن ربیع کو عضو معطل بنا دیا۔ اب غالباً یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آ جائے گی کہ خاندان برمک اور فضل بن ربیع کی عداوت بہت پرانی اور مستحکم عداوت تھی۔ جوں جوں برمکیوں کا عروج ہوتا گیا اور ان کا اقتدار بڑھتا گیا، فضل بن ربیع کی عداوت اور حسد نے ضرور ترقی کی مگر وہ اس لیے کہ ہارون کو اس خاندان پر حد سے زیادہ اعتماد تھا، ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ ایسی حالت میں فضل بن ربیع کے لیے ایک ہی راہ عمل تھی کہ وہ برامکہ کی بے وفائی، غداری اور بغاوت کے ثبوت تلاش کرے اور اگر کوئی ایسی بات مل جائے تو خلیفہ کو ان سے بدگمان بنا کر اپنا دلی مقصد حاصل کرے۔

برمکی چونکہ تجربہ کار، ہوشیار اور بہت چوکس رہنے والے تھے، اس لیے فضل بن ربیع کو کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا کہ وہ ان کو متہم کرے لیکن وہ ان کے تمام اعمال و افعال کو غور و تجسس کی نگاہ سے ضرور مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ برمکیوں نے اپنی سخاوت اور زرپاشی کے ذریعہ سے اپنے اس قدر ہمدرد و ہوا خواہ بنا لیے تھے کہ فضل بن ربیع اپنے لیے کوئی راز دار بھی تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ ہارون الرشید اس کے قدیمی و خاندانی حقوق کو مدنظر رکھ کر کوئی عہدہ سپرد کرنا چاہتا بھی تھا مگر اس کی ماں خیزران بھی چونکہ فضل اور اس کے باپ ربیع سے ناراض تھی اور اس ناراضی میں یحییٰ اس کا شریک تھا، لہٰذا خیزران نے بیٹے کو اس ارادے سے باز رہنے کی تاکید کی۔ جب خیزران کا سنہ ۱۷۴ھ میں انتقال ہو گیا تو ہارون نے فضل بن ربیع کو حساب کتاب کے دفتر کا مہتمم بنا دیا اور اب فضل بن ربیع کو کسی قدر پہلے سے زیادہ رسوخ حاصل ہو گیا۔

یحییٰ بن عبداللہ جب دیلم سے فضل بن جعفر کے ساتھ آئے تھے تو ہارون الرشید نے عہد نامہ لکھ دینے کے باوجود ان کو قید کرنا چاہا اور اس معاملہ میں اول بعض فقہاء سے فتویٰ حاصل کیا۔ یہ خبر سن کر برمکیوں نے یحییٰ بن عبداللہ کے موافق کوششیں اور خلیفہ کی خدمت میں سفارشیں کیں کیونکہ وہ ابو مسلم خراسانی کے عقیدے پر قائم اور اہل بیت کے درپردہ حامی و مددگار تھے۔ ہارون نے جعفر بن یحییٰ کی نگرانی میں یحییٰ بن عبداللہ کو دے دیا اور کہہ دیا کہ تم ہی ان کو اپنے پاس نظر بند رکھو۔ جعفر نے یحییٰ بن عبداللہ کو بڑی عزت و آرام سے اپنے یہاں رکھا۔

سنہ ۱۸۰ھ میں جب ہارون الرشید نے علی بن عیسیٰ کو خراسان کا گورنر بنا کر بھیجا تو یحییٰ بن خالد نے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ علی کے اس تقرر کی مخالفت کی۔ یہ غالباً ہارون الرشید کا پہلا کام تھا

جو اس نے یحییٰ بن خالد کی منشاء اور خواہش کے خلاف کیا۔ یحییٰ اور اس کے بیٹے اور اس کے رشتہ دار چونکہ تمام ملکوں میں چھائے ہوئے تھے، لہٰذا برمکیوں نے علی بن عیسیٰ کو خراسان میں چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ یحییٰ کے بیٹے موسیٰ بن یحییٰ نے اپنے میسر شدہ ذرائع کو کام میں لا کر بغاوت پر بغاوت اور سرکشی پر سرکشی کرانی شروع کر دی۔ علی بن عیسیٰ کو اتفاقاً اس کا حال معلوم ہو گیا کہ خراسان میں یہ بدامنی کس کے اشارے سے ہو رہی ہے۔ اس نے ہارون الرشید کی خدمت میں یحییٰ بن موسیٰ کی شکایت لکھ کر بھیجی۔ اس شکایت اور یحییٰ کی اس مذکورہ مخالفت نے مِل کر ہارون الرشید کے دل میں ایک خیال اور شبہ پیدا کر دیا۔ جس کا نتیجہ تھا کہ جب برمکیوں کے اہتمام خاص سے علی بن عیسیٰ کی نسبت یہ خبریں دارالخلافت میں پہنچنی شروع ہوئیں کہ علی بن عیسیٰ بغاوت پر آمادہ ہے اور خلیفہ کے خلاف تیاریاں کر رہا ہے تو ہارون الرشید نے کسی امیر یا سپہ سالار کو اس طرف نہیں بھیجا بلکہ بہ ذات خود فوج لے کر خراسان کی طرف روانہ ہوا اور رے میں پہنچ کر مقام کیا۔ یہ سنہ ۱۸۶ھ کا واقعہ ہے۔

ابھی تک ہارون الرشید کو محض شبہ ہی شبہ تھا اور وہ برمکیوں کی نسبت کوئی بدگمانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کو یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ علی بن عیسیٰ کے خراسان میں رہنے کو برامکہ ناپسند کرتے ہیں۔ جب علی بن عیسیٰ نے موسیٰ بن یحییٰ اور یحییٰ بن خالد کے دوسرے بیٹوں اور رشتہ داروں کی شکایت لکھ کر بھیجی کہ یہی لوگ خراسان میں بدامنی پیدا کر رہے ہیں تو ہارون کی گہری توجہ مسئلہ خراسان کی طرف منعطف ہوگئی۔ اس نے برامکہ سے اس بات کو بالکل پوشیدہ رکھا اور برامکہ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ خلیفہ ہماری طرف کن گہری متجسس نگاہوں سے دیکھ رہا ہے؟ چنانچہ انہوں نے علی کی شکایتوں کی عرضیاں ہارون کے پاس بھجوائیں۔ اگر ان کو یہ بات محسوس ہو جاتی کہ ہماری طرف شبہ کی نگاہیں پڑ رہی ہیں تو وہ ہرگز عرضیاں نہ بھجواتے اور علی بن عیسیٰ کو بغاوت سے متہم نہ کراتے۔ اب جبکہ ہارون رے میں پہنچا اور علی بن عیسیٰ نیاز مندانہ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے تنہائی میں وہ تمام باتیں جو خراسان میں اس کو معلوم و محسوس ہوئی تھیں، ہارون کی خدمت میں گزارش کیں اور ظاہر کیا کہ تمام ملک خراسان اور اس کے متعلقہ و ہمسایہ صوبے درحقیقت برمکیوں کی مٹھیوں میں ہیں اور وہ نہایت اہتمام و احتیاط کے ساتھ ابو مسلم خراسانی کے خون کا بدلہ لینے کی تیاری کر چکے ہیں۔

ان باتوں کو سن کر ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ ہارون کے دل پر کیا گزری ہو گی اور کس طرح اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو گی۔ ایک طرف برمکیوں کا اقتدار و اختیار اس کی

آنکھوں کے سامنے تھا، دوسری طرف اس نے یہ باتیں سنیں۔ چنانچہ اس نے علی بن عیسیٰ کی ہمت افزائی کر کے مرو کی جانب رخصت کر دیا اور خود اپنے قلبی تاثرات کو احتیاط کے ساتھ پوشیدہ رکھ کر واپس ہوا۔علی بن عیسیٰ کے رخصت ہونے کے بعد اب فضل بن ربیع کو موقع ملا اور اس نے یہ وحشت انگیز خبر ہارون کے گوش گزار کی کہ جعفر برمکی نے یحییٰ بن عبداللہ کو رہا کر دیا ہے اور وہ خروج کی تیاریوں کے لیے کہیں چلے گئے ہیں۔ ہارون نے جعفر سے بر سبیل تذکرہ یحییٰ بن عبداللہ کا حال دریافت کیا۔جعفر نے کہا کہ وہ میرے پاس بہ دستور نظر بند ہیں۔ ہارون نے کہا کہ کیا تم یہ بات قسمیہ کہہ سکتے ہو؟ یہ سنتے ہی جعفر حواس باختہ ہو گیا اور سمجھ گیا کہ راز افشا ہو چکا ہے۔اس نے سنبھل کر کہا کہ یحییٰ بن عبداللہ کو میرے زیر نگرانی رہتے ہوئے عرصہ دراز گزر چکا تھا اور مجھ کو ان کی طرف سے کسی قسم کے خطرہ کا اندیشہ نہ تھا۔اس لیے میں نے ان کو رہا کر دینے میں کوئی حرج نہیں دیکھا۔ ہارون کے لیے یہی سب سے نازک موقع تھا۔اس وقت اگر وہ کسی ناراضی کا اظہار کرتا تو پھر برامکہ ہرگز ہرگز اس کے قابو میں نہیں آ سکتے تھے اور وہ فوراً اپنی حفاظت کے لیے وہ تمام سامان کام میں لے آتے جو اب تک مادی اور معنوی اعتبار سے وہ فراہم کر چکے تھے۔

ہارون کے لیے برامکہ کا مقابلہ ہرگز آسان نہ تھا اور ممکن تھا کہ وہ ہارون کو سانس لینے اور اف کرنے کا بھی موقع نہ دیتے کیونکہ خاص یحییٰ بن خالد کے بیٹوں اور پوتوں میں پچیس آدمی جو صاحب سیف وقلم تھے، ہارون کے محل میں مختلف حیثیتوں اور مختلف بہانوں سے ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔تمام ملکوں کے انتظام واہتمام کی کنجی برامکہ کے ہاتھ میں تھی۔فوجوں کے سردار سب ان کے آوردے اور انہیں کے فرماں بردار تھے۔انتظامی افسر اور دفتروں کے اعلیٰ عہدے دار سب انہیں کے رکھے ہوئے تھے۔علماء وفقہاء وصوفیاء بھی ان کی گرفت سے باہر نہ تھے کیونکہ وہ ان لوگوں کی بڑی خدمت کرتے اور ان کو زیر بار احسان رکھتے تھے۔شعراء سب انہیں کے قصیدہ خواں تھے۔تمام رعایا میں ان کی سخاوت کی شہرت تھی، اس لیے یہ مغرب سے لے کر مشرق تک محبوب خلائق بن چکے تھے۔ یہ وہ عظیم الشان تیاریاں تھیں کہ میدان میں نکل کر ایک ہارون کیا کئی ہارون بھی شاید کامیاب نہ ہوتے، لیکن ہارون نے اپنے آپ کو سنبھالا اور جعفر سے یحییٰ بن عبداللہ کے رہا ہونے کا حال سن کر نہایت بے پرواہی سے جواب دیا کہ میں نے اس وقت ویسے ہی اتفاقیہ دریافت کیا تھا۔تم نے اس کو چھوڑ دیا، بہت ہی اچھا کیا۔میں خود اس وقت تم سے یہی کہنے والا تھا کہ یحییٰ بن عبداللہ کو رہا کر دو۔

اب ہر شخص غور کر سکتا ہے کہ یحییٰ بن عبداللہ جیسے شخص کا رہا ہونا ہارون الرشید کے لیے بجلی کے ٹوٹ پڑنے سے کم نہ تھا۔ علویوں کے خروج سے عباسی اب تک مطمئن نہ ہوئے تھے اور یحییٰ بن عبداللہ کوئی معمولی شخص نہ تھا جس کے آزاد ہونے کو ہارون معمولی واقعہ سمجھتا۔ بہر حال ہارون نے اس موقع پر فتح حاصل کی اور اپنی دلی حالت کو چھپایا۔ اسی زمانے میں یہ اتفاقی واقعہ پیش آیا کہ جعفر کے یہاں کسی ضیافت کے موقع پر اکثر اراکین سلطنت اور ایرانی النسل سردار موجود تھے۔ اسی جلسہ میں کسی شخص نے کہا کہ ابومسلم نے کیسی قابلیت سے سلطنت کو ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل کر دیا۔ جعفر نے یہ سن کر کہا کہ یہ کوئی زیادہ قابل تعریف کام نہ تھا کیونکہ چھ لاکھ آدمیوں کا خون بہا کر ابومسلم نے یہ کام انجام دیا۔ قابلیت اور خوبی کی بات تو یہ ہے کہ سلطنت ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں تبدیل ہو جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اس جلسہ میں کوئی ایسا شخص بھی موجود تھا جس نے یہ تمام گفتگو ہارون الرشید کو سنائی اور اس کو یقین ہو گیا کہ جعفر برمکی خود ایسا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد اس نے برامکہ کو غافل کرنے کے لیے اپنے بیٹے کی ولی عہدی اور تینوں بیٹوں کے درمیان ملکوں کے تقسیم کرنے کی دستاویز مرتب کرنے کا کام شروع کر دیا۔ یہ اس قسم کے کام تھے کہ کوئی خلیفہ اتنی بڑی سازش سے مطلع ہو کر ان کاموں کو ہرگز شروع نہیں کر سکتا تھا۔ یہی ہارون کا سب سے بڑا دھوکہ تھا جو اس نے برامکہ کو دیا۔ ان سب باتوں میں وہ زیادہ وقت بھی صرف نہیں کر سکتا تھا اور تادیر برامکہ کو غافل بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۶ھ کے آخری مہینوں میں وہ رے سے واپس ہوا۔ موتمن کی ولی عہدی کی بیعت لی، تقسیم نامہ لکھا، امین اور مامون سے عہد نامے لکھا کر دستخط کرائے، حج کے لیے گیا، خانہ کعبہ میں اس عہد نامہ کو لٹکایا، لوگوں میں خیرات تقسیم کی۔ مدینہ منورہ میں آکر انعامات وخیرات تقسیم کر کے واپس ہوا اور مقام انبار میں پہنچ کر یکا یک محرم سنہ ۱۸۷ھ کی آخری تاریخ وقت شب جس کی صبح کو یکم ماہ صفر تھی، جعفر کو قتل کر کے اس کے باپ اور بھائیوں کو قید کر لیا اور کسی کو کوئی حرکت کرنے کا مطلق موقع نہیں دیا۔

مقام انبار میں پہنچ کر ہارون الرشید نے ایک روز رات کے وقت اپنے حاجب مسرور کو بلوایا اور کہا کہ ایک قابل اعتماد جماعت کو لے کر اسی وقت جعفر کے خیمہ میں جاؤ اور اس کو خیمہ کے دروازے پر طلب کر کے اس کا سر اتار لاؤ۔ مسرور اس حکم کو سن کر سہم گیا مگر ہارون نے سختی سے کہا کہ میرے اس حکم کی فوراً بلاتوقف تعمیل ہونی چاہیے۔ مسرور اسی وقت رخصت ہوا اور جعفر کے خیمہ میں جا کر اس

کا سر اتار لایا۔ اسی شب میں خلیفہ ہارون نے جعفر کے بھائی اور باپ فضل و یحییٰ کو بھی گرفتار کر کے قید کر دیا اور فوراً ایک حکم عام جاری کر کے کہا کہ جعفر، فضل اور یحییٰ کی تمام جائیداد جہاں کہیں ہو، ضبط کر لی جائے۔ اس کے بعد برامکہ خاندان کے ہر ایک متنفس کو گرفتار و قید کر لیا گیا۔ برمکیوں کے تمام آوردوں کو ولایتوں کی حکومت اور ذمہ داری کے عہدوں سے معزول کر دیا گیا۔ اس طرح ہارون الرشید نے ایک ہی رات میں برمکیوں کے خطرہ کو مٹا کر اطمینان حاصل کیا اور اس کام کو اس خوبی اور اہتمام کے ساتھ کیا کہ کسی کو بھی کان ہلانے کا موقع نہ ملا۔ یحییٰ بن خالد کے بھائی محمد بن خالد برمکی کی وفاداری پر ہارون الرشید کو اعتماد تھا اور ممکن ہے کہ محمد بن خالد ہی نے محض راز کی باتوں سے ہارون الرشید کو آگاہ کیا ہو۔ اس لیے ہارون الرشید نے محمد بن خالد کو گرفتار و قید نہیں کیا۔ ادھر ہارون الرشید کے خاندان کا ایک معزز رکن عبدالملک بن صالح بن علی بن عبداللہ بن عباس جو رشتہ میں ہارون الرشید کا دادا تھا، برمکیوں کی سازش میں شریک تھا، جس کو خلافت کی توقع دلائی گئی تھی۔ برمکیوں کو قید کرنے کے بعد ہارون الرشید نے عبدالملک بن صالح کو بھی قید کر دیا۔ عبدالملک بن صالح کے بیٹے عبدالرحمٰن نے اپنے باپ کے خلاف گواہی دی تھی۔ عبدالملک مامون الرشید کے زمانے تک قید رہا۔ مامون نے اپنے عہد حکومت میں اس کو قید سے آزاد کیا۔ ابراہیم بن عثمان بن نہیک بھی برمکیوں کا شریک تھا۔ لہٰذا اس کو بھی قتل کیا گیا۔ یحییٰ برمکی نے سنہ ۱۹۰ھ میں اور فضل برمکی نے سنہ ۱۹۳ھ میں بہ حالت قید وفات پائی۔

برامکہ چونکہ لوگوں کو روپیہ بے دریغ دیتے تھے اور شعراء کی خوب قدردانی کرتے تھے، لہٰذا ان کی بربادی کے بعد عالم لوگوں کو جو اصلیت سے ناواقف تھے، ملال ہوا اور انہوں نے ہارون الرشید کو ظالم قرار دیا۔ شعراء نے ان کے مرثیے لکھے، قصہ گویوں نے ان کی سخاوت اور خوبیوں کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا۔ ہارون الرشید نے برامکہ کے حالات کو افشا نہیں ہونے دیا اور نہایت سختی کے ساتھ احکام جاری کیے کہ کوئی شخص برامکہ کا نام تک نہ لے۔ لہٰذا خود ہارون الرشید کے زمانے میں بھی عام لوگ قتل برامکہ کے صحیح اسباب کو معلوم نہ کر سکے۔ اگر برامکہ کی غداری اور سازش کا حال عوام کو معلوم ہو جاتا تو اس میں ہارون الرشید اور سلطنت عباسیہ کی ہواخیزی ہونے کے علاوہ فوراً نئی سازشوں کے پیدا اور سرسبز ہونے کا قوی احتمال تھا۔ ہارون الرشید کی یہ بھی کمال دوراندیشی تھی کہ اس نے برامکہ کے متعلق کوئی بیان شائع نہیں کیا۔ اس طرح ہارون کی ہیبت دلوں پر طاری اور لوگوں کی بہ دستور

حیرت جاری رہی، اور یہی سلطنت عباسیہ کے لیے مناسب بھی تھا۔ اگر برامکہ کی بربادی کے متعلق عام طور پر رائے زنی کا موقع دے دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ برامکہ کے ہواخواہوں اور مداحوں کی تعداد ہر جگہ عوام میں زیادہ تھی۔ ان لوگوں کی زبانیں کھل جاتیں تو کرہ ہوائی یقیناً سلطنت عباسیہ کے خلاف پیدا ہوجاتا۔ اس موقع پر سوائے اس تدبیر کے جو ہارون الرشید نے استعمال کی، اور کوئی تدبیر مفید نہیں ہوسکتی تھی۔

برامکہ چونکہ محبت اہل بیت اور خیر خواہ آل ابی طالب ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، لہٰذا ان کے قتل و تباہی کو آل ابی طالب نے اپنا نقصان وزیاں محسوس کیا اور آج تک بھی شیعیان علی اور شیعیان حسین برامکہ کے قتل و تباہی پر نوحہ زنی کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں اور ان کی علم دوستی و عالم پروری بڑے مبالغہ اور رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ حالانکہ اس مجوسی النسل خاندان نے دین اسلام اور ملت اسلامیہ کی غیر معمولی اور اہم خدمت انجام نہیں دی۔ ان کے قتل و بربادی کے اسباب بالکل عیاں اور روشن ہیں، جس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اپنی سلطنت کو بچانے اور محفوظ رکھنے کے لیے ہارون الرشید نے برمکیوں کو تباہ کردیا۔ جس طرح ہر ایک بادشاہ اپنی بادشاہت کے بچانے کے لیے دشمنوں کو برباد کردیا کرتا ہے۔ اس نے جہاں برامکہ کو قید کیا ہے، اپنے دادا کو بھی قید کردیا کیونکہ اس کا جرم بھی اسی قسم کا تھا۔ ایسی صاف بات میں دور از کار اور بے سروپا باتوں کو شامل کرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔

عہد ہارون کے بقیہ حالات:

عہد ہارون الرشید کے حالات اور قابل تذکرہ واقعات بیان کرتے ہوئے ہم سنہ ۱۸۷ھ تک پہنچ گئے ہیں۔ واقعہ برامکہ کے بعد سنہ ۱۸۷ھ میں خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے بیٹے موتمن کو صوبہ عاصم کی طرف روانہ کیا۔ موتمن نے بلاد روم کی طرف فوج کشی شروع کی اور عباس بن جعفر بن اشعث کو قلعہ سنان کے محاصرہ کے لیے روانہ کیا۔ رومی تاب مقاومت نہ لاسکے اور تین سو بیس مسلمان قیدیوں کو واپس دے کر مسلمانوں سے صلح کرلی۔ انہیں ایام میں یہ واقعہ پیش آیا کہ رومیوں نے ملکہ ایرینی اپنی قیصرہ کو معزول کرکے اس کی جگہ نیسی فورس یا نقفور نامی ایک سردار کو اپنا قیصر بنالیا۔ پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ رومیوں نے شارلمین بادشاہ فرانس کی فتوحات اطالیہ سے متاثر ہوکر ہارون الرشید

سے دب کر صلح کر لی تھی، اب نقفور نے تخت نشین ہو کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شارلمین سے صلح کی اور اس طرف سے اپنی حدود سلطنت متعین کرا کر اور مطمئن ہو کر ہارون الرشید کو ایک خط لکھا کہ:

''ملکہ نے اپنی فطری کمزوری کے سبب سے تم سے دب کر صلح کر لی تھی اور تم کو خراج بھی دیتی رہی لیکن یہ اس کی نادانی تھی۔ اب تم کو چاہیے کہ جس قدر خراج تم ہماری سلطنت سے وصول کر چکے ہو، وہ سب واپس کر دو اور جرمانہ میں ہم کو خراج دینا منظور کرو ورنہ پھر تلوار کے ذریعہ سے تم کو سزا دی جائے گی۔''

یہ خط جب ہارون الرشید کے پاس پہنچا تو اس کے چہرے سے اس قدر طیش وغضب کے آثار نمایاں ہوئے کہ امراء و وزراء اس کے سامنے دربار میں بیٹھنے کی تاب نہ لا سکے اور خاموشی و آہستگی کے ساتھ دربار سے کھسک آئے۔ ہارون نے اسی وقت قلم دوات لے کر اس خط کی پشت پر لکھا کہ:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، از جانب امیر المومنین ہارون الرشید بنام سگ روم، او کافر کے بچے! میں نے تیرا خط پڑھا۔ اس کا جواب تو آنکھوں سے دیکھے گا، سننے کی ضرورت نہیں! فقط۔''

یہ جواب لکھ کر خط واپس بھیج دیا اور اسی روز لشکر لے کر بغداد سے بلاد روم کی طرف روانہ ہو گیا اور جاتے ہی رومیوں کے دارالسلطنت ہرقلہ کا محاصرہ کر لیا۔ نقفور حیران و پریشان ہو گیا اور تاب مقاومت نہ لا کر ہارون الرشید کی خدمت میں عفو تقصیرات کا خواہاں ہوا اور جزیہ دینے کا اقرار کیا۔ ہارون، نقفور کو مغلوب و ذلیل کر کے پہلے سے زیادہ جزیہ ادا کرنے کا اقرار لے کر واپس ہوا۔ ابھی شہر رقہ تک ہی واپس آیا تھا کہ نقفور نے نقض عہد کیا اور پھر بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ اس کو یقین تھا کہ موسم سرما کی شدت کے سبب سے مسلمانوں کی فوجیں فوراً حملہ آور نہیں ہو سکتیں مگر ہارون الرشید یہ سنتے ہی شہر رقہ سے پھر ہرقلہ کی جانب روانہ ہوا اور بلاد روم میں داخل ہو کر بہت سے قلعوں کو فتح کر کے مسمار کر دیا اور فتح کرتے ہوئے نقفور تک پہنچ گیا۔ اس نے پھر عاجزانہ معافی کی درخواست پیش کی۔ ہارون نے اس سے جزیہ کی رقم تمام وکمال وصول کی اور اکثر حصہ ملک پر اپنا قبضہ جما کر واپس ہوا۔

اسی سال یعنی سنہ ۱۸۷ھ میں ابراہیم بن ادہم نے وفات پائی۔

سنہ ۱۸۸ھ میں قیصر روم نقفور نے پھر سرکشی کی علامات ظاہر کیں۔ لہٰذا ابراہیم بن جبرئیل نے

حدود صفصفات سے بلاد روم پر حملہ کیا۔ قیصر روم خود مقابلہ کے لیے نکلا لیکن تاب مقابلہ نہ لا سکا۔ شکست فاش کھا کر اور چالیس ہزار رومیوں کو قتل کرا کر فرار ہوا۔ اسلامی لشکر رومیوں کو شکست دے کر واپس چلا آیا۔

سنہ ۱۸۹ھ میں خلیفہ ہارون الرشید رے کی طرف گیا اور خراسان کی طرف کے صوبوں کے عمال کے عزل ونصب سے جدید انتظام کیا۔ مرزبان دیلم کے پاس امان نامہ بھیج کر اس کی دل جوئی کی۔ سرحدوں کے رؤسا اور فرماں روا اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی فرماں برداری کا یقین دلایا۔ طبرستان، رے، قومس اور ہمدان وغیرہ کی حکومت عبدالملک بن مالک کو مرحمت کی۔ اسی سال رومیوں اور مسلمانوں میں قیدیوں کا تبادلہ ہوا۔ اسی سال امام محمد بن حسن شیبانی شاگرد امام ابوحنیفہ نے رے کے قریب موضع زنبویہ میں وفات پائی۔ اسی روز کسائی نحوی بھی فوت ہوا۔ یہ دونوں ہارون الرشید کے ہمراہ تھے۔ ہارون الرشید دونوں کے جنازے میں شریک تھا۔ جب قبرستان سے واپس آئے تو ہارون الرشید نے کہا کہ آج ہم فقہ اور نحو دونوں کو دفن کر آئے۔

سنہ ۱۹۰ھ میں ہارون الرشید نے اپنے بیٹے مامون کو اپنا نائب بنا کر رقہ میں مقیم کیا اور تمام انتظام سلطنت اس کے سپرد کر کے نقفور قیصر روم کی بدعہدی کی وجہ سے بلاد روم پر ایک لاکھ ۳۵ ہزار فوج سے حملہ کیا۔ ہرقلہ کا محاصرہ کیا اور تیس یوم کے محاصرہ کے بعد بہ زور تیغ فتح کر لیا اور رومیوں کو قتل وگرفتار کیا، پھر داؤد بن عیسیٰ بن موسیٰ کو ستّر ہزار فوج کے ساتھ بلاد روم کے دوسرے قلعوں کو فتح کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس فوج نے تمام بلاد روم کو ہلا ڈالا۔ انہیں دنوں شرحبیل بن معن بن زائدہ نے قلعہ سقالیہ وبسہ اور دوسرے قلعوں کو فتح کیا۔ یزید بن مخلد نے قونیہ کو فتح کیا۔ عبداللہ بن مالک نے قلعہ ذی الکلاع کو فتح کر لیا۔ حمید بن معیوف امیر البحر نے سواحل شام ومصر کی کشتیوں کو درست کر کے جزیرہ قبرص پر چڑھائی کر دی اور اہل قبرص کو شکست دے کر تمام جزیرہ کو لوٹ لیا اور سترہ ہزار آدمیوں کو گرفتار کر لایا۔ اس کے بعد ہارون نے طوانہ کا محاصرہ کیا۔ غرض رومی سلطنت کو مسلمانوں نے تہ وبالا کر کے اس کو مٹا ڈالنے اور روز کے جھگڑوں کو ایک ہی مرتبہ طے کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ نقفور نے سخت عاجزانہ اور مجبور ہو کر جزیہ دینا قبول کر کے ہارون الرشید کے پاس پچاس ہزار اشرفی کی رقم بطور جزیہ روانہ کی، جس میں اپنی ذات کا جزیہ چار دینار اور اپنے لڑکے اور بطریق کی طرف سے دو دو دینار روانہ کیے تھے اور خلیفہ ہارون کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ قیدیان ہرقلہ میں

سے فلاں عورت مجھ کو واپس مرحمت فرما دی جائے کیونکہ اس سے میرے بیٹے کی منگنی ہوگئی ہے۔ خلیفہ نے اس درخواست کو منظور کرلیا اور اس عورت کو روانہ کر دیا۔ نقفور کی الحاح وزاری پر رحم کر کے اس کا ملک اسی کو واپس کر کے تین لاکھ اشرفی سالانہ خراج اس پر مقرر کر کے ہارون واپس ہوا مگر واپسی کے بعد ہی رومیوں نے پھر بغاوت وسرکشی اختیار کر لی۔ اسی سال یعنی سنہ ۱۹۰ھ میں موصل کی گورنری پر خالد بن یزید بن حاتم کو مامور کیا گیا۔ اسی سال ہرثمہ بن اعین قلعہ طرطوس کی تعمیر پر مامور کیا گیا۔ خراسان کی تین ہزار فوج اور مصیصہ وانطاکیہ کی ایک ہزار فوج قلعہ طرطوس کی تعمیر میں مصروف رہی اور سنہ ۱۹۲ھ میں قلعہ کی تعمیر تکمیل کو پہنچی۔ اسی قسم کی فوج کو آج کل سفر مینا کی پلٹن کہا جاتا ہے۔ اسی سال آذربائیجان میں خرمیہ نے علم بغاوت بلند کیا۔ اس کی سرکوبی کے لیے عبداللہ بن مالک دس ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ عبداللہ نے باغیوں کو شکست فاش دے کر قیدیوں کو قتل کر ڈالا اور اس فتنہ کا سدباب ہوا۔ اسی سال یعنی ۳ محرم سنہ ۱۹۰ھ کو یحییٰ برمکی نے ستّر برس کی عمر میں بمقام رقہ بہ حالت قید وفات پائی۔ اس کے بیٹے فضل بن یحییٰ نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

سنہ ۱۹۱ھ میں محمد بن فضل بن سلیمان کو خلیفہ ہارون الرشید نے موصل کی گورنری مرحمت فرمائی اور مکہ مکرمہ کی امارت پر فضل بن عباس کو مامور کیا گیا۔

خراسان میں بغاوت:

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ علی بن عیسیٰ کے گورنر خراسان مقرر ہونے پر برامکہ نے وہب بن عبداللہ اور حمزہ بن اترک کو بغاوت پر آمادہ کرلیا تھا۔ وہب تو مارا گیا تھا لیکن حمزہ باقی تھا۔ وہ ابھی تک ہاتھ نہیں آیا تھا اور جابہ جا ڈاکہ زنی کرتا پھرتا تھا۔ علی بن عیسیٰ خراسان نے سمرقند اور ماوراء النہر کی ولایت پر اپنی طرف سے یحییٰ بن اشعث کو عامل مقرر کر رکھا تھا۔ ماوراء النہر کی فوج میں رافع بن لیث بن نصر بن سیار مشہور سردار تھا۔ رافع بن لیث بھی برامکہ کی جماعت کا آدمی تھا اور علی بن عیسیٰ وخلیفہ ہارون سے متنفر تھا۔ اتفاقاً یحییٰ بن اشعث نے ایک عورت سے نکاح کیا۔ چند روز کے بعد رافع بن لیث نے اس عورت کو بہکایا۔ اس نے یحییٰ سے علیحدگی چاہی مگر یحییٰ نے اس کو طلاق نہ دی۔ رافع نے اس کو یہ تدبیر بتائی کہ تو اپنے مرتد ہونے کا اعلان کر اور دو گواہ مرتد ہونے کے پیش کر دے، فوراً یحییٰ سے تیرا نکاح ٹوٹ جائے گا، اس کے بعد پھر اسلام قبول کر لینا۔ میں تجھ سے نکاح کرلوں گا۔

عورت نے یہی تدبیر کی اور رافع کے نکاح میں آ گئی۔ غالباً نکاح فسخ کرانے کی یہ تدبیر سب سے پہلے رافع نے ایجاد کی تھی۔ یحییٰ بن اشعث نے یہ تمام کیفیت خلیفہ ہارون الرشید کی خدمت میں لکھ کر بھیج دی۔ ہارون الرشید نے علی بن عیسیٰ گورنر خراسان کو لکھا کہ رافع اور اس عورت میں علیحدگی کرا کر رافع پر حد شرعی جاری کرو اور شہر سمرقند میں گدھے پر سوار کرا کر تشہیر کراؤ۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں رافع کو اس عورت سے جدا کرا کر سمرقند کے جیل خانہ میں قید کر دیا گیا۔ ایک روز موقع پا کر رافع قید خانہ سے نکل بھاگا اور گورنر خراسان علی بن عیسیٰ کے پاس بلخ میں پہنچا۔ علی بن عیسیٰ نے اس کو قتل کرنا چاہا مگر علی کے بیٹے عیسیٰ بن علی نے سفارش کی اور علی بن عیسیٰ نے اس کو حکم دیا کہ تم سمرقند میں یحییٰ بن اشعث کے پاس جاؤ۔ رافع نے سمرقند پہنچ کر عامل سمرقند کو دھوکے سے قتل کر دیا اور خود سمرقند پر قابض ہو گیا۔ یہ خبر سن کر علی بن عیسیٰ نے اپنے بیٹے عیسیٰ بن علی کو سمرقند کی طرف روانہ کیا۔ رافع سے لڑتا ہوا عیسیٰ بن علی لڑائی میں مارا گیا۔ یہ خبر سن کر علی بن عیسیٰ لشکر لے کر بلخ سے مرو کی طرف اس خیال سے آیا کہ کہیں رافع مرو پر قبضہ نہ کر لے۔ یہ سنہ ۱۹۱ھ کا واقعہ ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے رافع کی چیرہ دستی کا حال سن کر علی بن عیسیٰ کو خراسان کی امارت وحکومت پر روانہ کیا۔ حقیقت یہ تھی کہ رافع کے ساتھ لشکر خراسان کے تمام بڑے بڑے سردار اور برامکہ کی جماعت کے آدمی شامل ہو گئے تھے۔ ہرثمہ بن اعین نے سمرقند پہنچ کر رافع بن لیث کو محصور کر لیا۔ رافع نے سمرقند میں محصور ہو کر مدافعت شروع کی۔ یہ محاصرہ عرصہ دراز تک جاری رہا۔

ہارون الرشید کی وفات:

رومیوں کی سرکوبی سے فارغ ہو کر اور نقفور کو مغلوب وذلیل کر کے اور اس سے جزیہ کی رقم وصول کرنے کے بعد خلیفہ ہارون الرشید رقہ میں واپس آیا۔ یہاں آ کر اس کو رافع بن لیث کی چیرہ دستی اور بعض امرائے خراسان کی سرکشی کا حال معلوم ہوا۔ اس نے خود خراسان کا قصد کیا اور لشکر فراہم کر کے ماہ شعبان سنہ ۱۹۲ھ میں رقہ سے بغداد پھر خراسان سے بغداد کی جانب روانہ ہوا۔ ہارون نے روانگی کے وقت رقہ میں موتمن کو نائب السلطنت بنا کر خزیمہ بن خازم کو اس کے پاس چھوڑا۔ بغداد میں اپنے بیٹے امین کو اپنا قائم مقام بنا کر مامون کو ہی بغداد میں امین کے پاس رہنے کا حکم دیا۔ مامون کے کاتب فضل بن سہیل نے مامون سے کہا کہ آپ کا دارالخلافہ بغداد میں امین کے پاس

رہنا مناسب نہیں۔ آپ خلیفہ کے ہمراہ چلنے کی کوشش کریں۔ مامون نے خلیفہ ہارون الرشید سے ہم سفر وہم رکاب رہنے کی التجا کی اور خلیفہ نے اس خواہش کو منظور کر لیا۔ ہارون الرشید بغداد سے روانہ ہونے کو تھا کہ رقہ میں فضل بن یحییٰ برمکی محرم سنہ ۱۹۳ھ کو بہ حالت قید فوت ہوا۔ بغداد سے روانہ ہو کر ماہ صفر سنہ ۱۹۳ھ میں خلیفہ جرجان میں پہنچا۔ جرجان میں پہنچ کر خلیفہ کی بیماری نے خطرناک صورت اختیار کی۔ ہارون جس زمانہ میں بلاد روم کے اندر مصروف قلعہ شکنی تھا، اسی زمانہ میں بیمار ہو گیا تھا۔ رقہ میں بیمار ہی پہنچا تھا۔ وہاں سے بغداد آیا، تب بھی علیل تھا اور اسی حالت علالت میں خراسان کی طرف فوج لے کر روانہ ہوا تھا۔ خلیفہ نے جرجان میں تمام سرداران لشکر کے روبہ رو یہ اعلان کیا کہ میرے ساتھ اس وقت جس قدر فوج اور سامان ہے، یہ سب ملک خراسان اور مامون سے متعلق رہے گا۔ اس تمام لشکر اور تمام سامان کا مالک مامون ہے اور یہ تمام سردار وسپہ سالار بھی مامون ہی کے تابع فرمان رہیں گے۔ اس طرح مامون کا اطمینان کر کے جرجان سے مامون کو مرو کی طرف بھیج دیا اور اس کے ساتھ عبداللہ بن مالک، یحییٰ بن معاذ، اسد بن خزیمہ، عباس بن جعفر بن محمد بن اشعث اور نعیم بن حازم وغیرہ سرداروں کو بھیجا۔ مامون کو مرو کی جانب روانہ کرنے کے بعد خود جرجان سے روانہ ہو کر طوس چلا گیا۔ اس وقت اس کے ساتھ فضل بن ربیع، اسماعیل بن صبیح، مسرور حاجب، حسین، جبرئیل بن بختیشوع وغیرہ موجود تھے۔ طوس پہنچ کر علالت نے یہاں تک ترقی کی کہ ہارون الرشید صاحب فراش ہو گیا۔ ہرثمہ بن اعین اور رافع بن لیث کے مقابلہ کا حال آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ ہرثمہ نے ابھی تک رافع کو مغلوب نہیں کیا تھا لیکن بخارا فتح ہو کر رافع کا بھائی بشیر بن لیث گرفتار ہو چکا تھا۔ ہرثمہ نے بشیر کو خلیفہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ جب ہارون الرشید طوس میں بستر علالت پر پڑا ہوا تھا، اس وقت بشیر اس کے پاس پہنچ کر حاضر کیا گیا۔ ہارون نے اس کو قتل کرنے کا حکم دیا اور اس کو بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کیا گیا۔ بشیر کے قتل کرنے کا حکم دے کر ہارون بے ہوش ہو گیا۔ جب اس کو ہوش آیا تو جس مکان میں ٹھہرا ہوا تھا، اسی مکان کے ایک گوشہ میں قبر کھود نے کا حکم دیا۔ جب قبر کھد کر تیار ہو گئی تو چند حافظوں نے قبر میں اتر کر ختم قرآن کیا۔[1] ہارون نے

---

[1] سنداً یہ واقعہ کس پایہ کا ہے؟ یہ تحقیق طلب ہے۔ اگر صحیح بھی ہو تو یہ واقعہ ہمارے لیے حجت نہیں۔ جو امر قرآن وسنت کے خلاف ہو، اس کا غلط ہونا بالکل ظاہر ہے۔ قرآنی خوانی اور ختم قرآن کے نام سے ہمارے معاشرہ میں جو رسم یا رسوم کا سلسلہ جاری ہے، یہ صریحاً بدعت کے زمرہ میں آتا ہے۔ کیوں کہ قرآن وسنت سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

اپنی چارپائی قبر کے کنارے بچھوا لی اور چارپائی پر پڑے پڑے قبر کو دیکھتا رہا۔ اسی حالت میں ۳ جمادی الثانی سنہ۱۹۳ھ مطابق ۲۴ مارچ سنہ ۸۰۸ء بہ وقت شب انتقال کیا۔ اس کے لیے بیٹے صالح نے نماز جنازہ کی نماز پڑھائی۔ ہارون الرشید نے ۲۳ سال ڈھائی مہینے خلافت کی۔ اس کی قبر طوس میں موجود ہے۔

ہارون الرشید کا نکاح زبیدہ بنت جعفر بن منصور سے ہوا تھا۔ زبیدہ کی کنیت ام جعفر تھی۔ محمد امین اسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ علی، عبداللہ، مامون، قاسم، موتمن، محمد معتصم، صالح، محمد ابوموسیٰ، محمد ابو یعقوب، ابوالعباس، ابوسلیمان، ابوعلی، ابواحمد یہ سب بیٹے امہات اولاد سے پیدا ہوئے تھے۔ ہارون الرشید کے ان بیٹوں میں امین، مامون، موتمن اور معتصم چار زیادہ مشہور ہیں۔ معتصم پڑھا لکھا نہ تھا۔ اسی لیے اس کو ہارون نے ولی عہدی کے قابل نہیں سمجھا مگر وہ خلیفہ ہوا اور اسی کی اولاد سے بہت سے عباسی خلیفہ ہوئے اور اسی سے ہارون الرشید کی نسل چلی۔ ہارون الرشید نے مرتے وقت جس طرح بہت سے بیٹے چھوڑے، اسی طرح بیٹیاں بھی بہت سی تھیں جو سب کنیزوں کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھیں۔

ہارون الرشید کو خاندان عباسیہ میں آفتاب خاندان سمجھنا چاہیے۔ اس کے زمانے میں خلافت عباسیہ نہایت مضبوط ہوکر اپنی معراج کمال کو پہنچ گئی تھی۔ ہارون الرشید کے عہد خلافت میں آل ابی طالب اور دوسرے سازشی گروہوں کی ہمتیں پست ہو چکی تھیں۔ اس کو علم وفضل کا بے حد شوق اور پابندی دین کا بہت خیال تھا۔ زندیقوں کے فتنہ کا اس کے عہد میں مکمل استیصال ہو چکا تھا۔ روم و یونان کی عظیم الشان عیسائی سلطنتیں اس کی خراج گزار تھیں۔ ہارون الرشید نے مرتے وقت خزانہ میں نوے کروڑ دینار چھوڑے تھے۔ اندلس و مراکش کے علاوہ وہ تمام عالم اسلام کا فرماں روا تھا۔ منصور ہی کے زمانے سے تصنیف وتالیف کا کام شروع ہو چکا تھا۔ ہارون الرشید کے زمانے میں یہودی اور عیسائی علماء کی بھی دربار بغداد میں بڑی قدردانی ہوتی تھی۔ عیسائیوں کو ہارون نے فوجی سرداریاں بھی عطا کیں اور اپنی مصاحبت میں بھی جگہ دی۔ اس کے زمانے میں ہندوستان کے علماء بھی گورنر سندھ کی معرفت اور براہ راست خود بھی بغداد میں پہنچے اور وہاں ان کی قدرومنزلت بڑھائی گئی۔ عبرانی زبان کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ مختلف علوم وفنون کی تدوین کا سلسلہ جاری ہوا۔ بغداد میں لوگوں کو راحت وآسائش اور دولت واطمینان خوب حاصل تھا۔ اس لیے شاعری اور موسیقی

کے چرچے بھی بغداد میں پائے جاتے تھے۔ قصہ گویوں نے ہارون کے متعلق بعض فرضی کہانیاں تصنیف کیں اور وہ کہانیاں دنیا میں مشہور ہو گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس خلیفہ کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیل گئیں۔ ہارون الرشید بہادر اور سپاہی منش انسان تھا۔ وہ بڑی خوش دلی اور مسرت کے ساتھ گھوڑے کی زین پر مہینے اور برس صرف کر دیتا تھا لیکن جب صوفیوں کی مجلس میں بیٹھتا تو ایک تارک الدنیا صوفی ودرویش نظر آتا تھا۔ جب فقہاء کی مجلس میں ہوتا تھا تو وہ اعلیٰ درجہ کا فقیہہ اور جب محدثین کی خدمت میں ہوتا تھا تو اعلیٰ درجہ کا محدث ثابت ہوتا تھا۔ صرف زندیقوں یعنی لا مذہبوں کا وہ ضرور دشمن تھا، باقی غیر مذہب والوں کے ساتھ اس کا برتاؤ مدارات ومروت کا تھا۔ حج، جہاد اور خیرات تین چیزوں کا اس کو بہت شوق تھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا رقیق القلب بھی تھا۔ جب کوئی شخص اس کو نصیحت کرتا اور جہنم سے ڈراتا تو وہ زاروقطار رونے لگتا تھا۔

ایک روز ابن سماک، ہارون کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ہارون کو پیاس لگی، اس نے پانی مانگا، پانی آیا اور ہارون نے پینا چاہا تو ابن سماک نے کہا کہ امیرالمومنین! ذرا ٹھہر جایئے۔ ہارون الرشید نے کہا کہ فرمایئے۔ ابن سماک نے کہا کہ اگر شدت پیاس میں آپ کو پانی نہ ملے تو ایک پیالہ پانی آپ کتنے تک خرید لیں گے؟ ہارون الرشید نے کہا کہ نصف سلطنت دے کر مول لے لوں۔ ابن سماک نے کہا کہ اب آپ پی لیجیے۔ جب ہارون الرشید پانی پی چکا تو ابن سماک نے کہا کہ امیرالمومنین! اگر یہ پانی آپ کے پیٹ میں رہ جائے اور نہ نکلے تو اس کے پیٹ سے نکلوانے میں آپ کہاں تک خرچ کر سکتے ہیں؟ ہارون الرشید نے کہا کہ ضرورت پڑے تو میں نصف سلطنت دے ڈالوں۔ ابن سماک نے کہا کہ بس آپ سمجھ لیجیے کہ آپ کا تمام ملک ایک پیالہ پانی اور پیشاب کی قیمت رکھتا ہے۔ آپ کو اس پر زیادہ غرور نہ ہونا چاہیے۔ ہارون الرشید یہ سن کر رو پڑا اور بہت دیر تک روتا رہا۔

ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ایک بزرگ سے کہا کہ آپ مجھے نصیحت کیجیے۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ کا کوئی مصاحب ایسا ہو جو خوف دلاتا رہے اور اس کا نتیجہ بہتر ہو تو وہ اس مصاحب سے اچھا ہے جو آپ کو خوف سے آزاد کر دے مگر نتیجہ اس کا برا ہو۔ ہارون الرشید نے کہا کہ ذرا کھول کر بیان فرمایئے تاکہ اچھی طرح سمجھ میں آ جائے۔ انہوں نے کہا کہ اگر کوئی شخص آپ سے یہ کہے کہ قیامت کے دن آپ سے رعیت کے متعلق سوال ہونے والا ہے، آپ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیں تو وہ اس

شخص سے بہتر ہے جو یہ کہے کہ آپ اہل بیت نبوی ﷺ سے ہیں اور بوجہ قرابت نبوی ﷺ آپ کے تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر ہارون الرشید ایسا رویا کہ پاس بیٹھنے والوں کو اس پر رحم آنے لگا۔

قاضی فاضلی کہتے ہیں کہ دو بادشاہوں کے سوا کوئی ایسا نہیں ہوا جس نے طلب علم میں سفر کیا ہو۔ ایک تو ہارون الرشید کہ اس نے اپنے بیٹوں امین و مامون کو ہمراہ لے کر موطا امام مالک کی سماعت کے لیے سفر کیا۔ چنانچہ جس نسخہ میں اس نے پڑھا تھا، وہ شاہان مصر کے پاس موجود تھا۔ دوسرا سلطان صلاح الدین ایوبی جو موطا امام مالک کے سننے کی غرض سے اسکندریہ گیا تھا۔

ہارون الرشید چوگان کھیلتا اور تیر و کمان سے نشانہ بازی کرتا تھا۔ ہارون الرشید کی عمر وفات کے وقت ۴۵ سال کے قریب تھی۔ اس کے علاج میں حکیم جبرئیل بن بختیشوع سے غلطی ہوئی۔ اس لیے مرض ترقی کر کے اس کی وفات کا باعث ہوا۔ یہ حکیم ہارون الرشید کے ہمراہیوں میں اس کے بیٹے امین کا طرفدار تھا اور اس کا حاجب مسرور مامون کا ہوا خواہ تھا۔ جبکہ ہارون الرشید سفر ہی میں تھا اور اس کی علالت ترقی کر رہی تھی تو بغداد سے اس کے بیٹے امین نے بکر بن المعمر کی معرفت بعض خطوط ہارون الرشید کے ہمراہیوں کے نام لکھ کر بھیجے تھے، جن میں ہارون الرشید کو فوت شدہ تصور کر کے اپنی بیعت کے لیے لکھا تھا۔ ایک خط امین نے اپنے بھائی صالح کے نام لکھا تھا کہ لشکر و اسباب اور خزانے لے کر فضل بن ربیع کے مشورے سے فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ اسی مضمون کے خطوط اس نے ہارون الرشید کے دوسرے ہمراہیوں کو بھی لکھے تھے۔ اسی مضمون کا ایک خط فضل بن ربیع کے نام تھا۔ انہیں خطوط میں اس نے تمام سرداروں کو ان کے عہدوں پر قائم رکھنے کے لیے بھی وعدہ کیا تھا۔ بکر بن المعمر کے آنے کی اطلاع ہارون کو اتفاقاً ہوگئی۔ اس نے بکر کو اپنے سامنے بلایا اور آنے کا سبب دریافت کیا۔ اس نے کوئی معقول جواب نہ دیا تو ہارون نے اس کو قید کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد ہی ہارون الرشید کا انتقال ہوگیا۔ فضل بن ربیع نے بکر کو جیل خانے سے نکلوایا۔ اس نے امین کے وہ خطوط دیے، ان خطوط کو پڑھ کر سرداروں نے آپس میں مشورہ کیا۔ چونکہ سب اپنے وطن بغداد کی طرف جانے کے آرزومند تھے، فضل بن ربیع سب کو لے کر بغداد کی طرف روانہ ہوگیا اور ہارون نے جو وصیت کی تھی اور مامون سے جو ان کے عہد و میثاق تھے، سب فراموش کر دیے۔

امین الرشید بن ہارون الرشید

محمد امین بن ہارون بن مہدی بن منصور عباسی، زبیدہ خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ امین و مامون دونوں ہم عمر تھے۔ ہارون الرشید نے اپنے بعد امین کو تخت خلافت کا وارث مقرر کیا تھا لیکن ساتھ ہی مامون کو خراسان وغیرہ ممالک مشرقیہ کا مستقل حاکم بنا کر امین کو وصیت کی تھی کہ مامون کو خراسان کی حکومت سے معزول نہ کرے اور مامون کو نصیحت کی تھی کہ امین کی اطاعت وسیادت سے انکار نہ کرے۔ طوس میں جب ہارون الرشید کا انتقال ہوا تو مامون مرو میں تھا اور امین بغداد میں۔ صالح، ہارون الرشید کے ہمراہ تھا۔ ہارون کی وفات سے اگلے دن یعنی ۴ جمادی الثانی سنہ ۱۹۳ھ کو طوس میں لشکر ہارون اور موجودہ سرداروں نے امین کی خلافت پر نیابتاً صالح کے ہاتھ پر بیعت کی اور محکمہ ڈاک کے افسر حمویہ نے فوراً اپنے نائب کو جو بغداد میں تھا، اس واقعہ کی اطلاع دی۔ چنانچہ اسی نے فوراً امین کو ہارون الرشید کے مرنے اور اس کے خلیفہ تسلیم ہونے کی خبر سنائی۔ صالح بن ہارون الرشید نے بھی اپنے بھائی امین کی خدمت میں اس واقعہ کو لکھا اور خلافت کی مبارکباد دی اور ساتھ ہی خاتم خلافت، عصا اور چادر بھیج دی۔

ان ایام میں ہارون الرشید کی بیوی اور امین کی ماں زبیدہ خاتون شہر رقہ میں اقامت گزین تھی اور خزانہ خلافت اسی کے قبضہ میں تھا۔ امین نے ان خبروں اور خطوں کے آنے پر جامع مسجد میں جا کر لوگوں کے سامنے خطبہ دیا، خلیفہ ہارون الرشید کی وفات کا حال سنایا اور لوگوں سے بیعت لی۔ زبیدہ خاتون اس خبر کو سن کر رقہ سے بغداد کی طرف مع خزانہ شاہی روانہ ہوئی۔ اس کے آنے کی خبر سن کر امین نے مقام انبار میں اس کا استقبال کیا اور عزت و احترام کے ساتھ بغداد میں لایا۔ مامون نے مرو میں باپ کے مرنے کی خبر سنی تو امیروں اور سپہ سالاروں کو جو وہاں موجود تھے، جمع کیا اور اپنے لیے مشورہ طلب کیا کہ مجھ کو اب کیا کرنا چاہیے؟ ان امیروں اور سپہ سالاروں میں عبداللہ بن مالک، یحییٰ بن معاذ، شبیب بن حمید بن قحطبہ، علاء حاجب عباس بن زہیر، ایوب بن ابی سمیر، عبدالرحمٰن بن عبدالملک بن صالح، فضل بن سہل قابل تذکرہ تھے۔ بغداد سے روانہ ہو کر جرجان تک مامون اور یہ تمام سردار بھی ہارون الرشید کے ہمراہ تھے۔ اس سفر میں فضل بن سہل نے سپہ سالاروں اور سرداروں کو مامون کی جانب مائل کرنے کی کوشش کی تھی اور بہت سے سرداروں نے وعدہ کیا تھا

کہ ہم مامون کی طرفداری میں ضرور حصہ لیں گے لیکن فضل بن ربیع، امین کا طرفدار تھا۔ اب بعد وفات ہارون، فضل بن ربیع کی کوشش سے سب کے سب جو طوس میں موجود تھے، امین کی بیعت کر کے بغداد کی جانب روانہ ہو گئے اور اس بات کا مطلق خیال نہ کیا کہ ہارون کی وصیت کے موافق ہم کو مامون کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے کیونکہ اس تمام لشکر اور سامان کا مالک مامون ہے۔ یہ سردار جو مامون کے پاس تھے، ہارون الرشید کی وصیت کے موافق ممالک مشرقیہ پر اس کی حکمرانی کے مویداور ہر طرح اسی کے ہوا خواہ تھے۔

ان میں سے بعض نے یہ مشورہ دیا کہ فضل بن ربیع ابھی راستہ میں ہے، یہاں سے فوج بھیج کر اس کو مرو کی جانب واپس لایا جائے مگر فضل بن سہل نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اگر اس طرح ان لوگوں کو واپس لایا گیا تو اندیشہ ہے کہ وہ دھوکا دیں گے اور موجب نقصان ثابت ہوں گے۔ ہاں، مناسب یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس جنہوں نے فرماں برداری کا اقرار کر کے اعانت وہمدردی کے وعدے کیے تھے، پیغام بھیجا جائے اور ان کو ہارون الرشید کی وصیت اور ان کے وعدے یاد دلائے جائیں۔ چنانچہ دو قاصد روانہ ہوئے، وہ جب فضل وغیرہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے سب کو اپنا دشمن پایا۔ بعض نے تو علانیہ مامون کو گالیاں بھی دیں۔ یہ دونوں قاصد مشکل سے اپنی جان بچا کر واپس آئے اور حالات جو کچھ دیکھ کر آئے تھے، سنائے۔ مامون کو یقین تھا کہ مجھ کو ممالک مشرقیہ پر قابض نہ رہنے دیا جائے گا۔ اس لیے وہ بہت فکرمند اور پریشان تھا۔ ادھر فضل بن سہل نے اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ مامون کو خلیفہ بنا کر رہوں گا۔ مامون کے ہمراہیوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو مامون کے خلیفہ ہونے کو ناپسند کرتے تھے مگر ممالک مشرقیہ پر اس کے قابض رہنے کے خواہاں تھے۔ فضل بن سہل اور اس کے ہم خیال لوگ امین کی خلافت کو ناپسند کرتے تھے اور مامون ہی کو خلیفہ بنانے کے خواہاں تھے۔ فضل بن سہل کا باپ سہل ایک نومسلم مجوسی تھا جو ہارون الرشید کے زمانے میں مسلمان ہوا تھا۔ ہارون نے اس کے بیٹے فضل کو مامون کا کاتب مقرر کیا تھا۔ مجوسی النسل ہونے کی وجہ سے وہ مامون کو خلیفہ بنانا چاہتا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ امین کی ماں ہاشمیہ تھی اور وہ عربوں کی حمایت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ مامون کی ماں ایرانی النسل تھی، اس لیے ایرانی وخراسانی لوگ مامون کے ہوا خواہ تھے۔ امین بغداد میں عربوں کے اندر موجود تھا اور مامون اپنے حامیوں یعنی ایرانیوں کے اندر مرو میں تھا۔ زبیدہ خاتون مامون

سے متنفر تھی اور عربی سردار جو عباسیوں کے ہوا خواہ تھے، وہ علویوں کو ناپسند کرتے تھے لیکن خراسان میں علویوں کے حامی بہ کثرت موجود تھے۔ جعفر برمکی جو علویوں کا طرفدار تھا، مامون کا اتالیق تھا۔ لہٰذا مامون کی مقبولیت خراسان وغیرہ ممالک مشرقیہ میں زیادہ تھی۔ فضل بن ربیع وغیرہ جو برامکہ سے متنفر تھے، مامون سے بھی ناخوش تھے۔ غرضکہ مامون وامین کے دل صاف نہ تھے اور ان دونوں کے گرد ایسے سردار جمع تھے جو دو گروہوں میں منقسم تھے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کا مخالف تھا۔ لہٰذا ہارون کے مرتے ہی ان دونوں گروہوں نے امین و مامون کی پیشوائی میں ایک دوسرے کے خلاف زور آزمائی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔ مامون نے اہل خراسان کی تالیف قلوب کے لیے خراسان کا چوتھائی خراج معاف کر دیا اور خراسانی سرداروں سے ترقیات وقدردانی کے بڑے بڑے وعدے کیے۔ اہل ایران خوش ہو ہو کر کہتے تھے کہ مامون الرشید ہمارا ہمشیر زادہ ہے، وہ ضرور ہمارے مرتبہ اور اقتدار کو بڑھائے گا۔ ادھر مامون نے مرو کے علماء وفقہاء کو بلا کر کہا کہ آپ لوگ وعظ وپند کے ذریعہ سے لوگوں کے خیالات کی تربیت کریں اور حالات کو قابو میں رکھیں۔ ان تمام حالات کے موجود ہوتے ہوئے مامون الرشید نے سب سے بڑی عقلمندی یہ کی کہ امین الرشید کی خدمت میں مودبانہ عرضی لکھ کر بھیجی اور ہدایا وتحائف روانہ کر کے اپنی نیازمندی وفرماں برداری کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

اگر خلیفہ امین الرشید کی طرف سے عزم و مآل اندیشی کے ساتھ کام لیا جاتا تو مامون الرشید ہی کی طرف سے ناجائز وناشدنی حرکات کا ظہور ہوتا اور وہی ملزم قرار پا کر اہل عالم کی نگاہ میں مطعون وبدنام ہوتا اور شاید اس کو کامیابی بھی حاصل نہ ہوتی لیکن فضل بن ربیع اور دوسرے مشیر امین کے لیے اچھے مشیر ثابت نہ ہوئے اور امین سے کسی دانائی وہوشیاری کا ظہور نہ ہوا بلکہ اس نے اپنے کاموں سے بہت جلد لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ ہارون الرشید کے تخت کو سنبھالنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اس نے تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی پہلی غلطی یہ کی کہ اپنے بھائی قاسم یعنی موتمن کو جزیرہ کی حکومت سے معزول کر کے اس کے پاس صرف قنسرین وعواصم کا صوبہ باقی رکھا اور جزیرہ کی حکومت پر اپنی طرف سے خزیمہ بن خازم کو مامور کر کے بھیج دیا۔ اسی سال یعنی اپنی خلافت کے ابتدائی ایام میں اس نے فضل بن ربیع کے مشورے سے اپنے بیٹے موسیٰ بن امین کو بجائے مامون کے ولی عہد بنانا چاہا اور مامون کو خود مخالفت کا موقع دے دیا۔ جس زمانہ میں ہارون الرشید خراسان کو جا رہا تھا تو

اس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ لشکر اور تمام سامان مامون الرشید کے پاس خراسان میں رہے گا اور مامون ہی اس کا مالک ہے لیکن فضل بن ربیع تمام سامان اور تمام لشکر کو جو وفات ہارون کے وقت طوس میں موجود تھا، لے کر بغداد کی طرف چل دیا اور اس طرح مامون کو بہت کمزور کر گیا۔ اس لیے فضل بن ربیع کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر امین کے بعد مامون خلیفہ ہوگا اور جلدی اس کو تخت خلافت مل گیا تو وہ میرے ساتھ ضرور برا سلوک کرے گا۔ لہٰذا اس نے یہ کوشش کی کہ مامون کو ولی عہدی سے معزول کروا دیا جائے۔ یہی خطرہ علی بن عیسیٰ سابق گورنر خراسان کو بھی اپنی نسبت تھا۔ لہٰذا اس نے بھی فضل بن ربیع کے اس مشورہ کی تائید کی اور امین کو مامون کی معزولی پر آمادہ کر دیا مگر خزیمہ بن خازم کے روبہ رو جب یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو اس نے اس رائے کی سخت مخالفت کی اور خلیفہ کو سردست اس کام سے روک دیا۔ یہ خبریں مامون کے پاس پہنچ رہی تھیں مگر اس نے اس کے متعلق بالکل خاموشی اختیار کی اور نتیجہ کا منتظر رہا۔

رافع اور ہرثمہ مامون کی خدمت میں:

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ہرثمہ بن اعین نے سمرقند میں رافع کا محاصرہ کر رکھا تھا اور رافع بن لیث ابھی مغلوب نہ ہوا تھا کہ طوس میں ہارون الرشید کا انتقال ہوا۔ رافع کا بھائی بشیر گرفتار ہو کر طوس میں ہارون کے پاس پہنچ کر اس کے حکم سے قتل ہو چکا تھا۔ ہارون کی وفات کے بعد ہرثمہ بن اعین نے بہ زور شمشیر سمرقند میں داخل ہو کر قبضہ کر لیا اور وہیں قیام بھی کر لیا۔ ہرثمہ بن اعین کے ساتھ طاہر بن حسین بھی تھا۔ رافع بن لیث نے سمرقند سے فرار ہو کر ترکوں میں جا کر پناہ لی اور ترکوں کا لشکر لے کر ہرثمہ کے مقابلہ کو آیا۔ اس لڑائی میں بھی اس کو ہزیمت ہوئی۔ اس کے بعد ترکوں اور رافع کے درمیان ناچاقی پیدا ہوئی اور اس کی حالت بہت کمزور ہوگئی۔ اس نے اپنا قاصد مامون کے پاس بھیج کر امان طلب کی۔ مامون نے اس کو امان دے دی اور وہ مامون کی خدمت میں مرو چلا آیا۔ یہاں اس کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ ہرثمہ بھی چند روز کے بعد مامون کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مامون نے ہرثمہ کو اپنی رکابی فوج کا افسر بنا لیا۔ انہیں ایام میں مامون نے عباس بن عبداللہ بن مالک کو ولایت دے کر حکومت سے معزول کر دیا۔

امین و مامون کی علانیہ مخالفت:

امین کے پاس بغداد میں خبر پہنچی کہ مامون نے ہرثمہ کو اپنی رکابی فوج کا افسر بنا لیا ہے اور رافع کو عزت کے ساتھ مصاحبت میں داخل کر لیا ہے اور ولایت رے سے عباس بن عبداللہ کو معزول کر دیا ہے۔ اس خبر کو سن کر وہ بلاوجہ ناراض ہوا اور خطبہ سے مامون کا نام نکال کر اپنے بیٹے کا نام بطور ولی عہد داخل کر دیا اور عباس بن موسیٰ بن عیسیٰ بن جعفر اور محمد بن عیسیٰ بن نہیک کو پیام دے کر مامون کے پاس بھیجا کہ تم اس بات پر رضامند ہو جاؤ کہ میرا بیٹا موسیٰ ولی عہدی میں تم پر سابق ہے اور مجمع عام میں اس کا اعلان کر دو کہ بجائے میرے موسیٰ بن امین ولی عہد ہے۔ مامون نے اس بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا مگر فضل بن سہل نے اس موقع پر یہ فائدہ اٹھایا کہ عباس بن موسیٰ کو ہم خیال بنا کر مخفی طور پر اس بات کے لیے آمادہ کر لیا کہ وہ بغداد میں رہ کر جاسوسی و مخبری کی خدمات انجام دے اور ضروری باتوں کی فوراً اطلاع بھجوا دیا کرے۔ امین نے مامون سے خراسان کی بعض ولایات سے دست بردار ہو جانے کی بھی فرمائش کی تھی۔ مامون نے اس سے بھی صاف انکار کر دیا تھا۔ مامون کو جب معلوم ہوا کہ بغداد میں خطبوں سے میرے نام کو خارج کر دیا گیا ہے تو اس نے جواباً خراسان میں امین کے نام کو خطبوں سے خارج کر دیا۔ انہیں ایام میں امین نے خانہ کعبہ سے اس دستاویز کو جو ہارون نے لٹکائی تھی، اتروا کر چاک کرا دیا۔ یہ واقعہ شروع سنہ ۱۹۴ھ کا ہے اور یہیں سے مامون الرشید کو امین کی علانیہ مخالفت کرنے کا حق پیدا ہو گیا۔ مامون نے خراسان کی ناکہ بندی بڑی احتیاط کے ساتھ کرا دی تاکہ امین کا کوئی خط اور کوئی قاصد حدود خراسان میں داخل نہ ہو سکے اور خراسان میں امین کسی بغاوت کو پیدا کرنے کی کوشش نہ کر سکے۔

صوبوں میں بدامنی:

جب دونوں بھائیوں میں مخالفت، عہدنامہ کے خانہ کعبہ سے اتروا کر چاک کر دینے اور خطبوں سے ایک دوسرے کے ناموں کو خارج کرا دینے کا حال مشہور ہوا تو جہاں جہاں کوئی مواد فاسد موجود تھا، وہ ابھرنے اور پھوٹ پڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ خاقان ثبت، ملوک ترک، بادشاہ کابل نے جو حکومت اسلامیہ کے باج گزار و فرماں بردار تھے، بغاوت و سرکشی پر آمادگی ظاہر کی اور بلاد اسلامیہ کو لوٹنے، شب خون مارنے اور حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگے۔ یہ خبریں سن کر مامون پریشان ہوا مگر

فضل بن سہل کے مشورے سے اس نے ان ملوک کو نرمی کے خطوط لکھے اور بعض کا خراج معاف کر کے بعض کو اسی قسم کی اور رعایتیں دے کر صلح و آشتی کے تعلقات کو مضبوط کر لیا۔ مامون کی یہ پریشانی جلد ہی رفع ہوگئی اور اندرونی ملک میں کسی قسم کا کوئی فتنہ برپا نہ ہونے دیا کیونکہ تمام اہل خراسان مامون کے بہ دل حامی و مددگار تھے اور امین کو جو اہل عرب کا حامی تھا، شکست دینا چاہتے تھے۔ ادھر ممالک مغربیہ یعنی امین کے ماتحت صوبوں میں جو شورشیں برپا ہوئیں، وہ امین کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوئیں۔ ملک شام میں خاندان بنوامیہ کا صرف ایک ہی شخص باقی رہ گیا تھا جس کا نام علی بن عبداللہ بن خالد بن یزید بن معاویہ تھا۔ اس کی ماں کا نام نفیسہ بنت عبیداللہ بن عباس بن علی بن ابی طالب تھا۔ یہ منصیانی کے نام سے مشہور تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں صفین کے سرداروں یعنی معاویہ وعلی (رضی اللہ عنہما) کا بیٹا ہوں۔ یہ ذی علم و صاحب شعور شخص تھا۔ امین و مامون کو آمادہ مقابلہ دیکھ کر اس نے ملک شام میں خروج کیا اور شام کے وہ قبائل جو بنوامیہ سے تعلق رکھتے تھے، اس کے ساتھ ہو گئے۔ امین نے فوجیں شام کی طرف روانہ کیں لیکن ان کو شکست ہوئی۔ کئی برس تک ملک شام میں ہنگامہ برپا رہا۔ آخر سنہ ۱۹۸ھ میں منصیانی بعض شامی قبائل سے مغلوب ہو کر شام سے فرار ہو گیا اور شامیوں نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ امین نے خانہ کعبہ سے دستاویز عہدنامہ کو اتار کر چاک کرا دیا اور داؤد بن عیسیٰ نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر کے مکہ و مدینہ اور حجاز کے باشندوں کو سمجھایا کہ امین نے مامون پر ظلم کیا ہے۔ ہم نے خلیفہ ہارون الرشید کے سامنے جو عہد کیا ہے، اس پر قائم رہنا چاہیے اور موسیٰ کی جو ایک شیرخوار بچہ ہے، ہرگز بیعت ولی عہدی نہیں کرنی چاہیے۔ داؤد بن عیسیٰ کی اس کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمام اہل حجاز نے مامون کی خلافت کو تسلیم کر کے امین کا نام خطبہ سے نکال دیا اور مامون ہی کو خلیفہ تسلیم کر لیا اور داؤد بن عیسیٰ نے مکہ سے براہ بصرہ، فارس اور کرمان جا کر مرو میں مامون الرشید کو حجاز کی حالت سے آگاہ کیا۔ مامون نے خوش ہو کر اپنی طرف سے مکہ کا گورنر مقرر کر کے بھیج دیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۹۶ھ کا ہے۔ غرض بغاوتوں اور سرکشیوں سے امین کو زیادہ نقصان پہنچا۔ مامون کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا جو اس بات کی دلیل ہے کہ امین کے اندر قابلیت ملک داری نہ تھی۔

رومی

ہارون الرشید کے انتقال سے چند روز بعد قیصر روم نقفور بھی جنگ برجان میں مارا گیا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ دو مہینے کے بعد وہ بھی مر گیا تو اس کی بہن کا داماد میکائیل بن جرجیس تخت نشین ہوا اور دوسرے سال سنہ ۱۹۴ھ میں رومیوں نے اس کے خلاف بغاوت کی تو وہ دارالسلطنت چھوڑ کر درویشوں اور رہبانوں میں جا شامل ہوا۔ تب رومیوں نے اپنے سپہ سالار الیون نامی کو تخت پر بٹھایا۔ غرض جس زمانے میں ہارون کی سلطنت میں اندرونی فسادات رونما ہو رہے تھے، اس زمانے میں رومیوں کی سلطنت بھی اسی قسم کی پیچیدگیوں میں مبتلا تھی۔

امین و مامون کی زور آزمائی:

سنہ ۱۹۴ھ کے آخری ایام میں امین نے مامون کو ولی عہدی سے معزول کیا اور مامون نے امین کا نام خطبہ سے نکال دیا۔ اس کے بعد امین نے یہی نہیں کہ اپنے بیٹے کو مامون کی جگہ ولی عہد بنایا بلکہ اپنے بھائی موتمن کو بھی معزول کر کے اس کی جگہ اپنے دوسرے بیٹے عبداللہ کو ولی عہد بنایا اور خطبوں میں موسیٰ و عبداللہ کا نام لیا جانے لگا۔ اب لڑائی اور زور آزمائی کے لیے امین و مامون کو کسی چیز کے انتظار کی ضرورت نہ تھی۔ فضل بن سہل کو مامون نے ذوالریاستین یعنی صاحب السیف والقلم کا خطاب دے کر اپنا مدارالمہام سلطنت بنایا۔ طاہر بن حسین بن مصعب بن زریق بن اسد خزاعی کو فوج کی سپہ سالاری سپرد کی گئی۔ فضل بن سہل نے سرحدی ولایت رے میں جا کر وہاں کے جنگ آزمودہ سپاہیوں کو موقع فراہم کیا اور اس سرحدی علاقے کے لوگوں کی ایک فوج بھرتی کر کے سپہ سالار کو سپرد کی۔ طاہر بن حسین نے ابوالعباس خزاعی کو لشکر رے کا امیر مقرر کیا۔ ابوالعباس نے رے میں اپنے لشکر کو کیل کانٹے سے درست کیا۔

ادھر امین الرشید نے عصمت بن حماد بن سالم کو ایک ہزار پیادوں کی جمعیت دے کر ہمدان کی طرف روانہ کر کے حکم دیا کہ تم ہمدان میں مقیم رہ کر اپنے مقدمۃ الجیش کو سادہ کی طرف روانہ کرنا۔ اس کے بعد امین نے ایک بڑا لشکر مرتب کر کے فضل بن ربیع کے مشورے سے علی بن عیسیٰ بن ہامان کی سپہ سالاری میں مامون کے مقابلہ کو خراسان کی طرف روانہ کیا۔ امین اور اس کے وزیر فضل بن

ربیع کی یہ سخت غلطی تھی کہ علی بن عیسیٰ کو سپہ سالار بنا کر خراسان کی طرف روانہ کیا۔ اہل خراسان علی بن عیسیٰ سے اس کے عہد گورنری سے ناخوش تھے۔ اس کے آنے کی خبر سن کر اہل خراسان اور بھی زیادہ لڑنے اور مارنے پر آمادہ ہو گئے۔ امین نے علی بن عیسیٰ کو نہاوند، ہمدان، قم، اصفہان اور بلاد جبل بطور جاگیر عطا کیے اور خزانہ خلافت سے ہر قسم کا سامان اور روپیہ ضرورت سے زیادہ دے کر پچاس ہزار سواروں کے ساتھ رخصت کیا اور عمال کے نام فرامین جاری کیے کہ علی بن عیسیٰ کی کمک کے لیے لشکر روانہ کریں اور ہر قسم کی امداد اس کو پہنچائیں۔ علی بن عیسیٰ، امین کی ماں زبیدہ خاتون سے رخصت ہونے کے لیے حاضر ہوا تو اس نے مامون کے متعلق علی کو نصیحت کی کہ اس کو گرفتار کر کے کوئی بے ادبی کا برتاؤ نہ کرنا۔ شعبان سنہ ۱۹۵ھ میں علی بن عیسیٰ بغداد سے روانہ ہوا۔ خود خلیفہ امین اور ارکان سلطنت بطریق مشایعت اس لشکر کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ یہ اس شان وشکوہ کا لشکر تھا کہ اہل بغداد نے اب تک ایسا عظیم الشان لشکر نہیں دیکھا تھا۔ علی بن عیسیٰ، خلیفہ امین سے رخصت ہو کر رے کے قریب پہنچا تو اس کے ہمراہیوں نے رائے دی کہ ہراول اور مورچے قائم کرنے چاہئیں مگر علی نے کہا کہ طاہر جیسے شخص کے مقابلے میں مورچے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ طاہر بھی علی کے قریب پہنچنے کی خبر سن کر رے سے نکلا اور رے سے پانچ فرسنگ کے فاصلے پر دونوں کا مقابلہ ہوا۔ علی بن عیسیٰ کے ہمراہ پچاس ہزار سے زیادہ فوج تھی اور طاہر بن حسین کے لشکر کی کل تعداد چار ہزار فوج تھی۔ دونوں کی قوتوں کا یہ ایسا نمایاں فرق تھا کہ علی بن عیسیٰ نے صف آرائی کے وقت اپنی فوج سے کہا کہ ان لوگوں کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان کو گھیر کر گرفتار کر لینا چاہیے۔

علی بن عیسیٰ کے عظیم الشان لشکر کو دیکھ کر طاہر بن حسین کے لشکر سے عین صف آرائی کے وقت کچھ لوگ فرار ہو کر علی بن عیسیٰ کے پاس چلے گئے تاکہ فتح مند ہونے والے گروہ کی شرکت سے فائدہ اٹھائیں اور ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رہیں مگر علی بن عیسیٰ نے ان لوگوں کو پٹوا کر نکال دیا اور بعض کو قید کر لیا۔ اس سے طاہر بن حسین کو بہت فائدہ پہنچا یعنی اس کے لشکر کا ہر متنفس لڑنے اور مارنے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ آخر لڑائی شروع ہوئی، طاہر بن حسین کے میمنہ اور میسرہ کو علی بن عیسیٰ کے میسرہ اور میمنہ نے شکست دے کر بھگایا مگر طاہر نے قلب لشکر کو لے کر علی کے قلب پر ایسا حملہ کیا کہ علی کا قلب شکست کھا کر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوا۔ یہ حالت دیکھ کر طاہر کے میمنہ اور میسرہ کے شکست خوردہ سپاہی لوٹے اور ہمت کر کے طاہر سے آ ملے۔ نہایت سخت معرکہ آرائی ہوئی اور اسی دار و گیر

میں علی بن عیسیٰ کے گلے میں ایک تیر نے ترازو ہو کر اس کا کام تمام کر دیا۔ علی بن عیسیٰ کے گرتے ہی تمام لشکر فرار ہوا اور طاہر کے تمام ہمراہیوں نے علی بن عیسیٰ کا سر کاٹ لیا۔ طاہر کے فتح مند لشکر نے دو فرسنگ تک فراریوں کا تعاقب کیا اور لشکر بغداد قتل و گرفتار ہوتے ہوئے چلے گئے۔ رات کی تاریکی نے حائل ہو کر بقیہ فراریوں کو قتل و گرفتاری سے بچایا۔ طاہر بن حسین رے میں واپس آیا اور فتح نامہ مامون کی خدمت میں روانہ کیا کہ:

''بہ خدمت امیر المومنین! گزارش ہے کہ یہ عریضہ ایسی حالت میں لکھ رہا ہوں کہ علی بن عیسیٰ کا سر میرے رو بہ رو ہے۔ اس کی انگوٹھی میری انگلی میں ہے اور اس کا لشکر میرے زیر فرمان ہے۔''

تین دن کے عرصہ میں یہ خط مرو میں فضل بن سہل کے پاس پہنچا۔ وہ لیے ہوئے مامون کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فتح کی مبارکباد دی، اراکین دولت نے بطور امیر المومنین سلام کیا۔ دو دن کے بعد علی کا سر بھی پہنچا جس کو تمام ملک خراسان میں تشہیر کیا گیا۔

بغداد میں علی بن عیسیٰ بن ہامان کے مقتول ہونے کی خبر پہنچی تو امین نے عبدالرحمٰن بن جبلہ انباری کو بیس ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ طاہر کے مقابلہ کو روانہ کیا۔ عبدالرحمٰن بن جبلہ کو ہمدان اور بلاد خراسان کی سند گورنری بھی دی گئی کہ ان ملکوں کو فتح کر کے اپنی حکومت قائم کر لو۔ عبدالرحمٰن بن جبلہ نے ہمدان پہنچ کر قلعہ بندی کی۔ اس کا حال طاہر بن حسین کو معلوم ہوا تو وہ فوج لے کر ہمدان کی طرف گیا۔ عبدالرحمٰن بن جبلہ نے ہمدان سے نکل کر مقابلہ کیا۔ طاہر نے پہلے ہی حملہ میں شکست دے کر بھگا دیا۔ عبدالرحمٰن نے ہمدان میں جا کر پھر تیاری کر کے شہر سے باہر نکل کر دوبارہ مقابلہ کیا۔ اس مرتبہ بھی شکست کھا کر ہمدان میں داخل ہو کر پناہ گزین ہوا۔ طاہر نے فوراً بڑھ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ نے طول کھینچا، اس وقفہ میں طاہر نے قزوین کو فتح کر لیا۔ عامل قزوین فرار ہو گیا۔ طویل محاصرہ سے اہل شہر کو اذیت ہوئی اور عبدالرحمٰن کو اندیشہ ہوا کہ کہیں اہل شہر ہی شب خون نہ ماریں۔ اس لیے اس نے طاہر سے امان طلب کی۔ طاہر نے اس کو امان دے دی اور ہمدان پر قبضہ کر لیا۔ طاہر کے امان دینے کی وجہ سے عبدالرحمٰن بلا روک ٹوک ہمدان میں رہتا تھا۔ ایک روز موقع پا کر عبدالرحمٰن نے اپنے ہمراہیوں کو مجتمع کر کے بہ حالت غفلت طاہر کے لشکر پر حملہ کیا۔ اس حملہ میں طاہر نے عبدالرحمٰن کو شکست دے کر قتل کیا۔ عبدالرحمٰن کے ہمراہی جو قتل ہونے

سے بچ گئے، وہ بھاگ کر عبداللہ واحمد پسران حریشی سے ملے جو بغداد سے عبدالرحمٰن کی مدد کے لیے آ رہے تھے، ان دونوں پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ بلا مقابلہ راستے ہی سے بغداد کی جانب واپس چلے گئے۔ طاہر نے یکے بعد دیگرے شہروں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ حلوان پہنچ کر مورچے قائم کیے اور خندقیں کھدوا کر خوب مضبوطی کر لی۔ ان فتوحات کے بعد مامون نے حکم جاری کیا کہ ہر شہر میں بیعت خلافت لی جائے اور منبروں پر ہمارے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ فضل بن سہل کو مامون نے ذوالریاستین (صاحب السیف والقلم) کا خطاب دے کر اپنا وزیراعظم اور مدارالمہام خلافت بنایا۔ فضل بن سہل کی نیابت و ماتحتی میں علی بن ہشام کو وزیر جنگ اور نعیم بن خازم کو وزیر مال اور دفتر انشاء کا مہتمم مقرر کیا۔ فضل بن سہل کے بھائی حسن بن سہل کو دیوان الخراج کی افسری سپرد کی گئی۔

خلیفہ امین کی حکومت میں اختلال:

بغداد میں جب خبر پہنچی کہ عبدالرحمٰن بن جبلہ بھی طاہر کے مقابلہ میں مارا گیا تو تمام شہر میں ہلچل مچ گئی۔ خلیفہ امین نے اسد بن یزید بن مزید کو طلب کر کے طاہر کے مقابلہ کے لیے روانگی کا حکم دیا۔ اسد بن یزید نے کہا کہ میرے لشکر کو ایک سال کا وظیفہ پیشگی دیا جائے، سامان حرب عطا فرمایا جائے۔ اس بات کا وعدہ کیا جائے کہ جس قدر شہر میں فتح کروں، ان کا کوئی حساب مجھ سے نہ لیا جائے گا۔ تجربہ کار بہادر سپاہی میرے ہمراہ کیے جائیں، کمزوروں اور ناتوانوں کو الگ کیا جائے۔ ان شرطوں کو سن کر امین برہم ہوا اور اسد بن یزید کو قید کر دیا۔ اس کے بعد عبداللہ بن حمید بن قحطبہ کو طلب کر کے طاہر کے مقابلہ پر جانے کا حکم دیا۔ عبداللہ بن حمید بن قحطبہ نے بھی اسی قسم کی شرطیں پیش کیں۔ وہ بھی معتوب ہوا۔ اس کے بعد اسد بن یزید کے چچا احمد بن مزید کو طلب کر کے اسد کو قید کر دینے کی معذرت کی اور جنگ طاہر پر جانے کا حکم دیا اور احمد بن مزید بیس ہزار فوج لے کر بغداد سے روانہ ہوا۔ یہ دیکھ کر عبداللہ بن حمید بن قحطبہ بھی دوسری بیس ہزار فوج لے جانے پر آمادہ ہو گیا اور دونوں ساتھ ہی ساتھ حلوان کی طرف روانہ ہوئے۔ حلوان کے قریب مقام فانقین میں دونوں سردار یہ چالیس ہزار کا لشکر لیے ہوئے خیمہ زن ہوئے۔ طاہر بھی یہ خبر سن کر اپنا لشکر لیے ہوئے ان کے مقابلہ پر آ پہنچا اور جاسوسوں کو بہ تبدیل لباس لشکر بغداد میں پھیلا دیا۔ ان جاسوسوں نے پہنچ کر خبر اڑائی کہ بغداد میں خزانہ خالی ہو چکا ہے اور لشکر کو تنخواہیں ملنی بند ہو گئی ہیں۔ لشکری

پریشان پھر رہے ہیں اور جہاں جو کچھ پاتے ہیں، اس پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ یہ خبر مشہور ہوتے ہی لشکر میں ہلچل مچ گئی۔ کوئی اس کی تردید کرتا تھا کوئی تصویب۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپس ہی میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو گئے اور طاہر کا مقابلہ کیے بغیر ہی بغداد کی طرف روانہ ہو گئے۔ طاہر نے بڑھ کر حلوان پر قبضہ کر لیا۔ اسی اثناء میں ہرثمہ بن اعین ایک لشکر جرار کے ساتھ مرو سے مامون کا فرمان لیے ہوئے طاہر کے پاس حلوان میں پہنچا۔ اس فرمان میں لکھا تھا کہ تم نے اب تک جس قدر ملک فتح کر لیا ہے، وہ سب ہرثمہ کے سپرد کر دو اور تم اہواز کی جانب پیش قدمی کرو۔ طاہر نے اس حکم کی تعمیل کی اور خود اہواز کی طرف فوج لے کر بڑھا۔

خلیفہ امین کی معزولی و بحالی:

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے عبدالملک بن صالح کو قید کر دیا تھا۔ امین نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی اس کو آزاد کیا۔ جب طاہر کے مقابلہ میں بغداد کی فوجوں کو شکستیں ہونے لگیں تو عبدالملک بن صالح نے دربار خلافت میں حاضر ہو کر کہا کہ خراسانیوں کے مقابلہ پر اہل عراق کی بجائے شامیوں کو بھیجنا چاہیے۔ وہ خراسانیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور میں ان کی اطاعت و فرماں برداری کا ذمہ دار ہوتا ہوں۔ یہ سن کر خلیفہ امین نے عبدالملک کو شام و جزیرہ کی سند گورنری مرحمت فرما کر روانہ کیا۔ عبدالملک نے رقہ میں پہنچ کر رؤساء شام سے خط و کتابت شروع کی اور تھوڑے ہی دنوں میں شام کا ایک بڑا لشکر فراہم کر لیا۔ حسین بن علی بن عیسیٰ بھی عبدالمالک کے ساتھ تھا اور عبدالمالک کی فوج میں اس حصہ فوج کا سردار تھا جو خراسانیوں پر مشتمل تھا۔ عبدالمالک اسی عرصہ میں بیمار ہو کر فوت ہوا اور شامیوں اور خراسانیوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ شام کے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ حسین بن علی تمام خراسانی لشکر کو لیے ہوئے بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ اہل شہر اور رؤساء بغداد نے اس کا استقبال کیا۔ رات کے وقت خلیفہ امین نے حسین بن علی کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ حسین نے جانے سے انکار کیا اور صبح ہوتے ہی اپنے ہمراہیوں کو خلیفہ امین کی معزولی پر آمادہ کیا اور بغداد کے پل پر آیا۔ یہاں امین کی فوج نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ حسین بن علی نے قصر خلافت پر حملہ کر کے امین اور اس کی والدہ زبیدہ خاتون کو گرفتار کر کے قصر منصور میں لا کر قید کر دیا اور لوگوں سے خلافت مامون کی بیعت لی۔

اگلے دن لوگوں نے حسین بن علی سے اپنے روزینے طلب کیے مگر حسب منشاء نہ پائے اور

آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اہل بغداد امین کی معزولی اور گرفتاری پر افسوس کرنے لگے اور متحد ہو کر حسین بن علی کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے۔ حسین بن علی نے ان لوگوں کا مقابلہ کیا۔ بڑی خوں ریز جنگ ہوئی جس میں حسین بن علی شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ اہل شہر نے قصر منصور میں جا کر امین اور زبیدہ کو آزاد کیا۔ امین کو لا کر تخت خلافت پر بٹھایا اور دوبارہ بیعت کی۔ حسین پابہ زنجیر امین کے روبہ رو پیش کیا گیا۔ امین نے ملامت کر کے اس کو آزاد کر دیا اور کہا کہ تم اب اپنی خطا کی تلافی اس طرح کرو کہ طاہر بن حسین کے مقابلے پر جاؤ اور اس کو شکست دے کر ناموری حاصل کرو۔ حسین کو خلعت گراں بہا عطا ہوا اور نہایت عزت واحترام کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ اہل بغداد اس کو مبارکباد دیتے ہوئے پل تک آئے۔ جب لوگوں کا مجمع کم ہو گیا تو حسین بن علی پل کو عبور کر کے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنی بغاوت کا اعلان کرتا گیا۔ امین نے اس کے تعاقب میں سواروں کو بھیجا۔ بغداد سے تین میل کے فاصلے پر سواروں نے حسین کو جا لیا۔ خفیف سی لڑائی کے بعد حسین بن علی مارا گیا۔ اس کا سر اتار کر لوگ امین کے سامنے لائے۔ یہ واقعہ ۱۵ رجب سنہ۔ ۱۹۶ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ اسی روز حسین بن علی کے قتل ہونے پر فضل بن ربیع جو امین کا وزیراعظم تھا، ایسا روپوش ہوا کہ کسی کو اس کی اطلاع نہ ملی۔ فضل بن ربیع کے اس طرح غائب ہونے اور دھوکا دینے سے امین کو اور بھی زیادہ پریشانی کا سامنا ہوا۔

طاہر کی ملک گیری:

بغداد میں مذکورہ حالات رونما ہو رہے تھے۔ ادھر طاہر بن حسین حلوان میں ہرثمہ بن اعین کو مفتوحہ ممالک کی حکومت سپرد کر کے مامون کے حکم کے موافق اہواز کی جانب بڑھا۔ اپنی روانگی سے پیشتر اس نے حسین بن عمر رستمی کو روانہ کر دیا تھا۔ ادھر بغداد سے خلیفہ امین نے عبداللہ واحمد کے واپس آنے پر محمد بن یزید بن حاتم کو اہواز کو بچانے کے لیے روانہ کیا تھا۔ طاہر نے یہ سن کر کہ محمد بن یزید بغداد سے فوج لیے ہوئے آ رہا ہے، چند دستے حسین بن عمر رستمی کی کمک کے لیے روانہ کر دیے اور حکم دیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو، یلغار کر کے حسین بن عمر رستمی سے جا ملو۔ مقام مکرم میں محمد بن یزید پہنچا تھا کہ طاہر کی فرستادہ فوج کے قریب آ جانے کا حال معلوم ہوا۔ محمد بن یزید نے یہاں مقابلہ مناسب نہ سمجھ کر اہواز پر اول قابض ہو جانا ضروری سمجھا اور اہواز تک پہنچ گیا۔ وہاں طاہر کا لشکر بھی

مقابلہ پر آیا۔ سخت لڑائی کے بعد محمد بن یزید مارا گیا۔ طاہر نے اہواز پر قبضہ کر لیا اور اپنی طرف سے یمامہ، بحرین اور عمان پر والی مقرر کر کے بھیجے۔ اس کے بعد واسط کا قصد کیا۔ واسط کا عامل بھاگ گیا اور طاہر نے بہ آسانی واسط پر قبضہ کرنے کے بعد کوفہ کی طرف فوج بھیجی۔ کوفہ میں عباس بن ہادی حاکم تھا۔ اس نے فوراً خلیفہ امین کی معزولی کا اعلان کر کے خلافت مامون کی بیعت کر لی اور طاہر کے پاس اس اطلاع کا ایک خط بھیج دیا۔ منصور بن مہدی گورنر بصرہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ کوفہ اور بصرہ دونوں عراق کے مرکزی مقام تھے۔ ان دونوں صوبوں کے گورنر خاندان خلافت سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں نے مامون کو امین پر ترجیح دے کر امین کی معزولی اور مامون کی خلافت کو تسلیم کر کے دوسروں کے لیے قابل عمل مثال قائم کر دی۔ ادھر داؤد بن عیسیٰ گورنر حجاز نے بھی جو خاندان خلافت سے تھا، حجاز میں لوگوں سے مامون کی خلافت کی بیعت لے لی جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ گورنر موصل مطلب بن عبداللہ بن مالک نے بھی امین کی معزولی کا اعلان کر کے مامون کی خلافت کو تسلیم کر کے بیعت کر لی۔ طاہر نے ان سب کو ان کے عہدوں پر بحال رکھا۔ طاہر نے خود مقام جرجرایا میں خیمہ زن ہو کر حرث بن ہشام اور داؤد بن موسیٰ کو قصر ابن ہبیرہ کی جانب روانگی کا حکم دیا۔ یہ واقعہ رجب سنہ ۱۹۶ھ کا ہے جبکہ بعد میں خلیفہ امین کی معزولی اور بحالی کا واقعہ پیش آ رہا تھا۔

خلیفہ امین نے معزولی کے بعد تخت خلافت پر متمکن ہو کر محمد بن سلیمان اور محمد بن حماد بربری کو قصر ابن ہبیرہ کی جانب اور فضل بن موسیٰ کو کوفہ کی جانب روانہ کیا۔ حرث اور داؤد نے محمد بن سلیمان اور محمد بن حماد کا مقابلہ کیا اور سخت معرکہ آرائی کے بعد دونوں کو بغداد کی طرف بھگا دیا۔ کوفہ کی طرف فضل بن موسیٰ کے روانہ ہونے کا حال سن کر طاہر نے محمد بن علاء کو فضل کے مقابلہ پر مامور کیا۔ اثناء راہ میں دونوں کی ملاقات ہوئی تو فضل نے محمد بن علاء سے کہا کہ تم ناحق میرے مقابلے پر لشکر لے کر آئے ہو۔ میں تو خلیفہ مامون کا مطیع ہو کر آیا ہوں۔ جب رات ہوئی تو فضل نے محمد بن علاء کے لشکر پر شب خون مارا مگر چونکہ محمد بن علاء پہلے ہی سے اس کے فریب کو تاڑ گیا تھا، لہٰذا وہ شب خون سے بے فکر نہ تھا۔ اس نے خوب جم کر مقابلہ کیا اور فضل کو شکست دے کر بغداد کی طرف بھگا دیا۔ اس کے بعد طاہر نے مدائن کا رخ کیا۔ مدائن میں خلیفہ امین کی کافی فوج متعین تھی اور بغداد سے برابر سامان رسد اور کمک مدائن میں پہنچ رہی تھی مگر طاہر کے پہنچتے ہی وہ تمام بغداد کی طرف بھاگ

گئی۔ طاہر نے مدائن پر قبضہ کر کے نہر صرصر پر ڈیرہ جا ڈالا اور وہیں ایک پل بندھوایا۔ خلیفہ امین نے جب قصر ابن ہبیرہ اور کوفہ کی طرف فوجیں روانہ کیں تو اسی عرصہ میں علی بن محمد بن عیسیٰ بن نہیک کو ہرثمہ بن اعین کی طرف روانہ کیا تھا۔ نہروان کے قریب لڑائی ہوئی، ہرثمہ نے علی بن محمد کی فوج کو شکست دے کر بھگا دیا اور علی بن محمد کو گرفتار کر کے مامون کے پاس مرو بھیج دیا اور خود بجائے حلوان کے نہروان میں آ کر مقیم ہوا۔

قتل امین:

امین کے ہر ایک لشکر کو مامون کے سپہ سالاروں کے مقابلے میں شکست پر شکست ہوتی رہی اور مامون کے دو زبردست سپہ سالار طاہر بن حسین اور ہرثمہ بن اعین بغداد کی طرف دو سمتوں سے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ادھر موصل، واسط، کوفہ، بصرہ، حجاز، یمن، حیرہ وغیرہ صوبے بھی سب قبضہ سے نکل چکے تھے۔ امین کی خلافت وحکومت صرف بغداد اور نواح بغداد تک محدود رہ گئی تھی۔ مسلسل ناکامیوں کے بعد اب رمضان سنہ ۱۹۶ھ سے امین کے لیے نہایت ہی نازک اور خطرناک زمانہ شروع ہو گیا تھا۔ امین نے مجبور ہو کر طاہر کی فوج میں لشکریوں کے پاس خفیہ پیغامات بھیجے اور مال واسباب وانعامات کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی سازش کی۔ چنانچہ طاہر کے لشکر سے جو نہر صرصر کے کنارے مقیم تھا، پانچ ہزار آدمی امین کے پاس بغداد میں چلے گئے۔ اس کے بعد بعض فوجی سردار بھی امین سے جا ملے۔ امین نے ان لوگوں کو جو طاہر کی فوج سے کٹ کر آ گئے تھے، حسب لیاقت انعام واکرام سے معزز کیا اور ایک زبردست فوج مرتب کر کے طاہر کے مقابلہ کو روانہ کیا۔ صبح سے شام تک لڑائی ہوتی رہی۔ آخر امین کے لشکر کو ہزیمت ہوئی اور مفرور بھاگ کر بغداد میں امین کے پاس پہنچے۔ امین نے نئے آدمیوں کا ایک اور لشکر جن میں شکست یافتوں میں سے ایک شخص بھی نہ تھا، مرتب کر کے دوبارہ صرصر کی طرف روانہ کیا۔ ان کو بھی شکست حاصل ہوئی۔

اب طاہر اپنی فوج لے کر صرصر سے اور ہرثمہ اپنا لشکر لے کر نہروان سے بغداد کی طرف روانہ ہوئے۔ طاہر نے باب انبار پر ڈیرہ ڈالا۔ ہرثمہ نے نہر یمن پر مورچہ جما دیا۔ عبداللہ بن وضاح نے شاسیہ کی جانب اور مسیّب بن زہیر نے قصر کلواذی کی جانب پڑاؤ ڈالا۔ اس طرح مامون کے سرداران فوج نے بغداد کا محاصرہ کر کے اہل بغداد پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ ادھر امین نے بھی اپنے

طلائی ونقرئی زیورات وظروف اور قیمتی سامان فروخت کر کے فوج کے روز ینے تقسیم کیے اور مدافعت پر پوری کوشش صرف کی۔ یہ محاصرہ قریباً سوا برس تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں اہل بغداد اور امین کے سپہ سالاروں نے جو جو مصائب برداشت کیے اور جس پامردی سے مقابلہ کیا، وہ ضرور قابل تعریف ہے مگر یہ سب کچھ بے نتیجہ اور خلاف عقل کام تھے۔ سعد بن مالک بن قادم امن حاصل کر کے طاہر کے پاس چلا آیا۔ طاہر نے اس کو خندقیں کھدوانے اور مورچوں کو آگے بڑھانے کا کام سپرد کیا۔ محاصرین میں ہرثمہ اور طاہر دونوں بڑے سردار تھے مگر طاہر اپنی فتوحات اور معرکہ آرائیوں میں بہ کثرت کامیاب ہونے کے سبب سے زیادہ شہرت حاصل کر چکا تھا اور اس لیے وہی اس تمام فوج کا افسر اور سپہ سالار اعظم سمجھا جاتا تھا۔ امین کی طرف سے قصر صالح اور قصر سلیمان بن منصور میں جو بغداد سے باہر دجلہ کے کنارے پر تھے، چند سردار معین تھے جو محاصرہ فوج کے دمدموں اور مورچوں کو توڑنے کے لیے منجنیقوں سے آتش بازی اور سنگ باری میں مصروف تھے۔ طاہر کی طرف سے بھی ترکی بہ ترکی سنگ باری اور آتش زنی کا کام ہو رہا تھا۔ رال کے جلتے ہوئے گولے اور پتھر طرفین سے پھینکے جاتے تھے۔ محاصر فوج جس قدر آگے بڑھ آتی تھی، خندقیں کھود کر مورچے بنا لیتی تھی۔ اس طرح بیرون شہر سے دائرہ کو تنگ کرتے ہوئے فصیل شہر تک پہنچ کر اور دروازوں کے ذریعہ سے یا فصیل کو توڑ کر اندر داخل ہوئے۔ پھر ہر محلّہ اور ہر حصہ میں قدم قدم پر مقابلہ کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ مدینۃ المنصور میں امین کو محصور کر لیا۔

غلہ اور ضروریات زندگی کا باہر سے شہر میں آنا بند ہو گیا تھا۔ جیل خانے سے قیدی چھوڑ دیے گئے تھے۔ شہر کے اوباشوں اور بدمعاشوں کو فوج میں بھرتی کر لیا گیا تھا۔ لوٹ مار، چوری، ڈاکہ زنی کا بازار بھی شہر میں گرم تھا۔ باا‌ثر سردار اور بہادر سپہ سالار طاہر کی ریشہ دوانیوں اور لالچوں کے ذریعہ سے بہ تدریج امین کے پاس سے جدا ہو کر طاہر کے پاس آتے جاتے تھے۔ شرفاء شہر موقع پا کر شہر سے نکلتے جاتے تھے۔ بہت سے محلے ویران ہو گئے تھے۔ بنوقحطبہ، محمد بن عیسیٰ، یحییٰ بن علی بن عیسیٰ بن ہامان، محمد بن ابی عباس طائی یکے بعد دیگرے طاہر سے جا ملے۔ جن مقاموں پر یہ لوگ مدافعت پر مامور تھے، وہ مقامات بھی طاہر کے سپرد کرتے گئے۔ امین نے مدافعت میں خوب استقلال دکھایا۔ آخر میں اس نے محمد بن عیسیٰ بن نہیک کے سپرد تمام جنگ کا اہتمام کر دیا تھا۔ جس طرف عبداللہ بن وضاح کی فوج تھی، اس طرف اہل بغداد کی نئی بھرتی کی ہوئی فوج نے حملہ کر کے عبداللہ

بن وضاح کو شکست دے کر شماسیہ پر قبضہ کر لیا۔ ہرثمہ یہ خبر سن کر اس طرف کمک کے لیے پہنچا۔ اتفاق سے ہرثمہ کو بھی شکست ہوئی اور گرفتار ہو گیا مگر اس کے ہمراہیوں نے دھوکہ دے کر اس کو رہا کرا لیا۔ یہ حالت سن کر طاہر خود اس طرف پہنچا اور ایک زبردست حملہ کر کے امین کے لشکر کو پسپا کیا اور عبداللہ بن وضاح کو پھر اس کے مورچہ پر قابض کرا دیا۔ طاہر نے بہ تدریج اپنے لشکر کو تمام شہر میں پھیلا دیا اور مدینۃ المنصور میں امین کو محصور کر لیا۔

امین نہایت صبر و استقلال سے محاصرہ کی سختیاں برداشت کرنے لگا۔ ارکین سلطنت میں سے صرف حاتم بن صفرہ، حسن حریشی اور محمد بن ابراہیم بن اغلب افریقی اس کے ہمراہ تھے۔ محمد بن ابراہیم نے امین سے کہا کہ اس گئی گزری حالت میں بھی سات ہزار سوار امیرالمومنین کے ہر ایک حکم کی تعمیل کو موجود ہیں۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ امراء و ارکین کے لڑکوں کو منتخب کر کے ان کا افسر مقرر کریں اور کسی دروازے سے بہ حالت غفلت نکل کر جزیرہ و شام کی طرف چلے جائیں اور ایک جدید سلطنت کی بنیاد ڈالیں۔ ممکن ہے کہ چند روز کے بعد عوام کا میلان طبع آپ کی جانب ہو جائے اور پھر حصول مقصد کی کوئی اچھی صورت پیدا ہو سکے۔ امین اس ارادے کے موافق عمل درآمد کر لیتا تو شاید اس کا انجام اس انجام سے بہتر ہوتا جو ہوا۔ طاہر کو جب امین کے اس ارادے کی اطلاع ہوئی تو اس نے سلیمان بن منصور اور محمد بن عیسیٰ بن نہیک کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر تم نے امین کو اس ارادے سے باز نہ رکھا تو تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔ ان لوگوں نے طاہر سے خائف ہو کر امین کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا کہ امیرالمومنین کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اپنے آپ کو ابن اغلب اور ابن صفرہ کے قبضہ میں دے دیں۔ یہ لوگ خائن اور غیر معتبر ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہرثمہ بن اعین سے امن طلب کر کے اس کے پاس چلے جائیں۔ ابن صفرہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ خلیفہ امین، ہرثمہ بن اعین سے امن طلب کر کے اپنے آپ کو اس کے سپرد کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے تو اس نے کہا کہ امیرالمومنین! آپ اگر امان ہی طلب کرتے ہیں تو طاہر سے طلب کریں، ہرثمہ کی امان میں نہ جائیں۔ مگر امین نے کہا کہ میں طاہر سے امان طلب نہیں کروں گا۔ چنانچہ ہرثمہ کے پاس پیام بھیجا گیا۔ اس نے بہ خوشی منظور کر لیا مگر طاہر کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس کو بے حد ناگوار گزرا کہ آخری فتح یابی کا سہرا ہرثمہ کے سر پر بندھے گا۔ اس نے نہایت سخت پہرہ مقرر کر دیا کہ امین محل سرائے سے نہ نکل سکے۔ ہرثمہ نے یہ تجویز کی تھی کہ رات کے وقت امین نکل کر اس کشتی میں

جو اس کی محل سرائے کے نیچے ہرثمہ لیے موجود ہوگا، سوار ہو جائے اور ہرثمہ کی پناہ میں آ جائے۔ طاہر کی طرف سے اس قسم کی تیاریاں دیکھ کر اس نے امین کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ آج رات اور صبر کریں کیونکہ آج صبح دریا کے کنارے مجھے کچھ ایسی علامات نظر آئی ہیں جن سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ امین نے جواباً کہلا بھیجا کہ میرے جس قدر ہوا خواہ اور ہمدرد تھے، وہ سب مجھ سے جدا ہو چکے ہیں۔ میں ایک ساعت بھی یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں طاہر کو اس کا علم نہ ہو جائے اور وہ مجھ کو گرفتار کر کے قتل نہ کر دے۔

آخر ۲۵ محرم سنہ ۱۹۸ھ کو وقت شب امین نے اپنے دونوں لڑکوں کو گلے لگایا، پیار کیا اور ان سے رخصت ہو کر روتا ہوا دریا کے کنارے آیا اور ہرثمہ کی جنگی کشتی پر سوار ہو گیا۔ ہرثمہ نے جو کشتی پر موجود تھا، نہایت عزت و احترام سے کشتی میں سوار کرایا اور امین کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور کشتی چلانے والوں کو روانگی کا حکم دیا۔ جوں ہی کشتی روانہ ہوئی، سامنے سے طاہر کی جنگی کشتیوں کا بیڑا سامنے آ گیا اور ہرثمہ کی کشتی کا محاصرہ کر کے لڑائی شروع کر دی۔ غوطہ زنوں نے کشتی میں سوراخ کر دیا اور حملہ آوروں نے ہر طرف سے تیر بازی کی۔ آخر کشتی میں پانی بھر آیا، وہ ڈوب گئی۔ ہرثمہ کے بال پکڑ کر ملاح نے نکالا اور ڈوبنے سے بچا لیا۔ امین پانی میں تیرنے لگا۔ اس کو طاہر کے آدمیوں نے پکڑ لیا۔ احمد بن سالم تیر کر کنارے تک پہنچ گیا۔ جب دریا سے باہر نکلا تو وہ بھی طاہر کے آدمیوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوا۔ احمد بن سالم کا بیان ہے کہ مجھ کو گرفتار کر کے طاہر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے مجھ کو قید خانہ میں بھجوا دیا۔ تھوڑی رات گزری ہوگی کہ طاہر کے سپاہیوں نے قید خانہ کا دروازہ کھولا اور امین کو اندر داخل کر کے پھر دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت امین صرف پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر عمامہ اور شانوں پر ایک بوسیدہ کپڑا تھا۔ امین انا للہ انا الیہ راجعون پڑھ کر رونے لگا۔ امین نے مجھ کو پہچان کر کہا کہ تم مجھ کو اپنے گلے لگا۔ لو میری طبیعت سخت متوحش ہو رہی ہے۔ میں نے اس کو گلے لگایا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ذرا اس کے ہوش و حواس بجا ہوئے تو مجھ سے مامون کا حال دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ وہ زندہ سلامت موجود ہے۔ امین نے کہا کہ اس کا وکیل تو مجھ سے کہتا تھا کہ مامون مر گیا۔ غالباً اس سے اس کا مدعا یہ ہوگا کہ میں اس کی جنگ سے غافل ہو جاؤں۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے وزیروں سے سمجھے کہ انہوں نے آپ کو دھوکا دیا، پھر امین نے آہ سرد کھینچ کر کہا کہ کیوں بھائی! کیا یہ لوگ وعدہ امان کو ایفا نہ کریں گے؟ میں نے کہا کہ ان شاء

اللہ تعالیٰ ضرور پورا کریں گے۔ ہم دونوں یہی باتیں کر رہے تھے کہ محمد بن حمید آیا۔ دور سے کھڑا ہوا دیکھتا رہا اور امین کو پہچان کر واپس چلا گیا۔ اس کے بعد آدھی رات کے وقت چند عجمی ننگی تلواریں لیے ہوئے قید خانہ میں آئے۔ امین ان کو دیکھ کر آہستہ آہستہ پیچھے پیچھے ہٹنے لگا۔ ان میں سے ایک نے لپک کر امین کو پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور ذبح کر کے سر اتار لیا۔ سر لے کر چلے گئے۔ صبح ہوئی تو لاش کو بھی اٹھا کر لے گئے۔

طاہر نے امین کا سر منظر عام پر لٹکا دیا۔ جب لوگوں نے اچھی طرح دیکھ لیا تو اپنے چچازاد بھائی محمد بن حسن بن زریق بن مصعب کے ہاتھ خاتم خلافت، عصا، چادر کے ہمراہ مامون کے پاس بھیج دیا اور شہر میں امن کی منادی کرا دی۔ جمعہ کے دن جامع مسجد میں مامون کے نام کا خطبہ پڑھا اور امین کی برائیاں بیان کیں۔ موسیٰ و عبداللہ پسران امین کو مامون کے پاس بھیج دیا۔ اس کے بعد طاہر کے لشکر نے اپنے روزینے طلب کیے مگر جب وصول نہ ہوئے تو سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ طاہر کو بغداد سے اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا، پھر اپنے خاص سرداروں کو بلا کر اور ایک جمعیت فراہم کر کے بغداد میں داخل ہوا اور اہل شہر اور اہل لشکر کو اطاعت پر مجبور کیا۔

خلافت امین کا جائزہ:

خلیفہ امین نے ۲۷ یا ۲۸ برس کی عمر پائی۔ چار برس اور ساڑھے سات مہینے خلافت کی۔ یہ تمام زمانہ فتنہ وفساد اور خوں ریزی میں گزارا۔ ہزار ہا مسلمانوں کا خون بلاوجہ بہایا گیا۔ امین کا عہد خلافت عالم اسلام کے لیے مصیبت ونحوست کا زمانہ تھا۔ امین اگرچہ نحو وادب میں دست گاہ کامل رکھتا تھا اور اچھے شعر کہتا تھا، اہل علم کا قدردان بھی تھا مگر لہو ولعب کی طرف مائل اور مہمات سلطنت کو سرانجام دینے کے ناقابل تھا۔ تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی قصر منصور کے قریب میدان چوگان بنانے کا حکم دیا۔ زیب وزینت اور آرائش کے کاموں میں اس کی خصوصی توجہ صرف ہوتی تھی۔ گانے بجانے کا شائق اور حسن پرستی کی لعنت میں گرفتار تھا، پھر سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ خود غرض وزراء میں ایسا کوئی نہ تھا کہ جو کہتا کہ:

تو ئی مردِ میدانِ ایں کارواں
چہ کارت بعشقِ پری پیکراں

غرض امین اپنی نو جوانی کے جذبات کا پورے طور پر مغلوب اور ملک گیری و ملک داری کی صفات سے معرا تھا۔ فضل بن ربیع جو اس کا وزیراعظم تھا، خاندان عباسیہ کے لیے اچھا وزیر ثابت نہ ہوا۔ فضل بن ربیع نے ہی طوس سے اس لشکر اور اس سامان کو جو مامون کے پاس ہارون کی وصیت کے موافق رہنا چاہیے تھا، بغداد لانے اور مامون کو نقصان پہنچانے کی نامناسب حرکت سے امین و مامون دونوں بھائیوں میں عداوت و دشمنی کا بیج بویا۔ اتنی سی بات کو غالباً مامون برداشت کر لیتا اور امین اپنی عیش پسندی کے سبب سے مامون کے درپے نہ ہوتا لیکن دوسرا نازیبا کام فضل بن ربیع نے امین سے کرایا کہ مامون کو ولی عہدی سے معزول کرا کر امین کے شیر خوار بچے کو مامون کی جگہ ولی عہد بنوایا اور اس ملک میں سے جو ہارون کی وصیت اور تقسیم کے موافق مامون کا تھا، ایک حصہ کتر لینا چاہا۔ عہد نامے کو خانہ کعبہ سے منگوا کر چاک کر دینے کی حرکت بھی امین نے فضل بن ربیع کے مشورے سے کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان عباسیہ کے تمام باثر اراکین امین سے بدگمان و بددل ہو گئے۔

اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو ان تمام مصائب اور تمام نقصانات کا جو کہ عالم اسلام کو پہنچے، سبب ہارون الرشید تھا۔ ہارون الرشید کے غلط اور قابل ملامت کاموں میں سب سے زیادہ قابل ملامت کام یہی تھا کہ اس نے اپنے جانشین کے انتخاب میں غلط رویہ اختیار کیا اور یہ جانتے ہوئے کہ امین کے مقابلہ میں مامون زیادہ لائق اور مستحق خلافت ہے، امین کو مامون پر مقدم رکھا۔ ہارون کی طرف سے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ امین نجیب الطرفین اور خالص ہاشمی تھا لیکن مامون کی ماں مجوسی النسل تھی۔ اس لیے مامون سے اندیشہ تھا کہ وہ عربی عنصر کو زیادہ کمزور کر کے ایرانیوں کے اقدار و قوت کو اور زیادہ بڑھا دے گا۔

امین کو اس لیے اپنا جانشین منتخب کیا تھا کہ وہ خالص ہاشمی اور عربی ہونے کی وجہ سے ہارون الرشید کی اس پالیسی کو جو اس نے آخر عمر میں اختیار کی تھی کہ ایرانیوں کے زور کو توڑ دیا جائے، کامیاب بنا سکے گا مگر اس پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے امین کا دل و دماغ موزوں نہ تھا۔ اور ہارون کو اس کا اندازہ بہ خوبی تھا کیونکہ اپنے آخر ایام میں وہ مامون کی قابلیت اور امین کی نااہلیت

---

❶ جناب رسول اللہ ﷺ نے عربی اور عجمی کی تقسیم اور تفریق پیدا کرنے اور عصبیت کی طرف بلانے اور اس کے تحت لڑنے سے نہایت سختی سے منع فرمایا تھا اور وعید سنا کر خبردار کیا تھا۔ لیکن خیر القرون کے بعد امت نے اسی عصبیت کو گلے سے لگایا اور اس کے تحت سینکڑوں جنگیں لڑیں، اناللہ وانا الیہ راجعون!

سے بہ خوبی واقف ہو چکا تھا۔ اگر اور بھی زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو ہارون الرشید کی بھی کوئی خطا نہیں تھی بلکہ شروع ہی سے عباسیوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا جو ظہور میں آیا۔ عباسیوں نے اول اہل خراسان کو حصول مقصد کا ذریعہ بنا کر عربوں کی مخالفت کی اور عربوں کے اثر واقتدار کو مٹانے میں ساری طاقت صرف کر کے خراسانیوں کو جو نومسلم تھے، طاقتور بنا دیا۔ ابو مسلم کو جو حکم عباسی مقتداء کی طرف سے دیا گیا تھا، اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ کسی عربی بولنے والے کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔[1] چنانچہ ابو مسلم نے چھ لاکھ عربوں کو خراسان وایران میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ علویوں اور عباسیوں کی متفقہ کوششیں جو بنوامیہ کے خلاف جاری تھیں، وہ شروع ہی سے اہل عرب کے اثر وقوت کو اور خراسانیوں، فارسیوں اور عراقیوں کو طاقتور بنانے والی تھیں۔ ہر ایک سازش جو بنوامیہ کے خلاف کامیاب ہوئی، اس میں عراقیوں اور خراسانیوں ہی سے امداد لی گئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بنوامیہ کی بربادی عمل میں آئی تو علوی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور عباسی خلافت وحکومت کے مالک ہو گئے۔ اب علویوں نے عباسیوں کی مخالفت شروع کی اور سازشوں کا سلسلہ برابر جاری رہا تو علویوں کو بھی عراقیوں اور خراسانیوں ہی سے امداد ملی۔[1]

جن لوگوں کو شروع میں بنوامیہ کے خلاف عربوں کے قتل کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا، وہی اب عباسیوں کے لیے موجب مشکلات بن گئے۔ منصور عباسی کے زمانے تک خراسانیوں کا عروج برابر ترقی پذیر رہا۔ صرف مہدی کے چند سالہ عہد حکومت میں مجوسی النسل لوگوں کی ترقی رکی رہی اور عربوں کی کچھ کچھ قدر دانی ہوئی۔ ہادی وہارون کے زمانے میں مجوسی النسل لوگ برابر ترقی کرتے اور اپنی قوت بڑھاتے رہے۔ ہارون نے اپنے آخری ایام حکومت میں اس بات کو محسوس کیا کہ عربوں کو کمزور کر دینے سے ہم نے خود اپنا بھی بہت نقصان کر لیا ہے۔ وہ اس کی تلافی کے درپے ہوا مگر اس کو موت نے زیادہ مہلت نہ دی۔ امین کی خلافت میں عربوں کا مرکز قوت امین اور خراسانیوں کا مرکز قوت مامون بن گیا یعنی امین و مامون کے ذریعہ سے عربی النسل گروہوں کا مقابلہ ہوا۔ امین چونکہ ذاتی طور پر ناقابل اور مامون اس کی نسبت زیادہ سمجھدار تھا، لہٰذا عربی گروہ کو شکست ہوئی اور

---

[1] عراق، خراسان اور ایران کے علاقے اس وقت سبائی گروہ کا گڑھ تھے۔ یہاں سے اس قدر سازشوں نے جنم لیا کہ خلافت اسلامیہ کا نظام مسلسل غیر مستحکم ہوتا چلا گیا اور شورشوں اور لڑائیوں نے خوب زور پکڑا۔ نتیجتاً خلفاء وحکام نے جو توجہ اور تیاری غیر مسلموں سے جہاد وقتال کرنے کے لیے کرنی تھی، وہ ان خانہ جنگیوں نے سمیٹ لی۔

مجوسی النسل لوگ حکومت اسلامیہ کے مالک بن گئے۔ انہیں خراسانیوں اور مجوسی النسل لوگوں نے مامون کو اپنا بنا کر اور سلطنت کی مشین کو اپنے قبضے میں لے کر چاہا کہ مامون کے بعد حکومت علویوں کے سپرد کر دیں مگر قدرتی طور پر ایسے اسباب پیش آ گئے کہ وہ کامیاب نہ ہو سکے اور حکومت وخلافت خاندان عباسیہ ہی میں رہی۔ آخر انہیں خراسانیوں اور نومسلم ترکوں نے زیادہ حوصلہ مند بن کر خود خلافت اسلامیہ کے تکے بوٹی کر کے الگ الگ اپنی حکومتیں قائم کیں، جس کی تفصیل آئندہ ابواب میں آنے والی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ خلافت اسلامیہ میں باپ کے بعد بیٹے کے ولی عہد ہونے اور وراثت کے قائم ہونے کی لعنت تمام مفاسد، تمام مصائب، تمام معائب کی بنیاد ہے اور اسی بدعت نے مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور حکومت اسلامیہ کے روشن و خوبصورت چہرے کو ہمیشہ گرد آلود رکھا۔ امین کی خلافت کے زمانہ کی بدتمیزیاں بھی اسی وراثت خلافت کی لعنت کا نتیجہ تھیں۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ علی، حسن رضی اللہ عنہما امین الرشید تین خلیفہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے ہاشمی تھے یعنی ان ہر سہ خلفاء کی مائیں بھی ہاشمیہ تھیں اور تینوں کے لیے خلافت بہ حسب ظاہر راس نہ آئی یعنی علی رضی اللہ عنہ کا تمام عہد خلافت اندرونی جھگڑوں اور مسلمانوں کی آپس کی لڑائیوں میں گزرا اور انجام کار ایک شقی نے ان کو شہید کر دیا۔ حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت کو خود چھوڑ دیا، تاہم وہ بھی زہر سے شہید ہوئے۔[1] امین کا بھی تمام زمانہ خلافت لڑائی جھگڑوں میں بسر ہوا اور وہ بھی قتل کیا گیا۔

---

[1] حسن رضی اللہ عنہ کو ان کی ایک بیوی جعدہ بنت اشعث نے زہر دیا تھا، جس سے آپ کی وفات ہوئی۔ (حکمران صحابہ رضی اللہ عنہم۔ الشیخ محمود احمد غضنفر، صفحہ ۳۰۸)

دوسرا باب

مامون الرشید

مامون الرشید بن ہارون الرشید کا اصل نام عبداللہ تھا، باپ نے مامون کا خطاب دیا۔ کنیت ابوالعباس تھی۔ بروز جمعہ نصف ربیع الاول سنہ ۱۷۰ھ میں پیدا ہوا۔ جس رات مامون الرشید پیدا ہوا، اسی رات ہادی کا انتقال ہوا۔ اس کی ماں کا نام مراجل تھا جو مجوسی النسل ام ولد تھی اور چلہ (ایام نفاس) ہی میں مرگئی تھی۔ مراجل باذغیس علاقہ ہرات میں پیدا ہوئی تھی۔ علی بن عیسیٰ گورنر خراسان نے اس کو ہارون الرشید کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ مامون الرشید کو آغوش مادر میں پرورش پانے کا موقع نہیں ملا۔ ہارون الرشید نے اس کی پرورش اور تربیت میں خصوصی توجہ مبذول رکھی۔ پانچ برس کی عمر میں کسائی نحوی اور یزیدی کی شاگردی میں دیا گیا۔ ان دونوں استادوں نے اس کو قرآن مجید اور عربی ادب کی تعلیم دی۔

بارہ برس کی عمر میں جبکہ مامون اپنی ذہانت اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ذکاوت کی بہ دولت اچھی دست گاہ پیدا کر چکا تھا، جعفر برمکی کی اتالیقی میں سپرد کیا گیا۔ اسی سال یعنی سنہ ۱۸۲ھ میں اس کو ہارون نے امین کے بعد ولی عہد مقرر کیا۔ مندرجہ بالا اساتذہ کے علاوہ دربار ہارون میں علماء وفضلاء کی کمی نہ تھی اور وہ سب بھی وقتاً فوقتاً مامون کی استادی پر مامور ہوتے رہے۔ مامون قرآن کریم کا حافظ اور متبحر عالم تھا۔ فصاحت کلام اور برجستہ گوئی میں اس کو کمال حاصل تھا۔ اپنے بھائی امین سے عمر میں کسی قدر بڑا تھا۔ قرآن اور حدیث اس نے بڑے بڑے ائمہ فن سے پڑھی تھی۔ ہارون الرشید نے امین و مامون دونوں کو بڑی ہی توجہ کے ساتھ تعلیم دلائی تھی لیکن مامون پر اس تعلیم اور توجہ کا جو اثر ہوا، وہ امین پر نہ ہوا۔

اگرچہ جمادی الثانی سنہ ۱۹۳ھ سے جبکہ ہارون الرشید کا انتقال ہوا تھا، مامون الرشید خراسان وغیرہ ممالک مشرقیہ کا خود مختار فرماں روا تھا لیکن اس کی خلافت کا زمانہ محرم سنہ ۱۹۸ھ سے جبکہ امین

مقتول ہوا، شروع ہوتا ہے۔ امین ۲۵ محرم کو بہ وقت شب مقتول ہوا اور مامون کی بیعت ۲۶ محرم سنہ ۱۹۸ھ بروز ہفتہ بغداد میں ہوئی۔

جب مامون کو امین کے مقتول ہونے کا حال معلوم ہوا اور بغداد میں اس کی فوج کا تسلط قائم ہو کر اہل بغداد نے مامون کو خلیفہ تسلیم کر لیا تو مامون نے اپنے وزیر فضل بن سہل کے حقیقی بھائی حسن بن سہل کو جبال، فارس، اہواز، بصرہ، کوفہ، حجاز، یمن وغیرہ نومفتوحہ ممالک کی حکومت عطا کر کے بغداد کی جانب روانہ کیا۔ ہرثمہ بن اعین اور طاہر بن حسین نے یہ تمام علاقہ فتح کیا تھا اور انہی ہر دو سپہ سالاروں کی پامردی سے یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ مامون کو اہل بغداد نے خلیفہ تسلیم کیا اور امین مقتول ہوا۔

طاہر جس نے سب سے زیادہ کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، اس بات کا متوقع تھا کہ اس کو ان نومفتوحہ صوبوں کی حکومت عطا ہوگی مگر خلاف توقع حسن بن سہل کو یہ حکومت ملی اور طاہر بن حسین کو حسن بن سہل نے جزیرہ، موصل اور شام کا گورنر مقرر کر کے نصر بن شیث بن عقیل بن کعب بن ربیعہ بن عامر کے مقابلہ پر روانہ کیا، جس نے امین کی بیعت کے ایفاء کا اظہار کر کے خلافت مامون کے خلاف موصل و شام میں گروہ کثیر جمع کر لیا تھا اور عراق کے شہروں پر قبضہ وتصرف کرتا جاتا تھا۔ حسن بن سہل کے حاکم اور نائب سلطنت مقرر ہو کر آنے سے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ فضل بن سہل، مامون پر پورے طور پر حاوی ہے اور اب ہر طرف ایرانیوں ہی کا دور دورہ ہوگا۔ عرب سرداروں کو اس تصور سے سخت اندیشہ ہوا اور ان میں عام طور پر بے دلی پھیل گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی یقین ہو گیا کہ مامون اب فضل بن سہل کی خواہش کے موافق مرو ہی کو دارالخلافہ رکھے گا اور بغداد میں نہ آئے گا۔

طاہر کو حسن بن سہل نے نصر بن شیث کے مقابلے پر بھیجا تو وہاں اس کو کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوئی اور طاہر نے شہر رقہ میں قیام کر کے نصر بن شیث کے ساتھ معمولی چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔ رقہ ہی میں طاہر کے پاس خبر پہنچی کہ خراسان میں اس کے باپ حسین بن زریق بن مصعب نے وفات پائی اور خلیفہ مامون اس کے جنازہ میں خود شریک ہوا۔ ہرثمہ بن اعین کو حسن بن سہل نے خراسان کی طرف چلے جانے کا حکم دیا۔ نصر بن شیث کی بغاوت چونکہ محض اس وجہ سے تھی کہ اہل عرب پر اہل عجم کو کیوں مقدم کیا جاتا ہے۔ اس لیے طاہر نے اس کے مقابلے میں زیادہ توجہ سے کام نہیں لیا کیونکہ طاہر خود اس بات کو ناپسند کرتا تھا کہ اہل عجم، اہل عرب پر حاوی ہوتے جاتے ہیں۔

ہرثمہ بن اعین بھی جو خاندان عباسیہ کے قدیمی متوسلین میں سے تھا، اہل عجم کے اقتدار کو اندیشہ ناک نگاہوں سے دیکھتا تھا۔

ابن طباطبا اور ابوالسرایا کا خروج:

ابوالسرایا سری بن منصور قبیلہ بنوشیبان سے تعلق رکھتا تھا۔ خلافت امین کے زمانہ میں وہ عامل جزیرہ کی فوج میں تھا۔ وہاں اس نے بنوتمیم کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا۔ عامل جزیرہ نے قصاص کی غرض سے اس کی گرفتاری کا حکم دیا تو وہ فرار ہو کر رہزنی کرنے لگا۔ آخر تیس آدمی اس کے ساتھ اس رہزنی میں شریک ہو گئے۔ چند روز کے بعد وہ مع اپنے گروہ یزید بن مزید کے پاس آرمینیا چلا گیا۔ یزید بن مزید نے اس کو سپہ سالاری کا عہدہ عطا کر دیا۔ یزید بن مزید فوت ہو گیا تو اس کے لڑکے اسد بن یزید کے پاس رہنے لگا۔ جب اسد آرمینیا کی حکومت سے معزول ہوا تو ابوالسرایا احمد بن مزید کے پاس چلا گیا۔ امین نے احمد بن مزید کو جنگ ہرثمہ پر مامور کیا تو احمد بن مزید نے ابوالسرایا کو اپنے لشکر کے مقدمۃ الجیش کی سرداری عطا کی۔ ہرثمہ نے اس سے سازش کر لی اور ہرثمہ کے پاس چلا گیا۔

ہرثمہ کے پاس جا کر اس نے جزیرہ سے اپنے قبیلہ بنوشیبان کے آدمیوں کو بلایا۔ وہ دو ہزار کی تعداد میں جزیرہ سے آ کر ہرثمہ کے لشکر میں بھرتی ہو گئے۔ ابوالسرایا نے ہرثمہ سے کہہ کر ان کے بڑے بڑے روزینے مقرر کرائے۔ جب امین مقتول ہوا تو ہرثمہ نے بنوشیبان کے روزینے دینے سے انکار کیا۔ ابوالسرایا نے ناراض ہو کر ہرثمہ سے حج کی اجازت چاہی۔ ہرثمہ نے اجازت دے دی اور بیس ہزار درہم سفر خرچ عطا کیا۔ ابوالسرایا نے یہ بیس ہزار درہم اپنے ہمراہیوں کو تقسیم کر دیے اور کہا کہ تم لوگ بھی ایک، ایک دو دو کر کے میرے پاس چلے آنا۔ چنانچہ ابوالسرایا ہرثمہ سے رخصت ہو کر بہ ظاہر حج کے ارادے سے روانہ ہوا۔ راستے میں قیام کیا اور وہیں دو سو آدمی آ آ کر اس کے پاس جمع ہو گئے۔ ان لوگوں کو مرتب کر کے ابوالسرایا نے عین التمر پر حملہ کیا اور وہاں کے عاملوں کو گرفتار کر کے عین التمر کو خوب لوٹا۔ مال غنیمت اپنے ہمراہیوں میں تقسیم کر دیا، پھر اس نے اپنی لوٹ مار کے سلسلہ کو جاری رکھ کر کئی مقامات سے سرکاری خزانے لوٹے۔

ہرثمہ نے اس کی سرکوبی و گرفتاری کے لیے فوج بھیجی۔ ابوالسرایا نے اس کو شکست دے کر بھگا

دیا۔ اس کے بقیہ ہمراہی بھی اس سے آ ملے اور اس کی جمعیت بڑھ گئی۔ اس کے بعد ابوالسرایا نے وقوقا کے عامل کو شکست دے کر وہاں کا خزانہ لوٹا، پھر انبار کا قصد کیا۔ وہاں کے عامل ابراہیم شروی کو قتل کر کے انبار کو خوب لوٹا اور مال غنیمت اپنے ہمراہیوں میں تقسیم کر کے چل دیا۔ انبار سے روانہ ہو کر طوق بن مالک تغلبی کے پاس گیا۔ وہاں سے رقہ کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں اتفاقاً محمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن ابراہیم بن حسن مثنیٰ بن علی سے ملاقات ہوگئی جو مدعی خلافت بن کر اٹھا اور اپنے گروہ کو لے کر رقہ سے نکلا تھا۔ ان کے باپ ابراہیم طبا طبا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اس لیے یہ ابن طبا طبا مشہور تھا۔

اب یہ وہ زمانہ تھا کہ حسن بن سہل عراق، حجاز اور یمن وغیرہ کا حاکم مقرر ہو کر بغداد میں آ چکا تھا اور عام طور پر اہل عجم، اہل عرب اقتدار کو خطرے اور نفرت کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور مامون کی خلافت کو اپنے لیے مضر سمجھنے لگے تھے۔[1] علوی لوگ جابہ جا اس حالت سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیاریوں میں مصروف تھے۔ ادھر نصر بن شیث نے اعلان کر دیا تھا کہ میں خاندان عباسیہ کا مخالف اور دشمن نہیں ہوں بلکہ موجودہ حکومت کی اس لیے مخالفت کر رہا ہوں کہ اس حکومت نے اہل عجم کو اہل عرب پر مقدم کر دیا ہے۔ اس اعلان کا یہ اثر تھا کہ نصر بن شیث کے مقابلہ میں مامون کے عرب سرداران فوج کی سرگرمیاں سست پڑ گئی تھیں۔

ہرثمہ کو بھی اسی زمانے میں حسن بن سہل نے ناخوش ہو کر خراسان کی جانب رخصت کیا تھا۔ ابو السرایا نے محمد بن ابراہیم (ابن طبا طبا) کے وجود کو بہت غنیمت سمجھا اور فوراً اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ابن طبا طبا نے ابوالسرایا کو بہ راہ دریا کوفہ کی جانب روانہ کیا اور خود بہ راہ خشکی کوفہ کی جانب روانہ ہوا۔ قرارداد کے موافق ۱۵ جمادی الثانی سنہ ۱۹۹ھ کو ایک طرف سے ابوالسرایا اور دوسری طرف سے ابن طبا طبا کوفہ میں داخل ہوا اور قصر عباس جو موسیٰ بن عیسیٰ کو، کہ یہی گورنر کوفہ کی قیام گاہ تھا اور یہیں شاہی خزانہ بھی تھا، لوٹ لیا۔ تمام شہر پر قبضہ حاصل ہو گیا اور اہل کوفہ نے ابن طبا طبا کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

حسن بن سہل نے کوفہ پر ابوالسرایا اور ابن طبا طبا کے قبضہ کا حال سن کر زہیر بن مسیّب کو دس

---

[1] عبداللہ بن سبا یہودی اور اس کے شیطان پرست حواریوں نے اہل عرب کے خلاف فضاء تیار کرنے کے لیے جو بیج بوئے تھے اور ان سے جو پودے پھوٹ نکلے تھے، وہ اب سر اٹھا رہے تھے اور تناور ہو چکے تھے۔

ہزار کی جمعیت کے ساتھ کوفہ کی جانب روانہ کیا۔ ابوالسرایا اور ابن طباطبا نے کوفہ سے نکل کر زہیر بن مسیّب کا مقابلہ کیا، زہیر کی فوج کو شکست ہوئی۔ ابوالسرایا نے زہیر کی لشکر گاہ کو لوٹا اور قتل و غارت میں بے رحمی سے کام لیا۔ ابن طباطبا نے ابوالسرایا کو بے رحمی اور قتل و غارت سے منع کیا۔ ابوالسرایا جو شروع سے قتل و غارت اور آزادی کا عادی تھا، اس روک تھام اور دخل غیر کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ابن طباطبا کو زہر دلوا دیا۔ اگلے دن وہ مردہ پایا گیا اور اس کی حکومت و ملک گیری کا زمانہ بہت ہی

جلد ختم ہو گیا۔ ابوالسرایا نے فوراً ایک نوعمر لڑکے محمد بن جعفر بن محمد بن زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب کو ابن طباطبا کا قائم مقام بنا کر بیعت کی اور خود تمام کاموں کو خودمختارانہ طور پر انجام دینے لگا۔

ابوالسرایا کی حکمرانی اور اس کا انجام:

زہیر بن مسیّب شکست کھا کر قصر ابن ہبیرہ میں آ کر مقیم ہو گیا۔ حسن بن سہل نے عبدوس بن محمد بن خالد مرد روزی کو چار ہزار فوج کے ساتھ زہیر کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ زہیر و عبدوس نے کوفہ کی طرف حملہ آوری کی مگر ۱۵ رجب سنہ ۱۹۹ھ کو ابوالسرایا کے مقابلہ میں شکست پا کر مقتول ہوئے۔ اس فتح کے بعد ابوالسرایا نے کوفہ میں اپنے نام کا سکہ جاری کیا اور متعدد علویوں کو صوبوں کی حکومت پر مامور کر کے روانہ کیا۔ اہواز کی حکومت پر عباس بن محمد بن عیسیٰ بن محمد کو، مکہ کی حکومت پر حسین بن حسن بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب المعروف بہ افطس کو، یمن کی حکومت پر ابراہیم بن موسیٰ بن جعفر صادق کو، بصرہ کی حکومت پر زید بن موسیٰ بن جعفر صادق کو روانہ کیا۔ عباس نے بصرہ پر وہاں کے عامل کو شکست دے کر قبضہ کر لیا اور اسی طرح ابوالسرایا کے ہر ایک عامل کو کامیابی حاصل ہوئی۔ ابوالسرایا نے عباس بن محمد کو لکھا کہ تم اہواز سے فوج لے کر بغداد پر مشرقی جانب سے حملہ کرو اور خود فوج لے کر قصر ابن ہبیرہ میں آ ٹھہرا۔ حسن بن سہل نے بغداد سے علی بن سعید کو مدائن اور واسط کی حفاظت کے لیے مدائن کی طرف روانہ کیا تھا۔ ابوالسرایا کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے فوراً قصر ابن ہبیرہ سے ایک فوج بھیج دی، جس نے علی بن سعید کے پہنچنے سے پہلے ہی ماہ رمضان سنہ ۱۹۹ھ میں مدائن پر قبضہ کر لیا۔ خود ابوالسرایا قصر ابن ہبیرہ سے روانہ ہو کر نہر صرصر پر آ کر مقیم ہوا۔ علی بن ابی سعید نے مدائن پہنچ کر ماہ شوال سنہ ۱۹۹ھ میں ابوالسرایا کے لشکر پر محاصرہ ڈال دیا۔ ابوالسرایا یہ سن کر

کہ مدائن میں اس کی فرستادہ فوج محصور ہوگئی ہے، نہر صرصر سے قصر ابن ہبیرہ کی جانب روانہ ہوا۔

ماہ رجب سنہ ۱۹۹ھ میں جب حسن بن سہل کی فرستادہ فوجیں ابوالسرایا سے شکست پا چکیں اور حسن بن سہل کے سردار مقتول و گرفتار ہو گئے تو حسن بن سہل کو بڑی فکر پیدا ہوئی۔ طاہر اس زمانہ میں شہر رقہ میں مقیم تھا اور نصر بن شیث کی وجہ سے وہ واپس نہیں آ سکتا تھا۔ ہرثمہ بغداد سے رخصت ہو کر خراسان کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ ان دونوں سرداروں کے سوا اور کوئی ایسا سردار حسن بن سہل کے پاس نہ تھا جو ابوالسرایا کے مقابلہ پر بھیجا جا سکے۔ ادھر ابوالسرایا نے بغداد کو فتح کرنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ بصرہ، کوفہ، واسط اور مدائن وغیرہ پر اس کا قبضہ ہو چکا تھا۔ حسن بن سہل، ہرثمہ سے اور ہرثمہ، حسن سے ناراض تھا۔ حسن، ہرثمہ سے کوئی امداد نہ لینا چاہتا تھا مگر نہایت مجبور ہو کر اس نے تیز رفتار قاصد ہرثمہ کے پاس بھیجا اور خط میں لکھا کہ تم فوراً راستہ ہی سے واپس آ جاؤ اور ابوالسرایا کے قصے کو چکاؤ۔ ہرثمہ یہ چاہتا تھا کہ حسن بن سہل کے کاموں میں سہولت پیدا ہو مگر چونکہ حسن نے خود امداد و اعانت طلب کی تھی، اس لیے ہرثمہ نے انکار مناسب نہ سمجھا اور فوراً بغداد کی جانب لوٹ پڑا۔ ہرثمہ بغداد میں اس وقت داخل ہوا جبکہ ابوالسرایا نہر صرصر سے قصر ابن ہبیرہ کی جانب مدائن کے محاصرے کی خبر سن کر روانہ ہوا تھا۔ ہرثمہ نے بغداد سے بلا توقف ابوالسرایا کے تعاقب میں کوچ کر دیا۔ راستے میں اول ابوالسرایا کے ہمراہیوں کی ایک جماعت ملی۔ اس کو ہرثمہ نے گھیر کر قتل کر دیا، پھر تیزی سے آگے آگے بڑھ کر ابوالسرایا کو جا لیا۔ ابوالسرایا نے لوٹ کر مقابلہ کیا۔ اس معرکہ میں ابوالسرایا کے بہت سے ہمراہی مارے گئے۔ ابوالسرایا اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلا اور کوفہ میں پہنچ کر بنو عباس اور ان کے ہوا خواہوں کے مکانات کو چن چن کر خوب لوٹا اور سب کو مسمار و ویران کر دیا۔ ان کا مال و اسباب اور امانتیں جو لوگوں کے پاس تھیں، سب پر قبضہ کیا۔ ہرثمہ نے بڑھ کر کوفہ کا محاصرہ کر لیا۔ ابوالسرایا نے کوفہ میں محصور ہو کر قریباً دو مہینے تک مدافعت میں استقامت دکھائی لیکن محاصرہ کی شدت سے مایوس و مجبور ہو کر محمد بن جعفر بن محمد کو ہمراہ لے کر آٹھ سو سواروں کے ساتھ کوفہ سے بھاگ نکلا۔ ۱۵ محرم سنہ ۲۰۰ھ کو ہرثمہ نے کوفہ میں داخل ہو کر وہاں ایک عامل مقرر کیا اور ایک روزہ قیام کے بعد بغداد کی طرف روانہ ہو گیا۔

ابوالسرایا کوفہ سے قادسیہ اور قادسیہ سے طوس کی جانب روانہ ہوا۔ مقام خوزستان میں ایک قافلہ مل گیا جو اہواز سے بہت سا مال و اسباب لیے ہوئے جا رہا تھا۔ ابوالسرایا نے اس کو لوٹ کر

مال واسباب اپنے ہمراہیوں میں تقسیم کر دیا۔

انہیں ایام میں حسن بن علی مامونی نے اہواز سے ابوالسرایا کے عامل کو بھگا کر قبضہ کر لیا تھا۔ جب حسن بن علی نے ابوالسرایا کی اس زیادتی کا حال سنا تو وہ اہواز سے فوج لے کر ابوالسرایا کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ دونوں کا مقابلہ ہوا اور ابوالسرایا کو شکست فاش حاصل ہوئی۔ ابوالسرایا شکست پا کر موضع راس العین علاقہ جلولا میں آیا۔ حسن بن علی نے خبر پا کر فوراً ابوالسرایا کو جا گھیرا اور ابوالسرایا کو قتل کرا کر اس کی لاش کو بغداد کے پل پر لٹکا دیا اور اس کے سر کو مع محمد بن جعفر بن محمد کے، مامون کی خدمت میں روانہ کیا۔ علی بن سعید نے مدائن کو فتح اور ابوالسرایا کی فوج کو قتل کر کے حسن بن سہل کے حکم کے موافق اول واسط کی طرف جا کر اس پر قبضہ کیا، پھر واسط سے بصرہ کی طرف کوچ کیا اور وہاں زید بن موسیٰ بن جعفر صادق کو بے دخل کر کے بصرہ پر قبضہ کیا۔

زید بن موسیٰ نے بصرہ میں تمام بنو عباس اور ان کے ہواخواہوں کے مکانات آگ لگوا کر خاک سیاہ کر دیے تھے۔ اس لیے زید النار کے نام سے شہرت پائی تھی۔ علی بن سعید نے زید النار کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ اس طرح محرم سنہ ۲۰۰ھ میں ابوالسرایا اور ملک عراق کے فتنوں کا خاتمہ ہوا لیکن حجاز و یمن میں ابھی تک شورش و بدامنی بہ دستور باقی تھی۔

حجاز و یمن میں بدامنی:

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ابوالسرایا نے آل ابی طالب ہی کو صوبوں اور ولایتوں کی حکومت پر مقرر کیا تھا۔ ہر جگہ حکومت عباسیہ کے خلاف علوی ہی مصروف عمل تھے۔ یہ ابوالسرایا کی دانائی ہی تھی کہ اس نے علویوں کو صوبوں اور ولایتوں کی حکومتیں دے کر بہ ظاہر اپنی حکومت کو علوی حکومت بنا دیا تھا۔ ابوالسرایا کا خاتمہ ہو گیا لیکن اکثر علوی جو صوبوں پر قابض و متصرف ہو چکے تھے، انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی خلافت قائم کرنے کی جدوجہد میں برابر مصروف رہے۔ قتل امین کے بعد علویوں کو نہایت ہی زریں موقع ہاتھ آ گیا تھا کیونکہ خود مامون پر جن لوگوں نے قبضہ حاصل کر لیا تھا یعنی فضل و حسن ابنان سہل بھی ایرانی النسل ہونے کے سبب سے آل ابی طالب کو آل عباس سے بہتر سمجھتے تھے اور ان کا میلان خاطر علویوں کی طرف زیادہ تھا۔

مامون نے خود جعفر برمکی سے تربیت پائی تھی۔ اس لیے اس کے دل میں بھی علویوں کی عزت و

توقیر بہت زیادہ تھی اور اس کے وزیراعظم کو بہترین موقع حاصل تھا کہ وہ امین کے قتل سے فارغ ہونے کے بعد سلطنت کا رخ علویوں کی جانب پھیر دے مگر ہرثمہ بن اعین کی فوجی قابلیت نے ابوالسرایا کا خاتمہ کر کے عراق کو صاف کر دیا اور علویوں کے طرز حکومت نے ان کو حجاز و یمن میں ناکام رکھا، جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ جب ابوالسرایا نے حسین افطس یعنی حسین بن حسن بن علی بن حسین کو مکہ کا حاکم بنا کر روانہ کیا تو اتفاقاً مکہ میں ہارون الرشید کا مشہور خادم مسرور مع ہمراہیوں کے گیا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں مامون کی طرف سے مکہ کا عامل داؤد بن عیسیٰ بن موسیٰ عباسی تھا۔ مسرور اور داؤد نے مکہ میں حسین افطس کے آنے کی خبر سن کر آل عباس اور ہمدردان آل عباس کا ایک جلسہ منعقد کر کے مشورہ کیا کہ اب ہم کو کیا کرنا چاہیے؟ مسرور اور دوسرے لوگوں نے مقابلہ اور جنگ کرنے کی رائے دی مگر داؤد نے کہا کہ میں حرم شریف میں قتل و خون ریزی کو پسند نہیں کرتا۔ اگر حسین افطس مکہ میں ایک طرف سے داخل ہوا تو میں دوسری طرف سے نکل جاؤں گا۔

مسرور یہ سن کر خاموش ہو گیا اور داؤد نے حسین افطس کے قریب پہنچنے کی خبر سن کر عراق کی طرف کوچ کر دیا۔ یہ دیکھ کر مسرور بھی مکہ سے چل دیا۔ حسین افطس مکہ سے باہر مقیم اور داخل ہونے میں متامل تھا۔ اس نے جب یہ سنا کہ مکہ آل عباس سے خالی ہو گیا ہے تو وہ صرف دس آدمیوں کے ساتھ مکہ میں داخل ہوا، طواف کیا اور ایک شب مکہ میں مقیم رہ کر اپنے ہمراہیوں کو بھی بلا کر مکہ پر قبضہ کر لیا اور حکومت کرنے لگا۔

ابراہیم بن موسیٰ بن جعفر صادق نے یمن میں پہنچ کر مامون کے عامل اسحاق بن موسیٰ بن عیسیٰ کو یمن سے بھگا دیا اور یمن پر قابض و متصرف ہو کر حکومت شروع کی۔ حسین افطس نے خانہ کعبہ کا غلاف اتار کر دوسرا غلاف جو ابوالسرایا نے کوفہ سے بھیجا تھا، چڑھایا۔ بنو عباس کے مال و اسباب اور گھروں کو لوٹ لیا۔ ان کی امانتوں کو بہ جبر لوگوں سے چھین لیا پھر عام مکہ والوں کے مال و اسباب پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ کعبہ شریف کے ستونوں پر جس قدر سونا چڑھا ہوا تھا، اس کو اتار لیا۔ خانہ کعبہ کے خزانہ میں جس قدر نقد و جنس تھا، سب کو نکال کر اپنے ہمراہیوں میں تقسیم کر دیا۔

حسین افطس کے ہمراہیوں نے حرم شریف کی جالیوں کو توڑ ڈالا۔ ادھر ابراہیم نے یمن میں پہنچ کر قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا اور بے گناہوں کو بہ کثرت قتل کرنے کی وجہ سے قصاب کا خطاب پایا۔ چنانچہ ابراہیم قصاب کے نام سے اب تک تعبیر کیا جاتا ہے۔ علویوں کے دوسرے سرداروں نے

بھی جو ابراہیم بن موسیٰ اور حسین افطس کی طرف سے فوجوں اور علاقوں کی طرف سے سرداریاں رکھتے تھے، لوٹ مار اور قتل و غارت میں کمی نہیں کی۔ زید بن موسیٰ کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اس نے بصرہ میں ظلم وستم کا بازار گرم کر کے زید النار کا خطاب پایا تھا۔ غرض علویوں نے ابوالسرایا کی طرف سے حکومتیں پا کر اپنی چند روزہ حکمرانی میں ایک اودھم مچا دیا اور غالباً ان کا یہ ظالمانہ وسفا کانہ طرز عمل ہی ان کی ناکامی و نامرادی کا باعث ہوا۔ جب مکہ میں ابوالسرایا کے قتل کی خبر پہنچی تو اہل مکہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ حسین افطس نے محمد بن جعفر صادق بن محمد باقر بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب کے پاس جا کر کہا کہ یہ موقع بہت مناسب ہے۔ لوگوں کے قلوب آپ کی طرف بہت مائل ہیں۔ ابوالسرایا مارا جا چکا ہے، آپ لوگوں سے اپنی خلافت کی بیعت لیں۔ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کیے لیتا ہوں، پھر کوئی شخص آپ کی مخالفت نہ کرے گا۔ محمد بن جعفر ملقب بہ دیباچہ عالم نے انکار کیا مگر حسین افطس اور محمد بن جعفر کا لڑکا علی، دونوں برابر اصرار کرتے رہے۔ آخر محمد بن جعفر بیعت لینے پر آمادہ ہو گیا۔ لوگوں نے اس کی بیعت کر لی اور وہ امیر المومنین کے لقب سے پکارا جانے لگا مگر اس کے بعد حسین افطس اور محمد بن جعفر کے بیٹے علی نے بداعمالیوں پر کمر باندھی۔ دونوں نے یہاں تک زناکاری میں ترقی کی کہ مکہ کی عورتوں کو اپنی عصمت کا بچانا دشوار ہو گیا۔ سر بازار عورتوں اور مردوں کو بے عزت کرنے لگے۔ اوباش لوگوں کی ایک جماعت ان کے ساتھ ہو گئی اور یہ رات دن ان افعال شنیعہ میں مصروف رہنے لگے۔

مکہ کے قاضی محمد نامی کا لڑکا اسحاق بن محمد ایک روز بازار میں جا رہا تھا، علی بن محمد بن جعفر یعنی امیر المومنین کے صاحبزادے نے اس کو پکڑوا کر بلوا لیا اور اپنے گھر میں بند کر لیا۔ لوگوں نے یہ حالت دیکھ کر ایسا جلسہ کیا اور سب اس بات پر متفق و آمادہ ہو گئے کہ محمد بن جعفر صادق کو معزول کیا جائے اور قاضی مکہ کے لڑکے کو علی بن محمد کے پاس سے واپس چھڑایا جائے۔ لوگوں نے شور و غل مچاتے ہوئے محمد بن جعفر امیر المومنین کا گھر جا گھیرا تو محمد بن جعفر نے لوگوں سے امان طلب کی اور خود اپنے بیٹے علی کے گھر میں جا کر دیکھا تو وہاں اس لڑکے کو موجود پایا اور علی سے لے کر لوگوں کے حوالے کیا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ابراہیم بن موسیٰ کاظم المعروف بہ ابراہیم قصاب نے یمن کے عامل اسحاق بن موسیٰ بن عیسیٰ کو بھگا دیا تھا۔

اسحاق بن موسیٰ یمن ہی میں موقع کا منتظر روپوش رہا۔ اب علویوں کی اس ظالمانہ حکومت اور

لوگوں کی نفرت کو دیکھ کر اس نے ایک لشکر بہ آسانی فراہم کر لیا۔ ابراہیم بھی یمن سے مکہ آیا ہوا تھا۔ اسحاق نے یمن سے روانہ ہو کر مکہ پر حملہ کیا۔ علویوں نے اردگرد کے بدوؤں کو جمع کیا اور خندقیں کھود کر اسحاق کے مقابلے پر مستعد ہو گئے۔ اسحاق نے اول تو صف آرائی کی مگر پھر کچھ سوچ کر وہاں سے سیدھا عراق کی جانب چل دیا۔ ادھر حسن بن سہل نے عراق سے فارغ ہو کر ہرثمہ بن اعین کو حجاز ویمن کے فسادات مٹانے کی طرف توجہ دلائی۔ ہرثمہ نے رجاء بن جمیل اور جلووی کو ایک فوج دے کر مکہ کی جانب روانہ کیا۔ ہرثمہ کا فرستادہ یہ لشکر ادھر سے جا رہا تھا، ادھر سے اسحاق آ رہا تھا۔ راستے میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اسحاق بھی ان لوگوں کے ساتھ مکہ کی جانب لوٹ پڑا، وہاں پہنچ کر علویوں کو مقابلہ پر مستعد پایا۔ سخت معرکہ آرائی کے بعد علویوں کو شکست ہوئی اور عباسی لشکر فتح مند ہو کر مکہ میں داخل ہوا۔

محمد بن جعفر نے امان طلب کی، اس کو امان دی گئی۔ محمد بن جعفر مکہ سے جحفہ اور جحفہ سے بلاد جہنیہ کی طرف جا کر لشکر جمع کرنا شروع کیا۔ جب ایک بڑا لشکر جمع ہو گیا تو مدینہ منورہ پر حملہ کیا۔ مدینہ کے عامل ہارون بن مسیّب نے مقابلہ کیا، متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ آخر دیباچہ عالم محمد بن جعفر صادق نے شکست فاش کھائی اور بلاد جہنیہ کی طرف سے واپس آنا پڑا۔ اسی لڑائی میں ایک آنکھ بھی جاتی رہی اور ہمراہی بھی بہت زیادہ مارے گئے۔ اگلے سال موسم حج میں رجاء بن جمیل اور جلووی سے، جو ابھی تک مکہ کی حکومت پر مامور تھے، امان حاصل کر کے مکہ میں آ کر لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ میں جانتا تھا کہ مامون الرشید فوت ہو چکا ہے۔ اسی لیے میں نے لوگوں سے بیعت لی تھی۔ اب صحیح خبر پہنچ گئی ہے کہ مامون زندہ ہے، لہٰذا میں تم لوگوں کو اپنی بیعت سے سبکدوش کرتا ہوں۔ حج ادا کرنے کے بعد سنہ ۲۰۱ھ میں حسن بن سہل کے پاس بغداد کا قصد کیا۔ اس نے مامون کے پاس بھیج دیا۔ مامون نے عزت سے رکھا۔ جب مامون مرو سے عراق کی جانب روانہ ہوا تو راستے میں بہ مقام جرجان میں وفات پائی۔

ہرثمہ بن اعین کا قتل:

فضل بن سہل نے ہارون الرشید کی وفات کے بعد مامون الرشید کی خوب ہمت بندھائی تھی اور اسی نے امین کے مقابلے کے لیے ساز وسامان کیے تھے۔ مامون نے اس کو وزیراعظم اور صاحب

السیف والقلم بنا دیا تھا۔ ایرانی مامون کی طرف اس لیے مائل تھے کہ اس کی ماں ایرانی تھی۔ اس نے جعفر سے تربیت پائی تھی۔ ایرانیوں کو چوتھائی خراج معاف کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا فضل کو اپنی وزارت اور خلیفہ پر قابو حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی سہولت حاصل تھی۔ اس نے مامون کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ مرو ہی کو دارالخلافہ رکھے جو خراسان کا دارالصدر تھا۔ یہاں اہل عرب کو کوئی زور وقوت حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر مامون الرشید بغداد چلا جاتا تو فضل بن سہل کا یہ زور قائم نہیں رہ سکتا تھا اور وہاں اہل عرب خلیفہ کو اس طرح فضل کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ فضل بن سہل نے اپنے بھائی محسن بن سہل کو عراق وحجاز وغیرہ ممالک کا حاکم و وائسرائے بنا کر اہل عرب کے زور کو کم کرنے کا سامان کر دیا تھا۔ ہرثمہ اور طاہر دو زبردست سپہ سالار تھے، جنہوں نے مامون کی خلافت قائم کرنے کے لیے بڑے بڑے جنگی کارنامے دکھائے تھے۔ طاہر کی شہرت اگرچہ ہرثمہ سے بڑھ گئی تھی مگر ہرثمہ کی قدامت نے اس کمی کو پورا کر دیا تھا اور دونوں کو دربار خلافت سے برابر کے داعیے تھے۔

طاہر کو یہ محسوس ہو چکا تھا کہ امین کو قتل کرنے میں اس نے مامون کی اس فطری محبت کو جو بھائی کو بھائی کے ساتھ ہوتی ہے، صدمہ پہنچایا ہے۔ اسی لیے اس کو اس کے مفتوحہ علاقہ کی حکومت نہ ملی بلکہ اس کی جگہ حسن بن سہل کو فضل بن سہل بآسانی مامون کے حسب منشاء ممالک مغربیہ کا حاکم مقرر کر سکا۔ پس طاہر تو اہل عجم کا زور توڑنے اور مامون کو مرو سے بغداد کی طرف لانے کے لیے کوشش و حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ صرف ہرثمہ بن اعین ہی یہ جرأت کر سکتا تھا کہ وہ خلیفہ کو اہل عرب کے حسب منشاء توجہ دلائے۔ ہرثمہ کو یہ بات بھی معلوم ہو چکی تھی کہ مامون الرشید کے پاس کوئی خط، کوئی درخواست، کوئی عرض داشت براہ راست بلاتوسط فضل بن سہل ہرگز نہیں پہنچ سکتی۔ اس کو یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ خلیفہ کسی شخص سے بلاتوسط فضل کے ملاقات نہیں کر سکتا یعنی کوئی شخص فضل کی اجازت کے بغیر خلیفہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس حالت میں مامون الرشید کی حالت قریباً ویسی ہی تھی جیسی کہ ہندوستان کے بادشاہ جہانگیر کی مہابت خاں کی قید میں۔

تاریخ اسلامیہ میں یہ سب سے پہلی مثال تھی کہ خلیفہ کو اس کے وزیر نے گویا نظر بند کر رکھا تھا اور خلیفہ اپنے آپ کو شاید نظر بند نہیں سمجھتا تھا۔ اب ابوالسرایا کے قتل اور مکہ کی طرف فوج بھیجنے کے بعد ہرثمہ کو معلوم ہوا کہ مامون الرشید کو اب تک عراق وحجاز کی بغاوتوں کا کوئی حال معلوم نہیں ہوا اور

وہ ملک کی عام حالت سے بالکل بے خبر ہے۔ چنانچہ ہرثمہ فوراً خراسان کی طرف اس ارادے سے روانہ ہوا کہ میں خود دربار میں حاضر ہو کر تمام حالات سے خلیفہ کو واقف کروں گا اور فضل بن سہل کی ان کارروائیوں کو، کہ اس نے اب تک خلیفہ کو بے خبر رکھا ہے، افشا کروں گا۔ ہرثمہ، حسن بن سہل سے رخصت ہوئے بغیر خراسان کی طرف روانہ ہو گیا۔ فضل بن سہل کو جب اس کی اطلاع ہوئی کہ ہرثمہ دربار خلافت کی طرف آ رہا ہے تو اس نے مامون الرشید سے یہ حکم لکھوا کر بھجوا دیا کہ تم راستے ہی سے شام وحجاز کی طرف چلے جاؤ، وہاں تمہاری سخت ضرورت ہے، ہمارے پاس خراسان میں آنے کی ابھی ضرورت نہیں۔

ہرثمہ چونکہ حقیقت سے پہلے ہی آگاہ تھا، اس نے مامون کے اس فرمان کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنی خدمات جلیلہ اور حقوق قدامت پر بھروسہ کیے ہوئے مرو کی جانب سفر کرتا رہا۔ حتیٰ کہ جب مرو کے قریب پہنچا تو اس کو خیال آیا کہ مبادا فضل بن سہل مجھ کو دربار میں باریاب ہی نہ ہونے دے اور میرے آنے کا حال ہی مامون الرشید کو معلوم نہ ہو۔ لہٰذا اس نے شہر میں داخل ہوتے ہوئے نقارہ بجانے کا حکم دیا تاکہ خلیفہ کو معلوم ہو جائے کہ کوئی بڑا سردار شہر میں داخل ہو رہا ہے۔ ادھر جب فضل کو معلوم ہوا کہ ہرثمہ نے حکم کی تعمیل نہیں کی اور برابر مرو کی طرف بڑھتا چلا آتا ہے اور میری شکایت کرنے کا قصد رکھتا ہے تو اس نے مامون الرشید سے کہا کہ مجھ کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ابوالسرایا کو ہرثمہ نے بغاوت پر آمادہ کیا تھا اور جب ہرثمہ کو اس کی سرکوبی پر مامور کیا گیا تو اس نے ابوالسرایا کو صاف بچ کر نکل جانے دیا اور حسن بن علی نے اس کا کام تمام کیا۔ اب اس کی نیت کا حال تو اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے مگر اس کی شوخ چشمی اور گستاخی کی انتہا ہو گئی ہے کہ آپ نے اس کو شام کی طرف جانے کا حکم دیا اور اس نے اس حکم کو پڑھ کر ذرا بھی پرواہ نہ کی اور خودسرانہ طور پر مرو کی طرف آ رہا ہے۔

جب ہرثمہ مرو میں داخل ہوا اور شوروغل اور نقارے کی آواز مامون کے کانوں تک پہنچی تو اس نے دریافت کیا کہ یہ کیسا شور ہے؟ فضل نے کہا کہ ہرثمہ آ پہنچا ہے اور وہی گستاخانہ اور فاتحانہ انداز میں داخل ہو رہا ہے۔ ان باتوں سے مامون کو سخت غصہ آیا، آخر ہرثمہ دربار میں آ پہنچا۔ قبل اس کے کہ وہ اپنا مقصود اصلی اظہار وبیان میں لائے، مامون نے اس سے جواب طلب کیا کہ حکم کی تعمیل کیوں نہیں کی؟

ہرثمہ اس کے متعلق معذرت کرنے لگا لیکن مامون کا طیش وغضب اس درجہ بڑھ چکا تھا کہ اس نے فوراً اس کو نہایت بے عزتی کے ساتھ دربار سے نکلوا کر جیل خانہ میں بھجوا دیا۔ غالباً اس کی کارگزاریاں خود سفارشی بنتیں اور غصہ فرو ہونے کے بعد مامون جلد ہی یا دیر میں اس کی طرف ملتفت ہوتا مگر فضل بن سہل نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور جیل خانہ میں اس کو قتل کرا کر اطلاع دے دی کہ ہرثمہ جیل میں فوت ہو گیا۔ مامون کو ہرثمہ کے فوت ہونے کی خبر سن کر کوئی ملال نہیں ہوا اور اس کی وہ حالت جو پہلے سے قائم تھی اور جس کو تبدیل کرنے کے لیے ہرثمہ نے بیڑا اٹھایا تھا، بہ دستور قائم رہی۔ اب بہ ظاہر کوئی طاقت اور کوئی تدبیر ایسی نہ تھی جو اس کام کا بیڑا اٹھائے مگر قدرت نے خود ایسے سامان فراہم کر دیے کہ فضل کو حسرت ناک موت کا سامنا کرنا پڑا۔

شورش بغداد:

ہرثمہ جب مرو کے جیل خانہ میں مقتول ہوا تو حسن بن سہل اس زمانہ میں بجائے بغداد کے نہروان میں مقیم تھا۔ بغداد میں جب ہرثمہ کے قتل ہونے کی خبر پہنچی تو یہاں ایک تلاطم برپا ہو گیا اور عام طور پر لوگوں کی زبان پر یہی تذکرہ آنے لگا کہ فضل بن سہل نے خلیفہ اور خلافت پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ چونکہ مجوسی ابن مجوسی ہے، اس لیے اب اہل عرب کو ذلتیں اٹھانی پڑیں گی۔ چنانچہ محمد بن ابی خالد نے اہل بغداد کو یقین دلایا کہ میں حسن بن سہل کو عراق سے خارج کر دوں گا۔ اہل بغداد نے اس کی اطاعت اختیار کی۔ محمد بن خالد نے لوگوں کو فوجی تربیت دے کر بغداد کے عامل علی بن ہشام کو جو حسن بن سہل کی طرف سے بغداد میں مامور تھا، نکال دیا۔ حسن بن سہل نے نہروان سے بغداد کی طرف فوجیں بھیجیں۔ محمد نے سب کو شکست دے دے کر بھگا دیا۔ حسن بن سہل واسط میں پہنچا، وہاں پہنچے ہوئے اس کو زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ محمد بن ابی خالد بغداد سے واسط کی طرف فوج لے کر روانہ ہوا۔

حسن بن سہل یہ خبر پا کر واسط سے چل دیا۔ محمد بن ابی خالد نے واسط میں داخل ہو کر قبضہ کیا اور حسن بن سہل کے تعاقب میں فوراً روانہ ہو گیا۔ حسن بن سہل نے لوٹ کر مقابلہ کیا۔ اتفاقاً محمد بن ابی خالد کو شکست ہوئی۔ محمد بن ابی خالد نے جرجرایا میں آ کر قیام کیا اور اپنی حالت درست کر کے پھر حسن بن سہل کا مقابلہ کیا۔ متعدد لڑائیاں ہوئیں، ایک لڑائی میں محمد بن ابی خالد سخت زخمی

ہو گیا۔ اس کا بیٹا اس کو لے کر بغداد میں آیا۔ یہاں آتے ہی محمد بن ابی خالد فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اہل بغداد نے منصور بن مہدی بن منصور عباسی کو خلیفہ بنانا چاہا مگر منصور نے انکار کیا۔ آخر بڑے اصرار کے بعد منصور کو اس بات پر رضا مند کر لیا کہ خلیفہ مامون ہی رہے، اسی کا نام خطبہ میں لیا جائے مگر حسن بن سہل کی جگہ پر نائب السلطنت منصور بن مہدی رہے۔ چنانچہ ماہ ربیع الاول سنہ۲۰۱ھ میں منصور بن مہدی نے بغداد کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد سپہ سالار لشکر مقرر ہوا۔

حسن بن سہل نے اب اپنی حالت کو درست کر کے منصور بن مہدی کے مقابلہ پر فوجیں بھیجیں اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں یہ ہنگامہ آرائیاں ہو رہی تھیں، ادھر مرو میں مامون الرشید بالکل بے خبر اور مطمئن تھا کیونکہ فضل بن سہل نے اس کے پاس بہ راہ راست خبر پہنچنے کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رکھا تھا۔ منصور بن مہدی اور حسن بن سہل کی معرکہ آرائیوں کے زمانے میں بغداد کے اوباشوں اور بدمعاشوں کو آزادی کے ساتھ بدمعاشیوں کے ارتکاب کا خوب موقع مل گیا۔ لوٹ کھسوٹ، ڈاکہ زنی، چوری، زنا، ظلم وتعدی کی وارداتیں بہ کثرت ہونے لگیں اور منہیات شرعیہ کے علانیہ ارتکاب میں کوئی حجاب وتامل باقی نہ رہا۔ یہ بدعنوانیاں جب بڑھتے بڑھتے حد سے زیادہ بڑھ گئیں اور شرفائے بغداد کی زندگیاں وبال جان ہو گئیں تو بغداد میں خالد مدریوش اور سہل بن سلامہ دو اشخاص نے لوگوں کو وعظ و پند کے ذریعہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام شروع کیا۔ ان دونوں کی اس کوشش سے ان بدعنوانیوں میں بہت کچھ کمی واقع ہوئی مگر سہل بن سلامہ کی طرف سے منصور بن مہدی اور عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد کو بغاوت وسرکشی کا خطرہ پیدا ہوا۔ آخر منصور و عیسیٰ دونوں نے حسن بن سہل سے اس شرط پر مصالحت کر لی کہ حسن بن سہل خلیفہ مامون کا دستخطی امان نامہ منگوا دے اور بغداد کی حکومت پر ان دونوں کو اپنی طرف سے مامور رکھے۔

چنانچہ حسن بن سہل بغداد میں داخل ہوا اور دونوں کی حکومت بغداد پر اپنی طرف سے مامور کر کے نہروان کی طرف واپس چلا گیا۔ یہ واقعہ رمضان سنہ۲۰۱ھ کا ہے۔ یہاں یہ واقعات رونما ہو رہے تھے، ادھر مرو میں اسی ماہ رمضان سنہ۲۰۱ھ میں مامون الرشید، علی رضا بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق کو اپنا ولی عہد مقرر کر رہا تھا اور بغداد کے واقعات سے قطعاً بے خبر تھا۔

امام علی رضا کی ولی عہدی:

مامون الرشید اگرچہ فضل بن سہل کے ہاتھ میں حالات سلطنت سے بالکل بے خبر تھا اور فضل بن سہل جس طرح چاہتا تھا، انتظام سلطنت کرتا مگر ساتھ ہی اس کو یہ محسوس نہیں ہونے پایا تھا کہ میں نظر بندوں کی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں۔ مامون کو شروع ہی سے اہل بیت نبوی کے ساتھ بڑی محبت و عقیدت تھی، جیسا کہ اوپر بھی ذکر ہو چکا ہے۔

مامون نے سنہ ۲۰۰ھ میں آل عباس کے اکثر افراد کو اپنے پاس مرو میں طلب کیا اور مہینوں اپنے پاس مہمان رکھا مگر مامون کی نظر انتخاب میں کوئی کامل المعیار نہ نکلا۔ آخر فضل بن سہل اور دوسرے محبان اہل بیت نے اس کی توجہ علی رضا بن موسیٰ کی طرف منعطف کی اور حقیقت یہ ہے کہ علی رضا کو اپنی قابلیت کے اعتبار سے بنی ہاشم میں سب پر فوقیت حاصل تھی۔ چنانچہ مامون الرشید نے بلا تامل اپنی لڑکی کی شادی علی رضا سے کر دی اور ماہ رمضان المبارک سنہ ۲۰۱ھ میں علی رضا بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق کو اپنا ولی عہد مقرر کر کے موتمن اپنے بھائی کو جو ہارون الرشید کی وصیت کے موافق مامون کا ولی عہد تھا، ولی عہدی سے معزول کر دیا۔ موتمن کو معزول کر دینے کا اختیار خود ہارون نے مامون کو دے دیا تھا۔ لہٰذا موتمن کی معزولی کا کوئی الزام مامون پر نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے بعد مامون نے سیاہ لباس جو عباسیوں کا شعار تھا، ترک کر کے سبز لباس جو علویوں کا شعار تھا، پہننا شروع کیا۔ تمام اہل دربار نے بھی یہی کیا۔

اس کے بعد مامون نے احکام جاری کیے کہ تمام سلطنت میں عمال و حکام اور لشکری بجائے سیاہ لباس کے سبز لباس استعمال کریں۔ عمال کے نام یہ حکم بھی بھیجا گیا کہ لوگوں سے علی رضا بن موسیٰ کاظم کی ولی عہدی کی بیعت لے لیں۔ یہ حکم جب فضل بن سہل کے توسط سے عمال سلطنت کے پاس پہنچا تو بعض نے خوشی سے اور بعض نے کراہت سے اس کی تعمیل کی۔ اسی حکم کو جب حسن بن سہل نے بغداد میں عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد اور منصور بن مہدی کے پاس بھیجا تو بغداد میں از سر نو ہلچل برپا ہو گئی اور لوگوں کو یقین ہو گیا کہ فضل بن سہل نے خلافت عباسیوں سے نکال کر علویوں کے اندر پہنچانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ آل عباس اور ہمدردان آل عباس اس بات کو کسی طرح برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عباسیوں میں سے خلافت کو نکالنے اور علویوں میں

پہنچانے کی کوشش سب سے پہلے ابومسلم نے کی۔ پھر یہی کوشش خاندان برامکہ نے کی جو مجوسی النسل تھے مگر وہ ناکام ونامراد رہے۔ اب ایک اور مجوسی النسل نے اس کوشش میں کامیابی حاصل کر لی۔ چونکہ اب اہل عرب اور اہل عجم کی تفریق بہت نمایاں ہو چکی تھی اور عام اہل عرب فضل بن سہل کو اپنا مخالف اور اہل عجم کا مربی یقین کرتے تھے، لہٰذا ہر ایک عربی النسل شخص نے علی رضا کی ولی عہدی کو اہل عجم کی کامیابی اور اپنی شکست تصور کیا۔

بغداد میں عربی عنصر زیادہ تھا اور آل عباس کا یہ خاص مقام تھا۔ یہاں اس خبر نے لوگوں کو اضطراب و بے چینی میں مبتلا کر کے غور وفکر اور مشوروں کی طرف متوجہ کر دیا۔ ایک طرف وہ ابھی تازہ تجربہ کر چکے تھے کہ بغاوت و سرکشی میں کیسے کیسے مصائب برداشت کرنے پڑے، دوسری طرف ان کے حزم و احتیاط نے عالم اسلام یعنی دوسرے اسلامی صوبوں اور ملکوں کی خبریں سننی ضروری سمجھیں کہ لوگوں پر علی رضا کی ولی عہدی کا کیا اثر ہوا ہے؟ بغداد میں یہ خبر ماہ رمضان سنہ ۲۰۱ھ میں پہنچی تھی اور پورے تین مہینے تک اہل بغداد نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ اس عرصہ میں اس خیال کے تحت کہ خاندان عباسیہ سے نکل کر علویوں میں خلافت نہیں جا سکتی، ایک طاقت پیدا ہوتی گئی۔

ابراہیم بن مہدی کی خلافت:

۲۵ ذوالحجہ سنہ ۲۰۱ھ کو آل عباس اور ہوا خواہان آل عباس نے ابراہیم بن مہدی کو خلافت کے لیے منتخب کر کے خفیہ طور پر اس کے ہاتھ پر بیعت کی اور یکم محرم سنہ ۲۰۲ھ کو علانیہ تمام اہل بغداد نے بیعت کر کے ابراہیم بن مہدی کو خلیفہ بنایا اور مامون کو خلافت سے معزول کر دیا۔ ابراہیم نے خلیفہ بنتے ہی چھ چھ مہینے کی تنخواہیں لشکریوں کو بطور انعام دینے کا وعدہ کیا اور کوفہ وسواد پر قبضہ کر کے مدائن کی طرف بڑھا اور لشکر کی آراستگی میں مصروف ہوا۔ بغداد کی جانب غربی پر عباس بنو موسیٰ کو اور جانب شرقی پر اسحاق بن موسیٰ کو مامور کیا۔

حمید بن عبدالحمید، حسن بن سہل کی طرف سے قصر ابن ہبیرہ میں مقیم تھا۔ وہ وہاں سے حسن بن سہل کے پاس گیا اور ابراہیم نے عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد کو قصر ابن ہبیرہ پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا۔ چنانچہ عیسیٰ بن محمد نے قصر ابن ہبیرہ پر قبضہ کر کے حمید کی لشکر گاہ کو لوٹ لیا۔ حسن بن سہل نے عباس بن موسیٰ کاظم برادر علی رضا کو سند گورنری عطا کر کے کوفہ کی جانب روانہ کیا۔ عباس بن موسیٰ

کاظم نے کوفہ میں پہنچ کر اعلان کیا کہ میرا بھائی علی رضا مامون کے بعد تخت خلافت کا مالک ہوگا۔ اس لیے اب تم لوگوں کو جو محبان اہل بیت ہو، ابراہیم بن مہدی کی خلافت تسلیم نہیں کرنی چاہیے اور خلافت مامون الرشید کے خلاف کوئی حرکت مناسب نہیں۔

اہل کوفہ نے عباس بن موسیٰ کاظم کی گورنری کو تسلیم کر لیا اور غالی شیعوں نے یہ کہہ کر کہ ہم تمہارے بھائی علی رضا کے معاون ہیں اور مامون سے ہم کو کوئی واسطہ نہیں، بے تعلقی اور خاموشی اختیار کی۔ ابراہیم بن مہدی نے عباس بن موسیٰ کاظم کے مقابلہ پر سعید اور ابوالبط اپنے دو سپہ سالاروں کو مامور کیا۔ عباس نے علی بن محمد بن جعفر اپنے چچا زاد بھائی کو ان کے مقابلہ پر بھیجا۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور علی بن محمد کو شکست ہوئی۔ سعید نے حیرہ میں قیام کیا اور فوج کو کوفہ کی طرف بڑھایا۔ اہل کوفہ اور عباس نے مقابلہ کیا، متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ آخر اہل کوفہ اور عباس نے امان طلب کی۔ عباس بن موسیٰ کاظم مکان سے باہر آئے اور فتح مند لشکر کوفہ میں داخل ہونے لگا۔ اسی اثناء میں عباس کے ہمراہیوں کو پھر کچھ جوش آیا اور لڑائی پر مستعد ہو گئے۔ سعید کے لشکر نے عباس کے ہمراہیوں کو پھر شکست دی اور کوفہ پر قبضہ کر کے عباس کو قید کر لیا۔

سعید یہ خبر سن کر خود حیرہ سے کوفہ میں آیا اور یہ تحقیق کر کے کہ عباس نے امان طلب کرنے کے بعد خود کوئی بدعہدی نہیں کی، عباس کو آزاد کر دیا اور کوفہ میں بعض لوگوں کو قتل کرایا اور کوفہ میں عامل مقرر کر کے بغداد کی طرف چلا آیا۔ حسن بن سہل نے حمید بن عبدالحمید کو کوفہ کی طرف روانہ کیا۔ عامل کوفہ بلا مقابلہ کوفہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ابراہیم بن مہدی نے عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد کو حسن بن سہل پر حملہ کرنے کے لیے واسط کی طرف روانہ کیا کیونکہ حسن بن سہل ان دنوں واسط میں مقیم تھا۔ عیسیٰ بن محمد کو حسن بن سہل نے شکست دے کر بغداد کی طرف بھگا دیا۔ غرض اسی قسم کے ہنگاموں میں سنہ ۲۰۲ھ ختم ہو گیا اور سنہ ۲۰۳ھ شروع ہوا۔

ابراہیم نے اپنی خلافت کو مستحکم و مضبوط بنانے کی امکانی کوشش میں کمی نہیں کی مگر سنہ ۲۰۳ھ کی ابتدائی تاریخوں میں بغداد کے اندر ایک ایسا ہنگامہ وقوع پذیر ہوا جس سے اس کی حکومت وخلافت معرض خطر میں پڑ گئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حمید بن عبدالحمید نے کوفہ پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد ابراہیم بن مہدی سے لڑنے کے لیے بغداد کا قصد کیا۔ ابراہیم بن مہدی کا سپہ سالار عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد تھا۔ حمید نے خفیہ پیغامات کے ذریعہ سے عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد کو اپنی طرف متوجہ

کر کے سازش کر لی۔ عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد نے حمید کی مدافعت و مقابلے میں پہلو تہی اختیار کی۔ اس سازش کا حال عیسیٰ کے بھائی ہارون بن محمد کو معلوم ہوا۔ اس نے ابراہیم بن مہدی کو اطلاع کر دی۔ ابراہیم بن مہدی خلیفہ نے عیسیٰ کو بلا کر دربار میں ذلیل کیا اور قید کر دیا۔ عیسیٰ کے قید ہونے کا حال معلوم ہوا تو لشکر میں بے چینی پیدا ہوئی اور عیسیٰ کے نائب عباس نے ابراہیم بن مہدی کے خلاف اہل لشکر کو اپنے ساتھ ملا کر ابراہیم بن مہدی کو معزول کر دینے کی تجویز کی۔ اہل بغداد میں سے بہت سے آدمی اس تجویز میں شریک ہو گئے اور ابراہیم کے اہل کاروں کو قید کر لیا۔ اس کے بعد عباس نے حمید کو لکھا کہ تم فوراً بغداد چلے آؤ، میں بغداد تمہارے حوالے کر دوں گا۔ چنانچہ حمید مع لشکر بغداد میں پہنچ کر شہر کے ایک حصہ پر قابض ہو گیا، دوسرے حصہ پر ابراہیم قابض تھا۔ شہر میں چند لڑائیاں ہوئیں، آخر مایوس ہو کر ابراہیم بن مہدی روپوش ہو گیا اور تمام شہر پر حمید بن عبدالحمید اور علی بن ہشام وغیرہ سرداران حسن بن سہل نے قبضہ کر لیا۔ اس طرح ۱۷ ماہ ذی الحجہ سنہ ۲۰۳ھ کو ابراہیم بن مہدی کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔

فضل بن سہل کا قتل:

اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ فضل بن سہل جو خبر چاہتا تھا، مامون کے گوش گزار کرتا تھا اور جس واقعہ کو چاہتا تھا، چھپا لیتا تھا۔ چنانچہ اس نے ابراہیم بن مہدی کے بغداد میں خلیفہ ہو جانے کی خبر کو بھی مامون الرشید سے پوشیدہ رکھا اور کسی کو مجال نہ ہوئی کہ مامون الرشید کو ملک عراق کی حالت سے واقف کر سکے۔ طاہر بن حسین کو فضل نے رقہ میں بطور والی متعین کر رکھا تھا۔ طاہر ایک نامور سپہ سالار تھا اور اس قابل تھا کہ اس سے عراق کی بدامنی رفع کرنے میں امداد لی جاتی مگر فضل بن سہل، طاہر کو ہرثمہ کا مثنیٰ سمجھتا تھا۔ اس لیے اس کو ایک معمولی ولایت کی حکومت پر مامور و متعین رکھ کر معطل بنا رکھا تھا۔

اس نے ابراہیم بن مہدی کی نسبت مامون سے یہ کہہ دیا تھا کہ اہل بغداد نے اپنی خوشی اسی میں ظاہر کی کہ ان کے دینی معاملات کی نگرانی وانصرام کے لیے ابراہیم بن مہدی کو بغداد کا امیر و عامل بنایا جائے۔ لہٰذا ابراہیم کو بغداد کی حکومت سپرد کر دی گئی۔ ادھر عراق میں بدامنی اور بے چینی دم بہ دم ترقی کرتی گئی اور لوگ حسن بن سہل سے زیادہ متنفر ہوتے گئے تو بعض اشخاص نے ہمت کر کے

اور اپنی جان پر کھیل کر مرو کا قصد کیا اور وہاں علی رضا بن موسیٰ کاظم ولی عہد خلافت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ سوائے آپ کے اور کوئی شخص حالات اصلیہ سے مامون کو واقف و آگاہ نہیں کرسکتا۔ آپ اس کام کا بیڑا اٹھائیں اور اس مرحلے کو طے کریں۔

علی رضا کو اگرچہ فضل بن سہل کو اپنا مخالف نہیں بلکہ ہمدرد و معاون ہونے کا گمان تھا لیکن یہ اس کی پاک باطنی اور نیک طینتی تھی کہ جرأت کر کے فوراً اس کام پر آمادگی ظاہر کی اور مامون الرشید کو فضل بن سہل اور حسن بن سہل کی نامناسب حرکات، قتل ہرثمہ، طاہر کی معطلی، عراق کے فساد اور ابراہیم بن مہدی کی خلافت کے متعلق مفصل اطلاع دے کر کہا کہ لوگ عام طور پر بددل ہو رہے ہیں اور آپ کی خلافت معرض خطر میں ہے۔ امام علی رضا نے ان حالات سے مطلع کرنے میں یہ بھی صفائی کے ساتھ کہہ دیا کہ آپ نے جو مجھ کو ولی عہد بنایا ہے، اس سے بھی بنو عباس اور ان کے ہوا خواہ ناراض ہیں۔

ان تمام باتوں کو سن کر مامون چونک پڑا اور اس نے کہا کہ آپ کے سوا کوئی اور بھی ان باتوں سے باخبر ہے؟ کہا کہ آپ کے فلاں فلاں سردار و مصاحب بھی واقف ہیں لیکن وہ سب فضل بن سہل کے خوف کی وجہ سے دم بہ خود ہیں اور آپ سے کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ مامون نے ان افسروں کو تنہائی میں اپنے پاس طلب کر کے اول دریافت کیا تو سب نے انکار کیا لیکن جب مامون نے ان کو یقین دلایا کہ فضل تم کو کچھ نہ کہہ سکے گا تو انہوں نے صاف صاف تمام باتیں بیان کر دیں اور علی رضا کے بیان کی پورے طور پر تصدیق کی۔ یہ سن کر مامون نے مرو سے عراق کی جانب روانگی کا قصد کیا۔ فضل کو جب یہ کیفیت معلوم ہوئی تو اس نے ان سرداروں کو جنہوں نے مامون کو حالات اصلیہ سے واقف کر کے علی رضا کے بیان کی تصدیق کی تھی، تکلیفیں پہنچائیں۔ کسی کو قید کر دیا، کسی کو بے عزت کر کے کوڑے لگوائے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ مامون نے یہ دانائی کی کہ فضل بن سہل کو اپنی طرف سے خائف و مایوس نہیں ہونے دیا اور فضل بن سہل کے چچازاد بھائی غسان بن عباد کو خراسان کا گورنر بنا کر خود خراسان سے عراق کی جانب روانہ ہوا۔ مقام سرخس میں وارد ہوا، یہاں فضل بن سہل کو حمام میں چار اشخاص نے حملہ کر کے قتل کر ڈالا اور خود فرار ہو گئے۔

مامون نے اعلان کرا دیا کہ جو شخص قاتلین فضل کو گرفتار کر کے لائے گا، اس کو دس ہزار دینار انعام دیا جائے گا۔ قاتلین گرفتار ہو کر حاضر ہوئے، مامون نے ان کے قتل کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ قتل

کیے گئے اوران کے سر حسن بن سہل کے پاس بھیج دیے گئے۔

مامون نے حسن بن سہل کوتعزیت کا خط لکھااور فضل بن سہل کی جگہ پراس کواپنا وزیر بنایا۔فضل بن سہل کی ماں کے پاس خودتعزیت کرنے گیااور کہا کہ جس طرح فضل آپ کا فرزند تھا،اسی طرح میں بھی آپ کا فرزند ہوں ۔ چندروز کے بعدحسن بن سہل کی بیٹی بوران سے شادی کر کے حسن کے مرتبے کو مامون نے اور بھی زیادہ بڑھا دیا تھا۔غرض فضل بن سہل کا قتل بالکل اسی طرح وقوع پذیر ہوا جس طرح جعفر برمکی کا قتل ظہور میں آیا تھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ فضل بن سہل کو مامون الرشید نے قتل کرایااوروہ چاروں شخص مامون الرشید کے مامور کردہ تھے، جنہوں نے فضل کوحمام میں قتل کیا۔فضل اپنے آپ کوکشتنی وگردن زدنی ثابت کر چکا تھا۔ مامون نے اس معاملہ میں اپنے باپ ہارون الرشید کے نقش قدم پر عمل کیا لیکن فرق صرف اس قدر ہے کہ ہارون الرشید نے جعفر برمکی کوقتل کرا کر برامکہ کے تمام خاندان کومعتوب بنایا اورقتل جعفر کا الزام اپنے اوپر لے لیا مگر مامون الرشید نے فضل کوقتل کرا کراس کے خاندان پراس قدرعنایتیں کیں کہ کسی کو جرأت نہ ہوسکی کہ مامون کو بدنام کر سکے اورملزم ٹھہرا سکے۔حتیٰ کہ فضل کا بھائی اور ماں باپ بھی مامون کی شکایت زبان پر نہ لا سکے۔فضل بن سہل مقام سرخس میں ۲ شعبان سنہ ۲۰۳ھ کوقتل ہوا۔

امام علی رضا بن موسیٰ کاظم کی وفات:

خلیفہ مامون الرشیداپنی بیٹی ام حبیب کا عقدعلی رضا سے پہلے کر چکا تھا۔اس سفر میں اس نے اپنی دوسری بیٹی ام فضل جو بہت ہی کم سن تھی، جوعقدعلی رضا کے بیٹے محمد بن علی سے کر دیا مگر رخصتی آئندہ زمانہ پر جبکہ لڑکی بالغ ہو جائے، ملتوی رکھی گئی۔ چنانچہ یہ رخصتی سنہ ۲۱۵ھ میں ہوئی۔

مامون الرشید ماہ رجب سنہ ۲۰۲ھ میں مرو سے روانہ ہوا اور ۱۵ صفر سنہ ۲۰۴ھ کو بغداد پہنچا۔ یہ سفر مامون نے قریباً ڈیڑھ برس میں طے کیا اورراستے میں ہرایک مقام پر ہفتوں اورمہینوں ٹھہرتا ہوا بغداد کی طرف آیا۔اس سفر میں ملک کے حالات سے اس کوخوب واقفیت حاصل ہوتی رہی اور بغداد میں اس کے پہنچنے سے پہلے ہی حالات اس کے موافق ہو گئے۔اسی سفر میں مامون الرشید نے بہ ماہ ذیقعدہ میں علی رضا کے بھائی ابراہیم بن موسیٰ کاظم کوامیرالحج مقرر کر کے بھیجا اورصوبہ یمن کی سند گورنری بھی ان کوعطا کر دی۔طوس میں پہنچ کر قیام کیااوراپنے باپ ہارون الرشید کی قبر پر دعا مانگی۔

طوس میں ایک مہینے سے زیادہ قیام رہا۔ یہیں ایسا اتفاق پیش آیا کہ ولی عہد خلافت امام علی رضا نے انگور کھانے کی وجہ سے انتقال کیا۔ مامون کو وفات کا سخت صدمہ ہوا۔ جنازہ کے ساتھ ننگے سر گیا اور رو رو کر کہنے لگا کہ ''اے ابوالحسن! تیرے بعد اب میں کہاں جاؤں اور کیا کروں۔'' تین دن تک قبر پر مجاور[1] رہا۔ ایک روٹی اور نمک اس کی غذا تھی۔ اپنے باپ ہارون الرشید کی قبر اس نے اکھڑوا کر اسی قبر میں علی رضا کو بھی اپنے باپ کے پاس دفن کیا۔ علی رضا کے ساتھ مامون الرشید کو بڑی محبت تھی۔ لوگوں کا یہ کہنا کہ مامون الرشید نے خود علی رضا کو انگوروں میں زہر دلوایا، سراسر غلط اور نادرست معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ علی رضا کی ولی عہدی کے لیے مامون الرشید کو مجبور نہیں کیا گیا تھا، اس نے اپنی خوشی سے ان کو ولی عہد بنایا۔ اپنی خوشی سے اپنی دو بیٹیوں کی شادی علی رضا اور علی رضا کے بیٹے محمد کے ساتھ کی۔ بلا کسی دوسرے کی تحریک کے علی رضا کے بھائی کو یمن کی گورنری دی اور امیر الحج مقرر کیا۔ جس شخص کو وہ زہر دے کر مروا ڈالنا چاہتا تھا، اس کے ساتھ یہ احسانات نہیں کر سکتا تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ جس شخص کو اس نے خود زہر دے کر مروا ڈالا تھا، اس کو اپنے باپ کی قبر میں دفن نہیں کر سکتا تھا۔ ہارون الرشید کی قبر میں اس کو دفن کرنا مامون کی سچی محبت کا ایک زبردست ثبوت ہے، جس میں کسی منافقت اور بناوٹ کو دخل نہیں ہو سکتا۔ اس کی وفات پر مامون کا اظہار ملال بھی اس بات کا ایک ثبوت ہے۔ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مامون الرشید نے آئندہ اپنی حکومت وخلافت میں علویوں کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کیا اور ان کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کرتا رہا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ مامون الرشید کو علویوں سے کوئی نفرت نہ تھی اور علویوں کو بہتر حالت میں لانا اور ان پر احسان کرنا چاہتا تھا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بنو عباس یا ان کے ہواخواہوں میں سے کسی نے امام علی رضا کو انگوروں میں زہر دیا ہو کیونکہ بنو عباس علی رضا کی ولی عہدی کے معاملے میں مامون الرشید سے ناراض تھے۔ امام علی رضا نے بہ عمر ۵۵ سال ماہ صفر سنہ ۲۰۳ھ میں وفات پائی۔ سنہ ۱۴۸ھ میں مدینہ منورہ میں پیدائش ہوئی تھی۔

---

[1] یہ مجاوری کا نظام جو اس وقت ہندو مذہب اور تہذیب کے زیر اثر برصغیر پاک و ہند میں خصوصاً مسلمانوں کے ہاں بھی رواج پا گیا ہے اور ''مزاروں'' پر مجاور موجود ہوتے ہیں، یہ دین کی تعلیمات کے سخت خلاف اور غیر شرعی ہے۔ اگر مامون نے تین دن بہ طور مجاور قبر پر وقت گزارا، تو یہ اس کا غلط کام ہے، جو ہمارے لیے حجت نہیں بن سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر قسم کے غیر اسلامی افکار سے محفوظ فرمائے، آمین!

طاہر بن حسین کی بازیابی:

طاہر بن حسین بن مصعب بن زریق بن ہامان کا حال اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ زریق، طلحہ بن عبیداللہ کا غلام تھا۔ یہ وہی طلحہ بن عبیداللہ خزاعی ہے جو طلحۃ الطلحات کے نام سے مشہور تھا۔ زریق کا بیٹا مصعب بن زریق بنوعباس کے نقیب سلیمان بن کثیر کا کاتب اور آخر میں ہرات کا امیر تھا۔

مصعب کا بیٹا طاہر بن حسین سنہ ۱۵۹ھ میں علاقہ مرو میں پیدا ہوا تھا۔ طاہر کو فضل بن سہل نے رقہ کی حکومت دے کر نصر بن شیث کے مقابلہ پر مامور کیا تھا۔ نصر بن شیث نے حلب اور اس کے شمالی علاقوں پر خودمختارانہ قبضہ کر رکھا تھا۔ طاہر کو قتل امین اور فتح بغداد کے بعد چونکہ کوئی صلہ حسب توقع نہ ملا اور فضل بن سہل نے اس کی کوئی ہمت افزائی نہ ہونے دی، اس لیے وہ رقہ میں مقیم رہ کر نہایت بے دلی کے ساتھ نصر بن شیث کے مقابلہ میں مصروف رہا مگر کوئی توجہ اور سرگرمی نہیں دکھائی۔ نصر بن شیث خود اعلان کر چکا تھا کہ میں صرف اس لیے مامون کی اطاعت نہیں کرنا چاہتا کہ اس نے عربوں پر عجمیوں کو ترجیح دی ہے۔ اس لیے بھی طاہر، نصر بن شیث کو زیادہ برا نہیں جانتا تھا۔ اب جبکہ مامون کو حالات سے واقفیت حاصل ہوئی اور وہ بغداد کی طرف روانہ ہوا تو اس نے طاہر بن حسین کو بھی لکھا کہ بغداد پہنچنے سے پہلے مقام نہروان میں تم ہم سے آ کر ملو۔

مامون طوس سے روانہ ہو کر جرجان پہنچا۔ یہاں بھی ایک مہینے سے زیادہ مقیم رہا۔ اسی طرح کوچ مقام کرتا ہوا نہروان پہنچا۔ یہاں طاہر بن حسین بھی رقہ میں اپنے بھتیجے اسحاق بن ابراہیم بن حسین کو اپنا قائم مقام بنا کر آیا اور مامون کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جوں جوں مامون بغداد سے قریب ہوتا گیا، ابراہیم بن مہدی کی حکومت و خلافت کو زوال آتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے بغداد میں داخل ہونے سے پہلے ہی ابراہیم بن مہدی کی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور وہ روپوش ہو کر بغداد میں چھپتا پھرتا تھا۔

نہروان سے روانہ ہو کر مامون بغداد میں ۱۵ صفر سنہ ۲۰۴ھ کو داخل ہوا۔ یہاں اس نے دربار منعقد کیا اور طاہر کی فتوحات اور جاں فشانیوں پر نظر کر کے اس سے کہا کہ تیری جو خواہش ہو اس کو ظاہر کر؟ طاہر نے کہا کہ آپ سبز لباس کو ترک کر کے وہی قدیمی سیاہ لباس پہننے کی اجازت دیں اور عباسیوں کا شعار خود بھی اختیار کریں۔ مامون نے سبز شعار کی جگہ سیاہ شعار کو اختیار کر لیا۔ اس

سے بغداد میں عام طور پر خوشی کا اظہار کیا گیا اور بنو عباس کی تمام شکایات دور ہو گئیں۔ یہ واقعہ ۲۳ صفر سنہ ۲۰۴ھ کو وقوع پذیر ہوا۔

عمال سلطنت کا تقرر اور قابل تذکرہ واقعات:

سنہ ۲۰۴ھ کے ماہ صفر میں مامون الرشید بغداد میں داخل ہو کر انتظام سلطنت کی طرف متوجہ ہوا۔ طاہر بن حسین کو صیغہ پولیس کی افسری اور بغداد کی کوتوالی جو اس زمانہ میں بہت بڑا عہدہ تھا، سپرد کی۔ ساتھ ہی جزیرہ و سواد کی حکومت و گورنری عطا کی۔ کوفہ کی گورنری اپنے بھائی ابو عیسیٰ کو اور بصرہ کی حکومت اپنے دوسرے بھائی صالح کو دی۔ حجاز کی گورنری عبداللہ بن حسین بن عباس بن علی بن ابی طالب کو عطا کی۔ موصل کی حکومت پر سید بن انس ازدی کو مامور کیا۔ عبداللہ بن طاہر بن حسین کو رقہ کی حکومت دی گئی۔ جزیرہ کی حکومت پر یحییٰ بن معاذ کو بھیجا گیا۔ آرمینیا و آذربائیجان کی حکومت عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد کو عطا ہوئی۔

اسی سال سری بن محمد بن حکم والی مصر کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا عبداللہ بن سری مقرر ہوا۔ اسی سال داؤد بن یزید گورنر سندھ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کی جگہ بشر بن داؤد کو حکومت سندھ عطا کی گئی اور بشر سے یہ شرط کی گئی کہ ہر سال ملک سندھ سے دس ہزار درہم بطور خراج بھیجا کرے۔ اسی سال حسن بن سہل کے دماغ میں خلل پیدا ہوا اور دیوانگی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس کو زنجیروں سے باندھنا پڑا۔ مامون الرشید نے اس کی جگہ احمد بن ابی خالد احول کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ خلیج فارس کے ساحل پر ایک گروہ قوم زط کے نام سے سکونت پذیر تھا، جن کی تعداد پندرہ بیس ہزار کے قریب قریب تھی۔ انہوں نے ڈاکہ زنی شروع کر کے بصرہ کے راستے کو مخدوش بنا دیا تھا۔ مامون الرشید نے جزیرہ کے عامل یحییٰ بن معاذ کو ان کی سرکوبی کا حکم دیا مگر ان لوگوں کا قرار واقعی علاج نہ ہوا۔

طاہر کا گورنر خراسان بننا:

سنہ ۲۰۵ھ میں مامون الرشید نے عیسیٰ بن یزید جلودی کو مہم زط پر مامور فرمایا۔ اسی سال یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک روز مامون کے پاس بے تکلف صحبت میں طاہر بن حسین حاضر ہوا۔ طاہر کی صورت دیکھ کر مامون کو اس وقت اپنا بھائی امین یاد آ گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، ساتھ ہی اس کو طاہر کی وہ تمام ظالمانہ کارروائیاں یاد آ گئیں جو اس نے امین کو گرفتار و ذلیل اور قتل کرنے میں روا

رکھی تھیں۔ طاہر نے خلیفہ مامون کو چشم پر آب دیکھ کر وجہ پوچھی۔ مامون نے کہا کہ کچھ ایسی ہی بات ہے جس کو ظاہر کرنے میں ذلت اور پوشیدہ رکھنے میں اذیت محسوس ہوتی ہے مگر دنیا میں ایسا کون شخص ہے جو اذیت ورنج سے محفوظ ہو، میں بھی اس اذیت کو برداشت کرتا ہوں۔

طاہر اس وقت تو کچھ نہ بولا مگر بعد میں اس نے مامون کے ندیم حسین سے جو اس صحبت میں موجود تھا، فرمائش کی کہ مامون سے اس بات کو کسی طرح معلوم کرے اور حسین کے پاس اس کے کاتب محمد بن ہارون کی معرفت ایک لاکھ درہم بھجوائے کہ یہ اس بات کے معلوم کرنے کا صلہ ہے۔ حسین نے موقع پا کر مامون سے دریافت کیا اور مامون نے راز افشا نہ کرنے کا وعدہ لے کر کہا کہ میں اس روز طاہر کو دیکھ کر اس لیے آبدیدہ ہو گیا تھا کہ یہی طاہر ہے جس نے میرے بھائی امین کو کس طرح ذلیل کر کے قتل کیا اور آج میری کس قدر تعظیم وتکریم بجالاتا ہے۔ حسین نے جب طاہر کو اس بات کی اطلاع دی تو وہ بہت پریشان ہوا اور اس کو اپنی موت نظر آنے لگی کہ کسی نہ کسی دن مامون مجھ کو ضرور نقصان پہنچائے گا۔ اس نے اس بات کو اپنے دل میں رکھ کر وزیراعظم احمد بن ابی خالد سے کہا کہ میں اب بغداد سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھ کو کسی صوبہ کی حکومت پر بھجوا دیجیے۔ میں آپ کے اس احسان کو فراموش کرنے والا نہیں ہوں۔

مامون جب خراسان سے بغداد کی طرف روانہ ہوا تو غسان بن عباد کو خراسان کا گورنر بنا آیا تھا۔ احمد بن ابی خالد، مامون کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھ کو آج غسان بن عباد اور خراسان کے تصورات نے رات بھر نہیں سونے دیا کیونکہ اتراک سرحد کی نسبت ایسی خبریں سننے میں آئی ہیں کہ وہ علمِ بغاوت بلند کرنے والے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو غسان بن عباد خراسان کو ہرگز نہیں بچا سکے گا۔ وہاں کسی زیادہ قابل اور تجربہ کار شخص کی ضرورت ہے۔ مامون نے کہا کہ ہاں یہ بات ضرور قابل تشویش ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ وہاں کس کو بھیجا جائے؟ احمد بن ابی خالد نے کہا کہ طاہر بن حسین سے بہتر اور کوئی شخص میری نگاہوں میں نہیں۔ مامون نے کہا کہ طاہر بن حسین کی طرف سے بھی بغاوت کا اندیشہ ہوسکتا ہے۔ احمد بن ابی خالد نے کہا کہ طاہر کی طرف سے میں ضامن بنتا ہوں، وہ ہرگز بغاوت نہ کرے گا۔

مامون نے اسی وقت طاہر کو بلا کر بغداد سے مشرق کی جانب کے تمام صوبوں کا نائب السلطنت بنا کر اور سندھ، بلخ و بخارا تک تمام خراسان کی حکومت دے کر مرو کی جانب رخصت کر دیا

اور طاہر کے بیٹے عبداللہ کو بغداد کی کوتوالی اور انتظام پولیس سپرد کیا۔ رخصت کرتے وقت طاہر کو دس لاکھ درہم عطا کیے اور ایک غلام بطور انعام اس کو دیا کہ یہ تمہارے حسن خدمات کا صلہ ہے۔ اس غلام کو مامون نے یہ سمجھا دیا تھا کہ اگر طاہر کو بغاوت پر آمادہ دیکھے تو فوراً کسی ترکیب سے اس کو زہر دے کر مار دے۔ طاہر آخر ذیقعدہ سنہ ۲۰۵ھ کو بغداد سے خراسان کی جانب روانہ ہوا۔

عبداللہ بن طاہر کی گورنری:

سنہ ۲۰۶ھ میں خبر پہنچی کہ یحییٰ بن معاذ عامل جزیرہ اور سری بن محمد بن حکم والی مصر فوت ہو گئے اور مرتے وقت یحییٰ نے اپنے بیٹے احمد کو جزیرہ کا اور سری نے اپنے بیٹے عبیداللہ کو مصر کا حاکم بنا دیا ہے۔ نصر بن شیث نے جزیرہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی ہے اور عبیداللہ نے مصر میں علمِ بغاوت بلند کر دیا ہے۔ مامون نے بغداد کے محکمہ پولیس کی افسری وکوتوالی پر بجائے عبداللہ بن طاہر کے اسحاق بن ابراہیم بن حسین بن مصعب کو مقرر کر کے عبداللہ بن طاہر کو جزیرہ کا حاکم مقرر کر کے روانہ کیا اور حکم دیا کہ رقہ و مصر کے درمیان کسی مقام پر قیام کر کے اول نصر بن شیث کا مقابلہ کرو اور ادھر سے اطمینان حاصل ہو تو مصر کی طرف فوج روانہ کرو۔

عبداللہ بن طاہر فوج لے کر روانہ ہوا اور رقہ و مصر کے درمیان مقیم ہو کر نصر بن شیث کو مجبور و محصور کرنے کے لیے فوجی دستے پھیلا دیے۔ طاہر بن حسین کو خراسان میں جب یہ خبر پہنچی کہ عبداللہ کو جزیرہ کا گورنر اور اس طرف کے تمام صوبوں کا نگران بنا کر خلیفہ نے روانہ کیا ہے تو اس نے عبداللہ کے نام ایک خط لکھ کر روانہ کیا۔ اس خط میں آداب ملک داری، اخلاق فاضلہ اور سیاست مدن کے وہ اصول بیان کیے گئے تھے کہ آج تک یہ خط علم اخلاق اور اصول ملک داری کے متعلق ایک بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

مامون الرشید نے اس خط کے مضامین عالیہ سے واقف ہو کر اس کی نقلیں کرائیں اور ایک ایک نقل تمام عمال سلطنت کے پاس بھجوائی۔ امام ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ میں اور ابن اثیر نے اپنی تاریخ کامل میں اس کو نقل کیا ہے۔ لوگوں نے اس خط کو علم اخلاق کے نصاب میں شامل کرنا ضروری سمجھا ہے۔ اسی سال فضل بن ربیع جو مامون کے خوف سے چھپا چھپا پھرتا تھا اور آخر میں ابراہیم بن مہدی کے پاس حاضر ہو کر اس کی مصاحبت میں داخل ہو گیا اور ابراہیم کے

روپوش ہونے پر روپوش ہو گیا تھا،عفو تقصیرات کا خواہاں ہوا اور مامون نے اس کی خطا کو معاف کر کے جاں بخشی کر دی۔

عبداللہ بن طاہر اور نصر بن شیث کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ کئی برس تک جاری رہا اور مصر کی طرف کوئی فوجی مہم روانہ نہیں ہو سکی۔ اسی سال یمن میں عبدالرحمٰن بن احمد نے علمِ بغاوت بلند کیا مگر یہ بغاوت اسی سال فرو ہو گئی یعنی مامون نے دینار بن عبداللہ کو یمن کی طرف روانہ کیا تو عبدالرحمٰن بن احمد نے دینار سے امن طلب کر کے یمن سے بغداد کی حاضری کا قصد کیا اور یمن کی حکومت دینار بن عبداللہ کے قبضہ میں آئی۔

طاہر بن حسین گورنر خراسان کی وفات:

طاہر بن حسین نے خراسان پہنچ کر اپنی حکومت، اقتدار کو قائم کرنے میں بہ آسانی کامیابی حاصل کر کے وہاں کے تمام فتنوں کو فرو کر دیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ خراسان کی گورنری وحکومت کے لیے بہت موزوں شخص تھا۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے، طاہر کو مامون الرشید کی طرف سے اطمینان حاصل نہ تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے مامون سے دور ہو کر اور ایک وسیع ملک پر قابض ومتصرف ہو کر اپنی حفاظت کے لیے ایسے سامان کیے کہ مامون کی گرفت میں نہ آ سکے۔ وہ فضل بن سہل کا انجام دیکھ چکا تھا۔ اس کو برامکہ کا انجام معلوم تھا۔ وہ ابومسلم خراسانی کا حال سن چکا تھا۔ وہ اپنی نسبت مامون کی اس رائے کو بھی جانتا تھا جو اس کو حسین ندیم کے ذریعہ سے معلوم ہوئی تھی۔ غرض سنہ۲۰۷ھ کے ماہ جمادی الثانی میں طاہر نے جامع مسجد مرو میں جمعہ کے روز خطبہ دیا اور اس خطبہ میں خلیفہ مامون الرشید کا نام نہیں لیا نہ اس کے لیے دعا کی، صرف اصلاح امت کی دعا کر کے منبر سے اتر آیا۔

کلثوم بن ثابت خراسان کا پرچہ نویس موجود تھا۔ اس نے فوراً اس واقعہ کی اطلاع لکھ کر مامون کے پاس بغداد روانہ کی۔ مامون نے جب اس عرضداشت کو پڑھا تو احمد بن ابی خالد وزیراعظم کو طلب کر کے اطلاع دی اور حکم دیا کہ فوراً فوج لے کر خراسان کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ چونکہ تم ہی طاہر کے ضامن بنے تھے، لہٰذا اب تم ہی جا کر خراسان کو اس کے فتنے سے بچاؤ اور طاہر کو گرفتار کر کے لاؤ۔ احمد بن ابی خالد نے سفر خراسان کے لیے تیاری شروع کر دی۔ اگلے دن بغداد میں مامون

الرشید کے پاس دوسرا پرچہ پہنچا کہ طاہر نے ہفتہ کے روز انتقال کیا۔

طاہر کا انتقال دفعتہً ہوا، جمعہ کے دن ہی اس کو بخار چڑھا اور شنبہ کے روز جب دیر تک خواب گاہ سے برآمد نہ ہوا تو لوگ اندر گئے اور دیکھا کہ طاہر چادر اوڑھے ہوئے مردہ پڑا ہے۔ غالباً اسی غلام نے جو مامون الرشید نے رخصت کرتے وقت طاہر کو عطا کیا تھا، طاہر کی نیت بدلی ہوئی دیکھ کر اس کو زہر دے دیا۔

مامون الرشید نے طاہر کے مرنے کی خبر سن کر کہا کہ الحمد لله الذی قدمه و اخرن یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے طاہر کو مجھ سے پہلے ہی وفات دی۔ اس کے بعد مامون نے طاہر کے بیٹے طلحہ بن طاہر کو خراسان کی سند حکومت عطا کی اور احمد بن ابی خالد کو خراسان اس لیے روانہ کیا کہ وہ جا کر طلحہ بن طاہر کو اچھی طرح خراسان پر قابض ومتصرف کرے اور کسی بغاوت وسرکشی کے امکان کو باقی نہ رہنے دے۔ مامون کی یہ خصلت خاص طور پر قابل تذکرہ ہے کہ وہ ہر ایک باغی یا سرکش کو اس کی بداعمالی کی سزا دیتا اور قتل کرا دینے میں دریغ نہ کرتا تھا مگر اس مجرم کے خاندان اور متعلقین کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ اور زیادہ احسان کر کے اپنا لیتا تھا۔ احمد بن ابی خالد نے خراسان جا کر اور ماوراء النہر کے علاقہ میں پہنچ کر وہاں کے سرکش لوگوں کو قرار واقعی سزائیں دیں اور جب یہ خبر سنی کہ طاہر کے بھائی حسن بن حسین بن مصعب نے کرمان میں علمِ بغاوت بلند کیا ہے تو کرمان پہنچ کر اس کو گرفتار کیا اور مامون کی خدمت میں لا کر اس کو پیش کیا۔ مامون نے حسین بن حسین کی خطا معاف کر دی۔ احمد بن ابی خالد جب خراسان سے دارالخلافہ بغداد کی طرف واپس آنے لگا تو طلحہ بن طاہر نے تیس لاکھ درہم نقد اور ایک لاکھ کا اسباب بہ طور نذر احمد بن ابی خالد کی خدمت میں پیش کیا اور اس کے کاتب کو پانچ لاکھ درم دیے۔

اسی سال مامون نے عیسیٰ بن یزید جلودی کو معزول کر کے داؤد بن منجور کو مہم زط پر مامور کیا اور مضافات بصرہ و دجلہ اور یمامہ وبحرین اس کو حکومت میں دیے۔ اسی سال محمد بن حفظ کو طبرستان وغیرہ کی حکومت سپرد کی۔ اسی سال بنوشیبان نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ مامون الرشید نے سید بن انس کو ان کی سرکوبی پر مامور کیا۔ مقام وسکرہ میں بنوشیبان سے لڑائی ہوئی اور وہ اچھی طرح سے پامال وخستہ حال کر دیے گئے۔

اسی سال مامون الرشید نے محمد بن جعفر عامری کو نصر بن شیث کے پاس جس کو عبداللہ بن طاہر

متواتر لڑائیوں کے بعد دباتا اور ہٹاتا جاتا تھا، بہ طور سفیر روانہ کیا اور اطاعت قبول کر لینے کی ترغیب دی۔ نصر بن شیث نے کہا کہ میں مامون الرشید سے صلح کر لینے پر آمادہ ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ میں مامون کے دربار میں حاضر نہ ہوں گا۔ مامون کے پاس واپس آ کر محمد بن جعفر نے یہ شرط نصر کی طرف سے سنائی تو اس نے قسم کھائی کہ میں جب تک نصر کو اپنے دربار میں حاضری کے لیے مجبور نہ کرلوں گا، چین سے نہ بیٹھوں گا۔ نصر نے اپنے ہمراہیوں سے جو سب کے سب عرب تھے، کہا کہ مامون الرشید جو قوم زط کے مینڈکوں کو ابھی تک مغلوب نہ کر سکا، بھلا ہم عربوں پر کہاں غلبہ پا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ پہلے سے زیادہ مستعدی کے ساتھ لڑائی اور زور آزمائی پر مستعد ہو گیا۔

بغاوت افریقہ:

افریقہ یعنی وہ صوبہ جس میں تونس و قیروان بڑے بڑے مرکزی مقام تھے اور جو مصر و مراکش کے درمیان واقع تھا، ہارون الرشید کے زمانے میں ابراہیم بن اغلب کو سنہ ۱۸۴ھ میں چالیس ہزار دینار سالانہ خراج پر بطور ٹھیکہ کے دے دیا گیا تھا۔ ابراہیم نے نہایت عمدگی سے افریقہ پر حکومت کی۔ اس وقت مامون الرشید کے زمانہ میں افریقہ کا حکمران ابراہیم کا بیٹا زیادۃ اللہ بن ابراہیم بن اغلب تھا۔ سنہ ۲۰۸ھ میں تونس کے اندر بغاوت نمودار ہوئی۔ اس بغاوت کا بانی منصور بن نصیر تھا۔ منصور بن نصیر نے افریقہ کے اکثر حصہ پر قبضہ کر لیا۔ دارالحکومت قیروان میں زیادۃ اللہ کو محصور کر لیا۔ زیادۃ اللہ نے منصور کو شکست دے کر بھگا دیا مگر منصور بن نصیر پھر لشکر فراہم کر کے مقابلہ پر آیا اور دونوں کی زور آزمائیوں کا سلسلہ سنہ ۲۰۸ھ سے شروع ہو کر سنہ ۲۱۱ھ تک جاری رہا۔ آخر سنہ ۲۱۱ھ میں منصور بن نصیر اپنے ایک ہمراہی کے ہاتھ سے مارا گیا اور زیادۃ اللہ نے اطمینان سے افریقہ پر حکومت شروع کی۔

نصر بن شیث کی بغاوت کا خاتمہ:

نصر بن شیث کا حال اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ یہ امین بن ہارون سے دوستی و محبت رکھتا تھا۔ قتل امین کی خبر سنی اور عربی عنصر کو مغلوب اور عجمیوں کو خلافت اسلامیہ پر حاوی دیکھ کر بغاوت و سرکشی پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس کو علویوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی مگر عجمیوں کی مخالفت و نفرت نے اس کو مامون کے مقابلہ پر آمادہ کر دیا تھا۔ عبداللہ بن طاہر سے پہلے طاہر بن حسین اس کے مقابلے پر بے دلی کے

ساتھ کام کرتا رہا۔ لہٰذا نصر بن شیث عقیلی کا تا دیر مقابلوں میں ثابت قدم و محفوظ رہنا اس کی شہرت وحوصلہ کی ترقی کا سبب بن گیا۔ صوبہ جزیرہ کے قریباً تمام اضلاع پر اس نے قبضہ کر لیا تھا اور حلب کے شمال مقام کیسوم میں مقیم تھا۔ آخر سنہ ۲۰۹ھ میں عبداللہ بن طاہر نے ہر طرف سے اس کو گھیر کر کیسوم میں محصور کر لیا اور نصر نے شدت محاصرہ اور اپنی سخت مجبوری کے عالم میں بلاشرط ہتھیار رکھ کر اپنے آپ کو عبداللہ بن طاہر کے سپرد کر دیا۔ عبداللہ نے اس کو مامون کے پاس بغداد کی طرف روانہ کیا۔ مامون کے دربار میں حاضر ہوا اور مامون نے صفر سنہ ۲۱۰ھ میں اس کو مدینۃ المنصور میں نظر بند کر دیا۔

ابن عائشہ کا قتل اور ابراہیم کی گرفتاری:

ابراہیم بن محمد بن عبدالوہاب بن ابراہیم امام بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب معروف بہ ابن عائشہ نے ابراہیم بن مہدی کی بیعت کی تھی۔ ابراہیم بن مہدی کے روپوش ہو جانے کے بعد ابراہیم ابن عائشہ بھی روپوش ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ابراہیم بن اغلب اور مالک بن شاہین بھی تھے۔ جس زمانے میں نصر بن شیث کو عبداللہ بن طاہر نے گرفتار کر کے بغداد کی طرف روانہ کیا تو جاسوسوں نے مامون کو یہ خبر پہنچائی کہ جس روز نصر بن شیث بغداد میں داخل ہوگا، اسی روز بغداد میں ابن عائشہ اور ابراہیم اور مالک بن شاہین خروج کر کے علمِ بغاوت بلند کریں گے اور فتنہ عظیم برپا ہو گا۔ اس سے پہلے بھی مامون کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ابراہیم بن مہدی، ابراہیم بن عائشہ، ابراہیم بن اغلب اور مالک بن شاہین بغداد میں روپوش ہیں اور لوگوں کو اپنی سازش میں شریک کر رہے ہیں۔

اس خبر کو سننے کے بعد بغداد کی پولیس کو حکم دیا گیا کہ بغاوت کے ان سرغنوں کو جس طرح ممکن ہو، گرفتار اور اسیر کرو۔ چنانچہ پولیس کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور یہ تینوں شخص یعنی ابراہیم بن مہدی کے سوا باقی تینوں شخص گرفتار ہو گئے۔ ان کو قید خانہ میں بھیج دیا گیا۔ انہوں نے قید خانہ کا دروازہ بند ہونے پر دیوار میں نقب لگانا شروع کیا اور وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ حال معلوم ہونے پر مامون خود قید خانہ میں پہنچا۔ باقی دونوں کو قتل کرا کر ابن عائشہ کو صلیب پر لٹکا دیا۔ اسی حالت میں اس کی جان نکل گئی۔ یہ پہلا عباسی تھا جو خلافت عباسیہ میں قتل کیا گیا۔ قتل کا یہ واقعہ ماہ صفر سنہ ۲۱۰ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ چند روز کے بعد ابراہیم بن مہدی عورتوں کا لباس پہنے

ہوئے راستے پر جاتا ہوا گرفتار ہوا اور اسی طرح زنانہ لباس میں حاضر دربار کیا گیا۔

مامون نے حاضرین دربار سے اس کی نسبت مشورہ طلب کیا۔ سب نے قتل کا مشورہ دیا مگر مامون کے وزیر اعظم احمد بن ابی خالد نے کہا کہ آپ اس کو معاف کر دیں اور اس کے جرم بغاوت سے درگزر فرمائیں۔ مامون نے ابراہیم بن مہدی کو معاف کر دیا اور سجدہ شکر بجا لایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عفو و درگزر کی توفیق عطا فرمائی۔ ابراہیم بن مہدی نے مامون کی تعریف میں اشعار سنائے اور مامون نے اس کے ساتھ عزت اور محبت کا برتاؤ کیا۔ ابراہیم کی گرفتاری ماہ ربیع الاول سنہ ۲۱۰ھ میں ہوئی تھی۔

مصر اور اسکندریہ کی بغاوت:

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ مصر کے حاکم سری بن محمد بن حکم نے فوت ہوتے وقت اپنے بیٹے عبیداللہ کو اپنا جانشین بنا دیا تھا۔ عبیداللہ نے حکومت ہاتھ میں لیتے ہی علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ نصر بن شیث کی لڑائیوں کے سبب سے عبداللہ بن طاہر مصر کی طرف متوجہ نہ ہو سکا اور مامون بھی اپنی سلطنت کے دوسرے حصوں کی طرف سے مطمئن نہ ہونے کے سبب سے کوئی نئی مہم مصر کی طرف روانہ نہ کر سکا۔ اس عرصہ میں مصر کے صوبہ کا ایک بڑا حصہ عبیداللہ کے قبضے سے بھی نکل گیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ امام مالک بن انس کے ساتھیوں نے جو قرطبہ دارالخلافہ اندلس میں رہتے تھے، اموی خلیفہ الحکم بن ہشام کے خلاف ایک بغاوت کی سازش کی۔ حکیم بن ہشام نے عین وقت پر مطلع ہو کر شہر قرطبہ کے مغربی حصہ کو جہاں سے یہ بغاوت شروع ہونے والی تھی، برباد اور نیست و نابود کر دیا۔ مالکیوں کو گرفتار کر کے سخت سزائیں دیں اور پھر ان سب کو اندلس یعنی اپنی حدود سلطنت سے خارج کر دیا۔ ان جلا وطن ہونے والوں کے ایک حصہ نے تو مراکش میں سکونت اختیار کی اور ایک حصہ بہ راہ دریا مصر کی طرف متوجہ ہو کر اسکندریہ میں داخل ہوا۔ اسکندریہ میں عبیداللہ بن سری کی طرف سے ایک عامل رہتا تھا۔ ان نو وارد مالکیوں نے موقع پا کر یہاں بھی بغاوت کی تیاری کی اور عامل اسکندریہ کو حملہ کر کے نکال دیا اور خود اسکندریہ اور اس کے اردگرد کے علاقہ پر قابض و متصرف ہو کر ابو حفص عمر بلوطی کو اپنا امیر بنا لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عبداللہ بن طاہر جنگ نصر بن شیث میں مصروف تھا۔

عبیداللہ بن سری اس علاقہ کو ان نو وارد مالکیوں سے واپس نہیں لے سکا۔ عبداللہ بن طاہر، نصر

سے فارغ ہوتے ہی مصر کی طرف متوجہ ہوا۔ عبیداللہ بن سری نے مقابلہ کیا مگر عبداللہ بن طاہر نے شکست دے کر اس کو محصور کر لیا۔ شدت محاصرہ سے تنگ آ کر عبیداللہ نے امان طلب کی اور اپنے آپ کو عبداللہ کے حوالے کر دیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر عبداللہ نے اسکندریہ کا رخ کیا۔ ابوحفص عمر بلوطی نے اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ دیکھ کر امان طلب کی۔ عبداللہ بن طاہر نے اس شرط پر اس درخواست کو منظور کیا کہ اسکندریہ اور ملک مصر کو خالی کر کے بحر روم کے کسی جزیرہ میں چلے جاؤ۔

چنانچہ عمر نے مع اپنے ہمراہیوں کے جہازوں میں سوار ہو کر جزیرہ اقریطش (کریٹ) کا رخ کیا اور وہاں جا کر اس جزیرہ پر قابض و متصرف ہو گیا۔ وہیں ان لوگوں نے مکانات بنائے اور مستقل سکونت اختیار کر کے حکومت قائم کی۔ یہ واقعہ سنہ ۲۱۰ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ سنہ ۲۱۰ھ سے قریباً ایک سو ساٹھ برس تک ابوحفص عمر بلوطی کے خاندان میں جزیرہ کریٹ کی حکومت قائم رہی۔ آخر خاندان ابوحفص کے آخری فرماں روا عبدالعزیز سے آرمیٹاس پسر قسطنطین نے اس جزیرہ کو فتح کر کے حکومت یونان سے ملحق کر لیا۔

زریق و بابک خرمی:

زریق جس کا اصل نام علی بن صدقہ تھا، ایک عربی النسل شخص تھا۔ جس کو خلیفہ مامون الرشید نے سنہ ۲۰۹ھ میں آرمینیا و آذربائیجان کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ اس نے سنہ ۲۱۱ھ میں چالیس ہزار کے قریب فوج جمع کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور مامون الرشید سے باغی ہو گیا۔ مامون الرشید نے ابراہیم بن لیث بن فضل کو آذربائیجان کی حکومت پر بھیجا۔ صوبہ فارس کے شمال اور آذربائیجان کی سرحد کے قریب ہارون الرشید کے زمانے سے ایک جدید مذہب کی بنیاد مستحکم ہو رہی تھی یعنی جاوید ان نامی مجوسی نے ایک نیا مذہب جاری کیا تھا۔ اس مذہب میں قتال و خوں ریزی اور زنا کوئی جرم نہ تھا۔ یہ مذہب مزدکی مذہب سے بہت مشابہ تھا۔ جب جاویدان فوت ہوا تو اس کے ایک مرید بابک خرمی نے جاویدان کی بیوی پر خود قبضہ کر کے اپنے پیر کے تمام مریدوں کی سرداری حاصل کی۔ بابک خرمی کے زمانے میں ان لوگوں نے جلد جلد قوت حاصل کی اور ان کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی۔ ان کی ڈاکہ زنی اور لوٹ کھسوٹ سے اس طرف کے صوبوں کا امن و امان جاتا رہا۔

سنہ ۲۰۱ھ میں انہوں نے شاہی فوجوں کا مقابلہ شروع کر دیا۔ صوبہ آذربائیجان کے گورنروں کو

کئی مرتبہ بابک خرمی کے مقابلے میں ہزیمت حاصل ہوئی اور اس کا رعب واقتدار خوب ترقی کر گیا۔ سنہ ۲۰۹ھ میں بابک نے آذربائیجان کے عامل کو زندہ گرفتار کر لیا تھا۔ اس کے بعد زریق کو سند گورنری دے کر بھیجا گیا تھا۔

سنہ ۲۱۰ھ میں زریق نے بغاوت اختیار کی تو بجائے ایک کے دو زبردست دشمن اس طرف پیدا ہو گئے۔ مامون الرشید نے سید بن انس حاکم موصل کو زریق کے مقابلہ کا حکم دیا۔ سید بن انس نے ایک زبردست فوج لے کر زریق پر حملہ کیا مگر لڑائی میں مارا گیا اور فوج شکست کھا کر بھاگ آئی۔ مامون کو اس خبر کے سننے سے سخت صدمہ ہوا اور سنہ ۲۱۱ھ کے آخری ایام میں محمد بن حمید طوسی کو موصل کی سند گورنری دے کر زریق و بابک دونوں کی سرکوبی کا حکم دیا۔ محمد بن حمید طوسی بغداد سے فوج لے کر روانہ ہوا تو موصل پر زریق قابض و متصرف ہو چکا تھا۔ چنانچہ موصل کے قریب دونوں کی لڑائی ہوئی۔ زریق شکست کھا کر بھاگا اور محمد بن حمید موصل میں داخل ہوا۔ موصل کے عرب باشندوں کو فوج میں بھرتی کیا اور سامان لشکر کو درست کر کے زریق کی طرف بڑھا۔ نہرزاب پر زریق کے ساتھ صف آرائی اور زور آزمائی کی دوبارہ نوبت آئی۔ اس لڑائی میں بھی زریق نے شکست کھائی اور قیدوگرفتاری کی ذلت اٹھائی۔ محمد بن حمید نے آگے بڑھ کر زریق کے تمام عاملوں اور اہل کاروں کو بے دخل کر کے تمام صوبہ آذربائیجان پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد محمد بن حمید، بابک خرمی کی طرف متوجہ ہوا۔ متعدد لڑائیاں ہوئیں، محمد بن حمید خرمیوں کو شکست دیتا اور پیچھے ہٹاتا ہوا دامن کوہ تک چلا گیا۔ خرمی لوگ پہاڑ پر چڑھ گئے۔ محمد بن حمید بھی ان کے تعاقب میں پہاڑ پر چڑھا۔ وہاں خرمیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا تو محمد بن حمید کی فوج کو شکست ہوئی، کمین گاہوں سے نکل نکل کر خرمیوں نے قتل عام شروع کر دیا۔ اسی معرکہ میں محمد بن حمید مارا گیا اور بابک خرمی کے حوصلے پہلے سے زیادہ بلند ہو گئے۔ یہ واقعہ سنہ ۲۱۲ھ میں وقوع پذیر ہوا۔

اسی سال موسیٰ بن حفص حاکم طبرستان فوت ہوا۔ اس کی جگہ مامون الرشید نے اس کے بیٹے کو حاکم طبرستان مقرر کیا۔ اسی سال خلیفہ مامون نے حاجب بن صالح کو سندھ کی حکومت پر مامور کر کے روانہ کیا۔ سندھ کے پہلے حاکم بشر بن داؤد نے سندھ کی حکومت سپرد کرنے سے انکار کیا۔ دونوں میں معرکہ آرائی کی نوبت پہنچی، آخر بشر بن داؤد شکست کھا کر کرمان کی طرف بھاگ گیا۔

اسی سال یعنی سنہ ۲۱۲ھ میں مامون الرشید نے عبداللہ بن طاہر کو مصر سے واپس بلا کر حکم دیا کہ

بابک خرمی کے فتنہ کو فرو کرو۔ عبداللہ بن طاہر مقام دینور میں اپنے لشکر کو ترتیب دے کر بابک خرمی کی طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ خبر پہنچی کہ نیشاپور میں خوارج نے خروج کیا ہے کیونکہ طلحہ بن طاہر گورنر خراسان فوت ہو گیا ہے۔ مامون الرشید نے فوراً عبداللہ بن طاہر برادر طلحہ کے پاس خراسان کی سند گورنری بھیج کر حکم دیا کہ تم خراسان پہنچ کر فتنہ خوارج کو فرو کرو۔ عبداللہ بن طاہر مقام دینور سے نیشاپور کی طرف متوجہ ہوا اور بابک خرمی، عبداللہ بن طاہر کے حملے سے بچ گیا۔ اس کے بعد بابک خرمی پر خلیفہ کی طرف سے کوئی سپہ سالار حملہ آور نہ ہوا اور مامون الرشید کی وفات کے بعد اس فتنہ کا استیصال ہوا۔ عبداللہ بن طاہر نے خراسان پہنچ کر وہاں کی بغاوت فرو کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

متفرق حالات:

مامون الرشید کے وزیراعظم احمد بن ابی خالد نے، جو نہایت عقلمند، نیک طینت اور پاک طبیعت شخص تھا، اسی سال وفات پائی اور اس کی جگہ مامون الرشید نے احمد بن یوسف کو خلعت وزارت عطا کیا۔ احمد بن ابی خالد بنی عامر کا ایک شامی غلام تھا جو اعلیٰ درجہ کا ادیب اور منشی تھا۔

احمد بن یوسف ایک معمولی دفتر میں کاتب تھا۔ مامون چونکہ اس کی قابلیت سے واقف تھا، لہٰذا اس کو یک لخت وزارت عظمیٰ کا عہدہ عطا کر دیا۔ سنہ۲۱۲ھ میں احمد بن محمد عمری معروف بہ احمر العین نے یمن میں علمِ بغاوت بلند کیا۔ خلیفہ مامون الرشید نے محمد بن عبدالحمید معروف بہ ابوالرازی کو یمن پر مامور کیا۔ سنہ۲۱۳ھ میں مامون الرشید نے اپنے بیٹے عباس کو جزیرہ، ثغور وعواصم پر اور اپنے بھائی ابواسحاق معتصم کو شام ومصر پر مقرر کیا۔ ابواسحاق معتصم نے اپنی جانب سے ابن عمیرہ باذ عیسیٰ کو مصر کا والی مقرر کر کے روانہ کیا۔ قیسیہ اور یمانیہ کے ایک گروہ نے ہنگامہ کر کے سنہ۲۱۴ھ میں ابن عمیرہ کو مار ڈالنا چاہا اور عَلمِ بغاوت بلند کیا تو معتصم خود مصر میں گیا اور بہ زور تیغ باغیوں کو زیر کر کے مصر میں قیام کیا اور اپنی طرف سے عمال مقرر کیے۔ اس طرح مصر میں امن وامان قائم ہو گیا۔

سنہ۲۱۳ھ میں مامون الرشید نے غسان بن عباس کو سندھ کی گورنری پر مامور کیا۔ اسی سال ابوالرازی والی یمن باغیوں کے ہاتھ سے یمن میں مقتول ہوا۔ مجبور ہو کر مامون الرشید نے محمد بن ابراہیم ریاوی کو جو زیاد بن ابی سفیان کی اولاد میں سے تھا، یمن کی ولایت سپرد کی۔ اس نے وہاں پہنچ کر شہر زبید کی بنیاد ڈالی اور اسی شہر کو اپنا مستقر قرار دے کر یمن پر حکومت شروع کی۔ خلیفہ کو وہ

تحائف وہدایا بھیجتا رہتا تھا اور خطبہ میں اس کا نام لیتا تھا۔ سنہ ۲۴۵ھ یعنی اپنی وفات تک یمن میں آزادی سے حکومت کرتا رہا۔ اس کے بعد یمن کی حکومت اس کی اولاد اور غلاموں میں سنہ ۴۳۲ھ تک قائم رہی۔

سنہ ۲۱۴ھ میں خلیفہ مامون نے علی بن ہشام کو جبل، قم، اصفہان اور آذربائیجان کی حکومت عطا کی۔ سنہ ۲۱۴ھ میں ابوبلال صابی شاری نے خروج کیا۔ مامون الرشید نے اپنے بیٹے عباس کو مع سپہ سالاروں کے اس کی سرکوبی پر مامور کیا۔ ابوبلال لڑائی میں مارا گیا اور یہ فتنہ فرو ہوا۔ سنہ ۲۱۵ھ میں قیصر میخائیل فوت ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا نوفل تخت نشین ہوا۔ رومیوں کی طرف سے علامات سرکشی و دشمنی نمایاں ہونے پر مامون الرشید نے اسحاق بن ابراہیم بن مصعب کو سواد، حلوان اور دجلہ کی گورنری عطا کر کے بغداد میں اپنا نائب بنا کر چھوڑا اور خود فوج لے کر رومیوں پر حملہ آور ہوا۔ موصل، انطاکیہ، مصیصہ اور طرسوس ہوتا ہوا بلاد روم میں داخل ہوا۔ قلعہ قرہ کو فتح کر کے شہر پناہ کو منہدم کر دیا، پھر اشناس کو قلعہ سندس کی جانب اور عجیف وجعفر کو قلعہ سنان کی طرف فوجی دستوں کے ساتھ روانہ کیا۔ چنانچہ یہ دونوں قلعے فتح ہو گئے۔ عباس بن مامون الرشید نے شہر ملطیہ پر قبضہ کیا۔

معتصم جو مصر میں مقیم تھا، مصر سے واپس ہو کر مامون کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رومیوں نے اظہار عجز کر کے معافی طلب کی اور خلیفہ مامون مراجعت کر کے دمشق کی جانب روانہ ہوا۔ ابھی خلیفہ راستے ہی میں تھا کہ رومیوں نے اپنی طاقت کو مجتمع کر کے یکا یک طرسوس و مصیصہ پر حملہ کر دیا۔ دونوں شہروں کے باشندے اس خیال سے کہ رومیوں نے مصالحت کر لی ہے، بے خبر تھے۔ لہٰذا نہایت بے رحمی سے قتل و غارت کیے گئے۔ مامون یہ سنتے ہی فوراً لوٹ پڑا اور بلاد روم میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ لشکر اسلام نے قلعوں پر قلعے اور شہروں پر شہر فتح کرنے شروع کیے۔ ایک طرف خلیفہ مامون فتح کرتا ہوا بڑھ رہا تھا، دوسری طرف معتصم حملہ آور تھا، جس نے تیس قلعے فتح کر لیے تھے۔ تیسری طرف یحییٰ بن اکثم شہروں کو فتح کرنے اور رومیوں کو گرفتار کرنے میں مصروف تھا۔ آخر قیصر روم نے اپنی گستاخی کی معافی مانگی اور خلیفہ مامون نے واپسی کا حکم دے کر دمشق کی طرف مراجعت کی اور یہاں سے مصر کی طرف متوجہ ہوا۔ مصر میں باغیوں کو خوب سزائیں دے کر وہاں کے حالات کو درست کیا۔ مصر سے پھر شام کی طرف واپس آیا۔ اس حملہ آوری و مراجعت میں پورا ایک سال صرف ہو گیا۔

سنہ ۲۱۷ھ میں رومیوں نے پھر سابقہ حرکات کا اظہار کیا اور مامون الرشید نے پھر اس طرف فوج کشی کی۔ اس مرتبہ بھی رومیوں سے بہت سی لڑائیاں ہوئیں اور نوفل قیصر روم نے پھر عاجزانہ طور پر درخواست صلح پیش کی۔ مامون نے اس مرتبہ بھی اس کی درخواست منظور کر لی اور بلاد روم سے واپس ہوا۔ سنہ ۲۱۸ھ میں مامون الرشید کو پھر رومیوں کی گوشمالی کے لیے جانا پڑا۔ وہاں سے واپسی میں اپنے بیٹے عباس کو بطور یادگار فتح شہر طوانہ کی تعمیر کا حکم دیا۔ اس نے ایک میل مربع کا قلعہ بنایا اور چار کوس کے محیط کی شہر پناہ تعمیر کرا کر مختلف شہروں کے لوگوں کو وہاں آباد کیا۔

مامون الرشید کی وفات:

سفر روم سے واپسی میں نہر بذندون کے کنارے ایک روز قیام ہوا۔ ۱۳ جمادی الثانی سنہ ۲۱۸ھ کو یہیں بخار میں مبتلا ہوا اور یہیں ۱۸ رجب سنہ ۲۱۸ھ بروز پنج شنبہ فوت ہوا۔ مرنے سے پہلے امراء و اراکین اور علماء کو اپنے روبرو بلا کر وصیت کی اور اپنے کفن دفن کے متعلق ہدایات دیں۔ اپنے مرنے کے بعد لوگوں کو رونے اور ہائے وائے کرنے سے منع کیا، پھر اپنے بھائی ابواسحاق معتصم کو جس کو ولی عہد سلطنت بنا چکا تھا، بلا کر نصیحتیں کیں اور اصول جہاں بانی کی طرف توجہ دلائی، پھر قرآن کریم کی آیات پڑھتا رہا۔ ایک مرتبہ بول اٹھا کہ اے وہ جس کی سلطنت کبھی زائل نہ ہوگی! اس پر رحم کر جس کی سلطنت زائل ہو رہی ہے۔ اس کے بعد فوت ہو گیا۔ اس کا بھائی ابواسحاق معتصم اور اس کا بیٹا عباس بذندون علاقہ رقہ سے مقام طرطوس میں لائے اور دفن کیا۔ مامون نے ۴۸ سال کی عمر پائی اور ساڑھے بیس سال حکومت کی۔

مامون کا تمام عہد خلافت لڑائیوں اور بغاوتوں کو فرو کرنے میں گزرا۔ مہم زط اور بابک خرمی کو اس نے ناتمام چھوڑا یعنی دونوں فتنے اس کے عہد خلافت میں فرو نہ ہو سکے۔ درحقیقت مامون کی حکومت و ملک گیری کا زمانہ اب شروع ہوا تھا کہ اس کی موت آ گئی۔ اس نے اپنے آخر ایام حیات میں اپنی بہادری و سپہ سالاری کی قابلیت کا ثبوت بھی دے دیا۔ رومیوں کے مقابلے میں اس نے پیہم کئی سال تک جہاد کیے اور اس میں ذرا شک نہیں کہ وہ حالت جہاد اور میدان جنگ ہی میں فوت ہوا۔

صوبوں اور ملکوں کی خودمختاری:

خاندان بنوامیہ کے خلفاء جب تک حکمران رہے، دمشق تمام عالم اسلام کا ایک ہی مرکز اور

دارالخلافہ تھا۔ بنوامیہ کی خلافت کے وارث عباسی ہوئے تو عبداللہ سفاح پہلا عباسی خلیفہ سنہ ۱۳۲ھ میں خلفاء بنوامیہ کا قائم مقام اور تمام عالم کا فرماں روا بنا لیکن صرف چھ سال بعد یعنی سنہ ۱۳۸ھ میں اندلس کا ملک خلافت بنوعباس سے جدا ہو گیا اور وہاں ایک جداگانہ خلافت بنوامیہ قائم ہو گئی۔ سنہ ۱۷۲ھ میں مراکش کے اندر ایک اور خودمختار سلطنت قائم ہو گئی جو سلطنت ادریسیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس طرح مراکش کا ملک بھی بنوعباس کی حکومت کے دائرے سے ہمیشہ کے لیے خارج ہو گیا۔ چند روز کے بعد یعنی سنہ ۱۸۴ھ میں ٹیونس اور الجیریا کا علاقہ جس کو صوبہ افریقہ کہا جاتا تھا، برائے نام حکومت عباس کا ماتحت رہ گیا۔ ورنہ وہاں بھی ابراہیم بن اغلب کی خودمختار حکومت قائم ہو کر عرصہ دراز تک اس کی اولاد میں قائم رہی۔ سنہ ۲۰۵ھ میں مامون الرشید نے طاہر بن حسین کو خراسان کی صوبہ داری پر مامور کر کے بھیجا۔ اسی تاریخ سے خراسان کی حکومت طاہر کے خاندان میں رہی۔ جس طرح افریقہ برائے نام دولت عباسیہ سے تعلق رکھتا تھا، اسی طرح خراسان کی دولت طاہریہ کا بھی برائے نام تعلق تھا یعنی معمولی خراج وہاں سے آ جاتا تھا اور خطبہ میں عباسی خلیفہ کا نام لیا جاتا تھا۔ باقی امور میں طاہریہ سلاطین خودمختار تھے۔

سنہ ۲۱۳ھ میں محمد بن ابراہیم زیادی کو یمن کی حکومت سپرد کی گئی اور اس کے بعد یمن کی حکومت اسی کے خاندان میں رہی۔ یمن بھی خراسان و افریقہ کی طرح آزاد ہو گیا، غرض سنہ ۱۳۸ھ سے سنہ ۲۱۳ھ تک صرف پچھتر سال کے عرصہ میں دولت امویہ اندلس، دولت ادریسیہ مراقش، دولت اغلبیہ افریقہ، دولت طاہریہ خراسان، دولت زیادیہ یمن یعنی پانچ آزاد سلطنتوں کی بنیاد مامون الرشید عباسی کے زمانے تک کہ اس وقت تک بنوعباس کی دولت و حکومت ترقی پذیر سمجھی جاتی تھی، قائم ہوئی۔

ترقیات علمیہ:

مامون الرشید کے عہد حکومت کا کوئی ایک سال بھی ایسا نہیں جو جنگ و پیکار اور زدوخورد کے ہنگاموں سے خالی ہو اور مامون الرشید کو ملکوں اور صوبوں کے انتظامات اور باغیوں کی سرکوبی کے اہتمام سے فراغت حاصل ہوئی ہو۔ لہٰذا توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک ایسا مصروف افکار اور حالات سلطنت سے ہمہ اوقات باخبر رہنے والا خلیفہ علوم وفنون کی طرف بھی توجہ کر سکا ہو گا لیکن حیرت ہوتی ہے کہ مامون الرشید عباسی کے عہد خلافت میں علوم وفنون کے جس قدر دریا بہے اور مامون نے اس

طرف توجہ کر کے جو جو کارہائے نمایاں علمی دنیا کے لیے انجام دیے، اس کی نظیر دوسری جگہ دستیاب نہیں ہوسکتی اور یہی وجہ ہے کہ اس کی شہرت وعظمت نے غیر معمولی بلند رتبہ حاصل کرلیا ہے۔ ہارون الرشید نے بغداد میں بیت الحکمت کے نام سے ایک دارالترجمہ اور دارالتصنیف قائم کیا تھا، جس میں مختلف ملکوں کے رہنے والے مختلف مذاہب کے پیرو اور مختلف زبانیں جاننے والے علماء مصروف کار رہتے تھے۔

مامون کو ارسطو کی کتابوں کا ترجمہ کرانے کا شوق ہوا تو اس نے قیصر روم کو لکھا کہ ارسطو کی تمام تصانیف جہاں تک دستیاب ہوسکیں، فراہم کر کے ہمارے پاس بھیج دو۔ قیصر کو اس حکم کی تعمیل میں کچھ تامل ہوا اور اس نے اپنے عیسائی علماء سے مشورہ لیا تو انہوں نے کہا کہ فلسفہ کی کتابیں ہمارے ملک میں مقفل ومحفوظ ہیں اور ان کو پڑھنے پڑھانے کی کسی کو اجازت نہیں کیونکہ اس سے مذہبی احترام لوگوں کے دلوں میں باقی نہیں رہ سکتا۔ ان کتابوں کو آپ ضرور خلیفہ اسلام کے پاس بھجوا دیں تاکہ وہاں فلسفہ کی اشاعت ہو اور مسلمانوں کا دینی جوش سرد پڑ جائے۔ قیصر نے پانچ اونٹ ان کتابوں سے لاد کر مامون الرشید کے پاس بھجوا دیے۔ مامون الرشید نے یعقوب بن اسحاق کندی کو ان کے ترجمہ پر مامور کیا، پھر مامون نے خود اپنی طرف سے عیسائی علماء کو جو اس کے یہاں نوکر تھے، بلاد روم ویونان کی طرف روانہ کیا کہ وہاں سے علوم وفنون کی کتابیں تلاش کر کے لائیں۔ قسطا بن لوقا ایک عیسائی فلاسفر خود اپنے شوق سے روم کے ملک میں گیا اور وہاں سے کتابیں تلاش کر کے لایا۔ مامون الرشید نے اس کو دارالترجمہ میں نوکر رکھ لیا۔

اسی طرح اس نے مجوسی علماء کو بڑی بڑی بیش قرار تنخواہوں پر نوکر رکھ کر مجوسیوں کے علوم وفنون کے ترجمہ کی خدمت سپرد کی۔ ہندوستان کے راجاؤں کو معلوم ہوا تو انہوں نے مامون الرشید کی خدمت میں سنسکرت کے عالموں اور بڑے بڑے پنڈتوں کو بہ طور تحفہ بھیج کر خلیفہ کی خوشنودی حاصل کی۔ بیت الحکمت کے مترجموں کی تنخواہیں ڈھائی ڈھائی ہزار تک تھیں اور ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی تھی۔ جن میں یعقوب کندی، حنین بن اسحاق، قسطا بن لوقا بعلبکی، ابوجعفر یحیٰ بن عدی جبرئیل بن بختیشوع وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ علاوہ تنخواہوں کے مترجموں کو ہر ایک کتاب کے ترجمہ کے برابر سونا یا چاندی تول کر دی جاتی تھی۔ فلسطین، مصر، اسکندریہ، سسلی، روم، ایران، ہندوستان وغیرہ ملکوں سے علوم وفنون کی کتابیں منگوا کر عربی میں ترجمہ کرائی جاتی تھیں اور بہت سے مترجمین ترجموں

کی اصلاح اور نظر ثانی پر مامور تھے۔

مامون الرشید کے ہی عہد میں ایک مشہور عالم محمد بن موسیٰ خوارزمی نے مامون الرشید کی فرمائش سے علم جبر ومقابلہ پر ایک کتاب لکھی اور وہ اصول قائم کیے کہ ان اصولوں پر آج تک نہ ترمیم ہو سکی نہ اضافہ ممکن ہوا۔ زمین کے گول ہونے کا حال جب یونانی کتابوں میں دیکھا تو مامون الرشید نے جغرافیہ وہیئت کے علماء کو بلا کر حکم دیا کہ زمین کے محیط کی پیدائش معلوم کرنے کے لیے کوئی وسیع وہموار میدان انتخاب کر کے ایک درجہ کی پیمائش کریں۔ چنانچہ سنجار کا مسطح میدان انتخاب کیا گیا۔ علماء ایک مقام پر قطب شمالی کی بلندی کے ساتھ زاویہ قائم کر کے ٹھیک شمال کی جانب جریب ڈالتے اور ناپتے ہوئے بڑھے۔ ۶۶۲/۳ میل شمال کی جانب جانے سے قطب شمالی کی بلندی کے زاویہ میں پورا ایک درجہ بڑھ گیا اور معلوم ہو گیا کہ جب ایک درجہ کی مسافت سطح زمین پر ۶۶۲/۳ میل ہے تو زمین کا کل محیط ۲۴ ہزار میل ہونا چاہیے کیونکہ ہر نقطہ پر تمام زاویوں کا مجموعہ ۳۶۰ درجہ ہوتا ہے اور ۳۶۰ کو ۶۶۲/۳ میں ضرب دینے سے ۲۴ ہزار میل کے قریب فاصلہ برآمد ہوتا ہے۔ دوبارہ یہی تجربہ صحرائے کوفہ میں بھی کیا گیا اور وہی نتیجہ برآمد ہوا۔

خالد بن عبدالملک مروروزی اور یحییٰ بن ابی منصور وغیرہ کے ذریعہ سے شماسیہ کی رسد گاہ تعمیر ومکمل کرائی اور اجرام سماویہ کے مطالعہ پر علماء ہیئت مامور کیے، فرامین بھیج کر ہر ایک شہر اور ہر ایک علاقے سے علماء وفضلاء طلب کیے گئے۔ علمی مجلسیں اور مناظرے منعقد ہوتے۔ مامون الرشید اس میں شریک ہو کر حصہ لیتا۔ ادیب، شاعر، متکلم، طبیب غرض ہر علم وفن کے باکمال بغداد میں ایسے بلند پایہ موجود تھے جن میں سے کسی کا جواب دنیا میں ملنا دشوار تھا۔ اصمعی جو لغات عرب اور نحو وادب کا امام تھا، پیرانہ سالی کی وجہ سے کوفہ چھوڑ کر بغداد نہ آ سکا۔ اس کو وہیں وظیفہ ملتا تھا اور اہم مسائل حل کرنے کے لیے وہیں بھیجے جاتے تھے۔ فراء نحوی نے بغداد میں علم نحو کی تدوین کی اور کتابیں لکھوائیں۔ اس کے لیے ایوان شاہی کا ایک کمرہ خالی کر دیا گیا تھا جس میں علماء طالب علمانہ حیثیت سے استفادہ کرنے آتے تھے۔ فن خوشنویسی پر مامون ہی کے زمانے میں کتابیں لکھی گئیں اور اس فن کے اصول وقواعد مدون ومرتب ہوئے۔ غرض مامون الرشید کی توجہ اور علوم میں دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے سامنے یونانیوں، ایرانیوں، مصریوں اور ہندیوں کے علوم وفنون سب یکجا وبے نقاب ہو گئے۔

اگر چہ مسلمانوں کو قرآن وحدیث کے ہوتے ہوئے کسی علم وفن کی ضرورت نہ تھی، تاہم ان قدیم فلسفوں اور متفرق علوم کی طرف مسلمانوں کی توجہ نے مبذول ہو کر سب کو اس طرح مرتب ومہذب کر دیا کہ گویا نئے سرے سے ایجاد کیا۔ کامل آزادی سے کام لیا گیا اور بہ ظاہر یہ مختلف قوموں کے حکمیہ علوم فلسفہ قرآن کے مقابلہ پر آئے اور خدام اسلام کو موقع ملا کہ انہوں نے ان تمام فلسفوں اور تمام مخالف قرآن اصولوں کو غلط اور نادرست ثابت کیا۔ اس طرح مذاہب وعلوم کی معرکہ آرائیوں کا سلسلہ جاری ہو کر اسلام کو جو علمی فتوحات حاصل ہوئیں وہ ان ملکی فتوحات سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں جو عہد بنوامیہ میں حاصل ہوئیں اور یہی علمی فتوحات ہیں جنھوں نے خلافت عباسیہ کے مرتبے کو خلافت بنوامیہ کا ہمسر بنا دیا ورنہ ملکی فتوحات کے اعتبار سے خلافت عباسیہ ہرگز خلافت بنوامیہ کی حریف وہمسر نہیں ہوسکتی بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ فتوحات ملکی کے اعتبار سے بنوعباس کی خلافت سخت ناکام ثابت ہوئی کیونکہ وہ بنوامیہ کے فتح کیے ہوئے ملکوں کو سنبھال بھی نہ سکی۔

ایک بہتان کی تردید:

ہندوستان کی تاریخوں کے نہایت ہی ناقص ونا تمام خلاصے جن کو تاریخ کہنا بھی غلطی میں شامل ہے، سرکاری مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ کتابیں غالباً سیاسی اغراض کو مدنظر رکھ کر لکھی جا سکتی ہیں اور ان کے مصنفین بعض اوقات ایسی بے بنیاد باتیں ان میں درج کر دیتے ہیں جس سے ہندوستانی بچے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر حقیقت کے خلاف غلط عقیدہ قائم کر لیتے ہیں۔ اسی قسم کی غلط بیانی کے ایک تیر کا مجروح مامون الرشید کو بھی بنایا گیا ہے۔ غالباً تیس چالیس سال [1] ہوئے، جب راجہ شیو پرشاد ستارہ ہند کی لکھی ہوئی ایک کتاب سرکاری مدارس میں پڑھائی جاتی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ ”راجپوتانہ کے ایک راجہ مسمی باپا راول پر مامون الرشید عباسی نے بائیس مرتبہ حملے کیے اور ہر مرتبہ باپا نے مامون کو شکست دے دے کر بھگا دیا۔ سنا گیا ہے کہ یہی سفید جھوٹ بعض اور کتابوں میں بھی نقل کیا گیا ہے جو داخل نصاب تھیں یا اب مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ جن لوگوں نے لڑکپن میں یہ پڑھا ہے کہ مامون نے باپا سے بائیس مرتبہ شکست کھائی، وہ اپنے دل میں مامون الرشید عباسی کے متعلق کیسا حقیر تصور رکھتے ہوں گے کہ ایک معمولی زمیندار کو زیر کرنے کے لیے اس

---

[1] مؤلف نے یہ کتاب ۱۳۴۳ھ میں مکمل کی تھی یعنی آج سے ۸۱ سال قبل۔ اس لیے اسی تناظر میں اعداد وشمار کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

نے اپنی پوری قوت اور تمام عہد خلافت صرف کر دیا اور ناکام رہا۔ اوپر کے صفحات میں مامون الرشید عباسی کے حکومت کا حال درج ہو چکا ہے۔ وہ خلیفہ ہونے سے پہلے جن جن مشاغل میں مصروف رہا، اس کا بھی اجمالی ذکر آ چکا ہے۔ خراسان کی حکومت پر فائز ہو کر وہ مرو میں مقیم تھا کہ ہارون الرشید کا طوس میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد قریباً چھ سال تک وہ مرو میں مقیم رہا۔ اس نے مرو سے باہر قدم نہیں نکالا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ اس کی فوجوں نے کابل وقندھار کے باغیوں کو زیر کیا اور اس ملک میں سنہ ۲۰۰ھ کے قریب عام طور پر اسلام شائع ومروج ہو گیا۔

اسی زمانے میں تبت کا بادشاہ مسلمان ہوا اور اس نے اپنے سونے چاندی کے بت خلیفہ مامون کے پاس مرو میں بھیج دیے۔ سندھ اس کی حکومت میں شامل تھا اور وہاں دربار خلافت سے عامل مقرر و مامور ہو کر آتے اور حکومت کرتے تھے لیکن مامون خود کبھی اس طرف نہیں آیا۔ اس نے مرو سے روانہ ہو کر بغداد کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر کے تفصیلی حالات تاریخوں میں درج ہیں لیکن سندھ کی طرف یا ہندوستان پر حملہ آور ہونے کا ذکر نہیں۔ بغداد پہنچ کر عرصہ دراز تک وہ بغداد میں مقیم رہا۔ آخر ایام حیات میں وہ بغداد سے نکلا تو بلاد روم میں حملے کرتا رہا، شام ومصر بھی گیا۔

ان مغربی بلاد کے سفر سے واپسی میں وہ فوت ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا اور عقل کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتی کہ مامون الرشید کی زندگی میں آخر وہ کون سا زمانہ ہے جس میں حملات ہند کو درج کیا جائے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی گورنر سندھ نے کبھی کوئی دستہ فوج راجپوتانہ کے زمینداروں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا ہو مگر یہ ایسی بے حقیقت اور ناقابل تذکرہ مہم ہو گی کہ اس کا ذکر کرنا کسی نے بھی ضروری نہ سمجھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ عامل سندھ کی بھیجی ہوئی فوج نے چونکہ باپا سے شکست کھائی، لہٰذا مسلمانوں نے اس کا ذکر نہیں کیا مگر ایسا کہنے میں معترض کی پست ہمتی اور بددیانتی کا پردہ فاش ہو جاتا ہے کیونکہ وہ خود تاریخ نویسی اور واقعہ نگاری میں ایسے دروغ وکذب کو جائز سمجھتا ہے ورنہ مسلمان مورخوں نے مامون کی فوجوں کے شکست کھانے، اس کے سپہ سالاروں کے ناکام رہنے کو کہیں بھی نہیں چھپایا۔

قوم زط کی غارت گری کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اس طعنہ کو بھی درج کر دیا جو نصر بن شیث نے دیا تھا کہ زط کے چند مینڈکوں پر فتح نہ پا سکا، بھلا ان مورخین کو اگر وہ مامون کی حمایت وطرفداری میں ایسے ہی مجرمانہ حقیقت پوشی پر اتر آئے تھے تو زط کا تذکرہ بڑی آسانی سے ہضم کر

سکتے تھے کیونکہ چند ہی روز کے بعد یہ قوم رومیوں کی بہ دولت صفحہ ہستی سے فنا ہوگئی تھی۔ بہرحال باپا کی بہادری کا مبالغہ آمیز تذکرہ کرتے ہوئے یہ سفید جھوٹ جس کی کوئی بھی اصلیت نہیں، تراشا گیا ہے۔ یہ اسی قسم کا تمسخر انگیز جھوٹ ہے جیسا کہ بکرماجیت کی نسبت ہندو مورخوں نے بلاکسی شرم ولحاظ کے لکھ دیا ہے کہ اس نے ہندوستان سے ملک اٹلی کے شہر روما میں پہنچ کر جولیس سیرز بادشاہ روم کو شکست دی تھی۔ یہ شاید انہوں نے اپنے زعم میں اسکندر یونانی کے حملہ ہند کا جواب دے دیا ہے۔ دل خوش کرنے کے لیے اس قسم کی باتیں گاؤں کی چوپال میں بیٹھ کر تو شاید تھوڑی دیر کے لیے لطف صحبت کا موجب ہوسکتی ہوں لیکن اس کا نام تاریخ اور واقعہ نگاری ہرگز نہیں۔

اخلاق وعادات:

خلیفہ مامون الرشید تمام خاندان بنوعباس میں بہ اعتبار حزم، عزم، حلم، عقل وشجاعت سب سے بڑھ کر تھا۔ وہ خود کہا کرتا تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی اور عبدالملک کو حجاج کی ضرورت تھی مگر مجھ کو کسی کی ضرورت نہیں۔ اس پر شیعیت غالب تھی یعنی علویوں کو بہت قابل تکریم اور مستحق خلافت سمجھتا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے بھائی موتمن کو معزول کر کے علی رضا کو ولی عہد بنایا اور اس سے اپنی بیٹی کی شادی کی۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ خود خلع خلافت کر کے علی رضا کو اپنے سامنے خلیفہ بنا دے مگر ابتدائی دس برس گزر جانے کے بعد آخر عہد خلافت میں علویوں کے خروج اور سرکشیوں سے تنگ آ کر اس کے خیالات میں تغیر آ گیا تھا۔ اس نے یہ بھی حکم جاری کرنا چاہا کہ کوئی شخص امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو بھلائی کے ساتھ یاد نہ کرے ورنہ مجرم قرار دیا جائے گا مگر پھر اس حکم کو لوگوں کے سمجھانے سے جاری نہیں کیا۔

قرآن مجید پڑھنے کا بھی اس کو بہت شوق تھا۔ بعض رمضانوں میں اس نے روزانہ قرآن مجید ختم کیا ہے۔[1] مامون نے جب علی رضا کو ولی عہد بنایا تو بعض بنوعباس نے اس سے کہا کہ آپ امر خلافت علویوں کے سپرد نہ کریں۔ مامون نے جواب دیا کہ علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں بنو عباس کو اکثر صوبوں کی حکومت پر مامور فرمایا تھا۔ میں اس کا عوض کرنا چاہتا ہوں اور ان کی اولاد کو حکومت وخلافت سپرد کرتا ہوں۔

---

1. حدیث میں تین دن سے کم مدت میں قرآن کریم پڑھنے (یعنی ختم کرنے) پر ناپسندیدگی ظاہر کی گئی ہے۔ چنانچہ سنن ترمذی، ابواب القراءۃ میں ہے کہ ''اس شخص نے قرآن نہیں سمجھا جس نے تین دن سے کم مدت میں ختم کیا۔'' (سندہ حسن)

مامون نے دارالمناظرہ میں جب ہر عقیدہ اور ہر مذہب کے لوگوں کو آزادانہ گفتگو کرنے کا موقع دیا اور علمی مباحث آزادی کے ساتھ ہونے لگیں تو اس کی توجہ متکلمین اور معتزلہ کی طرف زیادہ مبذول ہوگئی۔ انہیں آزادانہ مذہبی بحث ومباحثے کا یہ نتیجہ ہوا کہ خلق قرآن کا مسئلہ جو درحقیقت بالکل غیر ضروری اور ناقابل توجہ مسئلہ تھا، زیر بحث آیا اور مامون خلق قرآن کا قائل ہو کر ان لوگوں پر جو خلق قرآن کے قائل نہ تھے، تشدد کرنے لگا۔ اس تشدد وسختی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالف عقیدہ کے علماء نے اور بھی زیادہ سختی سے مخالفت شروع کی اور طرفین کی اس مخالفت وعصبیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مامون کے بعد تک بھی علماء دین کو اس بے حقیقت اور غیر ضروری مسئلہ کی وجہ سے بڑی بڑی اذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔

ابو محمد یزیدی کا بیان ہے کہ میں مامون کو بچپن میں پڑھایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ خدام نے مجھ سے شکایت کی کہ جب تم چلے جاتے ہو تو یہ نوکروں کو مارتا پیٹتا اور شوخی کرتا ہے۔ میں نے اس کو سات قمچیاں ماریں اور مامون روتا اور آنسو پونچھتا جاتا تھا۔ اتنے میں وزیراعظم جعفر برمکی آ گیا۔ میں اٹھ کر باہر چلا گیا اور جعفر، مامون سے بات چیت کر کے اور اس کو ہنسا کر چلا گیا۔ میں پھر مامون کے پاس آیا اور کہا کہ میں تو اتنی دیر ڈرتا ہی رہا کہ کہیں تم جعفر سے شکایت نہ کر دو۔ مامون نے کہا کہ جعفر تو کیا میں اپنے باپ سے بھی آپ کی شکایت نہیں کرسکتا کیونکہ آپ نے تو میرے ہی فائدے کے لیے مجھ کو مارا تھا۔

یحییٰ بن اکثم کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مامون الرشید کے کمرہ میں سو رہا تھا۔ مامون بھی قریب ہی مصروف خواب تھا۔ مامون نے مجھ کو جگا کر کہا کہ دیکھنا! میرے پاؤں کے قریب کوئی چیز ہے۔ میں نے دیکھ کر کہا کہ کچھ نہیں ہے لیکن مامون کو اطمینان نہ ہوا۔ اس نے فراشوں کو آواز دی۔ انہوں نے شمع جلا کر روشنی سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کے بچھونے کے نیچے ایک سانپ بیٹھا ہے۔ میں نے مامون سے کہا کہ آپ کے کمالوں کے ساتھ آپ کو عالم الغیب بھی کہنا چاہیے۔ مامون نے کہا کہ معاذاللہ! یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ بات صرف یہ تھی کہ میں نے ابھی خواب میں دیکھا ہے کہ کوئی شخص مجھ سے کہتا ہے کہ اپنے آپ کو ننگی تلوار سے بچاؤ۔ میری فوراً آنکھ کھل گئی اور میں نے سوچا کہ کوئی حادثہ قریب ہی ہونے والا ہے۔ سب سے قریب بچھونا ہی تھا، لہٰذا میں نے بچھونے کو دیکھا اور سانپ نکلا۔

محمد بن منصور کا قول ہے کہ مامون کہا کرتا تھا کہ شریف آدمی کی ایک یہ علامت ہے کہ اپنے آپ سے برتر کے مظالم سہے اور اپنے آپ سے کمتر پر ظلم نہ کرے۔ سعید بن مسلم کہتے ہیں کہ مامون نے ایک مرتبہ کہا کہ اگر مجرموں کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں عفو کو کس قدر دوست رکھتا ہوں تو ان سے خوف دور ہو جائے اور ان کے دل خوش ہو جائیں۔

ایک مجرم سے مامون نے کہا کہ واللہ! میں تجھ کو قتل کر ڈالوں گا۔ اس نے کہا کہ آپ ذرا تحمل کو کام میں لائیں۔ نرمی کرنا بھی نصف عفو ہے۔ مامون نے کہا کہ اب تو میں قسم کھا چکا۔ اس نے کہا کہ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے قسم توڑنے والے کی حیثیت سے پیش ہوں تو اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ ایک خونی کی حیثیت سے پیش ہوں۔ یہ سن کر مامون نے اس کا قصور معاف کر دیا۔ عبدالسلام بن صلاح کہتے ہیں کہ ایک روز میں مامون کے کمرے میں سویا، چراغ گل ہونے لگا۔ دیکھا تو مشعلچی سو رہا ہے۔ مامون خود اٹھا اور چراغ کی بتی درست کر کے لیٹ گیا اور کہنے لگا کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں غسل خانے میں ہوتا ہوں اور یہ خدمت گار مجھ کو گالیاں دیتے اور طرح طرح کی تہمتیں مجھ پر لگاتے رہتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے سنا نہیں لیکن میں سنتا ہوں اور معاف کرتا رہتا ہوں اور کبھی یہ بھی ظاہر نہیں کرتا کہ میں نے تمہاری باتیں سنی ہیں۔

ایک روز مامون الرشید دجلہ کی سیر کر رہا تھا، ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے دوسری طرف کنارے پر ملاح بیٹھے ہوئے تھے جن کو مامون کی موجودگی کا علم نہ تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ مامون یہ سمجھتا ہو گا کہ میرے دل میں اس کی قدر ہے مگر وہ اتنا نہیں سمجھتا کہ جو شخص اپنے بھائی کا قاتل ہو، اس کی ذرا بھی قدر میرے دل میں نہیں ہو سکتی۔ مامون مسکرا کر کہنے لگا کہ یارو! تم ہی کوئی تدبیر بتاؤ کہ اس جلیل القدر شخص کے دل میں میری قدر ہو جائے۔

یحییٰ بن اکثم کا بیان ہے کہ میں مامون کے کمرہ میں لیٹا ہوا تھا، ابھی سویا نہ تھا۔ مامون کو کھانسی اٹھی، اس نے اپنی قمیص کے دامن سے اپنا منہ دبا لیا تا کہ کوئی جاگ نہ اٹھے۔ مامون کا قول ہے کہ مجھ کو غلبہ حجت، غلبہ قدرت سے اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ غلبہ قدرت زوال قدرت کے وقت زائل ہو جائے گا مگر غلبہ حجت کو کسی وقت زوال نہیں۔ مامون کہا کرتا تھا کہ بادشاہ کی خوشامد پسندی بہت بری ہے۔ اس سے بھی بری قاضیوں کی تنگ دلی ہے جبکہ وہ معاملہ سمجھنے سے پہلے سرزد ہو۔ اس سے بھی بدتر معاملات دین میں فقہاء کی کم عقلی ہے۔ اس سے بدتر مال دار لوگوں کی کنجوسی، بوڑھے

آدمیوں کا مذاق کرنا، جوانوں کا سستی کرنا اور جنگ میں بزدلی دکھانا ہے۔

علی بن عبدالرحمٰن مروروزی کہتے ہیں کہ مامون کا قول ہے کہ وہ شخص اپنی جان کا دشمن ہے جو ایسے شخص کی مقاربت کا خواہاں ہو جو اس سے دوری اختیار کرنا چاہتا ہے اور ایسے شخص کی تواضع کرے جو اس کا اکرام نہ کرتا ہو اور ایسے شخص کی تعریف کرنے سے خوش ہو جو اسے جانتا ہی نہ ہو۔

ہدبہ بن مالد کہتے ہیں کہ میں ایک روز مامون کے ساتھ کھانا کھانے میں شریک تھا۔ جب دسترخوان اٹھایا گیا تو میں فرش پر سے کھانے کے ریزے چن کر کھانے لگا۔ مامون نے پوچھا کہ کیا تمہارا پیٹ نہیں بھرا؟ میں نے کہا کہ پیٹ تو بھر گیا ہے لیکن حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص دسترخوان اٹھانے کے بعد کھانے کے بچے ہوئے ریزے اٹھا کر کھائے، وہ مفلسی سے امن میں رہے گا۔[1] مامون نے یہ سن کر مجھے ایک ہزار دینار عطا کیے۔ ایک مرتبہ ہارون الرشید حج کرنے کے بعد کوفہ میں آیا اور وہاں کے محدثین کو بلا بھیجا۔ تمام لوگ حاضر ہو گئے مگر عبداللہ بن ادریس اور عیسیٰ بن یونس دو اشخاص نے حاضری سے انکار کیا۔ ہارون الرشید نے اپنے بیٹے امین و مامون کو ان کی خدمت میں بھیجا۔ یہ دونوں جب عبداللہ بن ادریس کے پاس گئے تو انہوں نے امین کو مخاطب کر کے سو احادیث پڑھ دیں۔ مامون بھی بیٹھا ہوا سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوئے تو مامون نے کہا اگر آپ اجازت دیں تو میں ان احادیث کو سنا دوں۔ چنانچہ انہوں نے اجازت دی اور مامون نے بلا کم و کاست تمام احادیث سنا دیں۔ ابن ادریس، مامون کی قوت حافظہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے، اللہ اکبر!

مامون الرشید نے ایک مرتبہ ذکر کیا کہ میں کسی شخص کے جواب سے ایسا بند نہیں ہوا جیسا ایک مرتبہ اہل کوفہ نے مجھ کو لاجواب کر دیا۔ بات یہ تھی کہ انہوں نے آ کر کوفہ کے عامل کی شکایت کی۔ میں نے کہا کہ تم لوگ جھوٹ کہتے ہو، وہ عامل نہایت عادل ہے۔ انہوں نے کہا کہ بے شک ہم جھوٹے اور امیر المومنین سچے ہیں لیکن اس عامل کے عدل کے لیے ہمارا ہی شہر کیوں مخصوص کیا گیا ہے۔ اس کو کسی دوسرے شہر میں بھیج دیجیے تا کہ وہ شہر بھی اس کے عدل سے ویسا ہی فائدہ اٹھائے

---

[1] اس روایت کی سند نہیں مل سکی۔ البتہ ایک صحیح حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ: ''جب تم میں سے کسی کا لقمہ گر جائے تو اسے اٹھا لے اور اس میں جو گندگی (مٹی) لگ گئی ہو اسے صاف کر لے اور کھا لے اور اسے شیطان کے لیے نہ چھوڑے اور اپنے ہاتھ کو تولیے سے نہ پونچھے، یہاں تک کہ (پہلے) اپنی انگلیاں چاٹ لے۔ اس لیے کہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے کون سے کھانے میں برکت ہے؟'' (صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، حدیث ۲۰۳۳ و ۲۰۳۴)

جیسیا ہمارا شہرا ٹھا چکا ہے۔ مجبوراً مجھے کہنا پڑا کہ اچھا جاؤ! میں نے اسے معزول کیا۔

یحییٰ بن اکثم کا قول ہے کہ میں ایک رات مامون الرشید کے کمرے میں سویا۔ آدھی رات کے وقت مجھے پیاس لگی، میں کروٹیں بدلنے لگا۔ مامون نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ میں نے کہا کہ پیاس لگی ہے۔ مامون اپنے بستر سے اٹھا اور پانی لایا اور مجھے پلایا۔ میں نے کہا کہ آپ نے کسی خادم کو آواز کیوں نہ دی؟ مامون نے کہا کہ میرے باپ نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے اور انہوں نے عقبہ بن عامر سے سنا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قوم کا سرداران کا خادم ہوتا ہے۔[1]

خلیفہ مامون الرشید کے کاموں اور کارناموں میں سب سے زیادہ قابل تعریف اور قابل تذکرہ یہ بات ہے کہ اس نے ولی عہد بنانے میں نہایت نیک نیتی اور بلند ہمتی کا ثبوت دیا اور محبت پدری کے فریب میں نہیں آیا، جیسا کہ اس سے پہلے خلفاء ولی عہدی کے معاملے میں غلطی کا ارتکاب کرتے اور حکومت اسلامیہ کے لیے ولی عہدی کے متعلق وراثت کی لعنت کو مضبوط واستوار بناتے رہے۔ مامون الرشید نے امام علی رضا کو ولی عہد خلافت بنا کر خاندان عباسیہ کو بالکل محروم رکھ کر نہایت آزادی کے ساتھ ایک بہترین شخص کا انتخاب اسی نمونہ پر کیا تھا جیسا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنا ولی عہد بنایا تھا مگر مامون الرشید کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ عباسی لوگ اس پر کسی طرح بھی رضا مند نہ ہوں گے اور فتنہ وفساد پر آمادہ ہوکر عالم اسلام کو مبتلائے مصیبت کر دیں گے۔ امام علی رضا کی وفات نے مامون کے اس منشاء کو پورا نہ ہونے دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے خاندان میں سے اپنے بھائی ابواسحاق معتصم کو ولی عہد بنایا اور اپنے بیٹے عباس کو جو ہر طرح حکومت وخلافت کی قابلیت رکھتا تھا، محروم رکھا۔ معتصم چونکہ عباس سے بھی زیادہ حکومت وسلطنت کی اہلیت رکھتا تھا، لہٰذا اس نے معتصم ہی کا انتخاب کیا اور اپنے بیٹے کی مطلق پرواہ نہ کی۔ مامون کے پیش رو بہت سے خلفاء صرف ایک ہی ولی عہد نہیں بلکہ دو دو ولی عہدوں کے تعین کی بدعت کے مرتکب ہوتے رہے تھے۔ مامون اگر ان کی طرح کرتا تو معتصم کے بعد اپنے بیٹے عباس کو نامزد کرسکتا تھا اور اس طرح اس کو اطمینان ہوسکتا تھا کہ معتصم کے بعد میرا بیٹا خلیفہ ہوگا لیکن اس نے اس نامعقول

---

[1] صحیح مسلم اور سنن ترمذی میں سید القوم کی بجائے ساقی القوم کے الفاظ ہیں، یعنی قوم کا پلانے والا (صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ الفائتۃ۔ سنن ترمذی، ابواب الاشربہ، حدیث ۱۸۹۴، حدیث حسنٌ صحیحٌ)

حرکت کو بھی پسند نہیں کیا۔ اس معاملے میں مامون الرشید کی جس قدر تعریف کی جائے، کم ہے۔

معتصم باللہ

ابو اسحاق معتصم بن ہارون الرشید سنہ ۱۸۰ھ میں جبکہ ہارون الرشید خود بلاد روم کی طرف عازم ہوا، مقام زبطرہ علاقہ سرحد میں باردہ نامی ام ولد کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ ہارون الرشید کو اس کے ساتھ بہت محبت تھی۔ وہ اپنی اولاد میں جب کوئی چیز تقسیم کرتا تو سب سے زیادہ حصہ معتصم کو دیا کرتا تھا۔ معتصم کو پڑھنے لکھنے کا مطلق شوق نہ تھا۔ لڑکپن میں اس نے کھیل کود کے اندر اپنا تمام وقت صرف کیا۔ ہارون الرشید نے ایک غلام کو متعین کر دیا تھا کہ وہ معتصم کے ساتھ ساتھ رہے اور جب موقع ملے، اس کو پڑھائے۔ جب وہ غلام مر گیا تو ہارون الرشید نے کہا کہ اب تو تمہارا غلام بھی مر گیا۔ بتاؤ! اب کیا ارادہ ہے؟ معتصم نے کہا کہ امیر المومنین! ہاں غلام مر گیا اور میں کتاب کے جھگڑے سے چھوٹ گیا۔ معتصم کی نسبت مشہور ہے کہ وہ بالکل امی تھا مگر صحیح یہ ہے کہ وہ بہت ہی کم پڑھنا جانتا تھا اور اپنا نام وغیرہ لکھ سکتا تھا۔ مگر چونکہ شاہی خاندان اور علماء کی صحبت میں پرورش پائی تھی اور ہارون و مامون کے زمانے کی علمی مجلسوں کے تماشے خوب دیکھے تھے، اس لیے اس کی واقفیت بہت وسیع تھی۔ معتصم نہایت تنومند پہلوان اور بہادر شخص تھا۔ ساتھ ہی وہ سپہ سالاری کی اعلیٰ درجہ کی قابلیت رکھتا تھا۔ ابن ابی داؤد کا قول ہے کہ معتصم اکثر اپنا بازو میری طرف پھیلا کر کہا کرتا تھا کہ اس میں خوب زور سے کاٹو۔ میرے دانتوں کا کیا اثر ہوتا، اس پر تو نیزہ کا بھی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ معتصم اکثر اپنی دو انگلیوں سے آدمی کے پہنچے کی ہڈی دبا کر توڑ ڈالا کرتا تھا۔

معتصم کبھی کبھی خود بھی شعر کہتا اور شعراء کی خوب قدردانی کرتا تھا۔ مسئلہ خلق قرآن کے خبط میں وہ اپنے بھائی مامون الرشید کی طرح مبتلا تھا۔ جس طرح مامون نے علماء کو اس مسئلہ کے متعلق اذیتیں پہنچائیں، اسی طرح معتصم باللہ عباسی نے بھی علماء کو تنگ کیا۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو اسی مسئلہ خلق قرآن کے متعلق نہایت بے رحمی و بے دردی سے تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں۔

مامون الرشید کے عہد خلافت میں معتصم باللہ شام و مصر کا گورنر تھا۔ مامون الرشید نے جب بلاد روم پر چڑھائی کی تو معتصم باللہ نے اپنی شجاعت کے جوہر خوب دکھائے۔ اسی لیے مامون الرشید نے خوش ہو کر اس کو اپنا ولی عہد بنایا اور اپنے بیٹے عباس کو محروم رکھا۔ معتصم باللہ کی بیعت خلافت مامون

کی وفات کے دوسرے دن ۱۹ رجب سنہ ۲۱۰ھ مطابق ۱۰ اگست سنہ ۸۳۳ء مقام طرطوس میں ہوئی۔

فضل بن مروان ایک عیسائی اس کا کار پرداز اور نائب تھا۔ جب بغداد میں مامون الرشید کی وفات کی اطلاع پہنچی تو فضل بن مروان نے اہل بغداد سے معتصم کی خلافت کی بیعت لی۔ معتصم نے بغداد میں پہنچ کر فضل بن مروان ہی کو اپنا وزیر اعظم بنایا۔ مقام طرسوس میں جب معتصم کے ہاتھ پر بیعت ہوئی تو فوج کے اکثر اراکین نے عباس بن مامون کا نام لیا کہ وہ خلافت کا زیادہ مستحق ہے۔ معتصم نے عباس کو طلب کیا اور اس نے معتصم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ عباس کی بیعت کے بعد یہ شورش ومخالفت خود بہ خود فرو ہوگئی۔ معتصم نے یا تو عباس کے اثر کو مٹانے کے لیے کہ اس کے زیر اہتمام شہر طوانہ کی تعمیر آبادی عمل میں آئی تھی یا اس لیے کہ سرحد روم پر ایک ایسا مضبوط مقام جس میں مسلمانوں کی آبادی تھی، رومیوں کو ہر وقت اپنی طرف متوجہ رکھے گا یا اللہ جانے کس لیے تخت خلافت پر متمکن ہوتے ہی حکم دیا کہ طوانہ کو مسمار و ویران کر دیا جائے اور اس کے باشندوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے شہروں کو واپس چلے جائیں اور جہاں سے آئے تھے، وہیں جا کر آباد ہوں، اس شہر کو ویران کرا کر جو سامان ساتھ لا سکتا تھا، اپنے ہمراہ بغداد لے آیا اور جو نہیں لا سکتا تھا، اس کو وہیں آگ لگا کر جلا دیا۔

محمد بن قاسم کا خروج:

محمد بن قاسم بن علی بن عمر بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب مدینہ منورہ کی مسجد میں رہا کرتا اور زہد و عبادت میں اپنے اوقات بسر کرتا تھا۔ ایک خراسانی نے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر ترغیب دینی شروع کی کہ آپ خلافت کے مستحق ہیں۔ آپ کو لوگوں سے خفیہ طور پر بیعت لینی چاہیے۔ چنانچہ اس نے ان لوگوں کو جو خراسان سے حج کرنے آتے اور مدینہ منورہ رہ جاتے، لا لا کر خدمت میں پیش کرنا شروع کیا اور انہوں نے محمد بن قاسم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس طرح جب ان لوگوں کی ایک معقول تعداد خراسان میں موجود ہوگئی تو محمد بن قاسم مع اس خراسانی کے جرجان جا کر مصلحتاً چند روز روپوش رہا۔ وہاں بیعت کا سلسلہ خوب مخفی طور پر جاری رہا اور رؤساء و امراء آ آ کر ملاقات کرتے رہے۔ بالآخر محمد بن قاسم علوی نے خروج کیا اور خراسان کے گورنر عبداللہ بن طاہر نے اس فساد کو مٹانے کی غرض سے فوج بھیجی۔ نواح طالقان میں متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ ہر لڑائی میں

محمد بن قاسم علوی کو شکست ہوئی۔ آخر محمد بن قاسم کو تنہا اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ مقام نساء میں پہنچ کر گرفتار ہو کر عبداللہ بن طاہر کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ عبداللہ بن طاہر نے معتصم باللہ کی خدمت میں بغداد بھیج دیا۔ معتصم باللہ نے مسرور الکبیر کے زیر نگرانی قید کر دیا۔ ۱۵ ربیع الاول سنہ ۲۱۹ھ کو محمد بن قاسم بغداد پہنچا۔ شوال سنہ ۲۱۹ھ کو پہلی شب یعنی شب عید الفطر کو موقع پا کر قید سے چھٹکارا پایا اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔

گروہ زط کا خاتمہ:

جمادی الآخر سنہ ۲۱۹ھ کو خلیفہ معتصم نے اپنے ایک سالار عجیف بن عنبہ کو گروہ زط کی جنگ پر مامور کیا۔ عجیف نے سات مہینے تک اس غارت گر گروہ کے ساتھ ہنگامہ کارزار گرم رکھا۔ آخر ان کو مجبور کر دیا کہ انہوں نے خود ماہ ذی الحجہ سنہ ۲۱۹ھ میں امان کی درخواست کی اور اپنے آپ کو عجیف کے سپرد کر دیا۔ عجیف ان سب کو جن کی تعداد مع عورتوں، بچوں کے سترہ ہزار تھی، لے کر بغداد کی طرف آیا۔ ان سترہ ہزار میں بارہ ہزار لڑنے کے قابل مرد تھے۔ ۱۰ محرم سنہ ۲۲۰ھ کو عجیف بغداد میں داخل ہوا اور معتصم خود کشتی میں سوار ہو کر شماسہ کی طرف آیا اور گروہ زط کے اسیروں کا معائنہ کر کے حکم دیا کہ ان کو سرحد روم کی طرف مقام چشمہ زربہ کے قریب آباد کر دو۔ چنانچہ یہ اس طرف پہنچا دیے گئے۔ وہاں یہ اتفاق پیش آیا کہ رومیوں نے موقع پا کر ان پر شب خون مارا اور سب کو قتل کر کے چلے گئے، ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ اس طرح اس غارت گر گروہ زط کا خاتمہ ہو گیا۔

شہر سامرا:

خلیفہ معتصم ایک فوجی آدمی تھا۔ اس کی توجہ فوج کی طرف زیادہ مبذول ہوئی۔ اس کے پیش رو خلفاء عباسیہ عام طور پر خراسانیوں کے زیادہ قدردان تھے اور انہوں نے عربی فوج پر بہت ہی کم اعتماد کیا تھا۔ اگرچہ خراسانیوں کی طرف سے بھی ان کو بار بار خطرے پیش آئے لیکن پھر بھی بحیثیت مجموعی انہوں نے اہل عرب کے مقابلے میں خراسانیوں اور ایرانیوں ہی پر زیادہ اعتماد کیا۔ لہٰذا فوج میں سے عربی عنصر کم ہوتے ہوتے بہت ہی کم ہو گیا تھا۔ معتصم باللہ نے فوج کی تربیت و تنظیم کی جانب شروع ہی میں توجہ مبذول کی۔ اس نے فرغانہ واشروسنہ کے علاقوں سے ترکوں کو بھرتی کرایا۔

ان ترکوں کی جنگ جوئی وصعوبت کشی اس کو بہت پسند تھی۔ اب تک فوج میں عربی وایرانی دو

ہی قسم کے لوگ ہوتے تھے اور ترکوں سے برابر سرحد پر لڑائی جھگڑے برپا رہتے۔ کبھی ترک سردار باج گزار بن جاتے، کبھی باغی ہو کر مقابلہ پر آتے اور فوجی طاقت سے مغلوب ومحکوم بنائے جاتے۔ ان پر یہ اعتماد نہیں کیا گیا تھا کہ ان کو فوج میں بھرتی کیا جاتا۔ معتصم نے ان کو اپنی فوج میں اس کثرت سے بھرتی کیا اور ترکوں کو اس قدر فوجی عہدے دیے کہ تعداد کے اعتبار سے بھی ترکی فوج، ایرانی فوج کے مدمقابل بن گئی۔ عربی قبائل کم ہوتے ہوتے صرف مصر و یمن کے قبائل خلیفہ کی فوج میں باقی رہ گئے تھے۔ خلیفہ نے تمام عربی النسل دستوں کو ملا کر ایک فوج الگ تیار کی اور اس کا نام مغاربہ رکھا۔

سمرقند، فرغانہ اور اشروسنہ کے ترکوں کی فوج جو سب سے زیادہ زبردست اور بڑی فوج تھی، اس کا نام فراغنہ تجویز کیا۔ خراسانی لشکر کو لشکر فراغنہ سے رقابت پیدا ہوئی۔ خلیفہ معتصم نے بڑے شوق سے ترکوں کی جدید فوج قائم کی تھی۔ ان کے گھوڑے بھی زیادہ اچھے تھے، ان کی تنخواہیں اور وظیفے بھی دوسروں سے زیادہ تھے۔ اس لیے خراسانیوں نے بغداد میں ان سے لڑائی جھگڑے شروع کر دیے۔ معتصم باللہ نے یہ رنگ دیکھ کر بغداد سے نوے (۹۰) میل کے فاصلے پر دجلہ کے کنارے نہر قاطون کے مخرج کے قریب لشکر فراغنہ کی چھاؤنی قائم کی۔ وہیں اس نے ایک قصر اپنے رہنے کے لیے تعمیر کیا۔ فوج کے لیے مکانات بنوائے، بازار و جامع مسجد وغیرہ تمام ضروری عمارات بنوا کر ترکوں کو آباد کر کے خود بھی اس نو تعمیر شہر میں چلا گیا۔

اس کا نام سرمن رائے رکھا جو کثرت استعمال سے سامرا مشہور ہو گیا۔ اس شہر کی تعمیر سنہ ۲۲۰ھ میں ہوئی اور اسی سال بغداد کی جگہ سامرا دارالخلافہ بن گیا۔ دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے چند ہی روز میں سامرا کی رونق و آبادی بغداد کے مدمقابل بن گئی اور عربی و خراسانی عنصر کی نسبت ترکی عنصر دارالخلافہ اور خلیفہ پر حاوی ہو گیا۔ اسی سال محمد بن علی رضا بن موسیٰ بن کاظم بن جعفر صادق کی وفات ہوئی اور بغداد میں تدفین ہوئی۔

فضل بن مروان کی معزولی:

اسی سال یعنی سنہ ۲۲۰ھ میں وزیراعظم فضل بن مروان کی نسبت خلیفہ کے کانوں میں بددیانتی کی شکایت پہنچیں۔ خلیفہ نے حسابات کی جانچ پڑتال کے لیے اہلکار مامور کیے تو دس لاکھ دینار کا غبن نکلا۔ خلیفہ نے یہ روپیہ فضل کے مال و اسباب سے وصول کیا اور اس کو موصل کے قریب کسی گاؤں

میں نظر بند کر دیا اور فضل کی جگہ محمد بن عبدالملک بن ابان بن حمزہ کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ محمد بن عبدالملک ابن زیات کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس کا دادا ابان ایک گاؤں میں رہتا اور وہاں سے تیل لا کر بغداد میں بیچا کرتا تھا۔ محمد بن عبدالملک نے بغداد میں تعلیم و پرورش پائی تھی اور اعلیٰ قابلیت کو پہنچ گیا تھا۔ اس کی وزارت کا زمانہ معتصم، واثق اور متوکل تک ہوا۔ خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں جس طرح قاضی یحییٰ بن اکثم کا عہدہ اگرچہ وزیر کا نہ تھا مگر وزیر اعظم سے زیادہ اختیارات حاصل تھے اور ہر وقت مامون کے ساتھ رہنا سہنا، اسی طرح معتصم کے پاس قاضی یحییٰ بن اکثم کے ایک شاگرد احمد بن ابی داؤد کا رہنا سہنا۔ وہ بھی اگرچہ وزیر اعظم نہ تھا مگر وزیر اعظم کے برابر ہی اثر واقتدار رکھتا تھا۔ یہ دونوں استاد شاگرد متکلم و معتزلی تھے۔ مسئلہ خلق قرآن کی نسبت جو مامون و معتصم نے علماء پر زیادتیاں کی تھیں، وہ انہیں دونوں بزرگوں کی تحریک وخواہش کا نتیجہ بیان کی جاتی ہیں۔ مگر صرف ابن ابی داؤد ہی ایک شخص معتصم کے دربار میں تھا جو اہل عرب کا حامی و ہوا خواہ تھا اور اسی کی وجہ سے عرب تھوڑی بہت عزت دارالخلافہ میں رکھتے تھے۔ ورنہ ہر طرف ترکوں یا ان کے بعد ایرانیوں کا غلبہ نظر آتا تھا۔

بابک خرمی اور افشین حیدر:

بابک خرمی کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ مامون الرشید کے ہر ایک سپہ سالار کو جو اس کے مقابلہ پر گیا، بابک نے شکست دی اور کسی سے زیر نہ ہوا۔ شہر بذا کو اس نے اپنا مستقر بنا رکھا تھا اور اردگرد کے تمام علاقہ پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ قرب و جوار کے عمال و رؤساء سب اس سے ڈرتے اور اس کی خوشنودی کے لیے اس کے آدمیوں کی خاطر مدارات کرتے رہتے تھے۔ خلیفہ معتصم نے ابوسعید محمد بن یوسف کو بابک کی سرکوبی پر مامور کیا۔ ابوسعید نے اول اردبیل و آذربائیجان کے درمیان ان تمام قلعوں کی مرمت کرائی جو بابک نے خراب و مسمار کر دیے تھے، پھر سامان رسد اور آلات حرب کی فراہمی کے بعد بابک کی طرف بڑھنے کی تیاری کی۔ بابک خرمی کے ایک دستہ فوج نے انہیں بلاد میں سے کسی ایک مقام پر شب خون مارا۔

ابوسعید کو اس شب خون کا حال معلوم ہوا تو وہ فوراً اپنی فوج لے کر تعاقب میں روانہ ہو گیا اور بابک کی اس فوج کے قریب پہنچ کر معرکہ آراء ہوا۔ اس لڑائی میں بابک کو شکست ہوئی۔ بہت سے

آدمی اس کے ابوسعید نے گرفتار اور بہت سے قتل کیے اور وہ تمام سامان جو شب خون مار کر لے گئے تھے، چھین لیا۔ یہ پہلی ہزیمت تھی جو بابک خرمی کی فوج کو حاصل ہوئی۔ اس شکست کا یہ اثر ہوا کہ بعض سردار جو بابک کے خوف سے اس کی حمایت کا دم بھرتے تھے مگر بہ دل اس سے ناراض تھے، لشکر اسلام کی ہمدردی پر آمادہ ہوگئے۔ بابک خرمی کا ایک سپہ سالار عصمت نامی علاقہ آذربائیجان کے ایک قلعہ دار محمد بن بعیث کے قلعہ میں آ کر ٹھہرا۔ محمد بن بعیث نے حسب معمول اس کی ضیافت اور اس کے ہمراہیوں کے قیام و طعام کا انتظام کیا اور عصمت کو حسب معمول عزت واحترام کے ساتھ ٹھہرایا اور رات کے وقت عصمت کو گرفتار کر کے خلیفہ معتصم کی خدمت میں روانہ کر دیا اور اس کے ہمراہیوں کو تیغ کے گھاٹ اتار دیا۔ خلیفہ معتصم نے عصمت سے بابک کے شہروں اور قلعوں کے اسرار دریافت کیے۔ عصمت نے بہ امید رہائی تمام اسرار معتصم کو بتا دیے۔ معتصم نے عصمت کو تو قید کر دیا اور بابک کے مقابلے پر کسی بڑے اور زبردست سپہ سالار کو بھیجنا ضروری سمجھا کہ اس فتنہ کا ایکا ایکی استیصال ہو سکے۔

معتصم کے سپہ سالاروں میں حیدر بن کاؤس نامی سب سے بڑا سپہ سالار تھا۔ یہ اثر وسنہ کے بادشاہ کا بیٹا تھا، جس کا خاندانی لقب افشین تھا۔ یہ مسلمان ہو گیا تھا اور اس کا اسلامی نام حیدر رکھا گیا تھا۔ اس لیے یہ افشین حیدر کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ تمام لشکر فراغنہ یعنی ترکی فوج کا سپہ سالار اعظم تھا۔ یہ مامون الرشید کے عہد خلافت میں معتصم کے ہاتھ پر مسلمان ہوکر معتصم کی خدمت میں رہتا تھا۔ معتصم نے اپنی گورنری شام ومصر کے زمانے میں افشین حیدر سے فوجی خدمات لی تھیں اور اس کو جوہر قابل پایا تھا۔ لہٰذا اب تخت خلافت پر بیٹھ کر اس نے لشکر فراغنہ کو مرتب کیا تو افشین حیدر، ایتاخ، اشناس، عجیف، وصیف، بغا کبیر وغیرہ کو، جو سب ترک تھے، اس ترکی لشکر کی سرداریاں عطا کیں۔ افشین حیدر کو سپہ سالار اعظم بنایا۔

ان سب سرداروں کے لیے سامرا میں محلات تعمیر کرائے۔ خلیفہ معتصم نے بابک کی قوت اور اس ملک کے پہاڑوں کی دشوار گزاری کا اندازہ کر کے افشین حیدر کو اس طرف روانہ کیا۔ اس کی ماتحتی میں علاوہ ترکی فوج کے خراسانی اور عربی فوجوں کے دستے بھی بھیجے گئے۔ ایک معقول تعداد عام مجاہدین کی بھی بہ غرض جہاد روانہ ہوئی۔ افشین نے وہاں پہنچ کر نہایت ہوشیار اور قابلیت کے ساتھ سلسلہ جنگ شروع کیا۔ معتصم نے افشین کو اس ساز وسامان اور لاؤ لشکر کے ساتھ روانہ کر کے

بعد میں ایتاخ کو اور تازہ دم فوج دے کر بطور کمکی روانہ کیا۔ چند روز کے بعد بغا کبیر کو سامان حرب اور ضروری سامان کے ساتھ روانہ کیا۔ فوج کے تمام مصارف و سامان رسد اور ہر قسم کی ضروریات کے علاوہ دس ہزار درھم روزانہ افشین کے مقرر تھے یعنی ایام محاصرہ اور ایام جنگ میں روزانہ دس ہزار درھم اور جن ایام میں محاصرہ و جنگ نہ ہوا اور افشین اپنے خیمے میں رہے، اس روز پانچ ہزار درھم افشین کو خزانہ خلافت سے علاوہ تنخواہ و وظیفہ کے اس جنگ بابک میں دیے جاتے تھے۔ جنگ بابک کا سلسلہ قریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔

افشین اردبیل پہنچ کر ایک جنگی چوکی قائم کر کے پھر آگے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اسی طرح چوکیاں قائم کرتا گیا تا کہ سامان رسد کے پہنچنے، خطوط و پیغامات کے آنے جانے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو، پھر ان پہاڑوں میں جو بابک کے تصرف میں تھے اور اس کی حفاظت کر رہے تھے، داخل ہو کر فوجوں کو مناسب مقامات پر تقسیم کر کے کہیں جھنڈیوں کے ذریعہ سے اور کہیں قاصدوں کے ذریعہ سے ایک دوسرے کی نقل و حرکت سے باخبر رہنے کا بندوبست کر کے بابک کی فوج کو ہٹاتے اور قلعہ بذ کی طرف پسپا کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ شب خون اور کمین گاہوں کا بڑا اندیشہ تھا۔ اس کا بھی افشین نے کافی خیال رکھا، آب و ہوا اور موسم سرما کی شدت نے عربی و عراقی لوگوں کو زیادہ اور خراسانیوں ورترکوں کو کسی قدر کم ستایا۔

جعفر بن دینار خیاط رضا کاروں اور مجاہدوں کا سپہ سالار تھا۔ اس نے اور بغا واتیخ نے خوب خوب داد جواں مردی دی۔ بابک اور اس کے سپہ سالاروں اذین وطرہ خان وغیرہ نے بھی قابلیت جنگ جوئی خوب دکھائی۔ ابوسعید جو افشین کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں بابک کی فوجوں سے برسر مقابلہ تھا مع اپنے ہمراہیوں کے افشین کی ماتحتی میں کام کرنے لگا تھا۔ اس سلسلہ جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بابک خرمی مغلوب و مجبور ہو کر گرفتار ہوا اور خلیفہ معتصم کی خدمت میں سامرہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ بابک اور اس کے بھائی معاویہ کی گرفتاری ماہ شوال سنہ ۲۲۲ھ کو عمل میں آئی اور افشین ماہ صفر سنہ ۲۲۳ھ میں سامرہ واپس پہنچا۔ خلیفہ معتصم نے فتح اور بابک کی گرفتاری کا حال سن کر فرمان جاری کر دیا کہ ہر منزل پر مقام برزند (آذربائیجان) سے سامرہ تک افشین کے لیے خلیفہ کی طرف سے ایک خلعت اور ایک گھوڑا مع ساز و براق پیش کیا جائے اور اس کا استقبال شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ ہو۔ جب افشین دارالخلافہ سامرہ کے قریب پہنچا تو معتصم نے اپنے بیٹے واثق کو شہر سے

باہر استقبال کے لیے بھیجا۔

جب افشین خلیفہ کے سامنے دربار میں حاضر ہوا تو کرسی زر پر بٹھا کر اس کے سر پر تاج رکھا گیا۔نہایت قیمتی خلعت اور بیس لاکھ درھم بطور انعام اس کو دیے گئے۔ دس لاکھ درھم اس کے علاوہ اس کی فوج میں تقسیم کرنے کے لیے عطا ہوئے۔ بابک کو خلیفہ معتصم کے حکم سے سامرہ میں قتل کیا گیا اور اس کے بھائی کو بغداد میں بھیج دیا گیا، وہ وہاں قتل ہوا۔ دونوں کی لاشوں کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ بابک کا دور دورہ قریباً بیس سال تک رہا۔ اس عرصہ میں اس نے ایک لاکھ پچپن ہزار آدمیوں کو قتل کیا۔ سات ہزار چھ سو مسلمان عورت و مرد اس کی قید سے چھڑائے گئے۔ بابک کے اہل وعیال میں سے سترہ مرد اور تیس عورتیں افشین نے گرفتار کیں۔

فتح عموریہ اور جنگ روم:

بابک خرمی جب اسلامی لشکر کے محاصرہ میں آ کر بہت تنگ اور مجبور ہوا تو اس نے ایک خط نوفل بن میکائیل قیصر روم کے نام روانہ کیا۔ اس میں لکھا کہ ''معتصم نے اپنی تمام وکمال فوجیں میرے مقابلہ پر روانہ کر دی ہیں۔ بغداد و سامرہ اور تمام صوبے اس وقت فوجوں سے خالی ہیں اور تمام سرداران لشکر میرے مقابلہ پر مصروف پیکار ہیں۔ آپ کو اس سے بہتر کوئی دوسرا موقع نہیں مل سکتا۔ آپ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں اور اسلامی علاقہ کو فتح کرتے ہوئے بغداد تک چلے جائیں۔'' بابک کا مدعا یہ تھا کہ اگر قیصر روم نے حملہ کر دیا تو اسلامی فوج کے دو طرف تقسیم ہونے سے میرے اوپر کا دباؤ کم ہو جائے گا۔ قیصر اس خط کو پڑھ کر ایک لاکھ فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا مگر اس وقت بابک کی جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اسلامی لشکر پوری طاقت سے اس کے سدراہ ہوسکتا تھا۔ چنانچہ نوفل نے سب سے پہلے زبطرہ پر شب خون مارا اور وہاں کے مردوں کو جو مقابلہ پر آئے، قتل کر ڈالا اور عورتوں، بچوں کو گرفتار کر کے لے گیا۔ اس کے بعد ملطیہ کی طرف متوجہ ہوا اور وہاں بھی یہی طرز عمل اختیار کیا۔

معتصم کے پاس ۲۹ ربیع الثانی سنہ ۲۲۳ھ کو زبطرہ اور ملطیہ کے مفتوح و برباد ہونے کی خبر پہنچی۔ اس خبر کو بیان کرنے والے نے یہ بھی کہا کہ ایک ہاشمیہ عورت کو رومی کشاں کشاں لیے جاتے تھے اور وہ ''معتصم، معتصم'' پکارتی جاتی تھی۔ یہ سنتے ہی معتصم ''لبیک، لبیک'' کہتا ہوا تخت خلافت

سے اٹھ کھڑا ہوا اور فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر کوچ کا نقارہ بجوا دیا۔ لشکر اور سرداران لشکر اور مجاہدین کا ایک کثیر گروہ معتصم کے ہمرکاب تھا۔ معتصم نے عجیف بن عنبسہ اور عمر فرخانی کو تیز رو سواروں کے دستے دے کر آگے روانہ کر دیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو، زبطرہ پہنچ کر وہاں کے لوگوں کو اطمینان دلائیں اور رومیوں کو مار بھگائیں۔ یہ دونوں سردار زبطرہ میں پہنچے تو رومی ان کے پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہو چکے تھے۔

ان کے بعد خلیفہ معتصم بھی مع لشکر پہنچ گیا۔ وہاں خلیفہ نے معلوم کیا کہ رومیوں کا سب سے زیادہ مشہور و مضبوط اور اہم شہر کون سا ہے؟ وہاں لوگوں نے کہا کہ آج کل شہر عموریہ سے زیادہ مضبوط و مستحکم قلعہ و شہر دوسرا نہیں، اور وہ اس لیے بھی زیادہ اہم شہر ہے کہ قیصر روم نوفل کی جائے پیدائش ہے۔ معتصم نے کہا کہ زبطرہ میری جائے پیدائش ہے، اس کو قیصر نے غارت کیا ہے تو میں اس کے جواب میں اس کی جائے پیدائش یعنی عموریہ کو برباد کروں گا۔ چنانچہ اس نے اس قدر آلات جنگ اور سامان حرب فراہم کیا کہ اس سے پہلے کبھی فراہم نہ ہوا تھا، پھر اس نے مقدمۃ الجیش کی افسری اشناس کو دی۔ محمد بن ابراہیم بن مصعب کو اس کا کمکی مقرر کیا۔ میمنہ پر ایتاخ کو اور میسرہ پر جعفر بن دینار خیاط کو مقرر کیا۔ قلب کی افسری عجیف بن عنبسہ کو دی۔ اس انتظام کے بعد بلاد روم میں داخل ہوا۔ ان تمام افواج کی اعلیٰ سپہ سالاری عجیف بن عنبسہ کو سپرد کی۔ مقام سلوقیہ پہنچ کر نہر س کے کنارے ڈیرے ڈال دیے۔ یہ مقام طرطوس سے ایک دن کی مسافت کے فاصلہ پر تھا۔ یہاں یہ بات بھی ذکر کرنے کے قابل ہے کہ خلیفہ معتصم باللہ نے افشین کو آرمینیا و آذربائیجان کا گورنر بنا کر آرمینیا کی جانب بھیج دیا تھا۔ افشین آرمینیا سے اپنا لشکر لے کر بلاد روم میں داخل ہوا۔ لشکر اسلام کے ایک دستے نے آگے بڑھ کر مقام انگورہ کو فتح کیا اور وہاں سے غلہ کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے ہاتھ آیا، جس کی مسلمانوں کو سخت ضرورت تھی۔ قیصر روم نے لشکر اسلام کے آنے کی خبر سن کر مقام انگورہ پر ہی مقابلہ کرنا چاہتا تھا اور یہیں ہر قسم کا سامان و غلہ فراہم تھا لیکن یہاں کی متعینہ فوج میں اس کے افسر میں اتفاقاً ناچاقی ہوئی اور فوج ناراض ہو کر پیچھے واپس چلی گئی۔ اس عرصہ میں قیصر خود سرحد آرمینیا کی طرف افشین کو روکنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہاں سے شکست کھا کر انگورہ کی طرف لوٹا تو یہاں مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس حالت میں وہ مجبوراً عموریہ کی طرف متوجہ ہوا اور وہیں ہر قسم کی تیاری اور معرکہ آرائی کا سامان فراہم کیا۔ چاروں طرف سے فوجوں کو فراہم کر کے ہر قسم کے آلات

حرب وسامان جنگ کی فراہمی میں مصروف ہو گیا۔ ادھر خلیفہ معتصم نے انگورہ میں قیام کر کے افشین کا انتظار کیا۔ یہیں افشین نے حاضر ہو کر ہمرکابی کا فخر حاصل کیا۔

ماہ شعبان سنہ ۲۲۳ھ کی آخری تاریخوں میں خلیفہ معتصم نے مع فوج مقام انگورہ سے کوچ کیا۔ یہاں سے بہ قصد جنگ روانہ ہوا تو افشین کو میمنہ پر، اشناس کو میسرہ پر مامور کیا اور خود قلب میں رہا۔ غرض لشکر اسلام نے آگے بڑھ کر شہر عموریہ کا محاصرہ کر لیا اور مورچے قائم کر کے ساباط اور دبابوں کے ذریعہ سے فصیل کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ غرض ۶ رمضان سنہ ۲۲۳ھ سے آخر شوال سنہ ۲۲۳ھ تک یعنی ۵۵ روز عموریہ کا محاصرہ رہا۔ بالآخر مسلمانوں نے عموریہ کو فتح کر کے وہاں کے لوگوں کو گرفتار وقتل کیا۔ مال غنیمت کو معتصم نے پانچ روز تک فروخت کرایا۔ پھر جو باقی بچا، سب کو جلا دیا۔ پھر فوج کو حکم دیا کہ عموریہ کو مسمار کر کے زمین کے برابر کر دو۔ چنانچہ فوج نے اس کام کو انجام دے کر عموریہ کو برباد کر دیا۔ قیصر نوفل بھاگ کر قسطنطنیہ چلا گیا اور خلیفہ معتصم نے قیدیوں کو اپنے سپہ سالاروں میں تقسیم کر کے طرطوس کی جانب کوچ کیا۔

عباس بن مامون کا قتل:

عجیف وافشین دونوں سپہ سالاروں میں رقابت تھی۔ خلیفہ معتصم عجیف کے کاموں پر اکثر نکتہ چینی کیا کرتا تھا اور افشین کے مقابلہ میں اس کی بے قدری و بے عزتی ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عجیف کی وفاداری میں فرق آ گیا اور وہ خلیفہ معتصم کے خلاف منصوبے گانٹھنے لگا۔ چنانچہ بلاد روم پر چڑھائی کے وقت اس نے عباس بن مامون سے جو اس سفر میں ساتھ تھا، کہا کہ آپ نے بڑی غلطی کی کہ معتصم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اگر آپ خود خلیفہ بننے کی خواہش کرتے تو تمام سرداران فوج آپ کی حمایت پر آمادہ تھے۔ عباس کو اس تحریک وترغیب سے کچھ خیال پیدا ہوا اور عجیف نے اسی قسم کے تذکرے بار بار کر کے عباس کو خروج پر آمادہ کر لیا۔ تجویز یہ ہوئی کہ پوشیدہ طور پر اول سرداران لشکر کو ہم خیال بنایا جائے اور پھر بیک وقت معتصم، افشین اور اشناس کو قتل کر کے عباس کی خلافت کا اعلان کر دیا جائے۔ اس تجویز پر کاربند ہو کر اول بہت سے لشکر کو عباس کی خلافت پر آمادہ کر لیا گیا مگر فتح عموریہ کے بعد وہاں سے واپس ہوتے ہوئے راستے میں معتصم کو اس سازش کا حال معلوم ہو گیا۔

معتصم نے اول عباس کو بلا کر قید کر لیا اور افشین کے سپرد کر دیا، پھر مشاء بن سہل عمر فرغانی اور

عجیف کو بھی یکے بعد دیگرے گرفتار کر کے قید کر لیا۔ اول مشاء بن سہل کو قتل کیا، پھر مقام بنج میں پہنچ کر عباس بن مامون کو ایک بورہ میں بھر کر سی دیا۔ اسی حالت میں دم گھٹ کر وہ مر گیا، پھر مقام نصیبین میں پہنچ کر ایک گڑھا کھدوایا اور عمر فرغانی کو اس میں زندہ دفن کر دیا، پھر موصل میں پہنچ کر عجیف کو بھی ایک بورہ میں بھر کر سی دیا، جس سے دم گھٹ کر وہ بھی مر گیا۔ سامرہ میں داخل ہو کر خلیفہ مامون الرشید کی بقیہ اولاد کو گرفتار کرا کر سب کو ایک مکان میں قید کر دیا، یہاں تک کہ وہ سب وہیں مر گئے۔ غرض اس سفر میں خلیفہ معتصم نے چن چن کر ہر ایک اس شخص کو جس پر ذرا بھی بغاوت کا شبہ ہوا، قتل کر کے قصہ پاک کیا۔

بغاوت طبرستان:

مازیار بن قارن رئیس طبرستان، عبداللہ بن طاہر گورنر خراسان کا ماتحت اور خراج گزار تھا۔ اس کے اور عبداللہ بن طاہر کے درمیان کسی بات پر ناراضی پیدا ہوئی۔ مازیار نے کہا کہ میں براہ راست خراج دارالخلافہ میں بھیج دیا کروں گا لیکن عبداللہ بن طاہر کو ادا نہ کروں گا۔ عبداللہ بن طاہر اس بات کو اپنے وقار گورنری کے خلاف سمجھ کر ناپسند کرتا تھا۔ چند روز تک یہی جھگڑا رہا اور مازیار خراج براہ راست دارالخلافہ میں بھیجتا اور وہاں سے عبداللہ بن طاہر کے وکیل کو وصول ہوتا رہا۔

جنگ بابک کے زمانے میں افشین کو آزادانہ خرچ کرنے کا اختیار تھا اور اس کے پاس برابر معتصم ہر قسم کا سامان اور روپیہ بھجواتا رہتا تھا۔ افشین اپنی فوج کے لیے نہایت کفایت شعاری کے ساتھ سامان اور روپیہ خرچ کرتا تھا۔ باقی تمام روپیہ اور سامان اپنے وطن اشروسنہ (علاقہ ترکستان) کو روانہ کر دیتا تھا۔

یہ سامان جو آذربائیجان سے بھیجا جاتا تھا، خراسان سے ہو کر گزرتا تھا۔ عبداللہ بن طاہر کو جب یہ معلوم ہوا کہ افشین برابر اپنے وطن کو سامان رسد، سامان حرب اور روپیہ بھجوا رہا ہے تو اس کو شبہ پیدا ہوا۔ اس نے ان سامان لے جانے والوں کو گرفتار کر کے قید کر دیا اور تمام سامان و روپیہ چھین کر اپنے قبضے میں رکھا اور افشین کو لکھ بھیجا کہ آپ کے لشکر سے کچھ لوگ اس قدر سامان لیے ہوئے جا رہے تھے، میں نے ان کو گرفتار کر کے قید کر دیا ہے اور سامان اپنی فوج میں تقسیم کر دیا ہے، کیونکہ میں ترکستان پر چڑھائی کی تیاری کر رہا ہوں۔ اگرچہ ان لوگوں نے یہ کہا کہ ہم چور نہیں ہیں اور اپنے

آپ کو آپ کا فرستادہ بتایا لیکن ان کا یہ بیان قطعاً غلط اور جھوٹ معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر یہ چور نہ ہوتے تو آپ مجھ کو ضرور اطلاع دیتے۔ اس خط کو دیکھ کر افشین بہت شرمندہ ہوا اور عبداللہ بن طاہر کو لکھا کہ وہ لوگ چور نہیں ہیں بلکہ میرے ہی فرستادہ تھے۔ عبداللہ بن طاہر نے افشین کے اس خط کو دیکھ کر ان لوگوں کو چھوڑ دیا مگر سامان جو ان سے چھینا تھا، وہ نہیں دیا۔

اس امر کی ایک خفیہ رپورٹ عبداللہ بن طاہر نے خلیفہ معتصم کے پاس بھی بھیج دی، جس پر بہ ظاہر خلیفہ معتصم نے کوئی التفات نہیں کیا۔ حقیقت یہ تھی کہ افشین اپنی ریاست وسلطنت اشروسنہ میں قائم کرنا چاہتا تھا اور اسی لیے وہ پیشتر سے تیاری کر رہا تھا۔ جب افشین جنگ بابک سے فارغ ہو کر سامرا میں واپس آیا تو اس کو توقع تھی کہ خلیفہ معتصم مجھ کو خراسان کی گورنری عطا کرے گا اور اس طرح مجھ کو بہ خوبی موقع مل جائے گا کہ میں اپنی سلطنت وحکومت کے لیے بہ خوبی تیاری کر سکوں لیکن خلیفہ معتصم نے اس کو آرمینیا و آذربائیجان کی حکومت پر مامور کیا اور امید خراسان کا خون ہو گیا۔

اس کے بعد ہی جنگ روم پیش آ گئی۔ افشین کو اس لڑائی میں بھی شریک ہونا پڑا مگر اس جنگ میں معتصم خود موجود تھا اور اس نے ابتدا میں اگر کسی کو سپہ سالار اعظم بنایا تھا تو وہ عجیف تھا جو اپنے آپ کو افشین کا مدمقابل اور رقیب سمجھتا تھا۔ عجیف کا جو انجام ہوا، وہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ اب افشین نے ایک اور تدبیر سوچی۔ وہ یہ کہ مازیار حاکم طبرستان کو پوشیدہ طور پر ایک خط بھیجا اور عبداللہ بن طاہر کے مقابلہ پر ابھارا، اس خط کا مضمون یہ تھا:

”دین زردشتی کا کوئی ناصر ومددگار میرے اور تمہارے سوا نہیں۔ بابک بھی اسی دین کی حمایت میں کوشاں تھا لیکن وہ محض اپنی حماقت کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوا اور اس نے میری نصیحتوں پر مطلق توجہ نہ کی۔ اس وقت بھی ایک زریں موقع حاصل ہے۔ وہ یہ کہ تم علمِ بغاوت بلند کر دو۔ یہ لوگ تمہارے مقابلے کے لیے میرے سوا یقیناً کسی دوسرے کو مامور نہ کریں گے۔ اس وقت میرے پاس سب سے زیادہ طاقتور اور زبردست فوج ہے۔ میں تم سے سازش کر لوں گا اور ہم دونوں متفق ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہمارے مقابلہ پر مغاربہ، عرب اور خراسانیوں کے سوا اور کوئی نہ آئے گا۔ مغاربہ کی تعداد بہت ہی قلیل ہے، ان کے مقابلہ کے لیے ہماری فوج کا ایک معمولی دستہ کافی ہوگا۔ عربوں کی حالت یہ ہے کہ ایک لقمہ ان کو دے دو اور پتھروں سے ان کا سر خوب کچلو۔ خراسانیوں کا جوش دودھ کا سا

ابال ہے، اٹھا اور فرو ہو گیا۔ تھوڑے سے استقلال میں ان کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ تم اگر ذرا ہمت کرو تو وہی مذہب جو ملوک عجم کے زمانے میں تھا، پھر قائم و جاری ہو سکتا ہے۔‘‘

مازیار اس خط کو پڑھ کر خوش ہوا اور اس نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ رعایا سے ایک سال کا پیشگی خراج وصول کر کے سامان حرب کی فراہمی اور قلعوں کی مرمت و درستی سے فارغ ہو کر بڑی سے بڑی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو بیٹھا۔ عبداللہ بن طاہر کو جب مازیار کی بغاوت و سرکشی کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے چچا حسن بن حسین کو ایک لشکر کے ساتھ اس طرف روانہ کیا۔ ادھر معتصم کو اس بغاوت کا حال معلوم ہوا تو اس نے دارالخلافہ اور دوسرے مقامات سے عبداللہ بن طاہر کی امداد کے لیے فوجوں کی روانگی کا حکم صادر کیا مگر افشین کو اس طرف جانے کا حکم نہیں دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مازیار گرفتار ہو کر عبداللہ بن طاہر کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ عبداللہ بن طاہر نے اس کو معتصم کی خدمت میں روانہ کر دیا اور معتصم نے اس کو جیل خانے بھیج دیا۔ حسن بن حسین نے جب مازیار کو گرفتار کیا تو اتفاق سے افشین کا مذکورہ اور اس کے علاوہ اسی مضمون کے اور بھی خطوط جو افشین نے مازیار کے پاس بھیجے تھے، مازیار کے پاس سے برآمد ہوئے۔ عبداللہ بن طاہر نے یہ خطوط بھی خلیفہ معتصم کے پاس بھیج دیے مگر خلیفہ معتصم نے ان خطوط کو لے کر اپنے پاس بہ حفاظت رکھ تو لیا اور بہ ظاہر کوئی التفات اس طرف نہیں کیا۔ یہ واقعہ سنہ ۲۲۴ھ کا ہے۔

بغاوت کردستان:

ادھر طبرستان کی بغاوت ابھی فرو نہ ہونے پائی تھی کہ نواح موصل میں جعفر بن فہر نامی ایک کرد نے کردوں کا ایک گروہ کثیر اپنے گرد جمع کر کے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اس صوبہ کی سرحد اگرچہ صوبہ آذربائیجان و آرمینیا سے ملتی تھی مگر معتصم نے عبداللہ بن سعید بن انس کو جعفر کی سرکوبی پر مامور کیا اور افشین کو اس مہم پر نہیں بھیجا۔ عبداللہ بن سعید نے پہنچ کر صف آرائی شروع کی۔ ان لڑائیوں کا سلسلہ سنہ ۲۲۴ھ کے ختم ہونے پر بھی ختم نہ ہوا۔ آخر معتصم نے اپنے ایک سپہ سالار ایتاخ کو نہایت زبردست لشکر کے ساتھ روانہ کیا اور جعفر بن فہر لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے ہمراہی گرفتار و مقتول ہوئے۔ یہ بغاوت بھی غالباً افشین کے اشارے سے ظہور میں آئی جو سنہ ۲۲۵ھ میں ختم ہوئی۔

بغاوت آرمینیا و آذربائیجان:

افشین اپنے ایک رشتہ دار کو جس کا نام منکجور تھا، اپنا قائم مقام بنا کر اور آذربائیجان کی حکومت سپرد کر کے خود دارالخلافہ میں سکونت پذیر تھا۔ منکجور کو آذربائیجان کے کسی قصبہ میں بابک خرمی کا بہت سا خزانہ مل گیا۔ منکجور نے اس کی اطلاع خلیفہ کو نہیں کی اور خود اپنا قبضہ کر لیا۔ معتصم کے پرچہ نویس نے اس کی اطلاع معتصم کو دی۔ منکجور کو اس کا حال معلوم ہوا تو وہ پرچہ نویس کے قتل پر آمادہ ہو گیا۔ پرچہ نویس نے باشندگان اردبیل سے پناہ طلب کی۔ اہل اردبیل نے منکجور کو اس حرکت سے باز رکھنا چاہا تو وہ ان کے بھی درپے قتل ہو گیا۔ معتصم کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے منکجور کی معزولی کا فرمان افشین کے پاس بھیج دیا اور بغا کبیر کو بجائے منکجور کے مع فوج آذربائیجان کی طرف روانہ کر دیا۔ منکجور یہ سن کر کہ میں معزول ہو گیا ہوں اور میری بجائے بغا کبیر آ رہا ہے، بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ اردبیل سے نکل کر معرکہ آرا ہوا۔ اس لڑائی میں منکجور کو شکست ہوئی اور بغا نے آگے بڑھ کر اردبیل پر قبضہ کیا۔ منکجور فرار ہو کر آذربائیجان کے کسی ایک قلعہ میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہا۔ قریباً ایک مہینہ قلعہ بند رہا۔ آخر اس کے ہمراہیوں میں سے ایک شخص نے بہ حالت غفلت اس کو گرفتار کر کے بغا کبیر کے سپرد کر دیا۔ بغا کبیر اس کو لیے ہوئے سامرا میں واپس آیا اور خلیفہ معتصم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ خلیفہ نے اس کو جیل خانے بھجوا دیا۔

افشین کی ہلاکت:

مندرجہ بالا واقعہ سے افشین کے متعلق خلیفہ معتصم کا شبہ اور بھی زیادہ یقین سے بدل گیا اور افشین کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا کہ خلیفہ مجھ سے بدگمان ہو گیا ہے۔ چنانچہ افشین نے دارالخلافہ سے نکلنے اور بھاگ جانے کی تدبیریں سوچنی شروع کیں۔ اول اس نے ارادہ کیا کہ میں خود اپنے صوبہ آذربائیجان و آرمینیا کی طرف جا کر وہاں سے بلاد خزر کی طرف ہوتا ہوا اپنے وطن اشروسنہ (ماوراء النہر) چلا جاؤں لیکن اس ارادے میں اس لیے کامیابی نہ ہوئی کہ خلیفہ معتصم نے منکجور کی جگہ خود اپنی طرف سے افشین کا قائم مقام تجویز کر کے بھیج دیا تھا اور افشین جانتا تھا کہ آذربائیجان میں وہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔

آخر اس نے ارادہ کیا کہ میں خلیفہ اور تمام اراکین و سرداران سلطنت کی ضیافت کروں۔ تمام

دن ان لوگوں کو کھانے پینے میں مصروف رکھوں، شام ہوتے ہی یہ سب لوگ دن بھر مصروف ومشغول رہنے کے سبب سے سو جائیں گے اور میں موقع پا کر شام ہوتے ہی نکل جاؤں گا اور پھر کسی کے ہاتھ نہ آؤں گا۔ ابھی وہ کوئی مستقل رائے قائم نہ کرنے پایا تھا کہ اتفاقاً اس کو اپنے راز دار خادم پر کسی وجہ سے غصہ آیا اور اس کو سخت سست کہا۔ اس خادم نے فوراً ایتاخ کے پاس آ کر افشین کے تمام ارادوں کی اطلاع کر دی۔ ایتاخ اسی وقت اس خادم کو لے کر خلیفہ معتصم کے پاس آیا اور کہا کہ افشین فرار ہونے کی تیاری کر رہا ہے۔ معتصم نے اسی وقت افشین کو طلب کیا اور درباری لباس اتروا کر قید خانہ میں بھجوا دیا اور کسی قسم کی کوئی بے تابی ظاہر نہیں کی۔ اس کے بعد خلیفہ معتصم نے فوراً عبداللہ بن طاہر گورنر خراسان کو لکھا کہ تم فوراً افشین کے بیٹے حسن بن افشین کو جو ماوراء النہر کے علاقے کا والی اور اشروسنہ میں مقیم ہے، گرفتار کر کے بھیج دو۔ حسن بن افشین اکثر نوح بن اسد والی بخارا کی شکایت کیا کرتا تھا۔

عبداللہ بن طاہر نے حسن بن افشین کو لکھا کہ ہم نے بخارا کی حکومت بھی تم کو سپرد کی، تم بخارا میں جا کر اور ہمارا یہ حکم دکھا کر نوح بن اسد سے بخارا کی حکومت کا چارج لے لو۔ حسن بن افشین اس تحریر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور فوراً بخارا کی طرف چل دیا۔ عبداللہ بن طاہر نے نوح بن اسد والی بخارا کو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ ہم نے اس بہانے سے حسن بن افشین کو تمہارے پاس بھیجا ہے۔ تم اس کو بخارا میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لینا اور گرفتار کر کے ہمارے پاس بھیج دینا۔ چنانچہ اس ترکیب سے حسن بن افشین گرفتار ہو کر مرو میں عبداللہ بن طاہر کے پاس آیا۔

عبداللہ بن طاہر نے اس کو معتصم کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ جب حسن بن افشین گرفتار ہو کر آ گیا تو خلیفہ معتصم نے اپنے وزیر اعظم محمد بن عبدالملک، قاضی احمد بن ابی داؤد، اسحاق بن ابراہیم اور دوسرے اراکین سلطنت کی ایک جماعت مرتب کر کے حکم دیا کہ تم سب مل کے افشین کے معاملہ کی تحقیقات کرو اور وہ جس سزا کا مستحق ہو، وہی سزا اس کو دو۔ اگرچہ خلیفہ معتصم اپنے حکم سے اسے فوراً قتل کرا سکتا تھا لیکن اس میں اندیشہ تھا کہ کہیں درپردہ بعض سردار اس کے شریک سازش نہ ہوں۔ لہٰذا اس نے یہ نہایت ہی عاقلانہ روش اختیار کی۔ اس طرح افشین کے قتل پر فوج میں کسی قسم کا جوش معتصم کے خلاف پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

معتصم، افشین کی بدنیتی سے خوب واقف ہو چکا تھا اور جنگ بابک کے دوران میں ہی اس کو

اس بات کی اطلاع ہو چکی تھی کہ افشین اپنے بیٹے کے پاس جس کو وہ پہلے سے اپنے وطن اشروسنہ کا عامل مقرر کرا چکا تھا، شاہی مال واسباب چرا کر اور چھپا کر بھجوا رہا ہے لیکن اس وقت افشین ایک ایسے دشمن کے مقابلہ پر معرکہ آراء تھا جو بیس سال سے مغلوب نہ ہو سکا تھا۔ لہٰذا معتصم بالکل خاموش رہا۔ جنگ بابک کی کامیابی کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا۔ لہٰذا جنگ بابک کے بعد افشین کو انعام واکرام سے محروم رکھنا اور اس کی بد دیانتی کا مواخذہ کرنا خود معتصم کے لیے زہر ہلاہل کا حکم رکھتا تھا اور اس کی بدنامی و قدردانی کی شہرت کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔ نیز یہ کہ افشین کی نسبت اصلاح کی بھی توقع تھی مگر جب افشین کے خطوط اور طرز عمل نے اس کی غداری کو ثابت کر دیا تو معتصم کے لیے یہی مناسب تھا جو اس نے کیا۔

وزیر اعظم اور دوسرے سرداروں کی مجلس نے افشین کے مقدمہ کو بڑی احتیاط اور باقاعدگی کے ساتھ سننا اور تحقیق کرنا شروع کیا۔ قید خانے سے روزانہ افشین اس کچہری میں لایا جاتا اور اس کی موجودگی میں گواہوں کے بیانات وثبوت کے کاغذات پیش کیے جاتے تھے۔ مازیار جواب تک قید میں تھا، افشین کے سامنے لایا گیا۔ افشین کے خطوط افشین کو دکھائے اور سنائے گئے۔ افشین نے سب کا اقرار کیا اور مازیار نے بھی صاف صاف حقیقت بیان کر دی، پھر افشین کے متعلق وہ باتیں پیش ہوئیں جن سے اس کا منافق وکافر ہونا ثابت ہوا۔ مثلاً اس کا قرآن، مساجد اور ائمہ مساجد کی بے حرمتی کرنا، زردشتی صحیفوں کی روزانہ تلاوت کرنا اور ان کو ہمہ اوقات اپنے ساتھ رکھنا، اسلام اور نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنا اور بہ ظاہر مسلمانوں میں شامل رہ کر نمازیں بھی ادا کرنا، شعائر اسلامی پر عامل رہنا۔ غرض نہایت پختہ، قطعی اور یقینی طور پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ افشین دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا بلکہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور حکومت اسلامیہ کا تختہ الٹ کر مجوسی سلطنت قائم کرنے کی تدابیر میں مصروف ومنہمک تھا۔ اس مقدمہ کی سماعت نہایت اطمینان کے ساتھ ختم ہوئی اور آخری فیصلہ یہ ہوا کہ مازیار کو چار سو درے لگائے جائیں اور افشین کو سزائے موت دی جائے۔ چنانچہ مازیار چار سو درے برداشت نہ کر سکا اور اسی سزا سے مر گیا۔ افشین کو سولی دے دی گئی اور اس کی لاش عبرت دلانے کے لیے منظر عام پر لٹکائی گئی۔ یہ واقعہ ماہ شعبان سنہ ۲۲۶ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ افشین کی جگہ اسحاق بن یحییٰ بن معاذ کو سپہ سالاری کی خدمت سپرد کی گئی۔

معتصم کی وفات:

افشین کے خطرے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد خلیفہ معتصم باللہ نے اپنے ممالک مقبوضہ کی سرحدات کی جانب سے اطمینان حاصل کیا اور جب تحقیق ہو گیا کہ اب کسی قسم کا بدامنی و بغاوت کا خطرہ باقی نہیں تو اس نے کہا کہ جب تک بنوامیہ بادشاہ اور خلیفہ رہے، ہم کو مطلق بادشاہی اور حکومت سے حصہ حاصل نہ ہوا لیکن ہم کو خلافت حاصل ہوئی تو بنوامیہ کی حکومت وسلطنت پھر بھی اندلس میں قائم ہے۔ لہٰذا اب مجھ کو دیار مغرب کی طرف فوج کشی کر کے اندلس کی حکومت بنوامیہ سے چھین لینی چاہیے۔ چنانچہ اس نے اپنے خزانہ اور اخراجات جنگ اور خرچ سفر کا اندازہ کرایا اور اندلس پر فوج کشی کی تیاری شروع کی۔ انہیں ایام میں خبر پہنچی کہ ابوحرب یمانی نے جو فلسطین میں سکونت پذیر تھا اور اپنے آپ کو بنوامیہ کے خاندان سے بتاتا تھا، اس نے اپنے گرد ایک لاکھ آدمی جمع کر لیے ہیں اور علمِ بغاوت بلند کرنا چاہتا ہے۔

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ ابوحرب جو فلسطین میں رہتا تھا، ایک روز کہیں باہر گیا ہوا تھا کہ ایک لشکری اس کے مکان میں اترنے اور قیام کرنے پر آمادہ ہوا۔ عورتوں نے اس کو منع کیا۔ لشکری نے عورتوں کو مارا اور زبردستی مکان کے مردانہ حصہ میں قیام کر دیا۔ ابوحرب جب باہر آیا اور لشکری کی اس زیادتی کا حال سنا تو لشکری پر حملہ آور ہو کر اسے قتل کر دیا اور خود حکام وقت کے خوف سے بھاگ کر علاقہ اردن کے پہاڑوں میں چلا گیا۔ اپنے چہرہ پر ایک نقاب ڈال لیا اور دیہاتیوں میں وعظ و پند کا سلسلہ جاری کیا۔ لوگ اس کے معتقد ہو گئے۔ اس نے اپنے وعظ و نصیحت میں خلیفہ وقت کے معائب بھی بیان کر دیے۔ اس طرح ایک لاکھ آدمی اس کے معتقد ہو گئے اور اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر خلیفہ وقت کے خلاف جنگ کرنے پر مستعد ہو گئے۔ معتصم نے رجاء بن ایوب کو ایک ہزار سوار دے کر اس کی سرکوبی پر مامور کیا لیکن رجاء بن ایوب نے ابوحرب کے ہمراہیوں کی کثرت سے مرعوب ہو کر لڑائی کو چھیڑنے میں تامل کیا اور اس بات کا انتظار کرنا مناسب سمجھا کہ کاشت کاری وزراعت کے کاموں کا زمانہ آ جائے اور ابوحرب کے ہمراہی جو عموماً زراعت پیشہ لوگ ہیں، اپنے کھیتوں کی طرف متوجہ ہو کر منتشر ہو جائیں تو پھر حملہ کروں۔ اسی حالت میں ۲۰ ربیع الاول سنہ ۲۲۷ھ کو خلیفہ معتصم باللہ نے وفات پائی اور بنوامیہ کے ساتھ زور آزمائی کا ارادہ تکمیل کو نہ پہنچ

سکا۔ خلیفہ معتصم کے بعد اس کا بیٹا واثق باللہ عباسی سریر آرائے سلطنت ہوا اور لوگوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ معتصم کے جنازے کی نماز واثق باللہ نے پڑھائی اور سامرا میں اس کو دفن کیا۔

خلافت معتصم کی خصوصیات:

خلیفہ معتصم چونکہ خود پڑھا لکھا آدمی نہ تھا، اس لیے اس کے عہد خلافت میں وہ علمی سرگرمیاں جو ہارون و مامون کے زمانے میں زور شور سے شروع ہو کر ترقی پذیر تھیں، مدھم پڑ گئیں۔ معتصم کو فتوحات ملکی اور جنگی و پیکار کا زیادہ شوق تھا۔ اس کے زمانے میں روم، بلاد خزر، ماوراء النہر، کابل اور سیستان وغیرہ کی طرف خوب فتوحات حاصل ہوئیں۔ قیصر روم پر اس نے ایسی کاری اور زبردست ضرب لگائی کہ اب تک مسلمانوں کی طرف سے ایسی ضرب نہیں لگائی گئی تھی۔ جنگ روم اور فتح عموریہ میں معتصم نے تیس ہزار رومیوں کو قتل اور تیس ہزار کو گرفتار کر کے رومیوں کو بے حد خوف زدہ بنا دیا تھا۔ معتصم کے دروازے پر جتنے بادشاہ جمع ہوئے، اس قدر کسی خلیفہ کے دروازے پر جمع نہ ہوئے تھے۔ معتصم کو عمارات بنانے کا بھی شوق تھا۔ ایک ہزار دینار روزانہ اس کے باورچی خانہ کا خرچ تھا۔

معتصم کو ترکی غلاموں کے خریدنے اور ان کی جمعیت بڑھانے کا خاص شوق تھا۔ اس نے اپنے خاص خاص ترکی غلاموں کو بڑی بڑی سپہ سالاریاں سپرد کر رکھی تھیں۔ اس کے زمانے میں ترکوں نے بہت ترقی کی اور وہ بہت جلد شائستہ و ذی حوصلہ بن کر اولوالعزمی دکھانے لگے۔ بہ ظاہر معتصم نے ترکی فوجوں کے بڑھانے اور ترکوں کو ترقی دینے میں خراسانیوں کا زور گھٹانا چاہا تھا جو اس سے پہلے عربوں کے زور کو گھٹا اور مٹا چکے تھے لیکن بعد میں یہی ترک خلافت عباسیہ کی بربادی کا موجب ہوئے۔ معتصم سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے ایک تیسری قوم کو زندہ و طاقتور بنایا۔ حالانکہ اس کو چاہیے تھا کہ وہ عربوں کو کسی قدر سہارا دے کر پھر خراسانیوں کا مدمقابل بنا دیتا لیکن چونکہ اس کے باپ دادا شروع ہی سے عربوں کو اپنا دشمن سمجھتے اور خراسانیوں کو قابل اعتماد سمجھ کر عربوں کو ناقابل اعتماد سمجھتے رہے تھے، لہٰذا اس کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنے خاندان کی قدیمی راہ عمل کو مکمل درہم برہم کر دے۔

معتصم خراسانیوں کی بغاوتوں اور سازشوں کے حالات بھی سن چکا تھا اور جانتا تھا کہ اس کے باپ دادا کو کس طرح خراسانیوں کی سازش کا بار بار مقابلہ کرنا پڑا ہے، نیز یہ بھی جانتا تھا کہ علویوں کو

جو ہمارے قدیمی رقیب ہیں، خراسانیوں اور عربوں دونوں میں رسوخ حاصل ہے اور دونوں سے وہ ہمارے خلاف قوت و امداد حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لیے معتصم نے اگر ایک قوم کو جس پر علویوں کا اثر نہ تھا، طاقتور بنایا تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا لیکن اس تیسری قوم یعنی ترکوں کو ابھی تک اسلام سے بوجہ اپنی جہالت و وحشت کے کوئی انس اور قومی تعلق پیدا نہ ہوا تھا۔ ترکوں کو اگرچہ مغلوب ومحکوم تو عرصہ دراز سے بنایا جا چکا تھا لیکن ان میں اسلام کی اشاعت کما حقہ نہیں کی گئی تھی، جس کا ایک سبب یہ تھا کہ ترکوں کے علاقے پر جس کو ماوراء النہر کہا جاتا تھا، عموماً ترک سردار ہی با اختیار رئیسوں کی طرح حکومت کرتے اور حکومت اسلامیہ کو خراج ادا کرتے تھے۔

ان نو مسلم ترکوں نے یکا یک ترقی کر کے جب دیکھا کہ خلافت اسلامیہ کی سب سے زبردست فوج ہم ہی ہیں تو وہ خلافت اسلامیہ کا تختہ الٹ دینے کے خواب دیکھنے لگے۔ جیسا کہ افشین کے حالات سے ثابت ہے کہ خلیفہ معتصم اگرچہ جاہل تھا مگر عاقل تھا۔ اس نے ترکوں کو فوج میں بھرتی کرنے اور طاقتور بنانے کا جو طرز عمل اختیار کیا تھا، اس کی خرابی کو دور کرنے اور خرابی کو مٹا دینے کی اس میں پوری قابلیت موجود تھی۔ اسی لیے اس کے سامنے ترکوں کے ہاتھ سے حکومت اسلامیہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکا۔ اگر اس کے جانشین بھی اسی قابلیت کے ہوتے یا معتصم کو زیادہ مدت تک خلافت وحکومت کا موقع ملتا تو یہ خرابیاں جو بعد میں پیدا ہوئیں، شائد پیدا نہ ہوسکتیں۔

اگر سچ پوچھا جائے تو یہ سب وہمی اور خیالی باتیں ہیں۔ اصل خرابی اور سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ مسلمانوں میں حکومت اسلامیہ کے لیے وراثت کی لعنت کو تسلیم کر لیا گیا تھا اور باپ کے بعد بیٹے کا حقدار خلافت ہونا مانا جاتا تھا۔ اس بدعت سیہ نے اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان پہنچایا اور صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کی سنت کو بھلا دینے نے مسلمانوں کو یہ دن دکھایا، انا للہ وانا الیہ راجعون! بہر حال معتصم کی خلافت کے زمانے سے ترکوں کا دور زندگی شروع ہو جاتا ہے۔

معتصم کو خلیفہ مثمن بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس کے ساتھ آٹھ کے عدد کو خصوصی تعلق تھا۔ معتصم خلیفہ ہارون الرشید کی آٹھویں اولاد تھا۔ وہ سنہ ۱۸۰ھ یا بہ قول دیگر ۱۷۸ھ میں پیدا ہوا۔ ان دونوں سنوں میں آٹھ کا عدد موجود ہے۔ وہ سنہ ۲۱۸ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہاں بھی آٹھ کا عدد موجود ہے۔ معتصم خلفاء عباسیہ میں آٹھواں خلیفہ ہے۔ اس نے ۴۸ سال کی عمر پائی۔ آٹھ لڑکے اور آٹھ لڑکیاں چھوڑیں۔ اس نے آٹھ برس، آٹھ مہینے اور آٹھ دن خلافت کی۔ اس نے آٹھ گھر تعمیر کرائے۔ آٹھ

بڑی بڑی لڑائیاں فتح کیں۔ آٹھ بادشاہ اس کے سامنے دربار میں حاضر کیے گئے۔ افشین، عجیف، عباس، بابک اور مازیار وغیرہ آٹھ بڑے بڑے دشمنوں کو اس نے قتل کرایا۔ آٹھ لاکھ دینار، آٹھ لاکھ درہم، آٹھ ہزار گھوڑے، آٹھ ہزار غلام، آٹھ ہزار لونڈیاں اس نے ترکہ میں چھوڑیں۔ ماہ ربیع الاول کے آٹھ دن باقی تھے کہ فوت ہوا۔

مسئلہ خلق قرآن[1] کا خبط اس کو بھی مثل مامون الرشید کے تھا اور اس غیر ضروری مسئلہ کی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ رہنے سے اکثر علماء کو اس کے ہاتھ سے تکلیفیں پہنچیں۔ یہ عیب اس میں نہ ہوتا تو اس کو خاندان عباسیہ کا سب سے بڑا خلیفہ کہا جا سکتا تھا۔ اس کے زمانے میں خلافت عباسیہ کی شوکت اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی تھی، جس کے بعد اس میں زوال واضمحلال کی علامات نمایاں ہوتی گئیں۔

واثق باللہ

واثق باللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید بن مہدی بن منصور عباسی کی کنیت ابوجعفر یا ابوالقاسم تھی۔ اس کا اصل نام ہارون تھا۔ یہ مکہ کے راستے میں قراطیس نامی ام ولد کے پیٹ سے ۲۰ شعبان سنہ ۱۹۶ھ میں پیدا تھا۔ اس کو اس کے باپ معتصم باللہ نے اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ معتصم کی وفات کے بعد تخت خلافت پر بیٹھا۔ یہ نہایت خوبصورت، گوری چٹی رنگت کا آدمی تھا۔ داڑھی گھنی اور خوبصورت تھی۔ اس کی رنگت میں سفیدی کے ساتھ زردی بھی جھلکتی تھی۔ آنکھوں کی سفیدی میں سیاہ تل بھی

---

[1] ۱۹۸ھ میں مامون بن ہارون الرشید عباسی نے خلافت کی زمام کار سنبھالی۔ معتزلہ کا فرقہ اٹھتا ہے اور دیگر بدعات کی اشاعت کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے مخلوق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور بڑی تیزی سے عوام کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ مامون بھی معتزلہ کے ساتھ ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جب گمراہی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی لہر کو دیکھتے ہیں تو پوری قوت کے ساتھ باطل قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان عمل میں نکلتے ہیں۔ اس مسئلہ میں حق و باطل کی یہ کشمکش کئی سالوں تک جاری رہتی ہے۔ چنانچہ مامون، پھر معتصم، واثق، متوکل ان چار خلفاء کے عہد میں یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ پر چاروں خلفاء کے ادوار میں تعذیب وتشدد کا ایک طوفان برپا رہتا ہے۔ لیکن بامشقت قید وبند کے مصائب اور تضحیک وتشنیع کے سلسلے بھی اللہ کی توفیق سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے پائے استقامت کو متزلزل نہ کر سکے اور وہ فاتح وسرخرو ہو کر تعذیب خانہ سے باہر تشریف لائے۔ یوں باطل کو شکست فاش ہوئی اور حق غالب آیا، فللہ الحمد! تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا دور ابتلا مؤلفہ ڈاکٹر محمد نفش مصری مترجم: الشیخ محمد صادق خلیل

نمودار ہوتا تھا۔ یہ بہت بڑا شاعر اور ادیب تھا۔ عربی ادب میں وہ مامون کا ہم پلہ بلکہ اس سے بھی فائق تھا مگر فلسفہ اور علوم حکمیہ میں مامون سے کمتر تھا۔ اس نے مامون الرشید کی علمی مجلسیں دیکھی تھیں۔ اس کو علم و فضل کا شوق تھا، اسی لیے اس کو مامون صغیر یا مامون ثانی کہتے تھے۔

واثق کو عربی اشعار اس قدر یاد تھے کہ خلفاء عباسیہ میں کسی کو اتنے اشعار یاد نہ تھے۔ اپنے باپ کی طرح کھانے پینے کا اس کو بھی بہت شوق تھا۔ بہت پرخور، خوش خور تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کو بڑے بڑے انعام و صلے دیتا تھا۔ اہل علم کی قدر کرتا تھا اور ان کے ساتھ تعظیم و تکریم کا برتاؤ ضروری سمجھتا تھا مگر خلق قرآن کے مسئلہ کا خبط اپنے باپ سے وراثت میں پایا تھا اور اس معاملہ میں یہاں تک غلو اختیار کیا تھا کہ اکثر بڑے بڑے علماء کو ثواب سمجھ کر اس نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ [1]

آخر عمر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مسئلہ خلق قرآن کے متعلق اس نے اپنی سرگرمی کم یا بالکل موقوف کر دی تھی۔ یہ وہ واقعہ تھا کہ ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن محمد ازدی جو امام ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ کے استاد تھے۔ مسئلہ خلق قرآن کے متعلق مخالف عقیدہ رکھنے کے سبب سے گرفتار ہو کر آئے اور دربار میں پیش ہوئے۔ وہاں قاضی احمد بن ابی داؤد سے جو معتصم کے زمانے سے دربار میں وزیر اعظم کے برابر مرتبہ رکھتے اور خلق قرآن کے قائل تھے، ابوعبدالرحمٰن نے ان سے سوال کیا کہ تم پہلے مجھ کو یہ بتاؤ کہ نبی اکرم ﷺ کو بھی اس کا علم تھا یا نہیں کہ قرآن خلق ہے؟ قاضی احمد نے کہا کہ ہاں نبی اکرم ﷺ کو اس کا علم تھا۔ [2] ابوعبدالرحمٰن نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو قرآن کے مخلوق ہونے کے عقیدہ کی تعلیم دی یا نہیں؟ قاضی احمد نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے تو اس کے متعلق کوئی حکم نہیں فرمایا۔

ابوعبدالرحمٰن نے کہا کہ جس عقیدہ کی نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو تعلیم نہیں دی اور باوجود علم رکھنے کے لوگوں کو اس کے ماننے پر مجبور نہیں کیا، تم اس کے متعلق لوگوں کی خاموشی کو کیوں کافی نہیں سمجھتے اور ان کو کیوں اس کے ماننے اور اقرار کرنے پر مجبور کرتے ہو؟ یہ سنتے ہی واثق باللہ چونک پڑا اور دربار سے اٹھ کر اپنی محل سرا میں چلا گیا اور چارپائی پر لیٹ کر بار بار یہ کہتا رہا کہ ”جس معاملے

---

1. کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ایک طرف واثق باللہ قرآن کریم کو مخلوق مان کر ایک صریح غلطی اور گمراہی اختیار کر چکا تھا، دوسری طرف اس نے بہت سے بڑے علماء کو قتل کرنے جیسا جرم اور گناہ کبیرہ کیا۔
2. قاضی احمد بن ابی داؤد نے یہ بالکل غلط بات کہی۔ اگر جناب رسول اللہ ﷺ کو اس مسئلہ کا علم تھا تو پھر نبی کریم ﷺ کو صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس بارے میں رہنمائی کرنی چاہیے تھی۔

میں نبی اکرم ﷺ نے خاموشی اختیار کی، ہم اس میں سختی کر رہے ہیں۔'' پھر حکم دیا کہ ابوعبدالرحمٰن کو آزاد کر کے اس کے وطن میں بہ آرام واپس پہنچا دو اور تین سو دینار سرخ بہ طور انعام دے دو۔

ابوحرب واہل دمشق:

خلیفہ معتصم کے حالات میں اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ رجاء بن ایوب کو معتصم نے ابوحرب یمانی کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا تھا۔ رجاء بن ایوب نے کچھ دن انتظار کرنے کے بعد ابوحرب سے لڑائی کا سلسلہ جاری کیا۔ اسی اثناء میں معتصم باللہ نے وفات پائی اور واثق باللہ تخت نشین ہوا۔ وفات معتصم کی خبر سنتے ہی اہل دمشق باغی ہو گئے۔ انہوں نے اپنے امیر کو دارالامارت میں محصور کر لیا اور لشکر کی فراہمی و تربیت میں مصروف ہو کر کثیر جمعیت فراہم کر لی۔

یہ خبر سنتے ہی واثق باللہ نے رجاء بن ایوب کے پاس حکم بھیجا کہ پہلے اہل دمشق کی خبر لو۔ اس وقت رجاء بن ایوب مقام رملہ میں ابوحرب کے مقابل معرکہ آرائی میں مصروف تھا۔ اس حکم کی تعمیل میں اس نے بہت تھوڑی سی فوج ابوحرب کے مقابلہ پر چھوڑی اور باقی فوج لے کر دمشق کی جانب متوجہ ہوا۔ یہاں اہل دمشق نے مقابلہ کیا اور بڑی خوں ریز جنگ ہوئی، جس میں ڈیڑھ ہزار آدمی اہل دمشق کے اور تین سو آدمی رجاء کی فوج کے مقتول ہوئے۔ اہل دمشق نے ہزیمت پا کر امن کی درخواست کی اور یہ بغاوت بالکل فرو ہو گئی۔ یہاں سے فارغ ہو کر رجاء رملہ کی جانب گیا اور ابوحرب کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ ابوحرب کے ہمراہیوں میں سے بیس ہزار آدمی ان لڑائیوں میں مقتول ہوئے تھے۔

اشناس کا عروج وزوال:

خلیفہ واثق باللہ نے تخت نشین ہو کر اشناس کو جو ترکی غلام تھا، اپنا نائب السلطنت بنا کر تمام ممالک محروسہ اسلامیہ کے سیاہ وسفید کا اختیار کامل دے دیا۔ وزیراعظم محمد بن عبدالملک بن زیات جو معتصم کے زمانے سے وزیراعظم چلا آتا تھا، واثق کے زمانے میں بھی وزیراعظم رہا۔ یہ عہدہ جو اشناس کے سپرد کیا گیا، اس کا نام نائب السلطنت تھا جو واثق باللہ نے نیا ایجاد کیا تھا۔

نائب السلطنت خلیفہ کے تمام اختیارات کا استعمال کرتا اور وزیراعظم کا اسی طرح افسر و حاکم تھا، جیسے خلیفہ۔ اب تک کسی خلیفہ نے ایسے وسیع اختیارات کسی دوسرے کو نہیں دیے تھے۔ ترکوں کو اگرچہ

افشین کے قتل سے ایک قسم کا نقصان و صدمہ پہنچا تھا لیکن ان کی فوجیں، پلٹنیں، رسالے بہ دستور موجود تھے۔ ان کی قدر و منزلت بہ دستور موجود تھی۔ اب واثق باللہ کے تخت نشین ہونے پر اشناس کو جب حکومت اسلامیہ میں سیاہ وسفید کے کامل اختیارات عطا ہوئے تو یوں سمجھنا چاہیے کہ تمام عالم اسلامی میں ترکوں ہی کی حکومت قائم ہوگئی۔ اشناس کو یہ حکومت زیادہ دن راس نہ آئی اور جلد ہی اس کے اختیارات پر بھی حد بندی قائم ہوگئی مگر یہ ایک ایسی نظیر قائم ہوئی جو بعد میں دولت عباسیہ کے زوال و بربادی کا باعث ہوئی۔

واثق باللہ چونکہ مجالس علمیہ کا بھی شوقین تھا، اس لیے وہ علماء و اراکین سلطنت کی مجلسوں میں بیٹھ کر گھنٹوں مذاکرات علمیہ اور روایات قدیمہ سنا کرتا تھا۔ علماء چونکہ اکثر عربی النسل لوگ تھے، انہوں نے ہارون الرشید کے زمانے کے واقعات بھی موقع پا کر سنانے شروع کیے۔ برامکہ کے علمی ذوق اور سخاوت کی حکایتوں کے ساتھ ہی ان کے اقتدار و اختیار کے قصے اور پھر خاندان خلافت کے خلاف ان کی سازشوں کی کیفیت اور بربادی کے تمام واقعات مناسب اور موزوں انداز میں واثق باللہ کے گوش گزار کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واثق باللہ کی کچھ آنکھیں سی کھل گئیں اور اس نے ترکی وخراسانی امراء کی نگرانی و دیکھ بھال کرنے شروع کر دی۔ اکثر لوگوں پر غبن کے الزامات پایہ ثبوت کو پہنچے اور واثق باللہ نے ان سے جرمانے وصول کرنے شروع کر دیے۔ اسی سلسلہ میں اشناس ترکی کے اختیارات بھی محدود کر دیے گئے اور وہ سنہ ۲۳۰ھ میں فوت ہو گیا۔

اہل عرب کے وقار کا خاتمہ:

اب تک برابر سلطنت عباسیہ اہل عرب کی سیادت وعزت کو کم کرنے میں مصروف رہی تھی اور عجمیوں کو برابر فروغ حاصل ہوتا رہا تھا۔ تاہم ملک عرب کے گہوارۂ اسلام ہونے کے سبب سے ایک خاص عزت اور دین اسلام کے اولین خادم ہونے کی وجہ سے عربوں کا ایک خصوصی احترام ہر ایک قلب میں موجود تھا۔ خود خاندان خلافت ایک عربی خاندان تھا۔ اس لیے عجمیوں کی یہ خواہش کبھی نہ ہوئی تھی کہ ہم عربوں کو ذلیل کرنے کا موقع پائیں، نہ خلفاء نے اب تک خراسانی وترکی سپاہیوں کے دستوں کو عربی قبائل کی سرکوبی کے لیے حجاز ویمن وغیرہ میں بھیجا تھا بلکہ جب کبھی حجاز ویمن وغیرہ کے خالص عربی صوبوں کے انتظام کے لیے ضرورت پیش آتی تھی تو عربی یا عراقی یا شامی سپاہی بھیجے

جاتے تھے۔

اس احتیاط اور اس التزام کا نتیجہ یہ تھا کہ عربوں کا اگر چہ وہ بہت ہی کمزور کر دیے گئے تھے، ایک احترام دلوں میں باقی تھا اور عربی وقار سے کسی کو انکار نہ تھا۔ اب خلیفہ واثق باللہ کے زمانے میں عربوں سے یہ چیز بھی چھن گئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نواح مدینہ میں قبیلہ بنو سلیم کی ایک بڑی تعداد رہتی تھی، انہوں نے بنو کنانہ پر حملہ کیا اور ان کا مال واسباب لوٹ لیا۔

اس قسم کی لوٹ مار کے واقعات عربوں میں اس وجہ سے شروع ہو گئے تھے کہ وہ اب ملک گیریوں اور فوجی خدمتوں سے برطرف ومعزول کر دیے گئے تھے اور خلفاء عباسیہ نے ان کو اپنی فوجوں سے بہ تدریج خارج کر دیا تھا۔ اس حالت میں عربوں کا جنگی جذبہ لوٹ مار اور ڈاکہ زنی میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ مدینہ کے عامل محمد بن صالح نے جب بنو سلیم کی اس زیادتی کا حال سنا تو ان کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی۔ اس فوج کو بھی بنو سلیم نے شکست فاش دے دی اور مکہ و مدینہ کے درمیان تمام علاقے میں بدامنی پیدا ہو گئی اور قافلوں کی آمد و رفت بند ہو گئی۔ خلیفہ واثق باللہ کو جب ان حالات سے آگاہی ہوئی تو اس نے بغا کبیر اپنے ایک ترکی سپہ سالار کو ترکی فوج کے ساتھ اس طرف روانہ کیا۔ بغا کبیر شعبان سنہ ۲۳۰ھ میں مدینہ منورہ پہنچا۔ بنو سلیم سے لڑائیاں ہوئیں۔ ان کو شکست دی، ایک ہزار بنو سلیم کو گرفتار کر کے مدینہ منورہ میں قید کر دیا اور بہت سوں کو قتل کیا۔

بغا کبیر قریباً چار مہینے تک مع اپنی ترکی فوج کے مدینہ میں مقیم رہا اور عربی قبائل کو طرح طرح ذلیل و مغلوب و خوف زدہ کرتا رہا۔ حج سے فارغ ہو کر بغا کبیر نے بنو ہلال کی طرف توجہ کی اور ان کو بھی بنو سلیم کی طرح سزائیں دیں اور تین سو آدمیوں کو گرفتار کر کے قید کر دیا، پھر بنو مرہ کی طرف متوجہ ہوا اور مقام فدک میں جا کر چالیس روز تک مقیم رہا اور فزارہ و بنو مرہ کے بہت سے آدمیوں کو گرفتار کر کے لایا اور مدینہ میں قید کیا، پھر بنو غفار، ثعلبہ اور اشجع کے رؤسا کو طلب کر کے ان سے اطاعت و فرماں برداری کے لیے حلف لیے، پھر بنو کلاب کے تین ہزار آدمیوں کو گرفتار کر کے دو ہزار کو رہا اور ایک ہزار کو قید کر دیا، پھر یمامہ میں جا کر بنو نمیر کے پچاس آدمیوں کو قتل کیا اور چالیس کو قید کیا۔

اہل یمامہ مقابلہ پر مستعد ہوئے۔ بغا کبیر نے کئی لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں میں ڈیڑھ ہزار اہل یمامہ کو قتل کیا۔ ابھی یمامہ میں لڑائی کے شعلے فرو نہ ہوئے تھے کہ واثق باللہ نے ایک اور ترک سردار کو تازہ دم ترکی فوج کے ساتھ یمامہ کی طرف بغا کبیر کی مدد کے لیے بھیج دیا۔ بغا کبیر نے تمام

ملک یمامہ میں قتل عام شروع کرا دیا۔ اہل یمامہ وہاں سے بھاگے تو یمن تک ان کا تعاقب کیا اور ہزار ہا آدمیوں کو قتل کیا۔ غرض عربی قبائل کو اچھی طرح پامال وذلیل کر کے اور دو سو شرفائے عرب کو قید کر کے اپنے ہمراہ بغداد کی طرف لے کر آیا۔

جو قیدی مدینہ میں پہلے قید کر آیا تھا، وہ ان کے علاوہ تھے۔ بغداد آ کر محمد بن صالح کو لکھا کہ مدینہ کے تمام قیدیوں کو لے کر بغداد آؤ۔ چنانچہ محمد بن صالح ان کو بغداد لے کر آیا اور وہ بھی سب جیل خانے میں ڈال دیے گئے۔ بغا کبیر نے عرب میں دو برس تک ترکوں کے ہاتھ سے عربوں کو بے دریغ قتل کرایا اور طرح طرح سے ان کو ذلیل ومغلوب کیا۔

سنہ ۲۳۰ھ میں عبداللہ بن طاہر حاکم خراسان نے وفات پائی۔ خلیفہ واثق باللہ نے اس کے بیٹے طاہر بن عبداللہ بن طاہر کو خراسان، کرمان، طبرستان اور رے کی حکومت پر عبداللہ بن طاہر کی وصیت کے موافق بحال رکھا۔

احمد بن نصر کا خروج وقتل:

احمد بن نصر بن مالک بن ہیثم خزاعی کا دادا مالک بن ہیثم خزاعی دعوت عباسیہ کے نقیبوں میں سے تھا۔ احمد بن نصر اصحاب حدیث کی صحبتوں میں اکثر رہتا تھا اور اسی لیے اس کا شمار محدثین میں تھا۔ وہ مسئلہ خلق قرآن کا مخالف تھا۔ اسی وجہ سے ایک گروہ کثیر نے خلافت عباسیہ کے خلاف اس کے ہاتھ پر بیعت کی اور شہر بغداد میں شب پنج شنبہ ۳ شعبان سنہ ۲۳۱ھ کو احمد بن نصر نے خروج کیا اور علم بغاوت بلند کر کے نقارہ بجا دیا۔ بغداد کی پولیس کے افسر نے نہایت ہوشیار اور مستعدی سے کام لے کر احمد بن نصر کو گرفتار کر لیا۔

احمد بن نصر اور اس کے ہمراہی جو گرفتار ہوئے تھے، واثق باللہ کے پاس مقام سامرا میں بھیجے گئے۔ واثق نے نصر کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور اس کا سر اور جسم جدا کر کے بغداد بھیجا گیا۔ جسم کو بغداد کے دروازہ پر لٹکایا گیا اور سر کو جسر بغداد پر لٹکا کر ایک چوکیدار کو متعین کیا گیا کہ وہ نیزہ کی نوک سے منہ کو قبلہ کی طرف نہ ہونے دے اور کان میں ایک پرچہ دھاگے سے باندھ کر لٹکا دیا گیا، جس پر لکھا تھا کہ یہ "سر" احمد بن نصر بن مالک کا ہے جس کو خلیفہ نے عقیدہ خلق قرآن کی طرف بلایا مگر اس نے انکار کیا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بہت جلد اس کو آتش دوزخ کی طرف بلا لیا۔" احمد بن نصر کے قتل کا

واقعہ ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن محمد ازدی کے واقعہ سے (جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے) پہلے کا ہے۔

رومیوں سے اسیران جنگ کا تبادلہ:

رومیوں کے ساتھ جنگ کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری چلا آتا تھا۔ مسلمانوں نے ہمیشہ رومیوں کو شکست دی اور کبھی کبھی قسطنطنیہ تک بھی پہنچ گئے مگر رومیوں کی حکومت و سلطنت کا مکمل استیصال نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ خلافت راشدہ کے عہد میں ایرانی بادشاہی برباد ہو چکی تھی مگر رومی بادشاہی ابھی باقی رہ گئی تھی، اگرچہ شام و فلسطین و مصر وغیرہ رومیوں سے چھین لیے گئے تھے۔ مسلمانوں کے قسطنطنیہ پر قابض ہو کر یورپ کے اندر داخل ہونے میں کوئی کسر باقی نہ تھی کہ اسی حالت میں اندرونی فسادات کھڑے ہو گئے اور قسطنطنیہ و یورپ مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہوتے ہوتے بچ گیا۔ ان اندرونی جھگڑوں کا سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ کبھی بند ہی ہونے میں نہ آیا اور کسی خلیفہ کو بھی ایسا موقع اور کامل اطمینان میسر نہ ہوا کہ وہ اپنی تمام طاقت وسیع مدت کے لیے یورپ کی طرف متوجہ کر دے اور اسے اپنے مقبوضہ ممالک میں بغاوت کا اندیشہ اور خروج کا خطرہ نہ ہو۔

غرض مسلمانوں کی آپس کی مخالفتوں نے قسطنطنیہ کے قیصر اور یورپ کے ملکوں کی حفاظت کی اور سرحدات پر عیسائیوں اور مسلمانوں کی لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی کوئی خلیفہ فوج لے کر رومیوں پر حملہ آور ہوا تو ان کو ڈرا دھمکا کر اور سزا دے کر فوراً دارالخلافہ کی طرف واپس چلا آیا۔ یہ کبھی ممکن نہ ہوا کہ زیادہ مدت اور کئی برس کے لیے وہ مستقر خلافت سے جدا رہ سکے۔ واثق باللہ کے زمانے میں بھی رومیوں سے چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں دو مرتبہ عیسائی اور مسلمان قیدیوں کا تبادلہ ہو چکا تھا یعنی مسلمانوں نے عیسائیوں کو جو ان کی قید میں تھے، چھوڑ دیا اور اس کے معاوضہ میں عیسائیوں نے ان مسلمان قیدیوں کو جو ان کی قید میں تھے، آزاد کر دیا۔ یہ تبادلہ پہلے بھی دریائے لامس کے کنارے ہوا تھا اور اب ۱۰ محرم سنہ ۲۳۱ھ کو تیسری مرتبہ واثق باللہ کے عہد میں اسی دریا کے کنارے ہوا۔ جس کی صورت یہ تھی کہ دریائے لامس پر دو پل ایک دوسرے کے متوازی بنائے گئے۔ ایک پل سے عیسائی قیدی اس طرف جاتا اور دوسرے پل سے مسلمان قیدی اس طرف سے آتا تھا۔ اس تبادلہ کے لیے واثق باللہ نے خاقان کو اپنی طرف سے عیسائی قیدیوں کے ساتھ دریائے لامس کے کنارے بھیج دیا تھا۔ برابر تعداد کے قیدیوں کا تبادلہ ہو

چکا اور سب مسلمان قیدی جن کی تعداد چار ہزار چھ سو تھی، اس طرف آ چکے تو رومی قیدی پھر بھی بہت سے مسلمانوں کے پاس بچ گئے۔

خاقان نے ان بچے ہوئے قیدیوں کو بلا معاوضہ رومیوں کے پاس یہ کہہ کر بھیج دیا کہ اس تبادلہ میں بھی ہمارا درجہ بڑھا ہوا رہنا چاہیے۔ یہ ہماری طرف سے رومیوں پر احسان ہے۔

واثق باللہ کی وفات:

واثق باللہ مرض استسقا میں مبتلا ہوا۔ اس کے تمام جسم پر ورم آ گیا تھا۔ علاج کی غرض سے اس کو گرم تنور میں بٹھایا گیا۔ اس سے مرض میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔ اگلے دن تنور کو کسی قدر زیادہ گرم کیا گیا اور پہلے دن کی نسبت زیادہ دیر تک تنور میں بیٹھا رہا، جس کی وجہ سے بخار ہو گیا۔ تنور سے نکل کر محافے میں سوار کر کے سیر و تفریح کے لیے لے چلے۔ جب محافہ کو زمین پر رکھ کر دیکھا گیا تو واثق باللہ فوت ہو چکا تھا۔ اسی وقت قاضی احمد بن داؤد، محمد بن عبدالملک وزیراعظم، ایتاخ وصیف، عمر بن فرح وغیرہ اراکین سلطنت قصر خلافت میں جمع ہوئے اور محمد بن واثق باللہ کو جو نو عمر لڑکا تھا، تخت خلافت پر بٹھانے لگے۔ اس وقت وصیف نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ:

"کیا تم لوگ اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے کہ ایسے نو عمر لڑکے کو خلیفہ بناتے ہو۔"

یہ الفاظ سن کر سب کو خیال ہوا اور اس کام سے رک کر مستحق خلافت شخص کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ آخر واثق باللہ کے بھائی جعفر بن معتصم کو طلب کیا اور خلعت پہنا کر تخت خلافت پر بٹھایا اور متوکل علی اللہ کا خطاب دیا۔ متوکل علی اللہ نے سب سے پہلے بیعت خلافت لے کر واثق باللہ کی نماز جنازہ پڑھائی اور دفن کرنے کا حکم دیا۔

واثق باللہ مکہ کی سڑک پر مقام ہارونی میں دفن کیا گیا۔ پانچ برس، نو مہینے خلافت کی اور ۳۶ برس چار مہینے کی عمر میں ۲۴ ذی الحجہ سنہ ۲۳۲ھ بروز چہارشنبہ فوت ہوا۔ بہت مستقل مزاج اور برداشت کرنے والا شخص تھا مگر مسئلہ خلق قرآن کے متعلق اس سے بہت زیادتیاں ہوئی۔ آخر عمر میں یہ خبط اس سے دور ہو گیا۔

عبرت:

مرنے کے بعد خلیفہ واثق باللہ کو تنہا چھوڑ دیا گیا اور تمام لوگ متوکل علی اللہ سے بیعت کرنے

میں مصروف ہو گئے۔ اس عرصہ میں ایک سوسمار [1] آیا اور واثق باللہ کی آنکھیں نکال کر کھا گیا۔

متوکل علی اللہ

متوکل علی اللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید کا اصل نام جعفر اور کنیت ابوالفضل تھی۔ سنہ ۲۰۷ھ میں شجاع نامی ام ولد کے پیٹ سے پیدا ہوا اور واثق باللہ کی وفات کے بعد ۲۴ ماہ ذی الحجہ سنہ ۲۳۲ھ کو تخت نشین ہوا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے لشکر کو آٹھ مہینے کی تنخواہ مرحمت فرمائی۔ اپنے بیٹے منتصر کو حرمین، یمن اور طائف کی حکومت عطا فرمائی۔

محمد بن عبدالملک کی معزولی مرگ:

محمد بن عبدالملک بن زیات معتصم کے عہد خلافت سے وزیراعظم چلا آتا تھا۔ واثق باللہ کے زمانے میں بھی وہ اسی عہدے پر فائز رہا۔ متوکل علی اللہ کے عہد خلافت میں ایک مہینے تک وزیراعظم رہنے کے بعد معزول و معتوب ہوا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ واثق باللہ اپنے عہد خلافت میں کسی بات پر اپنے بھائی متوکل سے ناراض ہو گیا۔

متوکل وزیراعظم محمد بن عبدالملک کے پاس گیا اور عرض کیا کہ آپ میری سفارش کر کے امیرالمومنین کو خوش کر دیں۔ محمد بن عبدالملک عرصہ دراز تک وزیراعظم رہنے کے سبب سے کسی قدر مغرور اور بدمزاج و غیر متواضع ہو گیا تھا۔ وہ نہایت کم التفاتی اور بداخلاقی سے پیش آیا اور متوکل سے کہا کہ تم اپنی اصلاح کرو تو امیرالمومنین خود ہی تم سے خوش ہو جائیں گے۔ کسی کی سفارش کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد واثق باللہ سے متوکل کی شکایت بھی کر دی کہ وہ میرے پاس سفارش کی غرض سے آیا تھا، میں نے اس کے بال عورتوں کی طرح بڑھے ہوئے دیکھ کر منہ نہیں لگایا۔ واثق نے متوکل کو دربار میں طلب کر کے وہیں سر دربار حجام سے بال کٹوا دیے اور دربار سے نکال دیا۔ چونکہ اس تمام بے عزتی کا باعث بھی محمد بن عبدالملک ہی ہوا تھا، لہٰذا متوکل نے تخت نشین ہو کر ایک مہینے کے بعد ایتاخ کو حکم دیا کہ محمد بن عبدالملک کو اپنے مکان میں گرفتار کر لو اور تمام ممالک محروسہ میں گشتی فرمان بھیج دو کہ محمد بن عبدالملک کا تمام مال و اسباب جہاں کہیں ہو، ضبط کر لیا جائے۔ چنانچہ

---

[1] گوہ رضب ......ایک جانور کا نام ہے۔

اس حکم کی تعمیل میں ایتاخ نے اس کو قید کر لیا اور اس کا مال و اسباب سب بغداد میں منگوا کر بیت المال شاہی میں داخل کر دیا۔ محمد بن عبدالملک کے بعد عمر بن فرح کو بھی ماہ رمضان سنہ ۲۳۳ھ میں اسی طرح گرفتار کر کے قید کر دیا، مگر پھر گیارہ لاکھ درہم زر جرمانہ وصول کر کے رہا کر دیا۔

ایتاخ کی گرفتاری و موت:

ایتاخ ایک ترکی غلام تھا۔ اول یہ سلام بن ابرص کے پاس تھا اور باورچی کا کام کرتا تھا۔ اسی لیے وہ آخر تک ایتاخ طباخ کے نام سے مشہور ہوا۔ خلیفہ معتصم نے اس کی دانائی و سلیقہ شعاری اور جسم کی مضبوطی و خوبصورتی دیکھ کر سلام ابرص سے سنہ ۱۹۹ھ میں خرید لیا تھا۔ آدمی چونکہ اداشناس اور ہوشیار تھا، اس لیے جلد ترقی کرتا رہا۔ معتصم ہی کے زمانے میں اس کی عزت و تکریم اور اختیار واقتدار میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ شاہی معتوب عموماً اسی مکان میں قید کیے جاتے اور اسی کی نگرانی میں رکھے جاتے تھے اور مقتول کیے گئے۔ محکمہ جنگ بھی اسی کی ماتحتی میں تھا۔ حجابت و سفارت کے عہدے بھی اسی کو حاصل تھے۔ ایتاخ ماہ ذیعقدہ سنہ ۲۳۴ھ میں بہ قصد حج روانہ ہوا۔ اس کی روانگی کے بعد خلیفہ متوکل نے حجابت کے عہدے پر اپنے خادم وصیف کو مامور کیا۔ حج سے واپس ہو کر جب ایتاخ بغداد کے قریب پہنچا تو خلیفہ متوکل کے حکم کے موافق اسحاق بن ابراہیم نے اس کو بغداد میں دعوت دے کر بلایا اور قید کر دیا اور اس کے دونوں لڑکوں منصور و مظفر کو بھی قید کر لیا۔ ایتاخ اسی حالت قید میں مر گیا اور اس کے دونوں لڑکے متوکل کے آخر زمانہ خلافت تک قید رہے۔ جب منتصر تخت نشین ہوا تو اس نے دونوں کو رہا کر دیا۔

بیعت ولی عہدی:

سنہ ۲۳۵ھ میں آذربائیجان میں محمد بن بعیث بن جلیس نے علم بغاوت بلند کیا مگر یہ بغاوت بغاصیر نے فوج کشی کر کے جلد فرو کر دی۔ اس کے بعد اسی سال خلیفہ متوکل نے اپنے بیٹوں محمد، طلحہ اور ابراہیم کی ولی عہدی کے لیے لوگوں سے بیعت لی اور یہ قرار دیا کہ میرے بعد اول محمد تخت و تاج کا مالک ہوگا، اس کے بعد طلحہ تخت نشین خلافت ہوگا۔ محمد کو منتصر کا اور طلحہ کو معتز کا خطاب دیا۔ محمد کو ممالک مغربیہ اور معتز کو ممالک مشرقیہ بطور جاگیر عطا کیے۔ ان دونوں کو بعد میں تاج و تخت کا وارث قرار دیا اور شام کا ملک ان کی جاگیر میں مقرر فرمایا۔

اسی سال یعنی سنہ ۲۳۵ھ میں خلیفہ متوکل نے فوج کی وردی تبدیل کی اور کمبلوں کے جبے پہنا کر بجائے پیٹی کے ڈوری باندھنے کا حکم دیا۔ ذمیوں کو جدید عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی ممانعت کی۔ ممالک محروسہ میں حکم جاری کیا کہ کوئی شخص کسی حاکم کی دہائی نہ دے۔ عیسائی ذمیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے جلوسوں میں صلیب نہ نکالیں۔ اسی سال حسن بن سہل اور اسحاق بن ابراہیم بن حسین بن مصعب برادر زادہ طاہر بن حسین جو مامون الرشید کے زمانے سے بغداد کا افسر پولیس چلا آتا تھا، فوت ہوا۔ متوکل نے محمد بن اسحاق کو محکمہ پولیس کی افسری عطا کی، ساتھ ہی صوبہ فارس کی گورنری بھی دی۔ یہ یاد رہے کہ صوبہ فارس خراسان سے جدا تھا۔ خراسان کی حکومت مع طبرستان وغیرہ طاہر بن عبداللہ بن حسین کے قبضہ میں تھی۔ اسی سال خلیفہ متوکل نے حکم جاری کیا کہ تمام عیسائی گلوبند باندھا کریں۔ غالباً کالر، نکٹائی اسی کی یادگار ہے۔ سنہ ۲۳۶ھ میں متوکل نے حسین رضی اللہ عنہ کے مزار پر لوگوں کو زیارت کے لیے جانے سے منع کیا اور قبر کے گرد جو مکانات بنائے گئے تھے، ان کو مسمار کرا دیا۔ اسی سال عبیداللہ بن یحییٰ بن خاقان کو عہدہ وزارت عطا ہوا۔

بغاوت آرمینیا:

صوبہ آرمینیا کی حکومت پر یوسف بن محمد مامور تھا۔ بقراط بن اسواط نامی بطریق نے جو بطریقوں کا سردار تھا، دارالامارت میں حاضر ہو کر یوسف بن محمد سے امن طلب کی۔ یوسف نے اس کو مع اس کے بیٹے کے گرفتار کر کے خلیفہ متوکل کے پاس بھیج دیا۔ آرمینیا کے بطریقوں میں یوسف کے خلاف سخت اشتعال پیدا ہوا تھا۔ بقراط بن اسواط کے داماد موسیٰ بن زرارہ نے بطریقوں کو جمع کر کے اس مسئلہ میں مشورہ طلب کیا۔ سب نے قسمیں کھائیں کہ یوسف بن محمد کو قتل کر دیں گے۔ چنانچہ موسیٰ بن زرارہ کی سرکردگی میں عیسائیوں نے خروج کیا۔ یوسف بن محمد مقابلہ کو نکلا۔ رمضان سنہ ۲۳۷ھ میں یوسف بن محمد اور اس کے ہمراہیوں کو باغیوں نے قتل کر ڈالا۔ یہ خبر سن کر متوکل نے بغا کبیر کو آرمینیا کی طرف بھیجا۔ بغا کبیر نے موصل اور جزیرہ میں ہوتے ہوئے مقام ارزن کے قریب جا کر قیام کیا۔ ارزن کو فتح کر کے موسیٰ بن زرارہ کے ہمراہیوں میں سے قریباً تیس ہزار آدمی مارے گئے اور ایک گروہ کثیر گرفتار ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۲۳۸ھ تک بغا کبیر نے آرمینیا کے باغی بطریقوں کو چن چن کر سزائیں دیں اور گرفتار کر کے بغداد کی جانب سب کو بھیج دیا۔

قاضی احمد بن ابی داؤد کی معزولی و وفات:

قاضی احمد بن ابی داؤد، واثق باللہ کے عہد خلافت میں وزیراعظم سے بھی بڑھ کر رسوخ واقتدار رکھتا تھا۔ متوکل کے ابتدائی زمانے میں بھی اس کی یہی حالت قائم رہی۔ خلیفہ متوکل سنہ ۲۳۷ھ میں قاضی احمد بن داؤد سے ناخوش ہوگیا اوراس کے مال واسباب اور جاگیروں کو ضبط کرنے کا حکم دیا۔ قاضی احمد کے بیٹے ابوالولید نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار درہم اپنا مال واسباب بیچ کر خلیفہ کی خدمت میں پیش کیے۔ متوکل نے قاضی احمد کو معزول کر کے قید کر دیا اور اس کی جگہ یحییٰ بن اکثم کو قاضی القضاۃ کا عہدہ سپرد کیا۔ قاضی احمد ان دنوں عارضہ فالج میں مبتلا تھا۔ قاضی احمد بن ابی داؤد نے اسی سال یعنی سنہ ۲۳۷ھ میں اپنے بیٹے ابوالولید کی وفات کے بیس روز بعد وفات پائی۔ اسی سال حمص میں عیسائیوں نے علمِ بغاوت بلند کیا اور عامل حمص کو نکال کر خود قابض ہو گئے۔ خلیفہ متوکل نے دمشق و دجلہ کی فوجوں کو حمص کی طرف جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ ان فوجوں نے عیسائیوں کی اس بغاوت کو فرو کیا اور بہت سے عیسائیوں کو شہر بدر کر دیا۔ اسی سال متوکل نے مصر کے قاضی ابوبکر بن محمد بن ابواللیث کو معزول کر کے کوڑوں سے پٹوانے کا حکم دیا اور اس کی جگہ حارث بن مسکین شاگرد امام مالک کو قاضی القضاۃ مصر مقرر کیا۔ اسی سال محمد بن عبداللہ بن عبداللہ بن طاہر بن حسین بن مصعب کو خلیفہ نے پولیس بغداد کی افسری عطا فرمائی۔ اس کا بھائی طاہر بن عبداللہ بن طاہر خراسان کا گورنر تھا۔

رومیوں کا حملہ:

سنہ ۲۳۸ھ میں رومیوں کا ایک بیڑہ جس میں سو جہاز تھے دمیاط کی طرف آیا، ساحل دمیاط کی معینہ فوج کو عنبسہ بن اسحاق والی مصر نے کسی ضرورت سے مصر میں طلب کیا تھا، رومیوں نے میدان کو خالی پا کر دمیاط کو خوب لوٹا۔ وہاں کی جامع مسجد کو جلا دیا اور مال واسباب اور قیدیوں کو اپنے جہازوں میں سوار کر کے ٹیونس کی طرف گئے، وہاں بھی یہی برتاؤ کیا۔ علی بن یحییٰ ارمنی لشکر صائفہ کے ساتھ ممالک روم پر حملہ آور ہوا اور بہت سے عیسائیوں کو قید کر لایا۔ سنہ ۲۴۱ھ میں ملکہ ندورہ قیصرہ روم نے مسلمان قیدیوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی، جس نے عیسائی ہونے سے انکار کیا، اس کو قتل کر دیا۔ بہت سے بہ خوف جان عیسائی ہو گئے، پھر کچھ سوچ کر ملکہ نے درخواست کی کہ قیدیوں کا

تبادلہ کرلیا جائے۔ چنانچہ متوکل نے اپنے خادم سیف نامی کو بغداد کے قاضی جعفر بن عبدالواحد کے ہمراہ عیسائی قیدیوں کے ساتھ روانہ کیا اور نہر لامس پر ان قیدیوں کا تبادلہ مسلمان قیدیوں کے ساتھ عمل میں آیا۔

بلاد روم پر حملہ:

مذکورہ بالا تبادلہ اسیران کے بعد رومیوں نے پھر بدعہدی کی اور اسلامی شہروں پر اچانک حملہ کرکے بہت سے مسلمانوں کو گرفتار کرکے لے گئے۔ مسلمان سرداروں نے رومیوں کا تعاقب کیا مگر ناکام واپس آئے۔ اس کے بعد خلیفہ متوکل نے علی بن یحییٰ کو لشکر صائفہ کے ساتھ بلاد روم پر جہاد کرنے کو روانہ کیا اور سنہ ۲۴۴ھ میں خود دارالخلافہ کو چھوڑ کر دمشق میں آیا اور دمشق میں قیام کرکے بلاد روم پر فوجیں بھیجنے اور حملہ روم کو کامیاب بنانے میں مصروف رہا۔ خلیفہ کے ہمراہ دمشق میں تمام اراکین سلطنت آ گئے اور دفاتر شاہی بھی دمشق میں آ گئے کیونکہ خلیفہ کا ارادہ مستقل طور پر دمشق ہی میں قیام کرنے کا تھا۔ ابھی خلیفہ کو دمشق میں آئے ہوئے صرف دو ہی مہینے گزرے تھے کہ وہاں وبا پھوٹ نکلی اور خلیفہ کو مجبوراً دمشق سے بغداد آنا پڑا۔ دمشق سے روانگی کے وقت متوکل علی اللہ، بغا کبیر کو ایک لشکر عظیم کے ساتھ بلاد روم پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر آیا۔ بغا کبیر نے بلاد روم میں داخل ہوکر ہر طرف قتل کا بازار گرم کر دیا۔ بہت سے قلعے فتح کیے اور رومیوں کو بے دریغ تہ تیغ کرنے اور اسیر بنانے میں کمی نہیں کی۔

جب رومیوں نے الامان الامان کی آوازیں بلند کیں اور اپنی خطاؤں کی معافی چاہی تو بغا کبیر خلیفہ کے حکم سے واپس آیا۔ سنہ ۲۴۵ھ میں رومیوں نے پھر بدعہدی کی اور موقع پا کر مسلمانوں کے شہروں کو لوٹ کر بھاگ گئے۔ اس کے جواب میں علی بن یحییٰ نے بلاد روم پر حملہ کیا اور خوب لوٹ مار کرکے واپس ہوا۔ سنہ ۲۴۶ھ میں رومیوں نے پھر مسلمانوں کو تنگ کیا اور سرحدی مقامات کو لوٹ کر ویران کر دیا۔

اب کی مرتبہ خلیفہ متوکل نے خشکی اور تری کی راہوں سے مختلف مقامات اور مختلف سمتوں سے بلاد روم پر حملہ آوری کے لیے فوجیں متعین کیں۔ ان بحری و بری فوجوں نے بلاد روم میں ایک زلزلہ پیدا کر دیا۔ رومیوں نے پھر معافی چاہی اور صلح کے خواہشمند ہوئے۔ مسلمانوں نے بہ خوشی اس

درخواست صلح کو منظور کر لیا اور نہر لامس پر پھر قیدیوں کا تبادلہ عمل میں آیا۔ اس مرتبہ دو ہزار تین سو قیدی سنہ ۲۴۶ھ میں چھڑائے گئے۔

تعمیر جعفریہ:

سنہ ۲۴۵ھ میں متوکل نے ایک جدید شہر موسوم بہ جعفریہ آباد تعمیر کرایا۔ اس کی تعمیر میں دو لاکھ دینار صرف ہوئے۔ وسط شہر میں ایک بہت بڑا محل جس کا نام لولوہ رکھا تھا، تعمیر کرایا۔ اس کی بلندی تمام شاہی محل سراؤں سے زیادہ تھی۔ اس شہر کو کوئی جعفریہ کوئی متوکلیہ کا ماخورہ کہتا تھا۔ اسی سال جعفر بن دینار خیاط نے وفات پائی۔ اسی سال نجاح بن سلمہ کو متوکل نے اس قدر پٹوایا کہ وہ مر گیا۔ نجاح بن سلمہ بڑے رعب کا آدمی تھا اور متوکل کے دفتر فرامین کا افسر تھا۔ اس کی نسبت رشوت کا الزام ثابت ہو گیا تھا، اس لیے اس کو ایسی سخت سزا دی گئی۔

قتل متوکل:

خلیفہ متوکل نے اپنے بیٹے منتصر کو ولی عہد اول بنایا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ منتصر پر شیعیت غالب تھی اور اعتزال میں وہ واثق و معتصم کا ہم عقیدہ تھا لیکن متوکل پابند سنت اور علمائے اہل سنت کا بڑا قدر دان، وہ خلق قرآن کے مسئلہ کا سخت مخالف اور شرک و بدعت کو مٹانے میں ہمت کے ساتھ مصروف رہتا تھا۔ باپ بیٹوں یعنی متوکل و منتصر کے عقائد کا یہ اختلاف آپس کی کشیدگی کا باعث ہوا۔ متوکل نے ارادہ کیا کہ بجائے منتصر کے اپنے دوسرے بیٹے معتز کو ولی عہد اول بنا دے۔ منتصر اور معتز چونکہ دو جدا جدا عورتوں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے، اس لیے دونوں میں رقابت پہلے ہی سے موجود تھی۔ اب جبکہ خلیفہ متوکل نے معتز کو منتصر پر ترجیح دینی چاہی تو منتصر اپنے باپ متوکل کا دشمن بن گیا۔

اس سے چند روز پہلے خلیفہ متوکل نے بغا کبیر، وصیف کبیر، وصیف صغیر اور دواجن اشروسنی وغیرہ ترک سپہ سالاروں کی بعض حرکات کے سبب سے ان سے ناراض ہو کر بعض کی جاگیریں ضبط کر لی تھیں۔ اس لیے ترک متوکل سے ناراض تھے۔ منتصر اور ترکوں نے مل کر متوکل کے قتل کرنے کی سازش کی۔ بغا کبیر اگرچہ بلاد روم کی طرف رخصت کر دیا گیا تھا مگر اس کا بیٹا موسیٰ بن بغا محل سرائے شاہی کی حفاظت و پاسبانی پر مامور تھا۔

بغا صغیر نے منتصر کو اپنا ہم خیال پا کر اپنے چاروں بیٹوں کے ساتھ چند ترکوں کی ایک جماعت کو متوکل کے قتل پر مامور کیا۔ ایک روز رات کو منتصر اور تمام درباری ایک ایک کر کے جب اٹھ آئے اور خلیفہ مع فتح بن خاقان اور چار دوسرے مصاحبوں کے رہ گیا تو دجلہ کی سمت کے دروازے سے قاتلوں کی مذکورہ جماعت شاہی دربار میں داخل ہو کر خلیفہ پر حملہ آور ہوئی۔ فتح بن خاقان بھی متوکل کے ساتھ مارا گیا۔ ان دونوں لاشوں کو وہیں چھوڑ کر قاتل اپنی خون آلود تلواریں لیے ہوئے رات ہی کو منتصر کے پاس پہنچے اور خلافت کی مبارکباد دی۔ اسی وقت منتصر سوار ہو کر محل سرائے شاہی میں داخل ہوا اور لوگوں سے بیعت لی۔ وصیف اور دوسرے ترکی سرداروں نے حاضر ہو کر بیعت کی۔ یہ خبر عبید اللہ بن یحییٰ خاقان وزیر تک پہنچی تو وہ رات ہی کو معتز کے مکان پر آیا مگر معتز کو اس سے ذرا دیر پہلے منتصر اپنے پاس طلب کر کے بیعت لے چکا تھا اور معتز مکان پر موجود نہ تھا۔ عبید اللہ وزیر جب معتز کے مکان پر پہنچا تو فوراً دس ہزار آدمی جمع ہو گئے۔ جن میں ازروی، ارمنی اور عجمی تھے۔ ان لوگوں نے متفق اللفظ ہو کر کہا کہ آپ ہم کو اجازت دیں تو ابھی منتصر اور اس کے ہمراہیوں کا خاتمہ کر دیں۔ عبید اللہ نے ان لوگوں کو روک دیا اور کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ صبح ہوئی تو منتصر نے متوکل اور فتح کے دفن کرنے کا حکم دیا۔ یہ واقعہ ۴ شوال سنہ ۲۴۷ھ کو وقوع پذیر ہوا۔

خلیفہ متوکل چالیس سال کی عمر میں چودہ برس، دس مہینے، تین دن خلافت کر کے مقتول ہوا۔

متوکل کے بعض ضروری حالات واخلاق:

متوکل علی اللہ نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی اپنا میلان احیاء سنت کی طرف ظاہر کیا۔ سنہ ۲۳۴ھ میں تمام محدثین کو دارالخلافہ سامرہ میں مدعو کیا اور بے حد تعظیم وتکریم سے پیش آیا۔ اس سے پیشتر واثق و معتصم کے عہد میں محدثین علانیہ درس نہیں دے سکتے اور رویت الٰہی کے متعلق احادیث نہیں بیان کر سکتے تھے۔ متوکل نے حکم دیا کہ محدثین مساجد میں آزادانہ حدیث کا درس دیں اور صفات باری تعالیٰ کے متعلق احادیث بیان کریں۔ متوکل نے گور پرستی کو مٹایا۔ اس لیے شیعہ اس کے دشمن ہو گئے کیونکہ حسین رضی اللہ عنہ کی قبر پر جو شرکیہ مراسم لوگوں نے شروع کر دیں تھیں، ان کو اس نے موقوف کرا دیا۔

سنہ ۲۴۰ھ میں اہل خلاط نے ایک ایسی آواز تند آسمان سے سنی کہ بہت سے آدمی اس کے

صدمہ سے مر گئے۔ عراق میں بیضہ مرغ کے برابر اولے پڑے اور مغرب میں تیرہ گاؤں زمین میں دھنس گئے۔ سنہ ۲۴۲ھ میں شمالی افریقہ، خراسان طبرستان، اصفہان میں سخت زلزلہ آیا۔ اکثر پہاڑ پھٹ گئے، اکثر آدمی زمین میں سما گئے۔ مصر کے گاؤں میں پانچ پانچ سیروزنی پتھر برسے۔ حلب میں ماہ رمضان سنہ ۲۴۳ھ لوگوں نے ایک پرند کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ لوگو! اللہ سے ڈرو، پھر اللہ اللہ چالیس مرتبہ کہا اور اڑ گیا۔[1] دوسرے روز بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کی اطلاع حلب والوں نے دارالخلافہ میں کی اور پانچ سو آدمیوں نے اس کی شہادت دی۔ سنہ ۲۴۵ھ میں تمام دنیا میں سخت زلزلے آئے۔ بہت سے شہر و قلعے مسمار ہو گئے۔ انطاکیہ میں ایک پہاڑ سمندر میں گر پڑا۔ مکہ مکرمہ کے چشموں کا پانی غائب ہو گیا۔ متوکل نے عرفات سے پانی لانے کے لیے ایک لاکھ دینار دیے۔ آسمان سے ہولناک آوازیں سنائی دیں۔

متوکل نہایت سخی تھا۔ شعراء کو اس نے اس قدر انعام دیا کہ اب تک کسی خلیفہ نے نہ دیا تھا۔ اسی کے زمانے میں ذوالنون مصری[2] نے احوال و مقامات اہل ولایت کو ظاہر کیا تو عبداللہ بن عبدالحکیم شاگرد امام مالک نے ان سے انکار کیا اور ذوالنون مصری کو اس لیے زندیق کہا کہ انہوں نے وہ علم ایجاد کیا جو سلف صالحین نے نہ کیا تھا۔ حاکم مصر نے ذوالنون مصری کو طلب کر کے ان کے عقائد دریافت کیے تو وہ مطمئن ہو گیا اور متوکل کو ان کا حال لکھ کر بھیجا۔ متوکل نے ذوالنون کو دارالخلافہ میں طلب کیا اور ان کی باتیں سن کر بہت خوش ہوا اور بڑی عزت و تکریم سے پیش آیا۔ متوکل کے مقتول ہونے کے بعد کسی نے اس کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا؟ متوکل نے جواب دیا کہ میں نے جو تھوڑا سا احیاء سنت کا کام کیا ہے، اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے بخش دیا۔ ابن عساکر کا قول ہے کہ متوکل نے ایک روز خواب میں دیکھا کہ آسمان سے ایک شکر پارہ گرا ہے، اس پر لکھا ہے کہ جعفر المتوکل علی اللہ۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو لوگوں نے اس کے لیے خطاب سوچا، کسی نے منتصر تجویز کیا، کسی نے اور کچھ لیکن جب متوکل نے علماء کو اپنا خواب بیان کیا تو سب نے متوکل علی اللہ ہی خطاب پسند کیا۔

ایک مرتبہ متوکل نے علماء کو اپنے یہاں طلب کیا، جن میں احمد بن معدل بھی تھے۔ جب سب

---

1. سنداً یہ واقعہ درست اور ثابت نہیں۔
2. ذوالنون مصری کا شمار مشہور ''صوفیاء'' میں ہوتا ہے۔

علماء آ کر جمع ہو گئے تو اس جگہ متوکل بھی آیا۔ متوکل کو آتا ہوا دیکھ کر سب علماء تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے مگر ایک احمد بن معدل بہ دستور بیٹھے رہے اور کھڑے نہیں ہوئے۔ متوکل نے اپنے وزیر عبیداللہ سے دریافت کیا کہ کیا اس شخص نے بیعت نہیں کی ہے؟ عبیداللہ نے کہا کہ بیعت تو کی ہے مگر ان کو کم نظر آتا ہے۔ احمد بن معدل نے فوراً کہا کہ میری آنکھوں میں کوئی نقصان نہیں ہے مگر میں آپ کو عذاب الٰہی سے بچانا چاہتا ہوں کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص لوگوں سے یہ امید رکھے کہ وہ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔[1]

متوکل یہ سن کر احمد بن معدل کے برابر آ بیٹھا۔ یزید مہلبی کہتے ہیں کہ ایک روز مجھ سے متوکل نے کہا کہ خلفاء رعایا پر محض اپنا رعب قائم کرنے کے لیے سختی کرتے تھے مگر میں رعایا کے ساتھ اس لیے نرمی کا برتاؤ کرتا ہوں کہ وہ بہ کشادہ پیشانی میری خلافت کو قبول کر کے میری اطاعت کریں۔ عمرو شیبان کہتے ہیں کہ میں نے متوکل کے مقتول ہونے سے دو مہینے بعد متوکل کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا معاملہ کیا؟ متوکل نے کہا کہ میں نے احیاء سنت کی جو خدمت انجام دی تھی، اس کے صلے میں مجھ کو اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ آپ کے قاتلوں کے ساتھ کیا ہو گا؟ تو متوکل نے کہا کہ میں اپنے بیٹے محمد (منتصر) کا انتظار کر رہا ہوں، جب وہ یہاں پہنچے گا تو میں اللہ کے سامنے فریادی ہوں گا۔ خلیفہ متوکل علی اللہ شافعی تھا اور یہ سب سے پہلا خلیفہ تھا جس نے شافعی مذہب اختیار کیا تھا۔

منتصر باللہ

منتصر باللہ بن متوکل علی اللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید کا اصل نام محمد اور کنیت ابوجعفر یا ابو عبداللہ تھی۔ سنہ ۲۲۳ھ میں بمقام سامرہ رومیہ حبشیہ نامی ام ولد کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ اپنے باپ متوکل کو قتل کرا کر ۴ شوال سنہ ۲۴۷ھ کو تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ اپنے دونوں بھائیوں معتز اور موید کو جو اس کے باپ متوکل کے ولی عہد مقرر کیے ہوئے تھے، ولی عہدی سے معزول کیا۔

ترک دربار خلافت پر قابو پائے ہوئے تھے اور روز بہ روز ان کی طاقت ترقی پذیر تھی۔ منتصر کو تو

---

[1] ترمذی، ابوداؤد بہ حوالہ مشکوٰۃ المصابیح المحقق الالبانی رحمہ اللہ، کتاب الاداب، حدیث ٤٦٩٩۔ یہ حدیث مسند احمد میں بھی موجود ہے۔

ترکوں ہی نے تخت خلافت پر بٹھایا تھا۔اس لیے وہ اور بھی زیادہ آزادی سے سب پر مستولی ہو گئے تھے۔منتصر یہ دیکھ کر کہ ترکوں کی طاقت حد سے زیادہ بڑھتی جاتی ہے اور یہی کسی دن میرے لیے موجب اذیت ہوں گے، ان کی طاقت واقتدار کے مٹانے پر مستعد ہو گیا۔

اس نے اپنی شش ماہ کی خلافت کے مختصر زمانے میں شیعوں پر بہت احسانات کیے۔حسین رضی اللہ عنہ کی قبر پر لوگوں کو زیارت کے لیے جانے کی اجازت دے دی اور علویوں کو ہر قسم کی آزادی عطا کر دی۔ اس نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی احمد بن خصیب کو خلعت وزارت عطا کیا اور بغا کبیر کو سپہ سالار اعظم بنایا۔ بغا کبیر اور دوسرے ترکوں کی ترغیب ہی سے اس نے اپنے بھائیوں کو ولی عہدی سے معزول کیا تھا۔ترکوں کے استیلا کو دیکھ کر جب ان کا زور کم کرنے کی طرف متوجہ ہوا تو ترک اس لیے کہ خلیفہ منتصر عقلمند بھی تھا اور بہادر بھی، اس سے خائف ہوئے اور سمجھے کہ وہ اپنے ارادے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے اس کے طبیب ابن طیفور کو تیس ہزار دینا رشوت دی کہ زہر آلود نشتر سے اس کی فصد کھولے۔ چنانچہ مسموم نشتر سے اس کی فصد طبیب مذکور نے کسی بیماری کا علاج کرتے ہوئے کھول دی۔

۵ ربیع الاخر سنہ ۲۴۸ھ کو چھ مہینے سے بھی کم خلافت کر کے فوت ہوا۔ مرتے وقت کہتا تھا کہ اے میری ماں! مجھ سے دین و دنیا جاتے رہے ہیں۔ میں اپنے باپ کی موت کا باعث ہوا اور اب میں اس کے پیچھے جاتا ہوں۔ خاندان کسریٰ میں ایک شخص شیرویہ نامی نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا، وہ بھی چند مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا تھا۔

مستعین باللہ

مستعین باللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید کا اصل نام اور کنیت ابوالعباس تھی۔ خوبصورت گورے رنگ کا آدمی تھا۔ چہرے پر چیچک کے داغ اور تو تلا تھا۔مخارق نامی ام ولد کے پیٹ سے سنہ ۲۲۱ھ میں پیدا ہوا تھا۔ جب منتصر فوت ہو گیا تو ارکان سلطنت جمع ہوئے کہ اب کس کو خلیفہ بنایا جائے؟ اولاد متوکل میں معتز اور موید موجود تھے لیکن ترک ان کی جانب سے اندیشہ مند تھے کہ انہوں ہی نے ان کو ولی عہدی سے معزول بھی کرایا تھا۔ لہٰذا معتصم باللہ کے بیٹے احمد کو تخت پر بٹھایا گیا اور

مستعین باللہ اس کا خطاب تجویز ہوا۔ مستعین باللہ نہایت نیک، فاضل ادیب اور فصیح و بلیغ شخص تھا۔ ٦ ربیع الآخر سنہ ۲۴۸ھ کو تخت نشین ہوا۔ جب مستعین باللہ کو تخت نشین کرنے کے لیے قصر خلافت کی طرف لے چلے تو محمد عبداللہ بن طاہر اور اس کے ہمراہ اور عام لوگوں نے شور و غوغا مچا کر خروج کیا اور معتز کی خلافت کا مطالبہ پیش کیا۔ آخر ترکوں نے ان لوگوں کا مقابلہ کیا۔

لڑائی میں بہت سے غوغائی مارے گئے۔ بہت سے ہزیمت خوردہ اپنی جان بچا کر لے گئے۔ ادھر لڑائی ہو رہی تھی، ادھر ترک مستعین باللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ ہنگامہ فرو ہوا اور انعام وعہدے تقسیم ہونے لگے۔ محمد بن عبداللہ بن طاہر کے پاس بیعت کے لیے پیغام بھیجا گیا۔ اس نے بھی آ کر بیعت کر لی۔ تکمیل بیعت کے بعد خبر پہنچی کہ طاہر بن عبداللہ بن طاہر گورنر خراسان کا انتقال ہو گیا۔ خلیفہ مستعین باللہ نے محمد بن طاہر بن عبداللہ کو گورنر خراسان مقرر کیا۔

اسی عرصہ میں حسین بن طاہر بن حسین کا بھی انتقال ہو گیا جو خراسان کے شرقی حصہ کا حکمران تھا۔ اس کی جگہ محمد بن عبداللہ بن طاہر کو مامور کیا۔ اس کے چچا طلحہ کو نیشاپور کی اور اس کے بیٹے منصور کو سرخس اور خوارزم کی حکومت سپرد کی۔ حسین بن عبداللہ کو ہرات کی حکومت عطا کی اور اس کے چچا سلیمان بن عبداللہ کو طبرستان کی اور اس کے چچا زاد بھائی عباس کو جرجان و طالقان کی حکومت پر روانہ کیا۔

سنہ ۲۴۸ھ میں عبداللہ بن یحیٰی بن خاقان نے ادائے حج کی اجازت چاہی۔ خلیفہ نے اجازت مرحمت فرمائی مگر اس کے روانہ ہونے کے بعد ہی ایک سردار کو عبداللہ بن یحیٰی کے گرفتار وجلاوطن کرنے پر مامور کیا، جس نے اسے گرفتار کر کے رقہ میں جلاوطن کر دیا۔ انہیں ایام میں ترکوں نے معتز اور موید کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ احمد بن خصیب نے ان کو اس ناروا فعل سے منع کیا۔ خلیفہ مستعین نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی ترکوں کے ایک سردار تامش نامی کو وزارت کا عہدہ عطا کیا تھا اور احمد بن خصیب کو نائب وزیر بنایا تھا۔ معتز اور موید کو خلیفہ مستعین نے مقام جوسق میں نظر بند کر دیا۔ تامش کو وزارت کے علاوہ مصر و مغرب کی حکومت و نیابت بھی سپرد کی۔ بغا صغیر کو حلوان و ماسبذان کی سند حکومت دی، اشناس کو سپہ سالاری اور عمال سلطنت کی نگرانی کا کام سپرد ہوا۔ غرض تمام بڑے بڑے عہدے ترکوں کو دیے گئے۔

سنہ ۲۴۹ھ میں رومیوں نے ممالک اسلامیہ پر حملہ کیا۔ رومیوں کے مقابلہ میں عمر بن عبداللہ اور

علی بن یحییٰ دو مشہور سردار مع بہت سے مسلمانوں کے شہید ہوئے۔ ان دونوں سرداروں کی شہادت کا حال سن کر بغداد میں لوگوں کو سخت ملال و افسوس ہوا اور ترکوں کی نسبت شکایات زبان پر آنے لگیں کہ انہوں نے طاقت پا کر خلفا کو قتل اور شرفاء کو ذلیل کرنے کا کام تو کیا لیکن کفار کے مقابلے میں جہاد کرنے کی طرف سے غفلت برتی۔ اس لیے دو خادم اسلام سردار شہید ہو گئے اور رومیوں کی جرأت مسلمانوں کے مقابلے میں بڑھ گئی۔

اس قسم کی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد میں ایک قسم کی شورش سی برپا ہوگئی اور لوگوں نے جہاد کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ اطراف وجوانب سے بھی مسلمان بہ عزم جہاد آ آ کر شریک ہونے لگے۔ مسلمان امراء نے روپیہ بھی جمع کر دیا۔ ایک جم غفیر بغداد سے بہ غرض جہاد نکل کر کھڑا ہوا۔ مستعین نے سامرہ پہنچ کر بھی اسی قسم کی شورش برپا کر دی اور جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ اس کے بعد ترکی سردار بغا، وصیف اور اتامش ترکی فوج لے کر ان مسلمانوں کے مقابلے پر آئے۔ عوام الناس کا ایک گروہ کثیر مقتول ہوا اور جوش وخروش فرو ہو گیا۔ اتامش چونکہ زیادہ قابو یافتہ اور خزانہ شاہی میں تصرف کرنے کا بھی اختیار رکھتا تھا، لہٰذا بغا اور وصیت اس سے رقابت رکھتے تھے۔ انہوں نے اتامش کے بعد عبداللہ بن محمد بن علی کو عہدہ وزارت عطا کیا۔ چند روز کے بعد بغا صغیر اور ابوصالح عبداللہ بن محمد بن علی وزیر دونوں میں ناراضی پیدا ہوئی۔

ابوصالح عبداللہ، بغا صغیر کے خوف سے سامرہ چھوڑ کر بغداد بھاگ گیا اور خلیفہ مستعین نے محمد بن فضل جرجانی کو وزیر بنایا۔ غرض خلیفہ مستعین بالکل ترکوں کے ہاتھ میں تھا۔ سامرہ میں سب ترک ہی آباد تھے۔ اس لیے ترکوں کے قبضہ سے نکلنے کی کوئی کوشش بھی خلیفہ نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں حالات میں یحییٰ بن عامر بن یحییٰ بن حسین بن زید شہید نے جن کی کنیت ابوالحسین تھی، کوفہ میں خروج کیا۔ کوفہ میں محمد بن عبداللہ بن طاہر کی جانب سے ایوب بن حسین بن موسیٰ بن جعفر بن سلیمان بن علی والی کوفہ تھا۔ ابوالحسین نے ایوب کو کوفہ سے نکال دیا اور شاہی بیت المال لوٹ لیا اور کوفہ پر قابض ومتصرف ہو گئے۔

ابوالحسین نے کوفہ سے واسط کی طرف کوچ کیا۔ محمد بن عبداللہ بن طاہر نے حسین بن اسماعیل بن ابراہیم بن مصعب کو روانہ کیا۔ راستے میں لڑائی ہوئی۔ ابوالحسن حسین بن اسماعیل کو شکست دے کر کوفہ میں واپس آ گئے اور اہل بغداد بھی ان کی امداد پر آمادہ ہو گئے۔ حسین بن اسماعیل اپنا لشکر

مرتب کر کے دوبارہ ابوالحسین یحییٰ بن عمیر پر حملہ آور ہوا۔ کوفہ سے نکل کر یحییٰ نے مقابلہ کیا۔ سخت لڑائی کے بعد ابوالحسین یحییٰ بن عمر مارے گئے۔ ان کا سر کاٹ کر سامرہ میں خلیفہ مستعین کے پاس بھیجا گیا۔ جس کو مستعین نے ایک صندوق میں بند کرا کر اسلحہ خانہ میں رکھوا دیا۔ ابوالحسین یحییٰ ۱۵ رجب سنہ ۲۵۰ھ کو مقتول ہوئے۔

ابوالحسین پر فتح پانے کے صلہ میں خلیفہ مستعین نے عبداللہ بن طاہر کو طبرستان میں جاگیریں عطا فرمائیں جن میں ایک جاگیر حدود دیلم کے قریب تھی۔ اس جاگیر پر قبضہ کرنے کے لیے جب محمد بن عبداللہ کا عامل گیا تو رستم نامی ایک شخص نے مخالفت کی۔ آخر دیلم والے اس مخالفت میں رستم اور اس کے دونوں بیٹوں محمد و جعفر کے طرفدار ہو گئے۔ طبرستان میں اس زمانہ میں محمد بن ابراہیم علوی موجود تھے۔ محمد و جعفر دونوں بھائیوں نے اس کے پاس آ کر کہا کہ آپ امارت کا دعویٰ کیجیے، ہم آپ کے حامی ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ تم رے میں جا کر حسن بن زید بن محمد بن اسماعیل بن حسن بن زید بن حسن سبط کی خدمت میں درخواست پیش کرو، وہ ہمارے سردار اور مقتدا ہیں۔

محمد بن جعفر نے اپنے باپ رستم سے آ کر کہا۔ اس نے ایک آدمی رے بھیجا۔ وہاں سے حسن بن زید طبرستان چلے آئے۔ یہاں دیلم و ریان وغیرہ سے لوگ آ آ کر بیعت ہونے شروع ہوئے۔ ایک جم غفیر فراہم ہو گیا اور حسن بن زید نے علاقہ طبرستان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد رے بھی قبضہ میں آ گیا۔ یہ خبر سن کر مستعین نے ہمدان کو بچانے کے لیے ایک لشکر بھیجا، جس کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد موسیٰ بن بغا کبیر کو دارالخلافہ سے مع فوج روانہ کیا گیا۔ اس نے طبرستان کو تو حسن بن زید کے قبضہ سے نکال لیا مگر دیلم پر حسن بن زید کا قبضہ رہا۔ موسیٰ وہاں سے رے کی طرف واپس چلا آیا۔ انہیں ایام میں خلیفہ مستعین نے دلیل بن یعقوب نصرانی کو اپنا وزیر بنایا۔ چند روز کے بعد باغر نامی ایک ترک کو دلیل نصرانی وزیر سے کوئی شکایت پیدا ہوئی۔ اس معاملہ میں بغا صغیر اور وصیف نے باغر کو مجرم بتایا۔ خلیفہ نے اس کو قید کر دیا۔ ترکوں نے شورش برپا کی۔ ترکوں کی اس شورش کو دیکھ کر بغا صغیر نے باغر کو قتل کرا دیا۔ اس سے بجائے فرو ہونے کے شورش اور بھی ترقی کر گئی۔ تمام سامرا باغی ہو گیا اور ہر طرف بلوائیوں کے جھنڈے نظر آنے لگے۔ مجبوراً خلیفہ مستعین، بغا، وصیف، شاہک اور احمد بن صالح شیرازو سامرا سے نکل کر بغداد چلے آئے اور محرم سنہ ۲۵۱ھ میں بغداد کے اندر محمد بن عبداللہ بن طاہر کے مکان میں فروکش ہوئے۔ خلیفہ کے آنے کے بعد دفتر کے آدمی بھی

دفاتر لے کر بغداد میں ہی آ گئے۔

خلیفہ کے بغداد چلے جانے کے بعد ترکوں کو پشیمانی ہوئی اور سامرا سے چھ ترک سردار بغداد میں خلیفہ کے پاس آ کر ملتجی ہوئے کہ آپ سامرا میں ہی تشریف لے چلیں، ہم سب اپنی ناشائستہ حرکات سے پشیمان اور معافی کے خواہاں ہیں۔ خلیفہ مستعین نے ترکوں کو ان کی بے وفائیاں اور گستاخیاں یاد دلا کر سامرہ جانے سے انکار کیا۔ ترکوں نے سامرہ واپس جا کر معتز بن متوکل کو جیل سے نکالا اور اس کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی۔ ابو احمد بن ہارون الرشید بھی اس زمانے میں سامرہ میں موجود تھا۔ ابو احمد سے جب بیعت کے لیے کہا گیا تو اس نے کہا کہ میں چونکہ مستعین کے ہاتھ پر بیعت کر چکا ہوں اور معتز ولی عہدی سے اپنی معزولی خود تسلیم کر چکا ہے، لہٰذا میں بیعت نہیں کروں گا۔ معتز نے ابو احمد کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور زیادہ اصرار نہیں کیا۔

بغا کبیر کے دونوں بیٹوں موسیٰ و عبداللہ نے بھی معتز کی بیعت کر لی۔ اسی طرح جو لوگ معتز کی خلافت کو پسند کرتے تھے، وہ معتز کے پاس سامرا چلے گئے۔ جو مستعین کو پسند کرتے تھے، وہ سامرا سے بغداد چلے آئے۔ یہی حالت صوبوں کے عاملوں اور گورنروں کی ہوئی۔ کچھ اس طرف ہو گئے، کچھ اس طرف۔ بغداد و سامرہ دونوں جگہ دو الگ الگ خلیفہ تھے۔ مستعین کی طرف خاندان طاہریہ اور خراسانی لوگ زیادہ تھے۔ معتز کی جانب قریباً تمام ترک اور بعض دوسرے سردار بھی تھے۔ گیارہ مہینے تک جنگ و پیکار کا ہنگامہ دونوں خلیفوں میں برپا رہا۔ باہر کے صوبہ داروں سے دونوں خط و کتابت کرتے اور اپنی اپنی طرف ان کو مائل کرتے تھے۔ یہ جنگ سامرا و بغداد تک ہی محدود نہ رہی بلکہ باہر کے صوبوں میں بھی اس کے شعلے مشتعل ہونے لگے مگر زیادہ زور بغداد کے نواح میں رہا کیونکہ باہر والے دارالسلطنت کے نتائج کا انتظار کرتے تھے۔

آخر ماہ ذی قعدہ سنہ ۲۵۱ھ میں محمد بن عبداللہ بن طاہر نے جو بغداد میں مستعین کی فوجوں کا سپہ سالار تھا، ترکوں پر جو بغداد کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، ایسا سخت و شدید حملہ کیا کہ وہ ہزیمت پا کر فرار ہو گئے۔ بغا اور وصیف بغداد میں مستعین کے ساتھ تھے۔ اس حملہ میں یہ بھی محمد بن عبداللہ بن طاہر کے ساتھ اپنے چھوٹے چھوٹے دستوں کو لیے ہوئے تھے یعنی ترکوں کی بہت ہی قلیل تعداد جو ان دونوں ترک سرداروں کے مخصوص آدمیوں پر مشتمل تھی، مستعین کی فوج میں شامل تھی۔ بغا اور وصیف نے جب ترکوں کو شکست پا کر خراسانیوں اور عراقیوں کے مقابلے میں بھاگتا ہوا دیکھا تو ان کی قومی

عصبیت میں حرکت پیدا ہوئی اور فوراً جدا ہو کر ترکوں کی ہزیمت یافتہ فوج سے جا ملے، ان کے پہنچنے سے ترکوں کی ہمت بندھ گئی اور اپنی جمعیت کو درست کر کے پھر لوٹ پڑے اور دوبارہ بغداد کا محاصرہ کر لیا۔

ادھر شہر والوں نے محمد بن عبداللہ بن طاہر کے متعلق خبریں اڑانی شروع کر دیں کہ یہ دیدہ و دانستہ خلیفہ مستعین کو مشکلات میں مبتلا کر رہا ہے، جس سے محمد بن عبداللہ بھی کچھ سست ہو گیا۔ آخر ۶ محرم سنہ ۲۵۲ھ کو مستعین باللہ نے معتز باللہ کے پاس ایک تحریر بھیج دی جس میں معتز باللہ کی خلافت کو تسلیم کر کے خود خلافت سے دست برداری ظاہر کی تھی۔ خلیفہ معتز نے بغداد میں داخل ہو کر معزول خلیفہ مستعین کو واسط کی طرف نظر بند کر کے بھیج دیا۔ وہاں مستعین نو مہینے تک ایک امیر کی حراست میں رہا، پھر سامرہ میں واپس چلا آیا اور ۳ شوال سنہ ۲۵۲ھ کو خلیفہ معتز کے اشارے سے قتل کیا گیا۔[1]

معتز باللہ

معتز باللہ بن متوکل علی اللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید سنہ ۲۳۲ھ میں بمقام سامرہ ایک رومیہ ام ولد فتحیہ نامی کے بطن سے پیدا ہوا۔ محرم سنہ ۲۵۱ھ سامرا میں خلیفہ بنایا گیا۔ ایک سال مستعین باللہ سے جنگ آزما رہ کر مستعین کو خلع خلافت پر مجبور کرنے میں کامیاب ہوا۔ نہایت خوبصورت شخص تھا۔ جس سال یہ تخت نشین ہوا، اسی سال اشناس ترکی مرا تھا۔ اس نے پچاس ہزار دینار چھوڑے تھے جو معتز نے ضبط کر کے اپنا کاروبار چلایا۔ معتز جب تخت خلافت پر بیٹھا تو اس کی عمر انیس سال کی تھی۔ اس نے احمد بن اسرائیل کو وزیر بنایا۔ محمد بن عبداللہ بن طاہر کو بغداد کی پولیس پر مامور رکھا۔ محمد بن عبداللہ بن طاہر خراسان کا گورنر تھا مگر خراسان میں اس کا نائب رہتا تھا اور وہ خود بغداد میں مقیم تھا۔ معتز کو ترکوں ہی نے تخت خلافت پر بٹھایا تھا۔ وہ بالکل ترکوں سے دبا ہوا تھا۔ بغداد میں جو لشکر رہتا تھا، اس میں خراسانی اور عراقی لوگ تھے۔ اس لشکر کو وظیفے اور تنخواہیں محمد بن عبداللہ تقسیم کیا کرتا تھا۔ معتز نے اس تمام لشکر کو تنخواہیں اور وظیفے دینے بند کر دیے۔

---

1. یہ تھا ان خلفاء کا حال! کہ ایک طرف مستعین باللہ خود خلافت سے دست بردار ہو گیا اور دوسری طرف نئے خلیفہ معتز باللہ نے اسے قتل کرا دیا۔ حالانکہ اسے معاف کر دینا چاہیے تھا۔

ماہ رجب سنہ۲۵۲ھ میں خلیفہ معتز نے اپنے بھائی موید کو ولی عہدی سے معزول کر دیا اور جیل خانے بھجوا کر قتل کرا دیا۔[1] رمضان سنہ۲۵۲ھ میں لشکر بغداد نے تنخواہ وظائف نہ ملنے کے سبب سے بغاوت کی اور محمد بن عبداللہ بن طاہر کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے۔ بڑی مشکل سے یہ فساد محمد بن عبداللہ نے فرو کیا۔ اسی سال فوج کے ترکوں اور عربوں میں فساد ہوا۔ طرفین میں خوب خانہ جنگی برپا رہی۔ عربوں کا ساتھ اہل بغداد نے دیا مگر ترکوں نے آخر دھوکے سے عربوں اور ان کے سرداروں کو قتل اور جلاوطن کیا۔ اسی سال خلیفہ معتز نے حسین بن ابی شوراب کو قاضی القضاۃ کا عہدہ عطا کیا۔ چونکہ رعب خلافت اب اٹھ چکا تھا، اس لیے جابہ جا صوبہ داروں نے اپنے آپ کو خود مختار سمجھنا شروع کر دیا اور خارجیوں اور علویوں نے خروج شروع کر دیے۔ مساور بن عبداللہ بن مساور بجلی خارجی نے ولایت موصل پر قبضہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور جو سردار خلیفہ کی طرف سے اس کے مقابلہ کو گیا، شکست دے کر بھگا دیا۔

سنہ۲۵۳ھ میں ترکوں نے وصیف و بغا اور سیما طویل اپنے سپہ سالاروں سے کہا کہ ہم کو چار چار مہینے کی پیشگی تنخواہیں دلوا دو۔ انہوں نے کہا کہ خزانہ خالی پڑا ہے۔ تم کو تنخواہیں کہاں سے دی جائیں۔ ترکوں نے شورش برپا کی۔ ان سرداروں نے خلیفہ معتز سے عرض کیا، معتز خود مجبور تھا۔ کیا کر سکتا تھا۔ ترکوں نے وصیف کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ چند روز کے بعد بابکیال اور بغا صغیر میں رقابت پیدا ہو گئی۔ خلیفہ معتز بابکیال کے حال پر زیادہ مہربان رہنے لگا۔ بغا نے خلیفہ کے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس ارادے کی اطلاع معتز کو ہو گئی اور بابکیال کے آدمیوں نے بغا صغیر کو قتل کر دیا۔

محمد بن عبداللہ بن طاہر کی وفات:

محمد بن عبداللہ بن طاہر گورنر خراسان نے سنہ۲۵۳ھ میں بغداد کے اندر وفات پائی۔ محمد بن عبداللہ نے مرنے سے پیشتر اپنی قائم مقامی اور گورنری خراسان کے لیے اپنے بیٹے عبیداللہ کی نسبت وصیت کی تھی مگر عبیداللہ کے دوسرے بھائی طاہر بن محمد بن عبداللہ بن طاہر نے بھائی کی مخالفت کی۔ محمد بن عبداللہ کی نماز جنازہ پڑھانے پر ہی آپس میں لڑ پڑے۔ آخر وصیت کے موافق عبیداللہ ہی باپ کا قائم مقام تسلیم کیا گیا لیکن خلیفہ معتز نے پھر سلیمان بن عبداللہ بن طاہر کو محمد بن عبداللہ بن طاہر کا قائم مقام بنایا اور اس نے بغداد میں قیام کر کے مہمات متعلقہ کو انجام دینا شروع کیا۔

احمد بن طولون:

ترکی سرداروں میں بابکیال نامی سردار بھی بغا، وصیف اور سیما طویل کی طرح ایک سر برآوردہ اور نامی سردار تھا۔ اسی سال یعنی سنہ۲۵۳ھ میں معتز باللہ نے بابکیال کو مصر کی سند گورنری عطا کی۔ بابکیال نے اپنی طرف سے احمد بن طولون کو بطور نائب حکومت مصر پر مقرر کر کے بھیجا۔

طولون ایک ترک تھا جو لڑکپن میں فرغانہ کی لڑائی میں گرفتار ہو کر آیا تھا۔ اس نے خاندان خلافت میں پرورش پائی تھی اور غلامان شاہی میں شامل تھا۔ اس کے بیٹے احمد نے بھی دارالخلافہ میں پرورش پا کر امور سلطنت سے واقفیت حاصل کی تھی۔ بابکیال کو جب مصر کی سند گورنری ملی تو اس کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اپنی طرف سے کسی کو مصر کی حکومت پر مامور کر کے بھیجوں۔ اس کے مشیروں نے احمد بن طولون کا نام لیا۔ چنانچہ اس نے احمد بن طولون کو مصر بھیج دیا اور احمد نے مصر پر قبضہ کر کے وہاں کا انتظام کیا۔ جب معتز کے بعد خلیفہ مہدی نے بابکیال کو قتل کر کے یارکوج ترکی کو مصر کی گورنری عطا کی تو یارکوج نے بھی اپنی طرف سے احمد بن طولون کو مصر کی حکومت پر مامور رکھا۔ اس طرح احمد بن طولون حکومت مصر پر خوب مضبوطی سے قائم ہو گیا اور پھر اس کی اولاد وراثتاً مصر پر قائم رہی اور اپنا سکہ مصر میں چلایا۔ غرض سنہ۲۵۳ھ سے مصر کو بھی خلافت عباسیہ سے خارج ہی سمجھنا چاہیے، یا کم از کم یہ سمجھنا چاہیے کہ سنہ۲۵۳ھ سے مصر میں حکومت طولونیہ کی ابتداء ہوئی۔

یعقوب بن لیث صفار:

یعقوب بن لیث اور اس کا بھائی عمرو بن لیث دونوں سجستان میں تانبے اور پیتل کے برتنوں کی دکان کرتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں خلافت کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے جابجا بغاوتیں اور سرکشیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ اس لیے خوارج نے بھی خروج شروع کیا۔ ان کے مقابلے میں اہل بیت یعنی علویوں کے طرفدار بھی نکل کھڑے ہوئے۔ انہیں میں ایک شخص صالح بن نضر کنعانی بھی ہوا خواہی اہل بیت کا دعویٰ کر کے خروج پر آمادہ ہوا۔ اس کے گرد امراء و رؤسا اور عوام الناس کا ایک گروہ جمع ہو گیا۔ یعقوب بن لیث بھی اسی گروہ میں شامل ہو گیا۔ صالح نے لڑ بھڑ کر سجستان پر قبضہ کر لیا اور خاندان طاہریہ کے ارکان کو وہاں سے نکال دیا۔ اس کامیابی کے بعد ہی صالح کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد درہم بن حسن ایک شخص صالح کا جانشین و قائم مقام ہوا مگر گورنر خراسان نے اس

کو کسی حیلہ سے گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا۔ صالح کی جماعت نے یعقوب بن لیث کو اپنا امیر بنا لیا۔ یعقوب نے نہایت ہوشیاری اور شجاعت سے کام لے کر سجستان پر اپنا قبضہ مکمل کیا اور محمد بن عبداللہ بن طاہر کے عامل محمد بن اوس انباری کو جو ہرات کی حکومت پر متعین تھا، نکال دیا اور ہرات پر قبضہ کر کے خراسان کے علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔

اسی اثناء میں فارس کے گورنر علی بن حسین بن شبل نے کرمان پر قبضہ کرنا چاہا۔ ادھر سے یعقوب بن لیث نے بھی کرمان کو اپنے تصرف میں لانا چاہا۔ علی بن حسین کے سپہ سالاروں کو یعقوب بن لیث نے شکست دے کر بھگا دیا اور آخر فارس کے دارالسلطنت شیراز پر حملہ آور ہو کر سنہ ۲۵۵ھ میں شیراز پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد فوراً سجستان کی طرف واپس چلا گیا اور دربار خلافت میں ایک درخواست اس مضمون کی بھیج دی کہ اس علاقہ میں بڑی بدامنی پھیل رہی تھی، یہاں کے لوگوں نے مجھ کو اپنا امیر بنا لیا ہے۔ میں امیرالمومنین کا فرماں بردار ہوں۔ اس کے بعد خاندان طاہریہ سے یعقوب بن لیث نے بہ تدریج تمام خراسان کو خالی کرا لیا اور خود قابض و متصرف ہو کر اپنی مستقل حکومت قائم کی۔ طاہر بن حسین کی اولاد نے خراسان پر اب تک مسلسل حکومت کی تھی۔ اس لیے خراسان کی مستقل اسلامی سلطنتوں کے سلسلہ میں سب سے پہلے خاندان طاہریہ کا نام لیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ خاندان طاہریہ کا تعلق برابر دربار خلافت سے رہا اور اس خاندان کا کوئی نہ کوئی شخص بغداد کا افسر پولیس بھی ضرور رہا۔

خلفاء عباسیہ میں کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ خاندان طاہریہ کی حکومت سے خراسان کو نکال لے مگر طاہریہ خاندان ہمیشہ اپنے آپ کو خلفاء عباسیہ کا نوکر اور محکوم سمجھتا اور خلفاء عباسیہ سے سند گورنری حاصل کرتا اور خراج مقررہ بھی بھیجتا رہا لیکن یعقوب بن لیث نے جو حکومت قائم کی، یہ اپنی نوعیت میں طاہریہ سلطنت سے جداگانہ اور خودمختارانہ تھی جو دولت صفاریہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے تفصیلی حالات آئندہ اپنے مقام پر بیان ہوں گے، ان شاء اللہ!

معتز باللہ کی معزولی اور موت:

خلیفہ معتز ترک سرداروں کے قبضہ میں تھا۔ وہ جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ خزانہ بالکل خالی ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے سرداروں نے خزانہ پر خوب تصرف کر لیا تھا۔ فوج کے آدمی خلیفہ پر اپنے

وظائف کا تقاضا کرتے تھے۔ خلیفہ سخت مجبور تھا۔ آخر ایک روز ترکوں نے جمع ہو کر امیرالمومنین کے دروازے پر جا کر شوروغل مچایا اور کہا کہ ہم کو کچھ دلوایئے ورنہ ہم صالح بن وصیف کو جو آج کل آپ پر قبضہ کیے ہوئے ہے، قتل کر ڈالیں گے۔

صالح بن وصیف ایک ترک سردار تھا، خلیفہ اس سے بہت ہی ڈرتا تھا۔ اس شورش کو دیکھ کر معتز اپنی ماں فتحیہ رومی کے پاس گیا کہ کچھ مال ہو تو اس ہنگامہ کو فرو کر دوں۔ فتحیہ کے قبضے میں بہت سا مال تھا مگر اس نے دینے سے انکار اور ناداری کا عذر کیا۔ ترکوں نے صالح بن وصیف اور محمد بن بغا صغیر اور بابکیال کو اپنا شریک بنا لیا اور ان سرداروں کی معیت میں مسلح ہو کر قصر خلافت کے دروازے پر آئے اور معتز کو بلایا۔ خلیفہ معتز نے کہلا بھیجا کہ میں نے دوا پی ہے، بیمار اور بہت کمزور ہوں، باہر نہیں آ سکتا۔ یہ سن کر ترک قصر خلافت میں زبردستی گھس گئے اور خلیفہ معتز کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لائے۔ اس کو مارا، گالیاں دیں اور صحن مکان میں برہنہ سر دھوپ میں کھڑا کر دیا، پھر ہر ایک شخص جو گزرتا تھا، اس کے منہ پر طمانچہ مارتا تھا۔ یہاں تک کہ جب خلیفہ کی بے عزتی حد کو پہنچ گئی تو اس نے کہا کہ اب اپنی خلافت سے دست برداری لکھ دو۔ معتز نے اس سے انکار کیا تو قاضی القضاۃ حسین بن ابی شوراب کو بلایا اور اراکین سلطنت طلب کیے گئے۔ ایک محضر لکھا، اس پر قاضی صاحب اور تمام اراکین سلطنت سے دستخط کرائے اور معتز کو معزول کر کے ایک تہ خانہ میں بے آب و دانہ بند کر دیا، وہیں اس کا دم نکل گیا۔

یہ واقعہ ماہ رجب سنہ ۲۵۵ھ کا ہے اور معتز کی موت ۸ شعبان سنہ ۲۵۵ھ کو واقع ہوئی۔ اس کے بعد لوگوں نے بغداد سے معتز کے چچازاد بھائی محمد بن واثق کو بلا کر تخت سلطنت پر بٹھایا اور مہتدی باللہ کا خطاب دیا۔ خلیفہ معتز کی ماں اپنے بیٹے کی گرفتاری و بے حرمتی کا حال دیکھ کر ایک سرنگ کے راستے فرار ہو گئی اور سامرا میں کسی جگہ چھپ گئی تھی۔ جب مہتدی خلیفہ ہو گیا تو ماہ رمضان سنہ ۲۵۵ھ میں صالح بن وصیف سے جو خلیفہ مہتدی کا نائب السلطنت بنا ہوا تھا، امان طلب کر کے ظاہر ہوئی۔ صالح نے اس کے مال و دولت کا سراغ لگایا تو اس کے پاس سے ایک کروڑ تین لاکھ دینار اور اس سے بہت زیادہ کے جواہرات نکلے، حالانکہ پچاس ہزار دینار معتز مانگتا تھا اور اتنے ہی میں فوج کی شورش اس وقت فرو ہو سکتی تھی۔ صالح نے فتحیہ کے تمام مال و اسباب پر قبضہ کر کے کہا کہ اس کمبخت عورت نے پچاس ہزار دینار کے عوض میں اپنے بیٹے کو قتل کرا دیا۔ حالانکہ اس کے قبضے میں کروڑوں

دینار تھے۔ اس کے بعد صالح نے فتحیہ کو مکہ کی طرف بھیج دیا۔ وہ معتمد کے تخت نشین ہونے تک مکہ میں رہی۔ پھر سامرہ میں چلی آئی اور سنہ ۲۶۴ھ میں مر گئی۔

مہتدی باللہ

مہتدی باللہ بن واثق باللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید کا اصل نام محمد اور کنیت ابواسحاق تھی۔ اپنے دادا کے عہد خلافت سنہ ۲۱۸ھ میں پیدا ہوا اور ۳۷ سال کی عمر میں بہ تاریخ ۲۹ رجب سنہ ۲۵۵ھ تخت نشین ہوا۔ گندم گوں، دبلا پتلا، خوبصورت، عابد زاہد، عادل اور بہادر شخص تھا۔ احکام الٰہی کی پابندی کے رواج دینے میں بہت کوشاں تھا۔ تخت نشین ہونے کی تاریخ سے مقتول ہونے تک برابر روزہ رکھتا رہا مگر اس کو کوئی مددگار نہ ملا۔ اس نے ایسے خراب حالات پائے کہ خلافت اسلامیہ کے عزت و وقار کو دوبارہ واپس لانا سخت دشوار تھا۔ ہاشم بن قاسم کہتے ہیں کہ میں رمضان میں شام کے وقت مہتدی کے پاس بیٹھا تھا۔ جب میں چلنے لگا تو مہتدی نے کہا کہ بیٹھ جاؤ، میں بیٹھ گیا، پھر ہم نے افطار کیا، نماز پڑھی اور مہتدی نے کھانا طلب کیا تو ایک بید کی ڈلیا میں کھانا آیا۔ اس میں پتلی پتلی روٹیاں تھیں۔ ایک پیالی میں تھوڑا سا نمک، دوسری میں سرکہ اور تیسرے برتن میں زیتون کا تیل تھا۔ مجھ سے بھی کھانے کو کہا۔ میں نے کھانا شروع کیا اور دل میں سوچا کہ کھانا ابھی اور آتا ہوگا۔ اس لیے بہت آہستہ آہستہ کھانا شروع کیا۔ مہتدی نے میری طرف دیکھ کر کہا کہ کیا تمہارا روزہ نہ تھا؟ میں نے کہا کہ تھا، پھر پوچھا کہ کیا کل روزہ نہ رکھو گے؟ میں نے کہا کہ رمضان کا مہینہ ہے، روزہ کیوں نہ رکھوں گا۔ کہا کہ پھر اچھی طرح کھاؤ اور یہ امید نہ رکھو کہ اور کھانا آتا ہوگا کیونکہ اس کے سوا اور کھانا ہمارے یہاں نہیں ہے۔

میں نے تعجب سے کہا کہ امیر المومنین! یہ کیا معاملہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کو تمام نعمتیں عطا کی ہیں۔ مہتدی نے کہا: ''ہاں یہ سچ ہے مگر میں نے غور کیا تو بنو امیہ میں عمر بن عبدالعزیز کو پایا کہ وہ کم کھانے اور رعایا کی راحت رسانی کی فکر سے بہت ہی لاغر ہو گئے تھے، پھر میں نے اپنے خاندان پر غور کیا تو مجھ کو بڑی شرم آئی کہ ہم لوگ بنی ہاشم ہو کر ان کی مانند بھی نہ ہوں۔ اسی لیے میں نے یہ طرز اختیار کیا جو تم دیکھ رہے ہو۔'' مہتدی نے لہو و لعب کو سختی سے روک دیا تھا۔ گانے بجانے کو حرام

قرار دیا تھا۔ عاملان سلطانی کو ظلم کرنے سے سخت ممانعت کر دی تھی۔ دفتر کے معاملات میں سختی سے کام لیتا تھا۔ خود روزانہ اجلاس منعقد کرتا اور دربار عام میں انفصال مقدمات کا کام کرتا، منشیوں کو اپنے پاس بٹھا کر حساب کتاب کرتا تھا۔

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، مہتدی باللہ کو بھی ترکوں ہی نے خلافت پر بٹھایا تھا۔ صالح بن وصیف نے جو ترکوں میں سب سے زیادہ قابو یافتہ ہو رہا تھا، مہتدی باللہ کو تخت نشین کرنے کے بعد ہی احمد بن اسرائیل، زید بن معتز باللہ، ابونوح کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اور ان کے مال واسباب کو ضبط کر لیا، پھر حسن بن مخلد کو بھی گرفتار کر کے اس کا مال واسباب ضبط کر لیا۔ خلیفہ مہتدی باللہ کو جب ان حالات کی اطلاع ہوئی تو بہت رنجیدہ ہوا اور کہا کہ ان لوگوں کے لیے قید ہی مصیبت کیا کم تھی جو ان کو ناحق قتل کیا گیا۔ اس کے بعد خلیفہ مہتدی باللہ نے سامرا سے تمام لونڈیوں اور مغنیوں کو نکلوا دیا۔ محل سرائے شاہی میں جس قدر درندے پلے ہوئے تھے، سب کو مار ڈالنے اور کتوں کو نکلوا دینے کا حکم دیا۔ قلم دان وزارت سلیمان بن وہب کے سپرد کیا مگر صالح بن وصیف نے اپنی حکمت عملی اور خوش تدبیری سے سلیمان بن وہب کو بھی اپنے قابو میں کر لیا اور خود حکومت کرنے لگا۔ معتز کی معزولی اور مہتدی کی تخت نشینی کے وقت موسیٰ بن بغا دارالخلافہ میں موجود نہ تھا۔ وہ رے کی طرف گیا ہوا تھا۔ اس نے جب یہ سنا کہ صالح نے معتز کو معزول کر کے مہتدی کو خلیفہ بنا دیا ہے تو وہ معتز کے خون کا بدلہ لینے کا اعلان کر کے دارالخلافہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں آ کر دربار خلافت میں حاضری کی درخواست بھجوائی۔ صالح، موسیٰ کے آنے کی خبر سن کر روپوش ہو گیا تھا۔

موسیٰ کو خلیفہ نے اندر آنے کی اجازت دی۔ اس نے آتے ہی خلیفہ کو گرفتار کر کے اور ایک خچر پر سوار کرا کر قید خانہ میں لے جانا چاہا۔ مہتدی نے کہا کہ موسیٰ! اللہ تعالیٰ سے ڈر۔ آخر تیری نیت کیا ہے؟ موسیٰ نے کہا کہ میری نیت بہ خیر ہے۔ آپ یہ حلف لیجیے کہ صالح کی طرفداری نہ کریں گے۔ خلیفہ نے یہ حلف کر لیا۔ موسیٰ نے اسی وقت خلیفہ کی بیعت کر لی۔ اس کے بعد موسیٰ نے صالح کی تلاش شروع کی۔ خلیفہ نے یہ کوشش کی کہ موسیٰ اور صالح میں صلح ہو جائے۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ موسیٰ اور اس کے ہمراہیوں کو یہ شبہ گزرا کہ صالح کا پتہ خلیفہ کو معلوم ہے اور اسی نے صالح کو چھپا رکھا ہے۔ چنانچہ موسیٰ بن بغا کے مکان پر ترکوں کا جلسہ مشورت منعقد ہوا اور خلیفہ مہتدی کے قتل یا معزول کی تدبیریں سوچی گئیں۔ اس مجلس کا حال خلیفہ کو معلوم ہو گیا۔ اگلے دن سب کو دربار عام

میں بلوایا اور مسلح ہو کر دربار میں غضب آلود چہرہ کے ساتھ آیا۔ ترکوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''مجھ کو تمہارے مشورے کا حال معلوم ہو چکا ہے۔ تم مجھ کو دوسرے خلفاء کی طرح نہ سمجھنا۔ جب تک میرے ہاتھ میں تلوار ہے، تم میں سے بہت سوں کی جان لے لوں گا۔ میں وصیتیں کر آیا ہوں اور مارنے مرنے پر آمادہ ہوں۔ تم یاد رکھو! میری دشمنی تمہارے لیے باعث وبال ہو گی۔ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ مجھ کو صالح کا کوئی حال معلوم نہیں کہ کہاں روپوش ہے؟''

یہ سن کر لوگ خاموش رہے اور اس شورش میں سکون پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد موسیٰ نے منادی کرا دی کہ جو شخص صالح کو گرفتار کر کے لائے گا، وہ دس ہزار انعام پائے گا۔ اتفاقاً ایک جگہ صالح کا پتہ چل گیا۔ موسیٰ نے اس کو قتل کرا کر اس کا سر نیزہ پر رکھ کر شہر میں تشہیر کرایا۔ مہتدی کو یہ حرکت ناگوار گزری مگر ترکوں کی طاقت کے مقابلہ میں خلیفہ کچھ نہ کر سکتا تھا، سخت مجبور تھا۔ آخر خلیفہ نے بابکیال نامی ترک سردار کو لکھا کہ موقع پا کر موسیٰ کو قتل کر دو۔ بابکیال نے یہ خط موسیٰ کو دکھا دیا۔ موسیٰ فوج لے کر قصر خلافت پر چڑھ آیا۔ ادھر اہل مغرب اور اہل فرغانہ نے خلیفہ مہتدی کی طرف سے مدافعت کی، متعدد لڑائیں ہوئیں۔

بابکیال اس عرصہ میں مقید ہو کر خلیفہ مہتدی کی قید میں آ چکا تھا۔ خلیفہ مہتدی نے بابکیال کو قتل کرا کر اس کا سر ترکوں کی طرف پھینک دیا۔ اس سے مخالف ترکوں کا جوش اور بھی بڑھ گیا اور وہ ترک جو فرغانہ وغیرہ کے خلیفہ کی فوج میں شامل تھے، بابکیال کے قتل سے ناراض ہو کر موسیٰ کی فوج میں جا ملے۔ جس زمانے میں ترکوں نے خلیفہ مہتدی کا محاصرہ کر رکھا تھا، بغداد و سامرا اور دوسرے مقامات کی رعایا خلیفہ مہتدی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی کیونکہ رعایا اس خلیفہ کے عدل و انصاف سے بہت خوش تھی اور خلیفہ صالح کے لقب سے یاد کرتی تھی مگر اس کا نتیجہ مہتدی کے خلاف نکلا۔ خلیفہ کو شکست ہوئی اور ترکوں نے اس کو گرفتار کر کے خصیتین دبا کر مار ڈالا۔ یہ حادثہ ۱۴ رجب سنہ ۲۵۶ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ خلیفہ مہتدی نے پندرہ دن کم ایک سال خلافت کی اور ۳۸ سال کی عمر میں مقتول ہوا۔ اس کے بعد ترکوں نے ابوالعباس احمد بن متوکل کو جو مقام جوسق میں قید تھا، قید سے نکال کر تخت نشین کیا۔ اس کے ہاتھ پر بیعت کی اور معتمد علی اللہ کا لقب تجویز کیا۔

معتمد علی اللہ

معتمد علی اللہ بن متوکل علی اللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید سنہ ۲۲۹ھ میں ایک رومیہ ام ولد فتیان نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ خلیفہ معتمد نے عبیداللہ بن یحییٰ بن خاقان کو وزارت کا عہدہ عطا کیا۔ یہ عبیداللہ سنہ ۲۶۳ھ میں گھوڑے سے گر کر مرا اور قلمدان وزارت محمد بن مخلد کو ملا۔

علویوں کا خروج:

سنہ ۲۵۶ھ میں ابراہیم بن محمد بن یحییٰ بن عبداللہ بن محمد بن حنفیہ بن علی بن ابی طالب معروف بہ ابن صوفی نے مصر میں اور علی بن زید علوی نے کوفہ میں دولت عباسیہ کے خلاف خروج کیا۔ ابن صوفی کو مصر میں کئی ہنگاموں اور لڑائیوں کے بعد ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مصر سے بھاگ کر مکہ میں آیا۔ وہاں کے عامل مکہ نے گرفتار کر کے احمد بن طولون کے پاس مصر بھیج دیا، اس نے قید کر دیا۔ کچھ مدت کے بعد قید سے رہا کر دیا۔ ابن صوفی مصر سے چھوٹ کر مدینہ میں آیا اور یہیں وفات پائی۔ علی بن زید نے کوفہ میں خروج کر کے وہاں کے عامل کو نکال دیا اور خود کوفہ پر متصرف ہو گیا۔ خلیفہ معتمد نے شاہ بن میکال نامی سردار کو کوفہ کی طرف بھیجا مگر اس نے علی بن زید کے مقابلے میں شکست کھائی۔ تب خلیفہ نے کیجور نامی سردار کو بھیجا۔ اس نے علی بن زید کو شکست دے کر شوال سنہ ۲۵۶ھ میں علی بن زید پر دوبارہ چڑھائی کی، لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں علی بن زید شکست کھا کر گرفتار ہوا اور کیجور اس کو دارالخلافہ کی طرف لے آیا۔ حسین بن زید علوی نے رے پر قبضہ کر لیا اور موسیٰ بن بغا اس کے مقابلہ کو روانہ ہوا۔

علی نامی ایک شخص نے اپنے آپ کو اس سے چند روز پیشتر علوی ظاہر کر کے اول بحرین میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا، پھر احسا چلا آیا۔ وہاں بھی اپنے آپ کو علوی بتایا مگر سلسلہ نسب جو پہلے بتایا تھا، اس کو تبدیل کر دیا۔ چونکہ جا بہ جا علوی لوگ خروج کر رہے تھے، اس کے دل میں بھی امنگ پیدا ہوئی اور اپنے آپ کو علوی بتا کر لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں مصروف رہا۔ مگر ہر جگہ اس کے نسب کا راز فاش ہوتا رہا۔ یہ علوی نہ تھا۔ آخر بغداد میں اس نے چند غلاموں کو اپنے ساتھ ملایا اور ان کو ہمراہ لے کر بصرہ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اعلان کیا کہ جو زنگی غلام ہمارے پاس چلا آئے

گا، وہ آزاد ہے۔ اس اعلان کو سن کر زنگی غلاموں کا انبوہ کثیر اس کے گرد جمع ہو گیا۔

ان غلاموں کے آقا جب علی کے پاس آئے اور اپنے غلاموں کی نسبت اس سے گفتگو کرنی چاہی تو علی نے اشارہ کر دیا۔ زنگیوں نے اپنے آقاؤں کو گرفتار کر لیا، پھر علی نے ان کو چھوڑ دیا۔ علی کے جھنڈے کے نیچے زنگی غلاموں کی جمعیت ہر روز ترقی کرتی رہی اور علی ان کو ملک گیری اور تیغ زنی کی ترغیب اپنی پر جوش تقریروں سے دیتا رہا، پھر قادسیہ اور اس کے نواح کو لوٹ کر بصرہ کی طرف آیا۔ اہل بصرہ نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ اس کے بعد بصرہ والوں نے بار بار مقابلہ کی تیاری کی اور ہر مرتبہ شکست ہی کھائی۔

زنگیوں کی فوج نے بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ دربار خلافت سے ابوہلال ترکی چار ہزار کی جمعیت کے ساتھ مامور ہوا۔ نہر ریان پر مقابلہ ہوا۔ زنگیوں نے اس کو بھی شکست دے کر بھگا دیا۔ غرض زنگیوں نے نہ صرف بصرہ بلکہ ایلہ واہواز اور دوسرے مقامات پر تصرف کر لیا۔ بار بار دربار خلافت سے ترکی سردار فوجیں لے کر آئے اور ہر مرتبہ شکست کھا کر واپس گئے۔ آخر سعید بن صالح نے شکست دے کر زنگیوں کو بصرہ سے نکالا مگر زنگیوں نے ۱۵ شوال سنہ ۲۵۷ ھ کو بہ زور تیغ بصرہ پر قبضہ حاصل کر کے تمام بصرہ کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ بڑی بڑی قیمتی اور خوبصورت عمارتیں جل کر خاکستر اور مٹی کا ڈھیر بن گئیں۔ لوٹ مار کی انتہا نہ تھی۔ جو سامنے آیا، وہ قتل کیا گیا۔

یہ حالات سن کر خلیفہ معتمد نے محمد معروف بہ مولد کو ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ اس کا مقابلہ زنگیوں نے بصرہ سے نکل کر نہر معقل پر کیا۔ لشکر مولد کو شکست دے کر بھگا دیا اور تمام مال واسباب لوٹ کر بھاگتے ہوؤں کو قتل کیا پھر نہر معقل کی طرف واپس آ گئے۔ اس کے بعد خلیفہ معتمد نے منصور بن جعفر خیاط کو زنگیوں کے مقابلہ پر مامور کیا۔ زنگی اپنے سردار علی بن ابان کی ماتحتی میں مقابلہ پر آئے، سخت معرکہ ہوا۔ صبح سے دوپہر تک برابر تلوار چلی۔ آخر منصور بن جعفر کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ اس خبر کو سن کر خلیفہ معتمد باللہ نے اپنے بھائی ابواحمد موفق کو جسے وہ مکہ مکرمہ کی گورنری پر مامور کر چکا تھا، مکہ مکرمہ سے بلایا اور اس کو مصر، قنسرین وعواصم کی سند گورنری دے کر زنگیوں کے مقابلہ پر مامور کیا اور اس کے ساتھ ہی مفلح کو بھی ایک فوج دے کر بھیجا۔ یہ دونوں زنگیوں کے مقابلہ کو روانہ ہوئے۔

زنگیوں سے لڑائی ہوئی اور مفلح مارا گیا اور اس کے ہمراہی فرار ہونے لگے۔ اس سے موفق کے

ہمراہیوں میں بھی پریشانی اور بے ترتیبی نمودار ہوئی۔ آخر موفق نے طرح دے کر اپنے لشکر کو بچایا اور ترتیب دے کر نہر ابوخصیب کے کنارے آ کر زنگیوں سے نبرد آزما ہوا۔ زنگیوں کو شکست دی اور ان کی جمعیت کو پریشان کر کے بہت سوں کو گرفتار وقید کر کے اور بہت سے قیدیوں کو ان کی قید سے چھڑا کر واپس سامرا میں آیا مگر اس شکست سے زنگیوں کا فتنہ فرو نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنی جمعیت فراہم کر کے پھر قتل وغارت کا بازار گرم رکھا اور سنہ ۲۷۰ تک اسی طرح بصرہ اور عراق کے اکثر حصہ پر مستولی رہے۔

یعقوب بن لیث کی گورنری:

معتمد کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال یعنی سنہ ۲۵۶ھ میں محمد بن واصل بن ابراہیم تمیمی نے جو اصل میں عراق عرب کا باشندہ تھا اور بہت دنوں سے فارس میں رہتا تھا، بعض کردوں کو اپنے ساتھ شامل کر کے فارس کے گورنر حرث بن سیما کو قتل کیا اور صوبہ فارس پر قابض ومتصرف ہو گیا۔ ادھر یعقوب بن لیث صفار کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ فارس پر حملہ آور ہوا۔ موفق نے اس وقت فارس کو یعقوب بن صفار کے پنجے سے بچانا ضروری سمجھ کر یعقوب بن لیث کے پاس طخارستان وبلخ کی سند گورنری معتمد سے لکھوا کر بھجوا دی اور کہلا بھیجا کہ تم فارس کا خیال ترک کر دو اور بلخ وطخارستان میں اپنی حکومت قائم کرو۔ یعقوب بن لیث نے اس کو بہت غنیمت سمجھا اور بلخ وطخارستان کا بہ خوبی انتظام کر کے کابل پہنچا اور رتبیل کو گرفتار کیا۔ اس کے بعد خلیفہ کی خدمت میں تحائف وہدایہ روانہ کیے۔

پھر سجستان آیا، سجستان سے ہرات اور ہرات سے خراسان کے شہروں کو قبضہ میں لانے لگا۔ سنہ ۲۵۹ھ میں یعقوب بن لیث نے خراسان پر قبضہ کر کے وہاں سے خاندان طاہریہ کے افراد کو خارج کر دیا۔ خلیفہ معتمد نے ایک تہدید آمیز فرمان بھیجا کہ تم انہیں شہروں پر قانع رہو جن کی سند گورنری تم کو دی گئی ہے۔ خراسان پر تصرف نہ کرو مگر یعقوب نے اس فرمان پر کوئی التفات نہ کیا۔ سنہ ۲۶۰ھ میں حسن بن زید علوی نے دیلم سے فوج لے کر یعقوب پر حملہ کیا۔ سخت لڑائی کے بعد حسن بن زید ہزیمت پا کر دیلم کی طرف واپس گیا اور یعقوب نے ساریہ اور آمل پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سجستان کی طرف چلا گیا۔

بغاوت موصل:

معتمد نے موصل کی گورنری پر ایک سردار اساتگین کو مامور کیا۔ ترکوں نے اہل موصل پر ظلم وزیادتی شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل موصل نے یحییٰ بن سلیمان کو اپنا امیر و حاکم بنا لیا اور ترکوں کو مار کر نکال دیا۔ خلیفہ کو اس بغاوت کا حال معلوم ہوا۔ ترکوں کی فوج بھیجی گئی، سخت سخت معرکے ہوئے مگر انجام یہ ہوا کہ خلیفہ کی فوج یعنی ترکوں کو ناکامی ہوئی اور موصل میں یحییٰ بن سلیمان کی حکومت قائم ہوگئی۔ یہ واقعہ سنہ ۲۶۰ھ اور سنہ ۲۶۱ھ کا ہے۔

ابن مصلح، ابن واصل اور ابن لیث صفار:

سنہ ۲۵۶ھ میں جب یعقوب بن لیث نے محمد بن واصل سے صوبہ فارس کے چھین لینے کے لیے چڑھائی کی تو خلیفہ نے بلخ و طخارستان کی گورنری اس کو دے کر واپس کر دیا تھا کہ یعقوب کا قبضہ فارس کے صوبہ پر نہ ہو، اور خود عبدالرحمٰن بن مفلح کو فوج دے کر روانہ کیا کہ محمد بن واصل سے صوبہ فارس چھین کر قبضہ کرو۔ عبدالرحمٰن اور محمد کی لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ عبدالرحمٰن بن مفلح کی کمک پر خلیفہ نے طاشتمر ترکی کو بھی مامور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طاشتمر ترکی میدان جنگ میں مارا گیا اور سنہ ۲۶۲ھ میں محمد بن واصل نے عبدالرحمٰن بن مفلح کو گرفتار کر لیا۔ اب خلیفہ معتمد نے محمد بن واصل سے خط و کتابت شروع کی اور عبدالرحمٰن بن مفلح کی رہائی کے متعلق تحریک کی۔ محمد بن واصل نے خلیفہ کے خطوں کا تو کوئی جواب نہ دیا مگر عبدالرحمٰن بن مفلح کو قتل کر کے شہر واسط پر حملہ کی تیاری شروع کر دی، جہاں موسیٰ بن بغا بمع فوج مقیم تھا۔ محمد بن واصل واسط کی طرف چلا تو راستے میں ابراہیم بن سیما اہواز میں سدراہ ہوا۔

ادھر سے ابوالساج نے جس کو خلیفہ نے صوبہ فارس کی سند گورنری انہیں ایام میں دی تھی، اپنے داماد عبدالرحمٰن کو محمد بن واصل کے مقابلہ اور صوبہ فارس پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ابوالساج خود زنگیوں کی جنگ میں مصروف تھا، جنہوں نے بصرہ اور اس کے نواح میں شورش برپا کر رکھی تھی۔ ابوالساج کا داماد عبدالرحمٰن جب فوج لے کر چلا تو راستے میں زنگیوں کے سردار علی بن ابان سے اتفاقاً مڈبھیڑ ہوگئی۔ علی بن ابان نے عبدالرحمٰن کو شکست دے کر مار ڈالا۔ محمد بن واصل اہواز میں ابراہیم سیما کے مقابلہ میں صف آراء ہوا۔ اسی اثناء میں خبر پہنچی کہ یعقوب بن لیث صفار سجستان سے فوج

لے کر حملہ آور ہوا ہے۔ محمد بن واصل تمیمی، ابراہیم بن سیما کے مقابلہ سے منہ موڑ کر فارس کی طرف لوٹا۔ آخر ابن صفار اور محمد بن واصل کا مقابلہ ہوا۔ ابن واصل کو شکست ہوئی۔ وہ میدان جنگ سے اپنی جان بچا کر بھاگا اور یعقوب بن صفار نے تمام صوبہ فارس پر قبضہ کر لیا۔ خراسان پہلے ہی اس کے قبضہ میں آ چکا تھا۔ اب سنہ ۲۶۱ھ میں فارس پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔

دولت سامانیہ کی ابتدا:

سامانی خاندان کا حال تو تفصیلی طور پر آگے بیان کیا جائے گا لیکن محض یاددہانی اور سلسلہ کو مربوط رکھنے کے لیے اس جگہ اس کی ابتدا کا حال بیان کر دینا ضروری ہے۔ اسد بن سامان خراسان کے ایک نامور اور ذی عزت خاندان کا شخص تھا۔ اسد بن سامان کے چار بیٹے تھے: نوح، احمد، یحییٰ اور الیاس۔ جس زمانہ میں مامون الرشید خراسان کے دارالسلطنت مرو میں مقیم تھا: اسی زمانہ میں یہ چاروں بھائی مامون الرشید کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مامون الرشید نے اپنے وزیراعظم فضل بن سہل کی تجویز کے موافق ان چاروں کو اچھے اچھے عہدوں پر مامور کیا۔ جب مامون الرشید خراسان میں غسان بن عباد کو اپنا نائب السلطنت اور حاکم خراسان بنا کر بغداد کی جانب روانہ ہوا تو غسان بن عباد نے نوح کو سمرقند کی، احمد کو فرغانہ کی، یحییٰ کو شاش واشروسنہ کی اور الیاس کو ہرات کی حکومت پر مامور کیا۔

جب مامون الرشید نے طاہر بن حسین اپنے مشہور سپہ سالار کو خراسان کی حکومت پر مامور کر کے بھیجا تو طاہر بن حسین نے بھی ان چاروں بھائیوں کو بدستور مامور رکھا۔ اس کے بعد نوح بن اسد کا جب انتقال ہوا تو طاہر بن حسین نے سمرقند کے علاقے کو یحییٰ اور احمد کے علاقوں میں شامل کر دیا۔ اس کے چند روز بعد الیاس نے عبداللہ بن طاہر کے عہد گورنری میں وفات پائی تو عبداللہ بن طاہر نے الیاس کے بیٹے ابواسحاق محمد کو اس کے باپ کی جگہ ہرات کی حکومت عطا کی۔ احمد بن اسد کے سات بیٹے تھے: نصر، یعقوب، یحییٰ، اسماعیل، ابوالاشعث، ابوخانم حمید اور اسد۔ جب احمد بن اسد کا انتقال ہوا تو سمرقند کے صوبہ کی حکومت اس کے بڑے بیٹے نصر کو ملی۔

نصر اس صوبہ پر خاندان طاہریہ کے خراسان سے بے دخل ہونے اور یعقوب بن لیث صفار کے قابض ومتصرف ہونے تک حکومت کرتا رہا اور قابض ومتصرف رہا۔ سنہ ۲۶۱ھ میں خلیفہ معتمد علی

اللہ نے نصر کے پاس صوبہ سمرقند کی سند گورنری بھیج دی۔ اب تک اس صوبہ کے حاکم کو حاکم خراسان ہی کے یہاں سے سند حکومت ملا کرتی تھی لیکن ملک خراسان کے قبضہ سے نکل جانے اور یعقوب بن صفار کے قبضہ میں چلے جانے کے باعث خلیفہ نے مناسب سمجھا کہ کم از کم علاقہ ماوراء النہر ہی میں ہماری سیادت قائم رہے۔ اس لیے براہ راست دربار خلافت سے نصر کے پاس سند حکومت بھیجی گئی اور لکھا گیا کہ یعقوب بن صفار سے اس ملک کی حفاظت کرو۔ نصر نے اپنے بھائی اسماعیل کو بخارا کی امارت عطا کی اور خود سمرقند میں حکومت کرتا رہا۔ سنہ ۲۷۵ھ میں ان دونوں بھائیوں میں ناراضی پیدا ہوئی، لڑائی تک نوبت پہنچی۔ اسماعیل نے فتح پائی۔ نصر گرفتار ہو کر اسماعیل کے سامنے آیا تو اسماعیل نے دوڑ کر بھائی کی قدم بوسی کی اور اس کو تخت پر بٹھا کر خود اس کی فرماں برداری کا اقرار کیا اور پھر بہ دستور سابق دونوں بھائی حکومت کرنے لگے۔ اسی اسماعیل نے دولت سامانیہ کی بنیاد قائم کی، جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

ولی عہدی کی بیعت:

ماہ شوال سنہ ۲۶۱ھ میں خلیفہ معتمد نے ایک دربار عام منعقد کیا اور تمام اراکین دربار کے روبہ رو اس بات کا اعلان کیا کہ میرے بعد میرا بیٹا جعفر ولی عہد سلطنت ہے اور اس کے بعد میرا بھائی ابو احمد موفق مستحق خلافت ہے لیکن اگر میری وفات تک جعفر بالغ نہ ہو تو پھر موفق ہی تخت خلافت کا مالک ہو گا اور اس کے بعد جعفر مستحق خلافت سمجھا جائے گا۔ چنانچہ اسی قرارداد پر سب سے بیعت لی گئی۔ جعفر کو مفوض الی اللہ کا خطاب دیا گیا اور افریقہ، مصر، شام، جزیرہ، موصل و آرمینیا کی حکومت اس کو دی گئی اور موسیٰ بن بغا کو اس کا نائب مقرر کیا گیا۔ ابو احمد کو الناصر لدین اللہ الموفق کا خطاب دے کر بلاد شرقیہ بغداد، کوفہ، طریق مکہ، یمن، کسکر، اہواز، فارس، اصفہان، رے، زنجان اور سندھ کی حکومت عطا کی۔ ان دونوں ولی عہدوں کے لیے دو سفید جھنڈے بنائے گئے۔ اس بیعت ولی عہدی کے بعد خلیفہ معتمد نے اپنے بھائی موفق کو زنگیوں کی سرکوبی پر مامور کیا۔

جنگ صفار:

موفق ابھی زنگیوں کی جانب روانہ نہیں ہونے پایا تھا کہ خلیفہ کے پاس خبر پہنچی کہ یعقوب بن صفار خراسان کے قبضہ و انتظام سے فارغ ہو کر دارالخلافہ کی طرف فوجیں لیے ہوئے بڑھ

رہا ہے۔ یہ سن کر سب پریشان ہو گئے۔ موفق برادر خلیفہ کا ارادہ بھی زنگیوں کی طرف جانے کا ملتوی ہو گیا۔ خلیفہ نے خود دارالخلافہ سے کوچ کر کے مقام زعفرانیہ میں قیام کیا اور اپنے بھائی موفق کو ابن صفار کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ موفق کے میمنہ میں موسیٰ بن بغا اور میسرہ میں مسرور بلخی افسر تھا۔ قلب کی سرداری خود موفق کے ہاتھ میں تھی۔ صبح سے عصر کے وقت تک نہایت خوں ریز جنگ ہوئی۔ کبھی ابن صفار کی فوج پیچھے ہٹ جاتی تھی، کبھی موفق کی۔ فتح و شکست کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا کہ اتنے میں خلیفہ نے موفق کی کمک کے لیے ایک اور فوج بھیج دی۔ اس تازہ دم امداد کے آ جانے سے یعقوب بن لیث کی فوج پر آثار ہزیمت نمودار ہو گئے۔ یعقوب بن صفار اور اس کی فوج میدان جنگ سے فرار ہو گئی۔ موفق کی فوج نے اس کی لشکر گاہ کو خوب لوٹا۔ ابن صفار میدان جنگ سے شکست کھا کر خوزستان کی طرف روانہ ہوا اور مقام جندی سابور میں جا کر قیام کیا۔ موفق، ابن صفار کا تعاقب نہیں کر سکا بلکہ واسط میں آ کر مقیم ہوا اور وہاں سے بیمار ہو کر بغداد چلا آیا۔

ادھر موفق اور ابن صفار مصروف جنگ تھے، ادھر محمد بن واصل نے جو پہلے ابن صفار سے شکست کھا کر اور صوبہ فارس چھنوا کر بھاگا ہوا تھا، موقع مناسب سمجھا اور اس نے خروج کر کے میدان خالی پا کر فارس پر قبضہ کر لیا۔ ابن صفار جب شکست کھا کر جندی سابور میں گیا تو زنگیوں نے ابن صفار کے پاس خط بھیجا اور اس کو خلیفہ کے خلاف جنگ کرنے کی ترغیب دے کر اپنی امداد کا وعدہ کیا۔ ابن صفار نے اس خط کے جواب میں ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ......﴾ آخر سورۃ تک لکھ کر بھیج دی اور ایک لشکر عمر بن سری کی افسری میں محمد بن واصل کے مقابلہ پر روانہ کر دیا۔ عمر بن سری نے محمد بن واصل کو فارس سے نکال کر فارس پر قبضہ کر لیا۔ معتمد نے یعقوب بن صفار کی لڑائی کے بعد موسیٰ بن بغا کو زنگیوں کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ ادھر ابن صفار نے ایک سردار کو اہواز کی طرف روانہ کیا۔ مقام اہواز پر خلیفہ بغداد، صفار اور زنگیوں کے تینوں لشکر آپس میں معرکہ آرا ہوئے۔ کوئی کسی کا طرفدار نہ تھا۔ یعقوب بن صفار جندی سابور سے سجستان کی طرف روانہ ہوا اور نیشاپور پر عزیز بن سری کو اور ہرات پر اپنے بھائی عمر بن لیث کو حاکم مقرر کر گیا۔ یہ سب سنہ ۲۶۱ھ کے واقعات ہیں۔

واسط پر زنگیوں کا قبضہ:

یعقوب بن صفار جندی سابور پر قبضہ کر کے اور اپنا ایک عامل مقرر کر کے سجستان کی جانب گیا تھا۔ ایک سردار کو اہواز کی جانب بھیجا گیا تھا۔ آخر اہواز پر زنگیوں نے ابن صفار کا قبضہ تسلیم کر لیا اور ابن صفار کے لشکر سے صلح کر کے وہ واسط کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہاں خلیفہ کی طرف سے ایک ترک سردار مامور تھا، زنگیوں نے اس کو شکست دے کر واسط پر قبضہ کر لیا اور شاہی فوجیں زنگیوں کے مقابلہ پر نہ ٹھہر سکیں۔ یہ واقعہ سنہ ۲۶۳ھ کا ہے۔

شام پر احمد بن طولون کا قبضہ:

سنہ ۲۶۴ھ میں ماجور نامی ایک ترک شام کی حکومت پر مامور تھا۔ اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے نے شام کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ احمد بن طولون یہ خبر سن کر مصر میں اپنے بیٹے عباس کو اپنا قائم مقام بنا کر خود دمشق کی طرف متوجہ ہوا۔ ترک زادے نے اطاعت اختیار کی اور ابن طولون نے سنہ ۲۶۴ھ میں دمشق اور اس کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا اور دو برس تک ملک شام میں قیام کر کے اس ملک کا ہر طرح اطمینان بخش انتظام کیا اور سنہ ۲۶۶ھ میں شام سے مصر کی طرف روانہ ہوا۔ اس طرح احمد بن طولون کی حکومت میں مصر و شام دونوں ملک آ گئے۔

یعقوب بن لیث صفار کی وفات:

یعقوب بن لیث صفار کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی۔ اگرچہ خراسان، طبرستان اور فارس میں احمد بن عبداللہ خجستانی، سعید بن اطہر، علی بن یحییٰ خارجی، حسن بن زید علوی، رافع بن ہرثمہ وغیرہ کئی دعویداران حکومت مصروف زور آزمائی تھے اور ہر ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتا تھا اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کون غالب اور کون مغلوب ہوگا؟ مگر بہ ظاہر یعقوب بن لیث صفاران میں سب سے زیادہ لائق، عالی حوصلہ اور طاقتور تھا، یعقوب بن لیث کے قبضہ میں ملک بھی بہت وسیع تھا۔ خلیفہ معتمد نے یہ دیکھ کر کہ شام کا ملک بھی نکل گیا، عراق کے بھی ایک بڑے حصے پر زنگیوں نے قبضہ کر رکھا ہے اور کسی طرح زیر ہونے میں نہیں آتے، ادھر خراسان وغیرہ صوبوں کی باقاعدہ سند حکومت دربار خلافت سے بھیج دی جائے تاکہ وہ اطاعت وفرماں برداری کے اقرار سے منحرف نہ ہو اور ملک میں انتظام قائم ہو جائے۔ اس کے متعلق بہ ذریعہ خط وکتابت سلسلہ جنبانی شروع ہو چکی تھی

کہ ۹ شوال سنہ ۲۶۵ھ کو یعقوب بن لیث صفار نے بہ عارضہ قولنج وفات پائی۔ یعقوب بن صفار کے پاس صوبہ فارس کی گورنری خلیفہ نے روانہ کر دی تھی، جو اس وقت پہنچی جب یعقوب بن صفار کا دم نکل رہا تھا۔ یعقوب کے بعد اس کا بھائی عمرو بن لیث صفار تخت نشین ہوا اور اس نے خلیفہ کی خدمت میں اطاعت و فرماں برداری کے اقرار کی عرضی روانہ کی۔ خلیفہ اس عرضی کو پڑھ کر بہت خوش ہوا اور عمرو بن لیث کے نام خراسان، اصفہان، سندھ، سجستان کی سند گورنری روانہ کر کے پولیس بغداد و سامرا کی افسری بھی عطا کی۔ ساتھ ہی خلعت بھی روانہ کیا۔ اس فرمان اور خلعت کا اثر یہ ہوا کہ عام طور پر لوگوں نے بطیّب خاطر عمرو بن لیث کی حکومت کو تسلیم کر لیا اور اس کی طاقت بڑھ گئی۔

موفق و معتضد کے ہاتھوں زنگیوں کا استیصال:

زنگیوں کی چیرہ دستی اور لشکر خلافت کا بار باران کے مقابلہ میں شکست پانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ قریباً دس سال ہو گئے تھے کہ زنگی برابر شاہی لشکر اور نامور سرداروں کو نیچا دکھا رہے تھے اور شہروں کے امن و امان کو غارت کر چکے تھے۔ ایک ایک زنگی نے دس دس اور پندرہ پندرہ علوی و ہاشمی عورتیں اپنے تصرف میں رکھ چھوڑی تھیں۔ بہبوذ اور غبیث نامی ان کے سردار منبروں پر چڑھ کر خلفاء راشدین، اہل بیت اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم سب کو گالیاں دیتے تھے۔ بہبوذ نے عالم الغیب ہونے کا دعویٰ کیا تھا، رسالت کا بھی مدعی تھا۔ قریباً ایک کروڑ مسلمانوں کو قتل کر چکے تھے۔ پیہم فتح مندی نے ان کی ہیبت دلوں پر طاری کر دی تھی۔ ترکوں کے غرور بہادری کو بھی انہوں نے خاک میں ملا دیا تھا۔

ترک ان کے نام سے لرزتے تھے۔ آخر خلیفہ معتمد کے بھائی موفق نے اپنے بیٹے ابوالعباس معتضد کو جو کہ بعد میں معتضد باللہ کے لقب سے خلیفہ ہوا، زنگیوں کی جنگ پر ماہ ربیع الثانی سنہ ۲۶۶ھ میں مامور کیا۔ ابوالعباس معتضد نے واسط کے قریب ایک سخت لڑائی کے بعد زنگیوں کو شکست فاش دی۔ یہ پہلی قابل تذکرہ شکست تھی جو زنگیوں نے لشکر خلافت کے مقابلہ میں کھائی۔ اس کے بعد موفق خود بھی بیٹے سے جا ملا اور باپ بیٹے نے مل کر زنگیوں کو پیہم شکستیں دینی شروع کیں۔ حتیٰ کہ چار سال تک برابر مصروف جنگ رہنے کے بعد سنہ ۲۷۰ھ کے ماہ صفر کی پہلی تاریخ کو زنگیوں کا سردار غبیث مارا گیا اور فتنہ کا مکمل استیصال ہو گیا تو شہر میں چراغاں کیا گیا اور بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ ادھر موفق اور معتضد دونوں باپ بیٹے زنگیوں کے مقابلہ میں مصروف تھے، ادھر

موصل میں خوارج نے اودھم مچا رکھی تھی۔ مساور خارجی جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، سنہ ۲۶۳ھ میں مارا جا چکا تھا۔ اس کے بعد اس کے مریدین و متبعین نے جمعیت فراہم کی اور ان کے دو گروہ ہو گئے۔ یہ دونوں گروہ آپس میں سنہ ۲۷۶ھ تک مصروف جنگ رہے مگر دربار خلافت سے اس علاقہ میں امن و امان قائم کرنے کی کوشش عمل میں نہیں آئی۔ اسی سے تمام ممالک محروسہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

خراسان کی طائف الملوکی:

یعقوب بن صفار کا جب انتقال ہوا تو خلیفہ معتمد نے اس کے بھائی عمرو بن لیث کو سند حکومت عطا کر دی مگر خراسان میں خاندان طاہریہ کے ہمدرد و ہوا خواہ موجود تھے۔ انہیں میں ایک شخص ابوطلحہ اور دوسرا رافع بن ہرثمہ تھا۔ یہ حسین بن طاہر کے نام سے جمعیت فراہم کر کے شہروں پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کی بنیاد قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ کبھی عمرو بن لیث کے عاملوں کو نکال کر شہروں پر قبضہ کرتے اور کبھی آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ ان معرکوں اور لڑائیوں میں اسماعیل بن احمد بن اسد بن سامان حاکم بخارا سے بھی مدد طلب کرتے تھے۔

اسماعیل سامانی کبھی ایک کا مددگار ہوتا، کبھی دوسرے کا اور کبھی عمرو بن لیث صفار کی مدد کے لیے موجود ہو جاتا۔ غرض ان ممالک میں ایک طوفان بدتمیزی برپا تھا۔ انہیں حالات میں سنہ ۲۷۱ھ میں موفق نے اپنی طرف سے صوبہ خراسان کی گورنری پر محمد بن طاہر کو مقرر کیا۔ خلیفہ معتمد جو اس سے پہلے عمرو بن لیث صفار کو خراسان کی گورنری دے چکا تھا۔ اس نے عمرو بن صفار کو خراسان کی حکومت سے معزول کر دیا۔ محمد بن طاہر خود تو بغداد ہی میں رہا۔ اپنی طرف سے رافع بن ہرثمہ کو جو پہلے ہی سے مصروف زور آزمائی تھا، حکومت خراسان عطا کر کے اپنا نائب بنا دیا مگر اس سے خراسان اور اس سے ملحقہ صوبوں کی بدامنی اور طوائف الملوکی میں کوئی فرق نہ آیا۔

ابن طولون کی وفات:

احمد بن طولون کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ اس کے قبضہ میں مصر و شام کے ملک تھے۔ خلیفہ معتضد برائے نام خلیفہ تھا۔ اس کا بھائی موفق اپنی عقلمندی اور شجاعت کے سبب سے تمام کاروبار خلافت پر حاوی تھا۔ معتمد نے ابن طولون سے خط و کتابت کر کے یہ چاہا کہ اس کی حمایت میں مصر چلا جائے۔

یہ سنہ ۲۶۹ھ کا واقعہ ہے جبکہ موفق زنگیوں کی جنگ میں مصروف تھا۔ موفق نے دوسرے سرداروں کی معرفت معتمد کو سمجھایا اور اس ارادے سے باز رکھا مگر ابن طولون سے ناراض ہو گیا۔

سنہ ۲۷۰ھ میں جب موفق زنگیوں سے فارغ ہوا تو اسی سال احمد بن طولون انطاکیہ میں علیل ہو کر فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا خمارویہ بجائے اپنے باپ کے شام و مصر کا حاکم ہوا۔ موفق نے اسحاق بن کنداج اور محمد بن ابوالساج کو ملک شام پر قبضہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ چنانچہ ان دونوں سرداروں نے ملک شام کے شہروں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ خمارویہ نے مقابلہ کے لیے فوج بھیجی۔ ان دونوں سرداروں نے لڑائی چھیڑنے میں تامل کیا اور مدافعت پر آمادہ رہے۔ یہ حال معلوم کر کے موفق نے اپنے بیٹے ابوالعباس معتضد کو شام کی طرف روانہ کیا۔ معتضد مصری فوج کو پیچھے ہٹا تا دمشق کو فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ خمارویہ خود مقابلہ پر آیا۔ ابوالعباس معتضد کو شکست ہوئی اور لوٹ کر دمشق آیا تو اہل دمشق نے شہر کا دروازہ نہ کھولا۔ مجبوراً طرطوس کی طرف گیا۔ خمارویہ دمشق میں آیا اور شام کے شہروں میں پھر اس کا سکہ وخطبہ جاری ہو گیا۔ اہل طرطوس نے ابوالعباس معتضد کو بغاوت کر کے نکال دیا اور خمارویہ کا خطبہ جاری کیا۔ ابوالعباس بحالت پریشان وتباہ بغداد میں واپس آیا۔

طبرستان کے حالات (علوی، رافع اور صفار):

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ اہل دیلم کی امداد واعانت سے طبرستان میں حسن بن زید علوی کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ماہ رجب سنہ ۲۷۰ھ میں حسن بن زید کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد محمد بن زید اس کا بھائی حاکم طبرستان ہوا۔ سنہ ۲۷۲ھ میں قزوین کے ایک ترکی عامل نے چار ہزار فوج کے ساتھ طبرستان پر چڑھائی کی۔ محمد بن زید نے آٹھ ہزار فوج لے کر مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور جرجان میں جا کر پناہ گزین ہوا اور فتح مندفوجوں کے واپس جانے پر پھر طبرستان پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۲۷۵ھ میں رافع بن ہرثمہ نے جرجان پر فوج کشی کی۔ محمد بن زید نے مقابلہ کیا اور ایک طویل مدت کے مقابلہ اور معرکہ آرائی کے بعد سنہ ۲۷۷ھ میں طبرستان سے بالکل بے دخل ہو گیا۔ آخر سنہ ۲۷۳ھ میں رافع بن ہرثمہ، عمرو بن لیث کے مقابلہ میں مقتول ہوا تو محمد بن زید نے پھر طبرستان پر قبضہ کیا مگر عمرو بن لیث صفار نے اس کو طبرستان سے بے دخل کر دیا۔ سنہ ۲۸۸ھ میں اسماعیل سامانی نے عمرو بن لیث صفار کو گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا تو محمد بن زید نے پھر دیلم سے خروج کر کے طبرستان پر قبضہ

کر لیا۔ اس کے بعد اسماعیل سامانی نے محمد بن ہارون کو طبرستان کی طرف روانہ کیا اور محمد بن زید مقابلہ کر کے مارا گیا۔ اس کا بیٹا زید بن محمد بن زید گرفتار ہو کر بخارا کے قید خانے میں بھیج دیا گیا۔

عمرو بن لیث صفار:

عمرو بن لیث صفار کو دربار خلافت سے خراسان اور سجستان وغیرہ کی سند گورنری مل چکی تھی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ فارس بھی اس کے قبضہ میں آ چکا تھا۔ سنہ ۲۷۱ھ میں دربار خلافت سے عمرو بن لیث کی معزولی کا فرمان جاری ہوا اور احمد بن عبدالعزیز بن ابی دلف حاکم اصفہان کو حکم دیا گیا کہ عمرو بن لیث کا مقابلہ کر کے فارس کا صوبہ آزاد کرا لو۔ چنانچہ دونوں کی لڑائی ہوئی اور عمرو بن لیث صفار کو شکست حاصل ہو گئی مگر صوبہ فارس پر عمرو بن لیث کا قبضہ ہوا۔

آخر سنہ ۲۷۴ھ میں موفق نے خود فارس پر فوج کشی کی اور اس صوبہ کو عمرو بن لیث کے قبضے سے نکال کر بغداد کی جانب واپس آیا۔ عمرو بن لیث کرمان و سجستان کی طرف چلا گیا اور سجستان و خراسان پر کامیابی کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ عمرو بن لیث نے دربار خلافت میں تحائف و ہدایا بھیج کر پھر اپنا رسوخ بڑھایا اور سنہ ۲۷۸ھ میں دربار خلافت سے علاقہ ماوراء النہر یعنی بخارا و سمرقند وغیرہ کی سند حکومت حاصل کر لی۔

ماوراء النہر میں اسماعیل بن احمد سامانی کامیابی کے ساتھ حکومت کر رہا تھا۔ عمرو بن لیث سند ماوراء النہر حاصل کرنے کے بعد لشکر اور سامان حرب کی فراہمی میں مصروف ہوا۔ جب اسماعیل بن احمد سامانی کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے عمرو بن لیث کو لکھا کہ ''میں ایک گوشہ میں سرحدی مقام پر پڑا ہوں۔ آپ کے پاس بہت وسیع ملک ہے، مجھ کو آپ یہاں پڑا رہنے دیں اور اس ملک سے میرے بے دخل کرنے کے درپے نہ ہوں۔'' عمرو بن لیث نے کوئی التفات نہیں کیا اور فوج لے کر ماوراء النہر پر حملہ کیا۔ اسماعیل سامانی مقابلہ پر آیا، لڑائی ہوئی۔ عمرو بن لیث گرفتار ہوا اور سمرقند کے جیل خانے میں قید کیا گیا۔ سنہ ۲۸۸ھ میں اسماعیل سامانی نے اس کو خلیفہ کے پاس بغداد بھیج دیا۔ خلیفہ معتضد کی وفات تک بغداد کے جیل خانے میں رہا۔ اس کے بعد مکتفی باللہ نے تخت نشین ہو کر اس کو قتل کرا دیا۔

مکہ و مدینہ کے حالات:

مدینہ میں محمد بن حسن بن جعفر بن موسیٰ کاظم اور ان کے بھائی علی بن حسن نے ایک دوسرے کے خلاف رقیبانہ خروج کیا۔ حکومت کا رعب اٹھ چکا تھا۔ ہر جگہ خانہ جنگیوں کا بازار گرم تھا۔ اسی سلسلے میں مدینہ منورہ کے اندر ان دونوں بھائیوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ بہت سے آدمی طرفین سے مقتول ہوئے۔ ایک مہینہ تک سنہ ۲۷۷ھ میں مدینہ منورہ کے اندر نماز جمعہ ادا نہیں ہو سکی۔ اس قسم کی حالت مکہ مکرمہ کی بھی تھی۔ مکہ مکرمہ میں یوسف بن ابی الساج عامل تھا۔ اس کی جگہ دربار خلافت سے احمد بن محمد طائی کو سند حکومت مل گئی۔ احمد طائی نے اپنی طرف سے اپنے غلام بدر کو امیر حجاج بنا کر بھیج دیا۔ یوسف نے مقابلہ کیا، مسجد بیت الحرام کے دروازے پر جنگ ہوئی۔ یوسف نے بدر کو گرفتار کر لیا۔ بدر کے لشکریوں اور حاجیوں نے مل کر حملہ کیا اور یوسف کو گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا اور بدر کو آزاد کرا لیا۔ غرض جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا مضمون تھا۔

موفق کی وفات:

خلیفہ معتمد باللہ برائے نام خلیفہ تھا۔ اس کا بھائی موفق اپنی بہادری اور دانائی کے سبب سے تمام امور سلطنت پر حاوی و قابض و متصرف ہو گیا تھا اور یوں سمجھنا چاہیے کہ موفق ہی خلافت کر رہا تھا۔ اگرچہ وہ باقاعدہ خلیفہ نہ تھا، موفق ولی عہد بھی تھا، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس سے پیشتر ترک سردار دربار خلافت پر قابض و متصرف تھے اور عرصہ دراز سے سیاہ و سفید کے مالک چلے آتے تھے۔ موفق نے قابو پا کر ان ترک فوجی سرداروں کے زور کو توڑ دیا اور خود قابض و متصرف ہو گیا۔ چونکہ موفق نے زنگیوں کا زور توڑ کر ان کو نیست و نابود کر دیا تھا، اس لیے اس کی اور اس کے بیٹے معتضد کی قبولیت عام مسلمانوں میں بہت بڑھ گئی تھی۔ ترک سردار زنگیوں کے مقابلہ میں ہمیشہ ناکام و مغلوب ہوتے رہے تھے۔ اس لیے ان کو بھی موفق کی مخالفت کا حوصلہ نہ رہا تھا مگر چونکہ سلطنت کی چول چال پہلے ہی ڈھیلی ہو چکی تھی اور آب و ہوا بگڑ چکی تھی، لہٰذا طوائف الملوکی کا بازار زیادہ ہی گرم ہوتا گیا اور ان طاقتوں کو جو عرصہ سے پرورش پا رہی تھیں اور اب اپنی جگہ خود مختاری کا اعلان کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں، دبایا نہ جا سکا۔ تاہم موفق کا وجود دارالخلافہ میں بہت غنیمت تھا اور کسی کو اتنی جرأت نہ ہو سکی تھی کہ خود خلیفہ کی قیادت سے انکار کر سکے یا خطبہ میں خلیفہ کا نام نہ لے۔ موفق

جب فارس واسفہان سے بغداد واپس آیا تو درد نقرس میں مبتلا ہو گیا۔ ہر چند علاج کیا، آرام نہ ہوا۔ ۲۲ صفر سنہ ۲۷۸ھ کو فوت ہو کر رصافہ میں مدفون ہوا۔ اگر چہ خلیفہ معتمد موجود تھا مگر اس کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہ تھی۔ اصل خلیفہ موفق ہی تھا۔ اب موفق کے فوت ہونے کے بعد ارا کین سلطنت اور سپہ سالار لشکر نے متفق ہو کر موفق کے بیٹے ابوالعباس معتضد کو موفق کی جگہ ولی عہد بنایا۔ معتضد چونکہ خوب تجربہ کار اور بہادر شخص تھا، لہٰذا وہ تمام امور سلطنت پر حاوی ہو گیا اور خلیفہ معتمد پھر اپنی اسی حالت میں مجبور و معطل رہا۔

قرامطہ:

سنہ ۲۷۸ھ میں سرزمین کوفہ میں ایک شخص حمدان نامی عرف قرامطہ نے ایک نیا مذہب جاری کیا۔ یہ ایک غالی شیعہ تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ امام صرف سات ہیں: اول حسین، دوم علی زین العابدین، سوم باقر بن علی، چہارم جعفر صادق، پنجم اسماعیل بن جعفر، ششم محمد بن اسماعیل اور ہفتم عبیداللہ بن محمد۔ اپنے آپ کو وہ عبیداللہ بن محمد کا نائب کہتا تھا۔ حالانکہ عبیداللہ نامی کوئی بیٹا محمد بن اسماعیل کا نہیں تھا۔ محمد بن الحنفیہ بن علی بن ابی طالب کو وہ رسول کہتا تھا۔ چنانچہ اذان میں یہ الفاظ بڑھا دیے تھے کہ اشھد ان محمد بن الحنفیۃ رسول اللہ، بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا تھا۔ دن رات میں صرف دو نمازیں رکھی تھیں یعنی دو رکعت قبل طلوع آفتاب اور دو رکعت بعد غروب آفتاب۔ وہ کہتا تھا کہ بعض سورتیں محمد بن الحنفیہ پر نازل ہوئی ہیں۔ جمعہ کے بجائے دوشنبہ کے دن کو ہفتہ میں وہ بابرکت سمجھتا تھا اور اس دن کوئی کام نہ کرتا تھا۔ سال بھر میں دو روزے فرض سمجھتا تھا۔ نبیذ کو حرام اور شراب کو حلال کہتا تھا۔ غسل جنابت کو غیر ضروری سمجھتا تھا۔ بعض جانوروں کو اس نے حلال اور بعض کو حرام قرار دیا تھا۔ جو شخص قرامطہ کا مخالف ہوا، اس کا قتل کرنا واجب ٹھہرایا تھا۔ اپنا لقب اس نے قائم بالحق رکھا تھا۔

زنگیوں کے سردار غبیث اور بہبود سے بھی اس نے اپنے اس نئے مذہب کے متعلق گفتگو کی تھی اور ان کو اپنا ہم خیال بنانا چاہا تھا مگر انہوں نے اس طرف کوئی التفات نہیں کیا۔ ان کی بربادی کے آٹھ برس کے بعد اس نے کوفہ میں اپنے عقائد کی اشاعت شروع کی اور بہت سے لوگ اس کے معتقد ہونے لگے۔ یہ رنگ دیکھ کر کوفہ کے عامل نے اس کو گرفتار کر کے جیل خانے بھیج دیا۔

اتفاقاً جیل خانے کے محافظوں نے غفلت کی اور قرامطہ وہاں سے نکل بھاگا۔ اس کے متبعین نے یہ مشہور کر دیا کہ قرامطہ کو جیل خانہ آنے جانے سے نہیں روک سکتا۔ غرض رفتہ رفتہ اس مذہب کا چرچا دور دراز تک ہونے لگا اور لوگ اس میں شریک ہوتے گئے۔ آج کل ہم اپنے زمانہ کے گور پرستوں، پیر پرستوں کو دیکھ دیکھ کر تعجب کرتے ہیں کہ کس طرح وہ جاہل، بے نماز، چانڈو باز لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ بندہ اور ولی کامل سمجھ کر ان کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں اور ان کے ہر ایک حکم کی تعمیل کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے احمقوں کی ایک جماعت ہر ایک زمانے میں موجود رہتی ہے۔ ہمارے شہر نجیب آباد میں ایک شخص رہتا ہے۔ شہر کی پیشہ ور فاحشہ عورتیں جو ناچنے گانے کا پیشہ کرتی ہیں، ہر جمعرات کو اس مکان میں آ کر اپنا گانا سناتی ہیں اور آوارہ مزاج ناہموار نوجوانوں کو وہاں اس حیا سوز واخلاق کش جلسہ میں بدچلنی کی تحریک کا موقع ملتا رہتا ہے۔ اللہ اور رسول (ﷺ) کی شان میں گستاخانہ الفاظ علانیہ وہ زبان سے نکالتا رہتا ہے۔ نماز، روزہ کا تو بھلا ذکر ہی کہاں ہوسکتا ہے۔ اس شخص کو کثیر التعداد لوگوں نے معبود کا مرتبہ دے رکھا ہے۔ اس کی خدمت میں مودبانہ اپنی حاجات عرض کرتے ہیں اور قیمتی تحائف و ہدایا سے اس کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لذیذ کھانے اور نایاب چیزیں پیش کرتے رہتے ہیں۔

ان معتقدین کے زمرہ میں بڑے بڑے اہل کار، ڈاکٹر، تاجر اور تعلیم یافتہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔ ہر چند کوشش کی گئی کہ کوئی ایسی بات معلوم ہو جس کو اس عقیدت کا سبب قرار دیا جا سکے مگر کوئی بات ثابت نہ ہوئی۔ لہٰذا مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انسانوں میں کچھ تعداد اللہ تعالیٰ ایسی بھی پیدا کرتا ہے کہ آنکھیں رکھتے ہوئے نابینائی کے شیدا اور دماغ ہوتے ہوئے تہی مغزی پر مفتون ہوتے ہیں۔ یہی لوگ جو آج کل بھی ہر جگہ موجود نظر آتے ہیں اور یہی لوگ تھے جنہوں نے قرامطہ [1] کے نو ایجاد مذہب کو قبول کیا اور انہیں لوگوں کی موجودگی نے ہمیشہ سیاہ قلب لوگوں کو اپنی اپنی دکانداریاں چلانے کی جرأت دلائی اور دین اسلام کے مقابلہ میں ہمیشہ مشکلات پیدا کر کے سچے مسلمانوں کے لیے جہاد سیفی ولسانی کا موقع بہم پہنچایا۔ لہٰذا ان لوگوں کے وجود کو بھی حکمت الٰہی کے خلاف ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو سچے مومنوں کو وہ مراتب کس طرح میسر ہوتے جو ان کے

---

[1] یہ باطنیوں کا ایک فرقہ تھا جو اس قدر شدت پسند، لڑاکے اور خبثاء تھے کہ ایک سال حج کے موقع پر بیت اللہ شریف سے حجر اسود کو اٹھا لائے تھے اور اسے کئی سال تک اپنے پاس رکھا۔ پھر بڑی مشکل سے وقت کے خلیفہ نے ان سے واپس لیا۔

خلاف کوشش کرنے سے ان کو میسر ہوئے۔ اگر نفس امارہ اور شیطان رجیم نہ ہوتا تو طاعت الٰہی پر اجر کیسے مرتب ہوتا۔

معتضد کی ولی عہدی:

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ موفق کی وفات کے بعد معتضد کو ولی عہد بنایا گیا تھا لیکن یہ ولی عہدی جعفر بن معتمد کے بعد تھی۔ جعفر بن معتمد ولی عہد اول اور معتضد ولی عہد دوم تھا، جیسا کہ اس کا باپ موفق بھی ولی عہد دوم تھا لیکن سنہ ۲۷۹ھ میں معتمد نے معتضد کے اقتدار واثر سے مرعوب ہو کر بجائے اپنے بیٹے جعفر کے معتضد اپنے بھتیجے کو ولی عہدی میں مقدم کر دیا اور اس مضمون کا فرمان ممالک محروسہ میں عاملوں کے نام جاری کرا دیا کہ میرے بعد معتضد تخت خلافت پر بیٹھے گا۔

جنگ روم:

خلیفہ معتضد کے عہد خلافت کے حالات پریشان میں ابھی تک رومیوں کا ذکر نہیں آیا۔ سنہ ۲۵۷ھ میں میخائیل بن روفیل قیصر قسطنطنیہ کو اس کے ایک رشتہ دار نے جو صقلبی کے نام سے مشہور تھا، قتل کر کے خود تخت سلطنت پر بیٹھ گیا۔ سنہ ۲۵۹ھ میں رومیوں نے ملطیہ پر فوج کشی کی مگر شکست کھا کر واپس گئے۔ سنہ ۲۶۳ھ میں رومیوں نے قلعہ کر کرہ متصل طرطوس کو مسلمانوں سے چھین لیا۔ سنہ ۲۶۴ھ میں عبداللہ بن رشید بن کاؤس نے چالیس ہزار سرحدی شامی فوجوں کے ساتھ بلاد روم پر چڑھائی کی۔ اول فتح حاصل ہوئی مگر بعد میں عبداللہ بن رشید گرفتار ہو کر قسطنطنیہ پہنچا۔

سنہ ۲۶۵ھ میں رومیوں نے عام اذفہ پر حملہ کیا۔ چار سو مسلمان شہید اور چار سو گرفتار ہوئے۔ اسی سال قیصر روم نے عبداللہ بن رشید کو مع چند جلد قرآن مجید کے احمد بن طولون کے پاس بطور ہدیہ روانہ کیا۔ سنہ ۲۶۶ھ میں جزیرہ صقلیہ کے متصل رومیوں اور مسلمانوں کے جنگی بیڑوں میں لڑائی ہوئی۔ مسلمانوں کو شکست ہوئی اور ان کی کئی جنگی کشتیاں رومیوں نے گرفتار کر لیں۔ باقی ماندہ نے ساحل صقلیہ میں جا کر قیام کیا۔

احمد بن طولون کے نائب شام نے اسی سال بلاد روم پر ایک کامیاب حملہ کر کے بہت سا مال غنیمت حاصل کیا۔ سنہ ۲۷۰ھ میں رومیوں نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ مقام قلمیہ پر جو طرطوس سے چھ میل کے فاصلے پر ہے، حملہ کیا۔ مازیار والی طرطوس نے رومیوں پر شب خون مارا۔ ستر ہزار رومی

مقتول ہوئے۔ بطریق اعظم گرفتار ہوا اور صلیب اعظم بھی مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔ سنہ ۲۷۳ھ میں مازیار والی طرطوس اور احمد جعفی نے مل کر بلاد روم پر حملہ کیا۔ حالت جنگ میں منجنیق کا ایک پتھر مازیار کے لگا۔ وہ زخمی ہو کر لڑائی موقوف کر کے واپس ہوا، راستے میں مر گیا۔ مسلمانوں نے طرطوس میں لا کر دفن کیا۔ اگرچہ عالم اسلام میں سخت ہلچل مچی ہوئی تھی اور جا بہ جا خانہ جنگی برپا تھی، تاہم رومیوں کو مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی عظیم کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

وفات معتمد:

خلیفہ معتمد علی اللہ بن متوکل علی اللہ نے ۲۰ رجب سنہ ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔ سامرا میں مدفون ہوا۔ معتصم باللہ بن ہارون الرشید کے وقت سے خلفاء عباسیہ کا دارالخلافہ سامرا چلا آتا تھا۔ معتمد علی اللہ نے سامرا کو چھوڑ کر بغداد میں رہنا اختیار کیا اور پھر بغداد ہی دارالخلافہ ہو گیا۔ سامرا کو چھوڑ نے اور بغداد کو دارالخلافہ بنانے ہی کا نتیجہ تھا کہ ترک سردار جو خلافت اور دربار خلافت پر حاوی و مسلط تھے، ان کا زور یک لخت ٹوٹ گیا۔ دارالخلافہ کی تبدیلی بھی معتمد کے بھائی موفق کی عقل و تدبیر کا نتیجہ تھا۔

معتمد کے زمانے میں دولت وحکومت کی قوتیں بالکل کمزور ہو چکی تھیں۔ امرائے سلطنت میں جیسا کہ ایسی حالت میں ہونا چاہیے تھا، نااتفاقی، عداوت اور ایک دوسرے کی مخالفت خوب زوروں پر تھی، ممالک محروسہ کے ہر حصے اور ہر سمت میں فتنہ وفساد کا بازار گرم تھا۔ لوگوں کے دلوں سے خلیفہ کا رعب بالکل مٹ چکا تھا۔ جہاں جس کو موقع ملا، اس نے ملک دبا لیا۔ صوبہ داروں نے خراج بھیجنا بند کر دیا۔ کوئی آئین اور کوئی قانون تمام ملک میں رائج نہ رہا۔ ہر شخص نے جس ملک پر قبضہ کیا، اپنا ہی قانون جاری کیا۔ رعایا پر بڑے بڑے ظلم ہونے لگے۔ عاملوں نے جس طرح آزادانہ چاہا، رعایا کو تختہ مشق ظلم بنایا۔ بنو سامان نے ماوراء النہر پر، بنو صفار نے سجستان و کرمان، خراسان اور ملک فارس پر، حسن بن زید نے طبرستان و جرجان پر، زنگیوں نے بصرہ، ایلہ و واسط پر، خوارج نے موصل و جزیرہ پر، ابن طولون نے مصر و شام پر، ابن اغلب نے افریقہ پر قبضہ کر کے اپنی اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار تھے جو اسی طرح ملکوں اور ولایتوں پر قبضہ کرنے کی فکر میں مصروف اور ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے۔ خلیفہ کی حکومت و سیادت کا صرف یہ نشان تھا کہ سب جمعہ کے خطبوں میں خلیفہ کا نام لیتے تھے۔ کوئی حکم خلیفہ کا نہیں مانا جاتا تھا۔ موفق

نے اپنی تمام طاقت اور ساری عمر فتنہ وفساد کے فرو کرنے میں صرف کر دی مگر سوائے زنگیوں کا استیصال کرنے کے اور کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

اسی زمانے میں قرامطہ وغیرہ کے آئندہ فتنوں کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی زمانے میں عبیداللہ بن عبید نے جو سلاطین مصر اور شیعیان یمن کا مورث ہے، مہدویت کا دعویٰ کیا اور قبیلہ بنو کنانہ کے اکثر افراد کو ہمراہ لے کر ملک مغرب کی طرف گیا اور وہیں ترقی کر کے رفتہ رفتہ مصر و افریقہ میں ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد قائم کر سکا۔ اسی زمانہ میں علم حدیث کے مشہور ناموراماموں نے مثلاً امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ نے وفات پائی۔ غرض معتمد کی خلافت کے ۲۳ سال اسی انتشار و پریشانی اور بدنصیبی و ناکامی کے عالم میں بسر ہو گئے۔

ہدایات وتبصرہ

خاندان بنو عباس کی حکومت وخلافت کو اب تک ڈیڑھ سو برس گزر چکے تھے۔ خلافت عباسیہ کی شان وشوکت اور عروج کا زمانہ پورے سو برس تک رہا اور معتصم باللہ کی وفات یعنی سنہ ۲۲۷ھ سے زوال کی علامات شروع ہو گئیں اور خلافت پر انتشار کا زمانہ طاری رہا۔ اس بیس سال کے عرصہ میں یہ توقع رہی کہ خلافت عباسیہ پھر اپنی اسی صد سالہ شان وشوکت اور قوت وعظمت کو واپس لا سکتی ہے لیکن سنہ ۲۴۷ھ میں متوکل علی اللہ کے قتل ہونے پر یک لخت اس کے تمام اعضاء مضمحل ہو گئے اور اس پر اس طرح بڑھاپا چھا گیا کہ عظمت رفتہ کے واپس آنے کی کوئی توقع نہ رہی۔ اس ضعیفی و پیری کے ۳۲ سال بھی ہم مطالعہ کر چکے ہیں۔ ابھی یہ ضعیف وناتوان خلافت کئی سو برس تک زندہ رہنے والی ہے۔ حکومت اسلامیہ کے بہت سے مرکز الگ الگ قائم ہو چکے ہیں اور بہت سے قائم ہونے والے ہیں۔ بہت جلد ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے کہ خلافت بغداد یا خلافت عباسیہ میں نام کی ایک عظمت باقی رہ جائے گی اور وہ خود کوئی طاقت نہ ہو گی۔

اندریں صورت اگر آئندہ خلافت خلفاء عباسیہ کے حالات اسی تناسب اور اسی مذکورہ وسعت کے ساتھ بیان ہوئے تو تاریخ کی دلچسپی غائب ہو جائے گی اور پڑھنے والوں کے دماغ پر ایک نامناسب بوجھ پڑ جائے گا۔ لہٰذا باوجود اس کے کہ اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس میں اختصار کو بہت مدنظر رکھا گیا ہے، آئندہ اس سے بھی زیادہ اختصار وایجاز سے کام لیا جائے گا۔ خلیفہ معتمد باللہ

کے عہد خلافت کا جو حال اوپر لکھا جا چکا ہے، اس کی بے ترتیبی خود اس امر کی شاہد ہے کہ ان خلفاء کے ذاتی حالات میں قابل تذکرہ اور اہم واقعات بہت ہی کم ہو سکتے ہیں۔ ہاں ان کے عہد خلافت میں دوسروں کے واقعات اور کارنامے لاتعداد ہیں کیونکہ نئے نئے سلسلے اور نئے نئے خاندان حکومت نمایاں ہو رہے ہیں۔ ان تمام خاندانوں اور تمام سلسلوں کا متوازی لے چلنا محال اور غیر ممکن ہے مگر اس کی ابتداء کا کہ کس طرح خاندان عباسیہ کے تعلق سے وہ برسر اقتدار آئے، تذکرہ اشارتاً دینا ضروری تھا تاکہ جب ان کا حال مستقل طور پر الگ شروع کیا جائے تو اس ابتدائی تذکرہ کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ آئندہ بھی جو جو نئے خاندان حکومت خلافت عباسیہ کے تعلق سے پیدا ہوں گے، ان کا تذکرہ ان شاء اللہ تعالیٰ حسب موقع کیا جائے گا۔

خاندان بنوامیہ کی سب سے بڑی خطا یہ ہے کہ اس نے ولی عہدی کو وراثت میں داخل کر کے حکومت اسلامیہ کی بربادی کا سامان کیا اور رسم بد کا مسلمانوں کو عادی بنایا۔ خاندان بنوعباس کی خطا بھی ان سے کسی طرح کم نہیں ہے کہ انہوں نے بنوامیہ کی ہر ایک چیز کو مٹایا اور ان کی یادگاروں کو فنا کیا مگر اس رسم بد کی خوب حفاظت کی اور مسلمانوں کی بربادی کے اس سامان کو مضبوط سے مضبوط تر بناتے رہے۔ دوسری غلطی ان کی یہ تھی کہ شروع ہی سے اہل عرب کے مخالف اور نو مسلم ایرانیوں کے ہمدرد رہے۔ سفاح سے لے کر مامون الرشید تک سوائے ایک مہدی کے ہر ایک خلیفہ نے عربوں کی طاقت کو گھٹایا اور مجوسی النسل لوگوں کو ابھارا اور آگے بڑھایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان عباسیہ کو بنوامیہ کی فتوحات کے دائرے سے آگے قدم رکھنا نصیب نہ ہوا اور دم بہ دم ان کی حکومت وسلطنت کا رقبہ محدود ہی ہوتا چلا گیا۔ اسلام کی حقیقی شان اور اسلامی اخلاق پر مجوسیت کا ایک ہلکا سا غبار چھا گیا۔ یہی مجوسی النسل لوگ خلفاء عباسیہ کے لیے باعث مشکلات رہے مگر ذی حوصلہ عباسی خلفاء ان مشکلات پر غالب آتے رہے۔ معتصم باللہ نے مجوسیوں کی قابو یافتہ اور زبردست جماعت کے مقابلہ میں ماوراء النہر کے ترکوں کی جن کا آبائی مذہب تو مجوسیت ہی تھا مگر قوم اور نسل کے اعتبار سے جدا اور خراسانیوں کے غیر تھے، ایک نئی جماعت تیار کی۔ معتصم باللہ کی یہ تدبیر ضرور مفید ثابت ہوتی، اگر وہ ترکوں کی نئی جماعت کو خراسانیوں سے زیادہ طاقتور نہ بناتا اور عربوں کو بھی ترقی دے کر ان دونوں جماعتوں کا ہمسر بنا دیتا مگر عربوں کا تعلق خاندان خلافت سے بہ دستور کم اور منقطع ہوتا رہا اور معتصم

باللہ کا سامرہ یعنی ترکی بستی میں سکونت پذیر ہونا ترکوں کی حد سے زیادہ ترقی کا موجب ہوا۔ معتصم باللہ نے غالباً ترکوں کو اس لیے پسند کیا تھا کہ وہ علویوں کے اثر سے پاک تھے۔ عربوں سے اسی لیے اس خاندان نے نفرت کی تھی کہ علوی بھی عرب تھے مگر علویوں کا اثر مجوسی النسل یعنی ایرانیوں پر جن سے بنوعباس نے کم کیا تھا، عربوں کی نسبت بھی زیادہ تھا۔ اسی لیے مشکلات کا سامنا رہنا تھا۔ معتصم نے دونوں گروہوں کو چھوڑ کر ایک خالی الذہن تیسرے گروہ کو منتخب کیا مگر ترک، ایرانیوں کی طرح شائستہ اور انتظام سلطنت سے واقف نہ تھے۔ ان کے لیے ضرورت تھی کہ ایک زبردست اور چوکس ہاتھ ان سے کام لے اور اپنے کام کا بنائے۔ معتصم کے جانشینوں میں اگر ہارون و مامون کا دل و دماغ رکھنے والے چند شخص اور ہوتے تو خلافت عباسیہ کی عظمت و شوکت اور بھی ترقی کر جاتی اور معتصم کا سامرہ کو دارالسلطنت بنانا بڑی ہی غیر عاقلانہ تدبیر سمجھی جاتی مگر معتصم کے جانشینوں کی کمزوری اور عربی عنصر کے ضعیف تر ہو جانے اور سامرہ کے دارالسلطنت ہونے نے ایک طوفان بے تمیزی برپا کر دیا اور معتصم کے جانشینوں کی کمزوری و نالائقی کا کوئی علاج کسی سے ممکن نہ ہوا۔[1]

ترک ایک خالص فوجی قوم تھی، جس کے پاس دماغ نہ تھا۔ لہٰذا وہ نہ تو اپنی حکومت و سلطنت قائم کر سکے، نہ علویوں کی خلافت قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ علوی لوگ اب تھک کر اور مایوس ہو کر بیٹھ چکے تھے اور بہ ظاہر کسی ایسے ہی عظیم الشان خطرے کا کوئی اندیشہ خلافت عباسیہ کے لیے باقی نہ رہا تھا۔ جب معتصم کے بعد خود دارالخلافہ میں ہنگاموں اور بدتمیزیوں کا طوفان برپا ہوا تو مرکز خلافت کی اس حالت کا اثر تمام صوبوں پر ہوا اور جہاں جو عامل یا والی تھا، وہ اپنی خودمختاری اور جداگانہ سلطنت قائم کرنے کی تدبیروں میں مصروف ہو گیا۔ اندلس، مراکش اور افریقہ کی مثالیں ان کے سامنے موجود تھیں۔ قلب کے ماؤف ہوتے ہی تمام اعضاء کا دوران خون بند ہو گیا اور ان صوبہ داروں اور عاملوں کی خودمختاری و افراتفری دیکھ کر علوی، خارجی، زنگی، قرمطی وغیرہ بھی قسمت آزمائی

---

[1] ان حالات کی اصل وجہ اعیان سلطنت اور عامۃ المسلمین کی اسلام سے دوری تھی۔ اسلام تو اتفاق و اتحاد اور اجتماعیت کا درس دیتا ہے اور اسلام کے اصول وضوابط اور احکام و مسائل پر عمل کرنے سے اتفاق و اتحاد اور اجتماعیت پیدا ہوتی ہے، برکات کا دور دورہ ہوتا ہے۔ خلافت اسلامیہ کے حالات پر اجمالی نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ خلفائے راشدین وغیرہ کو چھوڑ کر، حکومتی اور عوامی ہر دو سطح پر جیسے جیسے اسلام پر عمل کرنے سے انحراف اختیار کیا گیا، اسی نسبت سے بگاڑ بڑھتا گیا اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت ختم ہوتی چلی گئی۔

کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اب وہ حالت پیدا ہوگئی کہ منصور، ہارون و مامون بھی اگر ہوتے تو شاید کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔ متوکل کا قتل خلافت عباسیہ کے لیے نہایت منحوس واقعہ تھا۔ متوکل کے بعد ہی اگر موفق تخت نشین ہو جاتا تو ممکن تھا کہ وہ حالات کو سنبھال لیتا مگر موفق کو بحیثیت خلیفہ کام کرنے کا موقع نہ ملا اور اس کے بیٹے معتضد کو جو اپنے باپ ہی کی طرح ذی حوصلہ و باہمت تھا، اس وقت خلافت ملی جبکہ مرض لا علاج ہو چکا تھا۔

تیسرا باب

معتضد باللہ

معتضد باللہ بن موفق باللہ بن متوکل علی اللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید کا اصلی نام احمد اور کنیت ابوالعباس تھی۔ ربیع الاول سنہ ۲۴۳ھ میں صوآب نامی ام ولد کے پیٹ سے پیدا ہوا اور اپنے چچا معتمد باللہ کے بعد ماہ رجب سنہ ۲۷۹ھ میں تخت نشین ہوا۔ خوبصورت، بہادر اور عقلمند شخص تھا۔ سخت گیری وخوں ریزی سے بھی اگر ضرورت ہوتی تھی تو درگزر نہیں کرتا تھا۔ باہیبت اور معاملہ فہم تھا۔ منجموں اور افسانہ گولوگوں کا دشمن تھا۔ مامون کے زمانہ سے فلسفہ کا بہت چرچا ہو گیا تھا۔ معتضد نے فلسفہ اور مناظرہ کی کتابوں کی اشاعت سے روک دیا تھا تاکہ مذہبی فتنوں اور لڑائی جھگڑوں کا سدباب ہو۔ رعایا کے خراج میں اس نے کمی کر دی تھی۔ عدل کا شائق تھا، رعایا پر سے ظلم وستم کو دور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

مکہ میں دارالندوہ کی عمارت ابھی تک موجود تھی۔ معتضد نے اس کو گرا کر مسجد بیت الحرام کے پاس ایک مسجد بنا دی۔ مجوسی النسل لوگوں کی کثرت نے بغداد میں نوروز [1] کے دن عید منانے اور آگ جلانے کی رسم بھی جاری کر دی تھی۔ معتضد نے اس مجوسی رسم کو حکماً بند کر دیا۔ حماردیہ بن احمد طولون حاکم مصر کی لڑکی سے اس نے عقد کیا۔ اس نے دفتر میراث قائم کیا اور ذوی الارحام کو بھی میراث میں سے حصہ دلانے کا التزام کیا۔ اس سے لوگوں نے اس کو بہت دعائیں دیں اور اس کی قبولیت رعایا میں بڑھ گئی۔

معتضد نے ایک مرتبہ قاضی ابوحازم کے پاس کہلا کر بھجوایا کہ آپ نے فلاں شخص سے لوگوں کا

---

[1] یہ پارسیوں (آتش پرستوں یا مجوسیوں) کی قومی عید ہے۔ اسے جشن بزرگ بھی کہتے ہیں۔ وہ اپنے ماہ فرورین کے چھٹے دن یہ تہوار مناتے ہیں۔ پارسی زیادہ تر ایران میں رہتے ہیں۔ دور قدیم سے ایران پارسیوں کی آماجگاہ چلا آ رہا ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے سینکڑوں سال پہلے سے ایران پر، آتش پرستوں کا غلبہ تھا اور یہ ملک اس وقت دنیا کی ایک بڑی مملکت تھی، جو جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فتح ہوا اور یوں مجوسیوں کا غلبہ ختم ہو گیا بلکہ مجوسی سٹیٹ ختم ہو گئی، فللہ الحمد!

مال دلوایا ہے۔ میرا بھی کچھ مال اس کے پاس ہے، مجھ کو بھی دلواؤ۔ قاضی نے جواباً کہلا بھجوایا کہ آپ گواہ پیش کریں تو آپ کو بھی ڈگری دی جائے گی۔ معتضد کے گواہوں نے قاضی ابوحازم کے سامنے پیش ہونے سے انکار کر دیا کہ کہیں قاضی ہم کو ناقابل شہادت نہ ٹھہرائے۔ اس لیے معتضد کو اس کا مال نہیں ملا۔ معتضد نے خلافت عباسیہ کے بہت نازک اور خراب حالات پائے تھے مگر اس نے بہت کوشش کی کہ خلافت عباسیہ کی حالت سقیم درست ہو جائے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے کچھ ترقی کے آثار نمایاں بھی ہوئے مگر اس کے جانشینوں میں یہ قابلیت نہ تھی کہ رفتار ترقی کو قائم رکھ سکے۔

معتضد کے تخت نشین ہونے کے چند روز بعد ہی نصر بن احمد سامانی فوت ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی اسماعیل بن سامانی ماوراء النہر کا حکمران ہوا۔ موصل کے علاقہ میں خوارج کے دو گروہ آپس میں لڑ رہے تھے۔ ایک گروہ کا سردار ابوجوزہ سنہ ۲۸۰ھ میں گرفتار ہو کر بغداد میں آیا۔ معتضد نے اس کو بڑی تکلیفوں سے قتل کرایا۔ دوسرے گروہ کا سردار ہارون شاری بہ دستور مصروف بغاوت وسرکشی رہا۔ سنہ ۲۸۰ھ میں معتضد نے جزیرے پر خود فوج کشی کی اور قبائل بنی شیبان کو قرار واقعی سزا دے کر اور بہت سا مال غنیمت لے کر بغداد واپس آیا۔ معتضد نے اپنے غلام بدر نامی کو پولیس افسری اور عبیداللہ بن سلیمان بن وہب کو قلمدان وزارت عطا کیا۔ سنہ ۲۸۱ھ میں حمدان بن حمدون کو جو قلعہ ماردین پر قابض اور ہارون شاری خارجی سے دوستی پیدا کر چکا تھا، خلیفہ معتضد نے گرفتار کیا اور قلعہ ماردین کو مسمار کرا کر زمین کے برابر کر دیا۔

سنہ ۲۸۱ھ میں خلیفہ معتضد نے اپنے بیٹے علی المعروف بہ مکتفی کو رے، قزوین، زنجان، قم، جدآن کی حکومت پر مامور کیا۔ ماہ ربیع الاول سنہ ۲۸۳ھ میں خلیفہ معتضد نے اطراف موصل میں پہنچ کر ہارون شاری خارجی کے استیصال کی کوشش میں کامیابی حاصل کی۔ ہارون کو گرفتار کر کے قید کر دیا اور بغداد کی طرف واپس آیا۔ بغداد میں ہارون کو تشہیر کر کے قتل کرا دیا۔ سنہ ۲۸۵ھ میں معتضد نے آذربائیجان پر چڑھائی کی، قلعہ آمد کو فتح کر کے احمد بن عیسیٰ بن شیخ کو گرفتار کیا اور ماہ ربیع الثانی سنہ ۲۸۶ھ میں بغداد واپس آیا۔

قرامطہ کا خروج:

سنہ ۲۸۱ھ میں قرامطہ کے معتقدین میں سے ایک شخص یحییٰ بن مہدی نامی نے مقام قطیف

رمن مضافات بحرین میں وارد ہو کر علی بن معلیٰ بن حمدان کے مکان میں قیام کیا اور کہا کہ مجھ کو مہدی زمان نے بھیجا ہے اور وہ بھی عنقریب خروج کرنے والے ہیں۔ علی شیعہ تھا، اس نے تمام شیعوں کو فراہم کیا اور امام زمان کا خط جو یحییٰ نے پیش کیا تھا، پڑھ کر سنایا۔ شیعوں نے نہایت خلوص کے ساتھ بہ وقت ظہور مہدی خروج کا وعدہ کیا۔ تھوڑے دنوں بعد یحییٰ چند روز کو غائب ہو گیا اور پھر آ کر امام زمان کا ایک دوسرا خط پیش کیا، جس میں لکھا تھا کہ ہر شخص یحییٰ کو چھتیس چھتیس دینار نذر کرے۔ شیعوں نے اس حکم کی فوراً تعمیل کی۔ چند روز کے بعد یحییٰ پھر آیا اور تیسرا خط لایا، جس میں لکھا تھا کہ تم لوگ اپنے مال کا پانچواں حصہ امام زمان کے لیے یحییٰ کے حوالہ کرو۔

سنہ ۲۸۶ھ میں ابوسعید جنانی نے بحرین میں آ کر مذہب قرامطہ کی لوگوں کو علانیہ دعوت دی۔ اس نواح میں جو لوگ پہلے سے خفیہ طور پر اس مذاہب میں شامل ہو چکے تھے، وہ اب علانیہ آ آ کر جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔ ابوسعید نے سب کو لے کر مقام قطیف میں قیام کیا اور سازوسامان سے درست ہو کر بصرہ کا قصد کیا۔ بحرین کے یہ تمام حالات خلیفہ معتضد کو معلوم ہوئے تو اس نے بصرہ کے عامل احمد بن محمد بن یحییٰ واثقی کو لکھا کہ بصرہ کی شہر پناہ تعمیر کرا لو۔ چنانچہ چودہ ہزار دینار کے صرفہ سے شہر پناہ تیار ہو گئی۔

جس وقت ابوسعید بصرہ کے قریب پہنچا تو دارالخلافہ بغداد سے عباس بن عمر قنوی دو ہزار سواروں کے ساتھ بصرہ کی حفاظت کے لیے آ پہنچا۔ بصرہ سے باہر ہی عباس اور ابوسعید کی لڑائی ہوئی۔ دو روز کی سخت لڑائی کے بعد ابوسعید نے عباس کو گرفتار کر لیا اور جس قدر آدمی عباس کے ہمراہیوں میں سے گرفتار ہوئے، سب کو ابوسعید نے آگ میں ڈال ڈال کر جلا دیا۔ یہ واقعہ سنہ ۲۸۷ھ کے شعبان مہینہ کا ہے۔ ابوسعید قرمطی نے اس کو فتح کرنے کے بعد بصرہ کو چھوڑ کر علاقہ ہجر کا قصد کیا۔ اہل ہجر کو امن دے کر ہجر پر قبضہ کر لیا اور پھر بصرہ کی طرف آیا۔

اہل بصرہ پر بہت خوف طاری ہوا مگر بصرہ کے عامل احمد بن محمد واثقی نے سب کو تسکین و تشفی دی۔ ابوسعید اس مرتبہ بھی بصرہ کو چھوڑ کر اور عباس کو قید سے آزاد کر کے مضافات بحرین کی طرف چلا گیا۔ سنہ ۲۸۸ھ میں ایک شخص ابوقاسم یحییٰ المعروف بہ زکرویہ بن مہرویہ کوفہ میں گیا اور قبیلہ قلیص بن ضمضم بن عدی اس مذہب قرامطہ کی جانب مائل ہو گیا۔ رفتہ رفتہ یہ جمعیت بڑھنے لگی تو شبل نامی ایک سردار نے ان پر حملہ کیا۔ اس لڑائی میں قرامطہ کا ایک سردار ابوالفوارس نامی گرفتار ہوا۔ باقی

بھاگ کر دمشق کی جانب چلے گئے۔ ابوالفوارس کو شبل نے خلیفہ معتضد کے پاس بغداد بھیج دیا۔ معتضد نے اس کو قتل کرا دیا۔ قرامطہ نے دمشق میں جا کر لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت دمشق کا حاکم بطخ تھا۔ اس نے قرامطہ کا مقابلہ کیا۔ کئی مرتبہ لڑائی ہوئی، ہر لڑائی میں قرامطہ نے فتح پائی۔ یہ سنہ ۲۸۹ھ کا واقعہ ہے یعنی اس زمانہ میں معتضد باللہ کا عہد حکومت ختم ہو جاتا ہے۔ قرامطہ کا باقی حال بعد میں ذکر کیا جائے گا۔

سنہ ۲۸۶ھ میں خلیفہ معتضد نے اپنے بیٹے علی کو جس کا آئندہ لقب مکتفی ہوا، جزیرہ اور عواصم کی سند گورنری عطا کی اور حسن بن عمرو نصرانی کو رقہ سے طلب کر کے مکتفی کا میر منشی یا وزیر مقرر کیا۔

سنہ ۲۸۸ھ میں طاہر بن محمد بن عمرو بن لیث صفار نے ایک لشکر فراہم کر کے فارس کے صوبہ پر قبضہ کرنا چاہا مگر اسماعیل سامانی نے اس کو ٹوکا کہ اس صوبہ پر اگر تم نے تصرف کا ارادہ کیا تو میں آتا ہوں۔ طاہر تو رک گیا مگر خلیفہ معتضد کے غلام بدر نے جا کر فارس پر قبضہ کر لیا۔ وزیر عبیداللہ بن سلیمان بن وہب کے انتقال پر خلیفہ معتضد نے اس کے بیٹے ابوالقاسم کو وزیر اعظم بنایا تھا۔ خلیفہ معتضد کے زمانہ میں رومیوں پر سنہ ۲۸۵ھ، سنہ ۲۸۷ھ اور سنہ ۲۸۸ھ میں مسلمانوں نے چڑھائیاں کیں۔ کبھی رومیوں کا زیادہ نقصان ہوا، کبھی مسلمانوں کا۔

وفات معتضد باللہ:

سنہ ۲۸۹ھ میں خلیفہ معتضد باللہ کثرت جماع کی وجہ سے بیمار ہو گیا۔ مختلف امراض اس پر مستولی ہو گئے تھے۔ نزع کی حالت میں ایک طبیب اس کی نبض دیکھ رہا تھا کہ معتضد نے اس کو ایک لات ماری۔ ادھر طبیب گرتے ہی مر گیا اور ادھر معتضد کی جان نکل گئی۔ معتضد نے چار لڑکے اور گیارہ لڑکیاں چھوڑیں۔ معتضد کی وفات آخر ماہ ربیع الثانی سنہ ۲۸۹ھ میں ہوئی۔

مکتفی باللہ

مکتفی باللہ بن معتضد باللہ بن موفق باللہ بن متوکل علی اللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید کا اصل نام علی اور کنیت ابو محمد تھی۔ ایک ترکیہ ام ولد جیجک نامی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ علی نام کے صرف دو ہی خلیفہ ہوئے۔ ایک علی رضی اللہ عنہ اور دوسرا مکتفی باللہ۔ معتضد باللہ نے اس کو اپنا ولی عہد

بنایا تھا۔ جب معتضد کا انتقال ہوا تو مکتفی رقہ میں تھا اور بدر غلام فارس میں۔ وزیر اعظم ابوالقاسم بن عبیداللہ نے مکتفی کے نام پر لوگوں سے بیعت لی اور مکتفی کے پاس رقہ میں خبر بھیجی۔ مکتفی ۷ جمادی الاول کو بغداد میں داخل ہوا اور قاسم وزیر کو سات خلعت عطا کیے۔ مکتفی عادل، خوش خلق اور خوبصورت شخص تھا۔ وزیر ابوالقاسم بن عبیداللہ بھی یہ چاہتا تھا کہ معتضد کی اولاد میں سے کوئی خلیفہ نہ ہو بلکہ اس خاندان کے کسی اور شخص کو خلیفہ بنایا جائے۔

بدر بن عبیداللہ اس کے ارادے میں سدراہ ہوا اور وزیر کو مجبوراً اپنے اس ارادے سے باز رہنا پڑا۔ اب مکتفی کے تخت نشین ہونے کے بعد وزیر کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر بدر نے حاضر دربار ہو کر خلیفہ سے میرے اس ارادے کا تذکرہ کر دیا تو خلیفہ میرا دشمن ہو جائے گا۔ اس لیے وہ اس کوشش میں مصروف ہوا کہ بدر کے آنے سے پہلے خلیفہ کو بدر کی جانب سے بدگمان کر دے۔ چنانچہ جو بڑے بڑے سردار بدر کے ساتھ فارس میں تھے، ان کو بلا لیا گیا۔ بدر فارس سے واسط میں آیا تو واسط کی طرف ایک فوج روانہ کر دی۔ بدر چاہتا تھا کہ میں خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کروں۔ وزیر نے خلیفہ کو بدر کی طرف سے اور بھی برہم کر دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ بدر کو بغداد پہنچنے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔

بدر نہایت عقلمند، بہادر اور مدبر شخص تھا۔ اس کا قتل بالکل اسی قسم کا قتل تھا، جیسا ہرثمہ بن اعین کا قتل مامون الرشید کے ابتدائی دور خلافت میں ہوا۔ ماہ رجب سنہ ۲۸۹ھ میں محمد بن ہارون نے جو اسماعیل سامانی کا ایک باغی سردار تھا، رے پر قبضہ کیا۔ خلیفہ مکتفی نے فوج بھیجی۔ اس کو محمد بن ہارون نے شکست دے کر بھگا دیا، تب خلیفہ مکتفی نے رے کا علاقہ بھی اسماعیل سامانی کو دے دیا۔ اسماعیل سامانی نے آ کر رے پر قبضہ کیا۔ محمد بن ہارون شکست کھا کر بھاگا، پھر گرفتار ہو کر آیا۔ اس کو اسماعیل سامانی نے جیل خانہ میں قید کر دیا۔ جہاں وہ شعبان سنہ ۲۹۰ھ میں مر گیا۔

قرامطہ کا ہنگامہ شام میں:

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ صوبہ بحرین پر قرامطہ نے تسلط کر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ کوفہ میں نمودار ہوئے مگر وہاں شکست کھائی تو دمشق میں پہنچ کر طغج نامی عامل دمشق کو بار بار شکستیں دے کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ مکتفی باللہ نے دمشق میں قرامطہ کی یہ چیرہ دستی دیکھ کر بغداد سے کوچ کیا اور سنہ ۲۹۰ھ

میں رقہ پہنچ کر قیام کیا اور محمد بن سلیمان کو ایک زبردست لشکر دے کر دمشق کی جانب قرامطہ کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ محمد بن سلیمان نے بڑی ہوشیاری اور بہادری کے ساتھ قرامطہ کا مقابلہ کیا۔ قرامطہ کا سردار ابوالقاسم یحییٰ المعروف بہ ذکرویہ ۶ محرم سنہ ۲۹۱ھ کو گرفتار ہوا۔ بہت سے قرامطہ مقتول، بہت سے مقید اور بہت سے مفرور ہوئے۔ ذکرویہ گرفتار ہوکر رقہ میں مکتفی کے سامنے پیش ہوا۔ اس نے اس کو قتل کر دیا۔ ذکرویہ کے بعد اس کے بھائی حسین نے قرامطہ کو فراہم کر کے بدامنی پیدا کی، وہ بھی مقتول ہوا۔ اس حسین قرمطی نے اپنا خطاب امیرالمومنین مہدی رکھا تھا۔ اس کے چچیرے بھائی عیسیٰ نے اپنا لقب مدثر رکھا اور یہ ظاہر کیا کہ سورہ مدثر میں میرا ہی نام آیا ہے۔ اس نے اپنے غلام کا نام مطوق بالنور رکھا تھا۔ غرض سنہ ۲۹۱ھ میں سب کے سب یکے بعد دیگرے مقتول ہوئے اور ملک شام میں یہ فتنہ فرو ہوا مگر یہاں سے قرامطہ نے یمن میں جا کر فتنہ برپا کر دیا۔

مصر میں بنی طولون کا خاتمہ:

جب قرامطہ کی جنگ سے فراغت حاصل ہوگئی تو مکتفی رقہ سے بغداد آیا اور محمد بن سلیمان بھی دمشق سے بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ شام کا اکثر حصہ ہارون بن خمارویہ بن احمد بن طولون کی حکومت میں شامل تھا اور اس سے لڑائی کرنے کا نہ خلیفہ ارادہ رکھتا تھا نہ محمد بن سلیمان۔ بلکہ قرامطہ کے استیصال کے واسطے خلیفہ کو خود حرکت کرنا اور اپنی فوجوں کو بھیجنا جہاں اپنی سلطنت کی حفاظت تھی، وہاں ہارون شاہ مصر کی حمایت تھی۔ محمد بن سلیمان پہلے خاندان طولون کے یہاں ایک کارگزار سردار تھا، پھر کسی بات پر ناراض ہوکر خلیفہ کے پاس آ کر متوسلین خلافت میں شامل ہو گیا تھا۔ بغداد کی طرف آتے ہوئے راستے میں محمد بن سلیمان کو بدرحمامی کا جو ہارون بن خمارویہ کا غلام تھا، ایک خط ملا۔ بدرحمامی نے لکھا تھا کہ آج کل بنی طولون کی سلطنت کا شیرازہ کمزور اور قوائے حکمرانی کمزور ہو گئے ہیں۔ اگر اس وقت آپ مع فوج کے اس طرف چلے آئیں اور مصر پر حملہ آور ہوں تو میں بھی اپنے ہمراہیوں کے خلاف آپ کی مدد کو تیار ہوں۔

محمد بن سلیمان یہ خط لیے ہوئے بغداد آیا اور خلیفہ مکتفی کی خدمت میں پیش کیا۔ خلیفہ مکتفی نے محمد بن سلیمان کو ایک زبردست فوج دے کر فوراً مصر کی جانب روانہ کر دیا۔ محمد بن سلیمان نے مصر پہنچ کر لڑائیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بدرحامی محمد بن سلیمان کے پاس چلا آیا۔ ہارون بن خمارویہ مارا

گیا۔ مصر پر محمد بن سلیمان کا قبضہ ہوا۔ خاندان طولون کے تمام افراد گرفتار کر کے بغداد بھیج دیے گئے۔ یہ واقعہ ماہ صفر سنہ ۲۹۲ھ کا ہے۔ دربار خلافت سے عیسیٰ نوشری کو مصر کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ محمد بن سلیمان حکومت مصر اس کے سپرد کر کے بغداد چلا آیا۔ وہاں بنی طولون کے حامی سرداروں میں سے ایک سپہ سالار ابراہیم خلیجی نامی نے عیسیٰ نوشری کو بے دخل کر کے خود مصر پر قبضہ کر لیا۔ عیسیٰ بغداد کے جیل خانہ میں قید کر دیا گیا۔ اسی سال خلیفہ نے مظفر بن حاج کو یمن کی شورش فرو کرنے کے لیے جو قرامطہ نے وہاں پر مچا رکھی تھی، سند گورنری دے کر روانہ کیا۔

بنی حمدان:

سنہ ۲۹۲ھ میں خلیفہ مکتفی نے ابوالہیجا عبداللہ بن حمدان بن حمدون عدی تغلبی کو صوبہ موصل کی گورنری عطا کی۔ یکم محرم سنہ ۲۹۳ھ کو وہ وارد موصل ہوا۔ اس کے موصل پہنچتے ہی کردوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ ابوالہیجا مصر سے فوج لے کر کردوں کے مقابلہ کو نکلا مگر شکست کھائی۔ موصل میں آ کر خلیفہ سے مدد طلب کی۔ یہاں سے فوج گئی اور ماہ ربیع الاول سنہ ۲۹۴ھ میں ابوالہیجا نے کردوں پر فوج کشی کی۔ وہ خوفزدہ ہو کر کوہ سیق میں جا کر پناہ گزین ہوئے۔ بہت دنوں تک محاصرہ اور لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر کردوں کے سردار محمد بن بلال نے امن کی درخواست کی، جو قبول ہوئی۔ ابوالہیجا کا تمام صوبہ میں سکہ بیٹھ گیا اور تمام کرد مطیع و منقاد ہو گئے۔ سنہ ۳۰۱ھ میں ابوالہیجا نے خلیفہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ خلیفہ مقتدر نے مونس نامی اپنے خادم کو بھیجا۔ وہ ابوالہیجا کو گرفتار کر کے بغداد لایا۔ اس کا قصور معاف ہوا اور بغداد میں رہنے لگا۔ ابوالہیجا کے بھائی حسین و ابوالہیجا دونوں بھائیوں کو مع دوسرے رشتہ داروں کے جیل خانہ میں قید کر دیا گیا جو سنہ ۳۰۵ھ میں رہا ہوئے۔

ترکوں اور رومیوں کے حملے:

سنہ ۲۹۱ھ میں رومیوں نے ایک لاکھ فوج سے بلاد اسلامیہ پر حملہ کر دیا مگر اس حملہ میں ان کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ سرحدی سرداروں نے مار کر بھگا دیا۔ سنہ ۲۹۳ھ میں ایک نئے حملہ آور گروہ کا ظہور ہوا یعنی ترکوں نے جو ماوراء النہر کے شمالی پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتے تھے، ماوراء النہر پر حملہ کیا۔ اس طرف سے یہ سب سے پہلا حملہ تھا جو ماوراء النہر پر ہوا۔ ان وحشی اور جنگلی حملہ آوروں کی تعداد بے شمار تھی اور ایک سیلاب تھا جو امڈ آیا تھا مگر اسماعیل سامانی حاکم ماوراء النہر نے بڑی ہمت

واستقلال کے ساتھ تمام فوجوں کو یکجا فراہم کر کے ان حملہ آوروں کو اچھی طرح سبق دیا۔ ہزار ہا گرفتار اور ہزار ہا مقتول ہوئے، باقی بھاگ گئے۔ اسی سال رومیوں نے مسلمانوں سے صلح کی درخواست کی اور حسب دستور سابق قیدیوں کا تبادلہ عمل میں آیا مگر اس صلح کے بعد ہی رومیوں نے شہر فورس پر شب خون مارا۔ ہزار ہا مسلمان بے خبری میں شہید اور گرفتار ہوئے۔ جامع مسجد کو رومیوں نے جلا دیا اور واپس چلے گئے۔ اسی سال اسماعیل سامانی کے بلاد دیلم اور ترکوں کے بعض علاقوں پر بہ زور شمشیر قبضہ کیا۔ سنہ ۲۹۴ھ میں مسلمانوں نے طرطوس کی طرف سے بلاد روم پر حملہ کیا اور بہت سے رومیوں کو گرفتار کیا، جن میں ایک بطریق بھی تھا۔ اس بطریق نے بطیّب خاطر اسلام قبول کیا۔

مکتفی باللہ کی وفات:

ماہ جمادی الاول سنہ ۲۹۵ھ میں ساڑھے چھ برس حکومت کر کے مکتفی باللہ بغداد میں فوت ہو کر محمد بن طاہر کے مکان میں مدفون ہوا۔ اُس نے وفات سے پہلے اپنے بھائی جعفر کو اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ مکتفی نے مرتے وقت بیت المال میں ڈیڑھ کروڑ دینار چھوڑے۔ جعفر بن معتضد کی عمر اس وقت تیرہ برس کی تھی۔ اس نے تخت نشین ہو کر اپنا لقب مقتدر باللہ تجویز کیا۔

مقتدر باللہ

مقتدر باللہ بن معتضد باللہ کا اصلی نام جعفر اور کنیت ابوالفضل تھی۔ ماہ رمضان سنہ ۲۸۲ھ میں ایک رومیہ ام ولد غریب نامی کے بطن سے پیدا ہوا۔ مکتفی باللہ نے مرنے سے قبل جب اپنے ولی عہد کی نسبت لوگوں سے مشورہ کیا تو لوگوں نے اس کو یقین دلایا کہ مقتدر باللہ بالغ ہو گیا ہے۔ تب اس نے مقتدر کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔ اس سے پہلے ایسی چھوٹی عمر میں کوئی خلیفہ تخت نشین نہیں ہوا تھا۔ مقتدر کی تخت نشینی کے بعد لوگوں میں اس کی خلافت کی نسبت چرچا ہونے لگا۔ وزیراعظم عباس بن حسن کے اختیارات چونکہ بہت وسیع ہو گئے تھے اور خزانہ پر تصرف کرنے کا بھی اختیار چونکہ وزیراعظم ہی کو تھا، اس لیے اور بھی اراکین سلطنت کو مقتدر کی خلافت ناگوار تھی۔ ادھر وزیراعظم بھی اس لڑکے کی خلافت سے خوش نہ تھا۔ چنانچہ ابوعبداللہ بن محمد بن معتز کو خلافت پر آمادہ کیا۔ ابھی مقتدر کے معزول اور محمد بن معتز کے تخت نشین کرنے کے مشورے اور تیاریاں ہو رہی تھیں کہ

ابوعبداللہ محمد بن معتز کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ابوالحسین بن متوکل کو تخت نشین کرنے کا انتظام کیا گیا۔ اتفاق کی بات کہ ابوالحسین بھی فوت ہوگیا۔ اس کے بعد اور ابوعبداللہ محمد بن معتز کی وفات کی وجہ سے خلیفہ مقتدر کی حکومت کو ایک قسم کا استحکام حاصل ہوگیا۔ چند روز کے بعد پھر سرگوشیاں شروع ہوئیں اور ارا کین سلطنت نے عبداللہ بن معتز کو تخت خلافت کے لیے آمادہ کیا۔ عبداللہ بن معتز نے اس شرط کے ساتھ منظور کیا کہ خوں ریزی نہ ہو اور تمام ارا کین سلطنت اس تجویز میں شریک تھے مگر وزیراعظم عباس بن حسین اس میں شریک نہ تھا۔ ۲۰ ربیع الاول سنہ ۲۹۶ھ کو سب سے پہلے وزیراعظم کو جبکہ وہ اپنے باغ کو جا رہا تھا، دفعتاً حملہ کر کے قتل کر دیا گیا۔ اگلے دن ۲۱ ربیع الاول سنہ ۲۹۶ھ کو مقتدر کی معزولی کا اعلان کر کے عبداللہ بن معتز کی بیعت سب نے کر لی۔ اس وقت خلیفہ مقتدر چوگان کھیل رہا تھا۔ اپنی معزولی کا حال سنتے ہی فوراً محل سرائے چلا گیا اور دروازے بند کر لیے۔ عبیداللہ بن معتز نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنا لقب المرتضٰی باللہ تجویز کیا اور مقتدر کو لکھ بھیجا کہ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ دارالخلافہ چھوڑ کر باہر آ جاؤ اور خلافت کی ہوس ترک کر دو۔ مقتدر نے لکھا کہ مجھ کو آپ کے ارشاد کی تعمیل بہ سروچشم منظور ہے مگر شام تک مہلت عطا کر دو۔ رات کو مونس خادم سے دوسرے خدام نے مشورہ کیا کہ کوئی ہنگامہ برپا کرنا چاہیے۔ حسین بن حمدان قصر خلافت کے دروازے پر پہنچا تو انہوں نے تیروں کا مینہ برسایا۔ شام تک مقتدر کے غلاموں نے یہی سلسلہ جاری رکھا۔ رات کو بہ تدریج اور لوگ بھی مقتدر کی جمعیت میں شامل ہوتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ بن معتز جدید خلیفہ کو مع اپنے چند ہواخواہوں کے روپوش ہونا پڑا۔ مقتدر نے مونس خادم کو پولیس کی افسری عطا کر کے فتنہ کو فرو کرنے کا حکم دیا۔ ابوالحسن بن فرات کو وزیراعظم بنایا۔ عبداللہ بن معتز گرفتار ہو کر مقتول ہوا۔ اسی سال یعنی ربیع الثانی سنہ ۲۹۶ھ میں عبیداللہ مہدی کی بیعت افریقہ میں ہوئی اور دولت عبیدیہ شیعیہ امامیہ کی ابتدا ہو کر افریقہ میں دولت اغالبہ کا خاتمہ ہوا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دولت عبیدیہ کے آغاز اور دولت اغالبہ کے اختتام کا حال اس جگہ بیان کر دیا جائے۔

دولت عبیدیہ کا آغاز

عبیداللہ مہدی سب سے پہلا بادشاہ اپنے آپ کو محمد بن جعفر بن محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق کا بیٹا بتاتا تھا لیکن اس کے نسب میں لوگوں نے سخت اختلاف کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مجوسی

تھا۔ بعض نے اس کو نصرانی کہا ہے۔ شیخ المناظرین قاضی ابوبکر باقلانی نے بھی عبیداللہ مہدی کے عالی نسب ہونے سے انکار کیا ہے۔ مشاہیر علماء نے خلیفہ قادر باللہ کے عہد میں جبکہ اس کے نسب کا مسئلہ زیر غور تھا، صاف طور پر عبیداللہ مہدی کو اپنے دعوئے علویت میں کاذب قرار دیا تھا۔ ان علماء میں ابوالعباس ابیوذرہ، ابوحامد اسفرائنی، ابوجعفر نسفی، قدوری وغیرہ شامل ہیں۔ علویہ میں سے مرتضیٰ بن بطحاوی، ابن ارزق نے بھی عبیداللہ مہدی کو دعویٰ نسبت میں دروغ گو اور مفتری قرار دیا ہے۔

عبیداللہ مہدی غالی شیعہ تھا علمائے شیعہ نے بھی اس کے علوی ہونے سے انکار کیا ہے۔ مثلاً ابوعبداللہ بن نعمان نے بھی عبیداللہ مہدی کو علویت کے دعوے میں کاذب قرار دیا ہے۔ امام المورخین علامہ شیخ جلال الدین سیوطی نے بڑے زور کے ساتھ عبیداللہ مہدی کو اپنے نسب کے دعوے میں جھوٹا اور مجوسی النسل ثابت کیا ہے۔

مگر علم تاریخ کے ایک اور بہت بڑے امام یعنی ابن خلدون نے عبیداللہ کو علوی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے مقدمہ ابن خلدون میں بھی اور اپنی تاریخ میں بھی عبیداللہ کو نسب کے دعویٰ میں سچا تسلیم کیا ہے لیکن ابن خلدون نے اس معاملے میں جو دلائل پیش کیے ہیں، وہ نہایت ہی کمزور ہیں اور امام ابن خلدون کے مرتبے کا تصور کرتے ہوئے تو بہت ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ عبیداللہ کے خاندان میں ایک زبردست سلطنت قائم ہوگئی۔ اگر وہ علوی نہ ہوتا تو لوگ اس کی بادشاہت کو تسلیم نہ کرتے اور اس کے جھنڈے کے نیچے اپنے سر نہ کٹاتے۔ کسی کے نسب کی نسبت ثبوت پیش کرتے ہوئے اس قسم کی دلیل کا پیش کرنا یقیناً ایک تمسخر انگیز چیز ہے اور حقیقت یہ ہے کہ امام ابن خلدون کے پاس اس معاملہ میں دلیل ایک بھی نہیں ہے۔ وہ چونکہ خود مغربی ہیں، اس لیے ایک مغربی حکمران خاندان کے نسب کا مجہول ہونا ان کو بالطبع ناپسند ہے۔ اسی طرح وہ مراکش کی سلطنت ادریسیہ کو بھی علوی ہی ثابت کرنے میں پورا زور لگاتے ہیں اور ادریس ثانی کو ادریس اول کا بیٹا ثابت کرنے اور ایک بربری عورت کی عصمت و عفت کو بلاضرورت زیر بحث لانے میں پورا زور صرف کرتے ہیں کیونکہ وہ ہی ایک مغربی سلطنت تھی۔ ممکن ہے کہ یہ بدگمانی امام موصوف کی نسبت ایک معصیت ہو، استغفراللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ۔ بہرحال ان سلطنتوں کی تاریخ مسلسل طور پر جس مقام سے شروع ہوگی، وہاں پورے طور پر یہ نسبت کی بحث درج کی جائے گی۔

ابن حوشب نجار ایک کوفی ثم یمنی نے جو قرمطی اور شیعہ تھا، حلوانی وسفیانی نام کے دو مناد ملک افریقہ میں بھیجے کہ وہاں جا کر لوگوں کو محبت اہل بیت کی دعوت دیں اور بہ تدریج اپنی تحریک کو پھیلائیں۔ ان دونوں نے افریقہ کے ایک مقام کتامہ نامی میں قیام کر کے لوگوں کو اس طرف بلایا اور ایک معقول تعداد کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور اس بات کا یقین دلایا کہ شیخین رضوان اللہ علیہما غاصب خلافت تھے۔ اس لیے ان سے تبرا کرنا واجب ہے اور خلافت وامامت صرف اولاد علی رضی اللہ عنہ کا حق ہے۔ مقام کتامہ اس تحریک کا مرکز بن گیا۔ وہاں سے جب یہ خبر آئی کہ حلوانی وسفیانی دونوں مر گئے تو عبیداللہ مذکور نے ایک شخص ابوعبداللہ حسین بن احمد بن محمد بن زکریا شیعی کو جو صنعاء کا رہنے والا تھا، یہ یقین دلا کر کہ میں امام جعفر صادق کی اولاد سے ہوں، اپنا داعی بنا کر افریقہ کی طرف روانہ کیا اور سمجھا دیا کہ اسماعیل بن جعفر صادق کے بیٹے محمد معروف بہ محمد مکتوم میرے پردادا تھے۔ اس لیے تم کتامہ میں جا کر قیام کرنا کیونکہ کتامہ اور مکتوم دونوں کتمان سے مشتق ہیں۔

ابوعبداللہ اول یمن میں ابن حوشب کے پاس گیا۔ وہاں سے حجاج کے ایک قافلہ کے ساتھ مکہ مکرمہ میں آیا۔ یہاں اس نے کتامہ کے حاجیوں کا قافلہ تلاش کر کے ان کے ساتھ واقفیت پیدا کی۔ انہوں نے اس کے زہد وورع کو دیکھ کر خوب خدمت وتعظیم کی۔ حج سے فارغ ہو کر جب وہ لوگ افریقہ کی جانب روانہ ہوئے تو ابوعبداللہ بھی ان ہی کے ساتھ ہو لیا۔ انہوں نے بہت ہی غنیمت سمجھا۔ کتامہ میں جا کر انہوں نے اس کے قیام کے لیے کوہ انکجان پر ایک مکان بنا دیا، جس کا نام فج الاخیار رکھا۔ وہاں ابوعبداللہ مصروف عبادت رہنے لگا اور لوگ اس کے پاس بڑی گرویدگی کے ساتھ آنے جانے لگے۔ ابوعبداللہ نے وہاں ظاہر کیا کہ مہدی عنقریب ظاہر ہونے والے ہیں اور انہوں نے ہم کو اسی مقام پر قیام کرنے کی ہدایت کی تھی اور یہ بھی فرمایا تھا کہ ہمارے انصار کا نام مشتق ہے۔ کتمان سے وہ اہل کتامہ ہی ہوں گے۔ رفتہ رفتہ ابوعبداللہ کی حکومت وسیادت کتامہ میں قائم ہو گئی۔

یہ خبر ابراہیم بن احمد بن اغلب والی افریقہ کے پاس دارالسلطنت قیروان میں پہنچی تو اس نے ولایت میلہ کے عامل کو لکھا کہ ابوعبداللہ جو کتامہ میں مقیم ہے، اس کے حالات کے بارے میں اطلاع دو۔ عامل نے لکھ کر بھیج دیا کہ وہ ایک تارک الدنیا شخص ہے، لوگوں کو نماز روزہ کی نصیحت کرتا رہتا ہے۔ ابراہیم یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ چند ہی روز کے بعد ابوعبداللہ نے اپنی جمعیت کو مضبوط کر کے شہر میلہ پر حملہ کر دیا اور بعد محاصرہ وہاں کے عامل کو بے دخل کر کے میلہ پر قابض ومتصرف ہو

گیا۔ یہ سن کر ابراہیم بن احمد اغلبی نے اپنے بیٹے احول کو ایک لشکر کے ساتھ اس طرف روانہ کیا۔ ابوعبداللہ شہر میلہ سے شکست کھا کر کتامہ کی جانب فرار ہوا اور کوہ انکجان میں جا کر دم لیا۔ احول وہاں سے قیروان کو لوٹ گیا۔ اسی عرصہ میں ابراہیم بن احمد بادشاہ افریقہ نے وفات پائی۔ اس کا بیٹا ابوالعباس تخت نشین ہوا۔

ابوعبداللہ نے انکجان میں ایک شہر آباد کیا، جس کا نام دارالہجرۃ رکھا۔ احول اس کی سرکوبی کے لیے انکجان کی طرف آیا۔ ادھر ابوالعباس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا زیادۃ اللہ تخت نشین ہوا۔ زیادۃ اللہ نے احول کو بلا کر کسی وجہ سے قتل کر دیا۔ ابوعبداللہ کو دم بہ دم طاقت حاصل ہوتی چلی گئی۔ اس نے اہل کتامہ کا ایک وفد عبیداللہ مہدی کے پاس علاقہ حمص کی طرف، جہاں عبیداللہ مقیم تھا، روانہ کیا اور اپنی کامیابی اور فتوحات کے متعلق اطلاع دے کر لکھا کہ اب آپ اس طرف تشریف لائیں۔ اس وفد کے آنے اور اس کے بارے میں خبر لانے کا حال جاسوسوں کے ذریعہ سے خلیفہ مکتفی باللہ کو معلوم ہوا۔ اس نے فوراً عبیداللہ کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا اور مصر کے گورنر عیسیٰ نوشری کو بھی (اس زمانہ میں عیسیٰ نوشری بنی طولون کی بربادی کے بعد مصر کا گورنر تھا) لکھا کہ عبیداللہ کو جو مصر میں ہو کر گزرے گا، گرفتار کر لو۔ خلیفہ مکتفی کے اس حکم کو بھی ابن خلدون نے عبیداللہ کے علوی ہونے کی دلیل ٹھہرایا ہے یعنی اگر عبیداللہ خاندان اہل بیت سے نہ ہوتا تو مکتفی اس کی گرفتاری کا حکم جاری نہ کرتا۔ حالانکہ یہ بہت ہی کمزور دلیل ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک ہنگامہ پسند اور خواہان سلطنت شخص کو جو خفیہ طور پر کوششوں میں مصروف ہو، گرفتار کرنا ہر ایک سلطنت کا فرض ہوتا ہے۔ چاہے اس کی سازش اور ریشہ دوانی کا مقام اس سلطنت کے حدود سے باہر ہی کیوں نہ ہو اور ظاہر ہے کہ شاہان افریقہ یعنی خاندان اغلب کے فرماں روا عباسیہ خلافت کی سیادت کو تسلیم کرتے اور خطبوں میں عباسی خلیفہ کا نام لیتے تھے۔ نیز یہ کہ افریقہ کی سرحد مصر سے ملی ہوئی تھی۔ لہٰذا مکتفی یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ افریقہ میں کوئی فتنہ برپا ہو۔

عبیداللہ حمص سے اپنے لڑکے اور متعلقین کو لے کر چلا۔ اس نے سوداگروں کی وضع اختیار کر رکھی تھی اور بھیس بدلے ہوئے سوداگروں کے قافلہ کے ساتھ تھا۔ وہ مصر میں گرفتار ہوا مگر پھر اس کو نوشری نے دھوکا کھا کر چھوڑ دیا۔ مصر سے گزر کر وہ افریقہ کی حدود میں داخل ہوا، یہاں بھی زیادۃ اللہ کے جاسوس اس کی فکر میں تھے مگر وہ سب سے بچتا بچاتا ریاست سلجماسہ میں پہنچا۔ وہاں کے حاکم

نے اس کو پکڑ کر مع اس کے لڑکے کے قید کر دیا۔ زیادۃ اللہ عیش وعشرت میں مصروف تھا۔ سلطنت کے کاموں کی طرف اس کو مطلق توجہ نہ تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوعبداللہ شیعی کی طاقت دم بہ دم ترقی کرتی گئی اور اس کی کوئی روک تھام نہ کی گئی۔ جب زیادۃ اللہ نے دیکھا کہ ابوعبداللہ شیعی نے افریقہ کے بہت سے علاقہ پر قبضہ کر لیا ہے اور دم بہ دم ملک کو دباتا چلا آتا ہے تو اس نے ایک زبردست لشکر فراہم کر کے ابوعبداللہ کی سرکوبی کے لیے مامور کیا۔

ابوعبداللہ تاب مقاومت نہ لا کر ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ چھ مہینے اس پہاڑ پر محصور رہا۔ ساتویں مہینے ایک کامیاب شب خون مار کر لشکر افریقہ کو بھگا دیا اور پھر یکے بعد دیگرے شہروں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ زیادۃ اللہ نے ایک دوسرے سردار کو پھر مقابلہ پر بھیجا، اس کو شکست ہوئی۔ تب سنہ ۲۹۵ھ میں زیادۃ اللہ نے خاص اہتمام کے ساتھ فوجوں اور سپہ سالاروں کو ابوعبداللہ کی سرکوبی پر مامور کیا مگر اب ابوعبداللہ کا رعب قائم ہو چکا تھا۔ سال بھر تک برابر لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی ابوعبداللہ کو شکست ہوئی، کبھی لشکر افریقہ کو۔ اس عرصہ میں ابوعبداللہ کی جمعیت بڑھتی چلی گئی اور لوگ آ کر اس کی فوج میں شامل ہوتے گئے۔ زیادۃ اللہ کی فوج کم ہو رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا شہر ابوعبداللہ کے قبضہ میں آتا گیا۔ یہاں تک کہ زیادۃ اللہ کے سرداران فوج بھی یکے بعد دیگرے ابوعبداللہ کے پاس آ آ کر حاضر ہونے لگے۔

عروبہ بن یوسف اور حسن بن ابی خزیر نے حاضر ہو کر ملازمت حاصل کی۔ ماہ رجب سنہ ۲۹۶ھ میں ابوعبداللہ نے دارالسلطنت قیروان پر قبضہ کر کے زیادۃ اللہ کو بھگا دیا اور شاہی محلات میں اہل کتامہ کو قیام کا موقع دیا، پھر سلجماسہ پر چڑھائی کر کے وہاں کے حاکم السیع بن مدرار کو شکست دے کر گرفتار و قتل کیا اور عبیداللہ مہدی مذکور کو جیل خانہ سے نکال کر گھوڑے پر سوار کیا اور اس کے پیچھے یہ کہتا ہوا: ھذا مولا کم ھذا مولا کم لشکر گاہ میں آیا۔ وہاں سے کوچ کر کے شہر رفادہ میں آیا۔ عبیداللہ کے ہاتھ پر ابوعبداللہ اور تمام لوگوں نے بیعت کی اور ''المہدی امیرالمومنین'' کے لقب سے ملقب کیا۔ یہ بیعت آخر عشرہ ماہ ربیع الثانی سنہ ۲۹۶ھ میں ہوئی اور اسی روز سے دولت عبیدیہ کی ابتدا ہوئی۔

مہدی عبیداللہ نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے داعیوں اور واعظوں کو تمام ملک میں پھیلا دیا۔ لوگوں نے اس کے مذہب کو قبول کرنے سے انکار کیا تو ان کے قتل کرنے کا حکم دیا اور اہل کتامہ کو

بڑی بڑی جاگیریں اور مناصب عطا کیے۔ جزیرۂ صقلیہ کی حکومت پر حسن بن احمد بن ابی خزیر کو مامور کر کے بھیجا جو ۱۰ ذی الحجہ سنہ ۲۹۷ھ کو اس جزیرہ میں پہنچا اور ظلم و تعدی سے جزیرہ کی تمام رعایا کا ناک میں دم کر دیا۔ اسی طرح تمام ملک افریقہ میں عامل و والی مقرر کر کے با قاعدہ حکومت شروع کر دی۔

سنہ ۲۹۹ھ میں اہل صقلیہ نے حسن بن احمد بن ابی خزیر کی شکایت عبیداللہ مہدی کو لکھ کر بھیجی۔ اس نے اس کی جگہ علی بن عمر کو صقلیہ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اہل صقلیہ اس سے بھی ناخوش ہوئے اور اس کو معزول کر کے انہوں نے خود ہی احمد بن موہب کو اپنا امیر منتخب کر لیا۔ احمد بن موہب نے لوگوں کو مقتدر باللہ عباسی خلیفہ کی اطاعت پر آمادہ کیا اور مہدی کا نام خطبہ سے نکال کر مقتدر باللہ کا نام خطبہ میں داخل کر دیا اور جنگی جہازوں کا بیڑہ مرتب کر کے ساحل افریقہ کی طرف روانہ کیا۔

عبیداللہ مہدی نے مقابلے کے لیے ایک جنگی بیڑہ حسین بن علی بن خزیر کی ماتحتی میں مقابلہ پر روانہ کیا۔ دونوں بیڑوں میں بحری جنگ ہوئی۔ ابن خزیر مارا گیا اور عبیداللہ مہدی کے بیڑے کو اہل صقلیہ نے جلا کر ڈبو دیا۔ ان حالات کی خبر جب بغداد میں پہنچی تو خلیفہ مقتدر نے احمد بن موہب کے پاس سیاہ خلعت اور جھنڈے روانہ کیے اور اس طرح تقریباً ایک سال کے لیے جزیرہ صقلیہ میں عباسی خلیفہ کا خطبہ پڑھا گیا۔ عبیداللہ مہدی نے ایک زبردست جنگی بیڑہ تیار کر کے صقلیہ کی طرف روانہ کیا، جس سے احمد بن موہب کی طاقت ٹوٹ گئی اور اہل صقلیہ نے اس کو اپنے سپاہیوں کے ہمراہیوں کے عبیداللہ مہدی کے پاس بھیج کر خود عفو تقصیرات کی درخواست کی۔ عبیداللہ مہدی نے حکم دیا کہ احمد بن موہب اور اس کے ہمراہیوں کو ابن خزیر کی قبر پر لے جا کر قتل کر دو۔ یہ واقعہ سنہ ۳۰۰ھ میں وقوع پذیر ہوا۔

بیعت ولی عہدی:

سنہ ۳۰۱ھ میں مقتدر نے اپنے چہار سالہ بیٹے ابوالعباس کو، جو بعد میں قاہر باللہ کے بعد راضی باللہ کے لقب سے تخت خلافت پر بیٹھا تھا، اپنا ولی عہد بنایا اور مصر و مغرب کی گورنری اس کے نام کر کے مونس خادم کو اس کی نیابت میں مصر کی طرف روانہ کیا۔

اسی سال حسن بن علی بن حسین بن علی بن عمر بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب نے جو اطروش کے نام سے مشہور ہے، صوبہ طبرستان پر قبضہ کر لیا۔ اطروش نے طبرستان و دیلم میں اسلام کی

خوب اشاعت کی اور اس علاقے کے رہنے والوں کو اپنے وعظ و پند سے دائرہ اسلام میں داخل کر کے قوت حاصل کی اور طبرستان پر قبضہ کیا۔ اطروش مذہباً زیدی شیعہ تھا۔ اس لیے ان لوگوں کا، جو اطروش کی کوشش سے مسلمان ہوئے تھے، یہی مذہب ہوا۔ اطروش کے تمام سرداران لشکر دیلمی تھے۔ سنہ ۳۰۴ھ میں والی خراسان نے طبرستان پر حملہ کر کے اطروش کو قتل کر دیا۔

سنہ ۳۰۲ھ میں عبیداللہ مہدی نے اپنے سپہ سالار خفاشہ کتامی کو اسکندریہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ مونس خادم نے جو مصر پہنچ چکا تھا، مقابلہ کیا۔ سخت معرکہ آرائیوں کے بعد مہدوی فوج سات ہزار آدمیوں کو مقتول کرا کر افریقہ کی طرف بھاگ گئی۔

سنہ ۳۰۷ھ میں عبیداللہ نے اپنے بیٹے ابوالقاسم کو ایک عظیم الشان لشکر دے کر مصر پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا، جو مونس کے مقابلہ میں شکست کھا کر اور بہت سے سرداروں کو گرفتار کرا کر واپس گیا۔ اسی سال قیصر روم نے مقتدر باللہ سے صلح کی اور دوستی و محبت کے تعلقات قائم کرنے کے لیے اپنے سفیر بغداد میں روانہ کیے جن کے استقبال میں بڑی شان و شوکت کا اظہار کیا گیا۔ سنہ ۳۰۸ھ میں عبیدی لشکر نے مصر کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔

عراق میں قرامطہ کی شورش:

قرامطہ کا ایک گروہ صوبہ بحرین پر قابض و متصرف تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، سنہ ۳۱۱ھ میں قرامطہ کے سردار ابوطاہر سلیمان بن ابی سعید جنانی نے ایک روز رات کے وقت ایک ہزار سات سو آدمیوں کے ساتھ بصرہ پر حملہ کیا۔ شہر پناہ کی دیواروں پر سیڑھیاں لگا کر چڑھ گئے اور محافظوں کو قتل کر کے شہر پناہ کے دروازے کھول دیے اور قتل عام شروع کر دیا۔ بصرہ کا عامل سبا مفلحی مطلع ہو کر مقابلہ پر آیا اور قرامطہ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ ابوطاہر نے بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ سترہ روز تک بصرہ میں قیام کیا۔ مال و اسباب اور عورتوں و بچوں کو گرفتار کر کے اٹھارہویں روز ہجر کی طرف کوچ کر گیا۔ خلیفہ مقتدر نے اس حادثہ کی خبر سن کر محمد بن عبداللہ فاروقی کو بصرہ کی سند گورنری دے کر بصرہ کی جانب روانہ کیا۔ محمد بن عبداللہ اس وقت بصرہ میں پہنچا، جب ابوطاہر وہاں سے روانہ ہو چکا تھا۔

سنہ ۳۱۲ھ میں ابوطاہر قرمطی نے فوج لے کر مکہ سے واپس آنے والے حاجیوں کے قافلوں کو لوٹا اور ابوالہیجا حمدانی اور مقتدر باللہ کے ماموں احمد بن بدر کو جو انہیں قافلوں میں تھے، گرفتار کر کے

لے گیا۔ چند روز کے بعد ان دونوں کو رہا کر دیا اور خلیفہ مقتدر سے اہواز کو طلب کیا۔ خلیفہ نے انکار کیا تو ابو طاہر نے پھر قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ خلیفہ نے فوج بھیجی۔ ابو طاہر نے اس شاہی فوج کو شکست دے کر کوفہ تک اس کا تعاقب کیا اور کوفہ پر قبضہ کر کے چھ روز تک کوفہ میں قیام کیا اور وہاں سے بے حد مال و اسباب لے کر ہجر کی طرف روانہ ہوا۔

سنہ ۳۱۳ھ میں قرامطہ کے خوف سے کسی نے حج نہیں کیا۔ سنہ ۳۱۴ھ میں خلیفہ مقتدر نے یوسف بن ابی الساج کو آذربائیجان سے طلب کر کے بلاد شرقیہ کی حکومت سپرد کی اور ابو طاہر قرمطی کے مقابلہ کا حکم دیا۔ اس سال کوئی مقابلہ نہ ہوا، رمضان سنہ ۳۱۵ھ میں ابو طاہر فوج لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر واسط سے کوفہ کے بچانے کو یوسف چلا مگر ابو طاہر نے یوسف سے ایک روز پہلے پہنچ کر کوفہ پر قبضہ کر لیا۔ یوسف نے آ کر لڑائی شروع کی۔ یوسف کی فوج ابو طاہر سے شکست کھا کر فرار ہوئی اور یوسف زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ ابو طاہر نے یوسف کے علاج پر ایک طبیب مقرر کیا۔ بغداد میں یہ خبر پہنچی تو وہاں سے خلیفہ نے مونس کو روانہ کیا۔ مونس کے پہنچنے سے پہلے ابو طاہر کوفہ چھوڑ کر عین التمر کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ ابو طاہر نے کوفہ سے روانہ ہو کر انبار پر قبضہ کیا اور وہاں کی فوج کو شکست دے کر بھگا دیا۔ آخر نصر حاجب بغداد سے چلا اور مونس کے ساتھ مل کر دونوں نے چالیس ہزار فوج سے قرامطہ پر حملہ کیا مگر شکست کھائی۔ ابو طاہر نے یوسف کو جو اس کی قید میں تھا، قتل کر دیا۔ اس شکست کا حال سن کر اہل بغداد سخت پریشان ہوئے اور بغداد چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ شروع سنہ ۳۱۶ھ میں ابو طاہر نے انبار سے کوچ کر کے مقام راحبہ کو لوٹا اور ایک شب و روز اپنے لشکریوں کے لیے اہل رحبہ کا خون مباح کر دیا۔

اہل قرقیسا نے اس قتل عام کا ہیبت ناک منظر دیکھ کر امن کی درخواست کی، جس کو ابو طاہر نے منظور کر لیا، پھر فوجی دستے شب خون مارنے کے لیے ادھر ادھر روانہ کیے۔ تین روز کی مسلسل جنگ کے بعد رقہ کو فتح کر لیا اور صوبہ جزیرہ پر قابض و متصرف ہو گیا۔ بغداد سے فوجیں روانہ ہوئیں مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ سنہ ۳۱۶ھ ماہ شوال میں قرامطہ ہجر کی طرف چلے گئے، پھر چند روز کے بعد انہوں نے سواد واسط، عین التمر میں مختلف جماعتوں کی شکل میں ہنگامہ آرائیاں برپا کیں۔ خلیفہ مقتدر نے ہارون بن غریب، صافی بصری اور ابن قیس وغیرہ سرداروں کو قرامطہ کی سرکوبی پر مامور کیا۔ قرامطہ کی جماعتیں شکست کھا کھا کر اور اپنے علمِ چھنوا کر فرار ہوئیں اور ان علاقوں میں امن و امان قائم ہوا۔

اسی سال ابو طاہر نے ایک مکان بنوایا، اس کا نام دار الہجرت رکھا۔

رومیوں کی چیرہ دستی:

سنہ ۳۱۴ھ میں اہل روم نے ملطیہ کو فتح کر لیا۔ سنہ ۳۱۵ھ میں دمیاط پر قابض ہو گئے اور شہر کو غارت کر کے جامع مسجد میں ناقوس بجوایا۔ اسی سال اہل دیلم نے رے اور جبال کے علاقہ پر حملہ کر کے ہزارہا آدمی قتل کیے۔ اسی سال رومیوں نے خلاط پر قبضہ کیا اور وہاں کی جامع مسجد میں سے منبر نکال کر اس کی جگہ صلیب قائم کر کے گرجا بنا لیا۔

مقتدر کا معزول و بحال ہونا:

سنہ ۳۱۷ھ میں مونس المعروف بہ مظفر نے مقتدر کو معزول کیا۔ بات یہ تھی کہ مقتدر مونس کی بجائے ہارون بن غریب کو عرض بیگی یعنی حاجب بنانا چاہتا تھا۔ مونس کو اس کا حال معلوم ہوا تو فوج اور اکثر اراکین کو ہمراہ لے کر قصر خلافت پر چڑھ آیا اور مقتدر کو گرفتار کر کے محمد بن معتضد کو القاہر باللہ کے لقب سے تخت نشین کیا۔ سب نے اس کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لی اور عاملوں کے پاس اطلاعی فرامین بھیج دیے گئے۔ اگلے روز فوج نے آ کر انعام و اکرام کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبہ کے پورا ہونے میں توقف ہوا تو لوگوں نے غل مچا دیا اور مقتدر کی تلاش میں مونس کے گھر گئے۔ وہاں سے مقتدر کو کندھوں پر اٹھا کر قصر خلافت میں لے آئے، پھر اس کے سامنے قاہر باللہ کو پکڑ کر لے آئے۔ مقتدر نے قاہر باللہ کو دیکھ کر کہا کہ تم ذرا خوف نہ کرو۔ اس میں تمہاری کوئی خطا نہ تھی۔ لوگوں میں سکون پیدا ہوا اور پھر عاملوں کے پاس اطلاعی فرامین بھیجے گئے کہ مقتدر باللہ بہ دستور خلیفہ ہے۔ مقتدر نے لوگوں کو انعام و اکرام دے کر خوش کیا۔

مکہ میں قرامطہ کی تعدی:

قرامطہ کی حکومت بحرین میں مضبوط و مستقل ہو چکی تھی۔ قرامطہ کا سردار ابو طاہر تھا مگر خطبہ میں یہ لوگ عبیداللہ مہدی والی افریقہ کا نام لیتے اور اس کو اپنا خلیفہ مانتے تھے۔ سنہ ۳۱۸ھ میں ابو طاہر قرمطی فوج لے کر مکہ مکرمہ کی طرف گیا، یہ حج کا زمانہ تھا۔ بغداد سے خلیفہ کی جانب سے منصور دیلمی امیر حجاج بن کر روانہ ہوا تھا۔ وہ ۸ ذوالحجہ کو بہ خیریت مکہ میں پہنچ گیا۔ ۹ ذوالحجہ کو ابو طاہر پہنچا اور مکہ میں جاتے ہی حاجیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ سب کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ خانہ کعبہ کے اندر بھی

لوگوں کو قتل کرنے سے باز نہ رہا۔ مقتولوں کی لاشیں چاہ زم زم میں ڈال دیں۔ حجراسود کو گرز مار کر توڑ ڈالا اور دیوار کعبہ سے جدا کر کے گیارہ روز تک یوں ہی پڑا رہنے دیا۔ خانہ کعبہ کا دروازہ توڑ ڈالا۔ محمد بن ربیع بن سلیمان کا قول ہے کہ میں اس ہنگامہ میں مکہ کے اندر موجود تھا۔ میرے سامنے ایک شخص خانہ کعبہ کی چھت پر محراب کعبہ اکھیڑنے کے لیے چڑھا۔ میں نے کہا کہ الٰہی! یہ ظلم مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس شخص کا پاؤں پھسلا، سر کے بل گرا اور گرتے ہی مر گیا۔ ابو طاہر نے گیارہ روز تک مکہ کے باشندوں کو خوب لوٹا پھر حجراسود کو اونٹ پر لاد کر ہجر (دارالسلطنت بحرین) کی طرف لے چلا۔ مکہ سے ہجر تک سنگ اسود کے نیچے چالیس اونٹ ہلاک ہوئے۔ بیس برس تک حجراسود قرامطہ کے قبضہ میں رہا۔ پچاس ہزار دینار اس کے عوض قرامطہ کو دینے منظور کیے لیکن انہوں نے نہیں دیا۔ آخر زمانہ خلافت مطیع اللہ میں حجراسود ان سے واپس لے کر خانہ کعبہ میں نصب کیا گیا۔ واپسی کے وقت ہجر سے مکہ تک اس کو صرف ایک اونٹ لے آیا تھا۔ اس ظلم و زیادتی کا حال عبیداللہ حاکم افریقہ کو معلوم ہوا تو اس نے ابو طاہر کو بڑی لعنت و ملامت کا خط لکھا اور اہل مکہ کے مال و اسباب کو واپس کر دینے کی تاکید کی۔ ابو طاہر نے کچھ حصہ اہل مکہ کے مال و اسباب کا واپس کر دیا مگر حجراسود کو واپس نہیں کیا۔ وہ سنہ ۳۳۹ھ میں واپس مکہ آ کر اپنی جگہ پر نصب ہوا۔

مقتدر باللہ کا قتل:

مونس خادم نے ماہ صفر سنہ ۳۲۰ھ میں واصل پر قبضہ کر لیا اور سعید و داؤد ابنان عبداللہ بن حمدان اور ان کے بھتیجے ناصر الدولہ حسین بن عبداللہ بن حمدان کو، جو خلیفہ کی طرف سے موصل کی حفاظت پر مامور تھے، شکست دے کر بھگا دیا۔ اس کے بعد بغداد، شام اور مصر کی فوجیں بھی مونس کے پاس چلی آئیں کیونکہ مونس کی داد و دہش سے لشکری خوش تھے۔ ناصر الدولہ بن عبداللہ بن حمدان بھی مونس کے پاس چلا آیا اور اس کے ساتھ ہی موصل میں قیام پذیر ہوا۔ فتح موصل سے نو روز کے بعد مونس نے بغداد پر چڑھائی کا قصد کیا۔ مونس اور وزرائے خلافت میں سخت ناچاقی پیدا ہو گئی تھی، اس لیے یہ تمام واقعات ظہور پذیر ہوئے۔

سعید بن عبداللہ شکست کھا کر بغداد چلا آیا۔ مونس کے حملہ کی خبر سن کر بغداد سے سعید بن عبداللہ بن حمدان، ابوبکر محمد بن یاقوت اور دوسرے سرداروں کی ماتحتی میں فوجیں روانہ ہوئیں۔ جب

مونس کا لشکر قریب پہنچا تو لشکری بغداد کی طرف بھاگ آئے۔ مجبوراً سرداروں کو بھی بغداد آنا پڑا۔ مونس نے بغداد پہنچ کر باب شماسیہ پر قیام کیا۔ یہاں طرفین کے مورچے قائم ہوئے، لڑائی شروع ہوئی۔ مقتدر قصر خلافت سے نکل کر ایک ٹیلہ پر کھڑا تھا اور آگے فوج لڑ رہی تھی۔ بغداد والوں کو شکست ہوئی، خلیفہ کے ہمراہیوں نے عرض کیا کہ اب آپ یہاں نہ کھڑے ہوں، واپس چلیں۔ خلیفہ وہاں سے چلا۔ راستے میں بربریوں کے ایک دستہ فوج نے آ لیا، جو مونس کی فوج میں شامل تھا۔ ایک بربری نے تیر چلایا جو مقتدر کے لگا اور وہ گھوڑے سے گرا۔ اسی بربری نے آگے بڑھ کر مقتدر کا سر اتار لیا۔ جسم کو ننگا کر کے اور تمام کپڑے اتار کر وہیں چھوڑ دیا۔ سر کو نیزے پر رکھ کر مونس کے پاس لے گئے۔

یہ واقعہ روز چہار شنبہ ۲۷ شوال سنہ ۳۲۰ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ مونس نے ابومنصور محمد بن معتضد کو تخت سلطنت پر بٹھا کر قاہر باللہ کے لقب سے ملقب کیا۔ علی بن مقلہ کو قلمدان وزارت سپرد ہوا اور عہدہ حجابت پر علی بن بلیق مامور ہوا۔ مقتدر کی ماں کو گرفتار کر کے اس سے روپیہ طلب کیا گیا اور اتنا پٹوایا کہ وہ مرگئی۔ اسی طرح لوگوں کو زبردستی پکڑ پکڑ کر روپیہ فراہم ہوا۔

قاہر باللہ

قاہر باللہ بن معتضد باللہ بن مرفوع باللہ بن متوکل ایک ام ولد متنہ نامی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام محمد اور کنیت ابومنصور تھی۔

خلیفہ مقتدر کے قتل کے بعد اس کا بیٹا عبدالواحد مع ہارون بن غریب محمد بن یاقوت اور ابراہیم بن رائق کے مدائن کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں سے واسط اور سوس ہوتا ہوا اہواز پہنچا۔ قاہر باللہ نے علی بن بلیق اپنے حاجب کو فوج دے کر عبدالواحد اور اس کے ہمراہیوں کی گرفتاری کے لیے روانہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرداران لشکر کی کوشش اور خط و کتابت کے ذریعہ سے عبدالواحد اور اس کے ہمراہیوں نے مونس اور خلیفہ قاہر باللہ سے امان طلب کی، جو فوراً دی گئی اور یہ سب لوگ بغداد چلے آئے۔ محمد بن یاقوت کو مصاحب ہونا داخل کر لیا۔ وزیر السلطنت علی بن مقلہ کو محمد بن یاقوت کا مصاحب ہونا سخت ناگوار تھا۔ اس نے مونس کو بہکایا کہ تمہاری مخالفت و بربادی کے لیے محمد بن

یاقوت کوشاں ہے۔ مونس نے بلیق اور اس کے بیٹے علی بن بلیق حاجب کو خلیفہ کی نگرانی کا حکم دیا۔ خلیفہ کے پاس محل سرائے میں آنے جانے والی عورتوں کی بھی تلاش لی جانے لگی اور کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ خلیفہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ مجھ کو نظر بند اور معطل کیا جا رہا ہے تو اس نے بھی بعض فوجی سرداروں سے خفیہ سازش مونس وغیرہ کے خلاف شروع کر دی۔ ادھر مونس اور اس کے ہمراہیوں نے خلیفہ کو معزول کرنے اور ابواحمد بن مکتفی کے خلیفہ بنانے کی تیاری شروع کی۔ ان کوششوں میں قاہر باللہ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ علی بن بلیق، حاجب بلیق، مونس دھوکے سے گرفتار ہو کر قاہر باللہ کے حکم سے قتل کیے گئے۔ محمد بن یاقوت کو حاجب اور ابوجعفر محمد بن قاسم بن عبیداللہ کو وزیر بنایا گیا۔ یہ واقعہ شعبان سنہ ۳۲۱ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ انہیں ایام میں احمد بن مکتفی کی تلاش شروع ہوئی، وہ روپوش ہو گیا تھا۔ آخر گرفتار ہوا اور قاہر باللہ نے اس کو دیوار میں چنوا دیا۔ ان تمام مقتولوں کے مکانات مسمار کرا دیے گئے۔ مال واسباب خلیفہ نے ضبط کر لیا۔ ساڑھے تین مہینے وزارت کرنے کے بعد ابوجعفر وزیر بھی معتوب ومقید ہوا اور اٹھارہ روز قید رہ کر بہ حالت قید فوت ہو گیا۔

خاندان بویہ دیلمی کا آغاز

چونکہ اب تاریخ میں خاندان بویہ کے افراد کا تذکرہ خلفائے عباسیہ کے حالات میں بار بار آنے والا ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ اس خاندان کی ابتدائی تاریخ بیان کر دی جائے۔ اطروش یعنی حسن بن علی بن حسین بن علی زین العابدین کا ذکر اوپر بیان ہو چکا ہے کہ محمد بن زید علوی کے مقتول ہونے کے بعد اطروش نے دیلم میں جا کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور تیرہ برس تک برابر دیلم وطبرستان میں مصروف تبلیغ اسلام رہ کر اس علاقہ کے لوگوں کو مسلمان بنایا۔

اس زمانے میں دیلم کا حکمران حسان نامی ایک شخص تھا۔ حسان نے اطروش کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کی کوشش کی مگر اطروش کا اثر ترقی پذیر ہی رہا۔ اس نے مسجدیں بنوائیں اور لوگوں کو اسلام پر عامل بنا کر عشر بھی وصول کرنا شروع کر دیا۔ آخر اطروش نے ان نومسلموں کی ایک جمعیت مرتب ومسلح کر کے قزوین وسالوس وغیرہ سرحدی شہروں پر حملہ کیا اور ان سب کو اسلام کی دعوت دے کر اسلام میں داخل کر لیا۔ طبرستان کی ولایت سامانی حکمران کے علاقہ میں شامل تھی۔ طبرستان کے

سامانی عامل نے ظلم وستم پر کمر باندھی۔ اطروش نے اہل دیلم کو ترغیب دی کہ طبرستان پر حملہ کرو۔ چنانچہ سنہ ۳۰۱ھ میں اطروش نے اہل دیلم کی ایک فوج مرتب کر کے طبرستان پر حملہ کیا اور محمد بن ابراہیم بن صعلوک حاکم طبرستان کو شکست دے کر بھگا دیا اور خود طبرستان پر قابض ہو گیا۔ اطروش کے بعد اس کا داماد حسن بن قاسم اور اس کی اولاد طبرستان، جرجان، ساریہ، آمد اور استرآباد پر قابض ومتصرف ہوئی مگر ان سب کے فوجی سردار سپہ سالار دیلمی لوگ تھے۔ ان دیلمیوں میں ایک شخص لیلیٰ بن نعمان تھا، جس کو حسن بن قاسم نے جرجان کی حکومت سپرد کی تھی۔ یہ لیلیٰ بن نعمان سنہ۔۳۰۹ھ میں سامانیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد سامانیوں نے بنی اطروش پر متعدد حملے کیے۔ ان حملوں کی مدافعت بنی اطروش کی طرف سے سرخاب نامی ایک دیلمی سپہ سالار نے کی اور اسی میں وہ مارا گیا۔ سرخاب کا چچا ماکان بن کانی دیلمی بنی اطروش کی طرف سے استرآباد کی حکومت پر مامور تھا۔

ماکان نے اپنے ہم وطن دیلمیوں کو اپنے گرد جمع کر کے ایک فوج مرتب کی اور جرجان پر قبضہ کر لیا۔ ان دیلمیوں میں جو ماکان کے معاون ہوئے تھے، ایک نامور سردار اسفار بن شیرویہ دیلمی تھا۔ ماکان نے اپنی خود مختار حکومت قائم کر کے طبرستان کے اکثر حصہ پر قبضہ کر لیا اور اسفار بن شیرویہ کو کسی بات پر ناراض ہو کر نکال دیا۔ اسفار، ماکان سے جدا ہو کر بکر بن محمد بن الیسع کے پاس نیشاپور چلا گیا جو سامانیوں کی طرف سے نیشاپور کا عامل تھا۔ بکر بن محمد نے اسفار کو ایک فوج دے کر جرجان کے فتح کرنے کو روانہ کیا۔ ان دنوں ماکان طبرستان میں تھا اور اس کا بھائی ابوالحسن بن کانی اپنے بھائی کی طرف سے جرجان میں مامور تھا۔

یہاں ابوعلی بن اطروش بھی مقیم تھا اور اس کے قبضہ میں کوئی حکومت باقی نہ رہی تھی۔ ابوعلی نے موقع پا کر ایک دن ابوالحسن کانی کو قتل کر دیا اور دیلمیوں کی اس فوج نے جو جرجان میں مقیم تھی، ابوعلی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ابوعلی نے اپنی طرف سے علی بن خورشید دیلمی کو جرجان کی حکومت پر مامور کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اسفار سامانیوں کی طرف سے فوج لیے ہوئے جرجان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ علی بن خورشید نے اسفار کو لکھا کہ تم بجائے اس کے کہ ہم پر حملہ کرو، ہمارے ساتھ مل کر ماکان پر جو طبرستان میں ہے، حملہ کیوں نہیں کرتے؟ اسفار نے بکر بن محمد سے اجازت حاصل کر کے اس بات کو منظور کر لیا۔ یہ خبر سن کر ماکان بن کانی طبرستان سے فوج لے کر جرجان کی طرف چلا۔ علی بن خورشید اور اسفار بن شیرویہ نے مل کر اس کا مقابلہ کیا اور ماکان کو شکست دے کر بھگا دیا اور طبرستان میں

قابض ہو گئے۔ چند روز کے بعد علی بن خورشید اور ابو علی بن اطروش دونوں فوت ہو گئے اور طبرستان پر اخار بن شیرویہ بلا مزاحمت حکومت کرنے لگا۔ ماکان نے اس موقع کو مناسب سمجھ کر اسفار پر حملہ کیا اور طبرستان پر قابض ہو گیا۔ اسفار، بکر بن محمد بن الیسع کے پاس جرجان چلا گیا۔

سنہ ۳۱۵ھ میں بکر بن محمد بن الیسع فوت ہوا تو سامانی بادشاہ نے اس کی وفات کے بعد اپنی طرف سے اسفار بن شیرویہ کو جرجان کی حکومت پر معین کر دیا۔ اسفار بن شیرویہ کے سرداروں میں ایک شخص مرداویح نامی تھا۔ اس کو اسفار نے فوج دے کر جرجان سے طبرستان پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ماکان بن کانی اپنا لشکر آراستہ کر کے مقابلہ پر آیا۔ ماکان کو شکست ہوئی اور مرداویح نے طبرستان پر قبضہ کر لیا۔ ماکان بھاگ کر حسن بن قاسم داماد اطروش کے پاس مقام رے میں پہنچا۔ وہاں سے حسن بن قاسم مارا گیا اور ماکان بھاگ کر رے چلا گیا۔

اسفار نے طبرستان و جرجان پر قابض و متصرف ہو کر نصر بن احمد بن سامان والی خراسان و ماوراء النہر کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ اس کے بعد رے کی طرف بڑھا اور رے کو بھی ماکان کے قبضہ سے نکال لیا۔ ماکان آوارہ ہو کر جبال طبرستان کی طرف چلا گیا۔ اب اسفار بن شیرویہ کا قبضہ صوبہ رے، قزوین، زنجان، ابہر قم اور کرخ پر ہو گیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ ایک وسیع ملک پر حکومت کرنے لگا۔ اب اسفار کے دل میں خود مختاری کا خیال آیا۔ اس نے سامانی سلطان سے بغاوت کی کہ اسفار سے اس ملک کو چھین لے مگر ہارون کو اسفار کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اس کے بعد نصر بن احمد بن سامان نے اسفار کی سرکوبی کے لیے بخارا سے خود مع فوج حرکت کی۔ اسفار نے اپنے قصور کی معافی چاہی اور خراج گزاری کا وعدہ کیا۔ نصر نے اس کی درخواست منظور کر کے صوبہ رے کی حکومت اس کے پاس رکھی اور خود بخارا کو لوٹ لیا۔ اسفار کے سرداروں میں مرداویح نے سرداروں کو اپنے ساتھ شامل کر کے علم بغاوت بلند کیا۔ اسفار کو پکڑ کر قتل کر دیا اور ہمدان و اصفہان وغیرہ کو بھی فتح کر کے ایک وسیع ملک پر حکومت کرنے لگا اور ماکان بن کانی کو بلا کر طبرستان و جرجان کی حکومت پر مامور کیا، پھر ماکان کو اس حکومت سے معزول کر دیا۔ ماکان دیلم چلا گیا اور وہاں سے جمعیت فراہم کر کے طبرستان پر حملہ کیا مگر مرداویح کے عامل سے شکست کھا کر نیشا پور کی طرف بھاگ گیا۔

سنہ ۳۱۹ھ میں مرداویح نے مناسب سمجھا کہ اپنے تمام مفتوحہ و مقبوضہ ملک کی سند عباسی خلیفہ سے حاصل کر لینی چاہیے۔ چنانچہ اس نے دربار خلافت میں درخواست بھیجی کہ مجھ کو ان بلاد کی سند

حکومت عطا فرمائی جائے۔ میں دو لاکھ دینار سالانہ خراج دربار خلافت میں بھیجتا رہوں گا۔ خلیفہ نے یہ درخواست منظور کر کے سند بھیج دی اور اپنی طرف سے جاگیر بھی عطا فرمائی۔ سنہ ۳۲۰ھ میں مرداویح نے گیلان سے اپنے بھائی وشمگیر کو بھی بلوا بھیجا۔ مرداویح کی حکومت وسلطنت میں ابوشجاع بویہ نامی کے تین بیٹوں نے بہ سلسلہ ملازمت سرداریاں حاصل کیں اور انہیں کی وجہ سے یہ تمام داستان سنانی پڑی۔

ابوشجاع بویہ دیلمی ایک نہایت مفلس ماہی گیر تھا۔ مچھلیاں پکڑ کر اپنی اور اپنے عیال کی روزی بڑی محنت اور مشکل سے حاصل کرتا تھا۔ ایک روز اس نے خواب میں دیکھا کہ میں پیشاب کرنے بیٹھا ہوں اور میری پیشاب گاہ سے آگ کا ایک شعلہ نکلا، جس نے پھیل کر دنیا کو روشن کر دیا۔ اس خواب کی اس نے یہ تعبیر کی کہ میری اولاد بادشاہ ہوگی اور جہاں تک اس شعلہ کی روشنی گئی ہے، وہاں تک اس کی حکومت ہوگی۔ اس کے بعد بویہ ماہی گیر کے تین بیٹے ہوئے، جن کے نام علی، حسن اور احمد تھے۔ چونکہ بعد میں ان تینوں بھائیوں نے بڑی ترقی کی اور عمادالدولہ، رکن الدولہ، معزالدولہ کے نام سے صاحب حکومت وعزت ہوئے، لہٰذا کسی نے ان کا نسب یزدجرد شاہ ایران سے ملایا اور کسی نے ان کو بہرام گور کی اولاد میں بتایا۔ دولت وحکومت کے ساتھ ہی عالی نسبی کی بھی کوشش عام طور پر لوگ کیا کرتے تھے اور خوشامدی لوگ اس کام کی سرانجام دہی میں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوا کرتے ہیں۔

ہمارا شہر نجیب آباد پٹھانوں کا آباد کیا ہوا شہر ہے۔ یہاں پٹھان ایک معزز قوم سمجھی جاتی ہے جن کو ہر قسم کی دولت وحکومت وعزت حاصل تھی۔ غدر سنہ ۵۷ھ کے بعد جب پٹھانوں پر تباہی آئی تو بہت سے رام پور، بریلی، شاہجہان پور کی طرف جا کر آباد ہو گئے۔ بہت سوں کی نسلیں منقطع ہو کر نام ونشان گم ہو گیا۔ بہت ہی تھوڑے باقی رہ گئے، جن پر افلاس نے طاری ہو کر ایسے ستم ڈھائے کہ وہ اب کسی قطار شمار میں نہیں آتے۔ ان کے غلاموں اور نوکروں کو چونکہ ﴿ تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ کے قانون کے موافق اب خوب دولت وثروت حاصل ہے، لہٰذا بہت سے غلام اپنے آپ کو پٹھان بتاتے ہیں۔ بہت سے جوگی بچوں نے اپنا سلسلہ نسب نواب نجیب الدولہ سے ملا دیا ہے۔ بہت سے تیلیوں، سقوں، حجاموں، جلاہوں، مراسیوں، دھوبیوں، باغبانوں اور ماہی گیروں نے علی الاعلان اپنے آپ کو پٹھان اور خان کہلانا شروع کر دیا ہے اور مال و دولت کی

فراوانی نے ان کو اپنے اصلی نسب پر قانع نہیں رہنے دیا۔

چنانچہ کسی نجیب الطرفین پٹھان کی اب یہ مجال نہیں کہ ان کو ان کا اصلی شجرہ نسب سنائے اور آج کل کی نئی پود کو سمجھائے کہ نجیب آباد میں کون اصلی پٹھان ہے اور کون نقلی۔ جبکہ ہم اپنی آنکھوں سے لوگوں کو اپنے نسب تبدیل کرتے اور دوسرے نسبوں میں شامل ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں تو یہ بویہ ماہی گیر کے بیٹوں کا دولت وحکومت کے مقام رفیع تک پہنچ کر اپنا سلسلہ نسب شاہان ایران سے ملا دینا ہم کو حیرت میں نہیں ڈال سکتا۔

ماکان بن کانی نے جب اہل دیلم کو اپنی فوج میں بھرتی کیا تو بویہ کے تینوں بیٹے بھی اس کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ جب ماکان کو ناکامی ہوئی اور اس کا کام بگڑ گیا تو اس کے بہت سے آدمی جدا ہو ہو کر مرداویج کے پاس چلے آئے۔ مرداویج نے ان لوگوں کی خوب قدردانی کی اور ہر ایک کو اس کے مرتبہ سے زیادہ مناصب عطا کیے۔ انہیں لوگوں میں بویہ کے تینوں بیٹے بھی شامل تھے۔ انہوں نے اپنی خدمت گزاری، مستعدی اور ہوشیاری سے مرداویج کی خدمت میں رسوخ حاصل کر لیا اور مرداویج نے علی بن بویہ کو کرخ کی حکومت پر مامور کر کے روانہ کیا۔ علی بن بویہ کے ہمراہ اس کے دونوں چھوٹے بھائی حسن اور احمد بھی روانہ ہوئے۔ ان دنوں مرداویج کی جانب سے رے میں اس کا بھائی وشمگیر حکومت کر رہا تھا۔

وشمگیر نے حسین بن محمد بن عرف عمید کو اپنا وزیر بنا رکھا تھا۔ علی بن بویہ جب رے میں پہنچا تو اس نے عمید سے ملاقات کی اور ایک خچر بطور نذر پیش کیا۔ اس کے بعد کرخ کی طرف روانہ ہوا اور وہاں جا کر حکومت کرنے لگا۔ مرداویج کو جب علی بن لویہ کے اس طرح عمید سے ملنے اور نذر پیش کرنے کا حال معلوم ہوا تو اس کو شبہ گزرا کہ کہیں ماکان کے پاس سے آئے ہوئے سردار جن کو اچھے اچھے عہدے اور شہروں کی حکومت سپرد کر دی گئی ہے، آپس میں کوئی سازش کر کے باعث تکلیف نہ ہوں۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی وشمگیر کو لکھا کہ ماکان کے پاس سے آئے ہوئے جن لوگوں کو اس طرف شہروں پر مامور کیا گیا ہے، سب کو گرفتار کر لو۔ چنانچہ بعض تو گرفتار کر لیے گئے مگر علی بن بویہ کو جو کرخ پر قابض ہو چکا تھا، فساد برپا ہونے کے اندیشہ سے گرفتار کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

علی بن بویہ نے کرخ کے نواح پر کئی قلعوں کو مفتوح کیا۔ ان میں سے جو مال ہاتھ آیا، وہ لشکریوں کو تقسیم کر دیا۔ اس سے سپاہیوں کو اس سے محبت ہو گئی اور اس کا رعب و داب ترقی کرنے

لگا۔ سنہ ۳۲۱ھ میں مرداویح نے ان سرداروں کو جورے میں نظر بند تھے، رہا کر دیا۔ وہ سب کرخ میں علی بن بویہ کے پاس چلے گئے۔ اس نے ان کی بہت خاطر مدارات کی۔ انہیں ایام میں ایک دیلمی سردار شیرزاد نامی مع ایک جمعیت کے علی بن بویہ کے پاس آیا اور اس کو اصفہان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ مرداویح کو جب معلوم ہوا کہ تمام دیلمیوں کا اجتماع علی بن بویہ کے پاس ہو گیا ہے تو اس نے لکھا کہ ان تمام سرداروں کو، جو رہا ہو کر گئے ہیں، ہمارے پاس واپس بھیج دو۔

علی بن بویہ نے اس کے حکم کی تعمیل سے انکار کیا اور شیرزاد کی ہمراہی میں اصفہان پر حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ اصفہان میں ان دنوں مظفر بن یاقوت اور ابوعلی بن رستم حکومت کر رہے تھے۔ یہ دونوں خلیفہ سے ناراض اور بغاوت کا اعلان کر چکے تھے۔ علی بن بویہ نے اصفہان پر چڑھائی کر کے مظفر بن یاقوت کو بھگا دیا۔ ابوعلی بن رستم فوت ہو گیا اور اصفہان پر علی بن بویہ نے قبضہ کر لیا۔ یہ خبر سن کر مرداویح کو بڑی فکر پیدا ہوئی کیونکہ اب علی بن بویہ کی طاقت بہت ترقی کر چکی تھی۔ اس نے اپنے بھائی وشمگیر کو فوج دے کر اصفہان کی طرف علی بن بویہ کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ علی بن بویہ نے مطلع ہو کر اصفہان کو تو چھوڑ دیا اور جرجان پر قابض ہو گیا۔ یہ واقعہ ماہ ذوالحجہ سنہ ۳۲۱ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ وشمگیر نے اصفہان پر قبضہ کر لیا مگر پھر مظفر بن یاقوت کو اصفہان کی حکومت سپرد کر دی۔ علی بن بویہ نے اپنے بھائی حسن کو گازرون کی طرف خراج وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ وہاں راستے میں مظفر بن یاقوت کی ایک فوج سے مقابلہ ہوا۔ حسن نے اس کو شکست دی اور روپیہ وصول کر کے بھائی کے پاس لایا۔

علی بن بویہ اصطخر کی طرف روانہ ہوا۔ ابن یاقوت نے ایک زبردست فوج سے تعاقب کر کے علی بن بویہ کو مقابلہ کے لیے للکارا۔ لڑائی ہوئی، علی بن بویہ کے بھائی احمد نے اس لڑائی میں بڑی بہادری دکھائی۔ مظفر بن یاقوت شکست کھا کر فرار ہوا اور واسط جا کر دم لیا۔ علی بن بویہ نے شیراز آ کر اس پر قبضہ کیا اور اس طرح تمام صوبہ فارس اس کے قبضہ وتصرف میں آ گیا۔ یہاں لشکریوں نے جن کی تعداد بھی زیادہ ہو گئی تھی، تنخواہوں کا مطالبہ کیا۔ علی بن بویہ کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ بے باق کرے۔ اسی فکر میں ایک مکان کے اندر چھت پر لیٹ گیا۔ چھت میں سے ایک سانپ گرا، ابن بویہ نے حکم دیا کہ اس مکان کی چھت گرا دی جائے۔ چھت کو توڑنے لگے تو اس میں سونے کے بھرے ہوئے صندوق برآمد ہوئے۔ یہ تمام اس نے لشکر میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح اس فکر سے

نجات ملی۔ اس کے بعد اس نے کوئی کپڑا سینے کے لیے ایک درزی بلوایا۔ سپاہی درزی کو بلا کر لائے تو درزی یہ سمجھا کہ اب مجھ کو گرفتار کیا جائے گا، اس نے ڈر کے مارے چھوٹتے ہی یہ کہا کہ میرے پاس صندوقوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور میں نے ابھی تک ان کو کھول کر بھی نہیں دیکھا کہ ان میں کیا ہے؟ چنانچہ اس سے وہ صندوق منگوائے گئے، تو ان میں سے اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ علی بن بویہ نے اس پر بھی قبضہ کیا۔

یہ تمام مال مظفر بن یاقوت کا جمع کیا ہوا تھا، جو وہ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکا تھا۔ اتفاق کی بات کہ انہیں ایام میں اس کو دولت صفاریہ کا جمع کیا ہوا خزانہ بھی مل گیا۔ جس کی تعداد پانچ لاکھ دینار تھی۔ اسی اثناء میں علی بن بویہ ایک روز چلا جا رہا تھا کہ اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ کھدوا کر دیکھا تو ایک بڑا خزانہ برآمد ہوا۔ اس طرح علی بن بویہ کے پاس بڑا خزانہ جمع ہو گیا اور اس نے صوبہ فارس پر کامیابی کے ساتھ حکومت شروع کر کے اپنی طاقت کو دم بہ دم ترقی دینی شروع کی اور مرداویج کا مدمقابل بن کر اس کے لیے خوف و خطرات کا باعث ہو گیا۔

خلع قاہر:

قاہر باللہ خون ریز، جلد باز، متلون مزاج اور دائم الخمر تھا مگر رعایا کو شراب نوشی و شراب فروشی کی سخت ممانعت کر دی تھی۔ قریباً ڈیڑھ سال حکومت کرنے کے بعد ۶ جمادی الثانی سنہ ۳۲۲ھ میں فوج کے بلوائیوں نے اس کو گرفتار کر لیا اور ابوالعباس محمد بن مقتدر کو تخت خلافت پر بٹھا کر راضی باللہ کے لقب سے ملقب کیا۔ راضی باللہ نے تخت نشین ہو کر قاہر باللہ کو اندھا کرا دیا۔

علی بن محمد خراسانی کا قول ہے کہ ایک روز قاہر باللہ نیزہ ہاتھوں میں لیے ہوئے میرے پاس آیا اور کہا کہ ہر ایک عباسی خلیفہ کے عادات و خصائل مجھ سے بیان کرو۔ میں نے کہا کہ سفاح خوں ریزی میں جلدی کیا کرتا تھا۔ اس کے عمال بھی اسی کے قدم بہ قدم چلتے تھے۔ منصور بہادر شخص تھا اور مال جمع کرنے والا۔ منصور نے سب سے پہلے آل عباس اور آل ابی طالب کے درمیان تفرقہ ڈالا اور اتفاق قائم نہ رہنے دیا۔ سب سے پہلے اسی نے منجمین کو مقرب بنایا۔ سریانی اور عجمی کتابیں مثلاً اقلیدس، کلیلہ دمنہ اور یونانی کتابیں اس کے لیے ترجمہ کی گئیں۔ مہدی نہایت سخی، عادل، منصف مزاج شخص تھا۔ اس کے باپ نے جو کچھ لوگوں سے زبردستی چھینا تھا، وہ اس نے واپس

دے دیا۔ زندیقوں کو قتل کرایا۔ مسجد الحرام، مسجد مدینہ اور مسجد اقصیٰ کو تعمیر کرایا۔ ہادی جبار و متکبر تھا اور اس کے عامل بھی اسی کی پیروی کرتے تھے۔

ہارون الرشید نے جہاد اور حج کیے۔ مدینہ کے راستے میں مکانات اور حوض بنوائے۔ طرطوس، مصیصہ، مرعش وغیرہ آباد کیے۔ عام لوگوں کو ممنون احسانات کیا۔ خلفاء میں سب سے پہلے اسی نے چوگان کھیلا، نشانہ بازیاں کیں اور شطرنج کھیلی۔ امین سخی تھا مگر لذات میں مشغول ہو گیا۔ مامون نجوم وفلسفہ سے مغلوب ہو گیا تھا، نہایت حلیم وسخی شخص تھا۔ معتصم بھی اسی کے طریقہ پر چلا مگر اس کو شہسواری اور بادشاہان عجم کے تشبہ کا شوق تھا۔ غزوات وفتوحات اس نے خوب کیے۔ واثق اپنے باپ کے طریق پر چلا۔ متوکل، مامون، معتصم اور واثق کے بالکل خلاف چلا۔ ان کے اعتقادات سے بھی اس نے مخالفت کی۔ سماعت حدیث کا حکم دیا۔ لوگ اس سے عام طور پر خوش رہے۔ غرض اسی طرح وہ اور خلفاء کا حال پوچھتا جاتا تھا اور میں بیان کرتا جاتا تھا۔ سب کچھ سن کر خوش ہوا اور چلا گیا۔

راضی باللہ

راضی باللہ بن مقتدر باللہ کا نام محمد اور کنیت ابوالعباس تھی۔ سنہ ۲۹۷ھ میں ایک رومیہ ام ولد موسومہ ظلوم کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ قاہر کے معزول ہونے کے بعد جمادی الثانی سنہ ۳۲۲ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا۔ یہ جیل خانہ سے لا کر تخت پر بٹھایا گیا تھا۔ اس نے علی بن مقلہ کو وزیراعظم بنایا۔ محمد بن یاقوت کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ یاقوت ان دنوں واسط میں تھا۔ وہ فوج آراستہ کر کے علی بن بویہ کے مقابلہ پر گیا مگر شکست کھائی۔ اسی سال عبیداللہ مہدی مجوسی والی افریقہ پچیس سال سلطنت کرنے کے بعد فوت ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ابوالقاسم بامراللہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

قتل مرداویح:

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ مرداویح نے تمام صوبہ رے، اصفہان اور اہواز وغیرہ پر قابض ومتصرف ہو کر دربار خلافت سے سند بھی حاصل کر لی تھی مگر چند روز کے بعد اس نے بادشاہی کا دعویٰ کر کے سونے کا ایک تخت بنوایا۔ سپہ سالاروں اور سرداروں کے لیے چاندی کی کرسیاں تیار کرائیں۔ کسریٰ کی طرح تاج مرصع سر پر رکھا اور بادشاہ کے لقب سے اپنے آپ کو ملقب کیا، پھر

عراق و بغداد پر فوج کشی کی تیاری کی اور کہا کہ میں کسریٰ فارس کے محلوں کو از سر نو تعمیر کراؤں گا اور عراقیوں کی حکومت نیست و نابود کر کے از سر نو مجوسیوں کی حکومت قائم کروں گا۔ اس کی اس قسم کی تعلّی کی باتیں اس کے بعض سرداروں کو ناگوار گزریں اور لوگوں نے سنہ ۳۲۳ھ میں اس کو اصفہان کے باہر قتل کر ڈالا۔

صوبہ جات کی حالت:

خلیفہ راضی باللہ کی حکومت بغداد اور اس کے مضافات کے سوا اور کہیں نہ تھی۔ نہ کسی صوبہ سے خراج آتا تھا۔ ہر جگہ خود مختار حکومتیں لوگوں نے قائم کر لی تھیں۔ جن لوگوں نے خراج مقرر بھیجنے کے وعدے پر سندیں حاصل کی تھیں، انہوں نے بھی اپنے وعدوں کو پورا کرنا غیر ضروری سمجھ رکھا تھا۔ بصرہ پر محمد بن رائق کا قبضہ، خوزستان اور اہواز پر ابوعبداللہ بریدی کا قبضہ تھا۔ فارس کی حکومت علی بن بویہ ملقب بہ عماد الدولہ کے قبضہ میں تھی۔ کرمان میں ابوعلی محمد بن الیاس حکمران تھا۔ رے، اصفہان اور جبل کے صوبوں میں حسن بن بویہ ملقب بہ رکن الدولہ اور وشمگیر برادر مرداویح ایک دوسرے کے مقابل مصروف پیکار تھے۔ موصل، دیار بکر، دیار مضر، دیار ربیعہ بنی حمدان کے قبضہ میں تھے۔ مصر و شام پر محمد بن طغج قابض و متصرف تھا۔ ماوراء النہر اور خراسان کے بعض حصے پر بنی سامان حکمران تھے۔ بحرین اور یمامہ کے صوبوں پر ابوطاہر قرمطی کی حکومت قائم تھی۔ طبرستان کے صوبہ پر دیلمی سردار قابض و حکمران تھے۔ اندلس، مراکش اور افریقہ میں تو عرصہ سے خود مختار سلطنتیں قائم ہی تھیں۔

راضی باللہ کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال میں عماد الدولہ علی بن بویہ نے درخواست بھیجی کہ صوبہ فارس کی سند حکومت مجھ کو عطا فرمائی جائے، میں ایک کروڑ اسی لاکھ درھم سالانہ خراج اس صوبہ سے دربار خلافت میں بھیجا کروں گا۔ خلیفہ نے سند اور خلعت پرچم روانہ کر کے عماد الدولہ کا خطاب دیا اور اس کے بھائی حسن کو رکن الدولہ اور احمد کو معز الدولہ کا خطاب مرحمت ہوا۔ مرداویح کے مقتول ہونے کے بعد اس کی فوج کے دو حصے ہو گئے۔ ایک تو عماد الدولہ کے پاس فارس میں چلا آیا اور ایک حصہ اس کے ایک سردار بحکم نامی کے زیر فرمان رہا۔ بحکم نے دربار خلافت میں پہنچ کر رسوخ حاصل کیا اور جوڑ توڑ ملا کر ان سب سرداروں پر، جو دربار خلافت پر قابو یافتہ تھے، غالب آیا۔ امیر الامراء کا خطاب حاصل کر کے خلیفہ اور دربار خلافت پر مستولی ہو گیا اور بغداد میں تحکمانہ انداز سے رہنے لگا۔ وشمگیر برادر مرداویح نے رکن الدولہ بن بویہ کے مقابلہ میں اصفہان کو چھوڑ کر جبل و آذربائیجان پر

قبضہ کر لیا۔ رکن الدولہ بن بویہ اصفہان پر قابض ہو گیا۔ معزالدولہ بن بویہ نے اہواز پر قبضہ کر لیا۔ محمد بن رائق نے محمد بن طغج سے شام کا ملک چھین لیا۔ اس کے قبضہ میں صرف مصر کا ملک رہ گیا۔ راضی کے عہد میں خلافت برائے نام تھی۔ آخر عہد میں بحکم خلیفہ اور دربار خلافت پر ہر طرح قابض ومستولی تھا اور کسی کو اس کی مخالفت کی جرأت نہ تھی۔ بحکم خود واسط میں رہتا تھا اور اس کا امیر منشی بغداد میں خلیفہ کے پاس وزارت عظمیٰ کی خدمت انجام دیتا تھا۔

وفات راضی باللہ:

ماہ ربیع الاول سنہ ۳۲۹ھ میں چند مہینے کم سات سال تخت نشین رہ کر خلیفہ راضی باللہ نے بہ عارضہ استسقاء وفات پائی۔ بحکم نے یہ خبر سن کر اپنے میر منشی کو ہدایات لکھ بھیجیں۔ انہیں کے موافق ابراہیم بن معتضد باللہ کو متقی اللہ کے لقب سے ملقب کر کے ۲۹ ربیع الاول سنہ ۳۲۹ھ تخت خلافت پر بٹھا دیا گیا۔

خلیفہ راضی باللہ کے عہد خلافت میں محمد بن علی سمعانی معروف بہ ابن ابی الغراقر نے ظاہر ہو کر خدائی کا دعویٰ کیا۔ بہت سے لوگ اس کے بھی معتقد ہو گئے مگر خلافت راضی کے پہلے ہی سال اس کو پکڑ کر قتل کیا گیا۔ اس کے ہمراہی بھی جنہوں نے توبہ نہ کی، مقتول ہوئے۔ اسی سال قرامطہ نے بغداد اور مکہ کے درمیان ایسی لوٹ مار مچائی کہ بغداد والے حج نہ کر سکے اور سنہ ۳۲۷ھ تک حج کا ارادہ کوئی اہل بغداد نہ کر سکا۔ سنہ ۳۲۷ھ میں ابوطاہر قرمطی نے حاجیوں پر فی شتر پانچ دینار محصول قائم کیا اور لوگوں کو حج کی اجازت دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حاجیوں کو حج کرنے کا محصول ادا کرنا پڑا۔ اہل بغداد نے اطمینان سے یہ محصول ادا کر کے حج ادا کیا۔ راضی آخری خلیفہ تھا جس نے خطبہ جمعہ لوگوں کو سنایا۔ اس کے بعد عام طور پر خلفاء نے یہ کام بھی دوسروں کے سپرد کر دیا۔

متقی للہ

متقی للہ بن معتضد باللہ بن متوکل ایک ام ولد زہرہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ بہ عمر ۳۴ سال تخت نشین ہوا۔ ۲۶ رجب سنہ ۳۲۹ھ کو بحکم کردوں کے ہاتھ سے نواح واسط میں مارا گیا، دو برس آٹھ مہینے امیر الامرائی کی۔ اس کے مرنے کے بعد گیارہ لاکھ دینار کا مال ضبط ہو کر خزانہ خلافت

میں داخل ہوا۔شعبان سنہ ۳۲۹ھ میں ابوعبداللہ بریدی نے بصرہ سے فوج لے کر بغداد کا رخ کیا۔ خلیفہ متقی نے اس کو واپس جانے کو لکھا۔ جب وہ نہ مانا تو فوج بھیجی۔فوج اس کے مقابلہ سے بھاگ گئی۔ بریدی بغداد میں داخل ہوا اور خلیفہ سے پانچ لاکھ دینار طلب کیے اور کہلا بھجوایا کہ اگر آپ نے یہ فرمائش پوری نہ کی تو آپ کو معزول اور قتل کر دیا جائے گا۔ خلیفہ نے یہ رقم فوراً بھجوا دی۔

۲۴ روز کے بعد رمضان سنہ ۳۲۹ھ میں بریدی کی فوج نے تنخواہ نہ ملنے کے سبب سے بغاوت کی۔ بریدی بھاگ کر واسط چلا گیا۔ بریدی کے بھاگ جانے کے بعد کورتکین نامی سردار خلیفہ اور دربار خلافت پر مستولی ہو گیا۔ اس کو امیر الامراء کا خطاب ملا۔ بغداد میں اب علاوہ ترکوں کے دیلمیوں کا بھی ایک بڑا گروہ موجود ہو گیا تھا۔یحکم کے زمانے سے دیلمیوں کا اثر بغداد میں ترقی کرنے لگا تھا۔ دیلمیوں نے کورتکین کے خلاف شورش برپا کی۔ترکوں اور دیلمیوں میں جنگ ہوئی مگر کورتکین کا اثر بہ دستور قائم رہا۔ محمد بن واثق جو شام پر قابض ہو گیا تھا، یہ حالات سن کر خود امیرالامرائی حاصل کرنے کے لیے شام سے بغداد کی طرف چلا۔کورتکین نے بغداد سے باہر نکل کر مقابلہ کیا۔ ابن رائق بہ زور بغداد میں داخل ہوا۔کورتکین گرفتار ہو کر قید ہوا۔خلیفہ نے ابن رائق کو امیرالامراء بنا دیا۔محمد بن رائق نے ابوعبیداللہ بریدی سے واسط کا خراج زبردستی وصول کیا۔

ماہ ربیع الثانی سنہ ۳۳۰ھ میں ابن بریدی نے بغداد پر فوج کشی کی، ابن رائق کو شکست ہوئی۔ بریدی کے لشکر میں ترک اور دیلمی شامل تھے۔شہر میں داخل ہو کر لشکریوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔خلیفہ مع ابن رائق اور اپنے بیٹے ابومنصور کے موصل کی طرف بھاگ گیا۔ قصر خلافت اور اہل بغداد کے مکانوں کو لوگوں نے خوب لوٹا۔ اس لوٹ مار میں بعض قرمطی بھی آ کر شامل ہو گئے۔ شرفائے شہر کو سخت اذیت و ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔موصل میں ناصرالدولہ بن حمدان حکمران تھا۔خلیفہ کے پہنچنے پر وہ شہر چھوڑ کر باہر چلا گیا۔خلیفہ اور ابن رائق نے اس کو تسلی دے کر بلایا۔ ناصرالدولہ نے محمد بن رائق کو قتل کر دیا۔ خلیفہ نے ناصرالدولہ کو امیرالامراء کا خطاب دیا اور ناصرالدولہ کے بھائی ابوالحسین کو سیف الدولہ کے خطاب سے مخاطب فرمایا۔موصل سے فوج طلب کر کے ناصرالدولہ اور خلیفہ بغداد کی جانب چلے۔ ابن بریدی نے، جو بغداد پر قابض و متصرف تھا، مقابلہ کیا۔ شوال سنہ ۳۳۳ھ میں بریدی کو شکست ہوئی اور ناصرالدولہ مع خلیفہ بغداد میں داخل ہوا۔ ناصرالدولہ اور سیف الدولہ بغداد میں خلیفہ کے پاس گیارہ مہینے تک رہے، پھر ان کو اپنے صوبہ موصل کی فکر ہوئی۔

یہ دونوں بھائی موصل کی طرف روانہ ہوئے۔ ماہ رمضان سنہ ۳۳۱ھ میں توزون نامی سردار نے بغداد میں غلبہ وتسلط حاصل کیا اور خلیفہ نے توزون کو امیر الامرائی کا خطاب دیا۔ چند روز کے بعد یعنی محرم سنہ ۳۳۲ھ کو ابو جعفر بن شیرزاد داخل بغداد ہوا جبکہ توزون واسط کی طرف گیا ہوا تھا۔ خلیفہ متقی ابو جعفر کے داخل ہونے سے خوفزدہ ہو کر بغداد سے موصل کی طرف بھاگ گیا۔ توزون ابو جعفر نے مل کر موصل پر چڑھائی کی۔ وہاں ناصر الدولہ اور سیف الدولہ، دونوں بھائیوں کو شکست ہوئی۔ وہ مع خلیفہ نصیبین کی طرف چلے گئے۔ نصیبین سے خلیفہ متقی رقہ میں آیا اور توزون کو خط لکھا۔ توزون نے بنو حمدان سے صلح کر لی اور بغداد کو لوٹ گیا۔ خلیفہ بنو حمدان رقہ میں مقیم رہا۔

انہیں ایام میں معزالدولہ احمد بن بویہ نے، جو اہواز پر قابض ومتصرف تھا، واسط پر چڑھائی کی۔ توزون نے موصل سے واپس ہو کر مقابلہ کیا۔ ۱۷ ذیقعدہ سنہ ۳۳۲ھ میں توزون ومعزالدولہ میں جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں معزالدولہ کو شکست ہوئی۔ مگر اس نے دوبارہ حملہ کر کے واسط پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۳۲۲ھ میں رومیوں نے سرحد آذربائیجان کے شہر بردنہ پر حملہ کیا۔ مرزبان دیلم نے یہ خبر سن کر اس طرف فوج بھیجی۔ روسیوں نے مسلمانوں کو خوب قتل وغارت کیا۔ مسلمانوں نے مجتمع ہو کر ان کا مقابلہ کیا۔ عرصہ دراز تک لڑائی جاری رہی۔ آخر سخت معرکوں کے بعد روسیوں کو مار مار کر ان کے ملک کی طرف بھگا دیا۔

خلیفہ متقی کی معزولی:

خلیفہ متقی آخر سنہ ۳۳۲ھ تک بنی حمدان کے پاس رہا۔ اس عرصہ میں خلیفہ اور بنی حمدان کے درمیان کچھ کدورت پیدا ہوئی۔ خلیفہ نے ایک طرف بغداد میں اور دوسری طرف مصر میں اخشید بن محمد طغج کے پاس خطوط بھیجے۔ ۱۵ محرم سنہ ۳۳۳ھ کو اخشید بمقام رقہ خود خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ مصر میں تشریف لے چلیں اور وہیں قیام کریں۔ وزیر نے بھی اس رائے کو پسند کیا اور مصر کے دارالسلطنت بنانے کے منافع بیان کیے مگر خلیفہ نے اس بات کو پسند نہ کیا۔ اتنے میں بغداد سے توزون کا خط آ گیا۔ جس میں خلیفہ اور اس کے وزیر ابن شیرزاد کو امان دی گئی تھی۔ خلیفہ نے اس خط کو پڑھ کر خوشی کا اظہار کیا اور اخشید کو چھوڑ کر آخر محرم سنہ ۳۳۳ھ کو بغداد کی جانب روانہ ہو گیا۔ توزون نے مقام سندیہ میں استقبال کیا اور اپنے خیمہ میں ٹھہرایا۔ اگلے دن خلیفہ کی آنکھوں

میں گرم سلائیاں پھروا کر اندھا کر دیا۔ اس کے بعد ابوالقاسم عبداللہ بن خلیفہ مکتفی باللہ کو بلا کر اس کے ہاتھ پر اراکین دولت نے بیعت کی اور مستکفی باللہ کے لقب سے ملقب کیا۔ سب سے آخر میں معزول خلیفہ متقی کو دربار میں پیش کیا گیا۔ اس نے بھی خلیفہ مستکفی کی بیعت کی۔ متقی کو جزیرہ میں قید کر دیا گیا۔ پچیس برس اسی مصیبت میں گرفتار رہ کر سنہ ۳۵۷ھ میں فوت ہوا۔ جب قاہر باللہ کو متقی کے اندھا ہونے کی خبر پہنچی تو بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ اب ہم دو تو اندھے ہو گئے، تیسرے کی کسر ہے۔ عجب اتفاق تھا کہ چند ہی روز کے بعد مستکفی کا بھی یہی حشر ہوا۔

مستکفی باللہ

ابوالقاسم عبداللہ مستکفی باللہ بن مکتفی باللہ ایک ام ولد موسومہ املح الناس کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ صفر سنہ ۳۳۳ھ کو بہ عمر اکتالیس سال تخت نشین ہوا۔ ابوالقاسم فضل بن مقتدر باللہ بھی دعوے دار خلافت تھا، وہ روپوش ہو گیا۔ مستکفی نے اس کو بہت تلاش کرایا مگر وہ ہاتھ نہیں آیا۔ مستکفی کے عہد میں روپوش ہی رہا۔ مستکفی جب اس کی جستجو میں کامیاب نہ ہوا تو اس کا مکان منہدم کرا دیا۔

خلیفہ مستکفی کے تخت نشین ہوتے ہی توزون فوت ہو گیا۔ مستکفی نے ابوجعفر ابن شیرزاد کو امیر الامراء کا خطاب دیا۔ ابن شیرزاد نے تمام انتظام و اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر بے دریغ روپیہ خرچ کرنا شروع کر دیا۔ خزانہ خالی ہو گیا، تمام انتظام درہم برہم ہو گیا اور چند ہی روز کے بعد بغداد میں چوریاں اور ڈاکہ زنیوں کی کثرت نے یہاں تک نوبت پہنچا دی کہ لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر جلاوطنی اختیار کرنے لگے۔

انتباہ:

سلطنت اسلامیہ کا رقبہ اور وسعت مملکت عہد بنوامیہ تک برابر ترقی پذیر رہا۔ حکومت اسلامیہ کا ایک ہی مرکز تھا اور دمشق کے دربار خلافت سے جو حکم جاری رہتا تھا، اس کی تعمیل اندلس و مراکش کے مغربی ساحل سے چین و ترکستان تک یکساں ہوتی تھی۔ خلافت اسلامیہ جب بنوعباس کے قبضہ میں آئی تو چند ہی روز کے بعد اندلس میں بنوامیہ کی ایک خودمختار سلطنت الگ قائم ہو گئی اور مسلمانوں کی سلطنت کے بجائے ایک کے دو مرکز ہو گئے، پھر چند روز کے بعد مراکش میں ایک تیسرا مرکز حکومت

قائم ہوا۔ اس کے بعد افریقہ ومصر میں ایک اور حکومت قائم ہوئی۔ اسی طرح ماوراء النہر، خراسان اور فارس وغیرہ میں حکومتیں خلیفہ بغداد کی ماتحتی سے آزاد ہوتی گئیں۔ اب جس زمانہ کے حالات بیان ہو رہے ہیں، یہ وہ زمانہ ہے کہ خلیفہ بغداد کی حکومت شہر بغداد میں بھی باقی نہیں رہی تھی۔ چند روز پہلے دجلہ وفرات کا دوآبہ خلیفہ کی حکومت میں شامل تھا لیکن جب سے امیر الامراء کا عہدہ ایجاد ہوا، اس وقت سے اس دوآبہ کی حکومت امیر الامراء کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور برائے نام وہ اپنے آپ کو خلیفہ کا محکوم اور نائب کہتا تھا۔

خاص شہر بغداد میں خلیفہ کے احکام کی قدرومنزلت تھی اور بغداد میں وہ سب سے بڑی طاقت سمجھی جاتی تھی۔ ہر ایک وہ شخص جو دوسروں کو مغلوب کر کے اپنی طاقت کا اظہار کر سکتا تھا، اپنی قوت بازو سے امیر الامراء بن سکتا تھا۔ خلیفہ کو مجبوراً اسے امیر الامراء کا خطاب دینا پڑتا تھا۔ خلیفہ کے ہاتھ میں طاقت اگرچہ کچھ نہ تھی، پھر بھی اس کو تھوڑی بہت آزادی ضرور حاصل تھی اور ایک قسم کا رعب وجلال بھی باقی تھا۔

لیکن اب معزالدولہ احمد بن بویہ ماہی گیر اہواز سے آ کر بغداد اور خلیفہ پر مسلط ہوتا ہے۔ اسے ملک کا خطاب ملتا ہے اور اس کے بعد سے یکے بعد دیگرے ملوک ہوتے ہیں۔ معزالدولہ نے خلیفہ کو نظر بند کر کے ایک معزز قیدی کی حیثیت سے رکھا اور شہر بغداد میں جو اثر واقتدار خلیفہ کو حاصل تھا، وہ بھی چھین لیا۔ خلیفہ کا کام صرف یہ ہو گیا تھا کہ جب کوئی سفیر باہر سے آئے تو وہ خلیفہ کے دربار میں حاضر کیا جائے اور اس مصنوعی دربار میں خلیفہ کی پرشوکت نمائش کر کے حسب منشاء اس سے کام لیا جائے۔ کسی شخص کو خطاب دینا کسی کو کوئی سند عطا فرمانا یہ سب خلیفہ کے ہاتھ سے ہوتا تھا لیکن خلیفہ کے اختیار سے نہیں ہوتا تھا بلکہ ہر ایک کام میں اختیار ملک ہی کا ہوتا تھا۔

خلیفہ کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ ملک خلیفہ کی ایک تنخواہ مقرر کر دیتا تھا۔ یہ تنخواہ جب خلیفہ کو دیر سے ملتی تھی یا نہیں ملتی تھی تو اسے مجبوراً اپنا سامان فروخت کر کے اپنی گزر کرنی پڑتی تھی۔ پس جبکہ خلفاء عباسیہ کی یہ حالت ہو چکی تو اب ظاہر ہے کہ حکومت اور سلطنت کی تاریخ لکھنے کے لیے ان کا تذکرہ غیر ضروری ہو چکا ہے کیونکہ سوائے صرف لفظ خلیفہ کے اور کوئی چیز باقی نہیں رہی مگر چونکہ ہم کو حکومت اسلامیہ کی تاریخ پوری کرنی ہے اور اس میں ان حکمرانوں کا حال بیان ہونا ضروری ہے، جنہوں نے بغداد میں ملک کے نام سے نہ صرف بغداد بلکہ دوآبہ فرات و دجلہ اور

دوسرے صوبوں پر بھی حکومت کی ہے، لہٰذا ان ملوک کے حالات بیان کرنے میں ہم کو ابھی تھوڑی دور تک اور انہیں خلفائے عباسیہ کے سہارے سے چلنا چاہیے۔ جو اگرچہ شاہ شطرنج سے زیادہ مرتبہ نہیں رکھتے مگر خلیفہ ضرور کہلاتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ اب ہم خلفائے عباسیہ کے حالات مطالعہ نہیں کررہے بلکہ حکومت بغداد کے حالات مطالعہ کررہے ہیں۔ ساتھ ہی اس بات کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ اگرچہ جابجا صوبوں میں الگ الگ خودمختار حکومتیں اور سلطنتیں قائم ہو چکی تھی مگر خلیفہ کے نام کی تکریم سب بجا لاتے اور خطبوں میں اس کا نام ضرور لیتے تھے۔ اندلس میں بجائے خود خلافت قائم کی تھی، عبیدیین جو شیعہ بلکہ قرامطہ تھے، خلافت وامارت کے مدعی تھے۔ اس لیے اندلس وافریقہ میں خلیفہ بغداد کا نام خطبوں میں نہیں لیا جاتا تھا مگر باقی تمام ممالک اسلامیہ میں بغداد کے عباسی خلیفہ کو سب خلیفہ مانتے اور اپنا مذہبی پیشوا جانتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا ضرور ہوا ہے کہ خاص بغداد میں کسی ملک نے خلیفہ کا نام خطبہ سے خارج کردیا اور صرف اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا مگر دوسرے ملکوں میں خلیفہ کا نام خطبوں میں ضرور شامل رہا۔

خاندان بویہ کی بغداد میں حکومت:

خاندان بویہ کا حال اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ بویہ کے تینوں بیٹے علی، حسن اور احمد حکومت وسرداری حاصل کر چکے تھے۔ علی (عمادالدولہ) فارس پر قابض ومتصرف تھا۔ حسن (رکن الدولہ) اصفہان وطبرستان کی طرف حکومت وسرداری حاصل رکھتا تھا۔ احمد (معزالدولہ) اہواز پر قابض تھا۔ جب ابن شیرزاد کی امیرالامرائی میں بغداد کے اندر فتنہ وفساد برپا ہو گیا تو معزوالدولہ نے جو بغداد سے نسبتاً قریب تھا، بغداد پر حملہ کیا۔ شیرزاد بھاگ کر بنوحمدان کے پاس موصل چلا گیا اور معزالدولہ بغداد پر بآسانی قابض ومستولی ہو گیا۔ خلیفہ مستکفی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے معزالدولہ کو ملک کا خطاب دیا۔

معزالدولہ نے اپنے نام کے سکے مسکوک کرائے اور بغداد پر پورے قہر وغلبہ کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ چند روز کے بعد معزالدولہ کو معلوم ہوا کہ خلیفہ مستکفی اس کے خلاف کوئی سازش کررہا ہے۔ انہیں ایام میں والی خراسان کا سفیر آیا اور اس تقریب میں دربار عام منعقد کیا گیا۔ معزالدولہ نے سر دربار دو دیلمیوں کو اشارہ کیا، وہ آگے بڑھے۔ خلیفہ نے سمجھا کہ دست بوسی کے لیے آگے

بڑھے ہیں، اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ دیلمیوں نے وہی ہاتھ پکڑ کر خلیفہ کو تخت سے نیچے کھینچ کر ڈال دیا اور گرفتار کرلیا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اف کر سکے۔ معزالدولہ اسی وقت سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا اور دیلمی خلیفہ کو کھینچتے اور بے عزت کرتے ہوئے معزالدولہ کے سامنے لائے۔ اس کی آنکھیں نکال کر قید کر دیا۔ یہ واقعہ ماہ جمادی الآخر سنہ ۳۳۴ھ کا ہے۔ خلیفہ مستکفی نے ایک برس چار مہینے برائے نام خلافت کی اور سنہ ۳۳۸ھ میں بہ حالت قید فوت ہوا۔

مطیع اللہ

معزالدولہ بن بویہ، دیلمی بویہ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ یہ لوگ چونکہ اطروش کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے، اس لیے تمام دیلمی شیعہ تھے۔ خاندان بویہ شیعیت اور عصبیت میں سب سے بڑھا ہوا تھا۔ مستکفی کو ذلیل و معزول و مقید اور اندھا کر دینے کے بعد معزالدولہ نے چاہا کہ کسی علوی کو تخت خلافت پر بٹھائے مگر اس کے کسی مشیر نے اس کو اس ارادے سے باز رکھا اور سمجھایا کہ اگر آپ نے کسی علوی کو خلیفہ بنا دیا تو چونکہ آپ کی تمام قوم اس کو مستحق خلافت سمجھے گی، اس لیے وہ بجائے آپ کے اس علوی خلیفہ کی خدمت و اطاعت کو مقدم سمجھے گی اور دیلمیوں پر جو آپ کا اثر ہے، یہ ہرگز باقی نہیں رہے گا اور نہ آپ کی یہ حکومت و شوکت برقرار رہے گی۔ لٰہذا مناسب یہ ہے کہ اسی عباسی خاندان سے کسی شخص کو تخت خلافت پر بٹھاؤ تا کہ تمام شیعہ اس کو غیر مستحق خلیفہ سمجھ کر آپ کی اطاعت و فرمانبرداری کے لیے مستعد رہیں اور اس طرح شیعیت بغداد میں قائم رہے۔ چنانچہ معزالدولہ نے ابوالقاسم فضل بن مقتدر کو طلب کیا اور مطیع اللہ کے لقب سے تخت پر بٹھا کر رسم بیعت ادا کی اور سو دینار روزانہ اس کی تنخواہ مقرر کر دی۔ مطیع اللہ ایک ام ولد موسومہ مشغلہ کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا اور جمادی الثانی سنہ ۳۳۴ھ میں جبکہ اس کی عمر ۳۴ سال تھی، تخت نشین کیا گیا۔

معزالدولہ نے خلیفہ کی وزارت پر ابومحمد حسن بن محمد مہلبی کو مامور کیا۔ وزیر درحقیقت ملک ہی کا وزیر ہوتا تھا کیونکہ خلیفہ تو برائے نام خلیفہ تھا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ موصل پر ناصرالدولہ بن حمدان اور شام پر سیف الدولہ بن حمدان قابض تھے۔ مصر پر اخشید محمد بن طغج فرغانی فرماں روا تھا۔ ناصرالدولہ نے جب معزالدولہ کے اس طرح بغداد پر مستولی ہونے کا حال سنا تو موصل سے فوج

لے کر چلا اور ماہ شعبان سنہ ۳۳۴ھ میں سامرا پہنچا۔ معزالدولہ یہ خبر سن کر مطیع اللہ کو ہمراہ لے کر آگے بڑھا۔ بغداد شرقی میں ناصرالدولہ نے آ کر قیام کر دیا۔ طرفین سے لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر دونوں میں صلح ہوگئی۔ معزالدولہ نے اپنی پوتی کی شادی ناصرالدولہ کے بیٹے ابوتغلب سے کر دی۔ ناصرالدولہ موصل کو روانہ ہوا۔ سنہ ۳۳۵ھ میں ابوالقاسم بریدی نے بصرہ میں معزالدولہ کی مخالفت کا علمِ بلند کر کے تیاری شروع کی۔ سنہ ۳۳۶ھ میں معزالدولہ نے خلیفہ مطیع کو ہمراہ لے کر بصرہ پر چڑھائی کی۔ ابوالقاسم کی فوج کو شکست ہوئی۔ ابوالقاسم بھاگ کر بحرین میں قرامطہ کے پاس چلا گیا اور معزالدولہ نے بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ ابوجعفر صہیری کو بصرہ میں چھوڑ کر معزالدولہ مع خلیفہ مطیع اللہ بغداد چلا آیا۔ سنہ ۳۳۷ھ میں معزالدولہ نے ناصرالدولہ بن حمدان والی موصل پر چڑھائی کی۔ ناصرالدولہ تاب مقابلہ نہ لا کر نصیبین چلا گیا۔ اسی اثناء میں معزالدولہ کے بھائی رکن الدولہ نے خبر بھیجی کہ لشکر خراسان نے جرجان و رے پر چڑھائی کی ہے۔ جس قدر جلد ممکن ہو، فوجیں مدد کے لیے بھیجو۔ معزالدولہ نے ناصرالدولہ سے صلح کر کے موصل سے بغداد کی جانب کوچ کیا اور ناصرالدولہ موصل میں واپس آ گیا۔

ناصرالدولہ سے یہ صلح اس شرط پر کی گئی تھی کہ ناصرالدولہ خراج برابر بھیجتا رہے اور خطبہ میں معزوالدولہ، رکن الدولہ اور عمادالدولہ تینوں بھائیوں کا نام لیا کرے۔ سنہ ۳۳۸ھ میں معزالدولہ نے خلیفہ مطیع سے اس مضمون کا ایک فرمان لکھوایا کہ علی بن بویہ المخاطب بہ عمادالدولہ اپنے بھائی معزالدولہ کے ساتھ بطور مددگار کام کرے اور عہدہ سلطانی میں شریک رہے مگر عمادالدولہ اسی سال فوت ہوگیا۔ اس کی جگہ رکن الدولہ کو معزالدولہ کا مددگار بنایا گیا۔ سنہ ۳۳۹ھ میں حجر اسود پھر اپنی جگہ خانہ کعبہ میں لا کر نصب کیا گیا۔ اس کے گرد سونے کا ایک حلقہ جس کا وزن تین ہزار سات سو ستتر (۳۷۷۷) درہم تھا، لگایا گیا تھا۔

سنہ ۳۴۱ھ میں ایک نئے گروہ کا ظہور ہوا جو تناسخ کا قائل تھا۔ ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ مجھ میں علی رضی اللہ عنہ کی روح حلول کر آئی ہے۔ اس کی بیوی کا دعویٰ تھا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی روح مجھ میں منتقل ہوئی ہے۔ ایک دوسرا شخص کہتا تھا کہ مجھ میں جبرئیل کی روح ہے۔ ان دعووں کو سن کر لوگوں نے ان کو مارا پیٹا لیکن معزالدولہ نے بہ وجہ شیعہ ہونے کے لوگوں کو ایذا رسانی سے باز رکھ کر ان کا ادب کرنے اور تعظیم سے پیش آنے کا حکم دیا کیونکہ وہ اپنے آپ کو اہل بیت سے نسبت کرتے تھے۔

سنہ ۳۴۶ھ میں رے اور نواح رے میں زلزلہ عظیم آیا۔ طالقان خسف ہو گیا، کل تیس آدمی بچ سکے، باقی سب ہلاک ہو گئے۔ رے کے نواح میں ڈیڑھ سو گاؤں زمین میں دھنس گئے۔ شہر حلوان کا اکثر حصہ زمین میں غرق ہو گیا۔ سنہ ۳۴۷ھ میں دوبارہ اسی شدت کا زلزلہ آیا۔ اسی سال معزالدولہ نے موصل پر چڑھائی کی کیونکہ ناصرالدولہ سے خراج بھیجنے میں تاخیر ہوئی تھی۔ ماہ جمادی الاول سنہ ۳۴۰ھ میں موصل پر قبضہ کر لیا۔

ناصرالدولہ نصیبین چلا گیا۔ معزالدولہ نے موصل میں سبکتگین اپنے حاجب کبیر کو چھوڑ کر خود نصیبین کا قصد کیا۔ ناصرالدولہ وہاں سے اپنے بھائی سیف الدولہ کے پاس حلب چلا گیا۔ سیف الدولہ نے معزالدولہ سے خط و کتابت کر کے صلح کی کوشش کی اور ماہ محرم سنہ ۳۴۸ھ میں صلح نامہ لکھا گیا اور معزالدولہ عراق کی جانب واپس آیا۔ سنہ ۳۵۰ھ میں معزالدولہ نے بغداد میں اپنے لیے ایک بہت بڑا قصر تعمیر کرایا، جس کی بنیادیں چھتیس گز رکھی گئی تھیں۔ اسی سال رومیوں نے جزیرہ افریطش و کریٹ کو مسلمانوں کے قبضے سے چھین لیا۔ یہ جزیرہ سنہ ۲۳۰ھ سے مسلمانوں کے قبضے میں چلا آتا تھا۔

معزالدولہ کی ایک اور لعنتی کارروائی:

سنہ ۳۵۱ھ میں معزوالدولہ نے جامع مسجد بغداد کے دروازے پر نعوذ باللہ! نقل کفر کفر نباشد، یہ عبارت لکھوا دی: لعن اللہ معاویۃ بن سفیان ① ومن غصب فاطمۃ فدکا ومن منع عن وفن الحسن عند جدہ ومن نفی اباذر و من اخرج العباس عن انشوریٰ۔

عید غدیر کی ایجاد:

معزالدولہ نے ۱۸ ذوالحجہ سنہ ۳۵۱ھ کو بغداد میں عید منانے کا حکم دیا اور اس عید کا نام عید خم غدیر رکھا۔ خوب ڈھول بجائے گئے اور خوشیاں منائی گئیں۔ اسی تاریخ کو یعنی ۱۸ ذوالحجہ سنہ ۳۵۱ھ کو عثمان غنی رضی اللہ عنہ چونکہ شہید ہوئے تھے۔ لہٰذا اس روز شیعوں کے لیے غدیر خم کی عید منانے کا دن تجویز کیا

---

① سبائی گروہ کے باطل مذہب کا حصہ ہے کہ وہ سوائے تین چار صحابہ رضی اللہ عنہم کے باقی تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو منافق کہتے ہیں اور ان پر تبرّا کرتے یعنی ان کو گالی گلوچ کرتے ہیں، استغفر اللہ، معاذ اللہ! حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر سختی سے متنبہ فرما دیا تھا کہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا نہ کہنا۔ قابل غور مقام ہے کہ ہم مسلمانوں کو تو یہ دین اسلام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعہ سے ملا ہے۔ معاذ اللہ! اگر وہ سیدھے راستہ پر نہ تھے تو پھر یہ پورا دین ہی مشکوک ہو جاتا ہے۔ ہم سبائی گروہ کے اس باطل عقیدہ وفکر سے اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں۔

گیا۔ احمد بن بویہ دیلمی یعنی معزوالدولہ کی اس ایجاد کو جو سنہ ۳۵۱ھ میں ہوئی، شیعوں نے یہاں تک رواج دیا کہ آج کل کے شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ عید غدیر کا مرتبہ عیدالاضحیٰ سے بھی زیادہ بلند ہے۔[1]

تعزیہ داری کی ایجاد:

سنہ ۳۵۲ھ کے شروع ہونے پر ابن بویہ مذکور نے حکم دیا کہ ۱۰ محرم کو حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے غم میں تمام دکانیں بند کر دی جائیں۔ بیع وشرا بالکل موقوف رہے۔ شہر و دیہات کے تمام لوگ ماتمی لباس پہنیں اور علانیہ نوحہ کریں۔ عورتیں اپنے بال کھولے ہوئے، چہروں کو سیاہ کیے ہوئے، کپڑوں کو پھاڑے ہوئے سڑکوں اور بازاروں میں مرثیے پڑھتی، منہ نوچتی ہوئی اور چھاتیاں پیٹتی ہوئی نکلیں۔ شیعوں نے اس حکم کو بہ خوشی تعمیل کی مگر اہل سنت دم بخود اور خاموش رہے کیونکہ شیعوں کی حکومت تھی۔ آئندہ سال سنہ ۳۵۳ھ میں پھر اسی حکم کا اعادہ کیا گیا اور سنیوں میں فساد برپا ہوا، بہت بڑی خوں ریزی ہوئی۔ اس کے بعد شیعوں نے ہر سال اس رسم کو زیر عمل لانا شروع کر دیا اور آج تک اسی کا رواج ہندوستان (پاک و ہند) میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان (پاک وہند) میں اکثر سنی لوگ بھی تعزیے بناتے ہیں۔

عمان پر قبضہ اور معزالدولہ کی وفات:

عمان پر قرامطہ قابض ومتصرف تھے۔ سنہ ۳۵۵ھ میں معزالدولہ نے عمان پر براہ دریا فوج کشی کی اور ۹ ذی الحجہ سنہ ۳۵۵ھ کو عمان پر قابض ہو گیا اور قرامطہ کو وہاں سے بھگا دیا۔ ہزار ہا قرامطہ مارے گئے۔ ان کی نواسی کشتیاں جلا کر راکھ کر دی گئیں۔ عمان نے فارغ ہو کر واسط آیا، یہاں آ کر علیل ہوا پھر بغداد آیا۔ وزیر مہلبی نے اس سے پہلے عمان پر سنہ ۳۵۲ھ میں چڑھائی کی تھی مگر وہ بھی بیمار ہو کر آیا۔ بغداد میں پہنچ کر ہر چند علاج کیا گیا مگر آرام نہ ہوا۔ بائیس سال حکومت کر کے ربیع الآخر سنہ ۳۵۶ھ میں فوت ہوا۔

عزالدولہ کی حکومت:

معزالدولہ نے مرتے وقت اپنے بیٹے بختیار کو اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ وہ معزالدولہ کے بعد عزالدولہ کا خطاب خلیفہ سے حاصل کر کے حکمرانی کرنے لگا۔ دیلمی لوگ اب اس قدر غالب ومسلط

---

1. جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس امر کا کوئی ادنیٰ سا بھی اشارہ نہیں ملتا۔

ہو گئے کہ اصل حکمران وہی سمجھے جاتے تھے۔ خلیفہ کی کوئی حقیقت وحیثیت باقی نہ تھی۔ چنانچہ وہ اپنے بعد اپنے ولی عہد بھی خود تجویز کرنے لگے۔ ایک طرف خلیفہ اپنا ولی عہد مقرر کرتے تھے، دوسری طرف یہ حکمران سلطان اپنے ولی عہد مقرر کرتے تھے۔ خلیفہ کے ہاتھ میں کوئی حکومت نہ تھی بلکہ وہ خود محکوم تھا اور ان سلطانوں کے ہاتھ میں حکومت وطاقت تھی۔ اسی لیے بغداد میں ان کی ولی عہدی وجانشینی زیادہ اہم سمجھی جاتی تھی کیونکہ اس کا تعلق حکومت وسلطنت سے تھا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ بغداد میں دیلمیوں کا پہلا بادشاہ معزالدولہ تھا۔ اب ان کا دوسرا بادشاہ عزالدولہ تخت نشین ہوا۔

عزالدولہ نے ابوالفضل عباس بن حسین شیرازی کو اپنا وزیر بنایا۔ اسی سال جعتی بن معزالدولہ نے بصرہ میں اپنے بھائی عزالدولہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ابوالفضل عباس اس کی سرکوبی کو گیا اور مقید کر کے عزالدولہ کے پاس لایا، اس کو قید کر دیا۔ سنہ ۳۶۲ھ میں عزالدولہ نے ابوالفضل عباس کو وزارت سے معزول کر کے محمد بن بقیہ کو عہدہ وزارت عطا کیا۔ محمد بن بقیہ ایک ادنیٰ درجہ کا آدمی تھا۔ عزالدولہ کے باورچی خانہ کا مہتمم تھا۔ اسی سال ابوتغلب بن ناصرالدولہ حمدان نے موصل میں اپنے باپ ناصرالدولہ کو قید کر لیا اور خود حکومت کرنے لگا۔ ابوتغلب کی شادی عزالدولہ کی لڑکی سے ہوئی تھی جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ابوتغلب کے دو بھائی ابراہیم اور حمدان موصل سے بھاگ کر بغداد میں عزالدولہ کے پاس آئے اور ابوتغلب کی شکایت کر کے اس کے خلاف عزالدولہ سے امداد طلب کی۔ عزالدولہ نے اپنے وزیر محمد بن بقیہ اور سپہ سالار سبکتگین کو ہمراہ لے کر موصل پر چڑھائی کی۔ ابوتغلب موصل سے مع دفاتر سنجار چلا گیا۔

عزالدولہ موصل میں داخل ہوا اور ابوتغلب نے سنجار سے بغداد کا قصد کیا۔ یہ سن کر عزالدولہ نے ابن بقیہ اور سبکتگین کو بغداد کے بچانے کے لیے بغداد کی طرف بھیجا اور خود موصل میں رہا۔ ابن بقیہ ابوتغلب کے پہنچنے سے پہلے بغداد میں پہنچ گیا اور سبکتگین نے بغداد کے باہر ابوتغلب کا مقابلہ کر کے اس کو روکنا چاہا۔ ادھر ابوتغلب اور سبکتگین کی لڑائیاں شروع ہوئیں، ادھر بغداد میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان فساد برپا ہوا۔ اس فساد کی خبر سن کر سبکتگین اور ابوتغلب نے آپس میں صلح کر لی اور یہ ارادہ کیا کہ عزالدولہ اور تمام شیعوں کو بے دخل کر کے نئے خلیفہ کو تخت نشین کرنا چاہیے مگر بعد میں کچھ سوچ کر اس ارادے سے باز رہے اور ابن بقیہ کو بغداد سے بلا کر ابوتغلب سے سبکتگین نے شرائط صلح طے کر لیں۔ ان شرائط کے موافق عزالدولہ نے لکھا کہ آپ موصل سے بغداد آ جائیں اور

ابوتغلب کو موصل کی حکومت سپرد کر دیں۔

ابوتغلب موصل پہنچا اور عزالدولہ اپنے خسر سے بغل گیر ہو کر ملا۔ عزالدولہ بغداد کی طرف آ گیا۔ بغداد آ کر عزالدولہ روپیہ وصول کرنے کے ارادے سے اہواز گیا، وہاں ترکوں اور دیلمیوں میں جو عزالدولہ کے ہمراہ تھے، فساد برپا ہوا۔ عزالدولہ نے ترکوں کو سخت سزائیں دیں۔ اس کا حال سن کر سبکتگین نے جو بغداد میں تھا، علم بغاوت بلند کیا اور عزالدولہ کے مکان کو لوٹ کر اس کے خاندان والوں کو قید کر کے واسط بھیج دیا۔ یہ واقعہ ذیقعدہ سنہ ۳۶۳ھ میں ہوا۔

اب بغداد میں سبکتگین کی حکومت قائم ہو گئی، جو سنی حکومت تھی۔ شیعوں کو بغداد سے نکال دیا۔ اس کے بعد خلیفہ مطیع کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ اپنے آپ کو خلافت سے معزول کر لو کیونکہ فالج کے مرض سے بیکار اور ناقابل خلافت ہو گئے ہو۔ چنانچہ ماہ ذیقعدہ سنہ ۳۶۳ھ میں خلیفہ مطیع نے اپنے آپ کو معزول کر لیا اور اس کے بیٹے عبدالکریم کو طائع اللہ کے لقب سے تخت خلافت پر بٹھایا گیا۔ خلیفہ مطیع نے ساڑھے چھبیس برس برائے نام خلافت کی۔ جب سے ناصر الدولہ بن حمدان نے صوبہ موصل کو دبا لیا تھا۔ اس وقت سے رومیوں کے حملوں کی مدافعت اور رومیوں پر حملہ کرنا اسی سے متعلق ہو گیا تھا، پھر جب سنہ ۳۶۳ھ میں جبکہ ناصرالدولہ کے بھائی سیف الدولہ بن حمدان نے حلب و حمص پر قبضہ کیا تو رومیوں کی لڑائیوں کا تعلق سیف الدولہ سے ہو گیا۔ سیف الدولہ نے بڑی قابلیت اور مستعدی سے رومیوں کے حملوں کو روکا اور ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

سنہ ۳۶۳ھ میں عزالدولہ نے خلیفہ مطیع اللہ کا نام خطبہ سے نکال دیا۔ اس پر خلیفہ نے بہت رنج و ملال کا اظہار کیا۔ عزالدولہ نے ناراض ہو کر خلیفہ کی تنخواہ بند کر دی۔ خلیفہ کو اپنا اثاث البیت فروخت کر کے اپنی گزر کرنی پڑی۔ خلع کے بعد مطیع اللہ کا خطاب شیخ الفاضل تھا۔ مطیع نے محرم سنہ ۳۶۲ھ میں بمقام واسط وفات پائی۔ ابوبکر شبلی، ابونصر فارابی متنبی شاعر نے اسی خلیفہ کے عہد میں وفات پائی تھی۔

طائع اللہ

ابوبکر عبدالکریم طائع اللہ بن مطیع اللہ ایک ام ولد موسومہ ہزار کے بطن سے پیدا ہوا اور بہ عمر پینتالیس سال بعد از خلع مطیع بہ روز چہار شنبہ بہ تاریخ ۲۳ ذیقعدہ سنہ ۳۶۳ھ تخت خلافت پر بیٹھا۔

سبکتگین کو نصر الدولہ کا خطاب اور پرچم عطا کیا اور بجائے عزالدولہ کے نائب السلطنت اور سلطان بنایا۔ اسی سال مکہ اور مدینہ میں معزعبیدی فرماں روائے مغرب کے نام کا خطبہ پڑھا جانا شروع ہوا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جب خلیفہ مطیع نے خلع خلافت کیا ہے تو بغداد میں سبکتگین کی حکومت تھی اور عزالدولہ بن معزالدولہ اہواز میں تھا۔ سبکتگین نے عزالدولہ کی ماں اور بھائیوں کو واسط بھیج دیا تھا۔ یہ خبر سن کر عزالدولہ اپنی والدہ کی ملاقات کو واسط آیا اور اپنے چچا حسن بن بویہ الملخاطب بہ رکن الدولہ کو جو فارس میں حکومت کر رہا تھا، سبکتگین اور ترکوں کے خلاف امداد بھیجنے کے لیے لکھا۔ رکن الدولہ نے اپنے وزیر ابوالفتح بن حمید کو ایک فوج دے کر اپنے بیٹے عضدالدولہ کے پاس اہواز میں بھیجا اور عضدالدولہ کو خط لکھا کہ تم بھی فوج لے کر اور ابوالفتح کے ساتھ مل کر اپنے چچا زاد بھائی عزالدولہ کی مدد کو پہنچو۔ ادھر سبکتگین نے خلیفہ طائع اللہ اور اس کے باپ مطیع دونوں کو ہمراہ لے کر ترکی فوج کے ساتھ واسط کی طرف کوچ کیا۔ ابوتغلب حاکم موصل نے یہ سن کر موصل سے روانہ ہو کر بغداد پر قبضہ کر لیا۔ واسط کے قریب پہنچ کر سبکتگین اور مطیع دونوں کا انتقال ہو گیا۔ ترکوں نے افتگین کو اپنا سردار بنا لیا اور واسط کا محاصرہ کر لیا۔ افتگین معزالدولہ بن بویہ کا آزاد ترکی غلام تھا۔ افتگین نے پچاس یوم تک نہایت سختی سے محاصرہ جاری رکھا۔

عضدالدولہ مع اپنے باپ کے وزیر ابوالفتح بن حمید کے واسط پہنچا۔ عضدالدولہ کے قریب پہنچنے کی خبر سن کر افتگین واسط سے محاصرہ اٹھا کر بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ افتگین کے قریب پہنچنے کی خبر سن کر ابوتغلب بغداد چھوڑ کر موصل کو چل دیا۔ عزالدولہ اور عضدالدولہ دونوں نے چند روز واسط میں قیام کیا، پھر دونوں بھائیوں نے چاروں طرف سے بغداد کا محاصرہ کر لیا اور ہر طرف سے رسد کا آنا بند کر دیا۔ اہل شہر کو سخت تکلیف ہونے لگی۔ ترکوں نے افتگین کے مکان کو لوٹ لیا اور آپس میں فتنہ وفساد برپا کرنے لگے۔ آخر افتگین خلیفہ طائع اللہ کو اپنے ہمراہ لے کر اور محاصرہ توڑ کر صاف نکل گیا اور تکریت میں جا کر دم لیا۔

جمادی الاول سنہ ۳۶۴ھ میں عضدالدولہ اور عزالدولہ بغداد میں داخل ہوئے۔ عضدالدولہ نے ترکوں سے خط وکتابت کر کے ماہ رجب سنہ ۳۶۴ھ میں خلیفہ طائع اللہ کو بغداد واپس بلا لیا اور قصر خلافت میں فروکش کر کے بیعت کی اور عزالدولہ کو گرفتار کر کے خود حکومت کرنے لگا۔ محمد بن بقیہ کو عضدالدولہ نے واسط کی حکومت پر مامور کر کے بھیج دیا۔ عزالدولہ کا بیٹا زبان نامی بصرہ میں حکومت

کر رہا تھا۔ اس نے عضدالدولہ کی شکایت اور عزالدولہ کے گرفتار کر کے قید کر دینے کا حال لکھ کر رکن الدولہ کے پاس بھیج دیا۔ رکن الدولہ کو سخت ملال ہوا اور عضدالدولہ کو عتاب آموز فرمان لکھا۔ عضدالدولہ نے اس کے جواب میں اپنے نائب رکن الدولہ کو خط لکھا کہ:

”عزالدولہ میں ملک داری کی قابلیت اور طاقت نہ تھی۔ اگر میں دست اندازی نہ کرتا تو بنی بویہ کے قبضہ سے بغداد کی حکومت نکل جاتی۔ میں صوبہ عراق کا خراج تیس لاکھ درھم سالانہ ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ اگر آپ صوبہ عراق کی نگرانی وحکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں تو شوق سے تشریف لائیں، میں فارس چلا جاؤں گا۔“

اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ صوبہ عراق اور بغداد دیلمی حکومت کا ماتحت تھا اور دیلمیوں کا سب سے بڑا حاکم اس زمانہ میں رکن الدولہ تھا جو خراسان میں تھا اور خلیفہ بغداد صوبہ دار عراق کی نگرانی و ماتحتی کے اندر بغداد میں قیدیوں کی طرح تھا۔ آخر رکن الدولہ کے حکم کے موافق عضدالدولہ نے عزالدولہ کو قید سے نکال کر عراق کی حکومت سپرد کی اور یہ اقرار لیا کہ عراق میں خطبہ عضدالدولہ کے نام کا پڑھا جائے گا اور عزالدولہ اپنے آپ کو عضدالدولہ کا نائب سمجھے گا۔ ابوالفتح کو عزالدولہ کے پاس چھوڑا اور خود فارس کی طرف چلا گیا۔ افتگین ان واقعات کے بعد دمشق کی طرف گیا اور وہاں معز عبیدی کے عامل کو نکال کر خود دمشق پر قابض و متصرف ہو گیا۔ اہل دمشق افتگین کی حکومت سے خوش ہوئے کیونکہ وہاں روافض اپنے اعتقادات کو زبردستی لوگوں سے منواتے اور تنگ کرتے تھے۔ افتگین کے پہنچنے سے ان کو نجات ملی۔ افتگین نے بجائے عبیدی سلطان کے خلیفہ طائع کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ یہ واقعہ شعبان سنہ ۳۶۴ھ میں وقوع پذیر ہوا۔

عضدالدولہ کی حکومت:

سنہ ۳۶۲ھ میں رکن الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد عضدالدولہ باپ کا جانشین ہوا۔ عضدالدولہ کے خلاف عزالدولہ نے لشکر کی فراہمی کی تدبیریں کیں۔ عضدالدولہ کے ارادوں سے مطلع ہو کر بغداد پر چڑھ آیا۔ بغداد پر قبضہ کرنے کے بعد بصرہ پر بھی قابض ہو گیا۔ یہ واقعہ آخر سنہ ۳۶۶ھ کا ہے۔ سنہ ۳۶۷ھ کے شروع ہونے پر عضدالدولہ نے اپنے باپ کے وزیر ابوالفتح بن عمید کو جو عزالدولہ کا ہمنوا ہو گیا تھا، پکڑ کر اندھا کر دیا اور قید میں ڈال دیا۔ عزالدولہ نے اپنے وزیر

عمید کو جو عضدالدولہ کا ہمساز ہوگیا تھا، اندھا کردیا اور موصل وشام کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے ابوتغلب والی موصل کو اپنا ہمدرد بنا کر اور فوج لے کر بغداد پر حملہ آور ہوا۔ عزالدولہ کو عضدالدولہ نے لڑائی میں گرفتار کر کے قتل کردیا اور ابوتغلب کے تعاقب میں جا کر موصل وجزیرہ پر قبضہ کرلیا۔ ابوتغلب آوارہ ہوکر قیصر روم کے پاس چلا گیا۔ وہاں قیصر نے اپنی لڑکی کی شادی ابوتغلب سے کردی۔ بہرحال صوبہ موصل سے چندروز کے لیے بنوحمدان کی حکومت منقطع ہوگئی۔ سنہ ۳۷۲ھ میں عضدالدولہ نے اپنی حکومت کے پانچ برس چھ مہینے کے بعد وفات پائی اور مرار دولت نے اس کے بیٹے کا کیجار کو عضدالدولہ کی جگہ مسند حکومت پر بٹھا کر صمصام الدولہ کے لقب سے ملقب کیا۔ خلیفہ طائع اللہ بھی رسم تعزیت ادا کرنے اور حکومت کی مبارک باد دینے صمصام الدولہ کے پاس آیا۔

صمصام الدولہ کی حکومت:

صمصام الدولہ کے کئی بھائی تھے۔ من جملہ ان کے ایک شرف الدولہ تھا۔ اس نے صمصام الدولہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے فارس پر قبضہ کرلیا۔ سنہ ۳۷۵ھ میں شرف الدولہ نے بغداد پر حملہ کیا۔ رمضان سنہ ۳۷۶ھ میں شرف الدولہ نے صمصام الدولہ کو گرفتار کر کے بغداد پر قبضہ کیا۔ خلیفہ طائع اللہ نے شرف الدولہ کو کامیابی پر مبارک باد دی۔ صمصام الدولہ کو فارس بھیج دیا گیا۔ وہاں پہنچ کر صمصام الدولہ آزاد کردیا گیا۔

شرف الدولہ کی حکومت:

شرف الدولہ جب بغداد، عراق پر قابض ہوا تو موصل میں فتنہ وفساد برپا تھا۔ بنوحمدان میں سیف الدولہ کے بعد اس کا بیٹا سعدالدولہ حلب وغیرہ پر حکمران تھا۔ شرف الدولہ بن عضدالدولہ دو برس آٹھ مہینے کی حکومت کے بعد سنہ ۳۷۹ھ میں بہ عارضہ استسقا فوت ہوا۔ شرف الدولہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا بہاؤالدولہ حکمران ہوا۔

بہاؤالدولہ کی حکومت:

بہاؤالدولہ کو خلیفہ طائع نے حسب دستور خلعت دیا اور مبارک باد دینے خود آیا۔ بہاؤالدولہ نے ابراہیم وحسین پسران ناصرالدولہ بن حمدان کو موصل کی حکومت پر مامور کر کے بہ طور عامل اپنی طرف سے بھیج دیا۔ مگر پھر اس انتظام پر پشیمان ہوکر موصل سے سابق عامل کو لکھا کہ ان کو حکومت

سپرد نہ کی جائے لیکن ابراہیم و حسین نے زبردستی موصل پر قبضہ کرلیا۔ سنہ ۳۸۰ھ میں بہاؤالدولہ نے اپنے بھتیجے ابوعلی بن شرف الدولہ کو جو فارس میں حکومت کررہا تھا، دھوکے سے بلا کر قتل کرڈالا اور خود فارس کی طرف روانہ ہوا کہ وہاں کے خزائن پر قبضہ کرے۔ چنانچہ وہاں پہنچا اور فارس پر قبضہ کیا۔ اسی اثناء میں صمصام الدولہ نے جو فارس میں موجود تھا، اپنے گرد لوگوں کو جمع کر کے ملک پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ بہاؤالدولہ کو صمصام الدولہ کے ساتھ اس شرط پر صلح کرنی پڑی کہ فارس پر صمصام الدولہ کا قبضہ رہے۔ اس صلح نامہ سے فارغ ہو کر بہاؤالدولہ بغداد کی طرف آیا۔ یہاں آ کر دیکھا تو شیعہ سنیوں میں لڑائی برپا تھی۔

بہاؤالدولہ نے دونوں کو مصالحت کرا کر خاموش کردیا۔ ماہ رمضان سنہ ۳۸۱ھ میں خلیفہ طائع اللہ نے دربار عام منعقد کیا۔ بہاؤالدولہ تخت کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ امراء دولت آ رہے تھے اور خلیفہ کی دست بوسی کرنے کے بعد اپنی اپنی جگہ بیٹھتے جاتے تھے۔ اسی اثناء میں ایک دیلمی سردار داخل ہوا۔ دست بوسی کے لیے بڑھا۔ خلیفہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا، دیلمی نے ہاتھ پکڑ کر خلیفہ کو کھینچ لیا اور تخت سے نیچے گرا کر باندھ لیا۔ دربار خلافت اور قصر خلافت لٹنے لگے۔ بہاؤالدولہ اپنے مکان پر آیا اور دیلمی لوگ خلیفہ کو کھینچتے اور بے عزت کرتے ہوئے بہاؤالدولہ کے مکان پر آئے۔ بہاؤالدولہ نے مجبور کر کے خلیفہ طائع سے خلع خلافت کا اعلان کرایا اور ابوالعباس احمد بن اسحاق بن مقتدر کو بلا کر قادر باللہ کے لقب سے تخت خلافت پر بٹھایا۔ طائع کو قصر خلافت کے ایک حصہ میں قید و نظر بند کردیا اور اس کی ضروریات کا بندوبست کردیا۔ سنہ ۳۹۲ھ تک طائع اسی حالت میں رہا اور پھر فوت ہوگیا۔

قادر باللہ

ابوالعباس احمد قادر باللہ اسحاق بن مقتدر سنہ ۳۳۶ھ میں ایک ام ولد موسومہ تمنی کے بطن سے پیدا ہوا اور ۱۲ رمضان سنہ ۳۸۱ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا۔ صاحب دیانت سیاستدان تھا۔ نماز تہجد کبھی قضا نہیں کی۔ دین کا عالم تھا۔ تخت نشینی کے چند روز بعد ماہ شوال سنہ ۳۸۱ھ میں قادر باللہ نے ایک دربار منعقد کیا۔ اس میں بہاؤالدولہ اور خلیفہ قادر باللہ نے ایک دوسرے کے وفادار رہنے کی قسمیں کھائیں۔ قادر باللہ نے اس تذلیل و تحقیر کو جو طائع اللہ کے زمانے میں خلیفہ بغداد کی ہو چکی تھی، کم

کرنے کی کوشش کی اور وقار خلافت کو قائم کرنے کا خواہش مند رہا مگر دیلمی اس طرح قابو یافتہ ہو چکے تھے اور خلافت کا مرتبہ اس قدر پست ہو چکا تھا کہ قادر باللہ کوئی بہت بڑا تغیر پیدا نہ کر سکا۔ تاہم اس نے طائع کے مقابلہ میں اپنے مرتبہ کو ضرور ترقی دی۔

سنہ ۳۸۰ھ میں جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ صمصام الدولہ اور بہاؤالدولہ کے درمیان اس بات پر صلح ہوگئی تھی کہ فارس پر صمصام الدولہ کی اور عراق پر بہاؤالدولہ کی حکومت رہے مگر بہاؤالدولہ نے سنہ ۳۸۳ھ میں فارس پر فوجیں بھیجیں کہ صمصام الدولہ کے عاملوں کو بے دخل کر کے فارس پر قبضہ کر لیں۔ صمصام الدولہ نے ان فوجوں کو شکست دے کر بھگایا۔ سنہ ۳۸۴ھ میں بہاؤالدولہ نے طغان ترکی کی ماتحتی میں ایک زبردست فوج فارس کی طرف روانہ کی۔ صمصام الدولہ سے متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ صمصام الدولہ اور بہاؤالدولہ کی لڑائیوں کا سلسلہ سنہ ۳۸۸ھ تک جاری رہا۔ کبھی یہ کامیاب ہوتا، کبھی وہ۔ آخر ماہ ذوالحجہ سنہ ۳۸۸ھ میں نو برس فارس میں حکومت کرنے کے بعد صمصام الدولہ گرفتار ہو کر مقتول ہوا اور فارس پر بہاؤالدولہ کا قبضہ ہو گیا۔ سنہ ۳۸۹ھ میں بہاؤالدولہ خود فارس کے ملک میں گیا اور عراق کی حکومت ابوجعفر حجاج بن ہرمز کو سپرد کر کے بغداد میں چھوڑ گیا۔ خلیفہ قادر باللہ نے ابوجعفر کو عمید الدولہ کا خطاب دیا۔ اسی سال یعنی سنہ ۳۸۹ھ میں خاندان سامانیہ کے قبضہ سے ماوراء النہر کا بھی تمام علاقہ نکل گیا اور اس خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ سنہ ۳۸۴ھ میں خراسان ان کے قبضے سے نکل چکا تھا۔ بنو سامان کی سلطنت کے نصف حصہ پر تو بنی سبکتگین نے قبضہ کر لیا اور بقیہ نصف پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا تھا، جس کا مفصل حال بعد میں ذکر کیا جائے گا۔ چند روز کے بعد بغداد میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان فساد برپا ہوا۔ بہاؤالدولہ نے فارس میں یہ خبر سن کر عمید الدولہ کو عراق و بغداد کی حکومت سے معزول کر کے سنہ ۳۹۰ھ میں ابوعلی حسن بن ہرمز کو عنان حکومت دے کر عمید الجیوش کا خطاب دیا۔ عمید الجیوش نے شیعہ سنیوں کے فساد کو مٹایا اور ملک کا اچھا انتظام کیا۔ سنہ ۳۹۱ھ میں عمید الجیوش کو معزول کر کے ابونصر بن سابور کو عراق و بغداد کی حکومت سپرد کی۔ شیعہ سنیوں میں پھر فساد برپا ہوا مگر چند روز کے بعد مصالحت ہوگئی۔ سنہ ۳۵۰ھ میں بہاؤالدولہ کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سلطان الدولہ حکومت کرنے لگا۔ خلیفہ قادر باللہ نے اس کو سلطان الدولہ کا خطاب دیا۔

سلطان الدولہ کی حکومت:

سلطان الدولہ نے جو اپنے باپ بہاؤ الدولہ کی وفات کے بعد مسند حکومت پر متمکن ہوا، اپنے بھائی ابوالفوارس کو کرمان کی حکومت پر مامور کیا۔ کرمان میں ابوالفوارس کے پاس بہت سے دیلمی جمع ہوئے اور اس کو مشورہ دیا کہ تم اپنے بھائی سلطان الدولہ سے حکومت وریاست چھین لو۔ چنانچہ ابوالفوارس نے کرمان سے فوج مرتب کر کے شیراز پر حملہ کر دیا۔ ادھر سے سلطان الدولہ نے مقابلہ کیا۔ جنگ عظیم کے بعد ابوالفوارس کو شکست ہوئی۔ سلطان نے اس کا تعاقب کیا، وہ کرمان واپس آ کر کرمان میں نہ ٹھہر سکا کیونکہ سلطان الدولہ نے کرمان تک اس کا تعاقب کیا۔ کرمان سے ابوالفوارس، سلطان محمود غزنوی بن سبکتگین کے دربار میں پہنچا۔ سلطان محمود غزنوی نے اس کی تشفی وتسلی کی اور اپنے ایک سردار ابوسعید طائی کو فوج دے کر اس کے ساتھ کر دیا۔ ابوالفوارس یہ امداد لے کر دوبارہ فارس پر حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ بھی سلطان الدولہ نے شکست دے کر بھگایا۔ اس مرتبہ شکست کھا کر ابوالفوارس، سلطان محمود غزنوی کے پاس اس لیے نہیں گیا کہ اس نے ابوسعید طائی کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ چنانچہ بعد شکست وہ مہذب الدولہ حاکم بطیحہ کے پاس گیا، پھر خط و کتابت کر کے سلطان الدولہ نے اپنی خطا معاف کرا کر کرمان کی حکومت پر دوبارہ مامور ہوا۔

ترکوں کا خروج:

چین اور علاقہ ماوراء النہر کے درمیان ایک درۂ کوہ سے ترکوں کے قبائل جو ملک خطا کے رہنے والے تھے، خروج کیا اور طغا خان والی ترکستان کے علاقہ میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ طغا خان نے بلاد اسلامیہ سے فوجیں جمع کر کے ایک لاکھ بیس ہزار کے لشکر سے ان کا مقابلہ اور تعاقب شروع کیا۔ اپنے علاقہ سے نکال کر پہاڑوں کے درے اور تنگ گزرگاہ میں تین مہینے کی مسافت پر پہنچ کر ان کو جا لیا اور دو لاکھ آدمیوں کو قتل کر کے واپس ہوا۔ اس طرح ان ترکوں کو جنہیں مغل کہنا چاہیے، اچھی طرح نصیحت ہوگئی۔ یہ واقعہ سنہ ۴۰۸ھ میں وقوع پذیر ہوا۔

سلطان الدولہ نے اپنے بھائی مشرف الدولہ کو عراق کا گورنر بنا دیا تھا۔ مشرف الدولہ نے عراق میں سلطان الدولہ کے خطبے کو موقوف کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا شروع کر دیا اور سلطان الدولہ کو معزول کر دیا۔ یہ واقعہ سنہ ۴۱۱ھ میں واقع ہوا۔

مشرف الدولہ کی حکومت:

مشرف الدولہ کی حکومت وامارت کو جب سب دیلمی سرداروں نے جو عراق میں موجود تھے، منظور کر لیا تو سلطان الدولہ نے اپنے بیٹے ابوکالیجار کو فوج دے کر روانہ کیا۔ ابوکالیجار نے اہواز پر قبضہ کر لیا۔ چند معرکہ آرائیوں کے بعد سنہ ۴۱۲ھ میں کوفہ کے اندر شیعوں اور سنیوں میں سخت فساد ہوا۔ اس فساد کے شعلے بغداد تک بھی پہنچے۔ یہاں بھی فساد برپا ہو گیا۔ دیلمی جو قابو یافتہ تھے، شیعہ تھے۔ خلیفہ جو کوئی طاقت نہ رکھتا تھا، سنی تھا۔ ترکوں کی آبادی بغداد و سامرا میں کافی تھی۔ ترک بھی سب سنی تھے اور اسی بناءٔ پر وہ خلیفہ کے احکام کی تعمیل سب ضروری سمجھتے تھے۔ خلیفہ قادر نے ان تمام حالات پر خوب غور کر کے سنیوں کی امداد وحمایت میں کئی مرتبہ جرأت سے کام لیا اور شیعوں کو ان کی ناشدنی حرکات سے روکا۔ اس طرح ترکوں اور بغداد کے سنیوں کی ایک معقول تعداد خلیفہ قادر باللہ کی حامی تھی اور یہی وجہ تھی کہ خلیفہ قادر باللہ نے کچھ نہ کچھ رعب و وقار حاصل کیا۔ ماہ ربیع الاول سنہ ۴۱۶ھ میں مشرف الدولہ نے اپنی حکومت کے پانچویں سال وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا بھائی ابوطاہر جلال الدولہ والی بصرہ مسند نشین ہوا۔

جلال الدولہ کی حکومت:

مشرف الدولہ کی وفات کے بعد بغداد میں جلال الدولہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ جلال الدولہ بصرہ سے روانہ ہو کر بجائے بغداد آنے کے واسط چلا گیا۔ اس پر بغداد والوں نے اس کا نام خطبہ سے خارج کر کے اس کے بھتیجے ابوکالیجار بن سلطان الدولہ کا نام خطبہ میں داخل کر دیا۔ ابوکالیجار اس زمانہ میں اپنے چچا ابوالفوارس سے کرمان میں جنگ آزما تھا۔ اہل بغداد نے ابوکالیجار کو بغداد طلب کیا لیکن وہ بغداد نہ آ سکا۔ یہ سن کر جلال الدولہ واسط سے بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ بغداد کی فوجوں نے اس کو بغداد میں داخل نہیں ہونے دیا اور شکست دے کر واپس کر دیا۔ جلال الدولہ پھر بصرہ چلا گیا۔ جب اہل بغداد کو ابوکالیجار کے آنے سے مایوسی ہوئی تو خراسانیوں، ترکوں اور دیلمیوں نے مل کر یہ مشورہ کیا کہ جلال الدولہ کے واپس کر دینے کے بعد اب بہت زیادہ ممکن ہے کہ کوئی کرد یا عرب سردار بغداد پر مستولی ہو جائے۔ اگر کوئی عرب مستولی ہو گیا تو پھر ترکوں یا دیلمیوں کا بغداد پر قبضہ غیر ممکن ہو جائے گا اور عربوں کی حکومت بصرہ، شام، حجاز، یمامہ، بحرین اور موصل وغیرہ صوبوں

سے بہت جلد امداد حاصل کر کے مضبوط ہو جائے گی۔

یہ سوچ کر جلال الدولہ کے پاس خطوط روانہ کیے گئے اور اس کو بلا تامل بغداد کی طرف آنے کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ جلال الدولہ وارد بغداد ہوا اور حکومت کرنے لگا۔ اس کا نام خطبوں میں داخل ہوا۔ سنہ ۴۱۸ھ میں جلال الدولہ نے حکم دیا کہ نماز پنج وقتہ میں نقارہ بجایا جائے۔ خلیفہ قادر باللہ نے اس کو بدعت ہونے کی وجہ سے سخت ناپسند کیا اور اس حکم کو واپس لینے کی تاکید جلال الدولہ کو کی۔ جلال الدولہ نے اپنا یہ حکم منسوخ تو کر دیا مگر خلیفہ سے بہت کبیدہ خاطر ہو گیا۔ پھر چند روز کے بعد خلیفہ نے اجازت دے دی اور جلال الدولہ نے نقارہ بجانے کا حکم جاری کر دیا۔

سنہ ۴۱۹ھ میں ترکوں نے جلال الدولہ کے خلاف بغاوت کی مگر خلیفہ قادر باللہ نے درمیان میں پڑ کر مصالحت کرا دی۔ اس کے بعد ابو کالیجار نے عراق پر حملہ کیا۔ جلال الدولہ نے اس کے مقابلہ پر فوجیں روانہ کیں۔ اس طرح لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ دونوں ایک دوسرے سے لڑتے رہے، ابھی سلسلہ جنگ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ خلیفہ قادر باللہ نے سنہ ۴۲۲ھ میں انتقال کیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ابوجعفر عبداللہ قائم بامراللہ کے لقب سے تخت خلافت پر بیٹھا۔ شیخ تقی الدین صلاح نے قادر باللہ کو علمائے شافعیہ میں شمار کیا ہے۔

قائم بامراللہ

ابوجعفر عبداللہ قائم بامراللہ بن قادر باللہ ۱۵ ذیقعدہ سنہ ۳۹۱ھ میں ایک ارمنی ام ولد موسومہ بدر الدجیٰ کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ خوبصورت، عابد، زاہد، صابر، ادیب، خوش خط، سخی، صدقہ دینے والا، احسان کرنے والا شخص تھا۔ جلال الدولہ کے قوائے حکمرانی خود کمزور ہو گئے تھے۔ اس کی فوج میں آئے دن بغاوت برپا رہتی تھی۔ سنہ ۴۲۵ھ میں جلال الدولہ نے خود بغداد کے محلّہ کرخ میں اقامت اختیار کی اور ارسلان ترکی المعروف بہ بساسیری کو بغداد کے حصہ غربی پر مامور کیا۔ بساسیری نے غلبہ وتسلط حاصل کر کے اہل بغداد کو بہت ستایا اور خلیفہ کو بھی تنگ رکھا اور انواع واقسام کی گستاخیاں کر کے خلیفہ کو بالکل بے دست و پا اور مثل قیدی کے بنا دیا۔

شیعہ سنیوں میں فسادات برپا ہوئے۔ بساسیری بھی چونکہ شیعوں کا حامی تھا، اس لیے سنیوں کو

بڑے بڑے نقصانات برداشت کرنا پڑے۔ سنہ ۴۲۷ھ میں فوج نے بغاوت کی اور جلال الدولہ کے مکان کا محاصرہ کر کے لوٹ لیا۔ جلال الدولہ تکریت چلا گیا۔ خلیفہ قائم بامراللہ نے بیچ میں پڑ کر فوج کے ترکوں اور جلال الدولہ میں مصالحت کرا دی۔ سنہ ۴۲۸ھ میں جلال الدولہ اور اس کے بھتیجے ابوکالیجار میں مصالحت ہوگئی اور ایک دوسرے نے اتحاد و اتفاق قائم رکھنے کی قسمیں کھائیں۔

سنہ ۴۲۶ھ میں جلال الدولہ نے خلیفہ قائم بامراللہ سے درخواست کی کہ مجھ کو ملک الملوک کا خطاب دیا جائے۔ خلیفہ نے علماء وفقہاء سے اس خطاب کے جواز کی نسبت استفتا کیا۔ بعض نے جواز کا فتویٰ دیا۔ بعض نے اس کو ناجائز بتایا۔ آخر خلیفہ نے جلال الدولہ سے مجبور ہو کر مجوزین کی رائے پر عمل کیا اور جلال الدولہ کو ''ملک الملوک'' کا خطاب دے دیا۔ سنہ ۴۳۱ھ میں ابوکالیجار نے بصرہ پر فوج کشی کر کے وہاں کے عامل کو بے دخل کر کے قبضہ کر لیا اور اپنے بیٹے عزالملوک کو بصرہ کی حکومت سپرد کر کے خوداہواز کی جانب چلا گیا۔ اسی سال طغرل بیگ سلجوقی نے خراسان میں سلطان مسعود بن محمود بن سبکتگین کے سپہ سالار کو شکست دی اور نیشا پور پر قابض ہو گیا اور خراسان پر مستولی ہو کر سلطان اعظم کے لقب سے مشہور ہوا۔

اسی سال طغرل بیگ اور جلال الدولہ کے درمیان صلح نامہ لکھا گیا اور خلیفہ نے اپنے خاص ایلچی قاضی ابوالحسن کو طغرل بیگ کے پاس روانہ کیا۔ ماہ شعبان سنہ ۴۳۵ھ میں جلال الدولہ نے وفات پائی اور لوگوں نے اس کے بیٹے ابومنصور ملک العزیز کو جلال الدولہ کا قائم مقام بنایا مگر ملک العزیز لشکریوں کو ان کے حسب منشاء انعام و وظائف نہ دے سکا۔ لشکر میں بددلی پیدا ہوئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ابوکالیجار نے بہت سا مال سرداران فوج کے پاس بغداد میں بھیج دیا اور اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ ماہ صفر سنہ ۴۳۶ھ میں وہ بغداد میں داخل ہوا اور خلیفہ نے اس کو ''محی الدین'' کا خطاب عطا کیا۔ سنہ ۴۳۹ھ میں ابوکالیجار المخاطب بہ محی الدین بن سلطان الدولہ بن بہاؤالدولہ بن عضدالدولہ بن رکن الدولہ بن بویہ دیلمی نے سلطان طغرل بیگ سے اپنی بیٹی کا عقد کر کے مصالحت کی۔

ابوکالیجار کی حکومت:

ابوکالیجار نے نائب السلطنت بن کر اصفہان و کرمان کے علاقوں پر اپنی تدبیر و رائے اور چالاکی و فوج کشی وغیرہ کے ذریعہ سے قبضہ کیا اور سوا چار برس حکومت کر کے سنہ ۴۴۰ھ میں فوت ہوا۔ اس کی جگہ بغداد میں اس کا بیٹا ابونصر فیروز مسند نشین ہوا اور ''ملک الرحیم'' اپنا لقب رکھا۔

ملک الرحیم کی حکومت:

ملک الرحیم نے بغداد وعراق میں حکومت شروع کی اور اس کے دوسرے بھائی نے شیراز پر قبضہ کیا۔ اسی سال اہل بغداد میں سخت فساد برپا ہوا۔ بنائے فساد وہی شیعہ سنی کا جھگڑا تھا۔ اس کے بعد ملک الرحیم نے اپنے بھائی ابومنصور خسرو پر جس نے شیراز پر قبضہ کر لیا تھا، چڑھائی کی۔ لڑائیاں ہوئیں۔ اس کے بعد ملک الرحیم کے دوسرے بھائیوں اور رشتہ داروں نے عراق میں علم بغاوت بلند کیے۔ سنہ ۴۴۲ھ میں شیعوں سنیوں کے درمیان بغداد میں فساد برپا ہوا اور سینکڑوں آدمی طرفین سے مارے گئے۔

اسی سال سلطان طغرل بیگ نے اصفہان پر قبضہ کر لیا اور اپنے بھائی ارسلان بن داؤد کو بلاد فارس کی طرف روانہ کیا۔ ارسلان بن داؤد نے سنہ ۴۴۴ھ میں صوبہ فارس پر قبضہ کر لیا۔ خلیفہ قائم بامراللہ نے سلطان طغرل بیگ کے پاس ان تمام صوبوں کی سند حکومت بھیج دی جو اس نے فتح کر لیے تھے۔ سنہ ۴۴۳ھ میں عید کے موقع پر سلطان طغرل بیگ بغداد میں آیا اور خلیفہ کی دست بوسی کا فخر حاصل کیا اور خلعت واعزاز سے مشرف ہو کر واپس چلا گیا۔ سنہ ۴۴۵ھ میں بغداد کے اندر شیعہ سنیوں میں ایک بڑا فساد برپا ہوا۔ بغداد کے کئی محلے اس فساد میں جل کر خاک سیاہ ہو گئے۔ خلیفہ قائم بامراللہ نے اس فساد کو بہ مشکل فرو کیا۔ ملک الرحیم شیراز اور بصرہ وغیرہ میں اپنے بھائی بھتیجوں سے مصروف جنگ رہا۔ یہاں تک کہ سنہ ۴۴۷ھ کا زمانہ آ گیا۔

اس عرصہ میں سلطان طغرل بیگ نے آذربائیجان وجزیرہ پر قبضہ کر لیا۔ رومیوں پر جہاد کیا، وہاں سے بے قیاس مال و دولت حاصل کرنے کے بعد خراسان و فارس کے قبضہ کو مکمل کر کے موصل وشام پر قبضہ کیا۔ حج ادا کرنے کے لیے بیت اللہ شریف آ گیا۔ وہاں سے واپس ہو کر رے وخراسان کے انتظام واہتمام کی طرف متوجہ ہوا۔ بغداد اور اس کے نواح میں اوباشوں اور بدمعاشوں نے بڑی بدامنی پیدا کر رکھی تھی۔ سنہ ۴۴۷ھ میں طغرل بیگ نے خلیفہ قائم بامراللہ کی خدمت میں اطاعت وعقیدت کا ایک خط بھیجا۔ اسی زمانہ میں ملک عبدالرحیم بصرہ سے بغداد آیا اور خلیفہ کو مشورہ دیا کہ طغرل بیگ سے مراسم اتحاد کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ خلیفہ نے ماہ رمضان المبارک سنہ ۴۴۷ھ میں حکم دیا کہ سلطان طغرل بیگ کا نام خطبوں میں لیا جائے۔ سلطان طغرل بیگ یہ سن کر

خوش ہوا اور خلیفہ سے حاضری کی اجازت طلب کی۔ خلیفہ نے اجازت دی اور سرداران لشکر بغداد نے سلطان طغرل بیگ کے پاس اپنی اطاعت وفرماں برداری کے اظہار میں عریضے روانہ کیے۔ ۲۵ رمضان سنہ ۴۴۷ھ کو بغداد میں سلطان طغرل بیگ کے استقبال کا اہتمام کیا گیا۔

بساسیری چونکہ شیعہ تھا اور حاکم مصر عبیدی سے سازش رکھتا تھا، اس نے بغداد میں فساد برپا کرا دیا۔ طغرل بیگ نے وارد بغداد ہو کر ہر طرح کا انتظام کیا۔ دیلمیوں کے زور قوت کو توڑا۔ سنہ ۴۴۸ھ کے شروع ہونے پر سلطان طغرل بیگ نے اپنی بھتیجی خدیجہ المخاطب بہ ارسلان خاتون بنت داؤد کا نکاح خلیفہ قائم بامراللہ سے کر کے خاندان خلافت سے رشتہ داری قائم کی۔ آخر شوال سنہ ۴۴۸ھ کو سلطان طغرل بیگ کے چچازاد بھائی قطلمش نے بساسیری سے مقام سنجار کے قریب لڑائی کی، قطلمش کو شکست ہوئی۔

بساسیری نے صوبہ موصل پر قبضہ کر کے مستنصر عبیدی حاکم مصر کے نام کا خطبہ جاری کیا اور صوبہ جزیرہ کا والی بھی باغی ہو گیا۔ سلطان طغرل بیگ نے موصل پر چڑھائی کی اور اس کو فتح کر کے باغیوں کو قرار واقعی سزا دے کر سنہ ۴۴۹ھ کے شروع ہونے پر بغداد کی طرف لوٹا۔ خلیفہ نے بڑی عزت وتکریم کی، ایک دربار منعقد کیا گیا۔ خلیفہ نے طغرل بیگ کو ''ملک المشرق والمغرب'' کا خطاب دے کر تمام ملکوں کی حکومت وانتظام کی سند عطا کی۔

اس عرصہ میں بساسیری اور والی مصر عبیدی نے سلطان طغرل بیگ کے بھائی ابراہیم کو بہکا کر ہمدان میں بغاوت کرا دی۔ سلطان طغرل بیگ ہمدان کی بغاوت فرو کرنے کے لیے بغداد سے روانہ ہوا۔ بساسیری نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر بغداد پر قبضہ کر لیا اور جامع بغداد میں مستنصر عبیدی کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ یہ واقعہ ذیقعدہ سنہ ۴۵۰ھ کا ہے۔ بغداد کے شیعوں نے بساسیری کی ہر طرح سے مدد کی۔ بساسیری نے بغداد کے اندر اذانوں میں ''حی علیٰ خیر العمل[1]'' کا اضافہ کرایا۔ بساسیری کے مظالم سے تنگ آ کر بغداد کے سنیوں نے بغاوت کی مگر بساسیری کی فوج سے شکست کھا کر مقتول ہوئے۔ بساسیری نے خلیفہ کے وزیر اعظم معروف بہ رئیس الرؤسا کو پکڑ کر صلیب پر چڑھا دیا۔ یہ واقعہ آخری ذی الحجہ سنہ ۴۵۰ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ بساسیری نے مستنصر عبیدی کے پاس مصر میں بشارت نامہ روانہ کیا اور امداد طلب کی مگر مصر سے کوئی امداد اس کو نہ پہنچی۔ ادھر بساسیری کے

---

[1] اہل سنت کے مطابق قرآن وحدیث سے اذان میں اس جملہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

پاس خبر پہنچی کہ سلطان طغرل بیگ کو اپنے بھائی ابراہیم کے مقابلے میں فتح حاصل ہو چکی ہے۔ خلیفہ قائم بامراللہ اور اس کی بیوی ارسلان خاتون کو گرفتار کر کے بغداد سے باہر کسی مقام پر نظر بند کر دیا اور قصر خلافت کو لٹوا دیا گیا تھا۔ طغرل بیگ یہ تمام خبریں سن کر بغداد کی طرف متوجہ ہوا۔

بساسیری یہ خبر سن کر ۶ ذیقعدہ سنہ ۴۵۱ھ کو پورے ایک سال بعد بغداد سے چل دیا۔ طغرل بیگ بغداد میں داخل ہوا، خلیفہ کو بغداد میں بلوایا اور تخت خلافت پر بٹھا کر معذرت کی کہ میری غیر حاضری کی وجہ سے آپ کو اس قدر اذیت پہنچی۔ اس عرصہ میں داؤد برادر طغرل بیگ کا خراسان میں انتقال ہو گیا تھا۔ ۲۵ ذیقعدہ سنہ ۴۵۱ھ کو خلیفہ قائم بامراللہ بغداد میں داخل ہوا۔

دولت بنی بویہ پر ایک نظر:

بویہ ماہی گیر دیلمی کی اولاد کا حال اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ انہیں لوگوں نے خلافت پر مستولی ہو کر خلافت کی عزت کو خاک میں ملایا۔ سو برس سے زیادہ عرصہ تک یہ لوگ خلیفہ بغداد اور عراق و فارس پر قابض و متصرف رہے۔ یہ لوگ شیعہ تھے، اس لیے سنیوں کو اس سو سال کے عرصہ میں جو اذیتیں پہنچی ہیں، ان کا تصور بہت ہی درد انگیز ہے مگر ان کے دور حکومت میں علویوں کو کوئی خاص نفع نہیں پہنچا۔ یہ لوگ اگرچہ محبّ اہل بیت ہونے کا دعویٰ کرتے تھے مگر انہوں نے کسی علوی کو طاقتور بنانے اور برسر حکومت لانے کی کوشش نہیں کی۔ ان میں بعض شخص علم دوست بھی مشہور ہیں اور ان کے زمانے میں بعض مدارس بھی جاری ہوئے مگر ان سب پر مجوسیت غالب تھی اور انہوں نے حکومت عباسیہ کو مٹا کر اپنی قوم و خاندان کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔

ان کے زمانے میں عربی سیادت کے تمام نقوش مٹ گئے۔ ان کے کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سو برس سے زیادہ عرصہ تک شیعہ سنیوں کو برسر جنگ رکھا اور مذاہب اسلام [1] میں بعض ایسی شرکیہ مراسم جاری کیں جو آج تک مسلمانوں کے گلے میں طوق لعنت بنی ہوئی پڑی ہیں۔ ان کی حکومت کا دائرہ فارس وعراق سے باہر تک نہیں پہنچا۔ خراسان و ماوراء النہر پر ان کو حکومت کرنی نصیب نہیں ہوئی۔ شام وحجاز بھی ان کے اثر سے پاک رہا۔ ان کی حکمرانی کے سوا سو برس بدنظمی، لوٹ مار اور فتنہ وفساد سے لبریز ہیں۔ لہٰذا خاندان بویہ مسلمانوں کے لیے کوئی مبارک خاندان نہ تھا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کے رعب و وقار اور اسلامی سلطنت کی عظمت کو برباد

[1] یہاں مذاہب اسلام سے مراد ہے فرق ضالہ یعنی وہ گمراہ فرقے جو اس امت میں ظاہر ہوئے، مثلاً: سبائی گروہ، باطنی فرقہ وغیرہ۔

کرنے میں سب سے زیادہ کام کیا اور ایسی کوئی یادگار نہ چھوڑی جس پر آج مسلمان فخر کر سکیں۔ بہرحال سنہ ۴۴۷ھ میں اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ سلجوقیہ حکومت، قائم بامراللہ کے عہد خلافت میں قائم ہو گئی۔

دولت سلجوقیہ کی ابتدا

دولت سلجوقیہ کا حال خلفاء عباسیہ کے سلسلہ میں اس طرح بیان نہ ہو گا جیسا کہ دولت بنو بویہ کا حال اوپر ہو چکا۔ دولت سلجوقیہ کی تاریخ علیحدہ کسی باب میں لکھی جائے گی۔ اس وقت یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دولت سلجوقیہ کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ اس کے بعد خلفاء بنو عباس میں کسی اور خاندان کی حکومت کی تاریخ بیان کرنے کی بھی ضرورت غالباً پیش نہ آئے گی۔ خاندان سامان اور خاندان سبکتگین غزنوی کو بھی ابھی نہیں چھیڑا گیا۔

ترکوں کی قوم سرحد چین سے خوارزم، شاش، فرغانہ، بخارا، سمرقند، ترمذ تک آباد تھی۔ مسلمانوں نے ان لوگوں کو شکستیں دے کر ان کے سرداروں کو اپنا باج گزار بنا لیا تھا لیکن انہیں کی قوم کے بعض قبائل سرحد چین کے قریب پہاڑوں کے دشوار گزار دروں میں ایسے بھی باقی تھے، جو ابھی تک مسلمانوں کی فرماں برداری سے آزاد اور چین و ترکستان وغیرہ سے بالکل بے تعلق زندگی بسر کرتے تھے۔ ان لوگوں نے سنہ ۴۰۰ھ کے قریب اپنے دروں سے نکل نکل کر ماوراء النہر کے ان علاقوں پر چھاپے مارنے شروع کیے جو سامانی خاندان کی بربادی کے بعد وہاں کے ترک سرداروں کے قبضے میں تھے۔

ان علاقوں میں اسلام پھیل چکا تھا۔ سب سے بڑا سردار ایلک خان اس طرف حکمران تھا، لوٹ مار کی چاٹ نے بار بار ان ترکوں کو جو ابھی تک اسلام سے ناآشنا زندگی بسر کر رہے تھے، ترکستان و ماوراء النہر پر حملہ آور کیا۔ سنہ ۴۱۸ھ تک یہ ترک اپنے پہاڑی دروں سے نکل نکل کر آذربائیجان تک پہنچ گئے تھے اور ملک کی عام بدنظمی اور خلافت اسلامیہ کی کمزوری نے ان کو دور دور تک پہنچنے اور آباد علاقوں کو لوٹنے کا موقع دیا۔

سنہ ۴۱۸ھ میں ان لٹیرے ترکوں کا ایک شریف و معزز قبیلہ جو ابھی تک اپنی جگہ سے نہ ہلا تھا، ترکستان کی طرف متوجہ ہوا اور بخارا سے بیس فرسنگ کے فاصلہ پر ایک سبزہ زار میں سررہ گزر مقیم

ہوا۔اس قبیلے کے سردار کا نام سلجوق تھا۔یہ لوگ اپنے پیش رو ترکوں کی نسبت مہذب اور شریف الطبع تھے۔ان کے مویشی ان کے ہمراہ تھے۔ان کی جمعیت کثیر تھی۔ان کے جسم زیادہ مضبوط اور یہ لوگ شریف ومعزز ہونے کی وجہ سے زیادہ بہادر بھی تھے۔سلطان محمود غزنوی کے عامل نے طوس سے محمود غزنوی کو اس نئے قبیلے کے آنے کی اطلاع دی اور لکھا کہ ان لوگوں کا بخارا کے متصل خیمہ زن ہونا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔سلطان محمود غزنوی نے اس طرف خود توجہ کی اور وہاں پہنچ کر ان ترکوں کے پاس پیام بھیجا کہ اپنا ایک نمائندہ ہمارے دربار میں بھیجو۔وہاں سے ارسلان بن سلجوق یا اسرائیل بن سلجوق دربار محمودی میں حاضر ہوا۔

محمود غزنوی نے اس کو بطور یرغمال اور بطور ضمانت امن وامان گرفتار کر کے ہندوستان کے قلعہ میں بھیج دیا۔دو تین سال کے بعد محمود غزنوی فوت ہو گیا اور ترکوں کا یہ قبیلہ اپنے سامنے خراسان کے میدانوں کو سہل الحصول دیکھ کر خراسان میں پھیل گیا۔جو قبائل ان سے پہلے آ آ کر خراسان میں مصروف وغارت گری تھے، وہ بھی سب آ آ کر ان میں شامل ہونے شروع ہو گئے۔محمود غزنوی کے بیٹے مسعود غزنوی نے ان کو روکا ٹوکا اور متعدد لڑائیاں ہوئیں مگر بالآخر انہوں نے غزنویوں کو خراسان سے بے دخل کر کے خراسان پر قبضہ کر لیا۔محمود غزنوی کی اولاد دم بہ دم کمزور ہوتی گئی اور انہوں نے اس قبیلے یعنی سلجوقی سے صلح کر کے خراسان سے دست بردار ہو جانے کو غنیمت سمیھا۔بویہ کی اولاد آپس کی خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔نیز اس میں سلجوقیوں کے مقابلہ کی قابلیت وہمت بھی نہ تھی۔لہٰذا سلجوقیوں نے حیرت انگیز طور پر ترقی کے مدارج طے کیے۔بغداد میں چونکہ عباسی خلیفہ موجود تھا، اس لیے سلجوقیوں کے دلوں میں اس کا ادب بہت زیادہ تھا۔

سلجوقی قبیلہ اپنی ملک گیری کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے ہی نواح بخارا کے میدانوں میں اسلام کو قبول کر چکا تھا اور شیعوں کے اثر سے متاثر نہ ہوا تھا کیونکہ ماوراء النہر اور بخارا وغیرہ میں تمام مسلمان سنی مذہب رکھتے تھے اور یہی سلجوقیوں کا مذہب تھا۔جو لوگ بنو بویہ کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے، انہوں نے بھی سلجوقیوں کو اپنے لیے فرشتہ رحمت سمجھا۔سلجوقیوں کے سردار طغرل بیگ نے خراسان، آذربائیجان، جزیرہ وغیرہ کو اول فتح کر کے اپنی طاقت کو بڑھایا۔اس کے بعد جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بغداد کی طرف متوجہ ہوا۔اس طرح دیلمیوں کو بے دخل کر کے بغداد میں خود نائب السلطنت کا مرتبہ پایا اور ایک عرصہ دراز تک اس کے خاندان میں حکومت رہی اور اس کے جانشین

الپ ارسلان سلجوقی نے دریائے ڈینیوب سے دریائے سندھ تک ایک عظیم الشان سلطنت جو ہر طرح نہایت مضبوط و باہیبت تھی، قائم کی۔ بہرحال اب ہم کو خلیفہ قائم بامراللہ کے بقیہ حالات کی طرف ملتفت ہونا چاہیے۔

سنہ ۴۵۱ھ میں سلطان طغرل کے بھائی چغری بیگ داؤد والی خراسان سے غزنوی سلطان سے صلح کی اور اسی سال ابوالفضل بیہقی نے جو سلطان مسعود غزنوی کا میر منشی تھا، بہ عہد سلطان ابراہیم غزنوی تاریخ بیہقی تصنیف کی۔ چغری بیگ داؤد کے انتقال پر سلطان طغرل بیگ نے اپنی بھاوج، والدہ سلیمان سے نکاح کر لیا۔ اسی سال یعنی ذوالحجہ سنہ ۴۵۱ھ میں سلطان طغرل بیگ نے بساسیری کو جبکہ وہ کوفہ میں پہنچ کر قتل و غارت میں مصروف تھا، حملہ کر کے گرفتار و قتل کیا اور اس کا سر کاٹ کر بغداد بھیج دیا۔ جہاں وہ قصر خلافت کے دروازے پر لٹکایا گیا۔

محرم سنہ ۴۵۲ھ میں سلطان طغرل بیگ نے بغداد کے انتظام سے فارغ ہو کر واسط کی طرف کوچ کیا۔ وہاں کے انتظام سے فارغ ہو کر ربیع الاول سنہ ۴۵۲ھ میں بلاد جبل و آذربائیجان کی طرف روانہ ہوا۔ ۱۵ ربیع الثانی سنہ ۴۵۳ھ کو ابوالفتح بن احمد اہواز سے بغداد میں آیا اور خلیفہ نے اس کو قلمدان وزارت عطا کیا۔ چند ہی روز بعد ابونصر بن جہیر بن مروان کو فخر الدولہ کا خطاب دے کر عہدہ وزارت دیا گیا اور ابوالفتح معزول ہو کر اہواز چلا گیا۔

سنہ ۴۵۳ھ میں سلطان طغرل بیگ نے اپنی بیوی یعنی والدہ سلیمان کے فوت ہونے پر ابوسعد قاضی رے کی معرفت خلیفہ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ اپنی بیٹی سیدہ کا نکاح مجھ سے کر دیجیے۔ خلیفہ نے انکار کیا، اس کے بعد طغرل بیگ نے اپنے وزیر عمید الملک کندری کو بھیجا۔ عمید الملک نے جمادی الآخر سنہ ۴۵۴ھ تک بغداد میں مقیم رہ کر خلیفہ کو آمادہ کرنے کی ہر طرح کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور طغرل بیگ کی خدمت میں واپس گیا۔ طغرل بیگ نے بغداد کے قاضی القضاۃ اور شیخ ابومنصور بن یوسف کے نام عتاب آمیز خطوط روانہ کیے۔ ان لوگوں نے بارگاہ خلافت میں حاضر ہو کر خلیفہ کو لڑکی کا نکاح کر دینے کی ترغیب دی۔ خلیفہ نے یہ دیکھ کر کہ اب یہ معاملہ طول کھینچے گا، اسی کو مناسب سمجھا کہ طغرل بیگ کے ساتھ لڑکی کی شادی کر دی جائے۔ علاوہ ازیں خلیفہ کی بیوی ارسلان خاتون بھی جو طغرل بیگ کی بھتیجی تھی، خلیفہ کو آمادہ کر رہی تھی۔ بہرحال خلیفہ قائم بامراللہ نے طغرل بیگ کی درخواست کو منظور کر لیا اور طغرل بیگ کے وزیر عمید الملک کو شہزادی سیدہ کے نکاح کا وکیل مقرر کیا

اوراس کے پاس اطلاع بھیج دی۔ چنانچہ ماہ شعبان سنہ۴۵۴ھ میں تبریز کے کیمپ میں خلیفہ کی بیٹی اور طغرل بیگ کا نکاح ہو گیا۔

اس نکاح کے بعد طغرل بیگ نے خلیفہ اور خلیفہ کی بیٹی کے لیے مال اور اسباب اور زر و جواہر ہدیۃً بھیجے اور اپنی فوت شدہ بیوی کی تمام جاگیریں سیدہ بنت خلیفہ قائم بامراللہ کے نام منتقل کر دیں۔ اس کے بعد محرم سنہ۴۵۵ھ میں سلطان طغرل بیگ آرمینیا سے بغداد کی جانب روانہ ہوا اور شہزادی کی رخصتی عمل میں آئی۔ طغرل بیگ ماہ ربیع الاول تک بغداد میں رہا۔ اس کے بعد بلاد جبل کی طرف مع اپنی بیوی سیدہ خاتون کے روانہ ہوا۔ جس وقت رے میں پہنچا، بیمار ہو گیا اور ۸ رمضان سنہ۴۵۵ھ کو فوت ہو گیا۔

طغرل بیگ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ سلیمان بن داؤد، چغری بیگ طغرل کا بھتیجا تھا اور ربیب بھی تھا۔ اسی کو عمید الملک نے تخت نشین کیا مگر لوگوں نے اس کی مخالفت کی اور خطبہ میں سلیمان کے بھائی الپ ارسلان بن داؤد چغری بیگ کا نام پڑھا، جو خراسان کا والی اور مرو میں مقیم تھا۔ الپ ارسلان نے یہ سن کر مرو سے رے پر چڑھائی کی۔ عمید الملک نے حاضر ہو کر اظہار اطاعت کے بعد بیعت کی مگر الپ ارسلان، عمید الملک کی طرف سے اندیشہ مند ہی رہا۔ آخر اس نے سنہ۔۴۵۶ھ میں عمید الملک کو قید کر دیا اور اپنے وزیر نظام الملک طوسی کو وزیراعظم بنایا۔ رے میں داخل ہو کر الپ ارسلان نے سیدہ بنت خلیفہ کو بڑی احتیاط اور تکریم کے ساتھ بغداد کی جانب روانہ کیا۔ بغداد میں سلطان الپ ارسلان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

نظام الملک طوسی، سلطان الپ ارسلان کی طرف سے ۷ جمادی الاول سنہ۴۵۶ھ کو بغداد میں خلیفہ کی بیعت کے لیے حاضر ہوا۔ خلیفہ نے دربار عام منعقد کیا۔ نظام الملک کو کرسی پر بٹھایا اور ضیاء الدولہ کا خطاب دیا اور سلطان الپ ارسلان کو ''الوالدالموید'' کا خطاب عطا ہوا۔ سنہ۴۶۰ھ میں خلیفہ نے فخر الدولہ بن جہیر کو وزارت سے معزول کیا مگر ماہ صفر سنہ۴۶۱ھ میں دوبارہ قلمدان وزارت عطا ہوا۔ سنہ۴۶۲ھ میں محمد بن ابی ہاشم والی مکہ نے عبیدی مصری کا نام خطبہ سے نکال کر خلیفہ قائم بامراللہ اور سلطان الپ ارسلان کا نام خطبہ میں داخل کیا اور اذان سے ''حی علیٰ خیر العمل'' کو خارج کیا اور اپنے بیٹے کو بہ طور وفد سلطان الپ ارسلان کی خدمت میں روانہ کیا۔ سلطان نے خوش ہو کر خلعت عطا کیا۔ تیس ہزار دینار بطور انعام دیے اور دس ہزار سالانہ تنخواہ مقرر کی۔

سنہ ۴۶۳ھ میں حلب کے اندر بھی خلیفہ قائم بامراللہ اور سلطان الپ ارسلان کا خطبہ پڑھا گیا۔ سنہ ۴۶۲ھ میں قیصر روم ارمانوس نے دو لاکھ فوج سے صوبہ خلاط پر حملہ کیا۔ قیصر ارمانوس کے ہمراہ فرانس اور روس کے بادشاہ بھی تھے۔ سلطان الپ ارسلان نے صرف پندرہ ہزار فوج سے اس دو لاکھ کے لشکر عظیم کو شکست دی۔ روس کے بادشاہ کو گرفتار کر کے اس کے کان اور ناک کاٹ لیے۔ ارمانوس کو گرفتار کر کے اور اطاعت وفرماں برداری کا اقرار لے کر چھوڑ دیا۔ رومیوں کو ایسی عظیم الشان شکست دینے کے بعد سلطان الپ ارسلان نے سنہ ۴۶۵ھ میں ماوراء النہر کا قصد کیا۔ دریائے جیحون کا پل باندھا گیا۔ بیس دن میں سلطانی لشکر نے اس پل کے ذریعہ سے دریا کو عبور کیا۔ ایک قلعہ دار یوسف خوارزمی مجرمانہ حیثیت سے سلطان کے دربار میں پیش کیا گیا۔ سلطان نے کہا کہ اسے چھوڑ دو، میں اس کو تیر کا نشانہ بناؤں گا۔ اتفاقاً تیر خطا ہو گیا۔ یوسف نے دوڑ کر سلطان کو خنجر مارا۔ سلطان زخمی ہوا، حاضرین دربار نے یوسف کو مار ڈالا مگر سلطان اس زخم کے صدمہ سے ۱۰ ربیع الاول سنہ ۴۶۵ھ کو فوت ہو گیا۔ اس کی لاش مرو میں لا کر دفن کی گئی۔ اس کا بیٹا ملک شاہ باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔ خلیفہ قائم بامراللہ نے ملک شاہ کے پاس عہدنامہ اور لوائے سلطنت بھیج دیا۔ ۱۵ شعبان سنہ ۴۶۷ھ کو خلیفہ قائم بامراللہ نے فصد کھلوائی، اس کے بعد سو گیا۔ اتفاقاً رگ نشتر زدہ سے پھر خون جاری ہو گیا اور اس قدر خون جسم سے خارج ہو گیا کہ امید زیست منقطع ہو گئی۔ اسی وقت اراکین سلطنت بلوائے گئے اور خلیفہ قائم بامراللہ کے پوتے ابوالقاسم عبداللہ بن ذخیرۃ الدین محمد بن قائم بامراللہ کی ولی عہدی کی بیعت لی گئی۔ دوسرے دن خلیفہ کا انتقال ہوا۔ قائم بامراللہ کا صرف ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام ذخیرۃ الدین محمد تھا۔ وہ باپ کے سامنے ہی فوت ہو گیا تھا۔ اس کی وفات کے چھ ماہ بعد اس کا بیٹا ابوالقاسم عبداللہ پیدا ہوا تھا۔ ابوالقاسم نے تخت خلافت پر جلوس کیا اور ''مقتدی بامراللہ'' کا لقب اختیار کیا۔ خلیفہ قائم بامراللہ نے ۴۵ سال خلافت کی۔

مقتدی بامراللہ

ابوالقاسم عبداللہ مقتدی بامراللہ بن محمد بن قائم بامراللہ ایک ام ولد ارغوان نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ انیس سال تین ماہ کی عمر میں تخت خلافت پر بیٹھا۔ تخت خلافت پر بیٹھتے ہی لہو ولعب اور

گانے بجانے کی ممانعت کے احکام جاری کیے۔ اس کے زمانہ میں خلافت کے رعب واقتدار نے ترقی کی۔ یہ خلیفہ نہایت متقی، دین دار اور عالی ہمت تھا۔ شعبان سنہ۴۶۷ھ میں دمشق کو فتح کر کے خلیفہ مقتدی اور سلطان ملک شاہ کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اذانوں سے ''حی علیٰ خیر العمل'' کو خارج کیا اور رفتہ رفتہ تمام ملک شام پر قبضہ کر لیا۔ سنہ۴۶۹ھ میں بغداد کے اندر اشاعرہ اور حنابلہ کے درمیان سخت فساد برپا ہوا۔ بہت سے آدمی طرفین سے مجروح ومقتول ہوئے، پھر یہ فساد فرو ہو گیا۔ سنہ۴۷۰ھ میں ملک شاہ نے اپنے بھائی تاج الدولہ تتش کو شام کا ملک جاگیر میں دیا اور یہ بھی اجازت دی کہ جس قدر ملک حاکم مصر کے قبضے سے نکال کر اپنے قبضہ میں لاؤ، وہ بھی اپنی جاگیر میں شامل سمجھو۔

سنہ۴۷۰ھ میں تاج الدولہ نے حلب کا محاصرہ کیا۔ مصری فوج نے آ کر دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ اتسز نے محصور ہو کر تتش سے امداد طلب کی۔ وہ حلب سے محاصرہ اٹھا کر دمشق آیا۔ مصری یہ خبر سن کر بھاگ گئے، تاج الدولہ تتش نے اتسز کو اس غفلت کے الزام میں قتل کرا دیا۔ سنہ۴۷۶ھ میں خلیفہ مقتدی نے عمید الدولہ بن فخر الدولہ بن جبیر کو وزارت سے معزول کر کے ابوشجاع محمد بن حسن کو وزیر بنایا۔ ملک شاہ نے عمید الدولہ کو طلب کر کے دیار بکر کی حکومت پر مامور کیا۔

شعبان سنہ۴۷۷ھ میں سلیمان بن قتلمش سلجوقی والی قونیہ نے انطاکیہ کو رومیوں کے قبضہ سے چھین لیا۔ انطاکیہ سنہ۳۵۸ھ سے رومیوں کے قبضے میں چلا آتا تھا۔ سنہ۴۷۹ھ میں یوسف بن تاشفین والی مراکش نے خلیفہ مقتدی کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ جس قدر ملک میرے قبضے میں ہے، اس کی سند مجھ کو دے کر سلطان کا لقب عطا کیا جائے۔ خلیفہ مقتدی نے اس درخواست کو منظور کر کے اس کے پاس خلعت وعلم روانہ کیا اور ''امیر المسلمین'' کا خطاب عطا فرمایا۔ اسی یوسف بن تاشفین نے شہر مراکش کی بنیاد رکھی تھی۔ ماہ ذوالحجہ سنہ۴۷۹ھ میں سلطان ملک شاہ پہلی مرتبہ داخل بغداد ہوا۔ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر خلعت حاصل کیا۔ اگلے روز خلیفہ کے ساتھ چوگان کھیلا۔

وزیر نظام الملک نے اپنے مدرسہ نظامیہ کا معائنہ کیا۔ سلطان ملک شاہ ایک مہینہ بغداد میں رہ کر اصفہان کی طرف روانہ ہوا۔ سنہ۴۸۱ھ میں ابراہیم بن مسعود بن محمود بن سبکتگین غزنوی فوت ہوا۔ اس کی جگہ جلال الدین مسعود تخت نشین ہوا۔ سنہ۴۸۴ھ میں فرنگیوں نے تمام جزیرہ صقلیہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ جزیرہ سب سے پہلے مسلمانوں نے سنہ۲۰۰ھ میں فتح کیا تھا۔ جزیرہ پر اول بنو اغلب حکمران

رہے، پھر عبیدیوں کا قبضہ ہوا۔ عبیدیوں سے فرنگیوں نے چھین لیا۔ اسی سال یعنی سنہ ۴۸۴ھ میں ماہ رمضان میں سلطان ملک شاہ دوبارہ وارد بغداد ہوا۔

مجلس مولود:

سنہ ۴۸۵ھ میں ملک شاہ سلجوقی نے بغداد میں مجلس مولود بڑی دھوم دھام سے منعقد کی۔ اسی سال مقام نہاوند میں ماہ رمضان سنہ ۴۸۵ھ میں وزیر نظام الملک طوسی ایک قرمطی کے ہاتھ ستتر برس کی عمر میں مقتول ہوا۔

اسی سال یعنی ۱۵ شوال سنہ ۴۸۵ھ کو ملک شاہ سلجوقی نے وفات پائی اور اس کے بعد سلطان ملک شاہ کی بیوی ''ترکان خاتون'' اور اس کے بیٹے برکیارق میں لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ سنہ ۴۹۶ھ میں برکیارق لڑائیوں سے فارغ ہو کر بغداد آیا۔ خلیفہ مقتدی نے رکن الدولہ کا خطاب دے کر خلعت نیابت وسلطانی عطا فرمایا۔ کہتے ہیں کہ ملک شاہ کی موت خلیفہ مقتدی کی بددعا کا نتیجہ تھا یعنی ملک شاہ نے خلیفہ سے کہا تھا کہ آپ بغداد چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے جائیں تاکہ بغداد کو میں بلا شرکت غیرے اپنا دارالسلطنت بناؤں۔ خلیفہ نے بہ مشکل آٹھ روز کی مہلت حاصل کی اور رات دن ملک شاہ کے لیے بددعا میں مصروف رہا۔ آٹھ دن پورے نہ ہونے پائے تھے کہ ملک شاہ فوت ہوا اور خلیفہ اس مصیبت سے بچ گیا۔

۵ محرم سنہ ۴۸۷ھ کو خلیفہ مقتدی بامراللہ نے یکا یک وفات پائی۔ کہتے ہیں کہ ایک پرستار شمس النہار نامی نے اس کو زہر دیا تھا۔ خلیفہ مقتدی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوالعباس احمد تخت نشین ہوا اور مستظہر باللہ کا لقب اختیار کیا۔

مستظہر باللہ

ابوالعباس احمد مستظہر باللہ بن مقتدی باللہ ماہ شوال سنہ ۴۷۰ھ میں پیدا ہوا اور اپنے باپ کے بعد بہ عمر سولہ سال تخت نشین ہوا۔ مقتدی کی وفات کے وقت برکیارق بغداد میں موجود تھا۔ اس نے بطیب خاطر مستظہر باللہ کی بیعت کی۔

خلیفہ مقتدی کی وفات کے تیسرے روز مجلس عزا منعقد ہوئی اور سلطان برکیارق مع اپنے وزیر

عزالملک بن نظام الملک اور اس کے بھائی بہاؤ الملک کے حاضر دربار خلافت ہوا اور دوسرے اراکین بھی ماتم پرستی کو آئے۔ سنہ ۴۸۸ھ میں احمد خاں والی سمرقند اپنی بدمذہبی کی وجہ سے گرفتار ہو کر مقتول ہوا اور اس کی جگہ اس کا چچیرا بھائی تخت سلطنت پر بیٹھا۔

اسی سال تتش اور برکیارق میں رے کے قریب جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں برکیارق کے ہاتھ سے تتش مارا گیا اور برکیارق کی حکومت کو خوب استحکام حاصل ہو گیا۔ برکیارق کے بھائی محمد نے قوت حاصل کر کے خراسان پر قبضہ کر لیا۔ برکیارق اس کے مقابلہ کو گیا۔ سنہ ۴۹۲ھ کو بہ مقام رے جنگ ہوئی۔ برکیارق شکست کھا کر خوزستان چلا گیا۔ محمد بن ملک شاہ نے بغداد میں داخل ہو کر ۱۵ ذوالحجہ سنہ ۴۹۲ھ کو خلیفہ مستظہر باللہ سے غیاث الدنیا والدین کا خطاب حاصل کیا، پھر خراسان کی طرف چلا گیا۔ برکیارق نے خوزستان سے واسط پہنچ کر لشکر جمع کیا اور ۱۵ صفر سنہ ۴۹۳ھ کو وارد بغداد ہوا۔ خلیفہ نے مبارک باد دی۔ خلعت عطا کیا اور پھر برکیارق کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ اس کے بعد برکیارق نے محمد بن ملک شاہ پر حملہ کیا۔ ہمدان کے قریب نہر ابیض کے کنارے لڑائی ہوئی اور برکیارق کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد ۱۵ رجب سنہ ۴۹۳ھ کو پھر بغداد میں سلطان محمد کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ برکیارق نے شکست پا کر رے میں قیام کیا۔ یہاں سے اصفہان، پھر وہاں سے خوزستان گیا۔ وہاں سے فوج فراہم کر کے یکم جمادی الثانی سنہ ۴۹۴ھ کو محمد سے پھر جنگ آزمائی کی۔ اس کو شکست دے کر رے میں آیا۔ محمد اپنے حقیقی بھائی سنجر کے پاس جرجان چلا گیا۔ آخر ۱۵ ذیقعدہ سنہ ۴۹۴ھ کو برکیارق بغداد میں پہنچا اور اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

غرض سلطان برکیارق اور اس کے بھائی سلطان محمد کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی بغداد میں ایک کی حکومت ہوتی، کبھی دوسرے کی، کبھی صلح ہو جاتی اور پھر فوراً ہی لڑائی ہونے لگتی۔ اس مسلسل و پیہم لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام عراق و فارس و جزیرہ وغیرہ ممالک کا امن و امان جاتا رہا اور لوگوں کو اپنی عزتوں اور جانوں کا بچانا دشوار ہو گیا۔ جمادی الاول سنہ ۴۹۷ھ میں دونوں بھائیوں کے درمیان امراء لشکر کی کوششوں سے ایک صلح نامہ مرتب ہوا اور دونوں کے درمیان ملک تقسیم ہو گئے۔ ساتھ ہی یہ شرط بھی دونوں نے منظور کر لی کہ دونوں کے مقبوضہ ممالک میں دونوں کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ اس صلح نامہ کی رو سے بغداد کی حکومت سلطان برکیارق کے پاس رہی۔ اس صلح نامہ کے بعد چند روز برکیارق اصفہان میں مقیم رہا۔ وہاں سے بغداد کی طرف آ رہا تھا

کہ راستہ میں بہ مقام یزد جرد علیل ہو کر ماہ ربیع الثانی سنہ ۴۹۸ھ میں انتقال کیا۔ مرتے وقت اس نے اپنے بیٹے ملک شاہ بن برکیارق کو اپنا ولی عہد اور امیر ایاز کو اس کا اتالیق بنایا۔

ملک شاہ کی عمر اس وقت صرف پانچ سال کی تھی۔ برکیارق کے جنازہ کو اصفہان میں لے جا کر دفن کیا گیا۔ امیر ایاز، ملک شاہ کو لے کر ۱۵ ربیع الثانی سنہ ۴۹۸ھ میں داخل بغداد ہوا۔ خلیفہ نے ملک شاہ کو وہ تمام خطابات جو اس کے دادا ملک شاہ بن الپ ارسلان کو حاصل تھے، عطا کیے اور اس کے نام کا خطبہ بغداد میں پڑھا گیا۔ اس کے بعد سلطان محمد نے موصل پر قبضہ کر کے بغداد کا رخ کیا۔ سنہ ۵۰۱ھ میں داخل بغداد ہوا۔ امیر ایاز کو قتل کیا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ سنہ ۵۰۲ھ میں سلطان محمد نے بغداد میں اپنے لیے ایک قصر تیار کرایا۔ اب سلطان محمد بن ملک شاہ کی حکومت پورے طور پر اپنے آبائی ممالک پر قائم ہوگئی اور فتنہ وفساد دور ہوئے۔ ماہ شعبان سنہ ۵۱۱ھ میں سلطان محمد بیمار ہوا۔ مرض نے طول کھینچا۔ آخر ذوالحجہ سنہ ۵۱۱ھ میں سلطان محمد بن ملک شاہ نے وفات پائی اور اس کا بیٹا سلطان محمود باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔

خلیفہ نے اس کی تخت نشینی کو قبول ومنظور فرما کر خلعت عطا کیا اور ۱۵ محرم سنہ ۵۱۲ھ کو مسجدوں میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اس کے بعد ۱۵ ربیع الآخر سنہ ۵۱۲ھ کو خلیفہ مستظہر باللہ نے چوبیس سال تین مہینے خلافت کرنے کے بعد وفات پائی اور اس کا بیٹا ابومنصور فضل تخت نشین ہوا اور اپنا لقب مسترشد باللہ رکھا۔

مسترشد باللہ

مسترشد باللہ بن مستظہر باللہ ربیع الاول سنہ ۴۸۵ھ میں پیدا ہوا اور بعمر ۲۷ سال اپنے باپ کے بعد سنہ ۵۱۲ھ ۱۵ ربیع الآخر کو تخت نشین ہوا۔ خلیفہ مسترشد کے بھائی امیر ابوالحسن بن مستظہر نے بیعت نہیں کی اور بغداد سے واسط چلا گیا۔ سال بھر کے بعد گرفتار ہو کر آیا اور خلیفہ نے اس کا قصور معاف کر کے قصر خلافت میں ٹھہرایا۔ خلیفہ مسترشد کی تخت نشینی کے دوسرے مہینے مسعود بن سلطان محمد سلجوقی برادر سلطان محمود نے جو موصل میں مقیم تھا، خروج کیا اور اپنے ساتھ قسیم الدولہ زنگی بن آقسنقر والی بخارا اور ابوالہیجا والی اربل کو بھی ملایا اور بغداد میں آ کر اپنا عمل دخل بڑھایا۔ ادھر سلطان محمود کا

تیسرا بھائی سلطان طغرل بن سلطان محمد اپنے باپ کے زمانے سے زنجان کا حاکم تھا، سلطان محمود نے ملک طغرل پر چڑھائی کی، ملک طغرل زنجان سے بھاگ گیا۔ سلطان محمود نے زنجان کو لوٹ لیا۔

جب سلطان محمد کا انتقال ہوا اور سلطان محمود تخت نشین ہوا تو اس نے سلطان محمد کا بھائی یعنی سلطان محمود کا چچا سنجر ماوراء النہر کا حاکم تھا۔ سلطان سنجر کا لقب پہلے ناصرالدین تھا، سلطان محمد کے انتقال کے بعد سلطان سنجر نے ماوراء النہر کے ہمراہ امیر ابوالفضل والی سجستان، خوارزم شاہ محمد امیر نزد اور علاؤالدولہ یزد وغیرہ سردار بھی تھے۔ اس معرکہ میں سلطان محمود کو شکست اور سلطان سنجر کو فتح حاصل ہوئی اور اس نے بڑھ کر ہمدان پر قبضہ کیا۔ یہ خبر جب بغداد میں پہنچی تو یہاں سلطان سنجر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

سلطان محمود نے بعد شکست اصفہان میں جا کر دم لیا۔ آخر سلطان سنجر کی ماں نے کوشش کر کے دونوں میں صلح کرا دی۔ شرط یہ قرار پائی کہ سلطان سنجر سلطان محمود کو اپنا ولی عہد تسلیم کرے اور خطبوں میں سنجر کے بعد محمود کا نام لیا جائے۔ چنانچہ اس شرط کے موافق سلطان سنجر نے ماوراء النہر، غزنہ، خراسان وغیرہ اپنے ممالک میں سلطان محمود کی ولی عہدی کے فرامین بھیج دیے۔ صرف رے کا علاقہ سلطان سنجر نے سلطان محمود کے مقبوضہ ممالک سے اپنے قبضہ میں لے کر باقی تمام ممالک پر اس کی حکومت کو تسلیم کیا۔ ادھر سلطان محمود نے اپنے بھائی سلطان مسعود سے صلح کر کے اس کو موصل وآذربائیجان کے صوبے دے دیے اور اس نے موصل کو اپنا مستقر حکومت بنایا۔

سنہ ۵۱۳ھ میں سلطان محمود نے اپنی خودمختاری اور سلطان محمود کی مخالفت کا علم بلند کیا۔ ۱۵ ربیع الاول سنہ ۵۱۴ھ کو دونوں بھائیوں میں لڑائی ہوئی۔ مسعود کو شکست ہوئی اور موصل کے قریب جا کر پہاڑوں میں پناہ لی۔ امراء نے درمیان میں پڑ کر دونوں بھائیوں میں صلح کرا دی۔ سلطان محمود ماہ رجب سنہ ۵۱۴ھ میں بغداد واپس آ گیا اور سلطان مسعود پھر موصل میں حکومت کرنے لگا۔ سنہ ۵۱۵ھ میں سلطان محمود نے موصل کی حکومت آقسنفر برسقی کو دی اور مسعود کے پاس آذربائیجان کا صوبہ رہا۔

سلطان طغرل کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ وہ سلطان محمود سے شکست کھا کر گنجہ میں چلا آیا تھا۔ سنہ ۵۱۶ھ میں سلطان محمود اور سلطان طغرل کے درمیان صلح نامہ لکھا گیا۔ اس کے بعد سلطان محمود نے آقسنفر برسقی کو موصل کے علاوہ واسط کا علاقہ بھی جاگیری میں دے دیا۔ آقسنفر برسقی نے اپنی طرف سے قسیم الدولہ عمادالدین زنگی بن آقسنفر کو واسط کی حکومت پر مامور کیا۔ سنہ ۵۱۷ھ میں

سلطان محمود نے اپنے وزیر شمس الملک کو قتل کر دیا اور شمس الملک کے بھائی نظام الدولہ کو خلیفہ مسترشد نے اپنی وزارت سے معزول کیا۔ ماہ ذوالحجہ سنہ ۵۱۷ھ میں خلیفہ مسترشد نے خود فوج تیار کر کے دبیس بن صدقہ کی سرکوبی کے لیے بغداد سے کوچ کیا۔ موصل و واسط کی فوجیں بھی خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ مقام مبارکہ میں لڑائی ہوئی، اس لڑائی میں عمادالدین زنگی بن آقسنقر والی واسط نے بڑی بہادری اور جان فروشی دکھائی اور خلیفہ منصور نے فتح پائی۔ ۱۰ محرم سنہ ۵۱۸ھ کو خلیفہ مظفر و منصور بغداد میں داخل ہوا۔ یہ غالباً پہلی جنگ تھی جو عرصہ دراز کے بعد عباسی خلیفہ کی سپہ سالاری میں ہوئی۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ دبیس بن صدقہ بصرہ کو لوٹنا چاہتا تھا۔ چنانچہ عمادالدین زنگی بن آقسنقر بصرہ کی حفاظت کے لیے مامور ہو کر روانہ ہوا اور دبیس وہاں سے ناکام و نامراد ہو کر ملک طغرل بن سلطان محمد کے پاس چلا گیا۔ اسی سال یعنی سنہ ۵۱۸ھ میں آقسنقر برسقی نے جو شحنہ عراق مقرر ہو چکا تھا اور موصل میں رومیوں کے حملوں کو روکنے کی تدابیر میں مصروف تھا، عمادالدین زنگی بن آقسنقر کو بصرہ کی حکومت سے اپنے پاس موصل طلب کیا۔ عمادالدین زنگی بصرہ سے روانہ ہو کر موصل تو نہیں گیا بلکہ سلطان محمود کے پاس اصفہان پہنچا۔ سلطان محمود نے وہاں سے اس کو بصرہ کی سند حکومت دے کر بصرہ کی طرف واپس کر دیا۔ دبیس بن صدقہ جب سلطان طغرل کے پاس پہنچا تو اس نے اس کو اپنے مصاحبین میں داخل کر لیا۔ دبیس نے طغرل کو ابھار کر عراق پر چڑھائی کرا دی۔ سنہ ۵۱۹ھ کو فوج لے کر بغداد سے بہ غرض مقابلہ کوچ کیا۔ نہروان میں مقابلہ ہوا مگر دبیس اور طغرل دونوں خراسان میں سلطان سنجر کے پاس پہنچے۔ رجب سنہ ۵۲۰ھ میں یرنقش زکوی کوتوال بغداد سلطان محمود کے پاس اصفہان پہنچا اور کہا کہ خلیفہ مسترشد نے فوجیں مرتب کر لی ہیں۔ سامان جنگ بھی کافی فراہم ہے اور مالی حالت بھی خلیفہ کی کافی اچھی ہو گئی ہے۔ اندیشہ ہے کہ خلیفہ قابو سے نہ نکل جائے۔ یہ سن کر سلطان محمود نے فوجیں آراستہ کر کے خود بغداد کی جانب کوچ کیا۔ خلیفہ مسترشد نے جب یہ سنا کہ سلطان محمود بغداد کی جانب آ رہا ہے تو اس کو لکھا کہ تمہارے اس طرف آنے کی ضرورت نہیں۔ تم دبیس وغیرہ کے سرکشوں کی سرکوبی کے لیے واپس جاؤ۔ اس سے سلطان محمود کا شبہ یقین کے درجہ کو پہنچ گیا اور اس نے سمجھا کہ خلیفہ ضرور میرے اثر و اقتدار سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ اور بھی تیزی سے بغداد کی جانب سفر طے کرنے لگا۔ ۱۷ ذی الحجہ سنہ ۵۲۰ھ کو سلطان محمود بغداد میں داخل ہوا اور خلیفہ غربی بغداد میں چلا گیا۔ یکم محرم سنہ ۵۲۱ھ کو سلطان محمود کے ہمراہیوں نے

قصر خلافت کو لوٹا۔ اہل بغداد تیس ہزار کی تعداد میں خلیفہ مسترشد کے پاس جمع ہو گئے۔ دریائے دجلہ کے ساحل پر لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ بہت سی لڑائیوں اور زور آزمائیوں کے بعد خلیفہ اور سلطان محمود میں صلح ہوگئی۔ ربیع الثانی سنہ ۵۲۱ھ کو سلطان محمود بغداد سے ہمدان کی جانب روانہ ہوا اور عماد الدین زنگی کو بصرہ کی حکومت سے بلا کر بغداد کی شحنگی پر مامور کیا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ دبیس اور طغرل دونوں سنجر کے پاس خراسان پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے سنجر کو خلیفہ مسترشد اور سلطان محمود کی طرف سے برافروختہ و بدگمان کرنے کی کوشش کی۔ آخر سلطان سنجر خراسان سے فوجیں لے کر رے کی جانب روانہ ہوا۔ رے پہنچ کر سلطان محمود کو ہمدان سے اپنے پاس ملاقات کے لیے بلوایا۔ اس طلبی سے مدعا یہ تھا کہ اگر سلطان محمود مخالف نہیں ہوا تو چلا آئے گا، ورنہ انکار کرے گا۔ چنانچہ سلطان محمود اپنے چچا سنجر کے پاس بلاتوقف چلا گیا۔ سنجر نے بڑی عزت کا برتاؤ کیا اور دبیس کی سفارش کر کے محمود کے ساتھ کر دیا۔ محمود دبیس کو ہمراہ لے کر ہمدان واپس آیا اور ۹ محرم سنہ ۵۲۳ھ کو مع دبیس بغداد میں داخل ہوا۔ دربار خلافت میں دبیس کو پیش کر کے عفو تقصیر کی سفارش کی۔ خلیفہ نے دبیس کی خطا معاف کر دی۔ سلطان محمود نے بغداد کی شحنگی پر بہروز کو مامور کیا اور عماد الدین زنگی کو موصل کی گورنری پر مامور کر کے بھیج دیا۔ جمادی الثانی سنہ ۵۲۳ھ میں سلطان محمود بغداد سے ہمدان کی جانب روانہ ہوا۔ دبیس کو موقع مل گیا، اس نے بغداد سے روانہ ہو کر حلہ پر قبضہ کر لیا اور خلیفہ کی مخالفت و بغداد کا علم بلند کیا۔ خلیفہ نے اس کے مقابلہ کے لیے فوج روانہ کی۔ ابھی مقابلہ جاری تھا کہ ذیقعدہ سنہ ۵۲۳ھ کو سلطان محمود بھی دبیس کی سرکشی کا حال سن کر بغداد پہنچ گیا۔ دبیس حلہ چھوڑ کر بصرہ کی طرف روانہ ہوا۔ بصرہ کو خوب لوٹ کر پہاڑوں میں جا چھپا اور سلطان محمود ہمدان واپس چلا گیا۔ سنہ ۵۲۵ھ میں شوال کے مہینے میں سلطان محمود نے انتقال کیا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا داؤد تخت نشین ہوا۔ بلاد جبل وآذربائیجان میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ ماہ ذیقعدہ سنہ ۵۲۵ھ میں داؤد نے ہمدان سے زنجان کی جانب کوچ کیا۔ اسی اثنا میں خبر سنی کہ سلطان محمود نے جرجان سے آ کر تبریز پر قبضہ کر لیا ہے۔ داؤد نے فوراً تبریز کی جانب کوچ کیا اور محرم سنہ ۵۲۶ھ میں تبریز کا محاصرہ کر لیا۔ چچا بھتیجے میں لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ آخر دونوں میں مصالحت ہوگئی۔ داؤد تبریز سے ہمدان چلا آیا۔ مسعود نے تبریز سے نکل کر لشکر فراہم کرنا شروع کیا اور جب ایک عظیم الشان لشکر فراہم ہو گیا تو خلیفہ مسترشد کے پاس بغداد میں پیغام بھیجا کہ میرے نام کا خطبہ پڑھوایا جائے۔ خلیفہ نے جواب دیا

کہ فی الحال خطبہ میں سلطان سنجر کا نام لیا جاتا ہے۔ تمہارا اور داؤد دونوں کا نام فی الحال نہیں لیا جائے گا۔ اسی عرصہ میں سلجوق شاہ ابن سلطان محمد نے فوج فراہم کر کے بغداد میں آ کر قیام کیا۔ خلیفہ نے اس کے ساتھ عزت کا برتاؤ کیا۔ ادھر عمادالدین زنگی، سلطان مسعود کے پاس پہنچا۔ سلطان مسعود اور عمادالدین زنگی دونوں بغداد کی طرف روانہ ہوئے اور مقام عباسیہ میں قیام کیا۔ سلجوق شاہ نے مقابلہ کی تیاری کی اور قراجا ساقی کو مقابلہ پر روانہ کیا۔ ادھر سے عمادالدین زنگی مقابلہ پر آیا۔ ایک خوں ریز جنگ کے بعد زنگی کے لشکر کو شکست ہوئی۔ عمادالدین زنگی شکست کھا کر تکریت کی طرف گیا۔ تکریت میں ان دنوں نجم الدین ایوب پدر سلطان صلاح الدین حاکم تھا۔ اس نے عمادالدین زنگی کے اترنے کو کشتیاں بھی فراہم کیں اور پل بھی بندھوایا۔ زنگی نے دریا کو عبور کر کے موصل کا راستہ لیا۔ سلطان مسعود نے خط و کتابت شروع کر کے سلجوق شاہ اور خلیفہ کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ عراق کی حکومت سلطان مسعود کے قبضے میں رہے اور عراق کی حکومت و سلطنت کے علاوہ خطبہ میں سلطان مسعود کے بعد سلجوق شاہ کا نام لیا جائے۔ اس قرارداد کے موافق سلطان مسعود جمادی الاولیٰ سنہ ۵۲۶ھ میں داخل بغداد ہوا اور صلح نامہ لکھا گیا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ سلطان طغرل اپنے چچا سلطان سنجر کے ہمراہ ہے۔ دبیس جو پہاڑوں میں جا چھپا تھا، وہ بھی سلطان سنجر کے پاس پہنچ گیا ہے۔ اب ان حالات سے مطلع ہو کر سلطان سنجر مع طغرل و دبیس رے کی طرف بڑھا۔ وہاں سے ہمدان کی طرف چلا۔ ادھر سے مسعود شاہ اور سلجوق شاہ مع قراجا ساقی سنجر کی روک تھام کے لیے بغداد سے روانہ ہوئے۔ سنجر نے استرآباد سے آگے بڑھ کر مسعود و سلجوق شاہ کا مقابلہ کیا اور اس کو شکست دے کر بھگا دیا۔ سلطان سنجر نے مسعود و سلجوق کی خطا معاف کر دی اور ان کو اپنے پاس بلا کر عزت و احترام سے رکھا اور اپنے بھتیجے طغرل کو عراق کی حکومت سپرد کی اور اس کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ اسی اثناء میں یعنی ذوالحجہ سنہ ۵۲۷ھ میں خبر پہنچی کہ والی ماوراء النہر نے علم بغاوت بلند کر کے فوجی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ ملک سنجر کو فوراً خراسان کی طرف روانہ ہونا پڑا۔ اس زمانے میں سلطان داؤد بن محمود بلاد آذربائیجان کی طرف تھا، وہ فوجیں فراہم کر کے ہمدان کی طرف بڑھا۔ ادھر سے طغرل مقابلہ پر پہنچا۔ داؤد کو شکست ہوئی اور وہ شکست کھا کر بغداد کی طرف گیا۔ سلطان مسعود بھی سلطان سنجر سے رخصت ہو کر بغداد کو آیا۔ داؤد و مسعود دونوں نے مل کر خلیفہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم کو صوبہ آذربائیجان پر قبضہ کر لینے کی اجازت ہو، اجازت ہوئی اور دونوں نے ملک طغرل کے

اہل کاروں کو نکال کر آذربائیجان پر قبضہ کرلیا۔ طغرل مقابلہ پر آیا مگر شکست کھا کر بھاگا۔ سلطان مسعود نے ہمدان پر قبضہ کرلیا اور سلطان داؤد آذربائیجان پر متصرف رہا۔ سلطان مسعود کو ہمدان میں معلوم ہوا کہ سلطان داؤد نے آذربائیجان میں خودمختاری وسرکشی کا اعلان کردیا ہے۔ اس لیے وہ آذربائیجان کی طرف روانہ ہوا۔ ملک طغرل نے موقع پا کر فوجیں فراہم کیں اور بلادجبل کو فتح کرنا شروع کیا۔ سلطان مسعود مقابلہ پر آیا۔ طغرل نے مسعود کو ماہ رمضان سنہ ۵۲۸ھ میں شکست دے کر بھگا دیا۔ سلطان مسعود شکست کھا کر بغداد آیا اور طغرل ہمدان میں آ کر مقیم ہوا۔ غرض سلجوقیوں کی آپس کی خانہ جنگی کا قصہ بہت طویل اور بے مزہ ہے۔ سلطان طغرل فوت ہوا اور سلطان مسعود عراق پر قابض ہو متصرف ہوا۔ خلیفہ مسترشد اور سلطان مسعود کی ان بن ہوگئی۔ خلیفہ مقابلہ کے لیے نکلا، دونوں فوجوں نے خوب جدال وقتال کیا۔ خلیفہ کے لشکر نے نمک حرامی کی اور خلیفہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ خلیفہ نے شکست کھائی اور ہمدان کے ایک قلعہ میں قید کردیا گیا۔ یہ خبر بغداد میں پہنچی تو اہل بغداد میں غمناک شور برپا ہوگیا۔ انہیں ایام میں متواتر عراق وخراسان میں کئی روز تک زلزلے آتے رہے۔ سلطان سنجر نے اپنے بھتیجے سلطان مسعود کو لکھا کہ تم خود خلیفہ کے پاس جاؤ اور معافی مانگو۔ یہ زلزلہ کا آنا اور لوگوں کا مسجدوں میں نمازوں کے لیے نہ آنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ امیرالمومنین کو نہایت عزت وحرمت کے ساتھ دارالخلافہ بغداد میں پہنچاؤ۔ سلطان مسعود نے سلطان سنجر کے حکم کی تعمیل کی اور خلیفہ کی خدمت میں خود حاضر ہوا۔ جو لشکر سلطان مسعود کے ساتھ تھا، اس میں سترہ آدمی قرامطہ یا باطنی فرقہ کے بھی شامل تھے، جن کی سلطان مسعود کو خبر نہ تھی۔ ان باطنیوں نے خلیفہ کے خیمے میں پہنچ کر خلیفہ پر حملہ کیا اور قتل کر ڈالا۔ خلیفہ کے اس طرح قتل ہونے کا حال جب یکا یک لوگوں کو معلوم ہوا تو باطنیوں کو گرفتار کیا اور وہ سب کے سب قتل کیے گئے۔ سلطان مسعود کو صدمہ ہوا۔ یہ واقعہ ۱۶ ذوالقعدہ سنہ ۵۲۹ھ بروز پنج شنبہ وقوع پذیر ہوا۔ یہ خبر جب بغداد میں پہنچی تو اور بھی حشر برپا ہوگیا اور شہر میں بڑا کہرام مچا اور خلیفہ مسترشد کا بیٹا ابوجعفر منصور تخت خلافت پر بیٹھا اور اس نے اپنا لقب راشد باللہ مقرر کیا۔

راشد باللہ

راشد باللہ بن مسترشد باللہ سنہ ۵۰۰ھ میں ایک ام ولد کے بطن سے پیدا ہوا۔ جب وہ پیدا ہوا تو اس کے پاخانہ کی جگہ نہ تھی۔ طبیبوں نے ایک چاندی کے نشتر سے شگاف دے دیا اور وہ اچھا ہو گیا۔ راشد باللہ بغداد میں تخت نشین ہوا تو سلطان مسعود موجود نہ تھا۔ راشد باللہ کے نام کا خطبہ شہروں میں پڑھا گیا۔ راشد باللہ نے تخت نشین ہونے کے بعد لوگوں سے مال و دولت کے لینے میں کسی قدر ظلم وزیادتی سے کام لیا۔ شاہ مسعود کو لوگوں نے شکایات لکھ کر بھیجیں۔ سلطان مسعود بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ سلطان مسعود کے بغداد کی طرف آنے کی خبر سن کر راشد باللہ موصل کی طرف چلا گیا۔ سلطان مسعود نے بغداد میں داخل ہو کر ایک محضر تیار کرایا۔ اس میں بہت سے لوگوں کی شہادتیں قلم بند کی گئیں، جنہوں نے بیان کیا تھا کہ راشد نے فلاں فلاں اشخاص پر ظلم کیا، زبردستی مال چھینا، خون ریزی کی اور شراب بھی پی۔ یہ محضر علماء اور قضاۃ کی خدمت میں پیش کر کے استفتا کیا گیا کہ خلیفہ اگر ایسے حرکات کا مرتکب ہو تو نائب السلطنت کو اس کی معزولی کا اختیار ہے یا نہیں؟ اس پر قاضی شہر نے فتویٰ لکھ دیا کہ نائب السلطنت ایسے خلیفہ کو معزول کر سکتا ہے۔ چنانچہ سلطان مسعود نے راشد باللہ کے چچا محمد بن مستظہر کو تخت خلافت پر بٹھا کر بیعت کر لی اور راشد کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ یہ واقعہ ۶ ذیقعدہ کا ہے۔ راشد کی خلافت ایک سال رہی۔ محمد بن مستظہر نے تخت خلافت پر بیٹھ کر اپنا لقب مقتفی لامراللہ تجویز کیا۔ راشد کو جب اپنے معزول ہونے کا حال معلوم ہوا تو وہ موصل سے بلاد آذربائیجان کی طرف چلا گیا اور اپنے لشکریوں کو مال و دولت تقسیم کیا۔ آذربائیجان کے شہروں کو لوٹ مار سے برباد کیا۔ وہاں سے ہمدان آیا، یہاں بھی خوب فتنہ وفساد برپا کیا۔ لوگوں کو پکڑ کر سولی چڑھایا، قتل کیا، علماء کی داڑھیاں منڈوائیں۔[1] پھر اصفہان پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ اسی اثناء میں بیمار پڑا اور ۱۶ رمضان سنہ ۵۳۲ھ کو بعض عجمیوں نے آ کر چھریوں سے اسے قتل کر ڈالا۔ بغداد میں راشد کے قتل ہونے کی خبر پہنچی تو اس کے سوگ میں ایک دن کے لیے دفاتر بند کیے گئے۔ چادر اور عصا مرتے وقت راشد کے پاس آئے تھے۔ اس کے قتل ہونے پر یہ دونوں چیزیں مقتفی کے پاس

---

[1] جناب رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق داڑھی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن یہاں خلیفہ نے جبراً علماء کی داڑھیاں مونڈوائیں۔ اسی سے اس دور کے خلفاء کی دینی حالت کا کافی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بغداد پہنچائی گئی تھیں۔

مقتفی لامر اللہ

ابو عبداللہ محمد مقتفی لامر اللہ ۱۲ ربیع الاول سنہ ۴۷۹ھ کو ایک حبشیہ ام ولد کے پیٹ سے پیدا ہوا اور ۱۲ ذوالحجہ سنہ ۵۳۰ھ کو تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد سلطان مسعود نے سلطان داؤد کی سرکوبی وتعاقب کے لیے فوج روانہ کی۔ داؤد نے مقام مراغ میں شکست کھائی اور خوزستان پہنچ کر فوجیں جمع کیں اور تستر کا محاصرہ کر لیا۔ سلجوق شاہ، جو ان دنوں واسط کا حکمران تھا، سلطان مسعود کے حکم سے تستر کو بچانے کے لیے روانہ ہوا مگر داؤد سے شکست کھا کر واپس آیا۔ سلطان مسعود نے اس خیال سے بغداد کو نہ چھوڑا کہ کہیں راشد بغداد پر نہ چڑھ آئے۔ مسعود نے عمادالدین زنگی والی موصل کو لکھا کہ مقتفی کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ عمادالدین نے جب مقتفی کے نام کا خطبہ پڑھا اور راشد کا نام خطبہ سے خارج کر دیا تو راشد ناراض ہو کر موصل سے رجب سنہ ۵۲۱ھ میں چل دیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ فارس میں بعض سرداروں نے راشد کی حمایت کا قصد کر کے راشد کے پاس جانے کا قصد کیا۔ سلطان مسعود نے یہ سن کر بغداد سے کوچ کیا اور ان لوگوں کو شعبان سنہ ۵۳۲ھ میں شکست دے کر پریشان و آوارہ کر دیا اور وہاں سے آذربائیجان کا قصد کیا۔ ادھر داؤد خوارزم شاہ اور راشد نے مل کر عراق کا قصد کیا۔ سلطان مسعود نے یہ سن کر بغداد سے کوچ کیا۔ خوارزم شاہ اور داؤد دونوں راشد سے جدا ہو گئے۔ راشد نے اصفہان کا محاصرہ کیا۔ اسی اثناء میں راشد کو چند خراسانی غلاموں نے قتل کر دیا۔ راشد اصفہان کے باہر مقام شہرستان میں مدفون ہوا۔ ادھر سلجوق شاہ نے واسط سے آ کر بغداد پر قبضہ کیا۔ بڑی بدامنی پیدا ہوئی۔ اہل بغداد نے سلجوق شاہ کو شکست دے کر بغداد سے نکال دیا۔ ملک میں ہر طرف طائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی اور بدامنی یہاں تک ترقی کر گئی تھی کہ سنہ ۵۳۲ھ میں سلطان مسعود نے بغداد میں آ کر بہت سے ٹیکس جو اہل شہر سے وصول کیے جاتے تھے، معاف کر دیے۔ چند سال اسی حالت میں گزرے۔ خاندان سلجوقی سے متعدد افراد کے علاوہ دوسرے سرداروں نے بھی اپنی اپنی خود مختاری کی تدبیریں سوچنی شروع کیں۔ سلطان مسعود نے اپنے خاص سرداروں کو، جن کے بارے میں وہ دل میں میل رکھتا تھا اور جن پر قابو پا سکتا تھا، قتل کرنا شروع کیا۔ کئی سرداروں کو دھوکے سے قتل کرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود بہت کمزور ہو گیا۔

بلاد جبل میں جا کر اس نے اقامت اختیار کی اور بغداد وعراق کو بدامنی کے عالم میں چھوڑا۔ خلیفہ مقتفی نے اس حالت سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہیں کی یعنی خلیفہ نے اپنا اثر واقتدار رفتہ رفتہ قائم کرنا اور اپنی طاقت کو بڑھانا شروع کیا۔ خلیفہ کی طاقت ادھر ترقی کر رہی تھی، ادھر سلطان مسعود اور سلطان سنجر کا اثر بہ تدریج کم ہو رہا تھا۔ سلطان سنجر نے مسعود کو ملامت آمیز خطوط لکھے اور امیروں کو قتل کرنے اور بغداد کے قیام کو ترک کر دینے کی خرابیاں سمجھائیں۔ آخر سنہ ۵۴۴ھ میں سلطان سنجر خود مقام رے میں آیا۔ یہیں سلطان مسعود بھی اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رجب سنہ ۵۴۴ھ میں ملک شاہ بن سلطان محمود نے بعض سرداروں کو ہمراہ لے کر بغداد پر چڑھائی کی۔ خلیفہ مقتفی نے شہر کی قلعہ بندی کر کے مدافعت کی اور سلطان مسعود کو طلب کیا مگر سلطان مسعود رے میں اپنے چچا سنجر کے پاس تھا، وہاں سے نہ آ سکا۔ ملک شاہ بغداد میں تو داخل نہ ہوا مگر نہروان کو خوب لوٹا اور ویران کر دیا۔ اس کے بعد ۱۵ شوال سنہ ۵۴۴ھ کو مسعود وارد بغداد ہوا، پھر سنہ ۵۴۵ھ میں ہمدان چلا گیا۔ یکم ماہ رجب سنہ ۵۴۷ھ کو سلطان مسعود نے وفات پائی۔ اس کی جگہ سلطان مسعود کے وزیر خاص بیگ نے ملک شاہ بن سلطان محمود کو تخت نشین کیا مگر سلطان مسعود کے مرنے کے بعد خاندان سلجوقیہ کی حکومت بغداد سے جاتی رہی اور اس خاندان میں کوئی ایسا شخص نہ رہا جو امارت وسلطنت کے مرتبے کو قائم رکھ سکتا۔ اسی لیے سلطان محمود کو خاندان سلجوقیہ کا خاتم سمجھا جاتا ہے۔ ملک شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی ایک سردار کو حلہ پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا۔ اس نے حلہ پر قبضہ کر لیا۔ شحنہ بغداد مسعود جلال نامی نے حلہ جا کر ملک شاہ کے سردار کو قتل کر کے خود حلہ پر خود مختارانہ حکومت شروع کر دی۔ خلیفہ مقتفی نے خود فوج لے کر حلہ پر حملہ کیا اور فتح کر کے اہل حلہ سے اپنی اطاعت وفرماں برداری کا اقرار لیا۔ اس کے بعد خلیفہ نے واسط پر حملہ کر کے اس کو اپنے قبضہ میں لیا اور ۱۰ ذیقعدہ سنہ ۵۴۷ھ کو بغداد میں واپس آیا۔ سنہ ۵۴۸ھ میں خلیفہ نے اپنے وزیر زادہ اور امیر ترشک دونوں کو تکریت کی فتح کے لیے روانہ کیا۔ ان دونوں میں ناچاقی ہوئی۔ امیر ترشک نے وزیر زادہ کو اہل تکریت کے ہاتھوں سے گرفتار کرا دیا اور خود خراسان کی طرف راستے کے شہروں کو لوٹتا ہوا چل دیا۔ سنہ ۵۴۹ھ میں خلیفہ مقتفی نے خود تکریت پر چڑھائی کی۔ شہر کو فتح کر لیا مگر قلعہ تکریت فتح نہ ہوا۔ خلیفہ نے بغداد میں واپس آ کر اپنے وزیر کو قلعہ شکن منجنیقیں دے کر قلعہ تکریت کے فتح کرنے کو روانہ کیا۔ وزیر نے جا کر محاصرہ کر ڈالا۔ ادھر ارسلان بن طغرل بن سلطان محمد نے ایک فوج لے

کروزیر پر حملہ کیا۔ یہ خبر سنتے ہی خلیفہ مقتفی خود بغداد سے روانہ ہوا۔ مقام عقر بابل پر دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ اٹھارہ دن کی لڑائی کے بعد خلیفہ کے لشکر کا اکثر حصہ فرار ہوا مگر خلیفہ بڑی بہادری کے ساتھ بقیہ لوگوں کو لیے ہوئے مقابلہ کرتا رہا، حتیٰ کہ فتح حاصل ہوئی۔ ارسلان بن طغرل اور اس کے ہمراہی سردار سب میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یکم شعبان سنہ ۵۴۹ھ کو خلیفہ بغداد واپس آیا۔

سنہ ۵۵۰ھ میں خلیفہ مقتفی نے وقوقا پر فوج کشی کی مگر چند روز محاصرہ کے بعد بغداد واپس آیا۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ سنہ ۴۹۰ھ میں سلطان برکیارق نے سلطان سنجر کو خوزستان کی حکومت سپرد کی تھی۔ جب سلطان محمد اور سلطان برکیارق میں مخالفت اور لڑائی ہوئی تو سلطان محمد نے اپنے حقیقی بھائی سنجر کو خراسان کی حکومت سپرد کی تھی۔ اسی وقت سے سلطان سنجر کے قبضے میں خراسان کا ملک برابر رہا اور اس کو سلطان محمد کے بیٹے سلطان العراق کے نام سے یاد کرتے رہے۔ سنہ ۵۳۶ھ میں ترکوں کے ایک گروہ نے جو ترکان خطا کے نام سے موسوم تھا، ماوراء النہر کے علاقہ کو خوانین ترکستان سے چھین لیا۔ سلطان سنجر نے اس گروہ خطا کو ماوراء النہر سے نکالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا اور بہت سے کار آزمودہ سردار اس لڑائی میں مقتول ہوئے۔ سلطان سنجر کے کمزور ہو جانے کے سبب سے اس کے ماتحت حکمرانوں نے زور پکڑا اور اسی سلسلہ میں خوارزم شاہ بھی خود مختار ہو گیا۔ ماوراء النہر میں جو ترک رہتے تھے اور ترکان غز کہلاتے تھے، انہوں نے خراسان میں آ کر لوٹ مار اور بدامنی پھیلا دی۔ سنہ ۵۴۸ھ میں ان ترکوں اور سلطان سنجر کے درمیان لڑائی ہوئی، جس میں سلطان سنجر کو قید کر کے اپنے ساتھ رکھا اور خراسان کے شہروں کو لوٹتے ہوئے پھرنے لگے اور ماوراء النہر میں ترکان خطا کو بھی شکستیں دینے لگے۔ ترکان غز نے سلطان سنجر کو قید کر کے ایک سائیس کے برابر اس کی تنخواہ مقرر کی تھی اور لطف یہ کہ تمام بلاد خراسان میں خطبہ سلطان سنجر ہی کے نام کا جاری رکھا تھا۔ سنہ ۵۵۱ھ میں سلطان سنجر قید سے نکل بھاگا اور سنہ ۵۵۲ھ میں بہ حالت ناکامی فوت ہوا۔ اس کے بعد خوارزم شاہ اور اس کی اولاد نے تمام خراسان پر قبضہ کر لیا اور اصفہان و رے کے صوبوں اور آل سبکتگین کے زیر اثر صوبوں پر بھی متصرف ہو گئے اور چنگیز خان کے خروج تک قابض رہے۔ غرض کہ خلیفہ مقتفی لامر اللہ کے عہد میں دولت خوارزم شاہیہ کی بنیاد قائم ہوئی۔ سنہ ۵۴۹ھ میں خلیفہ مقتفی نے نورالدین بن محمود بن عمادالدین زنگی والی حلب کو مصر کی طرف جانے کا حکم دیا کہ وہاں عبیدی حاکم مصر کے پر اختلال کاموں میں دخیل ہو۔ اسی سال نورالدین بن محمود کو ملک العادل کا خطاب دیا۔

سلیمان شاہ بن سلطان محمد اپنے چچا سنجر کے پاس رہتا تھا۔ اسی کو سلطان سنجر نے اپنا ولی عہد بھی بنایا تھا۔ جب سلطان سنجر کو ترکوں نے گرفتار کر لیا تو سلیمان شاہ اس کے بقیہ لشکر کی سرداری کرنے لگا اور خراسان میں اپنے لیے کوئی مامن نہ دیکھ کر بغداد چلا آیا۔ ماہ محرم سنہ ۵۵۱ھ میں خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ خلیفہ کی بیعت کی اور نائب السلطنت مقرر ہوا۔ اس کے نام کا خطبہ بغداد میں پڑھا گیا۔ ماہ ربیع الاول سنہ ۵۵۱ھ میں سلیمان شاہ بغداد سے بلاد جبل کی طرف روانہ ہوا۔ ماہ ذی الحجہ سنہ ۵۵۱ھ میں سلطان محمود نے والی موصل اور دوسرے سرداروں کو اپنے ساتھ شامل کر کے بغداد پر چڑھائی کی اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ امیر موصل قطب الدین کو اس کے بڑے بھائی نورالدین زنگی نے ملامتانہ خط لکھا کہ تم کو محاصرہ بغداد میں شریک نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے قطب الدین زنگی خلیفہ کے خلاف جنگ کرنے سے جی چرا رہا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ربیع الاول سنہ ۵۵۲ھ میں سلطان محمد محاصرہ اٹھا کر ہمدان کی طرف چلا گیا اور قطب الدین نے موصل کی طرف کوچ کیا۔ سلطان محمد بن محمود بن ملک شاہ محاصرہ بغداد کے بعد بہ عارضہ سل بیمار ہو کر ہمدان میں مقیم رہا اور ماہ ذی الحجہ سنہ ۵۵۴ھ میں بہ مقام ہمدان فوت ہوا۔ اس کے بعد سلجوقی شہزادوں میں تخت نشینی کے متعلق اختلاف رہا۔ آخر سلطان محمد کے چچا سلیمان شاہ کو جو موصل میں قطب الدین زنگی کی حراست میں تھا، طلب کر کے تخت نشین کیا گیا۔ اس کے بعد سلیمان شاہ کو سلجوقی شہزادوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ آخر اس کی حکومت قائم ہوگئی مگر سلیمان شاہ کے ایک سردار شرف الدین نے اس کو اور اس کے وزیر کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

اس کے بعد شرف الدین نے ارسلان شاہ بن طغرل کو تخت نشین کرنے کی تجویز کی اور اس کے اتابک ایلدکز کو لکھا کہ اپنے ہمراہ ارسلان شاہ کو لے آؤ۔ چنانچہ ایلدکز مع فوج ہمدان آ پہنچا اور ارسلان شاہ کے نام کا خطبہ ہمدان میں پڑھوایا۔ ایلدکز سلطان مسعود کے غلاموں میں سے تھا، اس نے سلطان طغرل کی وفات کے بعد اس کی بیوی یعنی ارسلان شاہ کی ماں سے نکاح کر لیا تھا۔ اب ارسلان شاہ کی تخت نشینی کی رسم ادا ہونے کے بعد وہی اتابک اعظم مقرر ہوا اور بغداد میں خلیفہ کے پاس درخواست بھیجی کہ ارسلان شاہ کے نام کا خطبہ بغداد میں پڑھوایا جائے۔ خلیفہ نے ایلچی کو بے عزت کر کے نکلوا دیا۔ محمود بن ملک شاہ بن محمود کو جو نو عمر لڑکا تھا، اس کے باپ کے مصاحب اس کو فارس کی طرف لے کر گئے تھے اور وہاں فارس کے حاکم زنگی بن وکلا سلغری نے ان لوگوں سے محمود

کو چھین کر قلعہ اصطخر میں بند کر دیا تھا، خلیفہ کے وزیر عون الدین ابوالمظفر یحییٰ بن زہیر نے زنگی بن وکلا حاکم فارس کو لکھا کہ تم محمود کو آزاد کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کے نام کا خطبہ اپنے بلاد مقبوضہ میں جاری کر دو۔ چنانچہ زنگی نے اس کی تعمیل کی۔ ادھر ایلدکز نے زنگی کو لکھا کہ تم ارسلان شاہ کی بیعت سلطنت کرو۔ زنگی نے انکاری جواب دیا اور فوجیں فراہم کیں۔ ایلدکز نے فارس پر فوجیں روانہ کیں۔ لڑائیاں ہوئیں مگر کوئی اہم نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ۲ ماہ ربیع الاول سنہ ۵۵۵ھ میں مقتفی لامراللہ نے ۲۴ برس، ۴ مہینے خلافت کر کے وفات پائی اور اس کے بیٹے ابوالمظفر یوسف نے مستنجد باللہ کے لقب سے تخت خلافت پر جلوس کیا۔

مقتفی لامراللہ نے اپنے آپ کو سلجوقی سلطانوں کے اقتدار سے آزاد کر کے عراق و بغداد پر آزادانہ حکومت کی اور اسی لیے وہ خلفاء عباسیہ کے آخری کمزور خلیفہ میں ایک نامور اور طاقتور خلیفہ شمار ہوتا ہے۔

دیلمیہ و سلجوقیہ:

دیلمی یعنی بنی بویہ نے طاقت حاصل کر کے خاندان عباسیہ کے خلفاء کی عزت کو برباد کیا اور اپنے عہد حکمرانی میں خلافت اسلامیہ کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان لوگوں کے زمانے میں آئے دن شیعہ سنیوں کے ہنگامے بھی برپا رہے اور مسلمانوں کی طاقت دم بہ دم کمزور ہوتی رہی۔ ان کے بعد جب سلجوقیوں نے ان کی جگہ لی اور وہ برسر اقتدار آئے تو خلافت اور خلفاء کی عزت و تعظیم نے ترقی کی۔ سلجوقیوں نے خاندان عباسیہ کے ساتھ عقیدت مندی کا برتاؤ کیا۔ سلجوقیوں کی طاقت بنی بویہ سے بہت زیادہ تھی۔ سلجوقی سلطانوں نے بحیثیت مجموعی خلیفہ سے غداری و بے وفائی کا برتاؤ نہیں کیا۔ سلجوقیوں کے زمانے میں مسلمانوں کی ضائع شدہ طاقت و عظمت پھر واپس آئی۔ سلجوقیوں میں قابلیت ملک گیری و ملک داری بنو بویہ کی نسبت بہت زیادہ تھی۔ اس نسبت سے ان میں دین داری اور مذہبیت بھی زیادہ تھی۔ آخر زمانے میں آپس کی نااتفاقی اور خانہ جنگی نے دولت سلجوقیہ کا خاتمہ کر دیا اور یہ وہ مرض ہے جس سے دنیا میں کوئی خاندان محفوظ نظر نہیں آتا۔ بہر حال خلیفہ مقتفی کے زمانے میں سلجوقیوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اگرچہ سلجوقی سردار اس کے بعد عرصہ دراز تک چھوٹے چھوٹے قطعات ملک پر حکمران نظر آتے رہے مگر نائب السلطنت اور نگران ہونے کی حیثیت سے وہ اپنا دور

ختم کر چکے تھے۔

مستنجد باللہ

مستنجد باللہ بن مقتفی لامراللہ ماہ ربیع الثانی سنہ ۵۱۱ھ میں ایک گرجستانی ام ولد موسومہ طاؤس کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ سنہ ۵۴۷ھ میں ولی عہد بنایا گیا اور اپنے باپ کی وفات کے بعد ربیع الاول سنہ ۵۵۵ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا۔ سنہ ۵۵۶ھ میں ترکمانوں، کردوں اور عربوں نے یکے بعد دیگرے بغاوت کی اور خلیفہ مستنجد نے ان بغاوتوں کو فرو کیا۔ مقام حلہ میں قبیلہ بنی اسد کی آبادی زیادہ تھی۔ ان لوگوں سے سرکشی کے آثار نمایاں ہوئے اور سنہ ۵۵۸ھ میں خلیفہ نے تمام بنی اسد کے خلاف فوجیں روانہ کر کے ان کو عراق سے نکال دیا۔ سنہ ۵۵۹ھ میں واسط کے اندر بغاوت ہوئی۔ یہ بغاوت بھی فوجی قوت کی نمائش سے فرو کر دی گئی۔ سنہ ۵۶۰ھ میں خلیفہ کے وزیر عون الدین نے وفات پائی۔ سنہ ۵۶۳ھ میں مصر کے آخری عبیدی حاکم عاضدلدین اللہ کے وزیر شادر پر ابن سوار نامی ایک شخص نے غالب ہو کر اس کو مصر سے نکال دیا۔ شادر مصر سے ملک العادل نورالدین زنگی کے پاس آیا۔ نورالدین زنگی سلاطین سلجوقیہ کے سرداروں میں سے ایک سردار تھا۔ اس کے باپ عمادالدین زنگی کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ نورالدین محمود زنگی نے حلب و شام وغیرہ ممالک پر قبضہ کر رکھا تھا اور خلیفہ بغداد کا فرماں بردار تھا۔ نورالدین محمود کے سرداروں میں نجم الدین ایوب (جس کا ذکر اوپر بھی آ چکا ہے) اور اس کا بیٹا صلاح الدین یوسف بن نجم الدین ایوب اور نجم الدین ایوب کا بھائی اسدالدین شیر کوہ معزز اور اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ ملک العادل نورالدین محمود نے امیر اسدالدین شیر کوہ کو دو ہزار سواروں کے ساتھ مصر کی طرف روانہ کیا۔ شیر کوہ نے ابن سوار کا کام تمام کیا مگر شادر نے ان وعدوں کو جو دربار نورالدین میں کر کے آیا تھا، پورا نہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ فرانسیسی سواحل شام و مصر پر حملے کیا کرتے تھے اور ساحلی مقامات پر قابض ہو گئے تھے۔ شیر کوہ سے فرمائش کی گئی کہ ان عیسائیوں کو بھی ملک سے خارج کرو۔ شیر کوہ اور اس کے بھتیجے صلاح الدین نے فرنگیوں کو کئی مہینے کی لڑائیوں کے بعد مصر سے نکال دیا اور خود شام کی طرف چلا آیا۔ سنہ ۵۶۴ھ میں فرانسیسیوں نے پھر مصر پر حملہ کیا۔ عاضدلدین اللہ نے پھر ملک العادل سلطان نورالدین محمود زنگی کی خدمت میں امداد اور اعانت کی درخواست کی۔ نورالدین نے پھر شیر کوہ کو مع صلاح الدین مصر کی

جانب روانہ کیا۔ فرانسیسی شیرکوہ کے آنے کی خبر سنتے ہی بھاگ گئے اور عاضد لدین اللہ نے شیرکوہ کو اپنا وزیر بنا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ شاور نے علم بغاوت بلند کیا۔ شیرکوہ نے فوراً اس کا کام تمام کر دیا اور اطمینان سے خدمات وزارت انجام دینے لگا۔ سال بھر کے بعد سنہ ۵۶۵ھ میں شیرکوہ کا مصر میں انتقال ہو گیا تو حاکم مصر عاضد لدین اللہ عبیدی نے شیرکوہ کے بھتیجے سلطان صلاح الدین یوسف کو وزارت کا عہدہ دیا۔ شیرکوہ اور صلاح الدین دونوں اپنے پرانے سردار سلطان نورالدین محمود کے بھی وفادار تھے۔ اس طرح شام اور مصر دونوں ملکوں کی اسلامی طاقت متحد طور پر عیسائیوں کے حملوں کی مدافعت پر متوجہ رہی۔ ادھر خلیفہ مستنجد باللہ کو بھی عراق کی تمام بغاوتوں کے فرو کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی اور خلیفہ کا اقتدار اور رعب پورے طور پر قائم ہو گیا۔ ملک العادل نورالدین زنگی خلیفہ مستنجد کا وفادار اور مستنجد کے ہر ایک حکم کی تعمیل کو تیار تھا۔ لہٰذا یہ زمانہ امن وامان اور عراق ومصر کے مسلمانوں کے لیے اطمینان کا زمانہ تھا۔ ۹ ربیع الثانی سنہ ۵۶۶ھ میں خلیفہ مستنجد باللہ نے بیمار ہو کر وفات پائی۔ اسی خلیفہ کے عہد خلافت میں شیخ عبدالقادر جیلانی نے وفات پائی۔ مستنجد کے بعد لوگوں نے اس کے بیٹے ابو محمد حسن کو تخت خلافت پر بٹھا کر مستضی بامراللہ کا لقب دیا۔

مستضی بامراللہ

مستضی بامراللہ بن مستنجد باللہ سنہ ۵۳۶ھ میں ایک ارمنی ام ولد[1] کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی عدل وانصاف قائم کیا۔ رعایا کے تمام ٹیکس معاف کر دیے۔ اس کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال میں مصر کے اندر عبیدیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ صلاح الدین یوسف عبیدیوں کے آخری حاکم عاضد لدین اللہ کا وزیر اعظم ہو گیا تھا۔ صلاح الدین نے مصر کی بدامنی کو رفع کر کے ہر قسم کا انتظام کیا اور پورے طور پر ہر ایک محکمہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر حکومت کرنے لگا۔ نورالدین محمود زنگی فرماں روائے شام نے سنہ ۵۶۶ھ کے آخری ایام میں سلطان صلاح الدین کو لکھا کہ مصر میں خلیفہ مستضی باللہ عباسی کے نام کا خطبہ جاری کرو۔ صلاح الدین یوسف اپنے آپ کو سلطان نورالدین کا نائب سمجھتا تھا۔ اس نے اس حکم کی تعمیل ڈرتے ہی ڈرتے کی اور محرم سنہ ۵۶۷ھ کی ابتدائی تاریخوں میں یوم عاشورہ سے پہلے جو جمعہ آیا، اس جمعہ میں خلیفہ مستضی

[1] وہ کنیز جس کی اپنے آقا سے اولاد پیدا ہوئی ہو، یہ کنیز فروخت نہیں کی جا سکتی تھی۔ اب کنیزوں کو رکھنے کا رواج نہیں رہا۔

بامراللہ کے نام کو بہ نظر استحسان دیکھا گیا۔ ۱۰ محرم سنہ ۵۶۷ھ کو عاضدلدین اللہ فوت ہو گیا اور اگلے جمعہ کے دن تمام بلاد مصر میں خلیفہ بغداد کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اس کی اطلاع سلطان صلاح الدین نے سلطان نورالدین کو دی اور سلطان نورالدین نے خلیفہ مستضی کے پاس بغداد میں یہ خوشخبری بھیجی۔ جب یہ خبر بغداد میں پہنچی تو خلیفہ نے خوشی کی نوبت بجوائی اور تمام بغداد میں چراغاں کیا گیا۔ خلیفہ نے اپنے خادم خاص صندل نامی کو جو خلیفہ کی سرائے کا داروغہ بھی تھا، نورالدین کے پاس بھیجا اور اس کے ہاتھ نورالدین اور صلاح الدین کے لیے خلعت روانہ کیے اور سیاہ پھریرے بھیجے۔ صندل کے پہنچنے پر نورالدین نے بھی بڑی خوشی کا اظہار کیا اور صلاح الدین کے پاس خلیفہ کا خلعت روانہ کیا۔ مصر سے دولت عبیدیہ ختم ہوگئی اور دولت ایوبیہ مصر میں قائم ہوئی۔ نورالدین کے قبضہ میں شام، جزیرہ اور موصل کا تمام علاقہ تھا۔ اب خلیفہ نے اس کے پاس مصر، شام، جزیرہ، موصل، دیاربکر، خلاط، بلاد روم اور سواد عراق کی سند حکومت لکھ کر بھیج دی اور اس کو ان ممالک میں اپنا نائب السلطنت بنا کر سیاہ وسفید کا مالک بنا دیا۔ نورالدین کی طرف سے صلاح الدین مصر کا حاکم اور بادشاہ رہا۔ جس طرح صلاح الدین، نورالدین کا فرمان بردار تھا، اسی طرح نورالدین خلیفہ بغداد کا فرمان پذیر رہا۔ اب خلیفہ مستضی سے تمام بادشاہ ڈرنے لگے تھے اور دور دور تک اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ کسی کو خلیفہ کی مخالفت کی جرأت نہ رہی۔ خلیفہ نے قطب الدین قائماز کو سپہ سالار افواج بنایا تھا، سنہ ۵۷۰ھ میں قائماز نے خلیفہ کے خلاف بغداد میں سرکشی کا اظہار کیا۔ خلیفہ نے قصر خلافت میں محصور ہو کر اور چھت پر چڑھ کر بلند آواز سے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ قطب الدین قائماز کا مال واسباب تمہارے لیے معاف ہے۔ یہ سنتے ہی لوگ اس کے گھر پر ٹوٹ پڑے اور ذرا سی دیر میں سب کچھ لوٹ لیا۔ قائماز بغداد سے فرار ہو کر حلہ پر پہنچا۔ وہاں سے موصل کی طرف جارہا تھا کہ راستہ میں مرگیا۔ سنہ ۵۷۳ھ خلیفہ مستضی کا وزیر عضدالدین ابوالفرح محمد بن عبداللہ حج کے ارادے سے ایک بڑے قافلہ کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستے میں ایک قرمطی نے دھوکے سے اس کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد خلیفہ نے ابومنصور ظہیر الدین بن نصر معروف بہ ابن عطار کو قلمدان وزارت عطا کیا۔ ماہ ذیقعدہ سنہ ۵۷۵ھ میں خلیفہ مستضی بامراللہ ساڑھے نو برس خلافت کرنے کے بعد فوت ہوا۔ وزیر ظہیر الدین بن عطار نے اس کے بیٹے ابوالعباس احمد کو تخت خلافت پر بٹھایا۔ اس نے ناصرلدین اللہ کا لقب اختیار کیا۔

ناصرلدین اللہ

ناصرلدین اللہ بن مستضی بامراللہ ۱۰ رجب سنہ ۵۵۳ھ کو ایک ترکی ام ولد موسومہ زمرد کے بطن سے پیدا ہوا اور ذیقعدہ سنہ ۵۷۵ھ میں اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔ بہت ذی ہوش، دوراندیش اور چوکس رہنے والا خلیفہ تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی ممالک محروسہ اسلامیہ میں قاصد روانہ کیے گئے کہ خلیفہ کی بیعت امراء سے لیں۔ اس زمانہ میں ہمدان، اصفہان اور رے میں بہلوان نے اول بیعت کرنے سے انکار کیا مگر جب خود اسی کے سرداروں نے دھمکی دی کہ اگر آپ خلیفہ کی بیعت نہ کریں گے تو ہم منحرف ہو جائیں گے تو بہلوان نے بیعت کر لی۔ ایلدکز اتابک سنہ ۵۶۸ھ میں مقام ہمدان میں فوت ہو گیا تھا۔ ایلدکز جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، ارسلان شاہ بن سلطان طغرل کا اتالیق ونگران تھا۔ ایلدکز کی وفات کے بعد ارسلان شاہ کا اتالیق ایلدکز کا بیٹا بہلوان ہوا۔ سنہ ۵۷۳ھ میں ارسلان شاہ بھی فوت ہوا تو بہلوان نے ارسلان کے بیٹے طغرل بن ارسلان بن طغرل کو اس کا جانشین کیا اور خود بلاد مذکورہ کی حکومت کرتا رہا۔ سنہ ۵۸۲ھ میں جب بہلوان بن ایلدکز نے وفات پائی تو ہمدان، رے، اصفہان، آذربائیجان اور ارانیہ کے علاقے اس کے زیر حکومت تھے اور طغرل بن ارسلان اس کی کفالت میں تھا۔ بہلوان کے مرنے پر اس کا بھائی عثمان معروف بہ قزل ارسلان بن ایلدکز اس کا قائم مقام ہوا۔ طغرل بن ارسلان چند روز تو قزل ارسلان کی کفالت ونگرانی میں رہا، پھر اس سے علیحدہ ہو کر امراء کو اپنے ساتھ ملا کر بعض شہروں پر قابض ہو گیا۔ چنانچہ قزل ارسلان اور طغرل میں متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ رفتہ رفتہ طغرل کی قوت بڑھتی گئی اور قزل ارسلان کمزور ہوتا گیا۔ قزل ارسلان نے دربار خلافت میں عرضی بھیجی اور اطاعت وفرماں برداری کا اقرار کر کے طغرل کی طاقت کے بڑھتے جانے سے دربار خلافت کے لیے بھی اندیشہ پیدا ہو جانے کے امکان کا اظہار کیا۔ خلیفہ ناصرلدین اللہ نے سلاطین سلجوقیہ کے محلوں کو جو بغداد میں بنے ہوئے تھے، مسمار ومنہدم کرا دیا اور ابوالمظفر عبیداللہ بن یونس کو قزل ارسلان کی مدد کے لیے مع لشکر روانہ کیا۔ عبیداللہ ابھی قزل ارسلان تک نہیں پہنچنے پایا تھا کہ ۱۸ ربیع الاول سنہ ۵۸۴ھ کو بہ مقام ہمدان میں طغرل سے مقابلہ ہو گیا، سخت لڑائی ہوئی۔ طغرل نے فتح پائی اور عبیداللہ گرفتار ہو گیا۔ بقیہ لشکر نے بغداد آ کر دم لیا مگر اس کے بعد قزل ارسلان ہمدان، رے، اصفہان وغیرہ کل صوبوں پر استقلال کے ساتھ

حکومت کرنے لگا اور اپنے نام کا سکہ وخطبہ جاری کیا۔ سنہ ۵۸۷ھ میں طغرل بہ حالت قید قتل کر دیا گیا اور دولت سلجوقیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس حکومت وسلطنت کو طغرل بیگ نے قائم کیا تھا۔ اس کا خاتمہ بھی اسی نام کے سلطان یعنی طغرل بیگ پر ہوا۔

سنہ ۵۸۵ھ میں امیر عیسیٰ والی تکریت فوت ہوا تو اس کے بھائیوں نے تکریت پر قبضہ کیا۔ خلیفہ ناصر نے ایک فوج بھیج کر تکریت پر اپنا قبضہ کیا اور امیر عیسیٰ کے بھائیوں کو جاگیریں دے دیں۔ سنہ ۵۸۶ھ میں اسی طرح شرعانہ پر قبضہ کیا اور وہاں سے امیروں کو جاگیریں دیں۔ اس کے بعد سنہ ۵۹۱ھ میں خلیفہ ناصر نے خوزستان کی طرف فوجیں بھیج کر اس ملک پر بھی قبضہ کیا اور اپنی طرف سے طاش تگین مجیر الدین کو خوزستان کی حکومت پر مامور کیا۔ ان ایام میں رے پر قتلغ بن بہلوان بن ایلدکز حکومت کر رہا تھا۔ خوارزم شاہ نے قتلغ کو شکست دے کر بھگا دیا اور اس علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ موید الدین ابوعبداللہ محمد بن علی جس نے خوزستان کو خلیفہ کے حکم کے موافق فتح کر کے طاش تگین کے سپرد کر دیا تھا، اپنی فوج لیے ہوئے روانہ ہونے کو تھا کہ قتلغ بن بہلوان اس کے پاس پہنچا اور رے کی طرف فوج کشی کرنے کی ترغیب دی۔ موید الدین، قتلغ کے ہمراہ ہمدان کی طرف گیا، جہاں خوارزم شاہ کا بیٹا لشکر لیے ہوئے پڑا تھا۔ وہ موید الدین کی خبر سن کر رے کی طرف چلا گیا اور موید الدین نے ہمدان پر بہ آسانی قبضہ کر لیا۔ ہمدان سے رے کی طرف روانہ ہوا۔ ابن خوارزم رے کو چھوڑ کر چل دیا۔ موید الدین نے رے پر بھی قبضہ کر لیا اور رفتہ رفتہ اس تمام علاقے پر قابض ہو گیا جو قتلغ کے قبضہ میں پہلے تھا۔ خوارزم شاہ نے اول ایک ایلچی موید الدین کے پاس بھیجا اور کہا کہ اس ملک سے اپنا قبضہ اٹھا لو مگر موید الدین نے کہا کہ یہ ملک خلیفہ ناصر لدین اللہ کی فوج نے فتح کیا ہے، ہرگز واپس نہ ہو گا۔ خوارزم شاہ نے ایک زبردست فوج لے کر ہمدان پر حملہ کیا۔ اسی اثناء میں ماہ شعبان سنہ ۵۹۲ھ میں موید الدین کا انتقال ہو گیا مگر اس کی فوج نے خوارزم شاہ کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آخر بغداد میں فوج کو افسر کے نہ ہونے کی وجہ سے شکست ہوئی اور خوارزم شاہ نے ہمدان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد خوارزم شاہ اصفہان پہنچا۔ اس کو بھی اپنے قبضہ میں لا کر اپنے بیٹے کی نگرانی میں دیا اور ایک زبردست فوج حفاظت کے لیے وہاں چھوڑی۔ اس کے بعد خلیفہ ناصر لدین اللہ نے سیف الدین طغرل نامی ایک سردار کو فوج دے کر اصفہان کی طرف روانہ کیا۔ سیف الدین نے ابن خوارزم شاہ کو بھگا کر اصفہان پر قبضہ کیا، پھر ہمدان، زنجان اور قزوین پر بھی قبضہ کر لیا اور یہ

علاقے خلیفہ ناصر لدین اللہ کے قبضہ وتصرف میں آ گئے۔

سنہ ۶۰۲ھ میں طاش تگین امیر خوزستان نے وفات پائی۔ خلیفہ ناصر نے اس کی جگہ اس کے داماد سنجر کو مامور کیا۔ ۶۰۶ھ میں خلیفہ کے دل میں سنجر کی طرف سے ناراضی پیدا ہوئی۔ اس زمانہ میں جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ فارس کی حکومت اتابک سعد زنگی بن وکلا کے ہاتھ میں تھی۔ خلیفہ نے سنجر کی سرکوبی کے لیے اپنے نائب وزیر کو فوج دے کر روانہ کیا کہ خوزستان پہنچ کر سنجر کو سزا دو۔ جس وقت نائب وزیر خوزستان کے قریب پہنچا، سنجر خوزستان چھوڑ کر سعد زنگی کے پاس فارس چلا گیا۔ سعد نے سنجر کی خوب خاطر مدارات کی۔ ماہ ربیع الاول سنہ ۶۰۶ھ میں خلیفہ کی فوج نے خوزستان پر قبضہ کر لیا اور سنجر کو طلب کیا، سنجر نے انکار کیا۔ لہٰذا لشکر بغداد فارس کے دارالسلطنت شیراز کی طرف بڑھا۔ اتابک سعد زنگی نے سنجر کی سفارش کے خطوط نائب وزیر کو لکھے۔ آخر سنجر نائب وزیر کے پاس چلا گیا اور وہ ماہ محرم سنہ ۶۰۸ھ میں سنجر کو ہمراہ لیے ہوئے بغداد واپس آیا اور پابہ زنجیر دربار خلافت میں پیش کیا گیا۔ خلیفہ نے اپنے خادم یاقوت نامی کو خوزستان کی حکومت پر مامور کر کے بھیج دیا اور سنجر کو آزاد کر کے خلعت دیا۔

محرم سنہ ۶۱۳ھ میں خلیفہ نے اپنے پوتے موید بن علی بن ناصر لدین اللہ کو تستر (من مضافات خوزستان) کی امارت پر روانہ کیا۔ اس کا باپ علی ذیقعدہ سنہ ۶۱۲ھ میں فوت ہو چکا تھا۔ اغلمش بہلوان بن ایلدکز کے سرداروں میں سے تھا۔ اس نے اپنی بہادری اور دانائی کے ذریعہ سے بلاد جبل پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کی حکومت استقلال کے ساتھ قائم ہو چکی تھی۔ سنہ ۶۱۴ھ میں اس کو فرقہ باطنیہ (قرامطہ) نے قتل کر ڈالا۔ اغلمش کے قتل ہونے پر اس کے مقبوضہ ملک پر ایک طرف اتابک سعد بن وکلا حاکم فارس نے قبضہ کرنا چاہا، دوسری طرف خوارزم شاہ حاکم خراسان و ماوراء النہر نے قابض ہونا چاہا۔ اتابک بن زنگی نے فوج لے کر اصفہان کو فتح کیا۔ ادھر سے خوارزم شاہ مع فوج آ رہا تھا۔ مقام رے میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ سخت خون ریز جنگ کے بعد اتابک سعد کو شکست ہوئی۔ خوارزم شاہ نے اس کو گرفتار کر لیا اور اغلمش کے تمام مقبوضہ ملک پر قابض ہو کر دارالخلافہ بغداد میں خلیفہ کے پاس اپنا خطبہ بطور نائب السلطنت پڑھے جانے کی درخواست بھیجی۔ وہاں سے انکاری جواب آیا۔ خوارزم شاہ نے بغداد کی طرف فوج روانہ کی مگر راستے میں اس قدر برف باری ہوئی کہ اس فوج کا اکثر حصہ ہلاک ہو گیا، باقی کو ترکوں اور کردوں نے لوٹ لیا۔ بقیہ لوگ بہ حالت زار خوارزم شاہ کے

پاس واپس آ گئے۔ خوارزم شاہ نے اس کو بدفالی سمجھ کر خراسان کی جانب حملہ کیا تو مفتوحہ ملک پر اپنے بیٹے رکن الدین کو مامور کر کے عماد الملک ساوی کو اس کا مدار المہام بنایا اور اپنے مقبوضہ ممالک سے خلیفہ ناصر کے نام کا خطبہ موقوف کر دیا۔ یہ سنہ ۶۱۵ ھ کا واقعہ ہے۔

سنہ ۶۱۶ ھ میں قبیلہ تاتار نے جو طمغاج علاقہ چین کے پہاڑوں میں رہتا تھا، خروج کیا۔ ان لوگوں کا وطن ترکستان سے چھ مہینے کی مسافت پر تھا۔ اس قبیلہ کے سردار کا نام چنگیز خاں تھا، جو ترکوں کے قبیلہ تمرجی سے تعلق رکھتا تھا۔ چنگیز خاں نے ترکستان و ماوراء النہر پر فوج کشی کی اور ترکان خطا سے ان ملکوں کو چھین کر خود قابض ہو گیا۔ اس کے بعد خوارزم شاہ پر حملہ آور ہوا اور خراسان و بلاد جبل کو اس کے قبضے سے نکال لیا۔ اس کے بعد ارانیہ اور شروان پر قابض ہوا۔ انہیں تاتاریوں کا ایک گروہ غزنی، سجستان، کرمان وغیرہ کی طرف گیا۔ خوارزم شاہ ان تاتاریوں سے شکست کھا کر طبرستان کے کسی مقام میں جا کر سنہ ۶۱۷ ھ میں اکیس سالہ حکومت کے بعد فوت ہو گیا۔ خوارزم شاہ کو شکست دینے کے بعد تاتاریوں نے اس کے بیٹے جلال الدین بن خوارزم شاہ کو غزنی میں شکست دی اور چنگیز خاں دریائے سندھ تک اس کا تعاقب کرتا ہوا چلا گیا۔ جلال الدین دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ چند روز ہندوستان میں رہ کر سنہ ۶۲۲ ھ میں خوزستان و عراق کی جانب چلا گیا اور آذربائیجان و آرمینیا پر قابض ہو گیا۔ یہاں تک کہ مظفر کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ چنگیز خاں اور اس کی ملک گیریوں کے حالات بعد میں مفصل بیان کیے جائیں گے۔ آخر ماہ رمضان سنہ ۶۲۲ ھ میں ۴۷ سال کی خلافت کے بعد خلیفہ ناصر لدین اللہ نے وفات پائی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ خوارزم شاہ نے چونکہ خلیفہ سے منازعت کی تھی اور خلیفہ کا خطبہ اپنے ممالک مقبوضہ میں موقوف کر دیا، اس لیے خلیفہ ناصر لدین اللہ ہی نے چنگیز خاں کو خراسان پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی تھی کیونکہ خوارزم شاہ کو خود سزا دینا اور اس سے انتقام لینا خلیفہ کے لیے آسان نہ تھا۔ ناصر لدین اللہ نے اپنے جاسوس تمام ملکوں اور شہروں میں پھیلا رکھے تھے۔ وہ لوگوں کے معمولی کاموں اور باتوں سے بھی واقف رہنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اکثر لوگوں کو اس کی نسبت شبہ تھا کہ جنّ اس کے تابع ہیں اور وہی اس کو خبریں دیتے ہیں۔ سیاسی چالیں چلنا خوب جانتا تھا۔ ملکوں میں اس کا رعب خوب قائم ہو گیا تھا مگر رعایا اس سے خوش نہ تھی اور اس کی سخت گیریوں اور سخت سزاؤں سے نالاں تھی۔ اسی خلیفہ کے زمانہ میں سنہ ۵۸۳ ھ میں سلطان صلاح الدین نے رومیوں سے بہت سے شہر فتح کیے۔ بیت المقدس

بھی ۹۱ سال کے بعد مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ سنہ ۵۸۹ھ میں سلطان صلاح الدین یوسف فاتح بیت المقدس نے وفات پائی۔ اسی خلیفہ کے عہد میں ابوالفرح ابن جوزی، امام فخرالدین رازی، نجم الدین کبریٰ، قاضی خان صاحب الفتاویٰ، صاحب الہدایہ وغیرہ نے وفات پائی۔ خلیفہ ناصرلدین اللہ کے بعد اس کا بیٹا ابونصر محمد تخت نشین ہوا اور اس نے اپنا لقب ظاہر بامراللہ اختیار کیا۔

ظاہر بامراللہ

ظاہر بامراللہ بن ناصرالدین سنہ ۵۷۱ھ میں پیدا ہوا۔ باون (۵۲) سال کی عمر میں اپنے باپ کے بعد یکم شوال سنہ ۶۲۲ھ کو تخت نشین ہوا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی عدل وانصاف کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی۔ رعایا کو آرام پہنچایا، تمام ٹیکس معاف کر دیے، لوگوں کی جائیدادیں جو پہلے خلفاء نے ضبط کی تھیں، سب واپس کر دیں۔ مقروض لوگوں کے قرضے خود ادا کر دیتا تھا۔ اس خلیفہ کا قول تھا کہ میں نے شام کے وقت دکان کھولی ہے، مجھے نیکیاں کر لینے دو۔ ایک مرتبہ خلیفہ خزانہ کی طرف نکل آیا۔ ایک غلام نے کہا کہ یہ خزانہ آپ کے والد کے زمانے میں بھرا رہتا تھا۔ خلیفہ نے کہا کہ مجھے ایسی کوئی تدبیر قابل عمل نہیں معلوم ہوئی کہ یہ پھر بھر جائے۔ مجھ کو تو خزانہ خالی کرنا ہی آتا ہے۔ خزانہ کا جمع کرنا تو سوداگروں کا کام ہے۔ علماء کو خاص طور پر اس خلیفہ نے بہت مال ودولت دیا۔ اس خلیفہ کا زمانہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ سے بہت مشابہ تھا۔ ملک میں بھی امن وامان رہا اور رعایا اس کے عدل وانصاف سے بے حد مسرور اور خوش تھی مگر اس کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی۔ صرف ساڑھے نو مہینے خلافت کر کے ۱۵ رجب سنہ ۶۲۳ھ میں فوت ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوجعفر منصور تخت نشین ہوا اور اپنا لقب مستنصر باللہ تجویز کیا۔

ابوجعفر مستنصر باللہ

مستنصر باللہ بن ظاہر بامراللہ سنہ ۵۸۸ھ میں ایک ترکیہ ام ولد کے پیٹ سے پیدا ہوا اور اپنے باپ کی وفات کے بعد رجب سنہ ۶۲۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ خلیفہ اخلاق فاضلہ میں اپنے باپ سے بہت مشابہ تھا۔ اس نے عدل وانصاف قائم رکھنے میں اپنے باپ کی طرح کوشش کی۔ دین کی

پابندی کا اس کو خاص طور پر شوق تھا۔ بغداد میں اس نے مدرسہ مستنصریہ بنایا اور بڑے بڑے علماء مدرسہ پر مقرر ہوئے۔ اس مدرسہ کی تعمیر کا کام سنہ۶۲۵ھ میں شروع ہو کر سنہ۶۳۱ھ میں ختم ہوا۔ اس مدرسہ میں ایک کتب خانہ قائم کیا، جس میں ایک سو ساٹھ اونٹوں پر لاد کر نہایت نفیس و نایاب کتابیں داخل کی گئیں۔ حدیث، نحو، طب اور فرائض کے استاد الگ الگ مقرر کیے گئے۔ ان سب کے کھانے پینے، مٹھائی میوے اور دوسری چیزوں کا انتظام مدرسہ کی طرف سے ہوتا تھا۔ بہت سے گاؤں اس مدرسہ کے لیے وقف تھے۔ سنہ۶۲۸ھ میں ملک اشرف نے دارالحدیث اشرفیہ کی بنیاد رکھی۔ سنہ۶۳۰ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ سنہ۶۲۹ھ میں محمد بن یوسف بن ہود نے اندلس میں دعوت عباسیہ کا اعادہ کیا۔ سنہ۶۳۴ھ میں علاؤ الدین کیقباد بن قلج ارسلان بن سلیمان بن قتلمش بن اسرائیل بن سلجوق جو ایشیائے کوچک کے اکثر حصے پر قابض و متصرف تھا، فوت ہوا اور اس کا بیٹا غیاث الدین کیخسرو تخت نشین ہوا۔ سنہ۶۴۱ھ میں تاتاریوں نے غیاث الدین کیخسرو پر چڑھائی کر کے شکست دی اور غیاث الدین کیخسرو نے تاتاریوں کی اطاعت قبول کر کے باج گزاری منظور کی۔ اس طرح سلاجقہ روم کی دو صد سالہ حکومت کا خاتمہ ایشیائے کوچک میں ہو گیا۔ غیاث الدین کیخسرو تاتاریوں کی باجگزاری میں سنہ۶۵۶ھ تک حکومت کر کے فوت ہوا۔ اسی زمانہ میں خاندان عثمانیہ کے مورث اعلیٰ نے سلطنت عثمانیہ کے ایوان رفیع کی بنیادی اینٹ رکھی تھی، جس کا حال بعد میں مفصل بیان کیا جائے گا۔

خلیفہ مستنصر نے ملک کے انتظام اور عدل و انصاف کے قیام میں بہت کوشش کی مگر چونکہ ترکوں اور تاتاریوں نے یکے بعد دیگرے ولایتوں اور صوبوں پر قبضہ کرنا شروع کیا اور جلد جلد ایک کے بعد دوسرا ملک ان کے قبضہ میں آتا گیا، لہٰذا خلیفہ کی آمدنی کم ہو گئی۔ صلاح الدین یوسف کی سلطنت جو شام و مصر پر مشتمل تھی، صلاح الدین کی اولاد کی نااتفاقیوں سے برباد ہو رہی تھی۔ تاتاریوں کے سیلاب نے ماوراء النہر سے بحر روم اور بحر اسود تک کے تمام ملکوں کو تاخت و تاراج کر ڈالا تھا۔ تاہم ملک عراق پر خلیفہ کا قبضہ تھا اور تاتاریوں (مغلوں) کے دلوں پر خلیفہ بغداد کا اس قدر رعب قائم تھا کہ وہ خلیفہ کے مقبوضہ ملک کی طرف نگاہ نہیں کر سکتے تھے اور جس طرح خراسان، آذربائیجان، موصل، شام وغیرہ کے سلاطین خلیفہ کی ناراضی سے ڈرتے تھے، اسی طرح مغل بھی خلیفہ بغداد کی سیادت کو تسلیم کرتے اور کسی قسم کی گستاخی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ یہ تاتاری

(مغل) چونکہ آفتاب پرست تھے اور سلجوقیوں کی طرح مسلمان ہو کر نہیں آئے تھے۔ لہٰذا ان کو اس کی پرواہ ہی نہ تھی کہ کس کے نام کا خطبہ مسجدوں میں پڑھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان کے مفتوحہ ممالک میں بہ دستور خلیفہ بغداد کا خطبہ جاری تھا اور اسی لیے خلیفہ کو اطمینان تھا۔ تاتاریوں کے اس سیلاب کو دیکھ دیکھ کر خلیفہ مستنصر کا بھائی خفاجی نامی جو مستنصر سے زیادہ بہادر اور اولوالعزم تھا، کہا کرتا تھا کہ اگر میں خلیفہ ہو جاؤں تو دریائے جیحون کے پار تک ان تاتاریوں کا نام ونشان مٹا کر چھوڑوں۔ سنہ ۶۴۱ھ میں خلیفہ مستنصر فوت ہوا تو لوگوں نے اس کے بھائی خفاجی کو تخت پر نہ بٹھایا، جو ہر طرح قابل اور مستحق خلافت تھا بلکہ مستنصر کے بیٹے ابو احمد عبداللہ کو اس لیے ترجیح دی کہ ابو احمد عبداللہ نرم مزاج اور سادہ لوح تھا۔ اراکین سلطنت ایسے ہی خلیفہ کو پسند کرتے تھے تاکہ ان کے اقتدار وحکومت میں ترقی ہو۔ چنانچہ ابو احمد عبداللہ نے مستعصم باللہ کے لقب سے تخت خلافت پر جلوس کیا۔

مستعصم باللہ

مستعصم باللہ بن مستنصر باللہ سنہ ۶۹۰ھ میں ایک ام ولد موسومہ ہاجر کے بطن سے پیدا ہوا اور اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس خلیفہ میں عقل وفہم اور بیدار مغزی کی کمی تھی۔ اگرچہ خود دین داری اور اتباع سنت کی طرف مائل تھا مگر اپنا وزیر موید الدین علقمی کو بنایا جو غالی شیعہ تھا۔ علقمی نے عہدہ وزارت پر فائز ہوتے ہی خلیفہ کو کٹھ پتلی کی طرح اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کو عضو معطل بنا کر سیاہ وسفید کا مالک ومختار بن گیا۔ علقمی نے شیعوں کو آگے بڑھانا اور ہر قسم کی رعایتوں سے مستفید کرنا شروع کر دیا۔ دیلمیوں کے زمانے میں جو بدعات جاری تھیں، ان کو پھر زندہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ سنیوں میں وہی فسادات پھر برپا ہونے لگے جو دیلمیوں کے عہد اقتدار میں برپا رہتے تھے۔ ساتھ ہی علقمی اس کوشش میں مصروف ہوا کہ کسی طرح سے عباسیوں کا نام ونشان گم کر کے بغداد میں علویوں کی خلافت قائم کروں۔ بغداد میں بعض سمجھدار اور علقمی کے ان فاسد خیالات سے خبردار لوگ بھی تھے۔ انہوں نے خلیفہ کو علقمی کی غدارانہ کوششوں اور منصوبوں سے آگاہ کیا۔ خلیفہ اس قدر احمق اور پست ہمت تھا کہ اس نے ان لوگوں کی تمام باتوں کو خود علقمی سے بیان کیا۔ علقمی نے فوراً اپنی وفاداری اور فرماں برداری کا یقین دلا کر ان لوگوں کو غدار وفتنہ پرداز بتایا اور

خلافت مآب کو اس کا یقین آ گیا۔ علقمی کا اقتدار اور بھی زیادہ بڑھ گیا اور خیر خواہوں کی زبانیں نصیحت گری سے بالکل بند ہو گئیں۔

اس کے بعد علقمی نے خلیفہ کو لہو ولعب اور شراب نوشی کی طرف مائل کر دیا اور اندیشہ سے محفوظ ہو گیا۔ چند روز کے بعد خلیفہ کے بیٹے ابوبکر نے شیعوں کی دست درازیوں کو روکنے کے لیے خود بغداد کے محلّہ کرخ پر حملہ کیا، جو بالکل شیعوں کی آبادی تھی اور علقمی کی نسبت بھی سخت سست الفاظ کہے۔ اس سے علقمی کو سخت ملال ہوا اور خلیفہ سے شکایت کی مگر خلیفہ نے بیٹے کا لحاظ کیا اور علقمی کے حسب منشاء ابوبکر کو سزا نہ دی۔ اس سے علقمی کی غداری میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس نے چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں سے جو تاتاریوں کا سردار اعظم اور خراسان وغیرہ ممالک کا بادشاہ تھا، خط وکتابت شروع کی۔ ہلاکو خاں کے پاس جب علقمی کا پہلا خط پہنچا تو ہلاکو خاں نے اس پر زیادہ توجہ نہ کی۔ علقمی نے لکھا تھا کہ میں بڑی آسانی سے بلا جدال وقتال خلیفہ بغداد اور ملک عراق پر آپ کا قبضہ کرا دوں گا۔ آپ اس طرف ضرور فوج کشی کریں۔ اس کے جواب میں ہلاکو خاں نے علقمی کے ایلچی سے صرف یہ کہا کہ ''علقمی جو وعدہ کرتا ہے، اس کے لیے کوئی کافی ضمانت نہیں۔ ہم اس کی بات پر کس طرح یقین کر لیں۔'' حقیقت یہ تھی کہ خلیفہ کی کثرت افواج، عربوں کی بہادری اور اہل بغداد کی شجاعت سے مغل بہت مرعوب تھے اور شام کے ملک میں ان کے لشکر کو عرب قبائل کے مقابلے میں شکستیں بھی حاصل ہو چکی تھیں۔ علقمی نے خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر محاصل ملکی کی کمی اور فوج کی تنخواہوں کے زیادہ ہونے کی شکایت کر کے تخفیف لشکر کی تجویز پیش کی اور خلیفہ نے منظور کر لی۔

لشکر بغداد کا بڑا حصہ دوسرے شہروں اور ولایتوں میں منتشر کر دیا گیا۔ جو تھوڑے سے آدمی بچے، ان کی تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے یہ صورت اختیار کی کہ بازار کا محصول وصول کرنے کی لشکریوں کو اجازت دے دی۔ اس سے شہر والوں کو سخت اذیت پہنچی اور شہر میں لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ فوج کے بہت سے دستوں کو وزیر علقمی نے موقوف کر کے نکال دیا اور خلیفہ سے کہہ دیا کہ ان کو تاتاریوں کی روک تھام کے لیے سرحد پر روانہ کیا گیا ہے۔ مقام حلہ میں شیعوں کی آبادی زیادہ نہ تھی۔ حلہ کے شیعوں کو آمادہ کر کے ان سے ہلاکو کے پاس خطوط بھجوائے جن میں لکھا تھا کہ ہمارے بزرگوں نے بہ طور پیش گوئی ہم کو خبر دی تھی کہ فلاں سنہ میں فلاں تاتاری سردار بغداد اور عراق پر قبضہ کر لے گا۔ ان کی پیشین گوئی کے موافق آپ ہی وہ فاتح سردار ہیں اور ہم کو یقین ہے کہ آپ کا

قبضہ اس ملک پر ہونے والا ہے۔ لہٰذا ہم قبل از وقت اپنی فرماں برداری کا اقرار کرتے اور آپ سے اپنے لیے امن طلب کرتے ہیں۔ ہلاکو خاں نے ان کے قاصد کو بہ خوشی امن نامہ لکھ کر دے دیا۔ ہلاکو خاں کے دربار میں نصیرالدین طوسی کو بڑا رسوخ حاصل تھا اور وہ وزارت کی خدمات انجام دیتا تھا۔ نصیرالدین طوسی بھی علقمی کی طرح غالی شیعہ تھا اور علقمی نے نصیرالدین کو خط لکھا کہ جس طرح ممکن ہو، ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ کرنے کی ترغیب دو۔ اس وقت عباسیوں کی تباہی کے لیے بہترین موقع حاصل ہے۔ ساتھ ہی ہلاکو خاں کے نام عریضہ روانہ کیا اور لکھا کہ میں نے بغداد کو فوجوں سے خالی کر دیا ہے اور سامان حرب سب باہر بھیج دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر آپ کیا ضمانت چاہتے ہیں۔ اس عریضہ کے ساتھ ہی والی اربل سے ایک درخواست بھجوائی۔ اس میں بھی بغداد پر حملہ کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔

ہلاکو خاں کے پاس یہ خطوط اس وقت پہنچے جبکہ وہ قرامطہ یعنی اسماعیلیوں سے قلعہ الموت فتح کر چکا تھا اور اسماعیلیوں کا آخری بادشاہ گرفتار ہو کر اس کے سامنے آ چکا تھا۔ ہلاکو خاں نے نصیرالدین طوسی سے مشورہ طلب کیا۔ نصیرالدین نے کہا کہ علم نجوم سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بغداد پر آپ کا قبضہ ہو جائے گا۔ اس لیے بغداد پر حملہ آور ہونے میں آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ چنانچہ ہلاکو خاں نے ایک زبردست فوج بہ طور مقدمۃ الجیش بغداد کی جانب بھیجی۔ جب اس لشکر کے قریب پہنچنے کی خبر مستعصم باللہ نے سنی تو فتح الدین داؤد اور مجاہد بن ایبک کو دس ہزار سواروں کے ساتھ روانہ کیا۔ اس لشکر کا سپہ سالار فتح الدین تھا جو تجربہ کار سپہ سالار اور بہادر شخص تھا۔ مغلوں کے لشکر کو شکست ہوئی اور وہ میدان جنگ سے فرار ہوئے۔ فتح الدین نے اسی جگہ قیام کرنا مناسب سمجھا مگر مجاہدین نے اپنی ناتجربہ کاری سے تعاقب کرنے پر اصرار کیا۔ فتح الدین نے مجبوراً مغلوں کا تعاقب کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں نے لوٹ کر مقابلہ کیا۔ پیچھے سے وہ مغل جو کمین گاہ میں چھپ گئے تھے، حملہ آور ہوئے۔ لشکر بغداد بیچ میں گھر کر حواس باختہ ہو گیا۔ فتح الدین میدان جنگ میں مارا گیا اور مجاہدین نے بھاگ کر بغداد میں دم لیا۔ مجاہدین ہی کی بدتدبیری سے لشکر بغداد کی فتح شکست سے تبدیل ہو گئی مگر خلیفہ مستعصم نے اپنی فطری حماقت سے اس بھگوڑے سردار کو دیکھ کر تین مرتبہ کہا: الحمد للہ علی سلامۃ مجاھد الدین۔ گو لشکر بغداد کو شکست ہوئی مگر ہلاکو خاں کا مقدمۃ الجیش بھی پریشان و مجروح ہو چکا تھا۔ اس لیے خلیفہ مستعصم مطمئن تھا کہ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ مگر علقمی جس نے خلیفہ

کو اب تک بالکل بے خبر رکھا تھا، اپنے دل میں خلیفہ کی حماقت پر ہنس رہا تھا کہ اتنے میں یکا یک خبر مشہور ہوئی کہ ہلاکو خاں نے افواج کثیر کے ساتھ بغداد کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اہل شہر نے مدافعت کی کوشش کی اور پچاس روز تک تاتاریوں کو شہر میں نہیں گھسنے دیا۔ شہر کے شیعوں نے ہلاکو خاں کے لشکر میں جا جا کر امن حاصل کی اور شہر کے حالات سے آگاہی کیا۔ وزیر علقمی شہر کے اندر ہی رہا اور برابر ہلاکو خاں کے پاس دم دم کی خبریں بھیجتا رہا۔

چونکہ وزیر کو اہل شہر سے ہمدردی نہ تھی، لہٰذا اہل شہر دم بہ دم کمزور و پریشان ہوتے گئے۔ آخر وزیر علقمی اول شہر سے نکل کر ہلاکو خاں سے ملا اور صرف اپنے لیے امن طلب کر کے واپس آیا اور خلیفہ سے کہا کہ میں نے آپ کے لیے بھی امن حاصل کر لی ہے۔ آپ ہلاکو خاں کے پاس چلیں۔ وہ آپ کو ملک عراق پر اسی طرح قابض و متصرف رکھے گا، جیسا کہ غیاث الدین کیخسرو کو تاتاریوں نے اس کے ملک پر حاکم وفرماں روا رکھا ہے۔ خلیفہ مع اپنے بیٹے کے شہر سے نکل کر ہلاکو خاں کے لشکر میں پہنچا۔ ہلاکو خاں نے خلیفہ کو دیکھ کر کہا کہ اپنے اراکین سلطنت اور شہر کے علماء کو بھی آپ بلوائیں۔ خلیفہ کو ہلاکو خاں نے اپنے لشکر میں روکے رکھا۔ خلیفہ کا حکم سن کر علماء اور اراکین سلطنت شہر سے نکل کر لشکر تاتار میں آئے۔ ان سب کو ایک ایک کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہلاکو نے خلیفہ سے کہا کہ تم شہر میں پیغام بھیج دو کہ اہل شہر ہتھیار رکھ کر سب خالی ہاتھ شہر سے باہر آ جائیں۔ مستعصم نے یہ پیغام بھی شہر میں بھیج دیا۔ اہل شہر باہر نکلے اور تاتاریوں نے ان کو قتل کرنا شروع کیا۔ شہر کے تمام سوار و پیادے اور شرفاء کھیرے ککڑی کی طرح کئی لاکھ کی تعداد میں مقتول ہوئے۔ شہر کی خندق ان لاشوں سے ہموار ہو گئی، پھر دریائے دجلہ میں ان مقتولوں کے خون کی کثرت سے پانی سرخ ہو گیا۔ تاتاری لوگ شہر میں گھس پڑے۔ عورتیں اور بچے اپنے سروں پر قرآن مجید رکھ کر گھروں سے نکلے مگر تاتاریوں کی تلوار سے کوئی بھی نہ بچ سکا۔ ہلاکو خاں نے اپنے لشکر کو قتل عام کا حکم دے دیا تھا۔ بغداد اور اس کے مضافات میں تاتاریوں نے چن چن کر لوگوں کو قتل کیا۔ بغداد میں صرف چند شخص جو کنویں یا اسی قسم کی کسی پوشیدہ جگہ میں چھپے ہوئے رہ گئے، بچ گئے۔ باقی کوئی متنفس زندہ نہیں چھوڑا گیا۔ اگلے دن جمعہ ۹ صفر سنہ ۶۵۶ھ کو ہلاکو خاں خلیفہ مستعصم کو ہمراہ لیے ہوئے بغداد میں داخل ہوا۔ قصر خلافت میں داخل ہو کر اجلاس کیا، خلیفہ کو سامنے بلوایا اور کہا کہ ہم تمہارے مہمان ہیں۔ ہمارے لیے کچھ حاضر کرو۔ خلیفہ پر اس قدر دہشت طاری تھی کہ وہ کنجیوں کو پہچان نہ سکا۔ آخر

خزانے کے تالے توڑے گئے۔ دو ہزار نہایت نفیس پوشاکیں، ہزار دینار اور سونے کے زیورات ہلاکو کے سامنے پیش کیے گئے۔ اس نے کہا کہ یہ چیزیں تو تم نہ دیتے تب بھی ہماری ہی تھیں۔ یہ کہہ کر اپنے درباریوں میں سب تقسیم کر دیا اور کہا کہ ان خزانوں کا پتہ بتاؤ جن کا حال کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں مدفون ہیں؟ خلیفہ نے فوراً ان خزانوں کا پتہ بتایا، زمین کو کھود کر دیکھا گیا تو جواہرات اور اشرفیوں کی تھیلیوں سے بھرے ہوئے حوض نکلے۔

ہلاکو خاں کی فوج کے ہاتھ سے بغداد اور مضافات بغداد میں ایک کروڑ چھ لاکھ مسلمان مقتول ہوئے اور یہ تمام زہرہ گداز نظارے خلیفہ مستعصم کو دیکھنے پڑے۔ ہلاکو خاں نے خلیفہ کو بے آب ودانہ نظر بند رکھا۔ خلیفہ کو بھوک لگی اور کھانا مانگا تو ہلاکو خاں نے حکم دیا کہ ایک طشت جواہرات کا بھر کر سامنے لے جاؤ اور اسے کھاؤ۔ خلیفہ نے کہا کہ میں ان کو کیسے کھا سکتا ہوں؟ ہلاکو خاں نے کہلا بھیجا کہ جس چیز کو تم کھا نہیں سکتے، اس کو اپنی اور لاکھوں مسلمانوں کی جان بچانے کے لیے کیوں نہ خرچ کیا اور سپاہیوں کو کیوں نہ دیا کہ وہ تمہاری طرف سے لڑتے اور تمہارا موروثی ملک بچاتے اور ہماری دست برد سے محفوظ رکھتے۔ اس کے بعد ہلاکو خاں نے مستعصم کے قتل کرنے کا مشورہ اپنے اراکین سے کیا۔ سب نے قتل کرنے کی رائے دی مگر نصیرالدین طوسی علقمی نے یہ ستم ظریفی کی کہ ہلاکو خاں سے عرض کیا کہ مستعصم مسلمانوں کا خلیفہ ہے۔ اس کے خون سے تلوار کو آلودہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ نمدے میں لپیٹ کر لاتوں سے کچلوانا چاہیے۔ چنانچہ یہ کام علقمی کے سپرد ہوا اور اس نے اپنے آقا مستعصم باللہ کو نمدے میں لپیٹ کر اور ایک ستون سے باندھ کر اس قدر لاتیں لگوائیں کہ خلیفہ کا دم نکل گیا۔ پھر اس کی لاش کو زمین میں ڈال کر مغل سپاہیوں کے پاؤں سے کچلوا کر پارہ پارہ اور ریزہ ریزہ کرا دیا اور خود دیکھ کر خوش ہوتا رہا کہ میں علویوں کے خون کا بدلہ لے رہا ہوں۔ غرض خلیفہ کی لاش کو گور و کفن بھی نصیب نہ ہوا اور خاندان عباسیہ کا کوئی شخص بھی مغلوں کے قبضہ میں زندہ نہ بچ سکا۔

اس کے بعد ہلاکو خاں نے شاہی کتب خانے کی طرف توجہ کی، جس میں بے شمار کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ یہ تمام کتابیں دریائے دجلہ میں پھینک دی گئیں، جس سے دجلہ میں ایک بند سا بندھ گیا اور بہ تدریج پانی سب کو بہا کر لے گیا۔ دجلہ کا پانی جو اس سے پہلے مقتولین کے خون سے سرخ ہو رہا تھا، اب ان کتابوں کی سیاہی سے سیاہ ہو گیا اور عرصہ تک سیاہ رہا۔ تمام شاہی محلات لوٹ لینے کے بعد

مسمار کر دیے گئے۔ غرض یہ ایسی عظیم الشان خون ریزی اور بربادی تھی جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔ اسلام پر یہ ایسی مصیبت آئی تھی کہ لوگوں نے اس کو قیامت صغریٰ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔[1] علقمی نے جو اس تمام بربادی وخون ریزی کا باعث ہوا تھا، اب کوشش کی کہ ہلاکو خاں بغداد میں کسی علوی کو حاکم مقرر کرے اور اسی کو خلیفہ کا خطاب دے۔ ابتداء میں جب ہلاکو خاں بغداد پر حملہ آور ہوا تو علقمی کو بہتری کی توقع دلا دی گئی تھی اور اس کو یقین تھا کہ ہلاکو خاں کسی ہاشمی علوی کو خلیفہ بنا کر مجھ کو اس کا نائب السلطنت بنا دے گا لیکن ہلاکو خاں نے عراق میں اپنے عامل مقرر کر دیے۔ یہ دیکھ کر علقمی بہت پریشان ہوا۔ بڑی بڑی چالیں چلا اور اپنے مقصد حاصل کرنے کے لیے ہلاکو خاں کی خدمت میں گڑگڑایا اور خوشامدانہ التجائیں کیں مگر ہلاکو خاں نے اس کو اس طرح دھتکار دیا جیسے کتے کو دھتکار دیتے ہیں۔ چند روز تک علقمی ادنیٰ غلاموں کی طرح تاتاریوں کے ساتھ ساتھ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا رہا۔ آخر اسی ناکامی کے صدمہ سے بہت جلد مر گیا۔ خلیفہ مستعصم باللہ خلفاء عباسیہ کا آخری خلیفہ تھا، جس نے بغداد میں خلافت کی۔ سنہ ۶۵۶ ھ کے بعد بغداد دارالخلافہ نہ رہا۔ خلیفہ مستعصم کے بعد دنیا میں ساڑھے تین سال تک کوئی خلیفہ نہ تھا۔ اس کے بعد رجب سنہ ۶۵۹ ھ میں مستعصم باللہ کے چچا ابوالقاسم احمد کے ہاتھ پر بیعت خلافت ہوئی۔

خلفائے عباسیہ مصر میں

سلطان صلاح الدین بن ایوب نے حکومت عبیدیہ کے بعد مصر میں دولت ایوبیہ کی بنیاد ڈالی تھی، جس کا اجمالی تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ سنہ ۶۴۸ ھ تک مصر، شام اور حجاز کی حکومت سلطان صلاح الدین کے خاندان میں رہی۔ سلطان صلاح الدین چونکہ کرد قوم سے تھے، اس لیے دولت ایوبیہ کو دولت کردیہ بھی کہتے ہیں۔ دولت ایوبیہ کا ساتواں بادشاہ ملک الصالح تھا جو سلطان صلاح الدین کے بھائی کا پڑپوتا تھا۔ اس نے اپنے خاندانی رقیبوں کے خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے علاقہ کوہ قاف یعنی صوبہ سرکیشیا کے بارہ ہزار غلام خرید کر اپنی حفاظت کے لیے ایک جدید آئینی پیدل فوج قائم کی۔ اس کے عہد سلطنت میں فرانس کے عیسائی بادشاہ نے مصر پر جہازوں کے ذریعہ سے فوج لا

---

[1] اگرچہ محاورتاً اہل زبان بڑے مصائب کو قیامت صغریٰ سے تعبیر کرتے ہیں، جس سے ان کا مقصد اس مصیبت یا تکلیف کی شدت کو بیان کرنا ہوتا ہے! لیکن بہرحال ایسے مصائب کو قیامت پر تطبیق دینا یا قیاس کرنا درست نہیں۔

کر حملہ کیا۔ مملوک فوج نے نہایت بردباری کے ساتھ مقابلہ کر کے فرانس کے بادشاہ کو میدان جنگ میں گرفتار کر لیا۔ اس کارنامہ کے بعد مملوک فوج کا مرتبہ اور بھی بلند ہو گیا۔ ملک الصالح کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ملک معظم توران شاہ تخت نشین ہوا مگر دو ہی مہینے کے بعد تخت سلطنت پر ملک الصالح کی محبوب کنیز شجرۃ الدرنامی قابض ہو گئی۔ اس ملکہ کے عہد حکومت میں بے چینی و سرکشی کے آثار نمایاں ہوئے۔ ملکہ شجرۃ الدر تین مہینے سلطنت کرنے کے بعد گوشہ نشین ہو گئی اور برائے نام خاندان ایوبیہ کا ایک شخص ملک الاشرف موسیٰ بن یوسف تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد حکومت میں مملوکوں کا زور اور بھی ترقی کر گیا۔ آخر سنہ ۶۵۰ھ میں مملوکوں نے اپنی جماعت میں سے ایک شخص عزیز الدین ایبک صالح کو ملک المعز کے لقب سے تخت نشین کیا اور مصر میں خاندان ایوبیہ کی حکومت کا سلسلہ ختم ہو کر مملوکیوں یعنی غلاموں کی حکومت شروع ہوئی، جو عرصہ دراز تک رہی۔

سنہ ۶۵۵ھ میں ملک المعز کے بعد اس کا نوعمر بیٹا علی تخت نشین ہوا اور اس کا لقب ملک المنصور رکھا گیا اور اس کا اتابک امیر سیف الدین مملوک مقرر ہوا۔ سنہ ۶۵۷ھ میں علماء سے فتویٰ حاصل کر کے ملک المنصور اس لیے معزول کیا گیا کہ وہ ابھی بچہ تھا۔ اس کی جگہ امیر سیف الدین تخت نشین ہوا اور اس کا خطاب ملک المظفر تجویز ہوا۔ عام طور پر مملوک اپنے اندر سے پچیس آدمیوں کو منتخب کر کے ان کو حکومت کا اختیار دے دیا کرتے تھے۔ یہی بیس پچیس آدمی حکمراں کونسل کے ممبر سمجھے جاتے اور اپنے اندر سے کسی ایک شخص کو منتخب کر کے اپنا صدر یا امیر بنا لیتے تھے۔ یہ صدر منتخب ہو کر بادشاہوں کی طرح تخت نشین ہوتا اور سلطان یا ملک کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ سلطان تخت نشین ہونے کے بعد باقی ممبران کونسل کو سلطنت کے بڑے بڑے فوجی و ملکی عہدے سپرد کرتا تھا۔ ان بیس یا پچیس عہدے داروں ہی میں سے کوئی وزیراعظم ہوتا تھا، کوئی رئیس المعسکر، کوئی افسر پولیس ہوتا تھا، کوئی افسر مال۔ غرض ان کے سوا باقی لوگوں کو ان سے کم درجے کے عہدے اور اختیارات ملتے تھے۔ ان سب کا مرتبہ سب پر فائق ہوتا تھا۔ مملوک فوج کے کچھ آدمی فوت ہو جاتے یا لڑائی میں مارے جاتے تو فوراً سرکاری خزانہ سے اسی قدر سرکیشی غلام خرید کر تعداد کو پورا کر دیا جاتا۔ اس نظام پر چراکیسمہ یعنی مملوکوں کے طبقہ دوم نے زیادہ عمل درآمد کیا۔ ہندوستان میں بھی غلاموں کا خاندان حکمراں رہا ہے مگر اس میں دو تین بادشاہوں کے سوا باقی سب بادشاہ شمس الدین التمش کی اولاد سے تھے اور اس میں وہی وراثت حکومت کی لعنت موجود تھی لیکن مصر کے تخت پر متمکن ہونے والے مملوک

اکثر زرخرید غلام ہوتے تھے اور اپنی ذاتی قابلیت کے سبب سے تخت حکومت تک پہنچتے تھے۔ مورخین نے اس طرف توجہ نہیں کی اور دولت مملوکیہ مصر کی اس خصوصیت کو نمایاں اور واضح تر الفاظ میں بیان نہیں کیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دولت مملوکیہ مصر میں اگرچہ بعض باتیں قابل اصلاح ضرور تھیں مگر یہ بات بے حد قابل تعریف تھی کہ بادشاہ کے انتخاب کا موقع اکثر آزاد لوگوں کو مل جاتا تھا۔

اس سلطنت کے حالات ایک جداگانہ باب میں ان شاء اللہ بالتفصیل بیان ہوں گے۔ اس وقت صرف اس قدر بیان کرنا ضروری ہے کہ ملک مظفر نے جب یہ سنا کہ مغل یعنی تاتاری افواج نے بغداد وعراق اور خراسان، فارس، آذربائیجان، جزیرہ وموصل وغیرہ کو برباد وپامال کرنے کے بعد اپنی پوری طاقت سے شام کے علاقے کو برباد اور خاک سیاہ بنانا شروع کر دیا ہے تو وہ اپنا مملوک لشکر اور مصری افواج لے کر مصر سے شام کی طرف متوجہ ہوا اور ۱۵ رمضان المبارک سنہ ۶۵۵ھ جمعہ کے دن نہر جالوت پر مملوک فوج نے جس کا سپہ سالار رکن الدین بیبرس تھا، مغلوں یعنی تاتاریوں کے لشکر عظیم کو ایسی شکست فاش دی کہ آج تک مغلوں کو ایسی ذلت آفریں شکست کھانے کا موقع نہ ملا تھا۔ ہزارہا مغل میدان جنگ میں کھیت رہے اور باقی مملوکیوں کے مقابلے سے اس طرح بھاگے جیسے شیروں کے سامنے سے گوسفند[1] کا گلہ فرار ہوتا ہے۔ مملوکیوں کے ہاتھ مغلوں کا بہت کچھ سازوسامان آیا اور ان کی دھاک مغلوں کے دلوں پر اس قدر بیٹھ گئی کہ مغلوں نے بیسیوں سلطنتوں کو تہ و بالا کر ڈالا مگر ملک مصر کی طرف مملوکیوں کے خوف سے ان کو نظر بھر دیکھنے کی جرأت نہ رہی۔ مملوکیوں نے حلب تک مغلوں کا تعاقب کیا، پھر مصر کی جانب چلے گئے۔

۱۶ ذیقعدہ سنہ ۶۵۸ھ کو ملک المظفر کے مقتول ہونے پر رکن الدین بیبرس تخت نشین ہوا اور اپنا لقب ملک الظاہر تجویز کیا۔ ملک الظاہر کو تخت نشین ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ خاندان عباسیہ کے سینتیسویں آخری خلیفہ مستعصم باللہ کا چچا ابوالقاسم احمد جو بغداد میں عرصہ سے قید تھا، بغداد کی بربادی اور مستعصم کے قتل ہونے کے باعث کسی طرح قید خانہ سے نکل کر اور چھپ کر بھاگ نکلا تھا اور وہ ملک شام کے کسی مقام میں روپوش اور موجود ہے۔ چنانچہ ملک الظاہر نے دس معزز عربوں کا ایک وفد مصر سے ابوالقاسم احمد بن ظاہر بامر اللہ عباسی کی تلاش میں روانہ کیا۔ یہ لوگ ابوالقاسم احمد کو ہمراہ لے کر مصر پہنچے۔ ملک الظاہر، ابوالقاسم کے قریب پہنچنے کی خبر سن کر مصر کے تمام علماء وارکین کو لے کر

---

[1] بھیڑ یا بکری

استقبال کے لیے اپنے دارالسلطنت قاہرہ سے نکلا اور نہایت عزت و احترام سے شہر میں لا کر اس کے ہاتھ پر ۱۳ رجب سنہ ۶۵۹ ھ کو بیعت خلافت کی اور المستقر باللہ کا لقب تجویز کیا۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا، سکوں پر خلیفہ کا نام مسکوک کرایا۔ جمعہ کے دن خلیفہ کے جلوس کے ساتھ جامع مسجد میں آیا، بنی عباس کا شرف خطبہ میں بیان کیا اور خلیفہ کے واسطے دعا کی۔ بعد نماز خلیفہ نے سلطان ظاہر کو خلعت عطا کیا۔ ۴ شعبان سنہ ۶۵۹ ھ دوشنبہ کے دن قاہرہ سے باہر خیمے نصب ہوئے۔ خلیفہ نے دربار منعقد کیا اور اپنی طرف سے ملک الظاہر کو نائب السلطنت قرار دے کر سلطنت مصر کے سیاہ و سفید کا اختیار دیا یعنی اس مضمون کا ایک فرمان لکھ کر لوگوں کو سنایا۔ ملک الظاہر نے خلیفہ کے واسطے خدمت گار، خزانچی، آب دار اور ضروری اہل کار مقرر کر دیے اور خزانہ مصر کا ایک حصہ خلیفہ کے لیے مخصوص کر دیا، جس میں تصرف کا اختیار حاصل رہا۔ اس طرح ساڑھے تین سال مستعصم باللہ ابوالقاسم احمد نے خلافت کی۔ ۲ محرم سنہ ۶۶۰ ھ کو جبکہ ملک الظاہر سے فوج لے کر تاتاریوں سے لڑنے کو ملک شام میں آیا ہوا تھا، ایک لڑائی میں گم یا مقتول ہو گیا۔

خلیفہ کے مفقودالخبر ہونے کے بعد ایک سال تک پھر زمانہ فترت گزرا اور ملک الظاہر نے ایک اور عباسی شہزادے کا پتہ لگا کر بلوایا اور اس کو خلیفہ بنایا۔ اس شہزادے کا نام ابوالعباس احمد بن حسن بن علی بن ابی بکر بن خلیفہ مسترشد باللہ بن مستظہر باللہ تھا۔ اس کے پردادا تک کوئی خلیفہ نہ ہوا تھا۔ اس طرح خلیفہ مسترشد کی اولاد میں پھر خلافت عباسیہ شروع ہوئی۔ اس خلیفہ کا لقب حاکم بامراللہ تجویز ہوا اور ۸ محرم سنہ ۶۶۱ ھ کو وہ تخت نشین ہوا۔ سنہ ۶۷۴ ھ میں ملک الظاہر فوت ہوا، ملک السعید تخت نشین ہوا۔ سنہ ۶۷۸ ھ میں ملک المنصور مصر کا سلطان مقرر ہوا۔ سنہ ۶۸۰ ھ میں ملک المنصور نے تاتاریوں کو شام میں پہنچ کر شکست فاش دے کر بھگا دیا۔ سنہ ۶۸۹ ھ میں ملک المنصور فوت ہوا اور ملک الاشرف تخت نشین ہوا۔ ۱۸ جمادی الاول سنہ ۷۰۱ ھ کو خلیفہ الحاکم بامراللہ چالیس سال ۵ مہینے دس دن کی خلافت کے بعد فوت ہو کر قاہرہ میں مدفون ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ابوالربیع مستکفی باللہ خلیفہ بنایا گیا۔ خلاصہ یہ کہ مصر میں سنہ ۹۲۲ ھ تک مملوکوں کی خودمختار سلطنت قائم رہی۔ سنہ ۷۸۴ ھ تک سرکیشی مملوک جو مملوک بحریہ کہلاتے تھے، حکمران ہوتے رہے۔ اس کے بعد مملوکوں کی ایک دوسری قوم جو چرکسی مملوک کہلاتے تھے، بادشاہ ہونے لگے۔ بحریہ مملوکوں کا آخری سلطان ملک صالح رمضان سنہ ۷۸۴ ھ میں معزول ہوا اور برقوق چرکس ملک الظاہر کے لقب سے

تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۹۲۲ھ تک یکے بعد دیگرے چرکسی (گرجی) مملوک مصر کے بادشاہ ہوتے رہے۔ گرجی یا چرکسی مملوکوں کے آخری سلطان طومان بے کو سلطان سلیم عثمانی کے مقابلہ میں شکست ہوئی اور مصر کا ملک سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات میں شامل ہوا۔

مملوکوں کی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں خلفائے عباسیہ کا دوسرا سلسلہ مصر میں شروع ہو گیا تھا، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ یہ سلسلہ مملوکوں کی حکومت کے ساتھ ہی سنہ ۹۲۲ھ میں ختم ہوا۔ مصر میں خلفائے عباسیہ کی حالت اسی قسم کی تھی، جیسے آج کل پیروں کی گدیاں نظر آتی ہیں۔ نام کے لیے تو یہ خلیفہ کہلاتے اور اپنے ولی عہد بھی مقرر کرتے تھے۔ بھارت اور دوسرے ملکوں کے مسلمان بادشاہ ان سے سند حکومت اور خطاب بھی حاصل کرتے تھے۔ مصر کے مملوک سلاطین بھی اپنے آپ کو ان خلفاء کا نائب السلطنت ہی کہتے تھے اور بہ ظاہر تعظیم وتکریم کا برتاؤ کرتے اور خطبوں میں ان کا نام لیتے تھے۔ مگر حقیقتاً ان کو کوئی قوت وشوکت حاصل نہ تھی۔ ان کی تنخواہ مقرر تھی۔ سلاطین مصر ان کو نہ آزادانہ کہیں آنے جانے کی اجازت دیتے تھے، نہ کسی شخص کو ان سے ملنے کی اجازت تھی۔ یہ خلفاء اپنے اراکین خاندان کے ساتھ گویا اپنے محدود قصر میں نظر بند رہتے تھے۔ ان کی حیثیت ایک سیاسی شاہی قیدی کی تھی۔ ان کو خلیفہ کہا جاتا تھا لیکن خلافت اسلامیہ کا مفہوم ان سے اسی قدر بعد رکھتا تھا، جس قدر زمین سے آسمان تک کا فاصلہ ہے۔ سلطان سلیم عثمانی نے مصر پر قبضہ کرنے کے بعد مصر کے عباسی خلیفہ محمد نامی پر بھی قبضہ کیا جو خلفائے مصر کے سلسلہ میں اٹھارھواں اور آخری خلیفہ تھا۔ اس خلیفہ کے پاس جو علم اور جبہ بطور نشان خلافت موجود تھا، وہ سلطان سلیم نے اس کو رضامند کر کے لے لیا اور مصر سے چلتے وقت اس آخری عباسی خلیفہ کو بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ اس عباسی خلیفہ نے سلطان سلیم کو امر خلافت میں اپنا جانشین بنا دیا اور اس طرح سنہ ۹۲۲ھ میں عباسیوں کی وہ خلافت جو سفاح سے شروع ہو کر اب آٹھ سو برس کے بعد برائے نام اور اسم بے مسمّٰی ہو کر رہ گئی تھی، ختم ہوئی اور خاندان عثمانیہ میں جو اس زمانہ میں سب سے زیادہ حقدار خلافت تھا، شروع ہوئی۔ خاندان عباسیہ میں سینتیس (۳۷) خلیفہ بغداد وعراق میں ہوئے اور اٹھارہ مصر میں جن کی کل تعداد پچپن ہوتی ہے۔

خاندان عباسیہ کے سلسلہ پر نظر ڈالتے ہوئے اس وقت ہم بہت دور آگے نکل آئے ہیں۔ اب ہم کو پھر اس سلسلہ کے شروع میں واپس جانا ہے اور دائیں بائیں طرف جن ضروری اور اہم شاخوں کو چھوڑتے چلے آئے ہیں، ان کا مطالعہ کیے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ شاید اس جگہ

قارئین کرام کو خلافت عباسیہ کے متعلق کسی تبصرہ اور ریویو کی توقع ہو لیکن میں کہنے کے قابل باتیں سب لکھ چکا ہوں اور اب اس اثر کو جو اس عظیم الشان خاندان خلافت کا انجام دیکھ لینے کے بعد فطری طور پر قلب پر طاری ہوا ہے، ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ ہاں اگلے باب میں بعض ضروری باتیں گوش گزار کر کے اس جلد کو ختم کرتا ہوں، وباللہ التوفیق۔

❀......❀......❀

چوتھا باب

پہلی فصل

خلافت بنوامیہ اور خلافت عباسیہ کے حالات ختم ہو چکے ہیں مگر ان حالات کے پڑھنے سے خلفاء کی حکومت وطاقت، فتوحات اور لڑائیوں کا مختصر سا خاکہ ذہن میں قائم ہوتا ہے اور عام طور پر مورخین بادشاہوں اور حکمرانوں کے اسی قسم کے حالات اپنی تاریخوں میں لکھتے ہیں۔ انہیں کو بہ طور خلاصہ اوپر درج کیا گیا ہے لیکن آج کل فن تاریخ نے جو ترقی کی ہے، اس کی وجہ سے کسی نئی مرتب کی ہوئی تاریخ میں یہ بھی تلاش کیا جاتا ہے کہ جس زمانہ یا جس سلطنت کی تاریخ ہے، اس زمانہ یا سلطنت میں اصول حکمرانی کیا تھے؟ لوگوں کی معاشرت کیسی تھی اور علمی ترقیات کی کیا کیفیت تھی؟ وغیرہ۔ کتاب مطالعہ کرنے والوں کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے کم از کم اس سے دوگنی تعداد کے صفحات اور درکار ہیں اور کماحقہ یہ خواہش اس مختصر کتاب کے ذریعہ سے پوری نہیں ہوسکتی۔ اس نقص کا اقرار کر لینے کے بعد ذیل میں چند اشارات بعض قابل قدر کتابوں کی مدد سے درج کرتا ہوں۔

سلطنت کے قابل تذکرہ اہل کار اور عہدے دار:

خلافت بنوامیہ ایک فاتح وملک گیر سلطنت تھی۔ اس کے زمانہ میں عرب قوم فاتح اور تمام اقوام مفتوح سمجھی جاتی تھیں۔ عربوں میں مذہبی جوش موجود تھا اور قرآن کریم وسنت رسول ﷺ کے سوا کوئی قانون ان کے لیے واجب التعمیل اور نافذ الفرمان نہ ہوسکتا تھا۔ مسلمان آپس میں بھی لڑتے تھے مگر ان لڑائیوں اور چڑھائیوں کے باوجود عرب، شام، مصر اور عراق وغیرہ اسلامی ممالک میں باشندوں کی عام زندگی اور قیام امن کسی پیچیدہ نظام سلطنت کی خواہاں نہ تھی۔ خلیفہ اہم امور میں مشورے لیتا تھا مگر مشورے لینے کے لیے مجبور بھی نہ تھا۔ خلیفہ کو بلا طلب بھی مشورے دیے جاتے تھے، اور بسا اوقات اس کو وہ منظور بھی کرنے پڑتے تھے۔ حکومت میں عام طور پر عربی سادگی موجود تھی۔ معمولی بدوی خلیفہ تک پہنچ سکتے تھے اور ان بادیہ نشینوں کی طاقت لسانی کو خلیفہ کا رعب حکومت

مطلق کم نہیں کر سکتا تھا۔ خلیفہ صوبوں اور ولایتوں کی حکومت پر اپنے نائب مقرر کر کے بھیجتا تھا اور ان کو اس صوبہ یا ولایت میں کامل شاہانہ اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ خلیفہ جس طرح تمام عالم اسلام کا فرماں روا تھا، اسی طرح وہ تمام عالم اسلام کا سپہ سالار اعظم بھی ہوتا تھا۔ صوبوں اور ولایتوں کے عامل اپنے صوبہ کے بادشاہ بھی ہوتے تھے اور سپہ سالار بھی، وہی دینی پیشوا اور نمازوں کے امام ہوتے تھے اور وہی قاضی قضاۃ بھی۔ خلیفہ کو بھی جب کسی دینی مسئلہ کی نسبت شک ہوتا تھا تو علماء سے دریافت کرنے میں مطلق عار نہ تھی۔ اسی طرح عاملوں اور والیوں کو بھی علماء سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات صوبوں میں ایک عامل یعنی گورنر مقرر ہوتا تھا اور اسی کے ساتھ ہی دوسرا قاضی یا چیف جج دربار خلافت سے مقرر ہوتا تھا۔ عامل کا کام ملک میں انتظام قائم رکھنا، فوج کشی کرنا، دشمن کی مدافعت کے لیے آمادہ رہنا، رعایا کی حفاظت کرنا اور محاصل ملکی وصول کر کے خزانہ میں جمع کرنا ہوتا تھا اور قاضی کا کام حدود شرعیہ کو جاری کرنا، جھگڑوں کے فیصلوں کی خدمات انجام دینا اور احکام شرعی کی پابندی کرانا ہوتا تھا۔ اس حالت میں عامل صرف سپہ سالار افواج ہوتا تھا۔ غرض خلافت بنوامیہ میں سادگی زیادہ تھی۔ شرعی قوانین سے تمام دقتوں کو رفع کر دیا جاتا تھا اور رعایا عدل وانصاف کی وجہ سے بہت خوش حال اور فارغ البال تھی۔ نہ رعایا سے کوئی نامناسب ٹیکس یا محصول لیا جاتا تھا نہ سلطنت کو انتظام ملک کے لیے زیادہ روپیہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ خلیفہ تمام اسلامی دنیا کا روحانی پیشوا بھی سمجھا جاتا تھا اور دنیوی بادشاہ بھی۔ اس لیے ملک میں امن وامان کے قائم رکھنے میں بڑی آسانی ہوتی تھی۔ کوئی باقاعدہ وزارت کا عہدہ نہ تھا اور ضرورت کے وقت ہر شخص وزارت کے کام انجام دے سکتا تھا۔

خلافت عباسیہ میں عربوں کے سوا ایرانیوں اور ترکوں کو بھی فاتح قوم کے حقوق ملنے لگے اور بہ تدریج مفتوح قوم کا اقتدار عرب فاتحین سے بھی بڑھ گیا۔ اس لیے ملکی انتظام میں پیچیدگی واقع ہوئی۔ اگر عرب، ایرانی اور ترک سب کو احکام اسلام کے موافق مساوی درجہ میں رکھا جاتا اور حقیقی مساوات قائم ہوتی تو بنوامیہ کے زمانہ سے بھی زیادہ سادگی اور خوبی انتظام سلطنت میں نمایاں ہوتی۔ مگر بدقسمتی سے ایسی صورتیں پیش آتی رہیں کہ ان قوموں میں مخالفت اور رقابت ترقی کرتی رہی، جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ایرانیوں کو عربوں پر فضیلت دی گئی اور ایرانی وسامانی معاشرت کو دربار خلافت نے اختیار کر کے عربی راحت رساں سادگی کو حقارت کے ساتھ رد کر دیا اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا

کہ خلافت اسلامیہ کو ایسی پیچیدگیوں میں مبتلا ہونا پڑا جس سے اس کا اعتبار و اقتدار بہ تدریج کم ہوتے ہوتے فنا ہو گیا۔ بہر حال خلافت عباسیہ کے قابل تذکرہ عہدوں کی فہرست پیش کرنا مقصود ہے:

وزیر اعظم:

ابتداء میں خلیفہ کا ایک ہی وزیر ہوتا تھا اور وہ ہر ایک اعتبار سے خلیفہ کا نائب یا قائم مقام اور تمام صیغوں کا افسر ہوتا تھا۔ بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ ایک شخص تمام محکموں کی پوری ذمہ داری نہیں لے سکتا تو وزیر اعظم کے ماتحت الگ الگ صیغوں کے وزیر بھی مقرر ہونے لگے۔ وزیر اعظم کو ابتدائی خلفاء کے عہد میں صرف وہی اختیارات حاصل ہوتے تھے جو خلیفہ تفویض کر دیتا تھا۔ بہت سے معاملات ایسے ہوتے تھے جن کو کرنے کا اختیار خلیفہ کے سوا کسی دوسرے کو نہ ہوتا تھا، وہاں وزیر اعظم خلیفہ کو مشورہ دے سکتا تھا۔ اس قسم کے مشورے لینے میں صرف وزیر اعظم ہی نہیں بلکہ دوسرے اراکین سلطنت کو بھی خلیفہ تکلیف دیا کرتا تھا۔ بعض خلیفہ مثلاً ہارون الرشید نے اپنے وزیر اعظم کو سلطنت کے ہر ایک معاملہ میں کلی اختیارات عطا کر دیے تھے۔ وزیر اعظم ہی ہر قسم کے احکامات جاری کر دیتا اور خلیفہ کو اپنے جاری کردہ اہم احکام کی صرف اطلاع دیتا تھا۔ ایسے با اختیار وزیروں کا مرتبہ بہت ہی بلند ہوتا تھا اور وہ درحقیقت خلیفہ سے بھی زیادہ سیاہ و سفید کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ بعد میں جب خلفاء بہت کمزور ہونے لگے اور دیلمی امیر الامراء یا سلجوقی سلاطین خلافت پر مسلط ہو گئے، خلیفہ کا وزیر اعظم الگ ہوتا اور ان سلاطین کا وزیر اعظم جدا ہوتا تھا، اس زمانہ میں خلیفہ کی وزارت کوئی بہت بڑی چیز نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس دوعملی کے زمانہ میں بعض اوقات خلیفہ کے وزیر کو رئیس الرؤسا اور سلطان کے وزیر کو وزیر کہتے تھے۔ بعض اوقات خلیفہ کے وزیر کو خلیفہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہوتے تھے اور جبکہ خلیفہ کا وزیر سلطان نے مقرر کیا ہو تو خلیفہ اپنے وزیر کا قیدی ہوتا تھا۔

وزیر اعظم کا انتخاب عموماً خلیفہ اپنی ذاتی واقفیت کی بناً پر کرتا تھا اور بعض اوقات وہ نہایت معمولی طبقہ میں سے ایک شخص کو خلعت وزارت دے کر سب سے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیتا تھا اور کبھی ایک وزیر کے بعد اس کے بیٹے کو وزارت کا عہدہ دیا جاتا تھا۔ جعفر برمکی وزیر ہارون الرشید، فضل وزیر مامون الرشید، نظام الملک وزیر الپ ارسلان و ملک شاہ بہت مشہور وزیر ہیں۔

امیر الامراء:

یہ عہدہ خلفاء عباسیہ کے دور انحطاط وتنزل میں قائم ہوا اور لوگوں نے خلیفہ پر مسلط ہو کر امیر الامراء کا خطاب خود اپنے لیے تجویز کر کے خلیفہ سے حاصل کیا۔ یہ امیر الامراء حقیقتاً عراق، فارس اور خراسان کے فرماں روا تھے اور تمام عہدے دار انہیں کے ماتحت اور انہیں کے مقرر کیے ہوئے ہوتے تھے۔ خلیفہ تو صرف برائے نام یا برائے بیعت ہی ہوتا تھا۔ دیلمیوں کا زمانہ قریباً سو برس تک رہا اور وہ امیر الامراء کہلاتے تھے۔

سلطان:

جس طرح دیلمیوں نے امیر الامراء اپنا خطاب تجویز کیا، اسی طرح سلجوقیوں نے اپنے لیے سلطان کا خطاب پسند کیا۔ یہ سلجوقی سلاطین دیلمیوں سے زیادہ طاقتور، زیادہ دین دار اور دنیا کے زیادہ وسیع رقبہ پر حکمران تھے مگر دیلمیوں کی نسبت خلیفہ کے زیادہ فرماں بردار تھے۔ دیلمیوں نے دربار خلافت کے تمام اثر واقتدار کو سلب کر لیا تھا۔ سلجوقیوں نے خلیفہ کی عظمت کو تسلیم کیا اور خلفاء کو حکومت وفرماں روائی کا بھی موقع دیا اور انہیں کے زمانے میں خلفاء نے اپنی شوکت وحکومت کو واپس لینے کی کوشش میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی۔ خلفاء عباسیہ کے ابتدائی عہد خلافت میں امیر الامراء اور سلطان کے عہدے نہ تھے۔

عامل یا والی:

صوبوں اور ولایتوں کے حاکموں کو عموماً اختیارات حاصل ہوتے تھے اور ہر ایک عامل یا والی اپنے صوبہ کی آمدنی کا ایک مقررہ حصہ دربار خلافت میں بھیجتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی کسی صوبہ کے لیے خراج کی ایک متعین رقم مقرر کر کے کسی عامل کو بھیج دیا جاتا تھا۔ اس کو اس صوبے کے اندرونی انتظام میں کامل آزادی حاصل ہوتی تھی اور وہ مقررہ رقم سال بہ سال خزانہ خلافت میں داخل کرتا رہتا تھا۔ یہ صورت ٹھیکہ یا اجارہ کی مانند ہوتی تھی۔ اکثر حالتوں میں عامل کو اپنے صوبہ کے آمد وخرچ کا حساب سمجھانا پڑتا تھا۔ اس حالت میں وہ کسی مقررہ رقم کے ادا کرنے کا ذمہ دار نہ ہوتا تھا بلکہ جس سال جس قدر روپیہ خرچ سے بچتا، اسی قدر بھیج دیا جاتا تھا۔ سرحدی صوبوں کا جو دار الخلافہ سے زیادہ فاصلہ پر ہوتے تھے، مثلاً افریقہ، یمن اور ماوراء النہر وغیرہ کا عموماً ٹھیکہ دے دیا جاتا تھا۔ ان صوبوں

سے بہت ہی کم خراج لیا جاتا تھا اور بعض اوقات تو صرف خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جانا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ ان سرحدی صوبوں کے عاملوں کا تبدیل یا معزول کرنا اس وقت تک ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ وہ بے وفائی، مخالفت اور بغاوت کا اعلان نہ کریں لیکن باقی صوبوں کے عاملوں کو خلفاء جلد جلد تبدیل کرتے رہتے تھے۔

صاحب الشرطہ:

شہروں میں امن وامان قائم رکھنے، بغاوتوں کا انسداد کرنے، چوروں اور ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے سزا دینے کی ذمہ داری جس شخص سے متعلق ہوتی تھی، اس کو صاحب الشرطہ کہتے تھے۔ ہم اس کو محکمہ پولیس کا افسر اعلیٰ کہتے ہیں۔ یہ صاحب الشرطہ بغداد میں قیام پذیر رہ کر عراق کے دوسرے شہروں میں اپنے نائب مقرر کرتا اور بعض اوقات افواج عراق کا سپہ سالار اعظم اور حضور صوبہ کا عامل یا گورنر ہوتا تھا۔ طاہر بن حسین صاحب الشرطہ ہی تھا۔ اس کے بعد اس کو خراسان کی گورنری ملی تھی۔ غرض یہ کہ یہ بہت بڑا اور ذمہ داری کا عہدہ تھا اور اس پر کوئی معمولی شخص فائز نہیں ہو سکتا تھا۔

حاجب:

حاجب خلیفہ کی ذات کا محافظ اور خلیفہ کی ذات کے محافظ دستہ کا افسر ہونے کے علاوہ خلیفہ کی خدمت میں سب سے بڑھ کر رسوخ رکھنے والا شخص ہوتا تھا۔ حاجب سفر وحضر میں ہمیشہ خلیفہ کے ساتھ رہتا اور ہر ایک تنہائی کے وقت خلیفہ کا مونس ہوتا تھا۔ قصر خلافت کے تمام خدام اور پہرہ چوکی کے سپاہی اس کے محکوم ہوتے تھے۔ دربار میں وہ ہر نئے داخل دربار ہونے والے شخص کا ادب آموز اور خلیفہ کے ہر ایک حکم کی تعمیل کے لیے ہمہ اوقات مستعد رہتا تھا۔ حاجب سے بسا اوقات وزیر اعظم کو بھی دبنا پڑتا تھا۔ حاجب خلیفہ کے رازوں سے واقف اور خلیفہ کا سب سے بڑا معتمد ہوتا تھا۔ ہارون الرشید نے اپنے حاجب مسرور ہی کے ذریعہ سے جعفر برمکی کو قتل کرایا تھا۔

قاضی القضاۃ:

قاضی القضاۃ کا مستقل عہدہ ہارون الرشید نے قائم کیا تھا جو آخر عہد عباسیہ تک قائم رہا۔ اس عہدہ کو آج کل شیخ الاسلام کہتے ہیں۔ قاضی القضاۃ تمام صوبوں اور ملکوں میں اپنے اختیار سے اپنے نائب مقرر کرتا اور ہر صوبہ کا قاضی اپنے اختیار سے ہر ایک شہر میں ایک قاضی مقرر کرتا تھا جس کا کام

دینی احکام کی حفاظت و پابندی کرانا، جھگڑوں وغیرہ کے مقدمات کا فیصلہ کرنا ہوتا تھا۔ یہ بہت بڑا عہدہ تھا۔ دربار میں قاضی کا مقام سپہ سالار اعظم اور وزیر اعظم سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہر ایک تخت نشین ہونے والے خلیفہ کو باقاعدہ اسی وقت خلیفہ سمجھا جاتا تھا جبکہ قاضی القضاۃ بھی اس کو خلیفہ تسلیم کرے۔ کسی خلیفہ کی معزولی کے لیے قاضی القضاۃ ہی سے فتویٰ لیا جاتا تھا۔ قاضی کو خلیفہ معزول کرسکتا تھا لیکن نئے خلیفہ کی تخت نشینی کے وقت قاضی کی منظوری لازمی تھی۔ اہم معاملات میں مثلاً کسی ملک پر فوج کشی کرنے یا کسی صوبہ کا عامل مقرر کرنے میں قاضی سے بھی مشورہ لیا جاتا تھا۔ اگر خلیفہ خود سپہ سالار بن کر کسی ملک پر چڑھائی کرتا تھا تو قاضی القضاۃ اس کے ہمراہ ہوتا تھا ورنہ ہر فوج کے ساتھ قاضی اپنا ایک نائب مقرر کر کے بھیجتا تھا۔ عہد ناموں، صلح ناموں، ملکوں کی سند حکومت، خلیفہ کے اہم فرامین اور وصیت نامہ وغیرہ پر قاضی کی مہر ضرور ہوتی تھی۔

رئیس العسکر:

اگرچہ ہر ایک خلیفہ، ہر ایک عامل، ہر ایک وزیر اور ہر ایک بڑا آدمی سپہ سالار ہوسکتا تھا لیکن خلیفہ کی باقاعدہ افواج کا ایک رئیس العسکر یا سپہ سالار اعظم بھی ہوتا تھا۔ یہ کوئی مستقل اور مدامی عہدہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ہر ایک دستہ فوج کا ایک سپہ سالار ہوتا تھا۔ جو شخص بڑی بڑی مہموں میں سپہ سالار بنایا جاتا تھا، وہ عام طور پر رئیس العسکر یا رئیس العساکر کہلاتا تھا۔

محتسب:

محتسب کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ شہر کا گشت لگا کر لوگوں کو خلاف قانون اور خلاف شرع حرکات و افعال سے باز رکھ کر بداعمالیوں کی سزا دے۔ محتسب کبھی قاضی القضاۃ اور کبھی صاحب الشرطہ کا ماتحت ہوتا تھا۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو میونسپل انسپکٹر بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ سوداگروں اور دکان داروں کے ناپ تول کے پیمانوں کا بھی معائنہ کرتا اور دھوکہ دینے والوں کو گرفتار کر کے سزا دے سکتا تھا۔ ہر ایک شہر اور ہر ایک قصبہ میں ایک محتسب مع اپنے ماتحت عملہ کے مقرر ہوتا تھا۔

ناظر یا مشرف:

خلیفہ سلطنت کے تمام محکموں کی نگرانی کے لیے ایک صدر ناظر مقرر کرتا تھا۔ جو ایک وزیر سمجھا جاتا تھا، اس کے ماتحت ہر ایک محکمہ کا الگ الگ ناظر یا انسپکٹر مقرر ہوتا۔ مشرف اعلیٰ محکموں کی

رپورٹیں حاصل کرنے کے بعد اس کا ضروری خلاصہ خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا۔

صاحب البرید یا رئیس البرید:

ہر ایک صوبہ میں محکمہ ڈاک کی حفاظت و نگرانی و اہتمام کے لیے خلیفہ کی طرف سے ایک صاحب البرید یعنی پوسٹ ماسٹر جنرل مقرر ہوتا تھا۔ جس کا کام شاہی ڈاک کی روانگی اور قاصدوں کے لیے راستہ کی چوکیوں میں سواریوں کا بندوبست کرنا ہوتا تھا۔ اسی کے زیر اہتمام ہر ایک منزل پر گھوڑوں، خچروں یا اونٹوں کی ایک مناسب تعداد ہمہ اوقات موجود و مستعد رہتی تھی۔ صاحب البرید کا یہ بھی فرض ہوتا تھا کہ وہ اپنے صوبہ کے تمام اہم حالات اور ضروری واقعات کی خبریں بہم پہنچائے اور دربار خلافت کو اس کی اطلاع دے۔ صاحب البرید کے ماتحت جاسوسوں کی ایک جمعیت رہتی تھی۔ جس کے ذریعہ سے وہ اس صوبہ کی رعایا، وہاں کے حکام اور صیغوں کے حالات سے خلیفہ کو اطلاع دیتے رہتے تھے۔ صاحب البرید ہر ایک شہر میں اپنا ایک نائب مقرر کرتا تھا۔ اسی محکمہ کے ذریعہ سے رعایا کے خطوط بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیے جاتے تھے۔ اسی صاحب البرید کے ماتحت نامہ بر کبوتروں کا بھی اہتمام رہتا تھا۔ صاحب البرید کے پاس ایک ایسا رجسٹر بھی رہتا تھا جس میں ہر ایک ڈاک خانہ اور چوکی کا فاصلہ، سمت اور وہاں کے عملہ کی فہرست درج رہتی تھی۔

کاتب:

خلیفہ ایک شخص کو اپنا کاتب یا میر منشی مقرر کرتا تھا۔ یہ بھی وزراء میں شمار ہوتا تھا۔ اس کا کام خلیفہ کو باہر کی آئی ہوئی تحریریں سنانا، فرامین لکھنا اور خلیفہ کے حکم کے موافق احکام جاری کرنا اور ضروری دستاویزوں کو حفاظت سے رکھنا۔ اس کے ماتحت مختلف صیغوں کے دفاتر ہوتے تھے۔ مثلاً شاہی فرامین کی نقل محفوظ رکھنے کا دفتر، محکمہ رجسٹری، دیوان الجیوش، دیوان النفقات وغیرہ۔

امیر المنجنیق:

یہ فوجی انجینئر کا کام دیتا تھا۔ سفر مینا کی پلٹن بھی اسی کے ماتحت ہوتی تھی۔ راستوں کا بنانا، میدان جنگ اور کیمپ کے لیے جگہ کا انتخاب کرنا، دشمن کے قلعوں کو مسمار کرنا، قلعے، دمدمے اور مورچے بنانا اس کا کام تھا۔ قلعوں کے محاصرہ کرنے میں اس کے مشوروں اور تجویزوں کو ہمیشہ خصوصی اہمیت حاصل ہوتی تھی۔

امیر التعمیر یا رئیس البنا:

یہ چیف انجینئر ہوتا تھا۔ محلات شاہی کی تعمیر و مرمت، شہروں کی آبادی کا تعمیری کام، نہروں کا نکالنا، پلوں کا بنانا، بند باندھنا وغیرہ سب اسی کا کام تھا۔

امیر البحر:

جنگی جہازوں اور بحری فوجوں کے افسر کو امیر البحر کہتے تھے۔ امیر البحر کے ماتحت بہت سے قائد ہوتے تھے۔ ہر ایک قائد کے ماتحت ایک جنگی جہاز ہوتا تھا۔ قائد کو کپتان سمجھنا چاہیے۔

طبیب:

ایک سے زیادہ تجربہ کار و ہوشیار طبیب دارالخلافہ میں موجود اور دربار میں حاضر رہتے تھے۔ علمی مجالس میں ان کی شرکت ضروری تھی۔ ان کے ماتحت دارالشفاء اور دواخانے سرکاری مصارف سے جاری تھے۔ ان میں ہر ملک اور ہر مذہب کے طبیب شامل تھے۔ ان میں سے اکثر دارالتصانیف، دارالترجمہ اور بیت الحکمت کی رونق و عزت کا موجب تھے۔

سلطنت کے دیگر قابل تذکرہ صیغے اور دفتر:

خلیفہ اگرچہ مطلق العنان فرماں روا سمجھا جاتا تھا مگر وہ اپنی حکمرانی و فرماں روائی میں بالکل خلیع الرسن اور آزاد نہ تھا۔ خلیفہ بناتے وقت جب اس کے ہاتھ پر بیعت کی جاتی تھی تو اس میں اتباع قرآن و سنت کی شرط ضرور ہوتی تھی۔ علماء خلیفہ کے خلاف شرع کاموں پر اعتراض کرنے اور اس کو روکنے ٹوکنے کا حق رکھتے تھے۔ اس حق کے استعمال کرنے میں اگر خلیفہ کی طاقت سدراہ ہو تو عوام اس طاقت کا مقابلہ کر کے اور علماء شرع کی حمایت پر مستعد ہو کر خلیفہ کو نیچا دکھانے اور معزول کرنے پر فوراً آمادہ ہو جاتے تھے۔ بعض اوقات علماء اپنے اس فرض اور حق کو ادا کرنے میں پہلو تہی کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خرابیاں پیدا ہوئیں اور خلافت دم بہ دم کمزور ہوتی چلی گئی۔ خلیفہ کی ذات میں جو عظمت و شوکت موجود ہوتی تھی، اس کے ذریعہ سے خلیفہ کبھی کبھی بلا مشورہ بھی احکام جاری کر دیتا اور اپنے احکام کی تعمیل کرا سکتا تھا لیکن عام طور پر رعایا کی بہبود سے تعلق رکھنے والے کام سب مقررہ قوانین و آئین کے ماتحت انجام پذیر ہوتے تھے اور بہ حیثیت مجموعی سلطنت کی مشین نہایت

باقاعدگی کے ساتھ چلتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ باوجود سلاطین کی آپس کی لڑائیوں اور امراء کی نااتفاقیوں کے عہد خلافت عباسیہ میں علوم وفنون میں ترقی کرنے اور مہذب وشائستہ ہونے کا لوگوں کوخوب موقع ملتا رہا۔ خلافت عباسیہ کے ابتدائی ایام میں مختلف علوم وفنون کی بنیاد قائم ہو چکی تھی۔ قیمتی تصانیف شروع ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد حکومت عباسیہ کے ابتدائی ایام میں مختلف علوم وفنون کی ترقیات اورعلوم وفنون کی نشوونما اور ایجادات کی رفتار میں کوئی کمی اور سستی واقع نہیں ہوئی۔ اس کا بڑا سبب یہی تھا کہ نظام حکومت جو اسلامی اصولوں پر قائم ہوا تھا، وہ سلطنت کے ضعیف اور جنگ وجدل کےقوی ہو جانے کی حالت میں بالکل روگردان اور سراسر درہم برہم نہیں ہوا بلکہ بدامنی کے زمانے میں بھی اس کی روح موجود رہتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ علمی ومعاشرتی واخلاقی ترقیات کو کبھی زبردست دھکا نہیں لگا۔ سامانیوں، صفاریوں، سلجوقیوں کی حکومتیں زیادہ مستقل اور پائیدا نہیں تھیں مگر ان کے عہد حکومت اور حدود سلطنت میں بڑے بڑے زبردست عالم پیدا ہوئے اورعلوم وفنون کےمشہوراماموں نے اپنا زندہ جاوید کارنامے چھوڑے۔

ا۔ دیوان العزیز:

دربار خلافت کا نام دیوان العزیز تھا۔ جو وزیر کاروبار سلطنت کے تمام صیغوں پراختیار کلی رکھتے تھے اورانہیں کے ہاتھ میں زمام سلطنت سمجھی جاتی تھی، ان کے دفتر اور ان کے محکمہ پر بھی دیوان العزیز کا لفظ بولا جاتا تھا۔ تمام دفاتر اور تمام محکمے اور صیغے اسی کے ماتحت ہوتے تھے۔ وزیراعظم کو متعلقہ صیغوں کے افسروں سے مشورہ کرنے کے بعد احکام جاری کرنے پڑتے تھے۔

۲۔ دیوان الخراج:

اس کومحکمہ مال سمجھنا چاہیے۔ یہ محکمہ کبھی براہ راست وزیراعظم کے ہاتھ میں ہوتا تھااور کبھی اس کا مہتمم ایک جدا وزیر ہوتا تھا جو وزیراعظم کا ماتحت سمجھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی خلیفہ وزیر مال کا تعلق وزیراعظم سے نہیں رکھتا تھا بلکہ براہ راست خود اپنے کاتب کے ذریعہ سے اس کی نگرانی کرتا تھا۔ کبھی وزیرمال اپنے نائب صوبوں میں خود مقرر کرتا تھا اور وہ اس صوبہ کے گورنر کی ماتحتی سے آزاد ہوتے تھے۔ عام طور پر وزیر مال صوبوں کے گورنروں کو مالی انتظام میں مختار قرار دے کر انہیں کو جواب دہ اور ذمہ دار سمجھتا تھا۔

۳۔ دیوان الجزیہ یا دیوان الذمام:

اس محکمہ میں جزیہ اور ذمیوں کے متعلق کاغذات رہتے تھے۔ جزیہ کی وصولی، اس کا تقرر، جزیہ کی معافی وغیرہ سب اسی محکمہ سے متعلق تھی۔ اس محکمہ کا مہتمم وزیر مال کا ماتحت سمجھا جاتا تھا مگر قاضی القضاۃ کے احکام کی بھی اس کو تعمیل کرنی پڑتی تھی۔ قاضی القضاۃ کے احکام عموماً جزیہ کے کم یا موقوف کر دینے کے متعلق ہوتے تھے کہ فلاں صوبہ کے فلاں فلاں اشخاص سے جزیہ وصول نہ کیا جائے وغیرہ۔

۴۔ دیوان العسکر:

اس محکمہ میں فوجی رجسٹر رہتے تھے۔ اس محکمہ کا تعلق براہ راست وزیر اعظم یا خلیفہ سے ہوتا تھا۔ فوج کی تنخواہیں بھی اسی محکمہ کے ذریعہ سے تقسیم ہوتی تھیں۔ سپہ سالار اعظم بھی اسی محکمہ کا افسر سمجھا جاتا تھا مگر اس کا تعلق صرف اسی قدر ہوتا تھا کہ وہ اپنی موجودگی میں تنخواہیں تقسیم کرا دیتا تھا۔ بار برداری، جانوروں کی خریداری، اسلحہ کی فراہمی، وردیوں کی تیاری وغیرہ کے صیغے بھی اسی محکمے سے تعلق رکھتے تھے۔

۵۔ دیوان الشرطہ:

محکمہ پولیس کے دفاتر اور انتظام ایک الگ افسر کے ماتحت تھا۔ اسی کے ماتحت محتسب وغیرہ بھی ہوتے تھے۔ محکمہ پولیس کے سپاہیوں کی تنخواہ عموماً فوجی سپاہیوں سے زیادہ ہوتی تھی اور پولیس کے سپاہیوں کو زیادہ احتیاط کے ساتھ بھرتی کیا جاتا تھا۔

۶۔ دیوان الضیاع:

اس محکمہ کے متعلق ان رقبوں اور ان علاقوں کی آمدنی کا انتظام تھا جو عموماً صوبہ عراق میں خلیفہ کی جاگیریں سمجھی جاتی تھیں۔ ان شاہی املاک کی پیداوار کو بڑھانا، آباد و سرسبز رکھنا سب اسی محکمہ سے متعلق تھا۔

۷۔ دیوان البرید:

اس محکمہ کا صدر دفتر بغداد میں تھا۔ اس دفتر میں ملکوں کے نقشے، ڈاک خانوں کی فہرستیں اور ہر

منزل اور ہر راستے کے متعلق ضروری باتیں، ملازمین کے لیے ہدایات، ملازمین اور اہل کاروں کی خدمت کی رپورٹیں اور راستوں کے امن وامان کے لیے یادداشتیں اور غرض سب کچھ ہوتا تھا۔

۸۔ دیوان النفقات:

محل سرائے شاہی کے مصارف، انعامات، روزینے، عطیات وغیرہ کے رجسٹر اسی محکمہ سے تعلق رکھتے تھے۔

۹۔ دیوان التوقیع:

اس دفتر میں ہر ایک اس حکم کی نقل رکھی جاتی تھی جو خلیفہ کے دستخط یا مہر سے جاری ہوتا تھا۔ یہ محکمہ بھی جس کو محکمہ رجسٹر کہہ سکتے ہیں، کاتب کے ماتحت ہوتا تھا۔

۱۰۔ دیوان النظر فی المظالم:

یہ محکمہ مشرف اعلیٰ کے ماتحت ہوتا تھا۔ اس محکمہ کا کام شاہی اہل کاروں کے کام کا جانچنا، دفتروں اور رجسٹروں کی غلطیاں نکالنا، دفاتر کا معائنہ کرنا اور بے راہ روی سے اہل کاروں اور افسروں کو روکنا تھا۔

۱۱۔ دیوان الانہار:

اس محکمہ کا کام نہروں کی مرمت ونگرانی کرنا، آب پاشی کے وسائل بڑھانا تھا۔ نئی نہریں نکالنے میں کاشت کاروں کے سوا امراء اور اہل خیر کو آزادی حاصل تھی۔ کاشت کار یا کسی علاقہ کے باشندے اگر کوئی جدید نہر نکالنا چاہتے تھے تو اس نہر کے نکالنے کا نصف خرچ سرکاری خزانہ سے ملتا تھا۔ اگر پانی کی تقسیم میں ایک گاؤں والوں کا دوسرے گاؤں والوں سے کوئی جھگڑا یا فساد ہو جاتا تھا تو اس محکمہ کے اہل کار دخل دے کر اس کا فیصلہ کر دیتے تھے۔ ورنہ عام طور پر گورنمنٹ کوئی دخل نہ دیتی تھی، کاشت کار آپس ہی میں سب باتیں طے کر لیتے تھے۔ جدید نہروں کے نکالنے سے حکومت کو صرف یہ فائدہ ہوتا تھا کہ محاصل کی وصولی میں آسانی ہو جاتی تھی اور کاشت کار مال دار اور خوش حال ہو کر محاصل کی ادائیگی میں تامل نہ کرتے تھے۔

۱۲۔ دیوان الرسائل:

اس محکمہ کے اہل کاروں کا کام عہد ناموں کے مسودے تیار کرنا، شاہی فرامین کے مضامین لکھ کر مہر ثبت کرانا اور لفافوں میں بند کر کے مہر لگانا، اہم فیصلوں کی نقلیں رکھنا اور کسی منشور کی نقلیں کر کے صوبوں اور شہروں میں بھجوانا، عام لوگوں کی درخواستیں لے کر جس محکمہ سے اس کا تعلق ہو اس محکمہ میں بھجوا دینا اور دفاتر کے لیے مناسب فارم تجویز کرنا تھا۔

۱۳۔ دارالعدل:

اس میں ہر ایک عدالت کے فیصلے کی اپیل ہو سکتی تھی۔ دارالعدل میں قاضی بغداد یعنی قاضی القضاۃ وزراء، شہر کے علماء سب جمع ہو کر اہم مقدمات کی سماعت کرتے تھے۔ دارالعدل میں خلیفہ بھی بہ طور صدر شریک ہوتا تھا اور اگر خود خلیفہ کی ذات کو اس معاملہ سے کوئی تعلق ہو تو وزیر اعظم یا قاضی القضاۃ کو صدارت کا منصب دیا جاتا تھا۔ صوبہ داروں پر بغاوت کا الزام لگایا جاتا یا سپہ سالاروں کو سازش سے متہم کیا جاتا تو ان کو اسی عدالت میں پیش ہو کر اپنی صفائی اور برأت پیش کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ اس عدالت میں وہی شخص بہ طور گواہ پیش ہو سکتا تھا جو اپنے نیک چلن ہونے کی تحریری سند جس پر قاضی اور محتسب کے دستخط ہوں، پیش کر سکتا تھا۔ بڑے بڑے عالی رتبہ کے اشخاص اس عدالت میں گواہی دیتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں ہماری نیک چلنی پر کوئی اعتراض ہو کر ہماری شہادت مسترد نہ ہو جائے۔

۱۴۔ دارالقضا:

ہر ایک شہر کا قاضی اسی شہر کا جج، مجسٹریٹ اور منصف ہوتا تھا۔ اگر اس شہر کے عامل یا گورنر پر بھی کوئی شخص دعوے دائر کر دیتا تھا تو اس گورنر کو معمولی مدعا علیہ کی حیثیت سے قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا اور ثبوت پیش کرنا پڑتا تھا۔ غیر مسلموں کے لیے انہیں کی قوم و مذہب کے منصف مقرر تھے جن کی کچہری میں ان کے مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے۔ ان غیر مسلم منصفوں کی عدالت میں غیر مسلموں کے تمام دیوانی اور آپس کے فوج داری مقدمات طے ہو جاتے تھے، لیکن اگر ایک فریق غیر مسلم ہو تو اس حالت میں فریقین رضامندی سے جس عدالت میں چاہیں اپنا مقدمہ لے جائیں لیکن ایسے مقدمات کو قاضی کے یہاں رفع کیا سکتا تھا۔ عام طور پر غیر مسلم اپنے مقدمات بھی قاضی

ہی کی عدالت میں فیصلہ کرانا چاہتے تھے اوران کوکسی قسم کی شکایت نہ ہوتی تھی۔

سلطنت کے عام حالات:

حکومت کی طرف سے رعایا کے طرز زندگی اور آپس کے تعلقات میں قطعاً کوئی دخل نہیں دیا جاتا تھا۔شہروں اورقصبوں کے اندرونی انتظامات بھی سب باشندگان شہر کے اختیار میں تھے۔ وہ خود ہی آپس میں آزادانہ اپنی حفاظت کی تدبیریں کرتے اوراگر ایک عامل سے ناراض ہو جاتے تو اس کو وہاں سے تبدیل کرنے کی درخواست خلیفہ کی خدمت میں بھجواتے اور خلیفہ عموماً ان کی درخواست منظور کر لیتا اورکسی شہر کا عامل شہر والوں کی رضامندی کے بغیر مقرر نہ کیا جاتا۔ ہر ایک شہر کے باشندے بجائے خود ایک فوجی طاقت رکھتے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کسی شہر کے عامل کا کسی فوج نے محاصرہ کرلیا ہے۔ وہ اپنی سرکاری فوج سے دشمن کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے لیکن شہر والوں نے محاصرہ کرنے والے دشمن سے مصالحت کرلی ہے تو اس عامل کو مجبوراً شہر چھوڑ کر چلا جانا پڑا۔

شہریوں کے حقوق کو پامال کرنے کی حکام کو عموماً جرأت نہ ہوتی تھی۔معمولی سے معمولی آدمی بھی بڑے سے بڑے حاکم بلکہ خلیفہ تک پہنچ سکتا تھا اور جو کچھ اس کے جی میں آئے، کہہ گزرتا تھا۔ خلفاء عموماً اپنے آپ کو ہر دل عزیز اور نافع الناس ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔علوم وفنون کی قدردانی عام طور پر خلفائے عباسیہ نے بہت کی ہے۔

سفر کے لیے سہولتیں:

خلفاء عباسیہ نے عراق، حجاز، فارس، خراسان، موصل، شام وغیرہ میں راستوں کی حفاظت ونگرانی اور مسافروں کے امن وامان سے گزر جانے کے لیے معقول انتظام کیے تھے۔فوجی دستے متعین تھے، جابہ جا تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر چوکیاں قائم تھیں۔ ہر ایک منزل پر شاہی گھوڑے، اونٹ اور دوسری سواریاں موجود رہتی تھیں۔ایک مکان ہر منزل پر مسافروں کے ٹھہرنے اور آرام کرنے کے لیے ہوتا تھا۔شاہی سواریوں پر جو محکمہ ڈاک کے ماتحت ہوتی تھیں، کرایہ دے کر عام لوگ بھی سفر کر سکتے تھے۔کبھی کبھی اگرکسی زبردست ڈاکو یا باغی کی وجہ سے راستے مخدوش ہو جاتے تو تجارتی قافلوں کے ساتھ شاہی فوج بھیجی جاتی تھی۔ حاجیوں کے قافلوں کے ساتھ جو شخص امیر حج ہو کر جاتا تھا،اس کے ساتھ ایک فوج بھی ہوتی تھی اور وہ حاجیوں کی حفاظت کرتا تھا۔

تجارت کے لیے سہولتیں:

ہر ایک شہر میں سوداگروں کی ایک انجمن ہوتی تھی، جس میں کسی سرکاری آدمی کا شامل ہونا ضروری نہ تھا۔ سوداگر لوگ خود اشیاء کے نرخ قائم کرتے تھے۔ تجارتی مال پر چنگی بہت ہی کم لی جاتی تھی اور اس معاملہ میں تاجروں کو کبھی کوئی شکایت پیدا نہ ہوتی تھی۔ تاجروں کی عزت شاہی اہل کاروں سے زیادہ ہوتی تھی۔ تاجروں کو عموماً شاہی درباروں میں باریاب ہونے کا موقع دیا جاتا تھا۔ جو سوداگر باہر سے مال لا کر فروخت کرتے تھے، ان کو شہر کا حاکم خوش کر کے واپس کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ گویا ہر ایک تاجر جو باہر سے مال لے کر آیا، اس نے اس شہر کے حاکم پر ایک احسان کیا ہے۔ اگر تاجر کا مال فروخت نہیں ہوا تو حاکم شہر یا سلطان یا خلیفہ بلاضرورت بھی اس کے مال کو خرید لیتا اور سوداگر کو افسردہ خاطر واپس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جس عامل یا جس حاکم کی حدود حکومت میں تاجروں کا کوئی قافلہ لٹ جائے تو وہ انتہا درجہ کا غافل اور نالائق سمجھا جاتا تھا۔ تاجروں کو امرائے شہر اپنے یہاں مدعو کرتے اور عالی جاہ مہمان کی حیثیت سے ان کی مدارات بجا لاتے تھے۔ اگر کوئی سوداگر کسی دوسرے ملک سے آیا ہے تو اس کے حالات سفر سننے کے لیے خلفاء خود اس کی ضیافت کرتے اور انعام و اکرام سے مالا مال کر کے واپس کرتے تھے۔ چنانچہ اس طرز عمل نے تجارت کو خوب فروغ دے دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خلفاء عباسیہ کے زمانے میں ہر قسم کی صنعت و حرفت میں خوب ترقی ہوئی اور ہر ایک شہر کسی نہ کسی صنعت کے لیے مشہور ہو گیا۔ اسی طرح ایک جگہ کی پیداوار اور دوسری جگہ جانے لگی۔ اہل عرب تو زمانہ قدیم ہی سے تجارت پیشہ تھے لیکن خلافت عباسیہ کے عہد حکومت میں ایرانیوں کو بھی تجارت کا شوق ہو گیا اور اس شوق نے یہاں تک ترقی کی کہ مسلمان سوداگر شمال میں بحر شمالی کے ساحل تک اور جنوب میں افریقہ کے جنوب تک پہنچنے لگے۔ جس کے ثبوت میں خلفاء عباسیہ کے عہد کی بغدادی مصنوعات سویڈن اور مڈغاسکر میں علمائے طبقات الارض نے تلاش کی ہیں۔ بعض خلفاء مثلاً واثق باللہ نے باہر سے آنے والے سوداگروں اور تمام اشیاء درآمد پر محصول معاف کر دیا تھا۔

سرکاری محاصل:

زراعت اور غلہ کی پیداوار پر بجائے نقد روپیہ وصول کرنے کے عموماً بٹائی (مقاسمہ) کا قاعدہ

جاری تھا۔ پیداوار کا ۲/۵ حصہ سرکاری خزانہ کے لیے لیا جاتا تھا اور ۳/۵ کاشت کار کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جہاں کاشت کار کو آب پاشی کے لیے محنت کرنی پڑتی تھی، وہاں کاشت کار کو ۳/۴ چھوڑ دیا جاتا تھا اور لگان سرکاری صرف چوتھائی حصہ لیا جاتا تھا۔ بعض زمینوں کی پیداوار پر صرف ۱/۵ لیا جاتا تھا اور ۴/۵ کاشت کار کے قبضہ میں رہتا تھا۔ انگوروں اور کھجوروں وغیرہ کے باغات پر اسی مقاسمہ کے اصول کو مدنظر رکھ کر نقد لگان لگا دیا جاتا تھا اور نقدی کی شکل میں وصول ہوتا تھا۔ بعض صوبے مثلاً بحرین، عراق، جزیرہ وغیرہ میں بہ کثرت ایسے کاشتکار تھے کہ ان کی زمینوں پر خلافت راشدہ کے زمانہ میں بہ وقت فتح معاہدہ کے ذریعہ سے پیداوار پر محصول مقرر کیا گیا تھا۔ وہ گویا استمراری بندوبست تھا۔ ان کاشت کاروں پر کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا تھا۔ محصول تشخیص کرنے کے وقت اکثر زمینیں بلامحصول چھوڑ دی جاتی تھیں اور کاشت کاروں کو ذرا ذرا سے بہانوں پر محصول معاف کر دیا جاتا تھا۔ حکومت کی نظر اس بات پر زیادہ رہتی تھی کہ کاشت کار خوش حال اور فارغ البال رہیں تاکہ علاقہ کی آبادی اور سرسبزی میں فرق نہ آنے پائے۔ ملک کا بہت بڑا رقبہ ایسا تھا کہ اس پر پیداوار کا صرف دسواں حصہ مقرر تھا۔ ذمی جن سے فوجی خدمت نہیں لی جاتی تھی اور ان کے جان و مال کی حفاظت سلطنت کے ذمہ تھی، فوجی مصارف کے لیے نہایت معمولی ٹیکس ادا کرتے تھے۔ جو اپنی خوشی سے فوجوں میں بھرتی ہو جاتے، ان پر ٹیکس یعنی جزیہ نہیں لگایا جاتا تھا۔ مسلمانوں سے ایک اور ٹیکس صدقات کے نام سے وصول کیا جاتا تھا۔ مال دار مسلمانوں سے زکوٰۃ کے نام سے ایک ٹیکس وصول ہوتا تھا، اس کو انکم ٹیکس سمجھنا چاہیے۔

سرکاری مصارف:

سرحد روم پر جو فوجیں مستقل طور پر سرحدی چھاؤنیوں میں رہتی تھیں، ان کو دوسری فوجوں کے مقابلہ میں زیادہ تنخواہ ملتی تھی۔ ان فوجوں میں عموماً ہر ایک سپاہی کو پندرہ روپیہ سے تیس روپیہ تک تنخواہ دی جاتی تھی۔ ایک فوج دارالخلافہ میں ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ فوج کا ایک حصہ راستوں کی حفاظت پر مقرر اور ہزارہا مرحلوں کی چوکیوں پر منقسم تھا۔ بڑے بڑے شہروں اور مرکزی مقاموں میں بھی فوج کی ایک تعداد موجود رہتی تھی۔ شہروں کی حفاظت کے لیے جو پولیس محتسب کے ماتحت اور صاحب الشرطہ کی نگرانی میں رہتی تھی، اس کو سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ خزانہ کی ایک بہت بڑی مقدار

فوج کے لیے صرف ہو جاتی تھی۔ محکمہ ڈاک کے سپاہی، سواری کے جانور اور اہل کاران ڈاک کا خرچ بھی اسی میں شامل سمجھنا چاہیے۔ رضا کار جو عموماً سرحد روم کی لڑائیوں میں شامل ہونے کے لیے بھرتی ہو کر جاتے تھے، ان کو کھانا، سواری اور تمام ضروری چیزیں سلطنت کی طرف سے ملتی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں ان کے اہل وعیال کو نقد وظیفہ یا کھانے پینے کی اجناس سرکاری طور پر مہیا کی جاتی تھیں۔ جنگ کی حالت میں فوج کے خوردونوش کا تمام اہتمام اور بوجھ سرکاری خزانہ پر پڑتا تھا۔ رومیوں کے ساتھ لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس لیے خلفاء کو سرحد روم پر بہت سے شہر آباد کرنے اور قلعے بنانے پڑے۔ صوبوں کی فوجوں کے تمام مصارف صوبوں کے خزانے پر پڑتے تھے مگر سرحد روم، بغداد، عراق، محکمہ ڈاک، راستوں کی حفاظت کرنے والی اور خلیفہ کی ذاتی فوج اور رضا کاروں کی افواج کے تمام مصارف خلیفہ کے مرکزی خزانہ سے پورے کیے جاتے تھے۔ تخت نشین ہونے والا ہر ایک خلیفہ فوج کو انعام دیتا تھا۔

بڑے بڑے اہل کاروں کو جاگیریں بھی دی جاتی تھیں اور ان کی تنخواہیں بھی مقرر ہوتی تھیں۔ شہروں اور قلعوں کی تعمیر کے علاوہ مدرسے، سرائیں، پل، نہریں، کنویں، مسجدیں وغیرہ بھی ہمیشہ تعمیر ہوتے رہتے تھے۔ صناعوں، موجدوں اور کاریگروں کو بڑے بڑے انعامات اور وظیفے دیے جاتے تھے، جن سے ان کی خوب ہمت افزائی اور دوسروں کو ترغیب ہوتی تھی۔ حکیموں، طبیبوں، شاعروں، عالموں کو بے دریغ انعام واکرام سے مالا مال کیا جاتا تھا۔ بعض عیسائی اور یہودی طبیب بغداد میں اس قدر مال دار ہو گئے تھے کہ خلیفہ کے سوا کوئی دوسرا شخص مال و دولت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ بغداد میں بہت سے مدرسے تھے جن کے شاہانہ مصارف بڑی سیر چشمی سے ادا کیے جاتے تھے۔ اسی طرح دوسرے شہروں میں اعلیٰ درجہ کے دارالعلوم قائم تھے۔ اسلحہ سازی، پارچہ بافی، قندسازی، دواسازی، عطرسازی کے کارخانے بڑے بڑے شہروں میں قائم تھے اور حکومت کی طرف سے ان کی خوب ہمت افزائی ہوتی تھی۔ ریشمی اور اونی کپڑوں کے کارخانے اور بلور کے برتن بنانے کی صنعت خلفاء کی توجہ سے بہت ترقی پذیر ہوئی۔

خلیفہ کو خزانہ میں کئی کئی ہزار خلعت، دوشالے، اونی کپڑے، خوبصورت چادریں اور بیش بہا تلواریں، برچھے، ڈھالیں، کمانیں وغیرہ محض اس لیے موجود رکھنے پڑتے تھے کہ یہ چیزیں بہ طور انعام اور بہ طور نشان عزت اعلیٰ درجہ کے بہادروں، عالموں، صناعوں اور موجدوں کو دیتا رہے۔

دوسرے ملکوں کی قیمتی اشیاء جو ان ملکوں کے سوداگر لے کر آتے تھے، بڑی بڑی قیمتوں پر خلیفہ سب کو خرید لیتا اور اپنے خزانے اور توشہ خانے میں داخل کرتا تھا اور یہ سب چیزیں بہ طور انعام لوگوں کو دیتا رہتا تھا۔

فوجی انتظام:

فوج کی مجموعی تعداد ہر زمانے میں کم وزیادہ ہوتی رہی۔ بہت سے جیش تھے۔ ہر ایک جیش میں تقریباً دس ہزار سپاہی ہوتے تھے۔ جیش کے افسر کو امیر الجیش کہتے تھے۔ امیر الجیش کے ماتحت دس قائد ہوتے تھے۔ ہر ایک قائد کے ماتحت ایک ایک ہزار سپاہی ہوتے تھے۔ ہر ایک قائد کے ماتحت دس نقیب ہوا کرتے تھے۔ ہر ایک نقیب سو سو سپاہیوں کا افسر ہوتا تھا۔ ہر ایک نقیب کے ماتحت دس عارف ہوتے تھے۔ ہر ایک عارف دس دس آدمیوں پر افسر ہوا کرتا تھا۔ فوج کی وردی میں کبھی کبھی خلفاء اپنے ذوق کے موافق تغیر وتبدل بھی کر دیتے تھے۔ مثلاً معتصم نے ترکوں کی فوج کی وردی پر لیس ٹکوایا تھا۔ ہر ایک جیش کے ہمراہ ایک دستہ بان اندازوں کا ہوتا تھا۔ ایک کمپنی سفر مینا کی بھی ہوتی تھی، جن کے پاس بیلچے اور کلہاڑیاں بھی ہوتی تھیں۔ بعض اوقات فوج کی وردی نہایت قیمتی کمخواب کی ہوتی تھی۔ بار برداری کے لیے اونٹوں اور خچروں کی کافی تعداد ہوتی تھی۔ پیدل فوج کے پاس نیزہ، تلوار اور ڈھال ہوتی تھی، یہ حربیہ کہلاتی تھی۔ جس پیدل فوج کے پاس تیغ وسپر کے علاوہ تیر کمان بھی ہوتی تھی، اس کو رامیہ کہتے تھے۔ ہر ایک سپاہی کے سر پر خود، جسم میں چار آئینہ، ہاتھوں میں آہنی جوشن ودستانے اور پاؤں میں موزے ہوتے تھے۔ ہر ایک جیش کے ہمراہ انجینئروں کی بھی ایک معقول تعداد ہوتی تھی۔ چند طبیب اور جراح بھی ضرور ہمراہ ہوتے تھے۔ دواؤں کا ذخیرہ اور دواسازی کا تمام سامان یعنی سفری شفاخانہ اور زخمیوں کے اٹھانے اور لانے کے لیے بار برداری کا سامان اور پالکیاں بھی ہوتی تھیں۔ ہر ایک جیش کے ہمراہ ایک رسالہ سواروں کا بھی ہوتا تھا۔ یہ سوار اعلیٰ درجہ کے نیزہ باز اور تیرانداز ہوتے تھے۔

جب خلافت میں ضعف آ گیا اور بنوبویہ مسلط ہوئے تو فوجی سرداروں کو جاگیریں دینے کا قاعدہ ایجاد ہوا کہ فوجی افسر خود اس قطعہ زمین کے محاصل سرکاری سے اپنی تنخواہیں وصول کر لیں۔ اس قاعدے کے جاری ہونے سے کاشت کاروں پر مظالم ہونے لگے۔ جب ترک یعنی سلجوق خلافت پر مسلط ہوئے تو انہوں نے تمام سلطنت اسلامیہ میں اپنے یہاں کے دستور کے موافق یہ

قاعدہ جاری کیا کہ ہر ایک عامل اور ہر ایک والی کو ایک ایک سپہ سالار قرار دے کر اس حصہ ملک کی آمدنی کے اعتبار سے ایک معینہ تعداد کی فوج ہمہ اوقات تیار رکھنے کا ذمہ دار قرار دیا یعنی فوجی سرداروں کو قطعات ملک دے کر ان کی تمام وکمال حکومت ہر قسم کا انتظام سپرد کر دیا، جن کا فرض تھا کہ ضرورت کے وقت عندالطلب مقررہ تعداد کی فوج لے کر حاضر ہوں۔ اس طرح تمام ملک کی حکومت فوجی سرداروں کے قبضہ میں آ گئی اور قدیم عمال اور جاگیردار سب معطل ہو گئے۔ شاہی مرکزی خزانہ سے فوج کا تعلق نہ رہا بلکہ فوجی سرداروں کو اپنی اپنی جاگیروں سے خود اپنی تنخواہیں وصول کر لینے اور اپنی تنخواہ کو کم وزیادہ کرنے کا اختیار حاصل ہوگیا۔ خلیفہ کو مجبوراً اپنی فوجی نظامت کم کرنی پڑی، جس سے خود بہ خود خلیفہ کی طاقت سلب ہوگئی۔ سلجوقیوں کے کمزور ہونے پر خلیفہ بغداد نے صوبہ عراق پر پھر براہ راست اپنا قبضہ جمایا اور اپنی آمدنی کو بڑھا کر وہی پرانا قاعدہ کہ فوج کو انتظامی افسروں کے کام سے کوئی تعلق نہ ہو، جاری کیا۔

علمی ترقیات:

بغداد میں ہارون الرشید کے زمانے سے بیت الحکمۃ جاری تھا۔ عہد مامونی میں یونانی وسریانی وعبرانی، سنسکرت، فارسی وغیرہ زبانوں کی کتابیں ترجمہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑا محکمہ جاری ہوا۔ خلیفہ علمی مباحثہ کی مجلس ترتیب دیتا اور بحث ومناظرہ میں خود حصہ لیتا۔ امیروں، وزیروں اور بڑے بڑے آدمیوں کے یہاں علماء کے جلسے ہوتے۔ علمی مسائل پر خوب زور وشور سے بحثیں ہوتیں اور سننے والے اپنے دماغ کو روشن کرتے۔ کتابوں کی تصنیف وتالیف وترجمے میں جس طرح علماء کی ایک بڑی تعداد مصروف رہتی، اسی مناسبت سے کتابوں کی نقلیں تیار کرتے، کتب فروشوں کی بڑی قدرومنزلت تھی اور وہ کتابوں کی نقلیں تیار کرانے میں مصروف رہ کر محرروں کی ایک بڑی تعداد کو مصروف کار رکھتے تھے۔ علمی تحقیقات اور حصول علم کے لیے لوگ دور دراز ملکوں کے سفر اختیار کرتے اور واپس آ کر اپنے ہم وطنوں اور شاہی درباروں کے لیے ایک قیمتی وجود ثابت ہوتے تھے۔ عہد خلافت عباسیہ میں علم نحو ایجاد ہوا اور اس پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں۔ لوگوں نے سفر نامے لکھے، علم احادیث مدون ہوا، اصول حدیث پر کتابیں لکھی گئیں۔ علم کلام، علم فقہ،[1] علم عروض وغیرہ پر ہزارہا

[1] علم فقہ سے مراد تفقہ فی الدین کا علم ہے اور یہ علم قرآن کریم اور احادیث نبوی کے ساتھ مشروط ہے اور علم کلام سے ضمناً مدد لی جاسکتی ہے۔ لیکن علم فقہ کو قرآن وحدیث کے مقابلہ میں پیش کرنا درست نہیں بلکہ یہ بہت بڑی جسارت ہے اور قرآن =

کتابیں تصنیف ہوئیں اور نہ صرف بغداد بلکہ ہر شہر و ملک میں مصنفین مصروف تصنیف تھے۔ طب میں تشریح الابدان پر بڑی بڑی قیمتی کتابیں تیار ہو کر شائع ہوئیں۔ دواخانے بھی اسی زمانے کی ایجاد ہیں۔ علم تاریخ کی تدوین و ترتیب و تہذیب کا فخر بھی اسی زمانے کو حاصل ہے۔ علم ہیئت میں عباسیوں نے بڑی بڑی مفید ایجادات کیں۔ مامون الرشید نے دومرتبہ ایک درجہ کا فاصلہ سطح زمین پر ناپ کر اس بات کو ثابت کیا کہ زمین کا محیط ۲۴ ہزار میل ہے۔ رصدگاہیں تعمیر کرائیں، فن تعمیر پر کتابیں لکھوائیں۔ دوربین اور گھڑی بھی عہد عباسیہ کی ایجاد ہے۔ تصوف [1] واخلاق، علم الٰہیات پر بڑی بڑی معرکۂ آرا تصانیف اسی عہد میں ہوئیں۔ ریاضی، کیمیا، طبقات الارض، علم حیوانات، علم نباتات، علم منطق وغیرہ علوم پر نہ صرف کتابیں تصنیف ہوئیں بلکہ ان تمام علوم کو مسلمانوں نے ایجاد کیا، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اس کے لیے ایک علیحدہ مستقل ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ ان علمی ترقیات میں خلافت امویہ اندلسیہ بھی خلافت عباسیہ سے کسی طرح کم نہیں رہی۔

دوسری فصل

ہم اب تک جو کچھ پڑھ چکے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے حالات زندگی مطالعہ کرنے کے بعد ہم نے خلافت راشدہ کے تفصیلی حالات مطالعہ کیے۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد کوئی ان کے خاندان کا شخص جو قریبی رشتہ دار ہونے کے سبب سے ان کی جائیداد کا وارث قرار دیا جاتا، نبی اکرم ﷺ کی قائم کی ہوئی سلطنت کا حکمران یا خلیفہ نہیں ہوا اور یہ فیصلہ تعلیم الاسلام کے عین موافق ہوا تھا۔ خلفائے راشدین میں ہر ایک خلیفہ کی اولاد موجود تھی اور خلفاء کے ان بیٹوں میں ہر قسم کی قابلیت واہلیت بھی موجود تھی مگر کسی خلیفہ نے اپنی اولاد کو اپنا جانشین بنانا نہیں چاہا اور نہ اس

= وحدیث سے کھلا مذاق ہے چاہے نیت نہ بھی ہو۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ امام امت ﷺ کے فرمان کے مقابلہ میں اپنا قول پیش کرے چاہے وہ کتنا بڑا عالم کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ایسا کرنا دراصل اپنے ایمان پر خود لکیر پھیرنا ہے۔ لیکن افسوس کہ بعض فقہاء نے اپنی کتب فقہ میں اپنے ایسے اقوال درج کیے جو کتاب وسنت سے واضح ٹکراتے تھے۔ اسی سے تقلید جامد پیدا ہوئی اور لوگوں نے اپنے علماء اور فقہاء پر نہ صرف اندھا اعتماد کیا بلکہ فقہاء کے ایسے اقوال کو لازم پکڑنے اور ان پر عمل کرنے پر لوگوں کو پابند کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسی فقہ سے اللہ کی پناہ!

[1] تصوف، دین اسلام کے متوازی ایک فکر، نظام اور نظریئے کا نام ہے، جس کی اپنی مخصوص اصطلاحات، نکات، رموز واشارات اور طریقہ کار ہے۔

کے خاندان میں حکومت وسلطنت متوارث ہوئی۔صرف علی رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے بیٹے حسن رضی اللہ عنہ کو کوفہ والوں نے خلیفہ بنایا مگر حسن رضی اللہ عنہ نے چھ ہی مہینے کے بعد اس خلافت وحکومت کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے یہ غلطی سرزد ہوئی[1] کہ انہوں نے خود اپنے بیٹے کو اپنا ولی عہد وجانشین بنایا اور حکومت اسلامیہ کو جو تمام مسلمانوں کی کثرت رائے سے کسی شخص کو سپرد ہوسکتی تھی، اپنی ذاتی چیز کی مانند اپنے اختیار سے بہ طور ورثہ اپنی اولاد کے سپرد کیا۔تاہم انہوں نے اس بات سے اعلانیہ انکار نہیں کیا کہ حکومت اسلامیہ کسی ایک خاندان کی ملکیت نہیں۔اسی لیے انہوں نے یزید کی بیعت کے لیے تمام مسلمانوں کو رضامند کرنے کی کوشش فرمائی۔امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ غلطی بھی کچھ زیادہ اہم اور نقصان دہ نہیں تھی کیونکہ اس زمانہ کے مسلمانوں نے اس کی اصلاح کے لیے زبردست کوشش شروع کی۔اسی کوشش کے سلسلہ میں حادثہ کربلا[2] پیش آیا اور اسی کوشش کی کامیابی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت تھی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا خاندان حکومت اسلامیہ سے محروم کر دیا گیا تھا مگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ غلطی کے ساتھ عبداللہ بن سبا یہودی کی سازش بھی ایک مخالف اسلام کوشش تھی یعنی حکومت اسلامیہ کے نظام اساسی کو درہم برہم کرنے کے لیے دو طاقتیں اثر انداز ہوئیں۔ایک اندرونی لغزش جس کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی غلطی کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسری بیرونی مخالفت جس کو سبائی سازش کہا گیا ہے۔یہ دونوں چیزیں مل کر اور اسلامی جامہ پہن کر ایک فتنہ عظیم بن گئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف حکومت اسلامیہ کا ستون مرکز ثقل سے کسی قدر ہٹ گیا، دوسری طرف اس کو آماج گاہ حوادث بھی بننا پڑا۔ولی عہدی اور وراثت کی رسم بد کو مروانی خلفاء نے پائیدار بنا دیا اور نا قابل ونا اہل لوگوں کو تخت خلافت پر متمکن ہونے کا موقع ملنے لگا۔جس سے سلطنت اسلامیہ کے رعب وعظمت کو صدمہ پہنچا اور سبائی تحریک نے فائدہ اٹھانے کے لیے سلطنت

---

1. فاضل مؤلف کے اس انداز تحریر سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی غلطیاں تحریر کرنا ہمارا کام نہیں۔ہمیں تو حدیث میں اس بات سے منع فرما دیا گیا ہے۔(ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح المحقق الالبانی رحمہ اللہ، کتاب المناقب والفضائل، حدیث ٦٠١٤)
2. حادثہ کربلا ایک بہت بڑی سازش کے نتیجہ میں پیش آیا۔اس سازش میں سبائی گروہ اور مجوسی النسل لوگ شامل تھے اور یہ سازش یہ تھی کہ جناب حسین رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کو خلافت اسلامیہ سے ٹکرا دیا جائے۔مختصراً ہمیں اسی ایک نقطہ پر نگاہ کو مرکوز کرنا ہوگا کہ جن ہزاروں کوفیوں نے حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں آنے کی دعوت دی تھی، آپ کے تشریف لے جانے پر وہ سب بے وفا اور جھوٹے نکلے اور ان کے خطوط ظاہر ہونے پر سب نے اپنے تحریر کردہ خطوط کی تردید کردی۔

اسلامیہ کے خلاف کوششوں کا سلسلہ حکومت کے متوازی جاری کیا۔ آخر اموی یا مروانی خلفاء کے بعد عباسی تخت خلافت پر قابض ہو گئے اور ان کے قابض ہوتے ہی حکومت اسلامیہ کی تقسیم شروع ہو گئی۔ عباسیوں کی حکومت سے پیشتر بنوامیہ تمام عالم اسلامی پر حکومت کرتے تھے اور مرکز خلافت ایک ہی تھا لیکن عہد عباسیہ کی ابتدا ہی میں اندلس کا ملک جدا ہو گیا اور وہاں ایک الگ حکومت قائم ہوئی جس کو خلفاء عباسیہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے بعد مراکو، اس کے بعد افریقہ اور اسی طرح یکے بعد دیگرے بہ جائے ایک سلطنت اسلامیہ کے بہت سی مُسلم سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ خلافت بنوامیہ کے بعد خلافت عباسیہ کا حال بھی ہم ختم کر چکے ہیں لیکن دوسری سلطنتوں کو جو اس خلافت کے ابتدائی زمانے سے کٹ کٹ کر الگ الگ قائم ہوتی رہی ہیں، چھوڑتے چلے آئے ہیں۔ لہٰذا خلافت عباسیہ سے فارغ ہونے کے بعد اب تیسری جلد میں ہم کو ان کے حالات مطالعہ کرنے ہیں، ان شاء اللہ! اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مضامین اور واقعات کے تسلسل کو ذہن نشین کرانے کے لیے حکمران خاندانوں کا ایک مجمل خاکہ پیش کر دیا جائے۔

ہسپانیہ:

ہسپانیہ کو مسلمانوں نے فتح کر کے سنہ ۹۳ھ میں وہاں اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور یہ ملک خلفاء بنوامیہ کا ایک صوبہ بن گیا تھا۔ سنہ ۱۳۸ھ تک وہاں خلفائے بنوامیہ کی طرف سے مثل اور صوبوں کے امیر و عامل مقرر ہو کر آتے اور حکومت کرتے رہے۔ جب عباسیوں نے اموی حکومت کو برباد کر دیا اور خود قابض و متصرف ہو گئے تو امویوں کے دسویں خلیفہ ہشام کا پوتا عبدالرحمٰن کسی نہ کسی طرح عباسیوں کی تیغ خون آشام سے بچ کر اندلس پہنچ گیا اور سنہ ۱۳۸ھ میں وہاں پہنچ کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ لشکر عباسیہ نے حملہ کیا تو اس کو بھی شکست دی اور اندلس کے شہر قرطبہ (کارڈوا) کو دارالسلطنت بنا کر اپنی شاندار حکومت کی ابتدا کی۔ یہ حکومت اس کے خاندان میں سنہ ۴۲۲ھ تک رہی۔ ان اندلسی خلفاء کی شان وشکوہ اور قوت وعظمت نے تمام براعظم یورپ کو مبہوت کر دیا اور ان کی تہذیب وعلم دوستی نے تمام دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ان کے کارنامے بنوعباس کے کارناموں سے زیادہ دلچسپ اور زیادہ سبق آموز ہیں۔ سنہ ۴۲۲ھ اندلس میں طوائف الملو کی شروع ہوئی اور اموی خاندان کی پرشوکت خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ اندلس کی اموی خلافت کے بعد اندلس کا

ملک چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں میں تقسیم ہوگیا۔ جنھوں نے قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، بلنشیہ، طیطلہ اور مالقا وغیرہ شہروں کو اپنا اپنا دارالحکومت بنایا۔ چند روز کے بعد شمالی افریقہ کی مسلمان حکومتوں نے اندلس کے اکثر حصہ کو اپنے ماتحت بنایا۔[1] ادھر عیسائی سلاطین نے مسلمانوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا لڑا کر جب خوب کمزور کرلیا تو پھر ان کو اس طرح تختہ مشق ستم بنایا کہ شاید آج تک کسی قوم نے کسی قوم کے ہاتھ سے ایسے مظالم نہ سہے ہوں گے اور عالم انسانیت کے چہرے پر کبھی ایسے سیاہ داغ نہ لگائے ہوں گے، جیسے کہ اسپین کو فتح کرنے والے عیسائیوں نے لگائے۔ اسپین یا ہسپانیہ کی تاریخ آج تک مسلمانوں کو خون کے آنسو رلا رہی ہے اور ہسپانوی مسلمانوں کے برباد ہونے کی داستان دلوں کو فگار اور سینوں کو زخم دار بنانے کی خاصیت رکھتی ہے۔

سلطنت دریسیہ (مراکش):

سنہ ۱۷۲ھ میں مراکش بھی خلافت عباسیہ کی حکومت سے جدا ہوگیا اور وہاں ایک الگ خودمختار حکومت قائم ہوئی۔ یہ سلطنت اگرچہ سلطنت ہسپانیہ کے پڑوس میں تھی مگر جس طرح خلفاء عباسیہ کی مخالف تھی، اسی طرح خلفاء اندلسیہ یعنی سلطنت ہسپانیہ کی بھی مخالف تھی۔ یہ قریباً دو سو سال تک قائم رہی۔ سوا سو برس تک تو ادریسی سلاطین خودمختار رہے پھر عبیدیوں کی ابتدا افریقہ میں ہوئی تو انہوں نے ان کو اپنا باج گزار بنا لیا۔ اس کے بعد اس سلطنت کے ٹکڑے ہوگئے اور چند روز تک معمولی رئیسوں کی طرح حکمران رہ کر معدوم ہوگئے۔

حکومت اغلبیہ (افریقیہ):

سنہ ۱۷۴ھ سے صوبہ افریقہ (تیونس) بھی خلافت عباسیہ سے آزاد ہوگیا اور ابراہیم بن اغلب کی اولاد نے سو سال سے زیادہ عرصہ تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ سنہ ۲۱۹ھ میں سلطنت اغلبیہ نے جزیرہ صقلیہ کو عیسائیوں سے فتح کرکے اپنی حکومت میں شامل کیا اور آخر تک اس پر قابض و متصرف رہی۔ اس خاندان میں بعض بڑے ذی ہوش اور لائق فرماں روا گزرے ہیں۔ جب اس ملک میں عبیدیوں نے خروج کیا تو حکومت اغلبیہ ہی کی بنیادوں پر اپنی سلطنت قائم کی اور

---

[1] یہ وہ دور تھا جب دنیا بھر کے عیسائی حکمران مسلسل منظم وقوی ہو رہے تھے، اپنے فوجی و دفاعی وسائل بڑھاتے چلے جا رہے تھے اور مسلمان مسلسل روبہ تنزل تھے اور آپس کی لڑائیوں میں مصروف عمل تھے۔

سلطنت ادریسیہ کی خودمختاری کو سلب کر کے حکومت اغلبیہ کے دارالسلطنت قیروان کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ یہاں تک کہ وہ مصر پر بھی قابض ہوئے اور پھر مصر میں اپنا دارالحکومت تبدیل کر لیا۔ سلطنت اغلبیہ کی تاریخ ادریسیہ سے زیادہ دلچسپ ہے۔ سنہ ۲۹۶ھ میں اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس خاندان نے نہ صرف جزیرہ صقلیہ (سسلی) ہی کو فتح کیا بلکہ مالٹا اور سارڈینیہ کو بھی فتح کر لیا تھا۔ ان کی بحری طاقت بہت زبردست تھی اور تمام بحر روم پر سلاطین اغلبیہ کا قبضہ تھا۔ بعض اوقات ان کے جہاز یونان اور فرانس کے ساحلوں پر بھی تاخت و تاراج کرآتے تھے۔

حکومت زیادیہ (یمن):

سنہ ۲۰۳ھ میں محمد بن زیاد جو زیاد بن ابی سفیان کی اولاد سے تھا، یمن کا حاکم مقرر ہوا۔ اس کے خاندان میں سنہ ۴۰۲ھ تک یمن کی حکومت رہی۔ محمد بن زیاد نے زبید نامی شہر آباد کر کے اس کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ یمن کے متصلہ صوبہ تہامہ کو بھی اس نے بہ زور شمشیر فتح کیا۔ حضرموت تک کا علاقہ بھی فتح کر لیا تھا۔ اس خاندان میں بعض بہت با اقبال و صاحب جبروت بادشاہ ہوئے۔ سنہ ۲۸۸ھ میں ان کی سلطنت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر علویوں نے زیدیہ حکومت قائم کی۔ اس کے بعد بہ تدریج اس سلطنت کی حدود مختصر ہوتی گئیں۔ زیادیہ سلطنت اگرچہ خودمختار تھی مگر خلفاء عباسیہ کے نام کا خطبہ اس میں پڑھا جاتا تھا۔ زیاد کے علاوہ جب یمن کے ایک حصہ میں زید کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے اپنی حدود حکومت میں اس خطبہ کو بھی اڑا دیا۔ سلطنت زیادیہ جب کمزور ہو گئی تو اس کے غلاموں اور غلاموں کے غلاموں نے حکمرانی شروع کر دی۔ اس کے بعد یمن میں یکے بعد دیگرے بہت سے خاندانوں نے حکومت کی۔ خاندان زیادیہ کی تاریخ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ زیادیہ کے بعد یمن میں یعفوریہ، بخاحیہ، صلیحیہ، ہمدانیہ، مہدیہ، زوریہ، ایوبیہ، رسولیہ، طاہریہ وغیرہ خاندان یکے بعد دیگرے سنہ ۱۰۰۰ھ تک خودمختارانہ حکمران رہے۔ ان میں بعض خاندان شیعہ اور بعض سُنّی تھے۔ ان کی تاریخیں اپنے اندر کوئی نمایاں دلچسپی نہیں رکھتیں۔

حکومت طاہریہ (خراسان):

سنہ ۲۰۵ھ میں مامون الرشید عباسی نے طاہر بن حسین کو خراسان کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد خراسان کی حکومت پچاس سال سے زیادہ عرصہ تک اسی کے خاندان میں رہی۔ خاندان طاہریہ

عملاً خراسان میں خود مختارانہ حکومت کرتے رہے اور اسی لیے خراسان کو اسی وقت سے خلافت بغداد سے الگ سمجھنا چاہیے۔ خاندان طاہریہ کے فرماں روا اپنے آپ کو خلیفہ بغداد کا محکوم سمجھتے اور خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے لیکن دربار خلافت کو خراسان کے اندرونی انتظام میں کوئی دخل نہ تھا۔

دولت صفاریہ (خراسان وفارس):

سنہ ۲۵۴ھ میں یعقوب بن لیث صفار نے فارس پر قبضہ کر کے اس صوبہ کو خلافت عباسیہ سے جدا کر لیا اور سنہ ۲۵۹ھ میں خراسان پر بھی قابض ہو کر دولت طاہریہ کا خاتمہ کر دیا۔ خاندان صفاریہ نے قریباً چالیس سال حکومت کی، پھر خاندان سامانیہ نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ طاہریہ وصفاریہ کے حالات جس قدر گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکے ہیں، وہی کافی ہیں۔ ان کی تاریخ علیحدہ بیان کرنے کی اب ضرورت نہیں۔ لہٰذا قارئین کرام ان دونوں خاندانوں کی تاریخ آئندہ جلدوں میں تلاش نہ فرمائیں۔

دولت سامانیہ (ماوراء النہر وخراسان):

سامانیوں کا حال بھی کسی قدر اوپر بیان ہو چکا ہے۔ سنہ ۲۹۰ھ میں جب سامانیہ حکومت ماوراء النہر نے صفاریوں سے خراسان، علویوں سے طبرستان چھین لیا تو ماوراء النہر یعنی سمرقند وبخارا سے لے کر خلیج فارس اور بحیرہ قزوین تک اس حکومت کی حدود وسیع ہو گئیں۔ اسی زمانہ سے وصبہ ماوراء النہر بھی خلافت عباسیہ کی ماتحتی سے آزاد ہو گیا۔ سامانی خاندانوں نے سوسوا سوسال تک حکومت کی۔ اس سلطنت نے علوم وفنون اور تہذیب وشائستگی کو فروغ دینے میں قابل قدر حصہ لیا۔ بخارا وسمرقند علوم وفنون کے مرکز بن گئے اور وہاں ایسے ایسے زبردست علماء پیدا ہوئے کہ آج تک دنیا میں ان کی شہرت موجود ہے۔ قریباً نصف صدی کے بعد خراسان وفارس وطبرستان حکومت سامانیہ کے قبضہ سے نکل گئے اور دولت بنی بویہ نے ان علاقوں پر اپنی حکومت قائم کر کے سامانیوں کو بے دخل کر دیا، پھر اس خاندان میں ترک غلاموں کے قابو یافتہ ہونے سے جلد جلد زوال آنا شروع ہوا۔ سنہ ۳۸۴ھ میں اس خاندان کے ایک ترک غلام الپتگین نے سلطنت سامانیہ کے اس حصہ پر جو دریائے جیجون کے جنوب میں تھا، خود مختارانہ قبضہ کر لیا اور سنہ ۳۸۰ھ سے سنہ ۳۸۹ھ تک ایلک خاں ترک نے سامانی سلطنت کے باقی اس حصہ پر جو دریائے جیجون کے شمال میں ہے، قبضہ کر کے اس خاندان کو نیست و نابود کر دیا۔ خاندان سامانیہ کی تاریخ اس لیے اور بھی زیادہ دلچسپ ہے کہ اسی سلطنت سے الپتگین کی

سلطنت قائم ہوئی اور الپتگین کی سلطنت کا وارث سبکتگین ہوا، جس کا بیٹا محمود غزنوی ملک ہندوستان کے بچے بچے کے لیے موجب دلچسپی اور جاذب توجہ ہے۔

قرامطہ (بحرین):

سنہ ۲۸۶ھ میں صوبہ بحرین خلافت عباسیہ سے جدا ہو گیا اور اس میں قرامطہ نے اپنی خود مختار سلطنت قائم کی اور اپنے ظالمانہ طرز عمل سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو بے حد پریشان رکھا۔ قرامطہ کے مظالم اور بدعنوانیاں ایک جداگانہ مستقل باب میں بیان ہوسکیں گی۔ قرامطہ کی حکومت بحرین میں سنہ ۳۶۴ھ تک رہی۔ اس کے بعد دوسرے خاندانوں نے بحرین پر قبضہ کرلیا اور بہت سی خود مختار ریاستیں بحرین اور اس کے نواحی صوبوں میں حکومت کرنے لگیں۔

علویہ (طبرستان):

سنہ ۲۵۰ھ سے سنہ ۳۱۶ھ تک علویہ زیدیہ نے طبرستان کی ولایت میں اپنی حکومت کا سکہ چلایا۔ دولت سامانیہ نے اس کو غارت کیا۔ اس کے بعد پھر بھی کئی رقیب اس نواح میں ایک دوسرے سے دست وگریبان رہے اور انہیں سے بنی بویہ پیدا ہوگئے۔ ان کا حال اجمالاً اوپر بیان ہو چکا ہے۔

صوبہ سندھ:

سنہ ۲۶۵ھ میں صوبہ سندھ بھی خلافت عباسیہ سے بے تعلق اور آزاد ہو گیا۔ یہاں دو خود مختار ریاستیں مسلمانوں کی قائم ہوگئیں، جن میں ایک کا دارالحکومت ملتان اور دوسری کا دارالحکومت منصورہ تھا۔ سلطنت منصورہ میں ملک سندھ کا جنوبی حصہ شامل تھا اور ملتان کی حکومت شمالی حصہ پر قائم تھی۔ اس کے علاوہ توران، قصدان، کیکانان، مکران، مشکی وغیرہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی عرب سرداروں نے قائم کر لی تھیں، جو ان بڑی ریاستوں کی ماتحتی اور خراج گزاری تسلیم کر چکی تھیں۔ اس طرح تمام صوبہ سندھ خود مختار اور خلیفہ بغداد کی حکومت سے آزاد ہو چکا تھا مگر یہاں خطبہ ہر جگہ خلیفہ بغداد کے نام کا پڑھا جاتا تھا۔ یہ ریاستیں بہ تدریج کمزور ہوتے ہوتے سو یا سوا سو سال کے عرصہ میں معدوم ہوگئیں مگر ملتان کی ریاست اس وقت تک قائم تھی جبکہ سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ آوری شروع کی اور ہندوؤں نے اس کو ہندوستان آنے کی تکلیف دی تھی۔

دولت بنی بویہ دیلمیہ:

دیلمیوں نے سنہ ۳۲۲ھ سے سنہ ۴۴۷ھ تک یعنی قریباً سوا سو سال فارس و عراق پر حکومت کی۔ ان دیلمیوں نے بہ جائے اس کے کہ کسی بعید ترین صوبہ کو خلیفہ کی حکومت سے جدا کرتے، خود خلیفہ اور صوبہ عراق پر اپنا تسلط قائم کر کے حقیقتاً اور معناً خلافت عباسیہ کا خاتمہ کر دیا مگر خلیفہ کا نام اور نام کی خلافت باقی رکھی۔ ان کی وجہ سے خلافت عباسیہ کے وقار و اعتبار کو صدمہ پہنچا۔ اس کا حال گزشتہ اوراق میں مجملاً بیان ہو چکا ہے۔ چونکہ یہ لوگ خلافت عباسیہ پر مسلط و مستولی ہو گئے تھے اور خلیفہ انہیں کے ہاتھ میں مثل کٹھ پتلی کے تھا، لہٰذا خلفاء عباسیہ کے سلسلہ میں بنو بویہ کا حال اور ان کی حکومت کی کیفیت مسلسل نام بہ نام بیان کر دی گئی ہے۔ آئندہ اب ان کے تذکرہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

دولت طولونیہ (مصر):

ابن طولون کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ بنی طولون نے سنہ ۲۵۴ھ سے ۲۹۲ھ تک مصر پر حکومت کی۔ یہ اگرچہ خود مختار تھے اور مصر کا صوبہ گویا سنہ ۲۵۴ھ میں خلافت عباسیہ سے جدا ہو چکا تھا مگر مصر میں خطبہ خلیفہ بغداد کے نام کا پڑھا جاتا تھا۔ بنی طولون نے ملک شام کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا تھا۔ اس طرح شام و مصر میں ایک ایسی سلطنت قائم ہو گئی تھی جو اگرچہ اپنے آپ کو خلیفہ بغداد کی فرماں بردار بتاتی تھی مگر دربار بغداد کو شام و مصر کی حکومت سے بے تعلق کر دیا تھا۔

دولت اخشیدیہ (مصر و شام):

مصر و شام سے جب بنی طولون کی حکومت جاتی رہی تو چند روز کے لیے ان دونوں صوبوں کے حاکم دربار خلافت سے مقرر ہو کر آنے لگے اور بہ ظاہر یہ دونوں صوبے پھر خلافت عباسیہ میں شامل ہو گئے۔ سنہ ۳۱۶ھ میں مقتدر باللہ خلیفہ بغداد نے محمد بن طغج کو رملہ کا حاکم مقرر کیا۔ سنہ ۳۱۸ھ میں اس کو دمشق کی حکومت سپرد کی گئی اور سنہ ۳۲۳ھ میں اس کو مصر کی حکومت دی گئی۔ محمد بن طغج ماوراء النہر کے علاقہ فرغانہ کے قدیمی حکمران خاندان سے تعلق رکھتا تھا یعنی اس کے بزرگ فرغانہ کے امیر تھے۔ اس زمانہ میں فرغانہ کے امراء کو اخشید کے لقب سے پکارتے تھے۔ محمد بن طغج نے مصر کی حکومت پر فائز ہو کر سنہ ۳۲۷ھ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور اپنا لقب اخشید رکھا۔ سنہ ۳۳۰ھ

میں اس نے شام پر بھی قبضہ کر لیا اور سنہ ۳۳۱ھ میں ملک حجاز کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر کے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی اور ایسا کرنے میں اس کو اس لیے زیادہ وقت پیش نہیں آئی کہ دربار خلافت کو دیلمیوں نے بے کار و بے اثر بنا دیا تھا۔ خلیفہ کا رعب اور خوف دلوں سے مٹ چکا تھا۔ خاندان اخشیدیہ نے سنہ ۳۵۶ھ تک ان ملکوں پر حکومت کی۔ اس کے بعد عبیدیوں نے اول مصر کو پھر چند روز کے بعد شام کو بھی فتح کر لیا۔

دولت عبیدیہ (مصر، افریقہ و شام):

سنہ ۲۹۶ھ میں افریقہ (تیونس) کے اندر دولت اغلبیہ کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ دولت عبیدیہ قائم ہوئی۔ دولت عبیدیہ نے سنہ ۳۵۶ھ میں خاندان اخشیدیہ کے ایک طفل خرد سال سے مصر کا ملک چھین لیا اور قاہرہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دے کر اس کی شہر پناہ تعمیر کرائی۔ سنہ ۳۸۱ھ میں عبیدیوں نے قیروان کو چھوڑ کر اپنا دارالحکومت قاہرہ بنا لیا، اس لیے بحر روم کے جزیرے و مغربی اضلاع ان کے قبضے میں باقی نہ رہ سکے لیکن بحر روم کے مشرقی حصے میں ان کی سیادت مسلم ہوگئی اور مشرقی مقبوضات سے مغربی نقصانات کی تلافی ہوگئی مگر مغربی اضلاع جو ان کے قبضے سے نکلے، ان میں سے اکثر عیسائیوں کے قبضے میں پہنچے اور مشرقی علاقے انہوں نے مسلمانوں ہی سے چھینے۔ لہٰذا عبیدیوں کے مصر میں آنے سے عیسائیوں کو فائدہ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔ عبیدیوں نے خلافت کا دعویٰ بھی کیا اور لوگوں سے جو ان کے تحت حکومت تھے، اپنی خلافت کی بیعت لی اور اپنے آپ کو خلیفہ کہلوایا۔ اس طرح دنیا میں خلافت کے تین سلسلے قائم ہوئے۔ پہلا اور سب سے بڑا سلسلہ تو وہی ہے جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے قائم ہو کر خاندان عثمانیہ کے آخری خلیفہ سلطان عبدالحمید خاں تک قائم رہا۔ یہ سلسلہ سب سے بڑا ہے۔ اس کے پہلے حصے کا نام خلافت راشدہ، دوسرے حصے کا نام خلافت بنوامیہ، تیسرے حصے کا نام خلافت عباسیہ بغداد، چوتھے حصے کا نام خلافت عباسیہ مصر، پانچویں حصے کا نام خلافت عثمانیہ ہے۔ ہم اس طویل سلسلہ کے چار حصے ختم کر چکے ہیں۔ اب پانچواں حصہ باقی ہے جو آئندہ جلدوں میں مذکور ہوگا۔ اس طویل سلسلہ خلافت کے بعد دوسرا سلسلہ خلافت وہ ہے جو اندلس میں عبدالرحمٰن ثالث کے زمانے سے شروع ہو کر اسی خاندان پر ختم ہو گیا۔ اس سلسلہ خلافت کو بھی علمائے اسلام نے خلافت کا حصہ تسلیم کیا ہے اور خلفائے اندلس کو خلفائے اسلام تصور کرتے ہیں

یعنی ان کی فرماں برداری ان مسلمانوں کے لیے جو ان کی حدود سلطنت میں رہتے تھے، ضروری اور ان کی بغاوت معصیت تھی۔ تیسرا سلسلہ جو عبیدیوں نے جاری کیا تھا، اس کو علماء اسلام نے سلسلہ خلافت تسلیم نہیں کیا۔ نہ ان کو خلیفہ مانتے اور نہ اسلامی نقطہ نظر سے ان کو مستحق تکریم سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں نے شرک و بدعت کو رواج دیا۔ شعائر اسلام کی بے حرمتی کی اور انواع واقسام کی بداعمالیوں کے مرتکب ہوئے۔ بہرحال عبیدیوں کی حکومت مصر میں سنہ ۵۶۷ھ تک قائم رہی۔ اس کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس سلطنت کا خاتمہ کر کے مصر میں ایوبی سلطنت قائم کی اور خلافت عباسیہ کا خطبہ مصر میں پھر جاری ہوا۔

دولت بنوحمدان (موصل، جزیرہ وشام):

ابوالہیجا عبداللہ بن حمدان بن حمدون بن حارث بن لقمان بن اسد بن حزم نے سنہ ۲۸۹ھ میں صوبہ موصل کے اندر خود مختارانہ حکومت کی بنیاد ڈالی اور قریباً سو برس تک بنوحمدان نے موصل و جزیرہ و شام میں حکومت کی۔ ان لوگوں نے خلفائے عباسیہ کا خطبہ اپنی حدود مملکت میں جاری رکھا۔ ان میں سیف الدولہ اور ناصرالدولہ بہت نامور تھا۔ بنواخشید یہ سے شام کا اکثر حصہ انہوں نے چھین لیا تھا۔ جزیرہ پر بھی ان کا تسلط ہو گیا تھا۔ بنو بویہ یعنی دیلمیوں سے بھی ان کی معرکہ آرائیاں ہوئیں اور ان معرکوں میں انہوں نے مقابلہ بنی بویہ کا ہمسرانہ کیا۔ کبھی کبھی خلیفہ بغداد پر بھی ان کا تسلط قائم ہو جاتا تھا۔ ان کے عہد حکومت میں رومیوں پر فوج کشی اور رومیوں کی فوج کشی کی مدافعت کرنے کا تعلق دربار خلافت سے بالکل منقطع ہو گیا تھا۔ بنوحمدان ہی رومیوں پر فوج کشی کرتے اور ان کے حملوں کا جواب دیتے تھے۔ ان میں سیف الدولہ نے رومیوں پر بڑے بڑے کامیاب جہاد کیے اور اس معاملہ میں خوب ناموری اور شہرت حاصل کی۔ آخر میں صوبہ شام ان کے قبضے میں رہ گیا تھا۔ بعد میں بنوحمدان کی حکومت ان کے غلاموں کے قبضہ میں چلی گئی، جنہوں نے ملک شام میں عبیدیوں کا خطبہ جاری کیا۔ آخر سنہ ۲۸۰ھ میں اس حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور موصل میں بنوعقیل بن کعب بن ربیعہ بن عامر نے اپنی حکومت قائم کی اور صوبہ جزیرہ پر قابض ومتصرف ہو گئے۔ اس کے بعد ملک شام کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر متعدد عربی سرداروں نے اپنی حکومتیں قائم کر لیں جو برائے نام کسی بڑی طاقت کے ماتحت ہوتے اور کبھی اپنی مطلق العنانی کا اعلان کرتے۔ یہاں تک کہ سلجوقی بغداد پر قابض ومتصرف ہونے کے بعد شام کے علاقوں پر چھا گئے اور وہاں انہوں نے

اپنی طرف سے عامل مقرر کیے یا خود اپنی حکومت قائم کی۔

ریاست بنو سلیمان (مکہ):

مکہ مکرمہ کی حکومت پر دربار خلافت بغداد سے عاملوں کا تقرر ہوا کرتا تھا مگر سنہ ۳۰۱ھ میں ایک شخص محمد بن سلیمان نے جو سلیمان بن داؤد بن حسن مثنیٰ بن حسن بن علی بن ابی طالب کی اولاد میں سے تھا، اپنی خود مختار حکومت قائم کی۔ (محمد بن سلیمان کو سلیمان بن داؤد کا بیٹا نہیں سمجھنا چاہیے۔ ان دونوں سلیمانوں کے درمیان غالباً دو تین شخص اور ہیں) محمد بن سلیمان کی قائم کی ہوئی یہ ریاست سنہ ۴۳۰ھ تک قائم رہی۔ اس سوا سو سال سے زیادہ عرصہ میں مکہ مکرمہ کے اندر بڑے بڑے فساد اور ہنگامے برپا رہے۔ چار پانچ شخصوں نے اس خاندان میں مکہ کی حکومت کی۔ مگر ان کی حکومت عجیب قسم کی تھی۔ ایام حج میں مصر اور بغداد کے قافلے آتے اور امارت حج اور خطبہ پڑھنے میں جھگڑا ہوتا۔ آپس میں لڑتے اور حاکم مکہ کو کوئی چیز نہ سمجھا جاتا۔ اگر بغداد کا امیر حج غالب ہوا تو اس نے بنو بویہ اور خلیفہ بغداد کے نام کا خطبہ پڑھا۔ اگر مصری امیر حج غالب ہو گیا تو اس نے بنو اخشید کے نام کا خطبہ پڑھا۔ پھر جب عبیدی مصر پر غالب و متصرف ہو گئے تو عبیدیوں اور عباسیوں کے خطبہ میں جھگڑا ہوتا۔ ادھر قرامطہ آ جاتے تو انہیں کا عمل دخل قائم ہو جاتا۔ وہ تمام حاجیوں کو قتل کرتے اور لوٹ مار مچا دیتے۔ کبھی مصری لوگ سنگ اسود کی بے حرمتی کرتے، پتھر مارتے اور سنگ اسود کو گالیاں دیتے تو عراقی لوگ مشتعل ہو کر ان کو قتل کرنا شروع کر دیتے۔ اسی زمانے میں قرامطہ سنگ اسود کو اکھیڑ کر بحرین لے گئے اور بیس یا زیادہ برسوں کے بعد مکہ میں واپس بھیجا۔ غرض ایام حج میں بنو سلیمان کی حکومت کا کوئی نشان مکہ میں نہیں پایا جاتا تھا۔ یہ لوگ زیدیہ شیعہ تھے۔ اس لیے بالطبع عبیدیوں کی جانب مائل تھے مگر ان کی حالت یہ تھی کہ جس کو طاقتور دیکھتے، اسی کا کلمہ پڑھنے لگتے۔

ریاست ہواشم (مکہ):

سلیمانیوں کے بعد مکہ میں ابو ہاشم محمد بن حسن بن محمد بن موسیٰ بن عبداللہ بن ابی الکرام بن موسیٰ جون کی اولاد نے اپنی حکومت قائم کی۔ یہ لوگ بھی مثل بنو سلیمان کے مکہ کے حاکم رہے۔ دولت سلجوقیہ کے ابتدائی عہد حکومت میں ان لوگوں نے خلفاء بغداد کے نام کا خطبہ پڑھنا شروع کر دیا۔ آخر میں جب سلاطین سلجوقیہ کمزور ہو گئے تو ہواشم نے پھر عبیدیوں کے نام کا خطبہ پڑھنا شروع کیا۔

سنہ ۵۶۷ھ میں جب صلاح الدین ایوبی نے دولت عبیدیہ کا خاتمہ کر دیا تو ہواشم مکہ کا بھی خاتمہ ہوگیا یعنی حجاز ویمن پر بھی صلاح الدین کا قبضہ ہوگیا اور مکہ میں سلطان کی طرف سے عامل مقرر ہو کر آنے لگے۔ چند روز کے بعد مکہ پر بنوقتادہ نے اپنی حکومت قائم کی۔ ان کے بعد بنونمی نے حکومت کی۔ ان کے بعد اور لوگ قابض ومتصرف رہے۔ یہاں تک کہ سلیم عثمانی نے حجاز پر قبضہ کیا۔ اس وقت سے مکہ کے حاکم شریف مکہ کے نام سے سلاطین عثمانیہ مقرر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہمارے زمانہ میں شریف حسین [1] نے سلطنت عثمانیہ سے بغاوت کر کے حکومت اسلامیہ کو سخت نقصان پہنچایا اور عالم اسلام میں نہایت ذلت وحقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ بہ ظاہر اس نے عیسائیوں کی سیادت تسلیم کر کے خاندان علویوں کو بدنام کیا اور ہاشمیوں کے نام پر دھبہ لگا دیا۔

دولت مروانیہ (دیار بکر):

کردوں کے قبیلہ کا ایک شخص ابوعلی بن مروان تھا۔ اس نے ولایت دیار بکر میں ایک خود مختار حکومت قائم کی جو اس کے خاندان میں سنہ ۳۸۰ھ سے سنہ ۴۸۹ھ تک یعنی سو برس سے زیادہ مدت تک قائم رہی۔ آمد، ارزن، میفارقین اور کیفہ وغیرہ شہر اسی ریاست میں شامل تھے۔ یہ لوگ عبیدیین مصر کی اطاعت کا اقرار کرتے تھے۔ اسی لیے عبیدیوں نے ان کو حلب کی حکومت دی تھی۔ اس طرح وہ گویا حمدانیوں کے قائم مقام ہوگئے تھے۔ یہ لوگ دولت بویہ کی اطاعت کا بھی اقرار کرتے تھے۔ سلجوقیوں کے حملے سے ان کا خاتمہ ہوگیا۔

دولت غزنویہ (افغانستان):

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ الپتگین نے سلطنت سامانیہ کے جنوبی حصہ پر قبضہ کر کے اپنی ایک الگ حکومت قائم کر لی تھی۔ الپتگین کے بعد اس کا داماد سبکتگین اس سلطنت کا مالک ہوا۔ سبکتگین کا بیٹا محمود غزنوی تھا۔ اس خاندان نے سنہ ۳۵۱ھ سے سنہ ۵۵۲ھ تک حکومت کی۔ محمود غزنوی کے زمانے میں

---

1. یہ خلافت عثمانیہ (ترکی) کی طرف سے مکہ پر گورنر تھا۔ مکہ کے گورنر کو شریف مکہ کے سرکاری خطاب سے یاد کیا جاتا تھا جبکہ اس کا اصل نام حسین بن علی تھا۔ اس نے خلافت عثمانیہ سے بغاوت کر کے خفیہ طور پر انگریزوں (سلطنت برطانیہ) سے تعلقات استوار کر کے ان سے خفیہ معاہدہ کر لیا اور خلافت عثمانیہ کے خاتمہ میں بھرپور کردار ادا کیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: نجد وحجاز / علامہ رشید رضا مصری، مترجم: الشیخ عبدالرحیم ...... اور ...... محمد بن عبدالوہاب، ایک مظلوم اور بدنام مصلح / مسعود عالم ندوی،

اس سلطنت کی وسعت وطاقت شباب پر تھی۔ پنجاب اور ملتان سے لے کر خراسان کے مغربی سرے تک اور خلیج فارس سے لے کر دریائے جیحون تک یہ سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ محمود غزنوی نے ایک طرف بخارا اور سمرقند تک حملے کیے تو دوسری طرف کالنجر (بنگال) اور سومنا تھ تک حملہ آور ہوا۔ اس سلطنت کو جب زوال آیا تو خراسان پر خوارزم شاہیوں نے قبضہ کر لیا اور افغانستان و پنجاب پر خاندان غوری قابض ومتصرف ہو گیا۔ غزنویوں کو ہمیشہ خلیفہ بغداد کی اطاعت و فرماں برداری کا اقرار رہا۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد حکومت میں سلجوقیوں نے اپنے قدیمی مسکن یعنی مغربی چین کے پہاڑوں سے نکل کر بخارا کے میدانوں میں سکونت اختیار کی اور پھر بہ تدریج ایشیائے کوچک تک پھیل گئے۔ سلطان محمود غزنوی نے ماوراءالنہر کا علاقہ بھی فتح کر لیا تھا۔ اس خاندان کی تاریخ مفصل طور پر تاریخ ہند میں درج کی جائے گی، ان شاءاللہ

دولت سلجوقیہ:

سلجوقیوں کی حکومت سنہ ۴۳۰ھ سے سنہ ۷۰۰ھ تک کم وبیش ڈھائی سو سال قائم رہی۔ ابتدائی زمانہ ان کا بڑا شاندار تھا۔ آخر میں ان کے بہت سے ٹکڑے ہو گئے اور شروع ہی سے ان کے کئی طبقات قائم ہو چکے تھے۔ ان کا سب سے بڑا سلسلہ وہ تھا جس میں الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی جیسے مشہور آفاق سلاطین ہوئے۔ ان کو سلاجقہ ایران کہتے ہیں۔ ان کا کسی قدر حال اوپر بیان بھی ہو چکا ہے اور آئندہ مفصل بیان کیا جائے گا، ان شاءاللہ تعالیٰ۔ ان کے علاوہ سلاجقہ عراق، سلاجقہ شام، سلاجقہ روم وغیرہ بھی مشہور ہیں۔ ان سب خاندانوں کی تاریخ دلچسپی سے خالی نہیں۔ پھر ان سلجوقیوں کے غلاموں اور اتابکوں کی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ وہ بھی بہت مشہور اور اسلامی تاریخ کی زینت کہی جا سکتی ہیں۔ سلجوقیوں کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب کہ دیلمیوں کی چیرہ دستی نے خلافت بغداد کو سخت بے عزت اور کمزور کر دیا تھا۔ سلطنت اسلامیہ کے لوگوں نے تکے بوٹی کر لیے تھے اور جدا جدا خود مختار ریاستیں اور بڑی بڑی بادشاہتیں قائم ہو چکی تھیں۔ جیسا کہ اسی فصل میں اوپر بیان ہوتا چلا آتا ہے، سلجوقیوں نے خلافت عباسیہ کے مٹے ہوئے اقتدار کو پھر چمکایا اور بہت سے چھوٹے چھوٹے خاندانوں کو حکومت وفرماں روائی کی کرسی سے جدا کر کے ایک عظیم الشان اور طاقتور سلطنت میں خلیفہ کی بزرگی اور وقار کو قائم کیا مگر چونکہ سلجوقیوں کی طاقت تمام تر فوجی اور جنگی اجزا سے مرکب تھی اور سپہ سالاران فوج ہی کو انہوں نے ملکی انتظام اور ملک داری کا کام سپرد کر دیا تھا، لہٰذا چند روز

کے بعد اس طاقت کا شیرازہ بکھر گیا اور تمام سلجوقی سردار الگ الگ صوبوں اور ولایتوں پر خود مختارانہ قابض ہو کر اسی گزشتہ طائف الملوکی کو پھر واپس لانے کا موجب ہوئے۔ سلجوقی لوگ نو مسلم تھے مگر ان میں خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ علوی سازشوں، سبائی ریشہ دوانیوں سے بالکل پاک تھے۔ انہوں نے دین اسلام کی خدمت کے مواقع خوب پائے۔ جہاں تک ان کے امکان میں تھا، انہوں نے دینی علوم اور نیک لوگوں کی خوب خدمتیں کیں۔ وہ خلفائے عباسیہ کی تکریم محض اس لیے کرتے تھے کہ ان کو پرانی اسلامی روایات کے مطابق مستحق تکریم جانتے تھے لیکن وہ عباسیوں، امویوں، علویوں کی رقابتوں سے مطلق متاثر نہیں ہوئے، نہ ان کو کسی ایک فریق سے عداوت تھی نہ دوسرے سے بے جا محبت۔ وہ سیدھے سادھے اور سچے پکے مسلمان تھے۔ انہوں نے عیسائیوں کے خوب مقابلے کیے اور ان کے دلوں پر مسلمانوں کی شمشیر خاراشگاف کی دہشت و ہیبت پھر قائم کر دی اور عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو ایسا دھکا دیا کہ وہ دور تک پیچھے ہٹ گیا۔ سلجوقیوں ہی کی حکومت کا نتیجہ تھا کہ خلفاء عباسیہ کی حکومت صوبہ عراق پر آخر تک قائم رہی۔ ان کے زوال کا سبب وہی چیز تھی جو ہر ایک قوم کے زوال کا سبب ہوا کرتی ہے یعنی آپس کی نا اتفاقی اور ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونا۔ سلجوقیوں کی طاقت جیسا کہ بیان ہوا، ایک جنگی طاقت تھی۔ فوج جس پر اس طاقت کا دارومدار تھا، اس کے افسر ترکی غلام ہوتے تھے، جو دشت قپچاق سے منگوا کر خریدے جاتے تھے۔ ان زرخرید غلاموں پر سلاطین سلجوقیہ کا سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ ان کی وفاداری میں ان کو مطلق شبہ نہ تھا۔ اسی لیے فوجوں کی افسری ان غلاموں کو دی جاتی اور انہیں کو صوبوں اور ولایتوں کی حکومت سپرد ہوتی۔ یہ غلام شائستہ ہو کر جب سرداری کے مرتبے پر پہنچتے تو بڑے وفادار اور بہادر ثابت ہوتے تھے۔ سلاطین سلجوقیہ اپنے نوعمر اور کم سن شہزادوں کی اتالیقی پر انہیں مملوک سرداروں کو مامور کرتے اور انہیں غلاموں کی نگرانی و اتالیقی میں سلجوقی شہزادوں کی ادب آموزی ہوتی۔ اس لیے ان مملوکوں یعنی ترک غلاموں کو اتابک (اتالیق) کے نام سے پکارنے لگے۔ اتابک ترکی زبان میں ایسے امیر کو کہا جاتا ہے جو باپ کا قائم مقام سمجھا جائے یعنی اتا بمعنٰی پدر اور بک مخفف بیگ کا ہے جس کا معنٰی سردار ہوتا ہے۔ جب سلاطین سلجوقیہ آپس میں لڑ لڑ کر کمزور ہو گئے تو ان مملوکوں یعنی اتابکوں نے موقع پا کر اپنی مستقل حکومتیں جا بجا قائم کر لیں۔ طغتگین جو سلجوق تتش کا مملوک تھا، وہ تتش کے نوعمر بیٹے وفاق سلجوقی کا اتابق مقرر ہوا اور وفاق کے بعد تتش سلجوقی کی سلطنت کا مالک ہو

گیا اور دمشق میں حکومت کرنے لگا۔ عمادالدین زنگی سلطان ملک شاہ سلجوقی کے مملوک کا بیٹا تھا۔ اس نے موصل اور حلب میں اتا بکی سلطنت قائم کی۔ عراق کے سلجوقی سلطان مسعود کا ایک قپچاقی غلام تھا۔ اس نے آذربائیجان میں اتا بکی سلطنت قائم کی۔ سلطان ملک شاہ سلجوقی کا شاقی انوسگین نامی ایک مملوک تھا، اس کی اولاد میں شاہان خوارزم شاہیہ تھے۔ اسی طرح سلغر ایک اتا بک سردار تھا جس نے فارس میں اتا بکی سلطنت قائم کی۔ غرض چھٹی صدی ہجری میں تمام سلجوقی سلطنت پر سلجوقیوں کے افسران فوج قابض ومتصرف ہو کر اپنی اپنی مستقل بادشاہتیں قائم کر چکے تھے۔

اتابکان (شام وعراق):

ملک شاہ سلجوقی کا ترکی غلام آقسنقر تھا جو ملک شاہ کا حاجب بھی تھا۔ وہ حلب اور شام وعراق کی حکومت پر مامور تھا۔ سنہ ۵۲۱ھ میں آقسنقر کے بعد اس کا بیٹا عمادالدین عراق کا حاکم مقرر ہوا۔ اسی لیے اس نے موصل، سنجار، جزیرہ اور ایران کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ سنہ ۵۲۲ھ میں شام کے اکثر حصے اور حلب وغیرہ پر بھی قابض ہو گیا۔ عمادالدین نے عیسائیوں اور رومیوں کے مقابلہ میں خوب جہاد کیے اور عالم اسلام میں بڑی نیک نامی حاصل کی۔ عمادالدین کے بعد شام کی حکومت اس کے بیٹے نورالدین محمود کو ملی اور موصل وعراق دوسرے بیٹے سیف الدین کے قبضے میں آیا۔ نورالدین محمود نے عیسائیوں کے مقابلے میں اپنے باپ سے بھی زیادہ جہاد کیے اور اس کام میں بڑی شہرت وناموری پائی۔ نورالدین محمود کے بعد اس خاندان کے اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو گئے۔ اسی خاندان کی ایک شاخ کی قائم مقام دولت ایوبیہ ہوئی۔ عمادالدین زنگی کے خاندان میں سوا سو برس تک حکومت وسرداری باقی رہی۔

اتابکان (اربیلا):

عمادالدین زنگی کے ترکی افسروں میں ایک افسر زین علی کوچک بن بکتگین تھا۔ اس نے اس کو موصل میں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ سنہ ۵۳۹ھ میں زین الدین علی کوچک نے سنجار، حران، تکریت، اربل یعنی اربیلا کو اپنی حکومت میں شامل کیا اور اربل کو اپنا دارالحکومت بنا کر اپنی الگ حکومت قائم کی۔ یہ حکومت زین الدین علی کوچک کے خاندان میں سنہ ۶۳۰ھ تک قائم رہی۔ اس کے بعد خلیفہ بغداد کا اس پر براہ راست قبضہ ہو گیا تھا۔

اتابکان (دیار بکر):

ارتوق بن اکسب سلجوقی کا ایک افسر تھا۔ اس کے بیٹے ایل غازی نے سنہ۴۹۵ھ میں اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان میں تیمور کے زمانے تک برائے نام حکومت باقی تھی۔ سلطان صلاح الدین کے زمانے میں یہ لوگ سلطان موصوف کے فرماں بردار وماتحت ہو گئے تھے۔

اتابکان (ارمینیا):

قطب الدین سلجوقی کے غلام سلیمان قبطی نے سنہ۴۹۳ھ میں شہر خلاط کو دولت مروانیہ سے چھین کر اپنی حکومت قائم کی۔ اس کی اولاد میں سنہ۶۰۴ھ تک جبکہ دولت ایوبیہ نے اسے فتح کیا، حکومت باقی رہی۔

اتابکان (آذربائیجان):

سلطان مسعود سلجوقی کے قپچاقی غلام ایلدکز نے آذربائیجان میں اپنی حکومت قائم کی جو سنہ۵۳۱ھ سے سنہ۶۲۲ھ تک ایک سوایک برس قائم رہی۔

اتابکان (فارس):

ترکوں کے ایک گروہ کا سردار سلغر نامی ایک ترک تھا۔ وہ طغرل بیگ کے سلجوقیوں کے ہمراہیوں میں شامل ہوگیا۔ اس کی اولاد میں سنقر بن مودود نے سنہ۵۴۳ھ میں فارس پر قبضہ کیا۔ اس کے خاندان میں سنہ۶۸۶ھ تک فارس کی حکومت رہی۔ اسی خاندان کا ایک بادشاہ اتابک سعد خوارزم شاہ کا خراج گزار بن گیا تھا۔ اسی کے نام پر شیخ مصلح الدین شیرازی نے اپنا تخلص سعدی رکھا تھا۔ اتابک سعد کے بعد اتابک ابوبکر تخت نشین ہوا۔ اس نے اکتائی خان مغل کی اطاعت اختیار کر لی تھی۔ اسی اتابک ابوبکر کا ذکر شیخ سعدی نے گلستان میں کیا ہے۔

اتابق (ترکستان):

اس خاندان کا بانی اتابک طاہر تھا جو اتابکان فارس کا ایک فوجی سردار تھا۔ جس سال سنقر بن مودود نے فارس پر قبضہ کیا، اسی سال ابوطاہر کو ترکستان پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ چنانچہ سنہ۵۴۳ھ میں ابوطاہر نے ترکستان پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کی بنیاد قائم کی جو سنہ۷۴۰ھ تک قائم

رہی۔ اسی خاندان کا ایک شعبہ ترکستان کو چک پر دسویں صدی ہجری تک حکومت کرتا رہا۔

اتابکان خوارزم شاہیہ:

بلگاتگین غزنوی کا ایک ترکی غلام انوشتگین تھا جو سلطان ملک شاہ سلجوقی کا آب دار ہو گیا تھا۔ اس کو ملک شاہ نے خوارزم یعنی خیوا کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا جانشین اس کا بیٹا ہوا، جس کا نام خوارزم شاہ تھا۔ اس نے اپنی حکومت کو ترقی دی۔ دریائے جیحون کے کنارے تک اپنی حکومت کو وسعت دے کر خراسان واصفہان کو بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد اس نے بہت تیزی کے ساتھ سنہ ۶۱۱ھ میں افغانستان کے ایک بڑے حصے کو غزنین تک فتح کر لیا، پھر اس نے شیعہ مذہب اختیار کر کے یہ ارادہ کیا کہ خلافت عباسیہ کو بیخ و بن سے اکھیڑ کر نیست و نابود کر دے۔ ابھی اس ارادے میں کامیاب نہ ہونے پایا تھا کہ چنگیز خاں نے حملہ کر کے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ آخر مغلوں نے اس کو خوب پریشان کیا اور وہ ان کے سامنے سے بھاگتا اور فرار ہوتا ہوا آخر بحیرہ قزوین کے ایک جزیرہ میں سنہ ۶۱۷ھ میں مر گیا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ وہ بھی باپ کے بعد مغلوں کے آگے آگے بھاگتے پھرے۔ ایک بیٹا جلال الدین خوارزمی بھاگ کر ہندوستان میں آیا اور دو برس ہندوستان میں رہ کر پھر واپس چلا گیا۔ آخر سنہ ۶۲۸ھ میں مغلوں نے اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ خوارزم شاہیوں کی حکومت سنہ ۴۷۰ھ سے ۶۲۸ھ تک رہی مگر اس سلطنت پر بارہ سال ایسے عروج کے گزرے کہ وہ سلطنت سلجوقی کی ہم پلہ سمجھی جاتی تھی۔

دولت ایوبیہ:

اتابکان شام وعراق کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان میں عمادالدین زنگی نے کردستان کے رہنے والے ایک کرد سردار مسمی ایوب بن شادی کو شہر بعلبک کا محافظ و حاکم اپنی طرف سے مقرر کیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بڑا سردار ہو گیا۔ ایوب کا ایک چھوٹا بھائی شیرکوہ تھا۔ عمادالدین کے فوت ہونے پر جب اس کا بیٹا نورالدین محمود زنگی تخت نشین ہوا تو اس نے شیرکوہ کو حمص اور رحبہ کی حکومت عطا کی۔ شیرکوہ کی قابلیت و بہادری کا اندازہ کر کے نورالدین نے شیرکوہ کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنایا۔ جب نورالدین نے شیرکوہ کو مصر کی طرف بھیجا تو اس کے بھتیجے صلاح الدین بن ایوب کو بھی مصر کی جانب روانہ کیا۔ یہ تذکرہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ صلاح الدین نے سنہ ۵۶۴ھ میں اپنی حکومت کی بنیاد قائم کی پھر

بہت جلد اس کی حکومت میں مصر و شام وحجاز وغیرہ شامل ہو گئے۔ صلاح الدین کی قائم کی ہوئی سلطنت کا نام دولت ایوبیہ ہے۔ اس خاندان میں سنہ ۶۴۸ھ تک حکومت قائم رہی۔ صلاح الدین کے بعد اس خاندان کے بھی کئی ٹکڑے ہوگئے۔ حماۃ میں اس خاندان کی ایک شاخ سنہ ۷۴۲ھ تک قائم رہی۔ اس خاندان کی جو شاخ مصر میں حکمران تھی، اس کو ایوبیہ عادلیہ کہتے ہیں۔ انہیں کے جانشین مصر میں مملوک ہوئے۔

دولت مملوکیہ (مصر):

دولت ایوبیہ مصر کے بعد مصر میں مملوک سلاطین کی حکومت سنہ ۶۵۰ھ سے شروع ہوئی۔ اس کا ذکر بھی اوپر آ چکا ہے۔ ان مملوکوں کے بھی دو سلسلے ہیں۔ پہلا سلسلہ مملوک بحریہ اور دوسرا مملوک گرجیہ کہلاتا ہے۔

سنہ ۹۲۲ھ میں ان کا بھی خاتمہ ہوگیا اور بہ جائے ان کے مصر میں حکومت عثمانیہ قائم ہوئی۔

سلاطین سلجوقیہ کے جانشینوں کا ذکر کرتے ہوئے ہم بہت دور آگے نکل گئے ہیں۔ ترتیب زمانی کے اعتبار سے ابھی کئی مشہور زبردست سلطنتوں کی طرف اشارہ کرنا باقی ہے جو اس سے بہت پہلے زمانہ میں قائم ہوئی تھیں۔ لہٰذا اب خراسان وعراق وشام وغیرہ مشرقی ممالک کو چھوڑ کر ہمیں پھر مغرب کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

دولت زیریہ (تیونس):

جب دولت عبیدیہ نے قیروان سے قاہرہ میں اپنا دارالحکومت تبدیل کیا تو اس زمانہ میں مصر سے مراکش تک تمام شمالی افریقہ ان کے زیر حکومت تھا اور بحر روم میں دولت عبیدیہ کی بحری طاقت سب پر فائق سمجھی جاتی تھی مگر قاہرہ (مصر) میں دارالحکومت کے تبدیل ہو جانے کے بعد مغربی ممالک پر اس سلطنت کا رعب قائم نہ رہ سکا۔ چنانچہ تیونس میں خاندان زیریہ کی مستقل حکومت ہوگئی جو سنہ ۳۶۲ھ سے سنہ ۵۴۳ھ تک قائم رہی۔

دولت صمادیہ (الجیریا):

الجیریا میں خاندان صمادیہ کی مستقل حکومت قائم ہوگئی اور یہ حکومت سنہ ۳۹۸ھ سے سنہ ۵۴۷ھ تک قائم رہی۔ اسی طرح عبیدیوں کی دارالسلطنت کے تبدیل ہونے پر مراکش میں بھی

قبائل بربر خود مختار ہو گئے تھے جن کو خاندان مرابطین نے اپنا محکوم بنایا۔

دولت مرابطین:

عہد خلافت بنوامیہ میں یمن کے بعض قبائل علاقہ بربر یعنی تیونس والجیریا ومراکو میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے بہ تدریج اپنے وعظ اور اپنی اسلامی زندگی کے نمونہ سے بربریوں کو اسلام میں داخل کیا اور انہیں کی سعی وکوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بربری لوگوں نے اسلام کو قبول کیا۔ انہیں میں سے ایک قبیلہ جو مراکش میں قیام پذیر تھا، اس نے سنہ ۴۴۸ھ میں قبیلہ لمتونہ کے عالم عبداللہ بن یاسین کے وعظ و پند سے وہ بربری لوگ جو اب تک اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے، مسلمان ہو گئے اور انہوں نے عبداللہ بن یاسین کو اپنا سردار بنانا چاہا مگر عبداللہ نے انکار کر کے ابوبکر بن عمر ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ نومسلم بربریوں نے ابوبکر بن عمر کو اپنا سردار بنا کر امیرالمسلمین کے نام سے پکارنا شروع کیا۔ اس جمعیت کو دیکھ کر اردگرد کے بہت سے قبائل آ آ کر جمع ہونے شروع ہوئے۔ مراکش میں ان دنوں کوئی مستقل حکومت قائم نہ تھی بلکہ الگ الگ قبائل کی حکومتیں قائم تھیں اور کوئی کسی کا محکوم نہ تھا۔ اس طوائف الملوکی کے زمانے میں ابوبکر بن عمر کی طاقت دم بہ دم ترقی کرنے لگی۔ ابوبکر بن عمر نے اپنے ہمراہیوں کو مرابطین کا خطاب دیا یعنی سرحد اسلام کی حفاظت کرنے والی فوج، انہیں کو ملثمین بھی کہتے ہیں۔ ابوبکر نے بربری قبائل میں خدمت اسلام کا جوش پیدا کر کے ان کو خوب بہادر والوالعزم بنا دیا اور مراکش سے مشرقی کی جانب پیش قدمی کر کے سجلماسہ کو فتح کر لیا اور اپنے چچازاد بھائی یوسف بن تاشفین کو سجلماسہ کا حاکم مقرر کیا۔ یہ یوسف بن تاشفین اس ملک کا بادشاہ ہوا۔ سنہ ۴۶۰ھ میں یوسف نے شہر مراکش آباد کیا اور اسی کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ سنہ ۴۷۲ھ میں جبکہ عیسائیوں نے ہسپانیہ کے مسلمان رئیسوں کو اپنی حملہ آوریوں سے بہت تنگ کیا تھا تو انہوں نے یوسف بن تاشفین سے مدد کی درخواست کی۔ یوسف بن تاشفین نے اندلس یعنی ہسپانیہ میں جا کر عیسائیوں کو ایک بڑے معرکہ میں شکست فاش دے کر ان کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد وہ تین ہزار بربری یعنی لشکر مرابطین کو اندلس میں حفاظت کے لیے چھوڑ کر خود افریقہ یعنی مراکش کو واپس چلا آیا۔ چار برس کے بعد عیسائیوں نے پھر اندلس کے مسلمانوں کو تنگ کیا اور انہوں نے یوسف سے امداد کی استدعا کی۔ اس مرتبہ اس نے عیسائیوں کو شکست فاش دے کر اندلس کے اسلامی

علاقہ کو اپنی سلطنت کا ایک صوبہ بنا لیا۔ غرض مرابطین کی حکومت میں بہت جلد اندلس، مراقش، تیونس، الجیریا، طرابلس شامل ہو گئے۔ بحری قوت کی جانب اس خاندان نے زیادہ توجہ نہیں کی۔ سنہ ۵۵۱ھ تک مرابطین کی حکومت قائم رہی۔ اپنے بہادرانہ کارناموں سے ایک سو سال تک انہوں نے عیسائی طاقتوں کا ناطقہ بند رکھا۔

دولت الموحدین:

بربر کے قبیلہ مسمود کا ایک شخص ابوعبداللہ محمد بن تومرت جو جبل سوس کا باشندہ تھا، علم حدیث واصول کا جید عالم اور عربی علم وادب کا خوب ماہر تھا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بھی وہ خوب مستعد تھا۔ نصیحت گری وحق گوئی میں اس کے سامنے امیر وغریب کا مرتبہ یکساں تھا۔ اس کے زہد نے اس کو سادہ لباس اور سادہ غذا پر قانع کر دیا تھا۔ ایک جماعت اس کی تابع تھی اور اس کو مہدی کے نام سے پکارتی تھی۔ اپنے متبعین میں اس کو شاہانہ اختیارات حاصل تھے۔ سنہ ۵۲۲ھ میں جب اس کا انتقال ہوا تو وہ اپنے فرقہ جس کا نام موحدین رکھا تھا، کی امارت اپنے دوست عبدالمومن کو سپرد کر گیا۔ عبدالمومن نے سلطنت مرابطین کے خلاف خروج کر کے فتوحات شروع کر دیں۔ آخر دو سال کے عرصہ میں اس نے مرابطین سے بہت سا علاقہ چھین کر سنہ ۵۲۴ھ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ سنہ ۵۴۱ھ میں اس نے مرابطین کا دارالسلطنت فتح کر لیا اور چند روز کے بعد ان کا خاتمہ کر کے اندلس میں فوج بھیجی۔ اندلس ومراکش پر قبضہ کر لینے کے بعد اپنا لقب امیرالمومنین رکھا۔ اس کے بعد سنہ ۵۴۷ھ میں الجیریا کو فتح کر کے صمادیہ خاندان کا خاتمہ کیا۔ طرابلس کو فتح کر لینے کے بعد اس کی سلطنت سرحد مصر سے بحر اطلانطک تک قائم ہوگئی، جس میں اندلس کا ملک بھی شامل ہے۔ سنہ ۶۳۲ھ میں موحدین کی فوج کو عیسائیوں کے مقابلہ میں ایسی سخت شکست ہوئی کہ وہ اندلس میں اپنی حکومت قائم نہ رکھ سکے مگر اندلس کے سلاطین غرناطہ برابر عیسائیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اندلس کی حکومت کے نکل جانے سے خاندان موحدین میں ضعف وتنزل کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس کے بعد سلطان صلاح الدین نے طرابلس ان سے چھین لیا۔ پھر خاندان حفصیہ نے جو تیونس میں موحدین کی طرف سے بہ طور نائب حکمران تھا، خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ پھر الجیریا میں خاندان زیانیہ بھی خود مختار ہوگیا، پھر ملک مراکش میں کئی مدعیان سلطنت اٹھ کھڑے ہوئے۔ آخر سنہ ۶۲۷ھ میں اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ مراکش میں خاندان مرینیہ حکمران ہوا۔

دولت حفصیہ (تیونس):

موحدین نے اپنی جانب سے تیونس میں حفص نامی ایک شخص کو نیابت وحکومت پر مامور کیا تھا۔ اس کے خاندان میں یہ عہدہ نسلاً متوارث ہوا۔ آخر سنہ ۶۲۵ھ میں اس خاندان نے خودمختاری اختیار کی۔ اس خاندان نے قریباً تین سو سال تک تیونس میں نیک نامی کے ساتھ حکومت کی۔ آخر سنہ ۹۴۱ھ میں عثمانی امیرالبحر باربروسا خیرالدین نے تیونس کو فتح کر کے مقبوضات عثمانیہ میں شامل کیا اور اس خاندان کا خاتمہ ہوا۔

دولت زیانیہ الجیریا:

موحدین کی جانب سے صوبہ الجیریا میں خاندان زیانیہ کا جو شخص حاکم مقرر تھا، اس نے خاندان حفصیہ کی تقلید میں سنہ ۶۳۳ھ میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ ان لوگوں کا دارالسلطنت تلمسان تھا۔ سنہ ۷۹۶ھ تک ان کی حکومت رہی پھر مراکش کے خاندان مرینیہ نے ان کے ملک پر قبضہ کر کے ان کو نیست و نابود کر دیا۔

دولت مرینیہ (مراکش):

خاندان مرینیہ سنہ ۵۹۱ھ سے مراکش کے پہاڑی علاقہ پر خودمختارانہ قابض ومتصرف تھا۔ سنہ ۶۲۷ھ میں انہوں نے موحدین کے دارالسلطنت پر قبضہ کر کے تمام مراکش پر اپنی حکومت قائم کر لی اور سنہ ۷۹۶ھ میں اس خاندان کو اسی خاندان کے ایک شعبہ نے برباد کر دیا اور خود اس کا قائم مقام ہو گیا۔ اس کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کی دو چھوٹی چھوٹی رقیب حکومتیں قائم ہوئیں جن کا شغل آپس میں ہنگامہ کا بازار گرم رکھنا ہوا۔

یہاں تک ممالک مغربیہ کی صرف ان سلطنتوں کی فہرست بیان ہوئی ہے جو خلافت عباسیہ کی ہم عصر یعنی سنہ ۹۰۰ھ سے پہلے تھیں۔ خلافت عباسیہ کے ختم وخلافت عثمانیہ کے شروع ہونے کے بعد ممالک اسلامیہ کی جو حالت ہوئی یا جو کثیر التعداد نئی سلطنتیں دنیا کے ہر حصہ میں قائم ہوئیں، ان کا ذکر اس فصل میں نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ خلافت عباسیہ کے معاصر تھیں۔ ان کے بعد خلافت عثمانیہ اور اس کی معاصر تمام اسلامی سلطنتوں کا حال بیان کیا جائے گا۔ چونکہ خلافت عثمانیہ اس سال یعنی سنہ ۱۳۴۲ھ تک قائم رہی ہے، لہٰذا خلافت عثمانیہ اور اس کی معاصر سلطنتوں کا حال لکھ لینے کے بعد

تاریخ اسلام مکمل ہو جائے گی۔ اس فصل میں جن حکومتوں کی فہرست بیان ہو رہی ہے، ان میں سے بعض ایسی بھی ہیں کہ ان کا تذکرہ صرف اسی قدر کافی ہے جو اس فہرست میں بیان ہوا لیکن اکثر ایسی ہیں کہ ان کی تفصیلی تاریخ بیان ہونی چاہیے۔ اگرچہ وہ تفصیل بھی خلاصہ اور نہایت مختصر مگر مکمل خلاصہ ہو گا۔ انہیں حکومتوں کے حالات کا مجموعہ تاریخ اسلام کی تیسری جلد ہو گی۔ اس فصل میں ممالک مشرقیہ کی بعض سلطنتوں کی طرف ابھی اور اشارہ کرنا باقی ہے۔ مثلاً:

دولت اسماعیلیہ حشاشین:

امام جعفر صادق کے بیٹے موسیٰ کاظم کو اثنا عشری شیعہ ان کا جانشین اور امام مانتے ہیں لیکن امام موسیٰ کاظم کے ایک بھائی امام اسماعیل تھے۔ جو لوگ بہ جائے موسیٰ کاظم کے ان کے بھائی کو امام مانتے ہیں وہ شیعہ اسماعیلیہ کہلاتے ہیں۔ دولت عبیدیین اسماعیلی شیعوں کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ اسماعیلیوں نے اپنے حصول مقصد کے لیے ہمیشہ پوشیدہ اور خفیہ کارروائیوں اور نہاں در نہاں سازشوں سے کام لیا۔ سلطنت عبیدیہ نے اپنے عقائد اور خیالات کی اشاعت کے لیے شروع ہی سے ایک خفیہ محکمہ قائم کر دیا تھا۔ جس کے ذریعہ سے داعیوں کو اپنی مقبوضہ مملکت میں ہی نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی بھیجا جاتا تھا۔ یہ داعی واعظوں، درویشوں اور تاجروں وغیرہ کی شکل میں تمام اسلامی ممالک کے اندر پھیلے ہوئے تھے اور لوگوں کو اسماعیلی عقائد کی تعلیم و ترغیب دیتے تھے۔ ان کے کفریہ عقائد نہایت خطرناک تھے۔ قرآن مجید کو یہ لوگ قابل عمل نہیں جانتے تھے۔ اسماعیل بن جعفر صادق کو پیغمبر مانتے اور نبی اکرم ﷺ کا ہم رتبہ خیال کرتے اور محمد مکتوم بن اسماعیل بن جعفر صادق کو بھی نبی یقین کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اماموں کی تعداد سات تھی۔ بانی دولت عبیدیہ کو ساتواں امام قرار دیتے اور عبیدیہ سلاطین کی فرماں برداری واطاعت کو ذریعہ نجات ثابت کرتے وغیرہ۔ ان داعیوں کی کوششوں نے سلطنت عبیدیہ کو بہت فائدہ پہنچایا اور اس کی قبولیت کو بڑھایا تھا۔

حسن بن صباح ایک شخص رے کا باشندہ تھا۔ اس کے نسب میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ عربی النسل تھا۔ اس کے آباواجداد یمن سے آئے تھے۔ بعض کا قول ہے کہ وہ مجوسی النسل تھا۔[1] بہرحال حسن بن صباح کے باپ اور اہل خاندان کا عقیدہ شیعی تھا۔ حسن بن صباح نے

---

[1] اس نے قلعہ الموت میں اپنی سلطنت قائم کر رکھی تھی۔ اس کے پیروکار حشیشین کہلاتے تھے۔ حشیش کا نشہ ان کی زندگی کا لازمہ تھا۔ بعض نے حسن بن صباح کو عربی النسل یہودی کہا ہے۔

نیشا پور میں تعلیم پائی تھی۔ وہ عمر خیام اور نظام الملک طوسی وزیر اعظم ،الپ ارسلان و ملک شاہ کا ہم سبق رہ چکا تھا۔ نہایت ذہین اور خوددار شخص تھا۔ مستنصر عبیدی کے زمانے میں حسن بن صباح مصر پہنچا۔ وہاں اس کی بڑی عزت وتکریم ہوئی۔ سال بھر سے زیادہ عرصہ تک وہ مصر میں شاہی مہمان اور مستنصر کے مصاحب کی حیثیت سے رہا۔ وہاں اس نے عقائد اسماعیلیہ سے پوری واقفیت حاصل کر کے مستنصر کے ہاتھ پر بیعت کی اور دولت عبیدیہ کے اعلیٰ درجہ کے داعیوں میں شمار ہوا۔ جب حسن بن صباح اسماعیلیہ داعی بن کر روانہ ہوا تو اس نے مستنصر سے پوچھا کہ آپ کے بعد کس کے احکام کی تعمیل کروں اور آپ کے بعد میرا امام کون ہوگا؟ مستنصر نے کہا کہ میرے بعد تمہارا امام میرا بیٹا نزار ہوگا۔ چنانچہ اسی وجہ سے حسن بن صباح کی قائم کی ہوئی جماعت کو نزار یہ بھی کہتے ہیں۔ مصر سے عراق وایران میں واپس آ کر حسن بن صباح نے مختلف شہروں میں تھوڑے دن اقامت اختیار کی اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا شروع کیا۔ یہاں پہلے ہی سے اسماعیلی داعیوں کی کوشش سے بہت سے شیعہ اور غیر شیعہ اسماعیلیہ خیالات کے پیرو ہو چکے تھے۔ اس لیے حسن بن صباح کو بہت جلد بہت سے معاون ومددگار مل گئے۔ ملک شاہ کی طرف سے صوبہ اصفہان وقہستان کا حاکم مہدی علوی تھا۔ حسن بن صباح نے مہدی علوی سے اپنی عبادت گاہ بنانے کے لیے قلعہ الموت کو خرید لیا۔ اس قلعہ میں بیٹھ کر اس نے ہر قسم کی مضبوطی کر لی اور اپنے معتقدین کو جمع کر کے اور اردگرد کے جاہل وجنگجو قبائل میں اپنا اثر قائم کرنے کے بعد اپنی حکومت کی بنیاد قائم کی اور شیخ الجبل کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے بعض عجیب وغریب عقائد واعمال ایجاد کر کے لوگوں کو ان کی تلقین کی۔ اس نے فدائیوں کا ایک گروہ تیار کیا۔ ان فدائیوں نے بڑے بڑے کام کیے۔ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں، وزیروں، عالموں کو حسن بن صباح قلعہ الموت میں بیٹھا ہوا اپنے فدائیوں کے ہاتھ سے قتل کرا دیتا تھا۔ حسن بن صباح نے اپنے مشہور داعی کیا بزرگ امید کو اپنا ولی عہد وجانشین بنایا۔ اس کے بعد کیا بزرگ امید کی اولاد میں کئی پشت تک حکومت قائم رہی۔ آخر سنہ ۶۲۵ھ میں ہلاکو خاں کے ہاتھ سے اس کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ یہ سلطنت جو حسن بن صباح نے قائم کی تھی، قہستان میں سنہ ۴۸۳ھ سے سنہ ۶۵۵ھ تک پونے دو سو سال تک قائم رہی۔ اس اسماعیلی حکومت کی دھاک ساری دنیا میں بیٹھی ہوئی تھی اور بڑے بڑے بادشاہ فدائیوں سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ ہمیشہ دھوکے سے اور دشمن کو تنہا پا کر اچانک حملہ کرتے تھے۔

ملک شام پر عیسائیوں کے صلیبی حملے:

یورپ کے عیسائیوں نے متفق ومتحد ہو کر مسلمانوں پر سنہ ۴۹۰ھ سے حملے شروع کیے۔ عیسائیوں کے مذہبی پیشواؤں یعنی پادریوں نے تمام یورپ کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر دیوانہ بنا دیا تھا اور ملک شام کو مسلمانوں کے قبضے سے نکال لینے کو اعلیٰ درجہ کی مذہبی خدمت اور ذریعہ نجات قرار دیا گیا تھا۔ عیسائیوں کے ان حملوں① کا سلسلہ تین سو سال تک جاری رہا۔ یورپ کے تمام عیسائی بادشاہ اپنی ہر قسم کی متحدہ طاقت صرف کرنے اور بہ ذات خود عیسائی حملہ آوروں کے ساتھ ملک شام کی طرف آنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ان تمام لڑائیوں اور چڑھائیوں کا سلسلہ تاریخ اسلام کا ایک دلچسپ باب ہے اور اس داستان کو ایک ہی جگہ مسلسل بیان کیا جائے گا، ان شاء اللہ! ان صلیبی لڑائیوں کا وہ حصہ جہاں صلاح الدین ایوبی نے عیسائیوں کا مقابلہ کیا ہے، نہایت اہم اور بہت دلچسپ ہے۔

دولت مغلیہ (ایشیا):

ملک چین کے شمالی پہاڑوں سے چنگیز خاں کی زیر قیادت مغلوں یا تاتاریوں کے گروہ نے مغرب کی جانب خروج کر کے ترکستان، ماوراء النہر، خراسان، آذربائیجان، افغانستان، فارس، عراق، شام، ایشیائے کوچک، روس، آسٹریا تک کے تمام ملکوں کو اپنی لوٹ مار اور قتل وغارت کی آماج گاہ، ساتویں صدی ہجری کے شروع میں بنالیا تھا۔ سینکڑوں حکومتوں کو برباد اور سینکڑوں حکمران خاندانوں کو بے دخل کر دیا۔ ساتویں صدی ہجری کے وسط یعنی سنہ ۶۵۶ھ میں ہلاکو خاں نے بغداد کو لوٹا اور بغداد کے آخری خلیفہ عباسی مستعصم باللہ کو قتل کیا۔ اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ سنہ ۶۲۴ھ میں چنگیز خاں کے فوت ہونے پر مغلوں کی سلطنت کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ چنگیز خاں کی اولاد کا ایک حصہ چین پر حکمران ہوا۔ ایک حصے نے ترکستان و ماوراء النہر میں اپنی حکومت قائم کی۔ ایک حصہ نے خراسان وایران پر اپنی حکومت قائم کی۔ ایک حصہ بحر قزوین کے شمالی ومغربی حصہ پر فرماں روا ہوا۔ ان میں مغلوں کی وہ حکومت جو ایران وخراسان میں ہلاکو خاں نے قائم کی تھی، زیادہ قابل توجہ ہے۔ چند ہی روز کے بعد ان مغلوں کی اکثر حکومتیں اسلامی حکومتوں میں تبدیل ہو گئیں یعنی مغلوں نے اسلام قبول

---

① ان جنگوں کو صلیبی جنگیں یا مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی مقدس جنگیں (CRUSADES.) کہتے ہیں۔

کرلیا اور اسلام کے خادم بن گئے۔ دوسویا پو نے دوسو برس کے بعد براعظم ایشیا میں مغلوں کی حکومتیں کمزور ہوتے ہوتے نابود ہونے لگیں اور ان کی جگہ کثیر التعداد چھوٹی چھوٹی ریاستیں جابہ جا ایران وخراسان وعراق و ماوراءالنہر میں قائم ہوگئیں۔

سنہ ۸۰۰ھ کے قریب ان مغلوں کے تنزل و بربادی کے عالم میں ایک شخص تیمور سردار ہوا۔ اس نے اپنی ملک گیریوں اور فتح مندیوں سے تمام براعظم ایشیا میں ایک تہلکہ برپا کر دیا اور دنیا کو ایک مرتبہ پھر چنگیز خاں کی ملک گیریوں کا تماشہ دکھا دیا۔ تیمور چونکہ مسلمان تھا، اس لیے اگرچہ قتل وغارت گری کے ہنگامے اس کے ذریعہ سے بھی بہت رونما ہوئے۔ تاہم اس کی ملک گیریاں زیادہ عرصہ تک نہ رہیں۔ انہوں نے بھی تقریباً اتنا عرصہ حکومت کی جتنا عرصہ چنگیز خاں کی اولاد نے حکومت کی تھی۔ جس طرح چنگیز خاں کی اولاد کا تنزل ہوا، بالکل اسی طریقہ اور اسی رفتار سے تیمور کی اولاد کا زوال ہوا۔ جتنے دنوں چنگیزی مغلوں نے ایشیاء کے ملکوں پر حکومت کی تھی، قریباً اتنے ہی دنوں تیموری مغلوں کا دور دورہ رہا۔ جب ایران وترکستان وغیرہ سے تیموری خاندان کی حکومت مٹ گئی تو تیمور کی اولاد میں ایک شخص بابر پیدا ہوا۔ اس نے ہندوستان وافغانستان میں ایک زبردست حکومت کی بنیاد ڈالی جو عرصہ تک اس کے خاندان میں باقی رہی۔

دولت عثمانیہ (ترکی):

ترکان غز کا تذکرہ اوپر کہیں آ چکا ہے۔ ان ترکان غز کے اکثر قبائل کو سلجوقیوں نے دھکیل کر صوبہ ارمینیا اور بحیرہ قزوین کے ساحلوں کی طرف پہنچا دیا تھا۔ انہیں میں ایک وہ قبیلہ تھا جس کو سلطنت عثمانیہ کو قائم کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ جب سلاطین سلجوقیہ کا دور دورہ ختم ہوا اور تاتاریوں نے ایشیا کے ملکوں میں ہنگامے برپا کرنے شروع کر دیے تو اس زمانے میں ایشیائے کوچک کے اس حصے میں جو مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، دس بارہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں۔ ان ریاستوں میں اکثر سلجوقی شہزادے یا سلجوقیوں کے موالی حکومت کرتے تھے۔ انہیں میں ایک ریاست سرحد ارمینیا پر ترکان غز کے مذکورہ قبیلہ کے سردار سلیمان خاں کے قبضے میں تھی۔ سنہ ۶۲۱ھ میں جب مغلوں نے علاؤالدین کیقباد سلجوقی کی ریاست پر حملہ کیا تو سلیمان خاں اور اس کے بیٹے ارطغرل نے اپنے ہم قوم ترکوں کو لے کر مغلوں کے خلاف علاؤالدین کیقباد کی مدد کی۔ یہ مددعین وقت پر پہنچی اور اس سے مغلوں کو شکست کھا کر فرار ہونا پڑا۔ لہٰذا علاؤالدین کیقباد سلجوقی نے سلیمان کو خلعت دے کر اپنی

فوج کا سپہ سالار بنایا اور اس کے بیٹے ارطغرل کو شہر انگورہ کے قریب ایک وسیع جاگیر عطا کی۔ علاؤالدین سلجوقی کا دارالسلطنت اس زمانے میں شہر قونیہ تھا۔ ارطغرل کی جاگیر اور ریاست قیصر روم کے علاقے کی سرحد پر واقع تھی۔

ارطغرل نے اپنے باپ کے فوت ہونے پر اپنی ریاست کو وسیع کیا۔ کچھ علاقہ سلطان قونیہ سے انعام واکرام کے طور پر حاصل کیا اور کچھ عیسائی علاقے کو دبایا۔ اس طرح ارطغرل کی ایک قابل تذکرہ ریاست قائم ہوگئی۔ مغلوں نے ایشیائے کوچک کے ان چھوٹے رؤسا سے کچھ زیادہ تعرض نہیں کیا اور ان کو ان کے حال پر قائم رہنے دیا۔

سنہ ۶۴۱ھ میں علاؤالدین کیقباد سلجوقی کے بیٹے غیاث الدین کیخسرو کو مغلوں کا خراج گزار ہونا پڑا۔ سنہ ۶۵۷ھ میں ارطغرل کا بیٹا عثمان خاں پیدا ہوا۔ سنہ ۶۸۷ھ میں ارطغرل فوت ہوا اور اس کا بیٹا عثمان خاں بہ عمر تیس سال باپ کی جگہ ریاست کا مالک وفرماں روا ہوا۔ شاہ قونیہ یعنی غیاث الدین کیخسرو سلجوقی نے اپنی بیٹی کی شادی عثمان خاں سے کردی اور اس کو اپنی فوج کی سپہ سالاری کا عہدہ بھی عطا کیا۔ سنہ ۶۹۹ھ میں غیاث الدین کیخسرو سلجوقی جب مقتول ہوا تو تمام سلجوقی ترکوں نے سلطنت قونیہ کے تخت پر عثمان خاں کو بٹھایا اور اس طرح اپنی قدیمی ریاست کے علاوہ قونیہ کا علاقہ بھی عثمان خاں کے زیر تصرف آ گیا۔ عثمان خاں نے اپنے آپ کو سلطان کے لقب سے منسوب کیا۔ یہی پہلا سلطان ہے جس کے نام سے اس کے خاندان میں سلطنت عثمانیہ قائم ہوئی۔ عثمانی سلاطین نے بہت جلد تمام ایشیائے کوچک پر قبضہ کرکے قیصر روم کی حکومت کو ایشیا سے نابود کر دیا۔ سنہ ۶۲۳ھ میں سلاطین عثمانیہ نے ایڈریا نوبل کو فتح کر کے اپنا دارالسلطنت بنایا اور صوبہ طرابلس پر قبضہ کر کے براعظم یورپ کے جنوبی ومشرقی حصہ میں اسلامی حکومت قائم کی۔ قیصر روم نے دب کر صلح کی اور عثمانیہ طاقت سے اپنے بقیہ ملک کو بچایا۔ اس کے بعد عثمانیوں نے عیسائیوں کو شکستیں دے کر یورپ میں اپنے مقبوضات کو وسیع کرنا شروع کیا۔ آخر سنہ ۷۹۲ھ میں آسٹریا، بلگیریا (بلغاریہ)، بوسنیا، ہنگری وغیرہ کے عیسائی سلاطین نے متحد ومتفق ہو کر ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ سلطنت عثمانیہ پر حملہ کیا۔ سلطان مراد خاں عثمانی نے اپنی قلیل التعداد فوج سے مقام کسووا[1] پر عیسائیوں کے اس لشکر

---

[1] عصر حاضر میں (1990-91ء میں) عیسائیوں نے یورپ کی واحد مسلم ریاست بوسنیا اور اس کے دارالحکومت کسووا میں جس طرح لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور اس مسلم ریاست کو تباہ کیا، شائد یہ انھوں نے ۷۹۲ھ کی اپنی شکست فاش کا بدلہ لیا ہو۔

عظیم کا مقابلہ کیا اور سب کو شکست فاش دے کر تمام براعظم یورپ کو ہلا دیا۔

سنہ ۷۹۹ھ میں تمام براعظم یورپ نے مل کر جس میں فرانس و جرمنی وغیرہ کی افواج بھی شامل تھیں، سلطنت عثمانیہ کو بیخ و بن سے اکھیڑ دینے کا تہیہ کیا اور مقام نکوپولس میں سلطان بایزید ابن سلطان بامراد خاں سے معرکہ آرائی ہوئی۔ اس لڑائی میں بیس سے زیادہ عیسائی سردار قیدیوں میں بایزید کے سامنے پیش ہوئے جو بادشاہ یا شہزادے تھے۔ اس شکست فاش نے تمام عیسائی دنیا میں خوف وہراس پیدا کر دیا اور عیسائی سلاطین نے اپنے شکست خوردہ ممالک میں جا کر صلیبی جنگ کے اشتہار شائع کیے اور تمام عیسائی مذہبی جوش میں پھر پہلے سے زیادہ جوش وخروش کے ساتھ جمع ہو کر بایزید یلدرم سے نبرد آزمائی پر مستعد ہو گئے۔ بایزید یلدرم نے اس مرتبہ بھی سب کو شکست فاش دے کر تمام یورپ سے فرمانبرداری کا اقرار لیا۔ اس زمانے میں قیصر روم قسطنطنیہ میں ڈرا اور سہا ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے عثمانیوں کے خلاف خفیہ طور پر عیسائی حملہ آوروں کو امداد پہنچانے میں کمی نہیں کی تھی۔ لہٰذا بایزید یلدرم نے ارادہ کیا کہ سب سے پہلے قیصر کو سزا دے کر جزیرہ نما بلقان سے عیسائی حکومت کا نام ونشان مٹا دے اور اس کے بعد تمام براعظم یورپ کو فتح کر کے دنیا سے عیسائیوں کا استیصال کر دے۔ وہ ابھی قیصر پر حملہ کرنے نہ پایا تھا کہ براعظم ایشیا کی طرف سے خبر پہنچی کہ تیمور ایک زبردست فوج لے کر بایزید یلدرم کے ایشیائی مقبوضات پر حملہ آور ہوا ہے۔ چنانچہ بایزید کو فوراً ایشیائے کوچک میں آنا اور تیمور کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور سنہ ۸۰۴ھ میں جنگ انگورہ (انقرہ) ہوئی۔ اس لڑائی میں تیمور فتح مند اور بایزید یلدرم گرفتار ہوا اور براعظم یورپ پامالی سے بچ گیا۔ اس کے بعد یہ معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کا اب خاتمہ ہو گیا ہے لیکن چند برس کے بعد عثمانیہ سلطنت پھر اسی عروج اور شوکت کی حالت میں دیکھی گئی جیسی کہ وہ بایزید یلدرم کے زمانے میں تھی اور قریباً پچاس ہی سال کے بعد محمد خاں ثانی نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے جزیرہ نما بلقان سے عیسائی حکومت کو بے دخل کر دیا۔ اس کے بعد سلطان سلیم خاں نے ایرانیوں کو شکست فاش دی، مصر کو فتح کیا، عراق اور عرب کو اپنے قبضہ میں لایا اور ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم کر کے سنہ ۹۲۲ھ میں خلافت عباسیہ کا خاتمہ کر کے عثمانیوں میں خلافت اسلامیہ کے سلسلہ کو جاری کیا، جیسا کہ اوپر اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس خاندان کی تاریخ نہایت دلچسپ اور مسلمانوں کے لیے بے حد عبرت آموز ہے۔

ترکان کاشغر:

فرغانہ کے مشرقی قطعات میں جو ترک قبیلے مسلمان ہو گئے تھے، انہوں نے دولت سامانیہ کے زوال پذیر ہونے پر اپنی حکومت مختارانہ حکومت قائم کی جو سنہ ۳۲۰ھ سے سنہ ۵۶۰ھ تک قائم رہی۔ ان میں ایلک خاں مشہور حاکم ترکستان ہوا ہے۔ ان کا دارالحکومت کاشغر تھا۔ یہ ترکان غز میں سے تھے اور ترکان عثمانی انہیں کے ہم وطن تھے۔ ترکان سلجوقی کے ظہور و خروج پر اکثر ترکان غز ارمینیا وآذربائیجان کی طرف چلے گئے۔ ترکان سلجوق بھی انہیں کے ہم وطن و ہم قوم تھے۔ جو قبائل مغرب کی جانب آوارہ ہو کر چلے گئے، انہوں نے بحیرہ قزوین کے اردگرد اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ جو مشرق ہی کی جانب دھکیل دیے گئے تھے، انہوں نے مشرقی ترکستان یعنی کاشغر میں حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔

شاہان ہندوستان:

ہندوستان کا ایک صوبہ یعنی ملک سندھ پہلی صدی ہجری میں خلافت اسلامیہ کی حدود میں شامل ہو گیا تھا۔ عرصہ دراز تک سندھ کے عامل دربار خلافت سے مقرر ہو کر آتے رہے۔ اس کے بعد جب خلافت عباسیہ میں ضعف وانحطاط پیدا ہوا تو سندھ میں کئی خود مختار مسلم ریاستیں قائم ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ ریاستوں کے رقبے محدود ہوتے گئے۔ محمود غزنوی کے حملوں تک ایک ریاست سندھ میں موجود تھی۔ محمود غزنوی نے پنجاب وملتان پر قبضہ کر کے حکومت میں شامل کیا۔ جب غزنویوں کے قائم مقام غوری ہوئے تو انہوں نے تمام شمالی ہند کو فتح کر کے ہندوستان میں حکومت اور مستقل بادشاہت قائم کی۔ پہلا مسلمان بادشاہ جو ہندوستان میں سریر آرائے حکومت ہوا، قطب الدین ایبک تھا جو شہاب الدین غوری کا غلام تھا۔ غلام خاندان کے بعد خلجی خاندان نے حکومت کی۔ خلجیوں کے بعد تغلق حکمران ہوئے۔ خاندان تغلق کے بعد خضر خاں کا خاندان فرماں روا ہوا۔ اس کے بعد لودھی فرماں روا ہوئے۔ لودھیوں کے بعد مغل ہندوستان میں آئے مگر شیر شاہ نے ان کو نکال کر اپنی سلطنت قائم کی۔ مغلوں نے دوبارہ ہندوستان کو شیر شاہ کے خاندان سے فتح کر کے اپنی حکومت قائم کی۔ اس کے بعد انگریز ہندوستان میں آئے۔ یہ مسلمان خاندان جن کا نام اوپر لیا گیا، دہلی وآگرہ میں رہتے تھے۔ انہیں کے معاصر اور بھی مسلمان سلاطین ہندوستان کے مختلف صوبوں میں فرماں روا

ہوئے مثلاً بہمنی خاندان، شاہان گجرات، شاہان جون پور، شاہان بنگال، شاہان مالوہ وغیرہ۔ ان سب کا حال اور ہندوستان کی پوری تاریخ ایک الگ کتاب میں بیان ہوگی۔ اسی میں خاندان غزنین اور خاندان غوری کا تذکرہ کیا جائے گا، ان شاء اللہ!

سلطنت جلائرہ (عراق):

مغلوں یعنی تاتاریوں کی حکومت کو زوال آیا تو مغلوں کے فوجی سرداروں نے جابہ جا اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ من جملہ ان کے خاندان جلائر نے سنہ ۷۳۶ھ سے سنہ ۸۱۴ھ تک عراق میں حکومت کی۔ ان کا دارالسلطنت بغداد تھا۔ اس خاندان کی حکومت کا بانی شیخ حسن بزرگ جلائر تھا، اس کا بیٹا ادریس خاں سنہ ۷۵۷ھ میں اپنے باپ کی وفات پر تخت نشین ہوا۔ اس نے آذربائیجان اور تبریز کو ترکمانوں سے سنہ ۷۵۹ھ میں چھین لیا اور سنہ ۷۶۶ھ میں موصل اور دیار بکر کو بھی اپنی حکومت میں شامل کیا۔ سنہ ۷۸۴ھ میں اس کا انتقال ہوا تو کردستان اس کے بیٹے بایزید کو ملا اور عراق و آذربائیجان وغیرہ پر اس کے دوسرے بیٹے سلطان احمد جلائر کی حکومت قائم ہوئی۔ سنہ ۷۹۶ھ میں تیمور نے سلطان احمد جلائر کا تمام ملک فتح کر لیا اور احمد جلائر بھاگ کر مصر چلا گیا۔ وہاں مملوک سلطنت میں کئی سال پناہ گزیں رہنے کے بعد جبکہ تیمور سمرقند کی طرف واپس گیا، احمد جلائر پھر آ کر اپنی مملکت قدیمہ پر قابض ہوگیا۔ سنہ ۸۱۳ھ میں احمد جلائر قرا یوسف ترکمان کی لڑائی میں مارا گیا اور اس کا بھتیجا شاہ ولد بغداد میں تخت نشین ہوا۔ آخر سنہ ۸۱۴ھ میں اس خاندان کا قراقونلی ترکمانوں نے خاتمہ کر دیا۔

دولت مظفریہ:

مغلیہ سلاطین کے دربار میں امیر مظفر خراسانی ایک مشہور زبردست سردار تھا۔ اس کے بیٹے مبارز الدین کو سنہ ۷۱۳ھ میں مغل بادشاہ ابوسعید نے فارس کی گورنری عطا کی۔ سنہ ۷۱۵ھ میں فارس پر کرمان کا بھی اضافہ ہوگیا۔ اس نے فارس و کرمان پر قابض و متصرف ہو کر خودمختاری کا اعلان کیا۔ اس میں سنہ ۷۵۹ھ تک حکومت رہی۔ حافظ شیرازی مشہور شاعر اسی خاندان کے بادشاہ شجاع نامی کے دربار میں عزت کا مرتبہ رکھتے تھے۔

ترکمانان قراقونلی (آذربائیجان):

یہ بھی مثل جلائر خاندان کے مغلیہ افواج کی سرداری رکھتے تھے۔اس خاندان نے آذربائیجان میں نہروان کے جنوبی ملکوں میں اپنی حکومت قائم کی اور سنہ۷۸۰ھ سے سنہ۸۷۴ھ تک حکمران رہے۔ان میں قرایوسف ترکان بہت مشہور ہے۔ان لوگوں سے آق قونلی ترکمانوں نے حکومت چھین لی۔قراقونلی کا معنٰی سیاہ بھیڑ ہے۔یہ لوگ اپنے جھنڈے پر سیاہ بھیڑ کی تصویر بناتے تھے۔اس لیے ان کو قراقونلی کہا جاتا ہے۔اسی طرح آق قونلی کا معنٰی سفید بھیڑ ہے۔جو لوگ سفید بھیڑ کی تصویر اپنے جھنڈے پر رکھتے تھے، وہ آق قونلی کہلائے۔

آق قونلی خاندان:

آق قونلی ترکمانوں نے بھی دیار بکر کے نواح میں اپنی ریاست سنہ۷۸۰ھ میں قائم کر لی تھی۔ انہوں نے سنہ۸۷۴ھ میں قراقونلی ترکمانوں کو آذربائیجان سے بالکل بے دخل کر کے اپنی حکومت تمام آذربائیجان و دیار بکر پر قائم کر لی تھی مگر سنہ۹۰۷ھ میں شاہ اسماعیل صفوی نے ان کی سلطنت کو مٹا کر تمام ممالک پر قبضہ کرلیا۔

دولت صوفیہ:

سنہ۸۰۴ھ میں جب بمقام انگورہ تیمور کو فتح حاصل ہوئی تو بہت سے ترک تیموری لشکر نے گرفتار کر لیے۔ بعد فتح ان قیدیوں کو لیے ہوئے تیمور شیخ صفی الدین اردبیلی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ صفی الدین اپنے آپ کو امام موسیٰ کاظم کی اولاد میں سے بتاتے تھے مگر سنی مذہب رکھتے تھے۔تیمور نے اسی وقت ترک قیدیوں کو آزاد کر دیا۔قیدیوں نے آزاد ہوکر شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی اور شیخ کی خدمت میں رہنے لگے۔تیمور اردبیل سے چلا گیا لیکن شیخ کے گرد سرفروش خدام کا ایک مجمع کثیر فراہم ہوگیا اور نسلاً بعد نسل شیخ کی اولاد کے ساتھ ان ترک مریدوں کی اولاد نے وفاداری کا اظہار کیا حتیٰ کہ شیخ کی اولاد میں اسماعیل صفوی کو بادشاہ بنا کر چھوڑا۔اسماعیل صفوی شیعہ عقیدہ رکھتا تھا۔ سنہ۹۰۳ھ میں وہ ایران کے بعض شہروں پر قابض و متصرف ہوا اور پھر رفتہ رفتہ تمام ملک ایران پر قابض ہوگیا۔سنہ۹۲۰ھ میں سلطان سلیم عثمانی نے اس کو مقام خالدران پر، جو تبریز سے بیس فرسنگ کے فاصلہ پر ہے، شکست فاش دی اور صفوی سلطنت کے بعض مغربی صوبوں کو اپنی حکومت میں شامل

کر کے شام و مصر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسماعیل صفوی اس شکست کے بعد دس سال تک زندہ رہا۔ اس کے بعد اس کی اولاد میں ایران کی حکومت و سلطنت جاری رہی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۱۴۸ھ میں نادر شاہ ایرانی نے اس خاندان کا خاتمہ کر کے اپنی حکومت قائم کی۔ اس کے بعد ایران و افغانستان پر پٹھانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ پھر ایران میں سلطنت قاچار شروع ہوئی۔ افغانستان اب تک پٹھانوں کے قبضہ میں ہے۔

اجمالی نظر:

حکمران خاندانوں اور اسلامی حکومتوں کی مندرجہ بالا فہرست کے مطالعہ کرنے کے بعد یہ جلد دوم ختم ہو رہی ہے۔ جلد سوم کے مطالعہ کرنے والے کے دماغ میں سلطنت اسلامیہ کی نئی طرز کا ایک خاکہ قائم ہو سکے گا اور وہ یہ اندازہ کر سکے گا کہ کس کس زمانے میں کون کون سا خاندان کہاں کہاں حکمران تھا؟ اس اجمالی علم و واقفیت کے بعد خلافت عباسیہ کے خاتمہ تک اس کی پوری حالت اور ترقی و تنزل کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ ادھر آئندہ جلد سوم میں انہیں خاندانوں کے جو حالات بیان ہونے والے ہیں، ان کے سمجھنے میں یہ فصل مطالعہ کرنے والے کی بے حد امداد کرے گی، ان شاء اللہ!

پانچواں باب

مسلمانوں سے پہلے اندلس کی حالت

جغرافیہ اندلس:

یورپ کے نقشے میں جنوب ومغرب کی جانب ایک نمایاں جزیرہ نما ہے جس کے ذریعہ سے یورپ کا براعظم افریقہ کے براعظم سے ملتا یعنی اس جزیرہ نما کا جنوبی گوشہ مراکش کے شمالی گوشہ سے بغل گیر ہو کر وہ ایک خاکنائے بنانا چاہتے تھے کہ بحر روم یا بحر متوسط نے بحر ظلمات یا بحر اطلانطک سے مصافحہ کرنے میں سبقت کی اور یورپ وافریقہ کے درمیان قریباً دس میل کا فاصلہ رہ گیا۔ بحر متوسط اور خلیج بسکی ایک دوسرے کی طرف بڑھ کر اس جزیرہ نما کو جزیرہ بنانا چاہتے تھے مگر جبل البرتات یا کوہ پیری نیز کے سلسلے نے ایک دیوار اٹھا کر اس جزیرہ نما کو فرانس سے جدا تو کر دیا لیکن جزیرہ نہ بننے دیا۔ یورپ کے اس جنوبی ومغربی جزیرہ نما کو آئی بیریا، اسپین، ہسپانیہ، اندلس وغیرہ ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کا رقبہ دو لاکھ مربع میل سے زیادہ ہے۔

پیداوار اور آب وہوا:

آب وہوا یورپ کے تمام ملکوں سے بہتر یعنی معتدل، زمین زراعت کے لیے زیادہ موزوں اور زرخیز ہے۔ شادابی وسرسبزی اور کثرت پیداوار میں یہ ملک شام ومصر سے مشابہ ہے۔ چاندی کی کانیں خاص طور پر مشہور اور دوسری قیمتی دھاتیں بھی اس ملک میں پائی جاتی ہیں۔

وادی الکبیر اور ٹیکس دو مشہور بڑے دریا بہتے ہیں۔ ان دریاؤں اور ان کے معاونوں نے اس جزیرہ نما کو تختہ گلزار بنانے میں کمی نہیں کی۔ اس جزیرہ نما کی شمالی سرحد پر خلیج بسکی اور جبل البرتات ہے۔ مشرق میں بحر روم یا بحر متوسط ہے۔ جنوب میں بحر متوسط، آبنائے جبل الطارق اور بحر ظلمات اور مغرب میں بحر ظلمات ہے۔

صوبوں اور ولایتوں کی تفصیل:

اس جزیرہ نما کے مشہور صوبوں اور ولایتوں کی تفصیل اس طرح ہے گوشہ جنوب ومغرب میں پر تغال (پرتگال)، شمال ومغرب میں جلیقیہ کا صوبہ ہے، شمال میں استوریہ، قسطلہ، اربونیہ، ارغوان کے صوبے ہیں۔ شمال و مشرق میں قطلونیہ، مشرق میں اندلوسیہ کے صوبے ہیں۔طیطلہ اندلس یا ہسپانیہ کے وسط میں ہے۔قرطبہ اور غرناطہ کے مشہور شہر صوبہ اندلوسہ یعنی جزیرہ نما کے جنوبی حصہ میں واقع ہیں۔اشبلیہ بھی جنوبی ومغربی علاقہ میں مشہور تھا۔اس جزیرہ نما کا سب سے زیادہ زرخیز و آباد اور قیمتی علاقہ جنوبی حصہ یعنی صوبہ اندلوسیہ ہے اور یہی جنوبی حصہ زیادہ عرصہ تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا، جیسا کہ آگے بیان ہونے والا ہے۔

اندلس میں اہل فونیشیا، قرطاجنہ، رومی اور گاتھ کی حکومت

فونیشیا کی حکومت:

فنیشیا یا فونیشیا یا کنعان اس ملک کا نام ہے جو ملک شام کا مغربی حصہ کہلاتا ہے اور بحر روم کا مشرقی ساحل ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سے کئی سو سال پیشتر اس حصہ ملک میں ایک بڑی زبردست اور تجارت پیشہ قوم رہتی تھی جو کل مورخین میں اہل فونیشیا کہلاتی ہے۔ اہل فونیشیا کے جہازات تام بحر روم میں تجارتی مال اور ادھر سے ادھر لے جانے میں مصروف تھے۔ مال و دولت کی فراوانی نے ان کو ایک خاص تہذیب اور خاص تمدن کا بانی بنایا۔ فلسطین پر قبضہ کر کے انہوں نے بحر قلزم کے راستہ سے ہندوستان و چین تک اور ادھر آبنائے جبل الطارق سے گزر کر انگلستان و بحر شمالی تک اپنی تجارت کا سلسلہ قائم کیا۔ بحر روم کی شمالی اور جنوبی بندرگاہوں پر انہیں کا قبضہ تھا اور ان کی بحری طاقت دنیا میں سب سے بڑی بحری طاقت تھی۔ انہوں نے جا بجا اپنی نو آبادیاں قائم کر لی تھیں۔ انہیں نو آبادیوں میں شمالی افریقہ (تیونس) کا شہر قرطاجنہ ان کا آباد کیا ہوا تھا جو بعد میں ایک مستقل حکومت و سلطنت کا پایہ تخت بنا۔

انہیں آبادیوں میں ملک اندلس کے ساحلی مقامات پر ان کے آباد کیے ہوئے شہر وقصبے اور بندرگاہیں تھیں۔ رفتہ رفتہ ملک اندلس ان کی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا اور اہل فینشیا یہاں حکومت کرنے لگے۔ جب اہل فنیشیا کی سلطنت وحکومت میں زوال پیدا ہوا تو انہیں کے بعض افراد نے قرطاجنہ یعنی تیونس میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم کی اور اندلس بھی سلطنت قرطاجنہ کا ایک صوبہ بن گیا۔ اہل قرطاجنہ نے سینکڑوں برس کوس انا ولا غیری بجایا۔ یہ لوگ آتش پرست وستارہ پرست تھے۔ ان کی تہذیب اپنے زمانہ میں لانظیر سمجھی جاتی تھی۔ اہل فنیشیا کے مقابلہ میں اندلس پر اہل قرطاجنہ کا زیادہ اثر پڑا۔ اس لیے کہ ساحل شام کی نسبت قرطاجنہ اندلس سے زیادہ قریب تھا۔

اندلس میں رومی حکومت کا قیام:

جب اٹلی کے شہر روم میں رومتہ الکبریٰ کی سلطنت قائم ہوئی تو اہل قرطاجنہ اور اہل روم کی معرکہ آرائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ آخر رومیوں نے سلطنت قرطاجنہ کو برباد کیا اور اندلس میں رومیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ رومیوں نے پانچ سو سال تک اندلس میں حکومت کی۔ شہر روم سے اندلس کا حاکم بہ طور وائسرائے مقرر ہو کر آتا تھا اور سالانہ خراج اس ملک سے وصول کر کے دارالسلطنت روم میں بھیجتا تھا۔ جس طرح بحر روم اور اس کے ساحلی ملکوں کی حکومت اہل فنیشیا کے ہاتھ سے نکل کر اہل قرطاجنہ کے ہاتھ میں آئی تھی، اسی طرح اہل قرطاجنہ سے اہل روم کے قبضے میں پہنچی۔

گاتھ کی حکومت:

سلطنت روم پر عیسوی مذہب قبول کر لینے کے بعد سنہ ۴۰۰ء کے قریب دو مصیبتیں نازل ہوئیں۔ اول یہ کہ قوم گاتھ نے جو مغلوں سے مشابہ تھی، وسطی ومشرقی یورپ سے خروج کر کے حملے شروع کر دیے۔ رومیوں کی عیش پرست قوم گاتھ کی جفاکشی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اس لٹیرے گروہ نے رومی سلطنت کے چول ڈھیلے کر دیے۔ انہیں ایام میں رومی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو کر ایک دارالسلطنت تو شہر روم ہی رہا اور دوسری مشرقی سلطنت کا دارالحکومت قسطنطنیہ مقرر ہوا۔ گاتھوں کے اس لٹیرے گروہ نے دین عیسوی کو اسی طرح قبول کیا جیسے ترکوں کے ایک گروہ بنی سلجوق نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بنی سلجوق جس طرح اسلام قبول کر لینے کے بعد ہی بہت جلد اپنی حکومتیں قائم کر سکتے تھے، اسی طرح قوم گاتھ نے عیسوی مذہب قبول کرنے کے بعد فرانس کی جانب سے کوہ برطات یا کوہ

پیر نیز کو عبور کر کے جزیرہ نما ہسپانیہ پر قبضہ کیا۔ گاتھوں کے ایک حصے نے مشرق میں اپنی حکومت قائم کی اور ایک حصہ کی حکومت مغرب میں اندلس کے اندر قائم ہو گئی۔

جس طرح رومی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو کر مشرقی روم اور مغربی روم کی سلطنتیں قائم ہو گئیں تھی، اسی طرح گاتھوں کی بھی دو سلطنتیں مشرقی گاتھ اور مغربی گاتھ کے نام سے قائم ہوئیں۔ مغربی گاتھ کو چونکہ حکومت اور مذہب ساتھ ہی ساتھ ملے تھے، اس لیے انہوں نے عیسائی مذہب قبول کرنے کے بعد بھی اپنے آپ کو روم کے مذہبی پیشوا کا ماتحت ومحکوم نہیں رکھا بلکہ اندلس کے عیسائی پوپ روم کی سیادت سے آزاد اور اپنے مذہبی معاملات میں خود مختار رہے۔ حکومت گاتھ مذہب کی کچھ زیادہ پابند نہ تھی اور اس نے عیائیت کو سیاسی مصلحت سے ہی قبول کیا تھا لیکن رفتہ رفتہ عیسائیت کو جس طرح یورپ کے دوسرے ممالک میں فروغ ہوتا گیا، اسی طرح اندلس میں بھی پیشواؤں کا اثر واقتدار ترقی پذیر رہا۔ آخر چند روز کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ پادری لوگ بادشاہ کے انتخاب اور تخت نشینی کے مراسم ادا کرنے میں خوب دخیل ہو گئے اور ان کی طاقت کو توڑنا بادشاہ کے لیے آسان کام نہ رہا۔ حکومت گاتھ اندلس میں سنہ ۵۰۰ھ کے قریب مکمل طور پر قائم ہوئی تھی۔ دو سو سال تک گاتھ حکومت اندلس میں قائم رہی۔ اس عرصہ میں اندلس کے اندر گاتھیوں کی جنگ ہوئی۔ خون خواری، عیش وراحت اور زیب وزینت کے شوق سے تبدیل ہو گئی تھی۔ اہل فونیشیا اور قرطاجنہ دونوں آتش پرست اور ستارہ پرست تھے۔ دونوں میں عیش وراحت اور ظاہری زیب وزینت کا شوق موجود تھا۔ لہٰذا اہل اندلس اپنے حکمرانوں سے متاثر ہوئے اور یہ چیزیں ان میں موجود ہو گئیں۔ اس کے بعد رومیوں کی حکومت میں عیش ونشاط کے رواج نے خوب ترقی کی۔ گاتھ حکومت اگرچہ خود اپنے ساتھ سپاہیانہ اور جنگجویانہ خصائل لائی تھی لیکن اہل ملک کے اثر نے حاکموں کو چند روز کے بعد اپنے رنگ میں تبدیل کر لیا۔ چونکہ گاتھ خود اپنا کوئی تمدن، اخلاق اور اعلیٰ معاشرت نہ رکھتے تھے، لہٰذا وہ جب اہل اندلس سے متاثر ہوئے تو عیش ونشاط سے بھی بے بہرہ نہ رہے۔ بہرحال اندلس بہت سی تبدیلیوں کا مجموعہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ہر قسم کی ترقیات اور اس زمانے کے علوم سے بے بہرہ نہ تھا۔ مذہب عیسوی کے رواج اور نشوونما نے بھی اپنا کافی اثر اس ملک پر ڈالا تھا۔

سنہ ۷۰۰ء کے بعد گاتھ حکومت کا بھی اس ملک میں خاتمہ ہو گیا اور ایک مشرقی قوم نے ایرانیوں، رومیوں، شامیوں، مصریوں، یونانیوں کی حکومتوں ہی کو نہیں بلکہ ان ملکوں کی مشہور تہذیبوں

اور مذہبوں کو بھی پامال کرتے ہوئے اس ملک میں داخل ہو کر بت پرستی اور عیسویت کی جگہ توحید کا علم بلند کیا اور اسلامی حکومت قائم کی جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

گاتھ حکومت کا خاتمہ:

گاتھ سلطنت میں امتداد زمانہ کے ساتھ ہی ساتھ مذہبیت ترقی کرتی گئی۔ وہاں علیحدہ مذہبی مرکز یعنی چرچ قائم تھا۔ قانون سلطنت میں عیسوی تنگ دلی خوب داخل ہو گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اندلس کے یہودی دم بہ دم ذلیل ہوتے گئے۔ یہودیوں کو عیسائی اپنا غلام سمجھتے تھے۔ ان کی جائیدادیں زبردستی چھین لی جاتی تھیں۔ ان سے ہر قسم کی خدمت لی جاتی تھی اور ان کا مرتبہ حقوق کے اعتبار سے چوپایوں کے قریب پہنچا دیا گیا تھا۔ حالانکہ گاتھوں کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں یہودیوں کی ایسی ذلیل و مستقیم حالت نہ تھی۔ بت پرستی کے تمام اوہام باطلہ اندلس کے عیسائیوں میں موجود تھے۔ تہذیب و شائستگی، علوم وفنون اور تجارت کے اعتبار سے یہودیوں کو عیسائیوں پر فضیلت حاصل تھی۔ عیسائی عام طور پر عیش پسند اور تن آسان تھے مگر یہودیوں میں جفاکشی موجود تھی۔ چونکہ یہودی تعداد میں کم تھے اور حکومت بھی عیسائیوں کی تھی، لہٰذا وہ اپنی نجات کے لیے کوئی کوشش نہیں کر سکتے تھے۔ پادری لوگ معاملات سلطنت میں اس قدر زیادہ دخیل ہو گئے تھے کہ بادشاہ ان کے خلاف کوئی کام کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ بڑی بڑی جاگیریں اور زرخیز علاقے پادریوں کے قبضے میں تھے۔ خود پادریوں کے مکان پری خانے بنے ہوئے تھے۔ عیش وعشرت کے تمام سامان اور بدمستیوں کے تمام نظارے پادریوں کی مجلسوں میں دیکھے جاتے تھے لیکن کسی کو یہ مجال نہ تھی کہ ان کے مذہبی اقتدار کا مقابلہ کر سکے۔ پادریوں کے فتوے بڑے بڑے عالی جاہ اور صاحب سطوت لوگوں کو سرنگوں کر سکتے تھے۔ ایک ایک پادری کے پاس سو سو اور دو دو سو بربری غلاموں کا موجود ہونا تو معمولی بات تھی۔ ان کے احکام کے خلاف کہیں اپیل نہ ہو سکتی تھی۔ گاتھ سلطنت کا دارالحکومت طیطلہ تھا۔ طیطلہ میں اسقف اعظم (لاٹ پادری) جو چرچ ہسپانیہ کا صدر اعظم تھا، رہتا تھا۔ اسقف اعظم کے حقوق میں یہاں تک ترقی ہو چکی تھی کہ وہ بادشاہ کی معزولی کا فرمان بھی صادر کر سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اندلس میں خاص عیسوی حکومت قائم تھی۔

لرزیق کی تخت نشینی:

ساتویں صدی عیسوی کے آخری عشرہ میں اپنی شان وشوکت اور وسعت سلطنت کے اعتبار سے گاتھ سلطنت اپنے عروج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ تمام بحر روم پر ان کی سیادت مسلم تھی۔ جزیرہ نمائے ہسپانیہ کے سوا بحر روم کے اکثر جزائر بھی انہیں کے زیر اقتدار اور زیر حکومت تھے۔ افریقہ کے شمالی ساحل پر بھی بعض مقامات پر ان کا قبضہ قائم تھا۔ بحر روم کے مشرقی ساحل پر بازنطین یعنی رومی حکومت بڑے شان وشوکت کے ساتھ قائم تھی۔ جس زمانے میں مسلمانوں نے رومیوں کو ملک شام وفلسطین ومصر سے خارج کر دیا تھا، اس زمانے میں گاتھ قوم کا بادشاہ وٹیزر اطیطلہ میں برسر حکومت تھا۔ وٹیزرا نے جب یہ دیکھا کہ پادریوں نے تمام سلطنت پر اپنا اثر واقتدار قائم کر کے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو ستانے میں بڑی قساوت قلبی کا اظہار کیا ہے اور یہودیوں کے ساتھ ان کا ظالمانہ برتاؤ انسانیت کے خلاف ہے تو اس نے عیسائیوں یعنی پادریوں کے اقتدار کو توڑنے اور کم کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ پادریوں نے اس بات سے واقف ہو کر وٹیزرا کو معزول کرنے کی تجویز کی اور اس پر یہ الزام لگایا کہ وہ یہودیوں کا خیر خواہ ہے۔ یہودیوں کی خیر خواہی ایسا ناقابل عفو جرم تھا کہ پادریوں کو وٹیزرا کو معزول کرنے میں بہت زیادہ دقت پیش نہ آئی۔ انہوں نے وٹیزرا کو معزول کر کے ایک فوجی سردار لرزیق نامی کو جو شاہی خاندان سے تھا، تخت نشین کیا۔ اس طرح گاتھوں کی سلطنت کا خاتمہ ہو کر لرزیق کی حکومت آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں شروع ہوئی۔ لرزیق ایک کارآزمودہ سپہ سالار اور ستر اسی سال کا تجربہ کار شخص تھا۔ چونکہ پادریوں کی حمایت بھی اس کے شامل حال تھی، لہٰذا قدیم شاہی خاندان کو محروم کرنے اور لرزیق کی حکومت کے قائم ہونے میں کوئی دقت اور پریشانی بھی رونما نہ ہوئی۔ لرزیق نے تخت نشین ہو کر نہایت اطمینان اور پوری طاقت کے ساتھ حکومت شروع کی اور پادریوں کے اقتدار میں کسی قسم کا فرق نہ آنے پایا۔

اندلس پر مسلمانوں کے حملے کے محرکات:

افریقہ (مراکو) کے شمالی ساحل پر قلعہ سبطہ یا سوطا ابھی تک عیسائیوں کے قبضہ میں تھا۔ اس قلعہ کا قلعہ دار ایک شخص کونٹ جولین نامی تھا، جس کو عربی مورخ بالیان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جولین ایک یونانی سردار تھا اور قیصر قسطنطنیہ کی طرف سے مامور تھا۔ قیصر کے تمام مقبوضات افریقہ

مسلمانوں کے قبضہ میں آ چکے تھے، صرف یہی ایک قلعہ باقی تھا جو صلح کے ذریعہ سے جولین کے قبضہ میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ جولین نے اندلس کی عیسائی سلطنت سے حسب منشائے قیصر قسطنطنیہ اپنے تعلقات قائم کر لیے تھے کیونکہ قسطنطنیہ کے مقابلہ میں اندلس مقام سبطہ سے قریب تھا اور اندلس کی حمایت میں آ جانے سے اس عیسائی مقبوضہ کے قیام و بقا کی زیادہ توقع تھی۔ اس طرح کونٹ جولین حکومت اندلس کے گورنروں میں خیال کیا جاتا تھا اور قلعہ سبطہ حکومت اندلس کی ایک ماتحت ریاست بن گیا تھا جس کا تعلق برائے نام حکومت قسطنطنیہ سے بھی تھا۔ اندلس کے آخری گاتھ فرماں روا مسمی وٹیزا نے اپنی بیٹی کی شادی جولین سے کر دی تھی۔ جب وٹیزا تخت سلطنت سے معزول کیا گیا تو جولین کو بالطبع وٹیزا کے معزول اور لرزیق کے تخت نشین ہونے سے ملال ہوا۔ مگر چونکہ لرزیق کی تخت نشینی پادریوں کے حسب منشا عمل میں آئی تھی، لہٰذا جولین کو بھی مجبوراً سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ جولین کی ایک بیٹی فلورنڈا نامی تھی جو بادشاہ وٹیزا کی نواسی یعنی قدیمی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ گاتھ حکومت کے زمانے میں یہ دستور تھا کہ امیروں، گورنروں، سپہ سالاروں اور بلند مرتبہ لوگوں کے چھوٹے لڑکے بادشاہ کے پاس بہ طور خدمت رہتے تھے۔ وہ آداب دربار سیکھتے اور شائستگی حاصل کرتے تھے۔ بادشاہ بھی مثل اپنی اولاد کے ان کے رنج و راحت کا خیال رکھتا اور جب وہ جوان ہو جاتے تو اپنے والدین کے پاس جانے کی اجازت پاتے تھے۔ اسی طرح امراء کی لڑکیاں بادشاہ بیگم کے پاس محل میں بھیج دی جاتی تھیں اور وہاں محلات شاہی میں پرورش پا کر جوان ہوتی تھیں۔ بادشاہ اور بادشاہ بیگم ان لڑکیوں کو مثل اپنی بیٹیوں کے سمجھتے تھے۔ اسی رسم قدیم کے موافق کونٹ جولین کی بیٹی فلورنڈا بھی شاہی محلات میں موجود تھی۔ یہ لڑکی جوان ہوگئی تھی اور اس کو اب اس کے والدین کے پاس ہونا چاہیے تھا مگر اندلس کے بادشاہ لرزیق نے باوجود اس کے کہ وہ بوڑھا شخص تھا، اس لڑکی کی جبریہ طور پر عصمت دری کی۔ لڑکی نے بہ مشکل اپنی اس بے عزتی کے حال سے اپنے باپ کو اطلاع دی۔ اس خبر کو سن کر جولین کے دل میں طیش وغضب کی آگ مشتعل ہوئی اور گاتھ قوم کے جس شخص کو بھی اس کا حال معلوم ہوا۔ اس نے اپنی قوم اور قدیمی شاہی خاندان کی اس بے حرمتی کو گراں محسوس کیا۔ کونٹ جولین نے اپنی ناراضگی کو پوشیدہ رکھا اور فوراً سبطہ سے روانہ ہو کر طیطلہ (ٹالیڈو) میں پہنچا۔ شاہی دربار میں حاضر ہو کر اپنی بیوی یعنی فلورنڈا کی ماں کے بیمار ہونے اور مرنے سے پہلے بیٹی کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کرنے کا حال بیان کر کے فلورنڈا کے جانے کی

اجازت چاہی۔ یہ ایک ایسا بہانہ تھا کہ لرزیق کسی طرح اس کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ جولین اپنی بیٹی کو لے کر سبطہ میں آ گیا۔ قدیمی شاہی خاندان کے حامیوں میں سے اشبیلیہ کا اسقف بھی جولین کے پاس آیا اور یہ دونوں لرزیق کی حکومت کے درہم برہم کرنے کی تدابیر سوچنے میں مصروف ہوئے۔

موسیٰ بن نصیر:

اس زمانے میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کی جانب سے شہر قیروان میں موسیٰ بن نصیر خلیفہ کے مقبوضات غربی کا وائسرائے تھا۔ موسیٰ بن نصیر کی طرف سے طارق بن زیاد اس کا ایک بربری النسل غلام شہر طنجہ کی حکومت پر مامور اور ملک مراکش کی افواج اسلامیہ کا سپہ سالار تھا۔ طارق اگرچہ جولین سے قریب تھا لیکن جولین نے بہ جائے طارق سے گفتگو کرنے کے موسیٰ بن نصیر سے مقصود ظاہر کرنا مناسب سمجھا۔ وہ اشبیلیہ کے اسقف اعظم اور چند عیسائی سرداروں کو ہمراہ لے کر قیروان پہنچا اور موسیٰ بن نصیر کی خدمت میں اپنے آنے کی اطلاع پہنچائی۔ موسیٰ بن نصیر اس عیسائی سے بڑی تعظیم وتکریم کے ساتھ ملا۔ جولین اور اس کے ہمراہیوں نے عرض کیا کہ آپ اندلس پر فوج کشی کریں۔ فتح ونصرت یقیناً آپ کے شامل حال ہوگی۔ موسیٰ یہ سن کر متامل ہوا اور کوئی تسکین بخش جواب نہ دیا۔ تب جولین اور اسقف اشبیلیہ نے کہا کہ آج کل اندلس میں ایک شخص غاصبانہ طور پر مسلط ہے۔ موجودہ حکومت اندلس رعایا کے لیے ایک قہر الٰہی ہے۔ بنی نوع انسان کے حقوق جو محض انسان ہونے کی وجہ سے آپ پر عائد ہوتے ہیں، آپ ان کو ادا کریں اور اہل اندلس کو اس جہنم سے جس میں وہ آج کل مبتلا ہیں، نجات دلائیں۔ سوائے آپ کے دنیا میں اور کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے پاس ہم اپنی فریاد لے کر جائیں اور اس کے ذریعہ سے اس مصیبت سے آزادی پائیں۔ موسیٰ بن نصیر نے جولین کے اس اصرار کے بعد اندلس کے حالات اور حکومت اندلس کی فوجی طاقت کے متعلق سوالات کیے اور خلیفہ دمشق ولید بن عبدالملک سے اجازت طلب کرنا ضروری سمجھ کر ایک عریضہ دمشق کی جانب روانہ کیا۔

طریف کی سرکردگی میں ساحل اندلس پر پہلا اسلامی دستہ:

ادھر جولین کے ہمراہ اپنے ایک سردار طریف یا طارف کو پانچ سو آدمیوں کے ساتھ بھیج کر

مامور کیا کہ جولین کے جہازوں میں سوار ہوکر ساحل اندلس پر اتریں اور وہاں کے حالات سے خود واقفیت حاصل کر کے واپس آئیں۔ چنانچہ طریف اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سنہ۹۲ھ میں اندلس کے ساحل پر یعنی اندلس کی جنوبی راس کے مشرقی کنارے بندرگاہ جزیرہ پر اترا اور معمولی لوٹ مار کے بعد سالماً غانماً واپس آیا۔ تھوڑے ہی دن میں خلیفہ کے دربار سے اجازت آ گئی جس میں کمال حزم و احتیاط ملحوظ رکھنے کی تاکید تھی۔

طارق بن زیاد کو اندلس پر حملہ کرنے کا حکم:

جب موسیٰ بن نصیر کو جولین اور ان کے ہمراہیوں کے بیان کی تصدیق طریف کی زبانی ہوگئی تو اس نے طنجہ کے گورنر طارق بن زیاد کے نام حکم بھیج دیا کہ تم اپنی فوج لے کر اندلس پر چڑھائی کرو۔ طارق اپنا سات ہزار لشکر کشتیوں میں سوار کر کے آبنائے جبل الطارق کے پار اندلس کی جنوبی راس پر اترا۔ طارق اپنی اس سات ہزار فوج کو چار کشتیوں میں سوار کر کے لے گیا تھا۔ اس سے اس زمانے کے جہازوں کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کتنے بڑے تھے۔ طارق کی فوج میں زیادہ تر بربری نومسلم اور کمتر عربی لوگ تھے۔ مغیث الرومی نامی ایک مشہور فوجی افسر بھی اس فوج میں شامل تھا جو طارق کا ماتحت اور اس کا نائب سمجھا جاتا تھا۔ طارق ابھی آبنائے وسط میں تھا اور ساحل اندلس تک پہنچا تھا کہ اس پر غنودگی طاری ہوئی اور اس نے خواب میں دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ اس سے فرماتے ہیں کہ تمہارے ہاتھ پر اندلس فتح ہو جائے گا۔ اس کے بعد فوراً طارق کی آنکھ کھل گئی اور اس کو اپنی فتح کا کامل یقین ہوگیا۔

چھٹا باب

اندلس میں اسلامی حکومت

اندلس کے ساحل پر طارق کا ایک عجیب حکم:

طارق اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اندلس کے ساحل پر اترا اور سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جن جہازوں میں سوار ہو کر آئے تھے، ان کو آگ لگا کر سمندر میں غرق کر دیا۔ طارق کی یہ حرکت بہت ہی عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ذرا غور و تامل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ طارق کی انتہائی بہادری اور قابلیت سپہ سالاری کی ایک زبردست دلیل ہے۔ طارق اس بات سے واقف تھا کہ یہ مٹھی بھر فوج ایک عظیم الشان سلطنت کی افواج گراں کے مقابلہ میں بے حقیقت نظر آئے گی۔ ممکن ہے کہ بربری نو مسلموں کو گھر یاد آنے لگے اور ماتحت فوجی افسر اس بات پر زور دینے لگیں کہ جب تک بڑی اور زبردست فوجیں نہ آئیں، اس وقت تک لڑائی کا چھیڑنا مناسب نہیں، اور بہتر یہی ہے کہ طنجہ کو واپس چلیں۔ ایسی حالت میں یہ پہلی مہم ناکام رہے گی اور طارق کے خواب کی تعبیر مشتبہ ہو جائے گی۔ طارق کو اپنے خواب پر ایسا کامل یقین تھا کہ وہ اندلس کو اسی فوج سے فتح کر لینا یقینی سمجھتا تھا۔ اس نے جہازوں کو غرق کر کے اپنے ہمراہیوں کو بتا دیا کہ واپس جانے کا اب کوئی راستہ نہیں۔ ہمارے پیچھے سمندر ہے اور آگے دشمن کا ملک ہے۔ سوائے اس کے اور کوئی صورت نجات کی باقی نہ رہی کہ ہم دشمن کے ملک پر قبضہ کرتے اور اس کی فوجوں کو پیچھے دھکیلتے چلے جائیں۔ اس کام میں ہم جس قدر زیادہ چستی، ہمت اور جفاکشی سے کام لیں گے، ہمارے لیے بہتر ہو گا۔ سستی، پست ہمتی اور تن آسانی کا نتیجہ ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

اسلامی لشکر کی پہلی منزل:

طارق جس مقام پر اترا تھا، اس کا نام لائنز راک یا قلعۃ الاسد تھا۔ اس کے بعد سے اس کا نام جبل الطارق مشہور ہوا اور آج تک جبل الطارق یا جبرالٹر ہی کہلاتا ہے۔

عیسائی جنرل تدمیر کا پہلا حملہ اور شکست:

شاہ لرزیق کا سپہ سالار تدمیر ایک زبردست فوج لیے ہوئے اسی نواح میں اتفاقاً موجود تھا۔ طارق کے ہمراہی ابھی پورے طور پر اپنے حواس بجا کرنے بھی نہ پائے تھے کہ تدمیر نے ان نوواردوں کی خبر سن کر ان پر حملہ کیا۔ تدمیر ایک نہایت تجربہ کار اور مشہور سپہ سالار تھا۔ وہ بہت سے معرکوں میں ناموری حاصل کر چکا تھا۔ تدمیر نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ حملہ کیا مگر طارق نے اس کو شکست فاش دے کر بھگا دیا۔ تدمیر نے طارق سے شکست کھا کر اور ایک محفوظ مقام میں پہنچ کر بادشاہ لرزیق کو اطلاع دی کہ:

> ''اے بادشاہ! ہمارے ملک پر ایک غیر قوم نے حملہ کیا ہے۔ میں نے ان لوگوں کا مقابلہ کیا اور پوری ہمت وشجاعت سے کام لیا لیکن مجھ کو اپنی کوششوں میں ناکامی ہوئی اور میری فوج ان لوگوں کے مقابلہ میں قائم نہ رہ سکی۔ ضرورت ہے کہ آپ بہ نفس نفیس زبردست فوج اور طاقت کے ساتھ اس طرف متوجہ ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ حملہ آور لوگ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، آیا آسمان سے اترے ہیں یا زمین سے نکل آئے ہیں؟''

شاہ لرزیق کی تیاریاں:

اس وحشت انگیز خبر کو سن کر لرزیق نے تمام تر توجہ فوجوں کے فراہم کرنے میں صرف کر دی۔ لرزیق طیطلہ سے روانہ ہو کر قرطبہ میں آیا اور یہیں ملک کے ہر حصہ سے فوجیں آ آ کر فراہم ہونے لگیں۔ لرزیق نے خزانوں کے منہ کھول دیے اور بڑی مستعدی اور ہمت کے ساتھ ایک لاکھ کے قریب فوج لے کر قرطبہ سے طارق کی طرف روانہ ہوا۔ تدمیر بھی اپنی فوج لے کر ہمراہ رکاب ہوا۔ اس عرصہ میں طارق بیکار نہیں رہا۔ اس نے شہروں اور قصبوں پر قبضہ کرنا شروع کیا اور الجزائر وشدونہ کے علاقوں کو فتح کر کے وادی لکتہ تک پہنچ گیا۔ لرزیق کی فوج میں ایک لاکھ سپاہیوں کے علاوہ ملک اندلس کے تمام بڑے بڑے تجربہ کار سپہ سالار اور ہر صوبہ کے نامور سردار موجود تھے۔

پہلی جنگ:

شہر شدونہ سے متصل لاجنڈا کی جھیل کے قریب ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ۲۸ / رمضان

المبارک سنہ۹۲ھ مطابق ماہ جولائی سنہ۷۱۱ء کو دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ موسیٰ بن نصیر نے طارق کے روانہ ہونے کے بعد افریقہ سے پانچ ہزار فوج بہ غرض کمک روانہ کردی تھی۔ یہ پانچ ہزار فوج بھی طارق کے پاس اس مقابلے سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا طارق کی فوج اب بارہ ہزار ہوگئی تھی۔ ایک طرف بارہ ہزار مسلمان تھے، دوسری طرف ایک لاکھ عیسائی تھے۔ مسلمان اس ملک کے حالات سے ناواقف اور بالکل اجنبی تھے۔ عیسائی لشکر اسی ملک کا رہنے والا تھا اور اپنے ملک وسلطنت کو بچانے کو میدان میں آیا تھا۔ ادھر اسلامی لشکر کا سردار گورنر افریقہ موسیٰ بن نصیر کا آزاد کردہ غلام طارق بن زیاد تھا جو کوئی غیر معمولی قدردانی نہیں کرسکتا تھا۔ ادھر ملک اندلس کا بادشاہ عیسائی لشکر کی سپہ سالاری کر رہا تھا، جس کے قبضہ میں ملک کے تمام خزانے اور ہر قسم کی عزت افزائی وقدردانی کے سامان تھے۔ ادھر فوج میں اکثر نومسلم بربری تھے۔ ادھر عقیدت مند عیسائیوں کی فوج تھی، جن کو لڑائی پر ابھارنے اور بہادری کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ترغیب دینے کے لیے تمام بڑے بڑے اور نامور پادری اور بشپ موجود تھے۔ اس معرکہ میں طارق کی مٹھی بھر فوج جو اپنے حریف کی فوج گراں کا بہ مشکل آٹھواں حصہ تھی۔ اگر شکست کھا جاتی تو یہ معرکہ بہت ہی معمولی اور ناقابل تذکرہ معرکہ ہوتا لیکن چونکہ بارہ ہزار مسلمانوں نے ایک لاکھ باساز وسامان عیسائیوں کے لشکر جرار کو شکست فاش دی، لہٰذا یہ لڑائی دنیا کی عظیم الشان لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے۔ ایسے عظیم الشان معرکہ کی مثالیں تاریخ عالم میں بہت ہی کم اور صرف چند دستیاب ہوسکتی ہیں۔ ایک ہفتہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں خیمہ زن رہیں۔ طارق نے جس وقت لرزیق بادشاہ ہسپانیہ کے لشکر عظیم کے مقابل اپنی مٹھی بھر فوج کی صفیں درست کیں تو اپنے ہمراہیوں کو مخاطب کرکے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جو ایمان باللہ کو استوار اور پائے استقلال کو مضبوط کرنے والی تھی۔ طارق کی اس تقریر نے مسلمان بہادروں کے دوران خون کو بڑھا دیا اور شوق شہادت نے الفت دنیا اور محبت زن وفرزند کو دلوں سے مٹا دیا۔ اس کے بعد معرکہ کارزار گرم رہا۔ ادھر سے ہائے وہو کا شوروغل تھا، ادھر سے تکبیر کی آواز تھی، جو دشمنوں کے دل کو دہلاتی اور مسلمانوں کے دلوں کو بڑھاتی تھی ؎

یہ پیکار کارے کہ تکبیر کرد نہ شمشیر کرد و نے تیر کرد

عیسائی لشکر کا بڑا حصہ زرہ پوش سواروں پر مشتمل تھا لیکن اسلامی فوج سب پیدل تھی۔ عیسائی سواروں کی صفیں طوفانی سمندر کی لہروں کی طرح جب حملہ آور ہوئیں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ فیل پیکر

گھوڑوں اور دیو نژاد سواروں کے پرے مسلمانوں کو کچلتے اوران کی لاشوں کو سموں کی ضربوں سے قیمہ بناتے ہوئے گزر جائیں گے اور نیزہ وشمشیر کے استعمال کا موقع نہ پائیں گے لیکن جس وقت یہ آہن پوش متلاطم سمندر جمعیت اسلامی کے پہاڑ سے ٹکرایا تو معلوم ہوا کہ بھیڑوں کی کثرت شیروں کی قلت پر غلبہ پانے کے لیے حملہ آور ہوئی تھی۔ اسلامی تلواروں کی بجلیاں چمکیں اور عیسائی افواج کی گھٹائیں کچھ تو خاک وخون میں لتھڑی ہوئی لاشوں کی شکل میں تبدیل ہوگئیں اور اکثر لکہ ہائے ابر کی طرح پاش پاش ہوکر متحرک ومفرور نظر آنے لگیں۔ تکبیر کے پر ہیبت نعرے دم بہ دم میدان کے شوروغل پر غالب ہوتے جاتے تھے کہ شمشیر زنوں کی تیز دستی اور نیزہ بازوں کی چستی نے اس معرکہ کی عظمت کو مورخین عالم کے لیے ایسے بلند مقام پر پہنچا دیا کہ ربع مسکون کے ہر حصہ اور دنیا کی ہر ایک قوم نے حیرت کی نگاہوں سے اسلامی جوش کے اس نظارے کو دیکھا۔

میدان جنگ سے لرزیق کی فراری:

بادشاہ لرزیق یعنی عیسائی افواج کا سپہ سالار اعظم اپنی تمام تجربہ کاری، بہادری اور شہرت کو عیسائی مقتولوں کے ساتھ خاک وخون میں ملا کر اور اپنی جان کو عزت سے زیادہ قیمتی سمجھ کر طارق کے مقابلہ پر اپنے دیو ہیکل سنہری گھوڑے کو قائم نہ رکھ سکا بلکہ پیٹھ پھیر کر سراسیمگی کے عالم میں بھاگا۔ چند ساعت پیشتر جو شخص جزیرہ نما ہسپانیہ کا بادشاہ، ایک لاکھ جرار فوج کا سپہ سالار اور تمام پادریوں کا محبوب تھا، وہ سراسیمگی کی حالت میں اس طرح بھاگتا ہوا نظر آیا کہ دوسرے فراریوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکلنے کی کوشش کرتا تھا اور آپا دھاپی میں کسی کو اتنا ہوش نہ تھا کہ اپنے بادشاہ کے لیے فرار میں سہولت پیدا کرے۔

عیسائی فوج کی شکست کے اسباب:

خلاصہ کلام یہ کہ عیسائی لشکر کو شکست اور قلیل التعداد مسلمانوں کو فتح مبین حاصل ہوئی۔ عیسائیوں کی اس شکست فاش کا سبب عیسائی لشکر کی بزدلی نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ مسلمانوں کی غیر معمولی اور حیرت انگیز بہادری وجفاکشی اصل سبب تھا۔ اگر عیسائی لشکر کی بزدلی اس شکست کا سبب ہوتا تو بڑے بڑے سردار، شہزادے اور پادری کثیر التعداد مقتولوں کی لاشوں میں شامل نظر نہ آتے۔ ہنگامہ جنگ کی زود خورد کے فرو ہونے کے بعد تمام میدان جنگ لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ عیسائی

مقتولوں کی صحیح تعداد تو نہیں بتائی جا سکتی لیکن یہ ضرور ہوا کہ اس لڑائی کے ختم ہوتے ہی تمام اسلامی لشکر جس کے پاس کوئی گھوڑا نہ تھا، سواروں کے رسالوں کی شکل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ گھوڑے جو تمام مسلمانوں کے لیے کافی تھے، انہیں عیسائی سواروں کے تھے جو میدان جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مقتول ہوئے۔ اگر یہ سوار چاہتے تو مقتول ہونے سے پیشتر فرار ہو سکتے تھے۔ ایک ہفتہ تک میدان جنگ میں مسلمانوں کی قلت تعداد عیسائی لشکر سے پوشیدہ نہ تھی۔ اس عرصہ میں عیسائیوں کو ہر قسم کا سامان بھی پہنچ رہا تھا۔ ان کی تعداد بھی ترقی کر رہی تھی لیکن مسلمانوں کی حالت اس اجنبی ملک میں اس کے بالکل برخلاف تھی۔ عیسائیوں کی ہمت اور حوصلوں میں یقیناً مسلمانوں کی قلت تعداد نے اضافہ کیا ہوگا۔ یہ لڑائی صبح سے شام تک جاری رہی تھی۔ اس عرصہ میں طرفین کو اپنے حوصلے پورے کرنے اور پورا پورا زور صرف کر دینے کا بہ خوبی موقع ملا تھا۔ مگر نتیجہ نے بتا دیا کہ جس طرح مسلمانوں نے آٹھ گنی تعداد کے دشمنوں کو نیچا دکھایا، اسی طرح دس گنی تعداد کو بھی شکست فاش دے سکتے ہیں:

﴿ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴾ (الانفعال ۸:۶۵)

ہسپانیہ کی گاتھ سلطنت ایک طرف فرانس اور دوسری طرف اٹلی کی رومی سلطنت کو جنگ آزمائی میں نیچا دکھاتی رہتی تھی۔ براعظم یورپ پر اس کا رعب طاری تھا۔ ہسپانیہ کے سپہ سالاروں نے ہمیشہ میدانوں میں بہادری و فتح مندی کے گھوڑے دوڑائے تھے لیکن غازیان اسلام کے مقابلہ میں وہ اسی طرح مغلوب و کمزور ثابت ہوئے جس طرح یرموک کے میدان میں ان کے ہم مذہب قلیل التعداد مسلمانوں سے شکست یاب ہو کر مفرور یا مغلوب ہوئے تھے۔

مسلمانوں کو یہ فتح مبین ۵ شوال سنہ ۹۲ھ مطابق سنہ ۷۱۱ء میں حاصل ہوئی۔ اسی تاریخ سے اندلس میں اسلامی حکومت کی ابتدا سمجھنی چاہیے۔ طارق نے اسی روز فتح کی خوشخبری پہنچانے کے لیے امیر موسیٰ بن نصیر کے پاس قاصد روانہ کیا اور خود لشکر اسلام کے دستوں کو ارد گرد روانہ کر کے صوبہ اندلسیہ کی فتح کو مکمل کرنے میں مصروف ہوا۔ موسیٰ بن نصیر اسی فتح عظیم کا حال سن کر بہت خوش ہوا اور خلیفہ کی خدمت میں بشارت نامہ دمشق کی جانب بھیج کر خود اندلس کی جانب روانہ ہونے کا تہیہ

کیا۔ ایک خط طارق بن زیاد کے نام روانہ کیا کہ تم جس قدر حصہ ملک کو فتح کر چکے ہو، اسی پر قابض رہو اور پیش قدمی ترک کر دو۔ اس کے بعد موسیٰ بن نصیر اٹھارہ ہزار کا لشکر لے کر قیروان سے روانہ ہوا۔ قیروان میں اپنی جگہ اپنے بیٹے کو حکم مقرر کیا۔ جب امیر موسیٰ کا خط طارق کے پاس پہنچا تو وہ جزیرہ نما کا جنوبی یعنی اندلسیہ فتح کر چکا تھا لیکن جزیرہ نما کے بڑے بڑے مرکزی شہر اور دارالسلطنت طیطلہ عیسائی افواج کی چھاؤنیاں بنے ہوئے تھے اور اندیشہ تھا کہ عیسائی سردار متحد ہو کر اپنی طاقت سے طارق پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ طارق کے لیے سب سے زیادہ ضروری کام یہ تھا کہ وہ بلا تامل شمال کی جانب پیش قدمی کرے اور یکے بعد دیگرے شہروں کو فتح کر کے اس کے رعب و ہیبت کو جو جنگ وادی لکتہ کے بعد عیسائیوں کے دلوں پر طاری ہے، کم نہ ہونے دے۔ طارق نے سرداران لشکر کو جمع کیا۔ امیر موسیٰ کا حکم سنایا، سب نے یہی رائے دی کہ اگر امیر موسیٰ کے اس حکم کی تعمیل کی گئی تو اندیشہ ہے کہ عیسائی ہر طرف سے ہم پر حملہ آور ہو کر فتح اندلس کے کام کو بے حدوشمار نہ بنا دیں۔ کونٹ جولین بھی طارق کے ہمراہ موجود تھا۔ اس نے بھی یہی مشورہ دیا کہ اس وقت ملک کو فتح کرنے میں تامل نہ کیا جائے ورنہ پھر کام دشوار ہو جائے گا۔

طارق کی قرطبہ کی جانب پیش قدمی:

چنانچہ طارق نے قرطبہ کی جانب پیش قدمی کی۔ قرطبہ کا حاکم اندلس کے شاہی خاندان کا ایک شخص تھا۔ اس کے پاس وادی لکتہ کی لڑائی کے مفرورین بھی آ کر جمع ہو گئے تھے۔ اس شہر کا قلعہ بہت زبردست تھا اور اس کو فتح کرنا آسان نہ تھا۔ طارق نے آ کر اول شہر والوں کے پاس پیغام بھیجا کہ تم صلح کے ساتھ ہمارا قبضہ شہر پر تسلیم کر لو۔ جب جواب انکار میں ملا تو شہر کا محاصرہ کیا گیا۔ اس محاصرہ میں زیادہ وقت صرف کر دینے کو مناسب نہ سمجھ کر طارق نے مغیث الرومی کو قرطبہ کے محاصرہ پر چھوڑا اور خود طیطلہ کی جانب روانہ ہوا۔

طیطلہ کی فتح:

طیطلہ کو طارق نے بڑی آسانی سے ربیع الثانی سنہ ۹۳ھ میں فتح کر لیا۔ طیطلہ کے شاہی خزانے میں شاہان گاتھ کے پچیس عدد تاج طارق کو ملے۔ ہر ایک تاج پر بادشاہ کا نام اور مدت سلطنت لکھی ہوئی تھی یعنی اس وقت تک پچیس بادشاہ یکے بعد دیگرے گاتھ خاندان کی حکومت کر چکے تھے۔ ہر

ایک بادشاہ کے لیے نیا تاج بنایا جاتا تھا اور فوت شدہ بادشاہ کا تاج خزانہ میں رکھ دیا جاتا تھا۔ طیطلہ میں بھی طارق نے قیام نہیں کیا بلکہ وہ اندلس کے انتہائی شمالی صوبہ تک شہروں کو فتح کرتا ہوا چلا گیا۔ ادھر مغیث الرومی نے چند روزہ محاصرہ کے بعد قرطبہ اور اس کے نواح کو فتح کر لیا۔ اس طرح طارق نے جنوب سے لے کر شمال تک جزیرہ نما اندلس کا درمیانی حصہ فتح کر لیا۔ مشرق اور مغرب کی جانب کے صوبے باقی رہ گئے تھے۔

موسیٰ بن نصیر اندلس میں:

اسی اثنا میں امیر موسیٰ بن نصیر اندلس میں مع اپنی فوج کے داخل ہوا۔ کونٹ جولین کو طارق صوبہ اندلوسیہ کے انتظام پر چھوڑ گیا تھا۔ سب سے پہلے کونٹ جولین نے امیر موسیٰ کا استقبال کیا اور اس کو طارق سے اس لیے ناراض دیکھ کر کہ طارق نے حکم کے خلاف پیش قدمی کیوں کی، مودبانہ عرض کیا کہ ابھی بہت سے ضروری شہر اور مغربی صوبے باقی رہ گئے ہیں۔ آپ طیطلہ جانے کے لیے مغربی جانب کا راستہ اختیار کریں اور راستے کے تمام شہروں کو فتح کرتے ہوئے جائیں تو خطرہ بالکل دور ہو جائے گا۔ موسیٰ بن نصیر نے اسی رائے پر عمل کیا اور طیطلہ تک شہروں کو فتح کرتا ہوا چلا گیا۔ امیر موسیٰ کے وارد اندلس ہونے کی خبر سن کر طارق بھی طیطلہ کی جانب روانہ ہوا اور طیطلہ میں موسیٰ و طارق کی ملاقات ہوئی۔ موسیٰ نے طارق کو حکم کی تعمیل نہ کرنے پر زجر و توبیخ کی اور چند روز کے لیے طارق کو قید بھی کر دیا۔ مدعا یہ تھا کہ نہ صرف طارق بلکہ دوسرے سرداروں کو بھی یہ معلوم ہو جائے کہ ماتحت کے لیے افسر کے حکم کی تعمیل کرنا کس قدر ضروری ہے۔ اس تنبیہہ کے بعد امیر موسیٰ بن نصیر نے طارق کو ایک زبردست فوج دے کر آگے روانہ کیا اور خود طارق کے پیچھے روانہ ہوا۔ امیر موسیٰ ان معاہدوں کی تصدیق کرتا جاتا تھا۔ طارق و موسیٰ اندلس کے شمالی اور شمالی و مغربی شہروں کے فتح کرنے میں مصروف ہوئے اور موسیٰ بن نصیر کے بیٹے عبدالعزیز بن موسیٰ نے جنوبی و مشرقی علاقے کو فتح کرنا شروع کیا۔ شاہ لرزیق کا سردار تدمیر جنوبی و مشرقی علاقے میں فوج جمع کر کے عبدالعزیز کے مقابلہ پر آیا۔ بہت سی لڑائیاں ہوئیں مگر تدمیر کھلے میدان میں عبدالعزیز کا مقابلہ نہ کر سکا۔ وہ پہاڑوں میں چھپتا چھپاتا پھرتا تھا اور موقع پا کر کمین گاہ سے حملہ آور ہوتا تھا۔ آخر عبدالعزیز اور تدمیر کے درمیان صلح ہو گئی۔ عبدالعزیز نے ایک چھوٹا سا علاقہ تدمیر کو دے دیا، جس پر وہ حکومت کرنے لگا۔ یہ شرط قرار پائی تھی کہ تدمیر حکومت اسلامیہ کے دشمنوں کو اپنے یہاں پناہ نہ دے گا اور مذہبی آزادی کو بہر

طور قائم رکھے گا۔ ادھر طارق اور موسیٰ نے بھی ہر ایک شہر سے نہایت آسان شرائط پر معاہدہ کیے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ عیسائیوں کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔ ان کے گرجاؤں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے تمام معالات انہیں کی مذہبی کتابوں اور مذہبی عدالتوں کے ذریعہ سے طے ہوں گے۔ جو شخص اسلام قبول کرنا چاہے، اس کو کوئی عیسائی منع نہ کر سکے گا۔ عیسائیوں کے جان و مال اور املاک کی حفاظت کی جائے گی۔ طارق و موسیٰ نے اپنے لشکریوں کو یہ بھی حکم دے رکھا تھا کہ غیر معافی لوگوں سے قطعاً تعرض نہ کریں۔ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو ہرگز قتل نہ کیا جائے۔ صرف ان لوگوں کو قتل کیا جائے جو مسلح ہوکر میدان جنگ میں آ جائیں اور مسلمانوں کا مقابلہ کریں۔

طارق و موسیٰ شمالی و مغربی صوبوں کو فتح کرتے ہوئے جبل البرتات تک پہنچے۔ جبل البرتات کو عبور کر کے ملک فرانس میں داخل ہوئے۔ فرانس کا جنوبی علاقہ فتح کرنے کے بعد لشکر اسلام موسم سرما کی شدت اور سامان رسد کی نایابی کے سبب سے واپس جبل البرتات پر آیا اور موسیٰ بن نصیر نے ارادہ کیا کہ آئندہ سال میں ملک فرانس کو فتح کر کے آسٹریلیا و اٹلی و بلقان کو فتح کرتا ہوا قسطنطنیہ پہنچوں گا۔ واپس آ کر شمال و مغربی صوبہ جلیقیہ یا گلیشیا جو ابھی تک مفروروں کے لیے جائے امن تھا، فتح کیا۔

اندلس پر مکمل اسلامی قبضہ:

موسیٰ بن نصیر نے اندلس میں وارد ہوکر اور دار السلطنت طیطلہ سے شمال کی جانب روانہ ہونے سے پہلے مغیث الرومی کو مع تحائف و ہدایا اور ملک اندلس پر قبضہ ہونے کی خوشخبری دے کر دار الخلافہ دمشق کی جانب روانہ کیا۔ مغیث الرومی دار الخلافہ سے اس وقت واپس آیا جبکہ صوبہ جلیقیہ کو موسیٰ بن نصیر فتح کر چکا تھا اور ملک اندلس پر قبضہ مکمل کر کے یورپ کے بقیہ ملکوں کو فتح کرنے کی تدابیر میں مصروف تھا۔ مغیث الرومی خلیفہ کے پاس سے موسیٰ کے نام جو حکم لے کر آیا، اس نے موسیٰ بن نصیر کی اولوالعزمیوں کو افسردگی سے تبدیل کر دیا۔

خلیفہ ولید کا حکم اور موسیٰ بن نصیر کی طلبی:

خلیفہ نے موسیٰ بن نصیر کو فتح یورپ سے روک دیا اور بلاتوقف حاضر دربار خلافت ہونے کا حکم

دیا۔ اس حکم کی تعمیل میں امیر موسیٰ بن نصیر، طارق و مغیث کو ہمراہ لے کر اور اندلس کی حکومت اپنے بیٹے عبدالعزیز کو سپرد کر کے اندلس سے مع سازوسامان روانہ ہوا۔ موسیٰ کے ساتھ اندلس کے خزانے، طلائی ظروف وزیورات یعنی مال غنیمت کا خمس اور بہت سے لونڈی، غلام بھی تھے۔ اندلس سے موسیٰ مراکش ہوتا ہوا قیروان پہنچا اور قیروان سے مصر ہوتا ہوا دارالخلافہ دمشق کے قریب پہنچ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک مرض الموت میں گرفتار ہو گیا۔ موسیٰ بن نصیر دو برس اندلس میں رہا اور شروع ماہ جمادی الآخر سنہ ۹۶ھ میں ملک شام کی حدود میں داخل ہوا۔ ولید بن عبدالملک کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہونے والا تھا۔ سلیمان کو جب یہ معلوم ہوا کہ ولید کی اس مرض سے جاں بری دشوار ہے اور موسیٰ بن نصیر قریب پہنچ گیا ہے تو اس نے موسیٰ کے پاس پیغام بھیجا کہ تم ابھی دارالخلافہ میں داخل ہونے کی عجلت نہ کرو۔ غالباً سلیمان بن عبدالملک ولی عہد خلافت کا یہ منشا ہو گا کہ اگر خلیفہ ولید فوت ہونے والا ہے تو میری تخت نشینی کی ابتداء شاندار سمجھی جائے۔ ولی عہد خلافت کی اس خواہش کا پورا کرنا موسیٰ بن نصیر کے لیے بھی کچھ مضر نہ تھا کیونکہ اگر موسیٰ کے انتظار اور تامل کرنے میں خلیفہ کی بیماری دور ہو جاتی تو حالت صحت وتندرستی میں ولید کی خدمت میں حاضر ہونا زیادہ اچھا تھا اور اگر خلیفہ فوت ہو جاتا تو سلیمان بن عبدالملک موسیٰ بن نصیر سے خوش ہوتا کہ اس کی منشا کو موسیٰ نے پورا کیا۔ اس طرح نئے خلیفہ سے عنایت ومہربانی کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہ تھی مگر موسیٰ بن نصیر نے ولی عہد خلافت کے پیغام پر مطلق توجہ نہ کی اور دمشق میں جلد از جلد داخل ہو کر اپنے آپ کو خلیفہ ولید بن عبدالملک کی خدمت میں پیش کیا۔ خلیفہ ولید نے حالت بیماری میں موسیٰ کے تحف و ہدایا اور مال غنیمت سے وہ مسرت حاصل نہ کی جس کی موسیٰ کو توقع تھی۔ موجودہ خلیفہ کی علالت کو خطرناک دیکھ کر امراء و وزراء ولی عہد خلافت کی نگاہ میں اپنے آپ کو محبوب بنانے کی عام طور پر کوشش کیا کرتے ہیں لہٰذا موسیٰ بن نصیر کی اس حرکت کو موسیٰ کے مخالفوں یا حاسدوں نے اور بھی محل اعتراض بنایا ہو گا اور موسیٰ کی مخالفت میں لوگوں کی زبانیں ضرور تیز ہو گئی ہوں گی اور سلیمان بن عبدالملک کے روبرو موسیٰ بن نصیر کی ایک ایک غلطی بڑھا چڑھا کر بیان کی گئی ہو گی اور اس طیش وغضب کو اور زیادہ بھڑکایا ہو گا۔

سلیمان بن عبدالملک کی تخت نشینی اور موسیٰ بن نصیر پر عتاب:

آخر اسی ہفتے ولید بن عبدالملک نے وفات پائی اور ۱۶ ماہ جمادی الثانی سنہ ۹۶ھ کو خلیفہ سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا۔ سلیمان بن عبدالملک نے تخت نشین ہو کر موسیٰ بن نصیر سے سختی کے ساتھ محاسبہ کیا اور جب ممالک مغربیہ کے خراج کی بقایا، جو موسیٰ بن نصیر کے ذمہ واجب الادا تھی، موسیٰ ادا نہ کر سکا تو خلیفہ نے اس کو معتوب بنا کر اس کا مال واسباب ضبط کر لیا اور دو لاکھ اشرفیاں جو اس کے ذمہ باقی رہ گئی تھیں، ان کے عوض میں موسیٰ کو قید کر دیا۔ طارق اور مغیث الرومی کو بھی جو موسیٰ بن نصیر کے مشہور سردار اور فتح اندلس میں سب سے زیادہ کارہائے نمایاں انجام دینے والے تھے، اندلس پر فوج کشی کا حکم دربار خلافت سے نہیں دیا گیا تھا بلکہ موسیٰ کی درخواست فوج کشی کو دربار خلافت نے صرف منظور کیا تھا۔ لہٰذا فتح اندلس کا کارنامہ موسیٰ بن نصیر ہی سے زیادہ تعلق رکھتا تھا اور موسیٰ اور طارق ہی کی شہرت کا باعث ہوا تھا۔

طارق کا انجام:

خلیفہ سلیمان نے جب موسیٰ سے ناراض ہو کر اس کو قید کر دیا تو طارق پر بھی جو موسیٰ کا آزاد کردہ غلام اور موسیٰ ہی کا تربیت کردہ تھا، اس کا اثر پڑا اور کوئی غیر معمولی قدردانی طارق کی نہیں کی گئی۔ اندلس میں عبدالعزیز بن موسیٰ اور قیروان میں عبداللہ بن موسیٰ اور مراکش میں مروان بن موسیٰ حکمران تھے۔ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے لیے ضروری تھا کہ وہ موسیٰ کے خاندان کی طرف سے غافل نہ ہو اور طارق کو جو موسیٰ ہی کے خاندان کا ایک شخص سمجھا جاتا تھا، کوئی ذمہ داری کا عہدہ نہ دے۔ چنانچہ طارق کو ایک معقول پنشن دے کر ملک شام کے کسی شہر میں قیام پذیر ہونے کی پروانگی عطا ہوئی اور موسیٰ کو قید کر دیا گیا۔ امیر ابن المہلب نے موسیٰ کی سفارش کی تو سلیمان بن عبدالملک نے موسیٰ کو قید سے آزاد کر دیا اور جس قدر روپیہ اس سے وصول ہو سکتا تھا، وصول کر کے وادی القریٰ میں سکونت پذیر ہونے کا حکم دیا۔

موسیٰ بن نصیر کی وفات:

موسیٰ بن نصیر اس ناکامی و نامرادی کے عالم میں اگلے ہی سال یعنی سنہ ۹۷ھ میں اٹھتر سال کی عمر پا کر فوت ہوا۔ موسیٰ بن نصیر سنہ ۷۹ھ میں افریقہ کا گورنر مقرر ہوا تھا۔

مورخین نے اس موقع پر موسیٰ اور طارق کے اس مجہول انجام کو دیکھ کر سلیمان بن عبدالملک کو نشانہ اعتراض بنایا ہے کہ اس نے ان ملک گیر و فتح مند سپہ سالاروں کی قدردانی نہیں کی لیکن غور وتامل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس معاملہ میں سلیمان بن عبدالملک اس قدر خطاوار ہرگز نہیں جس قدر ظاہر کیا گیا ہے۔ جس طرح ملک گیری ایک قابل قدر اور موجب عزت چیز ہے، اس سے بڑھ کر ملک داری کا مرتبہ ہے۔ ضرورت ملک داری کا یہی تقاضا تھا جو سلیمان بن عبدالملک سے ظہور میں آیا۔ دنیا میں عام طور پر بہادر سپہ سالار اور ملک گیر فتح مند مالی معاملات میں بہت کمزور اور بے پرواہ ثابت ہوئے ہیں۔ اسی بے پرواہی کا نتیجہ تھا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالاری سے معزول کر دیا تھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ فعل ہرگز ہرگز محل اعتراض نہیں بن سکتا بلکہ عین ثواب اور راستی پر مبنی تھا۔ بالکل یہی صورت موسیٰ بن نصیر کے معاملہ کی ہے۔ موسیٰ بن نصیر سولہ سترہ سال سے افریقہ کی گورنری پر مامور تھا۔ موسیٰ بن نصیر کے ذمہ جو ملک افریقہ کے خراج کی بقایا تھی اور وہ بیت المال کا جس قدر مقروض تھا، اگر اس کو محض اس لیے چھوڑ دیا جاتا کہ موسیٰ کے زیر اہتمام ملک اندلس فتح ہوا ہے تو یہ بات دوسرے گورنروں کے لیے بدنما مثال ہوتی اور موسیٰ بن نصیر کی جرأت ایک غلطی یا غفلت میں اور بھی زیادہ ترقی کر جاتی۔

پھر اس بات کو بھی نظر انداز کرنا چاہیے کہ موسیٰ بن نصیر اور طارق کے معاملے میں سلیمان بن عبدالملک کے وزیروں، مشیروں، درباریوں میں سے کسی نے سلیمان بن عبدالملک کے متعلق سلیمان کی وفات کے بعد کوئی نکتہ چینی نہیں کی۔ مسلمان مورخین نے اس معاملے میں کسی حیرت اور افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ موسیٰ بن نصیر کے ساتھ کوئی غیر معمولی برتاؤ نہیں ہوا۔ جو کچھ ہوا، وہ عدل وانصاف کے خلاف نہ تھا۔ خلفائے بنوامیہ کے مصائب بیان کرنے والے اور ان کو ہر ایک بات کو ناروا ثابت کرنے میں مستعدی دکھانے والے سب سے زیادہ بنوعباس تھے لیکن بنوعباس نے بھی اس خاص معاملے میں سلیمان کو بدنام نہیں کیا اور سلیمان کی اس ناقدر شناسی کا تذکرہ بیان پر نہیں لائے۔

ہمارے زمانے میں جب کہ یورپین مورخین کی تصانیف بھی مسلمانوں کے مطالعہ میں آئیں، اور بھی زیادہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔ یورپین مورخین فتح اندلس کے حالات لکھتے ہوئے ایک تو اس بات کو ثابت کرنے کی بڑی کوشش کرتے ہیں کہ لرزیق کی سلطنت غیر معمولی طور پر کمزور ہوگئی تھی۔

پھر بلا دلیل یہ کہتے ہیں کہ لرزیق کی رعایا اس سے باغی ہوکر مسلمانوں سے مل گئی تھی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کو دیکھ کر اندلس کی رعایا ضرور مسلم فاتحین کو قدر و محبت کی نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی لیکن رعایائے اندلس نے لڑائی اور مسلمانوں کی چڑھائی میں سوائے اس کے کہ کونٹ جولین نے ذاتی طور پر انتقام لینے کے لیے مسلمانوں کو حملہ آور ہونے کی ترغیب دی اور ایک پادری نے اس معاملہ میں جولین کی تائید کی اور کوئی امداد مسلمانوں کو نہیں پہنچائی۔ نیز یہ کہ مسلمان اپنی ایمانی طاقت اور اپنے قلب کی قوت کے ہوتے ہوئے ایسی سازشوں اور باغیوں کی امداد کے محتاج بھی نہ تھے۔ عیسائی مورخ مسلمانوں کی اس غیر معمولی شجاعت و بہادری کے مرتبے کو کم کرنے کے لیے عجیب عجیب باتیں اور عجیب در عجیب افسانے تراشتے ہیں لیکن آخر میں مجبور ہوکر طارق و موسیٰ اور سلیمان تینوں کی اخلاقی صفات پر حملہ آور ہوکر اپنے دل کا بخار نکال لیتے ہیں۔

ایک جھوٹی کہانی اور اس پر تنقید:

چنانچہ انہوں نے ایک جھوٹی کہانی تصنیف کر کے اس کو خوب فروغ دیا ہے۔ وہ کہانی یہ ہے کہ طارق جب طیطلہ سے شمالی جانب روانہ ہوا تو اس کو طیطلہ کے مفرورین کی ایک جماعت ملی جن کے پاس سلیمان علیہ السلام تک کی ایک میز یا چوکی تھی جو زر و جواہر سے مرصع اور کروڑوں روپے کی قیمتی تھی۔ طارق نے اس کو چھین لیا۔ جب موسیٰ اندلس پہنچا تو موسیٰ نے طارق سے اس چوکی کو طلب کیا۔ طارق نے اس چوکی کا ایک پایہ اکھیڑ کر چھپا لیا اور تین ٹانگ کی چوکی موسیٰ کی خدمت میں پیش کر کے کہا کہ یہ اسی حالت میں ملی تھی۔ موسیٰ نے چوتھا پایا سونے کا بنوا کر نصب کرا لیا مگر وہ ویسا نہ بن سکا جیسے باقی تین پائے تھے۔ جب موسیٰ نے خلیفہ ولید یا سلیمان کی خدمت میں اس چوکی کو پیش کیا تو عرض کیا کہ چوکی میں نے مال غنیمت میں حاصل کی تھی۔ خلیفہ نے اس کے ایک پائے کو ناقص دیکھ کر پوچھا کہ یہ پایہ باقی پایوں کی مانند کیوں نہیں؟۔ موسیٰ نے عرض کیا کہ یہ مجھ کو عیسائیوں سے اسی حالت میں ملی تھی۔ طارق بھی اس وقت موجود تھا۔ اس نے فوراً اپنی بغل سے وہ چوتھا پایہ نکال کر خلیفہ کے سامنے پیش کر دیا کہ یہ چوتھا پایہ موجود ہے۔ خلیفہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ بن نصیر نے طارق کی کارگزاری کو اپنی طرف منسوب کیا ہے تو وہ سخت برہم ہوا اور اس نے موسیٰ کو قید بھی کیا اور جرمانہ بھی اتنا سخت کیا جو موسیٰ سے ادا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی کہانیاں عیسائی مورخوں نے تراشی ہیں۔ افسوس ہوتا ہے کہ ان مورخین نے جو ہمارے زمانے میں اندلس کی

تاریخیں لکھنے کی طرف متوجہ ہوئے، ایسی لغو اور بیہودہ کہانیوں کی لغویت کا پردہ فاش نہیں کیا۔[1]

طارق کا اپنے قریبی افسر اور آقا سے اس طرح چالاکی اور دھوکہ بازی کے ساتھ پیش آنا اور برسوں پہلے سے موسیٰ کو زک دینے کے لیے یہ منصوبہ گانٹھنا کسی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ پھر تعجب یہ ہے کہ موسیٰ کو چوکی یا میز کا چوتھا پایہ بنوانا پڑا اور موسیٰ سے کسی ایک شخص نے بھی یہ نہ کہا کہ یہ میز جب ہم نے عیسائی مفرورین سے چھینی ہے تو اس کے چاروں پائے سالم تھے۔ آپ اس چوتھے پائے کو تلاش کریں مگر یہ طارق کی ایسی سازش تھی کہ ہزارہا آدمی اس سے واقف تھے اور موسیٰ تین سال تک بے خبر رہ کر یہی سمجھتا رہا کہ چوکی اسی طرح عیسائیوں سے چھینی گئی تھی۔ موسیٰ جیسا اولوالعزم شخص جو تمام یورپ کو فتح کرتا ہوا قسطنطنیہ پہنچنے کا عزم رکھتا تھا، تعجب ہے کہ ایسی دنائت اور پست ہمتی پر کیسے آمادہ ہو سکتا تھا کہ دوسرے کی کارگزاری کو دربار خلافت میں جھوٹ بول کر اپنی طرف منسوب کرے۔ پھر لطف یہ کہ عیسائی مفرورین سے اس میز یا چوکی کا چھین لینا کوئی بہادری کی بات نہ تھی۔ خواہ کوئی شخص اس میز کو حاصل کرتا، وہ بہرحال خلیفہ کی خدمت میں پیش ہونا چاہیے تھی۔ پھر خلیفہ دمشق کے دربار میں طارق کا اس طرح حاضر ہونا کہ اس کی بغل میں میز کا پایہ دبا ہوا تھا، اور بھی حیرت انگیز ہے۔ طارق و موسیٰ کی ان مضحکہ خیز حرکات پر خلیفہ سلیمان کا اس قسم کی سزائیں تجویز کرنا بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ اندلس اور ممالک مغربیہ کی تاریخ لکھنے والوں میں ہم کو سب سے زیادہ اعتماد ابن خلدون پر کرنا چاہیے مگر وہ اس کہانی کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ جب موسیٰ بن نصیر خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی خدمت میں حاضر ہوا تو خلیفہ نے موسیٰ کے اس ارادے پر اظہار ناراضی کیا کہ وہ یورپ کے ملکوں کو فتح کرتا ہوا قسطنطنیہ پہنچنا چاہتا تھا۔ اس طرح مسلمانوں کو وہ خطرہ اور ہلاکت میں ڈالنے کی جرأت کرتا۔ نیز یہ کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک نے موسیٰ کو اندلس سے یہی خبر سن کر طلب کیا تھا کہ وہ بلا اجازت یورپ کے ملکوں پر حملہ آور ہونے کا قصد کر چکا ہے۔ اسی لیے خلیفہ سلیمان نے موسیٰ بن نصیر کو زجر و توبیخ کی کہ تو نے خودرائی اور خودسری کی راہ سے مسلمانوں کی فوج کو کیوں خطرہ میں مبتلا کرنا چاہا تھا۔ ابن خلدون کا یہ بیان بالکل قرین

---

[1] ایسی جھوٹی کہانیاں اور واقعات تو شروع خلافت سے چلے آ رہے ہیں۔ کبھی جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور فاطمۃ الزہرہ رضی اللہ عنہا کی لڑائی کے نام پر جھوٹ پھیلایا جاتا ہے، کہیں جناب علی رضی اللہ عنہ اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دو گروہ بنا کر لڑائیوں کے بہت سے جھوٹے واقعات بیان کیا جاتے ہیں۔ اسی طرح کا معاملہ واقعہ کربلا کا ہے۔

قیاس ہے۔اس میں اس میز والی کہانی کا کچھ تذکرہ موجود نہیں۔

موسیٰ بن نصیر اندلس کی حکومت اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اور افریقہ ومراکش کی حکومت بھی اپنے بیٹوں عبداللہ ومروان کو سپرد کر آیا تھا۔ یعنی ممالک مغربیہ سب موسیٰ کی اولاد کے تصرف و قبضے میں تھے۔اس لیے موسیٰ بن نصیر سے سختی کے ساتھ خلیفہ کا محاسبہ کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا اور اسی لیے ممالک مغربیہ میں بھی کسی قسم کی برہمی پیدا نہیں ہوئی۔ یہ بات بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں کہ خلیفہ سلیمان نے ایک طرف موسیٰ کو ایسی سخت تنبیہہ کی، دوسری طرف موسیٰ کے بیٹوں کی معزولی کو ضروری نہ سمجھا۔ ہاں چندروز کے بعد خلیفہ سلیمان نے محمد بن یزید کو تمام ممالک مغربیہ کا وائسرائے مقرر کر کے قیروان بھیج دیا تھا کہ وہ ممالک مغربیہ کی نگرانی کرے مگر اندلس کی حکومت بہ دستور عبدالعزیز بن موسیٰ کے قبضہ میں رکھی۔

اندلس کا پہلا حکمران:

طارق وموسیٰ دونوں ملک اندلس کو فتح کرنے والے تھے اور یہ دونوں سردار جتنے عرصہ اندلس میں رہے، ملکوں، شہروں اور قلعوں کو فتح کرنے اور عیسائی امراء سے عہدنامے لکھوانے اور اسلامی حکومت کے تسلیم کرانے میں مصروف رہے۔ان دونوں کو فاتح اندلس کہا جا سکتا ہے۔ اندلس کا پہلا حکمران موسیٰ بن نصیر کے بیٹے عبدالعزیز کو سمجھنا چاہیے۔اس کے بعد اندلس کے حاکم یا گورنر یکے بعد دیگرے دربار خلافت سے کبھی ممالک مغربیہ کے وائسرائے حاکم قیروان کے دربار سے اور کبھی مسلمانان اندلس کے انتخاب سے مقرر ہوتے رہے۔اندلس کے ان حاکموں کو امیران اندلس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

ساتواں باب

امیران اندلس

عبدالعزیز بن موسیٰ:

موسیٰ بن نصیر کے اندلس سے رخصت ہونے کے بعد اندلس کے اکثر ان شہروں نے جو اطاعت کا اظہار کر چکے تھے، بغاوت کی۔ ان بغاوتوں کو فرو کرنے اور دوبارہ عیسائیوں کو مطیع ومنقاد بنانے میں امیر عبدالعزیز نے پوری مستعدی اور ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ مسلمانوں پر جن افسروں کو مقرر کیا گیا تھا، ان کے پاس امن وامان قائم رکھنے کے لیے حسب ضرورت فوج نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اس لیے عیسائیوں کو جرأت ہوگئی تھی کہ وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائیں مگر ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کو اندلس سے نکالنا آسان کام نہیں۔ ساتھ ہی ان کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ نئی اسلامی حکومت پرانی گاتھ حکومت سے بہ درجہا بہتر اور اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت ہے۔

مذہبی آزادی:

مسلمانوں نے سب سے پہلے مذہبی آزادی کا اعلان کیا تھا اور عیسائیوں کو اپنے معاملات مذہبی و دنیوی میں ہر قسم کی آزادی عطا کر دی تھی۔ اگر وہ اسلام اور حکومت اسلامیہ سے متعرض نہ ہوں۔ اب امیر عبدالعزیز نے اسی سلسلہ میں اعلان کیا کہ جو غلام اسلام قبول کر لے گا، وہ مسلمان ہوتے ہی اپنے غیر مسلم آقا کی غلامی وقید سے آزاد سمجھا جائے گا۔ عیسائیوں کے پاس غلاموں کی بڑی تعداد موجود تھی اور وہ ان غلاموں سے اس طرح خدمات لیتے تھے جیسے چوپایوں سے خدمات لی جاتی ہیں۔ امیر عبدالعزیز کے اس اعلان کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہزارہا غلاموں نے آزادی حاصل کرنی شروع کی اور انسانی حریت سے بہرہ اندوز ہونے لگے۔ اس طرح نوع انسان کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی گئی اور ساتھ ہی قلت تعداد کی شکایت بھی مسلمانوں کو نہ رہی۔

امیر عبدالعزیز نے لرزیق کی بیوہ اینجیلونا سے خود شادی کی اور اس کو اپنے عیسائی مذہب پر قائم رہنے دیا۔ اب دوسرے مسلمانوں نے بھی عیسائی عورتوں سے شادیاں کرنی شروع کر دیں۔ شہروں کے ان مکانات میں جو لڑائیوں میں عیسائیوں کے مفرور و مقتول ہونے سے خالی اور ویران ہو گئے تھے، مسلمانوں نے اقامت اختیار کی اور عیسائیوں کے ساتھ مل کر شہروں اور قصبوں میں رہنے سہنے لگے۔ امیر عبدالعزیز نے یہی نہیں کہ عیسائیوں کو مذہبی آزادی عطا کی بلکہ عیسائیوں کو شہروں اور قصبوں کا ناظم بھی مقرر کیا۔ تدمیر سابق سپہ سالار لرزیق کو صوبہ مرسیہ حکومت میں پہلے ہی دے دیا تھا۔ عبدالعزیز کی عیسائی بیوی اینجیلونا نے جو ام عاصم بھی کہلاتی تھی، بہت جلد امیر عبدالعزیز کے مزاج پر حاوی ہو کر امور سلطنت میں دخل دینا شروع کر دیا۔ یہ بات عربی سرداروں کو گراں گزرتی مگر وہ اپنے امیر کی اطاعت کو ضروری سمجھتے تھے اور مغلوب و محکوم عیسائیوں کو اپنا ہم رتبہ اور ہمسر دیکھ کر کچھ نہ کر سکتے تھے۔

انہیں حالات میں خبر پہنچی کہ نئے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے موسیٰ بن نصیر کو خراج کے بقایا کے مطالبہ میں ماخوذ کیا اور جدید ملکی فتوحات کی کوئی قدر نہیں کی۔ اس خبر کا اثر عبدالعزیز کے دل پر جو کچھ ہوا ہو گا، ظاہر ہے۔ مگر وہ خلیفہ کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نہیں نکال سکتا تھا۔ اینجیلونا اور دوسرے عیسائی اہل کاروں نے اس حالت سے فائدہ اٹھانے میں کمی نہیں کی اور عبدالعزیز کی ذات کے ساتھ ان کی محبت و ہمدردی نے ترقی کی۔ عبدالعزیز کو چونکہ اپنے باپ کی خبر سن کر سخت صدمہ پہنچا تھا، لہٰذا وہ اینجیلونا کے ذریعہ سے عیسائیوں کو طاقتور بنانے اور خلیفہ دمشق کی حکومت سے اندلس کو آزاد کرنے کی تدبیر میں مصروف ہو گیا۔ امیر عبدالعزیز نے خلیفہ سلیمان کو اپنی طرف سے غافل رکھنے کے لیے اندلس کے خراج کی ایک معقول رقم اور تحف و ہدایا دمشق کی جانب روانہ کیے۔ خلیفہ کو امیر عبدالعزیز کے منصوبوں کا علم اپنے پرچہ نویسوں کے ذریعہ سے ہو چکا تھا۔ اب جو لوگ اندلس سے یہ خراج اور ہدایا لے کر گئے، انہوں نے خلیفہ کو امیر عبدالعزیز کے خطرناک عزائم اور نامناسب طرز عمل سے آگاہ کیا۔

امیر عبدالعزیز کا قتل:

اس جرم بغاوت کی تصدیق کے بعد دربار خلافت سے جو مناسب حکم جاری ہو سکتا تھا، وہی

جاری ہوا یعنی خلیفہ سلیمان نے انہیں لوگوں کے ہاتھ جو خزانہ اور تحفے لے کر آئے تھے، اندلس کے پانچ مسلمان سرداروں کے نام حکم بھیجا کہ اگر عبدالعزیز کی نیت بد ہے تو اس کو بلا توقف قتل کر دو۔ امیر عبدالعزیز نے اپنا دارالحکومت اشبیلیہ میں قائم کیا تھا۔ جس وقت خلیفہ کا یہ حکم سب سے پہلے حبیب بن عبیدہ کے پاس پہنچا تو اس نے باقی چار شخصوں کو بھی بہ غرض مشورہ دعوت دی۔ آخر پانچوں سرداروں کا یہی مشورہ ہوا کہ امیر عبدالعزیز کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ ان سرداروں نے خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں عبدالعزیز کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اور اس کا جسم اشبیلیہ میں دفن کر کے سر دمشق کی جانب بھیج دیا اور موسیٰ بن نصیر کے ہمشیر زادے یعنی امیر عبدالعزیز کے پھوپھی زاد بھائی ایوب بن حبیب لخمی کو اندلس کا امیر بنایا۔ خلیفہ سلیمان نے چونکہ عبدالعزیز کے مجرم یا بے گناہ ہونے کی تحقیق اندلس ہی کے پانچ سرداروں کے سپرد کر دی تھی، لہٰذا خلیفہ کے نزدیک ابھی تک یہ امر مشتبہ تھا کہ عبدالعزیز قتل ہوگا یا نہیں۔ اس لیے اس نے امیر عبدالعزیز کی جگہ کوئی امیر مقرر کر کے روانہ نہیں کیا تھا بلکہ انہیں سرداروں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ جس کو مناسب سمجھیں، اپنا امیر مقرر کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اندلس کے مذکورہ پانچ سردار اگر عبدالعزیز کو مجرم نہ پاتے تو ہرگز قتل نہ کرتے۔ خلیفہ نے عبدالعزیز کے قتل میں جس حزم و احتیاط سے کام لیا، اس سے زیادہ احتیاط ممکن نہ تھی۔ ان معزز سرداروں کی تعداد بھی اس قدر کافی تھی کہ ان سب کے متفقہ طور پر غلطی کرنے کا امکان نہ تھا۔ ان سے زیادہ اور کوئی ذریعہ تحقیق بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ سردار کس قدر بے نفس اور منصف مزاج تھے؟ اس کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ انہوں نے عبدالعزیز کو قتل کرنے کے بعد اسی کے خاندان کا ایک شخص امارت اندلس کے لیے منتخب کیا جو عبدالعزیز کا نہ صرف پھوپھی زاد بھائی تھا بلکہ وہ رشتہ میں اس کا چچا زاد بھائی بھی تھا یعنی ایوب بن حبیب کا باپ موسیٰ بن نصیر کا چچا زاد بھائی۔ اگر یہ لوگ کسی ذاتی عداوت کی بناء پر عبدالعزیز کو قتل کرتے تو اسی کے خاندان میں حکومت اندلس کو باقی نہ رہنے دیتے۔ اس واقعہ کو یورپی مورخین نے کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے جس سے خلیفہ سلیمان کی انتہائی ناانصافی اور ظلم کا تصور ہوتا ہے۔ وہ عبدالعزیز بن موسیٰ کی تعریف و توصیف میں خوب مبالغہ کرتے ہیں جس کو پڑھ کر مسلمان بہت خوش ہوتے ہیں۔ پھر جب اس کے مظلوم و بے گناہ مقتول ہونے کا حال پڑھتے ہیں تو خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی نفرت سے قلب لبریز ہو جاتا ہے اور یہی عیسائی مورخوں کا منشا ہوتا ہے۔ عبدالعزیز بن موسیٰ سنہ ۹۸ھ میں مقتول ہوا۔

ایوب بن حبیب:

خلیفہ کے حکم کی تعمیل کرنے والے پانچوں سرداروں نے عبدالعزیز کے قتل سے فارغ ہو کر تمام فوجی و ملکی سرداروں کو جمع کر کے ایک مجلس انتخاب منعقد کی اور ایوب بن حبیب کا نام پیش کر کے سب سے منظوری حاصل کی۔ چنانچہ ایوب بن حبیب اس شرط کے ساتھ امیر تسلیم کیا گیا کہ محمد بن یزید حکمران قیروان اور خلیفۃ المسلمین سے منظوری حاصل کی جائے۔ اگر اس انتخاب کو خلیفہ یا وائسرائے نے منظور نہ کیا تو پھر امیر وہ ہو گا جس کو خلیفہ یا وائسرائے مقرر کریں گے۔

اشبیلیہ سے قرطبہ میں دارالامارت کی منتقلی:

امیر ایوب بن حبیب نے یہ دیکھ کر اشبیلیہ میں عیسائیوں اور یہودیوں کی بڑی آبادی ہے اور وہ امیر عبدالعزیز کے مخصوص طرز عمل سے زیادہ قابو یافتہ ہو چکے ہیں، اشبیلیہ کو ترک کر کے قرطبہ کو دارالامارت بنایا۔ امیر ایوب کے کارناموں میں قرطبہ کو دارالسلطنت بنانا بھی ایک عظیم الشان اور قابل تذکرہ کارنامہ اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ اس کے بعد عرصہ دراز تک قرطبہ ہی مسلمانوں کا دارالحکومت اور پھر دارالخلافہ رہا اور قرطبہ کی شہرت نے تمام دنیا کا احاطہ کر لیا۔ اس کے بعد امیر ایوب نے افریقہ و مراکش سے بربری اور عربی قبائل کو اندلس میں آ کر آباد ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ بہت سے مسلمان اندلس میں آئے اور امیر ایوب نے ان کو اندلس کے مختلف شہروں اور قصبوں میں آباد کیا۔ اس طرح عیسائیوں کی بغاوت کا اندیشہ ایک حد تک دور ہو گیا۔ سرحدوں پر قلعے بنائے گئے۔ وہاں حفاظتی فوج رکھی گئی۔ امیر ایوب نے ملک کا دورہ کر کے حالات سے واقفیت حاصل کی اور جہاں جس قسم کی ضرورت دیکھی، اس کا انتظام کیا۔ امیر ایوب اپنی امارت کے صرف چھ ہی مہینے پورے کرنے پایا تھا کہ اس کی معزولی کا حکم لے کر حرب بن عبدالرحمٰن ثقفی پہنچ گیا۔ بات یہ تھی کہ امیر ایوب بن حبیب کی مستعدی و جفاکشی کا حال سن کر محمد بن یزید حاکم قیروان کو شبہ پیدا ہوا کہ چونکہ ایوب بھی عبدالعزیز و موسیٰ ہی کے خاندان کا شخص ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی وقت موجب تکلیف ثابت ہو۔ لہٰذا اس نے بہ اختیار خود حرب بن عبدالرحمٰن بن عثمان کو سند حکومت دے کر اندلس روانہ کیا کہ ایوب کو معزول کر کے خود اندلس پر قبضہ و حکومت کرو۔ اس نے اپنے اس انتظام کی اطلاع دربار خلافت میں بھیج کر منظوری حاصل کر لی۔

حرب بن عبدالرحمٰن ثقفی:

حرب بن عبدالرحمٰن نے اندلس میں پہنچ کر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور موسیٰ، عبدالعزیز وایوب کے زمانے کے تمام اہل کاروں کو بدگمانی کی نظر سے دیکھ کر ان پر سختی وتشدد شروع کیا۔ نیز عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سخت برتاؤ کیا۔ عیسائی اور یہودی اس سے پیشتر اپنے لیے مسلمانوں کے حکمرانوں کو بہت ہی رحیم و کریم دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک وفد قیروان روانہ کیا کہ محمد بن یزید سے گزارش کر کے اس امیر کو تبدیل کرائے۔ محمد بن یزید نے اس طرف توجہ نہ کی کیونکہ حرب بن عبدالرحمٰن کو اسی نے مقرر کر کے بھیجا تھا۔ اس وفد نے ہمت سے کام لے کر دمشق کا راستہ لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے بعد عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تخت خلافت پر متمکن تھے۔ چنانچہ یہ وفد خلیفۃ المسلمین عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حرب بن عبدالرحمٰن کو اندلس کی حکومت سے تبدیل کر دیجیے اور کسی رحم دل حاکم کو مقرر کیجیے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حرب بن عبدالرحمٰن کو حکومت اندلس سے معزول کر کے سمح بن مالک خولانی کو جو صوبہ افریقہ کی افواج کا سپہ سالار تھا، اندلس کی حکومت پر مامور فرمایا۔ سمح بن مالک نے اندلس پہنچ کر حرب بن عبدالرحمٰن کو معزول کیا اور خود زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ حرب بن عبدالرحمٰن بن عثمان ثقفی نے اندلس میں دو برس آٹھ مہینے حکومت کی۔

سمح بن مالک:

امیر سمح بن مالک خولانی اگرچہ ایک فوجی آدمی اور طارق بن زیاد کے ہمراہیوں میں سے تھا لیکن اس نے اندلس کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے عدل و داد اور رعایا کی خوش حالی کے سامانوں کی فراہمی شروع کی۔ امیر سمح کی حکومت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی حکومت کا عکس تھا۔

اندلس کی مردم شماری:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حکم سے اس امیر نے ملک اندلس کی مردم شماری کرائی جس سے ہر قوم، ہر قبیلے اور ہر ایک مذہب کے لوگوں کی الگ الگ تعداد معلوم ہوگئی۔ بربری لوگوں کو امیر سمح نے غیر آباد علاقوں میں آباد کر کے زراعت وحرفت کی طرف رغبت دلائی، جس میں ان کو کامیابی

حاصل ہوئی۔ ملک اندلس کا ایک جغرافیہ تیار کرایا جس میں ہر شہر اور ہر قصبہ کی آبادی، اس کا محل وقوع اور ضروری حالات درج تھے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کا فاصلہ، دریا اور پہاڑ وغیرہ سب حالات درج کیے۔ ملک کی تجارتی اشیاء کی فہرست، بلاد کے حالات معدنی، اشیاء کی کیفیت غرض ملک اندلس نہایت مکمل و مشرح جغرافیہ کا تیار کر کے خلیفہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ ایک نقشہ بھی ملک اندلس کا تیار کرا کر بھیجا۔ تجارت و زراعت میں سہولت پیدا کی۔ جزیہ، عشر، خمس اور خراج وغیرہ کے پختہ قانون رائج کیے۔[1] پھر شہر سرقسطہ میں ایک مسجد اور قرطبہ میں دریائے وادی الکبیر کا مشہور و معروف پل تیار کرایا۔ اس کے علاوہ جابجا اور بھی مسجدیں اور پل تعمیر کرائے۔ غرض چند روز میں اس امیر نے اندلس کو امن وامان اور عدل وانصاف سے پر کر دیا۔ امیر سمح کو امرائے اندلس میں وہی مرتبہ اور وہی نسبت حاصل ہے جو تمام خلفائے بنوامیہ میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو حاصل تھی۔

جنوبی فرانس میں پیش قدمی:

اس امیر کے ابتدائی عہد حکومت کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ وہ کوئی جنگجو اور شمشیر زن سپہ سالار بھی بن سکتا ہے لیکن ملک اندلس کے اندرونی انتظام واستحکام سے فارغ ہو کر خلیفہ کی اجازت کے موافق امیر سمح نے فوج لے کر جبل البرتات کی طرف توجہ کی۔ اس پہاڑ کی گھاٹیوں کو طے کر کے وہ اس ملک میں داخل ہوا جو آج کل جنوبی فرانس کہلاتا ہے۔ فرانس کے اس جنوبی حصے میں دو زبردست حکومتیں قائم کیں۔ ایک سلطنت یا ریاست وہ تھی جو اندلس کے گاتھ لوگوں نے فرار ہو کر اور یہاں آ کر قائم کر لی تھی۔ اس ریاست کا دارالحکومت شہر ناربون تھا۔ چونکہ تمام ملک اندلس کے خزائن جس قدر گاتھ لوگ لا سکتے تھے، یہیں لے آئے تھے اور تمام وہ لوگ بھی یہیں آ کر جمع ہو گئے تھے جو مسلمانوں کے دشمن تھے، لہٰذا یہ حکومت خوب طاقتور اور اپنے محل وقوع کے اعتبار سے ناقابل تسخیر سمجھی جاتی تھی۔ دوسری زبردست سلطنت قوم گال کی تھی، جس کا دارالسلطنت طولوز تھا۔

---

1. اسلامی حکومت یعنی خلافت میں حقوق شہریت کے بدلہ میں غیر مسلموں سے کچھ سالانہ محصول لیا جاتا تھا جو جزیہ کہلاتا تھا۔ عشر مسلمان کاشت کاروں اور زمینداروں پر فصل (غلہ، پھل) کی صورت میں مالی فریضہ ہے جو وہ ہر فصل کا دسواں حصہ کی صورت میں ادا کریں گے...... خراج، مسلم حکمران یعنی خلفاء ان غیر مسلم حکمرانوں سے ایک متعینہ سالانہ محصول کے طور پر وصول کرتے تھے جن کی ریاست کو فتح کر کے وہ ریاست ان کو واپس کر دیتے تھے ...... جنگ میں شکست کھا کر بھاگتے ہوئے غیر مسلم جو مال غنیمت یا سامان چھوڑ جاتے تھے، اس کا پانچواں حصہ غرباً و مساکین، اسلامی حکومت بیوگان وغیرہ کے لیے مختص کر دیتی تھی۔ یہ پانچواں حصہ خمس کہلاتا ہے۔

امیر سمح نے جبل البرتات سے گزر کر ناربون پر حملہ کر کے اس شہر کو فتح کر لیا اور تمام ریاست مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔ اسلامی لشکر کو یہاں سے بہت کچھ مال غنیمت ہاتھ آیا۔ ناربون سے آگے بڑھ کر طولوز پر حملہ کیا گیا۔ بڑی خون ریز جنگ ہوئی، آخر اس شہر کا محاصرہ مسلمانوں نے کر لیا۔ مسلمانوں کی فوج بہت تھوڑی تھی اور عیسائیوں کا لشکر ہر ایک آئندہ لڑائی میں زیادہ ہی برسرمقابلہ آتا تھا۔ شہر طولوز فتح ہی ہونے والا تھا کہ ایک فرماں رواڈیوک آف اکیوٹین ایک عظیم الشان فوج لے کر پہنچ گیا۔ امیر سمح کے ساتھ جس قدر فوج آئی تھی، اس کا ایک حصہ ان کو ناربون وغیرہ مفتوحہ علاقہ میں چھوڑنا پڑا تھا، اس لیے ان کے ہمراہ بہت تھوڑے آدمی تھے۔ صحیح تعداد تو اسلامی لشکر کی نہیں بتائی جا سکتی مگر یہ بات یقینی ہے کہ جب فرانسیسیوں کا لشکر عظیم میدان میں آ کر صف آرا ہوا تو امیر سمح نے بہ جائے اس کے کہ وہ حواس باختہ ہو جاتے، اپنی صفوں کو درست کر کے ایک ہمت بڑھانے اور جوش دلانے والی تقریر کی۔ ادھر پادریوں نے فرانسیسی لشکر کو قتال پر آمادہ کرنے والی تقریریں سنائیں۔ لڑائی شروع ہوئی اور طارق ولرزیق کی لڑائی کا نقشہ ایک مرتبہ پھر جنوبی فرانس میں نمودار ہوا۔ کئی گھنٹے تک تیر وشمشیر اور برچھیوں کی بجلیاں چمکتی رہیں۔ قریب تھا کہ فرانسیسیوں کا لشکر عظیم ان مٹھی بھر مسلمانوں کے مقابلہ میں لاشوں کے ڈھیر چھوڑ کر میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگے اور تمام ملک فرانس اسلامی لشکر کے پاؤں سے روندا جائے۔

امیر سمح کی شہادت:

عین اس وقت جبکہ مسلمان عیسائیوں کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھ رہے تھے، ایک تیر امیر سمح کے گلے میں آ کر لگا اور ترازو ہو گیا۔ اپنے امیر کو اس طرح جام شہادت نوش کرتے ہوئے دیکھ کر مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے اور جوش شمشیر زنی سرد پڑ گیا مگر پھر بھی وہ اس طرح حواس باختہ نہیں ہوئے جیسی کہ ایسے موقع پر توقع ہو سکتی تھی۔ مسلمانوں کی پیش قدمی رک گئی، عیسائی یک لخت چیرہ دست ہو گئے۔ مسلمانوں نے فوراً امیر سمح کی جگہ عبدالرحمٰن غافقی کو اپنا سپہ سالار اور امیر مقرر کر لیا۔ عبدالرحمٰن غافقی نہایت ہوشیاری اور استقلال کے ساتھ اسلامی لشکر کو لے کر پیچھے ہٹا۔ عیسائیوں کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ اسلامی لشکر کا تعاقب کریں۔ میدان جنگ میں ایک تہائی مسلمان شہید ہو چکے تھے، باقی دو تہائی لے کر عبدالرحمٰن غافقی پسپا ہوا۔

عبدالرحمٰن بن عبداللہ غافقی:

عبدالرحمٰن غافقی جس شجاعت و بہادری اور احتیاط کے ساتھ اپنے لشکر کو قتل و برباد ہونے سے بچا کر شہر ناربون تک لایا، اس کی تعریف عام طور پر مورخین نے لکھی ہے۔ جنگ طولوز جس میں امیر سمح شہید ہوئے، سنہ ۱۰۲ھ میں وقوع پذیر ہوئی۔ میدان طولوز سے ناربون تک آتے ہوئے راستہ میں عیسائی آبادیوں نے جابہ جا اس لشکر کو لوٹنا اور قتل کرنا چاہا۔ ان عیسائیوں کا خیال تھا کہ جس طرح ہزیمت خوردہ لشکر کو گنوار لوٹ لیا کرتے ہیں، اسی طرح ہم اس کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے مگر ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ فرانسیسیوں کی دس گنی جرار فوج بھی اس پر حملہ آور ہونے اور تعاقب کرنے کی جرأت نہ کر سکی تھی۔ چنانچہ راستے میں کئی جگہ لڑائیاں ہوئیں اور ہر جگہ عیسائیوں کو فرار ہونا پڑا۔ شہر ناربون میں پہنچ کر امیر عبدالرحمٰن غافقی نے اپنی حالت کو درست کیا اور اس صوبہ سے خراج اور مال غنیمت لے کر جبل البرتات کے ان ہی قبائل کی سرکوبی کی جو امیر سمح کے شہید ہونے اور طولوز سے مسلمانوں کے واپس ہونے کی خبر سن کر بغاوت و شرارت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ان قبائل کو درست کر کے امیر عبدالرحمٰن اندلس میں واپس آئے۔

جس وقت امیر سمح ملک فرانس پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے تو اپنی جگہ عنبسہ بن سحیم کلبی کو اندلس کا حاکم مقرر کر گئے تھے۔ عنبسہ نے یہ سن کر کہ عبدالرحمٰن غافقی کو ان قبائل سے جنگ کرنی پڑی ہے، فوراً اندلس سے کمک روانہ کی مگر اس کمک کے پہنچنے سے پہلے ہی عبدالرحمٰن فارغ ہو چکے تھے۔ اندلس میں واپس آ کر فوجی انتخاب کے موافق عبدالرحمٰن غافقی ہی کو امیر اندلس تسلیم کیا گیا۔

عبدالرحمٰن کی معزولی:

مگر چند ہی روز کے بعد بشیر بن حنظلہ بن صفوان کلبی حاکم افریقہ نے عبدالرحمٰن غافقی کی یہ شکایت سن کر کہ انہوں نے فوجیوں کے اقتدار و اختیار کو بڑھا دیا ہے، عبدالرحمٰن کو معزول کر کے عنبسہ بن سحیم کلبی کو امیر اندلس بنایا۔ عنبسہ بن سحیم کی امارت کو عبدالرحمٰن نے بہ خوشی تسلیم کر کے بیعت کی اور امیر عنبسہ نے عبدالرحمٰن کو مشرقی اندلس کا عامل بنایا، جہاں وہ پہلے بھی عامل تھے۔

عنبسہ بن سحیم کلبی:

عنبسہ نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہی نہایت قابلیت کے ساتھ ملک کا انتظام کیا اور

رعایا کوانواع واقسام کے فائدے پہنچائے۔ امیر عنبسہ کے ابتدائی عہد حکومت میں بلائی نامی ایک عیسائی نے، جس کو انگریزی میں پلیو کہتے ہیں، ایک پہاڑی علاقہ میں بغاوت کی اور بہت سے عیسائیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ سن کر اسلامی لشکر نے اس طرف توجہ کی اور تمام عیسائیوں کو قتل و گرفتار کرکے اس فتنہ کو فرو کر دیا۔ پلیو فرار ہو کر تیس آدمیوں کے ساتھ پہاڑوں میں جا چھپا۔ مسلمانوں نے ان تیس آدمیوں کی قلیل جماعت کو بے حقیقت سمجھ کر کوئی التفات نہ کیا۔ اگر مسلمان چاہتے تو ان کا تعاقب کرکے جہاں کہیں بھی وہ جاتے، گرفتار کرکے قتل کر دیتے مگر انہوں نے اس کے استیصال کو مطلق ضروری نہ سمجھا۔ یہ تیس آدمی لوٹ مار پر آمادہ رہ کر پہاڑوں میں سکونت رکھتے اور ڈاکہ زنی سے بعض مواضعات کو نقصان پہنچاتے۔ مسلمانوں نے چونکہ ان کی طرف توجہ ہی نہیں کی اور نہ کوئی دستہ فوج ان کے استیصال پر مامور ہوا، اس لیے یہ آئندہ زمانے میں اپنے اس جتھے کو مضبوط کرتے گئے اور عیسائی آ آ کر ان میں شریک ہوتے گئے۔ اس طرح اندلس میں ایک عیسائی ریاست کی بنیاد قائم ہوئی، جس کا ذکر آگے ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

جنوبی فرانس کی فتح:

امیر عنبسہ نے ملک کے انتظام سے فارغ ہو کر ملک فرانس پر چڑھائی کی۔ علاقہ ناربون مسلمانوں کے قبضہ میں موجود تھا، اس لیے جبل البرتات سے گزرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ امیر عنبسہ نے تمام جنوبی فرانس کو فتح کر لیا اور فرانس کے وسط میں پہنچ کر مشرق ومغرب کی جانب فوجیں پھیلا دیں۔ اس وقت مال غنیمت کی کثرت سے مسلمان بہت بوجھل ہو گئے تھے۔ فرانسیسیوں نے اپنی تمام فوجوں کو فراہم کرکے اپنے نصف سے زیادہ ملک کی پامالی کا تماشا دیکھا۔ آخر ایک مناسب اور موزوں وقت ومقام پر انہوں نے اپنی پوری طاقت سے اسلامی لشکر کا مقابلہ کیا۔ اس مرتبہ بھی مسلمانوں نے اپنی انتہائی بہادری کا ثبوت دیا اور فرانسیسیوں کے دانت کھٹے کر دیے۔

امیر عنبسہ کی شہادت:

امیر عنبسہ نے بداحتیاطی سے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دیا یعنی صف قتال میں سب سے آگے بڑھ کر عیسائیوں پر بہ ذات خود حملہ کیا اور عیسائی صفوف کو چیرتے ہوئے اندر گھس کر جام شہادت نوش کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ طولوز کی طرح اس مرتبہ بھی مسلمانوں کو پسپا ہونا پڑا۔

امیر عنبسہ نے اپنی شہادت سے پہلے ہی عروہ بن عبداللہ فہری کو اپنا قائم مقام تجویز کر دیا تھا۔ لہٰذا جس طرح امیر سمح کی شہادت کے بعد عبدالرحمٰن غافقی مسلمانوں کو واپس لے کر آئے تھے، اسی طرح عروہ بن عبداللہ فہری لشکر اسلام کو واپس اندلس لایا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۰۷ھ میں وقوع پذیر ہوا۔

عروہ بن عبداللہ فہری:

عروہ بن عبداللہ اندلس کے نامور سرداروں میں سے تھا۔ اس کی قوم اور خاندان کے لوگ اندلس میں بہ تعداد کثیر موجود تھے۔ یہ نہایت دیانت دار اور بہادر وسنجیدہ مزاج شخص تھا مگر اندلس کے بعض لوگ اس سے ناراض ہو گئے اور حاکم افریقہ بشیر بن حنظلہ بن صفوان سے شکایت کی۔ بشیر بن حنظلہ بن صفوان نے بہ جائے اس کے یحییٰ بن سلمہ کو اندلس کی امارت پر مامور فرمایا۔ عروہ صرف چند مہینے اندلس کا امیر رہا۔

یحییٰ بن سلمہ:

یحییٰ بن سلمہ کلبی نے سنہ ۱۰۷ھ کے آخر میں اندلس کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ یحییٰ بن سلمہ کے مزاج میں تشدد اور ضد کا مادہ تھا۔ اس لیے رعایائے اندلس اس سے بھی ناراض ہوگئی اور والی افریقہ کی خدمت میں شکایتیں پہنچیں، نتیجہ یہ ہوا کہ دو برس چند ماہ کے بعد یحییٰ بن سلمہ بھی معزول کیا گیا۔ اس کی جگہ امیر عثمان بن ابی عبیدہ لخمی حاکم اندلس مقرر ہو کر آیا۔

امیر عثمان:

امیر عثمان کو سنہ ۱۱۰ھ میں عبدالرحمٰن والی افریقہ نے مقرر کر کے بھیجا تھا۔ بشیر بن حنظلہ کے بعد عبید بن عبدالرحمٰن والی افریقہ مقرر ہو چکا تھا۔ امیر عثمان نے صرف پانچ ہی مہینے حکومت کی۔ اس کے بعد حذیفہ بن الاحوص قیسی کو امیر اندلس مقرر کر کے بھیجا گیا۔

حذیفہ بن الاحوص:

امیر حذیفہ بن الاحوص نے سنہ ۱۱۰ھ کے آخر تک اندلس میں حکومت کی۔ اس کے بعد محرم سنہ ۱۱۱ھ میں گورنر افریقہ نے بہ جائے حذیفہ کے ہثیم بن عبید کلابی کو اندلس کا حاکم مقرر کر کے بھیجا۔ بعض روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ دمشق نے خود ہثیم کو مقرر کر کے بھیجا تھا۔

ہثیم بن عبید:

ہثیم بن عبید کلابی شامی الاصل تھا اور اس میں سخت گیری اور تشدد کا مادہ زیادہ تھا۔ ہثیم کا طرز عمل اہل اندلس کو ناگوار گزرا۔ اندلس کے مسلمان اور عیسائی دونوں ہثیم سے ناخوش ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پرانے تجربہ کے موافق اندلس سے ایک وفد شکایت لے کر افریقہ پہنچا۔ گورنر افریقہ نے اس وفد کی شکایت پر کوئی توجہ نہیں کی اور امیر اندلس کو معزول نہ کیا۔ ممکن ہے کہ گورنر افریقہ نے ہثیم کو اس لیے معزول کرنے کی جرأت نہ کی ہو کہ اس کو خود امیرالمومنین نے دمشق سے مقرر فرما کر بھیجا تھا۔ بہرحال افریقہ یعنی قیروان میں یہ وفد ناکام رہا تو وہاں سے شام کی طرف روانہ ہو کر دمشق پہنچا اور خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے دربار میں حاضر ہو کر تظلم کناں ہوا۔ خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے محمد بن عبداللہ اشجعی کو اندلس کی طرف روانہ کیا اور یہ حکم دیا کہ اندلس جا کر ہثیم کے افعال و اعمال کی تحقیق و تفتیش کرو اور اول اپنے آپ کو بھیس بدل کر چھپائے رہو اور تحقیق حالات میں کسی قسم کی کوتاہی روا نہ رکھو۔ اگر عندالتحقیق یہ ثابت ہو جائے کہ واقعی ہثیم خطاکار ہے اور اس کے طرز عمل سے خلافت اسلامیہ اور ملت مسلمہ کو نقصان پہنچ رہا ہے تو فوراً معزول کر دو اور خود حکومت اندلس کا چارج لے لو ورنہ ہثیم کو بہ دستور حکومت اندلس پر قائم چھوڑ کر واپس چلے آؤ۔

ہثیم کی معزولی:

ہثیم بن عبید نے سرزمین مقرشہ پر جہاد کیا اور اس علاقے کو فتح کر کے دس مہینے وہاں ٹھہرا رہا۔ اپنی حکومت کے دو برس بعد ہثیم معزول ہوا۔

محمد بن عبداللہ اشجعی:

محمد بن عبداللہ اشجعی نے وارد اندلس ہو کر بہت جلد ہثیم کے خلاف حالات تحقیق کر لیے اور ہثیم کی خطاکاری کا مکمل ثبوت بہم پہنچ جانے کے بعد اپنے آپ کو اور خلیفہ کے حکم کو لوگوں پر ظاہر کر کے ہثیم کو معزول اور گرفتار کرا کر پابہ جولاں خلیفہ کی خدمت میں روانہ کر دیا اور خود کئی مہینے اندلس میں قیام کر کے وہاں کے انتظامات اور بگڑے ہوئے حالات کو درست کر کے عبدالرحمٰن بن عبداللہ غافقی کو اندلس کا امیر بنا کر دمشق کی جانب روانہ ہو گیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۱۳ھ کا ہے۔

عبدالرحمٰن بن عبداللہ غافقی / بار دوم:

عبدالرحمٰن غافقی نے اندلس کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر اول ملک کے اندرونی انتظام کو درست اور مکمل کیا۔ اکثر شہروں اور قصبوں میں مدرسے، مسجدیں اور پل تعمیر کرائے۔ اس کے بعد فوجی تیاری کر کے ملک فرانس پر حملہ کرنے اور گزشتہ مہموں کی ناکامی کی تلافی کے لیے تیاری شروع کی۔

عثمان لخمی کی بغاوت:

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ عثمان لخمی نے بھی پانچ مہینے اندلس پر حکومت کی تھی۔ حکومت وامارت اندلس سے معزول ہو کر عثمان کو اندلس کے ایک شمالی صوبہ کی حکومت مل گئی تھی۔ یہ صوبہ وہی تھا جس میں جبل البرتات اور اس کے شمال کا وہ حصہ ملک جو مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا۔ عثمان چونکہ تمام ملک اندلس کا حاکم ہو کر اب ایک چھوٹے سے حصہ ملک کا عامل اور حاکم اندلس کا ماتحت تھا، لہٰذا وہ اپنی اس حالت میں قانع نہ تھا اور اس فکر میں رہتا تھا کہ کسی طرح اپنی خودمختار حکومت قائم کروں۔ عثمان چونکہ بربری قبائل سے تعلق رکھتا تھا، لہٰذا اس کو عربوں اور شامیوں سے بھی کوئی ہمدردی نہ تھی بلکہ ان کو رقابت ونفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ڈیوک آف ایکیوٹین جو ملک فرانس کے ایک بڑے حصہ پر قابض ومتصرف اور گاتھ قوم کا بادشاہ تھا، جنگ طولون کے بعد ملک فرانس کے شمالی بادشاہ چارلس مارٹل کے مقابلے میں طاقتور بنانے کے لیے اس بات کا خواہشمند ہوا کہ اپنے ہمسایہ مسلمان عامل کو اپنا ہمدرد بنا کر اپنے رقیب مارٹل کو نیچا دکھائے۔ چنانچہ ڈیوک آف ایکیوٹین نے عثمان سے خط وکتابت اور تحائف کے ذریعہ سے صلح و دوستی کی بنیاد قائم کی اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ڈیوک آف ایکیوٹین نے اپنی نہایت حسین وجمیل اور شہرہ آفاق لڑکی کی شادی عثمان کے ساتھ اس شرط پر کر دی کہ لڑکی اپنے آبائی دین عیسوی پر قائم رہے گی اور عثمان اس کو مسلمان ہونے پر مجبور نہ کرے گا۔[1] اس لڑکی کے معاوضہ میں ڈیوک آف ایکیوٹین نے عثمان سے یہ عہد نامہ بھی لکھوا لیا

---

[1] تاریخ میں ہمیں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جب عیسائیوں نے حالات کے دباؤ کے تحت یا جب انہیں شکست یا اپنے ملک پر مسلمانوں کے خوف لاحق ہوا تو انہوں نے مسلم امراء کو یہ پیشکش کر دی کہ ہم اپنی لڑکی کی شادی آپ سے کر دیتے ہیں۔ اس سے ان کے بہت سے مقاصد ہوں گے تاہم دو مقاصد تو بالکل واضح ہیں: ایک یہ کہ مسلمان امراء اور علاقوں اور افواج وغیرہ کی جاسوسی اور ان کی کمزوریوں سے آگاہی، دوسرا مقصد اپنے ملک کو مسلمانوں کے قبضہ سے محفوظ کرنا اور مسلم افواج کی چڑھائی کو ٹال کر مناسب جنگی تیاریوں میں مصروف ہونا ہوتا تھا۔ فلسطین کی صلیبی جنگوں میں عیسائیوں نے اپنی لڑکیوں اور عورتوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جس طرح استعمال کیا، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

کہ عثمان اپنی فوجوں کو کبھی ڈیوک کے خلاف استعمال نہ کرے گا۔

عثمان لخمی کا قتل:

اب جبکہ امیر اندلس عبدالرحمٰن غافقی نے فرانس پر حملہ آور ہونے کے لیے فوجی تیاری کر کے جبل البرتات کو عبور کرنا چاہا تو عثمان کے پاس حکم بھیجا کہ اپنی متعلقہ فوج کو ہماری رکاب میں شامل ہونے اور اپنے علاقے میں سامان رسد کی فراہمی کے کام کے لیے مستعد رکھو۔ عثمان نے اس حکم کی تعمیل میں عذر کیا اور اول حیلے بہانے کرتا رہا لیکن جب عبدالرحمٰن غافقی پہنچا تو عثمان جبل البرتات کے دروں میں اسلامی لشکر کو روکنے اور مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عبدالرحمٰن نے ایک سردار کو تھوڑی سی فوج دے کر آگے روانہ کیا۔ عثمان شکست کھا کر بھاگا اور پہاڑ کے دشوار گزار مقامات میں جا چھپا۔ اس سردار نے تعاقب جاری رکھ کر عثمان کو قتل کیا اور اس کی عیسائی بیوی کو گرفتار کر کے عبدالرحمٰن کے پاس لے آیا۔

اس طرح جبل البرتات کی اس رکاوٹ کو دور کر کے اسلامی لشکر فرانس کے ہموار میدان میں داخل ہوا۔ شہر ناربون تک اسلامی حکومت کی سرحد تھی۔ اس شہر سے آگے بڑھ کر اسلامی لشکر نے شہروں کو فتح کرنا شروع کیا۔ فرانس کی مشہور بندرگاہ اور نامور شہر بورڈیلو بھی مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ اس زمانہ میں ڈیوک آف ایکیوٹین مجبور ہو کر چارلس مارٹل کی سیادت کو تسلیم کر چکا تھا۔ وہ اپنی تمام فوجوں کو لیے ہوئے چارلس مارٹل کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلامی لشکر کے اس سیلاب کی روک تھام کے لیے اس کو آمادہ کیا۔ چارلس مارٹل نے بڑی مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جس قدر افواج اور سامان جنگ فراہم کر سکتا تھا، فراہم کیا، عیسائیوں کا جم غفیر اور یورپ کے نامور شجیع و بہادر لوگ اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے اور اس جنگ کو مذہبی جنگ سمجھ کر پادریوں نے عیسائیوں کو خوب پر جوش تقریروں کے ذریعہ سے ابھارا۔ مسلمانوں نے دریائے گرون کو عبور کیا اور دریائے داردون کے کنارے پہنچے۔ یہاں عیسائی لشکر نے مقابلہ کیا مگر مسلمانوں کے مقابلے میں اس کو شکست فاش حاصل ہوئی اور مسلمانوں نے شہر پائی ٹیرس پر قبضہ کیا۔

شہر ٹورس پر لڑائی:

پائی ٹیرس پر قبضہ کر کے مسلمان شہر ٹورس کی طرف بڑھے جو میدان ملک فرانس کے مرکز میں

واقع ہے۔ شہر ٹورس کے قریب ایک میدان میں عیسائیوں کی مجموعی تعداد اور پورے لشکر نے اسلامی فوج کا مقابلہ کیا۔ اس میدان میں پہنچ کر دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل سات روز تک خیمہ زن رہیں اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مسلمانوں کی فوج بالکل غیر اور اجنبی ملک میں تھی۔ عیسائی اپنے ملک کی حفاظت کے لیے جمع ہوئے تھے۔ چارلس مارٹل اور ڈیوک آف ایکوٹین جیسے نامور اور تجربہ کار سپہ سالاروں کے علاوہ اسی حیثیت کے اور بھی کئی سردار عیسائیوں کی افواج کے مختلف حصوں کی سپہ سالاری کر رہے تھے۔ ہر طرف سے عیسائیوں کی فوجیں اُمڈی چلی آ رہی تھیں اور دم بہ دم ان کی جمعیت بڑھ رہی تھی۔ پادریوں کی پرجوش مذہبی تقریروں سے عیسائیوں کا جوش بھی ترقی کر رہا تھا۔ اس مرتبہ مسلمانوں کی فوج تعداد میں پہلے کی نسبت شاید زیادہ ہوگی لیکن چونکہ عیسائی لشکر بھی بہت زیادہ تھا اور ملک فرانس مدافعت پر مستعد ہوگیا تھا، لہٰذا مسلمانوں کی نسبت اس مرتبہ بھی وہی تعداد تھی جو پہلی لڑائیوں میں ہوتی تھی یعنی مسلمان عیسائیوں سے دسواں حصہ بھی نہ تھے۔ اس مرتبہ مسلمان مال غنیمت کے سبب سے پہلے سے زیادہ بوجھل تھے۔ اپنے ملک سے بہت دور نکل آئے تھے اور چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے۔ آخر آٹھویں روز مسلمانوں کے امیر عبدالرحمٰن غافقی نے زیادہ انتظار کرنا مناسب نہ سمجھ کر اپنی فوج کو حملہ کا حکم دیا۔ لڑائی شروع ہوئی اور شام تک میدان کارزار گرم رہا۔ رات کی تاریکی نے حائل ہو کر فیصلہ جنگ کل پر ملتوی کر دیا۔ رات کو مسلمان اپنی قلت تعداد کے سبب سے اور عیسائی مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کا تجربہ کر کے بہت متفکر رہے۔ اگلے دن صبح سے ہنگامہ دار و گیر پھر شروع ہوا۔ اس روز ڈیوک آف ایکیوٹین نے جو اس سے پہلے بھی مسلمانوں کی لڑائی کا تجربہ کر چکا تھا، یہ چالاکی کی کہ اپنی فوج کو لے کر رات ہی سے ایک کمین گاہ میں چھپ کر بیٹھا رہا۔ ٹھیک اس وقت جبکہ عیسائی مسلمانوں کے مقابلے میں میدان چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے تھے، ڈیوک آف ایکیوٹین نے عقب سے آ کر اسلامی لشکر پر حملہ کیا۔ اس غیر متوقع حملہ کا اثر یہ ہوا کہ اگلی صفیں پیچھے سے آنے والے دشمن کی طرف متوجہ ہو گئیں اور عیسائیوں کا لشکر عظیم جو فرار پر آمادہ تھا، یک لخت اپنے آپ کو سنبھال کر حملہ آور ہوا۔ مٹھی بھر مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ مجتمع نہ رہ سکا۔

امیر عبدالرحمٰن کی شہادت:

اس دارو گیر میں امیر عبدالرحمٰن غافقی نے اپنے پیشروؤں کی سنت پر عمل کیا اور شمشیر بہ کف دشمنوں میں گھس کر سینکڑوں کو تہ تیغ کیا اور جسم پر سینکڑوں زخم کھا کر جام شہادت نوش کیا۔ اس روز بھی صبح سے شام تک ہنگامہ کارزار گرم رہا تھا اور عبدالرحمٰن غافقی کی شہادت کے بعد ہی رات کی تاریکی نے لڑائی کو روک دیا تھا۔ بہ ظاہر آج بھی عیسائی فتح مند تھے اور باوجود اس کے کہ انہوں نے مسلمانوں کو نرغہ میں لے لیا تھا مگر شام کی شمشیر زنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود ہی سمٹ کر پھر ایک طرف ہو گئے تھے اور مسلمانوں کو ان کی جگہ سے نہ ہٹا سکے تھے مگر خاتمہ جنگ مسلمانوں کے لیے سخت اندوہناک اور عیسائیوں کے لیے بے حد مسرت انگیز تھا۔ مسلمانوں نے اپنے سپہ سالار اور امیر کے شہید ہو جانے کے بعد اپنے آپ کو میدان جنگ میں قائم رکھنا مناسب نہ سمجھا اور وہ رات ہی کو وہاں سے کوچ کر گئے۔ صبح کو جب عیسائیوں نے مسلمانوں سے میدان کو خالی دیکھا تو انہوں نے بھی وہاں قیام مناسب نہ سمجھا۔ مسلمانوں کا تعاقب کرنا تو بڑی بات تھی، چارلس مارٹل نے اپنے دارالحکومت کی طرف واپس جانے میں اس لیے زیادہ عجلت سے کام لیا کہ کہیں مسلمان کمین گاہ میں نہ چھپے بیٹھے ہوں اور ایسا نہ ہو کہ ہم پر حملہ آور ہو کر تباہی برپا کر دیں۔ اس لڑائی میں عیسائیوں کے لاتعداد آدمی مارے گئے اور مسلمانوں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان کا سپہ سالار کام آیا۔ بہرحال اس لڑائی کے بعد اس مہم کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمان زیادہ ملک فتح نہ کر سکے۔ اب چاہو تو اس کو مسلمانوں کی شکست تصور کر لو، چاہو برابر کی زور آزمائی قرار دے لو اور چاہو تو عیسائیوں کی شکست تصور کر لو۔ یہ لڑائی سنہ ۱۱۴ھ میں واقع ہوئی۔

عبدالملک بن فہری:

اس لڑائی کے انجام اور عبدالرحمٰن کی شہادت کا حال جب گورنر افریقہ عبید بن عبدالرحمٰن کو معلوم ہوا تو اس نے عبدالملک بن قطن فہری کو اندلس کا امیر مقرر کیا اور حکم دیا کہ فرانسیسیوں سے عبدالرحمٰن غافقی کا انتقام ضرور لینا چاہیے۔ عبدالملک بن قطن فہری نے اندلس میں داخل ہو کر سنہ ۱۱۵ھ میں زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور ملک کے اندرونی انتظامات سے فارغ ہو کر فرانس کے ملک پر حملہ کی تیاری کی۔

عبدالملک بن قطن ایک تجربہ کار اور ہوشیار شخص تھا۔ اس لیے اس سے بڑی بڑی توقعات تھیں۔ وہ اپنے ساتھ کچھ فوج افریقہ سے بھی لایا تھا مگر عبدالملک سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے موسم برشگال یعنی برسات میں فرانس کی جانب کوچ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جبل البرتات سے گزرتے ہی ندی نالوں اور دریاؤں نے فوج کے عبور کو دشوار بنا دیا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر عیسائی قزاقوں نے چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ فوج کو دریاؤں اور ندی نالوں میں گھرا ہوا دیکھ کر عبدالملک نے واپسی کا ارادہ کیا اور بہ مشکل نقصان اٹھا کر فوج کو واپس لیا۔ اس آنے جانے میں وقت بھی ضائع ہوا اور آدمیوں کا بھی نقصان ہوا اور کام بھی کچھ نہ ہوا۔

عبدالملک کی معزولی:

گورنر افریقہ نے ناخوش ہو کر عبدالملک کو امارت اندلس سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ عتبہ بن حجاج سلولی کو امیر اندلس بنا کر بھیجا۔

عتبہ بن حجاج سلولی:

عتبہ بن حجاج نے سنہ ۱۱۷ھ میں وارد اندلس ہو کر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور عبدالملک قطن فہری کو کسی چھوٹے سے علاقہ کا عامل مقرر کر دیا۔ یہ عتبہ کی غلطی تھی کہ اس نے ایک ایسے شخص کو جو تمام ملک اندلس کا فرماں روا تھا، ایک چھوٹے سے عامل کی حیثیت سے اپنی ماتحتی میں رکھا۔ اسی قسم کی غلطی عثمان لخمی کے متعلق اس سے پہلے سرزد ہو چکی تھی۔ مناسب یہ تھا کہ بعد میں آنے والے امیر عثمان لخمی کو یا تو بالکل بے دست و پا کر کے رکھتے یا اس کو اندلس میں نہ رہنے دیتے بلکہ افریقہ واپس بھیج دیتے۔ اسی طرح عتبہ کو چاہیے تھا کہ عبدالملک کو واپس افریقہ بھیج دیتا اور کم سے کم کسی حصہ ملک کی حکومت ہرگز سپرد نہ کرتا۔ بہرحال عتبہ نے ایک سیاسی غلطی ضرور کی۔

عتبہ کے کارنامے:

عتبہ بہت ہوشیار اور منصف مزاج شخص تھا۔ عتبہ کے عظیم الشان کارناموں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اندلس میں امن وامان قائم رکھنے کی غرض سے بڑے بڑے معقول انتظامات کیے۔ پولیس کا ایک خاص اور الگ محکمہ راستوں کی حفاظت اور امن وامان کے لیے قائم کیا۔ اس محکمہ میں سوار بھرتی کیے گئے جو گشت و گرداوری کر کے راستوں کی حفاظت کرتے تھے۔ یہی گویا گشتی یا موبائل

پولیس کی ایجاد تھی۔ عتبہ نے ہر ایک گاؤں اور ہر ایک بستی میں ایک ایک عدالت قائم کر دی تاکہ مرکزی عدالتوں میں کام کی کثرت نہ ہو اور لوگوں کو مقدمات کے فیصلوں میں سہولت رہے۔ عتبہ نے یہ بھی انتظام کیا کہ ہر ایک گاؤں اور ہر ایک بستی میں کم از کم ایک ایک مدرسہ قائم ہو۔ ان مدارس کے مصارف کو پورا کرنے کے لیے ملک کے خراج کا ایک حصہ مخصوص کر دیا۔ جہاں جہاں مساجد کی ضرورت تھی، وہاں مسجدیں تعمیر کرائیں اور ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ بھی لازمی طور پر قائم کیا گیا۔ اندلس میں بربریوں کی کثرت ہوگئی تھی اور ان میں ان کی جبلی وحشت و بربریت کی علامات مشاہدہ ہوتی رہتی تھیں۔ عتبہ نے ان سب کو اس طرح مصروف کر دیا کہ ان میں شائستگی و تہذیب نے ترقی کی۔ ممالک کے محاصل اور خراج میں بھی ایسی نرمی اور رعایت رکھی کہ عام طور پر تمام طبقات ملک خوش اور مسرور نظر آنے لگے۔ ملک کے عاملوں اور والیوں کو عدل و دیانت پر قائم کر کے اندلس کو بہترین ملک بنا دیا۔

اس کے بعد ملک فرانس کے اس حصہ پر جس کو مسلمان فتح کر چکے تھے اور وہاں برائے نام مسلمانوں کی حکومت یا سیادت تسلیم کی جاتی تھی، توجہ مبذول کی۔ شہر ربونیہ کو مضبوط کیا۔ دریائے رون کے کنارے متعدد قلعے تیار کرائے تاکہ موجودہ مقبوضہ ملک کی سرحد مضبوط رہے اور آئندہ پیش قدمی اور فتوحات میں آسانی ہو۔ فرانسیسیوں سے کئی مرتبہ مقابلہ ہوا اور ہر مرتبہ ان کو مسلمانوں سے شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔

سنہ ۱۲۱ھ میں افریقہ کے اندر بربریوں نے بغاوت کی۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے امیر عتبہ سے بہتر اور آدمی نہ تھا۔ چنانچہ گورنر افریقہ نے اندلس سے امیر عتبہ کو طلب کیا۔ عتبہ نے افریقہ پہنچ کر بربریوں کو خوب اچھی طرح سزا دی اور یہ بغاوت فرو ہوگئی۔ امیر عتبہ کی غیر موجودگی میں اندلس کے اندر بدنظمی پیدا ہوگئی اور جا بہ جا سازشیں اور قومی رقابتیں بیدار ہوگئیں۔ ادھر جبل البرتات سے شمال کی جانب کا صوبہ دار جس کا دارالحکومت شہر ناربون تھا، اس زمانے میں یوسف بن عبدالرحمٰن تھا۔ مارسلیز فرانس کا ایک مشہور شہر تھا۔[1] وہ ایک زبردست ریاست کا دارالحکومت تھا۔ ڈیوک آف مارسیلز جو مشرقی فرانس یعنی اس ریاست کا فرماں روا تھا اور جس کا نام مورون شیاس تھا، یوسف بن عبدالرحمٰن والی ناربون سے خواہان امداد ہوا۔ چونکہ چارلس مارٹل سے اس کو خوف تھا، لہٰذا

---

1. اب بھی یہ فرانس کا ایک بڑا اور مشہور شہر ہے۔

اس نے یوسف بن عبدالرحمٰن کی اطاعت قبول کر لی اور مسلمانوں کا باج گزار ہو گیا۔ چارلس مارٹل نے یہ سن کر اس پر حملہ کیا۔ مسلمانوں کی فوج نے موورون شیاس کی مدد کی۔ چونکہ امیر عتبہ اندلس میں موجود نہ تھا، لہٰذا والی ناربون کو کسی قسم کی کمک نہ پہنچائی گئی۔ چارلس مارٹل نے مارسلیز کو تو لوٹ کر اور جلا کر خاکستر کر دیا لیکن جس وقت وہ شہر ناربون پر حملہ آور ہوا تو یہاں سے اس کو ناکام و نامراد واپس جانا پڑا۔

امیر عتبہ کی وفات:

امیر عتبہ افریقہ کے کاموں سے فارغ ہو کر سنہ ۱۲۲ھ میں اندلس واپس آیا تو یہاں اس کے خلاف بغاوت کا ارادہ پختہ ہو چکا تھا۔ عبدالملک بن قطن کی نسبت اوپر تحریر ہو چکا ہے کہ اس کو عتبہ نے کسی علاقہ کا عامل بنایا تھا۔ عتبہ کی غیر موجودگی میں عبدالملک نے رعایا اندلس کے ایک بڑے حصے کو اپنے ساتھ بغاوت میں شامل کر لیا اور خود حکومت اندلس کا مدعی ہوا۔ امیر عتبہ نے آ کر اس بغاوت و سرکشی کو مٹانے کی تدابیر شروع کیں مگر اس کو موت نے زیادہ مہلت نہ دی۔ ماہ صفر سنہ ۱۲۳ھ میں امیر عتبہ نے دارالسلطنت قرطبہ میں انتقال کیا اور عبدالملک بن قطن بڑی آسانی سے تمام ملک اندلس پر قابض و متصرف ہو گیا۔

عبدالملک بن قطن / باردوم:

عبدالملک بن قطن فہری سو برس کی عمر کا بوڑھا شخص تھا لیکن اس کا جسم جوان کی طرح چست اور اس کی عقل ہر طرح سالم اور ہمت نو جوانوں کی طرح بلند تھی۔ عبدالملک مدینہ کا باشندہ اور واقعہ حرہ میں شریک تھا۔ اس نے مدینہ، شام، مصر، عراق، افریقہ اور اندلس کی بہت سی لڑائیوں میں شرکت کی تھی۔ اس کا جسم اپنے اندر زخموں کے سینکڑوں نشان رکھتا تھا۔ شامیوں اور حجازیوں میں جو منافرت چلی آتی تھی، عبدالملک جنگ حرہ کے سبب سے اور بھی زیادہ اس منافرت میں حصہ رکھتا تھا۔ ادھر افریقہ و مراکش میں بربریوں کو ان کی بربریت کے سبب سے عرب لوگ جوان کے فاتح تھے، حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بنوامیہ کی خلافت و سلطنت خالص عربی حکومت و سلطنت تھی۔ اس نفرت و حقارت کو جو ان کے فاتحین میں تھی، بربری خوب محسوس کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ بربری لوگ عربوں کو اپنا حاکم و فاتح تو سمجھتے تھے لیکن اصول اسلام سے واقف ہونے کے بعد جب

وہ عربوں میں قومی غرور و علو کی حرکات کا معائنہ کرتے تھے تو ان کے دل میں انقباض پیدا ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب ان کے اندر بنوامیہ یعنی موجودہ خلافت کے خلاف کوئی تحریک شروع کی جاتی تھی تو وہ فوراً متاثر ہوتے اور بغاوت پر آمادہ ہو جاتے تھے اور یہی سبب تھا کہ حکومت عبیدین کی بنیاد اسی بربری قوم میں بڑی آسانی سے رکھی جا سکی اور اسی وجہ سے عربی حکومت کے خلاف ہر ایک سازشی شخص بربری قوم کو نہایت موزوں قوم سمجھتا رہا۔ بربری لوگوں کو اپنی شجاعت پر ناز تھا اور وہ عربوں کی رقابت پر ہمیشہ کمربستہ رہے۔ اسی زمانے میں افریقہ کے اندر بربریوں کی بغاوت پھر از سرنو برپا ہو گئی تھی۔ گورنر افریقہ بربریوں کی اس بغاوت کے سبب سے بہت فکرمند اور مصروف و منہمک تھا۔ اس نے عبدالملک بن قطن کی حکومت پر اعتراض نہیں کیا۔

افریقہ کی گورنری پر کلثوم بن عیاض کا تقرر:

دربار خلافت سے ایک شامی سردار کلثوم بن عیاض، عبید بن عبدالرحمٰن کی جگہ گورنر افریقہ مقرر ہو کر آیا۔ یہاں بربریوں کے سردار میسرہ نامی نے مغرب الاقصیٰ میں لوٹ مار سے سخت بدامنی پیدا کر رکھی تھی۔ کلثوم بن عیاض نے بربریوں کو ایک حقیر قوم سمجھ کر بے پروائی سے مقابلہ کیا مگر بربری لوگ جو شروع میں بھی بلا جنگ وجدل عربوں کے محکوم نہ ہوئے تھے، اب سو برس کے عرصہ میں اسلام کی بہ دولت بہت کچھ ترقی کر چکے تھے۔ ان کی شجاعت و تہذیب میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ عربوں کے ساتھ بہت سی لڑائیوں میں شریک ہو ہو کر عربوں کی ہمسری کرنے لگے تھے۔ بربروں نے شامیوں کو شکست دی۔

کلثوم بن عیاض کی قلعہ سبطہ میں محصوری:

کلثوم بن عیاض اپنی بہت سی فوج کو کٹوا کر دس ہزار شامیوں کے ساتھ قلعہ سبطہ میں محصور ہو گیا۔ یہ قلعہ جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، آبنائے جبل الطارق کے جنوبی ساحل پر واقع ہے۔ اہل اندلس اگر چاہتے تو کلثوم بن عیاض کو امداد پہنچا سکتے تھے۔ اس قلعہ کا فتح کرنا بربریوں کی طاقت سے باہر تھا لیکن چونکہ قلعہ میں سامان رسد نہ تھا، اس لیے محصورین کو فاقہ کی مصیبت کا مقابلہ کرنا پڑا اور سب سے بڑی امداد ان کی یہی تھی کہ کھانے پینے کا سامان ان کو پہنچایا جاتا۔ کلثوم بن عیاض نے عبدالملک بن قطن حاکم اندلس سے سامان رسد کی امداد طلب کی، اپنی حالت زار سے مطلع کیا۔

عبدالملک نے بوجہ اس نفرت کے جو اس کو شامیوں سے تھی، کلثوم بن عیاض اور اس کے ہمراہیوں کو کسی قسم کی امداد نہ پہنچائی۔ اندلس کے ایک امیر سوداگر زید بن عمرو کو جب سبطہ کی محصور فوج کا یہ حال معلوم ہوا تو اس نے کئی جہازوں میں سامان رسد بار کرا کر قلعہ سبطہ کی طرف روانہ کیا۔ اس کا حال جب عبدالملک کو معلوم ہوا تو اس نے زید بن عمرو کو گرفتار کرا کر نہایت ذلت کے ساتھ قتل کرا دیا۔

گورنر افریقہ پر حنظلہ کا تقرر:

خلیفہ دمشق یعنی ہشام بن عبدالملک کو جب لشکر شام کی اس تباہ حالی کا علم ہوا تو اس نے فوراً امیر حنظلہ کو ایک زبردست فوج دے کر مغرب الاقصیٰ کی جانب روانہ کیا۔ حنظلہ نے یہاں پہنچ کر بربریوں کو شکست دے کر درست کر دیا اور محصور فوج کو قلعہ سبطہ سے آزاد کیا۔ انہیں ایام میں کلثوم بن عیاض کا انتقال ہو گیا اور حنظلہ نے افریقہ کی حکومت و گورنری اپنے ہاتھ میں لی۔

عبدالملک بن قطن کا قتل:

ادھر اندلس میں جب یہ خبر پہنچی کہ افریقہ میں بربریوں کو خوب قتل کیا گیا تو اندلس کے بربریوں نے متفق و متحد ہو کر عبدالملک بن قطن پر حملہ کیا۔ بربری لوگ صوبہ جلیقیہ اور اراگون میں بہ کثرت آباد تھے۔ صوبہ جلیقیہ شمال و مغرب میں تھا اور اراگون میں یا ارغون شمال و مشرق میں۔ دونوں طرف سے بربریوں نے قرطبہ پر حملہ کیا اور عبدالملک بن قطن کو کئی شکستیں دیں۔ بربریوں کے اس فتنہ کو فرو کرنا جب امیر عبدالملک بن قطن نے اپنی طاقت سے باہر دیکھا تو مجبوراً بلج بن بشر بن عیاض قشیری نے جو کلثوم بن عیاض کا بھتیجا اور کلثوم کے بعد مذکورہ دس ہزار شامی فوج کا افسر تھا، امداد طلب کی اور لکھا کہ اندلس آ کر ان بربریوں کے فتنے کو فرو کرانے میں ہماری امداد کرو تو اس کا کافی صلہ تم کو دیں گے۔ بلج بن بشر نے افریقہ کے جدید گورنر حنظلہ کے پاس رہنے کی نسبت اندلس میں جانا مناسب سمجھا۔ وہاں پہنچ کر بربری لشکروں کو شکستیں دے کر چند روز میں اس فتنے کو فرو کیا۔ اب اس شامی لشکر نے جب اندلس کے عربوں سے قلعہ سبطہ میں اپنی فاقہ کشی اور عبدالملک بن قطن کی سنگ دلی کا حال سنایا تو عام طور پر لوگ عبدالملک کے خلاف ہو گئے۔ بلج بن بشر نے اہل اندلس کو اپنے موافق دیکھ کر عبدالملک بن قطن کو گرفتار کر لیا۔ بلج، عبدالملک کو قید رکھنا چاہتا تھا مگر اس کے ہمراہیوں اور عبدالملک کے دشمنوں نے بلج کو دھمکیاں دے کر مجبور کر دیا اور یہ سو برس کا بوڑھا شخص

قتل کیا گیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۲۳ھ کے آخر ایام کا ہے۔

آپس کی پھوٹ:

بلج بن بشری یا بلج بن بشر کے اندلس پر قابض ہونے کے بعد عبدالملک بن قطن فہری کے دو بیٹوں امیہ بن عبدالملک اور قطن بن عبدالملک نے خفیہ طور پر اپنی قوم کے لوگوں کو بلج بن بشر کے خلاف مجتمع کرنا شروع کیا۔ یوسف بن عبدالرحمٰن عامل ناربون بھی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، عبدالملک کے بیٹوں کے ساتھ شریک ہو گیا۔ یوسف بن عبدالرحمٰن کی شرکت اور شامیوں کی حکومت کے آئندہ خطرناک تصور کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے بربری لوگ بھی جو چند روز پہلے عبدالملک کی مخالفت پر آمادہ ہوئے تھے، عبدالملک کے بیٹوں اور فہریوں کے ساتھ آ کر شامل ہو گئے اور قرطبہ کی طرف بڑھے۔ ادھر بلج بن بشر بھی اپنی فوج کو فراہم کر کے مقابلہ پر مستعد ہوا۔ بلج کی فوج میں بارہ ہزار شامی اور ملک اندلس کے اکثر عرب شامل تھے۔ دونوں فوجوں کا سخت مقابلہ ہوا۔ یہاں مسلمانوں کی دو زبردست فوجیں وسط اندلس میں ایک دوسرے سے لڑ رہی تھیں۔ وہاں عیسائی لوگ ملک فرانس میں یہ تدبیریں سوچ رہے تھے کہ مسلمانوں سے اپنے ملک کو آزاد کرایا جائے۔ غرض لڑائی میں امیر بلج خطرناک طور پر زخمی ہوا اور گھوڑے سے گر کر بے ہوش ہو گیا مگر شامیوں کی اس بے سردار فوج نے آخر دشمنوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اگلے روز امیر بلج نے زخموں کی اذیت سے وفات پائی۔ یہ واقعہ سنہ ۱۲۴ھ کا ہے۔ امیر بلج نے اندلس میں گیارہ مہینے حکومت کی۔ امیر بلج کے بعد شامیوں اور عربوں نے مل کر ثعلبہ بن سلامہ کو امارت اندلس کے لیے منتخب کیا۔

ثعلبہ بن سلامہ:

ثعلبہ بن سلامہ چونکہ یمنی تھا، اس لیے اس نے اندلس پر قابض و متصرف ہو کر اہل یمن کی طرف داری میں مبالغہ کیا۔ پسران عبدالملک بن قطن جو شکست کھا کر فرار ہو گئے تھے، وہ ابن سلامہ کے مطیع نہ ہوئے اور ملک میں ادھر لوٹ مار مچاتے پھرنے لگے۔ ادھر اہل یمن پر بے جا احسانات اور دوسرے عربوں پر تشدد کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام عربی قبائل ابن سلامہ سے ناراض ہو گئے اور مجبوراً حنظلہ بن صفوان گورنر افریقہ سے ابن سلامہ کی شکایت اور کسی نئے امیر کے بھیجنے کی درخواست کی۔

ابن سلامہ کی معزولی:

حنظلہ بن صفوان نے ابوالخطاب حسام بن ضرار کلبی کو سند امارت دے کر اندلس بھیجا۔ اہل اندلس نے ابوالخطاب حسام کا استقبال کر کے اطاعت قبول کی۔ حسام نے ابن سلامہ کو معزول کر کے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ یہ واقعہ سنہ۱۲۵ھ کا ہے۔

ابوالخطاب حسام بن ضرار کلبی:

ابوالخطاب ہر طرح سے حکومت کی قابلیت رکھتا تھا۔ ادھر اندلس کی تمام رعایا خواہ مسلمان ہوں یا عیسائی، روز روز کی خانہ جنگی سے تنگ آ گئی تھی۔ سب نے اس نئے امیر کا بڑی دھوم دھام سے قرطبہ کے باہر استقبال کیا اور اطاعت پر مستعد ہو گئے۔ پسران عبدالملک نے بھی حاضر ہو کر بیعت اطاعت کی۔ حسام نے نہایت عدل و داد اور محبت اور سخاوت کے ساتھ اپنی حکومت کو شروع کیا۔ اس امیر نے اسباب خانہ جنگی کو نہایت غور وفکر کے ساتھ تحقیق و متعین کیا اور پھر ہر ایک قوم اور ہر ایک قبیلہ کے لیے اندلس میں جدا جدا مقام سکونت کے لیے تجویز کیے اور اس طرح تمام اہل شام کو جو قرطبہ میں بہ تعداد کثیر جمع ہو کر موجب مشکلات ہو سکتے تھے، منتشر کر دیا اور دارالحکومت میں امیر کے لیے انتظام میں آسانیاں پیدا ہو گئیں۔

ابوالخطاب کی ایک سیاسی غلطی:

لیکن اس امیر سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے اپنے ہم وطن اور ہم قوم یمنیوں کی زیادہ رعایت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز کے بعد لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ قوم یمانیہ کی طرف داری نے ابوالخطاب کو قبائل مضریہ کی نگاہ میں دشمن بنا دیا۔ قبیلہ قیس بھی اس سے برہم ہو گیا۔ ایک روز امیر ابوالخطاب کے چچازاد بھائی اور ایک کنعانی عرب میں لڑائی ہوئی۔ مقدمہ امیر کی عدالت میں گیا۔ امیر نے باوجود اس کے کہ اس کا چچازاد بھائی خطاوار تھا، اس کی رعایت کی اور فیصلہ اسی کے حق میں کیا۔ اس فیصلہ سے ناراض ہو کر کنعانی ضمیل بن حاتم بن شمر ذی الجوشن سردار قبیلہ قیس کے پاس گیا اور امیر کی شکایت کی۔ ضمیل بن حاتم ایک زبردست سردار اور عربوں کے اندر معزز و ہردلعزیز تھا۔ وہ امیر ابوالخطاب کی خدمت میں آیا اور اس نے نامناسب طرز عمل کی شکایت کی۔ امیر نے اس کو کچھ جواب دیا، جس کے جواب میں ضمیل بن حاتم نے کوئی سخت و نامناسب جملہ کہا۔ امیر

نے حکم دیا کہ اس کو نکال دو۔ دربانوں نے قصر امارت سے نکالتے ہوئے اس کی گردن پر چند دھولیں بھی رسید کیں، جس سے ضمیل کا عمامہ ایک طرف کو لٹک گیا۔ وہ اسی حالت میں قصر سے باہر آیا تو ایک شخص نے کہا کہ آپ اپنا عمامہ تو درست کر لیجیے۔ اس نے جواب دیا کہ میری قوم اگر چاہے گی تو میرے عمامہ کو درست کر دے گی۔ ضمیل بن حاتم نے مکان پر پہنچ کر اپنی قوم کے سرداروں اور دوسرے عرب لوگوں کو بلایا اور تمام واقعہ سنایا۔ سب نے ضمیل بن حاتم کی حمایت کا وعدہ کیا۔

اس کے بعد ضمیل بن حاتم قرطبہ سے چل دیا اور ملک کے مختلف صوبوں میں جا کر وہاں کے امراء سے ملا اور سب کو اپنا حال سنایا۔ چونکہ عربوں میں عام طور پر ابوالخطاب سے نفرت پیدا ہو چکی تھی، سب نے ضمیل کی حمایت پر آمادگی ظاہر کی۔ جب ضمیل کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ ابوالخطاب سے عام طور پر رؤسائے اندلس ناخوش ہیں تو اس نے شہر سدونہ کو اپنا مستقر بنا کر اپنی قوم اور دوستوں کو وہاں بلایا۔ جب سب شہر سدونہ میں فراہم ہو گئے تو ان کو لے کر قرطبہ کی جانب بڑھا۔ ثعلبہ بن سلامہ جو پہلے امیر اندلس تھا، اس نے اس فوج کا مقابلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابوالخطاب کی فوج نے شکست کھائی اور وہ گرفتار ہو گیا۔ ضمیل نے ابوالخطاب کو قرطبہ میں لے جا کر ایک مضبوط قلعہ میں قید کر دیا اور ثعلبہ و ضمیل دونوں اندلس پر قابض ہو گئے۔ یہ واقعہ ماہ رجب سنہ ۱۲۷ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ ابوالخطاب دو سال حکومت کرنے کے بعد گرفتار ہوا مگر گرفتار و مقید ہونے کے بعد چند ہی روز میں عبدالرحمٰن بن حسن کلبی کی سعی و کوشش سے ابوالخطاب حسام بن ضرار کلبی قید سے رہا ہو گیا۔ اس نے قید سے آزاد ہو کر اور قرطبہ سے نکل کر اپنے ہم وطن یمنی قبائل کو اپنے گرد فراہم کرنا شروع کیا۔ چنانچہ یمنی قبائل بہ تعداد کثیر ابوالخطاب کے گرد جمع ہو گئے۔ ادھر ضمیل اور ثعلبہ بن سلامہ بھی مقابلہ پر مستعد ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خلافت دمشق عباسیوں کی سازش کا شکار بن کر درہم برہم ہو رہی تھی۔ آخری اموی خلیفہ مروان الحمار عباسی لشکر کے مقابلے میں شکست کھا کر آوارہ ہو چکا تھا۔ اندلس کی طرف توجہ کرنے کا کسی کو ہوش ہی نہ تھا۔ افریقہ و مصر وغیرہ بھی خاندان خلافت کی اس بربادی کے سلسلے میں نقش حیرت بنے ہوئے تھے۔ اندلس میں سنہ ۱۲۷ھ سے سنہ ۱۲۹ھ تک ابوالخطاب دشمنوں کے ہاتھ میں دوبارہ گرفتار ہو کر مقتول ہوا۔ سنہ ۱۲۸ھ میں ثعلبہ بن سلامہ اندلس سے افریقہ عبدالرحمٰن بن حبیب والی افریقہ کی خدمت میں چلا گیا۔ ابوالخطاب کے مقتول ہونے کی خبر سن کر گورنر افریقہ نے ثعلبہ بن سلامہ کو اندلس کا امیر بنا کر روانہ کیا۔ سنہ ۱۱۹ھ میں ثعلبہ بن سلامہ اندلس

میں آیا اور عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

ثعلبہ بن سلامہ / باردوم:

ماہ رجب سنہ۱۲۹ھ میں ثعلبہ بن سلامہ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور ضمیل بن حاتم چونکہ اس کا دوست تھا اور قابو یافتہ تھا، وہ مہمات امارت کے انجام دینے میں سب سے زیادہ دخیل اور بہ طور وزیر رہا۔ ثعلبہ بھی چونکہ یمنی تھا، اس لیے ضمیل بن حاتم نے کوشش کر کے یمنی اور دوسرے قبائل میں صلح کرا دی۔ چند ہی روز کے بعد ثعلبہ بن سلامہ کا انتقال ہوگیا۔ اہل اندلس پہلے ہی سے اپنے لیے خود امیر منتخب کر لینے کے عادی تھے، جیسا کہ چند امیروں کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ آج کل چونکہ مرکز خلافت میں بدنظمی تھی، اس لیے انہوں نے اپنی امارت کے لیے خود کسی شخص کا انتخاب کر لینے میں تامل نہیں کیا اور یوسف بن عبدالرحمٰن فہری کو جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، اپنا امیر بنا لیا۔ یوسف کی پرانی خدمات اور شہرت نے اس کی سفارش کی اور کسی کو اس انتخاب میں تامل نہ ہوا۔

یوسف بن عبدالرحمٰن فہری:

چونکہ ملک اندلس کو مرکز خلافت سے آج کل کوئی خصوصی تعلق نہ رہا تھا نیز یہاں ہر قوم اور ہر قبیلے کے مسلمان آباد تھے، اس لیے چند ہی روز کے بعد اندلس میں کشمکش اور ہلچل سی پیدا ہونے لگی۔ یوسف بن عبدالرحمٰن نے ضمیل بن حاتم کو جو سب سے زیادہ طاقتور شخص تھا اور یوسف کے انتخاب پر دل ہی دل میں کبیدہ خاطر معلوم ہوتا تھا، صوبہ طیطلہ کا حاکم بنا دیا۔ عیسائیوں نے صوبہ اربونیہ کے حاکم عبدالرحمٰن بن علقمہ کو بغاوت پر ابھار دیا مگر عبدالرحمٰن بن علقمہ قبل اس کے کہ مخالفت کے لیے نکلے، قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد دوسرے صوبہ دار ابن الولید کو عیسائیوں نے ابھارا اور عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئی۔ چنانچہ اس نے شہر اشبیلیہ کو فتح کر کے قرطبہ کا رخ کیا۔ امیر یوسف نے مقابلہ کر کے اس کو شکست دی اور گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد ایک اور سردار عمر بن عمرو نے علم بغاوت بلند کیا، وہ بھی ناکام رہا۔

اندلس کی صوبوں میں تقسیم:

ان بغاوتوں کو فرو کرنے کے بعد یوسف نے ملک کا اندرونی انتظام درست کیا۔ خاص ملک اندلس کو چار صوبوں میں تقسیم کیا اور پانچواں صوبہ اس حصہ ملک کو قرار دیا جو سرزمین فرانس میں

مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ صوبوں کے نام یہ تھے:

نمبر	صوبہ کا نام	صوبہ کے مشہور شہر
۱	اندلوسیہ	قرطبہ قرمونہ، اشبیلیہ، شدونہ، ملقون، البیرہ، جیان
۲	طیطلہ	عبیدہ، بیسہ، مرسیہ، وینیہ، بلنسیہ
۳	مریدہ (جلیقیہ)	مریدہ، لشبونہ، بچستہ، سلامنیکا
۴	اربونیہ (جنوبی فرانس)	ناربون، طلون، بن بلونہ، لیوگو، ٹوٹی

مرکزی حکومت کی تبدیلی کا اندلس پر اثر:

امیر یوسف بن عبدالرحمٰن فہری اگرچہ خود کسی فریق میں شامل نہ تھا لیکن اندلس کے اندر جب بنوامیہ کی خلافت کے ختم ہونے اور عباسیوں کی خلافت کے قائم ہونے کی خبر پہنچی تو جا بہ جا شامیوں اور ان امیروں کے خلاف ہوا خواہان بنوعباس مستعد ہو گئے جو بنوامیہ کے خیرخواہ تھے۔ ضمیل بن حاتم کو بنوامیہ کا خیرخواہ سمجھ کر چاروں طرف سے گھیر لیا۔ آخر قبیلہ قیس کے لوگوں نے ابن حاتم کی مدد کی۔ ضمیل بن حاتم نے جب امیر یوسف بن عبدالرحمٰن سے امداد طلب کی تو اس نے امداد دینے سے انکار کر دیا۔ بہرحال ابن حاتم نے اپنے آپ کو دشمنوں کے پنجے سے بچا لیا۔ اسی طرح جا بہ جا ملک میں ہنگامہ آرائیاں شروع ہو گئیں۔ ملک اندلس میں جو لوگ بنوامیہ کے ہوا خواہ تھے، ان میں دو شخص ابوعثمان عبیداللہ بن عثمان، عبداللہ بن خالد خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔ یہ دونوں آپس میں رشتہ دار بھی تھے یعنی ابوعثمان خسر اور عبداللہ بن خالد اس کا داماد تھا۔ یہ دونوں صوبہ اندلوسیہ کے شہر البیرہ میں حکمران تھے۔ اس شہر میں اہل شام کی زیادہ آبادی تھی۔ ان کے علاوہ یوسف بن بخت اور حسین بن مالک کلبی بھی مشہور سردار تھے۔ ضمیل بن حاتم کو جب امیر یوسف بن عبدالرحمٰن نے مدد نہ دی تو ابوعثمان اور عبداللہ بن خالد اس کی مدد کے لیے گئے۔ ان دونوں کی روانگی سے پہلے عبدالرحمٰن الداخل (جس کا حال آگے آئے گا) کا غلام بدر ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے ضمیل بن حاتم کو عبدالرحمٰن الداخل کے اندلس بلانے کے خیال میں شریک کر لیا۔ ضمیل نے یوسف بن عبدالرحمٰن سے بہ ظاہر بگاڑ کرنا مناسب نہ سمجھ کر یوسف کی رفقات اور ہمدردی کے اظہار میں کوتاہی نہیں کی۔ ضمیل سے رخصت ہو کر ابوعثمان اور عبداللہ بن خالد دونوں البیرہ میں واپس آئے اور بہ تدریج اپنے دوستوں اور ہوا خواہوں میں اس خیال و ارادے کی اشاعت خفیہ طور پر شروع کر دی۔ بعد میں ان کو

معلوم ہوا کہ ضمیل بن حاتم اپنے وعدے اور ارادے پر قائم نہیں بلکہ وہ یوسف بن عبدالرحمٰن ہی کی حکومت کو پسند کرتا ہے۔ اس طرح قبیلہ قیس اور قبیلہ فہر کے آدمیوں سے امید حمایت منقطع ہو گئی۔ مگر ابوعثان نے یہ ہوشیاری کی کہ ان دونوں قبیلوں کے خلاف یمنی قبائل میں مخالفت کا جوش بلند کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یمنی سرداروں نے جا بہ جا علم بغاوت بلند کیے اور امیر یوسف بن عبدالرحمٰن اور ضمیل بن حاتم دونوں ان کی سرکوبی اور مدافعت میں مصروف ہو گئے۔

عبدالرحمٰن الداخل اموی کی حکومت کا قیام:

جب ابوعثان نے یہ دیکھا کہ یمنی قبائل مصروف قتال وجدال ہو گئے تو فوراً عبدالرحمٰن الداخل کے غلام بدر کو گیارہ آدمیوں کے ساتھ ایک جہاز میں سوار کرا کے افریقہ کی جانب روانہ کیا اور کہا کہ بلاتوقف عبدالرحمٰن الداخل کو جو افریقہ میں مقیم ہے، اپنے ہمراہ لے آؤ۔ چنانچہ عبدالرحمٰن الداخل ربیع الثانی سنہ ۱۳۵ھ میں اندلس پہنچا اور بندر ضقات علاقہ البیرۃ میں جہاز سے اترا۔ اس کے استقبال کو ابوعثان اور تمام ہواخواہان بنوامیہ موجود تھے۔ ابوعثان عبدالرحمٰن الداخل کو البیرہ میں اپنے مکان پر لے گیا اور لوگوں کو فراہم کر کے ایک معقول جمعیت بہم پہنچائی۔ یوسف بن عبدالرحمٰن اس وقت صوبہ سرقسطہ کی جانب باغیوں سے نبرد آزما تھا۔ عبدالرحمٰن الداخل کے داخل اندلس ہونے کی خبر سن کر اور باغیوں کو شکست دے کر طیطلہ کی جانب آیا۔ یہاں آ کر ضمیل بن حاتم سے ملا اور غلطی یہ کی کہ ان تمام قیدیوں کو جن کو جان کی امان دے چکا تھا، قتل کرا دیا۔ اس سے اس کی فوج کے بہت سے سردار برہم ہوئے اور یوسف کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر البیرہ کی جانب جہاں عبدالرحمٰن الداخل مقیم تھا، روانہ ہو گئے۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی جگہ جگہ سے عرب سردار بالخصوص یمنی قبائل جو یوسف کے خلاف تھے، عبدالرحمٰن الداخل کے جھنڈے کے نیچے آ گئے۔ اب یوسف اور ابن حاتم صرف فہری اور قیسی لوگوں کے ساتھ باقی رہ گئے۔ شامی لوگوں کی ہمدردی تو عبدالرحمٰن الداخل کے ساتھ ہونی ہی چاہیے تھی مگر یمنی لوگ جو شامیوں کے حریف اور مخالف تھے، اس لیے شامل ہو گئے کہ وہ یوسف کے مخالف تھے اور عبدالرحمٰن الداخل، یوسف سے اندلس کی حکومت چھیننے آیا تھا۔ اس طرح فہری اور قیسی لوگوں کے سوا تمام عرب قبائل عبدالرحمٰن الداخل کے ہمدرد بن گئے۔ فہری اور قیسی بھی صرف یوسف اور ابن حاتم کی زبردست شخصیتوں کے سبب سے ان کے ساتھ تھے، ورنہ وہ بھی خاندان بنی امیہ کے اس شہزادے کو پسند کرتے تھے۔ ایک یہ سبب بھی عبدالرحمٰن الداخل کی قبولیت کا ہوا کہ اس کے اعلیٰ

اخلاق کی شہرت پہلے سے اندلس میں ہو چکی تھی اور عبدالرحمٰن بن قطن کے عہد امارت میں بعض شخصوں نے دمشق سے آ کر وہاں کے جو حالات بیان کیے تھے، ان میں عبدالرحمٰن کو بنوامیہ کے اندر سب سے بہتر نوجوان بتایا اور یہ بھی بیان کیا کہ اس کو حجازی اور یمنی عربوں سے بہت ہمدردی ہے۔ اس شہرت نے اس وقت بڑا کام دیا اور لوگوں نے بھی جو بنوامیہ کے مخالف تھے، عبدالرحمٰن کو محبت کی نگاہ سے دیکھا۔

آخر ابن حاتم اور یوسف دونوں طیطلہ سے قرطبہ کی جانب روانہ ہوئے۔ ادھر سے عبدالرحمٰن الداخل اپنی جمعیت کو لے کر قرطبہ کی طرف بڑھا۔ دریائے وادی الکبیر کے کنارے قرطبہ کے متصل میدان مصارت میں دونوں فوجوں کا مقابلہ عیدالاضحیٰ کے روز یعنی دس ذی الحجہ سنہ ۱۳۸ھ مطابق ۱۴ مئی سنہ ۷۵۶ء کو ہوا۔ بڑی خون ریز جنگ صبح سے شام تک رہی۔ آخر عبدالرحمٰن الداخل کو فتح حاصل ہوئی۔ امیر یوسف بن عبدالرحمٰن کا بیٹا عبدالرحمٰن اور دوسرے سردار گرفتار ہوئے مگر ابن حاتم اور یوسف دونوں بچ کر نکل گئے۔ ابن حاتم نے مریدہ میں اور یوسف نے جیان میں پناہ لی۔ عبدالرحمٰن الداخل اس میدان سے روانہ ہو کر قرطبہ میں داخل ہوا اور اعلان کیا کہ جو شخص اطاعت کا اقرار کرے گا، اس کو کوئی آزار نہ پہنچایا جائے گا۔ لوگوں نے بطیّب خاطر اطاعت قبول کی۔ ابن حاتم اور یوسف نے پھر فوجیں فراہم کیں، مگر آخر اطاعت ہی پر رضامند ہو گئے۔ عبدالرحمٰن الداخل نے ان کو اس شرط پر امان دی کہ وہ قرطبہ ہی میں سکونت اختیار کریں اور روزانہ ایک مرتبہ عبدالرحمٰن الداخل کے دربار میں حاضر ہو کر اپنی صورت دکھایا کریں۔ بس اس کے بعد سے عبدالرحمٰن الداخل اور اس کی اولاد کی حکومت اندلس میں شروع ہوئی اور عہد امارت یعنی اندلس کی اسلامی حکومت کا پہلا دور ختم ہو گیا۔

اسلامی حکومت کے دور اول پر ایک نظر:

اندلس کا ملک مرکز خلافت یعنی دمشق سے بہت زیادہ فاصلہ پر واقع تھا۔ اندلس تک پہنچنے کے لیے مسلمانوں کو قبطیوں، بربریوں وغیرہ کی کئی قوموں کو زیر کرنا پڑا تھا۔ مہینوں میں دربار خلافت کا کوئی حکم اندلس پہنچتا تھا اور اندلس کا کوئی پیغام دربار خلافت تک آتا تھا۔ اندلس جس زمانہ میں فتح ہوا، اس زمانے میں دربار خلافت اور مسلمانوں کے نامور سپہ سالاروں اور مدبروں کی توجہ خانگی جھگڑوں میں بہت کچھ صرف ہو رہی تھی۔ عراق و شام و ایران کے صوبوں نے مرکز خلافت کی توجہ کو

اپنی طرف زیادہ مبذول کر رکھا تھا۔ اس لیے اندلس کی طرف کوئی خصوصی توجہ کبھی مبذول نہ ہوسکی۔ اندلس عام طور پر گورنر افریقہ ہی کے ماتحت رہا۔ مگر چونکہ اندلس کی سرسبزی و شادابی اور خوش سوادی کی شہرت عام طور پر ممالک اسلامیہ میں ہوگئی تھی، اس لیے فتح اندلس کے بعد اندلس میں وہ لوگ جن کو حجاز، شام و عراق میں کوئی اہم خدمت سپرد نہ تھی، اندلس چلے گئے اور برابر جا کر وہاں آباد ہوتے گئے۔ ان نو وارد عربوں کو اندلس میں ایک فاتح قوم کی حیثیت سے عزت و تکریم کے ساتھ دیکھا جاتا تھا اور ان کو معزز عہدے بھی بہ آسانی مل جاتے تھے۔ اس لیے جو گیا، وہیں کا ہو رہا۔ افریقہ کے بربری قبائل شروع ہی میں زیادہ پہنچ گئے تھے اور بعد میں وہاں جاتے اور آباد ہوتے رہے۔ لہٰذا اندلس چند روز میں مسلمانوں کی ایک نو آبادی بن گیا۔ عیسائی لوگ جنہوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تھی، اس ملک کے باشندے تھے جن میں یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ اس طرح اندلس کی مخلوط آبادی میں مختلف عناصر شامل تھے۔ پچاس سال کے عرصہ میں بیسیوں حاکم تبدیل ہوئے۔ حکام کے اس جلد جلد تغیر و تبدل کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانان اندلس کے دلوں میں آزادی و خودسری بھی قائم رہی اور شان حق گوئی برابر ترقی کرتی ہوئی نظر آئی۔ عیسائی آبادی کو کسی وقت بھی کوئی آزار نہیں پہنچا۔ ان کے لیے صرف اقرار اطاعت ہی ہر قسم کے مصائب سے نجات کا باعث ہوگیا اور ان کو اقتصادی و علمی ترقیات کا خوب موقع ملتا رہا۔

اول اول مسلمانوں میں فتوحات کا جوش غالب رہا اور وہ ملک فرانس کے مرکز تک فاتحانہ پہنچ گئے۔ ابھی اسلامی حکومت کو قائم ہوئے کچھ زیادہ دن گزرے نہ تھے کہ خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان خانہ جنگیوں نے مسلمانوں کی فتوحات کو روک دیا اور فرانس کے ان عیسائیوں کو جو مسلمانوں کی حملہ آوری کے خوف سے ترساں و لرزاں تھے، سوچنے سمجھنے اور اپنی حالت پر غور کرنے کا موقع مل گیا۔ اس پچاس سالہ دور حکومت میں مختلف قبیلوں اور مختلف قابلیتوں اور مختلف دل و دماغ کے لوگ اندلس کے امیر و فرماں روا ہوتے رہے۔ تاہم اندلس کی آبادی، سرسبزی اور علوم و فنون میں بہت کچھ ترقیات ہوئیں۔ سب سے بڑھ کر مسلمانوں کا وجود اور ان کا اعلیٰ نمونہ ہی باشندگان اندلس کے لیے کافی تھا مگر اس سے بھی بڑھ کر رعایائے اندلس کو یہ فائدہ پہنچا کہ فاتحین نے مفتوحین کی عورتوں سے شادیاں کرنا شروع کر دیں۔ جب مسلمانوں کے گھر عیسائی عورتوں سے آباد ہو گئے تو وہ ذلت اور حقارت کا خیال جو عیسائی مفتوحین کی نسبت مسلم فاتحین کے دلوں میں ہونا چاہیے تھا، خود بہ خود معدوم

ہو گیا۔ مسلمانوں کو عیسائیوں سے ہمدردی پیدا ہوگئی اور وہ ان کو تعلیم و تربیت اور اعلیٰ اخلاق کی ترغیب دینے لگے۔ یہاں تک کہ ملک فرانس کے بعض حکمران جب آپس میں لڑتے تو اپنے مسلمان ہمسایوں سے فوجی امداد حاصل کر سکتے تھے۔

جب اول اول مسلمان اندلس میں داخل ہوئے اور عیسائیوں کا گاتھ سلطنت کا چراغ گل ہوا تو بہت سے پادری اور پادری مزاج عیسائی اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنے والے فوجی سپہ سالار بھاگ بھاگ کر شمال کی طرف چلے گئے۔ اندلس کا جنوبی حصہ زیادہ گرم، زرخیز اور خوش سواد تھا۔ مسلمان جنوب ہی کی طرف سے اس ملک میں داخل ہوئے تھے۔ لہٰذا وہ جنوبی صوبوں میں کثرت سے آباد ہو گئے۔ شمالی حصہ پہاڑی اور زیادہ سرد تھا، عربوں کو یہ شمالی حصہ پسند نہ آیا اور بہت ہی کم مسلمان شمالی شہروں میں سکونت پذیر ہوئے۔ پہاڑی علاقہ زیادہ قیمتی اور زرخیز بھی نہ تھا، مسلمانوں نے اس کو فتح کر کے اپنی حکومت تو قائم کی مگر اس کو زیادہ محبوب اور قیمتی نہ سمجھا۔[1] جبل البرتات کے دروں میں وہ مفرورین کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچے تھے لیکن جب گاتھ سرداروں کی جمعیت اور مفرورین کے اجتماع نے جبل البرتات کے شمالی میدان یعنی فرانس کے جنوبی حصہ میں مسلمانوں کو دعوت دی تو ایک اور نئے ملک میں سلسلہ جنگ جاری ہوا۔ جس کا نتیجہ ابھی اسی قدر ظاہر ہونے پایا تھا کہ صوبہ اربونیہ اور شہر ناربون اور اس کے شمالی میدانوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی لیکن اس کے بعد مسلمانوں کی خانہ جنگی نے اس کام کو آگے ترقی نہ کرنے دی۔

اندلس کے شمالی کوہی سلسلہ میں عیسائی کی ایک خود مختار ریاست کا قیام

پلیو:

یہ سب کچھ ہوا لیکن اسی حملہ آوری اور پیش قدمی کے سلسلے میں ایک معمولی سی غلطی نے مسلمانوں کو انجام کے لحاظ سے سخت نقصان پہنچایا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ امیر عنبسہ نے پلیو نامی

---

[1] اگر ان امراء کا مقصد اور نقطہ نظر اسلام کی اشاعت وترویج ہوتا تو وہ ان علاقوں کو حقیر اور معمولی نہ جانتے۔ اس طرح اسلام کی اشاعت کا رکبھی ہوتی اور وہ ان نقصانات سے بھی بچ جاتے جو بعد میں ظاہر ہوئے۔

ایک عیسائی لٹیرے کو جبل البرتات کے دروں میں نا قابل التفات سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ پلیو نامی غارت گر نے جب جبل البرتات میں اپنی قیام گاہ قائم کر لی تو وہ عیسائی جو مسلمانوں کے خوف سے آوارہ پھر رہے تھے اور وہ پادری جو اپنے ساتھ اندلس کے گرجاؤں سے تبرکات لے کر بھاگتے تھے، پلیو کے پاس آ آ کر فراہم ہونے لگے۔ اس طرح پلیو کی جمعیت نے ترقی کی اور وہ پہاڑوں کے درمیان ایک نہایت سخت دشوار گزار مقام میں مضبوط ہو کر بیٹھ گیا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ پہاڑ کے جس چند مربع میل رقبہ میں پلیو مقیم تھا، اس کے چاروں طرف اسلامی حکومت تھی۔ شمال کی جانب فرانس کا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ جنوب و مشرق کی جانب بھی اسلامی حکومت قائم تھی۔ مغرب کی جانب بھی اسلامی علاقہ تھا۔ پہاڑ کے اس جزیرے میں ان عیسائی متمردین کا استیصال کر دینا کوئی بھی بڑی بات اور دشوار کام نہ تھا۔ مگر مسلمانوں کے ہر ایک سردار اور ہر ایک سپہ سالار نے اس عرش کوہی پر فوج لے جانا اور حملہ آور ہونا اپنی بے عزتی سمجھی اور اس کو اس حال پر یہ سمجھ کر رہنے دیا کہ اس سے کسی مسلمان کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ حقیقت بھی یہ تھی کہ پلیو کو پہاڑ سے نیچے اترنے اور میدانی علاقہ میں نکلنے کی کبھی جرأت بھی نہیں ہوئی اور نہ ایسی جرأت عیسائیوں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں ہوسکتی تھی۔ مگر ان پادریوں نے جو اپنے مذہبی تبرکات لے لے کر پلیو کے پاس پہنچ گئے تھے، پلیو کو ایک مذہبی سردار اور عیسوی تبرکات کا محافظ قرار دیا۔ بارہ تیرہ سال تک وہ اسی چھوٹے سے پہاڑی علاقہ میں رہا اور اطراف و جوانب کے عیسائیوں سے اس کو سامان رسد کی امداد پہنچتی رہی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، عیسائیوں میں پلیو کی عظمت و محبت و شہرت ترقی کرتی گئی اور بہت سے عیسائی تکالیف برداشت کر کے بھی پلیو کے پاس پہنچتے اور تبرکات کی زیارت کرنے کو ضروری سمجھتے رہے۔ مسلمان ہمیشہ یہ سمجھتے رہے کہ چند عیسائی وحشی پہاڑ کی کھوہ میں ہمارے خوف سے اپنی جان بچا کر چھپ گئے ہیں۔ ہماری صورت دیکھ کر فرار ہوتے اور خوف کے مارے ہمارے سایہ سے بھاگتے ہیں، ان کو پڑا رہنے دو۔ اس بے پرواہی اور کم التفاتی نے ان عیسائیوں میں بہ تدریج جرأت پیدا کر دی اور وہ اپنی چھوٹی سی پہاڑی جائے پناہ کو ایک سلطنت سمجھنے لگے اور انہوں نے پلیو کو اپنا بادشاہ اور محافظ دین عیسوی قرار دیا۔

الفانسو:

پلیو کے انتقال پر اس کے بیٹے کو اپنا بادشاہ بنایا اور دو تین سال کے بعد وہ بھی فوت ہو گیا تو پلیو کے داماد الفانسو نامی کو عیسائیوں نے اپنا افسر اور بادشاہ قرار دیا۔ ادھر مسلمانوں کی خانہ جنگی اور آپس کے کشت وخون نے مسلمانوں کو شمالی صوبوں اور جبل البرتات کے متصلہ علاقوں کی طرف مطلق توجہ نہ کرنے دی۔ اس فرصت میں الفانسو نے جلیقیہ، ارگوان، اربونیہ کے علاقوں سے عیسائیوں کو اس پہاڑی علاقہ میں آنے اور آباد ہونے کی دعوت دی۔ جب عیسائیوں نے اپنے سرسبز کھیتوں اور میدانی علاقوں کو چھوڑنا اور زاہدانہ زندگی بسر کرنا پسند نہ کیا تو الفانسو نے اردگرد کے علاقوں پر چھاپے مارنے شروع کیے اور ڈاکہ زنیوں میں وہ صرف لوٹ مار ہی پر اکتفا نہ کرتا تھا بلکہ عیسائی آبادیوں پر چھاپہ مار کر عیسائیوں کو پکڑ پکڑ کر لے جاتا اور اپنے پہاڑی علاقوں میں سکونت پذیر کرتا تھا۔ ان عیسائیوں کی نظر بندوں کی طرح نگرانی بھی ہوتی تھی اور وہ کسی طرح اس پہاڑ سے نکل کر بھاگ نہیں سکتے تھے۔

عیسائی خودمختار ریاست کا دارالحکومت:

اس طرح جبریہ طور پر ایک آبادی پہاڑ کے اندر قائم کی گئی جو ایسٹریاس کے نام سے موسوم ہوئی اور یہی الفانسو کا دارالحکومت بنا۔ یہاں پادریوں کے رات دن کے وعظ وتقریر نے ان گرفتار شدہ عیسائیوں کو بہ تدریج اس پہاڑی زندگی پر رضامند کر دیا اور رفتہ رفتہ اس قدر آدمی جمع ہو گئے کہ وہ تنگ کوہ ان کے لیے کافی نہ رہا۔ اب الفانسو نے جبل البرتات کے شمالی دامن کی طرف اس علاقے میں لوٹ مار مچائی جو مسلمانوں کے قبضے میں تھا مگر وہ میدان میں جم کر مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اس نے بہ تدریج جبل البرتات کے جنوبی دامن سے شمالی دامن تک کا پہاڑی علاقہ سب اپنے قبضے میں کر لیا اور ایک چھوٹی ریاست قائم کر کے عیسائیوں کا امید گاہ بن گیا۔ مسلمان اگرچہ آپس میں چھری کٹاری ہو رہے تھے لیکن اگر ان کا کوئی ایک سردار چاہتا تو جبل البرتات کے پہاڑی سلسلے میں سے اس کانٹے کو بڑی آسانی سے نکال کر پھینک سکتا تھا مگر وہ اس حالت میں بھی عزم وارادہ کرتے تو صوبہ اربونیہ سے آگے ملک فرانس کی فتح کا ارادہ کرتے تھے۔ درمیان کے اس عیسائی کوہی جتھے کو قابل التفات ہی نہیں جانتے تھے، جس میں مذہبی تعصب کے دریا موج زن تھے

اور جس کو عیسائیوں کے پادریوں نے مسلمانوں کی نفرت سے مخمور و مدہوش بنانے میں انتہائی جوش و سرگرمی سے کام لیا تھا۔ اس طرح اندلس کے دور امارت میں اندلس کے شمالی کو ہی سلسلہ میں عیسائیوں کی ایک خود مختار ریاست کی بنیاد قائم ہوگئی، جس کا دارالحکومت ایسٹریاس تھا۔ اس عیسائی ریاست کو نہ تو فرانس کی عیسائی سلطنت سے کوئی تعلق تھا، نہ اٹلی کے پوپ سے مگر اس کا مذہبی تعصب سب سے بڑھا ہوا تھا اور آئین حکمرانی پادریوں کے ہاتھ میں اور پادریوں کا مرتب کردہ تھا۔ سنہ ۱۳۸ھ میں عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس میں داخل ہو کر اندلس کے دور امارت کا خاتمہ کیا اور اسی سال ریاست ایسٹریاس کا حاکم الفانسو اول فوت ہوا۔

آٹھواں باب

خلفائے اندلس

عبدالرحمٰن بن معاویہ اموی

عادات وخصائل:

عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام بن عبدالملک بن مروان بن حکم سنہ ۱۱۳ھ میں پیدا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن کا باپ معاویہ عین عالم جوانی میں بہ عمر ۲۱ سال سنہ ۱۱۸ھ میں، جبکہ عبدالرحمٰن کی عمر پانچ سال کی تھی، فوت ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں عبدالرحمٰن کا دادا ہشام بن عبدالملک تخت خلافت پر متمکن تھا۔ خلیفہ ہشام نے اپنے اس پوتے کی تعلیم وتربیت کی جانب خصوصی توجہ مبذول رکھی۔ ہشام بن عبدالملک کا ارادہ تھا کہ میں عبدالرحمٰن بن معاویہ کو اپنا ولی عہد بناؤں گا۔ اسی لیے وہ چاہتا تھا کہ عبدالرحمٰن میں ہر قسم کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ عبدالرحمٰن کی عمر صرف بارہ سال کی ہونے پائی تھی کہ ہشام بن عبدالملک فوت ہوا اور اس کے بعد ہشام بن عبدالملک کا بھتیجا ولید بن یزید تخت خلافت پر بیٹھا۔ عبدالرحمٰن کے اندر ابتدا ہی سے علامات سرداری موجود تھیں۔ وہ عادات بد اور خصائل رذیلہ سے بالکل پاک و بے تعلق رہا۔ علاوہ علوم مروجہ کے درباری اور آئین جہاں بانی سے اس کو پوری واقفیت حاصل تھی۔ علماء اور امرائے سلطنت کی صحبتیں اس کو میسر رہی تھیں۔ جوان ہونے کے بعد فنون سپہ گری اور جنگی قابلیت سے وہ بے بہرہ نہ تھا۔ بری صحبتوں سے اس کو ہمیشہ نفرت اور اخلاق فاضلہ کو حاصل کرنے کا ہمیشہ شوق رہا۔ اراکین سلطنت اور علمائے دمشق اس کی عزت وحرمت کو ملحوظ رکھتے اور اس کو خاندان خلافت میں ایک بہترین شخص تصور کرتے تھے۔

ترک وطن:

سنہ۱۳۲ھ میں جب خلافت بنوامیہ کا خاتمہ ہو کر خلافت عباسیہ شروع ہوئی تو عبدالرحمٰن بن معاویہ کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ دریائے فرات کے کنارے عبدالرحمٰن کی ایک جاگیر تھی۔ جب عباسی لشکر ملک شام میں داخل ہو کر دمشق پر قابض و متصرف ہوا اور بنوامیہ کا قتل عام ہونے لگا تو اس زمانے میں عبدالرحمٰن بن معاویہ دمشق میں موجود نہ تھا بلکہ اپنی جاگیر کے گاؤں میں آیا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن کو جب یہ معلوم ہوا کہ بنوامیہ اور ان کے ہمدردوں کو چن چن کر قتل کیا جا رہا ہے تو وہ احتیاط کی نظر سے گاؤں کے باہر درختوں کے کنج میں خیمہ نصب کر کے رہنے لگا کیونکہ گاؤں پر اگر کوئی آفت آئے تو خطرہ سے واقف ہو کر اپنی جان بچانے کی فکر کر سکے۔

ایک روز وہ اپنے خیمے میں بیٹھا تھا کہ اس کا تین چار سال کا لڑکا جو باہر کھیل رہا تھا، خوف زدہ ہو کر خیمہ کے اندر آیا۔ عبدالرحمٰن اس کے خوف زدہ ہونے کا سبب معلوم کرنے کے لیے خیمے سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ عباسیوں کا سیاہ جھنڈا ہوا میں لہرا رہا ہے اور اس کی جانب آ رہا ہے۔ تمام گاؤں میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ یہ دیکھ کر کہ عباسی لشکر بنوامیہ کو قتل کرنے کو پہنچ گیا ہے، وہ اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا کر دریا کی طرف بھاگا۔ ابھی وہ دریا تک نہ پہنچنے پایا تھا کہ دشمنوں نے اس کا تعاقب کیا اور چلا چلا کر کہنے لگے کہ تم بھاگو مت! ہم تم کو کوئی آزار نہ پہنچائیں گے اور ہر طرح سے تمہاری امداد واعانت بجا لائیں گے۔ عبدالرحمٰن کے پیچھے پیچھے اس کا بھائی بھی تھا۔ عبدالرحمٰن نے دشمنوں کی ان باتوں کی جانب مطلق التفات نہ کی اور دریا کے کنارے پہنچتے ہی دریا میں کود پڑا۔ عبدالرحمٰن کا بھائی تشفی آمیز باتوں سے فریب کھا کر دریا کے کنارے کھڑا ہو کر اور رک کر کچھ سوچنے اور پیچھے کو دیکھنے لگا۔ دشمنوں نے فوراً پہنچتے ہی اس کا سر تلوار سے اڑا دیا۔ عبدالرحمٰن نے مطلق پس و پیش نہ کیا اور دریا میں تیرتا ہوا اپنے بیٹے کو چھاتی سے لگائے ہوئے دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ دشمنوں نے دریا میں تیرنے کی جرأت نہ کی بلکہ اسی کنارے پر کھڑے ہوئے تماشا دیکھتے رہے۔

عبدالرحمٰن افریقہ میں:

عبدالرحمٰن یہاں سے چھپتا چھپاتا چل کھڑا ہوا۔ کبھی کسی گاؤں میں مسافر بن کر ٹھہر جاتا، کبھی جنگل میں کسی درخت کے نیچے پڑا رہتا۔ غرض بھیس بدلے اور بیٹے کو لیے ہوئے بڑی بڑی منزلیں

طے کرتا ہوا فلسطین کے علاقہ میں پہنچ گیا۔ وہاں اس کو اتفاقاً اس کے باپ کا غلام بدر نامی مل گیا۔ وہ بھی اسی حالت میں اپنی جان بچاتا اور چھپتا ہوا مصر کی طرف جا رہا تھا۔ بدر کے پاس عبدالرحمٰن کی ہمشیرہ کے کچھ زیورات اور روپیہ بھی تھا جو اس نے عبدالرحمٰن کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس طرح عبدالرحمٰن کی عسرت اور خرچ کی تکلیف رفع ہو گئی۔ اب اس نے اپنا بھیس بدل کر اور معمولی سوداگروں کی حالت بنا کر بدر کی معیت میں سفر شروع کیا۔ مصر میں پہنچ کر بنوامیہ کے ہمدردوں سے ملاقات کی۔ یہاں کے چندروزہ قیام کے بعد افریقہ کا قصد کیا۔

عبدالرحمٰن کا افریقہ میں اپنی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ اور فراری:

گورنر افریقہ کو عبدالرحمٰن کی آمد کا حال معلوم ہوا تو وہ عزت و محبت کے ساتھ پیش آیا لیکن اس کو چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن افریقہ میں اپنی حکومت کرنے کی فکر میں مصروف ہے۔ ادھر اس نے عباسیوں کی خلافت کے مستحکم ہو جانے کا حال سنا اور عبدالرحمٰن کو گرفتار کر کے عباسی خلیفہ سفاح کے پاس بھیج دینے کا ارادہ کیا۔ عبدالرحمٰن کو عین وقت پر اس کی اطلاع ہو گئی اور وہ اپنے غلام بدر اور اپنے بیٹے کو لے کر فوراً روپوش اور پھر وہاں سے فرار ہوا۔ گورنر افریقہ نے عبدالرحمٰن کی گرفتاری کے لیے ایک گراں سنگ انعام مشتہر کیا۔ جابجا عبدالرحمٰن کی تلاش شروع ہو گئی۔ لہٰذا عبدالرحمٰن کو اپنی جان بچانے کے لیے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ وہ کئی کئی روز تک بھوکا رہا۔ صحرا کے گوشوں میں ہفتوں اور مہینوں روپوش رہنا پڑا۔

ایک مرتبہ عبدالرحمٰن نے کسی بربری عورت کی کٹی میں پناہ لی اور گرفتار کرنے والے متلاشی پہنچے تو بوڑھی عورت نے ایک کونے میں عبدالرحمٰن کو بٹھا کر اس کے اوپر اپنے بہت سے کپڑے ڈال دیے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کونے میں پرانے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اس طرح متلاشی لوگ دیکھ بھال کر چلے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا دستیاب ہونا دشوار ہو گیا۔ غرض اسی پریشانی اور تباہ حالی میں چار پانچ سال تک عبدالرحمٰن افریقہ میں رہا۔ آخر وہ بربری قوم کے قبیلہ زنانہ کی ایک شاخ بنونفوسہ میں پہنچا۔ ان لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن کی ماں ہمارے ہی قبیلہ کی ایک عورت تھی تو انہوں نے عبدالرحمٰن کو مثل اپنے رشتہ داروں اور بھائیوں کے اپنے یہاں مہمان رکھا اور اس کو اطمینان دلایا کہ ہم تمہاری ہر طرح سے اعانت و حفاظت کے لیے

تیار ہیں۔عبدالرحمٰن نے سبطہ میں جہاں قبیلہ بنونفوسہ کی آبادی زیادہ تھی،قیام کیا۔اس چار پانچ سال کے تجربہ سے عبدالرحمٰن کومعلوم ہوگیا تھا کہ گورنر افریقہ سے ملک افریقہ کا چھیننا اور یہاں کوئی حکومت قائم کرنا آسان کام نہیں۔سبطہ میں آ کر اس کو اندلس کے حالات سے زیادہ واقفیت حاصل ہوئی کیونکہ یہ مقام جزیرہ نمائے اندلس سے بہت ہی قریب اور قوی تعلق رکھتا تھا۔جب عبدالرحمٰن کو یہ معلوم ہوا کہ اندلس میں بدامنی اور خانہ جنگی موجود ہے اور وہاں کا حاکم یوسف باغیوں کی سرکوبی میں مصروف اور پریشان ہے تو اس کی اولوالعزم طبیعت اور ہمت بلند میں ایک تحریک پیدا ہوئی۔اس نے فوراً اپنے غلام بدر کو اندلس روانہ کیا اور ان لوگوں کے نام جو خلافت بنوامیہ میں سرداری اور عزت کا مرتبہ رکھتے اور بنوامیہ کے ہمدرد تھے،خطوط لکھے۔

عبدالرحمٰن اندلس میں:

عبدالرحمٰن کے اندلس پہنچتے ہی ہواخواہان بنوامیہ اور اہل شام سن سن کر دوڑے اور عبدالرحمٰن کی اطاعت وفرماں برداری کے حلف اٹھائے۔اس کے بعد اردگرد کے شہروں اور قصبوں پر قبضہ شروع ہوا۔موسم برسات کے آ جانے کے سبب سے یوسف جلد قرطبہ نہ آ سکا۔اس لیے عبدالرحمٰن کو یوسف کی فیصلہ کن جنگ کے لیے سات مہینے کی مہلت مل گئی۔آخر عیدالاضحیٰ کے روز لڑائی ہوئی اور دارالسلطنت قرطبہ پر عبدالرحمٰن کا قبضہ ہوا۔جب اس لڑائی میں فتح حاصل ہوئی تو یمنی لوگوں کے ایک سردار ابوالصباح نامی نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ یوسف سے ہم بدلہ لے چکے ہیں۔اب موقع ہے کہ اس آدمی نوجوان یعنی عبدالرحمٰن کو قتل کر دو اور بہ جائے اس کے یہاں امویوں کی حکومت قائم ہو،اپنی قوم کی حکومت قائم کرو۔مگر چونکہ عبدالرحمٰن کے لشکر میں شامیوں اور بربریوں کی تعداد کافی تھی،اس لیے علانیہ یمنی لوگ کوئی مخالفت یا بغاوت نہ کر سکے اور خاموش ہو کر خفیہ طور پر عبدالرحمٰن کی ذات پر حملہ کرنے کی تدبیر سوچنے لگے۔اتفاق سے عبدالرحمٰن کو بھی ان لوگوں کے ارادے کا حال معلوم ہوگیا۔اس نے صرف یہ کیا کہ اپنا ایک باڈی گارڈ یعنی محافظ دستہ قائم کر لیا اور بہ ظاہر چشم پوشی اور درگزر سے کام لیا اور چند مہینے کے بعد ابوالصباح کو اس کی غلطی کی سزا میں قتل کرا دیا۔

عبدالرحمٰن کے عہدیدار:

عبدالرحمٰن بن امیہ چونکہ نوعمر اور اس ملک میں ایک اجنبی شخص تھا، لہٰذا یہاں کے امراء، یہاں کے عمال، یہاں کی رعایا، یہاں کے قبائل اور ان کی خصوصیات سے اس کو پوری پوری واقفیت اور آ گاہی حاصل نہ تھی۔ عبدالرحمٰن کی حکومت کے شروع ہوتے ہی حکومت و سرداری کے عہدوں پر جو لوگ مقرر و مامور ہوئے، ان میں بعض ایسے بھی تھے جو اہل اندلس کی ناراضی کا باعث ہوئے۔ بعض ایسے اشخاص تھے جن کو توقع تھی کہ ہم کو بڑے بڑے عہدے ملیں گے لیکن ان کو ان کی توقع کے موافق وہ عہدے نہیں ملے۔ اس طرح ایک بڑی تعداد ملک میں ایسی پیدا ہو گئی جو عبدالرحمٰن کی حکومت سے بھی کبیدہ خاطر اور ملول ہوئی۔ علاوہ ازیں یوسف فہری سابق امیر اندلس اور ضمیل بن حاتم کے دوست احباب اور متعلقین تو ناخوش تھے ہی۔

بغاوتیں:

عبدالرحمٰن بن معاویہ اگرچہ کسی گروہ اور کسی فریق سے خصوصی تعلق نہ رکھتا تھا اور وہ سب سے یکساں برتاؤ کرنا چاہتا تھا مگر جو پہلے سے اندلس میں رونما تھے، ان کا یہ اثر ہوا کہ عبدالرحمٰن کو اپنی حکومت کے شروع میں بغاوتوں اور سرکشیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یوسف فہری امیر اندلس معاہدہ کے موافق قرطبہ میں مقیم یا یوں کہیے کہ نظر بند تھا۔ قرطبہ پر قابض ہونے کے بعد عبدالرحمٰن کو دو سال تک ملک کے صوبوں پر تسلط قائم کرنے اور سرکشوں کو اطاعت پر مجبور کرنے پر صرف کرنے پڑے۔ اسی دوران میں عبدالرحمٰن کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے ہم قوموں کو جہاں کہیں وہ بنو عباس کی تلوار سے بچ گئے ہوں، اپنے پاس بلوائے اور بربریوں کی ایک فوج مرتب کرے، جن سے اس کو حمایت و ہمدردی کی توقع تھی۔ خاندان بنوامیہ کا ایک شخص عبدالملک بن عمر بن مروان بن حکم اور اس کا بیٹا عمر بن عبدالملک عباسیوں کی تلوار سے بچے ہوئے ابھی تک مصر میں موجود تھے۔ انہوں نے جب اندلس پر قبضہ کا حال سنا تو مصر سے روانہ ہوئے اور بنوامیہ کے دس اور آدمی بھی جو ادھر ادھر چھپے ہوئے تھے، ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس طرح بارہ آدمیوں کا یہ قافلہ اندلس میں عبدالرحمٰن کے پاس پہنچ گیا۔ عبدالرحمٰن اپنے ان رشتہ داروں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ عبدالملک بن عمر کو اشبیلیہ کی اور عمر بن عبدالملک کو موروز کی حکومت پر مامور کیا۔

اس اجنبی ملک میں عبدالرحمٰن بالکل تنہا تھا اور مسلمانان اندلس کے مختلف فرقوں اور گروہوں سے اس کو یہ توقع نہ تھی کہ وہ سب کے سب عباسیوں کی مخالفت پر آمادہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس نے اول اول اپنے آپ کو اسی طرح ایک امیر اندلس کی حیثیت میں رکھا، جیسا کہ اس سے پہلے بھی اندلس کے امیر ہوتے رہے تھے۔ خطبہ میں وہ خلیفہ عباس ہی کا نام لیتا تھا حالانکہ دل سے وہ عباسیوں کا دشمن تھا اور ان کو اپنا دشمن جانتا تھا۔ ان ہم قوم اور ہم قبیلہ بلکہ قریبی رشتہ داروں کو اس نے اپنے لیے بہت ہی غنیمت سمجھا اور ان کو بڑے بڑے عہدے، جو وہ بلا تامل دے سکتا تھا، دیے۔ اندلس کے اندر عبدالرحمٰن کی حکومت قائم ہونے کے بعد ہی بہت سے ایسے لوگ پیدا ہو چکے تھے جو عبدالرحمٰن کی حکومت سے خوش نہ تھے۔ اب جبکہ عبدالرحمٰن نے سنہ ۱۴۱ھ میں عبدالملک اور اس کے بیٹے عمر کو اشبیلیہ وغیرہ کی حکومت عطا کی تو ان لوگوں کو آزادانہ اور پہلے سے زیادہ چہ مگوئیوں کا موقع مل گیا اور غدر و بغاوت کی تحریک جلد جلد نشو ونما پا کر خطرناک صورت اختیار کر گئی۔

یوسف بن عبدالرحمٰن سابق امیر اندلس کا قتل:

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یوسف بن عبدالرحمٰن سابق امیر اندلس کو لوگوں نے ابھارا۔ وہ قرطبہ سے چھپ کر بھاگ نکلا مگر اس کے دونوں بیٹے ابو زید عبدالرحمٰن اور ابوالاسود قرطبہ سے نہ نکل سکے، وہ قرطبہ ہی میں رہ گئے۔ ضمیل بن حاتم، یوسف بن عبدالرحمٰن فہری کا وزیر بھی قرطبہ سے نہ نکل سکا۔ یہ تینوں نظر بند اور قید کر لیے گئے۔ یوسف فہری قرطبہ سے بھاگ کر طیطلہ پہنچا۔ قرارداد کے موافق ہر طرف سے لوگ آ آ کر اس کے گرد جمع ہونے شروع ہوئے اور بہت جلد بیس ہزار آدمیوں کا لشکر اس کے جھنڈے کے نیچے طیطلہ میں مرتب ہو گیا۔ یوسف بن عبدالرحمٰن اس لشکر کو لے کر اشبیلیہ پر حملہ آور ہوا اور عبدالملک بن عمر کا محاصرہ کر لیا۔ عبدالملک مدافعت پر آمادہ ہو گیا۔ یوسف نے اشبیلیہ کی فتح میں زیادہ وقت صرف کرنا مناسب نہ سمجھ کر محاصرہ اٹھا لیا اور قرطبہ کی جانب روانہ ہوا۔ ادھر عبدالملک کا بیٹا عمر اپنے باپ کے محصور ہونے کی خبر سن کر اشبیلیہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ دونوں باپ بیٹوں نے مل کر یوسف بن عبدالرحمٰن کی فوج کا تعاقب کیا۔ ادھر امیر عبدالرحمٰن کو جب یہ معلوم ہوا کہ یوسف بیس ہزار فوج لیے ہوئے قرطبہ کی جانب آ رہا ہے تو وہ قرطبہ سے نکل کر خود یوسف کی طرف بڑھا۔ راستے میں مقابلہ ہوا۔ سامنے سے عبدالرحمٰن نے حملہ کیا۔ پیچھے سے عبدالملک

اور عمر آ گئے۔ یوسف کی فوج کے بہت سے آدمی مارے گئے اور یوسف شکست کھا کر بے سروسامانی کے ساتھ طیطلہ کی جانب بھاگا۔ طیطلہ کے قریب پہنچا تھا کہ اس کی فوج کے یمنی لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اگر یوسف کو ہم قتل کر دیں اور اس کا سر امیر عبدالرحمٰن کے پاس لے جائیں تو وہ اس خدمت کے صلے میں ہم سے خوش ہو جائے گا اور ہماری اس خطا کو کہ ہم نے بغاوت میں شرکت کی ہے، معاف کر دے گا۔ چنانچہ یمنیوں نے یوسف کو طیطلہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا اور اس کا سر لے کر عبدالرحمٰن کی خدمت میں پہنچ گئے۔

یوسف فہری بڑا بہادر اور نامور سپہ سالار تھا۔ وہ اندلس کا امیر رہ چکا تھا۔ اس میں سخاوت ومروت کا مادہ بھی بہت تھا مگر لوگوں کے دھوکہ دینے سے دھوکہ کھا جاتا تھا۔ اس مرتبہ بھی یوسف نے فریب کھایا اور لوگوں کی باتوں میں آ کر اس طرح اپنی جان کو گنوایا۔ اس تلخ تجربہ کے بعد امیر عبدالرحمٰن کے لیے یہ جائز ہو گیا تھا کہ وہ ضمیل بن حاتم اور یوسف کے بیٹوں کو قتل کرا دے۔ چنانچہ ابن حاتم اور ابوزید بن یوسف تو قتل کیے گئے مگر ابوالاسود کو بوجہ اس کے کہ اس کی عمر تھوڑی تھی، قرطبہ کے متصل ایک پہاڑی قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ فتنہ یوسف کے فرو ہو جانے کے بعد باغیوں اور سرکشوں کی ہمتیں پست ہو گئیں اور بہ ظاہر امیر عبدالرحمٰن کا تسلط پورے طور پر قائم ہو گیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے فہری خاندان کے سرکشوں کی لاشوں کو جو اس بغاوت میں مقتول ہوئے تھے، لوگوں کو عبرت دلانے کے لیے قرطبہ کے باہر صلیب پر لٹکوا دیا تھا۔ بہ ظاہر لوگوں پر ہیبت طاری ہوئی لیکن اندر ہی اندر فہریوں کی ہمدردی کا جذبہ بھی ترقی کرتا رہا۔

ابوالاسود بن یوسف فہری جو قرطبہ کے باہر ایک قلعہ میں قید تھا، اس نے ایک عرصہ کے بعد اپنے آپ کو نابینا ظاہر کیا اور کہا کہ میری بصارت جاتی رہی ہے۔ محافظوں نے اس کو اندھا سمجھ کر نگرانی میں احتیاط برتنی شروع کر دی۔ وہ صبح کو قلعہ سے باہر ندی کے کنارے پیشاب پاخانے کے لیے لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا جاتا اور وہاں سے فارغ ہو کر کہتا کہ اللہ کا کوئی بندہ اندھے کو راستہ بتا دے اور قلعہ تک پہنچا دے۔ اسی وقت اس طرف فوج کے بہت سے سپاہی بھی حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کے لیے جایا کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی شخص اس مصنوعی اندھے کا ہاتھ پکڑ کر قلعہ کے دروازے تک پہنچا دیا کرتا تھا۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی نگرانی کرنے والے بالکل بے فکر اور مطمئن ہو گئے کہ یہ کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتا۔ ابوالاسود کے پاس اس کا ایک غلام ندی کے

کنارے آنے لگا۔ اس کی معرفت ابوالاسود نے اپنے ہمدردوں کو سلام و پیام بھیجنے شروع کر دیے اور ایک روز گھوڑے کی ڈاک بٹھا کر سنہ ۱۶۴ھ میں اس قید سے آزاد ہو کر نکل بھاگا۔ اس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

اندرونی انتظام:

یوسف فہری سے فارغ ہو کر امیر عبدالرحمٰن نے ملک کے اندرونی انتظام کی طرف توجہ کی اور ہر قسم کی شاہانہ علامات فراہم کرنے کے بعد سنہ ۱۴۶ھ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے عباسی خلیفہ کا نام خطبہ سے خارج کر دیا۔ عباسیوں کی خلافت مشرق میں ابھی نئی نئی قائم ہوئی تھی اور ابھی تک مشرق کے جھگڑوں اور فتنوں سے پورے طور پر فارغ و مطمئن نہ ہوئے تھے۔ اس لیے عبدالرحمٰن کے اندلس پر قابض و متصرف ہونے کا حال سن کر وہ رنجیدہ تو ضرور ہوئے لیکن اس قدر دور دراز علاقہ میں وہ کوئی مہم نہیں بھیج سکے اور یہ سمجھ کر کہ عبدالرحمٰن کو اندلس سے بے دخل کرنا آسان کام نہیں ہے، اسی کو غنیمت سمجھتے رہے کہ ہمارے نام کا خطبہ وہاں پڑھا جاتا ہے۔

عباسی حکومت کا عبدالرحمٰن کے خلاف اقدام:

اب جبکہ یہ معلوم ہوا کہ امیر عبدالرحمٰن نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے خطبہ سے خلیفہ کا نام خارج کر دیا ہے تو عباسی خلیفہ منصور کو سخت صدمہ ہوا۔ اس نے علاء بن مغیث یحصبی سپہ سالار افریقہ کو ایک خط لکھا اور ایک سیاہ جھنڈا بھی اس کے پاس بھیجا کہ وہ فوج لے کر اندلس پر چڑھائی کرے۔ چنانچہ علاء بن مغیث نے افریقہ سے اندلس کا قصد کیا۔ ادھر اندلس میں یوسف بن عبدالرحمٰن فہری کا ایک رشتہ دار ہاشم بن عبدربہ فہری جو شہر طیطلہ کا رئیس سمجھا جاتا تھا، فہریوں کی اس تباہی سے بے حد افسردہ خاطر تھا۔ اس نے بہت سے بربریوں کو جو اس کے قریب آباد تھے، لالچ دے کر اپنے ساتھ شریک کر لیا اور وہ لوگ جو فہریوں کی عبرتناک تباہی سے زیادہ متاثر تھے، خود آ کر ہاشم کے پاس جمع ہونے لگے۔

ہاشم الفہری نے علاء بن مغیث کے پاس افریقہ میں پیغام بھیجا کہ آپ فوراً اندلس پر حملہ کریں، ادھر ہم پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ پر نکلتے ہیں۔ اس پیغام نے علاء بن مغیث کے حوصلے اور بھی بلند کر دیے۔ عبدالرحمٰن افریقہ کی جانب سے ہونے والے حملہ کی مطلق اطلاع نہ رکھتا تھا۔

سنہ ۱۴۶ھ میں ہاشم نے علم بغاوت بلند کیا اور شمالی اندلس پر قابض و متصرف ہو گیا۔ طیطلہ کو خوب مضبوط کر لیا۔ امیر عبدالرحمٰن قرطبہ سے فوج لے کر اس بغاوت کے فرو کرنے کو روانہ ہوا اور جا گیر طیطلہ کا محاصرہ کر لیا۔ طیطلہ کے باغیوں نے خوب مستعدی سے مقابلہ کیا۔ اس محاصرہ نے کئی مہینے تک طول کھینچا اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ادھر علاء بن مغیث اپنی فوجوں کو لے کر براہ دریا علاقہ باجہ میں آ اترا۔ اس کے پاس خلیفہ منصور عباسی کا بھیجا ہوا سیاہ جھنڈا اور فرمان موجود تھا۔

رعایائے اندلس علاء بن مغیث کو خلیفۃ المسلمین کا قائم مقام سمجھ کر اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے اور عبدالرحمٰن کو باغی سمجھنے لگے۔ امیر عبدالرحمٰن نے جب یہ خبر سنی تو سخت پریشان ہوا۔ یہ نہایت ہی نازک موقع تھا کیونکہ شمالی اندلس کے باغی ابھی تک قابو میں نہ آئے تھے کہ جنوبی اندلس میں ایک ایسا طاقتور دشمن داخل ہو گیا اور رعایا اس کی طرف متوجہ ہونے لگی۔ امیر عبدالرحمٰن نے طیطلہ سے محاصرہ اٹھایا اور نو وارد دشمن کی طرف متوجہ ہوا۔ اشبیلیہ کے قریب مقام قرمونہ میں پہنچا تھا کہ علاء بن مغیث اپنی افواج جرار لیے ہوئے مقابلہ پر آ پہنچا۔ علاء کے قریب پہنچنے پر خود عبدالرحمٰن کی فوج کے بہت سے آدمی علاء بن مغیث کی فوج میں جا کر شامل ہو گئے۔ ادھر باغیان طیطلہ نے محاصرہ سے آزاد ہوتے ہی علاء بن مغیث کی فوج میں شامل ہونے کے لیے ایک حصہ فوج بھیج دی اور اس طرح اپنی ہوا خواہی کا یقین دلایا۔ عبدالرحمٰن کو مجبوراً قلعہ قرمونہ میں محصور ہونا پڑا۔

عبدالرحمٰن کا جرأت مندانہ اقدام:

علاء بن مغیث نے قرمونہ کا محاصرہ کر لیا اور اپنی فوج کے دستوں کو لوٹ مار کے لیے ادھر ادھر بھیجنا شروع کر دیا۔ اندلس کے بربری اور دوسرے لوگ یہ رنگ دیکھ کر لوٹ مار پر جا بجا پل پڑے۔ تمام ملک اندلس میں قتل و غارت اور بدامنی کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ امیر عبدالرحمٰن دو مہینے تک قلعہ قرمونہ میں محصور رہا۔ سامان رسد کے ختم ہو جانے سے لوگ بھوک کے مارے مرنے لگے اور کشودکار کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ اس حالت یاس و ناامیدی میں امیر عبدالرحمٰن نے اپنے ہمراہیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم لوگ بہ جائے اس کے کہ بھوک کی شدت سے مریں یا دشمنوں کے ہاتھ میں زندہ گرفتار ہوں، لڑ کر مر جائیں اور ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیں۔ چنانچہ اسی وقت آگ کا ایک بڑا الاؤ روشن کر کے سات سو آدمیوں نے اپنی تلواروں کے

میان اس میں ڈال کر جلا دیے، جو اس بات کی علامت تھی کہ دشمن سے لڑتے لڑتے مر جائیں گے یا فتح حاصل کریں گے۔ اس کے بعد قلعہ کا دروازہ کھول کر یکا یک دشمن پر جا پڑے۔ محاصر فوج دو مہینے سے قلعہ کو گھیرے ہوئے پڑی تھی۔ اس کو یہ معلوم تھا کہ محصورین کی تعداد بہت قلیل ہے، اس لیے وہ غافل اور بے فکر تھی۔ یکا یک ان سات سو بھوکے شیروں نے نکل کر اس طرح قتل کا بازار گرم کیا کہ محاصر دشمن اپنی سات ہزار لاشیں قلعہ کے سامنے چھوڑ کر میدان خالی کر گئے اور ذرا سی دیر میں ملک اندلس کی سلطنت جو امیر عبدالرحمٰن کے قبضہ سے نکل چکی تھی، پھر اس کے قبضہ میں آ گئی۔

عجیب قسم کی دل لگی:

اس موقعہ پر امیر عبدالرحمٰن نے منصور عباسی کے ساتھ عجیب قسم کی دل لگی کی یعنی علاء بن مغیث اور لشکر عباسی کے تمام بڑے سرداروں کے سر کاٹ کر ہر ایک کان میں سوراخ کر کے ایک ایک پرچہ باندھ دیا جس میں اس سردار کا نام مع عہدہ درج تھا، پھر ان سروں کو صندوقوں میں بڑی احتیاط کے ساتھ بند کرا کر حاجیوں کے قافلوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اس طرح یہ صندوق مکہ مکرمہ پہنچے اور وہاں سے ایک حجازی نے ان کو خلیفہ منصور کی خدمت میں پیش کر دیا۔ خلیفہ منصور نے جب ان صندوقوں کو کھولا تو جس صندوق میں علاء بن مغیث کا سر تھا، اسی میں وہ خط بھی تھا جو منصور نے علاء بن مغیث کے نام اندلس پر حملہ کرنے کے لیے لکھا تھا۔ ساتھ ہی اس سیاہ علم کے پرزے اور دھجیاں بھی تھیں جو منصور نے ابن مغیث کے پاس بھیجا تھا۔ منصور نے ان سروں کو دیکھا اور صرف یہ کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ میرے اور عبدالرحمٰن کے درمیان سمندر حائل ہے۔ پھر ایک روز کہا کہ مجھ کو عبدالرحمٰن کی جرأت، دانائی اور حسن تدبیر پر حیرت ہے کہ اس نے کس بے سروسامانی کے عالم میں اتنے دور دراز اور دشوار گزار ملک میں جا کر اپنی حکومت وسلطنت قائم کی۔ جنگ قرمونہ سنہ ۱۴۶ھ کے آخری حصہ میں ہوئی۔

باغیوں کا استیصال:

فتح قرمونہ کے بعد امیر عبدالرحمٰن نے اپنے خادم بدر اور تمام بن علقمہ کو فوج دے کر طیطلہ کی جانب آیا۔ ایک سخت اور خون ریز جنگ کے بعد بدر اور تمام کو باغیان طیطلہ پر فتح مبین حاصل ہوئی۔ ہشام بن عبدربہ فہری، حیوۃ بن ولید یحصبی، عثمان بن حمزہ بن عبیداللہ بن عمر بن خطاب وغیرہ

باغیوں کے بڑے بڑے سردار گرفتار ہوئے۔ ان سرداروں کو لے کر جب بدر اور تمام لوگ قرطبہ کے قریب پہنچے تو شہر سے باہر ہی ان باغی سرداروں کو سر و ریش مونڈ کر[1] اور ذلت کے ساتھ گدھوں پر سوار کرا کر شہر کے اندر لے گئے، جہاں امیر عبدالرحمٰن کے حکم سے ان کو قتل کر دیا گیا۔

علاء بن مغیث کے ساتھ بہت سے یمنی قبائل شامل ہو گئے تھے اور ان میں سے اکثر آدمی جنگ قرمونہ میں عبدالرحمٰن اور اس کے ہمراہیوں کے ہاتھ سے مقتول ہوئے۔ یمنی لوگوں کو اپنے ان مقتولین کا قصاص لینے کی خواہش تھی۔ چنانچہ اسی سال یعنی سنہ ۱۴۷ھ میں سعید تحصبی نے جو مطری کے نام سے مشہور تھا، خروج کیا اور شہر لبلہ میں فوجیں فراہم کر کے اشبیلیہ پر قابض و متصرف ہو گیا۔ امیر عبدالرحمٰن یہ خبر پا کر قرطبہ سے فوج لے کر مطری کی سرکوبی کے لیے اشبیلیہ کی جانب روانہ ہوا۔ مطری نے اشبیلیہ کے ایک قلعہ میں بند ہو کر مدافعت شروع کی اور عبدالرحمٰن نے اشبیلیہ کا محاصرہ کر لیا۔ عتاب بن علقمی شہر شدونہ میں تھا۔ وہ مطری کے ساتھ اس بغاوت میں شرکت کا وعدہ کر چکا تھا۔ چنانچہ مطری کے محصور ہونے کی خبر سن کر عتاب بن علقمی شدونہ سے فوج لے کر روانہ ہوا۔

امیر عبدالرحمٰن نے یہ خبر سن کر اپنے خادم بدر کو ایک حصہ فوج دے کر روانہ کیا کہ عتاب کو مطری تک نہ پہنچنے دیا جائے اور دونوں کے درمیان خود حائل رہے۔ ادھر سعید معروف بہ مطری مارا گیا۔ اہل قلعہ نے ایک شخص خلیفہ بن مروان کو اپنا سردار بنا لیا مگر آخر مجبور ہو کر امن کی درخواست دی۔ عبدالرحمٰن نے اس درخواست کو منظور کر کے قلعہ کو مسمار کرا دیا اور خود قرطبہ کی جانب واپس آیا۔ اس کے بعد ہی علاقہ جیان میں عبداللہ بن خراشہ اسدی نے علم بغاوت بلند کیا اور امیر عبدالرحمٰن کے مقابلہ کے لیے فوجیں جمع کیں۔ امیر عبدالرحمٰن نے فوراً ایک فوج اس طرف روانہ کی۔ عبداللہ کے ہمراہیوں نے یہ سن کر کہ عبدالرحمٰن کی فوج آ رہی ہے، عبداللہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ عبداللہ اسدی نے امیر عبدالرحمٰن سے معافی کی درخواست کی۔ امیر نے اس کو معافی دے دی۔ ۱۵۰ھ میں غیاث بن میر اسدی نے علم بغاوت بلند کیا۔ ولایت باجہ کے عامل نے فوجیں فراہم کر کے اس کا مقابلہ کیا۔ معرکہ کارزار میں غیاث مارا گیا۔ اس کی فوج شکست کھا کر منتشر ہو گئی۔ عامل باجہ نے غیاث کا سر

---

[1] قرآن و سنت اور خلفائے راشدین کی سیرت سے ایسا کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا کہ باغیوں یا دیگر مجرموں کو سزا دیتے ہوئے دیگر سزاؤں کے ساتھ ان کی داڑھی بھی مونڈ دی جائے۔ اس لیے اگر یہ واقعہ درست ہے تو امیر عبدالرحمٰن کا باغیوں کی داڑھیوں کو مونڈ دینے کا فعل غلط ہے۔

کاٹ کر بشارت نامہ کے ساتھ عبدالرحمٰن کی خدمت میں بھیج دیا۔ اسی سال یعنی سنہ ۱۵۰ھ میں امیر عبدالرحمٰن نے شہر قرطبہ کی شہر پناہ کا سنگ بنیاد رکھا۔

سنہ ۱۵۱ھ میں ایک شخص شقنہ بن عبدالواحد نے جو بربر کے قبیلہ مکناسہ سے تعلق رکھتا تھا اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے معلّمی کا پیشہ کرتا تھا، یہ دعویٰ کیا کہ میں حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی اولاد سے ہوں اور میرا نام عبداللہ بن محمد ہے۔ اس شخص کو عباسیوں کی سازشی کارروائیوں اور کامیابیوں کا علم تھا۔ نیز علویوں کے دعاۃ مکناسہ اور علاقہ بربر میں آتے رہتے تھے جن کا اس کو علم تھا۔ لہٰذا اس نے اندلس کی حکومت کو درہم برہم کرنے کی جرأت و جسارت کی۔ اس کی اولوالعزمی کچھ زیادہ عجیب نہ تھی کیونکہ بہت جلد بربریوں کی ضعیف الاعتقاد قوم اس کے گرد جمع ہوگئی۔ بربریوں کے علاوہ بعض اور لوگ بھی اس کے معتقد ہو گئے۔ ابن الواحد نے اپنی کرامت اور خرق عادات باتوں کا بھی ان لوگوں کو یقین دلا دیا۔ جب اس کے معتقدین کا ایک مجمع کثیر فراہم ہوگیا تو اس نے علم بغاوت بلند کیا اور اندلس کے مشرقی صوبہ بلنسیہ کے مقام شیطران پر قابض و متصرف ہوگیا۔ امیر عبدالرحمٰن یہ خبر سن کر اس کی سرکوبی کے لیے قرطبہ سے روانہ ہوا۔

ابن عبدالواحد، امیر عبدالرحمٰن کی آمد کا حال سن کر اپنی جماعت کے ساتھ پہاڑوں میں جا چھپا اور مقابلہ نہیں کیا۔ امیر عبدالرحمٰن قرطبہ کی جانب واپس آ گیا۔ طیطلہ کی حکومت پر حبیب بن عبدالملک کو مامور کر کے ابن الواحد کی سرکوبی کی ہدایت کی۔ حبیب بن عبدالملک نے اپنی طرف سے سلیمان بن عثمان بن مروان بن عثمان بن ابان بن عثمان بن عفان کو ابن الواحد کی گرفتاری وسزادہی پر مامور کیا۔ سلیمان فوج لے کر ابن عبدالواحد کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ ابن عبدالواحد نے مقابلہ کیا اور سلیمان کو گرفتار کر کے قتل کر ڈالا اور اطراف قوریہ پر قابض و متصرف ہوگیا۔

یہ حالت سن کر سنہ ۱۵۲ھ میں امیر عبدالرحمٰن نے قرطبہ سے کوچ کیا۔ ابن عبدالواحد امیر کی خبر سن کر فوراً پہاڑوں میں بھاگ گیا اور امیر عبدالرحمٰن پریشان ہوکر پھر واپس چلا آیا۔

سنہ ۱۵۳ھ میں امیر عبدالرحمٰن نے اپنے خادم بدر کو ایک فوج دے کر روانہ کیا اور بدر جب قلعہ شیطران کے قریب پہنچا تو ابن عبدالواحد شیطران کو خالی چھوڑ کر پہاڑوں میں چلا گیا۔ سنہ ۱۵۴ھ میں پھر امیر عبدالرحمٰن خود گیا مگر حسب سابق شقنہ بن عبدالواحد ہاتھ نہ آیا۔

سنہ ۱۵۵ھ میں امیر عبدالرحمٰن ابوعثمان عبیداللہ بن عثمان کو ایک زبردست فوج دے کر روانہ کیا

لیکن اس مرتبہ بھی کوئی نتیجہ حسب مراد پیدا نہ ہوا بلکہ ابن الواحد نے ابوعثمان کی فوج کے ایک بڑے حصہ کو دھوکہ دے کر قتل کر ڈالا اور کئی شہروں کو لوٹ لیا مجبور ہو کر امیر عبدالرحمٰن سنہ ۱۵۶ھ میں پھر قرطبہ سے خود ہی فوج لے کر روانہ ہوا اور قرطبہ میں اپنے بیٹے سلیمان کو اپنا حاکم بنا گیا۔ جب قلعہ شیطران کے قریب پہنچا تو خبر پہنچی کہ یمنی قبائل اور اہل اشبیلیہ نے علم بغاوت بلند کر دیا ہے۔ مجبوراً امیر عبدالرحمٰن شیطران اور ابن عبدالواحد کو ان کے حال پر چھوڑ کر اشبیلیہ کی طرف متوجہ ہوا اور عبدالملک بن عمر کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر اشبیلیہ پر حملہ کرے۔

عبدالملک نے اشبیلیہ کے قریب پہنچ کر اپنے بیٹے امیہ بن عبدالملک کو اہل اشبیلیہ پر شب خون مارنے کے لیے بہ طور ہراول آگے روانہ کیا۔ امیہ نے اہل اشبیلیہ کو ہوشیار پا کر حملہ نہ کیا اور باپ کے پاس واپس آیا۔ عبدالملک نے واپسی کی وجہ پوچھی تو امیہ نے کہا کہ اہل اشبیلیہ ہوشیار تھے اور حملہ کرنے کا موقع نہ تھا۔ عبدالملک نے کہا کہ تو نے موت سے ڈر کر حملہ نہیں کیا۔ تو بڑا بزدل ہے، میں بزدل کو محبوب نہیں رکھتا۔ یہ کہہ کر اس نے اسی وقت اپنے بیٹے امیہ کی گردن اڑا دی اور اپنے ہمراہیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ تم جانتے ہو کہ ہم لوگ کس طرح قتل کیے گئے اور اپنے وطن سے بے وطن ہوئے۔ اتفاق سے اس قدر دور دراز فاصلہ پر زمین کا ایک ٹکڑا یعنی ملک اندلس ہاتھ آیا ہے جو بہ مشکل ہماری گزران کے لیے کافی ہے۔ بزدلی کے ساتھ اس کو بھی ہاتھ سے دینا اور ضائع کرنا کسی طرح شایان شان نہیں۔ مناسب یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو موت پر ترجیح نہ دیں اور بہادری کے ساتھ لڑ کر مارے جائیں۔ سب نے اس کی تائید کی اور مارنے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ اشبیلیہ میں یمنی قبائل کی نہایت زبردست جمعیت اور پوری طاقت فراہم تھی اور یہ ان کی طاقت وقوت کی گویا آخری نمائش تھی۔ لہٰذا اشبیلیہ کو فتح کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ عبدالملک بن عمر نے حملہ کیا اور اس کی فوج نے اس حملہ میں متفقہ طور پر اس کا ساتھ دیا۔ بڑی خون ریز جنگ ہوئی۔ آخر اہل اشبیلیہ کو ہزیمت ہوئی۔ عبدالملک کے جسم پر کئی زخم آئے مگر اس نے دشمنوں کو قتل کرنے میں حیرت انگیز طور پر تیز دستی اور بہادری دکھائی۔ لڑائی کے خاتمہ پر جب عبدالملک نے تلوار ہاتھ سے رکھنی چاہی تو اس کی انگلیاں نہیں کھل سکیں اور تلوار ہاتھ سے نہیں چھوٹی۔ اسی حالت میں امیر عبدالرحمٰن بھی پہنچ گیا۔ اس نے عبدالملک کے ہاتھ میں خون آلود تلوار دیکھ کر اور لڑائی کی روئداد سن کر کہا کہ بھائی عبدالملک! میں اپنے لڑکے ہشام کی شادی آپ کی لڑکی سے کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد امیر

عبدالرحمٰن نے عبدالملک بن عمر کو اپنا وزیر بنا لیا۔

یمنی قبائل یعنی اہل اشبیلیہ کے دو سردار عبدالغفار بن حامد حاکم شہر بنیلہ اور حیوۃ بن فلاقش حاکم اشبیلیہ اور عمرو حاکم بیجہ اس معرکہ سے بچ کر فرار ہو گئے تھے۔ انہوں نے پھر اپنے گرد عربی قبائل کو جمع کیا۔ سنہ ۱۵۷ھ میں امیر عبدالرحمٰن نے ان پر حملہ کیا اور شکست دے کر ان کو اور ان کے ہواخواہوں کو قتل کر ڈالا۔ ان واقعات سے امیر عبدالرحمٰن کو عرب قبائل کی طرف سے بڑی بدگمانی اور بے اعتباری ہو گئی۔ چنانچہ اس نے عجمیوں اور غلاموں کو بھرتی کرنا شروع کر دیا تاکہ ان لوگوں یعنی عرب قبائل کی بغاوتوں اور سرکشیوں سے امن مل سکے۔ یہی مجبوریاں غالباً خلفائے عباسیہ کو بھی پیش آئی ہوں گی جن کی وجہ سے انہوں نے باوجود اس کے کہ وہ خود عرب تھے، عربوں پر دوسری قوتوں کو ترجیح دی اور عربوں کی غداری سے ہمیشہ ڈرتے ہی رہے۔ سنہ ۱۶۰ھ میں عبدالرحمٰن نے ایک لشکر ابن عبدالواحد کی طرف روانہ کیا۔ اس لشکر نے جا کر قلعہ شیطران کا محاصرہ کیا اور ایک مہینے تک محاصرہ کیے رہنے کے بعد بے نیل و مرام واپس آیا۔ آخر سنہ ۱۶۲ھ میں ابن عبدالواحد قلعہ شیطران سے نکل کر علاقہ شنتت بریہ کے ایک گاؤں میں آیا۔ اس کے ہمراہیوں میں سے دو شخص ابومعین اور ابوحریم نے اسے قتل کر ڈالا اور اس کا سر لے کر امیر عبدالرحمٰن کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اس طرح عرصہ دراز کے بعد اس فتنہ کا خاتمہ ہوا۔

ابھی ابن الواحد قتل نہ ہوا تھا کہ سنہ ۱۶۱ھ میں عبدالرحمٰن بن فہری معروف بہ صقلبی نے افریقہ میں فوجیں آراستہ کر کے اندلس پر قبضہ کرنے کے ارادے سے چڑھائی کی اور تدمیر کے میدان میں پہنچ کر قیام کیا۔ یہاں اندلس کے بہت سے بربری آ کر اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ عبدالرحمٰن بن حبیب نے سلیمان بن یقظان والی برشلونہ کے پاس پیغام بھیجا کہ تم خلافت عباسیہ کی اطاعت قبول کر لو ورنہ مجھ کو اپنے سر پر پہنچا ہوا سمجھو۔ سلیمان نے انکار کیا اور عبدالرحمٰن بن حبیب نے سلیمان پر حملہ کیا۔ مقابلہ ہوا اور سلیمان نے عبدالرحمٰن بن حبیب فہری کو شکست دے کر بھگا دیا۔ عبدالرحمٰن بن حبیب نے میدان تدمیر میں آ کر دم لیا۔ امیر عبدالرحمٰن بن معاویہ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ قرطبہ سے فوج لے کر میدان تدمیر کی طرف روانہ ہوا۔ امیر عبدالرحمٰن کے آنے کی خبر سن کر عبدالرحمٰن بن حبیب کوہ بلنسیہ میں جا کر پناہ گزین ہوا۔ امیر عبدالرحمٰن بن معاویہ نے اشتہار دے دیا کہ جو شخص عبدالرحمٰن بن حبیب کا سر کاٹ کر لائے گا، اس کو اس قدر انعام دیا جائے گا۔ اس

انعام کے مشتہر ہوتے ہی ایک بربری کو جو عبدالرحمٰن بن حبیب کے ہمراہیوں میں تھا، نیت بگڑی اس نے موقع پا کر عبدالرحمٰن بن حبیب کا سر کاٹ لیا اور امیر عبدالرحمٰن کی خدمت میں لا کر پیش کیا، پھر انعام وصول کر کے چل دیا۔ اس سنہ ۱۶۲ھ میں عبدالرحمٰن بن حبیب کے مارے جانے پر اس مہم کا خاتمہ ہو گیا اور امیر عبدالرحمٰن قرطبہ کی طرف واپس آیا۔

چند ہی روز کے بعد سنہ ۱۶۳ھ میں دحیہ غسانی نے علاقہ البیرہ کے ایک قلعہ میں جاگزیں ہو کر علم بغاوت بلند کیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے شہید بن عیسیٰ کو اس کی سرکوبی پر مامور کیا۔ شہید بن عیسیٰ نے اس باغی سردار کو شکست دے کر قتل کر ڈالا۔ اس کے چند روز بعد بربریوں نے سر اٹھایا اور ابراہیم بن سجرہ کی سرکردگی میں علم بغاوت بلند کیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے ابراہیم بن سجرہ کی سرکوبی پر بدر کو مامور کیا۔ بدر نے ابراہیم کو قتل کر کے بربریوں کی جمعیت کو منتشر کر دیا۔ انہیں دنوں سلمٰی نامی ایک سپہ سالار نے قرطبہ سے فرار ہو کر طیطلہ کا رخ کیا اور طیطلہ پر قبضہ کر کے علم بغاوت بلند کیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے حبیب بن عبدالملک کو سلمٰی کی سرکوبی پر مامور کیا۔ حبیب نے جا کر طیطلہ کا محاصرہ کیا اور عرصہ دراز تک یہ محاصرہ جاری رہا۔ آخر سلمٰی کا بہ حالت محاصرہ انتقال ہو گیا اور اس کے ہمراہی منتشر ہو گئے۔

بغاوتوں کے اسباب:

اندلس کی ان پیہم اور مسلسل بغاوتوں کا کوئی خاص سبب ہم کو ضرور تلاش کرنا چاہیے، جنہوں نے امیر عبدالرحمٰن کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اندلس میں کچھ اسی قسم کے لوگ جمع ہو گئے تھے اور اندلس کی تمام اسلامی آبادی کا مزاج کچھ ایسا واقع ہوا تھا کہ وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے رقیب تھے اور ساتھ ہی کسی کے زیر حکومت رہنا نہیں چاہتے تھے۔ موجودہ حاکم چونکہ ایک غریب الوطن شخص تھا جس کے خاندان کی حکومت و عظمت مشرق میں تباہ ہو چکی تھی، لہٰذا وہ امیر عبدالرحمٰن کی حکومت کو بھی دیر تک رکھنے کے خلاف تھا۔ یہ تو وہ اسباب ہیں جن کا اس سے پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے اور بالکل پیش پا افتادہ ہیں لیکن ان کے سوا ایک اور سبب خاص بھی ہے اور درحقیقت عبدالرحمٰن کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا اصلی سبب وہی ہے۔ عباسی خلفاء جنہوں نے بغداد کو اپنا دارالخلافہ بنا لیا تھا، امیر عبدالرحمٰن سے فاصلے پر تھے۔ ان کی حدود حکومت اور ملک اندلس کے

درمیان سمندر حائل تھا۔

وہ عبدالرحمٰن کی حکومت اور طاقت کے حالات کو سنتے تھے لیکن دور دراز فاصلے پر اس کا کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے۔ عباسیوں نے دو مرتبہ فوج کشی کی اور ان دونوں مرتبہ ان کے سپہ سالاروں کو موت کے گھاٹ اُترنا اور عباسی مہم کو ذلت کے ساتھ ناکام رہنا نصیب ہوا۔ علویوں کی سازش اور ممالک مشرقیہ کی پیچیدگیوں نے ان کو فوجی مہم کا اور زیادہ تجربہ کرنے کا موقع نہیں دیا اور اس معاملہ میں ان کی ہمت پست ہوگئی لیکن انہوں نے عبدالرحمٰن بن معاویہ کی مخالفت میں اسی سازش طریقہ کو استعمال کیا جس کو وہ بنوامیہ کی بربادی اور خلافت دمشق کا تختہ الٹنے میں استعمال کر چکے تھے۔ انہوں نے خفیہ ریشہ دوانیوں کے ذریعہ سے ملک اندلس کے عرب قبائل اور غدارانہ خصائل رکھنے والے بربریوں میں عباسیوں کی حمایت اور خلافت عباسیہ کی اعانت پر آمادہ کرنے کا اشاعتی سلسلہ جاری کیا۔ غیر معلوم اور غیر محسوس طریقہ پر عباسی مناد اندلس میں آنے جانے اور انواع واقسام کے طریقوں سے اپنا کام کرنے لگے۔ اس طرح اکثر عرب سردار اور بربری نومسلم امیر عبدالرحمٰن کی حکومت مٹانے اور عباسی خلیفہ کی نگاہ میں اپنی عزت بڑھانے کے لیے مستعد ہوگئے۔ ان لوگوں نے بار بار بغاوتیں کیں اور خود ہی نقصانات اٹھائے کیونکہ دربار بغداد سے اندلس کے باغیوں کو کوئی فوجی امداد نہیں بھیجی جاسکتی تھی۔

اندلس کے ان ناعاقبت اندیش باغیوں اور سرکش سرداروں نے ایک طرف امیر عبدالرحمٰن کو ملک کی بغاوتیں فرو کرنے کے کام میں الجھائے رکھا اور دوسری طرف ایسٹریاس کے عیسائیوں کو جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور جو جبل البرتات میں اپنی ایک چھوٹی سی عیسائی ریاست قائم کر چکے تھے، اس وسیع فرصت میں اپنی طاقت بڑھانے اور دامن کوہ اور پہاڑ کے علاقے میں اپنے محدود حکومت کو وسیع کرنے کا موقع مل گیا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جس سال عبدالرحمٰن بن معاویہ نے اندلس میں قدم رکھا ہے، اسی سال عیسائی ریاست کے حاکم الفانسو کا انتقال ہوگیا تھا۔ الفانسو کی جگہ اس کا بیٹا فردلید[1] یا فرد یاعلی رائی ریاست کا حاکم بن گیا تھا۔ اس نے اپنی ریاست کی حدود بڑھانے، عیسائیوں کو اپنے گرد جمع کرنے اور اپنا ہمدرد بنانے اور آئندہ کے لیے ترقیات کے منصوبے سوچنے کا خوب موقع پایا۔ ادھر جنوبی فرانس کا صوبہ جو مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، اس کی طرف متوجہ ہونے اور

---

[1] اسے فرڈینینڈ بھی کہتے ہیں۔

وہاں کے مسلمانوں کو امداد پہنچانے کا دربار قرطبہ کو موقع ہی نہیں ملا۔ کیونکہ اگر اس طرف فوجیں بھیجی جاتیں اور فرانسیسیوں سے سلسلہ جنگ شروع کیا جاتا تو ملک اندلس کو بچانا امیر عبدالرحمٰن کے لیے محال تھا۔

اب جبکہ عباسیوں کے ہمدردوں نے آئے دن بغاوتیں شروع کر دیں تو فرانسیسیوں نے شہر ناربون پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا۔ چھ سال تک بلا امداد غیرے شہر ناربون کے مسلمانوں نے فرانسیسی فوجوں کا مقابلہ جاری رکھا اور آخر نتیجہ یہ نکلا کہ چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک جنوبی فرانس مسلمانوں کے قبضے میں رہنے کے بعد پھر فرانسیسیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔

خلیفہ بغداد کے سپہ سالار عبدالرحمٰن بن حبیب کے مارے جانے کے بعد ملک فرانس میں جو لوگ عباسی سازش کے موید و ہمدرد تھے، ان میں حسین بن عاصی اور سلیمان بن یقظان خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔ یہ دونوں سرقسطہ اور اس کے نواح میں عامل وحکمران تھے۔ شہر سرقسطہ، جبل البرتات کے جنوبی دامن میں تھا۔ ان دونوں نے خلیفہ مہدی عباسی سے خط وکتابت کی۔ خلیفہ مہدی بڑا نیک اور بزرگ خلیفہ تھا۔ مگر یہ انسانی فطرت کا تقاضا تھا کہ اس کو بنوامیہ سے نفرت اور عبدالرحمٰن کے اندلس میں برسر ماتحت ہونے سے ملال تھا۔ دربار بغداد سے ان لوگوں کی ہمت افزائی ہوئی اور ان دونوں نے فرانس کے بادشاہ شارلیمین سے خط وکتابت کر کے اس کو ملک اندلس پر حملہ کرنے کی ترغیب دی اور یہ بھی بتایا کہ خلیفۃ المسلمین مہدی عباسی جو اس وقت تمام عالم اسلام کے دینی و دنیوی پیشوا ہیں،[1] ان کا بھی یہی منشا ہے کہ عبدالرحمٰن اور اس کی حکومت کو مٹا دیا جائے۔ لہٰذا ہم اور اکثر مسلمانان اندلس آپ کے شریک حال اور ہر طرح معاون و مددگار رہوں گے۔ شارلیمین کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی زریں موقع اندلس کی فتح کا نہ ہوسکتا تھا اور اندلس کی فتح سے بڑھ کر کوئی دوسرا کارنامہ اس کی شہرت وعظمت کے لیے ممکن نہ تھا مگر وہ صوبہ اربونیہ اور شہر ناربون کے مٹھی بھر بے یار ومددگار مسلمانوں کی ہمت واستقلال اور شجاعت وبہادری سے خوب واقف تھا۔ اس لیے اس نے اندلس پر حملہ کرنے میں عجلت سے کام نہیں لیا بلکہ اچھی طرح اپنی فوجی تیاریاں کیں اور ساتھ ہی اندلس کے ان باغیوں اور غداروں سے خط وکتابت جاری رکھ کر ہر قسم کی واقفیت بہم پہنچائی۔ اس سلسلے میں مناسب سمجھا گیا کہ اندلس کے سابق امیر یوسف فہری کے بیٹے ابوالاسود کو جو قرطبہ کے

---

1. یعنی وہ خلیفۃ المسلمین ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے دینی وسیاسی امام ہیں۔

متصل ایک قلعہ میں نظر بند ہے، آزاد کرایا جائے تاکہ اس کی وجہ سے مسلمانان اندلس کی توجہ امیر عبدالرحمٰن کی مخالفت میں زیادہ کام آسکے۔ ابوالاسود کی رہائی کا حال اوپر تحریر ہو چکا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو نابینا ظاہر کر کے قید سے رہائی حاصل کی تھی۔ ابوالاسود بھی سنہ ۱۶۴ھ میں آزاد اور فرار ہو کر باغیان سرقسطہ میں جا کر شامل ہو گیا۔ ادھر شاہ فرانس شارلیمین لاکھوں کی تعداد میں فوج فراہم کر کے کیل کانٹے سے درست ہو گیا اور اپنی اس فوج کشی کا مقصد اندلس سے مسلمانوں کا اخراج اور عیسائیوں کی حکومت کا قائم کرنا قرار دیا جس سے اس کو ہر قسم کی امداد حاصل ہو سکی اور عیسائیوں میں امیر عبدالرحمٰن کے خلاف بڑا جوش پیدا ہو گیا۔ شارلیمین نے خود حملہ کرنے سے پہلے باغیان سرقسطہ کا علم بغاوت بلند کیا۔ امیر عبدالرحمٰن کے لیے یہ سب سے زیادہ نازک اور خطرناک موقع تھا کہ اس کی بربادی کے لیے دربار بغداد کا اخلاقی اثر، مسلمانان اندلس کی عظیم ترین سازش و بغاوت اور عیسائیوں کی عظیم الشان فوجی تیاریاں سب متحد و متفق تھیں اور عبدالرحمٰن اس خطرہ کی پوری پوری کیفیت سے ناواقف و بے خبر تھا۔ امیر عبدالرحمٰن نے اپنے ایک سپہ سالار ثعلبہ بن عبید کو سرقسطہ کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ متعدد لڑائیاں ہونے کے بعد ثعلبہ کو سلیمان بن یقظان نے گرفتار کر لیا اور اس بات کے ثبوت میں کہ ہم کس قدر طاقتور اور آپ کے ہوا خواہ ہیں! ثعلبہ کو شارلیمین کے پاس بھجوا دیا۔ ثعلبہ کی گرفتاری کے بعد اس کی بقیۃ السیف فوج بھاگ گئی اور قرطبہ میں عبدالرحمٰن کے پاس پہنچی اور باغیوں کی قوت و طاقت سے اس کو مطلع کیا۔

ثعلبہ کی گرفتاری کے بعد ہی شاہ فرانس جو اپنی لاتعداد فوج لیے ہوئے جبل البرتات کے اس طرف جنوبی فرانس میں پڑا ہوا تھا، روانہ ہوا۔ فوج اس قدر زیادہ تھی کہ جبل البرتات کے ایک درہ میں ہو کر نہیں گزر سکتی تھی۔ لہٰذا اس کے دو حصے کیے گئے اور پہاڑ کے دو مختلف راستوں سے عبور کر کے شہر سرقسطہ کی فصیل کے نیچے دونوں طرف آ کر جمع ہو گئے۔ اس عیسائی لشکر کی کثرت اور اندلس سے اسلامی اثر کو محو کر دینے کی شہرت جب سرقسطہ کے مسلمانوں نے سنی تو انہوں نے سلیمان بن یقظان کو ملامت کی۔ بالخصوص حسین بن عاصی نے بھی اس انجام کو بہت ہی گراں محسوس کیا اور شہر سرقسطہ کے دروازے بند کر لیے۔ شارلیمین کو جب یہ محسوس ہوا کہ مسلمانان سرقسطہ میری امداد و اعانت میں پہلو تہی کریں گے اور امیر عبدالرحمٰن کے آنے پر ممکن ہے کہ اس کے ساتھ شامل ہو جائیں تو وہ سرقسطہ سے بے نیل و مرام فرانس کی جانب واپس ہوا۔

جب شارلیمین واپس ہوا تو حسین بن عاصی نے سلیمان بن یقظان کو قتل کر کے خود سرقسطہ کی حکومت اور باغی افواج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کے بعد ہی امیر عبدالرحمٰن بھی قرطبہ سے فوجیں لیے ہوئے سرقسطہ کے سامنے آ پہنچا اور فوراً سرقسطہ پر محاصرہ ڈال دیا۔ حسین بن عاصی نے اظہار اطاعت اور صلح کی درخواست کی۔ امیر عبدالرحمٰن نے اس کی یہ درخواست منظور کر لی۔ سرقسطہ سے فارغ ہو کر امیر عبدالرحمٰن نے شاہ فرانس کے اندلس کی طرف آنے کے جواب میں فرانس کا قصد کیا اور پہاڑی دروں کو بہ آسانی عبور کر کے فرانس کے میدان میں پہنچ گیا۔ اس موقع پر ایسٹریاس والے عیسائی اپنے پہاڑوں کے گوشوں میں چھپے اور سہمے ہوئے بیٹھے رہے اور انہوں نے اسی کو بہت غنیمت سمجھا کہ امیر عبدالرحمٰن ہماری طرف ملتفت ہی نہ ہو، جیسا کہ پہلے بھی کوئی امیر ان کی طرف ملتفت نہ ہوا تھا۔ چونکہ اس مرتبہ ان پہاڑی عیسائیوں نے جن کو پہاڑی قزاق سمجھا جاتا تھا، شارلیمین کا بہت سا سامان لوٹ لیا اور اس کی فوج کو نقصان پہنچایا تھا، اس لیے امیر عبدالرحمٰن نے ان کی طرف متوجہ ہونے یا ان کو نقصان پہنچانے کا مطلق خیال نہیں کیا بلکہ ان کے وجود کو جو اندلس کے شاہی لشکر کے لیے اب تک موجب تکلیف نہ ہوا تھا، غنیمت سمجھا۔

فرانس کے میدانوں میں پہنچ کر امیر عبدالرحمٰن نے فرانس کے نصف جنوبی حصے کو خوب تاخت و تاراج کیا۔ بہت سے قلعوں کو مسمار کر ڈالا۔ بہت سے شہروں کی شہر پناہیں ڈھا دیں اور نہایت عجلت کے ساتھ بہت بڑے رقبے میں تاخت و تاراج کر کے واپس چلا آیا۔ شارلیمین فرانس کی شمالی حدود کی طرف بھاگا تھا۔ وہ اپنے ملک کے اس جنوبی حصے کو حریف کی تاراج سے مطلق نہ بچا سکا۔ امیر عبدالرحمٰن فرانس میں زیادہ دنوں نہیں ٹھہر سکتا تھا کیونکہ اس کو اپنے ملک کا حال معلوم تھا کہ وہاں بغاوت و سرکشی کا کس قدر سامان موجود ہے۔ لہٰذا وہ فوراً ہی ملک فرانس سے واپس چلا آیا اور قرطبہ میں پہنچ کر مشکل سے چند مہینے گزرے ہوں گے کہ سنہ ۱۶۵ھ میں سرقسطہ سے حسین بن عاصی کے باغی ہونے کی خبر آئی۔ عبدالرحمٰن نے غالب بن تمامہ بن علقمہ کو اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے روانہ کیا۔ غالب اور حسین میں قریباً ایک سال تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا اور یہ ہنگامہ فرو نہ ہوا۔ تب مجبوراً امیر عبدالرحمٰن نے سنہ ۱۶۶ھ میں خود قرطبہ سے سرقسطہ کی جانب کوچ کیا اور حسین بن عاصی کو گرفتار کر کے قتل کیا اور سرقسطہ کے باغیوں میں سے بہت سوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا اور بہ ظاہر اس بغاوت کا خاتمہ کر دیا۔ ان ہنگاموں میں جو کئی سال سے برپا تھے، ابوالاسود بہ وجہ اپنی

ناتجربہ کاری کے امارت وسرداری کا مرتبہ باغیوں میں حاصل نہ کرسکا تھا۔ وہ بچ بچا کر کہیں چھپ رہا اور سیاست شاہی سے محفوظ رہا۔ اگرچہ بہ ظاہر باغی سرداروں میں سے اب کوئی ایسا باقی نہ رہا تھا جو علم بغاوت بلند کرسکتا تھا، اور عباسی سازشوں کو بھی پورے طور پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا، تاہم وہ لوگ جن کے عزیز واقارب جرم بغاوت اور عبدالرحمٰن کے مقابلے میں مقتول ہو چکے تھے، اپنے سینوں کے اندر اپنے مقتول عزیزوں کی یاد اور عداوت کا جوش ضرور چھپائے ہوئے تھے۔ بعض واقعہ پسند لوگوں نے ابوالاسود کو جو مقام قطلونہ میں روپوش تھا، خروج پر آمادہ کیا اور سنہ ۱۶۹ھ میں اس کے گرد اسی قسم کے ہنگامہ پسند لوگوں کا ایک جم غفیر فراہم ہو گیا۔ عبدالرحمٰن نے اس کو وادی احمد میں شکست دے کر بھگا دیا اور وہ پہاڑوں میں جا چھپا۔ سنہ ۱۶۹ھ میں ابوالاسود پھر میدان میں نکلا اور عبدالرحمٰن کے مقابلے میں چار ہزار ہمراہیوں کو قتل کرا کر بھاگ گیا۔ اگلے سال سنہ ۱۷۰ھ میں ابوالاسود فوت ہو گیا اور اس کے ہمراہیوں نے جو لٹیروں اور ڈاکہ زنوں کی حالت میں تھے، اس کے بھائی قاسم بن یوسف کو اپنا سردار بنایا اور بہت جلد ایک عظیم الشان فوج اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئی۔ امیر عبدالرحمٰن نے اس پر چڑھائی کی اور سخت پریشانی اور معرکہ آرائی کے بعد قاسم بن یوسف کو گرفتار کر کے قتل کیا۔

اسی سال یعنی سنہ ۱۷۰ھ میں خلیفہ ہارون الرشید تخت نشین ہوا۔ شارلیمین نے امیر عبدالرحمٰن کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے امیر عبدالرحمٰن کی خدمت میں صلح کی درخواست کی اور اپنی بیٹی کی شادی اس سے کرنی چاہی۔ امیر عبدالرحمٰن نے شارلیمین کی درخواست صلح تو منظور کر لی مگر اس کی بیٹی کو اپنے محل سرا میں داخل کرنے سے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ شارلیمین کی بیٹی حسن وجمال میں بے نظیر اور شہرہ آفاق تھی۔ امیر عبدالرحمٰن نے اس کو اپنی بیوی بنانے سے غالباً اس لیے انکار کر دیا ہوگا کہ جس طرح شاہ لرزیق کی بیوی ایجیلونا نے امیر عبدالعزیز کی حرم سرا میں داخل ہو کر حکومت اسلامیہ کو نقصان پہنچایا تھا، کہیں یہ عیسائی شہزادی بھی حرم سرا میں داخل ہو کر موجب خطر ثابت نہ ہو۔ امیر عبدالرحمٰن کی عمر بھی اب ۵۷ برس کے قریب تھی۔ اس عمر میں نئی شادیاں کرنے کا شوق عبدالرحمٰن جیسے ملک گیر و ملک دار اور مصروف الاوقات سلطان کو نہیں ہوسکتا تھا اور ممکن ہے کہ بعض مورخین کا یہ خیال بھی صحیح ہو کہ عبدالرحمٰن کی ران میں جنگ سرقسطہ کے موقع پر ایک ایسا زخم لگا تھا کہ وہ عورت کی مقاربت کے قابل نہ رہا تھا۔ بہرحال عبدالرحمٰن نے شارلیمین کی خطا معاف کر دی اور اس سے صلح

کر لی لیکن شارلیمین کو یہ بہ خوبی معلوم تھا کہ خلیفہ بغداد عبدالرحمٰن کا دشمن ہے۔ اس لیے باوجود اس کے کہ اس کو خلیفہ بغداد سے کسی امداد کی توقع نہیں ہوسکتی تھی، تاہم وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ خلیفہ بغداد عبدالرحمٰن کے سر پر فوجی مہم بھیج سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے بغداد کے نئے خلیفہ ہارون الرشید کی خدمت میں ایک سفارت روانہ کر کے تعلقات پیدا کرنا چاہے۔ ان دوستانہ تعلقات کے پیدا ہوجانے کی اس کو اس لیے بھی توقع تھی کہ وہ اس سے پہلے ہارون الرشید کے باپ مہدی کی منشاء کے موافق ایک مرتبہ اندلس میں فوج لے کر جا چکا تھا اور اس بات کو جانتا تھا کہ ہارون الرشید ضرور میری دوستی کے لیے محبت کا ہاتھ بڑھائے گا۔

چنانچہ شارلیمین کا خیال صحیح ثابت ہوا اور خلیفہ ہارون الرشید نے شارلیمین کے سفیروں کی بڑی آؤ بھگت کی اور ایک گھڑی شارلیمین کے پاس ہدیۃً بھجوائی۔ شارلیمین کے تعلقات اپنے پڑوسیوں یعنی یورپ کے عیسائی بادشاہوں سے زیادہ گہرے نہ تھے۔ اگر وہ ایسا ہی صلح جو اور الفت پسند ہوتا تو سب سے پہلے یورپ کے عیسائی سلاطین سے محبت و دوستی کے تعلقات ہی بڑھاتا لیکن اتنے دور دراز یعنی بغداد میں سفارت بھیجنے سے اس کی غرض صرف یہ تھی کہ کسی طرح اندلس کی اسلامی سلطنت کے خلاف کوئی تدبیر کارگر ہو سکے۔ اسی طرح ہارون الرشید نے بھی شارلیمین سے دوستی کے تعلقات پیدا کرنے میں سلطنت کی مخالفت مدنظر رکھی تھی مگر ان دونوں کے مقاصد پورے نہ ہوئے اور عبدالرحمٰن یا اس کی اولاد کو نہ ہارون الرشید کوئی نقصان پہنچا سکا نہ شارلیمین سے کچھ ہو سکا۔

عبدالرحمٰن کی وفات:

شارلیمین سے صلح ہو جانے کے بعد امیر عبدالرحمٰن کے لیے اب کوئی کام باقی نہ رہا تھا کیونکہ بہ ظاہر ملک میں اس کا رعب واقتدار بہ خوبی قائم ہو چکا تھا اور سرکشوں کو اچھی طرح سے مسل دیا گیا تھا لیکن پھر بھی امیر عبدالرحمٰن کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ سنہ ۱۷۱ھ میں اس کے خادم بدر اور اس کے بعض رشتہ داروں اور ہم قوموں نے اس کے خلاف ایک سازش کی اور تخت اندلس پر خود قبضہ کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ ممکن ہے کہ خلافت عباسیہ کی کسی خفیہ تحریک کا یہ اثر ہو یا اندلس کی روایات قدیمہ نے ان مخلصین کو غداری پر آمادہ کیا ہو۔ بہرحال امیر عبدالرحمٰن نے ان لوگوں کو یہی سزا دینی مناسب سمجھی کہ ان کو اندلس سے خارج کر کے افریقہ کی طرف بھیج دیا۔ اس کے بعد

عبدالرحمٰن تمام ان کاموں سے جو اس کے ہاتھ سے ہونے والے تھے، فارغ ہو چکا تھا۔ ربیع الثانی سنہ ۱۷۲ھ میں تینتیس سال چار مہینے حکومت کرنے کے بعد ۵۸ یا ۵۹ سال کی عمر میں فوت ہوا اور اس کی وصیت کے موافق اس کا بیٹا ہشام تخت نشین ہوا۔

عبدالرحمٰن کی زندگی پر تبصرہ:

عبدالرحمٰن بن امیہ کی زندگی کے حالات نہایت مختصر اور مجمل طور پر بیان ہو چکے ہیں لیکن اس عجیب وغریب اور دنیا کے عظیم الشان شخص کی زندگی کا صحیح تصور کرنے کے لیے یہ حالات کافی نہیں ہیں۔ بیس سال کی عمر تک اس کا غالب شغل کتب بینی اور علمی مجالس کی شرکت تھی۔ فنون سپہ گری سے واقف ہونا ضروری و لازمی سمجھا جاتا تھا۔ بیس سال کی پر راحت زندگی کے بعد اس زندگی کا ایک ایسا دور آیا کہ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح اپنے آپ کو چھپاتا پھرتا تھا اور روئے زمین کا ہر ایک انسان جو اس کو نظر آتا ہے، اپنا قاتل اور خون کا پیاسا جلاد ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے پاس کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا تک نہ تھا۔ چند سال اس حالت میں گزارنے اور جنگلوں، صحراؤں اور ملکوں میں آوارہ رہنے کے بعد وہ ایک ملک کا مالک اور بادشاہ بن جاتا ہے لیکن یہ بادشاہت کوئی تر لقمہ یا شربت کا گھونٹ نہ تھا بلکہ مصیبتوں اور محنتوں کی ایک پوٹ تھی جو اس کے سر پر رکھ دی گئی تھی۔ اگر عبدالرحمٰن کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ شروع ہی میں ناکام ہو کر برباد ہو جاتا مگر عبدالرحمٰن نے عجیب طاقتور دل اور عجیب پست نہ ہونے والی ہمت پائی تھی۔ وہ اندلس میں ایک تنہا اجنبی شخص تھا۔ اس کے ساتھ کسی قوم کو کوئی خصوصی محبت نہ ہو سکتی تھی لیکن اس نے جس دانائی، مآل اندیشی، دور بینی اور ہوشیاری سے کام لیا، یہ اسی کا حصہ تھا۔

ساتھ ہی وہ اعلیٰ درجہ کا سپہ سالار اور شمشیر زن سپاہی ثابت ہوا۔ حالانکہ اندلس میں داخل ہونے سے پہلے اس کو سپہ سالاری اور تیغ زنی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس نے کسی میدان اور کسی لڑائی میں کوئی بھی ایسی غلطی نہیں کی جس پر کوئی تجربہ کار سپہ سالار اعتراض یا نکتہ چینی کر سکے۔ جن لڑائیوں یا نکتہ چینیوں میں اس کے بڑے بڑے تجربہ کار سپہ سالار ناکام رہ جاتے تھے، ان مہموں کو عبدالرحمٰن جا کر فوراً سر کر لیتا تھا۔ کسی موقع پر اس کے ہاتھ پاؤں نہیں پھولے اور وہ حواس باختہ نہیں ہوا۔ حالانکہ بارہا اس پر ایسی مصیبتیں نازل ہوئیں اور اس کے خلاف ایسی بغاوتیں مسلسل ہوئیں کہ دوسرا شخص اس کی جگہ ہوتا تو دین وعقل کی پابندی میں نہ رہ سکتا۔ یا تو احمقوں کی طرح اپنے آپ کو ہلاک

کر دیتا یا بزدلوں کی طرح ذلیل ہو کر بھاگ جاتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ عبدالرحمٰن نے اس بات کا موقع ہی نہیں دیا کہ اس کی ہمت کی انتہا اور اس کے استقلال کی آخری سرحد کا کسی کو اندازہ ہو سکے لیکن اس کے معتدل انداز اور متانت آمیز طرز عمل سے ہمیشہ یہی ظاہر ہوا کہ وہ اس سے بھی بہت بڑھ کر ہمت دکھا سکتا ہے۔

اس نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جس سے اس کی بے وقوفی ثابت ہو سکے بلکہ اس کے ہر ایک کام میں اسی قدر دانائی اور دور اندیشی پائی گئی کہ اس وقت اس سے بڑھ کر دانائی اور دور اندیشی کی کسی سے توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔

اس کی تمام زندگی یعنی مدت حکمرانی ہم کو جنگ و پیکار کے ہنگاموں سے پر نظر آتی ہے اور کسی کا خیال بھی اس طرف نہیں جا سکتا کہ امیر عبدالرحمٰن نے ملک اندلس میں کوئی ایسا کام بھی کیا ہو گا جس کی ایک پرامن وامان سلطنت کے سلطان سے توقع ہو سکتی ہے۔ مگر جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ امیر عبدالرحمٰن نے اندلس میں علوم وفنون کو رواج دینے کی کوشش میں کامیابی حاصل کی اور اس ملک کے اندر اپنے خاندان کی حکومت کو مستقل بنانے کے لیے علم کو رواج دینے اور تمام ملک میں مدارس قائم کرنے کو سب سے زیادہ ضروری سمجھا تو انسان حیران رہ جاتا ہے اور اس مدبر و مآل اندیش شخص کی فہم وفراست پر عش عش کرنے لگتا ہے۔

امیر عبدالرحمٰن نے شہر قرطبہ اور اکثر شہروں کی شہر پناہیں تعمیر کرائیں۔ اندلس کے بہت سے شہروں اور قصبوں میں جہاں ضرورتیں تھیں، مسجدیں بنوائیں اور شہر قرطبہ میں ایک شان دار مسجد بنوائی۔ اس مسجد کی تعمیر اگرچہ امیر عبدالرحمٰن اپنی زندگی میں پوری نہیں کر سکا اور ناتمام ہی چھوڑ کر فوت ہو گیا مگر اس کی بنیاد جس وسیع پیمانے اور خوبصورت طریقے پر اس نے رکھوائی تھی، ختم ہونے کے بعد اس کے بانی ہی کی علو ہمت اور بلند نظری پر دلیل ہوئی۔ مسجد قرطبہ کی خوبصورتی اور حسن تدبیر نے بہت سے ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کی نگاہ میں اس مسجد کو خانہ کعبہ کی طرح باعظمت و مقدس بنا دیا تھا، حالانکہ تمام مسجدیں ایک ہی مرتبہ رکھتی ہیں۔[1] شوق عمارات میں امیر عبدالرحمٰن کا

---

[1] ویسے تو تمام مساجد اللہ کا گھر ہیں اور اس اعتبار سے ان کی حیثیت اور مقام یکساں ہے، لیکن فضیلت کے اعتبار سے تین مساجد خصوصی مقام رکھتی ہیں، یعنی مکہ مکرمہ کی مسجد الحرام (بیت اللہ شریف)، مدینہ طیبہ کی مسجد نبوی ﷺ اور بیت المقدس (فلسطین)۔ نبی کریم ﷺ نے ان تین مساجد کے علاوہ دیگر مساجد کے لیے سفر کرنا منع فرمایا ہے (صحیح بخاری، کتاب التهجد، حدیث ۱۱۸۹) مسجد حرام میں ایک نماز پڑھنا دوسری مساجد کی نسبت ایک لاکھ نماز سے افضل ہے (صحیح =

مرتبہ ہندوستان کے شاہجہاں سے بڑھ کر ہے تو رائے، تدبیر میں وہ ارسطو کا ہمسر نظر آتا ہے۔ ملک اندلس میں اپنی سلطنت قائم کر لینا تیمور و نپولین کی فتوحات سے بہت بڑھ چڑھ کر مرتبہ رکھتا ہے۔

علوم وفنون کی سرپرستی میں وہ ہارون الرشید و مامون الرشید سے کم نہ تھا بلکہ ہارون و مامون کے بعد خاندان عباسیہ میں علوم وفنون کے ایسے قدردان پیدا نہ ہو سکے لیکن عبدالرحمٰن کی اولاد میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جو ہارون و مامون سے بہت بڑھ کر علوم وفنون کے خادم ہوئے اور اسی لیے قرطبہ نے بغداد سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ ابن حیان لکھتا ہے کہ ''عبدالرحمٰن بڑا رحم دل اور شائستہ مزاج شخص تھا۔ اس کی تقریر نہایت فصیح و بلیغ، اس کی قوت مدرکہ نہایت تیز اور نکتہ رس تھی۔ معاملات میں اپنی رائے جلدی قائم نہ کر سکتا تھا۔ مگر قائم کر لینے کے بعد پورے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ اس کی تکمیل وتعمیل کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا مگر اہم معاملات درپیش ہونے پر سلطنت کے تجربہ کار اہل کاروں اور مشیروں سے مشورہ کرتا تھا۔ عبدالرحمٰن جانباز دلاور اور صف شکن بہادر تھا۔ میدان جنگ میں سب سے پہلے خود حملہ آور ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ دوست اور دشمن دونوں کے لیے یکساں ہیبت وجلال ظاہر کرتا تھا۔ جمعہ کے دن جامع مسجد میں خطبہ پڑھتا، بیماروں کی عیادت کو جاتا اور عام خوشی کے جلسوں میں اور شادیوں میں شوق سے شریک ہوتا۔''

امیر عبدالرحمٰن کے عہد حکومت میں حسب ذیل اشخاص یکے بعد دیگرے حاجب مقرر ہوئے تھے: تمام بن علقمہ، یوسف بن بخت، عبدالکریم بن محران، عبدالرحمٰن بن مغیث، منصور خواجہ سرا۔ امیر عبدالرحمٰن نے اگرچہ بعض اشخاص کو وزارت پر نامزد کیا مگر اس کا کوئی ایک وزیر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے اسی کے مشوروں پر عمل کیا ہو۔ اس نے ایک مجلس امراء مقرر کر رکھی تھی، جس سے انتظام ملکی میں مشورے لیتا تھا۔ اس مجلس مشاورت کے ارکان یہ تھے: ابوعثمان، عبداللہ بن خالد، ابوعبیدہ، شہید بن عیسیٰ، ثعلبہ بن عبید، آثم بن مسلم۔

حلیہ اور اولاد:

عبدالرحمٰن نہایت خوبصورت، کشیدہ قامت اور چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ رنگ بہت صاف اور بال بھورے رنگ کے تھے۔ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ اس کی قوت شامہ کمزور تھی۔ مرتے

= الجامع الصغیر ۲: ٤ ٧١) مسجد نبوی ﷺ میں ایک نماز کی ادائیگی سوائے مسجد حرام کے، باقی تمام مساجد میں نماز سے ایک ہزار درجہ زیادہ افضل ہے (صحیح بخاری، کتاب التهجد، حدیث ۱۱۹۰)

وقت اس نے نو بیٹیاں اور گیارہ بیٹے چھوڑے۔ جن میں سلیمان سب سے بڑا تھا مگر اس نے ولی عہد اپنے دوسرے بیٹے ہشام کو بنایا تھا۔ سلیمان وہی بیٹا تھا جس کو فرات کے کنارے سے بغل میں لے کر بھاگا تھا مگر بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ اندلس میں آنے سے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ بہرحال مرتے وقت جو بیٹے موجود تھے، ان میں سلیمان سب سے بڑا تھا۔ ہشام اپنے بھائی سلیمان سے زیادہ لائق اور تاج وتخت سلطنت سنبھالنے کی زیادہ قابلیت رکھتا تھا۔ اسی لیے عبدالرحمٰن نے اس کو اپنا ولی عہد بنایا تھا۔

نظم ونسق:

ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ امیر عبدالرحمٰن کی طبیعت میں مروت وفیاضی کا جوہر تھا لیکن غداروں اور باغیوں نے اس کو سختی وسزا دہی پر مجبور کیا۔ اس کا طبعی میلان علم وادب کی طرف تھا مگر ضرورت نے اس کو نہایت محتاط اور تجربہ کار سپہ سالار بنا دیا تھا۔ عبدالرحمٰن کی ابتدائی عمر دمشق کے انتہائی تکلفات میں گزری تھی مگر مصیبت آئی اور افلاس وغریبی سے پالا پڑا تو اس نے نہایت خوشی اور بلند ہمتی سے سب کچھ برداشت کیا۔ ابھی اس کی سلطنت پوری طرح قائم نہ ہونے پائی تھی کہ اس نے مشرق کے دور دراز علاقوں سے بنوامیہ اور اس کے متوسلین کو اپنے خرچ سے اندلس بلوایا اور ان میں سے ہر ایک کو اس کے مرتبے کے موافق عہدے اور عزتیں عطا کیں۔ عبدالرحمٰن کی ذکاوت و مآل اندیشی کے دشمن بھی مداح تھے۔ عبدالرحمٰن تمام مصائب وآلام کو خاموشی سے برداشت کر لیتا تھا۔

عبدالرحمٰن نے اپنے مقبوضہ ملک کو چھ صوبوں میں تقسیم کیا تھا۔ ہر ایک صوبہ میں ایک فوجی سپہ سالار رہتا تھا۔ اس سپہ سالار کے ماتحت دو عامل اور چھ وزیر ہوتے تھے۔ ان حکام کے مددگار قاضی اور دیگر حکام ہوتے تھے۔ صدر دفتر قرطبہ کو یہ لوگ تمام ضروری اطلاعات بھیجتے رہتے تھے۔ عبدالرحمٰن ہمیشہ اپنی رعایا کی فلاح وبہبود کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ اس نے ایسے قوانین جاری کیے تھے کہ رعایا خوش حال ہو اور اپنی املاک پر آزادی کے ساتھ بلامداخلت غیرے قابض ومتصرف رہے۔

عبدالرحمٰن کو تعلیم اور علم وادب کی اشاعت کا خاص طور پر شوق تھا۔ تمام ملک اندلس میں عبدالرحمٰن نے سڑکیں بنوائیں۔ ڈاک کا انتظام کیا، ہر پڑاؤ پر گھوڑے رکھے تاکہ جلد از جلد ملک سے دارالخلافہ قرطبہ میں اطلاعات پہنچ سکیں۔

عبدالرحمٰن نے لٹیروں اور ڈاکوؤں کا طاقت وسطوت کے ساتھ بالکل انسداد کر دیا تھا۔ بربری لوگ جو اپنی عادت سے کبھی باز نہ آتے تھے، پہلی مرتبہ امیر عبدالرحمٰن ہی کے زمانے میں وہ خاموش ہو کر بیٹھے۔ عبدالرحمٰن اپنے ممالک محروسہ کا ہمیشہ دورہ کرتا تھا تاکہ اپنے عاملوں کا اندازہ کرے کہ وہ اس کی رعایا پر کس طرح حکومت کرتے ہیں۔ جہاں جہاں امیر کا گزر ہوتا، وہاں کے محتاجوں اور عسیر الحال لوگوں کی دستگیری کرتا اور لوگوں کی اصلاح اور فائدے کے کام جاری کرتا۔

امیر عبدالرحمٰن کی فیاضیاں عام تھیں اور سب ان سے مستفیض ہوتے تھے۔ اگرچہ عبدالرحمٰن نے ہر جگہ مسجدیں اور رفاہ عام کی عمارتیں بنوائیں لیکن دارالحکومت قرطبہ کی شان و شوکت بڑھانے کے لیے اس نے خوبصورت عمارتیں بنانے میں زیادہ ہمت و توجہ صرف کی۔ شاہی محل کے صحن میں عبدالرحمٰن نے خرما کا ایک درخت نصب کرایا جو اندلس میں خرما کا پہلا درخت تھا۔ قرطبہ کے قریب ایک باغ رصافہ کے نام سے لگایا جو اپنے دادا ہشام کے باغ رصافہ کے نام پر تھا۔ قرطبہ میں ایک ٹکسال قائم کی جس میں دینار و درہم اسی نمونے کے مسکوک کرائے جیسے کہ شام میں رائج اور دمشق میں مسکوک ہوتے تھے۔ دنیا کے ہر حصے سے علماء وفضلاء کو بلایا اور ان کی خوب قدردانی کی۔ علمی تحقیقات اور فلسفیانہ موشگافیوں کے لیے مجلسیں مقرر کیں۔ اپنے بیٹوں کو بہترین طریقہ پر تعلیم دلائی اور ان کو حکم دیا کہ وہ دفتر شاہی اور قاضیوں کی کچہریوں میں حاضر ہو کر معاملات کو دیکھا کریں، اہم مقدمات اور سرکاری معاملات کے فیصلے بھی ان شہزادوں کے سپرد کیے جاتے تھے۔

عام لوگوں میں علم کا شوق پیدا کرنے کے لیے مشاعرے اور مناظرے کی مجلسیں مقرر ہوتیں۔ اچھی نظموں اور علمی مناظروں کی کامیابی پر انعامات دیے جاتے تھے۔ امیر عبدالرحمٰن ان تمام علمی مجلسوں میں خود بھی شریک ہوتا تھا۔ اندلس کی عیش پسند آب و ہوا اور مال و دولت کی فراوانی نے امیر عبدالرحمٰن کے سپاہیانہ اخلاق میں کوئی تغیر پیدا نہیں کیا تھا۔ اس کے اتقا اور پرہیزگاری میں کسی وقت تغیر اور کمی محسوس نہیں ہوئی۔ قرطبہ کی مشہور آفاق مسجد کے لیے جو مقام سب سے زیادہ موزوں اور مناسب تھا، وہ عیسائیوں کے قبضے میں تھا۔ امیر عبدالرحمٰن نے اس پر زبردستی قبضہ مناسب نہیں سمجھا۔ جب خود ہی عیسائیوں نے اس کو فروخت کرنا چاہا تو امیر نے اس کو قیمت دے کر خریدا اور شہر کے متعدد مقامات میں ان کو گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دی۔

امیر عبدالرحمٰن میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک عقلمند سیاست دان اور روشن دماغ بادشاہ میں ہونی چاہئیں۔ جس تاریخ سے امیر عبدالرحمٰن نے تخت اندلس پر قدم رکھا، اسی تاریخ سے ملک اندلس خلافت مشرقیہ اسلامیہ کی ماتحتی سے آزاد ہو گیا لیکن امیر عبدالرحمٰن نے نہایت دانائی اور ہوشیاری کے ساتھ اپنے آپ کو امیر ہی کہلایا اور خلافت کا دعویٰ نہیں کیا۔ دس برس کے بعد خطبہ میں اپنا نام داخل کیا۔ عبدالرحمٰن اس بات کو جانتا تھا کہ ملک اندلس میں بہت سے ایسے مسلمان موجود ہیں جو بنوامیہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور عباسیوں سے محبت رکھتے ہیں اور عام طور پر اسلامی سلطنت کا ایک ہی مرکز سمجھتے ہیں جو مشرق میں موجود ہے۔ اگر امیر عبدالرحمٰن اپنے آپ کو خلیفہ کہلاتا تو یقیناً اس کے خلاف تمام مسلمان شمشیر بہ دست ہو جاتے اور عبدالرحمٰن کو گستاخ اور بے ادب قرار دیتے۔ اندلسی مسلمانوں کی اس حالت کو بہ تدریج اصلاح پذیر کیا گیا اور عبدالرحمٰن ثالث نے مناسب وقت پر اپنے آپ کو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کہلایا۔ ایک اور مورخ لکھتا ہے کہ عبدالرحمٰن کی تقریر نہایت شائستہ اور دل آویز تھی۔ نہایت سنجیدہ اور معاملہ فہم اور منتظم شخص تھا۔ کسی کام کے کرنے میں جلدی نہیں کرتا تھا لیکن جس کام کا ارادہ کر لیتا، پھر اس کو بغیر ختم کیے نہیں چھوڑتا تھا۔ لہوولعب اور ضرورت سے زیادہ آرام کو اپنے پاس تک نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ سفید لباس اکثر پہنتا، حاجت مندوں کو اپنے پاس پہنچنے کے لیے آسانی بہم پہنچانے کی غرض سے دربانوں کو موقوف کر دیا تھا۔ کوئی حاجت مند اگر کھانے کے وقت اپنی درخواست لے کر آ جاتا تو اپنے ساتھ ہی دسترخوان پر بٹھا کر کھانا کھلاتا۔

عبدالرحمٰن بن معاویہ دنیا کے ان عظیم الشان انسانوں میں ہے، جنھوں نے قوموں کو زندہ کرنے، سلطنتوں کو بنانے اور روئے زمین کے حالات میں تغیر عظیم پیدا کرنے میں ایسی محیرالعقول طاقتوں کا اظہار کیا ہے کہ آسمان شہرت پر ان کے نام ستارہ بن کر چمک رہے ہیں اللہ تعالیٰ سے اور زندہ جاوید بن گئے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن معاویہ کے حالات پر جو اوپر مذکور ہوئے ہیں، پھر ایک مرتبہ غور کرو اور سوچو کہ اس نے کیسا غیر معمولی دل ودماغ پایا تھا۔ سب سے بڑھ کر قابل تعریف چیز امیر عبدالرحمٰن کی سپاہیانہ زندگی تھی کہ مسجد قرطبہ کی تعمیر کے وقت وہ امیر اندلس ہونے پر بھی معمولی مزدوروں کی طرح ان کے ساتھ کام کرنے اور پتھر ڈھونے کو عیب نہیں جانتا تھا۔

ہشام بن عبدالرحمٰن

امیرعبدالرحمٰن بن معاویہ المعروف بہ عبدالرحمٰن الداخل اگرچہ اپنے آپ کو امیر ہی کہلاتا رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اندلس کا پہلا خلیفہ تھا۔ معنوی طور پر اس کے اندر تمام وہ صفات وشرائط موجود تھیں جو ایک خلیفہ کی ذات میں ہونی چاہیں۔ اس کی اولاد میں عبدالرحمٰن ثالث نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ مگر ہم کو چاہیے کہ ہم اب ہشام اوراس کے جانشینوں کو سلطان یا خلیفہ کے لقب سے یاد کریں۔

ولادت:

سلطان ہشام بن عبدالرحمٰن اپنے باپ کے اندلس میں داخل ہونے کے بعد سنہ ۱۳۹ھ میں شوال کے مہینے میں پیدا ہوا تھا۔ ہشام کی ماں حلل نامی ام ولد کو اندلس کے سابق امیر یوسف فہری نے عارضی صلح کے وقت امیر عبدالرحمٰن کی خدمت میں ہدیۃً پیش کیا تھا۔ عبدالرحمٰن نے اس کو آزاد کر کے نکاح کیا تھا اوراس کو بہت ہی محبوب رکھتا تھا۔

تخت نشینی:

۳۲ یا ۳۳ سال کی عمر میں اپنے باپ کی وصیت کے موافق سنہ ۱۷۲ھ میں تخت نشین ہوا۔ جس وقت عبدالرحمٰن بن معاویہ کا انتقال ہوا تو ہشام شہر مریدہ میں بہ طور گورنر موجود تھا۔ وہیں اپنے باپ کی وفات کا حال سن کر تخت نشین ہوا اور عام طور پر ملک اندلس میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ قرطبہ میں اس کا بھائی عبداللہ موجود تھا۔ اس نے باپ کے بعد شاہی محل سرائے اور دارالسلطنت قرطبہ پر ہشام کے خلاف قبضہ کر لیا۔ ادھر صوبہ طیطلہ کا گورنر اس کا بھائی سلیمان تھا۔ ہشام مریدہ سے قرطبہ کی جانب متوجہ ہوا اور معمولی سے مقابلہ کے بعد عبداللہ کو گرفتار کر کے قرطبہ پر قابض ہوا اور دوبارہ رسم تخت نشینی ادا کی۔ اس موقعہ پر اس نے اپنے بھائی کی خطا معاف کر کے اس کو اپنے مشیروں اور وزیروں میں شامل کر لیا اوراس کی بڑی جاگیر مقرر کر دی۔

بھائیوں کی بغاوت:

ملک اندلس میں اگرچہ متضاد عناصر کے لوگ آباد تھے اوراس موقع پر جب کہ امیر عبدالرحمٰن

فوت ہوگیا تھا، ملک کے اندر بغاوتیں پیدا ہوسکتی تھیں مگر امیر عبدالرحمٰن نے اپنی زندگی میں سرکشوں کو اس طرح زیر کر دیا تھا کہ وہ اب اس قابل ہی نہ رہے تھے کہ سر اٹھائیں مگر ان غیر کف باغیوں نے تو نہیں البتہ خود ہشام کے بھائیوں نے علم بغاوت بلند کر کے سلطان ہشام کے عنوان سلطنت ہی میں مشکلات پیدا کر دیں اور بہت جلد لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ امیر عبدالرحمٰن نے اپنے ولی عہد کے انتخاب میں مطلق غلطی نہیں کی تھی۔ سلیمان نے جو طیطلہ کا گورنر تھا، بغاوت اور اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ ادھر عبدالرحمٰن قرطبہ سے بھاگ کر اپنے بھائی سلیمان کے پاس پہنچ گیا۔ سلطان ہشام نے دونوں بھائیوں کی سرکشی کا حال سن کر درگزر سے کام لیا اور سمجھا کہ چندروز کے بعد یہ خود ہی راہ راست پر آ جائیں گے۔

بھائیوں میں جنگ:

طیطلہ میں سلیمان کا وزیر غالب ثقفی تھا جو امیر عبدالرحمٰن کا وفادار سردار تھا۔ اس نے ان دونوں بھائیوں کو سمجھایا اور بغاوت سے باز رکھنا چاہا۔ سلیمان وعبداللہ نے غالب ثقفی کو عہدہ وزارت سے معزول کر کے قید کر دیا۔ غالب ثقفی کے قید ہونے کی خبر سن کر ہشام نے قرطبہ سے ایک خط اپنے سفیر کے ہاتھ طیطلہ کی جانب ان بھائیوں کے پاس بھیجا۔ جس میں لکھا تھا کہ ایسے قدیمی وفادار اور نمک حلال شخص کو قید کرنا مناسب نہ تھا۔ سلیمان وعبداللہ نے اس سفیر کے سامنے غالب ثقفی کو قید خانے سے بلوا کر قتل کر دیا اور کہا کہ جاؤ، اس خط کا یہی جواب ہے۔ سلطان ہشام اس جواب کو سن کر قرطبہ سے بیس ہزار فوج لے کر طیطلہ کی جانب سے روانہ ہوا۔ ادھر سے سلیمان وعبداللہ دونوں ایک زبردست فوج لے کر طیطلہ سے قرطبہ کی جانب روانہ ہوئے۔ طیطلہ سے تھوڑے فاصلے پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ سلیمان وعبداللہ شکست کھا کر طیطلہ میں واپس ہو کر قلعہ بند ہو بیٹھے۔ قلعہ طیطلہ اپنی مضبوطی کے لیے مشہور تھا۔ اس کا فتح کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہشام نے طیطلہ کا محاصرہ کر لیا۔ سلیمان نے اپنے بیٹے اور عبداللہ دونوں کو طیطلہ میں چھوڑ کر اور ایک حصہ فوج لے کر قرطبہ کا رخ کیا۔ قرطبہ میں عبدالملک بہ طور گورنر مقیم تھا۔ عبدالملک نے سلیمان کے آنے کی خبر سن کر قرطبہ سے کچھ فاصلہ پر سلیمان کا استقبال تیر وشمشیر سے کیا۔ سلیمان شکست کھا کر مرسیہ کی طرف بھاگ گیا اور ملک میں جابہ جا لوٹ مار مچاتا ہوا پھرنے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر سلطان ہشام نے طیطلہ

کے محاصرہ پر ایک سردار کو چھوڑ کر دارالسلطنت قرطبہ کا عزم کیا تاکہ قرطبہ میں بیٹھ کر سلیمان کی نقل و حرکت کی نگرانی اور اس کا بندوبست بہ آسانی کیا جا سکے۔

بھائیوں کی معافی:

عبداللہ جب طول محاصرہ سے تنگ آ گیا تو اس نے بلاشرط اور بلاجان کی امان طلب کیے ہوئے اپنے آپ کو سلطان ہشام کے قبضہ میں دے دینا گوارا کر لیا۔ چنانچہ وہ محاصرین کے ایک معتمد کی نگرانی میں قرطبہ آ کر دربار سلطانی میں حاضر ہوا۔ سلطان ہشام نے خطا معاف کر دی اور بڑی عزت و محبت کا برتاؤ کیا اور اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ عبداللہ کی طرف سے سلطان کا دل صاف ہے، اس کو طیطلہ ہی میں جاگیر دے کر رخصت کیا۔

سلیمان نے مرسیہ میں بہت سے آدمیوں کو جمع کر لیا۔ سلطان نے اپنے نوعمر بیٹے حکم کو فوج کا سردار بنا کر مقابلہ پر بھیجا۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا تو سلیمان، حکم سے شکست کھا کر بھاگا۔ اس کی تمام جمعیت مقتول و منتشر ہو گئی۔ آخر مجبور ہو کر دو برس تک آوارہ و سرگرداں رہنے کے بعد سنہ ۱۷۴ھ میں سلیمان نے سلطان ہشام سے معافی کی درخواست کی۔ سلطان ہشام نے فوراً اس کی درخواست منظور کی اور بھائی کو اپنے دربار میں نہایت عزت و تکریم کے مقام پر جگہ دی۔ سلیمان نے کہا کہ میں ملک اندلس میں اب رہنا پسند نہیں کرتا، مجھ کو افریقہ جانے کی اجازت دی جائے۔ ہشام نے بہ خوشی اس کو اجازت دے دی اور اس کی جاگیر جو اندلس میں تھی، ستّر ہزار مثقال سونے کے عوض میں خرید لی۔ سلیمان افریقہ میں پہنچ کر مقیم ہوا اور وہاں عباسیوں کا ایجنٹ بن کر اندلس کو ہمیشہ خط و کتابت کے ذریعہ سے بغاوت پر آمادہ کرتا رہا۔

فرانس پر حملہ:

بھائیوں کے فتنہ سے فراغت پا کر سلطان ہشام نے چالیس ہزار فوج مرتب کر کے ملک فرانس پر حملہ کیا اور تمام جنوبی فرانس اور شہر ناربون کو جو عرصہ تک صوبہ بونیہ کے مسلمان گورنر کا دارالحکومت رہ چکا تھا اور مسلمانوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے امیر عبدالرحمٰن کے زمانہ میں فرانسیسیوں کے قبضہ میں تھا، پھر فتح کر لیا۔ یہاں سے بے قیاس مال و دولت ہاتھ آیا۔ واپسی میں جبل البرتات کے عیسائیوں سے گستاخانہ حرکات معائنہ ہوئیں۔ یہ عیسائی ریاست مسلمانوں کی کم التفاتی اور عیسائیوں

کی چالاکی کے سبب سے پہاڑ کے گوشہ میں قائم ہوگئی تھی۔ آج تک اس عیسائی ریاست نے کبھی اسلامی لشکر کا مقابلہ نہیں کیا تھا۔ اسی لیے مسلمانوں نے بھی اس کے وجود کو اپنے لیے مضر نہ سمجھ کر اس کو باقی رکھا تھا۔ اب جبکہ اسلامی لشکر ملک فرانس کو فتح کر کے اور شارلیمین کو مقابلہ سے بھگا کر مع مال غنیمت واپس ہو رہا تھا تو ایسٹریاس کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی فوج کے عقبی حصہ کو اسی طرح چھیڑنا اور لوٹنا چاہا جس طرح انہوں نے شارلیمین کی فوج کو جبل البرتات میں لوٹ کر اس کے ایک بڑے حصہ کو برباد کر دیا تھا۔ مگر شارلیمین اور ہشام کی فوجوں میں بڑا فرق تھا۔

پہاڑی عیسائیوں کی سرکوبی:

سلطان ہشام نے قرطبہ پہنچ کر سنہ ۱۷۵ھ میں اپنے وزیر یوسف بن بخت کو ان پہاڑی عیسائیوں کی سرکوبی پر مامور کیا۔ یوسف بن بخت نے ریاست ایسٹریاس پر حملہ کر کے تمام ریاست کو تہ و بالا کر ڈالا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایسٹریاس کے عیسائیوں کو مسلمانوں کے مقابل ہونا پڑا مگر وہ بہت بری طرح ہلاک و برباد کیے گئے اور ان کا حاکم برمیوڈ رگرفتار کر لیا گیا۔ فتح کے بعد اس پہاڑی علاقہ کو مسلمانوں نے اپنی سکونت کے ناقابل پا کر پھر اسی حاکم کو دے دیا اور اس سے اطاعت و فرماں برداری اور ادائے خراج کا اقرار لے لیا۔

جنوبی فرانس کے مال غنیمت کے خمس سے مسجد قرطبہ کی تعمیر:

جنوبی فرانس اور عیسائی صوبوں سے جو مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا، اس کا خمس جو سلطان ہشام کی خدمت میں پیش کیا گیا، وہ ۴۵ ہزار اشرفیاں تھیں۔ سلطان ہشام نے یہ تمام روپیہ مسجد قرطبہ کی تعمیر و تکمیل پر خرچ کیا۔

صوبہ اربونیہ کی بغاوت کا استیصال:

عبدالملک نے اس مہم میں ایک اور عجیب حرکت کی کہ جلیقیہ، ایسٹریاس، اربونیہ اور جنوبی فرانس کے سرکش عیسائیوں کو جو میدان جنگ میں مسلمانوں نے گرفتار کیے تھے، شہر ناربون میں یہ حکم سنایا کہ تمہاری رہائی اس طرح ہو سکتی ہے کہ شہر ناربون کی شہر پناہ کو گرا کر اس کے پتھر شہر قرطبہ میں پہنچاؤ۔ چنانچہ ان عیسائیوں نے شہر کی فصیل کے پتھروں کو قرطبہ پہنچایا۔ قرطبہ اور ناربون کے درمیان کئی سو کوس کا فاصلہ تھا۔ راستے میں بہت سے دریاؤں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں کو عبور کرنا تھا۔

ایک ایک قیدی نے ایک ایک چھوٹا پتھر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ جو بڑے تھے، ان کو گاڑیوں میں لاد کر قیدیوں نے کھینچا۔ بعض متوسط درجہ کے پتھروں کو دو آدمیوں نے ڈولی کی طرح باندھ کر اور ایک بانس یا لکڑی میں لٹکا کر اٹھایا۔ اس طرح شہر ناربون کی فصیل کے جس قدر پتھر یہ قیدی اٹھا سکتے تھے، اٹھائے اور کوچ و مقام کرتے ہوئے شاہی دستہ فوج کی نگرانی میں قرطبہ تک لائے۔ ان پتھروں سے مسجد قرطبہ کی مشرقی دیوار کا ایک حصہ تعمیر ہوا۔ عبدالملک نے ان قیدیوں سے یہ مشقت لے کر ان کو حسب وعدہ رہا کر دیا اور عیسائی ریاستیں سزادہی کے بعد اقرار اطاعت لے کر پھر عیسائیوں کے سپرد کر دی گئیں کیونکہ ان شمالی اور پہاڑی علاقوں کو عرب سردار سرد آب و ہوا کے سبب سے پسند نہ کرتے تھے اور زیادہ قیمتی نہ جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان شمالی صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی بہت ہی کم تھی۔ جنوبی اندلس میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی اور یہیں کے عیسائی باشندے بھی زیادہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔

مسجد قرطبہ کی تکمیل اور وادی الکبیر کے پل کی از سر نو تعمیر:

سلطان ہشام نے اپنے باپ عبدالرحمٰن بن معاویہ کی مسجد قرطبہ کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے خصوصی توجہ صرف کی۔ سنہ ۱۷۵ھ میں سلطان ہشام نے اپنے بیٹے حکم کو صوبہ طیطلہ کا گورنر مقرر کیا۔ سنہ ۱۷۶ھ میں قرطبہ میں دریائے وادی الکبیر کا پل از سر نو تعمیر کرایا۔ یہ امیر سمح نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے عہد خلافت میں تعمیر کرایا تھا۔ اب سلطان ہشام نے اس کو پہلے سے زیادہ وسیع اور مضبوط اور خوبصورت بنوا دیا۔ جب یہ پل بن کر تیار ہوا تو سلطان کے کان میں کسی شخص نے یہ آواز پہنچائی کہ سلطان نے یہ پل اس لیے بنوایا تھا کہ اس کو شطہ میں جانے آنے کے لیے آسانی ہو۔ یہ سن کر سلطان نے مرتے وقت تک اس پل پر قدم نہیں رکھا۔ عباسی ایجنٹ پوشیدہ طور پر اندلس میں اپنا کام کرتے ہی رہتے تھے۔ ادھر سلطان ہشام کا بھائی سلیمان افریقہ (مراکش) میں بیٹھا ہوا مسلمانوں اور عیسائیوں کو گمراہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ شمال کی جانب شارلیمین جو ہارون الرشید سے دوستی پیدا کر چکا تھا، اسی قسم کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ جلیقیہ کی نوزائیدہ عیسائی ریاست نے فرانسیسیوں اور اندلسی واقعہ پسندوں کی پشت پناہی پر علامات سرکشی ظاہر کرنا شروع کیں۔ سلطان ہشام نے بلاتوقف عبدالکریم بن عبدالواحد بن مغیث کو بلا کر جلیقیہ کی جانب

روانہ کیا۔لشکر اسلام نے جلیقیہ میں پہنچ کر سرکشوں کو نیچا دکھایا اور ان سے اقرار اطاعت لے کر واپس آیا۔ ابھی یہ بغاوت فرو نہ ہوئی تھی کہ بربریوں نے متحد ہو کر علم بغاوت بلند کیا۔ سلطان ہشام نے ان کی سرکوبی پر عبدالقادر بن ابان بن عبداللہ خادم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ عبدالقادر نے سخت معرکہ کے بعد بربری جمعیت کو منتشر اور ہزار ہا کو خاک وخون میں ملایا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۷۸ھ کا ہے۔ سنہ ۱۷۹ھ میں اہل جلیقیہ نے فرانسیسیوں کے ابھارنے سے پھر سرکشی کا اظہار کیا۔ سلطان نے عبدالملک بن عبدالواحد بن مغیث کو مع فوج اس طرف روانہ کیا اور حکم دیا کہ علاقہ جلیقیہ میں ہوتے ہوئے ملک فرانس کے اندر داخل ہو کر اس اسلامی لشکر سے ملو جو دوسری طرف سے فرانس میں داخل ہو گا۔ چنانچہ ایک لشکر دوسرے راستہ سے فرانس میں بھیجا گیا۔ جلیقیہ کے عیسائی رئیس اوفونش نے اسلامی لشکر کی آمد کا حال سن کر تمام راستے اور شہر خالی کر دیے اور خود اسلامی لشکر کے آگے آگے پہاڑوں میں بھاگتا اور چھپتا پھرا۔ چونکہ عبدالملک جلیقیہ میں زیادہ دن نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا، لہٰذا وہ باغی سردار کو مفرور دیکھ کر فرانس کی حدود میں داخل ہوا اور دوسرے اسلامی لشکر سے مل کر ملک فرانس کے اکثر شہروں اور قلعوں کو فتح کر کے مسمار کیا اور فتح وفیروزی کے ساتھ قرطبہ کی جانب واپس آیا۔

وفات:

ماہ صفر سنہ ۱۸۰ھ میں سلطان ہشام بن عبدالرحمٰن نے سات سال چند ماہ حکومت کرنے کے بعد چالیس سال، چار ماہ کی عمر میں وفات پائی۔

ہشام کی زندگی پر تبصرہ:

مسجد قرطبہ کی تعمیر میں اسّی ہزار دینار امیر عبدالرحمٰن نے صرف کیے تھے اور ایک لاکھ ساٹھ ہزار دینار سلطان ہشام نے اس مسجد کی تعمیر وتکمیل میں خرچ کیے۔ سلطان ہشام اپنے باپ کی طرح سفید مگر نہایت سادہ اور کم قیمت لباس پہنتا تھا۔ اس کو شکار کا شوق تھا لیکن نہ ایسا کہ امور سلطنت اور دین وملت کے کاموں میں حارج ہو۔ آخر ایام حیات میں اس کو بھی ترک کر دیا تھا۔ حاجت مندوں کے لیے اس کا دربار ہمیشہ کھلا ہوا تھا۔ مظلوموں کو اپنی داد رسی میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی۔ محتاجوں کی خبر گیری میں وہ خود راتوں کو اپنا آرام ترک کر دیتا تھا۔ مسافروں کو خود لے جا کر کھانا کھلاتا، اندھیری راتوں میں شہر کے گلی کوچوں میں گشت کرتا اور محتاجوں، بیواؤں، مسکینوں کی دستگیری

میں بڑا لطف پاتا۔ چوروں، ڈاکوؤں اور مجرموں سے جو زر جرمانہ وصول کرتا، وہ سرکاری خزانہ میں داخل نہ ہوتا بلکہ رعایا ہی کے بہبود کے کاموں میں صرف کیا جاتا۔لڑائیوں میں جو لوگ اتفاقاً عیسائیوں کی قید میں چلے جاتے، ان کو سرکاری خزانے سے فدیہ دے کر آزاد کرایا جاتا۔

سلطان ہشام نے قسم کھانے کو ایک بھی مسلمان، عیسائیوں کی قید میں باقی نہ چھوڑا، سب کو آزاد کرالیا تھا۔ اندلس میں ایک مسلمان نے مرتے وقت یہ وصیت کی تھی کہ اس کے ترکہ سے ایک ایک مسلمان قیدی عیسائیوں کی قید سے آزاد کرایا جائے۔ چنانچہ تمام عیسائی ممالک کو چھان مارا، مگر کوئی مسلمان، عیسائیوں کی قید میں نہ ملا کیونکہ سلطان ہشام نے تمام مسلمانوں کو پہلے ہی آزاد کرا دیا تھا۔

سلطان ہشام ایک مکان خریدنا چاہتا تھا اور اس مکان کے مالک سے گفتگو ہو رہی تھی۔ اسی اثناء میں سلطان کو معلوم ہوا کہ اس مکان کے قریب رہنے والا ایک شخص اس مکان کو خریدنا چاہتا ہے مگر وہ سلطان کی وجہ سے اس مکان کی خریداری کے ارادہ کو ترک کر چکا ہے۔ یہ سن کر سلطان مکان کی خریداری سے پیچھے ہٹ گیا۔ سلطان ہشام نے ایسے تجربہ کار اور دین دار لوگ مقرر کیے تھے جو صوبوں کے عاملوں کے طرز حکومت، عدل وانصاف اور دفاتر کی جانچ پڑتال کرتے اور ہر ایک صوبہ میں جا کر وہاں کی رعایا سے وہاں کے حاکموں کے متعلق شکایات سنتے تھے۔

سلطان ہشام کے عہد حکومت میں قرطبہ کے اندر وہاں کے امیروں اور مال دار لوگوں نے بڑی بڑی خوبصورت اور عظیم الشان عمارتیں بنوائیں، جس سے شہر کی رونق اور خوبصورتی میں اضافہ ہوگیا تھا اور علمی مجالس کا سلسلہ تو امیر عبدالرحمٰن ہی کے زمانے سے خوب زور وشور کے ساتھ اندلس میں جاری تھا لیکن سلطان ہشام نے علمی ترقیات کے اس سلسلے کو ترقی دینے کے علاوہ سب سے بڑا یہ کام کیا کہ مدارس میں عربی زبان کو لازمی قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز میں اندلس کے عیسائی عربی زبان سے واقف ہو کر قرآن مجید اور دین اسلام سے واقفیت حاصل کرنے کے قابل ہوئے اور بڑی کثرت سے بہ طیب خاطر اسلام میں داخل ہونے لگے اور عیسائیوں کی وہ وحشت اور نفرت جو مسلمانوں سے تھی، یکسر دور ہو کر اس کی جگہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں تعلقات محبت و مودت قائم ہونے لگے۔ عربی زبان کو لازمی قرار دینے کا اثر اشاعت اسلام کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ عیسائیوں کے اندر مسلمانوں کا احترام پیدا ہوا اور وہ اپنے عقائد وخیالات کی نادرستی وغلطی سے واقف ہونے لگے۔ دونوں قومیں ایک دوسرے کی رعایت کرنے لگیں اور نوبت یہاں

تک پہنچی کہ مسلمان عام طور پر عیسائی عورتوں سے شادیاں کرنے لگے۔ عیسائیوں نے خود ہی اسلامی لباس پہننا شروع کر دیا۔ سلطان ہشام کے عادات و خصائل اور طرز زندگی میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ساتھ بہت مشابہت تھی۔ اندلس کی تمام رعایا نے ہشام کو ''سلطان عادل'' کا خطاب دیا اور اسی نام سے اس کا ہر جگہ ذکر کیا جاتا تھا۔

سلطان ہشام اپنے باپ عبدالرحمٰن سے زیادہ عابد، زاہد اور دینی شخص تھا۔ امیر عبدالرحمٰن کی سطوت اور بانی سلطنت ہونے کی حیثیت سے مولویوں اور مولوی مزاج لوگوں کو دربار شاہی میں ایک درجے تک اقتدار حاصل کرنے کا موقع ملتا تھا لیکن سلطان ہشام کے عہد حکومت میں علماء کا اقتدار سب پر فائق تھا۔

اسی زمانے میں فقہا کے الگ مذاہب کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔[1] امام مالک بن انس رحمہ اللہ کی مدینہ میں بڑی شہرت تھی اور حجاز میں فقہ مالکی کی پیروی عام طور پر لوگ کرنے لگے تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ کی خدمت میں اندلس کے بعض مسلمان آئے اور کچھ عرصہ رہ کر اندلس واپس گئے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے سلطان ہشام کے حالات سن کر بڑی محبت و عقیدت کا اظہار کیا۔ چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں کوئی شخص اگر اس وقت خلیفۃ المسلمین ہونے کا مستحق ہے تو وہ صرف ہشام بن عبدالرحمٰن ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا یہ خیال بالکل درست تھا کیونکہ ہشام علاوہ عابد و زاہد ہونے کے عقلمند و مدبر اور بہادر بھی تھا۔ وہ بہادری اور قابلیت، سپہ سالاری میں اپنے باپ کا ہمسر اور زہد و عبادت میں اپنے باپ سے بڑھ کر تھا۔

امام مالک رحمہ اللہ کے یہ کلمات عباسیوں کو سخت ناگوار گزرتے تھے اور اس لیے عباسیوں کے ہاتھوں سے انہوں نے اذیتیں برداشت کیں۔ ہشام کے ابتدائی عہد حکومت میں فرعون بن عباس، عیسیٰ بن دینار اور سعید بن ابی ہند جو ملک اندلس کے مشہور علماء میں سے تھے، حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ اور بھی علماء اور اکابر تھے۔ ان لوگوں کی جب امام

---

[1] ابن جبیر اندلسی (المتوفی ۶۱۴ھ) نے اپنے سفرنامہ میں اپنا آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کیا ہے، جس میں انہوں نے بیت اللہ شریف میں حنبلی، شافعی، حنفی اور مالکی چار مصلوں کے قائم ہونے اور مسجد حرام، مکہ میں ایک ہی وقت میں ان چاروں مسالک کی الگ الگ نماز پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ یعنی اس وقت فرقہ بندی کا اتنا زور تھا کہ بیت اللہ شریف میں چاروں مسالک کے پیروکار اپنی الگ الگ نماز پڑھتے تھے۔ (بحوالہ دعوت تحقیق، صفحہ ۸، سید وقار علی شاہ)

مالک بن انس رحمہ اللہ سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ چند روز ان کی صحبت سے مستفیض ہو کر اندلس واپس گئے اور امام مالک رحمہ اللہ کے خیالات وعقائد کی اشاعت کرنے لگے۔ ان کی تبلیغ کا یہ اثر ہوا کہ اندلس کے قاضی القضاۃ ابوعبداللہ زید نے بھی مالکی مسلک کو پسند کیا۔ سلطان ہشام انہیں لوگوں کی سب سے زیادہ قدر ومنزلت کرتا اور انہیں لوگوں کو زیادہ اپنی صحبت میں رکھتا تھا۔ لہٰذا سلطان نے بھی امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کو قبول کر کے حکم دیا کہ ہر سال سرکاری خزانہ سے ان لوگوں کے مصارف برداشت کیے جائیں جو امام مالک کی خدمت میں قرآن اور حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جائیں۔ چنانچہ نومسلم عیسائیوں اور نومسلموں کی اولاد نے اس طرف زیادہ توجہ کی اور حقیقت یہ ہے کہ ان نومسلموں میں دینی احکام کی پابندی اور عبادات کا زیادہ شوق تھا۔ سلطان ہشام اور شیخ الاسلام ابوعبداللہ کے مالکی مسلک اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا مذہب مالکی ہوگیا اور تمام ملک میں مالکی فقہ کے موافق قاضیوں کے فیصلے صادر ہونے لگے،[1] ہشام کے عہد حکومت میں صدقات وزکوٰۃ کتاب وسنت کے بالکل موافق وصول کیے جاتے تھے۔

ولی عہدی:

سلطان ہشام نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے حکم کو اپنا ولی عہد بنایا اور ارا کین سلطنت سے حکم کی ولی عہدی کی بیعت لی۔ اس موقع پر حکم کو مخاطب کر کے ہشام نے مندرجہ ذیل کلمات بہ طور وصیت فرمائے:

"تم عدل وانصاف کو قائم رکھنے میں امیر وغریب کا مطلق امتیاز نہ کرنا۔ اپنے ماتحتوں سے رعایت اور مہربانی کا برتاؤ کرنا۔ اپنے صوبوں اور شہروں کی حفاظت وحکومت پر وفادار اور تجربہ کار لوگوں کو مامور کرنا۔ جو عامل رعایا کو بلاوجہ ستائے، اس کو سخت سزا دینا۔ فوج پر اپنا اقتدار مضبوطی اور اعتدال کے ساتھ قائم رکھنا اور اس بات کا بھی لحاظ رکھنا کہ فوج کا کام ملک کی حفاظت کرنا ہے، ملک کو تباہ کرنا نہیں۔ فوج کی تنخواہ ہمیشہ وقت پر دینا اور جو وعدہ کرو، اس کو ضرور پورا کرنا۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرنا کہ رعایا تم کو محبت کی نگاہ سے

---

1. اگرچہ مالکی مسلک میں مجموعی طور پر کتاب وسنت کی طرف رجحان ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے مالکی، حنبلی، شافعی اور حنفی مسالک کی تعریف اور تقسیم کی کوئی سند نازل نہیں فرمائی تھی۔ دین اسلام تو مسلمانوں کو صحیح نصوص یعنی قرآن وحدیث کے مطابق اتفاق واتحاد کا حکم دیتا ہے۔

دیکھے۔ رعایا کو زیادہ ڈرانا اور خوف زدہ بنا کر رکھنا استحکام سلطنت کے لیے مضر ہے۔ اسی طرح رعایا کا بادشاہ سے متنفر ہونا نقصان رساں ہے۔ کاشت کاروں کے حال سے کبھی بے خبر نہ ہونا۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا کہ فصلیں تباہ اور خراب نہ ہونے پائیں اور چراگاہیں برباد نہ ہو جائیں۔ تمہارا مجموعی طرز عمل ایسا ہو کہ تمہاری رعایا تم کو دعائیں دے اور تمہارے زیر سایہ خوشی سے اپنی زندگی گزارے۔ اگر تم نے ان باتوں کو ملحوظ رکھا تو تم شاندار بادشاہ کی فہرست میں شامل ہو سکو گے۔''

سلطان ہشام کا تمام عہد حکومت لڑائیوں اور چڑھائیوں میں گزرا لیکن جب اس کے دینی، علمی، اخلاقی، معاشرتی کارناموں پر غور کیا جائے تو اس بات کا تصور دشوار ہو جاتا ہے کہ سلطان ہشام نے جنگی کارنامے بھی کیے ہوں گے اور بڑے بڑے بادشاہوں کو نیچا دکھایا ہوگا، کثیر التعداد بغاوتوں کو فرو کیا ہوگا اور ہر ایک میدان میں فتح پائی ہوگی۔ بہرحال ملک اندلس میں خاندان بنو امیہ کی حکومت وخلافت کے قائم ہونے اور قائم ہو کر تین سو برس تک باقی رہنے کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ امیر عبدالرحمٰن بانی حکومت اندلس کے بعد ہشام جیسا ہمہ صفت موصوف سلطان تخت اندلس کا وارث و مالک ہو۔ اگر سلطان ہشام کی جگہ کوئی دوسرا کم قابلیت والا سلطان ہوتا تو خاندان عبدالرحمٰن بن امیہ میں سلسلہ سلطنت کا قائم ہونا بے حد دشوار تھا۔ افسوس ہے کہ سلطان ہشام کی مدت سلطنت بہت تھوڑی رہی یعنی صرف سات برس اور آٹھ مہینے اس نے حکومت کی۔ تاہم اس کی تلافی اس طرح ہوگئی کہ ہشام کے بعد حکم بن ہشام بھی ایک نہایت موزوں شخص تھا جو تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوا۔

حکم بن ہشام

حکم بن ہشام اپنے باپ کی وفات کے بعد سنہ ۱۸۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی بہت بڑی بغاوت نے سر ابھارا۔

حکم کے چچا سلیمان اور عبداللہ کی بغاوت:

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلطان ہشام کا بھائی سلیمان افریقہ (مراکش) میں مقیم تھا، جیسا

کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ سلیمان خط و کتابت کے ذریعہ سے اندلس کے اندر بھی مادہ بغاوت پیدا کرنے میں مصروف تھا۔ ہشام کا دوسرا بھائی عبداللہ طیطلہ کے متصل اپنی جاگیر میں مقیم تھا۔ سلطان ہشام کی وفات کا حال سن کر عبداللہ فوراً طیطلہ سے بھاگ کر اپنے بھائی سلیمان کے پاس گیا جو مراکش کے شہر تنجہ میں مقیم تھا اور اس کے پاس بربریوں اور ڈاکہ زنوں کی ایک کافی تعداد موجود تھی۔ وہاں کے علاقے کو ان لوگوں نے اپنی لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کی جولان گاہ بنا رکھا تھا۔ تنجہ میں دونوں بھائیوں نے سلطنت پر قبضہ کرنے کا مشورہ کیا۔ شارلیمین بادشاہ فرانس سے اور دوسرے سرحدی رئیسوں سے پہلے ہی سلیمان نے ساز باز کر رکھی تھی۔ اب تجویز یہ قرار پائی کہ عبداللہ خود شارلیمین کی خدمت میں فرانس جائے اور اس کو اندلس پر حملہ کرنے کی ترغیب دے یعنی بادشاہ فرانس کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اندلس پر فوج کشی کر کے اس بغاوت کو جو ہم اندرون ملک میں برپا کریں گے، کامیاب بنا دے۔ عبداللہ، شارلیمین کے پاس گیا۔ وہاں شارلیمین نے وعدہ کیا اور ایک جرار فوج مرتب کر کے اپنے بیٹے کی سپہ سالاری میں سرحد اندلس پر روانہ کر دی۔ عبداللہ نے واپس آ کر طیطلہ کے عامل کو اپنے حسب منشا بغاوت پر آمادہ کر کے طیطلہ پر خود قبضہ کر لیا۔ طیطلہ اندلس کا قدیمی دارالسلطنت یعنی شاہان وزیگاتم کا دارالحکومت تھا، یہاں عیسائیوں کی آبادی بہت زیادہ تھی اور مسلمان بھی وہ نومسلم تھے جو اپنے عیسائی بزرگوں اور قدیمی عیسائی بادشاہ کے افسانوں کو فخریہ بیان کرنے اور یاد رکھنے کے عادی تھے۔ اس لیے طیطلہ کے عیسائیوں اور عیسائیوں کے ہم قوم نومسلموں کو بڑی آسانی سے بغاوت پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ یہاں امیر عبدالرحمٰن کو بھی بہت عزت و محبت کے ساتھ یاد کیا جاتا اور عبدالرحمٰن کے بیٹے عبداللہ کو بہ مقابلہ عبدالرحمٰن کے پوتے حکم سے زیادہ مستحق تکریم سمجھا جاتا تھا۔ غرض ایسے بہ کثرت اسباب موجود تھے کہ عبداللہ کو طیطلہ پر قبضہ کرنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ ادھر سلیمان بن عبدالرحمٰن نے مراکش سے اندلس کے صوبہ بلنسیہ میں پہنچ کر اپنے آپ کو خاندان سلطنت میں سب سے زیادہ مستحق اور بڑی عمر کا شخص ہونے کی وجہ سے مستحق سلطنت بتا کر اپنی امارت و سلطنت کا اعلان کر دیا اور اس صوبہ میں اپنا عمل دخل بڑھا دیا۔

سلیمان و عبداللہ کے اعلان بغاوت سے متصل ہی حسب قرارداد شارلیمین کے بیٹے نے جبل البرتات سے گزر کر اندلس کے میدان میں قدم رکھا اور کئی شہروں کو فتح کرنے کے بعد برشلونہ کا محاصرہ کر لیا۔ برشلونہ کے عامل زید نے شارلیمین کی اطاعت قبول کر لی مگر قلعہ کے اندر فرانسیسی فوج

کو داخل نہیں ہونے دیا۔ ادھر ایکیوٹین کی ریاست کے فرماں روا مسمی لوئی نے جبل البرتات کے مغربی حصہ کو عبور کر کے اندلس کے شمالی و مغربی علاقے کو تاخت و تاراج کر ڈالا اور لاردہ و وشقہ پر قابض ہو گیا۔ اندرون ملک سلیمان و عبداللہ نے ملک کے نہایت اہم اور مرکزی شہروں اور صوبوں پر قبضہ کر لیا اور شمال کی جانب سے عیسائیوں نے زبردست حملہ کر کے شمالی اندلس کو تہ و بالا کر دیا۔ یہ خطرات معمولی نہ تھے اور اندلس کے ہاتھ سے نکل جانے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔

حکم کی مدافعت:

سلطان حکم بن ہشام نے سب سے پہلے طیطلہ کی بغاوت کا حال سنا اور فوراً فوج لے کر طیطلہ کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں عبداللہ نے مدافعت میں مستعدی دکھائی۔ ابھی اس محاصرہ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تھا کہ شمالی اندلس کے قبضہ سے نکل جانے اور عیسائیوں کے حملہ آور ہونے کی اطلاع پہنچی۔ سلطان حکم نے عیسائی حملہ کو اپنا چچاؤں کی بغاوت سے زیادہ اہم اور خطرناک سمجھ کر طیطلہ سے محاصرہ اٹھا کر فوراً شمال کی جانب کوچ کر دیا۔ حکم کے قریب پہنچنے کی خبر سن کر شارلیمین کی افواج برشلونہ اور نواح برشلونہ سے نہایت عجلت کے ساتھ فرار ہو گئیں اور اس طرح فرار ہوئیں کہ راستے میں کسی جگہ انہوں نے ٹھہرنا اور دم لینا مناسب نہیں سمجھا بلکہ فرانس ہی میں جا کر دم لیا۔ اس کے بعد سلطان حکم وشقہ اور لاردہ کی جانب متوجہ ہوا۔ وہاں کی عیسائی افواج بھی قتل و غارت کے ہنگامے برپا کرنے کے بعد سلطان حکم کے قریب پہنچنے کی خبر سن کر بھاگ گئی اور اکیوٹین میں جا کر دم لیا۔ سلطان نے اندلس کا علاقہ عیسائیوں سے خالی کرا کر کوہ پیری نیز جبل البرتات کے شمال میں پہنچ کر فرانس کے جنوبی حصے کو تاخت و تاراج کیا اور شہر ناربون کو عیسائیوں سے چھین لیا، ادھر حکم عیسائیوں کے تعاقب میں فرانس تک پہنچ گیا۔ ادھر عبداللہ اور سلیمان نے موقع پا کر اندلس کے شہروں پر قبضہ کرنا اور سلطان حکم کے عاملوں کو بے دخل کرنا شروع کیا۔ یہ دونوں بھائی فتوحات کرتے ہوئے دریائے ٹیکس پر ایک دوسرے سے آ ملے مگر اس کے بعد انہوں نے اپنی فتوحات کو جاری نہیں رکھا بلکہ دونوں اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ فرانس میں حکم کے ساتھ کیا معاملہ پیش آتا ہے؟ یہ دونوں اس بات کے خواہشمند تھے کہ فرانسیسی حکم پر غالب آ جائیں اور حکم کا وہیں خاتمہ ہو جائے تو ہم تمام ملک اندلس پر قابض و متصرف ہو کر اپنی حکومت شروع کریں۔ اسی طرح حکم کے عامل بھی اسی انتظار میں اپنی اپنی جگہ خاموش اور متامل تھے کہ دیکھیے حکم کے اس عاجلانہ حملہ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ اللہ نہ کرے! اگر حکم فرانس

میں مارا جاتا تو تمام عامل بہ خوشی سلیمان وعبداللہ کی اطاعت قبول کر لیتے کیونکہ یہ دونوں امیر عبدالرحمٰن کے بیٹے تھے مگر فرانس میں جب حکم داخل ہوا تو وہاں کی افواج پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ وہ اس کے آگے ہر مقام پر بھاگتی ہوئی نظر آئیں۔ ممکن تھا کہ حکم اس ملک کو فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کرنے اور اپنے عامل مقرر کرنے کی کوشش کرتا اور کچھ روز فرانس میں گزارتا لیکن اس کو معلوم تھا کہ اندلس کے اندر کیسے طاقتور دشمن موجود ہیں اور وہاں اس کی غیر موجودگی کس قدر مضر ثابت ہو سکے گی۔ چنانچہ وہ عیسائیوں کو خوف زدہ بنا کر فوراً ہی اندلس کی جانب لوٹا۔

سلیمان وعبداللہ کا انجام:

سلیمان وعبداللہ نے اپنی طرف سے عبیدہ بن عمیرہ کو طیطلہ کا گورنر مقرر کر کے اور خود فوجیں لے کر حکم کو آگے بڑھ کر روکا۔ حکم کے فتح مند واپس آنے سے ان دونوں کی ہمتیں پست ہو چکی تھیں۔ مقابلہ ہونے پر دونوں نے شکست کھائی اور فرار ہو کر اندلس کے مشرقی کوہستان میں جا کر پناہ لی۔ سلطان حکم نے عمرو بن یوسف اپنے ایک سردار کو تو طیطلہ کے محاصرہ پر مامور کیا اور خود سلیمان وعبداللہ کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ کئی مہینے تک سلیمان وعبداللہ پہاڑوں میں حکم کو پریشان کرتے ہوئے پھرے اور کہیں مقابلہ نہ ہوا۔ آخر وہ مرسیہ کے اسی میدان میں نکلے جہاں چند روز پہلے بہ حالت شہزادگی حکم نے سلیمان کو شکست دی تھی۔ ادھر سلیمان حکم بھی مقابلہ پر پہنچ گیا۔ دونوں فوجوں نے خوب جم کر اور جی توڑ کر ایک دوسرے کا مقابلہ کیا۔ آخر ایک تیر سلیمان کے آ کر لگا اور اس کا کام تمام ہو گیا۔ سلیمان کے مارے جاتے ہی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ عبداللہ نے فرار ہو کر بلنسیہ میں جا کر قیام کیا اور سلطان حکم کے پاس عفو تقصیرات کی درخواست بھیجی۔ حکم نے چچا کی اس درخواست کو فوراً منظور کر کے یہ شرط پیش کی کہ آپ اپنے دونوں بیٹوں اصبغ اور قاسم کو میرے پاس بہ طور یرغمال چھوڑ دیں اور اندلس سے روانہ ہو کر مراکش کے مقام تنجہ میں جائیں اور وہیں قیام کریں۔ عبداللہ نے فوراً اس کی تعمیل کی اور تنجہ میں جا کر مستقل سکونت اختیار کی۔ حکم اپنے دونوں چچا زاد بھائیوں کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتا رہا اور چھوٹے بھائی کو شہر مریدہ کا عامل مقرر کر کے بڑے کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ ادھر سلطان حکم سلیمان وعبداللہ کے تعاقب میں مصروف تھا، ادھر عمر بن یوسف نے شہر طیطلہ کو فتح کر کے عبیدہ بن عمیر کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اور اپنے بیٹے

یوسف بن عمر کو طیطلہ کا حاکم مقرر کر کے خود عبیدہ کا سر لے کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے بعد سرقطہ میں بغاوت نمودار ہوئی۔ عمر بن یوسف اس طرف گیا اور وہاں کے باغیوں کو قرار واقعی سزا دے کر اس بغاوت کو فرو کیا۔ ان تمام خطرناک بغاوتوں کا سلسلہ سنہ ۱۸۱ھ میں شروع ہوا تھا۔ اب تین برس کے بعد سنہ ۱۸۴ھ میں فرو ہوا اور تمام ملک اندلس میں امن واطمینان اور سکون نظر آنے لگا۔

عیسائیوں کی ایک منظّم سازش:

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ان بغاوتوں کے شروع میں امیر حکم عیسائیوں کو سزا دینے کے لیے فرانس میں داخل ہوا تھا اور عیسائی افواج اس کے مقابلے پر نہیں ٹھہر سکی تھیں۔ اس تین سال کے عرصہ میں کلیساؤں نے اپنی یتیم وزبوں حالت کو محسوس کر کے مسلمانوں کے خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے نہایت موزوں اور صحیح تدابیر سوچیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلسلہ جبل البرتات کے مغربی حصہ میں جہاں خلیج بسکی، صوبہ جلیقیہ اور فرانس کی حدود ملتی ہیں، ایک ریاست عیسائیوں کی ریاست ایسٹریاس کے نام سے قائم ہو چکی تھی۔ یہ ریاست پہلے کی نسبت صوبہ جلیقیہ کے میدانوں تک وسیع ہو چکی تھی۔ ایک زبردست ریاست جبل البرتات کے مشرقی حصے کے شمال اور فرانس کے جنوب میں گاتھ قوم کے سرداروں نے اندلس سے خارج ہو کر قائم کر لی تھی۔ یہ ریاست خوب طاقتور تھی اور ریاست ایکیوٹین کے نام سے مشہور تھی۔ ادھر ملک فرانس میں سب سے زیادہ وسیع ملک پر ایک قدیمی سلطنت قائم تھی جس کا بادشاہ شارلیمین تھا۔ اس کے علاوہ صوبہ برشلونہ، اراگون، اربونیہ اور خلیج بسکی کے جنوبی ساحل یعنی جلیقیہ وغیرہ میں سرکش عیسائیوں کی غالب آبادی تھی۔ مسلمان برائے نام اس طرف کہیں کہیں آباد نظر آتے تھے۔ ان شمالی علاقوں کی حکومت ہمیشہ معرض خطر میں رہتی تھی اور عیسائی قبائل جب کبھی اپنے مسلمان حاکموں کو کمزور دیکھتے تھے تو بغاوت پر آمادہ ہو جاتے یا آمادہ کیے جا سکتے تھے۔

سلطان حکم کو اندرونی بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف دیکھ کر عیسائیوں نے ایک زبردست کونسل یا مجلس مشاورت شہر ٹولور میں منعقد کی۔ اس مجلس میں مذکورہ بالا تمام عیسائی ریاستوں اور حکومتوں کے سردار، اندلس کے شمالی حصوں کے عیسائی امراء سب جمع ہوئے اور مسلمانوں کے خلاف ایک زبردست عیسائی اتحاد قائم کیا گیا۔ ایکیوٹین اور فرانس کے بادشاہوں میں صلح قائم ہوئی۔ اسی

طرح ایسٹریاس کی ریاست نے جواب تک سب سے الگ اور بے تعلق تھی، اس اتحاد میں شرکت کی اور جبل البرتات کے جنوب اور اندلس کے شمال میں جہاں سرکش اور جنگجو عیسائیوں کی غالب آبادی تھی، عیسائی ریاستیں قائم کرنے کی تجویز سوچی گئی۔ مسلمانوں نے بارہا جبل البرتات کو طے کیا اور فرانس کے میدانوں میں اپنے گھوڑے دوڑائے لیکن فرانسیسیوں کو جبل البرتات کو عبور کرنا ہمیشہ دشوار اور نقصان رساں ثابت ہوا۔

مسلمانوں کے مقابلے کے لیے ایک جدید ریاست کا قیام:

شارلیمین بادشاہ فرانس نے جنوبی فرانس کا ایک ٹکڑا جو جبل البرتات کے دامن میں تھا، الگ کر کے ایک چھوٹی سی جدید ریاست قائم کی اور وہاں کا حاکم فرانس کا ایک رئیس بوریل نامی مقرر کیا گیا۔ اس ریاست کا نام ''گاتھک مارچ'' رکھا گیا اور اس کے رئیس کو خود مختار حاکم قرار دے کر اس امر کی ہدایت کی گئی کہ وہ مسلمانوں کے لیے جبل البرتات کو ناقابل گزر بنائے اور ان کو روکنے کے لیے ہمیشہ مستعد و تیار رہے۔ اس ریاست کو بادشاہ ایکیوٹین کی سرپرستی میں دے دیا گیا۔ جبل البرتات کے دامن میں جا بہ جا مناسب مواقع پر زبردست قلعے تعمیر کیے گئے اور اس اُمید پر اندلس کے شمالی عاملوں کے ساتھ تعلقات اور دوستی پیدا کرنے کے ذرائع سوچے گئے کہ ان کو بغاوت پر بہ آسانی آمادہ کیا جا سکے۔ ان تمام عزائم اور تیاریوں کی اطلاع خلیفہ بغداد کو بھی دی گئی اور ہارون الرشید کی طرف سے دوستی بڑھانے اور تحف وہدایا بھیجنے کے ذریعہ سے ہمت افزائی ہوئی۔ اس نئی ریاست گاتھک مارچ نے جبل البرتات کے مشرقی وجنوبی حصے پر بھی قبضہ جما لیا اور شمالی اندلس کے عیسائیوں نے اس کے لیے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی۔ غرض یہ نئی ریاست ایسٹریاس کی ریاست کے نمونہ پر ایک پہاڑی ریاست بن گئی اور جس طرح ایسٹریاس کی ترقی و طاقت میں پادریوں نے خاص طور پر اضافہ کی کوشش کی تھی، اسی طرح اس ریاست کو طاقتور بنانے کو بھی مذہبی کام قرار دیا گیا۔ وہ عیسائی جو ایکیوٹین، ایسٹریاس یا فرانس کی حکومتوں اور حاکموں سے کسی سبب سے ناراض و ناخوش تھے، وہ بہ جائے اس کے کہ مسلمانوں کی حکومت میں آ کر آباد ہوتے، اس نئی ریاست میں آ کر آباد ہونے لگے اور کوہی علاقہ جو بالکل ویران وغیر آباد پڑا ہوا تھا، آباد اور پر رونق ہونے کے علاوہ خوب طاقتور بھی ہو گیا۔

غدار مسلم عاملوں کی عیسائیوں کی ہمت افزائیاں:

سنہ ۱۸۴ھ کے آخر میں حکم کو مشکل سے اطمینان حاصل ہوا تھا کہ چند ہی روز کے بعد سنہ ۱۸۵ھ میں عیسائیوں نے شمالی اندلس میں پھر ہلچل پیدا کر دی اور بعض شمالی شہروں کے عاملوں نے شارلیمین کو خلیفہ بغداد کا دوست اور ایجنٹ سمجھ کر اور اس کی حمایت واعانت کو جائز جان کر سلطان حکم کے خلاف آمادہ ہو جانا ہی ثواب کا کام سمجھا۔ کیونکہ سلطان حکم کی دینداری پر عام لوگوں کو شک تھا اور اکثر اس پر اعتراضات ہوتے رہتے تھے۔ اس موقع پر ان جاسوسوں نے بھی جو خلیفہ بغداد کی طرف سے اندلس میں مامور تھے، کام کرنے کا خوب موقع پایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وشقہ، گیرون، لون، لریدہ اور ترکونہ وغیرہ شمالی شہروں کے عاملوں نے بادشاہ فرانس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر کے سلطان حکم کی فرماں برداری سے انکار اور شارلیمین کے احکام کی اطاعت کا اقرار کیا۔ اس طرح یک ریاست ''گاتھک مارچ'' اندلس کے شمالی میدان میں وسیع ہو کر اور ان مسلمانوں کو مطیع پا کر خوب طاقتور اور مضبوط ہو گئی۔

اسی طرح جلیقیہ اور ساحل بسکی کے عاملوں نے جس میں حاکم سرقسطہ بھی شامل تھا، عیسائی سلاطین کی اطاعت کا اعلان اور حکم سے بغاوت کا اظہار کیا۔ اس نئی مصیبت کے مقابلے کو سلطان حکم خود اس لیے قرطبہ سے حرکت نہ کر سکا کہ یہاں دارالحکومت کی بھی ہوا خراب ہو رہی تھی اور ضرورت تھی کہ سلطان دارالحکومت میں مقیم رہ کر بغاوت وسرکشی کے ان جراثیم کا علاج کرے جو ملک کے گوشہ گوشہ میں سرایت کر گئے تھے اور جن کو خود سلطان کے رشتہ داروں اور مسلمانوں نے تقویت پہنچائی تھی۔ شمالی حصہ ملک کو بچانے اور عیسائیوں کے قبضے سے نکالنے کے لیے اپنے سپہ سالار ابراہیم کو روانہ کیا۔ ابراہیم نے اول جلیقیہ وسرقسطہ کی جانب فوج کشی کی اور اس علاقے کو بہت سی لڑائیوں اور خون ریزیوں کے بعد عیسائیوں سے واپس چھینا۔ باغی عامل، عیسائی فوج اور عیسائی باشندوں کے ساتھ بھاگ بھاگ کر شارلیمین کے پاس فرانس پہنچے اور ان کو اندلس پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ ابراہیم بھی جلیقیہ وسرقسطہ وغیرہ کی طرف اس طرح مصروف ہوا کہ اندلس کے شمالی ومغربی حصے کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ ان مسلمان عاملوں نے جو شارلیمین کے پاس پہنچ گئے تھے، اس کو مشورہ دیا کہ اندلس کے قدیمی گاتھک دارالسلطنت کو آپ بہ آسانی قبضہ میں لا سکتے ہیں اور ہم اس کام میں آپ کی رہنمائی اور امداد کرنے کو موجود ہیں۔ مسلمان عاملوں کی اس ہمت افزائی نے

عیسائیوں کے حوصلوں کو بہت بلند کر دیا۔ چنانچہ ایک مجلس مشاورت فرانس میں منعقد ہو کر یہ قرار پایا کہ ریاست گاتھک مارچ کی حدود میں برشلونہ کی بندرگاہ کو بھی ضرور شامل کر لیا جائے۔ برشلونہ کا عامل زید بھی شارلیمین اور کونٹ لوئی سے خط و کتابت رکھتا اور ان کی طرف داری کا اقرار کر چکا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۸ھ کے آخر ایام میں عیسائی فوجیں گاتھک مارچ کی فوجوں کے ساتھ شامل ہو کر اندلس کے شمالی و مشرقی صوبہ کو پامال کرتی ہوئی برشلونہ تک پہنچیں۔ یہاں کے عامل زید نے ان فوجوں کے آنے پر برشلونہ کے دروازوں کو بند کر لیا اور عیسائیوں کے قبضے میں دینے سے صاف انکار کر دیا۔ عیسائی افواج نے برشلونہ کا محاصرہ کر لیا۔ عیسائیوں نے برشلونہ کے مضافات کو تباہ و برباد کر کے محاصرہ میں سختی سے کام لیا۔ زید کو کوئی امداد کسی طرف سے نہیں پہنچی۔ آخر برشلونہ پر عیسائیوں نے اس شرط کے ساتھ قبضہ پا لیا کہ وہ مسلمانوں کو وہاں سے اپنے اسباب منقولہ کے ساتھ نکل جانے دیں گے۔ مسلمانوں نے برشلونہ کو خالی کر دیا۔ عیسائی فوجیں اس میں داخل ہو گئیں اور شاہ ایکیوٹین نے قلعہ برشلونہ کو خوب مضبوط کر کے وہاں ایک گورنر مقرر کر دیا۔ یہ نو مفتوحہ تمام علاقہ گاتھک مارچ کی ریاست میں شامل ہو گیا۔ اسلامی فوجوں کے لیے شمالی اندلس میں اب دو محاذ جنگ قائم ہو گئے۔ ایک ریاست ایسٹریاس اور صوبہ جلیقیہ کی سرکش عیسائی آبادی کا، جن کو فرانس کی جانب سے برابر امداد پہنچتی رہتی تھی۔ دوسرا گاتھک مارچ اور برشلونہ کے علاقے کی باغی عیسائی رعایا کا جن کو ابھی فرانس کی جانب سے امداد پہنچ رہی تھی۔ ادھر جنوب میں سازشوں کا جال پھیلا ہوا تھا اور مسلمان مولویوں نے نہایت سخت مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ فوجیں جو عیسائیوں کی مدافعت کے لیے روانہ کی گئیں، وہ کسی ایک ہی محاذ پر عیسائیوں کے مقابلہ میں مصروف رہ سکتی تھیں۔ چنانچہ صوبہ جلیقیہ کی طرف جا کر انہوں نے عیسائیوں کو ہزیمت دی تو دوسرا محاذ خالی رہا اور برشلونہ قبضہ سے نکل گیا۔ اسی طرح اگر وہ برشلونہ کی طرف متوجہ ہوتیں تو سرقسطہ و جلیقیہ وغیرہ پر عیسائیوں کا قبضہ قائم رہتا اور وہ مزید پیش قدمی کرتے۔

سنہ ۱۸۹ھ میں اندلس کے مسلمان باغی عاملوں نے عیسائیوں کو ترغیب دے کر طیطلہ پر حملہ کرایا۔ عیسائیوں نے برشلونہ اور شمالی شہروں سے طیطلہ کی طرف حرکت کی۔ ادھر یوسف بن عمر نے مدافعت پر مستعدی ظاہر کی۔ آخر عیسائیوں نے طیطلہ کا محاصرہ کر لیا اور شہر طیطلہ اور اس کے نواح کی عیسائی آبادی نے حملہ آوروں کے لیے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچا کر یوسف بن عمر طیطلہ کو

عیسائیوں کے ہاتھ میں گرفتار اور عیسائیوں کا طیطلہ پر قبضہ کرا دیا۔ عیسائیوں نے یوسف بن عمر کو صخرۂ قیس میں قید کر دیا اور ملک اندلس کے قدیمی دارالسلطنت پر قابض ہو کر بے حد مسرور ہوئے۔ طیطلہ کی خبر یوسف بن عمر کے باپ عمر بن یوسف کو پہنچی تو وہ سرقسطہ کی جانب سے ایک جرار فوج لے کر طیطلہ کی جانب چلا۔ یہاں آ کر معرکہ عظیم کے بعد طیطلہ کو فتح کیا۔ یوسف بن عمر کو آزاد کرایا اور عیسائیوں کو وہاں سے مار بھگایا۔ طیطلہ پر عیسائیوں کا قبضہ کرانے میں باشندگان طیطلہ نے جن میں زیادہ تر عیسائی ہی تھے، زیادہ موثر کوشش کی تھی۔ لہٰذا سب سے زیادہ عتاب و عذاب کے مستحق عیسائیان طیطلہ ہی تھے جنہوں نے طیطلہ کی حکومت کو بے حد مخدوش بنا رکھا تھا، مگر عمر بن یوسف نے دوراندیشی اور ہوشیاری سے کام لے کر ان غداروں کو کچھ نہیں کہا اور جو جو عذرات پیش کیے، سب کو منظور کر کے ان کو مطمئن بنا دیا۔

حکم کی مخالفت کے اسباب:

سلطان حکم اگرچہ بہادر شخص تھا مگر جب سے اس کی حکومت شروع ہوئی تھی، لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری تھا اور اندلس کی سلطنت کے بعض حصے کٹ کٹ کر عیسائیوں کے قبضے و تصرف میں جا رہے تھے۔ عیسائی طاقتور اور مسلمان کمزور ہوتے جاتے تھے۔ اس کا سب سے بڑا سبب خود مسلمانوں کی خانہ جنگی اور ناعاقبت اندیشی تھی۔ حکم کے رشتہ داروں نے حکم کی مخالفت اور خود حکومت حاصل کرنے کی کوشش میں تیغ و تیر سے کام لینے میں جس طرح تامل نہیں کیا تھا، اسی طرح انہوں نے خفیہ سازشوں اور بغاوتوں کو برپا کرانے کی کوشش میں بھی دریغ نہیں کیا۔ اسی پر بس نہیں ہوا بلکہ عیسائیوں کو ہر قسم کی امداد بہم پہنچائی۔ دوسرے دشمن عیسائی تھے جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور اندلس کی اسلامی سلطنت کو کمزور کرنے کے لیے آپس میں متحد و متفق ہو چکے تھے۔ تیسرے دشمن عباسی تھے جن کی طرف سے حکم کے رشتہ داروں اور عیسائیوں دونوں کی ہمت افزائی ہوتی رہتی تھی۔ خود اندلس کے اندر ان کے حامی موجود تھے جو حکم کو نقصان پہنچانے اور اس کی حکومت کو مٹانے کی تدبیروں میں مصروف رہتے تھے۔ ان تینوں دشمنوں کے علاوہ ایک چوتھا زبردست دشمن اور پیدا ہو گیا تھا۔ یہ مالکی گروہ کے فقہاء و علماء تھے جن کا سلطان ہشام کے زمانے میں سلطنت و حکومت میں بڑا اثر و اقتدار تھا، وہی سلطان ہشام کے مشیر و وزیر اور وہی تمام محکموں کے مالک و مہتمم تھے۔ مذہبی

پیشوا ہونے کے سبب سے عوام اور بھی زیادہ ان کے زیر اثر تھے۔ سلطان حکم نے تخت نشین ہو کر ان مولویوں کے بڑھے ہوئے اقتدار کو کم کرنے کی کوشش کی اور ان کی صحبت کو اپنے لیے ضروری نہ سمجھا۔ سلطان کی یہ خودرائی یا خود آرائی ان کو سخت ناگوار گزری۔ وہ سلطان کے خلاف نکتہ چینی اور عیب شماری میں مصروف ہو گئے۔ یحییٰ بن یحییٰ قرطبہ کے قاضی القضاۃ اور اندلس کے شیخ الاسلام بنا دیے گئے تھے۔ وہ اپنے اثر واقتدار اور احترام واختیار کو کم دیکھ کر اور بھی زیادہ سلطان کے اعمال وافعال پر رائے زنی کرنے میں مصروف ہوئے۔ اس قسم کے تمام مشہور علماء جو مالکی مذہب میں داخل اور سلطان ہشام کے عہد میں حکومت وسلطنت میں دخیل تھے،فتویٰ بازی پر اتر آئے۔ اندلس میں یہ فقہی مذہب نیا جاری ہوا تھا۔ اس سے پیشتر کوئی مسلمان ان فقہی مذاہب کی تخصیص وتفریق سے واقف نہ تھا۔ لہٰذا وہ تمام لوگ جو مالکی مذہب میں داخل تھے،خاص طور پر سلطان حکم کے دشمن اور مخالف ہو گئے۔ اس چوتھے دشمن کی مخالفت کے نتائج سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئے اور اسی کی وجہ سے سلطان حکم باقی تینوں دشمنوں کا قرار واقعی انسداد نہ کر سکا اور عیسائیوں کو طاقتور بننے اور اسلامی حکومت کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا موقع ملتا رہا۔ بہرحال سلطان حکم کے زمانے میں مذکورہ بالا چاروں مخالف طاقتوں نے مل کر عیسائیوں کو طاقتور ہونے کا خوب آزاد موقع دیا۔ اس معاملے میں سلطان حکم کی بد احتیاطی اور آزاد مزاجی کو بھی ملزم قرار دیا جا سکتا ہے مگر نہ اتنا کہ جس قدر عام طور پر مورخ اس سلطان کو مجرم اور ملزم قرار دیتے ہیں۔

سنہ ۱۹۰ھ میں مولویوں کے گروہ نے اپنی سازشوں اور کوششوں کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کیا۔ قاضی القضاۃ یحییٰ بن یحییٰ اور فقیہ طالوت وغیرہ علمائے قرطبہ نے اپنے ہم خیال علماء وامراء کو مجتمع کر کے حکم کی معزولی کا مشورہ کیا اور یحییٰ کی سرکردگی میں ایک وفد قاسم بن عبداللہ یعنی سلطان حکم کے چچیرے بھائی اور داماد کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے کہا کہ آپ کو ہم تخت اندلس پر بٹھانا اور بادشاہ بنانا چاہتے ہیں۔ قاسم نے کہا کہ پہلے مجھ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کون کون لوگ ہیں جو اس کام پر آمادہ ہیں؟ اگر ان کی جمعیت اور طاقت اس قابل ہے کہ وہ سلطان حکم کو معزول کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو میں بہ خوشی آپ کے مشورے میں شریک ہو سکتا ہوں۔ لہٰذا کل آپ ان لوگوں کے ناموں کی فہرست میرے سامنے لائیں۔ قاضی یحییٰ اس فہرست کا وعدہ کر کے واپس آئے۔ اگلے دن جب فہرست لے کر پہنچے تو قاسم بن عبداللہ نے سلطان حکم کو پہلے ہی اپنے مکان

میں بلا کر اور پس پردہ چھپا کر بٹھا لیا تھا۔ قاضی یحییٰ نے ان لوگوں کے نام قاسم کے منشی کو لکھوانے شروع کیے۔ ادھر پس پردہ سلطان حکم کا منشی بھی سلطان حکم کے پاس بیٹھا ہوا ان لوگوں کے نام لکھ رہا تھا۔ حکم کے منشی کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں میرا بھی نام نہ لے دیا جائے۔ اس لیے اس نے قلم کو کاغذ پر اس طرح چلانا شروع کیا جس سے صریر قلم یعنی قلم کی آواز نکلنے لگی۔ پس پردہ لکھنے کی آواز سن کر قاضی صاحب اور ان کے ہمراہیوں کو شبہ ہوا کہ کوئی چھپا ہوا بیٹھا ہے اور ان ناموں کو لکھ رہا ہے۔ اس شبہ کے پیدا ہوتے ہی یہ لوگ وہاں سے اٹھ اٹھ کر بھاگے۔ کچھ تو نکل گئے، باقی اسی مکان میں گرفتار کر کے قتل کر دیے گئے، جن کی تعداد ۷۲ تھی۔ اس کے بعد بغاوت کا علم علانیہ بلند کر دیا گیا۔ قرطبہ کے جنوب کی جانب دریائے وادی الکبیر کے پار ایک محلّہ آباد تھا۔ اس محلّہ میں عام طور پر یہی لوگ رہتے تھے جو ان مولویوں کے زیر اثر اور زیادہ عیسائی قوم کے نومسلم تھے۔ ان لوگوں نے ہجوم کر کے سلطان حکم کے محل پر حملہ کر کے محاصرہ کر لیا مگر حکم نے سب کو منتشر کر دیا اور معمولی کشت و خون کے بعد یہ ہنگامہ فرو ہو گیا۔

اسی سال یعنی سنہ ۱۹۰ھ میں سلطان حکم نے مراکش کی نئی خود مختار حکومت ادریسیہ سے مصالحت اور دوستانہ تعلق پیدا کیا۔ مراکش میں سلطنت ادریسیہ کا خلافت بغداد سے آزاد ہو جانا حکومت اندلس کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا اور ملک اندلس عباسیوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے اثر سے بہت کچھ محفوظ ہو گیا۔ سلطنت اندلس کے لیے مراکش کی خودمختاری ایک تائید غیبی تھی اور سلطان حکم نے مراکش کی حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ سلطان حکم نے سنہ ۱۹۱ھ تک علمائے قرطبہ کا زور کم کرنے اور حکومت مراکش کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے سے فارغ ہو کر کسی قدر اطمینان حاصل کیا اور شمالی صوبوں کی جانب متوجہ ہو کر اس کے تدارک میں مصروف ہوا۔

طیطلہ کے باغیوں کا استیصال:

سنہ ۱۹۱ھ میں حکم نے حالات و واقعات پیش آمدہ کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ عیسائی سازشوں کو کامیاب بنانے کا سب سے زیادہ سامان طیطلہ میں موجود ہے اور وہاں کے عیسائی زیادہ ہنگامہ پسند اور طاقتور ہونے کی وجہ سے مسلمان اور عیسائی دونوں قسم کے سازش کنندوں

کا ملجا وماویٰ بنے رہتے ہیں۔ اگر طیطلہ کو اس کثافت سے پاک کر دیا جائے اور بغاوت وسرکشی کے اس مرکز کو توڑ دیا جائے تو پھر شمالی صوبوں کے انتظام میں آسانی پیدا ہو سکے گی۔ اس سازشی مرکز کو توڑنے کے لیے ایک سازش کی گئی کہ ''آہن با آہن تواں کوفتن''[1] حکم نے عمر بن یوسف کو بلا کر مشورہ کیا اور اس کے مشورہ کے موافق اس کے بیٹے یوسف بن عمر کی جگہ اس کو طیطلہ کی سند حکومت عطا کی گئی۔ عمر بن یوسف نے طیطلہ پہنچ کر اہل طیطلہ سے رعایت ومروت کا برتاؤ شروع کیا اور وہاں کے بعض امراء سے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ موجودہ خاندان سلطنت یعنی بنوامیہ کو تخت حکومت سے معزول کر دینا چاہیے۔ یہ سنتے ہی طیطلہ والے بہت خوش ہوئے اور بہت جلد تمام باشندگان طیطلہ نے عمر بن یوسف کو اپنی جان نثاری اور حمایت کا یقین دلایا۔ اس طرح اہل طیطلہ کے اصلی خیالات سے واقف ہونے کے بعد عمر بن یوسف نے ان سے کہا کہ موجودہ سلطنت کو مٹانے اور درہم برہم کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ ہم طیطلہ کے متصل ایک اور قلعہ تعمیر کریں تا کہ طیطلہ کا محاصرہ کرنا آسان کام نہ رہے۔ اہل طیطلہ نے کہا کہ اس قلعہ کی تعمیر کے تمام مصارف ہم خود ادا کریں گے۔ چنانچہ باشندوں نے خود ہی چندہ جمع کر کے کافی روپیہ عمر بن یوسف کی خدمت میں حاضر کر دیا اور بہت جلد ایک مختصر ومضبوط قلعہ بن کر تیار ہو گیا۔ اس کے بعد سرحدی عامل نے قرارداد کے موافق سلطان حکم سے فوجی امداد طلب کی کہ ادھر عیسائی حملہ کا خطرہ ہے۔ سلطان حکم نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کی سرداری میں ایک زبردست فوج اس طرف روانہ کی۔ یہ فوج راستے میں طیطلہ سے ہو کر گزری۔ جب طیطلہ کے قریب پہنچی تو عمر بن یوسف عامل طیطلہ نے استقبال کیا اور مراسم مہمان بجا لایا۔ اس جدید قلعہ میں ٹھہرایا اور اہل طیطلہ سے کہا کہ شہزادہ عبدالرحمٰن یعنی ولی عہد سلطنت چونکہ تمہارے شہر میں آیا ہے، لہٰذا تم اس کی مہمانی اور مدارات میں خوب شوق اور جوش کا اظہار کرو تا کہ اس کے دل میں تمہاری وفاداری اور محبت کا نقش بیٹھ جائے اور وہ تمہاری طرف سے غافل اور مطمئن رہے۔ اہل طیطلہ نے اس مشورہ کو پسند کیا اور ان تمام لوگوں نے جو فساد وبغاوت کے نمبردار اور انقلاب حکومت کے خواہاں تھے، شہزادے کی خدمت میں حاضر ہونے اور سلام کرنے کی اجازت چاہی۔ شہزادے نے بہ خوشی ان کو اجازت دی اور وقت مقررہ پر سب کو طلب کیا۔ اس طرح طیطلہ کا تمام مواد فاسد جب قلعہ کے اندر پہنچ گیا تو سب کو گرفتار کر کے قتل کر ڈالا گیا اور ایک

---

[1] یعنی لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔

خندق میں جو قلعہ کے اندر کھودی گئی تھی، سب کی لاشوں کو مٹی ڈال کر برابر کر دیا گیا۔ اس کے بعد طیطلہ سے شر و بغاوت کا استیصال ہو گیا۔ باقی لوگ انقلابی لوگوں کے اس انجام کو دیکھ کر سہم گئے اور پھر کسی کو بغاوت و سرکشی کی جرأت نہ ہوئی۔

عیسائیوں سے جھڑپیں:

آئے دن اس بغاوت و سرکشی اور ہنگامہ آرائی کو دیکھ کر اور باغیان طیطلہ کی اس سزا دہی سے فارغ ہو کر سلطان حکم نے عیسائیوں کے خلاف جو شمالی اندلس پر قابض اور دامن جبل البرتات پر برشلونہ تک متصرف ہو چکے تھے، معمولی فوجی دستے بھیجے لیکن پوری طاقت سے اس طرف متوجہ ہونا مناسب نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شمال میں لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی مسلمان عیسائیوں کو شکست دیتے اور کبھی خود ان سے شکست کھا جاتے۔ سات آٹھ برس تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ چونکہ مسلمانوں کی پوری اور بڑی طاقت عیسائیوں کے مقابلے پر نہیں بھیجی گئی تھی بلکہ صرف عیسائیوں کی پیش رفت کو روکنا مدنظر تھا، لہٰذا ان معرکہ آرائیوں کا نتیجہ عیسائیوں کے حق میں بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ ان کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب جاتا رہا۔ عیسائیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ مسلسل مصروف جنگ رہ کر لڑائیوں میں خوب مشاق اور چست ہو گئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ سلطان حکم کے فوجی دستوں نے عیسائیوں کی ریاست گاتھک مارچ، ریاست ایسٹریاس اور سرکشان جلیقیہ کو نہایت شوق وتن دہی کے ساتھ فوجی مشق کرائی اور ان کو میدان جنگ میں لڑنے کی تعلیم دے کر زبردست سپاہی بنا دیا۔ مگر سلطان حکم اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس کو باشندگان اندلس کی نسبت بدظنی پیدا ہو گئی تھی۔

جدید فوج کی بھرتی:

اس عرصہ میں اس نے دارالسلطنت قرطبہ میں رہ کر ایک جدید فوج مرتب کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ ان عیسائیوں کو فوج میں بھرتی کیا جو اندلس کے جنوبی علاقے میں سکونت پذیر اور شمالی سرکش عیسائیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ نیز اسلامی حکومت سے بہت خوش اور بافراغت زندگی بسر کرتے تھے۔ گویا ان عیسائیوں کو مشتبہ مسلمانوں کے مقابلے میں حکومت وقت کا زیادہ وفادار اور معتمد سمجھا گیا۔ عیسائیوں کی یہ فوج تمام ملک اندلس کے قبضے میں

رکھنے اور ہر قسم کے باغیوں کا سر کچلنے کے لیے کافی نہ تھی۔ لہٰذا سلطان نے ملک حبش، وسط افریقہ، ایشیائے کوچک اور ممالک ایشیا کے غلاموں اور حربی قیدیوں کی خریداری شروع کی اور اپنے اہل کاروں کے ذریعے سے دور دور سے غلاموں کو خرید کرا کر منگوایا۔ ان غلاموں کی ایک زبردست فوج تیار ہوگئی۔ یہ لوگ چونکہ عربی زبان سے ناواقف تھے، لہٰذا عجمی کہلاتے اور اپنے آقا یعنی حکم کی حفاظت کرنے اور میدان جنگ میں لڑنے کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے۔ نہ وہ کسی سازش میں شریک ہوسکتے تھے، نہ کسی سے تعلقات محبت قائم کر سکتے تھے۔ ان غلاموں کو اعلیٰ درجہ کے فوجی قواعد سکھائے گئے اور حکم نے بہ ذات خود ان کی تعلیم وتربیت کی جانب اپنی توجہ مبذول رکھی۔ حکم درحقیقت غلاموں کی ایسی فوج مرتب کرنے اور اس کے ذریعہ سے سلطنت کو قائم رکھنے کی تدبیر کا موجد ہے۔ اسی طرح مصر کے خاندان ایوبی نے کیا تھا اور مملوکوں کی فوج مصر میں قائم ہوکر آخر سلطنت کی مالک بنی تھی۔ جب سلطان حکم کو اس عیسائی اور عجمی فوج کی ترتیب وتکمیل سے اطمینان حاصل ہوا تو اب وقت آ گیا تھا کہ وہ شمال کی طرف عیسائی سرکشوں کی سرکوبی اور فرانسیسیوں پر فوج کشی کرنے کے لیے روانہ ہو۔ مگر قضا وقدر نے ابھی اس کے لیے اندرونی بغاوتوں کے سلسلے کو ختم نہیں کیا تھا۔

اصبح بن عبداللہ حاکم مریدہ نے ایک غلط فہمی کی وجہ سے علم بغاوت بلند کیا۔ سلطان کو اس طرف خود متوجہ ہونا پڑا۔ اصبح بن عبداللہ، سلطان حکم کا چچازاد بھائی بھی تھا اور بہنوئی بھی۔ آخر اصبح محصور و گرفتار ہوا مگر سلطان کی بہن نے درمیان میں پڑ کر غلط فہمی کو رفع کرا دیا اور سلطان اصبح کو آزاد کر کے اس کی خطا کو معاف اور دارالسلطنت قرطبہ میں رہنے کا حکم دیا۔ اس بغاوت سے سلطان ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک اور عظیم الشان خطرہ رونما ہوا جس سے یکا یک قصر حکومت منہدم ہی ہوا چاہتا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے:

مالکیوں کی مخالفت:

سنہ ۱۹۸ھ میں مالکی گروہ نے پھر سر اٹھایا۔ ایک مرتبہ پہلے ان لوگوں کی کوششوں اور سازشوں کا قلع قمع کر دیا گیا تھا۔ مگر اب جبکہ عیسائی اور عجمی لوگوں کی فوج تیار ہونے لگی تو مولویوں نے سلطان کے خلاف پھر فتویٰ بازی شروع کر دی اور عجمیوں کے وجود کو شہر قرطبہ کے لیے ایک لعنت قرار دیا

گیا۔① پچھلی سازش میں قاضی یحییٰ پیش پیش تھے اور ان کی نسبت اہل اندلس بہت محبت رکھتے اور ان کو ولی کامل بھی جانتے تھے۔ اسی لیے حکم نے قاضی یحییٰ کو ماخوذ نہیں کیا تھا اور ان کی ہر ایک مخالف سلطنت کوشش سے چشم پوشی اور درگزر کا سلوک ہوا تھا۔ اس مرتبہ بھی انہیں کے ذریعہ سے طبقہ علماء اور ان کے معتقدین میں جذبات نفرت نے ترقی کی اور قرطبہ والوں نے یہاں تک مبارزت کی کہ جہاں کہیں کوئی اکیلا عجمی مل جاتا، اس کو قتل کر دیتے۔ اس لیے عجمی لوگ شہر میں اور شہر کے بازاروں میں جب کبھی نکلتے تو کئی کئی مل کر نکلتے ورنہ اپنے فوجی کیمپ ہی میں رہتے۔

مخالفت کے شعلے قصر سلطانی تک:

ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ ایک عجمی اور ایک مالکی صیقل گر میں کسی بات پر لڑائی کی نوبت پہنچ گئی۔ شہر والے بالخصوص شہر کے جنوبی محلّہ والے جو وادی الکبیر کے دوسری جانب آباد تھے اور سب کے سب مالکی مذہب کے پیرو تھے، اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب نے مل کر قصر سلطانی پر حملہ کیا اور سلطان حکم کی معزولی کا اعلان کر دیا، اور بھی واقعہ پسند لوگ ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سرائے سلطانی کے دروازے کو توڑ کر اندر گھس گئے اور قصر سلطانی کے محافظ دستے کو قتل کرتے اور پیچھے ہٹاتے ہوئے دوسری ڈیوڑھی پر پہنچ گئے۔ تمام قصر سلطانی میں ایک تلاطم اور گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ سلطان حکم نے اپنے خدمت گار حسن نامی کو آواز دی اور کہا کہ سر میں لگانے کا خوشبودار تیل لاؤ۔ خدمت گار نے تیل حاضر کیا۔ سلطان نے سر میں تیل لگایا۔ حسن نے جرأت کر کے پوچھا کہ اس وقت سخت خطرہ کا مقام ہے۔ باغیوں نے سرائے سلطانی کے کواڑوں کو آگ لگا دی ہے اور لوگوں کو قتل کرتے اور مارتے ہوئے بڑھے چلے آتے ہیں اور آپ کو تیل لگانے اور اپنی زینت کرنے کی سوجھی ہے۔ سلطان نے جواب دیا کہ احمق! اگر میں اپنے بالوں میں خوشبودار تیل نہ لگاؤں تو باغیوں کو میرا سر کاٹتے وقت یہ کیسے معلوم ہو سکے گا کہ یہ بادشاہ کا سر ہے۔

سلطان حکم کی حاضر دماغی:

اس حکایت کو مورخین نے اس بات کے ثبوت میں نقل کیا ہے کہ سلطان حکم سخت سے سخت پریشانی اور گھبراہٹ کے موقع پر بھی مستقل مزاج رہتا اور حواس باختہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد سلطان نے اپنے چچا زاد بھائی اصبغ کو بلا کر حکم دیا کہ جس طرح سے ممکن ہو، تم اپنے آپ کو باغیوں

کے اس محاصرے سے باہر نکالو اور فوراً وادی الکبیر کے اس طرف جا کر جنوبی محلّہ میں آگ لگا دو۔ اصبح نے اس حکم کی تعمیل کی اور ایک چور دروازہ کے ذریعہ سے اپنے آپ کو باغیوں کے محاصرے سے باہر نکال لینے میں کامیاب ہو کر اور چند ہمراہیوں کو ساتھ لے کر قرطبہ کی ایک نواحی چھاؤنی میں خبر بھیجی کہ فوراً مسلح ہو کر جنوبی محلّہ میں پہنچو اور خود وہاں پہنچ کر متعدد مکانات میں آگ لگا دی۔ اتنے میں چھاؤنی سے فوج بھی پہنچ گئی۔ قصر سلطانی کا محاصرہ کرنے والے باغیوں نے جب آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل جنوبی محلّہ سے اٹھتے ہوئے دیکھے تو وہ لوگ جو اس محلّہ میں رہتے تھے اور وہی زیادہ تعداد میں اور اس بغاوت کے سرغنہ بھی تھے، اپنے مکانوں کو بچانے کے لیے اس طرف دوڑے اور فوراً قصر سلطانی باغیوں سے خالی ہو گیا۔ سلطان حکم نے اس مناسب موقع سے فائدہ اٹھانے میں مطلق کوتاہی نہیں کی۔ فوراً اپنے محافظ دستے کو لے کر ان باغیوں کے پیچھے قصر سے روانہ ہوا۔ ادھر سے اصبح بن عبداللہ نے، ادھر سے سلطان حکم نے حملہ کر کے ان باغیوں کو خوب قتل کیا اور پھر قتل کی ممانعت کا حکم دے کر باغیوں کی گرفتاری کا حکم دیا۔ بہت جلد چھاؤنیوں سے فوجیں آ گئیں اور ہزار ہا باغی گرفتار کر لیے گئے۔

مالکیوں کی جلاوطنی:

اب مجبور ہو کر حکم نے حکم دیا کہ مالکی مذہب کے جس قدر پیرو قرطبہ اور اس کے نواح میں موجود ہیں، سب کو جلاوطن کر دیا جائے۔ جلاوطنی کا یہ حکم صرف ان لوگوں کے لیے تھا جو علم و فضل سے بہرہ نہ رکھتے تھے۔ ان میں اکثر نومسلم عیسائی شامل تھے۔ قاضی یحییٰ اور دوسرے علماء کو بہ وجہ ان کے علم و فضل کے معاف کیا گیا اور باوجود اس کے کہ اصل موجب فساد، انہیں لوگوں کا وجود ہوا تھا، سلطان حکم نے یہی کافی سمجھا کہ ان کے معتقدین کو جلاوطن کر کے ان کی طاقت کو توڑا اور ان کے علم و فضل سے خود فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ معلوم ہو کر تعجب ہوتا ہے کہ یہی قاضی یحییٰ چند سال کے بعد سلطان حکم کے مصاحب اور بے تکلف مشیر خاص تھے۔ ان مالکی لوگوں کی جلاوطنی کے حکم کی تعمیل بڑی سرگرمی سے عمل میں لائی گئی۔ یہ لوگ جب ساحل اندلس پر پہنچے تو ان میں سے آٹھ ہزار آدمی جو اپنے ساتھ زن و فرزند بھی رکھتے تھے، مراکش میں جانے پر آمادہ ہوئے اور وہاں کے حاکم ادریس نے ان کے آنے کو اس لیے غنیمت سمجھا کہ اس کے دارالسلطنت شہر فیض یا تنجہ کی آبادی اور رونق میں اضافہ

ہوگا، جہاں یہ بڑے شوق سے آباد ہو گئے اور پندرہ ہزار مالکی جہازوں میں سوار ہوکر اسکندریہ (مصر) پہنچے اور اسکندریہ پر قابض ہو گئے۔ آخر وہاں سے بھی نکالے گئے اور جزیرہ اقریطش (کریٹ) پر قابض ہوئے۔ وہاں انہوں نے اپنی حکومت قائم کی جو سو برس تک ان کی اولاد کے قبضے میں رہی، جیسا کہ جلد دوم میں ان کا ذکر آ چکا ہے۔

اس کے بعد ہی حزم بن وہب نے مقام باجہ میں علم بغاوت بلند کیا اور اس بغاوت کا انجام یہ ہوا کہ حزم نے سلطانی فوج کے مقابلے میں شکست کھائی اور عفو تقصیرات کا خواہاں ہوا۔ سلطان نے اس کی خطا معاف کر دی۔ اب سلطان کو اس بات کا اور بھی یقین ہو گیا کہ ملک کی حالت ابھی تک قابل اطمینان نہیں اور بغاوت کے جراثیم جا بہ جا موجود ہیں۔

فرانس پر حملہ:

سلطان حکم کو تخت نشین ہوئے قریباً بیس سال ہو گئے تھے۔ اس بیس سال کے عرصہ میں اس کو مسلسل ملک کی اندرونی بغاوتوں اور عیسائیوں کے بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کا زیادہ وقت بغاوتوں ہی کو فرو کرنے میں صرف ہوا۔ عیسائیوں پر حملہ آور ہونے کی فرصت ومہلت نہ پا سکا۔ اب بہ ظاہر ملک میں خموشی دیکھ کر حکم نے ایک جرار فوج تیار کی اور اپنے حاجب عبدالکریم کی سرداری میں شمالی سمت کو عیسائیوں کے مقابلے کے لیے روانہ کی۔ حاجب عبدالکریم نے ریاست ایسٹریاس سے صرف اظہار فرماں برداری ہی کو غنیمت سمجھا اور سیدھا ملک فرانس میں جبل البرتات کے اس طرف پہنچ کر قتل و غارت اور فتوحات میں مصروف ہوا۔ یہ مہم سنہ ۲۰۰ھ میں ملک فرانس کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ سنہ ۲۰۳ھ تک عبدالکریم نے ملک فرانس تک جنگ و پیکار کے سلسلے کو جاری رکھا۔ سلطان حکم اور اس کے سپہ سالاروں کی یہ غلطی تھی کہ وہ صرف شارلیمین کی سلطنت کو اپنا حریف سمجھتے اور اسی کی حدود حکومت میں پہنچ کر وہاں کے شہروں کو فتح کرتے تھے۔ گاتھک مارچ کی ریاست جو جبل البرتات سے اس کے جنوبی ومغربی میدانوں تک وسیع ہو چکی تھی، ان کے لیے ناقابل التفات تھی۔ ان ریاستوں کو نہ انہوں نے مٹانا چاہا، نہ ان کے رقبہ کو کم کرنا ضروری سمجھا۔ وہ صرف اسی بات کو کافی سمجھتے تھے کہ یہ عیسائی ریاستیں ہماری فرماں برداری کا اقرار کرتی رہیں اور وہاں کی عیسائی آبادی پر خود ہی حکومت کریں۔ فرانس کے ملک پر وہ اس لیے حملہ آور ہوتے تھے کہ اگر فرانس کی سلطنت کو مٹا

دیا گیا تو خطرہ کا وجود باقی نہ رہے گا اور یہ پہاڑی عیسائی ریاستیں شاہ فرانس سے مل کر اور اس کی سازش میں شریک ہو کر ہمارے لیے مشکلات پیدا کرنے کا موقع نہ پاسکیں گی۔ لیکن سلطان حکم ان دونوں سرحدی ریاستوں کو بالکل مٹا کر جبل البرتات پر اپنی زبردست فوجی چوکیاں قائم کر دیتا تو آئندہ کے لیے ملک اندلس خطرات سے محفوظ رہ سکتا اور ممکن تھا کہ کسی وقت ملک فرانس اور یورپ کے دوسرے ممالک بھی مستقل طور پر مسلمان فتح کر لیتے۔ ان پہاڑی سرحدی ریاستوں نے اندلس کی اسلامی سلطنت کو جو نقصانات پہنچائے، اس کا تفصیلی تذکرہ آئندہ آنے والا ہے، ان شاء اللہ!

سلطان حکم ہی کے عہد حکومت میں ایسٹریاس کے ایک پادری نے ریاست ایسٹریاس اور صوبہ جلیقیہ کی سرحد کے ایک جنگل میں بتایا کہ یہاں سینٹ جیمس رسول کی قبر ہے اور مجھ کو خواب میں فرشتے نے اس قبر کا پتہ بتایا ہے۔ چنانچہ وہاں حاکم ایسٹریاس نے ایک گرجا تعمیر کرا دیا۔ گرجا نہ صرف ایسٹریاس اور صوبہ جلیقیہ کے عیسائیوں کی زیارت گاہ بنا بلکہ یورپ کے دور دراز مقامات تک اس کی شہرت ہوگئی اور عیسائی لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہاں آبادی قائم ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ ریاست ایسٹریاس کا حاکم نشین شہر اور دارالسلطنت بن گیا اور اپنے محل وقوع کے اعتبار سے تمام صوبہ جلیقیہ کو بھی قدرتاً اپنے ہی زیر اثر لے آیا۔

سپہ سالار عبدالکریم کئی سال کے بعد سنہ ۲۰۳ھ میں سالماً غانماً ملک فرانس سے واپس ہوا اور یہ مہم بڑی کامیاب سمجھی گئی کہ فرانسیسیوں کو ان کی گستاخی کی اچھی طرح سزا دے دی گئی مگر افسوس ہے کہ اس طرف مطلق توجہ نہ ہوئی کہ ریاست گاتھ مارچ اور ایسٹریاس کا نام ونشان مٹایا جاتا بلکہ ان دونوں عیسائیوں ریاستوں کے وجود کو بہت ہی غنیمت سمجھا گیا کہ ان کے ذریعہ سے باقاعدہ حکومت اس علاقہ میں قائم ہے، جہاں مسلمان جانا اور رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ملک فرانس میں رہنے کے لیے بھی کوئی عرب سردار رضا مند نہ تھا اور اسی خیال سے مسلمانوں نے بار بار فرانس کو فتح کیا مگر اس کی قدر و قیمت اس کی سرد آب و ہوا کے سبب سے کچھ نہ سمجھی۔ وہاں سے مال غنیمت حاصل ہونے اور وہاں کے رئیسوں سے خراج وصول کر لینے ہی کو کافی سمجھتے رہے۔ ہر ایک عربی نژاد سردار جب ناربون، جلیقیہ اور جبل البرتات سے متصلہ سرد علاقے میں عامل مقرر کر کے بھیجا جاتا تو وہ کبیدہ خاطر ہوتا اور جنوبی گرم و معتدل میدانی علاقوں میں رہنے اور جنوبی شہروں کا عامل مقرر ہونے کو اپنی خوش نصیبی جانتا۔

قحط وخشک سالی کی مصیبت اور اس کا انسداد:

سنہ۲۰۳ھ کے بعد اندلس میں حکم کے لیے اطمینان اور امن وامان کا زمانہ شروع ہوا تھا کیونکہ اب ملک میں نہ کوئی بغاوت تھی، نہ کسی عیسائی حملہ آور کو روکنا تھا، نہ اور کسی حملہ کا اندیشہ تھا لیکن قضا و قدر نے یہ تجویز کر دیا تھا کہ حکم کا تمام عہد حکومت مصروفیت اور ہنگامہ آرائی میں بسر ہو۔ چنانچہ اب جبکہ ہر ایک قسم کے حملے ختم ہو چکے تو اندلس پر قحط وخشک سالی کا حملہ ہوا۔ یہ قحط نہایت عظیم الشان تھا اور قحط کی وجہ سے ملک میں چوری و ڈاکہ زنی کی وارداتیں بھی بڑی کثرت سے ہونے لگیں۔ حکم نے جس طرح اب تک اپنے آپ کو ہر ایک موقع پر مستقل مزاج اور باحوصلہ ظاہر کیا تھا، اسی طرح اس نے اس مصیبت میں بھی اپنی شاہانہ ہمت کا اظہار کیا۔ قحط زدہ لوگوں کی پرورش کے لیے اس نے ہر شہر وقصبے میں محتاج خانے کھلوا دیے۔ غلہ کے باہر سے منگوانے کا اہتمام کیا۔ جابجا راستوں اور آبادی کی حفاظت کے لیے زائد پولیس اور فوجی دستے مقرر کیے۔ اس حالت میں جہاں کہیں کسی بدامنی کی خبر پہنچی، خود مع فوج اس طرف پہنچا اور امن وامان قائم کیا۔ غرض اس نے اس قحط کے زمانے میں اپنی رعایا کی ایسی دست گیری اور مدد کی کہ رعیت کا ہر ایک طبقہ اس سے محبت کرنے لگا اور وہ نفرت بھی جو مولویوں اور مولوی مزاج لوگوں نے اس کے متعلق پھیلا دی تھی، دور ہوگئی۔ جو لوگ اس پر اس کی آزاد مزاجی کی وجہ سے زبان طعن دراز کرتے تھے، اس کے مداح نظر آنے لگے۔

سلطان حکم کی وفات اور اولاد:

سلطان حکم کی نسبت خون خواری اور قتل کے عیب والزام کو خاص طور پر بیان کیا جاتا ہے مگر اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو اس میں شک نہیں کہ حکم نے بہت سے لوگوں کو قتل کرایا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جن لوگوں کو قتل کرایا گیا وہ مستحق قتل تھے یا نہیں اور سلطان حکم نے مجبوراً ان کو قتل کرایا یا صرف تفریح طبع کے لیے؟ سلطان حکم نے ۲۵ ذیقعد سنہ۲۰۶ھ پنج شنبہ کے دن بہ عمر ۵۲ سال، چند ماہ وفات پائی اور بیس لڑکے، بیس لڑکیاں چھوڑیں۔ سلطان حکم کے بعد اس کا بیٹا عبدالرحمٰن ثانی یا عبدالرحمٰن اوسط تخت نشین ہوا۔

حکم کی سیرت وکردار پر تبصرہ:

سلطان حکم بہادر، فیاض اور عاقبت اندیش شخص تھا۔ یہ مکاروں اور خفیہ سازشیں کرنے والوں کا

دشمن اور اپنے دوستوں کے لیے بہت بامروت اور ہمدرد تھا۔ علماء وفضلا کا قدردان اور شعراء کا مربی تھا۔ میدان جنگ میں مستقل مزاج اور جہاں کہیں معاف کرنے سے اصلاح کی توقع ہو، فوراً خطا کار کو معاف کر دیتا تھا۔ وہ اندلس کا ایک جلیل القدر اور عظیم الشان بادشاہ تھا۔ سلطان حکم کے دیندار اور اللہ والے ہونے کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ ایک روز اپنے کسی خادم پر ناراض ہو کر حکم دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے۔ اتفاقاً اس وقت زیاد بن عبدالرحمٰن جو ایک عالم شخص تھے، آ پہنچے اور سلطان حکم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "مالک بن انس نے مرفوعاً روایت کی ہے کہ جو شخص اپنے غیظ و غضب کے باوجود قدرت ضبط کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے قلب کو امن واطمینان سے پر کر دے گا۔"[1] اس کلام کے ختم ہوتے ہی سلطان کا غیظ وغضب کافور ہوگیا اور خادم کی خطا معاف کر دی۔

سلطان حکم کا ۲۷ سالہ عہد حکومت ہنگامہ آرائی اور بے اطمینانی کے عالم میں گزرا۔ اس بے اطمینانی اور بدامنی کے اسباب حکم کے پیدا ہوئے نہ تھے بلکہ قدرتی وارد ہونے والی افتادیں تھیں۔ اس زمانے میں اگر حکم سے کسی قدر کم مستقل مزاج شخص تخت اندلس پر ہوتا تو شائد بنوامیہ کی حکومت اندلس سے مٹ جاتی اور وہاں کے مسلمانوں کا انجام خطرناک ہوتا۔ سلطان حکم کا امتحان قدرت نے لیا اور وہ اس امتحان میں بہ ظاہر کامیاب ہوا۔

عبدالرحمٰن ثانی

سلطان عبدالرحمٰن ثانی ماہ شعبان سنہ ۱۷۶ھ میں طیطلہ میں پیدا ہوا اور سنہ ۲۰۶ھ میں اپنے باپ سلطان حکم کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ سلطان عبدالرحمٰن ثانی کی تخت نشینی کے وقت بہ ظاہر ملک میں امن وامان تھا اور اندرونی و بیرونی فتنوں کو فرو کیا جا چکا تھا مگر اس سلطان کو تخت نشین ہوتے ہی اپنے خاندان والوں کی بغاوت کا مقابلہ کرنا پڑا۔

اہل خاندان کی مخالفت:

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ سلطان حکم کا چچا عبداللہ اندلس سے مراکش کے شہر تنجہ میں جا کر سکونت

[1] تلاش بسیار کے باوجود کتب حدیث میں یہ روایت نہیں مل سکی، واللہ اعلم سبحانہٗ وتعالیٰ!

پذیر ہو گیا تھا۔عبداللہ اس وقت بہت بوڑھا اور ضعیف ہو چکا تھا مگر اپنے بھتیجے سلطان حکم کی وفات کا حال سن کر وہ تنجہ سے چلا اور اندلس میں وارد ہو کر اپنی حکومت کا اعلان کیا۔عبداللہ کے تین بیٹے اس وقت اندلس میں موجود اور صوبوں کی گورنری پر مامور تھے۔عبداللہ کو توقع تھی کہ میرے بیٹے ضرور میری بادشاہت کو قائم کرانے میں مددگار ہوں گے۔مگر یہ عبداللہ کی حماقت تھی اور کہا جا سکتا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی عقل کمزور ہو گئی تھی۔ شاہی فوجوں نے فوراً عبداللہ کا مقابلہ کیا اور وہ شکست کھا کر بلنسیہ میں پناہ گزیں ہوا۔اس کے بیٹے بہ جائے اس کے کہ باپ کی مدد کرتے اور اس بغاوت میں اس کے شریک ہوتے ،انہوں نے عقل و دانائی اور مآل اندیشی سے کام لے کر عبدالرحمٰن ثانی کی حمایت کی اور باپ کو سمجھایا کہ اس خام خیال سے باز رہو اور آتش فساد کو مشتعل نہ کرو۔آخر نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ نے اپنے پوتے عبدالرحمٰن ثانی سے عفو تقصیرات کی درخواست کی اور عبدالرحمٰن نے اس درخواست کو منظور ہی نہیں کیا بلکہ عبداللہ کو صوبہ مرسیہ کا والی بنا دیا۔ جہاں وہ دو تین سال یعنی مرتے دم تک برسر حکومت رہا۔

علی بن نافع ماہر موسیقی کی قدر افزائی:

تخت نشینی کے پہلے ہی سال یعنی سنہ ۲۰۶ھ میں ابراہیم موصلی کا شاگرد علی بن نافع معروف بہ فاریاب وارد اندلس ہوا۔علی بن نافع موسیقی میں استاد کامل تھا۔ نیز علوم مروجہ اور بعض دوسرے علوم غربیہ میں ماہر یکتا تھا۔ سلطان حکم نے یہ سن کر کہ ملک عراق و شام میں اس کی اس کے مرتبہ کے موافق قدردانی نہیں ہوئی، اس کو اندلس میں اپنے پاس طلب کیا تھا۔مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی سلطان حکم فوت ہو چکا تھا۔ جب سلطان عبدالرحمٰن کو اس حکیم و فلسفی کے وارد اندلس ہونے کا حال معلوم ہوا تو اس نے شہروں کے عاملوں کے نام احکام جاری کر دیے کہ قرطبہ تک پہنچنے میں علی بن نافع کو جس جس شہر میں ہو کر گزرنا پڑے، اس شہر کا حاکم اس کا شاہانہ استقبال کرے اور متعدد غلام اور گھوڑے اور ہدیے پیش کرے۔غرض بڑی عزت و احترام سے یہ شخص قرطبہ تک پہنچا اور بادشاہ کا مقرب خاص اور ندیم با اختصاص بن گیا۔

علی بن نافع کی معاشرتی اصلاحیں:

اس نے اندلس میں بڑی بڑی اہم معاشرتی اصلاحیں کیں اور تکلفات و زینت کے عجیب عجیب

طریقے ایجاد کیے جو بہت جلد مقبول ہوئے۔ اس کی کوششوں سے قرطبہ کے اندر آب رسانی کے نل لگائے گئے اور بہت جلد اندلس کے دوسرے شہروں میں بھی نلوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ نئے نئے اور پر تکلف اور لذیذ ومقوی کھانے اور خوبصورت لباس اسی کی ایجاد ہیں۔ غرض اس ایک شخص کی کوششوں اور ایجادوں نے نہ صرف تمام ملک اندلس بلکہ تمام یورپ پر اپنا اثر ڈالا۔ چھری کانٹے کے ساتھ کھانا کھانا بھی اس کی ایجاد ہے اور یورپ والوں نے اندلس کے مسلمانوں ہی سے چھری کانٹے کا استعمال سیکھا تھا۔[1] علی بن نافع کو سلطان عبدالرحمٰن ثانی کے مزاج میں بہ خوبی رسوخ حاصل تھا اور سلطان اس کی بڑی عزت کرتا تھا مگر اس نے کبھی کسی سیاسی معاملہ میں دخل نہیں دیا بلکہ اپنی تمام تر توجہ کو اصلاح معاشرت ہی کی جانب مبذول کر رکھا تھا۔ اس لیے وہ تمام ملک میں ہر دل عزیز و محبوب تھا اور کوئی اس کا دشمن ومخالف کبھی پیدا نہیں ہوا۔ اندلس والوں نے جہاں اس شخص کی وجہ سے لباس، غذا و مکان کے تکلفات دیکھے، وہاں انہوں نے موسیقی کا شوق بھی اس سے حاصل کیا۔[2] دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ علی بن نافع نے اندلس پہنچ کر وہاں کے سپاہی پیشہ مسلمانوں کو عیش پسند اور نازک مزاج بنانے کی موثر کوشش کی۔

اندلس میں مالکی مذہب کا فروغ:

قاضی یحییٰ بن یحییٰ مالکی کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ انہیں قاضی صاحب کی کوششوں سے سلطان حکم کے زمانے میں قرطبہ کے اندر ایک خطرناک بغاوت ہوئی، جس کے نتیجے میں قرطبہ کی آبادی کا پانچواں حصہ یعنی دریا پار کا جنوبی محلّہ بالکل ویران ہوگیا اور بیس پچیس ہزار آدمیوں کو اندلس سے جلاوطن ہونا پڑا تھا مگر قاضی صاحب آخر میں سلطان حکم کے مصاحبوں اور مشیروں میں داخل تھے۔ اب سلطان عبدالرحمٰن ثانی کی تخت نشینی کے بعد وہ سلطان عبدالرحمٰن کے مزاج میں بہت کچھ دخیل

---

[1] چھری کانٹے کے ساتھ کھانا کھانا کوئی شرف اور ترقی کا معیار نہیں۔ مسلمانوں میں بگاڑ اور تنزل کے بنیادی طور پر دو بڑے اسباب ہیں: ① فرقہ بازی ② عیش پسندی۔ انہی وجوہات کے باعث مسلمان پستی کا شکار ہوئے اور ذلت ومسکنت ہم پر چھا گئی، اللھم احفظنا!

[2] اسلامی اندلس کا خاتمہ بھی اسی لیے ہوا کہ مسلمان عیش وتنعم کے عادی ہو گئے، اسی طرح وہ عیسائیوں کی تہذیب سے متاثر ہو کر موسیقی وغیرہ کا بھی شکار ہو گئے۔ رہی سہی کسر فرقہ بندی نے پوری کر دی۔ اس طرح وہ دین سے دور ہو کر قوت کھو بیٹھے اور بالآخر سقوط غرناطہ جیسا المناک حادثہ وجود میں آ گیا جو اس امت کے المناک ترین حادثات میں سے ایک تھا۔

تھے۔ان کو سلطان عبدالرحمٰن نے قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام کا عہدہ دینا چاہا لیکن انہوں نے انکار کیا اور اس انکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قاضی القضاۃ کے بھی افسر سمجھے جانے لگے۔عوام ان کے بے حد معتقد تھے اور مذہبی معاملات میں ان کا فیصلہ سب سے آخری سمجھا جاتا تھا۔قاضی صاحب بہت بڑے کثیر التصانیف شخص تھے۔ وہ امام مالک کے شاگرد رشید تھے۔ انہوں نے کئی سال تک امام مالک رحمہ اللہ کی خدمت میں رہ کر علم دین کو حاصل کیا تھا۔اب سلطان عبدالرحمٰن کے عہد حکومت میں انہوں نے اپنے طرز عمل کے اندر بہت بڑی تبدیلی پیدا کر لی تھی۔اب وہ اپنے اثر اور رسوخ سے نہایت قابلیت کے ساتھ کام لے رہے تھے۔ وہ جس کسی شخص کی سفارش محکمہ قضا میں کر دیتے تھے، وہ کبھی رد نہ ہوتی تھی۔ لہٰذا ان تمام علماء نے جو کسی شہر یا قصبے کے قاضی بننا چاہتے تھے، مالکی مذہب اختیار کیا اور اس طرح قاضی یحییٰ کی نگاہوں میں عزت و محبت کا مقام پیدا کر کے کہیں نہ کہیں کے قاضی بن گئے۔اس غیر محسوس طرز عمل نے چند روز میں تمام ملک اندلس کو مالکی مذہب کا پیرو بنا دیا۔[1] سلطان عبدالرحمٰن ثانی اپنے باپ کے زمانے سے امور سلطنت میں دخیل اور تمام حالات سے خوب واقف و تجربہ کار تھا، لہٰذا اس نے احتیاط سے کام لیا اور اس بات کی کوشش کی کہ مولویوں اور مولوی مزاج لوگوں کو اس کے خلاف لوگوں کو برانگیختہ کرنے کا کوئی موقع نہ ملے۔

بغاوتوں کا استیصال:

عبدالرحمٰن ثانی کی تخت نشینی کے وقت اندلس کا تمام شمالی حصہ جس میں خلیج بسکی کا جنوبی ساحل اور جبل البرتات کا جنوبی دامن شامل تھا،عیسائیوں کے قبضے میں تھا مگر یہ تمام عیسائی رؤسا سلطنت اسلامیہ کے باج گزار اور دربار قرطبہ کی سیادت کو تسلیم کرتے تھے۔ دربار قرطبہ بھی اندلس کے اس شمالی حصے سے اس کے سوا اور کچھ نہ چاہتا تھا۔ برشلونہ کا علاقہ بھی عیسائیوں کے قبضہ میں عرصہ سے پہنچ چکا تھا اور وہاں ریاست ''گاتھک مارچ'' کے فرماں روا کی طرف سے ایک نائب الریاست مقرر تھا۔ ریاست ایسٹریاس لیون و جلیقیہ تک وسیع ہوگئی تھی اور اس کا جدید شہر کیسٹل یا قسطلہ

---

1. مناصب کے حصول کے لیے علماء کا مالکی مذہب اختیار کرنا کوئی شرعی دلیل نہ رکھتا تھا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے تو منصب کے حصول کی خواہش تک سے منع فرما دیا تھا (ملاحظہ ہو: صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، حدیث ٦٧٢٢، کتاب الاحکام، حدیث ٧١٤٨۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب کراھة الامارة بغیر ضرورة و باب ندب من خلف یمینا فرأی غیرھا خیرا) پھر منصب کے حصول کے لیے دوسرا مسلک اختیار کرنا اور زیادہ برا عمل ہے۔

دارالریاست یا دارالسلطنت بن چکا تھا۔ مسلمان ان شمالی عیسائی ریاستوں کو مٹانا ہرگز نہ چاہتے تھے مگر ان کو اپنی طاقت سے محض اس لیے مرعوب رکھنا چاہتے تھے کہ وہ فرانس کے عیسائیوں یعنی سلطنت فرانس وغیرہ سے ساز باز کر کے اندلس کے ملک پر چڑھائی نہ ہونے دیں۔ اسی غرض کے لیے وہ خلیج بسکی کو عبور کر کے اور کبھی جبل البرتات کو طے کر کے فرانس کے ملک پر حملہ کرتے تھے کہ شمالی ملکوں کے عیسائی اندلس کی جانب اقدام نہ کر سکیں۔ اندلس کی شمالی سرحد پر شہر البیرہ تھا جہاں دربار قرطبہ سے سرحدی عامل مقرر کیا جاتا تھا۔

البیرہ کے اس سرحدی عامل نے وہاں کی رعایا پر ظلم کیا اور عیسائیوں سے ساز باز رکھی۔ اس کی پاداش میں سلطان حکم نے اس کو قتل کرا کر اس کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا تھا۔ اس کے چند ہی روز بعد سلطان حکم کا انتقال ہو گیا تھا۔ جدید سلطان کی تخت نشینی پر سرحدی عیسائیوں نے موقع پایا اور البیرہ کی فوج اور رعایا کو بہکا کر قرطبہ میں بھیجا کہ وہ اس مال کا مطالبہ کریں جو مقتول عامل کا سرکاری خزانہ کے حق میں ضبط ہوا ہے کیونکہ وہ مال درحقیقت رعایا کا مال ہے جو عامل نے زبردستی چھین لیا تھا۔ یہ احتجاجی لوگ قرطبہ میں سنہ ۲۰۷ھ میں پہنچ کر قصر سلطانی کے دروازے پر گستاخانہ حرکات کے عامل ہوئے۔ ان کی تادیب کے لیے شاہی محافظ دستے کو حکم ہوا۔ ان لوگوں نے مقابلہ کیا، بہت سے مارے گئے، بہت سے بھاگ گئے۔

اسی سال یعنی سنہ ۲۰۷ھ میں علاقہ تدمیر کے اندر عربوں کے قبائل مضریہ اور قبائل یمانیہ میں جنگ چھڑی۔ اس خانہ جنگی کو فرو کرنے کے لیے شاہی فوج بھیجی گئی اور آتش فساد فرو ہوئی مگر جب شاہی فوج واپس ہوئی تو یہ قبائل پھر آپس میں لڑنے لگے، پھر شاہی فوج گئی۔ غرض کہ قبائل کی اس خون ریزی کا سلسلہ قریباً سات سال تک جاری رہا اور ملک اندلس کے اندر قبائل عرب نے عرب جاہلیت کی سیرت خوں خوری کی خوب نمائش کی۔

سنہ ۲۰۸ھ میں عیسائی ریاست ایسٹریاس یا ریاست جلیقیہ کے بادشاہ نے باج وخراج کی ادائیگی سے انکار کر کے علم بغاوت بلند کیا اور سلطنت اسلامیہ کی حدود میں داخل ہو کر شہروں کو لوٹا۔ اس خبر کو سن کر سلطان عبدالرحمٰن ثانی نے اپنے مشہور سپہ سالار عبدالکریم بن عبدالواحد بن مغیث کو مع فوج اس طرف روانہ کیا۔ اس بہادر سپہ سالار نے وہاں پہنچ کر ماہ جمادی الاخر سنہ ۲۰۸ھ میں عیسائیوں کو شکست پر شکست دے کر بھگا دیا اور ان کی فوجیں بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپیں۔ عبدالکریم نے

عیسائیوں کے سرحدی قلعوں کو مسمار کر کے عیسائی فرماں روا کو مجبور کیا کہ وہ خراج ادا کرے۔ اس نے آئندہ فرماں بردار رہنے کا اقرار کر کے معافی چاہی۔ اس کامیابی کے بعد عبدالکریم واپس آیا اور فوراً یہ فوج اسی سپہ سالار کی سرکردگی میں برشلونہ کی طرف روانہ کی گئی، جہاں سے بغاوت اور جنگی تیاریوں کی خبر پہنچی تھی۔ شاہی فوج نے جاتے ہی برشلونہ کا تمام علاقہ فتح کر کے عیسائیوں کو بھگا کر پہاڑوں کے اندر چھپنے پر مجبور کر دیا اور جلیقیہ والوں کی طرح ان سے بھی اقرار اطاعت لے کر تمام ملک مفتوحہ کو پھر انہیں کے قبضے میں چھوڑ دیا گیا۔

قیصر قسطنطنیہ کی سفارت:

سنہ ۲۰۹ھ میں قیصر قسطنطنیہ کی طرف سے عبدالرحمٰن ثانی کی خدمت میں ایک سفارت حاضر ہوئی۔ اس سفارت کے ذریعہ سے قیصر نے اندلس سے محبت و دوستی کے تعلقات پیدا کرنے چاہے۔ دربار بغداد نے فرانس کے بادشاہ سے تعلقات محبت قائم کر لیے تھے، قیمتی تحائف ونذرانے فرانسیسیوں کے لیے پہنچتے رہتے تھے اور دارالخلافہ بغداد سے ہمیشہ اس بات کی کوشش ہوتی رہتی تھی کہ فرانسیسی ملک اندلس پر حملہ آور ہوں۔ ان باتوں سے دربار قرطبہ واقف تھا۔

ادھر سلاطین اُندلس قیصر قسطنطنیہ پر ہمیشہ حملہ آور ہوتے رہتے تھے اور دربار قسطنطنیہ خود کو معرض خطر میں پاتا تھا۔ اب قیصر قسطنطنیہ نے سلطان اندلس کی بہادری اور مسلمانان اندلس کی شہرت سن کر دربار قرطبہ کو اپنا ہمدرد بنانا چاہا۔ سلطان اندلس کو قدرتی طور پر قیصر قسطنطنیہ سے ہمدردی ہونی چاہیے تھی کیونکہ وہ دربار بغداد کا دشمن تھا۔ قیصر قسطنطنیہ کے اس سفیر کی عبدالرحمٰن نے بڑی آؤ بھگت کی۔ سفیر نے بڑے بڑے قیمتی تحفے پیش کیے اور قیصر قسطنطنیہ کی عظیم الشان طاقت اور زبردست افواج کے حالات مبالغہ کے ساتھ سنا کر اس بات کا یقین دلایا کہ اگر آپ قیصر قسطنطنیہ کے ساتھ دوستی کے تعلقات پیدا کر لیں گے تو بڑی آسانی سے آپ اپنی آبائی خلافت اور شام وعراق وعرب وغیرہ کی حکومت عباسیوں سے واپس لے سکیں گے۔ عبدالرحمٰن نے اس موقع پر بڑی دانائی اور مآل اندیشی سے کام لے کر صرف اس قدر وعدہ کیا کہ اگر مجھ کو اپنے ملک کی طرف سے اطمینان حاصل ہوا تو میں قیصر کی امداد کر سکتا ہوں لیکن فی الحال مجھ کو اپنے ہی ملک میں بہت سے ضروری اور اہم کام درپیش ہیں، پھر جواباً بہت سے قیمتی تحفے اس سفیر کے ہمراہ اپنے ایلچی غزال کے ہاتھ قیصر کے لیے

روانہ کیے۔

امیر عبدالرحمٰن کی حمیت اسلامی:

یحییٰ الغزال نے قسطنطنیہ میں وارد ہوکر نہایت غور و تعمق کی نگاہ سے وہاں کے حالات کا معائنہ کیا اور اپنے سلطان کی دوستی کا یقین قیصر کو دلا کر واپس ہوا۔ سلطان عبدالرحمٰن نے ایک مسلمان فرماں روا کے خلاف خواہ وہ عبدالرحمٰن کا دشمن عباسی خلیفہ ہی کیوں نہ ہو، روپیہ یا فوج سے ایک عیسائی بادشاہ کی مدد کرنی کسی طرح مناسب نہ سمجھی اور زبانی وعدہ وعید پر ہی ٹال دیا، ورنہ عبدالرحمٰن قیصر کی درخواست کو پورا کرنے کی طاقت ضرور رکھتا تھا کیونکہ قیصر نے عبدالرحمٰن ثانی سلطان اندلس سے فوج اور روپیہ مانگا تھا۔ ایک یا چند ہزار فوج اور ایک یا چند لاکھ دینار بھیج دینا عبدالرحمٰن ثانی کے لیے بالکل معمولی بات تھی اور اندلس کی فوج یا خزانہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا مگر عبدالرحمٰن کو حمیت اسلامی نے اس کام سے باز رکھا۔

پرتگالیوں کی بغاوت:

اسی سال اندلس کے جنوب ومغرب میں اس علاقے کے اندر جس کو آج کل ملک پرتگال کہا جاتا ہے اور جہاں عیسائیوں کی آبادی زیادہ تھی، شہر مریدہ والوں کی سربراہی میں بغاوت کا فتنہ پیدا ہوا۔ اس فتنے کو فرو کرنے کے لیے عبیداللہ بن عبداللہ کو بھیجا گیا۔ سخت معرکوں کے بعد باغیوں کو شکست ہوئی اور شہر پناہ کو منہدم کر کے عبیداللہ سنہ ۲۱۰ھ میں واپس آ گیا۔ چند روز کے بعد باغیوں نے پھر سر اٹھایا اور عبیداللہ کو پھر اس طرف جانا پڑا۔ اس مرتبہ بھی بغاوت فرو ہوگئی۔

اس بغاوت کا سبب وہ پادری تھے جو جلیقیہ اور قسطلہ سے یہاں آ کر بغاوت کی ترغیب دینے میں مصروف تھے کیونکہ شمالی عیسائیوں بالخصوص جلیقیہ والوں کو یہ محسوس ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کا اندرونی بغاوتوں اور آپس کی لڑائیوں میں مصروف رہنا ہی ہماری ترقی اور کامیابی کا باعث ہے اور جب تک ہم جنوبی علاقوں میں ہنگامے برپا نہ کرا دیں، اس وقت تک ہم کو مسلمانوں کے خلاف کوئی کوشش اور بغاوت نہیں کرنی چاہیے۔ اہل مریدہ کی سرکشیوں اور گستاخیوں کی اب کوئی انتہا نہیں رہی تھی کیونکہ انہوں نے اپنے عامل کو بغاوت کر کے اپنے شہر سے نکال دیا تھا اور شاہی فوجوں کا دو مرتبہ مقابلہ کر چکے تھے۔ لہٰذا سنہ ۲۱۳ھ میں سلطان عبدالرحمٰن نے حکم دیا کہ شہر مریدہ کی منہدم شدہ فصیل

کے پتھروں کو دریا میں ڈال دو۔ جب اس حکم کی تعمیل عامل مریدہ نے کرنی چاہی تو وہاں کے لوگ پھر باغی ہو گئے۔ انہوں نے اس مرتبہ پھر شہر پر قبضہ کرلیا اور عامل کو وہاں سے خارج ہونا پڑا۔ اہل شہر نے شہر کی منہدم شدہ فصیل کو پھر تعمیر کرلیا اور مقابلہ کے لیے مضبوط ہو بیٹھے۔ یہ سن کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ بغاوت صرف عیسائیوں تک محدود نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کا بڑا حصہ اس میں شریک تھا اور باغیوں کی سرداری محمود بن عبدالجبار کے ہاتھ میں تھی۔ یہ مسلمان، عیسائیوں کے ترغیب دینے سے کیوں بغاوت پر آمادہ ہو جاتے تھے؟ اس کا سبب آگے بیان ہونے والا ہے، ان شاء اللہ! بہرحال سنہ ۲۱۷ھ تک مریدہ کے مقابل شاہی سپہ سالار مصروف جنگ رہے اور کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

آخر سنہ ۲۱۸ھ کی ابتدا میں سلطان عبدالرحمٰن نے خود مریدہ پر فوج کشی کی مگر اس مرتبہ ابھی شہر فتح نہ ہونے پایا تھا کہ سلطان کو محاصرہ اٹھا کر فوراً کسی ضرورت سے قرطبہ کی جانب واپس آنا پڑا۔ سنہ ۲۲۱ھ میں پھر خاص اہتمام سے حملہ کیا گیا اور یہ شہر سات سال تک ملک اندلس کے درمیانی علاقہ میں خودمختار رہنے کے بعد مفتوح ہوا اور سلطان کی طرف سے یہاں عامل مقرر ہوا۔ اہل مریدہ کی اس خطرناک بغاوت سے بڑھ کر بغاوت ملک اندلس میں نہ ہوئی تھی۔ چالیس ہزار جنگجو پورے طور پر مسلح اہل شہر کے پاس موجود تھے۔ ان باغیوں کو ہر قسم کی امداد ریاست ایسٹریاس وجلیقیہ سے خفیہ طور پر پہنچ رہی تھی۔ آخر سنہ ۲۲۰ھ میں جب یہ شہر فتح ہوا اور اس بغاوت کا خاتمہ ہوگیا تو محمود بن عبدالجبار مریدہ سے فرار ہوکر سیدھا ریاست ایسٹریاس ہی میں پہنچا اور وہاں اس کو ایک قلعہ کا قلعہ دار بنا دیا گیا، جہاں وہ پانچ سال تک زندہ رہا۔

عیسائیوں کو مسلمانوں کو باغی بنانے میں دو وجہ سے آسانی ہوئی: اول تو یہ کہ اندلس میں عیسائی عورتیں عام طور پر مسلمانوں کے گھروں میں تھیں۔ مسلمان مذہبی آزادی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی ان عیسائی بیویوں کو تبدیل مذہب کے لیے مجبور نہیں کرتے تھے۔ شمالی عیسائی ریاستوں کو چھوڑ کر کہ ان عیسائیوں کو مسلمانوں سے عداوت ونفرت تھی، باقی تمام اندلس کے عیسائی مسلمانوں کے ساتھ نہایت گہرے اور ہمدردانہ تعلقات رکھتے تھے۔ ان عیسائیوں کے ذریعہ سے شمالی ریاستوں کے عیسائی مسلمانوں میں ہر ایک خیال کی بہ آسانی اشاعت کر سکتے تھے۔ اس مرتبہ یہ مشہور کیا گیا تھا کہ سلطان عبدالرحمٰن نے زکوٰۃ کے علاوہ جو اور کوئی ٹیکس لگایا ہے،[1] یہ ابتداء ہے اس ظلم وستم کی جو

---

[1] زکوٰۃ کی حیثیت ٹیکس کی نہیں بلکہ یہ تمام صاحب استطاعت مسلمانوں پر فرض ہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں مسلمانوں میں =

سلطان اپنی رعایا کے تمام اموال پر قبضہ کرنے والا ہے۔ یہ ایک ایسی بات تھی کہ سب سے پہلے اس پر مسلمانوں ہی کو غصہ آتا تھا۔ بڑھتے بڑھتے اس معمولی سی بات نے وہ صورت اختیار کر لی جس کا ابھی اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

طیطلہ میں بغاوت:

مریدہ کی بغاوت چونکہ جلدی فرو نہ ہو سکی تھی اور مسلمان باغیوں کی پامردی نے شاہی لشکر کے لیے مشکلات پیدا کر دی تھیں، لہٰذا ملک کے اندر سرکش لوگوں کی ہمتیں پھر چست اور بلند ہونے لگیں اور طیطلہ میں جہاں عیسائی آبادی زیادہ تھی، عیسائیوں اور مسلمانوں نے مل کر ہاشم ضراب نامی ایک شخص کی سرداری میں علم بغاوت بلند کر کے وہاں کے عامل کو خارج کر دیا اور خود طیطلہ میں ہر قسم کی مضبوطی کر لی۔ عیسائی ریاست گاتھک مارچ اور اردگرد کے لوگوں نے ہر قسم کی امداد ہاشم ضراب کو پہنچانی شروع کر دی۔ واقعہ پسند اور بدچلن لوگ جوق در جوق آ کر طیطلہ میں داخل اور باغی فوج میں شامل ہونے لگے۔ طیطلہ پہلے ہی نہایت مضبوط اور ناقابل فتح شہر تھا۔ اب ہاشم نے سامان مدافعت اور افواج کی فراہمی سے اس کو خوب ہی مضبوط بنا لیا۔ یہ دیکھ کر سرحدی عامل محمد بن وسیم بھی ہاشم کے ساتھ شریک ہو گیا۔ ادھر سلطان عبدالرحمٰن ثانی نے اپنے بیٹے امیہ کو ایک زبردست فوج دے کر طیطلہ کی جانب روانہ کیا۔ امیہ نے ہر چند کوشش کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر امیہ اپنی فوج لے کر واپس ہوا اور ہاشم نے طیطلہ سے نکل کر شاہی فوج کا تعاقب کیا۔ شاہی فوج ایک جگہ کمین گاہ میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ جب اہل طیطلہ زد پر پہنچ گئے تو ان پر حملہ کیا۔ اس حملہ میں طیطلہ والوں کا بڑا نقصان ہوا مگر وہ بھاگ کر طیطلہ میں واپس چلے گئے اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ بار بار اس شہر کے

= زکوٰۃ اور عشر کا نظام نافذ تھا، غیر مسلموں سے جزیہ لیا جاتا تھا۔ تب خطہ عرب مخصوص جغرافیائی ماحول یعنی صحرائی علاقے، خشک پہاڑوں پر مشتمل تھا۔ نہ کوئی فصلیں تھیں سوائے کھجوروں کے باغات کے اور وہ بھی کہیں کہیں ہوتی تھیں۔ نہ آج کے جدید دور کی طرح صنعتوں، معدنی و دیگر قدرتی وسائل کی بھرمار تھی۔ اس کے باوجود عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ حال تھا کہ زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں ملتا تھا، اللہ اکبر! دوسری طرف ٹیکس کا غیر اسلامی نظام ہے جو دور جدید میں یہودیوں نے منظم انداز میں مسلط کیا ہے۔ اس نظام کے تحت ہر فرد ہزاروں جگہ پر ٹیکس ادا کر رہا ہے اور اسے اس بات کا شعور بھی نہیں۔ دنیا کے ممالک میں ٹیکسوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اس کے باوجود غربت کا رونا ہے، لاکھوں آدمی اب تک صرف عدم روزگار یا بھوک کی بناء پر خودکشی کر چکے ہیں۔ حکومتیں کھربوں ڈالر قرضوں تلے دبی ہوئی ہیں۔ یہ سب کچھ نتیجہ ہے یہودیوں کے عالمی سرمایہ دارانہ اور معاشی نظام کو قبول کر کے اس میدان میں بھی اللہ تعالیٰ سے بغاوت اختیار کرنے کا۔

محاصرہ کو فوجیں بھیجی گئیں مگر یہ شہر فتح نہ ہوا۔ ایک مرتبہ ہاشم نے طیطلہ سے نکل کر شنت بریہ کو خوب لوٹا اور اس پر قبضہ کر لیا۔

آخر سلطان عبدالرحمٰن نے اپنے بھائی ولید کو سنہ ۲۲۲ھ میں ایک زبردست فوج دے کر طیطلہ کی مہم پر روانہ کیا۔ ولید نے طیطلہ کے چاروں طرف فوجیں متعین کر کے ہر طرف سے سامان رسد کی آمد کو بند کرنے میں مبالغہ سے کام لیا اور اپنی کوشش کو استقلال کے ساتھ جاری رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل طیطلہ سخت مجبور ہوئے اور ولید نے سنہ ۲۲۳ھ میں طیطلہ کو فتح کیا۔ ہاشم ضراب لڑائی میں مارا گیا اور محمد بن وسیم وہاں سے بھاگ کر شہر سبن میں چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنے گرد باغیوں کی ایک جمعیت فراہم کی اور چند روز کے بعد طیطلہ میں اچانک پہنچ کر قابض و متصرف ہو گیا۔

سنہ ۲۲۴ھ میں سلطان عبدالرحمٰن نے خود چالیس ہزار فوج لے کر طیطلہ پر چڑھائی کر کے اس کو فتح کیا اور باغیوں کو قرار واقعی سزا دے کر امن وامان قائم کیا اور یہیں سے ایک فوج عبیداللہ بن عبداللہ کو دے کر مقام البہ اور قلاح کی جانب روانہ کیا۔ عبیداللہ نے اس نواح میں پہنچ کر عیسائیوں کو جنھوں نے بغاوت و سرکشی شروع کر دی تھی، متعدد شکستیں دے کر مطیع و منقاد بنا دیا۔ ابھی یہ لشکر شمالی حدود میں اپنا کام پورے طور پر ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ فرانسیسیوں کی فوجوں نے جو سرحد پر عرصہ سے جمع ہو رہی تھیں اور ممالک اسلامیہ کی اندرونی بغاوتوں سے فائدہ اٹھانے کی خواہاں تھیں، سرحد پر حملہ کیا اور حدود سلطنت اسلامیہ میں داخل ہو کر شہر سالم کو لوٹ کر برباد کیا۔ عبیداللہ نے اس طرف کے عامل ابن موسیٰ کو ہمراہ لے کر عیسائی فوجوں پر حملہ کیا اور ان کے سپہ سالار لرزیق نامی شاہ فرانس کو شکست دے کر بھگا دیا۔

سنہ ۲۲۵ھ میں سلطان عبدالرحمٰن ثانی نے خود بلاد جلیقیہ پر حملہ کر کے وہاں کے عیسائیوں کو سزائیں دے کر مطیع و منقاد بنایا۔ ریاست ایسٹریاس کے حاکم سے باج و خراج وصول کر کے اس سے اطاعت و فرماں برداری کا اقرار لیا اور اسی کی ریاست میں اپنا فوجی کیمپ قائم کر کے ملک فرانس پر خشکی کے راستے بھی اور سمندر کے راستے بھی فوجیں روانہ کیں۔ ان فوجی مہموں کا نتیجہ مال غنیمت اور کثیر التعداد قیدیوں کی شکل میں ظاہر ہوا اور سلطان عبدالرحمٰن سالماً غانماً قرطبہ کی جانب واپس آیا۔

قیصر قسطنطنیہ کی دوسری سفارت:

اسی سال طوفیلس قیصر قسطنطنیہ کی جانب سے قرطبہ میں ایک سفارت اسی طرف وارد ہوئی، جیسا

کہ قیصر میکائیل کی جانب سے اس سے پہلے سفارت آئی تھی۔عبدالرحمٰن نے اس سفیر کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کیا جو پہلے سفیر سے کر چکا تھا۔اس مرتبہ قیصر قسطنطنیہ بغداد سے بہت مجبور ہو گیا تھا اور اس نے پہلے قیصر سے زیادہ الحاح واصرار کے ساتھ عبدالرحمٰن سے مدد طلب کی تھی اور پہلے سے زیادہ توقعات دلائی تھیں۔ممکن تھا کہ خلیفہ بغداد کی مخالفت کو مدنظر رکھ کر اس نے فرانسیسیوں کے پاس بڑے بڑے قیمتی تحفے اور ہدیے بھیجنے کا سلسلہ جاری کر رکھا ہو اور فرانسیسیوں کو اپنی ہر ایک حملہ آوری پر جو وہ اندلس پر کرتے تھے،دربار بغداد سے شہ ملتی ہو۔اس مرتبہ عبدالرحمٰن، قیصر قسطنطنیہ کی مدد کو فوج روانہ کر دیتا مگر اتفاق کی بات انہیں ایام میں یورپ کے شمالی علاقے کی قوم نارمن نے جو ابھی تک عیسائیت سے متنفر اور آتش پرستی میں مبتلا تھی، جرمن واسکینڈی نیویا سے اپنی کشتیوں میں سوار ہو کر اور انگلش چینل میں گزر کر اندلس کے جنوبی ومغربی ساحل پر اتر کر یکایک قصبوں اور شہروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔شہر فادیس کو خوب لوٹا اور پھر مضافات اشبیلیہ تک پہنچ گئے۔یہ حملہ ایک غیر معروف اور اجنبی قوم نے اندلس پر اسی طرح کیا تھا، جس طرح مسلمانوں کا ابتدائی حملہ طارق بن زیاد کی سرداری میں ہوا تھا۔اس وحشت انگیز خبر کو سن کر امیر عبدالرحمٰن نے خشکی کے راستے سے ان کے مقابلے کو فوجیں روانہ کیں اور دوسری طرف اندلس کے مشرقی ساحل کی بندرگاہوں میں حکم بھیجا کہ جہازوں کو آبنائے جبل الطارق کی طرف بھیج دو تاکہ ان حملہ آوروں کے جہازوں پر قبضہ کر کے ان کے لیے راہ فرار کو مسدود کر دیں۔نارمنوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ پندرہ جہاز مسلح سپاہیوں سے بھرے ہوئے ہمارا راستہ روکنے کے لیے آ رہے ہیں تو وہ اندرون ملک سے بے تحاشا ساحل کی جانب بھاگے اور اپنی کشتیوں میں سوار ہو ہو کر غائب ہو گئے اور پھر عرصہ دراز تک ان کو اندلس پر چھاپہ مارنے کی جرأت نہ ہوئی۔

موسیٰ بن موسیٰ سپہ سالار کی بغاوت:

ابھی یہ فتنہ فرو ہی ہوا تھا کہ شمال کی جانب سے خبر پہنچی کہ موسیٰ بن موسیٰ جو عبدالرحمٰن ثانی کا مشہور سپہ سالار اور شمالی سرحد کا محافظ مقرر کیا گیا تھا، باغی ہو کر عیسائیوں سے مل گیا ہے۔اس کی سرکوبی کے لیے حرث بن بدیع کو بھیجا گیا۔موسیٰ مع عیسائی لشکر کے مقابلہ پر آیا مگر حرث نے شکست دے کر بھگا دیا۔موسیٰ مقام طیطلہ چھوڑ کر مقام رابط میں چلا گیا اور طیطلہ پر حرث نے قبضہ کیا۔آخر

عیسائی بادشاہ غرسیہ فوج لے کر موسیٰ کی کمک کو پہنچا اور جنگ وجدل کا ہنگامہ خوب زور شور سے جاری ہوا۔ ان ہنگامہ آرائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقام البہ میں ایک لڑائی کے اندر موسیٰ نے حرث کو گرفتار کرا دیا اور بادشاہ فرانس کے پاس بھیج دیا۔ عبدالرحمٰن ثانی کو اس خبر کے سننے سے سخت صدمہ ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے منذر کو ایک زبردست فوج دے کر موسیٰ کی طرف روانہ کیا۔ اس عرصہ میں موسیٰ نے طیطلہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ منذر نے سنہ ۲۲۹ھ میں غرسیہ نامی سردار والی نبلونہ کو جو موسیٰ کی حمایت وامداد کے لیے آیا تھا، ایک لڑائی میں قتل کر دیا۔ موسیٰ نے اپنے بیٹے کو بہ طور یرغمال منذر کے پاس بھیج کر صلح کی درخواست منظور کر لی اور موسیٰ کو طیطلہ کی حکومت پر مامور کر دیا۔

شمالی سرحدی اندلس کے عیسائیوں کی بغاوت:

ادھر شمالی سرحد پر یہ ہنگامہ برپا تھا، ادھر شمال ومشرق کی جانب عیسائیوں نے بغاوت وسرکشی کی تیاریاں بڑے زور شور سے شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ سنہ ۲۳۰ھ میں اہل برشلونہ نے اسلامی حدود میں لوٹ مار شروع کر دی اور وہاں کی اسلامی فوج کو قتل کر کے جنوب ومغرب کی جانب پیش قدمی کی۔ سلطان عبدالرحمٰن نے اپنے مشہور سپہ سالار عبدالکریم بن عبدالواحد بن مغیث کو سنہ ۲۳۱ھ میں برشلونہ کی جانب روانہ کیا۔ عبدالکریم نے برشلونہ اور اس کے نواح کے باغیوں کو قرار واقعی سزا دے کر ریاست گاتھک مارچ کو تہ وبالا کر ڈالا مگر پھر اقرار اطاعت لے کر یہ ریاست اس کے والی کو سپرد کر دی اور فرانس کی حدود میں داخل ہو کر فرانس کے شہر جرندہ تک برابر تاخت وتاراج کرتا ہوا چلا گیا۔ اسلامی فوج ملک فرانس میں زیادہ دیر تک نہیں رہی بلکہ فرانسیسیوں کو اپنی طاقت وصولت دکھا کر جلد واپس چلی آئی۔

عیسائیوں اور بنوامیہ کے دشمنوں کو اب تک اپنی ہر ایک تدبیر اور ہر ایک سازش میں بہ ظاہر ناکامی ہی حاصل ہوتی رہی تھی۔ اب جبکہ تمام ہنگامے فرو ہو گئے اور تمام باغی تھک کر بیٹھ رہے تو فرانس اور اندلس کی شمالی سرحدی ریاستوں کے عیسائیوں نے مل کر ایک مجلس مشاورت منعقد کی اور ایک عرصہ دراز تک دربار قرطبہ کی سرحدات کی طرف توجہ کرنے سے باز رکھنے کا ذمہ جلیقیہ کے پادریوں نے لیا کہ اس عرصہ میں عیسائی طاقتیں متحدہ طور پر فوجی تیاریاں کر سکیں، نئے قلعے بنا سکیں، شمالی عاملوں کو اپنے ساتھ ملا سکیں اور حکومت اسلامیہ پر ایک ایسی ضرب لگانے کے لیے تیار ہو

جائیں کہ اس کا نام ونشان باقی نہ رہے اور پھر وہی گاتھک سلطنت کا زمانہ واپس آ جائے۔ اس کوشش کو خاص مذہبی عبادت قرار دیا گیا۔ پادریان جلیقیہ نے ایک نہایت پرجوش پادری کو قرطبہ میں اس لیے مامور کیا کہ وہ خاص دارالسلطنت قرطبہ اور دوسرے شہروں میں پادریوں اور عیسائیوں کو دین عیسوی کی خدمت کے لیے قربان ہونے اور جان دینے پر آمادہ کرے۔ اندلس میں مسلمانوں کی طرف سے عیسائیوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل تھی۔ وہ اپنے گرجوں میں گھنٹے بجاتے اور اطمینان سے عبادت بجا لاتے تھے۔ مذہبی معاملات اور مقدمات کو عام طور پر عیسائی جج فیصلہ کرتے اور گرجوں کے مصارف شاہی خزانے سے عطا ہوتے تھے۔ مسلمان، عیسائیوں کے تیوہاروں میں اور عیسائی، مسلمانوں کے تیوہاروں میں شریک ہوتے[1] اور تجارت وزراعت وغیرہ میں دونوں قومیں بلاامتیاز یکساں حقوق رکھتی تھیں۔ کوئی ایسی وجہ پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی کہ عیسائیوں میں مسلمانوں کے خلاف مذہبی جوش پیدا کیا جا سکے۔ ان لوگوں کو مسلمانوں کے اصلی اخلاق کا معائنہ کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا کیونکہ ان اطراف میں زیادہ تر وہی لوگ سمٹ کر جمع ہو گئے تھے جو گاتھک سلطنت کے ارکان اور مسلمانوں کی آمد کو اپنی ذلت کا موجب جانتے تھے۔ یہیں پادریوں کے وعظ وتقریر کے ذریعہ سے مخالفت کے شعلے بلند ہوتے رہتے تھے اور مسلمان بھی اسی نواح میں بار بار حملہ آور ہوتے اور قتل وغارت کے ہنگامے برپا کرنے کا موقع پاتے رہتے تھے۔

جنوبی وشمالی اندلس کے عیسائیوں کا نیا فتنہ:

تاہم جنوبی اندلس میں شمالی اندلس کے فدائی عیسائی آ آ کر منتشر ہو گئے۔ انہوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا کہ علانیہ بازاروں اور مجمعوں میں نبی اکرم ﷺ کو گالیاں دیتے، قرآن کریم کی بے حرمتی کرتے اور مسلمانوں کو جوش دلاتے تھے۔[2] ان عیسائی بدزبانوں کو اول گرفتار کر کے قاضی کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہاں بھی انہوں نے بدزبانی کا اعادہ کیا، قاضی نے قتل کا حکم دیا۔ جب اس

---

1. یعنی مسلمانوں کا تنزل اور ان کی بے دینی اس سطح پر پہنچ گئی تھی کہ وہ کفار کے تہواروں میں بہ خوشی شریک ہوتے تھے۔ جبکہ حدیث میں کفار کی مشابہت سے سختی سے روکا گیا ہے۔ (مسند احمد ۵: صفحہ ۲۶۴ و ۲۶۵ بحوالہ یهود ونصاریٰ کی مخالفت کیوں اور کیسے؟ صفحہ ۳۸)

2. عیسائیوں کی تاریخ تو ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ لیکن مسلمانوں نے چاہے وہ کیسے ہی بے عمل ہوں، جواباً کبھی عیسیٰ علیہ السلام کو گالی گلوچ کا نشانہ نہیں بنایا کیونکہ ان کی نبوت پر ایمان رکھنا ہماری بنیادی عقائد میں سے ایک ہے اور یہ بھی موجودہ عیسائیت کے باطل ہونے کی ایک دلیل ہے۔

طرح ایک شخص کا قتل ہوا تو دوسرے نے خود قاضی کے دربار میں پہنچ کر علانیہ نبی اکرم ﷺ کو گالیاں دیں، قاضی نے اس کو بھی قتل کرا دیا۔ ان عیسائیوں نے جو اپنے آپ کو قتل ہی کرانے کے لیے مستعد ہو کر آئے تھے، یکے بعد دیگرے اپنے آپ کو مستحق قتل قرار دینا اور قتل ہونا شروع کیا تو قاضی اور سلطان کی طرف سے درگزر اور چشم پوشی کا برتاؤ شروع ہوا۔ عام عیسائیوں میں یہ خیال بڑی آسانی سے یہ لوگ پھیلا سکے کہ جو لوگ اس طرح مقتول ہوتے ہیں، وہ ولی کامل اور شاہ ولایت [1] بن جاتے ہیں۔ چنانچہ ان مقتولوں کی قبروں کو زیارت گاہ بنایا گیا اور قرطبہ اور دوسرے مقامات کے جاہل عیسائیوں کی ایک تعداد ان قتل ہونے والے عیسائیوں کی قبروں کو عزت وتکریم کی نگاہوں سے دیکھنے اور ان کی زیارت کرنے کو ثواب سمجھنے لگی۔ شمالی ریاستوں کے عیسائی ان ''شہیدوں'' کے مزاروں کی زیارت کو آتے اور خود بھی اسی نامعقول حرکت کا ارتکاب کر کے گرفتار ہو جاتے۔ جب ان شریروں کو مقتل میں لے جایا جاتا تو ہزار آدمی ان کو ولی کامل سمجھ کر ان کا آخری دیدار دیکھنے کو جمع ہو جاتے۔ اس طرح یہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہا اور سلطان سخت شش و پنج میں مبتلا رہا کہ اس طوفان بدتمیزی کو کس طرح سے فرو کیا جائے؟ آخر قرطبہ اور اشبیلیہ وغیرہ کے بڑے بڑے سنجیدہ مزاج پادریوں اور اسقفوں نے ایک عظیم الشان مذہبی مجلس منعقد کی اور ملک اندلس کے تمام بڑے بڑے پادریوں کو اس میں بلا کر یہ مسئلہ پیش کیا کہ آیا مذہب عیسوی کی رو سے مسلمانوں کے پیغمبر (ﷺ) اور ان کی مذہبی کتاب قرآن مجید کو گالیاں دینا ثواب کا کام ہے یا نہیں؟ اور جو لوگ اس طرح مقتول ہو رہے ہیں وہ شہید یا شاہ ولایت کہلانے کے مستحق ہیں یا نہیں؟ اس پر پادریوں نے خوب تقریریں کیں اور اس حرکت کو مذہب عیسوی کے بالکل خلاف قرار دے کر ان لوگوں کو جو اس طرح اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالتے اور مقتول ہوتے تھے، گناہ کا مرتکب قرار دیا اور یہ عجیب فیصلہ کیا کہ جو لوگ اب تک مقتول ہو چکے ہیں وہ تو شہید اور شاہ ولایت سمجھے جائیں گے لیکن جو عیسائی اس کے بعد اس حرکت ناشائستہ کا مرتکب ہوگا، وہ بدمعاش سمجھا جائے گا اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا۔ پادریوں کی کونسل کے اس فیصلے نے اندلسی عیسائیوں کو متاثر کیا لیکن شمالی ریاستوں کے

---

[1] تصوف میں بھی ایسی اصطلاحات ملتی ہیں بلکہ ان سے بھی چار قدم بڑھ کر ''سلطان اولیاء، سلطان العارفین، سلطان الفقرآ......'' وغیرہ خطاب/القاب موجود ہیں۔ مسلمانوں میں تصوف کی گمراہ تعلیمات نصاریٰ، مجوسیوں، روافض، ہندوؤں وغیرہ باطل مذاہب کی طرف سے آئی ہیں اور مسلمانوں نے اپنی بے دینی کی بنا پر ان تعلیمات کو آگے بڑھ کر گلے سے لگایا، العیاذ باللہ!

پادری جو اسی غرض کے لیے اپنے آپ کو ایک ولی کامل کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، اپنی ان حرکات سے باز نہ آئے۔ ایک طرف مسلمانوں کی شکایت تھی کہ سلطان ان عیسائی بدزبانوں کو سزا دینے میں لیت ولعل اور غفلت کرتا ہے، اسی لیے ان کے حوصلے بڑھتے جاتے ہیں۔ دوسری طرف عیسائیوں کا جاہل طبقہ اپنے ان پادریوں کو برا کہنے لگا جنھوں نے ان مذہبی شہیدوں کو بدمعاش قرار دیا تھا۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے جو خوش گوار تعلقات ملک میں قائم تھے اور ان میں کوئی مذہبی منافرت نہیں پائی جاتی تھی، وہ کمزور ہونے لگے اور عیسائی مسلم نااتفاقی پیدا ہونے لگی۔

عیسائیوں کے اس فتنے نے سلطان عبدالرحمٰن کو اس کی عمر کے آخری پانچ چھ سال میں بہت پریشان اور غمگین رکھا اور اس کی زندگی میں اس عجیب وغریب قسم کے فتنے کا مکمل سدباب نہ ہو سکا بلکہ اس کا کم وبیش سلسلہ جاری رہا۔

عبدالرحمٰن کی وفات:

آخر ماہ ربیع الاخر سنہ ۲۳۸ھ میں اکتیس سال چند ماہ حکومت کرنے کے بعد عبدالرحمٰن ثانی نے وفات پائی اور اس کا بیٹا محمد تخت نشین ہوا۔

عبدالرحمٰن کے عہد حکومت پر تبصرہ:

سلطان عبدالرحمٰن ثانی کا عہد حکومت اگرچہ لڑائی جھگڑوں سے خالی نہیں رہا، تاہم اس سلطان نے رفاہ رعایا اور علوم وفنون کی طرف سے غفلت نہیں برتی۔ عبدالرحمٰن خود نہایت اعلیٰ درجہ کا عالم اور فلسفہ شریعت کا خوب ماہر تھا۔ جامع مسجد قرطبہ میں متعدد کمرے تعمیر کرا کر اس میں اضافہ کیا۔ بہت سی مسجدیں، پل اور قلعے تعمیر کرائے۔ نئی سڑکیں نکالیں، مسافروں اور تاجروں کی سہولت کے سامان بہم پہنچائے۔ سررشتہ تعلیم کی طرف اس کی توجہ ہمیشہ مبذول رہی۔ کسی قصبے اور گاؤں کو بلا مدرسہ نہیں چھوڑا۔ ہر ایک شہر اور قصبے میں اپنے عاملوں اور مجسٹریٹوں کے لیے دفتروں اور کچہریوں کے شاندار مکانات تعمیر کرائے۔ ہر ایک شہر اور قصبے میں حمام بھی تعمیر کرائے۔

عبدالرحمٰن ثانی کو آرائش اور شان وشکوہ کا بڑا شوق تھا۔ رعایا کے سامنے عام منظروں میں کم نکلتا اور اکثر رعایا کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتا تھا۔ اس کی طبیعت میں رحم وکرم کا مادہ زیادہ تھا۔ سخت سزائیں دینے اور قتل کرانے میں ہمیشہ تامل کرتا۔ اس کے زمانے میں سلطنت کا خزانہ بہت ترقی کر

گیا تھا۔ اس نے پہلے سے زیادہ خوبصورت سکے مسکوک کرائے۔ دریائے وادی الکبیر کے دونوں کناروں پر قرطبہ سے متصل متعدد باغات میووں کے لگائے اوران کوعوام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یونانی فلسفوں کی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ علمی مجالس مقرر کیں۔ ایک مرتبہ ٹڈی دل کی کثرت نے کھیتوں کو کھا کر صفاچاٹ کر دیا اور امساک باراں کے سبب سے ملک میں عام طور پر قحط پڑ گیا۔ سلطان نے اس موقع پر رعایا کی بڑی مدد کی اور پھر یہ قاعدہ مقرر کیا کہ غلہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ شاہی خزانہ سے خرید کر مہیا رکھا جائے تا کہ کسی ایسے ہی قحط کے موقع پر رعایا کے کام آ سکے۔

ولی عہدی:

سلطان عبدالرحمٰن کی ایک بیوی طروب نامی تھی جس کے ساتھ اس کو محبت تھی۔ اس کے پیٹ سے عبدالرحمٰن کا بیٹا عبداللہ پیدا ہوا تھا۔ طروب کی یہ خواہش تھی کہ سلطان اپنے بعد عبداللہ کو تخت وتاج کا مالک قرار دے لیکن سلطان کا بیٹا محمد اپنے بھائی عبداللہ سے زیادہ قابل اور مستحق سلطنت تھا۔ طروب نے ایک مرتبہ اس بات کی کوشش کی کہ محمد کو زہر دے کر قتل کرا دیا جائے۔ اس کام کے لیے نصر نامی خواجہ سرا کو رازدار بنایا گیا۔ نصر نے ایک شاہی طبیب کو بڑا بھاری لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ دوا میں زہر ہلاہل ملا کر محمد کو پلا دے جو ان دنوں اس طبیب کے زیر علاج اور کسی معمولی مرض میں مبتلا تھا۔ شاہی طبیب نے نصر کی اس فرمائش کو منظور کر لیا مگر پوشیدہ طور پر سلطان کو بھی اطلاع دے دی کہ آج دوا کا پیالہ شہزادے کے لیے آئے گا، اس میں زہر ہلاہل شامل ہو گا۔ چنانچہ زہر آلود پیالہ آیا، بادشاہ نے نصر سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس دوا کو آج تم ہی پی جاؤ۔ نصر کو دوا پینی پڑی اور پیتے ہی فوراً مر گیا۔ جو گڑھا اس نے شہزادہ محمد کے لیے کھودا تھا، خود ہی اس میں گرا۔ اس کے چند روز بعد سلطان عبدالرحمٰن کا انتقال ہوا اور شاہی محافظ فوج کی مدد سے جو سلطان حکم کے زمانے سے قائم تھی، شہزادہ محمد تخت نشین ہوا اور عبداللہ مع اپنی والدہ طروب کے ناکام رہا۔

عبدالرحمٰن بن معاویہ یعنی عبدالرحمٰن اول یا عبدالرحمٰن الداخل کے زمانے میں ملکی محاصل کی تعداد تین لاکھ دینار تھی۔ سلطان حکم کے زمانے میں یہ تعداد چھ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ عبدالرحمٰن ثانی کے زمانے میں ملکی محاصل جو خزانہ شاہی میں داخل ہوتے تھے، دس لاکھ دینار سالانہ تھے۔ کل آمدنی کے تین حصے کیے جاتے تھے۔ ایک حصہ فوج کی تنخواہوں میں، ایک حصہ حکام اور عہدہ داران

سلطنت کی تنخواہوں میں صرف ہوتا تھا۔ ایک حصہ خزانہ عامرہ میں غیر مترقبہ ضرورتوں کے لیے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اسی میں رفاہ رعایا کے کام اور تعمیرات وغیرہ کے مصارف پورے کیے جاتے تھے۔ عبدالرحمٰن ثانی نے بعض تجارتی سامان اور دوسری چیزوں پر محصول لگا کر آمدنی کو بڑھایا تھا۔ اسی لیے اس کے خلاف ملک میں مخالفت کا جذبہ بہ آسانی پیدا کیا جا سکا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالرحمٰن کی اولاد سینکڑوں تک پہنچ گئی تھی یعنی سو سے زیادہ بیٹے اور پچاس کے قریب بیٹیاں تھیں۔ عبدالرحمٰن بہت قیافہ شناس تھا۔ اس کو اس کی رعایا نے المظفر کا خطاب دیا تھا۔ اس کا سجع اور نقش ''راضی بہ رضا'' تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ آنکھیں گہری، دراز ریش، جسیم وشحیم آدمی تھا۔ داڑھی میں حنا کا خضاب لگاتا تھا۔ وفات کے وقت ۴۵ لڑکے زندہ تھے۔

عبدالرحمٰن ثانی کے عہد حکومت میں عیسائیوں کو سلطنت کے بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدے دیے جاتے تھے اور عیسائی جو عام طور پر عربی زبان بولتے اور لکھتے تھے۔ دفتروں پر قابض ومتصرف ہو گئے تھے، مسلمانوں کی توجہ زیادہ تر فوجی خدمات کی طرف تھی۔ دفتری اہل کاریوں کو انہوں نے عیسائیوں کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

محمد بن عبدالرحمٰن کی تخت نشینی:

سلطان عبدالرحمٰن ثانی کے زمانے میں عیسائیوں کا اثر واقتدار دفاتر شاہی میں بہت بڑھ گیا تھا۔ مسلمان علماء اس حالت کو خاموشی کے ساتھ معائنہ کر رہے تھے اور سلطان حکم کے زمانے کا تجربہ کرنے کے بعد اب خاموش تھے مگر عیسائیوں کے اس رسوخ واقتدار نیز ان شرارتوں اور گستاخیوں کو دیکھ دیکھ کر کبیدہ خاطر ضرور تھے۔

سلطان محمد کا پہلا کام:

سلطان محمد نے جو ربیع الآخر سنہ ۲۳۸ھ میں اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا تھا، تخت نشین ہوتے ہی ذمہ داری کے عہدوں پر مسلمانوں کو مامور کیا اور عمال وحکام کو جو اسلامی احکام واعمال کی پابندی میں ناقص تھے، معزول کیا۔ سلطان محمد کی یہ پہلی کارروائی علماء اسلام کو بہت ہی پسند آئی۔ اسی عرصہ میں اندلس کے اندر بعض علماء کے ذریعہ سے جو حج کی غرض سے عرب وشام کے ملکوں میں آئے تھے، حنبلی مذہب داخل ہوا۔ قرطبہ کے اندر حنبلی اور مالکی مولویوں کے مباحثے اور

مناظرے شروع ہوئے اور مسلمانوں کے دو گروہ ہو کر آپس میں چھری کٹاری ہونے پر مستعد ہو گئے۔[1] سلطان محمد بن عبدالرحمٰن نے اس مباحثے میں خود دخل دے کر فیصلہ کیا اور اس برپا ہونے والے فتنے کو فرو کیا۔ اس خیال سے کہ مسلمانوں کی توجہ کو دوسری جانب منعطف کر دینے سے آپس کی مخالفتوں اور خانہ جنگیوں کا خطرہ دور ہو جائے گا، جہاد کے لیے فوجی بھرتی شروع کی گئی اور ایک زبردست فوج تیار کر کے شمالی عیسائی ریاستوں کے خلاف مہم روانہ ہوئی۔

اس زمانے میں ریاست ایسٹریاس یعنی سلطنت قسطلہ کے حاکم نے اسلامی علاقے کے متعدد شہروں پر قبضہ کر لیا تھا اور ہر طرف سے ایک عیسائی رئیس اسلامی رقبہ کو دباتا چلا جاتا تھا۔ اس فوج نے اول شاہ اردونی والی قسطلہ کے خلاف پیش قدمی کی۔ اس فوج کی سرداری سلطان محمد نے موسیٰ بن موسیٰ کو سپرد کی۔ یہ موسیٰ بن موسیٰ گاتھ قوم سے تعلق رکھتا تھا اور نومسلم تھا۔ مثل اس کے اور بھی کئی نومسلم شاہی فوج کی سرداریوں اور صوبوں کی گورنریوں پر مامور تھے۔ آخر اس مہم کا نتیجہ کچھ زیادہ مفید نہ نکلا اور معمولی معرکہ آرائیوں کے بعد اس طرف سے فوج واپس آ گئی۔ اب اس فوج کو برشلونہ کی جانب بھیجا گیا۔ کیونکہ وہاں بھی عیسائیوں نے جادۂ اطاعت سے قدم باہر رکھا تھا۔ وہاں سے بھی معمولی مال غنیمت لے کر یہ فوج واپس آ گئی۔

بغاوتوں کا استیصال:

سنہ ۲۳۹ھ میں باشندگان طیطلہ نے یہ محسوس کر کے کہ دربار قرطبہ پر علماء کا قبضہ و اثر زیادہ ہو گیا ہے اور عیسائی فدائیوں کو بلا تامل قتل کیا جانے لگا ہے، اپنے آپ کو خطرہ میں محسوس کر کے یا شمالی عیسائیوں کی قرارداد کے موافق سلطنت اسلامیہ کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی غرض سے بغاوت کی تیاری کی۔ یہ واضح رہے کہ سلطان محمد نے تخت نشین ہو کر جب عیسائی شہداء کی تعداد میں بے دریغ اضافہ کرنا شروع کر دیا تو عیسائیوں نے اپنی اس حرکت ناشائستہ کو بالکل ترک کر دیا تھا۔ اس کے عوض میں اب طیطلہ کی بغاوت کا اہتمام ہونے لگا۔ اہل طیطلہ نے اپنے عربی النسل گورنر کو گرفتار کر کے دربار قرطبہ میں پیغام بھیجا کہ سلطان عبدالرحمٰن ثانی نے ہمارے جن لوگوں کو بہ طور یرغمال

---

[1] حنبلیوں اور مالکیوں، حنفیوں اور شافعیوں، سنیوں اور شیعوں کی ایسی لڑائیوں، باہمی قتل وغارت، ایک دوسرے پر کفر کے فتووں حتیٰ کہ ایک دوسرے سے لڑائی کے لیے ماہ رمضان المبارک میں دن کے وقت روزہ افطار کر دینے تک کے واقعات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: دعوت تحقیق۔ سید وقار علی شاہ، صفحہ ۸ تا ۱۱۔

قرطبہ میں لے جا کر زیر نگرانی رکھا تھا، ان کو واپس کر دو ورنہ ہم تمہارے گورنر کو قتل کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیں گے۔

سلطان محمد نے اہل طیطلہ کی درخواست کو منظور کر کے ان لوگوں کو جو بہ طور یرغمال قرطبہ میں موجود تھے، طیطلہ بھیج دیا۔ اہل طیطلہ نے بجائے اس کے کہ وہ اب راہ راست پر آ جاتے، سلطان محمد کی کمزوری کا یقین کر کے علانیہ علم بغاوت بلند کر دیا اور طیطلہ کو ہر طرح سے مضبوط کر کے شمالی عیسائی سلاطین سے امداد طلب کی۔ اہل طیطلہ بار بار بغاوت کر چکے تھے مگر تعجب ہے کہ اب تک کسی بادشاہ نے بھی طیطلہ کے قلعہ اور شہر پناہ کو منہدم کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس کا سبب بھی مسلمانوں کی وہی بلند نظری ہے جس نے ان کو شمالی سرحدی ریاستوں کے استیصال سے باز رکھا۔ ورنہ یہ کام اس سے پہلے ان کے لیے نہایت ہی آسان اور معمولی تھا۔

سلطان محمد خود فوج لے کر سنہ ۲۴۰ھ میں قرطبہ سے طیطلہ کی جانب روانہ ہوا۔ ابھی سلطان محمد طیطلہ تک نہیں پہنچنے پایا تھا کہ ریاست ایسٹریاس کی فوج اور پہاڑی جنگ جو اہل طیطلہ کی امداد کے لیے طیطلہ میں داخل ہو گئے۔ سلطان نے طیطلہ کی فتح کو دشوار دیکھ کر یہ ترکیب کی کہ اپنی فوج کے بڑے حصے کو پہاڑوں، ٹیلوں اور جھاڑیوں میں چھپا کر ایک چھوٹے سے حصے کو میدان سلیط میں، جو ان ٹیلوں اور جھاڑیوں کے درمیان تھا، خیمہ زن کیا۔ اہل طیطلہ نے جب یہ دیکھا کہ سلطان کے ساتھ بہت ہی تھوڑی سی فوج ہے اور اسی لیے وہ طیطلہ کے محاصرے کی جرأت نہیں کر سکا تو وہ خود طیطلہ سے نکل کر سلطانی لشکر پر حملہ آور ہوئے۔ جب لڑائی شروع ہو گئی تو چاروں طرف سے سلطانی لشکر نکل کر حملہ آور ہوا۔ اس غیر مترقبہ آفت سے پہاڑی عیسائی اور اہل طیطلہ حواس باختہ ہو کر بھاگنے لگے مگر سلطانی لشکر نے اس میدان میں بیس ہزار آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ اس شکست سے اہل طیطلہ کی ہمت پست ہو گئی اور سلطان محمد نے بہ آسانی طیطلہ پر قبضہ کر کے وہاں ایک معمولی دستہ فوج متعین کیا۔

اس لڑائی میں اس قدر عظیم الشان کشت وخون ہوا تھا کہ اب اہل طیطلہ کے باغی ہونے اور سرکشی اختیار کرنے کی توقع نہ رہی تھی لیکن اہل طیطلہ کے تعلقات اب شمالی عیسائی سلاطین سے قائم ہو چکے تھے۔ ادھر شاہی لشکر میں بہت سے سردار اور صوبوں کے عامل ایسے تھے جو شاہ ایسٹریاس، شاہ گاتھک مارچ، شاہ جلیقیہ، شاہ نوار، شاہ ایکیوٹین، بادشاہ فران سے درپردہ خط وکتابت رکھتے اور

سازش کر چکے تھے۔ جس طرح ہر ملک میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کا سبب آپس کی نااتفاقی ہوا ہے، اسی طرح اندلس میں بھی آپس کی نااتفاقی اور خانہ جنگی نے نتیجۂ بد دکھایا۔ اندلس میں اس نااتفاقی و خانہ جنگی کی مثالیں دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ اور غیر معمولی نظر آتی ہیں۔ اندلس کی اسلامی تاریخ میں کوئی زمانہ ایسا دستیاب نہیں ہوتا جس میں مسلمان اس مہلک مرض سے محفوظ و مامون نظر آتے ہوں۔ بہرحال عیسائیوں کے اتحاد اور مسلمانوں کی غداری نے اہل طیطلہ کو سنہ ۲۴۲ھ کے آخر میں پھر بغاوت و سرکشی پر آمادہ کر دیا۔ اس مرتبہ سلطان محمد نے پھر طیطلہ پر چڑھائی اور دوبارہ ان کو مطیع و منقاد بنا کر اور باغیوں کو سزائیں دے کر واپس ہوا۔ مگر سلطان محمد کے واپس ہوتے ہی اہل طیطلہ نے ایک عیسائی سردار کے زیر قیادت پھر علم بغاوت بلند کیا۔ غرض اہل طیطلہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے اور سلطان محمد کو بارہا ان پر چڑھائی کرنے میں مصروف رہنا پڑا۔ آخر سنہ ۲۴۸ھ میں سلطان محمد اس بات پر رضامند ہو گیا کہ اہل طیطلہ کو اقرار اطاعت لے کر حکومت خود مختاری عطا کر دے یعنی اہل طیطلہ کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ اپنا گورنر خود منتخب کر لیں اور وہ گورنر ایک مقررہ سالانہ رقم دارالسلطنت قرطبہ میں بھیجا کرے، باقی اندرونی انتظام میں وہ خود مختار ہوگا۔ سلطان محمد نے اہل طیطلہ کی اس شرط کو منظور کر کے نہ صرف اپنی کمزوری کا اظہار کیا بلکہ یوں کہیے کہ عیسائیوں کے اس قدیمی دارالسلطنت کو خود مختاری حکومت عطا کر کے اندلس میں دوبارہ عیسائی سلطنت کا سنگ بنیاد رکھ دیا اور اسلامی سلطنت اندلس کے ایوان کی بنیاد میں سرنگ لگا دی جس سے ایک عرصہ کے بعد مسلمانوں کا نام و نشان ملک اندلس سے گم ہو گیا۔ طیطلہ والوں نے موسیٰ بن موسیٰ نو مسلم کے بیٹے لوپ کو گورنر بنانا چاہا۔ سلطان محمد نے اس کو بہ خوشی منظور کر لیا۔ اس کے بعد طیطلہ میں شمالی علاقے کی عیسائی حکومتوں سے پہاڑی اور جنگجو عیسائی آ آ کر بہ کثرت آباد ہونے شروع ہوئے اور مسلمانوں کو جو طیطلہ میں آباد تھے، بہ تدریج وہاں سے خارج اور بے دخل کرنا شروع کیا۔ نہ صرف شہر طیطلہ بلکہ اس کے ارد گرد کا تمام علاقہ ریاست ایسٹریاس کا نمونہ بن گیا۔ ادھر موسیٰ بن موسیٰ گورنر سرقسطہ نے عیسائی سلاطین سے خفیہ معاہدے کر لیے تھے۔ غرض اس غدار خاندان نے سلطنت اسلامیہ کو کمزور کرنے میں خوب حصہ لیا جو بہ ظاہر مسلمان کہلاتا تھا۔

اسی سال نارمن قوم نے اندلس کے مغربی ساحل پر اپنی کشتیاں لا کر اس طرف کے ساحلی علاقے پر چھاپہ مارا مگر سلطان محمد کے جہازوں نے جو اس ساحل پر موجود تھے، نارمنوں کی پچاس

کشتیاں گرفتار کرلیں اور وہ بلاسخت نقصان پہنچائے اندلس سے بھاگ گئے۔

رجب سنہ ۴۵۱ھ میں سلطان محمد نے اپنے بیٹے منذر کو سرحد شمال کی جانب البہ اور قلاح کے عیسائی سرکشوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا اور اس کے پیچھے خود فوج لے کر جلیقیہ کے قصد کی غرض سے روانہ ہوا۔ یہاں باپ بیٹوں کو فتوحات حاصل ہوئیں لیکن عیسائی لوگ اب مسلمانوں کے ان حملوں اور شمالی علاقے پر چڑھائیوں کو خوب پہچان گئے تھے۔ جب کوئی نہایت زبردست فوج حملہ آور ہوتی تو وہ معمولی مقابلہ کر کے پہاڑوں میں جا چھپتے اور معافی کی درخواستیں بھیجتے، اطاعت کا اقرار کرتے اور اس طرح ان حملہ آوروں کو واپس کر کے پھر اپنے مقبوضہ ملک پر قابض ومتصرف ہو کر حکومت کرنے لگتے۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ شاہی فوجیں قرطبہ کی جانب واپس آئیں اور عیسائیوں نے اپنی پیش قدمی شروع کی۔ اس سے پیشتر عیسائیوں کے حملے اسلامی شہروں پر لوٹ مار کی غرض سے ہوتے تھے لیکن اب وہ مسلمانوں کی کمزوری کو بہ خوبی محسوس کر چکے تھے۔ اب انہوں نے جس شہر پر قبضہ کیا، اپنا عامل مقرر کیا اور وہاں باقاعدہ حکومت قائم کر کے جلد جلد اپنے رقبہ حکومت کو وسیع کرنے لگے۔ چنانچہ جس طرح مشرقی ساحل پر برشلونہ لے لینے کے بعد عیسائی مشرقی ساحل پر نیچے اترنے کی فکر میں تھے، اسی طرح انہوں نے مغربی ساحل پر قبضہ کرنا شروع کیا اور پرتگال کے علاقے کو زیر تصرف لے آئے۔ سلطان محمد نے ایک جنگی بیڑہ ترتیب دے کر بحری راستے سے فوج بھیجی کہ وہ خلیج بسکی میں پہنچ کر جلیقیہ کے شمالی جانب سے حملہ آور ہو لیکن اتفاق سے سمندر میں طوفان آیا اور یہ بیڑا طوفان میں سخت نقصان اٹھا کر بے نیل مرام واپس آیا۔ اس کے بعد بحری مہم کا خیال ترک کر دیا گیا۔

اہل طیطلہ کی مثال دیکھ کر جابہ جا شہروں میں بغاوتیں شروع ہوئیں اور ہر ایک اس شہر نے جہاں عیسائیوں کی آبادی زیادہ تھی، حکومت خود مختاری کا مطالبہ کیا۔ ان بغاوتوں کو فرو کرنے میں سلطان محمد کو مطلق اطمینان میسر نہ ہوا۔

ایک نئے مذہب کی ایجاد:

ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ سنہ ۲۶۳ھ میں عبدالرحمٰن بن مروان نے جو اس سے پہلے بھی بغاوتوں میں حصہ لے چکا تھا اور سلطان محمد کی بے جا رعایت کے سبب سے نواح مریدہ میں ایک

ذمہ داری کے عہدے پر مامور تھا، اعلان بغاوت کیا۔ سلطان محمد نے اس طرف فوج کشی کی۔ تین مہینے کی جنگ و پیکار کے بعد عبدالرحمٰن بن مروان نے بہ جائے اس کے کہ اپنے وعدے اور ارادے کے موافق بغداد کی جانب روانہ ہوتا، اندلس ہی میں رہ کر ایک نئے مذہب کی ایجاد کی۔ اس مذہب میں عیسائیت اور اسلام کے اصولوں کو جمع کر کے ترتیب دیا گیا تھا۔[1] اس جدید مذہب میں بہت سے آوارہ مزاج مسلمان اور عیسائی شامل ہونا شروع ہوئے۔ چونکہ تمام ملک میں خودسری کی ہوا چل رہی تھی، لہٰذا بہت سے واقع پسند لوگ بلا لحاظ مذہب بھی اس کے گرد آ آ کر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ اس طرح صوبہ جلیقیہ وصوبہ پرتگال کی حدود میں ایک خطرناک لشکر حکومت وقت کے خلاف عبدالرحمٰن بن مروان کی سرداری میں فراہم ہو گیا۔ سلطان محمد نے اس خطرے سے آگاہ ہو کر اپنے وزیر ہاشم بن عبدالعزیز کو ایک فوج دے کر اس طرف روانہ کیا۔ عبدالرحمٰن نے ہاشم کو دھوکا دیا اور اس کے سامنے سے فرار ہوتا ہوا اپنے تعاقب میں ایک جگہ ہاشم کو لے گیا، جہاں کمین گاہ میں فوج چھپی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس فوج نے یکا یک چاروں طرف سے حملہ آور ہو کر ہاشم کی تمام فوج کو کاٹ ڈالا اور ہاشم گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے پہلے عبدالرحمٰن بن مروان نے الفانسو حاکم ایسٹریاس سے خط و کتابت کر کے دوستی و محبت کا عہد نامہ لکھ دیا تھا۔ اب اندلس کے وزیر اعظم کو گرفتار کر کے اس نے اپنے دوست الفانسو کے پاس بھیج دیا تھا تاکہ اس کو عبدالرحمٰن کی طاقت وقوت کا اندازہ ہو سکے اور محبت و دوستی کے تعلقات استوار ہو جائیں۔ سلطان محمد کو جب اپنے وزیر کے گرفتار ہونے کا حال معلوم ہوا تو اس نے عبدالرحمٰن بن مروان کو ہاشم کی رہائی کی نسبت لکھا۔ ابن مروان نے ایک لاکھ دینار زر فدیہ طلب کیا۔ چند مہینے تک ہاشم قید میں رہا اور عبدالرحمٰن بن مروان و سلطان محمد کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی۔ آخر سلطان محمد نے اس بات کو منظور کر لیا کہ عبدالرحمٰن شہر بطلیوس اور اس کے نواحی علاقے پر قابض و متصرف رہے اور اس پر کوئی خراج بھی عائد نہ کیا جائے۔ ساتھ ہی زر فدیہ ادا کر کے ہاشم کو چھڑایا جائے۔ چنانچہ ہاشم جب چھوٹ کر آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا حریف جس

[1] اسے شائد عیسائیوں نے اس کام پر ابھارا تھا۔ بہر حال یہ کفر کا مذہب تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو دین عرش سے نازل فرمایا تھا، وہ خالص اور شفاف ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش کا اختیار تو نبی کریم ﷺ کو بھی نہیں تھا کجا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے کسی امتی کو ہوتا۔ سورہ الحاقہ، آیت ۴۴ تا ۴۶ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اگر ہمارے نبی ﷺ (دین میں) اپنی طرف سے کوئی بات جھوٹ بنا لیتے تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑتے، پھر ہم ان کی شہ رگ کاٹ دیتے۔'' کتنی سخت تنبیہ ہے لیکن یہ دراصل امت کو خطاب ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے ایسی توقع ہی ناممکن ہے، جن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ خود لیتا ہے۔

نے اس کو قید کر لیا تھا، ایک نہایت مضبوط مقام پر خود مختار حاکم ہو گیا ہے اور باج وخراج سے بھی بالکل آزاد ہے۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ وزیر ہاشم کی رہائی اڑھائی برس کے بعد سنہ۲۶۵ھ میں ہوئی تھی۔

غرض عبدالرحمٰن بن مروان جو ایک معمولی باغی سردار تھا، اب اپنے آپ کو سلطان محمد کا ہمسر سمجھنے لگا۔ اس نے سلطنت ایسٹریاس سے اپنے تعلقات دوستی کو خوب بڑھایا۔ یہ رنگ دیکھ کر ملک کے ہر حصے میں سرداروں نے بغاوت وسرکشی پر کمر باندھی اور رعب سلطنت خاک میں مل گیا۔

موسیٰ بن ذی النون گورنر شنت بریہ نے بغاوت اختیار کر کے طیطلہ پر حملہ کیا کہ اس کو اپنے قبضے میں لائے۔ اہل طیطلہ نے مقابلہ کر کے اس کو شکست دی۔ اس نے پھر حملہ کیا اور اس طرح ان کی زور آزمائی کا سلسلہ جاری ہوا۔ ادھر اسد بن حرث بن بدیع نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان محمد نے شہزادہ منذر کو فوج دے کر موسیٰ بن ذی النون کی طرف بھیج دیا۔ منذر کئی شہروں اور قلعوں کو فتح کر کے قرطبہ میں واپس آ گیا۔ غرض سلطان محمد کو بغاوتوں کو فرو کرنے اور فوجیں بھیجنے سے ایک روز بھی فرصت نہیں ملی۔

اسی نازک زمانے میں عمر بن حفصون نامی ایک عیسائی نے خاص صوبہ اندلیسیہ یعنی جزیرہ نمائے اندلس کے جنوبی ومشرقی علاقے کے پہاڑوں میں اپنے گرد ڈاکوؤں کی ایک جمعیت فراہم کی۔ عمر بن حفصون گاتھک خاندان کے سربرآوردہ اشخاص میں تھا۔ اس لیے بڑی آسانی سے وہ عیسائیوں اور جرائم پیشہ لوگوں کو جمع کر سکا۔ نواح مالقہ میں پہاڑ کے ایک دشوار گزار مقام پر قلعہ بنا ہوا تھا۔ اس قلعہ کو عمر بن حفصون نے اپنی قرارگاہ بنایا اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اردگرد کے شہروں اور قصبہ کے عاملوں نے بار بار اس پر چڑھائیاں کیں مگر ہر مرتبہ شکست یاب ہوئے۔ آخر سنہ۲۶۷ھ میں دارالسلطنت قرطبہ سے ایک زبردست فوج اس کی سرکوبی کو روانہ ہوئی۔ عمر بن حفصون نے بہ راہ چالاکی اس فوج کی آمد پر درخواست صلح بھیجی اور اس بات کا وعدہ کیا کہ آئندہ لوٹ مار کرنے سے باز رہ کر علاقے میں امن وامان قائم رکھے گا۔ چنانچہ اسی شرط پر وہ پہاڑی قلعہ اس کے قبضے میں چھوڑ دیا گیا اور امن وامان قائم ہو گیا۔

سنہ۲۶۸ھ میں سلطان محمد نے شہزادہ منذر کو ایک زبردست فوج دے کر شمال کی جانب بھیجا کہ اس طرف کے عیسائی سرکشوں کو سزا دے دی جائے۔ شمالی ریاستوں اور باغیوں کی حالت، جیسا کہ

اوپر بیان ہو چکا ہے، یہ تھی کہ جب کوئی زبردست فوج اس طرف جاتی تھی تو اظہار اطاعت کرنے لگتے تھے۔ جب یہ فوج واپس ہوئی پھر تمرد و سرکشی پر قائم ہو گئے۔ چنانچہ شہزادہ منذر نے اول سرقسطہ پہنچ کر وہاں کے باغیوں کو درست کیا پھر البہ وقلاح وغیرہ کا رخ کیا۔ اس کے بعد لریدہ کی بدنظمی کو دور کر کے وہاں اسماعیل بن موسیٰ کو ناظم مقرر کیا اور واپس چلا آیا۔ منذر کے واپس ہوتے ہی حاکم برشلونہ نے اسماعیل پر حملہ کیا۔ اسماعیل نے کمال مردانگی سے مقابلہ کر کے اہل برشلونہ کو شکست دے کر بھگا دیا۔

سنہ ۲۷۰ھ میں عمر بن حفصون نے پھر بغاوت اختیار کی اور پہلے سے زیادہ طاقت بہم پہنچا کر علاقہ مالقہ کے امن وامان کو برباد کر دیا۔ قرطبہ سے ہاشم بن عبدالعزیز وزیراعظم ایک فوج لے کر عمر بن حفصون کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ معرکے ہوئے، آخر ہاشم نے سلام و پیام کے ذریعہ سے عمر بن حفصون کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی اور اس کو معافی کا وعدہ دے کر اپنے ساتھ قرطبہ چلنے پر رضامند کر لیا۔ عمر بن حفصون، وزیر ہاشم کے ساتھ قرطبہ چلا آیا۔ وزیر ہاشم اس کی بہادری دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے سلطان محمد سے کہہ کر عمر بن حفصون کو افواج سلطانی کا سپہ سالار اعظم مقرر کرا دیا۔

اس کے بعد سنہ ۲۷۱ھ میں وزیر ہاشم، عمر بن حفصون کو ایک زبردست فوج کے ساتھ ہمراہ لے کر شمال کی جانب متوجہ ہوا۔ وہاں اہل سرقسطہ پھر باغی ہو گئے تھے اور ریاست ایسٹریاس کی جانب سے خطرات پیدا ہو رہے تھے۔ عمر بن حفصون نے ان لڑائیوں میں بڑی شہرت و ناموری حاصل کی۔ اہل سرقسطہ اور عیسائیان ایسٹریاس کو پیہم شکستیں دے کر اور خراج وصول کر کے یہ دونوں واپس ہوئے۔ عمر بن حفصون کو حکومت اسلامیہ کی سپہ سالاری کچھ پسند نہ آئی کیونکہ اس طرح وہ اپنی امیدوں کو کہ دوبارہ گاتھک حکومت قائم ہو جائے، پورا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ راستے ہی سے وہ فرار اور وزیر ہاشم سے جدا ہو کر بھاگا اور سیدھا اپنے اسی پرانے قلعے میں پہنچ کر مضبوط ہو بیٹھا۔ اس کے قدیمی دوست اور پرانے رفیق پھر آ آ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ادھر عمر بن حفصون نے پہلے سے زیادہ مضبوط ہو کر نواح مالقہ میں خود مختارانہ حکومت شروع کی، ادھر عبدالرحمٰن بن مروان نے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، اشبیلیہ اور اس کے نواحی علاقے میں لوٹ مار شروع کر دی۔ سلطان محمد نے اشبیلیہ کی طرف اپنے بیٹے منذر اور وزیر ہاشم کو فوج دے کر بھیجا اور عمر بن حفصون کو اپنی حکومت و

ریاست قائم کرنے کے لیے نہایت قیمتی صورت مل گئی۔ وہاں اشبیلیہ کے نواح میں دو سال تک جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر سنہ ۲۷۲ھ میں عبدالرحمٰن بن مروان کو تھوڑا سا علاقہ اور دے کر صلح کر لی گئی اور اس طرف کی ہنگامہ آرائی ختم ہوئی۔

اس کے بعد شہزادہ منذر کو عمر بن حفصون کی طرف بھیجا گیا۔ عمر بن حفصون جب سے سپہ سالاری چھوڑ کر آیا تھا، پہلے کی نسبت زیادہ شائستہ اور مآل اندیش بن گیا تھا۔ اس نے دربار قرطبہ اور وزیر ہاشم کی صحبت سے بہت فائدہ اٹھایا اور اس مرتبہ آ کر بہ جائے ایک ڈاکو اور رہزن کے وہ ایک فرماں روا اور والی ملک کی حیثیت میں نمودار ہوا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جس قدر حصہ ملک پر اس کا قبضہ تھا، اس میں چوری اور ڈاکہ زنی کا بالکل انسداد کر دیا اور رہزنوں، چوروں اور ظالموں کو نہایت عبرتناک سزائیں دیتا اور بالخصوص اپنے سپاہیوں اور فوجی سرداروں کو تو قطعاً رعایا پر ظلم نہ کرنے دیتا۔ اس کا اثر اس کی حکومت و طاقت کو بڑھانے کا موجب ہوا اور یہی وہ گر تھا جو عمر بن حفصون دربار قرطبہ سے یاد کر کے آیا تھا۔ اب رعب سلطنت کے باقی نہ رہنے سے ملک میں ہر طرف بدامنی کا دور دورہ تھا اور ایسی حالت میں رعایا کے جان و مال کا محفوظ نہ ہونا یقینی بات تھی لیکن بہ خلاف اس کے عمر بن حفصون نے اپنے چھوٹے سے مقبوضے میں جس پر وہ غاصبانہ اور باغیانہ طور پر قابض و متصرف تھا، قابل رشک امن و امان قائم کر رکھا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی آبادی کو اس کے ساتھ محبت اور ارد گرد کے علاقوں کو بھی اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔

سلطان محمد کی وفات:

سنہ ۲۷۲ھ کے آخر اور سنہ ۲۷۳ھ کے شروع میں منذر بن محمد ولی عہد سلطنت فوج لے کر عمر بن حفصون کے مقابلہ کو آیا۔ ابتداءً چند چھوٹی چھوٹی معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ اس کے بعد بہت زیادہ ممکن تھا کہ عمر بن حفصون کو مغلوب یا مقتول یا گرفتار کر لیا جائے۔ عمر بن حفصون زخمی ہو چکا تھا۔ اس کو اور اس کی فوج کو منذر بن محمد نے محصور کر کے اس قدر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو منذر کے سپرد کر دینے والا تھا کہ اسی اثناء میں منذر کے پاس سلطان محمد کے فوت ہونے کی خبر پہنچی۔ منذر اس خبر کو سنتے ہی بلاتوقف قرطبہ کی جانب روانہ ہو گیا اور عمر بن حفصون اس طرح مع اپنی جماعت کے برباد ہونے سے بچ گیا۔

سلطان محمد سنہ ۲۰۷ھ میں پیدا ہوا تھا۔ قریباً ۶۶ سال کی عمر پا کر ماہ صفر سنہ ۲۷۳ھ میں ۳۴ سال، چند ماہ حکومت کرنے کے بعد فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا منذر تخت نشین ہوا۔

سلطان محمد کے عہد حکومت پر تبصرہ:

سلطان محمد کے عہد حکومت میں اندلس پر بدامنی طاری رہی۔ اس کو ایک روز بھی مطمئن ہو کر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ اندرونی بغاوتوں اور بیرونی سازشوں کے ختم نہ ہونے والے سلسلے نے سلطان محمد کو ہمیشہ مصروف و پریشان رکھا۔ سلطان محمد کے زمانہ میں خاندان بنوامیہ کی حکومت بہت ہی کمزور اور بے وقار ہو گئی تھی کہ معمولی اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو بھی بغاوت و سرکشی کی جرأت ہو گئی تھی۔ سلطنت اموی کے اس ضعف و اختلال نے عیسائیوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ انہوں نے اپنے آپ کو خوب طاقتور بنا کر اس بات کو ممکن سمجھا کہ ہم اندلس میں پھر عیسائی حکومت قائم کر سکیں گے۔

سلطان محمد ذاتی طور پر بہادر اور مستعد بادشاہ تھا مگر اندرونی بغاوتوں اور خود مسلمان سرداروں کی بغاوتوں نے ملک کی حالت کو اس قدر نازک بنا دیا تھا کہ ان کی مخالفتوں اور سازشوں کا یہ طوفان سلطان محمد کے زمانے میں سلطنت اسلامیہ کی خرابی و بے عزتی کا باعث ہوا۔ اس کے علاوہ عیسائی سلاطین اور عباسی خلفاء اندلسی مسلمانوں میں نااتفاقی پیدا کرانے میں کوشاں تھے لیکن اب عباسیوں کا جوش مخالفت تو سرد ہو چکا تھا اور ان کو اس قدر ہوش ہی نہ رہا کہ وہ سلطنت اندلس کی طرف توجہ کرتے۔ عیسائیوں کی مخالفت کوئی پوشیدہ چیز نہ تھی۔ اب جو مسلمانوں میں نااتفاقی اور عداوتیں پیدا ہوئی تھیں، یہ فقہا کی کوتاہ اندیشیوں کا نتیجہ تھا۔[1] اندلس کے قاضیوں اور عالموں کو عام طور پر بہ مقابلہ دیگر ممالک اسلامیہ کے ہمیشہ زیادہ اقتدار حاصل رہا ہے اور اسی مناسبت سے اندلس کے مسلمانوں میں ہمیشہ زیادہ نااتفاقی پائی گئی ہے، جس کا پہلا قابل تذکرہ اور اہم مظہر سلطان محمد کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں جو سب سے زیادہ نقصان اسلام کو اندلس میں پہنچا، وہ یہ تھا کہ اس سے پہلے تک عیسائی برابر اسلام میں داخل ہوتے رہتے تھے اور باوجود اس کے کہ شمالی پہاڑی عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کو بدنام کرنے اور اسلام سے عیسائیوں کو متنفر بنانے کے لیے طرح طرح کی کوششیں

---

[1] مسلمانوں کے رعب کے خاتمہ میں ان کی باہمی لڑائیوں، نااتفاقی نے بھی بڑا کام دکھایا ہے۔ اور مسلمانوں کی نااتفاقی کے دو بڑے اسباب دور خیر کے بعد سے لے کر آج تک رہے ہیں، اور وہ ہیں: سیاسی و مذہبی اختلاف، یعنی حکام و امراء کا باہمی اختلاف اور جدال، اور فقہاء و علماء کا اختلاف اور ان کا فرقوں میں بٹ جانا۔

ہوتی رہتی تھیں، تاہم سمجھدار شخص عیسائیوں کو ترک کر کے اسلام قبول کرتے جاتے تھے اور اس طرح نومسلموں کی ایک بڑی تعداد ہر زمانے میں موجود ہوتی تھی۔

سلطان محمد کے زمانے میں علماء وفقہا[1] نے ایسے فتوے اور ایسے قوانین جاری کیے جس سے نہ صرف عیسائیوں کے قدیمی حاصل شدہ حقوق کو صدمہ پہنچا بلکہ نومسلموں کے متعلق بھی بے اعتمادی اور بے اعتباری پیدا ہوئی اور اس کے نتیجہ میں ارتداد کا سلسلہ جاری ہوا۔ نومسلم لوگ اسلام کو چھوڑ کر پھر عیسائیت اختیار کرنے لگے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی عبرت کا مقام نہیں ہوسکتا کہ مولویوں کی تنگ نظری وسخت گیری نے قابو یافتہ ہو کر سلطان محمد کے آخر عہد حکومت میں مرتدین کا ایک بہت بڑا گروہ پیدا کر دیا جو شمالی اندلس میں نہیں بلکہ دارالسلطنت قرطبہ کے نواح میں پیدا ہو کر شمالی عیسائیوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم که بامن ہرچہ کرد آن آشنا کرد

سلطان محمد کے آخر عہد حکومت میں اندلس کے اندر مختلف جماعتیں اور مختلف گروہ پیدا ہوئے جن میں سے ہر ایک کے مقاصد الگ الگ تھے:

۱۔ خالص عربی النسل لوگ: ان کے اندر بھی آپس میں اتفاق نہ تھا اور کئی گروہ تھے۔ مثلاً شامی، یمنی، حجازی، حضرمی وغیرہ۔

۲۔ مولدین یعنی وہ لوگ جن کے باپ عرب اور مائیں عیسائیان اندلس سے تھیں: ان کو دوغلے عرب کہنا چاہیے۔ مگر یہ سب کے سب اپنے اندر عربی خون نہ رکھتے تھے بلکہ ان کا زیادہ حصہ بربری باپ اور اندلسی ماؤں کی اولاد پر مشتمل تھا۔

۳۔ نومسلم یعنی وہ لوگ جو پہلے عیسائی تھے اور اب مسلمان ہو گئے تھے: ان لوگوں کی اولاد بھی نومسلم ہی کہلاتی تھی اور یہ دین اسلام کے زیادہ پابند نظر آتے تھے۔

۴۔ خالص بربری لوگ، ان کی تعداد بھی کافی تھی۔

۵۔ جوسی: یہ ان لوگوں کی اولاد تھی جن کو بہ طور غلام مختلف ملکوں سے خرید کر منگوایا گیا تھا، ان کی تعداد زیادہ نہ تھی۔

۶۔ یہودی: یہ بھی اندلس کے قدیمی باشندے تھے۔ ان کا پیشہ زیادہ تر تجارت تھا اور فساد وبغاوت

---

[1] بعض سرکاری علماء اور فقہاء کی بات ہو رہی ہے ورنہ تو ہر زمانہ میں حق گو اور مخلص علماء موجود رہے ہیں۔

سے الگ رہنا چاہتے تھے۔

۷- عیسائی، یہ اپنے مذہب پر آزادی کے ساتھ عامل تھے۔ ان کی تعداد بھی ملک میں زیادہ تھی۔

۸- مرتدین: یہ وہ لوگ تھے جو سلطان محمد کے زمانے میں اسلام سے روگرداں ہو کر پھر حالت کفر میں واپس چلے گئے تھے۔ ان مرتدین کے ساتھ ہی ایک ایسا فرقہ بھی شامل تھا جو کسی مذہب کی قید میں نہ تھا اور اس کا پیشہ لوٹ مار اور غارت گری ہی تھا۔

اول الذکر چاروں گروہ مسلمان اور اصل اسلامی طاقت سمجھے جاتے تھے۔ بادشاہ اور علماء کا اولین فرض یہ تھا کہ ان کی نگاہ میں ان چاروں کا مرتبہ مساوی ہوتا مگر سلطان محمد سے اس معاملے میں سخت غلطی اور کمزوری کا اظہار ہوا اور مولدین کو جن کی تعداد اور طاقت بڑھی ہوئی تھی، شکایتیں پیدا ہوئیں۔ علماء کی گروہ بندی اور مالکی، حنبلی تفریق نے نومسلموں کے جوش کو سرد کر دیا۔[1] بربری لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اندر سے بہ حیثیت مجموعی روحانیت جاتی رہی۔ اخلاق فاضلہ ضعیف ہو گئے۔ دینی جہاد کا شوق سرد پڑ گیا۔ وہ تلواریں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں بے نیام ہوتی تھیں، اب نفسانی اغراض وخواہشات کو پورا ہونے میں چمکنے لگیں۔ ہر ایک گروہ کی تفریق نمایاں ہو کر نمایاں تر ہوتی گئی۔ سلطان نے جس قدر فقہاء کے اقتدار کو بڑھایا، اسی قدر عوام کا اعتماد فقہاء کی نسبت کمزور ہوتا گیا۔ اس بے اعتمادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی محبت دلوں سے جاتی رہی اور دنیا دین پر مقدم ہو گئی۔

مسلمانوں اور مسلمانوں کی سلطنت کا حال یہ تھا کہ ادھر عیسائیوں کی ریاستیں جو وسیع ہوتے ہوتے اسلامی سلطنت کی ہمسر بن گئی تھیں، روزافزوں ترقی پر تھیں۔ الفانسو سوم شاہ ایسٹریاس مسلمانوں سے اندلس کو خالی کرانے کا پروگرام تیار کر رہا تھا۔ پرتگال کے عیسائی اپنی الگ ریاست قائم کرنے کی تیاری کر چکے تھے۔ اشبیلیہ پر ابن مروان اور مالقہ وغیرہ پر ابن حفصون خود مختارانہ حکمران تھے۔ طیطلہ نے خود مختار ہو کر عیسائی مقبوضہ کو قرطبہ کے قریب تک وسیع کر دیا تھا۔ جلیقیہ وارا گون /ارغوان وغیرہ نے جبل البرتات سے اندلس کے مغربی ساحل یعنی پرتگال واشبیلیہ تک عیسائیوں کا ڈنکا بجوا دیا تھا۔ اس سلسلہ میں کہیں کہیں کسی شہر کا کوئی مسلمان عامل موجود تھا تو وہ

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو مسلمانوں کی آپس کی لڑائیوں، فرقہ بندیوں وغیرہ سے اس قدر زیادہ نقصان پہنچا ہے جس کے بارے میں یہاں اندازہ لگانا اور کچھ تحریر کرنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے تو کئی ضخیم کتب درکار ہیں۔

عیسائیوں کی ہمدردی کا دم بھر رہا تھا۔ غرض سلطان منذر نے نہایت خطرناک زمانے میں تخت سلطنت پر قدم رکھا۔

منذر بن محمد کی تخت نشینی

سلطان منذر بن محمد سنہ ۲۲۹ھ میں پیدا ہوا تھا۔ ۴۴ سال کی عمر میں اپنے باپ کی وفات کے بعد ماہ صفر سنہ ۲۷۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کی تمام عمر لڑائیوں اور زور آزمائیوں میں گزری تھی۔ اپنے باپ کے عہد حکومت میں وہ بار بار سپہ سالاری کی خدمت انجام دے چکا تھا۔

منذر کے کارنامے:

اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے باپ کے وزیراعظم ہاشم بن عبدالعزیز کے قتل کا فتویٰ جو علماء نے لگایا تھا، نافذ کیا اور اس کو دوسرے جہان میں پہنچایا۔ عمر بن حفصون نہ صرف مالقہ بلکہ اور بھی متعدد شہروں پر قابض و متصرف ہو چکا تھا۔ سلطان منذر نے ہاشم بن عبدالعزیز کے قتل سے فارغ ہو کر عمر بن حفصون پر چڑھائی کی۔ ابن حفصون اگرچہ نہایت تجربہ کار اور بہادر سپہ سالار تھا مگر سلطان منذر بھی کچھ اس سے کم نہ تھا۔ یکے بعد دیگرے قلعوں کو فتح کرتا، ابن حفصون کی فوجوں کو پیچھے ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ ابن حفصون نے مصلحت وقت دیکھ کر سلطان کی خدمت میں صلح کی درخواست بھیج کر اطاعت کا اقرار کیا۔ سلطان نے اس درخواست کو غنیمت سمجھا۔ اس لیے کہ وہ اس خطرناک دشمن کے ساتھ دیر تک الجھے رہنے کی نسبت دوسرے باغیوں کی سرکوبی کو ضروری جانتا تھا۔ سلطان ابھی واپس ہو کر قرطبہ تک نہیں پہنچنے پایا تھا کہ اس کے باغی ہونے کی خبر پہنچی۔ سلطان نے پھر واپس ہو کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ اب کی مرتبہ ابن حفصون نے پھر نہایت ندامت و شرمندگی اور عجز والحاح کے ساتھ اپنی خطا کی معافی چاہی اور خود سلطان کے ساتھ قرطبہ جانے پر رضامند ہو گیا۔ سلطان نے اس بات کو بہت غنیمت سمجھا۔ نہایت عزت و تکریم کے ساتھ اس باغی سردار کو اپنے ہمراہ لے کر قرطبہ کی طرف چلا۔

سلطان کا ارادہ تھا کہ قرطبہ پہنچ کر فوراً طیطلہ پر چڑھائی کرے اور مرکزی شہر کو قبضے میں لا کر پھر کسی دوسری طرف متوجہ ہو۔ یہ سلطان منذر کی کمال بیداری مغزی اور ہوشیاری کی دلیل تھی بلکہ کہا

جا سکتا ہے کہ شروع میں مسلمانوں سے غلطی ہوئی کہ انہوں نے طیطلہ کی اہمیت اور اس کے محل وقوع کے اعتبار سے اس کے دارالسلطنت ہونے کی موزونیت کو محسوس نہیں کیا۔ اگر مسلمان طیطلہ کو دارالسلطنت بنا لیتے تو یقیناً مسلمانوں کو اس قدر مشکلات ملک اندلس میں پیش نہ آتیں جو قرطبہ کے دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے پیش آئیں۔ طیطلہ ملک اندلس کے وسط میں واقع تھا اور بہت مضبوط مقام تھا۔ شمالی عیسائی ریاستوں کو طاقتور ہونے اور پھیلنے کا موقع ہی نہیں مل سکتا تھا۔ بہرحال سلطان منذر طیطلہ پر قبضہ کرنے کے لیے بیتاب تھا اور بہ ظاہر عمر بن حفصون کی طرف سے اس کو کامل اطمینان ہو چکا تھا۔ راستے میں عمر بن حفصون کو کسی نے اس کا وہ انجام یاد دلایا جو فقہاء کے فتوے کی تعمیل میں ہونے والا ہے۔ حالانکہ سلطان اس کی دل دہی پر آمادہ اور اس سے اہم خدمات سلطنت لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر جب عمر بن حفصون کو اپنا وہ واقعہ یاد آیا کہ محض فقہاء کی مخالفت کی وجہ سے ہشام بن عبدالعزیز بھی یعنی انہیں حضرات کے فتوؤں کی بناء پر قتل ہو چکا ہے تو وہ اپنے قتل ہونے کو یقینی سمجھنے لگا اور قرطبہ تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ لوگوں کی آنکھ بچا کر بھاگ نکلا۔ سیدھا اپنے قلعہ میں پہنچ کر قلعہ بند ہو بیٹھا اور اپنے اردگرد کے علاقہ سے اپنے تمام آدمیوں کو جمع کر لیا۔

سلطان منذر کی وفات:

سلطان منذر پھر اس کی طرف لوٹا۔ اب کی مرتبہ بڑی سختی سے قلعہ کا محاصرہ شروع کیا۔ عمر بن حفصون نے بھی بڑی ہمت کے ساتھ مدافعت جاری رکھی۔ اس محاصرے نے طول کھینچا اور قلعہ ابھی فتح ہونے نہ پایا تھا کہ سلطان منذر نے سنہ ۲۷۵ھ میں بہ حالت محاصرہ دو برس سے بھی کم حکومت کر کے قریباً ۴۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔ سلطان کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس لیے امراء لشکر نے منذر کے بھائی عبداللہ کے ہاتھ پر قلعہ کی دیوار کے نیچے بیعت کی۔ عبداللہ نے عمر بن حفصون کی ریاست وحکومت کو بھی باقاعدہ طور پر تسلیم کر لیا۔ عمر بن حفصون نے اس کو بہت غنیمت سمجھا اور سلطان عبداللہ اپنے بھائی منذر کے جنازے کو لے کر قرطبہ پہنچا۔ راستے میں عرب سرداروں کی چہ میگوئیاں حد سے بڑھ گئیں اور سلطان عبداللہ کو متہم کرنے میں یہاں تک مبالغہ سے کام لیا گیا کہ قرطبہ تک پہنچتے پہنچتے تمام فوج ادھر ادھر منتشر ہو گئی اور سو آدمیوں سے بھی کم آدمی سلطان عبداللہ کے ساتھ سلطان منذر کا جنازہ لیے ہوئے قرطبہ میں داخل ہوئے۔

عبداللہ بن محمد کی پہلی کمزوری

سلطان عبداللہ بن محمد نے تخت نشین ہوتے ہی یہ کمزوری دکھائی کہ عمر بن حفصون کی حکومت تسلیم کر کے محاصرہ اٹھا لیا۔ حالانکہ اس کے لیے قدرتی طور پر اپنے عنوان سلطنت کو شاندار بنانے کا موقع تھا کہ وہ قلعہ کو فتح کر کے واپس ہوتا اور عمر بن حفصون کو جو طول اور شدت محاصرہ سے تنگ آ چکا تھا، گرفتار یا قتل کر کے قرطبہ کی جانب لوٹتا۔

عبداللہ کے عہد میں سلطنت بنوامیہ کی حالت:

سلطنت عبداللہ کی تخت نشینی کے وقت یعنی سنہ ۲۷۵ھ میں حکومت اندلس یعنی سلطنت بنوامیہ کی حالت اس قدر سقیم ہو چکی تھی کہ خزانہ تمام خالی ہو گیا تھا۔ آمدنی جو کسی زمانے میں دس لاکھ دینار سالانہ تک پہنچ گئی تھی، اب ایک لاکھ دینار سالانہ تک پہنچ گئی تھی۔ عیسائی ریاستوں سے قطع نظر کیا جائے تو دارالسلطنت قرطبہ کے دونوں پہلوؤں، پر دو ایسے زبردست رقیب پیدا ہو چکے تھے جن کی طاقت سلطنت قرطبہ سے کم نہ تھی۔ ایک طرف ابن حفصون تھا اور دوسری طرف ابن مروان۔ ابن حفصون زیادہ عقلمند اور مدبر شخص تھا۔ اس کا طرز حکومت ایسا تھا کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہونے اور اس کے زیر حکومت رہنے کو پسند کرتے تھے مگر چونکہ اس کے ارتداد کا اعلان ہو چکا تھا، اس لیے بہت سے مسلمان اس کی مدد کرنے کو گناہ سمجھ کر سلطنت کے دوسرے رقیب ابن مروان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ابن حفصون باوجود اعلان ارتداد کے عیسائی ریاستوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا مگر ابن مروان باوجود مسلمان ہونے کے الفانسو سوم بادشاہ ایسٹریاس اور دوسرے عیسائیوں کا ہم عہد اور رفیق تھا۔ نواح اشبیلیہ میں بعض عرب سرداروں کی جاگیریں تھیں اور وہ وہیں اقامت گزیں تھے۔ ان لوگوں میں سے بعض نے یہ رنگ دیکھ کر علم بغاوت بلند کیا اور اشبیلیہ پر قابض و متصرف ہو گئے۔ ادھر اسی قسم کے جاگیردار عربوں نے غرناطہ کے نواح میں علم بغاوت بلند کر کے غرناطہ پر قبضہ کر لیا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ ابن حفصون اور ابن مروان کے مدمقابل دو اور طاقتیں پیدا ہو گئیں اور ان چاروں طاقتوں میں جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری ہوا۔ دربار قرطبہ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان سب کو زیر کرتا بلکہ اب سلطان عبداللہ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ نواح قرطبہ پر حکومت رکھتا اور ان لڑنے

والی چاروں طاقتوں کے درمیان کبھی کبھی دخل دے کران کی لڑائی کو صلح سے تبدیل کرا دیتا تھا۔ چونکہ چاروں رقیب ایک دوسرے کے مدمقابل تھے، اس لیے ان میں سے ہر ایک دربار قرطبہ کی سیادت کو تسلیم کرتا اور سلطان کو اپنا بادشاہ کہتا لیکن عملی طور پر وہ بالکل خود مختار تھے اور کسی قسم کا باج و خراج سلطان عبداللہ کے پاس نہیں بھیجتے تھے۔ مذکورہ عرب سرداروں کا طرز عمل مولدین اور نومسلموں کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ اس لیے مولدین اور نومسلموں کا ایک بڑا گروہ ابن مروان کے پاس چلا گیا تھا۔

انہیں ایام میں شمالی شہروں کے دو مسلمان عاملوں نے سرقسطہ وشنت بریہ کے نواح میں عیسائیوں کے اس منصوبہ کو کہ اندلس کو مسلمانوں سے خالی کرا لیا جائے، سخت صدمہ پہنچایا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب بادشاہ ایسٹریاس اپنی فوجیں لے کر جنوب کی طرف بڑھا تو مقام طرسونہ کے عامل لب بن محمد نے اپنی نہایت قلیل جمعیت سے عیسائی فوجوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ ادھر عبدالرحمٰن بن مروان نے اپنے دوست شاہ ایسٹریاس کو اطلاع دی کہ اگر اپنی حدود سلطنت سے آگے قدم بڑھایا تو میں سب سے پہلے مقابلہ کے لیے تیار ہوں۔ اس تنبیہ وتہدید کا یہ اثر ہوا کہ عیسائیوں نے چند روز کے لیے اور خاموش رہنا مناسب سمجھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حملہ آوری سے مسلمانوں کی خانہ جنگی موقوف ہو کر ان میں اتفاق پیدا ہو جائے گا اور آپس میں چھری کٹاری رہ کر ان کے کمزور ہونے کا سلسلہ رک جائے گا۔

ادھر ابن حفصون نے یہ ہوشیاری کی کہ افریقہ کے خاندان اغالبہ سے رابطہ کیا اور یہ کوشش کی ان کے ذریعہ سے خلیفہ عباسی سے اپنی سند حکومت از اندلس منگوا لی جائے۔ اس کوشش میں اگرچہ عمر بن حفصون کو کامیابی نہ ہوئی مگر اس خبر کے سننے سے دربار قرطبہ میں ہلچل پیدا ہوگئی اور سلطان عبداللہ نے جس قدر فوج وہ فراہم کرسکتا تھا، فراہم کر کے ابن حفصون پر فوراً چڑھائی کردی۔ سلطان عبداللہ اس بات سے واقف تھا کہ اگر عمر بن حفصون کے پاس خلیفہ عباسی کی سند آ گئی تو عام طور پر لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور پھر اندلس میں بنوامیہ کا وجود باقی نہ رکھا جائے گا۔ سلطان عبداللہ چودہ ہزار سے زیادہ فوج جمع نہ کرسکا۔ ابن حفصون کے پاس تیس ہزار فوج تھی۔ آخر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اس معرکہ میں سلطان عبداللہ اور اس کے ہمراہیوں نے غیر معمولی بہادری کا اظہار کیا اور ابن حفصون کو شکست فاش دے کر پہاڑوں میں بھگا دیا۔ باغی فوج کے بہت سے آدمی مارے گئے اور سلطان عبداللہ کی حدود ملکیت کسی قدر وسیع ہوگئیں۔ اس فتح کا اثر حکومت قرطبہ کے

لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ سلطنت کا اعتبار واعتماد جو بالکل ضائع ہو چکا تھا، اب کسی قدر پھر قائم ہونے لگا۔

عبداللہ کی عملی جدوجہد:

ادھر عبداللہ بن مروان نے انہیں ایام میں اشبیلیہ کے خود مختار رئیس ابراہیم بن حجاج سے صلح کر کے اپنی طاقت کو بڑھانے کی کوشش کی۔ سلطان عبداللہ نے اس فتح کے نتائج دیکھ کر ابن مروان کا زور توڑنا اور اس پر حملہ کرنا ضروری سمجھا۔ وزیر السلطنت احمد بن ابی عبیدہ کو فوج دے کر ابن مروان کی طرف بھیجا گیا۔ ابن مروان نے ابراہیم بن حجاج والی اشبیلیہ سے امداد طلب کی۔ چنانچہ ابراہیم بن حجاج بھی ابن مروان کی کمک پر تیار ہو گیا۔ دونوں نے مل کر احمد بن ابی عبیدہ کا مقابلہ کیا۔ اس معرکہ میں بھی رعب سلطنت نے اپنا کام کیا اور باغیوں کو شکست ہوئی۔ اس شکست کے بعد ابراہیم بن حجاج نے اطاعت وفرماں برداری کا اظہار کیا اور سلطان عبداللہ نے اس کو اشبیلیہ کا عامل مقرر کر دیا۔ اس لڑائی کا نتیجہ پہلی لڑائی سے بھی زیادہ مفید برآمد ہوا اور حدود سلطنت کے ساتھ ہی وقار سلطنت نے بھی پہلے سے زیادہ ترقی کی۔ اس واقعہ کے چند ہی روز بعد عبدالرحمٰن بن مروان کا انتقال ہو گیا اور اس کے بیٹوں نے طیطلہ وغیرہ میں حکومت شروع کی۔ ادھر ابراہیم بن حجاج حاکم اشبیلیہ نے اس کے ملک کا اکثر حصہ اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ عمر بن حفصون نے سلطان عبداللہ سے شکست کھا کر پہاڑوں میں پناہ لی تھی۔ جب سلطان دار السلطنت کی طرف واپس ہوا، عمر بن حفصون نے بہ تدریج اپنی طاقت کو بڑھانا اور اپنی حالت کو سدھارنا شروع کیا۔

بادشاہ ایسٹریاس مسمی الفانسو اور اس کے بھائی میں لڑائی شروع ہوئی۔ الفانسو نے اپنی تسکین خاطر کے لیے سلطان عبداللہ سے خط وکتابت کر کے تجدید صلح کی خواہش ظاہر کی۔ سلطان نے فوراً رضامندی ظاہر کر کے ان شرائط پر صلح کر لی کہ نہ بادشاہ ایسٹریاس اپنی موجودہ حدود سلطنت سے باہر قدم رکھے، نہ اسلامی فوجیں اس کی حدود میں داخل ہوں۔ یہ صلح الفانسو کے لیے بہر نہج مفید اور نفع رساں تھی کیونکہ مسلمان اس تمام ملک کو جو اس کے قبضے میں تھا، اپنا ملک سمجھتے اور اس پر قبضہ کرنے کا دعویٰ رکھتے تھے لیکن اب سلطان عبداللہ نے اس کی حکومت کو تسلیم کر کے اس کی اولوالعزمی کو تقویت پہنچا دی۔

ادھر آئے دن کی لڑائیوں اور بغاوتوں سے رعایا تنگ آ چکی تھی اور بدامنی کا یہ سلسلہ بہت ہی طویل ہو گیا تھا۔ لہٰذا خود بہ خود لوگوں کی توجہ اس طرف مائل ہوئی کہ دربار قرطبہ کے خلاف بغاوت کرنا کسی طرح مفید نہیں اور ایسے باغیوں کا ساتھ دینا اوران کی مدد کرنا گناہ عظیم ہے۔ لہٰذا یہ صورت جو پیدا ہو چکی تھی، دیر تک قائم رہی۔ اشبیلیہ ایک خود مختار اور طاقتور ریاست مشرق میں قائم تھی۔ ان کے علاوہ باقی ملک کا اکثر حصہ اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا اور سب اپنی اپنی جگہ حکومت کرتے اور دربار قرطبہ کی ظاہری تکریم کرتے تھے۔ عیسائی ریاستوں میں جانشینوں کے متعلق اتفاقاً پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں اوران کو اپنے اندرونی جھگڑوں سے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ حکومت اسلامیہ پر حملہ آور ہوتے ؎

خدا[1] شرے برانگیزد کہ خیرِ ما درآں باشد

اولاد:

سلطان عبداللہ کے گیارہ بیٹے تھے۔ جن میں دو بڑے بیٹے مطرف اور محمد زیادہ لائق اور امور سلطنت میں دخیل تھے۔ ان دونوں کے درمیان رقابت وعداوت پیدا ہو گئی تھی۔ زیادہ لائق اور قابل آدمی ریاست اشبیلیہ میں چلے گئے تھے کیونکہ وہاں علماء اور باکمال لوگوں کی خوب قدردانی ہوتی تھی۔ قرطبہ کا خزانہ خالی تھا۔ اشبیلیہ کی نوخیز اور جدید ریاست کا دربار ابراہیم بن حجاج کی قدردانیوں کے سبب سے قرطبہ کے لیے موجب رشک بن گیا تھا۔ یہاں کے موجودہ پست ہمت اراکین دربار نے دونوں بھائیوں کی رقابتوں کو ترقی دینے میں خوب کوشش کی۔ مطرف کو اپنے بھائی محمد کی شکایت کا موقع مل گیا اور اس نے باپ کے کان اچھی طرح بھرنے شروع کیے، اس کے ہمساز امراء نے تائید کی۔ سلطان عبداللہ اپنے بیٹے محمد کو غضب آلود نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ محمد نے مجبور ہو کر راہ فرار اختیار کی اور قرطبہ سے بھاگ کر عمر بن حفصون کے پاس چلا گیا۔ چند روز وہاں رہ کر اور اپنی حرکت

---

[1] لفظ ''خدا'' فارسی زبان کا لفظ ہے۔ ہمارے نزدیک تحریر یا گفتگو وغیرہ میں اس کا استعمال درست نہیں کیونکہ مذہباً اس کا تعلق اور پس منظر ایران کے مشرک مجوسی مذہب سے ہے، جس میں آگ کی پوجا کی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ نام اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے نہیں ہے۔ مجوسیوں کے دو خدا تھے، ایک نیکی کا (خدائے یزداں) اور دوسرا بدی کا (خدائے اہرمن)۔ یہ تصور باطل اور خلاف اسلام ہے۔ بنا بریں لفظ ''خدا'' کا استعمال غلط ہے۔ لفظ اللہ، اللہ تعالیٰ، اللہ تبارک وتعالیٰ، اللہ سبحانہ وتعالیٰ، اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کا استعمال ہونا چاہیے۔

پر پشیمان ہو کر باپ کے پاس پیغام بھیجا کہ مجھ کو جان کی امان دی جائے تو میں حاضر خدمت ہو جاؤں؟ عبداللہ نے اس کو جان کی امان دے کر بلوا لیا۔ اب مطرف کو شکایت کرنے کا اور بھی زیادہ موقع مل گیا تھا۔ چند روز کے بعد عبداللہ نے اپنے بیٹے محمد کو محل سرائے کے ایک حصے میں قید کر دیا۔ سلطان عبداللہ کو کسی مہم کی وجہ سے چند روز کے لیے قرطبہ سے باہر جانا پڑا۔ اپنی غیر موجودگی میں مطرف کو قرطبہ کا حاکم مقرر کر گیا تھا۔ مطرف نے اس موقع پر بھائی کو جو محل سرائے میں قید تھا، قتل کرا دیا۔ عبداللہ کو محمد کے قتل ہونے کا سخت صدمہ ہوا، محمد کے بیٹے عبداللہ کو بڑی محبت کے ساتھ پرورش کرنے لگا۔ اس کے بعد سنہ ۲۸۳ھ میں مطرف نے کسی کاوش کی بناء پر وزیر السلطنت عبدالملک بن امیہ کو قتل کر دیا۔ سلطان عبداللہ نے محمد اور عبدالملک کے قصاص میں مطرف کو قتل کرا دیا۔

وفات:

سلطان عبداللہ یکم ماہ ربیع الاول سنہ ۳۰۰ھ میں پچیس سال سے کچھ زیادہ دن سلطنت کرنے کے بعد بیالیس سال کی عمر میں فوت ہوا۔ سلطان عبداللہ کا تمام زمانہ فتنہ وفساد یا سلطنت کے ضعف وناتوانی کے عالم میں بسر ہوا۔ اس کے زمانے میں بھی فقہاء اکثر ایک دوسرے سے گلتھپ رہتے۔ مباحثوں، مناظروں اور دور از کار مسائل کی تحقیق میں مشغول نظر آتے تھے۔ بہ ظاہر کوئی صورت ایسی نظر نہ آتی تھی کہ مسلمانوں کا ابتدائی رعب وجلال اور حکومت اسلامیہ کا اثر واقتدار پھر واپس آ سکے گا۔ ان حالات میں سلطان عبداللہ کے بعد اس کا نوجوان پوتا عبدالرحمٰن بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن ثانی تخت نشین ہوا۔

نواں باب

عبدالرحمٰن ثالث

جغرافیہ اندلس:

عبدالرحمٰن بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن ثانی اپنے دادا عبداللہ کے بعد اکتیس سال کی عمر میں بہ تاریخ یکم ربیع الاول سنہ ۳۰۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ طارق وموسیٰ کا فتح کیا ہوا ملک اور عبدالرحمٰن الداخل کی قائم کی ہوئی سلطنت پاش پاش اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہ ظاہر عیسائیوں کے قبضہ میں جانے کے لیے ہر قسم کی استعداد پیدا کر چکی تھی لیکن قضا وقدر کو یہ صورت ابھی پیدا کرنی منظور نہ تھی۔ اس نوجوان سلطان کی تخت نشینی کے وقت اس کے بہت سے چچا جو اس سے عمر واستحقاق میں بڑھے ہوئے تھے، موجود تھے لیکن یا تو ان کی پاک باطنی اور نیک نفسی تھی یا انہوں نے ایسی قریب المرگ سلطنت کا بادشاہ بن کر اپنے آپ کو خطرات میں مبتلا کرنا مناسب نہ سمجھا کہ سب نے بہ خوشی اس نوجوان کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا اور تخت نشینی کے وقت کسی قسم کا فتنہ وفساد برپا نہ ہوا۔

سلطان عبدالرحمٰن ثالث کی تخت نشینی کے وقت اس لیے بھی امن وسکون رہا کہ یہ نوجوان سلطان تھوڑی سی عمر میں اپنے دادا کی زیر نگرانی ایسی اچھی اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کر چکا تھا اور ایسی عقل وذہانت رکھتا تھا کہ بڑے بڑے علماء وفقہاء اس پر رشک کرتے تھے۔ اس کے اخلاق فاضلہ اور حسن خصائل نے اعیان وارکان قرطبہ کو اپنا گرویدہ اور رشتہ داروں کو اپنا ہمدرد وبہی خواہ بنا لیا تھا۔ وہ نہ صرف مجالس علمیہ میں عزت کا مقام رکھتا بلکہ اس زمانے کی رسم کے موافق فنون سپہ گری سے بھی خوب واقف وماہر تھا۔

پہلا حکم:

تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی اس نوجوان سلطان نے حکم جاری کیا کہ وہ تمام محصولات جو اس کے

پیش روسلاطین بالخصوص سلطان عبداللہ نے خزانہ سلطانی کو پر کرنے کے لیے رعایا پر لگائے تھے اور جو احکام شرع کے خلاف تھے، معاف وموقوف کر دیے گئے۔ اس اعلان کا اثر نہایت ہی مفید ثابت ہوا۔ رعایا میں اس کی مدح وثنا ہونے لگی اور دلوں میں اس کی نسبت بہترین توقعات پیدا ہو گئیں۔

اس کے بعد سلطان ثالث نے اعلان کیا کہ جو شخص حکومت کا فرماں بردار بن کر آئے گا اور آئندہ اطاعت پر قائم رہنے کا وعدہ کرے گا۔ اس کی تمام سابقہ خطائیں معاف کر دی جائیں گی اور گزشتہ بدعنوانیوں پر مطلق توجہ نہ کی جائے گی اور اس معاملہ میں مذہب وعقائد کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے گا یعنی دربار سلطان سے عیسائی، یہودی، مسلمان سب کے ساتھ یکساں عدل وانصاف کا برتاؤ ہو گا۔ چونکہ لوگ طوائف الملو کی اور خانہ جنگی سے تنگ آ چکے تھے، لہٰذا وہ تمام چھوٹے چھوٹے سردار جو قرطبہ سے قریب تھے اور اپنے آپ کو سلطان قرطبہ کی فرماں برداری واطاعت سے آزاد کر چکے تھے، اس اعلان کو سن کر بلا تامل سلطان عبدالرحمٰن کی خدمت میں فرماں برداری کا اقرار کرنے لگے۔ اس طرح لگان سرکاری شاہی خزانہ میں داخل ہونا شروع ہوا اور اس کی کمی جو ناواجب محصولات کے معاف کرنے سے خزانہ میں ہوئی تھی، بہ خوبی تلافی ہو گئی۔

دو حریف طاقتیں:

اب صرف دو زبردست اور رقیب طاقتیں باقی رہ گئیں جو نسبتاً قرطبہ سے قریب اور موجب خطر تھیں۔ ایک عمر بن حفصون جو مالقہ، ریہ، بشتر وغیرہ پر قابض ومتصرف تھا اور عبیدیین سے ساز باز کر کے قرطبہ کی سلطنت کو درہم برہم کرنا چاہتا تھا۔ عمر بن حفصون اس لیے بھی زیادہ خطرناک تھا کہ اس کو ایک طرف عبیدیین اور دوسری طرف شمالی عیسائی بادشاہوں سے مدد پہنچ سکتی تھی۔ عبیدیین قدرتی طور پر بنوامیہ کے دشمن تھے جس طرح کہ وہ بنوعباس کے بھی دشمن تھے اور عیسائی اس لیے اس کو محبوب سمجھتے تھے کہ وہ مرتد ہو کر پھر عیسائی بن گیا۔ دوسری طاقت ریاست اشبیلیہ کی تھی، جہاں عربوں کی حکومت تھی اور شان وشکوہ میں اشبیلیہ کا دربار قرطبہ کے دربار سے فائق نظر آتا تھا۔ عبدالرحمٰن نے سب سے پہلے اشبیلیہ کے دربار سے فرماں برداری واطاعت کا اقرار لینا اور شرائط اطاعت کو ادا کرانا چاہا۔ اشبیلیہ کا حاکم ابراہیم بن حجاج فوت ہو کر اس کی جگہ تخت نشین ہو چکا تھا۔ اشبیلیہ کے بہت سے سرداروں نے سلطان عبدالرحمٰن ثالث کے ساتھ اظہار عقیدت کیا اور دربار

اشبیلیہ نے بھی اس موقع پر خرخشہ پیدا کرنا مناسب نہ سمجھا۔

پہلی مہم:

اشبیلیہ کی جانب سے جب سلطان عبدالرحمٰن ثالث کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ادھر سے کوئی مخالفانہ فوجی کارروائی نہیں ہوگی تو اس نے ایک فوج مرتب کر کے اپنے آزاد غلام بدر نامی کو دے کر عمر بن حفصون کی جانب روانہ کیا۔ یہ مہم عبدالرحمٰن ثالث نے اپنے تخت نشین ہونے کے پہلے ہی سال یعنی سنہ ۳۰۰ھ میں روانہ کی۔ بدر نے عمر بن حفصون کے قلعوں کو یکے بعد دیگرے فتح کرنا شروع کیا۔ عمر بن حفصون اپنا بہت سا میدانی علاقہ فتح کرا کر پہاڑی قلعوں میں جا چھپا۔ بدر اس طرف سے سالماً غانماً واپس آیا اور لوگ بہ خوشی آ آ کر سلطانی فوج میں داخل ہونے لگے۔

بغاوتوں کا استیصال:

سنہ ۳۰۱ھ میں سلطان عبدالرحمٰن ثالث نے ابن مسلمہ کی طرف سے ناشدنی حرکات دیکھ کر اور بعض امیران اشبیلیہ کی شکایات سن کر اشبیلیہ پر فوج کشی کی۔ ابن مسلمہ نے عمر بن حفصون سے مدد طلب کی۔ عمر بن حفصون نے اس موقع کو مناسب سمجھ کر ابن مسلمہ کی اس طرح مدد کی کہ جب سلطانی فوج اشبیلیہ کی طرف گئی تو ابن حفصون کی فوج پیچھے سے سلطانی فوج کی طرف بڑھی۔ سلطان عبدالرحمٰن نے عمر بن حفصون کی فوج کو شکست دے کر بھگایا اور ابن مسلمہ کو بھی شکست فاش ہوئی۔ ابن مسلمہ گرفتار ہوا اور سلطان نے اپنا ایک گورنر اشبیلیہ میں مقرر کر دیا۔ اس کام میں سلطان کو زیادہ دقت نہیں اٹھانی پڑی کیونکہ ابن مسلمہ کے رشتہ دار اور اراکین دربار اشبیلیہ خود اس بات کے خواہاں تھے کہ اشبیلیہ عبدالرحمٰن ثالث کی حدود سلطنت میں براہ راست شامل ہو جائے۔ دربار اشبیلیہ کے مشہور سرداروں میں ایک شخص اسحاق بن محمد تھا جو اشبیلیہ کے فتح ہونے کے بعد قرطبہ میں چلا آیا۔ اس کو سلطان عبدالرحمٰن ثالث نے جوہر قابل پا کر اپنا وزیر بنایا۔ جب وہ فوت ہوا تو اس کے بیٹے احمد بن اسحاق کو وزارت کا عہدہ عطا کیا۔

اس طرح جب سلطنت کے وقار و عظمت میں ترقی ہوگئی تو سلطان عبدالرحمٰن نے فوجیں آراستہ کر کے عمر بن حفصون کے استیصال کو ضروری سمجھا اور سنہ ۳۰۴ھ میں اس طرف فوج کشی کی۔ عمر بن حفصون نے اس موقع پر عبیدیین کی سلطنت سے امداد طلب کی۔ وہاں سے جو جہاز آئے، ان کو

سلطان عبدالرحمٰن نے اپنے جہازوں کے ذریعہ سے ابن حفصون تک نہ پہنچنے دیا اور سمندر ہی میں سب کو گرفتار کر لیا۔ ابن حفصون پر مایوسی چھا گئی اور وہ جب پہاڑوں میں محصور ہو کر سخت مجبور ہو گیا تو اس نے یحییٰ بن اسحاق کے ذریعہ سے اپنی درخواست سلطان کی خدمت میں پہنچوائی اور آئندہ مطیع وفرماں بردار رہنے کا اقرار کر کے صلح چاہی۔ سلطان نے اس کے تمام سیر حاصل اور زرخیز علاقے پر قبضہ کر کے بہت تھوڑا سا پہاڑی علاقہ اس کے پاس چھوڑ دیا اور اس طرف سے مطمئن ہو کر قرطبہ کو واپس آیا۔

اس کے بعد ایک فوج اپنے وزیر اسحاق بن محمد کو دے کر مرسیہ وبلنسیہ کی سرکوبی کو روانہ کیا۔ اسحاق بن محمد نے اس طرف کے باغیوں کو مطیع کر کے قرمونہ پر چڑھائی کی اور اس کو حبیب بن سوارہ کے قبضے سے نکال کر سلطانی مملکت میں شامل کیا۔ اسی سال سلطان کے آزاد کردہ غلام بدر نے لبلہ پر چڑھائی کر کے وہاں کے باغی سردار عثمان بن نصر کو گرفتار کر کے قرطبہ کی جانب بھیج دیا۔ سنہ ۳۰۶ھ میں اسحاق بن محمد نے قلعہ سمبرنہ کو فتح کر کے وہاں کے باغیوں کو مطیع وفرماں بردار بنایا۔

سلطان کے خلاف ایک سازش:

سنہ ۳۰۸ھ میں محمد بن عبدالجبار بن سلطان محمد اور قاضی بن سلطان محمد نے سلطان عبدالرحمٰن ثالث کے خلاف ایک سازش کی اور تخت سلطنت حاصل کرنے کے لیے سلطان کے قتل کی تدبیروں میں مصروف ہوئے۔ اتفاقاً اس سازش کے شرکاء میں سے ایک شخص نے سلطان کو تمام حالات کی خبر کر دی۔ سلطان نے عجلت سے کام نہیں لیا بلکہ اول خوب اچھی طرح سے تحقیق وتفتیش کے سلسلے کو جاری رکھا اور جب ان دونوں پر جرم ثابت ہو گیا تو دونوں کو قتل کرا دیا۔ چونکہ یہ دونوں مجرم ثابت ہو چکے تھے، لہٰذا لوگوں نے اس سزا پر کسی بے چینی یا ناراضگی کا مطلق اظہار نہیں کیا۔

۳۰۹ھ میں قلعہ طرسوی فتح ہوا۔ اسی سال احمد بن اضحیٰ ہمدوانی نے جو قلعہ جامہ پر قابض اور اطاعت سے منحرف تھا، خود ہی اطاعت قبول کر کے اپنے بیٹے کو بہ طور یرغمال قرطبہ میں بھیج دیا۔ غرض چھوٹے چھوٹے سردار جو جابہ جا خود مختار ہو گئے تھے، یکے بعد دیگرے ایک ایک کر کے سب مطیع وفرماں بردار بنائے گئے یا مقتول ہوئے اور سلطنت قرطبہ کا رقبہ وسیع ہو کر وہ حالت جو سلطان عبداللہ کے زمانے میں تھی، دور ہو گئی یا یوں سمجھنا چاہیے کہ جس قدر ملک بیسیوں چھوٹی چھوٹی

ریاستوں میں منقسم تھا، وہ سب ایک اسلامی سلطنت کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔

عیسائی مقبوضات کی تفصیل:

اب عیسائی مقبوضات کا حال پڑھو۔ سب سے قریب مشرقی ساحل کے متصل ایک پہاڑی علاقہ ابن حفصون کے قبضے میں تھا جو عیسائی ہو گیا تھا اور اس کے رفیق سب عیسائی لوگ ہی باقی رہ گئے تھے۔ لہٰذا یہ ایک عیسائی ریاست تھی جو ابن حفصون کی تجربہ کاری کے سبب سے ایک زبردست عیسائی طاقت سمجھی جاتی تھی مگر اس سے صلح ہو گئی تھی۔ طیطلہ ایک نہایت مضبوط مقام تھا جس کا فتح کرنا آسان کام نہ تھا۔ یہاں سلطان عبداللہ کے زمانے میں خودمختار ریاست قائم ہو گئی تھی اور اب اس کا دربار قرطبہ سے کوئی رسمی تعلق بھی باقی نہ رہا تھا۔ یہ ریاست ملک اندلس کے وسط میں واقع تھی اور ایک زبردست عیسائی طاقت تھی۔ برشلونہ، یہاں عرصہ دراز سے عیسائی حکومت قائم تھی۔ اربونیہ میں بھی ایک مستقل عیسائی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔ نوار، اربونیہ کے متصل ہی فرانسیسیوں نے ایک زبردست ریاست قائم کر لی تھی۔ ایسٹریاس کی ریاست اب ایک زبردست سلطنت کی شکل میں تبدیل ہو کر اندلس کے میدانوں میں دور دور تک پھیل گئی تھی، جس کے ماتحت جلیقیہ، لیون اور قسطلہ کی تین زبردست عیسائی ریاستیں تھیں۔

ان کے علاوہ ساحل بحر ظلمات پر پرتگال کے علاقہ میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں عیسائیوں نے قائم کر لی تھیں جو ریاست جلیقیہ کے ماتحت سمجھی جاتی تھیں۔ یہ وہ عیسائی مقبوضات تھے جو جزیرہ نمائے اندلس کی حدود میں تھے۔ باقی جنوبی و مشرقی فرانس اور مغربی فرانس اور شمالی فرانس کی عیسائی سلطنتیں ان کے علاوہ تھیں جو سلطنت اسلامیہ اندلس کی مخالفت پر کمر بستہ تھیں۔ سلطنت اسلامیہ کی حدود کا ایک کونہ جو شمال کی جانب نکلا ہوا تھا، وہ صرف سرقسطہ کا ضلع تھا۔ جہاں مسلمان عامل حکمران تھا مگر اس کے تعلقات عیسائیوں سے دوستانہ تھے اور اس لیے قابل اعتراض نہ تھے کہ سلطان عبداللہ اور الفانسو سوم بادشاہ ایسٹریاس سے دوستانہ صلح نامہ ہو گیا تھا، جو اب تک قائم تھا اور اب تک کسی فریق نے اس کی خلاف ورزی میں اقدام نہیں کیا تھا۔

سلطان عبدالرحمٰن ثالث نے چند ہی سال میں تمام باغیوں سے فراغت حاصل کر کے طیطلہ پر فوج کشی کی۔ فوج کشی سے پہلے سلطان نے اہل طیطلہ کے پاس پیغام بھیجا کہ تمہارے لیے اب مناسب یہی ہے کہ اطاعت و فرماں برداری سے انحراف نہ کرو اور ہوا خواہان سلطنت کے زمرہ میں

شامل ہو جاؤ۔ اہل طیطلہ نے اس پیغام سلطان کا سختی کے ساتھ انکاری جواب دیا اور جس قدر وہ مقابلہ کے لیے تیاری کر سکتے تھے، کی اور اردگرد سے عیسائی فوجوں کو بلایا۔ برشلونہ، نوار اور ایسٹریاس سے امداد طلب کی۔ پادری لوگوں نے ہر جگہ عیسائیوں کو طیطلہ کو بچانے کے لیے جوش دلایا۔ آخر سلطان عبدالرحمٰن ثالث بڑی احتیاط اور مآل اندیشی کے ساتھ طیطلہ کی جانب بڑھا۔ جنگ و پیکار اور معرکہ آرائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ قریباً سال بھر کی کوشش و کشمکش کے بعد سلطان نے طیطلہ کو فتح کر لیا۔ مفتوحین کے ساتھ نرمی و ملاطفت اور عفوو درگزر کا برتاؤ کیا اور چند مہینے طیطلہ اور نواح طیطلہ میں رہ کر اور وہاں کے تمام ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر قرطبہ کی جانب واپس آیا۔

فتح طیطلہ کا اثر عیسائی سلاطین پر یہ ہوا کہ انہوں نے اسلامی مقبوضات پر حملہ کر کے کئی شہروں کو تباہ و برباد کر دیا۔ سلطان نے احمد بن اسحاق وزیر السلطنت کو فوج دے کر اس طرف روانہ کیا۔ اس نے ریاست لیون پر حملہ کیا اور عیسائیوں کو متعدد شکستیں دے کر پیچھے ہٹایا۔ آخر ایک لڑائی میں وزیرالسلطنت احمد بن اسحاق شہید ہوا۔ سلطان نے اپنے خادم بدر کو بھیجا۔ بدر کے مقابلے پر ریاست نوار، لیون وغیرہ کی متفقہ فوجیں آئیں اور معرکہ کارزار گرم ہوا۔ بدر نے شکست دے کر سب کو بھگا دیا۔ اس کے بعد ہی سلطان عبدالرحمٰن ثالث خود فوج لے کر عیسائیوں کی بدعہدی اور سرکشی کی سزا دینے پہنچا اور فتح کرتا ہوا حدود فرانس میں داخل ہوا۔ نوار وار بونیہ کی ریاستوں نے اظہار اطاعت کر کے سلطان کو واپس کیا اور سلطان کے واپس ہوتے ہی تمام شمالی عیسائیوں نے آپس میں مسلم کشی کے لیے اتحاد و اتفاق کے عہود کی تجدید کی۔ یہ سنہ ۳۱۳ھ کے واقعات ہیں۔ ابھی سلطان عبدالرحمٰن بلاد شمالی ہی میں مصروف قتال تھا کہ اس کے پاس عمر بن حفصون کے مرنے کی خبر پہنچی۔ عمر بن حفصون اپنی تجربہ کاری و ہوشیاری کے اعتبار سے بہت بڑا آدمی بن گیا تھا۔ اس کی طرف سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔ سلطان نے واپس قرطبہ میں پہنچ کر اس کی ریاست کو ضبط کرنا اور براہ راست مقبوضات سلطانی میں شامل کرنا مناسب نہ سمجھ کر عمر بن حفصون کے بیٹے جعفر کو والی ریاست بنا دیا۔ آخر سنہ ۳۱۵ھ میں یہ ریاست معدوم ہو کر تمام علاقہ مقبوضات سلطانی میں شامل ہوا۔

ادھر سلطان عبدالرحمٰن ثالث اپنے آبائی ملک کو باغیوں کے قبضے سے واپس لینے میں کامیاب ہوا۔ ادھر شمال اور جنوب دونوں جانب اس کے لیے قدرتی طور پر بہتری کے سامان پیدا ہوئے۔ عبدالرحمٰن ثالث کو شمال کی جانب عیسائیوں کے حملے کا اندیشہ تھا کیونکہ وہ بحر روم سے بحر ظلمات تک

جزیرہ نما کے تمام شمالی حصے پر قابض ومتصرف تھے اور اب بہ جائے عباسیوں کے عبیدیین کی طرف سے ان کی ہمت افزائی ہو رہی تھی۔ ان کے دلوں پر مسلمانوں کی وہ ہیبت اب طاری نہ رہی تھی، جو طارق وموسیٰ کی آمد کے وقت طاری ہوئی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اب پہلے کی طرح بہادر و باہمت نہ رہے تھے اور عیسائیوں نے بہت کچھ بہادری و جفاکشی میں ترقی کر لی تھی۔ لہٰذا شمالی خطرہ نہ تھا۔ جنوب کی جانب عبیدیین کی طاقت بہت زبردست ہوگئی تھی اور وہ براعظم افریقہ کے تمام شمالی حصے پر مستولی ہو کر مراکش کی حکومت ادریسیہ کا نام ونشان گم کرنے اور اندلس کی فتح کا عزم رکھتے تھے۔ سلطان عبدالرحمٰن ثالث کو بہ یک وقت دونوں جانب سے اطمینان حاصل ہوگیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ:

الفانسوسوم کی سلطنت کی تقسیم:

الفانسوسوم بادشاہ ایسٹریاس نے اپنی سلطنت کو اپنی اولاد میں اس طرح تقسیم کیا تھا کہ لیون کا علاقہ غرسیہ کو دیا۔ جلیقیہ کی حکومت اردولی کے حصے میں آئی اور اویڈو کا علاقہ فردیلہ کو ملا۔ غرسیہ کی شادی شاہ نوار کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اس لیے ریاست نوار کو لیون کی ریاست سے خصوصی تعلق تھا۔ چنانچہ لیون اور نوار کی ریاستوں نے مل کر کئی مرتبہ مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ تین سال حکومت کرنے کے بعد غرسیہ سنہ ۳۱۶ھ میں فوت ہوا۔ اس کے بعد شانجہ ریاست لیون کا فرماں روا ہوا۔ مگر اردونی حاکم جلیقیہ نے اپنے بھتیجے شانجہ کو بے دخل کر کے خود ریاست لیون کو بھی اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ ادھر بادشاہ نوار کا بھی انتقال ہوا تو شانجہ بھاگ کر اپنے ننھیال میں چلا گیا۔ وہاں اس کی نانی طوطہ نامی حکمران نوار تھی۔ ادھر قسطلہ کی ریاست نے بادشاہ جلیقیہ ولیون کی فرماں برداری سے آزاد و خودمختار ہونے کی کوشش شروع کی اور فرڈی نند حاکم قسطلہ اپنی خودمختاری کی تدابیر میں مصروف ہوا۔ غرض ان عیسائی فرماں رواؤں کے اندر کچھ ایسے خرخشے اور اندرونی جھگڑے پیدا ہوئے کہ وہ کئی سال تک اسلامی علاقے کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے۔ سلطان عبدالرحمٰن ثالث نے عیسائیوں کے ان خانگی نزاعات کی خبریں سن کر عقلمندی اور ہوشیاری کی راہ سے اس طرف مطلق کوئی فوج نہیں بھیجی اور موقع دیا کہ وہ آپس ہی میں لڑ بھڑ کر اپنے معاملات کو طے کریں۔ اگر ان ایام میں سلطان عبدالرحمٰن شمال کی جانب فوج کشی کرتا تو یقیناً عیسائیوں کے اندر فوراً اتفاق واتحاد ہو جاتا اور ان کی آپس کی لڑائیاں یک لخت بند ہو جاتیں۔

مراکش پر قبضہ:

اسی فرصت میں جنوب کی جانب سے یہ خوشخبری پہنچی کہ عبیدیین جو مراکش کے خاندان ادریسیہ کو مٹا کر تمام ملک مراکش پر قابض و متصرف ہونا چاہتے ہیں، ان کے مقابلے سے تنگ آ کر ابراہیم بن محمد ادریسی یہ چاہتا ہے بجائے اس کے کہ عبیدیین کی فرماں برداری واطاعت قبول کرے، سلطان عبدالرحمٰن ثالث کی اطاعت اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اب تک دربار قرطبہ اور حکومت مراکش کے تعلقات دوستانہ و ہمسرانہ تھے۔ سلطان عبدالرحمٰن نے اس کو ایک تائید غیبی سمجھ کر فوراً اپنی فوج جہازوں میں سوار کرا کر ساحل مراکش میں اتار دی۔ مراکش ان دنوں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ مراکش کے ہر ایک رئیس نے سلطان عبدالرحمٰن کی سیادت کو قبول وتسلیم کر کے اپنے اپنے ایلچی مع تحف وہدایا قرطبہ میں بھیجے اور بعض رؤساء خود ہی حاضر قرطبہ ہو گئے۔ سلطان عبدالرحمٰن کی فوجوں نے عبیدیین کی فوجوں کو مار کر بھگا دیا اور اپنی طرف سے سند امارت دے کر وہاں کے رئیسوں کو مامور کیا۔ اس طرح ملک مراکش بھی دربار قرطبہ کا ایک صوبہ بن گیا۔ جس زمانے میں سلطان عبدالرحمٰن مراکش کی جانب متوجہ تھا، اس زمانے میں شمالی عیسائیوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ وہ اپنے خانگی جھگڑوں میں مبتلا تھے۔ عبیدیین کا خطرہ بالکل جاتا رہا کیونکہ ملک مراکش اب سلطان عبدالرحمٰن کے قبضے میں آ گیا اور اندلس کا ملک بہت محفوظ ہو گیا۔

گورنر سرقسطہ کی بغاوت:

سنہ ۳۲۲ھ عیسائی سلاطین کے اندرونی جھگڑے ختم ہوئے اور اسی زمانے میں سلطان عبدالرحمٰن مراکش کو اپنی حدود سلطنت میں شامل کرنے سے فارغ ہو چکا تھا۔ اب عیسائیوں نے محمد بن ہشام، گورنر سرقسطہ کو بغاوت پر آمادہ کر کے اس کی حمایت کا پختہ وعدہ کیا اور برشلونہ سے لے کر جلیقیہ تک کا تمام علاقہ سلطان عبدالرحمٰن کے مقابلہ پر آمادہ ومستعد ہو گیا۔ سرقسطہ کے مسلمان عامل کی بغاوت کو کامیاب بنانے اور اس کی حمایت پر سب کے آمادہ ہو جانے کا سبب یہ تھا کہ مراکش کے شامل اندلس ہو جانے کی خبر نے عیسائیوں کو یکایک بیدار کر دیا اور انہوں نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو، عبدالرحمٰن کی طاقت کو توڑ دینا چاہیے اور اب تامل کرنا اپنے لیے خطرات کو بڑھانا ہے۔ اسی لیے صوبہ سرقسطہ کے عامل کو جو نسبتاً قرطبہ سے دور اور عیسائی مقبوضات کے جوار

میں تھا، باغی بنانے اور بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تاکہ عبدالرحمٰن کی طاقت مقابلے میں کمزور ثابت ہو۔

عبدالرحمٰن عامل سرقسطہ کی بغاوت کا حال سن کر اس کی سزا دہی کے لیے شمال کی جانب متوجہ ہوا تو عیسائی افواج کو مستعد پیکار پایا۔ مقام وشمہ پر سخت خون ریز و فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ محمد بن ہشام گرفتار ہوا اور عیسائی افواج اپنے اپنے علاقوں کی جانب فرار ہوئیں۔ اس کے بعد سلطان عبدالرحمٰن نے ہر ایک عیسائی ریاست پر الگ الگ حملہ کر کے ہر ایک کو شکست دے کر مغلوب و مجبور کیا۔ سب نے اطاعت فرماں برداری کا اقرار کیا۔ ملکہ طوطہ فرماں روائے نوار نے سخت نگرانی اپنے ہاتھ میں رکھی۔ عیسائیوں کو تنبیہ اور محمد بن ہاشم کی سرکوبی سے فارغ ہو کر اور سرقسطہ میں امیہ بن اسحاق کو گورنر مقرر کر کے سلطان قرطبہ میں واپس آیا۔

جنگ خندق:

سنہ ۳۲۷ھ کے ابتدائی مہینوں میں امیہ بن اسحاق کے کسی بھائی سے غداری وسازش کا جرم سرزد ہوا، جس کی سزا میں اس کو سلطان نے قتل کرا دیا۔ امیہ بن اسحاق گورنر سرقسطہ نے جب اپنے بھائی کے قتل کیے جانے کا حال سنا تو سخت صدمہ ہوا۔ عیسائی سلاطین نے اس موقع کو غنیمت جا کر امیہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کو بڑی آسانی سے بغاوت پر آمادہ کر لیا۔ جلیقیہ کا عیسائی بادشاہ ان دنوں رذمیر نامی بڑا ہوشیار اور تجربہ کار شخص تھا۔ امیہ باغی ہو کر اور سرقسطہ کی فوج اور خزانہ جس قدر ہمراہ لے جا سکتا تھا، ہمراہ لے کر رذمیر کے پاس مقام سمورہ دارالسلطنت جلیقیہ میں چلا گیا اور اسی جگہ نوار ولیون اور قسطلہ وغیرہ کی فوجیں بھی آ کر فراہم ہونے لگیں۔ برشلونہ وطرکونہ تک کی فوجیں بھی یہاں پہنچ گئیں۔ فرانس سے بھی عیسائی مجاہدین اس طرف آ آ کر فراہم ہونے لگے۔ اندلس میں عیسائی طاقت کا یہ سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔ جس میں ایک مسلمان گورنر بھی مع اپنی زبردست طاقت کے شامل اور انتہائی جوش کے ساتھ سلطان عبدالرحمٰن کو شکست دینے اور نقصان پہنچانے پر آمادہ تھا۔ اس مسلمان گورنر نے عیسائیوں کو بڑی بڑی قیمتی معلومات بہم پہنچائیں اور نہایت مفید و معقول مشورے دیے۔ امیہ بن اسحاق کی موجودگی عیسائیوں کے لیے بے حد ہمت افزائی اور جرأت کا موجب تھی۔ ادھر سلطان عبدالرحمٰن نے جب اس فساد عظیم کا حال سنا تو اس نے

فوراً اعلان جہاد کیا۔ باقاعدہ فوج کے علاوہ بہت سے رضا کار اور غیر مضافی لوگ بھی شوق شہادت میں آ آ کر شریک لشکر ہو گئے۔

اس لشکر کی تعداد پچاس ہزار سے زیادہ تھی۔ جس کو ہمراہ لے کر سلطان عبدالرحمٰن نے قرطبہ سے شمال کی جانب کوچ کیا مگر ان پچاس ہزار سے زیادہ آدمیوں میں بڑا حصہ ان لوگوں کا تھا جو تجربہ کار و ستیز آزمودہ نہ تھے۔ جوں جوں سلطان کی فوج شمال کی جانب بڑھتی گئی، عیسائی فوجیں سمٹ سمٹ کر سمورہ میں جمع ہوتی گئیں۔ عیسائیوں کو اپنی تعداد اور قوت کی زیادتی کے علاوہ ایک یہ مضبوطی حاصل تھی کہ سمورہ کے گرد شہر پناہ کی سات مضبوط دیواریں تھیں اور ہر دیوار کے بعد ایک نہایت عمیق خندق کھدی ہوئی تھی۔ ان کا سپہ سالار رذمیر تھا اور امیہ بن اسحاق اس کا مشیر و معاون تھا۔ اسلامی فوج نے جا کر معرکہ کارزار گرم کیا۔ عیسائی لشکر نے میدان میں نکل کر مقابلہ کیا۔ ہر ایک میدانی جنگ میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور عیسائیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ کئی روز کی معرکہ آرائی کے بعد عیسائی لشکر سمورہ کی شہر پناہ میں محصور ہو گیا۔ ۳۰ شوال سنہ ۳۲۷ھ کو مسلمان سخت حملہ کر کے دو دیواروں کے اندر گھس گئے۔ تیسری دیوار کو بھی انہوں نے فتح کیا لیکن اس دیوار کے اندر پہنچتے ہی عیسائیوں کے لشکر نے جو کمین گاہوں میں پوشیدہ تھا، نکل کر ہر طرف سے حملہ شروع کر دیا اور مسلمانوں کی بڑی تعداد بہ وجہ اس کے کہ نہ آگے بڑھ سکتی تھی، نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی، خندق میں گر گر کر ڈوب گئی۔ غرض مسلمان ایسے تنگ مقام میں اور ایسی بری طرح پھنسے کہ صرف ۴۸ آدمی زندہ بچ کر باہر نکل سکے اور اپنے بادشاہ عبدالرحمٰن ثالث کو جو پچاسواں شخص تھا، بہ مشکل اس سرغنہ سے بچا کر نکال لائے۔ باقی سب کے سب سمورہ کی خندق میں شہید ہو گئے۔ ان پچاس آدمیوں کے تعاقب میں رذمیر نے ایک رسالہ بھیجنا چاہا تو امیہ بن اسحاق نے اس کو یہ کہہ کر روک دیا کہ بہت زیادہ ممکن ہے کہ اسلامی لشکر کی کوئی بڑی تعداد باہر جھاڑیوں میں چھپی ہوئی موجود ہو اور وہ ہر طرف سے گھیر کر آپ کے لشکر کو تباہ کر دے۔ غرض عبدالرحمٰن ثالث کو بڑی ناکامی ہوئی اور جب سے مسلمانوں نے اندلس کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، آج تک کسی معرکہ میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد شہید نہیں ہوئی تھی۔ یہ لڑائی یوم الخندق یا جنگ خندق کے نام سے مشہور ہوئی۔

اس لڑائی کے بعد امیہ بن اسحاق کو پچاس ہزار مسلمانوں کی لاشیں دیکھ کر اپنی بداعمالی پر غور کرنے کا موقع ملا اور اس کے ضمیر نے اس کو ملامت کی کہ تو نے مسلمانوں کا اس قدر کشت و خون کرا

کر بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ چنانچہ اس نے سلطان کے پاس ایک درخواست بھیج کر اپنی خطا کی معافی چاہی اور عیسائیوں کا ساتھ چھوڑ کر چلا آیا۔ سلطان عبدالرحمٰن نے قرطبہ میں واپس آ کر زبردست فوجیں عیسائی ممالک کی طرف بھیجیں۔ ان اسلامی فوجوں نے پہنچ کر ہر جگہ عیسائیوں کو شکست فاش دی اور ان کو جنگ خندق کی فتح عظیم سے فائدہ اٹھانے کا مطلق موقع نہ دیا۔ یہاں تک کہ حدود فرانس تک فاتحانہ پہنچ کر اور بہت کچھ مال غنیمت لے کر واپس آئیں۔

خلافت عباسیہ میں انقلاب:

اسی سال یعنی سنہ ۳۲۷ھ میں سلطان کے پاس عباسی خلیفہ مقتدر کے مقتول ہونے، خلافت عباسی کے برائے نام باقی رہنے اور عبیدیین کے دعویٰ خلافت کی خبریں پہنچیں۔ سلطان عبدالرحمٰن ثالث نے یہ دیکھ کر اب خاندان عباسیہ کا کوئی خطرہ نہیں رہا اور عبیدیین سے اندلس کے مسلمانوں کو بہ وجہ ان کے شیعہ ہونے کے کوئی ہمدردی نہیں، مناسب سمجھا کہ امیرالمومنین اور خلیفۃ المسلمین کا خطاب اختیار کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے امیرالمومنین ہونے کا اعلان کیا اور ناصرلدین اللہ کا لقب اختیار کیا۔ اس خطاب اور لقب کی کسی نے مخالفت نہیں کی اور حقیقت بھی یہ تھی کہ اس زمانے میں وہی عالم اسلام کے اندر سب سے زیادہ خلیفۃ المسلمین کہلائے جانے کا مستحق بھی تھا۔ اس کے بعد امیرالمومنین عبدالرحمٰن نے قرطبہ کی رونق وشان بڑھانے اور خوبصورت عمارات بنانے کی طرف توجہ مبذول کی اور آٹھ دس سال تک برابر ہر سال شمال کی عیسائی ریاستوں کی سرکوبی کے لیے افواج بھیجتا رہا۔ عیسائیوں کو اس قدر مجبور و مغلوب کیا گیا۔ ہر ایک نے اظہار عجز وانکسار ہی کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بنایا اور شمالی عیسائیوں کی سرکوبی و بغاوت کا خطرہ بالکل جاتا رہا۔

اندلس کے واقعات جو اب تک بیان ہو چکے ہیں، ان کے مطالعہ سے خلیفہ عبدالرحمٰن کی یہ غلطی بالکل صاف نظر آتی ہے کہ اس نے باوجود اس کے کہ ان شمالی ریاستوں کے حالات دیکھے سنے تھے مگر پھر بھی موقع پا کر ان کے وجود کو مکمل متاصل کرنا نہ چاہا اور ان کو اپنا مغلوب دیکھ کر باقی رہنے دیا۔ خلیفہ عبدالرحمٰن سنہ ۳۳۰ھ کے بعد بڑی آسانی سے ان تمام عیسائی ریاستوں کو جو مسلمانوں کے مفتوحہ ملک میں مسلمانوں کی عزلت کے سبب سے پیدا ہو گئی تھیں، ایک ایک کر کے مٹا سکتا اور اپنے مسلمان عامل مقرر کر سکتا تھا لیکن اسنے بھی جزیرہ نما کے اندر ان عیسائی ریاستوں کے وجود کو باقی

رکھا۔ جس کا نتیجہ مسلمانوں کے لیے سخت مضر ثابت ہوا۔ اس زمانے میں غالباً یہ تصور بھی نہ ہوسکتا ہو گا کہ کسی دن مسلمانوں کی اولاد ایسی ضعیف وناتواں ہو جائے گی کہ یہ عیسائی نواب جو آج فرماں برداری کا اقرار کر رہے ہیں، اندلس سے اسلام کا نام ونشان مٹا سکیں گے۔ امیر المومنین بننے کے بعد عبدالرحمٰن ثالث نے دارالخلافہ قرطبہ سے باہر قدم نہیں رکھا اور جب کبھی ضرورت ہوئی، اپنے سرداروں کو فوجیں دے کر لڑائیوں پر بھیجا۔

بحری وبری قوت میں اضافہ:

سنہ ۳۲۸ھ سے بحیثیت مجموعی خلیفہ ناصر کے لیے اطمینان وفراغت کا زمانہ شروع ہوا۔ کوئی پریشان کرنے والی بات بہ ظاہر باقی نہ تھی۔ اسی فرصت میں خلیفہ ناصر لدین اللہ یعنی عبدالرحمٰن ثالث نے بحری قوت کو بڑھانے اور ساتھ ہی بری فوجوں کے باترتیب بنانے کی طرف توجہ کی۔ بہت سے جنگی جہاز بنوائے گئے اور اندلس کا بیڑا اس زمانے کے تمام جنگی بیڑوں سے طاقتور ہو گیا۔ بحر روم پر خلیفہ ناصر کی سیادت مسلم ہوگئی۔ خلیفہ نے قدیمی شاہی محل کے متصل ایک عظیم الشان قصر دارالروضہ کے نام سے تعمیر کرایا۔ مسجد قرطبہ کی زیب وزینت اور وسعت میں اضافہ کیا گیا۔ علمی مجالس اور مذاکرات علمیہ کا سلسلہ جاری ہوا۔ تجارتوں میں سہولتیں پیدا ہوئیں اور اندلس کے تاجر دور دراز مقامات تک مال تجارت لے کر پہنچنے لگے۔

خلیفہ عبدالرحمٰن کی عالمگیر عظمت:

خلیفہ عبدالرحمٰن ناصر کی خدمت وشہرت نے بہت جلد دنیا کا محاصرہ کر لیا۔ سنہ ۳۳۶ھ میں قسطنطین بن الیون بادشاہ قسطنطنیہ نے اپنے سفیر نہایت شاندار اور قیمتی تحائف کے ساتھ خلیفہ ناصر کی خدمت میں قرطبہ کی طرف روانہ کیے۔ قسطنطین نے ان شاندار تحائف کو بھیج کر ایک طرف اپنی شان وعظمت اور مال ودولت کی نمائش کرنی چاہی تھی اور دوسری طرف خلیفہ ناصر کی دوستی سے فائدہ اٹھانے کا خواہاں تھا۔ خلیفہ ناصر نے اس سفارت کے قریب پہنچنے کا حال سن کر شہر قرطبہ کی آراستگی کا حکم دیا۔ فوجیں زرق برق وردیوں میں دورویہ ایستادہ ہوئیں۔ دروازوں اور دیواروں پر زردوزی کے پردے، ریشمی نمگیرے، خوبصورت قناتیں اور انواع واقسام کی زینت اور صنعت کاری دیکھ کر قسطنطنیہ کے ایلچی حیران وششدر رہ گئے اور اپنے لائے ہوئے ہدیوں کو حقیر دیکھنے لگے۔ سنگ مرمر

کے خوبصورت ستونوں اور پچی کاری کے سنگین ورنگین فرشوں پر سے گزرتے ہوئے یہ ایلچی دربار کے ایوان عالی شان میں پہنچے، جہاں خلیفہ ناصر تخت خلافت پر جلوہ افگن اور امراء، وزراء، علماء، شعراء اور سرداران فوج اپنے اپنے قرینے اور مرتبے پر ایستادہ تھے۔ ان سفیروں پر یہ پر ہیبت و عظیم الشان نظارہ دیکھ کر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ بہر حال وہ سنبھلے اور نہایت ادب و تپاک سے کورنش بجا لائے اور تخت کے قریب جا کر اپنے بادشاہ کا خط پیش کیا۔ ایک آسمانی رنگ کا غلاف تھا جس پر سونے کے حروف سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس غلاف کے اندر ایک صندوقچہ تھا جو نہایت خوبصورت اور مرصع کار تھا۔ اس صندوقچہ پر سونے کی ایک مہر لگی ہوئی تھی جس کا وزن چار مثقال تھا۔ اس مہر کے ایک طرف مسیح علیہ السلام کی اور دوسری طرف شاہ قسطنطین کی تصویر کندہ تھی۔ اس صندوقچہ کے اندر ایک اور صندوقچہ بلور کا تھا۔ جس پر طلائی ونقری مینا کار بیل بوٹے منقوش تھے۔ اس کے اندر ایک نہایت خوبصورت ریشمی لفافہ تھا۔ جس کے اندر نہایت خوبصورت آسمانی رنگ کی جھلی پر طلائی حروف میں لکھا ہوا خط رکھا تھا۔ عنوان خط میں خلیفہ عبدالرحمٰن ناصر لدین اللہ کو نہایت شان دار القاب کے ساتھ مخاطب کیا گیا تھا۔ خلیفہ نے خط پڑھوا کر سنا۔ اس کے بعد محمد بن عبدالبر [1] کی طرف اشارہ کیا کہ وہ حسب حال تقریر کریں۔ ان فقیہ صاحب کو برجستہ تقریر کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا مگر اس وقت اس دربار کی عظمت اور مجلس کے رعب کا یہ عالم تھا کہ فقیہ مذکور کھڑے ہوئے اور چند الفاظ ادا کرنے کے بعد بیہوش ہو کر گر پڑے۔ ان کے بعد ابو علی اسماعیل بن قاسم کھڑے ہوئے اور حمد و نعت کے بعد کوئی لفظ منہ سے نہ نکال سکے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ فکر واندیشہ میں مستغرق ہیں۔ یہ رنگ دیکھ کر منذر بن سعید جو معمولی درجہ کے علماء میں شامل تھے، کھڑے ہوئے اور بلا تامل تقریر شروع کر دی۔ یہ تقریر اس قدر لطیف و پر جوش اور حسب موقع تھی کہ بے اختیار تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ خلیفہ نے اس حسن خدمت کے صلہ میں منذر بن سعید کو قاضی القضاۃ کے عہدے پر مامور کر دیا۔ معمولی مراسم کے بعد دربار برخاست ہوا۔ سفیروں کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ ٹھہرایا گیا اور بڑی شاندار مہمانی کی گئی۔ چند روز کے بعد قسطنطنیہ کی سفارت کو واپسی دی گئی اور اس کے ساتھ ہی خلیفہ نے ہشام بن ہذیل کو اپنی طرف سے بہ طور سفیر شاہ قسطنطین کے پاس روانہ کیا اور اس کو ہدایت کر دی کہ قسطنطین سے ایک دوستانہ عہد نامہ لکھوا کر واپس قرطبہ میں آیا۔ اس کے بعد بادشاہ

[1] مشہور حنفی فقیہ۔

اٹلی، بادشاہ جرمن، بادشاہ فرانس، بادشاہ صقلیہ (اٹلی) کے سفیر یکے بعد دیگرے دربار قرطبہ میں حاضر ہوئے اور اپنے اپنے بادشاہوں کی طرف سے اظہار عقیدت بجا لائے اور محبت و ہمدردی کے تعلقات پیدا کرنے کی درخواست کی اور ہر ایک بادشاہ نے خلیفہ عبدالرحمٰن ناصر کی چشم عنایت اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے منت وسماجت اور خوشامد میں کوتاہی نہیں کی۔ یورپ کا ہر ایک بادشاہ یہ چاہتا تھا کہ خلیفہ عبدالرحمٰن میرا حامی و مددگار بن جائے تاکہ میں دشمنوں کے حملوں سے محفوظ ہو جاؤں۔

خلیفہ عبدالرحمٰن نے اپنے بیٹے حکم کو اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ دوسرا بیٹا عبداللہ نماز روزہ کی طرف زیادہ مائل اور الزاہد کے نام سے مشہور تھا۔ عبداللہ کو قرطبہ کے ایک فقیہ نے جن کا نام عبدالباری تھا، بہکایا اور حکومت کی طمع دلا کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ خلیفہ عبدالرحمٰن اور حکم کو قتل کرنے کی ایک زبردست کوشش کی جائے۔ چنانچہ فقیہ عبدالباری اور عبداللہ نے مل کر خلیفہ اور ولی عہد کو قتل کرنے کی تیاری کی۔ اس سازش میں اور لوگوں کو بھی شریک کیا گیا۔ ۱۰ ذی الحجہ سنہ ۳۳۹ھ یعنی عیدالاضحیٰ کے دن اس سازش کا انکشاف ہو گیا اور خلیفہ مع ولی عہد قتل ہوتے ہوتے بچ گئے۔ خلیفہ نے اپنے بیٹے عبداللہ اور فقیہ عبدالباری دونوں کو گرفتار کر کے جیل خانے بھجوا دیا، پھر اسی روز اول اپنے بیٹے عبداللہ کو جیل خانے سے نکال کر قتل کرایا۔ فقیہ صاحب نے جب عبداللہ کے قتل ہونے کا حال سنا تو خود ہی جیل خانے میں خودکشی کر کے ہلاک ہو گئے۔

سنہ ۳۴۲ھ میں رذمیر بادشاہ جلیقیہ کے فوت ہونے پر اس کا بیٹا اردونی چہارم تخت نشین ہوا اور خلیفہ عبدالرحمٰن ناصر کی خدمت میں سفیر بھیج کر اپنی حکومت اور باپ کی جانشینی کی اجازت چاہی۔ خلیفہ نے اس کی تخت نشینی کو منظور کر کے اجازت نامہ بھیج دیا۔ سنہ ۳۴۵ھ میں فرڈی نند سردار قسطلہ نے اردونی چہارم کو اپنا سفارشی بنا کر خلیفہ کی خدمت میں اپنی مستقل ریاست وحکومت کے تسلیم کیے جانے کی درخواست بھیجی۔ خلیفہ نے فرڈی نند کی اس درخواست کو منظور کر لیا اور اس کو ریاست قسطلہ کا مستقل حاکم وفرماں روا بنا دیا۔ فرڈی نند اب تک ریاست جلیقیہ یعنی رذمیر کا ماتحت سمجھا جاتا تھا لیکن چونکہ اردونی چہارم نے سفارش کر کے اس کو بھی مستقل فرماں روا اور خود مختار رئیس بنوا دیا۔ اس سے قبل یہ صورت پیش آ چکی تھی کہ شانجہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اپنی آبائی ریاست لیون پر قابض ہو چکا تھا اور کئی برس سے ریاست لیون، جلیقیہ سے جدا شانجہ کے تصرف میں تھی۔ ریاست نوار میں اس کی نانی طوطہ حکمران تھی۔ شانجہ مٹاپے میں مبتلا ہو کر اس قدر موٹا ہو گیا تھا کہ گھوڑے پر چڑھنا تو

بڑی بات ہے، پیدل بھی دو قدم نہیں چل سکتا تھا۔ سنہ ۳۴۶ھ میں فرڈی نندا اور اردونی چہارم نے مل کر شانجہ کو ریاست لیون سے بے دخل کر دیا۔ شانجہ اپنی نانی طوطہ کے پاس ریاست نوار میں چلا گیا۔ ریاست نوار میں شانجہ کا ایک ماموں بادشاہ تھا مگر عنان حکومت ان کی نانی ہی کے ہاتھ میں تھی، جو قابلیت و تجربہ کاری کی وجہ سے اپنے بیٹے شاہ نوار کی نگران و اتالیق بھی تھی۔ ملکہ طوطا نے خلیفہ کی خدمت میں بہت سے تحفے اور ہدیے بھیج کر درخواست کی کہ خلیفہ شانجہ کا ملک اردونی سے واپس دلا دے اور ایک طبیب قرطبہ سے بھیج دے جو شانجہ کے مرض کا علاج کرے۔ خلیفہ نے ایک شاہی طبیب کو نوار کی طرف فوراً روانہ کر دیا اور ملک کے واپس دلانے کا مسئلہ غور و تامل کے لیے دوسرے وقت پر ٹال دیا۔ طبیب کے علاج سے شانجہ کو آرام ہو گیا اور اس کی پہلی چستی و چالا کی پھر واپس آ گئی۔

دربار خلافت میں تین عیسائی بادشاہ بہ حیثیت فریادی:

اس کے بعد سنہ ۳۴۷ھ میں ملکہ طوطہ نے یہی مناسب سمجھا کہ میں خود خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض معروض کروں۔ چنانچہ وہ اپنے بیٹے شاہ نوار اور اپنے نواسے شاہ لیون کو لے کر قرطبہ کی جانب روانہ ہوئی۔ گویا تین عیسائی بادشاہ حدود فرانس سے خلیفہ کے دربار میں حاضر ہونے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ ایک نہایت جاذب توجہ نظارہ تھا۔ راستے کے جن جن شہروں یا قصبوں میں یہ لوگ قیام کرتے تھے، لوگ ان کو دیکھنے کو جمع ہو جاتے تھے کہ کئی بادشاہ فریادی بن کر دربار قرطبہ کی طرف جا رہے ہیں۔ قرطبہ کے قریب پہنچے تو ان کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ دربار میں خلیفہ کے سامنے حاضر ہوئے تو دربار کی شان اور خلیفہ کے رعب و جلال نے ان کو مبہوت کر دیا۔ خلیفہ نے ان کی دل دہی اور تشفی کی اور ان لوگوں کے اتنی دور چل کر آنے اور فریاد کرنے کا اثر یہ ہوا کہ خلیفہ نے ان کے ساتھ اپنے فوجی دستوں کو روانہ کیا کہ ریاست لیون و جلیقیہ کی حکومت شانجہ کو دلا دیں۔ چنانچہ امیر المومنین عبدالرحمٰن ثالث کی فوجوں نے اردونی چہارم کو بے دخل کر کے شانجہ کو جلیقیہ و لیون کا بادشاہ بنا دیا اور اردونی بھاگ کر قسطلہ میں فرڈی نند کے پاس چلا گیا اور سلطانی فوجوں نے اس سے زیادہ تعرض نہیں کیا۔ اردونی کے انجام کو دیکھ کر شاہ برشلونہ اور رئیس طرکونہ نے اپنے سفیر دربار قرطبہ میں بھیج کر التجا کی کہ ہم دربار خلافت کے غلام ہیں اور اپنی اپنی ریاست کو عطیہ سلطانی سمجھتے ہیں۔ اطاعت و فرماں برداری کی شرائط ادا کرنے میں مطلق انکار و تامل نہیں۔ لہٰذا ہم کو ہماری

ریاستوں کی سندیں پھر عطا ہوں اور ہمارے اظہار اطاعت کی تجدید کو شرف قبولیت عطا فرمایا جائے۔ خلیفہ ناصر نے ان عیسائی بادشاہوں کے نام اپنی رضا مندی وخوشنودی کے احکام روانہ کر کے ان کو مطمئن کیا۔

اہل علم وفن کی قدر افزائی:

خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث نے جہاں کہیں کسی علم وفن کے باکمال کا نام سنا، اس کو بلوایا اور بڑی قدردانی کے ساتھ پیش آیا۔ اس کی قدردانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد، قسطنطنیہ، قاہرہ، قیروان، دمشق، مدینہ، مکہ، یمن، ایران اور خراسان تک سے باکمال لوگ کھنچ کھنچ کر قرطبہ میں جمع ہو گئے۔ ان باکمالوں میں ہر علم وفن اور ہر ملت و مذہب کے لوگ شامل تھے اور دربار خلافت سے سب کی عزت افزائی اور تربیت و پرورش ہوتی تھی۔

تعمیری ذوق:

خلیفہ عبدالرحمٰن کو سلاطین اندلس میں وہی مرتبہ حاصل تھا جو ہندوستان کے شاہان مغلیہ میں شاہجہاں کو، مسجد قرطبہ کی تعمیر کا کام عبدالرحمٰن اول کے زمانہ میں شروع ہو کر اس کے بیٹے ہشام کے زمانے میں ختم ہو چکا تھا مگر اس کے بعد بھی ہر ایک فرماں روائے اندلس نے اس مسجد کی شان و شوکت اور زینت کے بڑھانے میں ہمیشہ خزانوں کا منہ کھلا رکھا۔ خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث نے بھی اس مسجد کی تعمیر و تکمیل میں چالیس اور پچاس لاکھ کے درمیان روپیہ خرچ کیا۔ اس مسجد کا طول شرق سے غرب تک پانچ سو فٹ تھا۔ اس کی خوبصورت محرابیں ایک ہزار چار سو سترہ سنگ مرمر کے ستونوں پر قائم تھیں۔ محراب کے قریب ایک بلند منبر خالص ہاتھی دانت اور چھتیس ہزار مختلف رنگ اور وضع کی لکڑی کے ٹکڑوں سے بنا اور ہر قسم کے جواہرات سے جڑا ہوا رکھا تھا۔ یہ منبر سات برس کے عرصہ میں تیار ہوا تھا۔ خلیفہ عبدالرحمٰن نے اس مسجد کے قدیم میناروں کو گرا کر ایک نیا مینار ایک سو آٹھ فٹ بلند تیار کرایا تھا۔ جس میں چڑھنے اور اترنے کے دو زینے تھے جن میں ایک سو سات سیڑھیاں تھیں۔ اس مسجد میں چھوٹے بڑے دس ہزار جھاڑ روشنی کے جلا کرتے تھے، جن میں سے تین سب سے بڑے جھاڑ خالص چاندی کے اور باقی پیتل کے تھے۔ بڑے بڑے جھاڑوں میں ایک ہزار چار سو اسی پیالے روشن ہوتے تھے اور ان تین چاندی کے جھاڑوں میں چھتیس سیر تیل جلا کرتا تھا۔ تین

سو ملازم اور خدام اس مسجد کے لیے متعین تھے۔ [1]

خلیفہ عبدالرحمٰن نے اپنی عیسائی بیوی زہرہ کے لیے قرطبہ سے چار میل کے فاصلے پر جبل العروس کے پر فضا دامن میں ایک رفیع الشان قصر تیار کیا۔ یہ اس قدر وسیع عمارت تھی کہ اس کو قصر الزہرہ یا مدینۃ الزہرہ کہتے تھے۔ اس قصر کی وسعت کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کے احاطے کی دیواروں میں پندرہ ہزار بلند اور شاندار دروازے تھے۔ یہ قصر ہمارے زمانے کے موجودہ رائج الوقت سکّے کے اعتبار سے بیس کروڑ پچاس لاکھ روپیہ کی لاگت میں بن کر تیار ہوا تھا لیکن اگر اس زمانے میں روپیہ کی ارزانی اور ضروریات کی زندگی کی گرانی کا لحاظ کیا جائے تو قصر الزہرہ کی لاگت ہم کو ایک ارب روپیہ سے کم نہیں بتلانی چاہیے۔ اس قصر کا طول چار میل اور عرض قریباً تین میل تھا۔ سنہ ۳۲۵ھ سے اس قصر کی تعمیر شروع ہو کر سنہ ۳۵۰ھ میں پچیس سال کے اندر ختم ہوئی۔ دس ہزار معمار، چار ہزار اونٹ اور خچروں سے روزانہ اس کے بنانے میں کام لیا جاتا تھا۔ یہ قصر چار ہزار تین سو سولہ برجوں اور ستونوں پر جو سنگ مرمر وغیرہ قیمتی پتھروں کے بنے ہوئے تھے، قائم تھا۔ ان ستونوں میں سے بعض ستون فرانس و قسطنطنیہ وغیرہ کے بادشاہوں نے ہدیۃً عبدالرحمٰن ناصر کی خدمت میں بھیجے تھے۔ عبداللہ، حسن بن محمد، علی بن جعفر وغیرہ انجینئروں کو بھیج کر سنگ مرمر کی ایک مقدار افریقہ سے منگوائی گئی تھی۔ ایک سب سے بڑا فوارہ جو سونے کا معلوم ہوتا تھا اور اس پر نہایت خوش نمائش و نگار تھے، احمد یونانی اور ربیع پادری قسطنطنیہ سے لائے تھے۔ ایک فوارہ سنگ سبز کا ملک شام سے منگوایا گیا تھا۔ بارہ پرند اور چرند جانوروں کی صورتیں مختلف جواہرات اور سونے کی بنی ہوئی، اس میں لگائی گئی تھیں۔ ہر جانور کے منہ میں چونچ میں سے پانی کا فوارہ بلند ہوتا تھا۔ اس فوارے میں کاریگر نے وہ دست کاری ظاہر کی تھی کہ یورپ کے جن سیاحوں نے ان کو دیکھا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ دیکھنا اور سننا تو بڑی بات ہے، خواب اور خیال کو بھی یہاں مجال دخل نہ تھی۔

اس قصر کا ایک حصہ قصر الخلفاء بھی قابل دید تھا۔ اس کی چھت خالص سونے اور ایسے شفاف سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی کہ دوسری طرف کی چیز مثل آئینہ کے نظر آتی تھی۔ یہ چھت باہر کی جانب

[1] افسوس ظاہری خوبصورتی اور نمود و نمائش کا جذبہ تو بڑھتا گیا اور دینی روح اور ذوق ہم مسلمانوں کی عملی زندگی سے الا ماشاء اللہ ختم ہوتی چلی گئی۔ اب عام مساجد میں بھی زیادہ تر نمود و نمائش اور سجاوٹ تو ہوتی ہے لیکن دینی روح، خشوع و خضوع، خضوع، تقویٰ وغیرہ کا ماحول بہت ہی کم ہوتا ہے۔

سونے چاندی کے سفالوں سے سجی ہوئی تھی۔ اس کے وسط میں ایک خوبصورت مرصع فوارہ نصب تھا، جس کے سر پر وہ مشہور موتی جڑا ہوا تھا، جس کو بادشاہ یونان نے بہ طور تحفہ عبدالرحمٰن ثالث کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اس فوارے کے علاوہ قصر کے بیچ میں ایک فوارہ نما طشت پارہ سے لبریز رکھا تھا۔ اس قصر کے گرد نہایت خوش نما آئینے ہاتھی دانت کے چوکٹوں میں جڑے ہوئے تھے۔ مختلف اقسام کی لکڑیوں کے مرصع دروازے سنگ مرمر اور بلوری چوکٹوں پر نصب تھے۔ جس وقت یہ دروازے کھول دیے جاتے تھے اور آفتاب کی شعاع سے مکان روشن ومنور ہوتا تو کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اس کی چھت اور دیواروں کی طرف نظر بھر کے دیکھ سکے۔ اس حالت میں اگر پارہ ہلا دیا جاتا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام مکان جنبش میں ہے۔ جو لوگ اس راز سے واقف نہ تھے، وہ مکان کو فی الحقیقت جنبش میں سمجھ کر بے حد خائف ہوتے۔

اس قصر کے انتظام اور نگرانی کے لیے تیرہ ہزار سات سو پچاس ملازم اور تیرہ ہزار تین سو بیاسی غلام جو نصاریٰ قوم کے تھے، متعین تھے۔ حرم سرا کے اندر چھ ہزار عورتیں خدمت گزاری کے لیے حاضر رہا کرتی تھیں۔ حوضوں میں روزانہ بارہ ہزار روٹیاں علاوہ اور چیزوں کے مچھلیوں کی خوراک کے لیے ڈالی جاتی تھیں۔ مدینۃ الزہرہ وہ نادر الوجود تھا جس کی وسعت سنگ مرمر کی عمارات، دربار خاص وعام کی شان وشوکت، اس کے باغات کا پر فضا سماں جہاں ہزارہا فوارے اچھلتے، نہریں اور حوض پانی سے چھلکتے تھے، دیکھنے کے لیے دور دور سے سیاح آتے تھے۔ عربوں نے اس قصر کو اپنی صنعت وحرفت ودست کاری کی نمائش گاہ بنا دیا تھا۔ افسوس کہ عیسائی وحشیوں نے آئندہ زمانے میں جب قرطبہ پر قبضہ کیا تو قصر الزہرا کا نام ونشان تک مٹا دیا۔ مسجدوں کو ڈھایا، مقبروں کو مسمار کر کے قبروں تک کو ادھیڑ ڈالا، انا للہ وانا الیہ راجعون!

پاک باطنی:

قاضی القضاۃ منذر بن سعید بلوطی کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ان کا ایک واقعہ جو عبدالرحمٰن ناصر کے ساتھ ہوا، ذکر کرنے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ عبدالرحمٰن نے قرطبہ میں ایک مکان کو اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے خریدنا چاہا۔ وہ مکان یتیم بچوں کی ملکیت تھی اور وہ یتیم بچے قاضی منذر کی نگرانی میں تھے۔ جب قاضی کے پاس اس مکان کی خریداری کا پیغام پہنچا تو قاضی صاحب نے فروخت کرنے

سے انکار کر دیا اور خلیفہ کی خدمت میں کہلا بھجوایا کہ یتیموں کی جائیداد اس وقت منتقل ہو سکتی ہے جبکہ ان تین شرطوں میں سے کوئی ایک شرط پوری ہو:

۱- کوئی سخت ضرورت لاحق ہو۔

۲- جائیداد کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

۳- ایسی قیمت ملتی ہو کہ جس کے لینے میں یتیموں کا آئندہ فائدہ متصور ہو۔

فی الحال ان تین شرطوں میں سے کوئی شرط موجود نہیں اور ملازمین سرکار نے جو قیمت اس مکان کی تجویز کی ہے، وہ بہت کم ہے۔ خلیفہ یہ پیغام سن کر خاموش ہو گیا اور اس نے سمجھا کہ قاضی بغیر قیمت بڑھائے نہ مانے گا۔ ادھر قاضی منذر کو اندیشہ ہوا کہ کہیں خلیفہ اس مکان کو زبردستی نہ چھین لے۔ چنانچہ قاضی نے فوراً مکان کو منہدم کرا دیا۔ اس کے بعد ملازمین شاہی نے دگنی قیمت دے کر اس زمین کو خریدا۔ خلیفہ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے قاضی کو بلا کر مکان کے منہدم کرانے کا سبب دریافت کیا۔ قاضی منذر نے کہا کہ جس وقت میں نے مکان کے منہدم کرنے کا حکم دیا، اس وقت میرے زیر نظر قرآن کی یہ آیت تھی ﴿ فَانْطَلَقَا حَتّٰى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ﴾[1] خلیفہ یہ سن کر خاموش ہو گیا اور اس روز سے قاضی منذر کی زیادہ عزت کرنے لگا۔ اس واقعہ سے خلیفہ اور قاضی دونوں کی پاک باطنی کا ثبوت ملتا ہے۔ قاضی منذر سنہ ۳۵۵ھ میں خلیفہ ناصر سے پانچ سال بعد فوت ہوئے تھے۔

امیر المومنین خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث ناصر لدین اللہ نے ۲ رمضان المبارک سنہ ۳۵۰ھ کو ۷۲ سال، چند ماہ کی عمر میں مقام قصر الزہرہ میں وفات پائی۔

مال گزاری کی آمدنی:

اس خلیفہ کے عہد میں دو کروڑ چون لاکھ اسی ہزار دینار سالانہ مال گزاری داخل خزانہ عامرہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ سات لاکھ ۶۵ ہزار دینار مختلف ذرائع سے وصول ہوتے تھے۔ یہ تمام آمدنی ملک اور رعایا پر ہی خرچ کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جو روپیہ بہ طور خراج و جزیہ عیسائیوں اور یہودیوں سے وصول ہوتا تھا، وہ خاص شاہی خزانہ میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ اس آمدنی کی کوئی تعداد

❶ ''تو دونوں چل پڑے یہاں تک کہ جب کشتی میں سوار ہوئے تو (خضر نے) کشتی کو پھاڑ ڈالا۔ (موسیٰ نے) کہا: ''کیا آپ نے اس کو اس لیے پھاڑا ہے کہ سواروں کو غرق کر دیں! یہ تو آپ نے بڑی (عجیب) بات کی۔'' (الکھف ۱۸: ۷۱)

مقرر نہ تھی۔ اس میں سے ایک ثلث خاص سلطان کی جیب خاص کے لیے مقرر تھا۔ باقی کل رقم عمارتوں، پلوں اور سڑکوں وغیرہ پر خرچ کی جاتی تھی۔

خلیفہ کی وفات:

اس خلیفہ کی وفات کے بعد اس کے کاغذات میں سے خلیفہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک یادداشت نکلی جس میں خلیفہ نے اپنے پچاس سالہ عہد حکومت کے ان دنوں کا حال لکھا تھا، جن میں خلیفہ کو کوئی فکر نہ تھی اور ایسے دنوں کی تعداد جو افکار سے خالی تھی، صرف چودہ تھی۔ وفات کے وقت خلیفہ کے گیارہ لڑکے موجود تھے، جن میں حکم بن عبدالرحمٰن ولی عہد تھا۔

عبدالرحمٰن ثالث کے عہد حکومت پر تبصرہ:

خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کا زمانہ اندلس کی حکومت اسلامیہ کا نہایت شاندار زمانہ تھا۔ ملک میں ہر طرف امن وامان کا دوردورہ تھا۔ تجارت کی بہت بڑی ترقی تھی۔ اہل اندلس نے افریقہ وایشیا کے دوردراز مقامات پر اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لی تھیں۔ بحری طاقت میں کوئی ملک اور کوئی قوم اندلس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ تمام سمندروں پر گویا اندلسی حکومت مسلمانوں کی تھی۔ اس خلیفہ نے اپنے سرداروں اور اہل کاروں کو شاہی اختیارات نہیں دیے بلکہ وہ خود ہر ایک اہم اور ضروری معاملہ کی طرف متوجہ ہوتا اور اہل کاروں پر کاموں کو چھوڑ کر بے فکر نہیں ہوجاتا تھا۔ اس نے ان عرب سرداروں اور فقیہوں کی طاقت کو جو حکومت وسلطنت پر حاوی تھے، بہ تدریج کم کر کے ان لوگوں کو جو خلیفہ کے ہمدرد و خیر اندیش تھے، بڑھایا اور اپنے ذاتی غلاموں کا ایک حفاظتی دستہ فوج بنایا۔ خلیفہ کی نگاہ سے سلطنت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ پوشیدہ نہیں رہتا تھا۔ تمام جزئیات تک خلیفہ کی نظر پہنچ جاتی تھی۔

اس خلیفہ نے جو سب سے بڑا کام کیا، وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور گروہوں میں جو مخالفت اور خانہ جنگی برپا رہتی تھی، اس کو بالکل مٹا دیا۔ ہر ایک جماعت اور ہر ایک گروہ کو اس کے مرتبہ کے موافق سلطنت کی طرف سے حقوق حاصل تھے اور کوئی گروہ سلطنت کا دشمن نہ تھا، آپس میں ایک دوسرے سے چھری کٹارے ہونا چاہتے تھے۔ اسی میں خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کی کامیابیوں کا راز مضمر تھا اور یہی وہ چیز تھی جس کے سبب سے اندلسی مسلمانوں کی عظمت تمام دنیا کی نگاہوں میں

پیدا ہو گئی تھی۔

اس خلیفہ کے زمانے میں غیر مسلم لوگوں یعنی عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ کے ساتھ نہایت مروت اور نرمی کا برتاؤ ہوتا تھا۔ خلیفہ عبدالرحمٰن کی حدود حکومت میں رہنے والے تمام عیسائی خلیفہ عبدالرحمٰن کو اس قدر محبوب رکھتے تھے کہ اس معاملے میں وہ مسلمانوں سے ہرگز کم نہ تھے۔

مسلمان مولویوں کے تنگ دل اور سخت گیر طبقہ کو اس خلیفہ نے نبی اکرم ﷺ کی رعایتوں کی طرف توجہ دلائی، جو وہ غیر مسلم لوگوں کے ساتھ روا رکھتے تھے اور ان کو مجبور کیا کہ وہ قرآن وحدیث کی اصل روح سے واقف ہوں اور حقیقت وشریعت سے آگاہ ہو کر تنگ چشمی کو چھوڑ دیں۔ اس کام میں خلیفہ کو کامیابی حاصل ہوئی اور اس کا زمانہ خیر وبرکت کا زمانہ سمجھا گیا۔

جہاد کرنے اور کفار سے بہ ذات خود لڑنے میں یہ خلیفہ کسی سے کم نہ تھا اور اس کی فوجی کارروائیاں بہت ہی عظیم الشان تھیں۔ ساتھ ہی جب خلیفہ کے رفاہ رعایا، خدمت علم وفنون، اصلاح معاشرت، ترقی وتمدن، شوق عمارات، ترقی مال و دولت، ترقی زراعت وغیرہ کارناموں پر غور کیا جاتا ہے تو اس کا مرتبہ ہی بلند ہوتا ہے اور عبدالرحمٰن، ثالث عبدالرحمٰن اول سے ہرگز کم ثابت نہیں ہوا۔

اس خلیفہ کے زمانے میں نہ صرف قرطبہ بلکہ تمام ملک اندلس دنیا میں بہترین نمونہ بن گیا تھا۔ کہیں چپہ بھر زمین ایسی نہ تھی جس میں کاشت نہ ہوتی ہو۔ خوبصورت باغات کی افراط وکثرت سے تمام ملک گلزار نظر آتا تھا۔ کوئی شہر و قصبہ اور گاؤں ایسا نہ تھا جس میں خوبصورت اور سر بہ فلک عمارات کی کثرت نہ ہو۔ وہ اندلس جو اس خلیفہ کی تخت نشینی سے پہلے بدامنی اور فتنہ وفساد کا گھر بنا ہوا تھا، اس کے عہد سلطنت میں امن وامان اور فارغ البالی کا مسکن بن گیا تھا۔ قرطبہ اور دوسرے شہروں کی عمارات اور رونق وسلیقہ شعاری بغداد ودمشق وغیرہ سے بہ درجہا بڑھ چڑھ کر تھی۔ اندلس کی آبادی کے مقابلے میں تمام براعظم یورپ ایک بیابان نظر آتا تھا، جہاں تہذیب وشائستگی کا نام ونشان نہ تھا۔ یورپ کے تمام بادشاہوں کی آمدنی مل کر بھی تنہا خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کی آمدنی کے برابر نہ تھی۔ خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کی باقاعدہ فوج جن کے نام رجسٹروں میں درج تھے، ڈیڑھ لاکھ تھی مگر بے قاعدہ فوج یعنی ضرورت کے وقت رضا کاروں وغیرہ کی تعداد جو فراہم ہو سکتی تھی، اس کا کوئی شمار نہ تھا۔ بارہ ہزار آدمیوں کی فوج جن میں آٹھ ہزار سوار اور چار ہزار پیدل تھے، خلیفہ کی محافظ تن فوج تھی۔

تمام جزیرہ نمائے اندلس میں سڑکوں اور شاہراہوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ مسافروں کی

حفاظت کے لیے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چوکیاں قائم تھیں اور سپاہی گشت کرتے اور پہرہ دیتے رہتے تھے۔ ڈاک کا انتظام بہ ذریعہ قاصدوں کے تھا جو ڈاک لے کر گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے جاتے تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ خبر اتنی جلدی پہنچ جاتی تھی کہ دوسرے ملکوں کے لوگ اس کو جادو سمجھتے تھے۔ لاتعداد بروج پہرہ چوکی کے لیے بنے ہوئے تھے۔ یہ بروج ساحل بحر پر بھی بنے ہوئے تھے۔ ان برجوں کی چوٹیوں پر سے دارالخلافہ میں جہازوں کی نقل وحرکت کی خبر بلاتوقف پہنچ جاتی تھی۔ بیت المال سے ایک بہت بڑی رقم ایسی عمارتوں کے لیے ہمیشہ لی جاتی تھی، جو رفاہ عام کے لیے بنوائی جاتی تھیں۔ ان عمارتوں کے بنوانے سے یہ بھی غرض تھی کہ کاریگروں اور مزدوروں کے لیے کام ہمیشہ مہیا رہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ اس تمام ملک میں جو مسلمانوں کے قبضہ میں رہ چکا ہے۔ غیر معمولی تعداد قلعوں اور پلوں کی پائی جاتی ہے۔ بیمار اور محتاج آدمیوں کے لیے سرکاری مکانات تھے۔ وہاں سرکاری خرچ سے ان کی ہر قسم کی خبر گیری کی جاتی تھی۔ تمام ممالک محروسہ میں دارالیتامٰی قائم تھے۔ ان میں یتیموں کی پرورش اور تعلیم کا انتظام خلیفہ کے صرف خاص سے ہوتا تھا۔

قرطبہ کی آبادی دس لاکھ تھی۔ سڑکیں نہایت صاف و پختہ، مکانات عموماً سنگ مرمر کے اور نہایت خوبصورت پانی کے نکاس کی موریوں کا نہایت عمدہ اور قابل تعریف انتظام تھا۔ صفائی کے لیے ایک محکمہ قائم تھا جو ہمہ اوقات شہر کی صفائی کی نگرانی میں مصروف تھا۔ جا بہ جا شہر کے اندر بھی نفیس و دل کشا باغیچے تھے اور نواح شہر میں تو ایسے باغیچوں کی بڑی ہی کثرت تھی۔ شہر میں مکانات کی تعداد ایک لاکھ تیرہ ہزار تھی۔ ان میں وزراء و امراء اور خلیفہ کے محلات و قصور شامل نہیں ہیں۔ اسی ہزار چار سو دکانیں، سات سو مسجدیں، نو سو حمام اور چار ہزار تین وہ مکانات تھے جن میں مال تجارت رکھا رہتا تھا، ان کو گودام کہنا چاہیے۔ دنیا کے ہر ملک و شہر کے آدمی، ہر ملک کا لباس اور ہر ملک وسلطنت کے سکے قرطبہ میں نظر آتے تھے۔ اس شہر کا طول چوبیس میل اور عرض چھ میل تھا، جو وادی الکبیر کے کنارے کنارے پھیلا چلا گیا تھا۔ خاص شہر جس کے گرد پختہ فصیل تھی، چودہ میل کے محیط میں تھا۔ رات کے وقت قرطبہ کے بازار میں اگر کوئی شخص بہ خط مستقیم سفر کرے تو دس میل تک وہ بازاروں کے چراغوں کی روشنی میں چل سکتا تھا۔ روئے زمین کا کوئی شہر قرطبہ کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کرسکتا تھا۔ دنیا کے کسی شہر میں اس قدر قلمی کتابیں نہیں تھیں، جس قدر قرطبہ میں موجود تھیں۔ پہاڑ کا

پانی ڈھائی میل کے فاصلے سے بہ ذریعہ نل شہر کے اندر آتا تھا۔ باغوں میں اسی نل کے ذریعے سے فوارے چھوٹتے تھے۔ شہر کے سات بڑے بڑے دروازے تھے، جن کے پھاٹکوں میں تالا جڑا ہوا تھا۔ شہر پناہ کے اندر شہر پانچ حصوں میں منقسم تھا۔ ہر ایک حصے کی شہر پناہ الگ الگ تھی۔ شہر کے پانچ حصوں میں سے ایک حصہ قصر شاہی تھا۔ اس کا قلعہ الگ تھا اور اراکین سلطنت اسی میں رہتے تھے۔ شہر قرطبہ ہی میں نہیں، تمام ملک اندلس میں بھیک مانگنے والا کوئی فقیر نظر نہ آتا تھا۔ سلطان عبدالرحمٰن ثالث اپنے آخر ایام حکومت میں مدینۃ الزہرہ میں چلا گیا تھا، جو قرطبہ کے قریب ایک دوسرا چھوٹا سا شہر بن گیا تھا اور رونق وخوبصورتی میں قرطبہ سے بہت بڑھ چڑھ کر تھا۔ اندلس میں ہر قسم کے میوے بافراط پیدا ہونے لگے تھے اور بازاروں میں بہت ارزاں فروخت ہوتے تھے۔

دارالخلافہ قرطبہ میں بہ کثرت مدارس اور دارالعلوم جاری تھے۔ جا بہ جا مشاعرے، مناظرے اور علمی تحقیقات کے جلسے منعقد ہوتے تھے۔ شہزادے، امراء اور خود خلیفہ ان جلسوں کی شرکت اور نگرانی کرتے۔ علماء کو انعام و وظائف عطا کرتے تھے۔ ہیئت، طب، فلسفہ، حدیث اور تفسیر کے بے نظیر عالم قرطبہ میں موجود تھے۔ طلباء کے مصارف اور رہنے سہنے کا انتظام سب شاہی خزانہ کے ذمہ تھا۔ آخر ایام حیات میں خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث نے اپنے ولی عہد حکومت کا کاروبار سلطنت بہت کچھ سپرد کر دیا تھا اور خود اپنا وقت عبادت الٰہی میں زیادہ بسر کرنے لگا تھا۔

وفات:

خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث الملقب بہ ناصرلدین اللہ نے مرتے وقت سلطنت اندلس کو اس حالت میں چھوڑا کہ عیسائی سلاطین جو سرحد پر تھے، اپنی سینکڑوں برس کی جدوجہد کے بعد مایوس و ناکام ہو کر سلطنت اسلامیہ اندلس کی غلامی وفرماں برداری کا اقرار کرنے پر مجبور ہو کر اطاعت گزاری پر ہمہ وقت مستعد نظر آتے تھے اور غلاموں کی طرح دربار قرطبہ میں عرضیاں بھیجتے اور التجائیں کرتے تھے۔ جو عیسائی بادشاہ دور دراز کے ملکوں پر قابض وفرماں روا تھے، وہ بھی خلیفہ اندلس کو رضا مند رکھنے کی کوششوں میں مصروف نظر آتے اور دربار قرطبہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا ہونے پر فخر کرتے تھے۔ مراکش کا ملک اندلس کی حکومت میں شامل تھا۔ تمام بحر روم اور دوسرے سمندروں پر بھی اندلس کے بیڑہ کی حکومت تھی اور سمندروں میں کوئی طاقت اندلس کے جہاز کو نہیں ٹوک سکتی تھی۔ کوئی

اندرونی خطرہ بھی باقی نہ رہا تھا۔

خلیفہ حکم بن عبدالرحمٰن ثالث کی تخت نشینی

اپنے باپ کی وفات کے تیسرے روز خلیفہ حکم ۵ رمضان المبارک سنہ ۳۵۰ھ کو بہ عمر ۴۸ سال قصر الزہرا میں تخت خلافت پر بیٹھا۔ وزراء، سپہ سالاران فوج، امراء، علماء اور اراکین سلطنت بیعت کے لیے حاضر دربار ہوئے۔ قاضی القضاۃ اور دوسرے قاضیوں نے اول بیعت کی۔ اس کے بعد خلیفہ کے بھائیوں اور شہزادوں نے رسم بیعت ادا کی۔ اس کے بعد وزراء و امراء واراکین سلطنت نے اقرار اطاعت کیا۔ صوبوں کے عامل جو قرطبہ میں حاضر ہو سکے تھے، انہوں نے اصولاً شرف بیعت حاصل کیا۔ باقی لوگوں کے پاس ملک کے صوبوں اور بڑے بڑے شہروں میں بیعت لینے کے لیے خلیفہ نے وکلاء روانہ کیے۔ قصر شاہی کے خادموں اور غلاموں نے بھی بیعت کی۔ تخت نشینی کی رسم بڑی دھوم دھام اور شان وشکوہ کے ساتھ ادا ہوئی۔ خلیفہ حکم ثانی نے اپنا لقب مستنصر باللہ تجویز کیا۔ جعفر مصحفی کو اپنا حاجب مقرر کیا۔

نظم ونسق کا جائزہ:

اس کے بعد خلیفہ حکم نے سلطنت کے تمام صیغوں اور محکموں کا جائزہ خصوصی توجہ کے ساتھ لیا۔ ہر ایک وزیر کے دفتر کا معائنہ کیا۔ فوج کے رجسٹروں کو جانچا اور افواج شاہی کی موجودات لی۔ غرض نہایت احتیاط کے ساتھ سلطنت کی جزئیات تک سے اپنے آپ کو واقف وآگاہ بنایا۔ حالانکہ وہ پہلے سے بھی سلطنت کے کاموں سے ناآشنا نہ تھا اور ہر صیغہ کی نگرانی کر چکا تھا۔ اپنے علم و واقفیت کی تجدید کر لینے کے بعد اس نے ہر ایک اہل کار کے پاس اس کے مامور و مستقل ہونے کے پروانے روانہ کیے۔ گویا ہر ایک اہل کار کو اس نئے خلیفہ نے از سر نو اس کی خدمت پر مامور کیا۔ اس طرز عمل سے نئے خلیفہ کی بیدار مغزی اور مستعدی کا سکہ دلوں پر بیٹھ گیا۔

سرحدی عیسائی سلاطین کی بغاوتیں:

خلیفہ حکم کو بچپن سے کتابیں پڑھنے اور علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر کا ایک بڑا حصہ گزر چکا تھا۔ بڑے بڑے علماء وفضلاء اس کے سامنے کوئی علمی تقریر کرتے

ہوئے گھبراتے تھے۔ دنیا کے کسی ملک اور کسی تخت سلطنت پر غالباً ایسا ذی علم اور متبحر بادشاہ نہیں بیٹھا۔حکم ثانی کے علم وفضل اور مطالعہ کتب کی حکایتیں چونکہ پہلے ہی سے دور دور تک مشہور تھیں، اس لیے اس کے تخت نشین ہونے کی خبر سن کر عیسائی سرحدی سلاطین کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنے باپ کی طرح ایک بہادر صعوبت کش سپہ سالار ثابت نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ انہوں نے سرکشی اور طغیان کا اظہار کیا۔

بادشاہ قسطلہ نے اسلامی سرحدی شہروں پر دست درازی وحملہ آوری شروع کر دی۔ خلیفہ حکم نے یہ حال سن کر اپنی تخت نشینی کے پہلے ہی سال میں بہ ذات خود قسطلہ کی جانب فوج کشی کی اور عیسائیوں کو شکست فاش دے کر جلیقیہ کے ملک میں دور تک داخل ہو کر اور اقرار اطاعت لے کر واپس آیا۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ جلیقیہ کے سرکش عیسائی اس تنبیہ کو کافی نہ سمجھ کر شورش وفساد پر پھر آمادہ ہیں۔ چنانچہ خلیفہ حکم نے اپنے آزاد کردہ غلام غالب کو سپہ سالار افواج سرحد بنا کر روانہ کیا اور جلیقیہ والوں کی سرکوبی کے لیے تاکید کر دی۔ غالب نے پہنچ کر عیسائی افواج کو اپنی فوج سے کئی گنا زیادہ دیکھا مگر اس نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے حملہ کیا۔ سب کو شکست فاش دے کر بھگایا اور حکومت قسطلہ کے ایک بڑے حصے کو تاراج اور قلعوں کو منہدم کر کے قرطبہ کی جانب واپس ہوا۔

ابھی چند ہی روز گزرے ہوں گے کہ شانجہ کے باغی ہونے کی خبر پہنچی۔ اس کی مدد کے لیے لیون، نوار اور قسطلہ وغیرہ کئی عیسائی حکومتوں کی فوجیں مجتمع ہو گئیں۔ خلیفہ حکم نے یعلیٰ بن محمد حاکم سرقسطہ کو لکھا کہ تم ان باغیوں کی سرکوبی کا کام انجام دو۔ چنانچہ یعلیٰ بن محمد نے تنہا ان افواج گراں کا مقابلہ بڑی بہادری اور قابلیت کے ساتھ کیا اور سب کو شکست دے کر خلیفہ حکم کی خدمت میں مع مال غنیمت حاضر ہوا۔ یعلیٰ بن محمد ابھی قرطبہ ہی میں فروکش تھا کہ حاکم برشلونہ کے باغی ہونے کی خبر پہنچی اور ساتھ ہی معلوم ہوا کہ حاکم قسطلہ بھی پھر سامان بغاوت فراہم کر رہا ہے۔ خلیفہ حکم نے یعلیٰ بن محمد کو برشلونہ کی جانب روانہ کیا اور غالب و ہذیل بن ہاشم کو حاکم قسطلہ کی سرکوبی پر مامور کیا۔ دونوں فوجیں برشلونہ وقسطلہ کی جانب روانہ ہوئیں اور دونوں جگہ عیسائیوں کو سخت نقصان اٹھا کر اقرار اطاعت پر مجبور ہونا پڑا۔

خلیفہ حکم کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں جب عیسائیوں کو پیہم ناکامیاں ہوئیں تو ان کی

ہمتیں پست ہو گئیں اور ان کو یقین ہو گیا کہ خلیفہ حکم ثانی اپنے باپ سے کسی طرح عزم وقوت میں کم نہیں۔ سنہ ۳۵۴ھ میں ایک مرتبہ پھر سرحدی عیسائیوں میں کشمکش اور سرکشی کے حالات نمایاں ہوئے مگر یعلٰی بن محمد اور قاسم بن مطرف نے سب کو سیدھا کر دیا۔ اسی سال نارمن لوگوں نے جزیرہ نمائے اندلس کے مغربی ساحل پر حملہ کر کے شہر بشونہ (بسن) کے نواح میں تاخت و تاراج شروع کی۔ خلیفہ کو جب اس کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے امیر البحر عبدالرحمٰن بن رباحس کو حکم دیا کہ ان قزاقوں کو بھاگنے نہ دے اور خود قزاقوں کو خشکی اور سمندر سے وہاں کے باشندوں نے مقابلہ کر کے بھگا دیا تھا۔ نہ خشکی میں کوئی شخص نظر آیا، نہ ان کا کوئی جہاز ساحل پر موجود پایا گیا۔

عیسائی بادشاہوں کی مرعوبیت:

شانجہ کا چچازاد بھائی اردونی جو فرڈی نند حاکم قسطلہ کا داماد بھی تھا، ریاست لیون کا فرماں روا تھا۔ جب شانجہ کو خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کی فوجوں نے لیون کا حاکم بنا دیا تو اردونی اپنے خسر فرڈی نند کے پاس چلا گیا تھا۔ اب اردونی نے جلیقیہ سے اپنے بیس ہمراہیوں کے ساتھ خلیفہ حکم کی خدمت میں حاضر ہونے اور فریاد کرنے کا قصد کیا۔ چنانچہ سنہ ۳۵۵ھ میں اردونی شاہ لیون شہر سالم میں مع اپنے ہمراہیوں کے پہنچا تو امیر غالب محافظ حدود شمالی نے اس کو روکا اور کہا کہ تم ممالک محروسہ اسلامیہ میں بلا اطلاع و اجازت کیسے داخل ہوئے؟ اردونی سابق بادشاہ لیون نے کہا کہ میں امیر المومنین کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ میں اپنے آقا کے پاس جاتا ہوں۔ میں نے کسی اجازت اور اطلاع کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تاہم غالب نے اس کو وہیں شہر سالم میں روک کر دربار خلافت کو اطلاع دی۔ یہاں سے اردونی کے آنے کی اجازت مرحمت ہوئی اور ساتھ ہی اس کے استقبال کے لیے ایک سردار کو روانہ کر دیا گیا۔

جب اردونی شہر قرطبہ کے قریب پہنچ گیا اور شہر میں داخل ہونے کے بعد وہ خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کی قبر کے سامنے پہنچا تو خود بہ خود فوراً گھوڑے سے اتر کر قریب پہنچا اور دیر تک دعا کرتا رہا اور قبر کو سجدہ کر کے آگے روانہ ہوا۔ خلیفہ حکم نے اردونی کو اجازت دی کہ وہ سفید لباس پہن کر، جو بنوامیہ میں عزت کا لباس سمجھا جاتا تھا، داخل دربار ہو۔ شہر طیطلہ کا اسقف عبداللہ بن قاسم اور قرطبہ کے عیسائیوں کا مجسٹریٹ ولید بن خیرون اس کے ہمراہ برائے ادب آموزی و رہبری موجود تھے۔ اردونی جب دربار میں حاضر ہوا تو خلیفہ کے سامنے پہنچنے سے پہلے ہی اس مکان کی عظمت و ہیبت

سے مرعوب ہو کر اور ٹوپی اتار کر دیر تک ششدر کھڑا رہا۔ ہمراہیوں نے آگے بڑھنے کے لیے اشارہ کیا۔ جب تخت کے سامنے پہنچا تو بے اختیار سجدہ میں گر پڑا، پھر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر کسی قدر آگے بڑھا اور پھر سجدہ میں گر پڑا۔ اسی طرح سجدہ کرتا ہوا اس مقام تک پہنچا جو اس کے لیے مقرر کیا گیا تھا اور اسی کرسی پر جو اس کے لیے بچھائی گئی تھی، بیٹھا۔ اب اس نے ولید بن خیرون کے اشارے پر کئی مرتبہ بولنے کی کوشش کی۔ اس پر اس قدر رعب تھا کہ کچھ نہ بول سکا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر خلیفہ حکم کچھ دیر خاموش رہا تا کہ اس کو اپنے حواس درست کرنے کا موقع ملے، پھر اس کے بعد خلیفہ نے کہا کہ:

> ''اے اردون! ہم تیرے یہاں آنے سے بہت خوش ہوئے، ہمارے الطاف خسروانہ سے تیری خواہشات پوری ہوں گی۔''

اردونی نے خلیفہ کا یہ کلام سن کر فرط مسرت سے اٹھ کر تخت کے سامنے سجدہ کیا اور نہایت عاجزی سے عرض کیا ''اے میرے آقا! میں حضور کا ادنیٰ غلام ہوں'' خلیفہ نے فرمایا کہ ''ہم تجھ کو خیر خواہان دولت میں شمار کرتے ہیں اور تیری درخواستوں کو منظور کرتے ہیں۔ اگر کوئی خواہش ہو تو بیان کر۔'' اردون یہ سن کر پھر دیر تک تخت کے سامنے سجدہ میں پڑا رہا اور اس کے بعد نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ شانجہ میرا چچا زاد بھائی اس سے پہلے سابق خلیفہ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوا تھا کہ اس کا کوئی یار و مددگار نہ تھا اور رعایا اس سے خوش نہ تھی۔ خلیفہ مرحوم نے اس کی التجا سنی اور اس کو بادشاہ بنا دیا۔ میں نے خلیفہ مرحوم کے حکم اور فیصلے کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی اور ملک چھوڑ دیا۔ حالانکہ رعایا مجھ سے خوش تھی۔ میں اس وقت اپنے دلی جوش اور عقیدت کے ساتھ حاضر ہوا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ خلیفہ وقت میرے استحقاق پر نظر کر کے میرا ملک مجھ کو مرحمت فرمائیں گے۔ خلیفہ نے یہ سن کر فرمایا کہ ہم تیرا مدعا سمجھ گئے ہیں۔ اگر شانجہ کے مقابلے میں تیرا استحقاق فائق ہے تو ضرور ملک تجھ کو ملے گا۔ یہ سن کر اردونی نے پھر سجدہ کیا۔[1] خلیفہ نے دربار برخاست کیا

[1] ایسا اس نے شائد خلیفہ اور دربار میں موجود مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور خلیفہ کی شرکیہ انداز میں تعظیم کرنے کے لیے کیا تھا۔ خود خلیفہ کی ذات پر بھی حرف آتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اردونی کا قبر کو سجدہ کرتے ہوئے اور خود کو یعنی خلیفہ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھتا رہا اور اس نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ علماء بھی وہاں موجود ہوں گے اور دیگر مسلمان بھی۔ کسی کو غیرت نہ آئی کہ سجدہ تو صرف اللہ وحدہ لاشریک لۂ کو کرنا ہے۔ اگر یہ روایت درست ہے تو پھر یہ کیسا بے روح خلیفہ تھا جو یہ سب کچھ ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔

اور اردونی کو اس کی قیام گاہ پر عزت و آرام کے ساتھ پہنچا دیا گیا۔ اردونی کو قصر سلطان کے ایک مغربی حصے کے بالا خانے پر ٹھہرایا گیا تھا۔ وہاں جاتے ہوئے راستے میں اردونی نے ایک تخت بچھا ہوا دیکھا، جس پر خلیفہ کبھی کبھی بیٹھ جاتا تھا۔ اس خالی تخت کو دیکھ کر اردونی نے اسی طرح سجدہ کیا کہ گویا خلیفہ اس پر بیٹھا ہے۔ اس کے بعد خلیفہ کے وزیراعظم جعفر نے آ کر اردونی کو خلیفہ کی طرف سے ایک مکلّف خلعت دیا۔ اس طرح چند روز مہمان رکھ کر اپنے چند سرداروں کے ساتھ روانہ کیا کہ اس کو آبائی ریاست میں تخت نشین کر آئیں۔ اس کے بعد شانجہ اور سمورہ وجلیقیہ کے رئیسوں نے بھی عرضیاں اظہار فرماں برداری کے لیے روانہ کیں اور بیش بہا تحفے بہ طور نذرانہ کیے۔ برشلونہ وطرکونہ کے حاکموں نے بھی قیمتی نذرانے اور خراج روانہ کر کے اظہار عقیدت کیا۔

اس کے بعد فرانس، اٹلی اور یورپ کے دوسرے عیسائی سلاطین نے جس طرح وہ خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کی خدمت میں اپنے سفیر اور تحائف بھیجتے تھے، بھیجے اور خلیفہ حکم کا رعب بھی اپنے باپ کی طرح قائم ہو گیا۔ مغربی جلیقیہ کے عیسائی فرماں روا نے، جو ان دنوں بہت طاقتور تھا اور جس کا نام لرزیق تھا، اپنی ماں کو خلیفہ حکم کی خدمت میں روانہ کیا۔ خلیفہ نے مادر لرزیق کو عزت کے ساتھ دربار میں باریاب کیا اور اس کی خواہش کے موافق اس کے بیٹے کے لیے سند امارت وحکومت لکھ دی۔

مراکش کے حاکم کی بغاوت:

سنہ ۳۱۶ھ میں مراکش کے ادریسی حاکم نے جو خلیفہ قرطبہ کی طرف سے وہاں مامور تھا، بربریوں کی جمعیت کثیر فراہم کر کے سرکشی وخود مختاری کا اعلان کیا۔ خلیفہ نے سرقسطہ کے حاکم یعلٰی بن امیہ کو مراکش کی جانب روانہ کیا۔ اندلسی فوج کشی کا حال سن کر حاکم مراکش نے معز عبیدی سے اعانت طلب کی اور اس کی فرماں برداری واطاعت کو قبول کر لیا۔ ادھر سے امیر جوہر فوج لے کر مراکش پہنچ گیا۔ معرکہ کارزار گرم ہوا۔ یعلٰی بن محمد اس معرکہ میں کام آیا اور یہ مہم ناکام رہی۔

اس خبر کو سن کر دربار قرطبہ میں فکر وملال کے آثار نمایاں ہوئے۔ خلیفہ نے اپنے آزاد کردہ غلام امیر غالب کو مراکش روانہ کیا۔ غالب کے پہنچنے پر جوہر تو مصر کی طرف چل دیا اور حسن حاکم مراکش مقابلہ پر آمادہ ہوا۔ کئی معرکوں کے بعد غالب نے حسن کو ایک قلعہ میں محصور کر کے اس بات پر مجبور

کرلیا کہ وہ بلاشرط اپنے آپ کو غالب کے سپرد کردے۔ چنانچہ غالب نے حاکم مراکش کو قرطبہ روانہ کیا۔ خلیفہ نے اس کے ساتھ عزت ومحبت کا برتاؤ کیااور بہ طور مہمان قرطبہ میں مقیم کرکے روزینہ مقرر کردیا۔ چند روز کے بعد اس کی خواہش کے موافق اسے اسکندریہ کی جانب بھیج دیا۔ غالب نے ایک سال مراکش میں قیام کرکے وہاں کے تمام انتظام کو مضبوط ومکمل کیااور سنہ ۳۶۴ھ میں مراکش کے بہت سے قیدیوں کو ہمراہ لیے ہوئے قرطبہ واپس آیا۔ جہاں اس کا بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔

ولی عہدی:

سنہ ۳۶۵ھ میں اس خلیفہ نے اپنے بیٹے ہشام کو ولی عہد خلافت بنا کر امراء و وزراءاور ارا کین سلطنت سے بیعت لی اور تمام ممالک محروسہ میں عالموں سے بیعت ولی عہدی وکالتاً لی گئی۔

وفات:

۲ ماہ صفر سنہ ۳۶۶ھ کو سولہ سال کی حکومت کرنے کے بعد ۶۴ سال کی عمر میں خلیفہ ثانی نے بہ عارضہ فالج قرطبہ میں وفات پائی۔اس کی وفات کے وقت اس کے بیٹے ہشام کی عمر گیارہ سال کے قریب تھی۔خلیفہ حکم ہی نے ولی عہدی کے وقت اس کا وزیر محمد بن ابی عامر کو تجویز کردیا تھا۔اگلے روز ہشام تخت نشین ہوا۔

خلیفہ حکم ثانی کے دور پر تبصرہ:

خلیفہ حکم ثانی اندلس کے نہایت نامور اور مشہور علماء میں شمار ہوتا ہے۔اگر اس خلیفہ کے زمانے میں لڑائیوں اور چڑھائیوں کا زیادہ موقع ہوتا تو وہ یقیناً اعلیٰ درجہ کا سپہ سالار ثابت ہوتا مگر اس کے عہد حکومت میں جنگ وجدل کے بہت ہی کم مگر بہت اہم ہنگامے برپا ہوئے۔جن میں عموماً لشکر اندلس کو کامیابی اور فتح مندی حاصل ہوئی۔

اس خلیفہ کا زیادہ وقت علمی مشاغل میں صرف ہوا۔اس خلیفہ کا وزیر جعفر بھی ہارون الرشید کے وزیر جعفر برمکی سے کم لائق نہ تھا۔خلیفہ نے ملکی انتظام کے متعلق اس کے اختیارات کو وسیع کرکے اپنے لیے علمی مشاغل کا بہت کچھ وقت نکال لیا تھا۔اس خلیفہ کے زمانے میں مذہبی بے جا تعصب بالکل نہ رہا تھا۔ہر قوم و مذہب کے آدمی کو اندلس میں کامل آزادی حاصل تھی۔تنگ دلی اور پست

خیالی کا نام ونشان دربار قرطبہ میں نہیں پایا جاتا تھا۔ عدل وانصاف کو قائم رکھنے کا اس خلیفہ کو بہت زیادہ خیال تھا۔ تمام رعایا خلیفہ سے خوش اور ہر طبقہ میں اس کی محبت وعظمت بے شائبہ ریا موجود تھی۔

خلیفہ احکام قرآنی کا سختی سے پابند تھا اور مسلمانوں سے اس کی پابندی کراتا تھا۔ اس سے پہلے اندلس کے فوجی لوگوں میں شراب نوشی کا عیب بھی پایا جانے لگا تھا۔ اس خلیفہ نے شراب کا بنانا، بیچنا، استعمال کرنا قطعاً ممنوع اور جرم عظیم قرار دے کر اس پلیدی سے اپنے ملک کو پاک کیا۔ خلیفہ کی طرف سے ایک بڑی رقم روزانہ خیرات کی جاتی تھی۔ جابجا ملک کے بڑے بڑے شہروں میں کالج اور دارالعلوم قائم کیے۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہات میں بھی مدرسے قائم تھے۔ طلباء کے اکثر مصارف شاہی خزانہ سے ادا ہوتے تھے۔ جو طالب علم باہر سے آتے تھے، وہ جب تک اندلس کے اندر تحصیل علم میں مصروف رہیں، خلیفہ کے مہمان سمجھے جاتے تھے۔ سررشتہ تعلیم کا اعلیٰ افسر خلیفہ نے اپنے بھائی منذر کو مقرر کیا تھا۔

حکم ثانی کا ذوق علمی:

خلیفہ حکم ثانی کو تمام علوم مروجہ میں دست گاہ حاصل تھی۔ کتابوں سے اس کو بہت جنون تھا۔ دمشق، بغداد، قسطنطنیہ، قاہرہ، قیروان، مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ وغیرہ ان تمام مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا، خلیفہ حکم کے گماشتے موجود رہتے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ جو اچھی نایاب کتاب پائیں، اس کو خریدیں اور خلیفہ حکم کے پاس بھیج دیں۔ مصنفین کو ترغیب دیں کہ وہ اپنی تصنیف کی پہلی کتاب خلیفہ کے پاس بھیجیں۔ علماء کو قرطبہ جانے کی ترغیب دیں، جہاں ان کی فراخ دلی کے ساتھ قدر و منزلت بڑھائی جاتی تھی اور وہ مال و دولت سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔ کسی کتاب کو حاصل کرنے میں چاہے کتنی ہی مصیبت برداشت کرنی پڑے اور اشرفیوں کی چاہے کتنی ہی تھیلیاں خالی کرنی پڑیں، حکم کے کتب خانے کے لیے وہ کتاب ضرور ہی خریدی جاتی تھی۔ ہر ایک شہر میں خلیفہ حکم کی طرف سے لوگ صرف اسی کام پر متعین تھے کہ وہ کتابوں کی نقلیں کر کے قرطبہ میں بھیجیں۔ دنیا کے تمام بادشاہوں سے خلیفہ حکم کے مراسم تھے اور ان سب کو شاہی کتب خانوں میں نقل کرنے والے لوگ خلیفہ حکم کی طرف سے موجود رہتے تھے کہ تمام نایاب کتابوں کی نقلیں حاصل کریں۔

روئے زمین کے ہر ایک ملک اور ہر ایک شہر میں اس بات کی شہرت ہو گئی تھی کہ قرطبہ کا خلیفہ

سب سے زیادہ مصنفین کا قدردان ہے۔اس لیے بہت سے ایسے مصنفین تھے جو بغداد یا بصرہ وغیرہ میں رہتے تھے مگر اپنی کتابیں خلیفہ حکم کے نام سے معنون کر کے دربار قرطبہ میں بھیجتے تھے۔ یونانی اور عبرانی کتابوں کے ترجمے کرانے کے لیے سینکڑوں، ہزاروں علماء کا ایک زبردست محکمہ بنا دیا تھا۔ اندلس بالخصوص قرطبہ کے ہر ایک شریف آدمی کو کتاب کا شوق ہو گیا تھا اور ہر گھر میں ایک کتب خانہ موجود ملتا تھا۔ صرف قرطبہ ہی میں نہیں بلکہ اندلس کے ہر ایک بڑے شہر میں ایک بڑا کتب خانہ سرکاری اہتمام سے موجود ومہیا تھا۔ ہر ایک شخص جو امیر المومنین کی خدمت میں عزت ورسوخ حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ کوئی نایاب اور مفید کتاب بہ طور ہدیہ لے کر حاضر ہوتا تھا۔

حکم کا ذاتی کتب خانہ:

خلیفہ حکم کا ذاتی کتب خانہ اس قدر عالی شان تھا کہ اس کی عمارت قصر شاہی سے کم وسیع وشاندار نہ تھی۔ اس کتب خانے کی عمارت کو سنگ مرمر سے بنایا گیا تھا۔ سنگ مرمر ہی کا خوبصورت فرش تھا، جس پر سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کی پچی کاری تھی۔ صندل، آبنوس اور اسی قسم کی قیمتی لکڑیوں کی الماریاں تھیں۔ ہر ایک الماری پر سنہرے حرفوں سے لکھا ہوا تھا کہ کس علم وفن کی کتابیں ہیں۔ اس دارالکتب میں ہزارہا جلد ساز اور کاتب مصروف کار رہتے تھے۔ کتابوں کی تعداد چھ لاکھ کے قریب تھی۔

کتب خانہ کی فہرست:

فہرست کتب چوالیس جلدوں میں تھی۔ اس فہرست میں صرف کتاب اور مصنف کا نام درج تھا۔ ان کتابوں میں بہت ہی کم کتابیں ہوں گی جن کو خلیفہ وقت حکم نے مطالعہ نہ کیا تھا۔ قریباً ہر ایک پر خلیفہ کے قلم سے لکھے ہوئے حواشی تھے۔ ہر ایک کتاب کے پہلے ورق پر خلیفہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا مصنف اور کتاب کا نام اور مصنف کا شجرہ نسب درج ہوتا تھا۔ خلیفہ حکم کی قوت حافظہ بہت زبردست تھی۔ ساتھ ہی وہ اعلیٰ درجہ کا ذہین ونقاد بھی تھا۔ ہر قسم کی نظم ونثر بلا تکلف لکھتا تھا۔

حکم کی تصنیف:

فن تاریخ سے اس خلیفہ کو بہت شوق تھا۔ اندلس کی ایک تاریخ اس خلیفہ نے خود لکھی تھی۔ مگر وہ زمانہ کی دست برد سے ضائع ہو گئی۔ روئے زمین کے علماء خواہ وہ کسی قوم اور کسی مذہب اور کسی علم وفن سے تعلق رکھتے ہوں، قرطبہ کی طرف کھنچ کھنچ کر چلے آئے تھے۔ غرض یہ کہ خلیفہ حکم کے زمانے

میں قرطبہ تمام علوم وفنون کا ایک ہی لانظیر مرکز تھا۔

مشاہیر علماء اور اہل کمال کی قدردانیاں:

ابوعلی قالی بغدادی مصنف کتاب الامالی، عبدالرحمٰن ثالث کے عہد میں وارد اندلس ہوا تھا۔ سلطان حکم اس بے نظیر عالم کو ایک دم کے لیے اپنے پاس سے جدا نہ کرتا تھا۔ ابوبکر الارزق جو اپنے زمانے کے مشہور عالم اور سلمہ بن عبدالملک بن مروان کے خاندان سے تھا، سنہ ۳۴۹ھ میں قرطبہ پہنچا اور ۵۸ سال کی عمر میں ماہ ذیقعدہ سنہ ۳۸۵ھ میں فوت ہو کر قرطبہ میں مدفون ہوا۔ خلیفہ حکم اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اسماعیل بن عبدالرحمٰن بن علی جو ابن زمع کے خاندان سے تھا، قاہرہ سے اندلس آیا اور خلیفہ حکم کے علمائے دربار میں شامل ہوا۔ ثقر البغدادی اور قیاس بن عمرو غیرہ مشہور خوشنویس تھے، جن کی خلیفہ حکم بڑی قدر کرتا تھا۔ ابوالفرج اصفہانی اور ابوبکر مالکی کے پاس ایک ایک ہزار دینار سرخ خلیفہ نے بھیجے۔ ابوعبداللہ محمد بن عبدون عذری دربار قرطبہ کا اعلیٰ درجہ کا طبیب تھا۔ محمد بن مفرج فقہ اور حدیث کا مشہور عالم تھا۔ ابن مغیث، احمد بن عبدالملک، ابن ہشام القوی، یوسف بن ہارون، ابوالولید یونس اور احمد بن سعید ہمدانی مشہور شعراء تھے۔ محمد بن یوسف درانی نے خلیفہ حکم کے حکم سے افریقہ کی تاریخ مع جغرافیہ لکھی تھی۔ عیسیٰ بن محمد، ابوعمر احمد بن فرج، یعیش بن سعید خلیفہ حکم کے عہد میں مشہور مورخ اور زبردست عالم تھے جو دربار قرطبہ کی رونق تھے۔

علم نوازی کی مثال:

خلیفہ حکم کی علم دوستی اور عالم نوازی کی ایک حکایت قابل تذکرہ ہے کہ ایک روز ابوابراہیم نامی ایک فقیہ مسجد ابوعثمان میں وعظ بیان کر رہا تھا۔ اسی حالت میں شاہی چوب دار آیا اور اس نے ابوابراہیم سے کہا کہ امیرالمومنین نے آپ کو اسی وقت بلایا ہے اور وہ باہر انتظار کر رہے ہیں۔ ابوابراہیم نے کہا کہ تم امیرالمومنین سے کہہ دو کہ میں اس وقت اللہ کے کام میں مصروف ہوں۔ جب تک اس کام سے فارغ نہ ہولوں، نہیں آ سکتا۔ چوب دار اس جواب کو سن کر حیران رہ گیا اور ڈرتے ڈرتے جا کر خلیفہ کی خدمت میں ابوابراہیم کا جواب عرض کیا۔ خلیفہ حکم نے سن کر چوب دار سے کہا کہ تم جا کر ابوابراہیم سے کہہ دو کہ میں اس بات کو سن کر بہت خوش ہوا کہ آپ اللہ کے کام میں مصروف ہیں۔ جب اس کام سے فارغ ہو جائیں تو تشریف لائیں۔ میں اس وقت تک دربار میں

آپ کا منتظر رہوں گا۔ چوب دار نے یہ پیغام آ کر ابوابراہیم کو سنایا۔ ابوابراہیم نے کہا کہ تم جا کر امیرالمومنین سے کہہ دو کہ میں بڑھاپے کی وجہ سے گھوڑے پر سوار ہوسکتا ہوں نہ پیدل چل سکتا ہوں۔ باب السدہ یہاں سے زیادہ دور ہے مگر باب الصنع یہاں سے قریب ہے۔ اگر باب الصنع کو کھول دینے کی اجازت دیں تو میں اس دروازے سے بہ آسانی حاضر دربار ہوسکوں گا۔ باب الصنع ہمیشہ بند رہتا تھا اور کسی خاص موقع پر ہی اس کے کھولنے کی اجازت ہوتی تھی۔ ابوابراہیم اس کے بعد پھر اپنے وعظ میں مصروف ہوگیا اور چوب دار یہ پیغام بھی خلیفہ تک پہنچا کر خلیفہ کے حکم سے آ کر مسجد میں بیٹھ گیا۔ جب ابوابراہیم اپنا وعظ ختم کر چکا تو چوب دار نے عرض کیا کہ باب الصنع آپ کے لیے کھول دیا گیا ہے اور امیرالمومنین آپ کے منتظر ہیں۔ ابوابراہیم جب باب الصنع پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں امراء و وزراء اس کے استقبال کے لیے موجود ہیں۔ دربار میں گیا اور خلیفہ سے باتیں کر کے اسی دروازے سے عزت واحترام کے ساتھ واپس آیا۔

حکم کے عہد حکومت کی امتیازی خصوصیت:

حکم ثانی کو فی الواقع اندلس کا سب سے بڑا خلیفہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے زمانے میں رعب و وقار سلطنت، امن وامان ملک، وسعت وسلطنت، سرسبزی وشادابی، مال و دولت، تجارت وغیرہ چیزیں اپنے معراج کمال کو پہنچی ہوئی تھیں اور سب سے زیادہ قابل تعریف اور قابل توجہ چیز علم وتعلم کی گرم بازاری تھی۔ علم کا آفتاب قرطبہ کے آسمان پر نصف النہار کو پہنچا ہوا تھا اور یہ وہ فخر ہے کہ خلیفہ حکم ثانی کے مقابلہ میں ہارون و مامون ومنصور بھی پیش نہیں کر سکتے۔ خلیفہ حکم عالم بادشاہوں اور علم پرور سلاطین انجمن کا صدراعظم ہونے کی وجہ سے فرماں روایان عالم میں خصوصی امتیاز رکھتا ہے لیکن حیرت واستعجاب کی کوئی انتہا باقی نہیں رہتی جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ ایسے ذی علم، ایسے ذی ہوش، ایسے عقلمند خلیفہ کے تمام علم وعقل کو محبت پدری نے مغلوب کر لیا اور اس نے اپنے ایسے بیٹے کو اپنا جانشین تجویز کیا جو اس کی وفات کے وقت صرف گیارہ سال کی عمر رکھتا تھا۔ اس وقت خلافت وسلطنت میں وراثت کو دخل دینے کی غلطی سے محفوظ رہنے کی توقع اگر ہوسکتی تھی تو حکم ثانی جیسے سمجھ دار خلیفہ ہی سے ہوسکتی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ وہ اس معاملہ میں کامیاب ثابت نہیں ہوا اور مامون الرشید عباسی اس سے بازی لے گیا۔ اس نے اول تو اپنے خاندان کی بھی پرواہ نہیں کی اور

ایک علوی کو اپنا ولی عہد بنایا لیکن جب وہ ولی عہد خلافت مامون کے سامنے ہی فوت ہو گیا تو اس کے بعد اس کا بھائی معتصم اس کا جانشین ہوا۔

خلیفہ حکم ثانی کا بھائی مغیرہ ہر ایک اعتبار سے حکومت و سلطنت کی قابلیت رکھتا اور حکم ثانی کا صحیح جانشین ہو سکتا تھا مگر حکم ثانی نے مغیرہ کو محروم رکھ کر اپنے نابالغ بیٹے کو ولی عہد بنا کر اپنے آپ کو خلفائے اندلس کا آخری خلیفہ بنایا۔ حکم کے بعد بھی برائے نام خاندان بنوامیہ میں چند روز خلافت و حکومت رہی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حکم ثانی کے فوت ہوتے ہی بنوامیہ کی حکومت و خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ خلیفہ حکم نے اپنے بیٹے کو ولی عہد خلافت بناتے ہوئے محمد بن ابی عامر کو اس کا اتالیق تجویز کر دیا تھا لیکن اس اتالیقی یا وزارت کا تعلق شہزادہ ہشام کی جاگیر اور اس کے عہد ولی عہدی ہی سے تھا۔ یہ مطلب نہ تھا کہ ہشام بن حکم تخت نشین خلافت ہونے کے بعد بھی محمد بن ابی عامر کو اپنا وزیر بنائے اور عہدہ حجابت عطا کرے کیونکہ ایک خلیفہ کے فوت ہونے سے اس کے حاجب کا معزول ہونا ضروری نہ تھا، جب تک نیا خلیفہ اس کو معزول نہ کر دے۔

ہشام ثانی بن حکم ثانی اور منصور محمد بن ابی عامر

سنہ ۳۶۶ھ میں جبکہ خلیفہ حکم ثانی فوت ہوا اور اس کا بیٹا ہشام ثانی گیارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا ہے تو خلافت اسلامیہ اندلس میں مندرجہ ذیل اشخاص سب سے زیادہ طاقتور اور قابو یافتہ تھے:

۱۔ جعفر بن عثمان مصحفی حاجب السلطنت یا وزیر اعظم، یہ خلیفہ حکم کے عہد حکومت سے وزارت عظمیٰ کے اعلیٰ عہدہ پر مامور چلا آتا تھا۔ ذی علم، علم دوست اور سب سے زیادہ معزز شخص سمجھا جاتا تھا۔

۲۔ ملکہ صبح، یہ حکم ثانی کی عیسائی بیوی اور ہشام بن حکم کی ماں تھی۔ خلیفہ حکم ثانی کے عہد حکومت میں بھی یہ اکثر امور سلطنت کے اندر دخیل اور قابو یافتہ تھی۔ خلیفہ حکم کو اس کی خاطر بہت عزیز تھی۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ولی عہد خلافت کی ماں تھی۔ ساتھ ہی بہت عقلمند اور چالاک عورت تھی۔

۳۔ غالب، یہ سپہ سالار اعظم افواج اسلامیہ اندلس تھا۔ خلیفہ حکم ثانی کا آزاد کردہ غلام تھا۔ اس کے

ساتھ فوج کے سپاہیوں اور شہروں کے باشندوں کو محبت تھی۔

۴۔ محمد بن ابی عامر بن محمد بن عبداللہ بن عامر بن محمد ولید بن یزید بن عبدالملک معافری۔ اس کا جد اعلیٰ عبدالملک معافری، طارق بن زیاد فاتح اول کے ہمراہ وارد اندلس ہوا تھا۔ محمد بن ابی عامر، ہشام بن حکم کا اتالیق اور ملکہ صبح کی حمایت و اعانت رکھتا تھا۔

۵۔ فائق خواجہ سرا، یہ قصر سلطانی کے محافظ دستہ کا افسر اور توشہ خانہ کا داروغہ تھا۔

۶۔ جوذر خواجہ سرا، یہ شہر قرطبہ کے تمام بازاروں کا نگران یا کوتوال شہر تھا۔ موخر الذکر دونوں خواجہ سرا اس قدر قابو یافتہ تھے کہ بڑے بڑے امراء ان سے ڈرتے اور ان کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

اراکین دولت کے مشورے:

جب خلیفہ حکم ثانی کا انتقال ہوا تو فائق و جوذر کے سوا اور کوئی اس وقت موجود نہ تھا۔ ان دونوں نے خلیفہ کے انتقال کے بعد مشورہ کیا کہ شہزادہ ہشام کی تخت نشینی حکومت اسلامیہ کے لیے خطرہ سے خالی نہیں۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ خلیفہ حکم کے بھائی مغیرہ کو تخت نشین کیا جائے کیونکہ وہ بار خلافت کے تحمل کی قوت و قابلیت رکھتا ہے۔ جوذر کی رائے یہ تھی کہ وزیراعظم جعفر مصحفی کو سب سے پہلے قتل کر دیا جائے تاکہ مغیرہ کی تخت نشینی میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ مگر فائق نے کہا کہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم وزیر مصحفی کے سامنے اپنا خیال بیان کریں اور اس کو اپنا ہم خیال بنائیں۔ بہت زیادہ ممکن ہے کہ جعفر ہمارا ہم خیال ہو جائے۔ اگر وہ ہم خیال نہ ہوا تو پھر اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس تجویز کے موافق وزیر جعفر کو طلب کیا گیا۔ جب وزیر آ گیا تو اس کو خلیفہ کے فوت ہونے کی اطلاع دے کر ان دونوں نے اپنی رائے پیش کی۔ وزیر فوراً موقع کی نزاکت کو تاڑ گیا اور اس نے کہا کہ میں آپ دونوں کی رائے کے موافق ہی عمل کروں گا۔ مگر دوسرے اراکین سلطنت کو بھی اس مشورہ میں شریک کر لینا ضروری ہے۔ اس طرح ان دونوں کو دھوکا دے کر وہاں سے نکل آیا اور اپنے مکان پر آتے ہی اس نے ارکان و اعیان سلطنت کو طلب کیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو خلیفہ کی وفات کا حال سنا کر فائق و جوذر کی رائے کا اظہار کیا اور کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ اسی وقت مغیرہ اور حکم کو قتل کر دیا جائے تاکہ ہر ایک فتنے کا سد باب ہو جائے۔ اس کو سن کر سب نے پسند تو کیا مگر

اس بے گناہ کو قتل کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ آخر محمد بن ابی عامر اٹھا اور اس نے کہا کہ میں اس کام کو انجام دیتا ہوں۔ جب محمد بن ابی عامر، مغیرہ کے مکان پر پہنچا تو وہ سو رہا تھا۔ اس کو ابھی تک اپنے بھائی کے فوت ہونے کا حال معلوم نہ تھا۔ بیدار ہو کر جب اس نے محمد بن ابی عامر سے اس حادثہ کا حال سنا تو بہت غمگین ہوا اور اپنے بھتیجے ہشام کی اطاعت کا اقرار اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی آمادگی ظاہر کی۔ محمد بن ابی عامر نے یہ رنگ دیکھ کر اور مغیرہ کو بالکل بے ضرر محسوس کر کے جعفر مصحفی کے پاس خبر بھیجی کہ مغیرہ ہر طرح سے ہشام کی فرماں برداری پر آمادہ اور بغاوت و سرکشی کا کوئی خیال نہیں رکھتا۔ ایسی حالت میں زیادہ سے زیادہ اس قدر احتیاط کافی ہے کہ مغیرہ کو قید کر دیا جائے۔ اس کی جان لینے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر وزیر جعفر نے فوراً پیغام بھیجا کہ اگر تم اس کام کو نہیں کر سکتے تو میں کسی دوسرے شخص کو بھیجتا ہوں تاکہ وہ بلا توقف مغیرہ کا کام تمام کر دے۔ یہ سن کر محمد بن ابی عامر نے مغیرہ کو بے گناہ قتل کر دیا اور جس کمرے میں اس کو قتل کیا تھا، اس کمرہ کو اسی وقت بند کرا دیا۔

تخت نشینی:

اس کے بعد خلیفہ ہشام کی رسم تخت نشینی ادا ہوئی۔ فائق وجوذر کو اپنے منصوبے میں ناکامی ہوئی۔ انہوں نے اس کے بعد نوعمر خلیفہ کے خلاف لوگوں میں ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کی اور مغیرہ کے بے گناہ مارے جانے کی طرف توجہ دلائی۔ اس سے لوگوں میں ایک عجیب قسم کی برہمی اور ناراضگی پیدا ہوئی اور چند ہی روز کے بعد دارالسلطنت قرطبہ میں خبر پہنچی کہ شمالی سرحد کے عیسائی باج گزار حکمرانوں نے اسلامی علاقے میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا ہے اور نوعمر خلیفہ کے تخت نشین ہونے سے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ ان حالات میں وزیراعظم جعفر نے اپنی قابلیت کا کوئی بہترین نمونہ نہیں دکھایا اور آپس کی مخالفتوں اور رقابتوں نے بھی اس کو بدحواس اور مجبور سا کر دیا۔

محمد بن عامر بہ حیثیت مشیر:

آخر ملکہ صبح کے حکم واشارے سے محمد بن ابی عامر کو وزیر جعفر کے کاموں میں اس کا شریک مقرر کیا گیا۔ چند ہی روز کے اندر محمد بن ابی عامر نے جعفر کو طاق میں بٹھا دیا اور تمام امور سلطنت پر خود حاوی ہو گیا۔ اب اس کے بعد اندلس کی حکومت اسلامیہ کے جو حالات بیان ہونے والے ہیں، وہ

درحقیقت ابن ابی عامر ہی کے کارنامے ہیں اور اسی لیے عنوان میں ہشام کے ساتھ ابن عامر کا نام بھی درج کیا گیا ہے۔

محمد بن عامر کے حالات زندگی: محمد بن ابی عامر سنہ ۳۲۷ھ میں اندلس کے مقام طرکش میں جہاں اس کا خاندان سکونت پذیر تھا، پیدا ہوا۔ اگرچہ اس کا مورث اعلیٰ عبدالملک معافری ایک یمنی سپاہی پیشہ شخص تھا مگر اس کے بعد اس کی اولاد میں زیادہ تر پڑھے لکھے اور ذی علم لوگ ہوتے رہے اور سپہ گری کی طرف اس خاندان کی توجہ کم رہی۔ محمد بن ابی عامر ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھا کہ اس کا باپ حج سے واپس آتا ہوا علاقہ طرابلس الغرب میں فوت ہو گیا تھا۔ محمد بن ابی عامر بہت تھوڑی عمر میں قرطبہ آ کر سرکاری مدرسہ میں آ کر پڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ فارغ التحصیل ہو کر اس نے ایوان شاہی کے متصل ایک دکان کرایہ پر لی اور اس میں بیٹھ کر عرائض نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ اجرت لے کر لوگوں کے خطوط، کچہریوں میں پیش ہونے والی عرضیاں لکھ دیا کرتا تھا۔ یہی اس کا ذریعہ معاش تھا۔ اتفاقاً ملکہ صبح یعنی مادر ہشام کو ایک محرر کی ضرورت ہوئی جو اس کی جائیداد کا حساب کتاب لکھا کرے۔ کسی خواجہ سرا نے محمد بن ابی عامر کی ملکہ سے سفارش کر دی۔ چنانچہ محمد بن ابی عامر ملکہ کے یہاں محرروں میں نوکر ہو گیا۔ اس کی حسن کارگزاری کی شہرت اور ملکہ کی سفارش نے اس کو چند روز کے بعد اشبیلیہ کے محصولات کی وصولی کا افسر مقرر کر دیا۔ اس عہدے پر فائز ہو کر چونکہ اس کو قرطبہ سے باہر رہنا پڑتا تھا، لہٰذا اس نے ملکہ صبح کی خدمت میں عرض معروض کر کے ملکہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ خلیفہ حکم کی خدمت میں سفارش کر کے اس کو قرطبہ ہی میں کوئی عہدہ دلا دے۔ چنانچہ اس کو محکمہ دارالضرب کا افسر و مہتمم بنا دیا گیا۔ اس عہدہ جلیلہ پر پہنچ کر محمد بن ابی عامر نے اپنی قابلیت کا خوب اظہار کیا۔ ملکہ صبح کو بھی قیمتی تحائف کے ذریعہ سے خوش رکھا۔ وزیر مصحفی اور دوسرے امراء کو بھی اپنا ہمدرد و خیر خواہ بنا لیا اور بہت جلد اس قدر اعتبار پیدا کر لیا کہ خلیفہ حکم نے مرنے سے پہلے اس کو شہزادہ ہشام کا اتالیق مقرر کر دیا۔

محمد بن عامر کے کارنامے:

خلیفہ حکم کی وفات اور مغیرہ کے قتل کے بعد جب ہشام تخت نشین ہوا تو تمام کاروبار سلطنت وزیر جعفر مصحفی کے ہاتھ میں آ گیا۔ سپہ سالار غالب بہ ظاہر وزیر جعفر کا رقیب سمجھا جاتا تھا۔ ملکہ صبح پہلے

سے زیادہ امور سلطنت میں دخیل اور حاوی ہوگئی تھی۔ اس کی سب عزت کرتے تھے اور وہ محمد بن ابی عامر پر زیادہ مہربان تھی۔ محمد بن ابی عامر نے وزیر جعفر اور سپہ سالار غالب کو مشورے دے کر سب سے پہلے خواجہ سراؤں کے زور کو تڑوایا۔ فائق کو میورقہ میں جلاوطن کر دیا، جہاں وہ گم نامی کے عالم میں فوت ہوا۔ جوذر کو استعفا دینے پر مجبور کیا گیا۔ ان کی جماعت کے لوگوں کو منتشر کر دیا گیا۔ اسی حالت میں شمالی عیسائیوں کے حملہ آور ہونے اور خراج کی ادائیگی سے انکار کرنے کی خبریں پہنچیں۔ وزیر جعفر نے محمد بن ابی عامر کو فوج دے کر عیسائیوں کے مقابلہ اور سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ محمد بن ابی عامر نے شمالی حدود میں پہنچ کر عیسائیوں کو پیہم اور عبرت آموز شکستیں دیں اور وہاں سے سالماً غانماً واپس آیا۔ ان فتوحات کی خبریں پہلے ہی قرطبہ میں پہنچ چکی تھیں اور محمد بن ابی عامر کی قبولیت اور عظمت دلوں میں بہت بڑھ گئی تھی۔ اہل قرطبہ نے اس کا شاندار استقبال کیا اور دربار میں قدرتی طور پر اس کا اثر اور اختیار پہلے سے دوچند ہوگیا۔ اب محمد بن ابی عامر نے غالب کو اپنا شریک وہم خیال بنا کر جعفر مصحفی کو وزارت سے معزول اور ذلیل کرا دیا۔ یہاں تک کہ اس کو قید کر دیا، اسی حالت میں وہ فوت ہوا۔

غالب چونکہ تمام افواج اندلس میں محبوب و ہر دل عزیز تھا، لہٰذا اس پر ہاتھ ڈالنا آسان کام نہ تھا۔ محمد بن ابی عامر نے فوجی بھرتی جاری کی۔ جس میں شمال کے پہاڑی عیسائیوں اور مراکش وطرابلس الغرب کے بربریوں کو بھرتی کیا۔ ابن ابی عامر اب تنہا وزیراعظم تھا۔ غالب کی خاطر مدارات اور تعظیم وتکریم حد سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ غالب کی بیٹی سے اس نے شادی کر لی تھی۔ اس لیے غالب کی طرف سے اس کو کوئی خطرہ نہ تھا مگر چونکہ ابن ابی عامر میں اولوالعزمی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور وہ مطلق العنان فرماں روا کی حیثیت سے اندلس میں حکومت نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا اس نے پرانی فوج کے ایک حصہ کو موقوف کر دیا۔ باقی کو غیر اہم اور مناسب موقع پر مامور کر کے فوج کی قومی جماعت بندیوں کو درہم برہم کر دیا۔ نئی فوج کی تعداد کو بہ تدریج بڑھا کر زیادہ قواعد دان اور مضبوط بنا لیا اور اس طرح بڑی ہوشیاری کے ساتھ غالب کی قوت کو کمزور کر دیا۔ اس کے بعد غالب کو بھی اس نے بہ آسانی اپنے راستے سے ہٹا دیا اور کسی قسم کا کوئی فتنہ برپا نہ ہوا۔ غالب اور ابن ابی عامر کی کسی موقع پر تیز گفتگو ہوئی۔ سخت کلامی کے بعد زبان تیغ سے کام لینے تک نوبت پہنچی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابن ابی عامر کسی قدر زخمی ہوا اور غالب بھاگ کر عیسائی بادشاہ لیون کے پاس چلا گیا۔ اسی طرح حریفوں

سے میدان خالی کرا کر ابن ابی عامر نے ملکہ صبح کے اقتدار کو امور سلطنت سے بالکل خارج کر دیا اور ہشام ثانی کو قصر خلافت کے اندر اپنے مقرر کردہ خدام میں گویا نظر بند کر کے بٹھا دیا۔

ہشام قصر خلافت سے آگے نہیں نکل سکتا تھا۔ محل کے اندر عیش وعشرت اور لہو ولعب کے تمام سامان اس کے لیے فراہم تھے اور وہ اپنی اسی حالت پر قانع اور مطمئن تھا۔ بلا ابن ابی عامر کی پروانگی کے کوئی شخص ہشام سے مل بھی نہیں سکتا تھا۔ ابن عامر نے ہر طرح سے مضبوط ومطمئن ہو کر فوجی اصلاح وترتیب کی طرف توجہ کی اور بہت جلد وہ اپنی بہادر اور جرار فوج میں محبوب و ہر دل عزیز بن گیا۔

عیسائیوں سے جہاد:

اس کے بعد اس نے عیسائیوں پر جہاد کیے اور کئی عیسائی ریاستوں کو ممالک محروسہ میں شامل کر کے باقیوں کو ایسی سخت سزائیں دیں کہ عیسائی سلاطین اس کے نام سے لرزنے اور کانپنے لگے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ خود عیسائی سلاطین اور عیسائی سرداروں نے اس کی فوج میں شریک ہو کر عیسائی ملکوں کو پامال کیا اور خود عیسائیوں نے اپنے ہاتھ سے اپنے گرجوں کو ڈھانے اور مسمار کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ مگر ابن ابی عامر نے ان کو معبدوں کی بے حرمتی وتباہی سے روک دیا۔ پھر اس نے افریقہ کی طرف توجہ کی۔ ادھر بھی سلطنت اندلس کی حدود کو وسیع کیا۔ غرض اس نے اپنے عہد حکومت میں چھپن جہاد کیے اور ہر ایک لڑائی میں فتح مند ہوا۔ آخری ایام حکومت میں اس نے اپنا خطاب ''منصور'' تجویز کیا۔ چنانچہ وہ نہ صرف منصور بلکہ منصور اعظم کے خطاب سے مشہور ہے۔

وفات:

سنہ ۳۹۴ھ میں ۲۷ سال کی حکومت کے بعد قسطلہ کے آخری جہاد سے واپس آتا ہوا مدینہ سالم میں جس کو میڈ نیا سلی کہتے ہیں، فوت ہو کر مدفون ہوا۔

محمد بن عامر منصور کے عہد پر تبصرہ:

منصور اعظم کی مثال ایسی سمجھنی چاہیے جیسے خلافت بغداد میں دیلمی وسلجوقی وغیرہ سلاطین کی حالت تھی کہ خلیفہ برائے نام ہوتا تھا اور اصل حکومت ان سلاطین کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ منصور اعظم نے اپنے آپ کو حاجب یعنی وزیر اعظم ہی کے نام سے موسوم رکھا لیکن باقی تمام امور میں وہ مطلق

العنان فرماں روا تھا۔ اس نے مدینہ زاہر کے نام سے ایک قصر قرطبہ کے قریب چند میل کے فاصلے پر تعمیر کرایا تھا جو قلعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی میں وہ تمام دفاتر اور خزائن کو لے گیا تھا۔ خطبہ میں خلیفہ ہشام کے ساتھ اس کا بھی نام لیا جاتا تھا۔ سکہ میں بھی اس کا نام درج ہوتا تھا۔ امراء و اراکین سلطنت اس کی ایسی ہی تکریم کرتے اور تمام آداب دربار اسی طرح بجالاتے جس طرح وہ خلفائے بنوامیہ کے لیے بجالاتے تھے۔

ابن ابی عامر یعنی منصور اعظم کا وجود اندلس اور اندلس کی اسلامی حکومت وسلطنت کے لیے بہت ہی مبارک ومسعود تھا۔ اس نے لیون اور اس کی اردگرد کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو خلافت قرطبہ کا براہ راست ایک صوبہ بنالیا تھا۔ برشلونہ، قسطلہ اور نوارکو اس نے خراج گزار اور پورے طور پر فرماں بردار بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ایک مرتبہ غرسیہ والی ریاست کشکبنش کے پاس منصور اعظم کا کوئی ایلچی کسی ضرورت سے گیا۔ غرسیہ نے اس کا شاندار استقبال کیا اور اس کو اپنے تمام ملک کی سیر کرائی۔ اس سیر وسیاحت میں اس ایلچی کو معلوم ہوا کہ کسی کلیسہ میں کوئی مسلمان عورت قید ہے جس کو راہبوں نے قید کر رکھا ہے۔ ایلچی نے واپس آ کر حالات سنائے اور اس مسلمان عورت کا بھی تذکرہ کیا۔ منصور اعظم اسی وقت فوج لے کر ریاست کشکبنش پر حملہ آور ہوا۔ جب حدود کشکبنش کے قریب پہنچا تو غرسیہ عاجزانہ حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ مجھ سے کوئی حرکت گستاخانہ سرزد نہیں ہوئی۔ منصور نے کہا کہ تو نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے ملک میں کوئی مسلمان قیدی نہ رکھے گا، پھر فلاں گرجا میں ایک مسلمان عورت کو کس لیے قید کیا گیا؟ غرسیہ نے فوراً عورت کو منصور کے حوالے کر کے اس گرجا کو منصور کے سامنے گرا دیا۔

۲۴ ماہ جمادی الآخر سنہ ۳۸۷ھ کو منصور نے قرطبہ سے شہر قوریہ کی جانب کوچ کیا۔ قوریہ کو فتح کر کے جلیقیہ میں داخل ہوا۔ یہاں عیسائی سرداروں نے آ آ کر ملازمت وشرکت اختیار کی۔ ان سب کو لے کر منصور اعظم سمندر کے کنارے تک تمام علاقے کے سرکش لوگوں کو سزا دے کر اور اس طرف کے قلعوں کو جو سامان بغاوت تھے، مسمار کرا کر بحر اطلانطک کے چھوٹے چھوٹے جزیروں کو فتح کیا اور مفرورین کو جو وہاں جا کر پناہ گزین ہوئے تھے، گرفتار کیا۔ ساحل فرانس کے شہروں کو فتح کر کے اور ان عمارتوں کو جو سازش خانے بنائے گئے، مسمار کرنے کے بعد واپس ہوا۔ یہ منصور اعظم کا اڑتالیسواں جہاد تھا۔

علم وفضل کی قدر افزائی:

منصور اعظم علم وفضل کا ایسا ہی قدردان تھا جیسا کہ خلیفہ حکم ثانی۔ وہ خود بھی عالم تھا اور عالموں کی بڑی قدر کیا کرتا تھا۔ مگر وہ لوگ جو لڑکپن میں اس کے ہم سبق رہ چکے تھے، منصور اعظم کی اس عظمت وشوکت کو دیکھ کر دل ہی دل میں حسد کے مارے جلے بھنے جاتے تھے۔ انہوں نے موقع پا کر منصور کے خلاف ایک سازش مرتب وبرپا کی اور یہ الزام لگایا کہ منصور فلسفہ کی جانب زیادہ مائل ہے اور اس پر دہریت غالب ہے۔ مگر منصور نے اپنے خلاف اس قسم کی شہرت سن کر فوراً اس کی تلافی کی اور خود دینی علماء کی ایک بڑی مجلس منعقد کر کے اس قسم کی باتوں کا سدباب کر دیا۔ منصور نے بہت سے پل بنائے۔ جامع مسجد قرطبہ کی اس نے بھی توسیع کی۔ امن وامان اور رعایا کی خوش حالی اس کے زمانے میں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ وہ ایسے مقامات پر بھی اپنی فوجیں لے گیا جہاں اس سے پہلے کوئی مسلمان نہ پہنچا تھا۔ غرض منصور کا عہد حکومت ہر ایک اعتبار سے حکومت اندلس کا نہایت شاندار زمانہ تھا۔ منصور اعظم کے نام سے عیسائی سلاطین کے دل میں اس قدر خوف طاری ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ کسی اموی خلیفہ سے بھی وہ نہ ڈرتے تھے۔ منصور نے نہایت ادنیٰ درجہ کی حالت سے ترقی کر کے اپنے آپ کو حکومت وسلطنت کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچایا۔ اس لیے وہ دنیا کے باحوصلہ اور قابل تکریم لوگوں کی صف میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ سنہ ۳۹۴ھ میں جب وہ فوت ہوا تو اگرچہ خلافت بنوامیہ ہشام ثانی کی بے بسی ونالائقی کے سبب سے اپنے آخری سانس پورے کر رہی تھی، مگر اسلامی عظمت وشوکت اپنے معراج کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔

منصور اعظم کے فوت ہونے کی خبر قرطبہ میں پہنچی تو ہواخواہان بنوامیہ کو اس لیے خوشی ہوئی کہ اب ہشام ثانی جو شاہ شطرنج کی حیثیت رکھتا تھا، آزادانہ وخودمختارانہ فرماں روائی کر سکے گا۔ چنانچہ بعض خیرخواہوں نے خلیفہ ہشام تک پہنچنے اور یہ خوشخبری سنانے کی کوشش میں کامیابی حاصل کی۔ مگر ہشام نے منصور کے فوت ہونے کی خبر سن کر بے حد رنج وملال کا اظہار کیا اور منصور کے بڑے بیٹے عبدالملک کے آنے سے کوئی خیال ظاہر نہیں کیا۔ جب عبدالملک شہر سالم میں اپنے باپ کو دفن کرنے کے بعد قرطبہ میں وارد ہوا تو خلیفہ ہشام ثانی نے اس کو فوراً طلب کر کے اپنا وزیراعظم بنایا اور اب منصور کی مانند عبدالملک تمام سلطنت اندلس کے سیاہ وسفید کا مالک ومختار ہوا۔ خلیفہ ہشام نے اس کو

سیف الدولہ اور ''مظفر'' کا خطاب دے دیا۔ مظفر نے اپنے باپ کی روش پر عمل کیا اور چھ سال حکومت کرنے کے بعد سنہ ۳۹۹ھ میں فوت ہوا۔ مظفر نے اپنے عہد حکومت میں آٹھ مرتبہ عیسائی ملکوں پر چڑھائیاں کیں اور ہر مرتبہ فتح مند ہوا۔ اس کے زمانے میں بھی علم وفن کی خوب ترقی رہی اور حکومت اسلامیہ کے اس رعب میں جو منصور کے زمانے میں قائم ہو چکا تھا، کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی۔

مظفر کے فوت ہونے پر اس کا بھائی عبدالرحمٰن بن منصور وزارت عظمیٰ یا تخت سلطانی پر فائز ہوا۔ عبدالرحمٰن نے اپنا لقب ناصر تجویز کیا۔ ناصر کا بھائی مظفر اور اس کا باپ منصور دونوں اگرچہ سلطنت اندلس کے خودمختار فرماں روا تھے مگر وہ اپنے آپ کو وزیراعظم یا حاجب السلطنت ہی کہتے رہے۔ عبدالرحمٰن ناصر نے یہ دیکھ کر کہ اراکین دربار اور سرداران لشکر اور عمال و حکام سب اسی کے خیرخواہ اور اسی کے باپ کے ترتیب کردہ دوست گرفتہ ہیں، بلاخوف وخطر اپنے آپ کو خودمختار بنایا اور خلیفہ ہشام کی ظاہری تعظیم وتکریم میں بھی قصور کرنے لگا۔

اس کے بعد ناصر نے ہشام کو مجبور کیا کہ وہ ناصر کو اپنا ولی عہد خلافت تجویز کرے۔ چنانچہ ہشام نے مجبوراً ایک فرمان کے مضمون پر جو ناصر نے لکھوا کر پیش کیا، دستخط کر دیے اور ممالک محروسہ کے تمام عمال کے نام وہ فرمان بھیجا گیا، جس میں لکھا تھا کہ ہمارے بعد عبدالرحمٰن ناصر کو خلیفہ بنایا جائے اور ہر فرد بشر اس کو ولی عہد خلافت تصور کرے۔ اس فرمان میں ناصر کی عالی نسبی اور قابلیت ملک داری کی بہت تعریف کی گئی تھی۔ اس فرمان یا سند ولی عہدی کی تمام ارکان واعیان سلطنت نے تائید وتصدیق کی اور جامع مسجد قرطبہ میں بھی اس کا اعلان کیا گیا۔ ناصر اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوا مگر یہی سند ولی عہدی اور سلطانی اس کے لیے موجب ہلاکت ثابت ہوئے۔

ہشام کی معزولی:

ناصر اپنی حکومت کے پہلے ہی سال اپنے بھائی اور باپ کی سنت کے موافق فوج لے کر سرحد کی طرف عیسائیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ قرطبہ میں قریشیوں اور امویوں کو یہ دیکھ کر کہ حکومت وخلافت بنوامیہ سے نکل کر ایک اور خاندان میں جا رہی ہے، سخت ملال ہوا تھا۔ انہوں نے خاندان خلافت کی حمایت کے لیے لوگوں کو خفیہ طور پر آمادہ کرنا شروع کیا۔ اب جبکہ ناصر مع فوج شمالی سرحد پر گیا ہوا تھا، قرطبہ والوں نے قرطبہ کی موجودہ فوج کے ان افسروں کو جو ناصر کے ہمدردخواہ تھے، قتل

کر کے خلیفہ ہشام ثانی کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کے پڑپوتے محمد بن ہشام بن عبدالجبار بن خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کو تخت نشین کر کے ''مہدی باللہ'' کا لقب دیا۔ عبدالرحمٰن ناصر نے اس طرح ہشام کے معزول اور مہدی کے تخت نشین ہونے کی خبر سن کر فوراً قرطبہ کی جانب کوچ کیا۔ جب قرطبہ کے قریب پہنچا تو اس کی فوج کے اکثر سردار اور بربری سپاہی اس کی مزاحمت اور مخالفت کو آئے۔ اسی دوران متحارب افواج کی باہمی لڑائی ہوئی جس میں وہ مقتول ہوا اور مہدی کے حامی ایک فوجی افسر نے اس کا سر کاٹا اور خلیفہ مہدی کے پاس لے آیا۔ اس طرح حکومت بنی عامر کا خاتمہ ہوا اور ساتھ ہی اندلس میں طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوا۔

مہدی بن ہشام بن عبدالجبار

ہشام نے لوگوں کی خواہش معلوم کر کے بلاتوقف بہ ذریعہ تحریر تخت خلافت سے دست برداری اختیار کی۔ محمد بن ہشام المخاطب بہ مہدی نے اس کو قصر خلافت کے ایک حصے میں نظر بند کر دیا اور اپنے ایک چچازاد بھائی محمد بن مغیرہ کو حاجب السلطنت اور دوسرے چچازاد بھائی امیہ بن الحاف کو کوتوال قرطبہ مقرر کیا۔ اس کے بعد منصور اعظم کے شہر وقصر زہرہ کی طرف فوج بھیجی۔ وہاں کے رہنے والوں نے بلا مقابلہ ومقاتلہ دروازے کھول دیے۔ خلیفہ مہدی کی تمام فوج نے قصر اور عمارت کو منہدم کر کے زمین کے برابر کر دیا اور تمام مال واسباب لوٹ کر زہرہ کا نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ یہ حادثہ سنہ ۳۹۹ھ یا سنہ ۴۰۰ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ اس کے بعد ناصر کے قتل اور خاندان ابن ابی عامر کی حکومت کے ختم ہونے کا واقعہ پیش آیا اور چوتھی صدی ہجری کے خاتمہ پر اندلس کی حکومت اسلامیہ کی عظمت وشان ختم ہو کر طوائف الملوکی [1] کا دروازہ کھلا۔

فوجیوں کا اقتدار:

خلیفہ ہشام ثانی کو معزول کر کے خلیفہ مہدی کو تخت نشین کر کے اور سلطان ناصر کی مخالفت میں فوراً قریشیوں اور امویوں کے شریک حال بن جانے میں بربری افواج نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ لہٰذا اب خلیفہ مہدی کی حکومت وخلافت میں بربریوں اور فوجی آدمیوں کا اقتدار حد سے زیادہ

[1] یعنی خانہ جنگی یا حکام کی باہمی لڑائیاں!

بڑھ گیا اور خلافت کی باگ یک لخت فوجی لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ ان لوگوں نے رعایا پر تشدد شروع کیا۔ رعایا نے تنگ آ کر خلیفہ مہدی سے شکایت کی۔ مہدی نے رعایا کی فریاد کو اس لیے نہ سنا کہ بربریوں کو ناراض کرنا خلاف مصلحت سمجھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل قرطبہ میں جو لوگ مہدی کے طرفدار اور اس کو تخت خلافت پر بٹھانے میں سرگرم رہے تھے، سب ناراض ہو گئے اور اس تکلیف دہ حکومت سے آزاد ہونے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ بربریوں کی زیادتیوں سے تنگ آ کر اہل شہر نے بربریوں کے چند شخصوں کو قتل کر دیا۔ خلیفہ مہدی نے ان قاتلوں کو قصاص میں قتل کیا۔ اس طرح رعایا کی ناراضگی دن بہ دن ترقی کرتی گئی۔

مہدی کے خلاف سازش:

ادھر خلیفہ مہدی بربریوں سے بھی بددل، ناخوش اور فوجیوں کے اس اقتدار کو مضر سلطنت سمجھ کر خفیہ طور پر ان کا زور توڑنے کی تدبیروں میں مصروف تھا۔ اتفاقاً اہل لشکر یعنی بربریوں کو اس بات کا علم ہو گیا کہ خلیفہ ہماری تباہی و بربادی کی فکر میں ہے۔ انہوں نے یہ سنتے ہی خاندان خلافت کے ایک شہزادے ہشام بن سلیمان بن عبدالرحمٰن ثالث کو تخت خلافت پر بٹھانے اور مہدی کو معزول کرنے کی سازش کی۔ اس سازش کا حال مہدی کو معلوم ہوا تو اس نے فتنے کے برپا ہونے سے پہلے ہی ہشام بن سلیمان اور اس کے بھائی ابوبکر دونوں کو گرفتار کر کے اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

سلیمان بن حکم کی وفات:

ان دونوں کے مقتول ہونے کی خبر سن کر ایک اموی شہزادہ سلیمان بن حکم اپنی جان بچا کر قرطبہ سے بھاگا۔ قرطبہ سے باہر بربری لوگ جمع ہو رہے تھے اور اس فکر میں تھے کہ اب کس کو تخت خلافت کے لیے منتخب کیا جائے؟ سلیمان بن حکم کو آتا ہوا دیکھ کر سب خوش ہو گئے اور اس کو خلیفہ بنا کر ''مستعین باللہ'' کا خطاب دیا اور قرطبہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ سلیمان بن حکم نے کہا کہ ہماری طاقت ابھی اس قابل نہیں کہ قرطبہ کو فتح کر سکیں۔ مناسب یہ ہے کہ پہلے طاقت کو بڑھایا جائے۔ یہ سوچ کر سلیمان بن حکم المخاطب بہ مستعین باللہ بربریوں کے ہمراہ طیطلہ پہنچا اور احمد بن نصیب کو اپنا وزیراعظم بنایا۔ اس کے بعد مستعین نے مدینہ سالم کے حاکم واضح عامری سے خط و کتابت کر کے اس کو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہا لیکن واضح عامری اس سے پیشتر خلیفہ مہدی کی بیعت کر چکا تھا، لہٰذا اس

نے صاف انکار کیا۔

باہمی خانہ جنگی:

مستعین طیطلہ سے بربریوں کی فوج لے کر مدینہ سالم کی طرف چلا۔ مہدی نے یہ سن کر کہ سلیمان نے مدینہ سالم پر حملہ کیا ہے، اپنے غلام قیصر کو سواروں کا ایک دستہ دے کر واضح عامری کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ مدینہ سالم کے قریب لڑائی ہوئی۔ قیصر مارا گیا۔ واضح مدینہ سالم میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔

سلیمان اور مہدی کی عیسائی بادشاہ ابن اوفونش سے مدد کی درخواست:

مستعین نے جب دیکھا کہ اس شہر کا فتح ہونا دشوار ہے اور فوج کے لیے سامان رسد حسب ضرورت فراہم نہیں ہو سکتا تو اس نے ابن اوفونش یعنی عیسائی بادشاہ کے پاس سفیر بھیج کر درخواست کی کہ تم ہماری مدد کرو اور حسب ضرورت سامان رسد اور فوج بھیجو تاکہ ہم قرطبہ پر حملہ آور ہو کر تخت خلافت حاصل کر لیں۔ اس پیام سلام کی خبر قرطبہ میں مہدی کے پاس پہنچی تو اس نے بھی عیسائی بادشاہ کے پاس پیغام بھیجا اور اپنی طرف مائل کرنے کے لیے وعدہ کیا کہ ہم تمام سرحدی قلعے اور شہر تمہارے سپرد کر دیں گے۔ دونوں کے پیغامات سن کر عیسائی بادشاہ نے مستعین کی امداد کرنی مناسب سمجھی اور ایک ہزار بیل، پندرہ ہزار بکرے اور ضروری سامان مستعین کے پاس بھیج دیا۔ اس کے بعد فوج بھی امداد کے لیے روانہ کی۔ اب مستعین، واضح کو مدینہ سالم میں علیٰ حالہ چھوڑ کر قرطبہ کی جانب چلا۔ اس کی فوج میں بربری اور عیسائی دونوں موجود تھے۔ مستعین کو قرطبہ کی طرف جاتا ہوا دیکھ کر واضح بھی اپنی فوج لے کر اس کے پیچھے پیچھے چلا مگر اس سے غلطی یہ ہوئی کہ قرطبہ پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں مستعین پر حملہ آور ہوا۔ اس لڑائی میں اس کو شکست فاش حاصل ہوئی اور بہت سے ہمراہیوں کو قتل کرا کر صرف چار سو آدمیوں کے ساتھ قرطبہ کی جانب بھاگا۔ واضح جب قرطبہ میں پہنچا اور مستعین کے حملہ آور ہونے کا حال مہدی کو معلوم ہوا تو وہ فوج لے کر مستعین کے مقابلہ کو قرطبہ سے باہر نکلا اور میدان سرادق میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ سخت خون ریزی کے بعد مہدی کو شکست ہوئی۔ بیس ہزار اہل قرطبہ میدان سرادق میں مقتول ہوئے۔ بقیۃ السیف کو لیے ہوئے مہدی طیطلہ کی جانب بھاگا اور مستعین فتح مند ہو کر قرطبہ میں داخل ہوا اور تخت خلافت پر جلوس کیا۔ یہ فتح

چونکہ عیسائیوں کی مدد سے مستعین کو حاصل ہوئی تھی، لہٰذا عیسائیوں کی خوب خاطر مدارات ہوئی اور قرطبہ کے علماء وفضلاء کا بہت بڑا حصہ ان عیسائی وحشیوں کے ہاتھوں سے شہید ہوا۔ خلیفہ مہدی نے طیطلہ میں پہنچ کر عیسائی بادشاہ اوفونش سے پھر خط وکتابت کی اور اس کو اپنی مدد پر آمادہ کیا۔ عیسائی بادشاہ اس موقع کی اہمیت کو خوب پہچانتا تھا اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر کمزور کر دینے کا نہایت ہی اچھا موقع حاصل ہے۔ چنانچہ اس نے مہدی سے فوراً عہد نامہ لکھا کر جس قدر فوج اس کی مدد کو بھیج سکتا تھا، بھیج دی اور اس بات کی مطلق پرواہ نہیں کی کہ جو فوج مستعین کے ہمراہ گئی تھی، وہ ابھی تک واپس نہیں آئی۔ مہدی عیسائیوں کی امداد لے کر قرطبہ پر حملہ آور ہوا۔ مقام عقبۃ البقر میں نہایت خون ریز جنگ کے بعد مستعین کو شکست حاصل ہوئی اور مہدی دوبارہ فاتحانہ قرطبہ میں داخل ہو کر تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ عیسائیوں کی وہ فوج جو مستعین کے ساتھ تھی، مہدی کے لشکر میں شامل ہوگئی اور اس لڑائی میں بھی زیادہ تر مسلمان اور اہل قرطبہ ہی مارے گئے۔ مستعین نے قرطبہ سے نکل کر تمام ملک میں لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا۔ ادھر مہدی کے قرطبہ میں داخل ہونے کے بعد عیسائی لشکر نے اپنی لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت سے باشندگان دارالخلافہ کا ناک میں دم کر دیا۔ مہدی قرطبہ میں داخل ہوتے ہی عیش وعشرت میں مصروف ہوگیا۔ اس طرح تمام ملک اندلس جو امن وامان کا گہوارہ تھا، بدامنی کا گھر بن گیا اور ہر ایک وضیع وشریف کو اپنی جان ومال کا بچانا دشوار ہوگیا۔

مہدی کی معزولی:

واضح عامری، مہدی کے ساتھ تھا۔ اس نے جب ملک کو اس طرح تباہ اور حکومت اسلامیہ کو برباد ہوتے دیکھا تو شہر قرطبہ کے بااثر لوگوں سے مشورہ کر کے مہدی کو معزول کرنے اور خلیفہ ہشام ثانی کے دوبارہ تخت نشین کرنے کی تیاری کی۔ چنانچہ ۱۱ ذی الحجہ سنہ ۴۰۰ھ کو ہشام دوبارہ قید خانہ سے نکال کر تخت خلافت پر بٹھایا گیا اور مہدی کو سر دربار ہشام کے روبرو غیر نامی غلام نے قتل کیا۔

ہشام کی دوبارہ تخت نشینی

واضح عامری کو جو منصور بن ابی عامر کا آزاد غلام تھا، حجابت یعنی وزارت عظمیٰ کا عہدہ ملا۔ واضح

نے مہدی کا سر مستعین کے پاس وادی شوس میں بھیجا اور لکھا کہ اب خلیفہ ہشام دوبارہ تخت خلافت پر متمکن ہو چکا ہے اور مہدی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ تم خلیفہ وقت کی اطاعت اختیار کرو اور طریق سرکشی سے باز رہو لیکن چونکہ مستعین کے ساتھ اس غارت گری میں ابن اوفونش عیسائی بادشاہ بھی شریک ہو گیا تھا، اس لیے واضح عامری کے اس پیغام کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا اور ابن اوفونش اور مستعین نے مل کر قرطبہ پر حملہ کیا۔ قرطبہ کے اردگرد کا تمام علاقہ برباد کر کے قرطبہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔

عیسائی بادشاہ کو دوسو قلعے دے کر صلح ہوئی:

آخر طول محاصرہ سے تنگ آ کر عیسائی بادشاہ کو مستعین کی ہمراہی سے جدا کرنے کے لیے سلام و پیام کا سلسلہ جاری ہوا اور عیسائی بادشاہ کی خواہش کے موافق ہشام نے دوسو قلعے مع چند بڑے بڑے شہروں کے جو شمال کی جانب ابن اوفونش کی ریاست کے متصل تھے، اس کو دے دیے اور سند لکھ کر بھیج دی۔ اوفونش نے اس سند کے ذریعہ اس نئے علاقہ پر قبضہ کیا اور مستعین کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مستعین اور اس کے ہمراہی بربری برابر مصروف محاصرہ رہے مگر چونکہ محاصرہ کمزور ہو گیا تھا، لہٰذا اب مقابلہ اور معرکہ کی یہ صورت ہو گئی کہ کبھی شہر والے، بربریوں کو مارتے ہوئے دور تک پیچھے ہٹا دیتے اور کبھی بربری، شہر والوں کو شکست دے کر شہر کے اندر گھس جاتے۔ یہ حالت بہت دنوں تک جاری رہی۔ اس عرصہ میں کئی عیسائی حکمرانوں نے اپنی بغاوت اور مستعین کی مدد کرنے کا دباؤ ڈال کر دربار قرطبہ سے ابن اوفونش کی طرح بہت سے صوبوں کی سندیں حاصل کیں اور بہت سا ملک عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

ہشام کا انجام:

آخر ۳ شوال سنہ ۴۰۳ھ میں مستعین نے بہ زور تیغ قرطبہ پر قبضہ حاصل کیا۔ ہشام ثانی یا تو اس ہنگامہ میں قتل ہو گیا یا کہیں اس طرح غائب ہوا کہ پھر اس کا پتہ نہ چلا۔ واضح عامری اس سے چند روز پہلے قتل ہو چکا تھا۔ مستعین نے قرطبہ میں داخل ہو کر تخت خلافت پر جلوس کیا۔

مستعین باللہ:

مستعین کا ذکر اوپر سے چلا آتا ہے۔ اب یہ مستقل طور پر قرطبہ کا خلیفہ بن گیا۔ مگر جا بہ جا

صوبوں کے حاکم خود مختار بادشاہ بن بیٹھے۔ ابن عباد نے اشبیلیہ میں، ابن افطس نے بطلیوس میں، ابن ابی عامر نے بلنسیہ ومرسیہ میں، ابن ہود نے سرقسطہ میں اور مجاہد عامری نے رانیہ اور جزائر میں خود مختارانہ حکومتیں شروع کر دیں۔ شمالی عیسائی سلاطین نے اس مناسب موقع اور موزوں وقت سے فائدہ اٹھانے میں کمی نہیں کی۔ ہر ایک عیسائی ریاست نے اپنی حدود کو وسیع کر کے اپنے قریبی علاقوں کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ غرض اندلس میں طوائف الملوکی کا زمانہ شروع ہو گیا اور حکومت اسلامیہ پارہ پارہ ہو کر بے حد کمزور و ناتواں ہوگئی۔

مستعین کا قتل:

محرم سنہ ۴۰۷ھ تک مستعین نے قرطبہ اور اس کے مضافات پر حکومت کی اور تین سال چند ماہ برائے نام خلافت کے بعد اشبیلیہ کے متصل مقام طالقہ کے میدان میں علی بن حمود سے شکست کھا کر گرفتار و مقتول ہوا اور بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ درحقیقت بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ تو حکم ثانی کی وفات اور ہشام ثانی کی تخت نشینی کے وقت ہو چکا تھا مگر ہشام ثانی کے زمانے میں بھی خاندان بنوامیہ کی عظمت بہ حیثیت خاندان خلافت باقی تھی۔

بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ:

اب محرم سنہ ۴۰۷ھ میں مستعین کے قتل ہونے پر اس خاندان کی حکومت کا نام ونشان ہی اندلس سے جاتا رہا مگر برائے نام سنہ ۴۲۸ھ تک بعض امویوں نے حکومت وسلطنت کے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ بعض برائے نام کامیاب بھی ہوئے مگر سنہ ۴۲۸ھ کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سنہ ۴۰۷ھ میں علی بن حمود (جس کا ذکر آگے آتا ہے) مستعین کو قتل کرنے کے بعد قرطبہ پر قابض اور تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ سنہ ۴۱۳ھ تک وہ اور اس کا بھائی قاسم قرطبہ میں حکمراں رہا۔ سنہ ۴۱۳ھ کے آخر ایام میں ابن حمود کی حکومت منقطع ہوئی اور اہل قرطبہ کی حمایت واعانت سے عبدالرحمٰن بن ہشام بن عبدالجبار برادر مہدی ماہ رمضان سنہ ۴۱۴ھ میں قرطبہ کے تخت پر بیٹھا اور ''مستظہر'' کا خطاب یا لقب اختیار کیا۔ اس کی حکومت کو ابھی دو مہینے گزرے تھے کہ محمد بن عبدالرحمٰن بن عبیداللہ بن عبدالرحمٰن فتح مند ہو کر ''مستکفی'' کے لقب سے تخت نشین ہو کر قرطبہ میں حکومت کرنے لگا۔ سنہ ۴۱۶ھ میں یحییٰ بن علی بن حمود نے حملہ کیا۔ مستکفی شکست کھا کر

بلاد شمالی کی جانب بھاگ گیا اور وہیں فوت ہوا۔ یحییٰ بن علی بن حمود قرطبہ میں سنہ ۴۱۷ھ تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے بعد وزیر السلطنت ابو محمد جمہور بن محمد بن جمہور نے ہشام بن محمد اموی کی غائبانہ بیعت کی۔ ہشام بن محمد ان دنوں ابن ہود کے پاس مقام لریدہ میں مقیم تھا، یہ سن کر کہ میرے نام پر بیعت کی گئی ہے، لریدہ سے مقام بدنت میں چلا آیا۔ یہاں تین سال مقیم رہا اور اپنا لقب ''معتمد باللہ'' رکھا۔ قرطبہ میں دونوں رؤسائے قرطبہ مل کر حکومت کرتے اور ہشام بن محمد کو اپنا خلیفہ مانتے رہے۔ جب ان امراء میں باہمی اختلاف اور لڑائی جھگڑے نمودار ہوئے تو سنہ ۴۲۰ھ میں ہشام بن محمد اموی کو مقام بدنت سے قرطبہ میں لائے اور باقاعدہ تخت نشین کر کے اس کی بیعت کی۔ سنہ ۴۲۲ھ میں لشکریوں نے بغاوت وسرکشی اختیار کر کے ہشام بن محمد کو معزول کر دیا۔ ہشام معزول ہو کر قرطبہ سے لریدہ چلا آیا اور سنہ ۴۲۸ھ میں یہیں فوت ہو گیا۔ ہشام بن محمد پر خاندان بنوامیہ کی برائے نام حکومت و خلافت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

اموی حکومت پر تبصرہ:

عبدالرحمٰن اول نے سنہ ۱۳۸ھ میں اندلس کے اندر داخل ہو کر اپنی حکومت کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کی اولاد میں ہشام بن محمد کے فوت ہونے پر سنہ ۴۲۸ھ میں اس کی حکومت کا دوسونوے سال کے بعد بالکل خاتمہ ہو گیا۔ عبدالرحمٰن اول کی اولاد میں بعض ایسے باحوصلہ اور الوالعزم فرماں روا ہوئے کہ انہوں نے اندلس کو فخر الممالک بنا دیا۔ نہ صرف ملک کی سرسبزی وشادابی میں حیرت انگیز کارنامے دکھائے بلکہ انہوں نے علوم وفنون کے بھی ایسے دریا بہائے کہ آج تک تمام دنیا ان کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہے۔ موجودہ یورپ کی علمی ترقیات تمام وکمال انہیں علم دوست اور علم پرور اموی فرماں رواؤں کی رہین منت ہیں۔ قرطبہ میں خلفائے اندلس نے ایسی علمی مشعل روشن کی تھی جس سے تمام یورپ مستفید ہوا۔ انہیں خلفائے اندلس کی علمی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج یورپ تمام دنیا کو علم و ہنر سکھانے کا مدعی ہے۔ خلفائے اندلس کی شوکت و طاقت کا بھی یہ عالم تھا کہ تمام یورپ ان سے کانپتا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سلاطین یورپ ہر قسم کی ذلتیں برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ اس جگہ غور کرنے کے قابل بات یہ ہے کہ ایسی شاندار سلطنت اور ایسی عظیم الشان اسلامی حکومت کے برباد ہونے کا سبب کیا تھا؟ اس کا جواب سوائے اس کے اور کچھ

نہیں کہ مسلمانوں نے شریعت اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی پیروی میں قصور کیا۔ اسلام نے دنیا کی سلطنت وحکومت کو کسی خاندان یا کسی خاص قبیلہ کا حق نہیں بتایا تھا۔ مسلمانوں نے تعلیم اسلامی کے خلاف حکومت میں وراثت کو دخل دیا اور باپ کے بعد بیٹے کو مستحق خلافت سمجھا، جیسا کہ دنیا میں پہلے سے رواج ہوگیا تھا۔ اسی رواج کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹایا تھا مگر مسلمانوں نے چند سالوں کے بعد پھر اس غلط رواج کو اپنے گلے میں ڈال دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نالائق و نااہل لوگ تخت حکومت پر جلوہ فرما ہونے کا موقع پانے لگے۔ قرآن کریم اور شریعت اسلام کی طرف سے غفلت اختیار کرنے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں نااتفاقی پیدا ہوئی اور آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ اس آپس کی پھوٹ نے دشمنوں کو طاقت پہنچائی اور مسلمان برباد ہوگئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

دسواں باب

حکومت بنی حمود

دولت ادریسیہ کا ذکر کسی باب میں آ چکا ہے کہ ہارون الرشید عباسی کے عہد خلافت میں ادریس کی مراکش میں خود مختار سلطنت قائم ہوگئی تھی۔ یہ حکومت ادریسیہ بھی اب مراکش سے زائل ہو چکی تھی۔ منصور اعظم یا ابن ابی عامر کے عہد وزارت وحکومت میں مراکش سے جو بربری لوگ اندلس میں آئے، ان کے ہمراہ خاندان ادریسیہ کے دو شخص آئے جو دونوں حقیقی بھائی تھے۔ ان دونوں کے نام علی اور قاسم تھے۔ یہ دونوں حمود بن میمون بن احمد بن علی بن عبیداللہ بن عمر بن ادریس کے بیٹے تھے۔ علی بن حمود اور قاسم بن حمود منصور اعظم کی فوج میں نوکر ہو گئے۔ انہوں نے ان لڑائیوں میں جو عیسائیوں کے ساتھ منصور بن عامر کی ہوئیں، خوب بہادری دکھائی اور اپنی قابلیت کا اظہار کیا۔ ابن ابی عامر نے خوش ہو کر ان دونوں کو فوجی افسری عطا کی۔ یہ دونوں بربری فوج کے اعلیٰ افسر تھے اور بربری لوگ بھی ان کی افسری سے خوش تھے کیونکہ ان کا خاندان ایک عرصہ تک مراکش میں برسر حکومت رہ چکا تھا۔ یہی دونوں بھائی تھے جنہوں نے بربری فوج کو لے کر خاندان ابن ابی عامر کی بیخ کنی کی اور انہیں دونوں نے مستعین اموی کو خلیفہ بنایا۔ مستعین نے قرطبہ میں تخت خلافت پر جلوس کرنے کے بعد علی بن حمود کو طنجہ اور دیگر صوبہ جات افریقہ کا والی مقرر کر دیا۔

علی بن حمود:

چونکہ مستعین کی چند روزہ حکومت میں اندلس کے تمام صوبے خود مختار ہو گئے، لہٰذا یہ رنگ دیکھ کر علی بن حمود نے بھی طنجہ میں خود مختارانہ حکومت شروع کر دی اور اپنے آپ کو مستعین کی فرماں برداری سے آزاد کر لیا۔ خیران نامی والی المیرہ کو اپنا شریک کار بنا کر علی بن حمود نے جہازوں کے ذریعے سے ساحل اندلس پر اپنی فوج اتار دی۔ طنجہ میں اپنے بیٹے یحییٰ کو اپنا قائم مقام بنا آیا اور خود وارد اندلس ہو کر قرطبہ کی جانب مع فوج روانہ ہوا اور یہ مشہور کیا کہ میں خلیفہ ہشام کے خون کا بدلہ لینے

آیا ہوں۔ آخر مالقہ کے میدان میں مستعین نے قرطبہ سے روانہ ہو کر علی بن حمود کا مقابلہ کیا۔ محرم سنہ ۴۰۷ھ میں مستعین کو شکست فاش حاصل ہوئی۔ علی نے بڑھ کر قرطبہ پر قبضہ کیا اور مستعین کو گرفتار کرا کر قتل کرایا اور خود تخت نشین ہو کر حکومت شروع کی۔ اپنا لقب ''ناصرلدین اللہ'' رکھا۔ چونکہ بربری فوج کا اثر غالب تھا اور بربری لوگ علی بن حمود سے خوش تھے، اس لیے جنگ مالقہ کے بعد علی بن حمود کو کسی قسم کی مخالفت اور پریشانی کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا۔ علی بن حمود کی سلطنت کا ابتدائی زمانہ تو بہت اچھا ثابت ہوا کیونکہ وہ عدل اور انصاف کی جانب زیادہ مائل نظر آتا تھا مگر بعد میں اس نے بربری لوگوں کو بھی ناراض کر دیا اور رعایا پر نئے نئے ٹیکس لگائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج اور رعایا دونوں اس سے ناراض ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر خیران صقلبی والی المیرہ نے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، عبدالرحمٰن بن محمد کو بادشاہ مشہور کیا۔

علی بن حمود کا قتل:

ادھر علی بن حمود کے خاص الخاص غلاموں میں بعض صقلبی موجود تھے۔ خیران صقلبی کی سازش سے ان صقلبی غلاموں نے ماہ ذی قعدہ سنہ ۴۰۸ھ میں علی بن حمود کو حمام کے اندر قتل کر ڈالا۔

قاسم بن حمود:

اس قتل کا حال لوگوں کو معلوم ہوا تو عموماً وہ خوش ہوئے اور بربری لوگوں نے علی بن حمود کے بھائی قاسم بن حمود کو جو مستعین کے زمانے سے جزیرہ خضرا کا حاکم تھا، قرطبہ میں طلب کر کے علی بن حمود کی جگہ تخت نشین کیا۔ قاسم چونکہ قرطبہ سے قریب تھا، اس لیے اس کو تخت نشین کر دیا گیا۔ مگر بربری فوج کی عام خواہش یہ تھی کہ علی بن حمود کے بیٹے یحییٰ بن علی کو طنجہ سے بلا کر بادشاہ بنایا جائے۔ ادھر خیران صقلبی نے عبدالرحمٰن بن محمد کو لے کر ملک کا دورہ کیا اور لوگ عبدالرحمٰن کی جانب مائل ہونے لگے مگر چند روز کے بعد والی غرناطہ کے مقابلہ میں جو ایک بربری سردار تھا، خیران صقلبی نے عین معرکہ جنگ میں دھوکا دے کر عبدالرحمٰن بن محمد کو قتل کرا دیا۔

یحییٰ بن علی کا ایک بھائی ادریس بن علی بن حمود مالقہ کا حاکم تھا۔ اس نے اپنے بھائی ادریس کو اپنی مدد پر آمادہ کر کے طنجہ سے مع فوج جہازوں کے ذریعہ سے روانہ ہو کر اندلس میں قدم رکھا اور اپنے چچا قاسم کے خلاف حکومت کا دعویٰ کیا۔ خیران صقلبی بھی یحییٰ سے آملا۔ یحییٰ کے بھائی ادریس

نے خیران کے متعلق بھائی کو توجہ دلائی کہ یہ بڑا چالاک اور فتنہ پرداز شخص ہے مگر یحییٰ نے جواب دیا کہ ہم کو اس کی امداد اور ہمدردی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یحییٰ مع فوج قرطبہ کی طرف روانہ ہوا۔ قاسم اس حملہ آوری کا حال سن کر قرطبہ سے فرار ہوا اور اشبیلیہ میں جا کر قاضی ابن عباد کے یہاں پناہ گزیں ہوا۔

یحییٰ بن علی بن حمود:

قاسم یکم جمادی الاول سنہ ۴۱۰ھ کو قرطبہ سے فرار ہوا اور پورے ایک مہینے کے بعد یحییٰ بن علی قرطبہ میں بلاتعرض داخل ہو کر تخت نشین ہوا اور اپنا لقب ''متعالی'' رکھا۔ یحییٰ صرف شہر قرطبہ پر قابض ہو کر اپنے آپ کو اندلس کا فرماں روا سمجھنے لگا۔ حالانکہ قرطبہ سے باہر اس کی حکومت کو کوئی تسلیم نہ کرتا تھا اور جابجا صوبہ دار خود مختار فرماں روائی کر رہے تھے۔ یحییٰ کی غفلت اور حماقت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں پھر سازشوں اور بغاوتوں کا سلسلہ جاری ہوا اور قرطبہ کی فوج کے بہت سے سردار قاسم کے پاس اشبیلیہ میں جا کر اس کو اس بات پر آمادہ کرنے لگے کہ قرطبہ پر حملہ کرو۔ اس قسم کی مخالف کارروائیوں سے مطلع ہو کر یحییٰ اس قدر خائف ہوا کہ قرطبہ سے بھاگ کر مالقہ چلا گیا۔

قاسم بن حمود کی دوبارہ حکومت:

قاسم یہ خبر سن کر سنہ ۴۱۳ھ میں پھر قرطبہ میں آ کر حکومت کرنے لگا۔ یحییٰ مالقہ میں مقیم اور قابض و متصرف ہو گیا۔ اس کے بھائی ادریس نے یہ دیکھ کر کہ مالقہ کی حکومت بھائی نے چھین لی ہے، مالقہ سے روانہ ہو کر طنجہ پر قبضہ کر لیا۔ قاسم قرطبہ میں، یحییٰ بن علی مالقہ میں اور ادریس بن علی طنجہ میں حکومت کرنے لگے۔

امویوں کا قتل عام:

چند روز کے بعد امرائے بربر قاسم سے ناراض ہو گئے۔ ادھر باشندگان قرطبہ پھر اس خیال میں مصروف ہوئے کہ کسی اموی شہزادے کو تخت سلطنت پر بٹھایا جائے۔ قاسم نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر امویوں کو قید و قتل کرنا شروع کیا۔ اس ظلم و تشدد کو دیکھ کر رعایا نے بغاوت اختیار کی۔ اہل شہر کی بغاوت فرو کرنے کے لیے قاسم نے بربری فوج استعمال کی۔ شہریوں نے مجتمع ہو کر نہایت پامردی سے مقابلہ کیا اور بالآخر قاسم اور اس کی فوج کو شکست دے کر شہر سے نکال دیا۔ بربری فوج تو

شکست کھا کر یحییٰ کے پاس مالقہ کی جانب گئی اور قاسم قرطبہ سے نکل کر اشبیلیہ کی طرف آیا۔ قاسم نے اپنے بیٹے کو اشبیلیہ کا حاکم بنا کر محمد بن زیری اور محمد بن عباد کو اس کا وزیر بنایا تھا۔ اب قاسم کو قرطبہ سے شکست خوردہ آتے ہوئے، سن کر ان دونوں امیروں نے اشبیلیہ کا دروازہ بند کر لیا اور مقابلہ پر مستعد ہو گئے۔ قاسم نے شہر سے باہر مقیم ہو کر ان امیروں کے پاس پیغام بھیجا کہ میرے بیٹے کو میرے پاس بھیج دو تو میں یہاں سے کسی دوسری طرف چلا جاؤں۔ چنانچہ انہوں نے قاسم کے بیٹے اور رشتہ داروں کو اس کے پاس بھیج دیا۔ قاسم اپنے اہل وعیال کو لے کر مع اپنے حبشی غلاموں کے قلعہ سریش میں جا کر مقیم ہو گیا۔ یہاں تک کہ یحییٰ بن علی نے ۴۱۵ھ میں قلعہ سریش کو فتح کر کے قاسم کو گرفتار وقید کر لیا اور سنہ ۴۲۷ھ میں قاسم، یحییٰ کے حکم سے مقتول ہوا۔

عبدالرحمٰن بن ہشام:

جس وقت قاسم قرطبہ سے فرار ہو کر اشبیلیہ کی جانب روانہ ہوا تو قرطبہ میں چند روز تک کوئی حاکم اور سلطان نہ تھا۔ قرطبہ والوں کو یہ فکر تھی کہ کسی اموی کو تخت خلافت پر بٹھائیں۔ آخر تین اموی شہزادے تاج وتخت کے مدعی ہوئے۔ ۱۵ رمضان سنہ ۴۱۴ھ کو اہل قرطبہ نے ایک مجمع عام میں ان تینوں شہزادوں میں سے ایک کا انتخاب کیا یعنی عبدالرحمٰن بن ہشام کو مستظہر کے لقب سے تخت نشین کیا۔ مستظہر نے تخت نشین ہو کر اپنے وزراء کی رائے کے خلاف ابوعمران نامی ایک بربری سردار کو جو قید تھا، رہا کر دیا اور اس کو سرداری عطا کی۔ اسی ابوعمران کی کوشش وسازش سے ۳ ذیقعدہ سنہ ۴۱۴ھ کو مستظہر مقتول ہوا۔

محمد بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ مستکفی:

اس کے بعد محمد بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ "مستکفی" کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ سنہ ۴۱۶ھ میں یحییٰ بن علی بن حمود جو اپنے چچا ابوالقاسم کو گرفتار کر چکا تھا اور سریش، مالقہ اور جزیرہ پر قابض ومتصرف تھا، مع فوج قرطبہ کی جانب روانہ ہوا۔ مستکفی اس حملہ آوری کی خبر سن کر کچھ ایسا حواس باختہ ہوا کہ قرطبہ سے شمالی حدود کی جانب بھاگ گیا اور وہیں ۲۵ ربیع الاول سنہ ۴۱۶ھ کو فوت ہو گیا۔ یحییٰ نے قرطبہ میں داخل ہو کر اپنے ایک افسر ابن عطاف کو قرطبہ کی حکومت سپرد کی اور خود مالقہ کی جانب چلا گیا اور وہاں جا کر ابوالقاسم ابن عباد حاکم اشبیلیہ کو زیر کرنے کے لیے فوجی تیاریوں میں مصروف

ہوا۔ چند روز کے بعد اہل قرطبہ نے ابن عطاف کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس کو مع فوج قرطبہ سے نکال دیا۔

اہل قرطبہ میں ابو محمد جمہور بن محمد نامی ایک شخص سب سے زیادہ بارسوخ و بااثر تھا۔ اس کے مشورہ سے اہل قرطبہ نے ہشام اموی کو جو لریدہ میں مقیم تھا، اپنا خلیفہ تسلیم کیا۔ ہشام تین سال تک قرطبہ میں نہ آ سکا۔ سنہ ۴۲۰ھ میں وہ داخل قرطبہ ہوا اور ''معتمد باللہ'' کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ دو سال کے بعد سنہ ۴۲۲ھ میں فوج اور رعایائے قرطبہ نے اس کو معزول کر کے خارج کر دیا اور وہ لریدہ میں واپس آ کر سنہ ۴۲۸ھ تک زندہ رہا۔ یحییٰ بن علی نے اشبیلیہ کا محاصرہ کیا تھا اور اہل قرطبہ کو دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ ہشام کے قرطبہ سے چلے جانے کے بعد اہل قرطبہ نے یحییٰ کی فرماں برداری اختیار کر لی۔ یحییٰ نے سنہ ۴۲۶ھ میں اشبیلیہ کو اپنا مطیع کیا۔ اس طرح یحییٰ بن علی کا رعب اس طوائف الملوکی میں سب سے زیادہ قائم ہو گیا۔ اسی سال ابوالقاسم بن عباد حاکم اشبیلیہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا معتضد تخت نشین ہوا۔ اہل اشبیلیہ نے پھر علم آزادی بلند کیا اور یحییٰ بن علی نے اشبیلیہ پر حملہ کیا۔ اسی حملہ میں یحییٰ بن علی مقتول ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۴۲۷ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ یحییٰ بن علی کے مقتول ہونے پر اس کے ہوا خواہ مالقہ میں چلے گئے جو یحییٰ کا مستقر حکومت تھا۔ وہاں انہوں نے یحییٰ کے بھائی ادریس بن علی کو سبطہ سے بلوا کر تخت نشین کیا اور سبطہ کی حکومت حسن بن یحییٰ کو ملی۔ ادریس بن علی نے مالقہ میں تخت نشین ہو کر اپنا لقب ''متاید باللہ'' رکھا۔ قرطبہ میں ابو محمد جمہور نے جمہوری حکومت قائم کی۔ ممبران کونسل نے ابو محمد جمہور کو اپنا صدر منتخب کیا۔ اس طرح شہر قرطبہ میں ہر قسم کا امن و امان قائم رہا۔ ادریس بن علی نے والی قرمونہ اور والی المیریہ کو اپنا شریک بنا کر اشبیلیہ پر حملہ کیا اور تین چار سال تک اشبیلیہ کی فوجوں سے لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ سنہ ۴۳۱ھ میں ادریس بن علی فوت ہوا۔ بعض سرداروں نے اس کے بیٹے یحییٰ بن ادریس کو مالقہ کے تخت پر بٹھانا چاہا۔ بعض نے کہا کہ حسین بن یحییٰ حاکم سبطہ مستحق تخت نشینی ہے۔ بالآخر حسن بن یحییٰ سبطہ سے آ کر مالقہ کے تخت پر بیٹھا اور اپنا لقب ''مستنصر'' رکھا۔ سنہ ۴۳۸ھ میں حسن کی چچازاد بہن یعنی ادریس کی لڑکی نے اس کو زہر دے کر مار ڈالا۔ اس کے بعد تین چار سال تک اس خاندان کے غلاموں اور نوکروں نے مالقہ میں یکے بعد دیگرے حکومت کی۔

ادریس بن یحییٰ حمودی:

آخر سنہ ۴۴۳ ھ میں ادریس بن یحییٰ بن علی بن حمود مالقہ کے تخت پر قابض و متمکن ہوا۔ غرناطہ وقرمونہ کی ریاستوں نے اس کی اطاعت قبول کی۔ ادریس بن یحییٰ نے اپنا لقب ''عالی'' رکھا اور سبطہ کی حکومت اپنے باپ کے غلاموں سکوت و زرق اللہ کو عطا کی۔ سنہ ۴۴۸ ھ میں محمد بن علی بن حمود نے خروج کیا اور ادریس بن یحییٰ شکست کھا کر قمارش چلا گیا۔ محمد بن ادریس نے مالقہ میں تخت نشین ہو کر اپنا لقب مہدی رکھا اور اپنے بھائی ''سنالی'' کو اپنا ولی عہد بنایا۔ سنہ ۴۴۹ ھ میں محمد بن ادریس نے وفات پائی۔ اس کے فوت ہونے کی خبر سن کر ادریس بن یحییٰ دوبارہ مالقہ میں آ کر تخت نشین ہوا۔ سنہ ۴۵۰ ھ میں ادریس بن یحییٰ نے وفات پائی۔

خاندان حمود کا آخری بادشاہ محمد اصغر:

اس کے بعد محمد اصغر بن ادریس بن علی بن حمود مالقہ کے تخت پر بیٹھا۔ سنہ ۴۵۱ ھ میں بادیس بن حابوس بادشاہ غرناطہ نے مالقہ پر حملہ کر کے محمد اصغر کو مالقہ سے بے دخل کر دیا۔ محمد اصغر مالقہ سے المیریہ چلا آیا اور سنہ ۴۵۶ ھ تک یہاں بہ حالت پریشان مقیم رہا۔ سنہ ۴۵۶ ھ میں ملیلہ (افریقہ) والوں کی درخواست پر افریقہ چلا گیا اور وہاں کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر سنہ ۴۶۰ ھ تک حکومت کرتا رہا۔ محمد اصغر خاندان حمود کا آخری بادشاہ تھا جس نے مالقہ میں سنہ ۴۵۱ ھ تک حکومت کی۔ اسی خاندان حمود کا ایک اور شخص قاسم بن محمد الملقب بہ واثق باللہ صوبہ جزیرہ میں حکمران تھا۔ وہ بھی سنہ ۴۵۰ ھ تک حکمران رہا۔ معتضد بن ابوالقاسم بن عباد بادشاہ اشبیلیہ نے حملہ کر کے سنہ ۴۵۰ ھ میں جزیرہ پر قبضہ کر کے قاسم بن محمد کو گرفتار کر لیا۔ اس طرح خاندان حمود کی حکومت کا اندلس سے خاتمہ ہوا۔

گیارہواں باب

دیگر متحارب سلاطین

بنو عباد، بنو ذوالنون، بنو ہود وغیرہ

خاندان بنوحمود کی حکومت کا حال اوپر ذکر ہو چکا ہے لیکن خاندان بنو امیہ کی حکومت چوتھی صدی ہجری کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ خاندان بنوحمود کا حال بیان کرتے ہوئے ہم سنہ ۴۵۰ھ تک پہنچ گئے۔ حالانکہ حمود کا تعلق جزیرہ نمائے اندلس کے بہت چھوٹے ٹکڑے کے ساتھ رہا ہے۔ ان کے ہم عصر اور بھی خاندان الگ الگ صوبوں پر خود مختارانہ حکومت کر رہے تھے۔ ان سب کے حالات تفصیلی طور پر بیان کرنے میں زیادہ وقت اور زیادہ اوراق صرف نہیں کیے جا سکتے۔ لہٰذا بہ طور اجمال ذیل میں اس طوائف الملوکی کی باقی داستان سنائی جاتی ہے۔ اندلس کی تاریخ کے اس حصہ کو حسرت وافسوس اور خون کے آنسوؤں سے لبریز سمجھنا چاہیے۔ ذیل میں صرف وہ قابل تذکرہ باتیں درج کی جاتی ہیں جن کے وقوع کا زمانہ معلوم ہونے سے واقعات تاریخی کا تسلسل بہ آسانی قائم ہو سکے۔ ذیل کے واقعات کو ملاحظہ فرماتے ہوئے یہ تصور ہمیشہ قائم رکھنا چاہیے کہ شمالی عیسائی حکومتیں دم بہ دم اپنی طاقت اور وسعت کو ترقی دے رہی ہیں اور سب کی تمام تر توجہ اسی کوشش میں صرف ہو رہی ہے کہ مسلمان سلاطین اندلس آپس میں دست وگریباں رہیں اور وہ مسلمانوں کی دولت اور مملکت کو جہاں تک ممکن ہو بہ آسانی غصب کرتے رہیں۔

اشبیلیہ وغربی اندلس (بنو عباد):

بنو عباد میں محمد بن اسماعیل بن قریش قصبہ طشانہ کا صاحب الصلوٰۃ یعنی امام تھا۔ اس کا بیٹا اسماعیل سنہ ۴۱۳ھ میں دربار اشبیلیہ کا وزیر مقرر ہوا۔ سنہ ۴۱۴ھ میں اسماعیل بن محمد کا بیٹا ابوالقاسم محمد اشبیلیہ کا قاضی اور وزیر مقرر ہوا۔ جب قاسم بن حمود اشبیلیہ کی جانب آیا تو ابوالقاسم محمد قاضی اشبیلیہ

اور محمد بن زبیری نے اشبیلیہ پر قابض ہو کر اس کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔

ابو القاسم محمد:

اس کے بعد ابو القاسم محمد نے محمد بن زبیری کو بھی اشبیلیہ سے نکال دیا اور خود اشبیلیہ کا حاکم بن بیٹھا۔ قاسم بن حمود قرمونہ کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں محمد بن عبداللہ برزالی نے سنہ۴۰۴ھ سے اپنی خود مختار حکومت قائم کر رکھی تھی۔ چند روز وہاں رہ کر قاسم بن حمود قلعہ سریش کی طرف چلا آیا تھا اور محمد بن عبداللہ قرمونہ میں بہ دستور فرماں روا رہا۔

ابو عمر عباد:

ابو القاسم محمد کے بعد اس کا بیٹا ابو عمر عباد تخت اشبیلیہ پر متمکن ہوا اور اپنا لقب معتضد رکھا۔ معتضد اور محمد بن عبد والی قرمونہ کے درمیان متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ سنہ۴۳۴ھ میں اسماعیل بن قاسم بن حمود نے محمد بن عبد والی قرمونہ کو قتل کر کے قرمونہ پر قبضہ کیا۔ چند روز کے بعد اسماعیل قرمونہ سے جزیرہ کی طرف چلا گیا اور قرمونہ پر محمد بن عبداللہ کے بیٹے عزیز الملقب بہ مستظہر نے قبضہ کیا۔ چند روز کے بعد معتضد نے قرمونہ، سریش، ارکش اور رندہ وغیرہ مقامات کو فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ ادینہ اور شلطیش پر عبدالعزیز بکری خود مختارانہ حکومت کر رہا تھا۔ معتضد فرماں روائے اشبیلیہ نے اس پر چڑھائی کی۔ اول تو ابن جمہور وزیر السلطنت قرطبہ نے معتضد اور عبدالعزیز کے درمیان دخل دے کر مصالحت کرا دی لیکن ابن جمہور کی وفات کے بعد سنہ۴۴۳ھ میں معتضد نے ادینہ اور شلطیش کو فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور اپنی طرف سے اپنے بیٹے معتمد کو وہاں کی حکومت سپرد کی۔ مقام شلب کے حاکم مظفر نے سنہ۴۲۲ھ میں وفات پائی۔ سنہ۴۴۳ھ میں معتضد نے شلب کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور مظفر کے بیٹے کو وہاں کی حکومت سے بے دخل کر دیا۔ یہ علاقہ بھی معتضد نے اپنے معتمد کو سپرد کیا۔

لبلہ میں ابو العباس احمد بن یحییٰ نے سنہ۴۱۴ھ میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ سنہ۴۲۳ھ میں وہ فوت ہوا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی محمد بن یحییٰ لبلہ کا حاکم و فرماں روا ہوا۔ معتضد نے موقع پا کر لبلہ پر چڑھائی کی۔ بہت سی معرکہ آرائیوں کے بعد محمد بن یحییٰ لبلہ چھوڑ کر اپنے بھتیجے فتح بن خلف بن یحییٰ کے پاس قرطبہ چلا گیا۔ معتضد نے سنہ۴۴۵ھ میں قرطبہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اسی طرح ابن رشیق سے

المیریہ، ابن طیغور سے مرتلہ چھین لیا اور رفتہ رفتہ اپنی حدود حکومت کو خوب وسیع کر لیا اور بنو عباد کی ایک مضبوط ریاست وحکومت قائم کر لی۔ دوسری طرف بادیس بن حبوس نے غرناطہ میں اپنی حکومت قائم کی تھی۔ بادیس بن حبوس اور معتضد کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ ابھی یہ سلسلہ جنگ ختم نہ ہونے پایا تھا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا تھا کہ سنہ ۴۶۱ھ میں معتضد نے وفات پائی۔

معتمد بن معتضد بن اسماعیل:

اس کی جگہ اس کا بیٹا معتمد بن معتضد بن اسماعیل تخت نشین ہوا۔ معتمد نے بھی اپنے باپ کی طرح اپنی حدود حکومت کو وسیع کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ بادیس بن حبوس نے بھی معتمد کی سیادت کو تسلیم کر لیا۔ سنہ ۴۴۷ھ میں کیسٹل اور لیون کے عیسائی بادشاہ فرڈی نند اول نے مسلمانوں کو آپس میں مصروف جنگ دیکھ کر اپنی پوری طاقت سے ریاست اشبیلیہ پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت سے مسلمان رئیسوں نے اپنے مسلمان رقیبوں کے مقابلے میں فرڈی نند کو خراج دینا گوارا کر کے اس سے امداد واعانت طلب کی تھی۔ معتضد نے بھی اس عیسائی بادشاہ کو خراج دینا منظور کر کے اس حملہ سے اپنا پیچھا چھڑایا تھا۔ ہجری سنہ ۴۵۸ھ میں فرڈی نند اول فوت ہوا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا الفانسو چہارم کیسٹل میں تخت نشین ہوا۔ یہ بڑا مغرور ومتکبر شخص تھا۔ سنہ ۴۶۸ھ میں معتمد نے اپنی طاقت کو خوب مضبوط کر کے عیسائی بادشاہ کو خراج دینا موقوف کیا۔

الفانسو چہارم کی اسلامی شہروں پر غارت گری:

مغربی اندلس میں بنو عباد کے علاوہ اور بھی بعض چھوٹے چھوٹے رئیس خودمختارانہ حکومت کر رہے تھے جو بنو عباد کے ماتحت نہ تھے۔ ان میں سے اکثر عیسائی بادشاہ کے زیر حمایت آ گئے تھے۔ الفانسو چہارم اسلامی شہروں کو لوٹ کر اور مسلمان رئیسوں سے خراج وصول کر کے خوب طاقت ور ہو گیا تھا۔ اس نے عیسائیوں کی ایک عظیم الشان فوج جمع کر کے سنہ ۴۷۸ھ میں بنی ذوالنون کے آخری بادشاہ قادر نامی سے طیطلہ چھین لیا اور تمام مسلمان سلاطین کو تنگ کرنا شروع کیا۔

معتمد سے الفانسو کا مطالبہ خراج:

معتمد کے پاس بھی الفانسو چہارم کا سفیر ابن شالب نامی یہودی پہنچا اور زرخراج کا مطالبہ کیا۔ معتمد نے اس یہودی سفیر کے پاس بلاتوقف زرخراج بھیج دیا۔ سفیر نے یہ روپیہ معتمد کے پاس واپس

بھیج دیا اور کہا کہ میں چاندی کے سکے یعنی روپیہ نہ لوں گا بلکہ سونے کے سکے یعنی اشرفیاں وصول کروں گا۔ یہ روپیہ اس پیغام کے ساتھ معتمد کے پاس پہنچا تو اس نے اپنے چند سپاہی بھیج کر سفیر کو اپنے پاس بلوایا اور گستاخی کی سزا میں اس کو ایک لکڑی کے تختے پر لٹا کر اس کے ہاتھ اور پاؤں میں لوہے کی میخیں ٹھکوا دیں اور یہودی سفیر ابن شالب نے اپنے آپ کو معرض ہلاکت میں دیکھ کر معتمد سے التجا کی کہ اگر تو مجھ کو چھوڑ دے تو میں اپنے برابر وزن کر کے سونا حاضر خدمت کروں گا مگر معتمد نے اس کو ہلاک کر کے اس کے ہمراہیوں کو قید کر لیا۔ معتمد جانتا تھا کہ اب الفانسو چہارم کے حملہ آور ہونے میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہا۔ ادھر الفانسو اس خبر کے سننے سے بے حد مشتعل ہوا۔ بہ ظاہر تمام جزیرہ نمائے اندلس پر عیسائیوں کے قابض ہو جانے اور مسلمانوں کی حکومت کے ختم ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی کیونکہ آپس کی خانہ جنگیوں نے مسلمانوں کو اس قابل نہ رکھا تھا کہ وہ عیسائیوں کا مقابلہ کر سکیں۔

یوسف بن تاشفین سے معتمد کی درخواست امداد:

معتمد نے عواقب امور پر نظر کر کے یوسف بن تاشفین بادشاہ مراکش کے پاس اپنی التجا پیش کی کہ یہ وقت امداد و اعانت کا ہے ورنہ اندلس سے اسلام کا نام ونشان گم ہو جائے گا۔ یوسف بن تاشفین خاندان مرابطین کا، جو ابھی چند روز ہوئے افریقہ میں برسر حکومت آیا تھا، ایک نامور اور فتح مند بادشاہ تھا۔ وہ معتمد عبادی کی درخواست پر فوراً اندلس میں آیا اور اشبیلیہ پہنچا۔ ادھر سے الفانسو چہارم اپنی جرار فوج لیے ہوئے اشبیلیہ کی طرف بڑھا۔

میدان ذلاقہ میں عیسائیوں سے تاریخی جنگ:

میدان ذلاقہ میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ یہ مقابلہ سنہ ۴۸۰ھ مطابق ۲۳ اکتوبر سنہ ۱۰۸۶ء کو ہوا۔ یوسف بن تاشفین اور معتمد کی متفقہ فوج یعنی کل اسلامی لشکر کی تعداد بیس ہزار اور عیسائی لشکر کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ یہ لڑائی اندلس کی مشہور لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے کیونکہ اس نے اندلس میں مسلمانوں کے قدم اور کئی سو سال کے لیے جما دیے اور مسلمانوں کا رعب پھر عیسائیوں کے دلوں میں قائم کر دیا۔ اس لڑائی میں طرفین نے کسی قدر کوشش وشجاعت کا اظہار کیا۔ اس کا اندازہ ابن اثیر کی اس روایت سے ہو سکتا ہے کہ الفانسو چہارم میدان جنگ سے صرف تین آدمی لے کر فرار ہوا۔

باقی سب کے سب وہیں کھیت رہے۔ اس عظیم الشان فتح کے بعد مسلمانوں کو موقع حاصل تھا کہ وہ اپنی حالت کو درست کر لیتے مگر یوسف بن تاشفین کے مراکش واپس جانے کے بعد امرائے اندلس میں پھر خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ معتمد بڑا علم دوست اور عالم پرور سلطان تھا۔ مگر فتح ذلاقہ کے بعد معتمد کی عملی زندگی قابل اعتراض ہوگئی۔ اگلے سال یوسف بن تاشفین پھر وارد اندلس ہوا اور اکثر امراء وسلاطین اندلس سے اقرار لے کر اپنا ایک گورنر نگران چھوڑ کر واپس گیا۔ ان سلاطین کی بد اطواریوں نے یوسف بن تاشفین کو موقع دیا کہ وہ براہ راست اس ملک کو اپنی حکومت میں شامل کر لے۔ سنہ ۴۸۴ھ میں معتمد کو یوسف بن تاشفین نے گرفتار کر کے مراکش کے ایک مقام اغمات میں قید کر دیا جہاں وہ چار سال کے بعد سنہ ۴۸۸ھ میں فوت ہوگیا۔ اس طرح بنی عباد کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ علاوہ بنی عباد کے اور بھی چند چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئی تھیں، جن کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے۔

صوبہ بطلیوس (غربی اندلس) میں بنوافطس کی حکومت:

جب اندلس میں شیرازہ خلافت درہم برہم ہوا تو ابومحمد عبداللہ بن مسلمہ معروف بہ ابن افطس نے غربی اندلس کے صوبہ بطلیوس پر قبضہ کر کے اپنی حکومت وخود مختاری کا اعلان کیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوبکر مظفر تخت نشین ہوا۔ مظفر نے نہایت استقلال کے ساتھ حکومت شروع کی۔ اس کی بنوذوالنون اور بنوعباد سے متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ سنہ ۴۴۳ھ میں مظفر کو بطلیوس میں قلعہ بند اور قید ہونا پڑا۔ آخر ابن جہور نے ان متخاصمین کے درمیان صلح کرا دی۔ سنہ ۴۶۰ھ میں مظفر نے وفات پائی اور اس کا بیٹا ابوحفص عمر بن محمد معروف بہ ساجہ تخت نشین ہوا اور اپنا لقب متوکل رکھا۔

یوسف بن تاشفین کا بطلیوس پر قبضہ:

سنہ ۴۸۹ھ میں یوسف بن تاشفین نے بطلیوس پر قبضہ کر کے متوکل اور اس کی اولاد کو عیدالاضحیٰ کے روز قید حیات سے آزاد کیا۔ متوکل کو یہ سزا اس لیے دی گئی کہ وہ عیسائیوں سے خط وکتابت جاری رکھ کر اس کوشش میں مصروف تھا کہ عیسائیوں کو اسلامی مقبوضات پر حملہ آور کرائے اور یوسف بن تاشفین کے اثر کو اندلس سے مٹائے۔ اس سازش سے مطلع ہونے کے بعد یوسف بن تاشفین کے لیے جائز ہوگیا تھا کہ وہ متوکل کا نام ونشان مٹائے اور دوسرے غداروں کے لیے سامان عبرت پیدا کرے۔

قرطبہ میں ابن جہور کی حکومت

جہور، ابوالولید، عبدالملک:

جمہور بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن معمر بن یحییٰ بن ابی الغافر بن ابی عبیدہ کلبی جس کی کنیت ابن حزم تھی، سنہ ۴۲۲ھ میں قرطبہ کے اندر باشندگان قرطبہ کے مشورہ سے حاکم بنایا گیا تھا۔ مگر اس نے ایک مجلس منتظمہ ترتیب دے کر اس کی صدارت قبول کی اور سب کے مشورے کو اپنی حکومت میں شامل رکھا۔ اس نے یہ بھی احتیاط کی کہ قصر شاہی کی جگہ اپنے مکان مسنونہ ہی پر کچہری کی اور اپنے آپ کو بادشاہ یا سلطان نہیں کہلایا۔ وہ بڑا نیک دل اور پاک طینت شخص تھا۔ اس کی حکومت ہر طرح سے قابل تعریف تھی۔ مریضوں کی عیادت کو جاتا اور عوام کی مجلسوں میں بے باکانہ شریک ہوتا تھا۔ محرم سنہ ۴۳۵ھ میں فوت ہو کر اپنے مکان میں مدفون ہوا۔

ابوالولید بن جہور عبدالملک:

اس کی جگہ اس کا بیٹا ابوالولید محمد بن جہور باشندگان قرطبہ کی اتفاق رائے سے حکمران قرطبہ تسلیم کیا گیا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح اہل علم وفضل کا قدردان تھا۔ اس کا عہد حکومت تمام ملوک طوائف میں بہتر اور قابل تعریف سمجھا گیا ہے۔ ابوالولید کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک قرطبہ کا حاکم ہوا۔ اس سے قرطبہ کے لوگ ناراض ہو گئے۔

ابن عطاشہ:

بنو ذوالنون نے قرطبہ پر چڑھائی کی۔ عبدالملک نے بنو عباد سے امداد طلب کی۔ عبادی فوجوں نے بنو ذوالنون کو تو بھگا دیا لیکن خود قرطبہ پر قبضہ کر کے عبدالملک کو قید کر لیا۔ اس طرح سنہ ۴۶۱ھ میں جہور کے خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور معتضد عبادی نے اپنے بیٹے سراج الدولہ کو قرطبہ کا حاکم مقرر کیا لیکن سراج الدولہ کو قرطبہ میں داخل ہونے کے چند ہی روز بعد کسی نے زہر دے کر مار ڈالا اور قرطبہ پر ابن عطاشہ قابض ومتصرف ہو گیا۔

غرناطہ میں ابن حابوس کی حکومت:

جس زمانے میں بنو حمود نے علاقہ میں اپنی حکومت قائم کی تھی، اسی زمانے میں ایک بربری

سردار زادی بن زیری مناد نے غرناطہ میں اپنی حکومت قائم کی۔ اندلس میں خانہ جنگی کا سلسلہ جاری ہوا تو سنہ ۴۱۰ھ میں امیر زادی اپنے بیٹے کو غرناطہ میں اپنا قائم مقام بنا کر خود شاہ قیروان کے پاس افریقہ گیا۔ زادی کی غیر موجودگی میں زادی کے بھائی ماکس بن زیری نے غرناطہ پر قبضہ کر کے اپنے بھتیجے کو بے دخل کر دیا اور خود غرناطہ کا بادشاہ بن گیا۔ سنہ ۴۲۹ھ میں ماکس بن زیری کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا بادیس جو ابن حابوس کے نام سے مشہور تھا، تخت نشین ہوا۔ ابن حابوس کی ابن ذی النون اور ابن عباد سے متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ ابن حابوس کا وزیراعظم اسماعیل نامی ایک یہودی تھا۔ سنہ ۴۶۷ھ میں ابن حابوس کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ اس کا پوتا ابو محمد عبداللہ بن بلکین بن بادیس تخت نشین ہوا اور اپنا خطاب ''مظفر'' رکھا۔ اس نے اپنے بھائی تمیم کو اپنے دادا کی وصیت کے موافق مالقہ کی حکومت پر مامور کیا۔ سنہ ۴۸۳ھ میں مرابطین [1] نے ان دونوں بھائیوں کو معزول و جلاوطن کر کے اغمات کی طرف بھیج دیا۔

طیطلہ میں بنو ذوالنون کی حکومت:

جب اندلس میں فتنہ وفساد کا بازار گرم ہوا تو سنہ ۴۱۹ھ میں اسماعیل بن ظافر بن عبدالرحمٰن سلیمان بن ذی النون نے قلعہ اقلنتین پر قبضہ کر لیا۔ طیطلہ کا عامل یعیش بن محمد بن یعیش طیطلہ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے قابض و متصرف ہو گیا تھا۔ جب سنہ ۴۲۷ھ میں وہ فوت ہوا تو طیطلہ کی فوج کے سرداروں نے اسماعیل کو قلعہ اقلنتین سے طلب کیا کہ آ کر طیطلہ پر قبضہ کر لو۔ چنانچہ اسماعیل بلا مزاحمت طیطلہ پر قابض ہو گیا اور نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ سنہ ۴۲۹ھ میں اسماعیل بن ظافر فوت ہوا تو اس کا بیٹا ابوالحسن یحیٰی تخت نشین ہوا اور اپنا خطاب مامون رکھا۔ مامون نے بڑے زور شور سے حکومت کی۔ اس کی شوکت وعظمت طوائف الملوکی میں سب سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ اس سے سرحدی عیسائی امراء کی متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ منصور اعظم ابن ابی عامر کی اولاد سے ایک شخص مظفر نامی صوبہ بلنسیہ پر قابض تھا۔ مامون نے سنہ ۴۳۵ھ میں بلنسیہ سے اس کو بے دخل کر کے اپنی حدود حکومت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد مامون قرطبہ پر حملہ آور ہوا اور قرطبہ کو بنو عباد کے قبضے سے نکال لیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے ابو عمر کو اہل قرطبہ نے قتل کر ڈالا۔ سنہ ۴۶۷ھ میں

[1] افریقہ کا ایک بربری مسلمان قبیلہ جس نے ۴۵۰ ہجری کے قریب کافی عرصہ تک اندلس کے کچھ علاقوں، افریقہ، مراکش وغیرہ پر حکومت کی۔

مامون کو بھی کسی نے زہر دے کر مار ڈالا۔ اس کے بعد طیطلہ کی حکومت اس کے پوتے قادر بن یحییٰ بن اسماعیل کے قبضے میں آئی۔ سنہ ۴۷۸ھ میں الفانسو کیسٹل کے عیسائی بادشاہ نے طیطلہ پر چڑھائی کی۔ قادر بن یحییٰ نے طیطلہ کو خالی کر دیا اور الفانسو چہارم سے یہ شرط ٹھہرائی کہ صوبہ بلنسیہ پر قبضہ حاصل کرنے میں میری مدد کرنی ہوگی۔ بلنسیہ پر ان دنوں قاضی عثمان بن ابوبکر بن عبدالعزیز قابض ومتصرف تھا۔ باشندگان بلنسیہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ الفانسو چہارم قادر کی حمایت میں بلنسیہ پر فوج کشی کرے گا تو انہوں نے خود ہی عثمان بن ابوبکر کو معزول کر کے قادر بن یحییٰ کو بلا کر اپنا حاکم بنا لیا۔ سنہ ۴۸۱ھ میں قادر نے وفات پائی۔

سرقسطہ میں بنو ہود کی حکومت

ابوایوب سلیمان، احمد مقتدر باللہ، یوسف موتمن اور احمد مستعین:

جب ملک اندلس میں فتنہ وفساد برپا ہوا تو سرقسطہ میں منذر بن مطرف بن یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن محمد حاکم تھا۔ اول منذر نے مستعین کا ساتھ دیا۔ بعد میں اس کی رفاقت ترک کر دی۔ چند روز کے بعد منذر نے سرقسطہ کے صوبہ پر خود مختارانہ حکومت شروع کر کے اپنی آزادی واستقلال کا اعلان کیا اور اپنا خطاب ''منصور'' رکھا۔ جلیقیہ وبرشلونہ کے عیسائی سلاطین سے عہد وپیمان قائم کیے۔ سنہ ۴۱۴ھ میں جب منصور فوت ہوا تو اس کا بیٹا مظفر سرقسطہ میں تخت نشین ہوا۔ اس زمانہ میں ابوایوب بن محمد بن عبداللہ بن موسیٰ بن سالم مولیٰ (ابو حذیفہ کا آزاد غلام) شہر طیطلہ پر قابض ومتصرف تھا۔ سنہ ۴۳۱ھ میں سلیمان نے مظفر کو مغلوب وگرفتار کر کے قتل کیا اور سرقسطہ پر قابض ومتصرف ہوگیا تو مظفر کا بیٹا یوسف لریدہ پر حکمرانی کرنے لگا اور مظفر کے ساتھ لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔

چند روز کے بعد سنہ ۴۳۷ھ میں سلیمان فوت ہوگیا اور اس کا بیٹا احمد باپ کی جگہ مقتدر باللہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ مقتدر باللہ نے یوسف کے خلاف فرانس اور بشکنس کے عیسائی سلاطین سے امداد طلب کی۔ چنانچہ عیسائی سلاطین مقتدر کی مدد کو آئے۔ یوسف نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور سرقسطہ میں مقتدر اور عیسائیوں کو محصور کر لیا۔ یہ سنہ ۴۴۳ھ کا واقعہ ہے۔ اس محاصرہ میں یوسف کو ناکامی ہوئی۔ عیسائی سلاطین اپنے ملکوں کو واپس چلے گئے۔ مقتدر سرقسطہ میں سنہ ۴۷۴ھ تک حکومت

کر کے فوت ہوا۔

اس کی جگہ اس کا بیٹا یوسف سرقسطہ میں تخت نشین ہوا اور اپنا لقب موتمن رکھا۔ یوسف موتمن علوم ریاضیہ میں دست گاہ کامل رکھتا تھا۔ اس فن میں اس نے الاستہلال اور المناظر وغیرہ کئی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ سنہ ۴۷۸ھ میں یوسف موتمن نے وفات پائی۔ اسی سال عیسائیوں نے طیطلہ کو قادر ذی النون کے قبضے سے نکال لیا تھا۔

یوسف موتمن کے بعد اس کا بیٹا احمد تخت نشین ہوا اور اپنا لقب مستعین رکھا۔ اس کے عہد حکومت میں عیسائیوں نے مقام وشقہ کا محاصرہ کر لیا۔ احمد مستعین نے وشقہ کو چھڑانے کے لیے سرقسطہ سے کوچ کیا۔ سنہ ۴۸۹ھ میں بہ مقام وشقہ پر عیسائیوں کے مقابلہ میں سخت جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں احمد مستعین کو شکست ہوئی اور دس ہزار مسلمان میدان جنگ میں شہید ہوئے۔ احمد مستعین سرقسطہ میں آ کر حکومت کرنے لگا۔ عیسائی چونکہ وشقہ میں فتح مند ہو کر چیرہ دست ہو گئے تھے، لہٰذا انہوں نے کامل تیاری کے بعد سنہ ۵۰۳ھ میں سرقسطہ پر چڑھائی کی۔ احمد مستعین نے سرقسطہ سے نکل کر مقابلہ کیا، سخت لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں احمد مستعین نے جام شہادت نوش کیا۔

سرقسطہ کے تخت پر احمد مستعین کا بیٹا عبدالملک متمکن ہوا اور عمادالدولہ اپنا خطاب رکھا لیکن سنہ ۵۱۲ھ میں عیسائی باغیوں نے سرقسطہ پر قبضہ کر کے عمادالدولہ کو نکال دیا۔ عمادالدولہ نے سرقسطہ کی ریاست کے ایک قلعہ روطہ میں جا کر پناہ لی اور وہیں سال بھر مقیم رہنے کے بعد سنہ ۵۱۳ھ میں فوت ہوا۔

اس کا بیٹا احمد قلعہ روطہ میں سیف الدولہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے آبائی ملک کو عیسائیوں سے واپس لینے کے لیے بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ آخر قلعہ روطہ بھی عیسائیوں کے ہاتھ فروخت کر کے مع اہل خاندان طیطلہ میں آ کر رہنے لگا اور وہیں سنہ ۵۳۶ھ میں فوت ہو گیا۔

جزائر شرقیہ میورقہ، منورقہ اور سردانیہ وغیرہ:

سنہ ۲۹۰ھ میں عصام خولانی نے جزیرہ میورقہ کو فتح کیا تھا اور وہی سلطان اندلس کی طرف سے وہاں کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ عصام کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ باپ کی جگہ گورنر میورقہ مقرر ہوا۔

سنہ ۳۵۰ھ تک اس نے حکومت کی۔ اس کے بعد خلیفہ ناصر نے اپنے خادم موفق کو اس جزیرہ کا حاکم مقرر کیا۔ موفق نے فرانس کے ملک پر کئی مرتبہ جہاد کیا۔ سنہ ۳۵۹ھ میں موفق فوت ہوا۔ اب اس کا خادم کوثر نامی اس جزیرہ کا حاکم مقرر ہوا۔ اس نے سنہ ۳۸۹ھ میں وفات پائی۔ اب منصور نے اپنے غلام مقاتل نامی کو اس جزیرہ کی حکومت پر مامور کیا۔ سنہ ۴۰۳ھ میں مقاتل فوت ہوا۔ اس کے بعد مجاہد بن یوسف بن علی عامری گورنر میورقہ مقرر ہوا۔ اس کے بعد عبداللہ حاکم ہوا۔ عبداللہ نے سنہ ۴۱۵ھ میں سردانیہ کو فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کیا۔ سنہ ۴۶۸ھ میں مبشر نامی ایک شخص اس جزیرہ کا حاکم ہوا۔ اب تک جزیرہ میورقہ، منورقہ اور سردانیہ طوائف ملوک میں سے کسی نہ کسی کے ماتحت سمجھے جاتے تھے۔ مبشر نے ان جزیروں کی خود مختارانہ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور فرانس کے ساحل پر اتر کر برابر مصروف جہاد رہا۔ یہاں تک کہ برشلونہ وفرانس کے عیسائی سلاطین نے میورقہ پر چہار سمت سے جنگی جہاز بھیج کر محاصرہ کیا۔ مبشر نے علی بن یوسف بن تاشفین سے امداد طلب کی۔ علی کے جنگی جہازوں نے عیسائیوں کو مار کر بھگا دیا۔ اس کے بعد ان جزائر کی حکومت مرابطین کے قبضے میں چلی گئی۔ ان کے بعد موحدین[1] حکمران ہوئے۔ ان کے آخر ایام حکومت میں ان جزائر پر عیسائیوں کا قبضہ ہوا۔

❶ یہ بھی مرابطین کی طرح شمالی افریقہ کا ایک بڑا حکمران خاندان تھا جو کافی عرصہ تک وہاں کے کچھ جزیروں پر حکومت کرتا رہا۔

بارھواں باب

اندلس میں عیسائیوں کی چیرہ دستی

مرابطین کی حکومت:

حالات و واقعات کے سلسلہ کو مربوط کرنے کے لیے ہم کو پھر کسی قدر پیچھے واپس جانا پڑے گا۔ جزیرہ نما اندلس میں جب اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور طوائف الملو کی شروع ہو گئی تو وہ عیسائی ریاستیں جو مسلمانوں کی کم التفاتی و بے پرواہی کے سبب سے شمالی سرحدوں پر موجود تھیں اور ان کا وجود مسلمانوں کے رحم وکرم پر منحصر تھا، اب اپنی ترقی کے خواب دیکھنے لگیں۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ طوائف الملو کی کو پیدا کرنے اور مسلمانوں کی خانہ جنگی کو جاری رکھنے کے لیے عیسائیوں نے خوب موثر کوششیں کی تھیں اور انہوں نے کوئی موقع اور کوئی وقت ضائع نہیں ہونے دیا۔ الفانسو چہارم نے سنہ۴۶۷ھ میں خود بھی مسلمانوں کے مقابلے کی تیاریاں شروع کیں۔ تمام عیسائی سلاطین کو جو اسلامی اندلس کی سرحدوں پر موجود تھے، تیاری وحملہ آوری کی ترغیب دی اور تمام عیسائیوں کو اپنی حمایت پر آمادہ کیا۔ اس نے سنہ۴۷۸ھ میں طیطلہ کو القادر باللہ کے قبضے سے نکال کر اپنی حکومت میں شامل کیا۔ طیطلہ میں اس نے اول اول مسلمانوں کو وعظ و پند اور پادریوں کی تبلیغ کے ذریعہ سے مذہب عیسوی اختیار کرنے کی ترغیب دی لیکن جب اس کو اس کوشش میں قطعاً ناکامی ہوئی اور ایک مسلمان نے بھی عیسائیت کو قبول کرنا پسند نہ کیا تو الفانسو چہارم نے مسلمانوں پر سختیاں شروع کیں۔ مسجدوں کو منہدم کرنے، بڑی بڑی مسجدوں کو گرجا بنا لینے میں تامل نہیں کیا گیا۔

دوسری طرف ارغون کے عیسائی بادشاہ نے صوبہ بلنسیہ پر فوج کشی کی۔ دھوکے سے اسلامی فوجوں کو قتل کیا۔ رذمیر نامی عیسائی بادشاہ نے سرقسطہ کو مسلمانوں سے چھین لیا اور وہاں کی مسجدوں کو ڈھانے اور مسمار کرنے میں ذرا باک نہیں کیا۔ اس موقع پر قابل تذکرہ بات یہ ہے کہ مسلمان اب تک بارہا عیسائیوں کو ہزیمتیں دے کر ان کے شہروں میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے لیکن کسی ایک موقع

پر بھی عیسائیوں نے مسلمانوں سے یہ سنگ دلی نہیں دیکھی تھیں کہ انہوں نے عیسائیوں کی عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہو۔ عیسائیوں نے جواب مسلمانوں کے شہروں کو فتح کیا تو ان کی تلوار سے پرامن اور بے ضرر رعایا کے بچے، بوڑھے، عورتیں سب قتل ہوئے۔ اس کے بعد بھی مسلمانوں کو جب کبھی عیسائیوں پر فتوحات حاصل ہوئیں، انہوں نے عیسائیوں کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو مطلق ہاتھ نہیں لگایا۔

الفانسو چہارم نے طیطلہ پر قبضہ کرنے کے بعد حکومت اشبیلیہ کی حدود میں قدم بڑھانے کی جرأت کی۔ اشبیلیہ کا بادشاہ معتمد بن معتضد عبادی چونکہ بادشاہ المیریہ سے برسر جنگ تھا، اس نے فوراً زرخراج الفانسو چہارم کے پاس روانہ کیا اور اس بلا کو اپنے سر سے ٹالنا چاہا۔ آخر الفانسو چہارم نے معتمد کے پاس پیغام بھیجا کہ ''میری بیوی جو حاملہ ہے، اس کو تا وضع حمل مسجد قرطبہ میں رکھنا چاہتا ہوں تا کہ وہیں بچہ پیدا ہو۔ اس کے قیام کا بندوبست کر دو اور قصر زہرا بھی اس کے لیے خالی کر دو۔'' قرطبہ ان دنوں معتمد کی حکومت میں شامل تھا۔ معتمد نے الفانسو کی اس درخواست کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اس کے یہودی سفیر کو جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، گستاخی کی سزا میں قتل کر دیا۔ الفانسو چہارم یہ سنتے ہی دریائے وادی الکبیر کے کنارے اشبیلیہ کے محاذ پر آ کر خیمہ زن ہوا اور معتمد کو لکھا کہ فوراً شہر اور محلات شاہی میرے لیے خالی کر دو۔ معتمد نے اس خط کی پشت پر جواب لکھ کر بھیج دیا کہ ہم ان شاء اللہ! بہت جلد تجھ کو تیری گستاخیوں کا مزا چکھا دیں گے۔ اس مختصر جواب سے الفانسو کے قلب پر رعب طاری ہو گیا اور وہ اشبیلیہ پر حملہ کی جرأت نہ کر سکا۔ مگر اس نے اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے تمام ملک اندلس میں یہ مشہور کرا دیا کہ معتمد عبادی نے یوسف بن تاشفین کو اپنی مدد کے لیے مراکش سے بلایا ہے۔ اس خبر کو شہرت دینے میں مصلحت یہ تھی کہ رؤساء اندلس مراکش کے بادشاہ کا اپنے ملک میں داخل ہونا سخت ناپسند کرتے اور اپنی بے عزتی سمجھتے تھے۔ حالانکہ عیسائیوں سے معاہدے کرنے اور عیسائیوں کو خراج ادا کرنے میں ان کو شرم نہیں آتی تھی۔ چنانچہ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی مسلمان سلاطین نے معتمد بن معتضد عبادی بادشاہ اشبیلیہ کو لعنت ملامت کے خطوط لکھے کہ تو نے یوسف بن تاشفین کو کیوں اندلس میں بلانا گوارا کیا؟ معتمد نے ان سب کو یہ جواب لکھا کہ: ''مجھ کو خنزیروں کی پاسبانی سے اونٹوں کی نگہبانی کرنا پسند ہے۔''

مطلب اس کا یہ تھا کہ الفانسو مجھ کو گرفتار کر کے خنزیروں کے چرانے کی خدمت لے گا اور

یوسف بن تاشفین اگر اندلس پر قابض ہو کر اور مجھ کو گرفتار کر کے مراکش لے گیا تو وہاں مجھ سے اونٹ چرانے کا کام لے گا یعنی میں الفانسو کا قیدی بننا گوارا نہیں کرتا، یوسف کا قیدی بننا گوارا کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد معتمد نے ایک وفد یوسف بن تاشفین کے پاس روانہ کیا اور عیسائیوں کے مقابلے میں مدد طلب کی۔ یوسف بن تاشفین فوراً وارد اندلس ہوا۔ الفانسو بھی اس زبردست دشمن کے مقابلے کی تیاریوں میں مصروف ہوا اور اس نے ہر طرف سے بہادر اور تجربہ کار جنگجو فراہم کر کے ساٹھ ہزار تک اپنے لشکر کی تعداد بڑھا لی۔ اس زبردست لشکر کو دیکھ کر الفانسو نے ازراہ کبر وغرور کہا کہ اگر میرے مقابلے کو آسمان سے فرشتے بھی اتر آئیں تو میں اس لشکر سے ان کو بھی شکست دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد الفانسو نے یوسف بن تاشفین کو، جبکہ وہ معتمد کے پاس اشبیلیہ میں پہنچ چکا تھا، ایک خط بھیجا۔ اس خط میں اپنی کثرت فوج اور طاقت وقوت کا ذکر کر کے یوسف کو مغلظات گالیاں بھی دی تھیں۔ یوسف نے اپنے معتمد ابوبکر بن القصیر کو اس خط کا جواب لکھنے کے لیے حکم دیا۔ ابوبکر نے ایک نہایت مدلل ومطول مسودہ لکھ کر پیش کیا۔ یوسف نے یہ کہہ کر کہ اس قدر عبارت آرائی کی ضرورت نہیں ہے، الفانسو کے خط کی پشت پر یہ جملہ اپنے قلم سے لکھ کر روانہ کر دیا کہ:

''جو زندہ بچے گا وہ دیکھ لے گا۔''

اس مختصر جواب کو پڑھ کر الفانسو خوف زدہ ہو گیا۔ آخر ذلاقہ کے میدان میں جنگ عظیم برپا ہوئی۔ اسلامی لشکر کی کل تعداد بیس ہزار کے قریب تھی اور عیسائی لشکر ساٹھ ہزار سے زیادہ تھا۔ بروز چہار شنبہ ماہ رجب سنہ ۴۷۹ھ جب اسلامی لشکر آگے بڑھا تو الفانسو نے پیغام بھیجا کہ ہم ہفتہ کے روز نبرد آزما ہوں گے۔ یوسف ومعتمد نے اس درخواست کو منظور کر لیا لیکن الفانسو نے اسلامی لشکر کو دھوکا دیا تھا۔ اس نے جمعہ کے روز بے خبری میں حملہ کیا۔ اس سے اسلامی لشکر میں ایک قسم کی پریشانی نمودار ہوئی لیکن مسلمانوں نے سنبھل کر عیسائیوں کے حملہ کو روکا اور بڑی بہادری سے لڑنے لگے۔ معتمد کی ران کے نیچے اس روز تین گھوڑے ہلاک ہوئے اور وہ بڑی بہادری سے لڑا۔ یوسف نے جب حملہ کیا تو عیسائی تاب مقابلہ نہ لا سکے۔ الفانسو بھی اس لڑائی میں زخمی ہوا اور اپنی تمام فوج اس میدان میں کٹوا کر ۲۰ ماہ رجب سنہ ۴۷۹ھ کو چند سو آدمیوں کے ساتھ میدان ذلاقہ سے فرار ہوا۔ اسلامی لشکر اس فتح کے بعد چار روز یعنی ۲۴ ماہ رجب تک اسی میدان میں مقیم رہا۔ معتمد نے مال غنیمت کی نسبت یوسف بن تاشفین کی خدمت میں عرض کیا کہ کس طرح تقسیم کیا جائے؟ یوسف نے

کہا کہ میں تمہاری مدد کرنے آیا ہوں، مال غنیمت حاصل کرنے نہیں آیا۔ ذلاقہ سے یوسف ومعتمد دونوں اشبیلیہ آئے۔ یہاں یوسف چند روز مقیم رہ کر افریقہ واپس چلا گیا۔ الفانسو اس شکست کے بعد مخبوط الحواس ہو گیا تھا مگر مسلمان رؤسا نے عیسائیوں کی اس عظیم الشان شکست سے کوئی فائدہ نہیں اٹھانا چاہا بلکہ پہلے کی طرح پھر خانہ جنگی میں مصروف ہو گئے۔ مسلمانوں کی اس حالت کو دیکھ کر عیسائیوں نے پھر ہمت کی اور فوجی تیاریوں میں مصروف ہو کر مسلمانوں کے قبضے سے شہروں کو نکالنا شروع کر دیا اور اشبیلیہ کے بعض قلعوں پر بھی قابض ہو گئے۔

ماہ ربیع الاول سنہ ۴۸۱ھ میں امراء اندلس کی درخواست پر یوسف بن تاشفین کو پھر اندلس میں آنا پڑا مگر اس مرتبہ اندلس کے مسلمانوں کی ذلت و بدنصیبی یہاں تک ترقی کر چکی تھی کہ وہ یوسف بن تاشفین کے ساتھ ایک کیمپ میں شامل ہو کر پھر آپس میں لڑنے سے باز نہ رہے۔ یوسف اس حالت کو دیکھ کر برداشتہ خاطر ہوا اور مراکش کی جانب واپس چلا گیا۔

دو سال کے بعد سنہ ۴۸۳ھ میں یوسف بن تاشفین عیسائیوں کو سزا دینے کے لیے پھر اندلس میں آیا کیونکہ اندلس کے مسلمان سلاطین یوسف بن تاشفین کو اپنا نگران تسلیم کر چکے تھے اور عیسائیوں کو اپنے مقبوضات پر حملہ آور دیکھ کر یوسف بن تاشفین سے خواہان امداد ہوا کرتے تھے۔ اس مرتبہ یوسف بن تاشفین عیسائی فوجوں کو پیچھے ہٹاتا اور شکست دیتا ہوا شہر طیطلہ کے سامنے جا پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ الفانسو چہارم نے طیطلہ کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا تھا اور وہ طیطلہ میں موجود تھا۔ یوسف نے طیطلہ کا محاصرہ کر کے امرائے اندلس سے امداد چاہی کہ محاصرہ کو کامیاب بنانے میں شریک ہوں لیکن کسی نے مدد نہ کی۔ بالخصوص عبداللہ بن بلکین بادشاہ غرناطہ نے کہ اس پر ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی تھی، مطلق التفات نہ کیا۔ یوسف کو مجبوراً محاصرہ اٹھا کر طیطلہ سے واپس ہونا پڑا اور اس نے امرائے اندلس کو ٹھیک کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اس نے عبداللہ حاکم غرناطہ اور اس کے بھائی تمیم حاکم مالقہ کو گرفتار کر لیا اور افریقہ بھیج دیا۔

اس کے بعد ماہ رمضان المبارک سنہ ۴۸۳ھ میں یوسف بن تاشفین اپنے بھتیجے اور سپہ سالار سیر بن ابی بکر بن تاشفین کو مع فوج اندلس میں عیسائیوں کی سرکوبی کے لیے چھوڑ کر خود افریقہ چلا گیا۔ اس سپہ سالار نے الفانسو پر فوج کشی کی اور کئی مقامات اس سے لڑ کر چھین لیے۔ اس جہاد میں اندلس کے مسلمان امراء کو سیر بن ابی بکر کی امداد کرنی لازمی تھی مگر ان بدبختوں نے اس کی امداد اور عیسائیوں

کے مقابلے سے صاف انکار کر دیا۔ سیر بن ابی بکر نے امراء اندلس کی نالائقیوں پر کوئی التفات نہ کر کے اپنی فتوحات اور عیسائیوں کے مقابلے کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک معقول حصہ ملک مع صوبہ پرتگال عیسائیوں سے چھین لیا اور بعض عیسائی رئیسوں سے اقرار اطاعت بھی لے لیا۔ جب اس سپہ سالار کے قبضے میں ایک حصہ ملک بھی آ گیا اور اندلس میں اس کے قدم اچھی طرح جم گئے تو اس نے یوسف بن تاشفین کو لکھا کہ ہمارے قبضہ میں جزیرہ نما کے اندر ایک کافی رقبہ آ گیا ہے جو ہم نے عیسائیوں سے فتح کر لیا ہے لیکن اندلس کے مسلمان امراء نے ہماری مطلق امداد نہیں کی اور وہ ہماری نسبت عیسائیوں کے ساتھ مودت و محبت کے تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں اور اپنے طرز عمل سے اسلام کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ان کی نسبت بھی کوئی حکم صادر فرمایا جائے۔

یوسف بن تاشفین نے سیر بن ابی بکر کو لکھا کہ تم عیسائیوں پر جہاد کے سلسلہ کو جاری رکھو اور امرائے اندلس سے پھر امداد و اعانت کی خواہش کرو۔ اگر وہ اس کام میں تمہارے شریک ہو جائیں تو ان سے تعرض نہ کرو اور اگر وہ عیسائیوں کے مقابلے میں تمہاری حمایت و ہمدردی نہ کریں تو تم ان کے ملکوں کو بھی ان سے چھین لو مگر اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھو کہ اول ان مسلمان امراء کی ریاستوں پر قبضہ کرو جو عیسائیوں کی سرحدوں پر واقع ہیں تاکہ مسلمانوں کے قبضے سے نکل کر کوئی مقام عیسائیوں کے قبضے میں نہ جا سکے۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور سب سے پہلے سیر بن ابی بکر نے ابن ہود بادشاہ سرقسطہ کی طرف توجہ کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سرقسطہ اس سے پہلے عیسائیوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ سرقسطہ کا مسلمان بادشاہ مقام روطہ میں مقیم اور اسی کے نواحی علاقہ پر قابض تھا۔ روطہ کو سیر نے بہ آسانی فتح کر لیا۔ اس کے بعد ماہ شوال سنہ ۴۸۴ھ میں عبدالرحمٰن بن طاہر سے مرسیہ چھین کر اس کو افریقہ کی جانب بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد المیریا اور بطلیوس پر بھی قبضہ کر لیا گیا، پھر قرمونہ، بیجہ، بلات، ملاقہ، قرطبہ وغیرہ مقامات کو تسخیر کیا۔ معتمد بادشاہ اشبیلیہ نے مرابطین کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کی۔ یہی سب سے بڑا طاقتور بادشاہ تھا جو اندلس میں باقی رہ گیا تھا۔ اس نے الفانسو چہارم سے بھی امداد طلب کی۔ چنانچہ الفانسو نے عیسائیوں کی ایک فوج معتمد کی مدد کے لیے بھیج دی۔ اس امدادی فوج کے آنے کا حال سن کر سپہ سالار سیر بن ابی بکر نے فوراً ایک طرف اشبیلیہ کا محاصرہ کیا اور دوسری طرف ایک سردار کو عیسائی لشکر کی روک تھام کے لیے روانہ کر دیا۔ اس سردار

نے عیسائیوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ ادھر سیر بن ابی بکر نے اشبیلیہ کو فتح کر کے معتمد کو مع اہل خاندان قید کر کے افریقہ بھیج دیا۔ جہاں وہ نظر بندی کی حالت میں رہنے لگا اور سنہ ۴۸۸ھ ماہ ربیع الاول میں فوت ہوا۔

تمام اندلس پر یوسف بن تاشفین کا قبضہ:

سنہ ۴۸۵ھ میں تمام اسلامی اندلس یوسف بن تاشفین کے تحت وتصرف میں آ گیا اور طوائف الملوکی کا خاتمہ ہو کر یوسف بن تاشفین بادشاہ مرابطین کے وائسرائے اور گورنر اندلس پر حکمرانی کرنے لگے۔ اس طرح وہ ملک جو پارہ پارہ ہو کر عیسائیوں کے قبضے میں جانے والا تھا، مراکش کے مسلمان بادشاہ کے قبضے میں آ کر محفوظ ہو گیا اور عیسائیوں کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اب بھی عیسائی جزیرہ نما کے شمالی علاقوں پر قابض تھے لیکن اندلس کا بڑا حصہ اور آباد و زرخیز جنوبی علاقہ مسلمانوں کے زیر حکومت تھا۔ یوسف بن تاشفین کو سنہ ۴۷۹ھ میں خلیفہ بغداد مقتدی بامراللہ نے امیر المسلمین کا خطاب اور خلعت وعلم بھیجا تھا۔

یوسف بن تاشفین کی وفات:

اندلس پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد امیر المسلمین یوسف بن تاشفین پندرہ سال تک زندہ رہا اور محرم سنہ ۵۰۰ھ میں فوت ہوا۔ اندلس میں یہ زمانہ امن وامان کا گزرا۔ اگرچہ اندلس کے عربی النسل باشندے مرابطین کی حکومت وسلطنت سے اس لیے کبیدہ خاطر رہے کہ وہ بربری لوگوں کو اپنے اوپر حکمران دیکھنا پسند نہ کرتے تھے لیکن یہ ان کی غلطی تھی۔ اگر بربری مسلمان ان پر حکمران نہ ہوتے تو ان کو عیسائیوں کی غلامی کرنی پڑتی۔

ابوالحسن علی بن یوسف بن تاشفین:

امیر المسلمین یوسف بن تاشفین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوالحسن علی بن یوسف بن تاشفین ۲۳ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ سنہ ۵۰۳ھ میں علی بن یوسف نے طیطلہ کا محاصرہ کیا۔ یہ شہر اپنی مضبوط فصیل اور محل وقوع کی خوبی کے سبب سے فتح نہ ہو سکا۔ مگر علی بن یوسف نے وادی الحجارہ اور اس نواح کے اکثر شہروں کو فتح کر لیا۔ اسی سال بشونہ (لسبن) اور پرتگال کے بقیہ شہروں کو بھی عیسائیوں سے چھین لیا گیا۔ علی بن یوسف نے اپنے بھائی تمیم بن یوسف کو اندلس کا نائب السلطنت

(وائسرائے) مقرر کیا تھا۔ تمیم نے الفانسو اول بن رومیر بادشاہ برشلونہ کی جنگی تیاریوں کا حال سن کر اس کی پیش قدمی کو اپنے حملے سے روک دیا اور سرقسطہ کو عیسائیوں سے فتح کر کے اسلامی مقبوضات کو وسیع کیا۔ بادشاہ برشلونہ نے شاہ فرانس کو اپنی مدد پر آمادہ کر کے سنہ ۵۱۲ھ میں سرقسطہ کا محاصرہ کر لیا۔ عیسائیوں کی فوجیں سامان حرب اور کثرت تعداد کے سبب اس قدر زیادہ طاقتور تھیں کہ سرقسطہ کے مسلمان تاب مقاومت نہ لا سکے۔ سامان رسد کی نایابی سے جب جان پر آبنی تو انہوں نے شہر کا دروازہ کھول دیا۔ اس طرح سرقسطہ عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا اور اس صوبے کے دوسرے شہروں اور قلعوں کو بھی عیسائیوں نے فتح کر لیا۔ یہ رنج دہ خبر جب علی بن یوسف کو پہنچی تو وہ مراکش سے سنہ ۵۱۳ھ میں اندلس آیا اور اشبیلیہ و قرطبہ ہوتا ہوا سرقسطہ پہنچا اور اس تمام علاقہ کو جو عیسائیوں نے فتح کیا تھا، فتح کر کے اور اچھی طرح سے عیسائیوں کو سزا دے کر اور اقرار فرماں برداری لے کر سنہ ۵۱۵ھ میں واپس مراکش پہنچا۔ الفانسو چہارم جس نے طیطلہ کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا تھا سنہ ۵۱۳ھ میں فوت ہو گیا تھا لیکن الفانسو اول بادشاہ برشلونہ موجود تھا۔ اسی کو ابن رومیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ علی بن یوسف کے اندلس سے مراکش جاتے ہی ابن رومیر نے اسلامی مقبوضات پر چڑھائی کر دی۔ اس چڑھائی کا سبب یہ تھا کہ غرناطہ کے عیسائی باشندوں نے اس کو لکھا تھا کہ تم غرناطہ پر حملہ کرو۔ ہم تمہارے اس حملہ کو کامیاب بنانے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ چنانچہ ابن رومیر غرناطہ تک اپنی زبردست فوجیں لیے ہوئے پہنچ گیا۔ عیسائیوں کی امیدوں پر درحقیقت یوسف بن تاشفین کی فتوحات سے پانی پھر گیا تھا اور وہ مرابطین سے بہت ڈرتے تھے لیکن خود اندلس کے بعض مسلمان باشندے مرابطین کی عداوت میں عیسائیوں کی ہمدردی کا دم بھرتے تھے۔ اس رذیلانہ طرز عمل سے عیسائیوں کی ہمتیں پھر بڑھ گئی تھیں اور وہ مرابطین کی فوجوں کے مقابلے پر نکلنے لگے تھے۔ ابن رومیر کا یہ حملہ بھی اسی وجہ سے ہوا تھا۔ مگر ذوالحجہ سنہ ۵۱۵ھ میں غرناطہ کے قریب مسلمانوں نے اس کو تمیم بن یوسف بن تاشفین کی سرداری میں ایسی شکست دی کہ وہ آدھی فوج ضائع کر کے برشلونہ کی طرف بھاگ گیا۔ غرناطہ اور اس کے نواح میں عیسائی زیادہ آباد تھے اور وہ ہمیشہ مسلمانوں کی مخالفت اور عیسائی سلاطین کی کامیابی کے لیے سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ ان حالات سے واقف ہو کر علی بن یوسف نے سنہ ۵۱۶ھ میں خود اندلس میں آ کر بہت سے عیسائیوں کو جو غرناطہ اور اس کے نواح میں سکونت پذیر تھے، افریقہ کی جانب بھیج دیا۔ بعض کو اندلس کے دوسرے مقامات

میں منتقل کر دیا۔

سنہ ۵۲۰ھ میں ابوطاہر تمیم بن یوسف نے اپنے بیٹے تاشفین بن علی بن یوسف بن تاشفین کو اندلس کا وائسرائے مقرر کیا۔ ۳۶ برس، سات مہینے مراکش واندلس پر حکومت کرنے کے بعد ماہ رجب سنہ ۵۳۷ھ میں علی بن یوسف کا انتقال ہوا۔

ابومحمد تاشفین:

اس کی جگہ اس کا بیٹا ابومحمد تاشفین تخت نشین ہوا۔ سنہ ۵۱۶ھ میں علی بن یوسف آخری مرتبہ اندلس میں آیا تھا۔ اس کے بعد اس کو اندلس آنا نصیب نہ ہوا بلکہ وہ محمد بن عبداللہ المعروف بہ مہدی موعود کے جھگڑوں میں مصروف رہا۔ یہ جدید دشمن جو ملک مراکش میں پیدا ہوا تھا اور جس کا مفصل حال آگے آتا ہے، دم بہ دم ترقی کرتا رہا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ علی کا بیٹا ابومحمد تاشفین بھی باپ کے بعد تخت نشین ہوتے ہی مراکش کے اندرونی ہنگامے میں اس طرح مصروف ہوا کہ اندلس کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔

تاشفین بن علی:

سنہ ۵۳۷ھ میں جب تاشفین بن علی اندلس سے مراکش جا کر باپ کی جگہ تخت نشین ہوا تو اس نے یحییٰ بن علی بن غانیہ کو اندلس کا وائسرائے مقرر کیا تھا۔ یحییٰ نے جہاں تک ممکن ہوا، اندلس کو بچایا اور عیسائیوں کے زور کو گھٹانے میں مصروف رہا۔ ادھر دم بہ دم سلطنت مرابطین میں ضعف وانحطاط کی علامات نمودار ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ ۲۷ رمضان سنہ ۵۳۹ھ میں تاشفین بن علی بحالت ناکامی ومایوسی عبدالمومن سے شکست کھا کر فوت ہوا۔

ابراہیم بن تاشفین:

اس کے بعد اس کا بیٹا ابواسحاق ابراہیم بن تاشفین بن علی بن یوسف بن تاشفین شہر مراکش میں تخت نشین ہوا لیکن سنہ ۵۴۱ھ میں عبدالمومن نے مراکش کو فتح کیا اور ابراہیم بن تاشفین کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس طرح سلطنت مرابطین کا خاتمہ ہوا۔ اندلس میں جب عبدالمومن کے چیرہ دست ہونے اور مرابطین کے مغلوب ومجبور ہونے کی خبریں پہنچیں تو عیسائیوں نے پھر بڑے زور شور کے ساتھ اسلامی مقبوضات پر حملے شروع کر دیئے۔

سنہ ۵۲۸ھ میں ابن رومیر نے بعض شہروں کو فتح کیا تو یحییٰ بن علی نے اس کے مقابلہ پر پہنچ کر ایک سخت لڑائی کے بعد ابن رومیر کو قتل کیا اور اس طرح سلطنت اسلامیہ کا رعب قائم کر دیا۔

اندلس پر مرابطین کی حکومت کے خاتمہ کا اثر:

دربار مرابطین کی درہمی و برہمی کا حال سن کر ملک اندلس کے والیوں نے جابجا اپنی اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ جس طرح خلافت بنوامیہ کی بربادی کے بعد ملک اندلس میں طوائف الملوکی شروع ہوگئی تھی۔ اسی طرح اب بھی جو شخص جس شہر یا قلعہ کا حاکم تھا وہ خودمختار فرماں روا بن بیٹھا بلکہ پہلی طوائف الملوکی میں خودمختار رئیسوں کی تعداد کم اور ان کے مقبوضہ علاقے وسیع تھے۔ اس مرتبہ اسلامی اندلس بہت ہی چھوٹے چھوٹے کثیر التعداد ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ شہر شہر اور قصبے قصبے میں الگ الگ سلطنتیں قائم ہوگئیں اور سب نے شاہانہ خطاب ولقب اپنے لیے تجویز کر لیے۔ یہاں تک بھی کچھ زیادہ افسوس کی بات نہ تھی اگر یہ سب ایک دوسرے کے دشمن نہ بنتے لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ آپس میں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے پر آمادہ ہو گئے اور تمام اسلامی اندلس لڑائیوں اور ہنگامہ آرائیوں کے شوروغل سے گونج اٹھا۔ ایسی حالت میں عیسائیوں کے لیے تمام جزیرہ نما پر قابض ہو جانے کا زریں موقع مل چکا تھا۔ خود یحییٰ بن علی وائسرائے اندلس بھی قرطبہ پر قبضہ کر کے انہیں طوائف ملوک کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا اور دوسروں سے زیادہ طاقتور نہ تھا۔ اسی حالت میں عبدالمومن سردار موحدین نے سلطنت مرابطین کو مراکش سے مٹا کر بلاتوقف اپنا ایک سپہ سالار اندلس کی طرف روانہ کیا اور سنہ ۵۴۲ھ میں اندلس پر قابض ہوگیا اور چند روزہ طوائف الملوکی کے بعد اندلس اسی طرح موحدین کی حدود سلطنت میں شامل ہوگیا۔

مرابطین کے عہد حکومت میں فقہاء کا خوب زور شور تھا۔ یوسف اور علی دونوں بادشاہ مالکی مذہب کے پیرو اور فقہاء کے بے حد قدردان تھے۔ بڑے عابد زاہد اور علم دوست فرماں روا تھے۔ مگر وہ اس معاملے میں اس قدر بڑھ گئے تھے کہ فلسفہ اور علم کلام کے جانی دشمن مشہور تھے۔ قاضی عیاض نے شکایت کر کے امام غزالی کی تصانیف کے خلاف دربار شاہی سے احکام جاری کرا دیے تھے جن کی رو سے ہر ایک وہ شخص جس کے پاس سے امام غزالی[1] کی کوئی مصنفہ کتاب برآمد ہو، کشتنی و گردن زدنی قرار دیا جاتا تھا۔

---

[1] امام غزالی کی تصانیف میں تصوف، فلسفہ وغیرہ مباحث وعناوین موجود ہیں۔

تیرھواں باب

اندلس پر موحدین کی حکومت

محمد بن عبداللہ تومرت:

محمد بن عبداللہ بن تومرت جو ابن تومرت کے نام سے مشہور ہے، ملک مراکش کے علاقہ سوس کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ بربروں کے قبیلہ مسمودہ سے تھا مگر بعد میں اس نے دعویٰ کیا کہ میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہوں اور اپنا سلسلہ نسب حسن بن علی رضی اللہ عنہ تک پہنچایا۔

سنہ۵۰۱ھ میں ابن تومرت اپنے وطن علاقہ سوس سے روانہ ہو کر ممالک مشرقیہ کی طرف گیا اور حصول علم میں چودہ سال تک وطن سے باہر رہا۔ ابوبکر شاشی سے بغداد میں اصول فقہ اور دیگر دینی علوم حاصل کیے۔ مبارک بن عبدالجبار اور دوسرے بزرگوں سے حدیث پڑھی۔

امام غزالی کی پیش گوئی:

امام غزالی کی خدمت میں بھی حاضری کا شرف حاصل کیا۔ ایک روز جبکہ امام غزالی کی خدمت میں ابن تومرت بھی موجود تھا، کسی نے عرض کیا کہ آپ کی کتابوں کو امیر المسلمین علی بن یوسف بن تاشفین فرماں روائے مراکش و اندلس نے جلا ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ امام ممدوح نے کہا کہ اس کا ملک برباد ہو جائے گا اور میرا خیال ہے کہ اس کے ملک و سلطنت کی بربادی اسی شخص کے ذریعہ سے عمل میں آ جائے گی جو اس وقت ہماری مجلس میں موجود ہے۔ امام موصوف نے یہ الفاظ فرماتے ہوئے ابن تومرت کی طرف اشارہ کیا۔ اسی روز سے ابن تومرت کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ مرابطین کی سلطنت کو مٹایا جائے جو تقلید جامد کی حامی اور روشن خیالی کی دشمن ہے۔ چنانچہ ابن تومرت اپنے وطن کی طرف متوجہ ہوا۔ راستے میں اسکندریہ میں چند روز قیام کیا اور وہاں امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے باز نہ رہا۔ والی اسکندریہ نے اپنے شہر سے نکلوا دیا۔ غرض ابن تومرت کی یہ صفت خاص طور پر قابل تذکرہ ہے کہ وہ لوگوں کو نصیحت کرنے اور برائیوں سے روکنے میں مطلق باک نہ کرتا تھا۔

عابد زاہد اور نہایت اللہ والا شخص تھا۔ ابن تومرت کے مذہبی عقیدے کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ اشاعرہ، متکلمین اور امامیہ کا مجموعہ تھا۔ ابن تومرت کی نسبت ابن خلقان لکھتا ہے کہ وہ متقی و پرہیزگار شخص تھا۔ نہایت زاہدانہ زندگی بسر کرتا۔ اس کی پوشاک وغذا نہایت سادہ ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ خوش نظر آتا اور عبادات کی جانب مائل رہتا تھا۔ ابن تومرت نہایت فصاحت کے ساتھ عربی زبان بولتا تھا۔ مراکشی زبان تو اس کی مادری زبان تھی۔ سنہ ۵۱۵ھ میں وہ اپنے وطن میں آیا اور لوگوں کو وعظ و پند کرنے لگا۔

عبدالمومن مرید خاص ابن تومرت:

اسی عرصہ میں اس کے پاس ایک شخص عبدالمومن نامی جو ایک بربری قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، آیا اور خاص الخاص تلامذہ و مریدین کے زمرہ میں شامل ہوا۔ عبدالمومن اپنے فطری جذبات وخیالات میں ابن تومرت سے پوری مشابہت رکھتا تھا۔ ابن تومرت کی جانب لوگ بڑی کثرت سے متوجہ ہونے لگے۔ امیرالمومنین کے فقہائے دربار نے امیر کو مشورہ دیا کہ ابن تومرت کو قتل کر دیا جائے لیکن علی بن یوسف نے کہا کہ مجھ کو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس کو قتل کروں۔ آخر فقہاء کے اصرار پر اس کو شہر مراکش سے نکلوا دیا گیا۔ ابن تومرت نے اپنے رفیقوں کے ساتھ سلسلہ کوہ اطلس کے ایک گاؤں میں قیام کیا اور وہاں بربری قبائل جوق در جوق آ آ کر اس کی جماعت میں شامل ہونے لگے۔

ابن تومرت کا دعویٰ مہدویت:

چند روز کے بعد ابن تومرت نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنے مریدین کے طبقات مقرر کیے۔ طبقہ اول کے لوگوں کو مہاجرین اور طبقہ دوم کے لوگوں کو مومنین کا خطاب دیا۔ اسی طرح سات یا آٹھ طبقات قائم کیے۔ جب جمعیت بڑھ گئی تو عبدالمومن کو سپہ سالار بنا کر سلطنت مرابطین کے خلاف جنگی کارروائیاں شروع کیں۔ پہلے مقابلے میں مومنین کی جماعت کو شکست ہوئی مگر بعد میں انہوں نے مخالفت اور زور آزمائی کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ملک مراکش کے ایک معقول حصے پر ابن تومرت کا قبضہ ہوگیا۔ ابن تومرت نے سنہ ۵۱۷ھ سے جنگی کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ سات سال کی لڑائیوں کے بعد سنہ ۵۲۴ھ میں ابن تومرت نے وفات پائی اور مرنے سے پہلے عبدالرحمٰن کو امیرالمومنین کا خطاب دے کر اپنا ولی عہد و جانشین مقرر

کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابن تومرت کی حکومت مرابطین کی مدمقابل اور خوب طاقتور بن چکی تھی۔

عبدالمومن:

عبدالمومن کے باپ کا نام علی تھا جو قبائل مسموده کے قبیلہ کومیہ کا ایک فرد تھا۔ عبدالمومن سنہ۴۸۷ھ میں پیدا ہوا تھا۔ سنہ۵۳۷ھ میں جبکہ علی بن یوسف بن تاشفین کا انتقال ہوا، عبدالمومن کی حکومت پورے طور پر تمام ملک مراکش میں مسلم ہوگئی۔ ابن تومرت کی تعلیم کا خلاصہ اور لب لباب چونکہ اللہ تعالیٰ کی کامل توحید کو آشکارا کرنا تھا اور اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کو وہ اس کی ذات سے جدا یقین نہیں کرتا تھا، اس لیے اس کے تمام مریدین عام طور پر موحدین کے نام سے پکارے گئے۔

عبدالمومن کے اندلس پر قابض ہونے کی تفصیلات:

عبدالمومن نے مراکش پر قابض ومتسلط ہونے کے بعد سنہ۵۳۶ھ میں اپنے ایک سردار ابوعمران موسیٰ بن سعید کو اندلس روانہ کیا۔ اس نے سب سے اول جزیرہ طریف پر قبضہ کیا۔ پھر اگلے سال بالقہ واشبیلیہ کی طرف بڑھا۔ اس کے بعد قرطبہ پر بھی موحدین کا قبضہ ہوگیا۔ سنہ۵۴۱ھ میں عبدالمومن نے خود اندلس آنے کا قصد کیا لیکن عین روانگی کے وقت مراکش کی مشرقی حدود میں فتنہ وبغاوت کے نمودار ہونے کی خبر سن کر رک گیا اور اپنے بیٹوں کو اندلس روانہ کیا۔ چنانچہ ابوسعید بن عبدالمومن نے السیرہ کو فتح کیا۔ قرطبہ اس سے پہلے سنہ۵۴۵ھ میں عبدالمومن کے سردار یحییٰ بن میمونہ نے جبکہ عیسائی اس کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، عیسائیوں کو بھگا کر خود فتح کرلیا تھا۔ سنہ۵۴۸ھ میں عبدالمومن آبنائے جبل الطارق کو عبور کرکے وارد اندلس ہوا اور اندلس کے اس جنوبی ساحل پر ایک شہر کا سنگ بنیاد رکھا، جس کا نام الفتح رکھا گیا۔ یہیں اندلس کے تمام والی اور امراء آ آ کر عبدالمومن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سب نے اقرار اطاعت کیا اور اپنی فرماں برداری کا یقین دلایا۔ اس طرح تمام اسلامی اندلس پھر ایک سلطنت سے وابستہ ہوگیا۔

سنہ۵۵۵ھ میں عبدالمومن نے اپنے بیٹے ابوسعید کو غرناطہ کا حاکم اور تمام اسلامی اندلس کا وائسرائے مقرر کیا۔ سنہ۵۵۶ھ میں ابوسعید کو باپ کے پاس مراکش جانا پڑا۔ اس کی غیر موجودگی میں ابراہیم نامی ایک شخص نے موقع پاکر غرناطہ پر قبضہ کرلیا اور خودمختاری کا اعلان کیا۔ یہ خبر سن کر ابوسعید مع اپنے بھائی ابوحفص کے اندلس آیا۔ ابراہیم نے غرناطہ سے نکل کر مقابلہ کیا۔ سخت لڑائی

ہوئی، ابوحفص اس لڑائی میں مارا گیا۔ ابوسعید نے شکست کھائی اور مالقہ میں جا کر قیام کیا۔ ابراہیم کا داماد مردینش، مرسیہ و جیان کا حاکم تھا۔ اس نے بھی ابراہیم کا ساتھ دیا اور ملک اندلس پھر معرض خطر میں پڑ گیا۔ عبدالمومن نے سنہ ۵۵۷ھ میں اپنے تیسرے بیٹے ابویعقوب اور اپنے فوجی سردار شیخ ابویوسف بن سلیمان کو ابوسعید کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ ادھر ابوسعید نے بھی مالقہ میں کافی فوج فراہم کر لی تھی۔ غرض غرناطہ کے متصل پھر نہایت زبردست جنگ برپا ہوئی۔ اس لڑائی میں لشکر موحدین کو فتح حاصل ہوئی۔ مردینش جیان کی جانب بھاگ گیا اور ابراہیم نے عفو کی درخواست کی، جو منظور ہوئی۔ اس بغاوت کے فرو ہونے کے بعد عبدالمومن کے لیے کوئی پریشانی باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ اس نے افریقہ و اندلس میں فوجوں کے جمع کرنے کا اہتمام کیا۔ تین لاکھ فوج مراکش میں عبدالمومن کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئی اور دو لاکھ کے قریب مسلمان اندلس میں جہاد کے لیے آمادہ و متحد ہو گئے۔ اس طرح اس پانچ لاکھ کے لشکر کو لے کر عبدالمومن نے ارادہ کیا کہ اندلس کی شمالی عیسائی ریاستوں کو فتح کرتا ہوا یورپ کو مغلوب و مفتوح بنائے۔ اگر عبدالمومن کی عمر وفا کرتی تو وہ عیسائیوں کے خلاف اس جہاد میں یقیناً کامیابی حاصل کرتا لیکن عین اس وقت جبکہ وہ اس جہاد کے لیے اپنی کثیر التعداد فوج کے ساتھ روانہ ہونے کو تھا، جمادی الثانی سنہ ۵۵۸ھ کے آخری جمعہ کو فوت ہوا۔

ابویعقوب:

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابویعقوب یوسف تخت نشین ہوا اور یہ مہم جس کو عبدالمومن پورا کرنا چاہتا تھا، بعض اندرونی پیچیدگیوں کے سبب سے ناتمام رہی۔ عبدالمومن کی وفات کے بعد عیسائیوں کو موقع ملا کہ انہوں نے اندلس کے بعض مغربی اضلاع پر قبضہ کر لیا اور ان کا کوئی تدارک نہ ہو سکا۔ ادھر مردینش حاکم جیان و مرسیہ نے خودمختاری کا اعلان کر کے عیسائیوں کو تقویت پہنچائی۔ ابویعقوب نے مراکش سے دس ہزار فوج ہمراہ لے کر اندلس کا قصد کیا اور اشبیلیہ میں آ کر مقیم ہوا۔ ابویعقوب یوسف کے اشبیلیہ آنے کے بعد ہی مردینش حاکم مرسیہ و جیان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بیٹوں نے آ کر اپنے باپ کا تمام علاقہ ابویعقوب یوسف کی نذر کر دیا اور اطاعت و فرماں برداری کی گردنیں جھکا دیں۔ ابویعقوب یوسف نے بھی ان کے ساتھ بڑی رعایت و مروت کا برتاؤ کیا اور ان

کے باپ کے علاقے پر ان کو حاکم مقرر کر دیا۔ اس کے بعد اس نے مغربی عیسائیوں کی طرف متوجہ ہو کر تمام علاقہ جو انہوں نے دبا لیا تھا، چھین لیا۔ اس کے بعد طیطلہ کا محاصرہ کیا لیکن چند روز کے بعد کسی ضرورت کی وجہ سے محاصرہ اٹھا کر مراکش چلا گیا۔ سنہ ۵۸۰ھ میں شہر شنترین کے عیسائیوں نے پھر بغاوت کی۔ امیر المومنین ابو یعقوب یوسف نے اندلس آ کر شنترین کا محاصرہ کیا۔ ابھی اس محاصرہ کو ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ امیر المومنین یوسف سخت بیمار و علیل ہو کر ۷ ماہ رجب سنہ ۵۸۰ھ شنبہ کے دن فوت ہو گیا۔ اس کی لاش اشبیلیہ، پھر اشبیلیہ سے مراکش لے جا کر سپرد خاک کی گئی۔

ابو یعقوب کے عہد حکومت پر تبصرہ:

اس کے بعد اس کا بیٹا ابو یوسف تخت نشین ہوا اور اپنا خطاب منصور باللہ رکھا۔ ابو یعقوب بڑا نیک دل، علم دوست اور روشن خیال شخص تھا۔ ابو بکر محمد بن طفیل جو فلسفہ و علم کلام کا امام سمجھا جاتا ہے، ابو یعقوب کا مصاحب و مشیر خاص تھا۔ دوسرا اسی مرتبہ کا عالم ابو بکر بن صائغ المعروف بہ ابن ماجہ بھی ابو یعقوب کے مشیروں میں شامل تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی اسی مرتبہ کے بہت سے علماء حاضر دربار رہتے تھے۔ ابن طفیل کی ترغیب سے امیر المومنین ابو یعقوب نے ابو الولید محمد بن احمد بن محمد بن رشد کو قرطبہ سے بلوا کر اپنے مصاحبین میں شامل کیا۔ یہ وہی ابن رشد ہیں جو فلسفہ کے مشہور امام اور ارسطو کی تصانیف پر بہترین تنقید کرنے اور اس کی کمزوریاں ظاہر کرنے والے شخص ہیں۔ آج بھی ابن رشد کے نام سے یورپ اور تمام علمی دنیا کا بچہ بچہ واقف ہے۔ ابو یعقوب کے عہد حکومت میں مراکش سے طرابلس تک ممالک افریقہ اور تمام ملک اندلس، جزیرہ صقلیہ اور بحر روم کے دوسرے جزائر سب سلطنت موحدین میں شامل ہو گئے تھے اور سلطنت موحدین کا فرماں روا دنیا کے عظیم الشان سلاطین میں شمار ہوتا تھا۔

ابو یوسف منصور:

ابو یعقوب کے بعد اس کا بیٹا ابو یوسف منصور تخت نشین ہوا۔ تخت نشینی کے وقت منصور کی عمر ۳۲ سال کی تھی۔ یہ ایک عیسائی عورت ساحرہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ منصور کے عہد حکومت میں اندلس کے اندر ہر طرح مسلمانوں کو رفاہیت و غلبہ حاصل رہا۔ منصور ہر طرح اپنے باپ سے مشابہ تھا۔ علماء و فضلاء کا بے حد قدر دان اور کتابوں کا شائق تھا۔ جس طرح ابو یعقوب کبھی اندلس اور کبھی

مراکش میں رہا، اسی طرح منصور نے بھی اپنی حکومت کا اکثر زمانہ اندلس میں گزارا۔ سنہ ۵۸۵ھ میں منصور نے اندلس کے مغربی حصے سے عیسائیوں کے اکثر کو بالکل مٹا دیا اور الفانسو ثانی بادشاہ طیطلہ نے منصور کی خدمت میں پانچ سال کے لیے صلح کی درخواست پیش کی۔ منصور نے اس درخواست کو منظور کرلیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عیسائی یورپ کے ہر ایک ملک سے جمع ہو ہو کر شام و فلسطین پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ الفانسو دوم شاہ طیطلہ کو یہ خوف تھا کہ کہیں منصور میرا نام ونشان نہ مٹا دے۔ اس لیے اس نے پنج سالہ صلح کی درخواست منظور کرا کر اپنا اطمینان کیا کہ اس عرصہ میں صلیبی فوجی فارغ ہو کر میری مدد پر پہنچ سکیں گے۔ خود اندلس کے عیسائی شام و فلسطین کے صلیبی حملوں میں بہ کثرت شامل ہوتے تھے۔

منصور کی بحری طاقت بھی چونکہ بہت زبردست تھی، اس لیے سلطان صلاح الدین ایوبی نے منصور کے پاس اپنا ایک سفیر عبدالرحمٰن بن منقد نامی جو اعلیٰ درجہ کا شاعر بھی تھا، بھیجا اور ایک خط منصور کے نام اس سفیر کے ہاتھ روانہ کیا، جس میں لکھا تھا کہ عیسائی فوجیں فلسطین پر حملہ آور ہوئی ہیں۔ اس وقت اگر اپنے جنگی جہازوں کو مسلمانوں کی امداد کے لیے بھیجو اور ساحل فلسطین کی حفاظت کے کام میں اعانت کرو تو بڑی آسانی سے عیسائیوں کو شکست دی جاسکتی ہے۔ اس خط میں سلطان صلاح الدین نے منصور کو امیر المومنین کے خطاب سے مخاطب نہیں کیا تھا کیونکہ سلطان صلاح الدین صرف خلیفہ بغداد ہی کو امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین سمجھتے تھے، اتنی سی بات پر منصور کبیدہ خاطر ہوا۔ ابن منقد کی بہ ظاہر خوب خاطر مدارات کی اور ایک قصیدے کے صلہ میں ابن منقد کو چالیس ہزار درہم انعام کے دیے مگر سلطان صلاح الدین نے جو امداد طلب کی تھی، اس کے دینے میں لیت ولعل اور پس وپیش کیا۔

الفانسو ثانی بادشاہ طیطلہ پنج سالہ صلح کے دوران میں مسلمانوں کی حملہ آوری سے تو بالکل مطمئن تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلمان وعدہ کے خلاف کبھی حملہ آور نہیں ہوسکتے۔ اس عرصہ میں اس نے خوب فوجی تیاریاں کیں۔ دوسرے عیسائی سلاطین کو اپنی مدد کے لیے آمادہ کیا اور اپنی اس تیاری کو بھی مثل صلیبی جنگوں کے مذہبی جنگ قرار دے کر بہ آسانی ہر قسم کی امداد واعانت عیسائیوں سے حاصل کی۔ مدت صلح کے گزرنے پر ماہ رجب سنہ ۵۹۱ھ میں کئی عیسائی سلاطین اور ان کی فوجوں کو ہمراہ لیے ہوئے مقام مالارکو علاقہ بطلیوس میں پہنچا تھا کہ ادھر سے منصور مقابلہ پر پہنچ گیا۔ بڑے

زور شور سے لڑائی ہوئی۔ عیسائیوں کے مقابلہ میں اسلامی فوج کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی مگر عیسائی اپنی فوج کے ایک لاکھ ۴۶ ہزار آدمیوں کو قتل اور تیس ہزار کو قید کرا کر میدان جنگ سے فرار ہوئے۔ یہ بہت بڑی اور نہایت عظیم الشان فتح تھی جو منصور کو حاصل ہوئی اور اس نے عیسائیوں کی ہمت کو بہت کچھ پست کر دیا۔ اس لڑائی میں ڈیڑھ لاکھ خیمے، اسی ہزار گھوڑے، ایک لاکھ خچر اور چار لاکھ بار برداری کے گدھے اور ساٹھ ہزار مختلف وضع کے زرہ بکتر مسلمانوں کے ہاتھ آئے جس سے بہ آسانی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ عیسائیوں کی تیاریاں کیسی مکمل اور عظیم الشان تھیں اور منصور کے خلاف الفانسو دوم نے کیسی زبردست طاقت فراہم کی تھی۔ منصور نے یہ تمام مال غنیمت جس میں بہت ساز و جواہر بھی شامل تھا، سب اپنی فوج میں سپاہیوں کو تقسیم کر دیا۔

الفانسو دوم اس میدان سے بھاگ کر اپنی بقیہ فوج کے ساتھ قلعہ رباح میں پناہ گزیں ہوا۔ منصور بھی پاشنہ کوب پہنچا اور اس قلعہ کا محاصرہ کیا۔ الفانسو یہاں سے بھاگ کر طیطلہ آیا اور اس شرم انگیز شکست کے غم وغصہ میں سر وریش کو منڈوا ڈالا اور صلیب کو اٹھا کر قسم کھائی کہ جب تک ان لاکھوں عیسائی مقتولوں کا انتقام نہ لے لوں گا، اس وقت تک عیش و آرام کو حرام سمجھوں گا۔ منصور کو جب معلوم ہوا کہ الفانسو نے طیطلہ میں جا کر اس طرح قسم کھائی اور وہ دوبارہ جنگی تیاریوں میں مصروف ہے تو وہ بلا توقف طیطلہ پر حملہ آور ہوا اور شہر کا محاصرہ کر کے قلعہ شکن توپوں سے فصیل وقلعہ کی دیواروں کو چھلنی کر دیا۔ قریب تھا کہ شہر اور الفانسو دونوں منصور کے قبضے میں آ جائیں لیکن اس سقیم حالت میں الفانسو ثانی نے اپنی حمیت وغیرت کا یہ نمونہ دکھایا کہ اپنی ماں اور بیوی اور بیٹیوں کو منصور کے پاس بھیجا۔ یہ عورتیں سر برہنہ روتی ہوئی منصور کے سامنے آئیں اور الفانسو کی ماں نے اپنے بیٹے کے لیے عفو تقصیرات کی درخواست کرتے ہوئے اس قدر آہ وزاری کی کہ منصور اس نظارہ کی تاب نہ لا سکا۔ آنسوؤں کے دریا نے خون کے آنسوؤں پر غلبہ حاصل کیا اور قہر وغضب کو صفت رحم سے مغلوب ہونا پڑا۔ منصور نے الفانسو کی ماں اور بیوی اور بیٹیوں کی بہت دل دہی اور تشفی کی۔ ان کو گراں بہا زیورات اور انعام واکرام سے مالا مال کر کے عزت وحرمت کے ساتھ شہر میں واپس بھیجا اور اسی وقت طیطلہ سے کوچ کر کے قرطبہ میں چلا آیا۔ الفانسو نے منصور کے روانہ ہونے کے بعد اپنے سفیروں کو اقرار اطاعت اور عہد نامہ کی تحریر وتکمیل کے لیے روانہ کیا جو قرطبہ میں حاضر دربار ہوئے۔ منصور کے پاس جو تیس چالیس ہزار عیسائی قیدی تھے، ان کو منصور نے مراکش میں بھیج کر آباد

کرا دیا اوران کا ایک الگ قبیلہ قرار دیا گیا۔ منصور نہایت نیک طینت، عابد زاہد اور متبع سنت فرماں روا تھا۔ اس کے حکم سے جہری نمازوں میں امام الحمد سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی بالجہر پڑھتے تھے۔[1] ابوالولید ابن رشد نے سنہ ۵۹۴ھ کے آخری ایام میں منصور کے عہد حکومت میں مراکش کے اندر وفات پائی۔ ماہ صفر سنہ ۵۹۵ھ میں منصور قریباً پندرہ سال کی فرماں روائی کے بعد فوت ہوا۔ اسی سال انگلستان کا بادشاہ رچرڈ فوت ہوا۔

ابوعبداللہ محمد:

منصور کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوعبداللہ محمد ماہ صفر سنہ ۵۹۵ھ میں بہ عمر سترہ (۱۷) سال تخت نشین ہوا اور اپنا لقب ناصرلدین اللہ رکھا۔ بادشاہ ناصر کے عہد حکومت میں مراکش کے مشرقی ممالک میں بغاوت وبدامنی پیدا ہوئی اور سلطنت مرابطین کے بعض متوسلین نے جمعیت فراہم کر کے ملکوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ ناصر اس بغاوت وبدامنی کے رفع کرنے کو مراکش میں مقیم رہا۔ ادھر سلطان صلاح الدین ایوبی سے شام وفلسطین کے میدانوں میں شکست کھا کر جو بقیۃ السیف عیسائی یورپ کے ملکوں میں واپس آئے، انہوں نے شام وفلسطین کی ہزیمتوں کا انتقام اندلس ومراکش کی اسلامی سلطنت سے لینا چاہا اور برشلونہ، کیسٹل اور لیون وغیرہ کے عیسائی سلاطین کے پاس یورپ کے ہر ملک سے عیسائی جنگجو آ کر جمع ہوئے۔ روم کے پوپ نے سلطنت موحدین کے خلاف جنگ کا عام اعلان کیا۔ انہیں ایام میں انگلستان کے بادشاہ جان کے خلاف انگلستانی امراء نے کوشش شروع کی اور پوپ انوسنٹ سوم نے بادشاہ جان کے ملت عیسوی سے خارج ہونے کا اعلان کیا۔ جان نے اپنے تین سرداروں کا ایک وفد ناصرلدین اللہ کے پاس مراکش روانہ کیا۔ اس سفارت میں ٹامس ہارڈنگٹن، ریلف فرنکولس اور لندن کا پادری رابرٹ شامل تھے۔ یہ سفارت سنہ ۶۰۶ھ میں مراکش پہنچی۔ ارکان سفارت کئی ایوان اور ڈیوڑھیوں میں سے گزرتے ہوئے جن کے دونوں طرف شاہی خدام کی صفیں ایستادہ تھیں، امیر ناصرلدین اللہ کے سامنے پہنچے۔ اس وقت امیر موصوف مطالعہ کتب میں مصروف تھا۔ ارکان وفد نے شاہ انگلستان کا خط پیش کیا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ آپ میری

---

[1] بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بارے میں کتب احادیث میں جہری اور سری آواز سے دونوں طرح کی روایات موجود ہیں، جن میں اونچی آواز سے پڑھنے والی تقریباً تمام روایات ضعیف ہیں جبکہ دل میں یعنی سری آواز کے ساتھ پڑھنے کی روایات صحیح، کثیر اور قوی ہیں۔ اس لیے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بالسر پڑھنا چاہیے۔

مدد کریں اور میرے ملک کی بغاوت فرو کرنے کے لیے فوجیں بھیج دیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ میں دین عیسوی کو ترک کر کے مسلمان ہونے پر آمادہ ہوں۔ پادری رابرٹ اس سفارت کا پیشوا تھا۔ اس نے بھی امیر ناصر سے ایسی باتیں کیں جس سے امیر ناصر کو یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ یہ لوگ دنیوی مقاصد کے لیے بہ طور رشوت تبدیلی مذہب کا لالچ دیتے ہیں۔ اسی لیے امیر ناصر لدین اللہ نے اس سفارت کی کچھ زیادہ قدر نہ کی اور کم التفاتی کے ساتھ رخصت کر کے اس امر کا منتظر رہا کہ شاہ انگلستان اگر اسلام کی صداقت کو تسلیم کر چکا ہے تو وہ ضرور میری اس کم التفاتی کے بعد بھی اپنے اسلام کا اعلان کرے گا اور اس وقت اس کی امداد کے لیے جنگی بیڑہ روانہ کر دیا جائے گا۔

امیر ناصر بہت دھیمی طبیعت کا آدمی تھا۔ جنگ و پیکار کے ہنگامے برپا کرنے کا اس کو شوق نہ تھا۔ اسی لیے وہ فوج جو اس کے باپ کے زمانے میں بڑی طاقتور اور باہمت تھی، امیر ناصر کی کم التفاتی سے اس کے سردار بددل ہو رہے تھے۔ علاوہ ازیں سابق امیر کے عہد حکومت میں فوج کے ہر سپاہی کو علاوہ مقررہ تنخواہ کے ہر سہ ماہی ہر بادشاہ کی طرف سے انعامات ملا کرتے تھے۔ امیر ناصر کے عہد میں ان انعامات کے موقوف ہونے سے سپاہی افسردہ خاطر تھے۔ سنہ ۶۰۸ھ میں امیر ناصر افریقہ کی مہمات سے فارغ ہو کر اندلس کی جانب متوجہ ہوا۔ یہاں طیطلہ میں شاہ کیٹسل الفانسو کے گرد یورپ کے ہر ملک اور ہر حصے سے عیسائی لوگ جوق در جوق آ آ کر جمع ہو رہے تھے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام براعظم یورپ کی پوری طاقت اور شاہان یورپ کے جمیع جنگی سامان اسلام کشی کے لیے جزیرہ نمائے اندلس میں فراہم ہو گئے تھے۔ شام و فلسطین کے مقابلہ میں اندلس یورپ سے قریب بھی تھا اور اندلس کے ہموار میدانوں تک عیسائی ریاستوں کی حدود پھیلی ہوئی تھیں۔ اس لیے وسط اندلس میں عیسائی طاقت کی یہ سب سے بڑی نمائش بہ آسانی ممکن ہوئی۔

ناصر لدین اللہ نے عیسائیوں کی اس عظیم الشان تیاری اور یورپ کے ہر ملک میں مسلمانوں کے خلاف اعلان جہاد کا حال سن کر مراکش و اندلس سے فوجوں کو فراہم کیا اور جنگ کا اعلان کرایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھ لاکھ کے قریب منظّم فوج اور مجاہدین اشبیلیہ میں جمع ہو گئے۔ اس لشکر کو لے کر امیر ناصر لدین اللہ شہر جیان کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر الفانسو اپنے لاتعداد لشکر کو لیے ہوئے شہر سالم کے قریب مقام العقاب میں آ کر خیمہ زن ہوا۔ ادھر سے اسلامی لشکر بھی شہر جیان سے العقاب میں آیا۔ عیسائی انتقام کے جوش میں از خود رفتہ ہو رہے تھے اور ملک شام کی ناکامیوں کا بدلہ اندلس میں

مسلمانوں سے لینا چاہتے تھے۔ ادھر اسلامی لشکر کی حالت عجیب تھی۔ باقاعدہ فوج جو اچھی طرح مقابلہ کی قابلیت رکھتی تھی، سب اپنے امیر سے برگشتہ تھی کیونکہ ان کو کئی مہینے سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ فوجی افسروں کی خواہش یہ تھی کہ اس لڑائی میں ان کے بادشاہ کو شکست ہو اور وہ اس تلخ تجربہ کے بعد فوج پر روپیہ صرف کرنے اور انعام واکرام دینے میں بخل کو کام میں نہ لائے۔ چنانچہ ۱۵ ماہ سنہ ۶۰۹ ھ کو جب لڑائی شروع ہوئی تو اسلامی لشکر سے بعض سردار اپنی ماتحت جمعیتوں کو لے کر جدا ہو گئے۔ بعض سرداروں اور سپاہیوں نے حملے کے وقت دانستہ اپنے نیزوں کو ٹیڑھا کر کے بہ جائے اس کے کہ دشمنوں کے سینوں کو چھیدتے، زمین میں گاڑا اور تلواروں کو دشمنوں کی طرف پھینک دیا۔ بعض نے عجیب وغریب تمسخر انگیز حرکات کا اظہار کیا اور معرکہ جنگ شروع ہونے کے بعد امیر ناصر کے احکام کی تعمیل ترک کر دی۔ زبردست اور باقاعدہ مسلح فوج کی یہ نامعقول حرکات دیکھ کر مجاہدین کے بھی حوصلے پست ہو گئے۔ امیر ناصر کے بخل کا یہ خطرناک نتیجہ اور مراکش وبربری لشکر کی یہ رذیلانہ غداری اسلام اور مسلمانوں کے لیے بے حد مضر ثابت ہوئی۔ اندلس کے کسی میدان میں آج تک اتنی بڑی فوجیں نبرد آزما نہ ہوئی تھیں۔ عین معرکہ جنگ میں اسلامی لشکر کا ایک بڑا حصہ یہ غداری نہ دکھاتا تو یورپ کی اس عظیم الشان اور متفقہ فوج کو یقیناً مسلمانوں کے ہاتھ سے ہزیمت اٹھانی پڑتی اور آئندہ کبھی عیسائیوں کو مسلمانوں کے مقابلے کی ہمت نہ ہوتی کیونکہ جو انجام وہ شام وفلسطین میں دیکھ کر آئے تھے، اس سے بدتر انجام ان کا اندلس میں ہوتا۔ مگر حسرت وافسوس کے ساتھ بیان کرنا پڑتا ہے کہ اس چھ لاکھ کے اسلامی لشکر کا انجام یہ ہوا کہ اپنے امیر کی نافرمانی کر کے سب کا سب عیسائیوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ امیر ناصر نے شمشیر زنی میں مطلق کوتاہی نہیں کی اور اکثر مجاہدین نے اپنے امیر کا ساتھ دیا۔ صرف ایک ہزار آدمی اس چھ لاکھ کے لشکر میں سے زندہ بچے اور وہ بھی بہ مشکل امیر ناصر کو میدان جنگ سے واپس لانے میں کامیاب ہوئے۔ باقی سب یا تو میدان جنگ میں لڑ کر شہید ہوئے یا عیسائیوں کے ہاتھ میں قیدو گرفتار ہو گئے۔ گرفتار ہونے والوں کو توقع تھی کہ ہم کو آزاد کرا لیا جائے گا مگر عیسائیوں نے اسی میدان العقاب میں سب کو ذبح کر ڈالا۔

امیر ناصر اشبیلیہ میں شکست خوردہ واپس آیا اور عیسائیوں نے اندلس کے شہروں کو لوٹنا اور مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ شہر جیان کی تمام مسلم آبادی کو گرفتار کر کے مردوں، بچوں اور بوڑھوں، عورتوں کو قتل کر ڈالا۔ الفانسو نے جب دیکھا کہ عیسائی فوجی تمام ملک کو تہ تیغ کرنے اور

اموال واسباب کو لوٹنے میں مطلق العنان ہیں تو اس نے ان کو روکنا اور اپنے زیر اقتدار رکھنا چاہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے ناراض ہو ہو کر دوسرے ممالک کے عیسائی اپنے اپنے ملکوں کو واپس ہونے لگے، جس کو الفانسو نے بہت ہی غنیمت سمجھا۔ جنگ العقاب نے اندلس میں اسلامی سلطنت کی جڑوں کو ہلا دیا۔اس کے بعد سلطنت موحدین اور مغرب میں مسلمانوں کی حکومت جلد جلد زوال پذیر ہونے لگی۔ ساقش میں بہت سے قصبے اور گاؤں اس لڑائی کے بعد ویران ہو گئے کیونکہ ان کے باشندے اس لڑائی میں کام آ گئے تھے۔ امیر ناصر چند روز اشبیلیہ میں مقیم رہ کر مراکش میں آیا اور ۱۰ شعبان سنہ ۶۱۰ ھ چہار شنبہ کے دن فوت ہو کر اگلے روز پنجشنبہ مدفون ہوا۔

یوسف مستنصر:

امیر ناصر کی وفات کے بعد ۱۱ شعبان سنہ ۶۱۰ ھ کو اس کا بیٹا یوسف تخت نشین ہوا اور اپنا لقب مستنصر رکھا۔تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۱۶ سال کی تھی۔ وہ یکم شوال سنہ ۵۹۴ ھ کو پیدا ہوا تھا۔ دس سال تخت نشین رہ کر سنہ ۶۲۰ ھ کے ماہ شوال میں لاولد فوت ہوا۔ یہ نہایت عیش پرست اور کم ہمت شخص تھا۔ عیسائیوں نے اندلس کے اکثر حصہ پر قبضہ کر لیا۔ بعض صوبوں کے والیوں نے اپنے صوبوں کو جواں مردی کے ساتھ عیسائیوں کی دست برد سے محفوظ رکھا مگر مستنصر مرتے وقت تک مراکش سے باہر نہ نکلا اور بادشاہ ہو کر کبھی اندلس میں نہ آیا۔

عبدالواحد:

مستنصر کی وفات کے بعد اس کا بھائی عبدالواحد تخت نشین ہوا۔نو مہینے کے بعد موحدین کے امراء نے اس کو معزول و مقتول کر کے شیرازہ حکومت کو درہم برہم کر دیا۔

عبدالواجد عادل:

ان دنوں امیر منصور کا ایک بیٹا یعنی امیر ناصر کا بھائی مسمی عبدالواجد اندلس کے صوبہ مرسیہ کا والی تھا۔اس نے عبدالواحد بن ناصر کے مقتول ہونے کا حال سن کر خود سلطنت کا دعویٰ کیا اور اپنا لقب عادل رکھا۔ عادل نے مرسیہ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا۔

اسی سال یعنی سنہ ۶۲۱ ھ میں عیسائیوں نے اس پر حملہ کیا۔اس لڑائی میں عادل کو شکست ہوئی۔ اس شکست کے بعد عادل اپنے بھائی ادریس کو اشبیلیہ میں اپنا نائب السلطنت مقرر کر کے خود مراکش

چلا گیا۔ وہاں اہل مراکش نے ایک نوعمر لڑکے یحییٰ بن ناصر کو اپنا بادشاہ بنا کر عادل کا مقابلہ کیا۔ اس لڑائی میں عادل گرفتار ہو گیا۔ یہ حالت دیکھ کر ادریس نے اشبیلیہ میں اپنی تخت نشینی کی رسم ادا کی اور اپنا لقب مامون رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ موحدین کا رعب اندلس اور مراکش دونوں ملکوں سے اٹھ چکا تھا۔ مراکش میں بنی مرین ملک کو دباتے جاتے تھے۔ ادھر اندلس میں مسلمان امراء کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے ملک پر مراکش و بربر کے لوگ کیوں حکمران ہوں۔ اب ہم کو خود اپنا کوئی امیر منتخب کرنا چاہیے تاکہ ہم عیسائیوں کی محکومی سے بچ سکیں۔ ورنہ اگر اور چند روز تک ہمارا ملک ایسے ہی کمزور مراکش فرماں رواؤں کے ماتحت رہا تو عیسائی بڑی آسانی سے تمام اندلس پر قابض و متصرف ہو کر ہم کو اپنا غلام بنا لیں گے۔ چنانچہ شاہان سرقسطہ بنی ہود کی نسل سے ایک شخص محمد بن یوسف نے مامون کو اندلس سے خارج کر کے اپنی حکومت کی بنیاد قائم کی۔

حکومت موحدین کا خاتمہ:

اس طرح سنہ۶۲۵ھ میں موحدین کی حکومت کا نام و نشان اندلس سے گم ہو گیا۔ مامون نے اندلس کو چھوڑ کر مراکش کی بندرگاہ سبطہ میں قیام کیا۔ وہاں اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا رشید تخت نشین ہوا۔ بنی مرین مراکش میں اپنی طاقت کو دم بہ دم ترقی دے رہے تھے۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ۶۶۸ھ میں موحدین کا نام و نشان گم ہو گیا اور مراکش میں بنی مرین کی حکومت پورے طور پر قائم ہوگئی۔

چودھواں باب

اسلامی اندلس میں پھر طوائف الملوکی

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جب اندلس کی خلافت بنوامیہ برباد ہوئی تو تمام جزیرہ نمائے اندلس میں بہت سی خودمختار اسلامی سلطنتیں الگ الگ قائم ہو گئی تھیں اور آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت پر آمادہ تھیں۔ اس زمانے میں عیسائی بادشاہوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنی حدود کو وسیع کر کے اسلامی حکومت کے رقبہ کو کم کر دیا۔ اس کے بعد مرابطین کی سلطنت اسلامی اندلس پر قابض و متصرف ہو گئی یعنی الگ الگ چھوٹی چھوٹی مسلمان بادشاہتوں کا علاقہ مل کر ایک اسلامی اندلس کے ماتحت ہو گیا۔ مگر جس قدر ملک اس گزشتہ طوائف الملوکی میں عیسائیوں کے قبضے میں پہنچ گیا تھا، وہ عموماً واپس نہ ہوا۔ مرابطین کی سلطنت جب برباد ہوئی اور اس کی جگہ موحدین کی حکومت قائم ہوئی تو اس تبدیلی میں بھی عیسائیوں نے اندلس کا ایک قلیل حصہ اور دبا لیا اور عیسائی مقبوضات اندلس میں زیادہ وسیع ہو گئے۔ اب موحدین کی سلطنت میں ضعف و انحطاط کے آثار ایسے وقت میں نمودار ہوئے جبکہ تمام یورپ مسلمانوں کی بیخ کنی پر آمادہ اور عیسائی لوگ مسلم کشی کے لیے دیوانے ہو رہے تھے۔ جنگ العقاب نے نہ صرف موحدین کی سلطنت کو پیغام مرگ پہنچایا بلکہ عیسائیوں کے مقبوضات کو اندلس میں وسیع سے وسیع تر بنا دیا۔ اسی زمانے میں اندلس سے مسلمانوں کا نام و نشان پورے طور پر مٹایا جا سکتا تھا۔ مگر عیسائی مجاہدین کی بدعنوانیوں اور نالائقیوں نے اندلسی عیسائیوں کو ان سے متنفر کر دیا اور اس طرح اندلسی عیسائیوں نے مسلمانوں کے استیصال کا کام کسی دوسرے وقت کے لیے ملتوی کر دیا۔ موحدین کی سلطنت جب اندلس سے ختم ہوئی تو اندلس کا نصف سے زیادہ شمالی حصہ اور قریباً تمام مغربی صوبے عیسائیوں کے قبضہ و تصرف میں پہنچ چکے تھے۔ مسلمان ہٹتے اور سمٹتے ہوئے جنوب و مشرق کی طرف آ گئے تھے۔ موحدین کی حکومت کے بعد بھی اسی قسم کی طوائف الملوکی اندلس میں نمودار ہوئی جیسی کہ بنوامیہ کی حکومت کے بعد نمودار ہوئی تھی۔ مگر فرق یہ تھا کہ پہلی طوائف

الملوکی میں مسلمانوں کا ملک زیادہ وسیع تھا اور ہر ایک رئیس کے قبضے میں بڑے بڑے صوبے تھے۔ اس طوائف الملوکی میں اسلامی اندلس کا رقبہ بہت مختصر و محدود رہ گیا تھا اور اسی لیے ہر ایک رئیس کے قبضے میں بہت چھوٹے چھوٹے علاقے تھے۔ جس طرح پہلی طوائف الملوکی میں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا تھا، اسی طرح اس مرتبہ بھی ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے بلکہ اس مرتبہ یہ اور مصیبت تھی کہ ہر ایک مسلمان رئیس دوسرے مسلمان رئیس کو تباہ و برباد کرانے کے لیے عموماً عیسائی بادشاہ کو چڑھا کر لاتا اور اس برادر کشی کے کام سے فارغ ہو کر اپنی مملکت کے بعض شہر و قلعے عیسائی بادشاہ کی نذر کر دیتا۔ عیسائی بہت خوش ہوتے اور مسلمانوں کی اس نالائقی کو اطمینان کی نظر سے دیکھتے تھے کہ ہمارا مقصود خود بہ خود حاصل ہو رہا ہے۔

ریاست بنو ہود محمد بن یوسف:

سنہ ۵۰۳ھ میں احمد مستعین بن ابو عامر یوسف موتمن بن ابو جعفر بن ہود عیسائیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے سرقسطہ کے سامنے شہید ہوا تھا۔ یہ شاہان سرقسطہ میں چوتھا بادشاہ تھا۔ اس کی اولاد میں محمد بن یوسف ایک شخص تھا جو موحدین کی حکومت کے آخری ایام میں اندلس کے اندر رئیسانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ شیرازہ سلطنت ڈھیلا ہو گیا ہے تو وہ قزاقوں کے ایک گروہ میں شامل ہو کر ان کا سردار بن گیا اور رفتہ رفتہ اپنی جمعیت کو بڑھا کر مرسیہ کے عامل ابوالعباس کو شکست دے کر مرسیہ پر قابض ہو گیا اور بہت جلد غرناطہ، مالقہ، المیریہ وغیرہ پر قابض ہو کر سنہ ۶۲۵ھ میں موحدین کے بادشاہ مالون کو اندلس سے خارج کر کے قرطبہ وغیرہ پر بھی قابض و متصرف ہو گیا۔ سنہ ۶۲۶ھ میں قریباً تمام اسلامی اندلس اس کے زیر فرمان ہو گیا۔ اسی سال برشلونہ کے عیسائی بادشاہ نے جزیرہ میورقہ اور منورقہ کو فتح کر کے موحدین کے عاملوں کو وہاں سے خارج کر دیا۔ محمد بن یوسف کی اس مثال کو دیکھ کر ملک میں اور بھی باحوصلہ سردار اٹھ کھڑے ہوئے اور ہر ایک اپنی الگ حکومت قائم کرنے کی تدابیر میں مصروف ہو گیا۔ محمد بن یوسف نے یہ دیکھ کر کہ تمام سرداروں پر غالب آنا اور اپنی حکومت پر تمام رعایا کو رضامند کر لینا آسان کام نہیں، ایک درخواست عباسی خلیفہ بغداد کی خدمت میں روانہ کی اور لکھا کہ میں نے آپ کے نام سے تمام ملک اندلس فتح کر لیا ہے اور میری حکومت یہاں قائم ہو گئی ہے۔ لہٰذا نہایت ادب کے ساتھ ملتجی ہوں کہ مجھ کو اس ملک کا والی

مقرر فرمایا جائے اور اس ملک کی سند حکومت میرے نام کی بھیج دی جائے۔ خلیفہ بغداد نے اس درخواست کو تائید غیبی سمجھ کر اندلس کی سند حکومت مع خلعت محمد بن یوسف کے سفیر کو عطا کر دی۔ جب خلیفہ بغداد مستنصر کے پاس سے سند امارت آ گئی تو ابن ہود یعنی محمد بن یوسف نے غرناطہ کی جامع مسجد میں لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا اور خود عباسی خلیفہ کا خلعت پہن کر اور سیاہ علم ہاتھ میں لے کر آیا اور لوگوں کو خلیفہ مستنصر عباسی کا فرمان پڑھ کر سنایا اور تمام مسلمانوں کو مبارکباد دی کہ خلیفہ نے ہماری درخواست کو منظور فرما کر ہماری نگرانی اور شفقت منظور فرما لی ہے۔ اس تدبیر کا یہ اثر ہوا کہ چند روز کے لیے نصر بن یوسف معروف بہ ابن الاحمر اور ابوجمیل زیان بن مردنیش وغیرہ امراء نے جو ابن ہود یعنی محمد بن یوسف کی مخالفت پر آمادہ تھے، یہ دیکھ کر کہ خلیفہ بغداد کے فرمان کی وجہ سے لوگ اس طرف مائل ہیں، خموشی اختیار کی اور بہ ظاہر اس کی بیعت بھی کر لی مگر چند ہی روز کے بعد یہ امراء پھر مخالفت پر آمادہ و مستعد ہو گئے اور لڑائیاں یعنی خانہ جنگی کا سلسلہ جاری ہوا۔ عیسائیوں نے اس خانہ جنگی کو دیکھ کر مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ سنہ ۶۲۷ھ میں انہوں نے شہر مریدہ پر جو قرطبہ کے بعد سب سے بڑا شہر تھا، قبضہ کر لیا۔ اہل مریدہ نے محمد بن یوسف کو اطلاع دی۔ محمد بن یوسف فوراً فوج لے کر مریدہ پہنچا اور الفانسو نہم بادشاہ لیون پر شہر کے قریب بلا تامل حملہ آور ہوا۔ اس لڑائی میں اس کو عیسائی فوج سے شکست کھانی پڑی۔ شکست خوردہ واپس ہوا اور مرسیہ کو اپنا دارالسلطنت بنا کر حکومت کرنے لگا۔ سنہ ۶۲۹ھ میں ابن الاحمر نے اپنے آپ کو اندلس کی فرماں روائی کا حق دار ظاہر کر کے سریش وجیان وغیرہ شہروں کو فتح کر لیا۔ اسی اثناء میں ابومروان نامی ایک سردار نے اشبیلیہ پر قبضہ کر لیا۔ ابن الاحمر نے ابومروان کے ساتھ دوستی و اتحاد پیدا کر کے اپنی قوت کو بڑھایا۔ سنہ ۶۳۲ھ میں ابن الاحمر اشبیلیہ میں دوستانہ داخل ہوا اور ابومروان کو قتل کر کے اس کے مقبوضہ علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اشبیلیہ کی رعایا نے چند روز کے بعد ناخوش ہو کر ابن الاحمر کو خارج کر دیا اور محمد بن یوسف کی فرماں برداری قبول کی۔ محمد بن یوسف نے ایک سردار ابن الرمیمی نامی کو اپنا وزیر و مدارالمہام بنا کر اکثر امور سلطنت اسی کے سپرد کر رکھے تھے۔ آخر میں اس نے ابن الرمیمی کو المیریہ کا حاکم بنا دیا تھا۔ ابن الرمیمی نے المیریہ میں بغاوت اختیار کی۔ محمد بن یوسف اس کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ ابن الرمیمی کے جاسوسوں نے اس کا رات کے وقت موقع پا کر خیمے کے اندر گلا گھونٹ ڈالا۔ یہ واقعہ ۲۴ جمادی الثانی سنہ ۶۳۵ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ اس

کے بعد ابن الرمیمی المیریہ کا خودمختار مستقل بادشاہ بن گیا۔ مرسیہ کی حکومت محمد بن یوسف کی اولاد کے قبضے میں رہی تھی، جنہوں نے ابن الاحمر کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ سنہ ۶۵۸ھ میں اس خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

بنو ہود کے علاوہ ابن الاحمر، ابن مروان، ابن خالد، ابن مردنیش وغیرہ بہت سے چھوٹے چھوٹے رئیسوں نے اپنی الگ الگ ریاستیں قائم کیں۔ ابن الاحمر نے فرڈی نند بادشاہ کیٹسل وطیطلہ سے ابتداء میں اتحاد قائم کیا اور دوسرے چھوٹے چھوٹے مسلمان رئیسوں کی تباہی میں فرڈی نند شریک کار رہا۔ ادھر بادشاہ برشلونہ نے الگ مسلمانوں پر چڑھائیاں شروع کر رکھی تھیں۔ عیسائی اول دو مسلمانوں کو آپس میں لڑاتے، پھر ایک کے طرفدار ہو کر دوسرے کو برباد کرا دیتے۔ اس کے بعد پھر اس سے لڑائی چھیڑ دیتے اور دوسرے مسلمان کو اس کے مقابلہ پر آمادہ کر دیتے اور ہمیشہ مسلمانوں کے شہروں اور قلعوں پر قابض ہوتے جاتے تھے۔ اسی سلسلہ میں فرڈی نند ثالث بادشاہ کیسٹل (قسطلہ) نے بہ تاریخ ۲۳ شوال سنہ ۶۳۶ھ دارالخلافہ قرطبہ کو فتح کر لیا اور اس عظیم الشان شہر کی عظمت و بزرگی کو خاک میں ملا کر اندلس میں عیسائی سلطنت کی بنیاد کو پائیدار و استوار بنا دیا۔ اسی تاریخ سے اندلس میں اسلامی شوکت کا خاتمہ سمجھنا چاہیے۔ ابن الاحمر نے یہ دانائی کا کام کیا کہ فرڈی نند ثالث سے صلح کر کے اور بعض شہر و قلعے اس کو دے کر اپنی طرف سے عرصہ تک مطمئن رکھا اور اس فرصت میں غرناطہ، مالقہ، لارقہ، المیریہ، جیان وغیرہ پر اپنا قبضہ جما لیا اور ایک ایسی مضبوط ریاست جزیرہ نمائے اندلس کے صرف جنوبی و مشرقی اندلس میں اسلامی حکومت محدود رہ گئی اور بجائے قرطبہ کے غرناطہ اسلامی اندلس کا دارالحکومت قرار دیا۔ اس چھوٹی سی اسلامی سلطنت کا رقبہ پچاس ہزار میل مربع یعنی کل جزیرہ نما کا چوتھائی تھا۔ اب ذیل میں سلطنت غرناطہ کے حالات بیان ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اندلس کی اسلامی تاریخ ختم ہو جائے گی۔

پندرہواں باب

سلطنت غرناطہ

ابن الاحمر:

نصر بن یوسف جو ابن الاحمر کے نام سے مشہور ہے، اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس نے سنہ ۶۳۲ھ میں اشبیلیہ کے حاکم ابن خالد کو اپنا دوست اور خلیفہ بنا کر غرناطہ اور مالقہ پر قبضہ کیا۔ سنہ ۶۴۳ھ میں حاکم المیریہ نے اس کی اطاعت قبول کی اور سنہ ۶۶۳ھ میں لارقہ کی رعایا نے بھی اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اب تک فرڈی نند سے اس کی موافقت تھی لیکن جب تمام مسلمان ریاستیں ایک ایک کر کے ختم ہو گئیں تو عیسائیوں نے ابن الاحمر کی ریاست کو ہضم کرنا چاہا۔ ابن الاحمر نے یہ عقلمندی کی تھی کہ بنی مرین کے بادشاہ یعقوب بن عبدالحق سے جو افریقہ و مراکش میں موحدین کے بعد حکمران تھا، دوستانہ تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ جب کبھی ابن الاحمر کو عیسائیوں کے مقابلہ کی ضرورت پیش آئی، یعقوب مرینی کی طرف سے اس کو فوجی امداد پہنچی۔ اس طرح ابن الاحمر نے عیسائیوں کو بار بار شکستیں دے کے بھگایا اور اپنی چھوٹی سی سلطنت کو ان کی دست برد سے بچایا۔ ابن الاحمر نے غرناطہ میں قصر الحمرا کی بنیاد رکھی تھی، جو اندلس میں اسلام کی مٹی ہوئی شوکت کے عہد کی ایک عجوبہ روزگار عمارت سمجھی جاتی اور ہفت عجائبات عالم میں شمار ہوتی ہے۔ حالانکہ قرطبہ کے قصر زہرا سے اس کو کوئی نسبت نہ تھی جسے عیسائی وحشیوں نے صفحہ ہستی سے مٹا دیا ہے۔ ابن الاحمر ایک لڑائی میں عیسائیوں کو شکست دے کر غرناطہ کو واپس آ رہا تھا کہ ۱۵ جمادی الثانی سنہ ۶۷۱ھ کو محل کے قریب پہنچ کر اتفاقاً گھوڑے کے ٹھوکر کھانے سے گرا۔ بہ ظاہر کوئی خطرناک زخم نہیں آیا تھا مگر اسی صدمہ سے ۲۹ جمادی الثانی سنہ ۶۷۱ھ کو فوت ہوا۔

ابوعبداللہ محمد:

اس کے بعد اس کا بیٹا ابوعبداللہ محمد تخت نشین ہوا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۳۸ سال کی

تھی۔ اس نے اپنے باپ کی وصیت کے موافق بنی مرین سے سلسلہ دوستی جاری رکھا اور نہایت ہوشیاری و مستعدی کے ساتھ مہمات سلطنت میں مصروف ہوا۔ سنہ ۶۷۳ ھ میں عیسائیوں نے سلطنت غرناطہ پر چڑھائی کی۔ محمد نے یعقوب بن عبدالحق مرینی سے اعانت طلب کی۔ یعقوب نے فوراً اپنے بیٹے کو مع فوج اندلس روانہ کیا۔ اس کے عقب میں خود بھی روانہ اور جزیرۃ الخضراء کو ایک باغی امیر سے چھین کر اپنی فوج کا مستقر بنایا۔ محمد نے بھی اپنی طرف سے قلعہ ظریفہ یعقوب کی نذر کیا کہ بادشاہ اپنی فوجی چھاؤنی یہاں قائم کرے۔ سلطان محمد اور سلطان یعقوب دونوں مل کر عیسائیوں پر حملہ آور ہوئے۔ ۱۵ ربیع الاول سنہ ۶۷۲ ھ کو ایک سخت لڑائی کے بعد عیسائیوں کو شکست فاش حاصل ہوئی۔ اس شکست کے بعد عیسائیوں نے دوبارہ پھر فوج کشی کی اور مسلمانوں نے ان کو شکست فاش دی۔ اس کے بعد ماہ محرم سنہ ۶۹۵ ھ میں شاہ قسطلہ نے غرناطہ کی سرحد پر فوجیں جمع کرنی شروع کیں۔ سلطان محمد نے یہ خبر سن کر فوراً حملہ کیا اور مقام قباتہ اور اس کے متعلقات کو جو عیسائیوں کی چھاؤنیاں تھے، فتح کر لیا۔ سنہ ۶۹۹ ھ میں سلطان محمد نے عیسائیوں سے بعض سرحدی قلعوں کو چھین لیا۔ قریباً تیس سال حکومت کر کے ۸ شعبان سنہ ۷۰۱ ھ کو سلطان محمد نے وفات پائی۔ یہ سلطان محمد فقیہہ کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس کو کتب بینی کا بہت شوق تھا۔

محمد فقیہہ کے فوت ہونے پر اس کا بیٹا محمد مخلوق تخت نشین ہوا۔ سلطان محمد فقیہہ سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے یعقوب بن عبدالحق کی فوجی چھاؤنی کو اپنے لیے موجب خطر سمجھ کر عیسائیوں کو ابھار دیا اور ان کو امداد پہنچا کر بنی مرین کے قبضے سے نکلوا کر عیسائیوں کا قبضہ کرا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں کی ایک ایسی چھاؤنی قائم ہوگئی جس کی وجہ سے حکومت غرناطہ کو کسی بحری راستہ سے امداد پہنچنی دشوار ہوگئی۔

محمد مخلوع:

محمد فقیہہ کے بعد اس کے بیٹے محمد مخلوع نے تخت نشین ہو کر محمد بن محمد حکم لخمی وزیر سلطنت کو تمام اختیارات سلطنت عطا کر دیے۔ سنہ ۷۰۳ ھ میں ابوالحاج بن نصر حاکم وادی آتش نے علم بغاوت بلند کیا مگر گرفتار و مقتول ہوا۔ ماہ شوال سنہ ۷۰۵ ھ میں محمد مخلوع نے افریقہ کے قلعہ سوطا کو فتح کیا۔ وزیر السلطنت سے رعایا کے اکثر لوگ ناخوش تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد مخلوع کے بھائی نصر بن محمد

کو بغاوت پر آمادہ کیا اور اول وزیر السلطنت کے مکان کو لوٹ کر قصر شاہی پر دھاوا کر دیا۔ محمد مخلوع کو گرفتار و معزول کر کے نصر بن محمد کو تخت سلطنت پر بٹھایا۔

سلطان نصر بن محمد:

سلطان نصر بن محمد فقیہہ نے تخت نشین ہو کر ابوالحاج مقتول مذکور کے بیٹے نصر کو اپنا وزیر بنایا۔ محمد مخلوع کا عزل اور نصر بن محمد کی تخت نشینی کا واقعہ عیدالفطر کے دن سنہ ۷۰۸ھ میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ سنہ ۷۰۹ھ میں بادشاہ قسطلہ نے الجزائر پر حملہ کیا۔ یہ شہر تو فتح نہ ہوا مگر جبل الطارق پر شاہ قسطلہ کا قبضہ ہو گیا۔ اسی سال دوسری طرف شاہ برشلونہ نے المیر یہ پر حملہ کر دیا۔ سلطان نصر نے المیر یہ کو بچانے کے لیے فوج بھیجی۔ ابھی المیر یہ پر سلسلہ جنگ جاری تھا کہ ابوسعید نے بلیش کو بھی فتح کر لیا اور اس طرح سلطنت غرناطہ میں خانہ جنگی شروع ہو کر سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ یہ نامعقول حالات ابھی رو بہ اصلاح نہ ہوئے تھے کہ جمادی الثانی سنہ ۷۱۰ھ میں سلطان نصر بیمار ہوا اور زندگی سے ناامیدی ہوئی۔ لوگوں نے سلطان محمد مخلوع کو سلطان نصر کی جگہ تخت نشین کرانا چاہا۔ اتفاقاً سلطان نصر تندرست ہو گیا۔ اس نے سلطان محمد مخلوع کو جواب تک قید تھا، قتل کیا۔ ابوسعید اور اس کے بیٹے ابوالولید نے مالقہ کو دارالحکومت بنا کر اپنے مقبوضہ حصہ ملک پر خود مختارانہ حکومت شروع کر دی تھی۔ محرم سنہ ۷۱۳ھ میں ابوالولید فوج لے کر دارالسلطنت غرناطہ کے قریب قریۃ العطشاء میں آ کر خیمہ زن ہوا۔ سلطان نصر بھی غرناطہ سے فوج لے کر نکلا۔ ۱۳ محرم سنہ ۷۱۳ھ کو سلطان نصر نے ابوالولید سے شکست کھائی اور غرناطہ میں آ کر پناہ لی۔ غرناطہ پہنچ کر صلح کی سلسلہ جنبانی کی۔ ابھی صلح نامہ کی تکمیل نہ ہونے پائی تھی کہ بعض باشندگان غرناطہ نے ابوالولید کو جو مالقہ چلا گیا تھا، جا کر صلح سے روکا اور غرناطہ پر حملہ کی ترغیب دی۔ وہ بعض سرداران غرناطہ کو اپنا ہمدرد پا کر فوراً حملہ پر آمادہ ہو گیا۔ مقام شدونہ کے قریب مالقہ و غرناطہ کی فوجوں کا ایک زبردست مقابلہ ہوا۔ آخر ابوالولید کو فتح حاصل ہوئی اور وہ پاشنہ کوب مفردین کے ساتھ ہی غرناطہ میں داخل ہوا۔ سلطان قصر حمرا میں محصور ہو گیا۔ آخر ۲۱ شوال سنہ ۷۱۳ھ کو سلطان نے تخت سلطنت سے دست برداری کی دستاویز ابوالولید کے حق میں لکھ دی۔

ابوالولید:

ابوالولید نے غرناطہ کے تخت پر جلوس کر کے نصر کو وادی آش میں جا کر رہنے کی اجازت دی۔ ابوالولید نے غرناطہ کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر بہت ہوشیاری سے امور سلطنت کو انجام دینا شروع کیا۔ عیسائی جو مسلمانوں کی اس خانہ جنگی کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے، یہ دیکھ کر کہ اب غرناطہ کے تخت پر پہلے سے زیادہ قابل اور بہادر بادشاہ قابض ہو گیا ہے، حملہ آوری کی تیاریوں میں مصروف ہوئے۔ چنانچہ شاہ قسطلہ نے سنہ ۷۱۶ھ میں سلطنت غرناطہ کے سرحدی مقامات پر حملہ کیا اور کئی شہروں پر قابض ہو گیا۔ ابوالولید نے بھی سلسلہ جنگ جاری رکھا اور آخر محرم سنہ ۷۱۹ھ میں عیسائیوں کو مار کر نکال دیا اور اپنا تمام علاقہ اس نے خالی کرا لیا۔ ابوالولید کی یہ چیرہ دستی دیکھ کر عیسائیوں نے مذہبی جنگ کا اعلان کر کے تمام عیسائی سرداروں اور رئیسوں کو مسلمانوں کی بیخ کنی پر آمادہ کیا۔ پادریوں نے اپنے مواعظ و تقاریر سے عیسائی ممالک میں جوش پیدا کر دیا۔ اندلس کے پوپ اعظم نے خاص طور پر اس جہاد میں حصہ لیا۔ شہر طیطلہ میں عیسائی افواج کا اجتماع ہوا۔ دو لاکھ سے زیادہ جنگجو عیسائی طیطلہ میں جمع ہو گئے کہ غرناطہ کی ریاست کو بیخ و بن سے اکھیڑ کر مسلمانوں کا نام ونشان جزیرہ نمائے اندلس سے مٹا دیں گے۔ اس لشکر عظیم کا سپہ سالار اعظم سلطنت قسطلہ کا ولی عہد بطر وہ قرار دیا گیا۔ یورپ کے مختلف ممالک سے پچیس کے قریب عیسائی سلاطین اس لشکر میں آ کر شریک ہوئے۔ پوپ اعظم نے ہر ایک سردار کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کو برکت دی اور تمام براعظم یورپ میں پادریوں نے دعائیں مانگیں کہ اس مرتبہ اندلس سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹا دینے میں کامیابی حاصل ہو۔

جنگ البسیرہ:

اس عظیم الشان لشکر اور ایسی حیرت انگیز تیاریوں کا حال سن کر غرناطہ کے مسلمانوں کو بڑی پریشانی ہوئی۔ ابوالولید نے مراکش کے بادشاہ ابوسعید کے پاس پیغام بھیجا کہ یہ وقت مدد کا ہے۔ مگر سلطان مراکش نے کسی قسم کی مدد دینے سے انکار کر دیا یا یہ کہ وہ کوئی مدد نہ دے سکا۔ بہر حال جب اس طرف سے بھی مایوسی ہوئی تو غرناطہ کے مسلمانوں کی عجیب حالت ہوئی۔ ان کی نگاہوں کے سامنے ہلاکت یقینی تھی اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ابوالولید، سلطان غرناطہ زیادہ سے

زیادہ جس قدر فوج جمع کر سکا، اس کی تعداد ساڑھے پانچ ہزار تھی یعنی چار ہزار پیادے اور ڈیڑھ ہزار سوار۔ عیسائیوں کے کئی لاکھ لشکر جرار کے مقابلہ میں اس قلیل تعداد کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی مگر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اسی مٹھی بھر فوج کو لے کر سلطان غرناطہ ۲۰ ربیع الثانی سنہ ۷۱۹ھ کو غرناطہ سے روانہ ہوا۔ سلطان نے اپنے ایک سردار شیخ الغزاۃ نامی کو پانچ سو آدمیوں کا ایک دستہ دے کر بہ طور ہر اول آگے بھیجا اور پانچ ہزار فوج لے کر اس کے پیچھے خود روانہ ہوا۔ راستے بھر امراء لشکر سے مشورے ہوتے رہے کہ ہم کس طرح عیسائیوں پر فتح پا سکتے ہیں؟ آخر مسلمانوں کے ہراول کا عیسائیوں کے ہراول سے مقابلہ ہوا اور عیسائی ہراول شکست کھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بعد سلطان ابوالولید نے مقام البسیرہ کے متصل ایک جھاڑی میں اپنے ایک سردار ابوالجیوش نامی کو ایک ہزار سواروں کے ساتھ چھپا دیا۔ شیخ الغزاۃ کو پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ آگے بھیجا اور حکم دیا کہ تم عیسائیوں کے سامنے پہنچ کر پیچھے ہٹنا اور اپنے تعاقب میں ان کو لگائے لانا۔ ابوالجیوش کو یہ ہدایت تھی کہ جب عیسائی تمہارے برابر سے گزر جائیں تو تم جھاڑیوں سے نکل کر ان پر عقب سے حملہ آور ہونا۔ صرف تین سو سوار لے کر سلطان ابوالولید ایک مناسب مقام پر ٹھہر گیا اور باقی فوج کو ایک اور سردار کو دے کر مناسب ہدایات کے ساتھ آہستہ بڑھنے کا حکم دیا۔ شیخ الغزاۃ ۶ جمادی الاول سنہ ۷۱۹ھ کو علی الصباح عیسائی لشکر کے سامنے پہنچا۔ عیسائیوں نے اس قلیل جماعت کو دیکھ کر فوراً حملہ کیا۔ شیخ الغزاۃ نے حسب ہدایت پیچھے ہٹنا شروع کیا اور عیسائی لشکر کا سمندر کمزور مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کے شوق میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ متحرک ہوا۔ شیخ الغزاۃ پیچھے ہٹتا جاتا تھا اور عیسائی لشکر جوش مسرت میں بڑھا چلا آتا تھا۔ جب ابوالجیوش کے سامنے سے یہ لشکر گزرا تو وہ اپنے ایک ہزار ہمراہیوں کو لے کر شیر نیستان[1] کی طرح جھاڑی سے نکل کر عیسائیوں پر ٹوٹ پڑا۔ ابوالجیوش کے حملہ آور ہوتے ہی شیخ الغزاۃ بھی رک کر حملہ آور ہوا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان ابوالولید بھی تیسری سمت سے اپنے تین سو سواروں کو لے کر حملہ آور ہوا۔ اس کے ساتھ ہی بقیہ فوج نے بھی بڑی بے جگری کے ساتھ حملہ کیا۔ بہ ظاہر یہ حملہ اور ستم اس کئی لاکھ کے لشکر عظیم کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہ رکھتے تھے مگر مسلمانوں نے اپنی جان پر کھیل کر اور زندگیوں سے مایوس ہو کر شوق شہادت میں اس شدت سے حملے کیے تھے کہ عیسائی لشکر حواس باختہ ہو کر تاب مقاومت نہ لا سکا اور جدھر جس کا منہ

---

[1] جنگل کا شیر۔

اٹھا بھاگنے لگا۔ ایک لاکھ عیسائی میدان جنگ میں کھیت رہے اور باقی جان بچا کر لے گئے۔ غالباً یہ لڑائی جو جنگ البسیرہ کے نام سے مشہور ہے، اپنی نوعیت میں بے نظیر جنگ ہے۔ سب سے زیادہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ اس لڑائی میں صرف تیرہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔ ایک طرف تیرہ اور دوسری طرف ایک لاکھ آدمیوں کا ہلاک ہونا عجائبات میں سے ہے۔[1] میدان جنگ میں سپہ سالار اعظم بطروہ اور پچیس معاونین کی لاشیں بھی موجود تھیں۔ سات ہزار قیدیوں میں بطروہ کی بیوی اور بیٹے بھی شریک تھے۔ بطروہ کی لاش ایک صندوق میں رکھ کر شہر غرناطہ کے دروازے پر لٹکا دی گئی تھی۔ اس شکست فاش سے عیسائیوں کی کمر ٹوٹ گئی اور ان کو معلوم ہوا کہ غرناطہ کی ریاست کا اندلس سے نام ونشان مٹانا کوئی آسان کام نہیں۔ سلطان ابوالولید نے اس فتح پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور عیسائیوں کی درخواست پر ان سے صلح کر کے اپنی سلطنت کے اندرونی انتظام واستحکام میں مصروف ہو گیا اور جب سنہ ۷۲۵ھ کو سلطان ابوالولید نے قلعہ مرطاش فتح کیا، اس کے بعد جب سلطان غرناطہ میں واپس آیا تو ۲۷ر جب سنہ ۷۲۵ھ کو اس کے بھتیجے نے اس کو دھوکے سے قتل کر دیا۔ اراکین سلطنت نے قصاص میں قاتل کو قتل کیا اور سلطان کے بیٹے محمد کو تخت نشین کیا۔

سلطان محمد:

سلطان محمد نے تخت نشین ہو کر ابوالعلا عثمان کو اپنا وزیر بنایا۔ وزیر عثمان نے اپنا اقتدار جب حد سے زیادہ بڑھایا اور تخت سلطنت کے لیے مضر ثابت ہونے لگا تو سلطان محمد نے سنہ ۷۲۹ھ میں اس کو قتل کرا دیا۔ سنہ ۷۳۳ھ میں سلطان محمد نے جبل الطارق کو عیسائیوں سے خالی کرا لیا۔ عیسائی اس کو بچانے اور واپس لینے کے لیے بحری و بری فوجوں کے ساتھ حملہ آور ہوئے مگر ناکام ونامراد رہے۔ جبل الطارق سے سلطان محمد غرناطہ کو واپس آ رہا تھا کہ ابوالعلا عثمان کے بیٹوں اور رشتہ داروں نے موقع پا کر سلطان محمد پر حملہ کیا اور قتل کر ڈالا۔ سلطان کے ہمراہی اس کی لاش کو مالقہ لائے اور یہیں دفن کر دیا۔

سلطان یوسف:

اب سلطان محمد مقتول کا بھائی یوسف تخت نشین ہوا۔ سلطان یوسف کی عمر تخت نشینی کے وقت

---

[1] بہ ظاہر یہ تعجب کی بات ہے لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہے، کر سکتا ہے۔ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے، جسے چاہے فتح عطا فرمائے اور جسے چاہے شکست سے دوچار کرے۔

صرف سولہ سال کی تھی مگر یہ نہایت عقلمند، اللہ والا اور بہادر شخص تھا۔ اس نے نہایت قابلیت کے ساتھ سلطنت کو سنبھالا اور اپنے بھائی کے قاتلوں سے انتقام لے کر امور سلطنت کو نہایت عمدگی سے انجام دیا۔ عیسائیوں نے جبل الطارق اور اس کے نواح میں پھر حملہ آوری اور چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ سلطان یوسف نے ابوالحسن مرینی شاہ مراکش کو توجہ دلائی۔ ابوالحسن مرینی نے اپنے بیٹے کو فوج دے کر جبل الطارق کی طرف بھیجا۔ ادھر سے سلطان یوسف بھی پہنچ گیا۔ جنگ ہوئی، عیسائیوں نے شکست پائی۔ جب مراکش کا لشکر واپس جانے لگا تو عیسائیوں نے دھوکا دے کر ایک سخت حملہ کیا۔ اس میں مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا۔ سنہ ۷۴۰ھ میں سلطان ابوالحسن خود ساٹھ ہزار فوج لے کر اندلس آیا۔ ادھر سے سلطان یوسف بھی اس کی امداد واعانت کو پہنچ گیا۔ عیسائیوں نے اسلامی لشکر کی چڑھائی کا حال سن کر پہلے سے خوب تیاری کر لی تھی۔ ظریف کے متصل ایک میدان میں جنگ عظیم برپا ہوئی۔ عیسائیوں کی فوج تعداد اور سامان جنگ میں بہت زیادہ تھی۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کو ہزیمت ہوئی اور ایک بڑی تعداد نے جام شہادت نوش کیا۔ عیسائیوں نے سلطنت غرناطہ کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ سلطان ابوالحسن مراکش کو واپس گیا اور یوسف نے غرناطہ میں آ کر پناہ لی۔ اس لڑائی میں بڑے بڑے علماء وزہاد جو شامل لشکر تھے، شہید ہوئے۔ انہیں شہداء میں لسان الدین ابن الخطیب کے باپ عبداللہ سلمان بھی تھے۔

سنہ ۷۴۹ھ میں سلطان یوسف نے لسان الدین ابن الخطیب کو اپنا وزیراعظم بنایا اور عیسائیوں سے انتقام لینے کی تیاریوں میں مصروف رہا۔ سنہ ۷۵۵ھ میں سلطان یوسف عیسائیوں پر جہاد کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ عید کے روز جبکہ سلطان نماز عید ادا کر رہا تھا، سجدہ کی حالت میں ایک مجہول الاحوال شخص نے نیزہ مار کر سلطان کو شہید کر دیا۔ قصر حمراء میں اس کو دفن کیا گیا۔

سلطان محمد غنی باللہ:

یوسف کے بعد اس کا بیٹا محمد تخت نشین ہوا اور غنی باللہ کا لقب اختیار کیا۔ تخت نشینی کے چند روز بعد سلطان محمد نے لسان الدین ابن الخطیب کو ابوسالم بن ابوالحسن مرینی شاہ مراکش کے پاس بھیجا کہ اس کو عیسائیوں کے خلاف امداد پر آمادہ کرے۔ ابوسالم نے فوج بھیج دی اور عیسائیوں سے معمولی لڑائیاں ہوئیں مگر کوئی قابل تذکرہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ حاجب السلطنت رضوان نامی اس بادشاہ

کے مزاج میں دخیل ہو کر سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان محمد کے سوتیلے بھائی اسماعیل نے ۲۸ رمضان سنہ ۷۶۰ھ کو جبکہ سلطان محمد شہر سے باہر جنت العریف میں مقیم تھا، قلعہ غرناطہ پر قبضہ کر لیا۔ ۲۹ رمضان کی صبح کو جب سلطان محمد نے سنا کہ شہر و قلعہ پر اسماعیل کا قبضہ ہو چکا ہے تو وہ سیدھا وادی آش کی طرف روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر فوج کو فراہم کرنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے شاہ قسطلہ سے خط و کتابت کر کے اس کو اپنی امداد پر آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر ابھی اس عیسائی بادشاہ کی طرف سے کوئی تسکین بخش جواب نہیں ملا تھا کہ سلطان ابو سالم بن ابوالحسن مرینی بادشاہ مراکش کی طرف سے ۱۰ ذی الحجہ سنہ ۷۶۰ھ کو ابوالقاسم ابن شریف بہ طور سفیر پہنچا اور سلطان محمد سے کہا کہ بادشاہ مراکش کے ساتھ چونکہ آپ کے قدیمی دوستانہ تعلقات ہیں، لہٰذا ان تعلقات کی بناء پر ابو سالم خواہشمند ہے کہ آپ اس کے یہاں بہ طور مہمان تشریف لے چلیں۔ وہ آپ کی ہر قسم کی امداد کرنے پر آمادہ ہے۔ سلطان محمد ۱۱ ذی الحجہ کو وادی آش سے مراکش کی جانب روانہ ہوا اور مراکش پہنچ کر عزت و حرمت کے ساتھ سلطان ابو سالم کا مہمان ہوا۔ ادھر غرناطہ میں سلطان اسماعیل کی حکومت شروع ہو گئی۔

سلطان اسماعیل:

سلطان اسماعیل نے بھی تخت نشین ہونے کے بعد قسطلہ کے عیسائی بادشاہ سے خط و کتابت کر کے دوستی و صلح کی بنیاد قائم کی۔ شاہ قسطلہ چونکہ ان دنوں شاہ برشلونہ کے ساتھ برسر جنگ تھا، اس نے اس صلح کو بہت غنیمت سمجھا۔ مگر ۴ شعبان سنہ ۷۶۱ھ کو سلطان اسماعیل کے بھائی ابو یحییٰ عبداللہ نے سلطان اسماعیل اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر کے خود تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ ۲۷ شوال سنہ ۷۶۲ھ کو اکیس مہینے کی جلاوطنی کے بعد سلطان محمد، سلطان مراکش کی امداد سے اندلس میں آیا اور سلطنت غرناطہ کے علاقہ پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ ابو یحییٰ عبداللہ نے جب اپنے آپ کو مقابلے میں کمزور پایا تو وہ خود بادشاہ قسطلہ کے پاس امداد طلب کرنے گیا۔ بادشاہ قسطلہ نے اس اعانت خواہ و پناہ گزین کو ۲ رجب سنہ ۷۶۳ھ کو مع تمام ہمراہیوں کے اشبیلیہ کے قریب قتل کرا دیا اور اس کے تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔

ادھر سلطان محمد مخلوع نے ۲۰ جمادی الآخر سنہ ۷۶۳ھ کو غرناطہ پر قبضہ کر کے تخت سلطنت پر جلوس

کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جبل الطارق سلطنت مراکش کے مقبوضات میں شامل تھا اور کئی سال سے سلطنت غرناطہ قسطلہ کی عیسائی سلطنت کی باج گزار ہوگئی تھی۔ سلطان محمد نے اس مرتبہ غرناطہ، پر قابض ہوکر نہایت احتیاط وخوبی کے ساتھ اپنی حالت کوسنبھالنے کی کوشش کی۔ حسن اتفاق سے مراکش میں ابوسالم کے فوت ہونے پر اس کی اولاد میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ادھر شاہ قسطلہ اور اس کے بھائی میں لڑائیاں ہونے لگیں۔ دونوں طرف کی خانہ جنگیوں سے سلطان محمد نے فائدہ اٹھایا۔ ایک طرف تو قلعہ جبل الطارق پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف سلطنت قسطلہ کوخراج دینے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ واقعہ سنہ۷۷۲ھ کا ہے۔ سنہ۷۷۲ھ میں جب شاہ قسطلہ کے سفیروں کوکوئی خراج نہیں دیا گیا اور انکاری جواب کے ساتھ واپس کیا گیا تو عیسائیوں سے سوائے خاموش رہنے کے اور کچھ نہ ہوسکا۔ غرض اس سلطان کے عہد حکومت میں سلطنت غرناطہ کے رعب ووقار نے خوب ترقی کی اور عیسائی اس سے ڈرنے لگے۔

سلطان یوسف ثانی:

سنہ۷۹۳ھ میں سلطان محمد فوت ہوا اور اس کا بیٹا یوسف ثانی تخت نشین ہوا۔ یہ صلح پسند اور عقلمند شخص تھا۔ اس نے بادشاہ قسطلہ سے قیام صلح کے لیے عہدنامہ مکمل کیا۔ یوسف ثانی کے چار بیٹے یوسف، محمد، علی اور احمد تھے۔ ان میں محمد سب سے زیادہ چالاک اور ہوشیار تھا۔

سلطان محمد ہفتم:

سنہ۷۹۸ھ میں یوسف ثانی فوت ہوا تو محمد اپنے بڑے بھائی یوسف کومحروم کر کے خود تخت نشین ہوگیا۔ اس خاندان میں محمد نام کے بہت سے شخص ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس محمد بن یوسف ثانی کومحمد ہفتم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ محمد ہفتم کی تخت نشینی کے چندروز بعد عیسائیوں سے پھر چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی تھی اور مسلمانوں نے اس سلسلہ جنگ میں عیسائیوں کوشکستیں دے کر سلطنت قسطلہ کے بعض مقامات پر قبضہ کر لیا تھا۔ انہیں ایام میں بادشاہ قسطلہ فوت ہوا اور اس نے اپنا ایک شیرخور بچہ جان نامی چھوڑا۔ اسی شیرخور کوتخت سلطنت پر بٹھا کر اس کے چچا فرڈی نند نے مہمات سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ فرڈی نند نے بھی سلسلہ جنگ کو جاری رکھا۔ چونکہ عیسائیوں کی فوج تعداد میں بہت زیادہ تھی، اس لیے محمد ہفتم نے عیسائی افواج کومحاذ جنگ پر مصروف رکھ کر اپنی فوج کے ایک حصہ سے

شہر جیان کی طرف حملہ کیا۔ اس ترکیب سے عیسائیوں کو اپنی افواج اس طرف منتقل کرنا پڑیں اور ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ فرڈی نند نے مجبور ہو کر درخواست صلح پیش کی جو محمد ہفتم نے منظور کر لی۔ اس طرح اس سلسلہ جنگ کا خاتمہ ہوا۔ سنہ ۸۰۳ھ میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے لشکروں میں پھر ایک جنگ عظیم برپا ہوئی۔ اس لڑائی میں غالب و مغلوب کا کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ آخر عیسائیوں نے پھر صلح چاہی اور آٹھ مہینے کے لیے وقتی صلح ہو گئی۔ ابھی مدت پوری نہ ہونے پائی تھی کہ سلطان محمد ہفتم نے بیمار ہو کر وفات پائی اور اس کا بھائی یوسف ثالث جو نظر بند تھا، تخت نشین ہوا۔

سلطان یوسف ثالث:

یوسف ثالث نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے ایک سردار عبداللہ کو فرڈی نند کے پاس بھیج کر مدت صلح کو دو سال تک کے لیے وسیع کرا لیا۔ جب یہ دو سال کی مدت ختم ہونے لگی تو سلطان یوسف ثالث نے اپنے بھائی علی کو شاہ قسطلہ کے پاس بہ طور سفیر بھیج کر مدت صلح میں اور توسیع چاہی۔ عیسائیوں نے سلطان کی اس صلح جوئی کو کمزوری پر محمول کر کے کہا کہ اگر تمہارا سلطان ہم کو خراج دینا قبول کر لے تو ہم اس درخواست کو منظور کر سکتے ہیں۔ علی نے عیسائیوں کی اس درخواست کو نامنظور کر کے غرناطہ کی جانب مراجعت کی۔ اس کے بعد فرڈی نند نے فوج گراں لے کر حدود سلطنت غرناطہ پر حملہ کیا۔ نہایت سخت و شدید جنگ ہوئی اور سلطنت غرناطہ کا ایک حصہ عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ابھی یہ لڑائی ختم نہ ہوئی تھی کہ سلطنت فاس (مراکش) کے ایک لشکر نے اپنے شہزادہ ابوسعید کی قیادت میں قلعہ جبل الطارق پر حملہ کیا۔ اس حملہ کا حال سن کر سلطان یوسف ثالث نے اپنے بھائی احمد کو فوج دے کر جبل الطارق کو بچانے کے لیے روانہ کیا۔ وہاں دونوں شہزادوں میں صلح ہو گئی اور ابوسعید، شہزادہ احمد کے ساتھ بہ طور مہمان غرناطہ چلا آیا۔ مراکش کے بادشاہ نے جو شہزادہ ابوسعید کا بڑا بھائی تھا، یوسف ثالث کو لکھا کہ کسی طرح ابوسعید کو وہیں قتل کرا دو۔ یوسف ثالث نے ابوسعید کو اس کے بھائی کا خط دکھایا اور اس کو بتایا کہ تمہارے بھائی نے تم کو قتل کرانے کے لیے جبل الطارق پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ ابوسعید نے سنہ ۸۲۰ھ میں سلطان یوسف ثالث سے مدد لے کر اور اندلس ہی میں ہر قسم کا سامان مہیا کر کے مراکش پر حملہ کیا اور اپنے بھائی کو بے دخل کر کے خود تخت نشین ہوا اور اپنے محسن سلطان یوسف ثالث کا شکریہ ادا کیا۔

اسی سال یعنی سنہ ۸۲۰ھ میں جان بادشاہ قسطلہ نے بالغ ہو کر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اپنے چچا فرڈی نند کو معزول کر دیا اور اپنی ماں کے مشورے کے موافق یوسف ثالث سے صلح قائم کی۔ یوسف ثالث اس قدر منصف مزاج اور عادل شخص تھا کہ اکثر عیسائی سردار اپنے آپس کے نزاعوں میں یوسف ثالث ہی کو حکم قرار دیتے اور اس کے فیصلے کو بہ خوشی قبول کر لیتے تھے۔ سلطان یوسف ثالث نے سنہ ۸۲۲ھ میں اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد ہشتم تخت نشین ہوا۔

سلطان محمد ہشتم نے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت قسطلہ اور سلطنت مراکش دونوں سے صلح و دوستی کے عہد ناموں کی تجدید کی اور امیر یوسف کو جس کے بزرگ غرناطہ کے قاضی ہوتے آئے تھے، اپنا وزیر اعظم بنایا۔ یہ وزیر بڑا لائق شخص تھا۔ مگر محمد ہشتم نے نااہلوں کی صحبت اور سفلہ پروری اختیار کی، جس سے رعایائے غرناطہ بہت بددل ہوئی۔ آخر محمد نہم نے موقع پا کر غرناطہ پر قبضہ کر لیا۔ محمد ہشتم غرناطہ سے بھاگ کر اور ایک غریب ملاح کی شکل بنا کر ابوالفارس بادشاہ تونس کے پاس چلا گیا۔ ابوالفارس نے اس کو عزت و تکریم کے ساتھ اپنے پاس رکھا اور مدد دینے کا بھی وعدہ کیا۔

سلطان محمد نہم:

سلطان محمد نہم نے تخت نشین ہو کر امراء کو اپنا طرفدار بنایا۔ مگر اس نے یہ غلطی کی کہ وزیر یوسف کو اپنا مخالف بنا لیا اور اس کی تخریب کے درپے ہوا۔ وزیر یوسف غرناطہ سے پندرہ سو آدمیوں کو ہمراہ لے کر مرسیہ بھاگ آیا اور یہاں سے خط و کتابت کے ذریعہ سے بادشاہ قسطلہ سے اجازت لے کر اس کے پاس چلا گیا اور بادشاہ قسطلہ مسمی جان کو محمد ہشتم کی امداد پر آمادہ کرانا چاہا۔ اس عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں کو آپس میں لڑوانے کا بہت اچھا موقع پایا اور کہا کہ اپنے ہمراہیوں میں سے بااثر اشخاص کا ایک وفد بادشاہ تونس کے پاس بھیجو اور اس کو بھی امداد پر آمادہ کرو۔ چنانچہ وفد گیا اور ابوالفارس بادشاہ تونس نے پانچ سو سوار اور ایک معقول رقم بہ طور امداد دے کر اپنے جہازوں میں سوار کرا کر محمد ہشتم کو اندلس کی طرف روانہ کر دیا۔ جب سلطان محمد ہشتم اندلس کے ساحل پر اترا تو وزیر یوسف کی کوشش سے صوبہ المیریا کے باشندوں نے اس کی امداد کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ محمد نہم نے محمد ہشتم کے آنے کی خبر سن کر اس کے مقابلے کو فوج بھیجی۔ مگر جب یہ دونوں فوجیں ایک

دوسرے کے سامنے پہنچیں تو یوسف کی کوشش سے محمد نہم کی فوج کا بڑا حصہ محمد ہشتم کی فوج سے آ ملا۔ اس طرح باقی لوگ بھاگ کر غرناطہ آئے۔ محمد ہشتم غرناطہ کی طرف بڑھا اور سنہ ۸۳۳ھ میں غرناطہ کو فتح کر کے محمد نہم کو گرفتار و قتل کیا اور خود تخت نشین ہوا۔

محمد ہشتم نے دوبارہ سلطنت حاصل کرنے کے بعد اپنے وزیر یوسف کی رائے کے موافق اپنے طرز عمل کو تبدیل کر دیا اور رعایا کی دل جوئی میں مصروف ہوا۔ اب عیسائی بادشاہ قسطلہ کی طرف سے اطمینان حاصل کرنے کے لیے محمد ہشتم نے چاہا کہ اس سے دوامی صلح ہو جائے لیکن عیسائی بادشاہ نے کہا کہ تم ہم کو خراج دینا قبول کرو تو دوامی صلح ہو سکتی ہے۔ اس کو محمد ہشتم نے نامنظور کیا مگر چونکہ شاہ قسطلہ کو بھی بعض اندرونی پیچیدگیوں کی وجہ سے اطمینان حاصل نہ تھا، لہٰذا کوئی فتنہ برپا نہ ہوا۔ چند روز کے بعد شاہ قسطلہ نے حملہ کیا۔ متعدد لڑائیاں ہوئیں، کبھی مسلمانوں کو کبھی عیسائیوں کو کامیابی ہوئی۔ ابھی لڑائیوں کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ محمد ہشتم کے ایک رشتہ دار یوسف ابن الاحمر نے علم بغاوت بلند کیا اور اپنے دوستوں کی مدد سے البیرہ میں سلطنت غرناطہ کے تخت کا مدعی ہو کر شاہ قسطلہ سے خط و کتابت کر کے اس بات کا اقرار کیا کہ اگر آپ کی مدد سے میں سلطنت غرناطہ پر قابض و متسلط ہو گیا تو سالانہ خراج بلا چون و چرا ادا کیا کروں گا اور ضرورت کے وقت اپنی فوج سے آپ کا مددگار رہوں گا۔ عیسائیوں نے اس کو تائید غیبی سمجھا اور شاہ قسطلہ نے فوراً اپنی فوجیں مقام البیرہ میں یوسف کی مدد کے لیے بھیج دیں۔ یہاں محمد ہشتم نے حملہ کیا اور جنگ عظیم برپا ہوئی۔ بادشاہ قسطلہ بھی اس جنگ میں خود موجود تھا۔ آخر طرفین سے بہت سے آدمی کام آئے اور غالب و مغلوب کا فیصلہ ہوئے بغیر شاہ قسطلہ یوسف ابن الاحمر کو لیے ہوئے قرطبہ کی جانب اور محمد ہشتم غرناطہ کی جانب چلا گیا۔

شاہ قسطلہ نے قرطبہ میں دربار عام منعقد کر کے یوسف ابن الاحمر کو بادشاہ غرناطہ بنایا اور اس کو ہر قسم کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد یوسف کو فوج دے کر رخصت کیا کہ غرناطہ کی سلطنت پر قبضہ کر لے۔ یوسف نے فرماں برداری کا اقرار کیا اور روانہ ہو کر حدود سلطنت غرناطہ میں عیسائیوں کی مدد سے لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ عیسائیوں کو اب ہر قسم کا اطمینان تھا کیونکہ دونوں مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جنگ آزما ہو گئے تھے اور وہ دور سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ سلطان محمد ہشتم نے اپنے وزیر یوسف کو یوسف ابن الاحمر کی سرکوبی پر مامور کیا۔ سنہ ۸۳۹ھ میں وزیر یوسف

ایک لڑائی میں یوسف ابن الاحمر کے ہاتھ سے مارا گیا۔ یہ خبر جب غرناطہ میں پہنچی تو وہاں کی رعایا میں سخت بے چینی پیدا ہوئی اور محمد ہشتم کے خلاف رائے زنی ہونے لگی۔ محمد ہشتم یہ رنگ دیکھ کر قصر حمراء کا تمام خزانہ ہمراہ لے کر غرناطہ سے مالقہ کی طرف چلا گیا۔

یوسف بن الاحمر:

اس کے بعد ہی یوسف بن الاحمر غرناطہ پر آ کر قابض و متصرف ہو گیا۔ غرناطہ میں تخت نشینی کی رسم ادا کر کے بادشاہ قسطلہ کو اقرار فرماں برداری کا عریضہ بھیجا اور محمد ہشتم کی گرفتاری کے لیے مالقہ کی جانب فوج روانہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ ابھی مالقہ کی جانب فوج روانہ نہ کر سکا تھا کہ چھ مہینے کی بادشاہت کے بعد یوسف بن الاحمر فوت ہو گیا۔

اس کے بعد محمد ہشتم اس کے مرنے کی خبر سنتے ہی مالقہ سے غرناطہ میں آ کر تیسری مرتبہ تخت نشین ہوا۔ امیر عبدالحق کو اپنا وزیر اور امیر عبدالبر کو اپنا سپہ سالار بنایا۔ عیسائیوں نے پھر فوج کشی کی اور سپہ سالار غرناطہ نے ان کو شکست دے کر واپس بھگا دیا۔ اس شکست سے عیسائیوں کی ہمت پست ہو گئی اور غرناطہ کی اسلامی سلطنت کا رعب پھر قائم ہو گیا۔ افسوس کہ اس کامیابی کے بعد جبکہ مسلمانوں کو اپنی طاقت بڑھانے اور اپنی حالت سدھارنے کا موقع حاصل تھا، پھر خانہ جنگی کے سامان پیدا ہو گئے۔ سلطان محمد ہشتم کا ایک بھتیجا ابن عثمان المیریا کا حاکم مقرر تھا۔ اس نے اپنے چچا کے خلاف غرناطہ کی رعایا کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ جب اس کو یقین ہو گیا کہ غرناطہ میں لوگ میری طرفداری کریں گے تو فوراً غرناطہ میں آ کر اور باغیوں کا سردار بن کر قصر الحمراء پر قابض ہو گیا اور محمد ہشتم کو تیسری مرتبہ تخت سے اتار کر قید کر دیا۔ امیر عبدالبر سپہ سالار نے غرناطہ بھاگ کر ہوا خواہوں کو جمع کیا اور سلطان محمد ہشتم کی رہائی کی تدبیریں کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اگر میں سلطان محمد ہشتم کی رہائی کے مطالبہ کا اعلان کروں گا تو ممکن ہے کہ ابن عثمان جو غرناطہ میں تخت نشین ہو چکا ہے، محمد ہشتم کو قتل کر دے۔ لہٰذا اس نے محمد ہشتم کے دوسرے بھتیجے ابن اسماعیل کو اپنا شریک کار بنانے اور سلطنت کا دعویٰ کرنے کی ترغیب دی۔ ابن اسماعیل فوراً رضامند ہو گیا اور بادشاہ قسطلہ نے خط و کتابت کرنے اور اجازت لینے کے بعد عبدالبر سے آ ملا۔ عیسائیوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ ایک طرف ابن اسماعیل نے اور دوسری طرف شاہ قسطلہ نے سلطان ابن عثمان کی حدود پر فوج کشی شروع کی۔ یہ سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا۔ سنہ ۸۵۲ھ میں شاہ ارغون اور شاہ اربونیہ (دونوں عیسائی

تھے) نے شاہ قسطلہ کے خلاف فوج کشی شروع کی۔ اس طرح شاہ قسطلہ اپنی مصیبت میں گرفتار ہوا اور مسلمانوں کی طرف سے فوجیں ہٹا لیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن اسماعیل بھی اپنے حریف شاہ قسطلہ کے خانہ جنگی سے فارغ ہونے تک خاموش رہا۔ سلطان ابن عثمان کو جب یہ معلوم ہوا کہ شاہ ارغون اور شاہ اربونیہ سلطنت قسطلہ کے خلاف متحد ہو گئے ہیں تو اس نے اپنے سفیران دونوں عیسائی بادشاہوں کے پاس بھیج کر ان سے دوستانہ تعلقات پیدا کیے اور وعدہ کیا کہ جب تم قسطلہ پر حملہ آور ہو گے تو میں بھی تمہارے مقصد کی کامیابی کے لیے ادھر سے حملہ آور ہوں گا۔ چنانچہ سنہ ۸۵۴ھ میں سلطان ابن عثمان نے قسطلہ کی سلطنت پر حملہ کیا اور صوبہ مرسیہ کو تاخت وتاراج کرتا اور قسطلہ کی فوجوں کو دور تک بھگاتا ہوا بہت سے مال غنیمت کے ساتھ غرناطہ واپس آیا۔ اگلے سال سلطان ابن عثمان نے صوبہ اندلوسیہ پر حملہ کیا اور مرسیہ کی طرح اس صوبہ کو بھی خوب تباہ وبرباد کرتا رہا۔ اگر سلطان ابن عثمان چاہتا تو قرطبہ پر قبضہ کرسکتا تھا۔ مگر اس نے قرطبہ کی طرف التفات نہ کیا۔ سنہ ۸۵۸ھ تک اربونیہ وارغون کی مخالفت سلطنت قسطلہ سے جاری رہی اور ابن عثمان بھی ان دونوں اول الذکر عیسائی سلطنتوں کی امداد کرتا رہا۔ شاہ قسطلہ کی صلح ہوگئی تو اس نے ابن اسماعیل کو جوان ایام میں سرحد قسطلہ پر خاموش ومنتظر تھا۔ فوج دے کر سنہ ۸۵۹ھ میں ابن عثمان پر حملہ آور کرایا۔ ابن اسماعیل کو چونکہ اکثر مسلمان امراء کی ہمدردی حاصل تھی، اس لیے اس کے مقابلے میں ابن عثمان کو شکست ہوئی۔ وہ مع چند ہمراہیوں کے بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوا اور ابن اسماعیل غرناطہ میں آ کر تخت نشین ہوا۔

سلطان ابن اسماعیل:

ابن اسماعیل کی تخت نشینی کے چند ہی روز بعد شاہ قسطلہ مسمّی جان کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ ابن اسماعیل کی تخت نشینی کے بعد چونکہ قسطلہ کا بادشاہ جان فوت ہو چکا تھا، اس کے بیٹوں، پوتوں نے برسر اقتدار ہو کر ابن اسماعیل کے ساتھ پھر سلسلہ جنگ شروع کر دیا اور سنہ ۸۷۰ھ تک برابر عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کی لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان لڑائیوں میں سلطان ابن اسماعیل کے بیٹے ابوالحسن نے بڑی ناموری حاصل کی۔ سنہ ۸۷۰ھ میں ابن اسماعیل نے وفات پائی اور اس کا بیٹا ابوالحسن تخت نشین ہوا۔

سلطان ابوالحسن:

سلطان ابوالحسن چونکہ ایک تجربہ کار سپہ سالار بھی تھا، اس لیے تخت نشین ہو کر اس نے عیسائیوں کے ساتھ لڑائیوں کے سلسلہ کو بہ حسن وخوبی جاری رکھا۔ چند روز کے بعد مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا یہ عجیب سامان ہوا کہ سلطنت قسطلہ کے نوجوان بادشاہ فرڈی نند کی شادی سلطنت ارغون کی شہزادی ازبیلا کے ساتھ ہوئی اور اس شادی کے ساتھ ہی ارغون کی سلطنت، قسطلہ کی سلطنت میں مل کر ایک بہت ہی زبردست عیسائی سلطنت بن گئی۔ فرڈی نند اور ازبیلا دونوں بے حد متعصب اور پادری مزاج واقع ہوئے تھے۔ اس لیے انہوں نے مل کر اس بات کا تہیہ کیا کہ جزیرہ نمائے اندلس سے اسلامی سلطنت کا نام ونشان مٹا دینا چاہیے اور اس جزیرہ نما میں ایک بھی مسلمان کو زندہ نہ چھوڑنا چاہیے۔ ادھر فرڈی نند اور ازبیلا میں یہ قرارداد ہو رہی تھی، ادھر سلطان ابوالحسن نے مصلحت وقت سمجھ کر اس عیسائی سلطنت کے ساتھ صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ چنانچہ فرڈی نند نے سنہ ۸۸۰ھ میں سلطان ابوالحسن کو لکھا کہ اگر تم صلح کے خواہاں ہو تو بلا عذر ہم کو خراج دینا منظور کرو۔ ابوالحسن کی جگہ اگر کوئی دوسرا سلطان غرناطہ کے موجودہ تخت پر ہوتا تو وہ شاید ایسا سخت جواب نہ دے سکتا۔ مگر ابوالحسن نے فرڈی نند کو لکھا کہ غرناطہ کے دارالضرب میں اب سونے کے سکے نہیں، فولادی شمشیریں تیار ہوتی ہیں تاکہ عیسائیوں کی گردنیں اڑائی جائیں۔ اس جواں مردانہ جواب نے چند روز کے لیے فرڈی نند کو مبہوت ومرعوب بنا دیا اور بہ ظاہر کئی سال تک سلسلہ جنگ ملتوی رہا۔ سلطان ابوالحسن نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ہم اس ملک میں آزاد وخود مختار رہیں گے اور عیسائیوں کا محکوم بننے کے عوض موت کو ترجیح دیں گے۔ فرڈی نند اور ازبیلا جو دونوں مل کر فرائض فرماں روائی ادا کرتے تھے، تیاری میں مصروف رہے۔

عیسائی تیاریوں کا حال سن کر ابوالحسن نے خود ہی سنہ ۸۸۶ھ میں سلطنت قسطلہ کے قلعہ صخرہ پر جو دریائے وادی الکبیر کے کنارے نہایت مضبوط قلعہ تھا اور فرڈی نند کے دادا نے مسلمانوں سے فتح کیا تھا، حملہ کیا اور جس وقت سلطان ابوالحسن غرناطہ میں تخت نشین ہوا تو سلطنت غرناطہ کا رقبہ سمٹ کر صرف چار ہزار مربع میل یا اس سے کم رہ گیا تھا اور سلطنت قسطلہ کا رقبہ اس وقت وسیع ہو کر سوا لاکھ مربع میل سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ فرڈی نند کو قلعہ صخرہ کے نکل جانے کا سخت صدمہ ہوا اور اس نے

سلطنت غرناطہ کے قلعہ الحمہ پر دھوکے سے حملہ کیا۔ چونکہ اس قلعہ کی حفاظت کے لیے کوئی فوج اس وقت وہاں موجود نہ تھی، لہٰذا معمولی کوشش کے بعد عیسائیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں نے قلعہ صخرہ کو فتح کر کے وہاں کے غیر مصافی عیسائیوں کو کسی قسم کا کوئی آزار نہیں پہنچایا لیکن عیسائیوں نے الحمہ پر قابض ہو کر وہاں کی تمام مسلمان رعایا کو بلا امتیاز زن و مرد تہ تیغ کر دیا۔ فرڈی نند نے الحمہ پر دس ہزار عیسائی فوج حفاظت کے لیے چھوڑ دی اور خود واپس چلا گیا۔ غرناطہ میں جب الحمہ کے قتل عام کی خبر پہنچی تو تمام شہر میں کہرام مچ گیا۔ سلطان ابوالحسن نے ایک عرب سردار کو اس قلعہ کو واپس لینے کے لیے روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ فرڈی نند کا ایک سردار یعنی حاکم قرطبہ فوج لے کر قرطبہ سے چلا کہ قلعہ الحمہ کو بچائے۔ یہ خبر سن کر عرب سردار نے اپنی فوج کا ایک حصہ قلعہ کے محاصرہ پر چھوڑا اور ایک حصہ حاکم قرطبہ کے مقابلے کو بھیجا۔ راستے میں لڑائی ہوئی اور حاکم قرطبہ شکست کھا کر بھاگا۔ ٹھیک اسی وقت دوسری طرف سے حاکم اشبیلیہ یعنی دوسرا عیسائی سردار ایک زبردست فوج لے کر نمودار ہوا۔ چونکہ قلعہ کے محاصرہ پر بہت ہی تھوڑی سی فوج باقی تھی، اس لیے مصلحت وقت سمجھ کر مسلمانوں کی فوج غرناطہ کو واپس چلی آئی اور یہ قلعہ قبضہ میں نہ آ سکا۔ قلعہ الحمہ نہایت زبردست اور غرناطہ کے قریب کا قلعہ تھا۔ اس لیے اس کا عیسائیوں کے قبضہ میں چلا جانا بے حد خطرناک تھا۔

ماہ جمادی الاول سنہ ۸۸۷ھ میں سلطان ابوالحسن کے پاس خبر پہنچی کہ فرڈی نند اپنی پوری فوج کے ساتھ غرناطہ کی طرف روانہ ہوا ہے۔ ادھر سے سلطان ابوالحسن بھی غرناطہ سے مع فوج روانہ ہوا۔ سلطنت غرناطہ کی سرحد پر مقام لوشہ کے قریب ۲۷ جمادی الاول سنہ ۸۸۷ھ کو ایک زبردست جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں فرڈی نند کو شکست فاش حاصل ہوئی اور لشکر اسلام کے ہاتھ بے حد مال غنیمت آیا۔ ادھر میدان لوشہ میں سلطان ابوالحسن اپنے حریف فرڈی نند کو شکست فاش دے کر بھگا رہا تھا، ادھر غرناطہ میں سلطان کا بیٹا ابوعبداللہ محمد باپ کے خلاف سازش میں مصروف عمل تھا۔

اس فتح کے بعد سلطان ابوالحسن عیسائیوں کو مار مار کر بھگانے اور اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کی تدبیروں میں مصروف ہونا چاہتا تھا کہ اس کے پاس وہیں خبر پہنچی کہ شہزادہ ابوعبداللہ محمد نے المیریہ، بسطہ اور غرناطہ پر قبضہ کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ سلطان مجبوراً مالقہ میں آ کر مقیم ہو گیا۔ اس طرح غرناطہ اور نصف مشرقی حصہ میں ابوعبداللہ محمد کی حکومت قائم ہو گئی اور مالقہ یعنی نصف

مغربی حصہ میں سلطان ابوالحسن کی حکومت باقی رہی۔ اس چھوٹی سی اسلامی حکومت کو دو حصوں میں تقسیم دیکھ کر ایک طرف عیسائیوں کے دہان حرص میں پانی بھر آیا، دوسری طرف باغی شہزادے ابوعبداللہ محمد نے سلطنت کا باقی نصف حصہ بھی باپ سے چھین لینے کی تیاریاں کیں۔ چنانچہ اول اشبیلیہ، استیجہ اور سریش کے عیسائی صوبہ داروں نے فوج فراہم کر کے سلطان ابوالحسن پر مالقہ میں حملہ کیا۔ سخت لڑائی ہوئی اور اشبیلیہ اور سریش کے حاکم مع دو ہزار سواروں کے گرفتار ہوئے۔ باقی میدان جنگ میں مقتول یا مفرور ہوئے۔ ادھر سلطان ابوالحسن ان عیسائیوں سے لڑنے کے لیے مالقہ سے روانہ ہوا تھا، ادھر اس کا بیٹا فوج لے کر مالقہ پر قبضہ کرنے کے لیے پہنچ گیا تھا۔ جب سلطان میدان جنگ سے فتح مند ہو کر واپس ہوا تو بیٹے سے مقابلہ پیش آیا۔ اس لڑائی میں بھی سلطان ابوالحسن کو فتح حاصل ہوئی اور ابوعبداللہ محمد شکست کھا کر غرناطہ کی طرف بھاگ آیا۔ سلطان ابوالحسن اپنے بیٹے ابوعبداللہ محمد کو بھگا کر مالقہ میں داخل ہوا تو اس پر فالج کا حملہ ہوا اور اس کی بصارت جاتی رہی۔ ادھر ابوعبداللہ محمد نے باپ کی طرف سے مطمئن ہو کر اور فوج فراہم کر کے عیسائیوں کے علاقہ پر حملہ کیا۔ مقام لوشنیہ میں پہنچ کر فوج کو تاخت و تاراج میں مصروف کر دیا۔ وہاں کی عیسائی فوج کے سردار نے اس ناتجربہ کار مسلمان کو دھوکا دیا اور اپنی فوج کو لیے ہوئے الگ کمین گاہ میں منتظر بیٹھا رہا۔ جب ابوعبداللہ مع مال غنیمت واپس ہونے لگا تو اس نے ایک درہ کوہ میں راستہ روک کر چاروں طرف سے گھیر کر تمام اسلامی لشکر کو قتل اور ابوعبداللہ کو گرفتار کیا۔ بعد گرفتاری ابوعبداللہ محمد کو شاہ قسطلہ کے پاس بھیج دیا۔ یہ خبر سن کر باشندگان غرناطہ سلطان ابوالحسن کے پاس مالقہ پہنچے اور غرناطہ آنے کی درخواست کی۔ سلطان نے اپنی بیماری اور معذوری کی وجہ سے انکار کیا اور اپنے بھائی ابوعبداللہ زغل کو اپنی جگہ غرناطہ کے تخت پر جلوس کرنے کا حکم دیا اور خود تخت و سلطنت سے علیحدگی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

سلطان ابوعبداللہ زغل:

سلطان ابوعبداللہ زغل نے تخت نشین ہو کر ملک کا بندوبست شروع کیا مگر عیسائیوں کے ایک عظیم الشان لشکر نے صوبہ مالقہ پر حملہ کیا اور جو قلعے غیر محفوظ اور بے انتظام تھے، ان پر بہ آسانی قابض ہو گئے۔ آخر قلعہ بقوان کا محاصرہ کیا اور اپنی شدید گولہ باری سے قلعہ کی ایک دیوار گرا دی۔

مسلمانوں نے جو بہت تھوڑی تعداد میں قلعہ کے اندر محصور تھے، بڑی ہمت اور بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا اور عیسائیوں کی ایک عظیم الشان تعداد کو کاٹ کر رکھ دیا۔ آخر ایک ایک کر کے سب شہید ہوئے اور یہ قلعہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ماہ جمادی الاول سنہ ۸۹۰ ھ کو سلطان زغل غرناطہ سے سرحدی انتظام کے لیے روانہ ہوا۔ ابھی یہ غرناطہ کے متصل قلعہ مثلین کے انتظام میں مصروف اور قلعہ سے باہر ایک میدان میں خیمہ زن تھا کہ عیسائیوں کے ایک لشکر عظیم نے بالکل غیر مترقبہ طور پر حملہ کیا اور یکا یک آ کر مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ اس حملہ کا وہم وگمان بھی نہ تھا، اس لیے مسلمانوں کی جمعیت میں سخت پریشانی ہوئی۔ عیسائیوں نے قتل کرتے ہوئے بڑھنا شروع کیا اور سلطان زغل کے خیمے کے قریب پہنچ گئے۔ مسلمانوں نے اپنے سلطان کو خطرے کی حالت میں دیکھ کر اپنے آپ کو سنبھالا اور پوری ہمت کے ساتھ عیسائیوں پر حملہ آور ہوئے۔ بہت جلد لڑائی کا نقشہ بدل دیا۔ عیسائی بدحواس ہو کر بھاگے اور ہزار ہا لاشیں اس میدان میں چھوڑ گئے۔ ساتھ ہی عیسائیوں کا پورا توپ خانہ جو ان کے ساتھ تھا، مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ ان حملہ آور عیسائیوں کے پیچھے بادشاہ فرڈی نند خود بھی ایک لشکر عظیم لیے ہوئے آ رہا تھا۔ ان مفروروں کو راستے میں روک کر حالات معلوم کیے اور آگے بڑھنے کا ارادہ کیا تو اس کو معلوم ہوا کہ سلطان زغل نے انہیں توپوں کو جو عیسائیوں سے چھینی ہیں، قلعہ مثلین پر چڑھا کر اس کو خوب مضبوط کر لیا ہے اور مدافعت کے لیے ہر طرح تیار ہے۔ یہ سن کر فرڈی نند کی ہمت نہ پڑی، واپس چلا گیا اور دوسرے قلعوں کو جو غیر محفوظ تھے، فتح کرتا اور اسلامی مقبوضات کو مختصر اور تنگ کرنے میں مصروف رہا۔

فرڈی نند کو باوجود کامیابیوں کے اس بات کا کامل یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کی حکومت کا استیصال کوئی آسان کام نہیں اور اگرچہ اسلامی ریاست کا رقبہ بہت ہی محدود و مختصر رہ گیا ہے، تاہم اگر مسلمان متحد و متفق ہو کر شمشیر بہ کف ہو جائیں گے تو ان کے لیے تمام جزیرہ نمائے اندلس کو فتح کر لینا کچھ دشوار نہ ہوگا، جیسا کہ طارق وموسیٰ کے زمانے میں مٹھی بھر مسلمانوں نے عیسائی سلطنت کو بیخ و بن سے اکھیڑ کر پھینک دیا تھا۔ فرڈی نند کی اس مآل اندیشی اور دانائی نے اس کو چند روز کے لیے جنگی سرگرمیوں سے روک دیا اور اس نے فریب و دغا سے کام لینا مناسب سمجھا۔ اس کے پاس ابوعبداللہ محمد بن ابوالحسن جو جنگ لوشنیہ میں گرفتار ہو کر آیا تھا، موجود تھا۔

اس نے ابوعبداللہ محمد کو اپنے سامنے بلوا کر بڑی محبت وہمدردی اور دل سوزی کی باتیں کیں اور

کہا کہ سلطنت غرناطہ کے اصل وارث وحق دار تو تم ہو۔تمہارے چچا زغل نے غاصبانہ طور پر قبضہ کر رکھا ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ زغل کو بے دخل کر کے تم خود سلطنت غرناطہ پر قابض ومتصرف ہو۔ اس کام میں تم کو جس قسم کی ضرورت پیش آئے، میں امداد کو موجود ہوں۔ یہ بھی کہا کہ میری عین خواہش یہ ہے کہ میری ہمسایہ اسلامی سلطنت اچھی حالت میں رہے اور ہمارے درمیان کبھی جنگ و پیکار کی نوبت نہ آئے۔غرض ابوعبداللہ محمد کو خوب سبز باغ دکھا کر اور یہ وعدہ دے کر کہ جس قدر رعایا اور شہر تیرے قبضے میں آ جائیں گے، میں ان کو ہرگز کسی قسم کا نقصان نہ پہنچاؤں گا۔مگر زغل سے مجھ کو کوئی ہمدردی نہیں۔ ابوعبداللہ محمد، فرڈی نند سے رخصت ہو کر سیدھا مالقہ میں آیا اور یہاں کے لوگوں کو فرڈی نند کے عہد و مواثیق سے مطلع کر کے اپنی فرماں برداری کی درخواست کی۔ مالقہ والوں نے یہ سمجھ کر کہ ہم ابوعبداللہ محمد کو اگر اپنا سلطان تسلیم کر لیں گے تو عیسائیوں کے حملوں سے محفوظ ہو جائیں گے،فوراً اس کو اپنا سلطان تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد ابوعبداللہ محمد نے اپنے قبضہ کو وسیع کرنا شروع کیا۔ زغل نے اس بغاوت کو فرو کرنے کی کوشش کی مگر ان عیسائیوں نے جو ابھی تک اسلامی ملک میں آباد اور مقام بیزین میں سب سے زیادہ موجود تھے، ابوعبداللہ کی حمایت و اعانت میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ آخر ایک نہایت اہم مقام لوشہ کو ابوعبداللہ نے اپنے چچا زغل سے طلب کیا کہ لوشہ کی حکومت مجھ کو سپرد کر دو تو میں آپ کے ساتھ مل کر فرڈی نند پر حملہ کروں گا۔زغل نے اپنی رعایا کے اکثر افراد اور بعض سرداروں کو اس طرف متوجہ دیکھ کر لوشہ عبداللہ کو دے دیا۔ ادھر ابوعبداللہ نے لوشہ پر قبضہ کیا،ادھر فرڈی نند نے مع فوج لوشہ کی طرف کوچ کیا۔ ابوعبداللہ نے فرڈی نند کا استقبال کیا اور لوشہ پر اس کا قبضہ کرا کر ماہ جمادی الثانی سنہ ۸۹۱ھ کو قلعہ البیرہ، مثلین اور صخرہ کے محاصرہ کو روانہ ہوا۔ان قلعوں پر بھی ابوعبداللہ محمد نے عیسائی افواج کی مدد سے قبضہ کر کے فرڈی نند کو دے دیا اور سلطنت غرناطہ کا ایک بڑا اہم اور قیمتی حصہ جس کو فتح کرنا فرڈی نند کے لیے بیحد دشوار تھا، ابوعبداللہ محمد کی وجہ سے بہ آسانی قبضہ میں آ گیا۔ کیونکہ رعایا کے اکثر افراد ابوعبداللہ کو اپنا شہزادہ اور وارث تخت وتاج سمجھ کر ان کی مخالفت سے دست کش تھے اور عام طور پر مسلمانوں میں لڑائی کا وہ جوش پیدا ہی نہیں ہوسکتا تھا جو ایک عیسائی حملہ آور کے مقابلے میں پیدا ہونا لازمی تھا۔اب ان اہم مقامات کے نکل جانے پر مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے دیکھا کہ ابوعبداللہ محمد تو عیسائی بادشاہ کا ایجنٹ ہے اور اس نے شہروں اور قلعوں پر قبضہ کر کے ان کو بادشاہ قسطلہ کے سپرد کر دیا ہے۔

مقام نبیرین بالکل شہر غرناطہ سے ملا ہوا تھا۔ یہاں عیسائیوں کی آبادی تھی، اس لیے ابوعبداللہ محمد نے نبیرین میں قیام کر کے اہل غرناطہ کو اپنی حمایت پر آمادہ کرنا چاہا۔ یہاں یہ ریشہ دوانیاں جاری تھیں، ادھر اہل مالقہ نے سلطان زغل کی فرماں برداری کا ارادہ کر کے عیسائی حکومت کی تمام علامات کو مٹا دیا۔ فرڈی نند نے ماہ ربیع الثانی سنہ ۸۹۶ھ میں بہ ذات خود ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ مالقہ پر حملہ کیا اور جنگی جہاز بھی ساحل مالقہ پر روانہ کیے۔ فرڈی نند کے اس حملہ کی خبر سن کر سلطان زغل غرناطہ سے مالقہ کی طرف مع فوج روانہ ہوا۔ ادھر ۱۵ جمادی الاول سنہ ۸۹۲ھ کو ابوعبداللہ محمد نے موقع پا کر اور غرناطہ کو خالی دیکھ کر اس پر قبضہ کر لیا۔ زغل نے جب یہ سنا کہ غرناطہ پر ابوعبداللہ محمد قابض ہو چکا ہے تو وہ مالقہ کو فرڈی نند کے محاصرہ میں چھوڑ کر خود غرناطہ کی طرف چلا۔ راستہ میں یہ معلوم کر کے کہ ابوعبداللہ محمد کا غرناطہ پر مکمل قبضہ ہو چکا ہے، وادی آش میں ٹھہر گیا۔ اہل مالقہ نے عیسائیوں کے حملوں کو بڑی پامردی اور بہادری کے ساتھ روکا۔ ساتھ ہی شاہ مراکش، شاہ تونس، شاہ مصر اور سلطان ترکی کو لکھا کہ اس وقت ہماری مدد کرو اور عیسائیوں کے پنجے سے چھڑاؤ مگر کسی نے بھی ان کی مدد کے لیے کوئی فوج نہ بھیجی ﴿ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴾[1] ہر طرف سے مایوس ہو کر ماہ شعبان سنہ ۸۹۲ھ میں مالقہ فرڈی نند کے حوالہ کر دیا۔ اہل مالقہ نے جب اپنی نااتفاقیوں اور خانہ جنگیوں کی پاداش میں ہر طرف سے مایوس ہو کر فرڈی نند سے صلح و امن کی درخواست کی تو اس نے کہلا بھیجا کہ اب تمہارے پاس سامان رسد ختم ہو گیا ہے۔ نیز تم ہر طرف سے مایوس ہو چکے ہو، لہٰذا بلاشرط شہر کی کنجیاں ہمارے پاس بھیج دو اور ہمارے رحم و کرم کے امیدوار ہو۔ جب فرڈی نند مالقہ پر قابض ہوا تو اس نے حکم دیا کہ ہر ایک مسلمان کو قید کر لو اور ان کے تمام اموال و جائیداد ضبط کر لیے جائیں۔ چنانچہ پندرہ ہزار مسلمانوں کو عیسائیوں نے اپنا غلام بنایا، باقی تمام باشندگان مالقہ کو بے سروسامانی کے عالم میں وہاں سے نکال کر جلاوطن کر دیا۔ ان میں بہت سے فاقہ اور بے سروسامانی کے سبب سے ہلاک ہو گئے۔ بعض ساحل افریقہ تک پہنچے اور وہیں آباد ہوئے۔ مالقہ کے بعد فرڈی نند نے اس کے تمام نواحی شہروں اور قلعوں کو فتح کر کے وہاں کی تمام مسلم آبادی کو مقتول و جلاوطن کیا۔ اس کے بعد اس نے یکے بعد دیگرے ایک ایک شہر اور ایک ایک قلعہ کو فتح کرنا اور وہاں سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانا شروع کیا۔ وادی آش میں پہنچ کر جہاں سلطان زغل

---

[1] ''اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔'' (البقرہ ۲: ۱۰۷)

مقیم تھا، کوشش کی کہ کسی طرح زغل میرے ساتھ شریک ہو جائے۔ ابوعبداللہ محمد جو غرناطہ پر قابض ہو کر اب فرڈی نند کی پیش قدمی کو ناپسند کرتا اور غرناطہ اور اس کے نواحی رقبہ کو اپنے تخت حکومت رکھنا چاہتا تھا، اہل غرناطہ کی پا مردی سے مقابلہ پر آنے اور عیسائیوں سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس حالت میں فرڈی نند نے زغل کو اپنا دوست بنانے اور غرناطہ کی حکومت دوبارہ دلوانے کا سبز باغ دکھایا اور زغل مجبوراً یا حقیقتاً اپنے رقیب ابوعبداللہ محمد کی تباہی دیکھنے کے شوق میں وادی آش فرڈی نند کے سپرد کر کے اس کے ساتھ ہو لیا۔ غرض کہ اس عیسائی بادشاہ نے آخر وقت تک بھی مسلمانوں کی تباہی میں مسلمانوں سے امداد لینی ضروری سمجھی۔ زغل کے شریک ہونے سے فرڈی نند کا المیریہ پر بہ آسانی قبضہ ہو گیا۔ المیریہ اور وادی آش پر قبضہ ہونا گویا اندلس سے مسلمانوں کی حکومت کا نام ونشان گم ہونا تھا۔ اب صرف شہر غرناطہ اور اس کے مختصر مضافات ہی مسلمانوں کے قبضہ میں رہ گئے۔ فرڈی نند نے ماہ صفر سنہ ۸۹۵ھ میں وادی آش اور المیریہ پر قبضہ کر کے سلطان زغل کو اپنے ہمراہ لیا تھا۔ اس وقت سلطان ابوعبداللہ قصر الحمراء میں اپنے چچا زغل کی اس بدانجامی کا حال سن کر خوش ہو رہا تھا کہ اس کے قبضے سے تمام ملک نکل گیا۔ ابوعبداللہ محمد کو یقین تھا کہ غرناطہ میں اب تنہا میری ہی حکومت قائم رہے گی اور فرڈی نند غرناطہ کے لینے کی جرأت ہرگز نہ کرے گا لیکن فرڈی نند نے ابوعبداللہ کو لکھا کہ جس طرح تمہارے چچا زغل نے اپنا تمام مقبوضہ ملک مجھ کو سپرد کر دیا ہے، تم بھی قصر حمراء اور غرناطہ میرے سپرد کر دو۔ اس تحریر کے آنے پر سلطان ابوعبداللہ نے باشندگان غرناطہ میں سے بااثر اشخاص کو جمع کر کے فرڈی نند کے خط کا مضمون سنایا اور کہا کہ زغل نے فرڈی نند کو غرناطہ کے لینے کی ترغیب دی ہے۔ اب ہمارے لیے دو ہی باتیں باقی ہیں: یا تو غرناطہ اور قصر حمراء فرڈی نند کے سپرد کر دیں یا یہ کہ جنگ پر آمادہ ہو جائیں۔ اہل غرناطہ ابوعبداللہ کی غداریوں اور نالائقیوں سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے کہ اسی نے حکومت اسلامیہ کو برباد کرنے کے تمام سامان مہیا کیے ہیں مگر اس حالت میں وہ سوائے اس کے اور کسی بات پر متفق نہیں ہو سکتے تھے کہ عیسائیوں سے جنگ کرنی چاہیے۔ چنانچہ سب نے جنگ کی رائے دی۔ ابوعبداللہ کی دلی خواہش چاہے کچھ ہو مگر سب کو جنگ پر آمادہ دیکھ کر اس نے بھی اسی پر اپنی آمادگی ظاہر کی۔ یہاں یہ مشورے ہو رہے تھے، ادھر فرڈی نند شاہ قسطلہ اپنی عیسائی فوجوں کا ٹڈی دل لیے ہوئے آ پہنچا اور آتے ہی ماہ رجب سنہ ۸۹۵ھ میں غرناطہ کا محاصرہ کر لیا۔ ادھر شہر والوں نے مدافعت اور مقابلہ پر کمر ہمت چست

باندھی۔ لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ عیسائیوں نے غرناطہ کے کئی نواحی قلعوں پر قبضہ کر لیا مگر مسلمانوں نے قدم قدم پر اس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ عیسائیوں کے دانت کھٹے کر دیے اور ان قلعوں کو جن پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا تھا، واپس لے لیا۔ فرڈی نند نے یہ حالت دیکھ کر مناسب سمجھا کہ غرناطہ کی فتح کو کسی دوسرے وقت پر ملتوی کیا جائے اور زیادہ ساز و سامان اور زیادہ سے زیادہ تازہ دم فوج لا کر محاصرہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ محاصرہ اٹھا کر چلا گیا۔ سلطان ابوعبداللہ نے اس فرصت کو غنیمت سمجھا اور اہل غرناطہ کو لے کر اس علاقہ کی طرف بڑھا جو عیسائیوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ بعض قلعوں کو فتح کر کے وہاں کی عیسائی افواج کو تہ تیغ کیا اور مسلمانوں کی فوج وہاں مقرر کی۔ غرناطہ میں واپس آ کر پھر جنگی تیاری کی اور فوج لے کر بشرارت کی جانب روانہ ہوا۔ یہاں کے بعض قصبوں کو اپنے قبضہ میں لایا اور قلعہ اندرش کو فتح کر کے عیسائی جھنڈا وہاں سے اتار کر پھینکا اور اسلام کا علم نصب کیا۔ علاقہ بشرارت کے تمام باشندوں نے اطاعت قبول کی اور از سر نو اس ملک میں اسلامی حکومت جاری ہوئی۔

اتفاقاً بشرارت کے کسی گاؤں میں ابوعبداللہ کا چچا زغل بھی مقیم تھا۔ اس نے ابوعبداللہ کو اس طرح کامیاب و فائز المرام دیکھ کر مقابلہ کی تیاری کی اور وہاں سے المیریہ میں جا کر عیسائیوں کو اپنے گرد جمع کیا اور ابوعبداللہ کے مقابلہ پر مستعد ہو کر فرڈی نند کو اطلاع دی کہ ابوعبداللہ اس قدر طاقتور ہو گیا ہے کہ اگر اس کی طرف سے چند روز بے التفاتی اختیار کی گئی تو پھر اس کو روکنا دشوار ہو جائے گا۔ زغل کا یہ خیال صحیح تھا مگر اس نے خود عبداللہ کے مدمقابل ہو کر اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری کر کے ابوعبداللہ اور اہل غرناطہ کی اس رفتار ترقی کو روک دیا، جو چند روز میں فرڈی نند اور عیسائیوں کے بس کی نہ رہتی۔ اس موقع پر زغل کو چاہیے تھا کہ وہ اتفاق و اتحاد سے کام لیتا اور ذاتی رقابتوں کو فراموش کر کے اسلامی مقصد کو فوت نہ ہونے دیتا مگر مسلمانوں کی بدنصیبی نے ان کو یہ حالات دکھائے اور اس خانہ جنگی و نا اتفاقی نے مسلمانوں کو سنبھلنے نہ دیا۔ چنانچہ ماہ رمضان سنہ ۸۹۵ھ میں زغل نے عیسائی فوجوں کو فراہم و متفق کر کے قلعہ اندرش کو مسلمانوں کے قبضے سے نکال لیا۔ سلطان ابوعبداللہ نے اسی مہینے اہل غرناطہ کی پامردی و جواں ہمتی سے قلعہ ہمدان، منکب، شلوبانیہ کو فتح کر لیا۔ شلوبانیہ کا قلعہ ابھی فتح نہ ہوا تھا کہ خبر ملی کہ فرڈی نند بادشاہ قسطلہ مع فوج غرناطہ کے قریب پہنچ گیا ہے۔ یہ سنتے ہی ابوعبداللہ قلعہ شلوبانیہ سے غرناطہ کی طرف متوجہ ہوا اور ۳ شوال سنہ ۸۹۵ھ کو غرناطہ پہنچا۔ عیسائی لشکر

نے برج ملاحہ کو مسمار کر دیا تھا۔ آٹھویں روز انہوں نے غرناطہ کو چھوڑ کر وادی آش کا راستہ لیا اور وہاں پہنچ کر مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا۔ جو باقی رہے، ان کو جلاوطن کر دیا۔ ایک شخص بھی وہاں اللہ کا نام لینے والا نہ رہا۔ قلعہ اندرش کو بھی مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیا اور اس قتل و غارت کے بعد تمام عیسائی لشکر واپس چلا گیا۔

فرڈی نند نے قسطلہ کی جانب واپس جاتے ہوئے زغل کو (جس نے فرڈی نند کی حمایت میں ابوعبداللہ کی موثر مخالفت کی تھی) بلا کر حکم سنایا کہ اب آپ کی اس ملک میں کوئی ضرورت نہیں۔ ہم آپ پر صرف اس قدر احسان کر سکتے ہیں کہ اگر آپ اس ملک یعنی جزیرہ نمائے اندلس سے کہیں باہر جانا چاہیں تو ہم آپ کو جانے دیں گے۔ زغل یہ حکم سنتے ہی اندلس سے روانہ ہو کر افریقہ پہنچا اور مقام تلمسان میں اپنی زندگی کے دن گم نامی کی حالت میں بسر کر دیے۔ اس موقع پر فرڈی نند شاہ قسطلہ کے عزم و استقلال اور احتیاط کی ضرور داد دینی پڑتی ہے کہ وہ چونکہ اندلس سے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کا نام ونشان مٹانا چاہتا تھا، لہٰذا اس کے کاموں میں صبر و تامل اور عقل و دانائی زیادہ تھی۔ عجلت سے وہ کوسوں دور ونفور تھا۔ اس مرتبہ پھر فرڈی نند کے واپس چلے جانے پر ابوعبداللہ نے برشلونہ کی طرف قدم بڑھایا اور محاصرہ کے بعد فتح کر لیا مگر چند ہی روز کے بعد ماہ ذی قعدہ کے آخر ایام میں عیسائیوں نے متفق ہو کر اس شہر کو مسلمانوں کے قبضے سے چھڑا لیا اور وہاں کسی مسلمان متنفس کو باقی زندہ نہ چھوڑا۔ اب اہل غرناطہ اپنی تعداد کی کمی اور کاموں کی کثرت سے تنگ آ کر افسردہ ہو گئے تھے۔ ان کی افسردگی و پژمردگی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ ملک اندلس سے مسلمانوں کے جا بہ جا قتل اور جلاوطن ہونے کے حالات سنتے رہتے تھے اور بیرونی ممالک سے ان کو امداد نہ پہنچنے کا یقین ہو چکا تھا۔

اندلس میں اسلامی حکومت کا خاتمہ:

۱۲ جمادی الآخر سنہ ۸۹۶ھ کو فرڈی نند شاہ قسطلہ مع ملکہ ازبیلا عظیم الشان قلعہ شکن توپ خانے اور بے شمار جرار لشکر لیے ہوئے غرناطہ کے متصل پہنچا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے سرسبز وشاداب باغوں، کھیتوں اور آباد بستیوں کو تاراج و خاک سیاہ بنانا اور مسلمان باشندوں کے خون کی ندیاں بہانا شروع کر دیا۔ غرناطہ کے سامنے پہنچ کر اس نے چھاؤنی ڈال دی اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اہل شہر نے محصور ہو کر اور اپنی زندگیوں سے مایوس ہو کر مدافعت میں پھر جان لڑانی شروع کر دی۔ شہر کا ایک

حصہ چونکہ کوہ شلیر سے وابستہ تھا، لہٰذا عیسائی فوجیں شہر کا مکمل محاصرہ نہیں کر سکتی تھیں ۔ یہ محاصرہ قریباً آٹھ مہینے جاری رہا۔ جزیرہ نمائے اندلس میں اب سوائے اس محصور شہر کے اور کوئی اسلامی مقبوضہ باقی نہ تھا۔ جب موسم سرما شروع ہوا اور پہاڑ پر برف کی وجہ سے راستے بند ہو گئے تو شہر والوں کو جو رسد کوہ شلیر کی طرف سے پہنچتی تھی، موقوف ہوئی۔ لہٰذا ماہ صفر سنہ ۸۹۷ھ میں اہل شہر نے سلطان ابوعبداللہ سے درخواست کی کہ جب تک ہمارے جسم میں جان باقی ہے، دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ اب بھوکے مرنے کے عوض ہم میدان جنگ میں تیروتفنگ کھا کر جان دینا پسند کرتے ہیں۔ ہم کو امیر طارق ابن زیاد کا معرکہ یاد ہے کہ اس فاتح اول نے اپنی مٹھی بھر جمعیت سے ایک لاکھ عیسائی فوج کو شکست فاش دی تھی ۔ ہماری تعداد جو اس وقت محصور ہے، بیس ہزار سے کچھ کم ہے لیکن چونکہ ہم مسلمان ہیں، لہٰذا ہم کو عیسائیوں کی ایک لاکھ باسامان فوج سے ہراساں ہونے کی مطلق ضرورت نہیں۔ سلطان ابوعبداللہ نے دیکھا کہ اہل شہر کا اضطراب دن بہ دن بڑھتا ہے۔ اگر فوراً جنگ یا صلح کا فیصلہ نہ ہوا تو لوگ باغی ہو کر کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جس سے نقصان عظیم پہنچے۔ اس نے وزراء و امراء کو طلب کر کے مجلس مشورہ قصر حمراء میں منعقد کی۔ شہر کے علماء و شیوخ کو بھی اس مجلس میں شریک کیا گیا۔ ابوعبداللہ نے کہا کہ اب عیسائی لوگ جب تک شہر پر قبضہ نہ کر لیں گے، محاصرہ سے باز نہ آئیں گے۔ ایسے نازک وقت میں کیا تدبیر کیا جائے؟ سلطان ابوعبداللہ کا حوصلہ اس قدر پست ہو گیا تھا کہ سوائے ان چند الفاظ کے اس کی زبان سے اور کوئی جملہ نہ نکل سکا۔ اس کے جواب میں تمام حاضرین نے کہا کہ مناسب یہی ہے کہ شاہ قسطلہ سے صلح کر لی جائے۔ مگر بہادر سپہ سالار موسیٰ بن ابیل غسانی جوش میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ابھی تک کامیابی کی امید باقی ہے۔ ہم کو ہرگز ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ ہم کو آخر وقت تک مقابلہ کرنا چاہیے۔ مجھ کو امید ہے کہ ہم عیسائیوں کو ضرور بھگا دیں گے اور ان کا محاصرہ اپنے شہر سے اٹھا دیں گے۔ عام باشندگان غرناطہ کی یہی رائے تھی، جو موسیٰ نے ظاہر کی۔ مگر اس مجلس میں جو لوگ شریک تھے، ان میں سے کسی نے موسیٰ کی تائید نہ کی۔ یہی قرار پایا کہ اگر ہم جنگ میں کامیاب نہ ہوئے تو عیسائی ایک مسلمان کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔ لہٰذا ایسی شرائط پر صلح کر لی جائے جس سے عام خلائق کے جان و مال کو نقصان نہ پہنچے۔ چونکہ فوج اور رعایا جنگ پر آمادہ تھی، اس لیے ابوعبداللہ نے اپنے وزیر ابوالقاسم عبدالملک کو خفیہ طور پر فرڈی نند کے پاس بھیجا۔ عیسائی شہر و قلعہ کی حالت سے ناواقف تھے۔ اس وقت تک وہ مسلمانوں کو

کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے تھے۔ لٰہذا بہت بددل اورافسردہ ہورہے تھے۔ ابوالقاسم وزیر کے پہنچنے اور پیغام صلح سننے سے بہت ہی خوش ہوئے۔ شاہ قسطلہ نے اس درخواست کوفوراً منظور کرلیا۔ اس راز کورعایا سے پوشیدہ رکھنے کی غرض سے ابوالقاسم رات کوقلعہ سے باہر جا کرعیسائیوں سے ملاقات کرتا اورصلح نامہ کی شرائط طے کیا کرتا تھا۔ بڑی ردوکد کے بعد شرائط طے ہوئیں اور صلح نامہ پرابوعبداللہ اورفرڈی نند شاہ قسطلہ کے دستخط ہوگئے۔

عیسائیوں سے صلح نامہ:

اس صلح نامہ کی بعض اہم شرائط یہ تھیں:

۱۔ مسلمانوں کواختیار ہوگا کہ شہر کے اندر رہیں یا باہر چلے جائیں۔ کسی مسلمان کے جان و مال کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔

۲۔ مسلمانوں کے مذہبی امور میں عیسائی کوئی دخل نہ دیں گے۔

۳۔ کوئی عیسائی مسجد میں نہ گھسنے پائے گا۔

۴۔ مساجد اوراوقاف بہ دستور قائم رہیں گے۔

۵۔ مسلمانوں کے معاملات شرع اسلام کے موافق مسلمان قاضی طے کریں گے۔

۶۔ طرفین کے قیدی رہا کردیے جائیں گے۔

۷۔ اگرکوئی مسلمان اندلس سے افریقہ جانا چاہےتو سرکاری جہاز میں وہ افریقہ پہنچا دیا جائے گا۔

۸۔ جوعیسائی مسلمان ہوگئے ہیں، وہ اسلام کوترک کرنے پر مجبور نہ کیے جائیں گے۔

۹۔ اس جنگ میں جو مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا ہے، وہ بہ دستوران کے پاس رہے گا۔

۱۰۔ موجودہ ٹیکس کے علاوہ کوئی نیا ٹیکس مسلمانوں پر نہ لگایا جائے گا۔

۱۱۔ تین سال تک مسلمانوں سے کسی قسم کا ٹیکس نہ لیا جائے گا۔ جوٹیکس وہ اب ادا کررہے ہیں، وہ بھی تین سال تک معاف رہے گا۔

۱۲۔ سلطان ابوعبداللہ کے سپرد البشرات کی حکومت کردی جائے گی۔

۱۳۔ آج سے ساٹھ روز کے اندر قلعہ الحمراء، توپ خانہ اور دیگر سامان جنگ جواس وقت قلعہ میں موجود ہے، اس پرعیسائیوں کا قبضہ کرادیا جائے گا۔

۱۴۔ آج سے ساٹھ روز کے اندر اس معاہدہ کی شرائط کی تکمیل پورے طور پر کردی جائے گی۔

۱۵۔ شہر غرناطہ ایک سال تک آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔ سال بھر کے بعد عیسائی شرائط بالا کی پابندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس پر قبضہ کریں گے۔

اس عہد نامہ پر یکم ربیع الاول سنہ ۸۹۷ھ مطابق ۳ جنوری سنہ ۱۴۹۲ء کو دستخط ہوئے تھے۔ اس کی خبر اہل شہر اور فوج سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ عام طور پر بددلی پھیل گئی اور آوازیں بلند ہونے لگیں کہ سلطان ابوعبداللہ نے مفت میں سلطنت کو ضائع کردیا۔ سلطان بہت پریشان ہوا اور اس خیال سے کہ شہر والوں کی بغاوت کہیں بنا بنایا کام نہ بگاڑ دے، ساٹھ روز پورے ہونے سے پہلے ہی یعنی ۱۲ ربیع الاول سنہ ۸۹۷ھ کو قصر الحمراء عیسائیوں کے سپرد کردیا۔ فرڈی نند نے اندلس کے سب سے بڑے پادری منذورہ کو حکم دیا کہ وہ مع فوج پہلے شہر میں داخل ہو اور قلعہ حمراء کے سب سے بلند برج پر سے اسلامی نشان کو گرا کر صلیب نصب کردے تاکہ اس نیک شگون کو دیکھتے ہی بادشاہ مع اپنی ملکہ ازبیلا کے شہر میں داخل ہو۔ جب سلطان ابوعبداللہ نے منذورہ کو قلعہ میں آتے دیکھا تو مع پچاس امیروں کے گھوڑے پر سوار ہو کر قلعہ سے باہر نکل آیا۔ اس وقت کی کیفیت کا تصور ہر شخص کرسکتا ہے کہ شہر پر کیسی اداسی چھائی ہوئی ہوگی۔ مسلمانوں کے دلوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ عیسائیوں کی خوشی کا حال بھی تحریر میں نہیں آ سکتا۔ عیسائی بادشاہ اور اس کی ملکہ فوجی لباس میں اپنے لشکر کے ساتھ صلیب کے بلند ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ سب کی نگاہیں قصر حمراء کے سب سے بلند برج کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ سامنے سے ابوعبداللہ نے شاہ قسطلہ کے قریب آ کر کنجیاں حوالے کیں اور کہا کہ اے طاقتور بادشاہ! ہم اب تیری رعایا ہیں۔ یہ شہر اور تمام ملک ہم تیرے سپرد کرتے ہیں کیونکہ اللہ کی یہی مرضی تھی۔ [1] ہم کو یقین ہے کہ تو رعایا کے ساتھ ہمیشہ شریفانہ اور فیاضانہ برتاؤ روا رکھے گا۔ فرڈی نند چاہتا تھا کہ کچھ تشفی آمیز الفاظ کہے لیکن ابوعبداللہ بلاتوقف آگے بڑھ گیا اور ملکہ ازبیلا سے ملتا ہوا البشرات کی طرف جہاں اس کا اسباب اور رشتہ دار پہلے ہی جا چکے تھے، روانہ ہوگیا۔

---

❶ اللہ تعالیٰ تو یہ نہیں چاہتا تھا، وہ تو مسلمانوں کو غلبہ دینا چاہتا ہے لیکن اس کے لیے اس نے ایمان کو لازم قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو نہیں چاہا تھا کہ مسلمان عیش و عشرت میں ڈوب جائیں، غیر مسلموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کریں، اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کو بھول جائیں اور دین اللہ سے انحراف کریں۔ یہ شاہ عبداللہ اور مسلمانوں ہی کی بداعمالیاں تھیں جنھوں نے ان کو اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ ذَالِكَ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسُ!

اتنے میں چاندی کی صلیب قصر حمراء کے برج پر بلند ہو کر آفتاب کی شعاعوں میں چمکنے لگی اور عیسائی بادشاہ فاتحانہ قصر حمراء میں داخل ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جب ابوعبداللہ البشرات کے پہاڑ کی ایک چوٹی پر پہنچا تو بے ساختہ اس نے مڑ کر غرناطہ کی طرف دیکھا اور اپنے خاندان کی گزشتہ شان وعظمت پر آخری نظر ڈال کر بے ساختہ زاروقطار رونے لگا۔ ابوعبداللہ کی ماں نے جو اس وقت ہمراہ تھی کہا کہ:

"جب تو باوجود ایک مرد سپاہی پیشہ ہونے کے اپنے ملک کو نہ بچا سکا تو اب مثل عورتوں کے ایک گم شدہ چیز پر رونے سے کیا فائدہ؟"[1]

اندلس کے مسلمانوں پر عیسائیوں کے مظالم:

عیسائیوں نے الحمراء پر قابض ہو کر معاہدے کی تمام شرائط کو فوراً فراموش کر دیا۔ شہر غرناطہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ سلطان ابوعبداللہ کو البشرات میں بھی نہیں رہنے دیا۔ تھوڑے سے روپے دے کر البشرات کو بھی ابوعبداللہ سے خرید لیا اور وہاں سے ابوعبداللہ مراکش میں جا کر شاہ مراکش کا نوکر ہو گیا۔ وہاں ایک عرصہ دراز تک اس حالت میں رہ کر فوت ہوا۔ عیسائیوں نے تمام ملک میں فوراً اپنی مذہبی عدالتیں قائم کر دیں، جن میں ہر روز ہزارہا مسلمان گرفتار کر کے لائے جاتے اور محض اس جرم میں کہ ان کا مذہب اسلام ہے، بعض جھوٹے الزام لگا کر آگ میں جلا دیے جاتے تھے۔ تاہم مسلمان اپنے دین پر قائم اور جزیرہ نمائے اندلس میں موجود پائے جاتے تھے۔

سنہ ۹۰۴ھ میں ایک عام حکم جاری کیا گیا کہ ہر ایک شخص جو مسلمان ہے، وہ دین عیسوی قبول کر لے ورنہ اس کو جہاں کہیں پایا جائے گا، قتل کر دیا جائے گا۔[2] مسلمانوں نے اس حالت میں شہروں اور میدانوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ لی اور ہر قسم کی اذیت برداشت کی۔ مگر دین اسلام کو چھوڑنا پسند نہ کیا۔ بعض مسلمانوں کو عیسائیوں نے پکڑ کر زبردستی بپتسمہ دیا اور ان کے بچوں کو عیسائی بنایا۔ یہ وہ لوگ تھے جو عربی النسل یا بربری نہ تھے بلکہ ان کے باپ دادا اسی ملک کے قدیم باشندے

---

1. یہ ہے سقوط اندلس/غرناطہ کی الم ناک اور دلدوز داستان! یوں اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔
2. اس کے باوجود عیسائی اور بہت سے دوسرے غیر مسلم یہ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے ذریعہ سے پھیلا ہے۔ وہ اگر اپنی تاریخ پر سنجیدگی اور انصاف کے ساتھ نگاہ ڈالیں تو انہیں بہ خوبی ایسے لاتعداد واقعات دکھائی دیں گے جہاں عیسائی حملہ آوروں نے مفتوح اقوام خصوصاً مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنایا ہے یا بنانے کی کوشش کی ہے۔

تھے اور اپنا عیسوی مذہب چھوڑ کر بہ خوشی مسلمان ہو گئے تھے۔ان نومسلم خاندانوں میں سے بھی کسی نے دین اسلام کو چھوڑنا گوارا نہ کیا اور وہ چھپ چھپ کر اپنے گھروں میں نمازیں پڑھتے تھے۔

بعض مسلمانوں پر عیسائیوں نے بہ ظاہر یہ سب سے بڑی مہربانی کی کہ ان کو افریقہ چلے جانے کی اجازت دی۔ان لوگوں کے لیے جہاز بھی فراہم کر دیے۔انہوں نے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جو سب سے زیادہ قیمتی سامان جہازوں میں لادا تھا، وہ نایاب اور قیمتی کتابوں کے ذخائر تھے، مگر عیسائیوں نے ان جہازوں کو ساحل افریقہ تک پہنچنے سے پہلے سمندر کے اندر غرق کر دیا۔اسی طرح نہ صرف ذی علم مسلمانوں بلکہ نایاب کتب خانوں کو بھی سمندر کی تہ میں پہنچا کر اپنی شرافت وتہذیب اور علم پروری کا نہایت عجیب وغریب ثبوت بہم پہنچایا۔مسلمانوں کو جس طرح چن چن کر اندلس میں قتل وبرباد کیا گیا، اس کی مثال دنیا کے کسی ملک اور قوم میں دستیاب نہیں ہوسکتی۔

خلاصہ کلام یہ کہ چند سال کے عرصہ میں ایک بھی اللہ وحدہ لاشریک کا نام لینے والا سرزمین اندلس میں باقی نہ رہا۔عیسائیوں نے سب ہی کو تلوار کے گھاٹ اتارا یا سمندر میں ڈبویا یا آگ میں جلا دیا۔آج کل کے مسلمان اگر چاہیں تو اندلس کی جگر خراش اور زہرہ گداز داستان پڑھ کر آپس کی نااتفاقی اور خانہ جنگی کے ہیبت ناک نتائج پر غور کر سکتے اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔

تاریخ اندلس کو ختم کرنے سے پہلے یہ بات بھی بتا دینی ضروری ہے کہ سلطنت غرناطہ کی بربادی اور غرناطہ میں فرڈی نند کی حکومت کے قائم ہو جانے کے بعد بھی جزیرہ نمائے اندلس میں جابجا عرصہ دراز تک مختلف شہروں اور قصبوں اور پہاڑوں میں مسلمان پائے جاتے رہے اور ان کی گرفتاری وقتل کا سلسلہ اندلس میں برابر جاری رہا۔کبھی دس بیس مسلمان جمع ہوئے تو انہوں نے مقابلہ بھی کیا اور لڑ کر مارے گئے۔بعض اندلس کے شمالی پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے اور وہاں بے سروسامانی کے عالم میں ہلاک ہوئے۔ان میں سے بعض بچ کر یورپ کے ملکوں کو طے کر کے ملک شام تک پہنچے۔بعض مرنے والوں کے بچوں کو عیسائیوں نے اپنے قبضے میں لے کر عیسائی بنا لیا۔اس طرح ملک فرانس کے جنوبی اور ملک اندلس کے شمالی حصوں میں عربی النسل خاندانوں کے وجود کا امکان مورخین نے تسلیم کیا ہے اور اسی لیے نپولین بوناپارٹ کو بعض لوگوں نے عربی النسل بیان کیا ہے۔اندلس کی اسلامی حکومت کی مختصر تاریخ بیان ہو چکی ہے اور اب ہم کو دوسرے ملکوں کی طرف متوجہ ہونا ہے لیکن اندلس کی تاریخ کو ختم کر لینے کے بعد ہم کو ایک غلط انداز اور سرسری نگاہ ضرور ڈالنی چاہیے اور دیکھنا

چاہیے کہ مسلمانوں نے اندلس میں حکومت کر کے براعظم یورپ کو کس قدر نفع یا نقصان پہنچایا ہے۔

اندلس کی اسلامی حکومت پر ایک نظر:

خیر القرون کے عرب حکمرانوں کی طرح اندلس میں بھی عربوں کی حکومت اگرچہ شخصی نظر آتی تھی مگر اس میں جمہوریت کا رنگ بہت زیادہ شامل تھا۔ خلیفہ کا حکم اور شریعت کا قانون ہر فرد بشر پر یکساں عامل تھا۔ ان حکمرانوں میں نہ موروثی جاگیردار تھے، نہ موروثی امراء۔ عبدالرحمٰن ثانی اموی سلطان پر قاضی کی کچہری میں ایک عیسائی نے دعویٰ کیا اور قاضی کے حکم کی اس عظیم الشان سلطان کو اسی طرح تعمیل کرنی پڑی جس طرح ایک غلام کو تعمیل کرنی پڑتی۔ قاضی قانون شرع کے موافق خلیفہ کو سزا دینے کی قدرت رکھتا تھا۔ کوتوالی کا انتظام نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ ہر بازار میں ایک محتسب ہوتا تھا جو تجارت پیشہ لوگوں کے کاروبار کی نگرانی کرتا تھا۔ ہر شہر و قصبے میں شفا خانے اور دوا خانے کھلے ہوئے تھے۔ سڑکیں اور نہریں مسلمانوں نے تمام ملک میں جال کی طرح بچھا دی تھیں۔ خلیفہ ہشام نے دریائے وادی الکبیر کا نہایت شاندار اور خوبصورت پل بنایا۔ اسی طرح جابجا دریاؤں کے پل بن گئے تھے۔ فنون جنگ اور آئین فوج کشی میں عام طور پر مسلمان ساری دنیا سے زیادہ شائستہ تھے۔ اندلس کے مسلمانوں نے قلعہ شکنی کے آلات ایجاد کیے۔ یورپ کے وحشیوں کو جو ہمیشہ فتح مند ہونے پر شہروں اور بستیوں کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا کرتے اور عورتوں، بچوں، بوڑھوں تک کو تہ تیغ کر دیتے تھے، اپنے طرز عمل سے مسلمانوں نے آٹھ سو برس تک شائستگی کی تعلیم دی کہ فتح یاب ہونے پر بے گناہ رعایا کو کسی قسم کا بھی آزار نہیں پہنچانا چاہیے۔ زراعت کو مسلمانوں نے اس قدر ترقی دی تھی کہ یہ ایک مکمل فن بن گیا تھا۔ ہر میوہ دار درخت اور زمین کی خاصیت و ماہیت سے واقفیت حاصل کی۔ اندلس کے ہزاروں لاکھوں مربع میل رقبوں کو جو بنجر اور ویران پڑے ہوئے تھے، مسلمانوں نے میوہ دار درختوں اور سرسبز و شاداب لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ چاول، نیشکر [1]، روئی، زعفران، انار، آڑو، شفتالو وغیرہ جو آج کل اندلس میں بہ کثرت پیدا ہوتے ہیں، مسلمانوں ہی کے طفیل اندلس بلکہ تمام یورپ کو نصیب ہوئے۔ اندلوسیہ اور اشبیلیہ کے صوبوں میں زیتون اور خرما کی کاشت کو بڑی ترقی دی۔ سریش، غرناطہ اور مالقہ کے علاقوں میں انگوروں کی بڑی پیداوار ہوتی تھی۔ زراعت کے ساتھ مسلمانان اندلس نے معدنیات کی تلاش میں بھی کوتاہی نہیں

---

[1] گنا۔

کی۔ سونا، چاندی، لوہا، فولاد، پارہ، کہربا، تانبا، یاقوت اور نیلم وغیرہ کی کانیں دریافت کیں اور یہ چیزیں بہ کثرت پیدا ہونے لگیں۔ غرناطہ کی سلطنت اندلس میں مسلمانوں کی آخری نشانی تھی لیکن اس چھوٹی سی سلطنت نے بھی فن تعمیر اور قدردانی علوم کے متعلق بڑی بڑی عظیم الشان یادگاریں چھوڑیں ہیں۔ مسلمانوں نے ایسا عجیب وغریب سیمنٹ ایجاد کیا کہ قصر حمراء جو سلطنت غرناطہ کی نشانی دنیا میں باقی ہے، آج تک اپنے مصالحہ کی پختگی سے سیاحوں کو حیران کر دیتا ہے۔ قصر الحمراء کو شاہان غرناطہ نے بہ صرف زر کثیر شہر کے قریب ایک نہایت بلند ٹیلے پر جبل شلیر کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے سایہ میں تیار کیا تھا۔ اس کی چار دیواری کے اندر ایسے خوشنما سبز وشاداب باغات، نہر ہائے شیریں، درختہائے میوہ دار تھے کہ چشم فلک نے اس کی نظیر نہ دیکھی تھی۔ اس قصر کی ہر ایک چیز قابل دید اور اس قدر حیرت انگیز ہے کہ دنیا کے مشہور صناع و دست کار دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ اس کی بلند دیواروں کی گچ کی صفائی سنگ مرمر سے زیادہ چمکدار اور لوہے سے زیادہ مضبوط ہے۔ جالی دار دیواروں کی طرح طرح کی نازک گلکاریاں اور اس کی نئی وضع کی محرابوں سے ہر ایک لٹکی ہوئی قلم نزاکت کا اظہار کرتی ہے۔ مسلمانوں نے اندلس پر قابض ومتصرف ہو کر تمام ملک میں دارالعلوم، مدارس، رسد خانے، عظیم الشان کتب خانے کھول دیے تھے، جہاں علمی تحقیقات کا ہر ایک سامان موجود رہتا تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں یا دارالعلوم اور چھوٹے قصبوں میں ابتدائی اور درمیانی درجے کے مدارس تھے۔ قرطبہ، اشبیلیہ، مالقہ، سرقسطہ، بشونہ، جیان، طیطلہ وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں دارالعلوم قائم تھے۔ جہاں اطالیہ، فرانس، جرمن، انگلستان وغیرہ ممالک کے طلباء اور شائقین علوم آتے اور برسوں رہ کر تعلیم پاتے تھے۔ عربوں نے یونانی، لاطینی اور اسپانس زبانوں کو بے حد مشقت اور عرق ریزی کے ساتھ سیکھا اور ان زبانوں میں عربی زبان کی متعدد لغات لکھ ڈالیں۔ خلیفہ حکم ثانی کے عہد حکومت میں صرف قرطبہ کے کتب خانے میں مختلف علوم وفنون کی چھ لاکھ کتابیں موجود تھیں اور ہر کتاب پر خاص خلیفہ کے ہاتھ کا حاشیہ تحریر تھا۔ مسلمانوں نے فلسفہ یونان کی تمام کتابوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کر ڈالا۔ ابن رشد جو ارسطو پر بھی فضیلت رکھتا تھا، اندلس ہی کا ایک مسلمان تھا۔ مسلمانوں نے علم ہیئت میں وہ ترقی کی اور ایسے رسد خانے قائم کیے کہ تمام یورپ کو انہیں کے نقش قدم پر چلنا پڑا۔ اصطرلاب جو رسد خانوں کی روح رواں ہے، اندلس کے مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ طب اور جراحی میں اندلسی مسلمانوں نے ایسی ترقی کی تھی کہ چند روز گزشتہ تک تمام

یورپ انہیں کی کتابوں سے فیض اٹھاتا تھا۔علم حیوانات ونباتات میں اندلسی مسلمانوں کے کارنامے بے حد عظیم الشان ہیں۔ قرطبہ اور غرناطہ میں علم حیوانات ونباتات کی تعلیم کے لیے خاص طور پر باغات اور کارخانے موجود تھے۔ پٹ سن اور روئی سے کاغذ تیار کرنا اندلسی مسلمانوں نے ایجاد کیا۔ الفانسو یاز دہم کی تاریخ میں لکھا ہے کہ:

> ''شہر کے مسلمان بہت سی گونجنے والی چیزیں اور لوہے کے گولے بہت بڑے بڑے سیب کے برابر پھینکتے تھے۔ یہ گولے اس قدر دور جاتے تھے کہ بعض فوج کے اس پار جا کر اور بعض فوج کے اندر گرتے تھے۔''

اس بیان سے ثابت ہے کہ مسلمان جب توپ اور بارود کو استعمال کرتے تھے، عیسائی اس سے قطعاً ناواقف تھے۔ سنین الاسلام کا مصنف لکھتا ہے کہ سنہ ۴۴۱ھ میں اندلس کے مسلمانوں میں سے بعض نے امریکہ کو دریافت کیا تھا، مگر اس کی زیادہ شہرت نہ ہوئی۔ یہ شہرت کولمبس کی تقدیر میں لکھی تھی جو بہت دنوں بعد امریکہ پہنچا تھا۔

مسلمانوں کے علمی ذوق وشوق نے تمام یورپ کے لیے ادب وفلسفہ اور صنعت وحرفت بلکہ تمام علوم وفنون کے دروازے کھول دیے تھے۔ آٹھ سو برس تک مسلمان ہر چیز میں اہل یورپ کے استاد بنے رہے۔ عیسائی امراء زبان اور ہر چیز میں مسلمانوں کے پیچھے چلنا اپنے لیے موجب فخر سمجھتے اور عربی نظم ونثر لکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے، یہ انہیں مسلمانوں کا اثر تھا۔ فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں اکثر وہ الفاظ جو جہاز رانی اور بحری انتظامات سے متعلق ہیں، عربی ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان ممالک نے مسلمانوں ہی سے جہاز رانی سیکھی ہے۔ سیر وشکار کے متعلق بھی اکثر الفاظ عربی الاصل ہیں۔ علم ہیئت کی اصطلاحیں اور دواؤں کے نام جو یورپ کی زبانوں میں رائج ہیں، عربی ہیں۔

غرض یہ کہ اندلس کے مسلمان تمام یورپ کے استاد، تمام یورپ کے محسن اور تمام یورپ کو علم و حکمت اور ترقی وعزت کے طریقے بتانے والے اتالیق تھے۔ آج یورپ اپنی کوئی بھی ایسی قابل فخر چیز پیش نہیں کر سکتا جس میں وہ مسلمانوں کا رہین منت نہ ہو۔ ان احسانات کا جو معاوضہ یورپ اور یورپ کے عیسائیوں نے مسلمانوں کو دیا، وہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

اس جگہ ایک مرتبہ پھر اس بات کو یاد کر لینا چاہیے کہ مسلمانوں نے جب پہلی صدی ہجری میں اندلس کو فتح کیا تھا تو کسی عیسائی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا تھا بلکہ عیسائی لوگ خود بہ خود اسلام کی

خوبیوں کو دیکھ کر دین اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ اب جبکہ عیسائیوں نے طاقت حاصل کی اور وہ مسلمانوں کو ان کے دین سے نہ پھیر سکے تو عیسائیوں نے لاکھوں مسلمانوں کو جو اندلس میں موجود تھے، قتل کر ڈالا، آگ میں جلا دیا اور پانی میں ڈبو دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملک اندلس جو مسلمانوں کے عہد حکومت میں دنیا کا سب سے زیادہ سرسبز وشاداب اور آباد ملک سمجھا جاتا تھا اور جس کی زرخیزی ضرب المثل تھی، مسلمانوں کی بربادی کے بعد ایسا ویران وغیر آباد ہوا کہ آج تک ویرانی ونحوست نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ مسلمانوں کے زمانے میں پہاڑوں تک پر زراعت ہوتی تھی اور کوئی چپہ زمین کا بنجر نہ تھا۔ لیکن آج ہزارہا میل مربع زمین کے قطعات ویران وبنجر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ ملک جو مسلمانوں کے عہد حکومت میں دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی اور شاندار ملک تھا، آج سب سے زیادہ منحوس اور بے حقیقت ملک سمجھا جاتا ہے۔

مسلمانوں پر یہ مصائب محض اس لیے نازل ہوئے کہ انہوں نے کلام الٰہی [1] کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان میں خودغرضی اور نااتفاقی پیدا ہوئی۔ پابندی اسلام کے ترک ہونے کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان سردار اپنے بھائی مسلمان سرداروں کی مخالفت میں عیسائیوں کے پاس جا کر ان سے مدد طلب کرنے میں کوئی باک وتامل نہ کرتے تھے۔ مسلمانوں نے خود عیسائیوں کے ہاتھوں سے خوشی خوشی مسلمانوں کو ذبح کرایا اور عیسائیوں کے دلوں سے اسلامی رعب کو مٹایا۔ اندلس کے مسلمانوں نے اپنی بداعمالیوں سے اپنے آپ کو مغضوب بنا لیا تھا۔ اسی لیے ان کو دنیا کے کسی حصے میں کوئی امداد نہ پہنچی اور کفار کے ہاتھوں سے فجار کو اللہ تعالیٰ نے سزا دلوائی۔ مسلمان جب کبھی اور جہاں کہیں دین اسلام سے ایسے غافل اور قرآن کریم سے بے تعلق ہوئے، ان پر ایسی ہی مصیبتیں نازل ہوئیں اور آئندہ بھی ہمیشہ مسلمانوں کی بربادی کے اسباب قرآن کریم اور جناب رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی تعلیمات کی طرف سے غافل ہو جانے ہی کی بداعمالی میں تلاش کیے جا سکیں گے۔ بہ جائے اس کے کہ ہم اندلس کے مسلمانوں کی تباہی پر نوحہ خوانی کریں، ہم کو چاہیے کہ ان کے حالات سے عبرت آموز ہوں اور اپنی حالتوں میں اصلاح کی کوشش کریں۔ سچے پکے مسلمان بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جائیں اور متحد ومتفق ہو کر سستی وکاہلی کو چھوڑ دیں اور مصروف سعی ہو جائیں کہ اسی کا نام زندگی اور اسی کا نام اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔

---

[1] اس سے مراد قرآن وحدیث یعنی دین اسلام ہے۔

سولہواں باب

مراکش وافریقہ

جزیرہ نمائے اندلس کے جنوب میں آبنائے جبل الطارق کے اس طرف براعظم افریقہ کے شمال ومغرب کے گوشہ میں جو ملک واقع ہے، اس کو مراکش یا مراکو یا مریٹینیا کہتے ہیں۔ اس ملک میں مراکو نام کا ایک شہر بھی آباد ہے۔ ملک مراکش کے خاص خاص صوبے سوس الادنیٰ، سوس الاقصیٰ، رلف، سوطہ وغیرہ ہیں۔ مگر حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ صوبوں کی حدود اور نام بھی ہمیشہ تبدیل ہوتے رہے۔ عرب لوگ کل ملک مراکش کو مغرب الاقصیٰ کے نام سے پکارتے تھے۔ اسی طرح الجیریا کو مغرب الاوسط کہتے تھے۔ کبھی کبھی الجیریا، تونس تک کے علاقوں پر بھی مراکش کے ملک کا اطلاق ہوا ہے۔ ملک عرب کی طرح ملک مراکش میں بھی بر برقوم کے قبائل الگ الگ صوبوں میں بودوباش رکھتے تھے اور ان قبائل کے ناموں سے صوبوں کو نامزد کیا جاتا اور ان کی آبادی کے اعتبار سے حدود کی تقسیم وتعین کی جاتی تھی۔ تونس والجیریا، مراکش، تینوں ملکوں میں زیادہ تر بربرقوم آباد تھی۔ اس لیے سوائے ملک مصر کے تمام شمالی افریقہ کو ملک بربر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت اس ملک مراکش میں زناطہ، مسمودہ، سنہاجہ، قطامہ، ہوارہ وغیرہ بربری قبائل آباد تھے۔ علاقہ بربر یعنی شمالی افریقہ میں ایرانیوں کے بعض خاندان بھی اس طرف آ کر آباد ہوئے اور آتش پرستی مراکش وغیرہ میں پہنچی۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد یعنی بنی اسرائیل بھی اس طرف آ کر آباد ہوئے۔ کم از کم یہودی مذہب کا تو اس طرف ایک زمانے میں ضرور دور دورہ رہا۔ رومیوں اور یونانیوں کی حکومت بھی ان علاقوں میں قائم ہوئی۔ قرطاجنہ کی مشہور قوم اسی علاقہ بربر، تونس یا افریقہ کی رہنے والی تھی، جس کو اہل فینشیا یعنی کنعانیوں کی ایک شاخ سمجھا جاتا ہے۔ آخر میں گاتھ قوم مراکش میں چیرہ دستی دکھا چکی تھی۔ مشرقی روم یعنی قسطنطنیہ کی حکومت اس زمانہ تک اس علاقے میں موجود تھی، جب تک کہ مسلمانوں نے اس ملک کو فتح کیا ہے۔ بہرحال قوم بربر مراکش اور اس

کے متصلہ مشرقی علاقوں میں آباد اور سینکڑوں قبائل میں منقسم تھی۔ اس قوم کو عربوں، شامیوں، مصریوں، یونانیوں، ایرانیوں، رومیوں وغیرہ کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ ملک اور آب و ہوا کے اثر سے اس مرکب قوم کا ایک خاص مزاج، خاص اخلاق اور مخصوص تہذیب متعین ہوچکی تھی اور اسی لیے بربر ایک خاص قوم کی حیثیت سے اقوام عالم میں شمار ہوئی۔ باوجود اس کے کہ بعض مہذب اور ترقی یافتہ قوموں نے شمالی افریقہ میں حکمرانی کی، بربر قوم کی بربریت و وحشت جو ملکی آب و ہوا کا نتیجہ تھا، دور نہ ہوسکی۔ ہاں، اس بربریت اور وحشت میں اگر فرق آیا اور وہ مبدل بہ تہذیب وشائستگی ہوئی تو اسلام کے اثر سے ہوئی۔ مسلمانوں کو اس ملک کو فتح کرنے اور حکومت اسلامیہ قائم کرنے میں بڑی بڑی دقتیں اٹھانی پڑیں۔ بربری قبائل نے بار بار بغاوتیں کیں اور بار بار وہ مفتوح ومغلوب بنائے گئے اور ان کی ان غداریوں اور بے وفائیوں کا سلسلہ برابر اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ وہ سب کے سب دین اسلام کو قبول کرنے کے بعد مثل عربوں کے بہادر، مہذب اور شریف ثابت ہوئے۔ جب کبھی ان میں اسلام کی پابندی کم ہوئی، اسی نسبت سے ان کی قدیمی وحشت و غداری عود کر آئی۔

ملک مراکش کو عقبہ بن نافع نے جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے، تمام و کمال فتح کرلیا تھا اور مراکش کے بعض صوبوں کے فرماں رواؤں نے بخوشی عقبہ کی فرماں برداری قبول کر لی تھی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ مراکش باغی ہوا اور ہر مرتبہ مغلوب ومحکوم بنایا گیا۔ موسیٰ بن نصیر گورنر افریقہ ومراکش نے اپنی طرف سے طارق بن زیاد کو مراکش کی حکومت سپرد کی تھی۔ اسی طارق بن زیاد نے ملک اندلس کو فتح کیا اور پھر اس کے بعد موسیٰ بن نصیر بھی خود اندلس میں داخل ہوا۔ ملک اندلس کی فتح میں زیادہ تر بربری لوگوں کی فوج کام میں لائی گئی تھی اور اسی لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ مراکش نے اندلس کو فتح کر کے حکومت اسلامیہ میں داخل کیا تھا۔ اندلس پر قبضہ ہونے کے بعد ہی بربری لوگوں نے مراکش واندلس میں بغاوتوں کا سلسلہ جاری کردیا۔ اندلس میں تو ان کی بغاوت جلد فرو ہوگئی مگر ملک بربر یعنی شمالی افریقہ میں ان کی بغاوتوں کا ایک سلسلہ تھا جو عرصہ دراز تک جاری رہا۔ خلافت بنوامیہ کی بربادی اور خلافت عباسیہ کے قیام واستحکام کے بعد تک بھی بربری قوم نے بغاوت وسرکشی کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ مسلمانوں نے ہر مرتبہ ان کو نیچا دکھایا اور ان کی کج روی کو روکا لیکن انہوں نے جب کبھی ذرا بھی گرفت کو ڈھیلا دیکھا تو بلاتوقف سرکشی پر آمادہ نظر آئے۔ قوم بربر کی اس حالت

اوراس مزاجی کیفیت سے مطلع ہو کر خلافت عباسیہ کے ہر ایک مخالف اور انقلابی سازش کرنے والے نے ملک مراکش وافریقہ ہی کو جو بربر قوم کا مسکن تھا، للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ علوی لوگ جو بار بار عباسیوں کے خلاف اٹھتے رہے، ان سب کی سب سے بڑی امید گاہ یہی ملک بربر رہا ہے اور ان کو جب کبھی موقع ملا، عراق، شام اور عرب سے بھاگ کر اسی ملک میں پہنچے۔ مسلمانوں نے اس کو فتح کرنے کے بعد ہی دین اسلام سے بربری لوگوں کو واقف کرا دیا تھا اور وہ بڑی تیز رفتاری سے اسلام میں داخل ہو کر قریباً سب کے سب مسلمان ہو چکے تھے۔ لیکن جب ان کی جبلی عادت بہت جلد اس تحریک کو جو مذہبی لباس میں پیش ہو کر بغاوت پر آمادہ کرتی تھی، قبول کر لیتی تھی۔

سلطنت ادریسیہ:

اوپر خلفائے عباسیہ کے حالات میں امام محمد بن عبداللہ اور ان کے خاندان کی مکہ میں بربادی وشکست کا حال ذکر ہو چکا ہے۔ اسی خاندان کا ایک شخص ادریس نامی مع اپنے خادم راشد کے ملک حجاز سے فرار ہو کر مصر وافریقہ ہوتا ہوا مراکش پہنچا۔ سجلماسہ کے متصل مقام بولیہ میں مقیم ہوا۔ وہاں کے ایک عامل یا سردار اسحاق بن محمد بن عبدالحمید نامی نے ادریس کی خوب خاطر تواضع کی اور رفتہ رفتہ بربر قبائل میں سے زواغہ، لواطہ، زناطہ، سدراطہ، کمناسہ اور غمازا وغیرہ قبائل ادریس کے ہم خیال ہو گئے۔ بربری قبائل کو شالہ، سلا، ازمور اور تامسنا کی حکومت ملی۔ حمزہ کو بولیلی اور اس کے مضافات سپرد ہوئے۔ باقی صغیر السن لڑکے اپنی دادی کنیزہ کی کفالت ونگرانی میں رہے۔ تلمسان پر سلیمان بن عبداللہ قبضہ کر ہی چکا تھا۔ اس طرح ایک عورت کی رائے پر عمل کر کے اراکین سلطنت نے مراکش کی ایک زبردست سلطنت کو چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ چند روز کے بعد عیسیٰ نے ازمور سے اپنے بھائی محمد بن ادریس پر فوج کشی کی۔ محمد نے اپنے بھائی قاسم کو اس مہم پر جانے کا حکم دیا مگر قاسم نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا۔ تب محمد نے عمر کو عیسیٰ کے مقابلے پر روانہ کیا۔ عمر نے عیسیٰ کو شکست دے کر اس کے تمام مقبوضہ ملک کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا اور محمد نے عمر کو بہ خوشی ایسا کرنے دیا۔ اس کے بعد محمد نے عمر کو حکم دیا کہ وہ قاسم کو بھی تادیب کرے۔ جس نے محمد کے حکم کی تعمیل سے انکار کیا۔

عمر نے قاسم پر فوج کشی کی، سخت لڑائی ہوئی۔ قاسم نے شکست کھا کر گوشہ نشینی اور زہد وعبادت

میں اپنی بقیہ زندگی بسر کر دی اور عمر نے قاسم کی ریاست کو بھی اپنے مقبوضہ ملک میں شامل کر لیا۔ اس طرح عمر کی سلطنت بہت وسیع ہوگئی۔ مگر وہ ہمیشہ اپنے بھائی محمد کی اطاعت کا اقرار کرتا رہا۔ سنہ ۲۲۰ھ میں عمر کا انتقال ہوا اور محمد نے اس کے بیٹے علی بن عمر کو سند حکومت عطا کر کے اس کے باپ کی جگہ مامور کیا۔

وفات:

عمر کی وفات کے سات مہینے بعد سنہ ۲۲۱ھ میں محمد بن ادریس نے بھی وفات پائی۔ اس نے مرتے وقت اپنے نو سالہ بیٹے علی کو اپنا جانشین اور ولی عہد مقرر کیا۔

علی بن محمد:

چنانچہ محمد کے بعد اراکین سلطنت نے بہ خوشی علی بن محمد کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہایت مستعدی سے کاروبار سلطنت انجام دینے لگے۔ اس کے عہد حکومت میں ہر طرح امن وامان قائم رہا۔ تیرہ سال کی حکومت کے بعد علی بن محمد نے سنہ ۲۳۴ھ میں وفات پائی اور مرتے وقت اپنے بھائی یحییٰ بن محمد کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

یحییٰ بن محمد:

یحییٰ بن محمد نے سلطنت کو خوب رونق دی اور اس کے زمانے میں سلطنت ادریسیہ عظیم الشان سلطنتوں میں شمار ہونے کے قابل ہوگئی۔ شہر فاس کی آبادی میں خوب ترقی ہوئی۔ تجارت کی گرم بازاری ہوئی۔ علماء وفضلاء دور دور سے آ کر دربار ادریسیہ میں جمع ہوئے۔

یحییٰ بن یحییٰ:

یحییٰ بن محمد کی وفات کے بعد اس کا بیٹا یحییٰ بن یحییٰ تخت نشین ہوا۔ یحییٰ بن یحییٰ کی بدچلنی اور نالائقی نے رعایا کو ناراض کر دیا اور عبدالرحمٰن بن ابی سہل کی سرداری میں لوگوں نے بغاوت کر کے یحییٰ بن یحییٰ کو معزول کر کے فاس سے نکال دیا۔ وہ اسی شرم وغیرت میں چند روز کے بعد فوت ہو گیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، علی بن عمر اپنی ریاست پر ابھی تک حکمراں تھا۔ یحییٰ بن یحییٰ کے مذکورہ انجام سے مطلع ہو کر علی بن عمر فاس میں آ کر تخت نشین ہوا اور اس طرح ایک وسیع سلطنت کا

مالک ہوگیا مگر چند ہی روز کے بعد عبدالرزاق خارجی نے علم بغاوت بلند کر کے اکثر حصہ ملک پر قبضہ کرلیا اور عرصہ دراز تک خاندان ادریسیہ کی حالت بہت ہی نازک اور کمزور و پریشان رہی۔

یحییٰ بن ادریس بن عمر:

یہاں تک کہ سنہ ۲۹۲ھ یحییٰ بن ادریس بن عمر بن ادریس اصغر نے قوت پا کر تمام ملک مراکش پر قبضہ کیا اور سلطنت ادریسیہ پر پھر عروج وکمال کا زمانہ آیا۔ اس نے نہایت کامیابی اور قوت وشوکت کے ساتھ حکومت کی۔ یہ ادریسیوں میں سب سے بڑا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عبیدیین کی حکومت افریقہ میں قائم ہوچکی تھی۔ سنہ ۳۰۵ھ میں عبیدیین کے لشکر نے حدود مراکش پر حملہ کیا۔ ادھر سے یحییٰ بن ادریس اپنا لشکر لے کر مقابلہ پر مستعد ہوا۔ سخت مقابلے اور عظیم الشان معرکہ آرائی کے بعد یحییٰ کو شکست اور لشکر عبیدیین کو فتح حاصل ہوئی۔ یحییٰ شکست خوردہ فاس میں واپس آیا اور صلح کی سلسلہ جنبانی خط وکتابت کے ذریعہ سے شروع کی۔ آخر یہ بات قرار پائی کہ یحییٰ بن ادریس دولت عبیدی کی اطاعت قبول کر کے نشان اطاعت کے طور پر کچھ زر نقد سالانہ ادا کرے۔ سنہ ۳۰۹ھ میں جبکہ یحییٰ بن ادریس کا بیٹا طلحہ بن یحییٰ بن ادریس فاس پر بہ طور حکمراں تھا، لشکر عبیدی کے ہاتھ میں گرفتار ہوگیا۔ دو سال قید رہ کر یحییٰ رہا ہوا اور مہدیہ میں جا کر رہنے لگا۔ وہیں سنہ ۳۳۱ھ میں فوت ہوا۔

سنہ ۳۰۹ھ سے مراکش اور فاس پر عبیدی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ سنہ ۳۱۳ھ میں حسن بن محمد بن قاسم بن ادریس نے فاس کے عبیدی گورنر ریحان کتامی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس کو فاس سے بے دخل کر کے فاس میں پھر ادریسی حکومت قائم کی۔ مگر چند ہی روز کے بعد موسیٰ بن ابی العافیہ عبیدی سپہ سالار نے چڑھائی کر کے فاس کو فتح کیا اور حسن کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس کے بعد خاندان ادریسی کے اور بھی کئی شخص گرفتار ومقتول ہوئے۔ فاس پر تو عبیدی حکومت کا قبضہ ہوا مگر مراکش کے اکثر اضلاع میں خاندان ادریسی کے افراد چھوٹے چھوٹے قطعات پر قابض ومتصرف رہے اور یہ سب ادریس اصغر کی اولاد عمر ومحمد کی نسل سے تھے۔ آخر انہوں نے سلطان اندلس کی طرف رجوع کیا اور سب کے سب فرماں روائے اندلس کے مطیع ہو گئے۔ اندلس کے اموی سلطان نے بہت جلد مراکش پر قبضہ کر کے وہاں سے عبیدیوں کو نکال دیا اور مراکش سلطنت قرطبہ کا ایک

صوبہ بن گیا، جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ اندلس کی تاریخ میں جو اوپر بیان ہو چکی ہے، خاندان بنو حمود کا ذکر آ چکا ہے۔ وہ خاندان اسی خاندان ادریسیہ کی ایک شاخ تھا۔

ادریسی حکومت کا خاتمہ:

سلیمان بن عبداللہ کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ وہ ادریس اکبر یا ادریس اول کا بھائی تھا اور اس نے تلمسان و تاہرت کے علاقے میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ سلیمان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد بن سلیمان مغرب الاوسط پر حکمراں ہوا۔ اس کے بعد بنو سلیمان میں خانہ جنگی برپا ہوئی اور ملک چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ اوشکول کا علاقہ عیسیٰ بن محمد بن سلیمان کے قبضے میں آیا۔ جراوہ کی حکومت ادریس بن محمد بن سلیمان کے قبضے میں آئی۔ ادریس بن محمد بن سلیمان کا بیٹا ابوالعیش عیسیٰ باپ کا جانشین ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم بن عیسیٰ، اس کے بعد اس کا بیٹا یحییٰ بن ابراہیم، اس کے بعد اس کا بھائی ادریس بن ابراہیم فرماں روا ہوا۔ آخر اس خاندان کے تمام افراد کو عبدالرحمٰن ناصر خلیفہ قرطبہ کے سپہ سالاروں نے گرفتار کر لیا تھا۔ تونس کے صوبہ پر سنہ ۳۴۲ھ تک علی بن یحییٰ بن محمد بن ابراہیم بن محمد بن سلیمان حکمراں رہا۔ اس کے بعد بھی بنو سلیمان کے اکثر افراد مغرب الاوسط کے اکثر مقامات پر برائے نام قابض و متصرف رہے، پھر رفتہ رفتہ اس خاندان سے حکومت بالکل منقطع ہو گئی۔

دولت اغالبہ (افریقہ):

دوسری جلد میں خلافت عباسیہ کے حالات بیان کرتے ہوئے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ سب سے پہلے ملک اندلس حکومت و خلافت عباسیہ سے الگ ہو گیا تھا اور وہاں ایک خود مختار حکومت و سلطنت بنو امیہ کی قائم ہو گئی تھی، جس کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اندلس کے بعد مراکش کا ملک خلافت عباسیہ سے جدا ہوا اور وہاں ایک خود مختار ادریسیہ سلطنت قائم ہوئی۔ اس ادریسیہ حکومت کا حال بھی مختصر طور پر اوپر بیان ہو چکا ہے۔ مراکش کے بعد افریقہ یا تونس یا طرابلس الغرب کا ملک خلافت عباسیہ سے جدا ہوا اور وہاں حکومت اغالبہ قائم ہوئی۔ اس حکومت اغالبہ کا حال اب مختصر طور پر بیان ہوتا ہے۔ افریقہ کا ملک [1] بھی علاقہ بربر میں شامل ہے۔ خلافت امیہ کے زمانہ میں ممالک بربریا

---

[1] اس وقت افریقہ کو ملک ہی کہا جاتا تھا۔ اب یہ ایک بہت بڑا براعظم ہے، جس کو عالمی طاغوت نے تقریباً چالیس ممالک میں تقسیم کر رکھا ہے۔

شمالی افریقہ کے تمام ملکوں کا نگران وائسرائے اسی ملک افریقہ یا طرابلس کے شہر قیروان میں رہتا تھا اور مراکش و اندلس کے گورنر اسی قیروان کے وائسرائے کی تجویز سے مقرر ہوتے تھے۔ خلافت عباسیہ کے زمانے میں جب اندلس و مراکش کے ملک دائرہ حکومت عباسیہ سے خارج ہو گئے تو قیروان کے وائسرائے کی حیثیت ایک معمولی صوبہ دار یا گورنر کی رہ گئی تھی۔ رعایا اور آب و ہوا کے اعتبار سے یہ ملک بھی چونکہ ملک مراکش سے مشابہت رکھتا تھا اور یہاں بھی بربری لوگ ہی زیادہ آباد تھے، لہٰذا یہ صوبہ بھی ہمیشہ معرض خطر ہی میں رہتا تھا اور یہاں جلد جلد عامل یا گورنر تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ بغاوتوں اور سرکشیوں کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا۔

ابراہیم بن اغلب:

عاملوں کی تبدیلی کے سلسلہ میں جب محمد بن مقاتل نے دوبارہ اس صوبہ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اس ملک کے باشندوں نے اظہار ناراضگی کیا اور ابراہیم بن اغلب کو جو دربار خلافت میں موجود تھا، لکھا کہ آپ اس صوبہ کی حکومت خلیفہ سے کہہ کر اپنے نام مقرر کرالیں۔ اس پیغام سے مطلع ہو کر ابراہیم بن اغلب نے خلیفہ ہارون الرشید کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ملک مصر کی آمدنی سے ایک لاکھ دینار سالانہ ملک افریقہ میں نظام حکومت قائم رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ اس ملک سے آپ کو کوئی آمدنی نہیں ہوتی۔ آپ مجھ کو اس ملک کا حاکم مقرر کر کے بھیج دیجیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ خزانہ مصر سے وہ ایک لاکھ دینار سالانہ نہیں لوں گا اور چالیس ہزار دینار سالانہ ملک افریقہ سے بہ طور خراج دربار خلافت میں بھیجتا رہوں گا۔ ابراہیم بن اغلب کی اس درخواست کو سن کر خلیفہ ہارون الرشید نے ہرثمہ بن اعین سے مشورہ کیا۔ ہرثمہ نے عرض کیا کہ ابراہیم کی اس درخواست کو ضرور منظور فرما لیجیے اور ملک افریقہ کی سند حکومت اس کو دیجیے۔ چنانچہ ہارون الرشید نے ابراہیم بن اغلب کو سند حکومت عطا کر دی۔ یہ ایک قسم کا ٹھیکہ تھا جو ابراہیم بن اغلب کو دیا گیا تھا۔ ابراہیم بن اغلب نے محمد بن مقاتل سے حکومت کا چارج لے لیا اور چونکہ رعایا ابراہیم سے خوش تھی، اس لیے تمام ملک میں امن و امان قائم ہو گیا۔ ابراہیم بن اغلب نے سنہ ۱۸۴ھ میں ملک افریقہ کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور قیروان کے متصل ایک نیا شہر آباد کر کے اس کا نام عباسیہ رکھا۔

لڑائیاں:

سنہ۱۸۶ھ میں حمدیس نامی ایک شخص نے عباسیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ابراہیم نے عمران بن مجاہد کو فوج دے کر مقابلہ پر بھیجا۔ سخت لڑائی کے بعد حمدیس کو شکست ہوئی اور میدان جنگ میں باغیوں کے دس ہزار آدمی کھیت رہے۔ اس کے بعد ابراہیم بن اغلب نے اپنی تمام تر توجہ مغرب الاقصیٰ کی طرف مبذول کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ادریس اول مراکش میں فوت ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ادریس اصغر کے نام سے ادریس اول کا خادم راشد مراکش میں حکومت کر رہا تھا۔ ابراہیم اغلب نے بربریوں کو انعام واکرام دے کر اپنی طرف گرویدہ کیا اور ان بربریوں کی ایک جماعت نے راشد کا سر اتار کر ابراہیم بن اغلب کے پاس قیروان بھیج دیا۔ اس کے بعد ابراہیم بن اغلب نے اپنے احسانات کا سلسلہ جاری رکھا اور ادریس اصغر کے اکثر اراکین کو اپنی طرف مائل کیا مگر ابھی اس کا کوئی قابل تذکرہ نتیجہ برآمد نہ ہوا تھا کہ سنہ۱۸۹ھ میں شہر طرابلس کے باشندوں نے ابراہیم بن اغلب کے عامل سفیان بن مہاجر کے خلاف بغاوت کر کے اس کو طرابلس سے مار کر نکال دیا۔ ابراہیم نے طرابلس کی طرف فوج روانہ کی اور ذی الحجہ سنہ۱۸۹ھ میں طرابلس میں پھر اس کی حکومت قائم ہو گئی۔ سنہ۱۹۵ھ میں ابراہیم بن اغلب کے خلاف ایک زبردست بغاوت نمودار ہوئی یعنی عمران بن مجاہد ربیعی نے تونس میں علم بغاوت بلند کیا اور ایک زبردست جمعیت کے ساتھ قیروان کی طرف بڑھا اور قیروان پر قابض ومتصرف ہوگیا۔ ابراہیم بن اغلب نے عباسیہ کے گرد خندق کھدوا کر مضبوطی کی اور عباسیہ میں محصور ہوگیا۔ عمران نے ایک سال تک ابراہیم بن اغلب کا محاصرہ جاری رکھا۔ اس عرصہ میں محاصر ومحصور دونوں کی متعدد لڑائیاں ہوئیں جن میں ابراہیم بن اغلب کو اکثر کامیابی حاصل ہوئی مگر کوئی فیصلہ کن نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اس عرصہ میں عمران نے اسد بن فرات قاضی کو بھی بغاوت پر ابھارا۔ مگر اسد نے بغاوت سے انکار کیا۔ ابراہیم بن اغلب نے اپنی اس حالت کی اطلاع خلیفہ ہارون الرشید کو دے کر روپیہ کی امداد چاہی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ابراہیم کے پاس کافی خزانہ فوراً روانہ کر دیا۔ اس خزانہ کے پہنچنے پر ابراہیم بن اغلب نے داد ودہش کا سلسلہ جاری کیا اور عمران کی فوج کے اکثر آدمی ابراہیم کے پاس چلے آئے۔ عمران پریشان ہوکر اور محاصرہ اٹھا کر مقام زاب کی طرف چلا گیا اور وہیں مقیم رہا۔ ابراہیم بن اغلب نے اس خطرہ سے نجات حاصل کر کے سنہ۱۹۶ھ

میں اپنے بیٹے عبداللہ کو طرابلس کی حکومت پر روانہ کیا۔ اس کے پہنچنے پر چند ہی روز کے اندر طرابلس کی فوج نے بغاوت کی اور دارالامارت میں اس کا محاصرہ کر لیا۔ پھر اس شرط پر کہ وہ طرابلس کو چھوڑ کر چلا جائے، اس کو امان دی۔ عبداللہ نے طرابلس سے نکل کر اور اسی کے مضافات میں مقیم رہ کر بربریوں کو اپنے گرد جمع کرنا شروع کیا اور ان کو خوب روپیہ لٹایا۔ جب اس طرح ایک جمعیت کثیر فراہم ہوگئی تو طرابلس پر حملہ کیا اور طرابلس کی فوج کو شکست دے کر طرابلس پر قبضہ کیا۔ اس کے چند روز بعد ابراہیم بن اغلب نے عبداللہ کو طرابلس کی حکومت سے معزول کر کے سفیان بن مضار کو وہاں کا حاکم مقرر کیا۔ اہل طرابلس نے پھر بغاوت کی اور سفیان کو طرابلس سے نکال دیا۔ سفیان، ابراہیم کے پاس عباسیہ میں پہنچا۔ ابراہیم نے سفیان کے ساتھ اپنے بیٹے عبداللہ کو روانہ کیا اور پھر طرابلس کی طرف بھیجا۔ سخت معرکہ ہوا اور بڑے کشت وخون کے بعد چند روز طرابلس میں امن وامان رہا، پھر عبدالوہاب بن عبدالوہاب بن عبدالرحمٰن بن رستم بربریوں کی ایک جمعیت کثیر لے کر طرابلس پر چڑھ آیا اور کشت وخون کا بازار گرم ہوا۔

وفات:

ادھر ماہ شوال سنہ ۱۹۶ھ میں ابراہیم بن اغلب نے عباسیہ میں وفات پائی۔ یہ خبر جب عبداللہ کو طرابلس میں پہنچی تو اس نے عبدالوہاب سے صلح کر لی۔ مضافات طرابلس عبداللہ کو دے کر شہر طرابلس اپنے پاس رکھا اور صلح نامہ مرتب کرنے کے بعد طرابلس سے قیروان کی جانب روانہ ہوا۔

عبداللہ بن ابراہیم:

ابراہیم بن اغلب نے وفات کے وقت اپنے بیٹے عبداللہ کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور اپنے دوسرے بیٹے زیادۃ اللہ کو بھائی کی اطاعت کے لیے وصیت کی۔ چنانچہ زیادۃ اللہ نے باپ کی وفات کے بعد اپنے بھائی عبداللہ کی حکومت کے لیے لوگوں سے بیعت لی۔ عبداللہ بن ابراہیم بن اغلب ماہ صفر سنہ ۱۹۷ھ میں وارد قیروان ہوا اور زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ قریباً پانچ سال حکومت کر کے ماہ ذی الحجہ سنہ ۲۰۱ھ میں عبداللہ نے کان کے زخم کی وجہ سے وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بھائی زیادۃ اللہ تخت نشین ہوا۔

زیادۃ اللہ:

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ابراہیم اغلب نے اس ملک کی حکومت ہارون الرشید سے ٹھیکہ پر لی تھی۔ لہٰذا خطبہ میں خلیفہ عباسی کا نام لیا جاتا تھا، مگر حکومت خودمختارانہ تھی۔ زیادۃ اللہ کی تخت نشینی کے بعد اس کے پاس مامون الرشید عباسی کی طرف سے سند حکومت آئی اور ساتھ ہی یہ بھی حکم آیا کہ منبروں پر عبداللہ بن طاہر کے لیے دعا کی جائے۔ اس سے زیادۃ اللہ کو انقباض پیدا ہوا اور اس نے قاصد کو رخصت کرتے وقت تحف وہدایا کے ہمراہ چند دینار حکومت ادریسیہ کے مسکوک شدہ روانہ کیے۔ مدعا اس سے یہ تھا کہ ہم آپ کو چھوڑ کر ادریسی حکومت سے تعلق پیدا کر سکتے ہیں۔

بغاوتیں:

چند روز کے بعد زیاد بن سہل نے جو اس کا ایک فوجی افسر تھا، باغی ہو کر شہر باجہ پر محاصرہ ڈالا۔ زیادۃ اللہ نے یہ خبر سن کر سنہ ۲۰۷ھ میں فوج اس طرف روانہ کی۔ زیادۃ اللہ کی فوج نے زیاد کو شکست دے کر اور گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد منصور ترمذی نے مقام طنبہ میں علم بغاوت بلند کیا اور فوجیں آراستہ کر کے تونس پر چڑھ آیا۔ تونس کا گورنر اسماعیل بن سفیان مقابلہ میں مقتول ہوا اور منصور کا تونس پر قبضہ ہو گیا۔ زیادۃ اللہ نے اپنے چچازاد بھائی اغلب بن عبداللہ بن اغلب کو جو اس کا وزیر بھی تھا، فوج دے کر روانہ کیا۔ چلتے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ اگر منصور سے شکست کھا کر آؤ گے تو تم سب کو قتل کر دوں گا۔ وہاں پہنچ کر لڑائی ہوئی اور منصور نے اس فوج کو شکست دی۔ اغلب بن عبداللہ شکست خوردہ قیروان کی طرف واپس آ رہا تھا، لشکریوں نے جان کے خوف سے اغلب بن عبداللہ کو قتل کر دیا اور خود منصور کے پاس چلے گئے۔ منصور کو بڑی قوت حاصل ہوئی۔ اس نے ایک زبردست فوج مرتب کر کے قیروان کا قصد کیا اور جاتے ہی قیروان پر قابض ہو گیا۔ زیادۃ اللہ عباسیہ میں محصور ہوا۔ قیروان پر منصور کا اور عباسیہ پر زیادۃ اللہ کا قبضہ رہا۔ چالیس دن کی لڑائیوں کے بعد زیادۃ اللہ کو فتح حاصل ہوئی اور منصور بھاگ کر تونس چلا گیا۔ سرداران لشکر میں سے کئی افسروں نے ملک کے جس حصہ پر موقع پایا، قبضہ کر لیا۔ انہیں میں عامر بن نافع ارزق بھی تھا، جس نے علم بغاوت بلند کیا تھا۔ زیادۃ اللہ نے محمد بن عبداللہ بن اغلب کو ایک فوج دے کر عامر کے مقابلہ کو بھیجا۔ عامر نے اس فوج کو شکست دے کر بھگا دیا۔ غرض زیادۃ اللہ کے قبضے میں بہت ہی تھوڑا سا علاقہ رہ

گیا، باقی سب مختلف سرداروں کے قبضے میں چلا گیا۔ مگر چند ہی روز کے بعد منصور اور عامر میں لڑائی ہو گئی۔ اس حالت سے فائدہ اٹھا کر زیادۃ اللہ نے اپنی حالت کو درست کیا اور دوبارہ اپنی طاقت کو بڑھایا۔ ادھر منصور، عامر کے مقابلے میں مقتول ہوا اور عامر نے تونس میں مقیم ہو کر اپنی الگ حکومت قائم کی۔ یہاں تک کہ سنہ ۲۱۴ھ میں عامر کا انتقال ہوا۔ سنہ ۲۱۸ھ میں زیادۃ اللہ کا تونس پر بھی قبضہ ہو گیا اور دوسرے باغی سرداروں کو بھی اس نے مغلوب کیا۔

جزیرہ صقلیہ کی فتح:

جزیرہ صقلیہ (سسلی) میں قیصر قسطنطنیہ کی حکومت تھی اور وہاں ایک گورنر قیصر کی طرف سے مقرر و مامور ہو کر آتا اور حکومت کرتا تھا۔ سنہ ۲۱۱ھ میں قیصر نے قسنطیل نامی بطریق کو صقلیہ کا حاکم مقرر کر کے بھیجا۔ اس نے ایک رومی سردار کو امیر البحر بنایا جس کا نام فیمی تھا۔ فیمی نے ساحل افریقہ پر لوٹ مار مچائی اور اپنا رعب سمندر میں قائم کیا۔ مگر اسی زمانے میں قیصر نے گورنر صقلیہ کو لکھا کہ تم اپنے امیر البحر کو گرفتار کر کے ہمارے پاس بھیج دو۔ امیر البحر کو جب یہ خبر پہنچی تو اس نے جزیرہ صقلیہ میں داخل ہو کر شہر سرتوسہ پر قبضہ کر لیا۔ گورنر اور امیر البحر میں جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں گورنر کام آیا اور امیر البحر فیمی نے تمام جزیرہ پر قابض ہو کر اپنی خود مختار سلطنت کا اعلان کیا اور اپنے آپ کو بادشاہ کہلوایا۔ جزیرہ صقلیہ کے اس بادشاہ نے جزیرہ کے ایک حصہ کی حکومت پر بلاطہ نامی ایک شخص کو مامور کیا۔ بلاطہ کا ایک چچا زاد بھائی میخائیل بھی اس جزیرہ کے ایک حصہ میں برسر حکومت تھا۔ ان دونوں چچا زاد بھائیوں نے مل کر فیمی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور متعدد معرکہ آرائیوں کے بعد سرقوسہ پر قابض و متصرف ہو گئے۔ فیمی شکست کھا کر اور جزیرہ کو چھوڑ کر جہازوں میں آ گیا اور امداد حاصل کرنے کے لیے زیادۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ زیادۃ اللہ نے قیروان کے قاضی اسد بن فرات کو ایک فوج دے کر صقلیہ کے بادشاہ فیمی کے ساتھ کر دیا۔

جزیرہ صقلیہ پر سب سے پہلے مسلمانوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عبداللہ بن قیس فزاری کی سرداری میں فوج کشی کی تھی لیکن یہ فوج کشی ایک وقتی حملہ تھا، جس سے رومیوں کو مرعوب کرنا مقصود تھا۔ یہ حملہ سنہ ۳۳ھ میں ہوا تھا، پھر سنہ ۸۵ھ میں موسیٰ بن نصیر وائسرائے افریقہ نے بھی اسی قسم کی فوج کشی اس جزیرہ پر کی تھی، پھر سنہ ۱۰۲ھ میں خلیفہ یزید بن عبدالملک کے ایک

سردار محمد بن ابو ادریس انصاری نے جزیرہ صقلیہ پر حملہ کیا۔ اس کے بعد بشر بن صفوان کلبی نے سنہ ۱۰۹ھ میں خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت میں صقلیہ پر حملہ کیا۔ ان تمام حملوں میں مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوئیں اور وہ صقلیہ سے بہت سے قیدی اور مال غنیمت لے لے کر واپس ہوئے۔ سنہ ۱۱۰ھ میں عبیدہ بن عبدالرحمٰن قیسی وائسرائے افریقہ کے ایک سردار مستیز بن حرث نے صقلیہ پر فوج کشی کی مگر سمندر میں طوفان کے برپا ہونے اور جہازوں کے ڈوب جانے سے یہ مہم ناکام رہی اور مستیز راستے ہی سے بہ دوقت تمام طرابلس واپس آیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۲۲ھ میں عبیداللہ بن حجاب گورنر افریقہ نے حبیب بن عبیداللہ کو مع اس کے بیٹے عبدالرحمٰن بن حبیب صقلیہ کی طرف روانہ کیا۔ عبدالرحمٰن بن حبیب نے ساحل پر اتر کر فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور اندرون جزیرہ میں شہر سرقوسہ تک جو صقلیہ کا دارالسلطنت تھا، پہنچ گیا، حاکم صقلیہ نے عبدالرحمٰن بن حبیب کو جزیہ دینا منظور کیا اور اطاعت و فرماں برداری کا اقرار کر کے عبدالرحمٰن سرقوسہ سے سالماً غانماً ساحل پر اپنے باپ حبیب بن عبیداللہ کے پاس واپس آیا۔ اس طرح جزیرہ صقلیہ کو مفتوح و باج گزار بنا کر دونوں باپ بیٹے افریقہ واپس آئے مگر چند ہی روز بعد یہ جزیرہ اسلامی حکومت وسیادت کے دائرے سے خارج ہو گیا۔ یہ فتح بھی محض عارضی اور ہنگامی ہی تھی۔ سنہ ۱۳۵ھ میں ایک مرتبہ پھر حاکم افریقہ نے اس جزیرہ پر فوج کشی کی۔ اس کے بعد سنہ ۲۱۲ھ تک مسلمانوں کو اس جزیرہ کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں ملا۔

اب زیادۃ اللہ کے پاس جب فیمی آیا اور اس جزیرہ کو فتح کرنے کی ترغیب دی تو زیادۃ اللہ نے اسد بن فرات قاضی قیروان کو سو جہاز دے کر جو فیمی کے جہازوں کے علاوہ تھے، صقلیہ کی طرف بھیجا اور اس حکم کے ساتھ بھیجا کہ صقلیہ کو فتح کر کے وہاں مستقل طور پر اسلامی حکومت قائم کی جائے اور رومی حکومت کا نام ونشان مٹا دیا جائے۔ نصف ربیع الاول سنہ ۲۱۲ھ کو یہ جنگی بیڑہ صقلیہ کی جانب روانہ ہوا اور تیسرے روز جزیرہ صقلیہ کے ساحل پر اسلامی فوج جا اتری۔ بلاطہ نے جواب جزیرہ صقلیہ کا بادشاہ بن گیا تھا، مقابلہ کے لیے فوج بھیجی۔ بلاطہ نے قیصر کی خدمت میں اظہار فرماں برداری کی درخواست بھیج کر باقاعدہ سند حکومت اور امداد منگوا لی تھی۔ لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ ہر مقام پر عیسائی لشکر کو شکست دیتے ہوئے مسلمان آگے بڑھے۔ فیمی مذکور اسلامی لشکر کے ہمراہ تھا مگر اب وہ مسلمانوں کی پیہم فتوحات اور عیسائیوں کی ہزیمتوں سے دل ہی دل میں افسردہ ورنجیدہ ہوتا

تھا۔ اس نے در پردہ عیسائیوں کو ضروری خبریں پہنچانی اور مشورے دینے شروع کیے، جس سے اسلامی لشکر کے لیے مشکلات پیدا ہوئیں مگر ان لڑائیوں میں بلاطہ مقتول ہوا اور عیسائیوں نے خود ہی دھوکا دے کر اس کے بعد فیمی کو الگ بلا کر قتل کر دیا۔ بلاطہ کی جگہ عیسائیوں نے فوراً اپنا دوسرا سردار منتخب کیا اور سرقوسہ کو ہر قسم کی تیاری کے بعد خوب مضبوط کر کے مسلمانوں کا مقابلہ سختی سے جاری رکھا۔ قاضی اسد بن فرات نے سرقوسہ کا محاصرہ کیا۔ اسی محاصرہ کے دوران میں قاضی اسد بن فرات کا شعبان سنہ ۲۱۳ھ میں انتقال ہوا۔

لشکر اسلام نے قاضی اسد بن فرات کے انتقال پر محمد بن ابوالجواری کو اپنا سردار منتخب کیا۔ اس کے بعد ہی عیسائیوں کی امداد اور مسلمانوں کے مقابلہ کی غرض سے قسطنطنیہ سے فوجیں جنگی جہازوں میں آ گئیں۔ سخت لڑائی ہوئی، لشکر اسلام نے اس نووارد فوج کو شکست دے کر بھگا دیا اور محاصرہ کو سختی سے جاری رکھا مگر اس کے بعد ہی اسلامی لشکر میں وبا پھیل گئی۔ اس وبا کا حملہ عیسائی لشکر کے حملے سے زیادہ خطرناک اور مہلک ثابت ہوا۔ بہت سے آدمی ہلاک ہو گئے۔ مسلمانوں نے سرقوسہ سے محاصرہ اٹھا لیا اور اپنے مقبوضہ شہروں میں واپس آ کر ارادہ کیا کہ افریقہ کو واپس چلیں اور وہاں سے حالت درست کر کے پھر واپس آ کر تمام جزیرہ کو فتح کریں گے لیکن ان کو معلوم ہوا کہ قسطنطنیہ کے جہازوں نے ناکہ بندی کر لی ہے۔ اب عیسائی فوجیں بحری و بری راستے سے بڑی تعداد میں آ کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئیں اور مسلمانوں کو ان کی لشکرگاہ میں محصور کر لیا۔ کچھ مسلمان جو مقبوضہ شہروں کے انتظام پر مامور تھے، انہوں نے یہ خبر سن کر چاہا کہ ہم اپنے محصور بھائیوں سے جا ملیں مگر عیسائیوں کے محاصرے کو نہ توڑ سکے اور باہر ہی ادھر ادھر بہ حالت پریشان پھرنے لگے۔ اسی حالت محاصرے میں محمد بن ابوالجواری نے وفات پائی۔

مسلمانوں نے فوراً زہیر بن عوف کو اپنا سردار منتخب کر لیا۔ مقام مازو میں مسلمان عرصہ دراز تک اسی حالت محاصرہ میں رہے۔ اتفاقاً اندلس سے جنگی جہازوں کا ایک بیڑہ بہ قصد جہاد نکلا ہوا تھا اور بحر روم میں گشت کر رہا تھا۔ صقلیہ کے ان مسلمانوں کو جو محاصرہ سے باہر تھے، یہ حال معلوم ہوا اور انہوں نے اس اندلسی بیڑہ کے قریب پہنچنے پر کسی نہ کسی طرح سے اسلامی لشکر کی حالت سقیم سے مطلع کیا۔ اس بیڑہ سے فوراً تین سو کشتیاں ساحل صقلیہ پر بھیج دی گئیں اور اندلس کے اسلامی لشکر نے ساحل پر اتر کر عیسائیوں کو مارنا اور قتل کرنا شروع کیا اور عیسائی محاصرہ اٹھا کر فرار ہوئے۔ یہ واقعہ

جمادی الآخر سنہ ۲۱۵ھ کا ہے۔ مسلمانوں نے اس محاصرہ سے آزاد ہوتے ہی پھر فتوحات کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اندلسی بیڑہ تو اپنا کام کر کے واپس چلا گیا اور افریقی اسلامی لشکر نے شہر پلرمو کا محاصرہ کر لیا اور مفتوحہ شہروں پر بھی از سر نو حکومت قائم کی۔ اسی عرصہ میں افریقہ سے بھی کمکی فوج کی کشتیاں پہنچ گئیں۔ اس سے پہلے جو فوج اسد بن فرات کے ہمراہ آئی تھی، اس کی کل تعداد دس ہزار سات سو تھی۔ جس میں دس ہزار پیدل اور سات سو سوار تھے۔ شہر پلرمو ابھی فتح نہ ہوا تھا کہ سنہ ۲۱۸ھ میں افریقہ سے محمد بن عبداللہ بن اغلب یعنی زیادۃ اللہ کا چچازاد بھائی صقلیہ کا گورنر مقرر ہو کر آیا اور سنہ ۲۲۰ھ میں پلرمو اور قصیر مانہ وغیرہ شہروں کو رومیوں سے فتح کر لیا۔ جزیرہ صقلیہ کا نصف جنوبی حصہ مسلمانوں کے قبضے میں تھا اور نصف شمالی حصے میں عیسائیوں کی حکومت قائم کی تھی اور قیصر روم کی طرف سے برابر مدد پہنچتی رہتی تھی مگر مسلمان برابر اپنی مفتوحات کو بڑھاتے اور جزیرہ میں اسلامی حکومت کو وسیع کرتے رہے۔ پلرمو کی فتح کے بعد سے جزیرہ صقلیہ سلطنت اغلبیہ کا ایک صوبہ بن گیا اور وہاں برابر یکے بعد دیگرے قیروان سے گورنر مقرر ہو کر آتے اور حکومت کرتے رہے۔ زیادۃ اللہ کے عہد حکومت کا سب سے بڑا اور شاندار کارنامہ جزیرہ صقلیہ کو حکومت اسلامیہ میں شامل کرنا ہے۔ اس جزیرہ میں قریباً پونے تین سو سال تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔ اس کے بعد آپس کی خانہ جنگیوں نے اس جزیرہ کو عیسائیوں کے قبضے میں پہنچا دیا اور انہوں نے جس طرح اندلس سے مسلمانوں کا نام ونشان گم کیا، اسی طرح جزیرہ صقلیہ سے بھی مسلمانوں اور ان کے نشانوں کو مٹایا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وفات:

زیادۃ اللہ نے سنہ ۲۲۳ھ میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بھائی اغلب ابن ابراہیم بن اغلب تخت نشین ہوا، اس کی کنیت ابوعقال تھی۔

ابوعقال اغلب بن ابراہیم:

ابوعقال کی حکومت سے رعایا عام طور پر خوش رہی۔ فوج بھی اس سے خوش تھی۔ اگر کسی نے بغاوت وسرکشی کی تو اس کی سرکوبی کامیابی کے ساتھ کر دی گئی۔ دو برس اور سات مہینے حکومت کرنے کے بعد ابوعقال نے سنہ ۲۲۶ھ میں ماہ ربیع الاول میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابوالعباس

محمد بن اغلب بن ابراہیم بن اغلب تخت نشین ہوا۔

ابوالعباس محمد:

ابوالعباس محمد کی حکومت بھی مثل اپنے باپ کے تھی۔ سنہ ۲۴۰ھ میں ابوالعباس کے بھائی ابوجعفر نے علم بغاوت بلند کر کے ابوالعباس کو معزول کر دیا اور خود حکومت کرنے لگا۔ ابوالعباس نے موقع پا کر فوج جمع کی اور ڈیڑھ سال کے بعد سنہ ۲۴۲ھ میں دوبارہ تخت حکومت حاصل کر کے ابوجعفر کو مصر کی طرف نکال دیا مگر اسی سال ابوالعباس کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا ابوابراہیم احمد بن ابوالعباس محمد تخت نشین ہوا۔

ابوابراہیم احمد:

ابوابراہیم احمد نے تخت نشین ہو کر فوج کی تنخواہوں میں اضافہ کیا۔ ملک کے اندر جا بہ جا قلعے بنوائے۔ جزیرہ صقلیہ میں رومی فوجوں کے ساتھ سلسلہ جنگ برابر جاری رہتا تھا۔ ابوابراہیم کے زمانے میں ماہ شوال سنہ ۲۴۷ھ میں مسلمانوں کو رومیوں پر ایک فتح عظیم حاصل ہوئی اور بہت سے قیدی افریقہ میں آئے۔ ابوابراہیم نے ان رومی قیدیوں کو نامہ بشارت کے ساتھ خلیفہ متوکل کے پاس بغداد کی جانب بھیج دیا مگر بہ ظاہر وہ خلیفہ بغداد کی سیادت کو تسلیم کرتے اور دربار خلافت سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق ضرور رکھتے تھے۔ سنہ ۲۴۹ھ میں ابوابراہیم احمد نے وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا بیٹا زیادۃ اللہ جو زیادۃ اللہ اصغر کے نام سے مشہور ہے، تخت نشین ہوا۔

زیادۃ اللہ:

زیادۃ اللہ اصغر کا طرز حکومت بھی مثل اپنے بزرگوں کے رہا مگر اس کو ایک سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کے بعد اس کا بھائی محمد بن ابوابراہیم احمد ملقب بہ ابوالغرانیق تخت نشین ہوا۔

ابوالغرانیق:

ابوالغرانیق اپنے بھائی زیادۃ اللہ اصغر کی وفات کے بعد سنہ ۲۵۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ لہوولعب کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اس کے عہد حکومت میں جزیرہ صقلیہ کا ایک حصہ رومیوں نے

مسلمانوں سے فتح کر لیا۔ مگر چند روز کے بعد مسلمانوں نے پھر وہ حصہ رومیوں سے چھین لیا تھا۔ اس نے سرحد مراکش اور ساحل بحر پر متعدد قلعے تعمیر کرائے۔ گیارہ سال حکومت کرنے کے بعد جمادی الثانی سنہ۲۶۱ھ میں فوت ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بھائی ابراہیم بن ابوابراہیم احمد تخت نشین ہوا۔

ابراہیم بن احمد:

ابراہیم بن احمد بہت ذی ہوش اور مدبر شخص تھا۔ اس نے نہایت عمدگی کے ساتھ حکومت شروع کی اور انتظام ملکی کو خوب مضبوط و مستحکم بنایا۔ بغاوتوں کے امکان کو مٹایا۔ سنہ۲۶۷ھ میں مصری فوجوں نے افریقہ پر حملہ کیا مگر ابراہیم کی فوجوں نے ان کو شکست دے کر بھگا دیا۔ سنہ۲۶۹ھ میں ملک کے اندر ایک بغاوت نمودار ہوئی، جس کو فرو کرنے میں بہت خون ریزی ہوئی۔ سنہ۲۸۰ھ میں خوارج نے خروج کیا اور تمام ملک میں بغاوتوں کے آثار نمودار ہوئے۔ ابراہیم نے نہایت استقلال واطمینان کے ساتھ اس فتنہ خوارج کو فرو کرنے کے لیے فوجیں ملک کے ہر حصے میں پھیلا دیں اور بہت جلد امن وامان قائم ہو گیا۔ اس کے بعد ابراہیم نے سوڈانی لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا اور ان سوڈانی غلاموں کی تعداد کو جو بہ طور سوار بھرتی کیے جاتے تھے، تیس ہزار پہنچایا۔ سنہ۲۸۱ھ میں ابراہیم قیروان سے شہر تونس میں چلا آیا اور وہیں محل سرائے بنوا کر اقامت اختیار کی۔ سنہ۲۸۳ھ میں فوج لے کر مصر کی جانب ابن طولون سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ اثناء راہ میں ایک بغاوت کا حال سن کر اس طرف متوجہ ہو گیا اور اس بغاوت کو فرو کیا۔

سنہ۲۸۷ھ میں جزیرہ صقلیہ سے خبر آئی کہ اہل پلرمو نے بغاوت اختیار کی ہے۔ ابراہیم نے اپنے بیٹے ابوالعباس عبداللہ کو ایک سو ساٹھ کشتیوں کا بیڑہ دے کر صقلیہ کی جانب روانہ کیا۔ ابوالعباس نے صقلیہ پہنچ کر عیسائی باغیوں کو پیہم شکستیں دے کر تمام جزیرہ میں امن وامان قائم کر دیا، پھر فوجیں آراستہ کر کے جزیرہ صقلیہ سے کشتیوں میں سوار ہو کر ساحل فرانس پر حملہ آور ہوا اور ڈیڑھ برس کے بعد سالماً غانماً واپس آیا۔ اس کے آتے ہی ابراہیم خود جزیرہ صقلیہ میں گیا اور وہاں سے ساحل فرانس پر حملہ آور ہوا۔ فرانسیسی اس سے بہت خوف کھاتے تھے۔ اس نے وہاں بعض مقامات کا محاصرہ کر رکھا تھا کہ اسی حالت میں آخر ماہ ذی الحجہ سنہ۲۸۹ھ میں فوت ہوا۔ اس کی لاش پلرمو

میں لاکر دفن کی گئی۔

اسی ابراہیم کے عہد حکومت میں ابوعبداللہ حسین بن محمد شیعی نے مراکش وافریقہ کی درمیانی حد پر کوہ اطلس کے جنوبی شہر کتامہ میں ظاہر ہوکر بربری قبائل کو محبت اہل بیت کی ترغیب وتلقین شروع کر کے بہت جلد کافی طاقت حاصل کر لی اور کتامہ پر قابض ہوکر حدود سلطنت اغلبہ کو دبانا شروع کیا تھا کہ سلطان ابراہیم اغلبی فوت ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ابوالعباس عبداللہ بن ابراہیم تخت نشین ہوا۔

ابوالعباس:

ابوالعباس نے تخت نشین ہوکر تونس کو اپنا دارالحکومت بنایا اور اپنے بیٹے ابوخول کو فوج دے کر ابوعبداللہ شیعی کے معتقدین کا قتل عام کیا۔ شیعی نے پھر فوج جمع کر کے ابوخول پر حملہ کیا۔ ایک شبانہ روز کی جنگ عظیم کے بعد ابوخول کو شکست ہوئی۔ وہ تونس واپس آیا۔ یہاں سے پھر فوج مرتب کر کے ابوعبداللہ شیعی کے مقابلے کو روانہ ہوا۔ ابوعبداللہ شیعی نے دھوکا دے کر اس کی فوج پر حملہ کیا۔ اس غیر مترقبہ حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوخول کی فوج شکست کھا کر بھاگی اور ابوخول نے مقام سطیف میں قیام کر کے پھر لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا اور مستعد ہوکر ابوعبداللہ شیعی کے مقابلے کو روانہ ہوا۔ ادھر ابوخول کے دوسرے بھائی زیادۃ اللہ بن ابوالعباس نے اپنے باپ کے بعض خدام کو شریک سازش کر کے ابوالعباس کا کام تمام کرا دیا اور خود شعبان سنہ ۲۹۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ خبر جب ابوخول کو پہنچی تو وہ تونس کی طرف واپس آیا اور آتے ہی گرفتار ہوکر قتل ہوا۔ علاوہ اس کے اور بھی اپنے بھائیوں اور چچاؤں کو زیادۃ اللہ نے قتل کرایا۔ زیادۃ اللہ کی کنیت ابومضر تھی۔

ابومضر زیادۃ اللہ:

ابومضر زیادۃ اللہ کی تخت نشینی کے بعد ابوعبداللہ شیعی نے بڑھ کر شہر سطیف پر قبضہ کر لیا اور اس کی طاقت میں خوب اضافہ ہو گیا۔ ابومضر عیش پسند اور پست ہمت شخص تھا۔ اس نے تونس کو چھوڑ کر مقام رقادہ میں سکونت اختیار کی اور اپنے ایک سردار ابراہیم بن جیش کو ابوعبداللہ شیعی کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ ابراہیم بن جیش چالیس ہزار فوج لے کر روانہ ہوا اور مقام قسطیلہ میں پہنچ کر چھ مہینے مقیم رہا اور اس عرصہ میں فوجیں ہر طرف سے فراہم کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک لاکھ فوج اس کے پاس فراہم ہو گئی۔ اس لشکر عظیم کو لے کر وہ کتامہ کی طرف بڑھا، مقابلہ ہوا۔ اتفاق کی بات کہ ابراہیم بن جیش کو

شکست ہوئی اور اس نے قیروان میں آ کر دم لیا۔

ابوعبداللہ شیعی نے شہر طنبہ کو فتح کر کے وہاں کے عامل فتح بن یحییٰ کو قتل کیا۔ ابوعبداللہ شیعی کی ان فتوحات کا حال سن کر قیروان اور دوسرے شہروں میں ہلچل اور بدامنی کے آثار نمایاں ہوئے۔ زیادۃ اللہ نے ان حالات کو درست کرنے میں روپیہ بہت خرچ کیا اور فوجوں کی بھرتی بھی جاری کردی۔ مقابلہ کے لیے فوجیں بھیجیں مگر ابوعبداللہ شیعی کی پیش قدمی برابر جاری رہی اور جلد جلد ایک شہر کے بعد دوسرا شہر اس کے قبضے میں آتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ابوعبداللہ نے شہر قمودہ پر قبضہ کیا۔

سلطنت اغلبیہ کا خاتمہ:

شہر قمودہ پر اس کے قبضے کا حال سن کر ابومضر زیادۃ اللہ مقام رقادہ سے جہازوں میں مع اپنے مال واسباب کے سوار ہو کر مشرق کی طرف چلا گیا۔ اول اس نے اسکندریہ میں اترنا چاہا مگر وہاں حاکم مصر نے اس کو اترنے سے روک دیا۔ مجبوراً وہ ساحل شام پر اترا اور مقام رقہ میں مقیم ہوا اور وہیں فوت ہو کر خاندان اغلبیہ کا خاتمہ کر گیا۔ سنہ ۲۹۶ھ میں ابوعبداللہ شیعی نے تمام حدود سلطنت اغلبیہ پر قبضہ کر کے عبیداللہ مہدی کے لیے لوگوں سے بیعت لی اور اس طرح سلطنت اغلبیہ کا خاتمہ ہو کر دولت عبیدیین کی ابتدا ہوئی۔ اسی سال قیروان ورقادہ وغیرہ پر قابض ہو کر ابوعبداللہ شیعی نے سنہ ۲۹۷ھ میں حسن بن خزیر کتامی کو جزیرہ صقلیہ کا گورنر مقرر کر کے روانہ کیا۔ سنہ ۲۹۹ھ میں صقلیہ والوں نے حسن بن خزیر کی بدخوئی سے تنگ آ کر اس کو قید کر لیا اور عبیداللہ مہدی کو معذرت کے ساتھ اطلاع دے کر دوسرا گورنر اپنے جزیرے کے لیے مقرر کرایا۔

سترہواں باب

دولت عبیدیین مصر وافریقہ میں

ابوعبداللہ:

خلافت عباسیہ کے شروع ہوتے ہی علویوں نے اس کی مخالفت میں کوششیں شروع کر دی تھیں، جن کا حال دوسری جلد میں بیان ہو چکا ہے۔علویوں نے بار بار خروج کیا اور بار بار ناکامی کا منہ دیکھا۔محبت اہل بیت اور سلطنت عباسیہ کی مخالفت کا اشاعتی کام خفیہ طریقہ سے تمام عالم اسلام میں علویوں نے پھیلا دیا تھا۔مگر عباسیوں کی مستعدی اور ان کے ہوا خواہوں کی کوششوں نے علویوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔اس پوشیدہ اور سازشی کام کی ابتدا عبداللہ بن سبا یہودی نے کی تھی۔اسی کو اس سازش کام کا استاد اور موجد کہنا چاہیے۔اس کام میں مجوسیوں، یہودیوں، بربریوں نے بھی نو مسلموں کے لباس میں علویوں کی امداد کی۔ جب سلطنت عباسیہ کی وسیع سلطنت کا شیرازہ ڈھیلا ہونے لگا تو بعض یہودی الاصل اور مجوسی النسب لوگوں نے اپنے آپ کو علوی بتا کر فائدہ اٹھانا چاہا۔ بربر کا علاقہ مرکز سلطنت بغداد سے زیادہ فاصلہ پر تھا اور بربری لوگوں کے مخصوص خصائل سے بہ آسانی فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔لہٰذا تیسری صدی ہجری کے آخری حصے میں محمد حبیب نامی ایک شخص نے، جو سلمیہ علاقہ حمص میں سکونت پذیر تھا، اپنے آپ کو امام جعفر صادق رحمہ اللہ کے بیٹے اسماعیل کی اولاد میں ظاہر کر کے حکومت و سلطنت حاصل کرنے کی کوشش کی۔امام جعفر صادق رحمہ اللہ کے زمانے سے ان کے داعی یمن، افریقہ اور مراکش میں مصروف کار تھے اور لوگوں کو اس خیال کی طرف متوجہ کر رہے تھے کہ عنقریب امام مہدی کا ظہور ہونے والا ہے اور وہ علوی فاطمی ہوں گے۔محمد حبیب نے اپنے رازداروں میں سے ایک شخص رستم بن حسن بن حوشب کو یمن کی طرف بھیجا کہ وہاں جا کر لوگوں کو اس بات کی تعلیم دے کہ امام مہدی بہت جلد ظاہر ہونے والے ہیں۔ چنانچہ رستم نے یمن میں جا کر اپنے کام کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا اور ایک جمعیت بھی فراہم کر لی۔

اس کے بعد محمد حبیب کے پاس بصرے کا ایک شخص ابوعبداللہ حسن بن محمد بن زکریا جو شیعہ خیال کا آدمی تھا اور ہمیشہ علویوں کی حمایت وطرفداری میں کوشاں رہتا تھا، آیا۔ محمد حبیب نے اس کو مناسب تعلیم دے کر اور جوہر قابل پا کر ہدایت کی کہ تم اول یمن پہنچ کر رستم بن حسن کی صحبت میں چند روز رہو اور دعوت وتبلیغ کے قاعدے اس سے سیکھو اور پھر وہاں سے علاقہ بربر کی طرف جاؤ اور وہاں اپنا کام شروع کرو۔ وہاں زمین تیار ہے، تم جا کر تخم ریزی شروع کرو، تم کو ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔ ابوعبداللہ شیعی کو محمد حبیب نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ہمارا بیٹا عبیداللہ امام مہدی ہے اور تم اسی کے داعی بنا کر بھیجے جاتے ہو۔ ابوعبداللہ اول یمن پہنچا، وہاں چند روز رہ کر اور رستم بن حسن اور دوسرے داعیوں سے دعوت وتبلیغ کے اصول اچھی طرح سیکھ کر رخصت ہوا۔ موسم حج میں مکہ پہنچا۔ وہاں شہر کتامہ کے سرداروں اور رئیسوں سے جو حج کرنے آئے تھے، ملا۔ پھر انہیں کے ہمراہ کتامہ پہنچا اور دعوت وتبلیغ کے کام میں مصروف ہو کر لوگوں کو اپنے زہد وعبادت کی نمائش سے گرویدہ بنایا۔ ابوعبیداللہ شیعی ۱۵ ربیع الاول سنہ ۲۸۸ھ کو شہر کتامہ میں وارد ہوا اور بہ آسانی لوگوں کو امام مہدی کی آمد کا یقین دلانے لگا۔ چونکہ ابوعبداللہ شیعی سے پہلے بھی اس ملک میں علویوں کے داعی آ آ کر اس قسم کے خیالات کی اشاعت کر چکے تھے، لہٰذا ابوعبداللہ کو زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ اہل کتامہ نے ابوعبداللہ شیعی کے لیے مقام فج الاخبار میں ایک مکان بنا دیا۔ یہ وہاں رہ کر لوگوں کو وعظ وپند کے ذریعہ سے تعلیم دینے لگا۔ اس نے اہل کتامہ کو یقین دلایا کہ امام مہدی[1] جس مقام پر آ کر قیام کریں گے، اس مقام کا نام کتمان سے مشتق ہوگا۔ اس لیے مجھ کو یقین کامل ہے کہ وہ یہی مقام کتامہ ہے اور جو لوگ امام مہدی کے اعوان وانصار ہوں گے، وہ بہترین خلائق ہوں گے۔ پس تم کو ان کا منتظر رہنا چاہیے اور تمہارا فرض ہے کہ ہمہ اوقات امام مہدی کی حمایت واعانت کے لیے مستعد رہو۔

ابوعبداللہ کے آنے اور اس قسم کی تعلیم دینے کی اطلاع ابراہیم بن احمد بن اغلب سلطان افریقہ کو ہوئی تو اس نے ابوعبداللہ کے پاس ایک حکم بھیجا کہ تم اپنی اس گمراہ کن تعلیم کو بند کرو، ورنہ تم کو سزا

---

[1] امام مہدی کے نام سے تاریخ اسلام میں بہت سے دعوے دار اٹھے لیکن وہ تمام جھوٹے تھے۔ اصل امام مہدی جن کے بارے میں احادیث میں آخری زمانہ میں ایک خلیفہ ہوں گے جو مال ودولت بغیر حساب کتاب کے (لوگوں میں) تقسیم کریں گے، ان کا نام محمد، لقب مہدی اوران کے والد کا نام عبداللہ ہوگا، وہ جناب رسول اللہ ﷺ کی اولاد میں سے یعنی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے ہوں گے، وہ زمین پر سات سال تک حکومت کریں گے اور زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ (صحیح مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعۃ ۔ جامع ترمذی، ابواب الفتن۔ ابوداؤد، کتاب المہدی وغیرہ)

دی جائے گی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تمام اہل کتامہ اور ارد گرد کے قبائل ابوعبداللہ کے دل سے معتقد ہو چکے تھے۔ ابوعبداللہ نے اپنے آپ کو طاقتور پا کر سلطان کے اس ایلچی کو نہایت سخت جواب دے کر لوٹا دیا۔ اہل کتامہ اس حال سے واقف ہو کر اپنے دل میں ڈرے کہ اب ہم حاکم افریقہ کے زیر عتاب آئیں گے۔ چنانچہ انہوں نے آپس میں مجلس مشاورت منعقد کی کہ ابوعبداللہ کو اپنا یہاں سے نکال دیں یا ابراہیم بن احمد حاکم افریقہ کے پاس بھیج دیں۔ کتامہ کے بہت سے مولوی لوگ بھی ابوعبداللہ کے معتقد ہو گئے تھے۔ انہوں نے مخالفت کی اور ابوعبداللہ کی مدد کو ضروری بتایا۔ انہیں لوگوں کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسی علاقہ کے ایک عامل حسن بن ہارون غسانی نے ابوعبداللہ کو اپنی حمایت میں لے کر شہر تازروت میں بلا لیا۔ ادھر کتامہ والوں نے بھی ابوعبداللہ کی حمایت اور امداد پر مستعدی ظاہر کی اور ابوعبداللہ کی طاقت اب پہلے سے سہ چند ہو گئی۔ حسن بن ہارون غسانی کی اسی زمانے میں ایک دوسرے سردار مہدی بن ابی کمارہ سے مخالفت ہوئی اور نوبت لڑائی تک پہنچی۔ مہدی بن ابی کمارہ کا ایک بھائی ابوعبداللہ شیعی کا معتقد تھا۔ اس نے ابوعبداللہ کے اشارے سے اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔ اس طرح ابوعبداللہ کی شان و شوکت اور بھی بڑھ گئی اور حسن بن ہارون اس کو اپنا آقا سمجھنے لگا۔ ابراہیم بن احمد کے ایک زبردست سردار فتح بن یحییٰ نے فوج لے کر ابوعبداللہ پر حملہ کیا اور شکست کھا کر قیروان کی طرف بھاگ گیا۔ اس کے بعد ابوعبداللہ نے جا بہ جا اپنے داعی پھیلا دیے اور لوگوں کو جبراً و قہراً بھی ابوعبداللہ کا مرید و مطیع ہونا پڑا اور ملک مغرب کے ایک حصے پر ابوعبداللہ کی حکومت مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئی۔ یہ سب واقعات صرف ایک یا ڈیڑھ سال کے عرصہ میں وقوع پذیر ہو گئے۔

سنہ ۲۸۹ھ میں سلطان ابراہیم اغلبی کے بیٹے ابوالعباس عبداللہ بن ابراہیم نے تخت نشین ہو کر اپنے بیٹے ابوخول کو ابوعبداللہ شیعی کے مقابلہ پر روانہ کیا، جیسا کہ اوپر سلطنت اغلبہ کے حالات میں بیان ہو چکا ہے۔ اول ابوعبداللہ کو ابوخول کے مقابلے میں شکست و ناکامی ہوئی مگر کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ ابوخول کا خطرہ خود بہ خود دور ہو گیا اور وہ (ابوخول) مقتول ہوا۔ ابوعبداللہ نے کتامہ کے متصل مقام انکجان کے نواح میں ایک شہر دارالہجرت کے نام سے آباد کیا۔ جب زیادۃ اللہ اغلبی خاندان کا آخری فرماں روا تخت نشین ہوا تو ابوعبداللہ کو شہروں کو فتح کرنے اور اپنی حکومت کو بڑھانے کا خوب موقع ملا اور وہ لوگوں کو یہ بتانے لگا کہ امام مہدی کا اب بہت ہی جلد ظہور ہونے

والا ہے۔ ساتھ ہی اس نے اپنے بعض معتمدین کو سلمیہ علاقہ حمص کی طرف عبیداللہ بن محمد حبیب کے پاس بھیجا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ محمد حبیب کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کے انتقال کی خبر ابوعبداللہ شیعی کے پاس پہنچ گئی تھی۔

ابوعبداللہ کے فرستادوں نے عبیداللہ کے پاس پہنچ کر عرض کیا کہ ملک مغرب میں آپ کی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ اب تشریف لے چلیے۔ چنانچہ عبیداللہ جو عبیدالمہدی کے نام سے مشہور ہوا، سلمیہ سے ان لوگوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ عبیداللہ المہدی کے ہمراہ اس کا بیٹا ابوالقاسم اور ایک غلام بھی روانہ ہوا۔ ان سب نے سوداگروں کے ایک قافلہ کی شکل بنائی اور سیدھے راستوں کو چھوڑ کر پیچیدہ راہوں کو اختیار کیا۔ جاسوسوں نے یہ خبر عباسی خلیفہ مکتفی کے پاس پہنچائی کہ اس طرح فلاں شخص سلمیہ سے ملک مغرب کی طرف روانہ ہوا ہے۔ خلیفہ مکتفی نے ابوعبداللہ شیعی کی ملک گیریوں اور عبیداللہ بن محمد حبیب کے اس طرح روانہ ہونے کے حالات سن کر ایک حکم عیسیٰ نوشتری گورنر مصر کے نام جاری کیا کہ اس حلیہ کا ایک شخص مصر سے گزر کر ملک مغرب میں جائے گا۔ اس کو جہاں پاؤ، گرفتار کر لو۔ گورنر عیسیٰ نے عبیداللہ کے قافلہ کو گرفتار کر لیا مگر وہ دھوکا کھا گیا اور یہ یقین کر کے کہ یہ شخص عبیداللہ نہیں ہے، اس کو چھوڑ دیا۔ عبیداللہ اور ابوعبداللہ کے درمیان زیادۃ اللہ اغلبی حاکم افریقہ حائل تھا اور اس کے پاس مصر سے خبر پہنچ گئی تھی کہ عبیداللہ، ابوعبداللہ کے پاس جا رہا ہے۔ لہٰذا زیادۃ اللہ نے جابجا عبیداللہ کی گرفتاری کا بندوبست کر دیا تھا۔ عبیداللہ نے طرابلس سے جس شخص کے ہاتھ اپنے آنے کی خبر ابوعبداللہ کے پاس بھجوائی تھی، وہ ابوعبداللہ کا بھائی ابوالعباس تھا، جو مع دوسرے ہمراہیوں کے عبیداللہ کو لینے کے لیے بھیجا گیا اور اس کے ساتھ سلمیہ سے آ رہا تھا۔ ابوالعباس اتفاقاً راستے میں گرفتار ہو گیا۔ عبیداللہ کو قیروان کے اندر اپنے گھائی کے گرفتار ہو جانے کی خبر پہنچی تو وہ حواس باختہ ہو کر مقام قسطیلہ چلا گیا مگر وہاں بھی قیام مناسب نہ سمجھ کر مقام سجلماسہ میں پہنچا۔ سجلماسہ کا حاکم زیادۃ اللہ اغلبی کا خادم الیسع بن مدرار تھا۔ اس نے اول عبیداللہ کو ایک نووارد سوداگر سمجھ کر خاطر مدارات کی لیکن جب زیادۃ اللہ کا حکم پہنچا کہ یہی شخص عبیداللہ ہے، اس کو گرفتار کر لو تو الیسع نے عبیداللہ کو گرفتار کر لیا۔ ابوالعباس قیروان کے جیل خانے میں اور عبیداللہ مہدی سجلماسہ کے قید خانے میں تین چار سال تک قید کی سختیاں برداشت کرتے رہے۔ اس عرصہ میں ابوعبداللہ شیعی نے اپنی فتوحات کے سلسلے کو برابر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اس نے بیسیوں لڑائیوں اور معرکہ

آرائیوں کے بعد شروع سنہ ۲۹۶ھ میں دو لاکھ فوج فراہم کر کے تیز رفتاری کے ساتھ پیش قدمی جاری کی اور ماہ رجب سنہ ۲۹۶ھ میں شہر قیروان کو فتح کر کے اپنے بھائی ابوالعباس کو جیل خانے سے نکالا اور سجلماسہ کے قید خانے میں خفیہ طور پر ان فتوحات کی خوشخبری عبیداللہ مہدی کے پاس پہنچائی۔ ابوعبداللہ کی فوج میں کتامہ کے دو سردار خاص طور پر قابل تذکرہ تھے۔ ایک عروبہ بن یوسف اور دوسرا حسن بن ابی خزیر۔ ابوعبداللہ نے قیروان پر قابض ومتصرف ہو کر وہاں کے مکانات ومحلات اہل کتامہ پر تقسیم کر دیے۔ فتح کے بعد جب جمعہ آیا تو جامع مسجد کے خطیب نے پوچھا کہ خطبہ میں کس کا نام لیا جائے؟ ابوعبداللہ نے کہا کہ فی الحال کسی کا نام نہ لیا جائے۔ اس کے بعد قیروان میں اپنے بھائی ابوالعباس کو حاکم مقرر کر کے سجلماسہ کی طرف بڑھا۔ راستے میں جو جو قبائل آئے، اکثر نے بہ خوشی اطاعت قبول کی۔ بعض راستے سے ہٹ گئے۔ سجلماسہ کے قریب پہنچ کر ابوعبداللہ نے سجلماسہ کے حاکم الیسع بن مدرار کے پاس ایک خط بھیجا۔ اس خط میں بہت منت وسماجت اور فروتنی کے ساتھ درخواست صلح پیش کی۔ اس منت وسماجت اور صلح کی استدعا کا سبب یہ تھا کہ عبیداللہ مہدی اس کی قید میں تھا۔ اس لیے ابوعبداللہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں وہ عبیداللہ کو قتل نہ کر دے۔ ابوعبداللہ کا قاصد خط لے کر جب الیسع بن مدرار کے پاس پہنچا تو اس نے قاصد کو قتل کرا دیا۔ خط کو چاک کر کے پھینک دیا اور فوجیں آراستہ کر کے مقابلے کے لیے نکلا۔ مقابلہ ہوا اور الیسع کی فوج شکست کھا کر بھاگی۔ الیسع اور اس کے ہمراہی بھی فرار ہوئے۔ ابوعبداللہ نے فوراً شہر میں داخل ہو کر سب سے پہلے جیل خانے کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر عبیداللہ مہدی کو مع اس کے بیٹے ابوالقاسم کے جیل خانے سے نکل کر گھوڑے پر سوار کیا۔ تمام اراکین لشکر ہمراہ تھے۔ عبیداللہ مہدی کے پیچھے پیچھے ابوعبداللہ تھا، فرط مسرت سے روتا جاتا تھا اور یہ کہتا جاتا تھا: ھذا مولاکم، ہذا مولاکم (یہ تمہارا امام ہے، یہ تمہارا امام ہے) اسی طرح اپنے خیمہ تک لایا۔ عبیداللہ کو تخت پر بٹھایا۔ خود بھی بیعت کی، دوسروں سے بھی بیعت کرائی۔ اسی حالت میں الیسع بن مدرار پابہ زنجیر گرفتار ہو کر پیش ہوا۔ ابوعبداللہ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور وہ قتل کیا گیا۔

عبیداللہ مہدی:

ابوعبداللہ اور عبیداللہ چالیس روز سجلماسہ میں مقیم رہ کر مغرب کی جانب روانہ ہوئے۔ ماہ ربیع

الثانی سنہ ۲۹۷ھ میں رقادہ اور قیروان پہنچے۔ ابوعبداللہ نے تمام مال واسباب جواب تک جمع کیا تھا، عبیداللہ کی خدمت میں پیش کیا اور عبیداللہ مہدی کی با قاعدہ بیعت خلافت ہوئی۔ خطبوں میں اس کا نام لیا گیا اور تمام ملک بربر میں مناد و مبلغ بھیجے گئے۔ سلطنت وحکومت کے ذریعے سے سب کو اپنے مسلک وعقیدہ میں زبردستی داخل کیا گیا۔ صوبوں پر حاکم اور نائب السلطنت مقرر کر کے بھیجے گئے۔ اہل کتامہ نے شروع ہی سے ان کی حمایت کی تھی۔ ابوعبداللہ شیعی اور اس کا بھائی ابوالعباس سلطنت کے کاموں میں پیش پیش تھے اور حق بھی یہی تھا کہ وہ امور سلطنت میں اوروں سے زیادہ دخیل ہوتے کیونکہ ابوعبداللہ ہی نے اپنی پامردی وجواں مردی سے اس عظیم الشان سلطنت کو پیدا کیا تھا۔ اسی نے خاندان اغالبہ کی بیخ کنی کی تھی۔ اسی نے عبیداللہ کو بلا کر بنی بنائی سلطنت کے تخت پر بٹھایا تھا۔

عبیداللہ نے تخت نشین ہو کر اور اپنے آپ کو مطلق العنان فرماں روا دیکھ کر یہ چاہا کہ ابوعبداللہ اور اس کے بھائی ابوالعباس کے اثر ورسوخ کو مٹائے۔ چنانچہ اس نے ان دونوں بھائیوں کے اثر واقتدار کو مٹانا اور کم کرنا شروع کیا۔ ابوعبداللہ نے جب دیکھا کہ ہماری بلی ہمیں کو میاؤں کرتی ہے تو اس کی آنکھیں کھلیں۔ اہل کتامہ ابوعبداللہ کے زیادہ معتقد تھے۔ ابوعبداللہ ہی نے ان کو امام معصوم کا پتہ دیا تھا۔ ابوعبداللہ ہی کے کہنے سے انہوں نے عبیداللہ کو امام مہدی اور امام معصوم مانا تھا۔ لہٰذا ابوعبداللہ نے اہل کتامہ کو در پردہ سمجھانا شروع کیا کہ مجھ کو امام معصوم کی شناخت میں دھوکا لگ گیا ہے۔ یہ شخص امام معصوم نہیں۔ یہ تو غاصب اور مال مردم خور ہے۔ اصلی امام معصوم تو اس کے بعد آئے گا۔ یہ باتیں سن کر اکثر اہل کتامہ اس خیال میں اس کے شریک ہو گئے۔ اس کا حال عبیداللہ کو بھی معلوم ہوا۔ اس نے سازشی لوگوں کو کسی نہ کسی حیلے سے قتل کرانا شروع کر دیا۔ اہل کتامہ اور ابوعبداللہ کے مشورے سے ایک شخص جو شہر کتامہ میں بڑا نیک اور عابد وزاہد ہونے کی وجہ سے شیخ المشائخ کے نام سے مشہور تھا، عبیداللہ مہدی کے پاس بھیجا گیا۔ شیخ المشائخ نے مہدی کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم لوگوں کو آپ کی نسبت شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ آپ معصوم ہیں یا نہیں؟ لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہم کو اپنی امامت کی کوئی نشانی دکھلائیں۔ عبیداللہ سمجھ گیا کہ اب فتنہ برپا ہونے والا ہے۔ اس نے فوراً اپنے غلام کو اشارہ کیا۔ غلام نے شیخ المشائخ کا سر اڑا دیا۔ اس واقعہ سے مطلع ہو کر اہل کتامہ عبیداللہ کے قتل پر اور بھی زیادہ آمادہ ہو گئے۔

ابوعبداللہ کا قتل:

عبیداللہ نے حالات کی نزاکت کا اندازہ کر کے اہل کتامہ کے سب سے بڑے سردار عروبہ بن یوسف اور اس کے بھائی حباسہ بن یوسف کو اپنی خلوت خاص میں طلب کر کے نہایت محبت واخلاص کی باتیں کیں اور حکم دیا کہ ابوعبداللہ اور اس کے بھائی ابوالعباس کو قتل کر دو۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں عروبہ وحباسہ دونوں ابوعبداللہ کے مکان کے باہر ایک جگہ چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ جب ابوعبداللہ نکلا تو عروبہ نے حملہ کیا۔ ابوعبداللہ نے کہا کہ عروبہ! تم کس کے حکم سے یہ کام کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ جس کی اطاعت کا تم نے ہم کو حکم دیا تھا۔ اسی نے تمہارے قتل کا حکم دیا ہے۔ یہ کہہ کر قبل اس کے کہ ابوعبداللہ کچھ کہے، اس کا کام تمام کر دیا۔ اس طرح ابوالعباس بھی قتل کیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۵ جمادی الآخر سنہ ۲۹۸ھ کو وقوع پذیر ہوا۔

بغاوتیں:

اس واقعہ کے بعد ابوعبداللہ کے حامیوں نے بغاوت وسرکشی پر کمر باندھی۔ عبیداللہ نے ان کا مقابلہ کر کے فتنے کو فرو کیا۔ چندروز کے بعد اہل کتامہ نے عبیداللہ کے خلاف پھر خروج کیا۔ عبیداللہ نے پھر اس بغاوت کو طاقت کے استعمال سے فرو کیا۔ چونکہ اب ملک کی آب و ہوا بگڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی، لہٰذا عبیداللہ نے شیعہ مذہب کی دعوت وتبلیغ کے کام کو ملتوی کر دیا اور تمام دعاۃ کو منع کر دیا کہ لوگوں کو شیعیت کی طرف نہ بلاؤ کیونکہ اس طرح بغاوتوں کے پیدا ہونے کا زیادہ اندیشہ ہے۔ اس کے بعد عبیداللہ مہدی نے عروبہ کو باغمایہ کی اور حباسہ کو برقہ اور اس کے مضافات کی حکومت عطا کی اور اپنے بیٹے ابوالقاسم کی جو ابوالقاسم نزار کے نام سے مشہور ہے، ولی عہدی کا اعلان کیا۔

چندروز کے بعد اہل کتامہ میں ابوعبداللہ کا پھر ایک خیال اور جوش پیدا ہوا۔ انہوں نے عبیداللہ کے خلاف ایک نوجوان کو اپنا امیر بنا کر اس کو مہدی کا لقب دیا اور اس کے نبی ہونے کا اعلان کیا۔ عبیداللہ نے اپنے بیٹے ابوالقاسم نزار کو ایک زبردست فوج دے کر اہل کتامہ کی جانب روانہ کیا۔ ابوالقاسم نے لڑائی میں اہل کتامہ کو شکست دے کر کتامہ کو پامال و ویران کر ڈالا اور اس نوجوان مہدی اور نبی کو بھی پکڑ کر قتل کیا۔ سنہ ۳۰۰ھ میں اہل طرابلس نے علم بغاوت بلند کیا۔ عبیداللہ نے ابوالقاسم کو اس طرف بھیجا۔ ابوالقاسم نے ایک طویل محاصرے کے بعد طرابلس کو فتح کیا اور اہل طرابلس سے

تین لاکھ دینار سرخ بہ طور تاوان جنگ وصول کیے۔

سنہ ۳۰۱ھ میں ابوالقاسم نے جنگی جہاز فراہم کر کے اور ایک شائستہ فوج ہمراہ لے کر مصر و اسکندریہ پر فوج کشی کی۔ اس حملہ میں حباسہ بن یوسف بھی اس کے ہمراہ تھا۔ چنانچہ اسکندریہ پر قبضہ کرلیا۔ یہ خبر جب بغداد میں خلیفہ مقتدر عباسی کو پہنچی تو اس نے سبکتگین اور مونس خادم کو مع فوج اس طرف روانہ کیا۔ ان دونوں نے متعدد لڑائیوں کے بعد ابوالقاسم و حباسہ کو حدود مصر سے نکال دیا اور عبیدی فوج قیروان کی طرف واپس چلی گئی۔ سنہ ۳۰۲ھ میں حباسہ نے دوبارہ اسکندریہ پر فوج کشی کی۔ مونس خادم نے کئی لڑائیوں کے بعد حباسہ کو بھگا دیا۔ حباسہ کی سات ہزار فوج اس مرتبہ مقتول ہوئی اور حباسہ بہ مشکل اپنی جان بچا کر لے گیا۔ عبیداللہ مہدی نے عباسہ کو اسی سال قتل کرا دیا۔ حباسہ کے بھائی عروبہ نے بھائی کے قتل پر علم بغاوت بلند کیا۔ اہل کتامہ نے اس بغاوت میں عروبہ کا ساتھ دیا۔ عبیداللہ نے اپنے خادم غالب کو عروبہ کی تادیب پر مامور کیا۔ غالب نے ایک زبردست فوج کے ساتھ حملہ کر کے عروبہ کو شکست دے کر قتل کیا اور اس کے چچیرے بھائیوں اور ہمراہیوں کی ایک بڑی جماعت کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔ اس کے بعد ہی جزیرہ صقلیہ میں بغاوت ہوئی اور اہل صقلیہ نے اپنے گورنر علی بن عمرو کو جو حسین بن خزیر کے بعد مقرر ہوا تھا، صقلیہ سے نکال کر خلیفہ مقتدر عباسی کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ ہم فرماں برداری قبول کرتے ہیں۔ یہ خبر پا کر سنہ ۳۰۴ھ میں عبیداللہ نے حسن بن خزیر کو جنگی جہازوں کا ایک بیڑہ دے کر اہل صقلیہ کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ ادھر اہل صقلیہ کے سردار احمد بن قہرب نے سخت مقابلہ کے بعد حسن بن خزیر کو شکست دے کر قتل کیا مگر اس کے بعد اہل صقلیہ کو خوف پیدا ہوا کہ عبیداللہ کی مخالفت کے بعد ہمارا محفوظ رہنا دشوار ہے۔ انہوں نے خود ہی اپنے سردار احمد بن قہرب کو گرفتار کر کے عبیداللہ کے پاس بھیج دیا اور اپنی خطاؤں کی معافی چاہی۔ عبیداللہ نے احمد کو قتل کرا دیا اور صقلیہ کی حکومت پر علی بن موسیٰ بن احمد کو مامور کر کے بھیجا۔

شہر مہدیہ کی بنیاد:

عبیداللہ مہدی چونکہ شیعہ اسماعیلیہ اور امام مہدی ہونے کا مدعی تھا، لہٰذا اس کو ہمیشہ خطرہ رہتا تھا کہ میرے خلاف بغاوت نہ پھوٹ پڑے کیونکہ افریقہ و قیروان میں تمام آدمی اس کے ہم عقیدہ نہ

تھے۔ اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ کسی مناسب موقع پر ایک شہر آباد کر کے اپنا دارالحکومت بنائے۔ چنانچہ سنہ ۳۰۳ھ میں اس نے ساحلی علاقہ کا دورہ کر کے سرزمین برکصورہ کے قریب ایک جزیرہ کو پسند کر کے وہاں ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اس کا نام مہدیہ تجویز کیا۔ شہر مہدیہ کی شہر پناہ نہایت مضبوط بنوائی اور دروازوں میں لوہے کے کواڑ لگوائے۔ سنہ ۳۰۶ھ میں اس شہر کی تعمیر تکمیل کو پہنچی اور عبیداللہ مہدی نے ہنس کر کہا کہ آج مجھ کو بنی فاطمہ کی طرف سے اطمینان ہوا کہ اب وہ دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہ سکیں گے۔ اسی سال اس نے کشتیاں بنانے کا ایک کارخانہ جاری کیا اور پہلے ہی سال نو سو کشتیاں تیار کرا کرا ایک زبردست جنگی بیڑہ تیار کیا۔ سنہ ۳۰۷ھ میں اس نے اپنے بیٹے ابوالقاسم کو اسکندریہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ابوالقاسم نے جاتے ہی اسکندریہ اور دریائے نیل کے ڈیلٹا پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کا حال جب بغداد میں خلیفہ مقتدر کو معلوم ہوا تو اس نے پھر مونس خادم کو فوج دے کر مصر کی جانب روانہ کیا۔ بہت سی لڑائیوں اور زور آزمائیوں کے بعد مونس کو فتح اور ابوالقاسم کو شکست حاصل ہوئی۔ ابوالقاسم ابھی مصر میں لڑ ہی رہا تھا کہ عبیداللہ نے اس کی مدد کے لیے اسی کشتیوں کا ایک بیڑہ مہدیہ سے روانہ کیا۔ اس جنگی بیڑہ کے افسر سلیمان خادم اور یعقوب کتامی تھے۔ ابھی یہ بیڑہ پہنچا نہ تھا کہ ابوالقاسم شکست خوردہ وہاں سے بھاگا۔ اس بیڑہ والوں کو ابوالقاسم کے فرار ہونے کی اطلاع نہ ہوئی۔ راستے میں بھی ایک دوسرے سے نہ ملے۔ ابوالقاسم بچا ہوا نکل گیا اور یہ امدادی بیڑہ بڑھتا ہوا آگے چلا گیا۔ وہاں مونس کے بیڑہ سے مقابلہ ہوا، جس میں صرف پچیس کشتیاں تھیں۔ اس عبیدی بیڑہ کو شکست ہوئی اور سلیمان ویعقوب دونوں گرفتار ہو گئے۔ کشتیوں کو مونس کی فوج نے آگ لگا کر جلا دیا، آدمی سب مقتول ہوئے۔

اگلے سال یعنی سنہ ۳۰۸ھ میں عبیداللہ مہدی نے مضالہ بن حبوس کو ملک مراکش پر حملہ کرنے کے لیے مغرب کی جانب روانہ کیا۔ یحییٰ بن ادریس بن عمرو سے متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ آخر یحییٰ نے عبیداللہ مہدی کی اطاعت قبول کر لی اور عبیداللہ نے موسیٰ بن ابی العافیہ مکناسی کو صوبہ جات مراکش کا نگران مقرر کر دیا۔ سنہ ۳۰۹ھ میں مراکش کے دوسرے صوبے بھی عبیدی حکومت میں شامل کر لیے گئے۔ فاس کی حکومت یحییٰ کے قبضہ میں تھی لیکن وہ باج گزار وفرماں بردار بن چکا تھا۔ اسی سال موسیٰ بن ابی العافیہ نے یحییٰ کی شکایت کی اور عبیداللہ کے حکم سے یحییٰ کو معزول کر کے یہ حصہ ملک بھی

حکومت عبیدی میں شامل ہوا۔ جب اس طرح خاندان ادریسیہ کی حکومت کا نام ونشان مٹ گیا تو ادریسی خاندان کے افراد نے ریف اور غمارہ کے علاقے میں پہنچ کر اپنی حکومت قائم کی۔ انہیں لوگوں میں سے خاندان بنوحمود تھا جو قرطبہ میں بنوامیہ کی حکومت کے بعد قاضی وحکمراں ہوا تھا، جس کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے۔ مضالہ نے مراکش سے فارغ ہو کر سجلماسہ پر چڑھائی کی اور وہاں مدرار مکناسی کے اہل خاندان کو جو دولت عبیدیہ سے منحرف اور برسر حکومت تھے، قتل کر کے سجلماسہ کی حکومت اپنے چچازاد بھائی کو سپرد کی۔ مضالہ ایک زبردست سپہ سالار اور عبیداللہ مہدی کی حکومت کو مراکش میں قائم کرنے کا باعث ہوا تھا۔ اس کی اس ملک گیریوں اور قتل وتشدد سے بربریوں کے قبائل زناتہ یکایک برافروختہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ زناتہ اور مضالہ کے درمیان بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر کار مضالہ قبائل زناتہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کے مارے جاتے ہی تمام ملک مراکش میں بغاوت برپا ہوگئی اور تمام ملک مراکش عبیدیوں کے قبضے سے نکل گیا۔

عبیداللہ نے سنہ ۳۱۵ھ میں لشکر کتامہ کے ساتھ اپنے بیٹے ابوالقاسم کو مراکش کی طرف روانہ کیا۔ قبائل زناتہ کا سردار محمد بن خزر ابوالقاسم کو آتا ہوا دیکھ کر اپنی فوج کے ساتھ جنوبی ریگستان میں چلا گیا۔ ابوالقاسم شہروں کو فتح کرتا ہوا مغرب کی طرف بڑھا۔ شہر جرادہ میں حسن بن ابی العیش کو محصور کرلیا، جو خاندان ادریسی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس محاصرے نے بہت طول کھینچا اور ابوالقاسم کو اس شہر کی فتح سے مایوس ہو کر واپس ہونا پڑا۔ واپسی میں شہر مسیلہ سے بنوکملالان کو جو وہاں حکمران تھے، گرفتار کر کے قیروان کی طرف جلاوطن کر دیا اور شہر مسیلہ کو دوبارہ تعمیر وآباد کرا کر محمدیہ کے نام سے موسوم کیا اور یہاں کی حکومت علی بن حمدون کو عطا کی اور شہر زاب بھی اسی کی حکومت میں دیا اور مراکش کی عام حکومت ونگرانی موسیٰ بن ابی العافیہ کے سپرد کی۔ چندروز کے بعد موسیٰ بن ابی العافیہ، عبیداللہ مہدی کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے دولت امویہ اندلس کا مطیع ہو گیا اور تمام ملک مراکش میں خلیفہ اندلس کا خطبہ پڑھوا دیا۔

یہ سن کر عبیداللہ نے احمد مکناسی کو ایک زبردست فوج دے کر مراکش کی جانب روانہ کیا۔ بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر موسیٰ بن ابی العافیہ مراکش سے اندلس کی جانب چلا گیا اور احمد بن بصلین مکناسی مراکش کو پامال کر کے واپس مہدیہ کی جانب چلا گیا۔

وفات:

ماہ ربیع الاول سنہ ۳۲۲ھ میں عبیداللہ مہدی اپنی حکومت کے چوبیس سال پورے کر کے فوت ہوا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا ابوالقاسم محمد مہدیہ میں تخت نشین ہوا۔ ابوالقاسم محمد نے اپنا لقب قائم بامراللہ رکھا۔ یہی ابوالقاسم قائم بامراللہ ابوالقاسم نزار کے نام سے بھی مشہور ہے۔

ابوالقاسم نزار:

ابوالقاسم نے تخت نشین ہو کر اول تو ان معمولی بغاوتوں کو جو عبیداللہ کی وفات کی خبر سے برپا ہوئی تھیں، فرو کیا، پھر مراکش کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں موسیٰ بن العافیہ آ کر پھر قابض ہو گیا تھا۔ سنہ ۳۲۴ھ تک سوائے فاس کے تمام ملک مراکش پر ابوالقاسم کی حکومت یا سیادت پھر قائم ہو گئی۔ اس کے بعد ابوالقاسم نے ابن اسحاق نامی ایک سردار کو زبردست بحری فوج اور جنگی بیڑہ دے کر بحر روم کے شمالی ساحلوں پر تاخت و تاراج کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ابن اسحاق نے ساحل پر اتر کر شہر جنیوا تک تاخت و تاراج کر کے جنیوا کو فتح کر لیا، پھر وہاں سے رخصت ہو کر جزیرہ سردانیہ کو فتح کیا۔ اس کے بعد ساحل شام کی طرف متوجہ ہوا اور وہاں کے ساحلی علاقوں کو دھمکیاں دے کر ساحل شام پر جو کشتیاں ملیں، ان کو جلا دیا، پھر ابن اسحاق نے اپنے ایک خادم زیران نامی کو فوج دے کر ساحل مصر کی جانب روانہ کیا۔ زیران نے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مصر سے اخشید کا لشکر آیا۔ اس نے ان لوگوں کو مار کر مغرب کی طرف بھگا دیا۔ ان واقعات کے بعد ابوالقاسم کو ابویزید کے ہنگاموں سے کسی دوسری طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں ملی۔

ابویزید سے جھڑپیں:

ابویزید مخلد بن کیراد کے حالات مختصراً یہ ہیں کہ کیراد نامی ایک شخص شہر قسطلہ کا باشندہ تھا اور تجارت کی غرض سے اکثر سوڈان کے علاقے میں جایا کرتا تھا۔ وہیں اس کا بیٹا ابویزید پیدا ہوا۔ ابویزید نے سوڈان ہی میں پرورش پائی اور وہیں اس کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ اہل سوڈان شیعوں کے مخالف اور خارجی مسلک کی طرف زیادہ مائل تھے۔ ابویزید بھی ان خیالات سے متاثر ہوا۔ اس کے بعد ابویزید مقام تاہرت کی طرف آیا اور معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ ابوعبداللہ شیعی نے ملک بربر میں آ کر اپنا کام شروع کیا تھا۔ ابویزید نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور اپنے عقائد

وخیالات کو شائع کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ ابوعبداللہ شیعی کی کامیابیاں وہ خاموشی سے دیکھتا اور اپنے ہم خیالوں کی ایک جماعت کو قائم رکھ کر ترقی دیتا رہا۔ ابوعبداللہ اور عبیداللہ کو اس کا حال معلوم تھا لیکن اہم معاملات اور جنگی کاموں کے سلسلہ نے ان دونوں کو اس لڑکے کو پڑھانے والے شخص کے مخالفانہ خیالات کی بیخ کنی کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ جب عبیداللہ مہدی کا انتقال ہوا اور ملک میں کچھ ہلچل مچی تو ابویزید نے اپنے خیالات کی اشاعت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے کاموں میں زیادہ مستعدی اور طاقت سے کام لینا شروع کر دیا اور اپنے آپ کو شیخ المومنین کے لقب سے ملقب کیا۔ لوگ کثرت سے آ آ کر اس کے مرید ہونے لگے اور اس نے اپنے مریدوں کی ایک فوج تیار کی۔ شہر باغایہ کے والی کو جب ابویزید کی جنگی تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو اس نے اس پر چڑھائی کی۔ ابویزید نے گورنر باغایہ کو شکست دے کر اور آگے بڑھ کر باغایہ کا محاصرہ کر لیا۔ عرصہ تک محاصرہ جاری رکھا اور جب فتح سے مایوس ہو کر واپس چلا آیا، بربری قبائل اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس نے خلیفہ اندلس ناصر کا خطبہ منبروں پر پڑھا۔ قبائل زناتہ سب اس کے مطیع ہو گئے۔ غرض دم بہ دم ابویزید کی طاقت ترقی کرتی گئی اور ابوالقاسم کے قبضے سے ایک کے بعد دوسرا شہر نکلتا گیا۔ ابوالقاسم نے بڑے بڑے سرداروں اور سپہ سالاروں کو ابویزید کے مقابلے پر روانہ کیا مگر ہر ایک نے ابویزید سے شکست کھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۳۳۳ھ کے ماہ صفر میں ابویزید کی فوجوں نے قیروان پر قبضہ کر لیا اور ابوالقاسم مہدیہ میں محصور وقلعہ بند ہونے پر مجبور ہوا۔ اب ابویزید نے تمام ملک افریقہ میں اپنی فوجیں پھیلا دیں اور قتل وغارت کا بازار گرم ہوا۔ ابوالقاسم کے بعض گورنروں کے قبضے میں جو شہر وعلاقے باقی تھے، ان کو ابوالقاسم نے امداد واعانت کے لیے لکھا۔ اہل کتامہ بھی ابوالقاسم کی امداد پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماہ جمادی الاول سنہ ۳۳۳ھ میں اہل کتامہ کو شکست دے کر ابویزید نے بھگا دیا اور دوسری فوجوں کو بھی جو ابوالقاسم کی حمایت میں مقابلہ پر آئی تھیں، شکست ہوئی۔ ابوالقاسم نے مہدیہ کو خوب مضبوط کر لیا تھا اور وہاں سامان رسد بہت کافی موجود تھا۔ ابویزید نے حملہ کر کے مہدیہ کی شہر پناہ تک اپنی فوجوں کو پہنچا دیا مگر مہدیہ کے اندر داخل نہ ہو سکا۔ ابویزید نے بار بار مہدیہ کا محاصرہ کیا مگر مہدیہ کی فتح پر قادر نہ ہوا۔ سنہ ۳۳۴ھ میں ابویزید مجبور ہو کر قیروان کی طرف لوٹا اور ابوالقاسم کی فوج نے مہدیہ سے نکل کر اس کے لشکر پر چھاپے مارنے شروع کیے۔

وفات:

ربیع الاول سنہ ۳۳۴ھ میں ابویزید کے بیٹے نے مہدیہ پر فوج کشی کی اور محاصرہ کر لیا۔ اسی محاصرہ میں ماہ جمادی الثانی سنہ ۳۳۴ھ میں ابوالقاسم نے مہدیہ میں وفات پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابویزید نے شہر سوسہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔

اسماعیل بن ابوالقاسم:

اسماعیل بن ابوالقاسم نے اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہو کر اپنا لقب المنصور رکھا۔ اسماعیل نے ایوب بن ابویزید کا محاصرہ اٹھا دیا اور جہازوں کے ذریعہ سے ایک فوج سوسہ کی امداد اور ابویزید کا محاصرہ اٹھانے کے لیے روانہ کی۔ ابویزید نے کوشش کی کہ یہ بیڑہ ساحل پر فوج نہ اتار نے پائے مگر اس کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ اس امدادی فوج نے ساحل پر اتر کر اور اہل سوسہ کے ساتھ شامل ہو کر ابویزید کا مقابلہ کیا۔ ابویزید کو شکست ہوئی، اس کی تمام لشکر گاہ لوٹ لی گئی۔ وہ بہ حالت پریشانی قیروان کی طرف آیا۔ یہاں اس کی شکست کا حال سن کر اہل قیروان نے اس کے عامل کو قیروان سے نکال دیا اور ابویزید کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا اور ابوالقاسم کی اطاعت کا اعلان کر دیا۔ ابویزید مجبوراً سبیبہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہ واقعہ آخر ماہ شوال سنہ ۳۳۴ھ کا ہے۔ اس کے بعد اسماعیل بن ابوالقاسم قیروان میں آیا اور اہل شہر کو تسلی دی۔ ماہ ذی قعدہ سنہ ۳۳۴ھ میں ابویزید نے ایک زبردست فوج لے کر قیروان پر حملہ کیا۔ اسماعیل نے مقابلہ کیا اور متعدد لڑائیوں کے بعد پھر محرم سنہ ۳۳۵ھ کو اسماعیل نے شکست کھائی مگر اس نے اپنی منتشر و پراگندہ فوج کو جلد ہی جمع کر کے ۱۵ محرم سنہ ۳۳۵ھ کو ایک عظیم الشان جنگ کے بعد ابویزید کو شکست دی۔ اس شکست سے ابویزید کے کاموں میں اختلال پیدا ہوا۔ وہ شکست خوردہ باغایہ کی طرف گیا۔ اہل باغایہ نے شہر کے دروازے بند کر کے اس کو شہر کے اندر داخل نہ ہونے دیا۔ ابویزید نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔

یہ حال سن کر اسماعیل بن ابوالقاسم فوج لے کر باغایہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہ واقعہ ماہ ربیع الاول سنہ ۳۳۵ھ کا ہے۔ ابویزید نے اسماعیل کے آنے کا حال سن کر باغایہ کو چھوڑ دیا اور ایک دوسرے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ وہاں بھی اس کو کامیابی حاصل نہ ہوئی اور اسماعیل اس کے تعاقب میں پہنچ گیا۔ غرض اسی طرح ابویزید ادھر ادھر پھرتا رہا۔ آخر جبال کتامہ کے قریب ابویزید اور اسماعیل کے درمیان ایک

فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ یہ لڑائی نہایت خون ریز تھی جو ۱۰ شعبان سنہ ۳۳۵ھ کو ہوئی۔ اس لڑائی میں ابو یزید زخمی ہوا اور دس ہزار ہمراہیوں کو میدان جنگ میں قتل کرا کر خود بچ کر نکل گیا اور پھر فوج کو جمع کرنے اور مقابلے کی تیاری میں مصروف رہا۔ اب ایسی حالت تھی کہ ابو یزید کے عامل اور طرف دار قبائل سب یکے بعد دیگرے اپنی اپنی خطاؤں کی معافی طلب کر کے اسماعیل بن ابوالقاسم کے ساتھ شامل ہو گئے تھے اور تمام ملک جو ابو یزید کے تحت وتصرف میں آ چکا تھا، اس کے قبضے سے نکل کر اسماعیل کے قبضے میں آ گیا۔

ابو یزید کی گرفتاری اور وفات:

محرم سنہ ۳۳۶ھ کو سب سے آخری لڑائی ہوئی اور قلعہ کتامہ میں ابو یزید بعد شکست محصور اور اس کے بعد گرفتار ہوا۔ وہ گرفتاری کے وقت خطرناک طور پر زخمی تھا۔ چند ہی روز کے بعد فوت ہو گیا اور اسماعیل نے اس کی کھال نکلوا کر اس میں بھس بھروایا۔ ان واقعات کے بعد اسماعیل قیروان کی جانب آیا لیکن ساتھ ہی اس کے پاس خبر پہنچی کہ ملک مغرب کے عامل حمید بن بصلین نے دولت عبیدیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے خلافت امویہ اندلس کی اطاعت اختیار کر لی ہے۔ اسماعیل فوجیں لے کر اس طرف روانہ ہوا۔ مقام تاہرت پر معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ حمید کو شکست ہوئی۔ اسی حالت میں خبر پہنچی کہ فضل بن ابو یزید نے فوجیں فراہم کر کے باغایہ کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اسماعیل اس طرف متوجہ ہوا۔ فضل کے ہمراہیوں میں سے ایک شخص نے فضل کا سر کاٹ کر اسماعیل کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ واقعہ ربیع الاول سنہ ۳۳۶ھ کا ہے۔ اسماعیل کو اب چند روز کے لیے اطمینان حاصل ہوا۔ سنہ ۳۳۹ھ میں اس نے خلیل بن اسحاق کو جزیرہ صقلیہ کی حکومت سے معزول کر کے حسین بن علی بن ابوالحسین کو صوبہ صقلیہ کی حکومت پر مامور کیا۔ اس کے بعد حسین بن علی کی اولاد نے بالاستقلال اس جزیرہ میں حکومت کی۔

اسماعیل کی وفات:

سنہ ۳۴۰ھ میں اسماعیل نے ایک زبردست جنگی بیڑہ تیار کر کے حاکم صقلیہ حسین بن علی کو لکھا کہ تم بھی شاہی بیڑہ کے ساتھ مہم میں شامل ہونے کے لیے تیار رہو۔ چنانچہ حملہ کر کے ملک اٹلی کا جنوبی حصہ فتح کر لیا گیا اور سنہ ۳۴۲ھ میں یہ فتح مند فوج مع مال غنیمت قیروان اور مہدیہ کی طرف

واپس آئی جبکہ اسماعیل ماہ رمضان سنہ ۳۴۱ھ میں فوت ہو چکا تھا۔

معز بن اسماعیل:

اسماعیل کے بعد اس کا بیٹا معز تخت نشین ہوا۔ اس کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال مراکش کے بعض قبائل بربر نے اس کی حکومت قبول کی۔ سنہ ۳۴۲ھ میں معز نے حسین بن علی گورنر صقلیہ کے پاس حکم بھیجا کہ اپنے جنگی جہازوں کے بیڑہ کو لے کر اندلس کے ساحل مریہ پر حملہ کرو۔ چنانچہ حسین نے اس حکم کی تعمیل کی اور وہاں سے مال غنیمت اور قیدی لے کر واپس ہوا۔ اس کے جواب میں خلیفہ اندلس ناصر لدین اللہ نے اپنے خادم غالب کو ایک بیڑہ جنگی جہازوں کا دے کر حکم دیا کہ ساحل افریقہ پر حملہ کرو مگر معز کی فوج اور جنگی جہازوں نے پہلے ہی اس حملہ کی روک تھام کا بندوبست کر رکھا تھا۔ چنانچہ غالب کو واپس ہونا پڑا۔ اس کے بعد سنہ ۳۴۷ھ میں اندلسی بیڑے نے ساحل افریقہ پر کامیاب حملہ کیا اور تمام ساحلی مقامات اور شہروں کو تاخت و تاراج کر کے تباہ و ویران کر دیا اور بہت سے قیدی اور مال غنیمت لے کر واپس ہوا۔

اس کے بعد معز نے فوجوں کی فراہمی اور ملک کے انتظام کی طرف توجہ منعطف کر کے اپنے مقبوضات کو وسیع کیا۔ معز کے مقبوضہ ممالک کے صوبوں پر مندرجہ ذیل گورنر مامور تھے:

1. صوبہ ایفکان اور تاہرت کی حکومت یعلیٰ بن محمد کے سپرد تھی۔
2. صوبہ اشیر کی حکومت زیری بن مناد صنہاجی کے سپرد تھی۔
3. صوبہ مسیلہ کی حکومت جعفر بن علی اندلسی کے سپرد تھی۔
4. صوبہ باغایہ کی حکومت قیصر صقلی کے سپرد تھی۔
5. صوبہ فاس اور تاہرت کی حکومت احمد بن بکر بن ابی سہل کے سپرد تھی۔
6. صوبہ سجلماسہ کی حکومت محمد بن داسال مکناسی کے سپرد تھی۔

سنہ ۳۴۷ھ کے آخر ایام میں معز کے پاس خبر پہنچی کہ یعلیٰ بن محمد نے امویہ اندلس سے سازش کر لی ہے اور دولت عبیدیہ سے منحرف ہو گیا ہے۔ معز نے جوہر صقلی اپنے کاتب کو یعلیٰ کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ اس کے ساتھ جعفر بن علی گورنر مسیلہ اور زیری بن مناد گورنر اشیر کو بھی شامل ہونے کا حکم ملا۔ یعلیٰ بن محمد بھی مقابلہ کے لیے مستعد ہو گیا۔ ساتھ ہی صوبہ فاس اور صوبہ سجلماسہ کے

گورنروں نے بھی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ آخر بڑی خون ریزی اور جنگ و پیکار کے بعد سنہ ۳۴۸ھ میں یعلیٰ گرفتار ہوا اور فاس وسجلماسہ پر بھی قبضہ حاصل کیا گیا اور صوبہ تاہرت زیری بن مناد کی حکومت میں شامل کیا گیا۔ احمد بن بکر اور محمد بن راسول گرفتار ہو کر قیروان پہنچے۔ سنہ ۳۴۹ھ میں معز نے اپنے خادموں قیصر اور مظفر کو جو معز کے بہت ہی منہ چڑھے ہوئے تھے، قتل کیا۔

اوپر خلفائے عباسیہ کے حالات میں ذکر ہو چکا ہے کہ اندلس کے جلاوطنوں میں سے ایک گروہ نے مصر کے ساحل پر اتر کر اسکندریہ پر قبضہ کرلیا تھا، جبکہ مصر کا گورنر عبداللہ بن طاہر تھا۔ عبداللہ بن طاہر نے ان کا محاصرہ کیا اور اس شرط پر ان کو امان دی کہ وہ حدود مصر سے باہر کہیں چلے جائیں۔ چنانچہ ان اندلسی جلاوطنوں نے اسکندریہ سے روانہ ہو کر جزیرہ قریطش (کریٹ) پر قبضہ کرلیا اور ابوحفص بلوطی کو اپنا بادشاہ بنایا۔ ابوحفص کی اولاد میں اس جزیرہ کی حکومت اب تک چلی آتی تھی۔ سنہ ۳۵۰ میں عیسائیوں نے سات سو جنگی جہازوں کا بیڑہ لے کر اس جزیرہ پر حملہ کیا۔ بڑی خون ریزی ہوئی۔ ہزار ہا مسلمان شہید اور ہزاروں قید وگرفتار ہوئے اور یہ جزیرہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ سنہ ۳۴۵ھ میں قیصر قسطنطنیہ اور معز کی بحری فوجوں میں لڑائی ہوئی۔ عیسائی لشکر کو شکست فاش حاصل ہوئی اور مسلمانوں کی فوج نے عیسائیوں کے کئی شہروں پر قبضہ کر کے اور اپنی فوجیں وہاں اتار کر قیصر قسطنطنیہ کو مجبور کیا کہ وہ معز کو جزیہ وخراج ادا کرے۔ اس کے چند روز بعد معز کو خبر ملی کہ کافور اخشیدی حاکم مصر کی وفات پر مصر کے اندر بدنظمی اور فتنہ وفساد برپا ہوگیا ہے اور خلیفہ بغداد، عضد الدولہ اور بختیار بن معز الدولہ کی خانہ جنگی کے سبب سے مصر کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ معز نے مصر پر فوج کشی کا قصد کیا۔

مصر پر قبضہ:

سنہ ۳۵۵ھ میں معز نے اپنے وزیر اور کاتب جوہر کو ایک زبردست فوج دے کر مصر کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ جوہر راستہ میں ہر مقام پر مناسب انتظام کرتا ہوا آہستگی سے مصر کی طرف بڑھا۔ اخشیدی فوج تاب مقاومت نہ لاسکی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵ شعبان سنہ ۳۵۹ھ کو جوہر نے مصر میں داخل ہو کر جامع مسجد مصر میں معز کے نام کا خطبہ پڑھا۔ ماہ جمادی الاول سنہ ۳۵۹ھ میں جوہر نے جامع ابن طولون میں جا کر نماز ادا کی اور اذان میں ''حی علی خیر العمل'' کا اضافہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ پہلی

اذان تھی جو اس فقرہ کے اضافہ کے ساتھ مصر میں دی گئی۔ تمام ملک مصر پر قابض و متصرف ہو کر اور اخشیدی خاندان کے ارکان کو گرفتار کر کے مع تحف و ہدایا جوہر نے معز کی خدمت میں روانہ کیا۔ معز نے ممبران خاندان اخشیدی کو مہدیہ کی جیل میں قید کر دیا۔ جوہر نے معز کی خدمت میں مصر آنے کی دعوت دی اور اپنے ایک سردار جعفر بن فلاح کتامی کو شائستہ فوج دے کر فلسطین و شام کی طرف روانہ کیا۔ جس زمانے میں جوہر فوج لے کر مصر کی طرف روانہ ہوا تھا، اسی زمانے میں ابوجعفر زناتی نامی ایک شخص نے معز کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ مگر اس بغاوت کو معز نے خود متوجہ ہو کر بہ آسانی فرو کر لیا تھا۔ اب معز کے پاس جوہر کا خط پہنچا کہ تمام ملک مصر دولت عبیدیہ میں شامل ہو گیا ہے اور آپ کو خود یہاں تشریف لانا چاہیے۔ معز نے خوش ہو کر دربار عام منعقد کیا اور مغربی صوبوں کے بندوبست واہتمام سے اطمینان حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ ادھر محرم سنہ ۳۶۰ھ میں جعفر بن فلاح کتامی نے دمشق پر قبضہ کر لیا اور اطمینان سے حکومت کرنے لگا۔ اس خبر کو سن کر معز کو اور بھی زیادہ خوشی حاصل ہوئی اور اس نے قاہرہ کو دارالسلطنت بنانے کا مصمم ارادہ کر کے بلکین بن زیری بن مناد کو افریقہ اور ملک مغرب کا وائسرائے بنا کر قیروان میں قیام کرنے کا حکم دیا اور ابوالفتوح کا خطاب عطا کیا اور اس کے ماتحت موزوں اشخاص کو مقرر و نامزد کر کے آخر شوال سنہ ۳۶۱ھ کو اپنے دارالحکومت مہدیہ سے نکل کر قیروان کے قریب مقام کیا۔

قاہرہ میں دارالسلطنت کی منتقلی:

چند روز کے بعد تمام خزانہ اور سامان بار برداریوں کے ذریعہ سے وہیں آ گئے۔ اس تمام سامان اور لشکر کو لے کر مصر کی طرف روانہ ہوا۔ بلکین بن زیری بطریق مشایعت ساتھ ہوا۔ ایک دو منزل کے بعد بلکین کو قیروان کی طرف رخصت کیا اور خود برقہ کی جانب چلا۔ وہاں سے روانہ ہو کر شعبان سنہ ۳۶۲ھ کو اسکندریہ پہنچا۔ اہل شہر نے استقبال کیا اور عزت واحترام کے ساتھ شہر میں لے گئے۔ وہاں سے روانہ ہو کر ۵ رمضان سنہ ۳۶۳ھ کو قاہرہ میں داخل ہوا۔ معز قیروان سے روانہ ہو کر قریباً ایک سال کے بعد قاہرہ پہنچا۔ جعفر بن فلاح کتامی کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اس نے دمشق کو فتح کر کے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ اس سے پیشتر دمشق پر بنی طغج کی حکومت تھی جو قرامطہ کو خراج ادا کیا کرتے تھے۔ جب جعفر بن فلاح کا دمشق پر قبضہ ہوا تو اس نے قرامطہ کو خراج دینے سے انکار

کیا۔ چنانچہ قرامطہ کے بادشاہ اعصم نے دمشق پر حملہ کیا۔ جعفر نے مقابل ہو کر قرامطہ کو شکست دے دی اور ان کی فوج منتشر ہو کر میدان سے بھاگ گئی۔ اس کے بعد سنہ ۳۶۱ھ میں قرامطہ نے دوبارہ زبردست فوج لے کر دمشق پر حملہ کیا۔ اس مرتبہ بھی جعفر نے مقابلہ کیا اور وہ لڑائی میں مارا گیا۔ دمشق پر قرامطہ کا قبضہ ہو گیا۔ قرامطہ نے دمشق کے بعد رملہ پر قبضہ کیا اور مصر پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگے۔ یہ تمام حالات معز کو دوران سفر میں معلوم ہوئے۔ قاہرہ پہنچ کر اس کو معلوم ہوا کہ قرامطہ نے یافہ کا محاصرہ کر رکھا ہے اور سرحد مصر پر ان کی فوجیں آ آ کر جمع ہو رہی ہیں۔

قرامطہ سے جھڑپیں:

معز نے قاہرہ پہنچتے ہی قرامطہ کے بادشاہ اعصم کو جو اس زمانے میں اپنے دارالحکومت احساء میں مقیم تھا، ایک خط لکھا۔ اس میں لکھا کہ تم لوگ پہلے ہمارے ہی باپ دادا کے مناد بنے ہوئے پھرتے تھے اور ہماری محبت کا دعویٰ کرتے تھے۔ اب مناسب یہی ہے کہ تم ہماری اطاعت وفرماں برداری قبول کرو اور ہمارے مقابلے اور مخالفت کا خیال بالکل ترک کر دو۔ اسی قسم کے مضامین ونصیحتوں سے لبریز ایک طویل خط بھیجا گیا۔ یہ خط جب اعصم کے پاس احساء میں پہنچا تو اس نے اس کے جواب میں معز کو لکھا کہ:

> ”تمہارا خط ہمارے پاس پہنچا جس میں نفس مطلب تو کم اور فضول باتیں زیادہ ہیں۔ ہم تم پر فوج کشی کرنے والے ہیں۔ والسلام“

اعصم نے یہ جواب مصر کی جانب روانہ کر کے فوج کو تیاری کا حکم دیا اور خود فوج لے کر مصر کی طرف روانہ ہوا اور حدود مصر میں داخل ہو کر مقام عین شمس میں قیام کیا۔ یہاں قرامطہ کی تمام فوجیں آ آ کر جمع ہو گئیں۔ حسان بن جراح طائی امیر عرب بھی طے کا بہت بڑا گروہ لے کر اعصم کے پاس پہنچ گیا۔ اعصم وحسان نے باہم مشورہ کر کے اپنی فوج کے دستوں کو ملک مصر کے قصبوں کی تاخت وتاراج کے لیے پھیلا دیا اور اس طرح مصر میں قتل وغارت اور خون ریزی کا بازار گرم ہو گیا۔ معز کو قرامطہ کی کثرت فوج سے بڑا خوف پیدا ہوا۔ قرامطہ نے بہت جلد قاہرہ پر حملہ کیا۔ معز نے قرامطہ کی تیز رفتاری دیکھ کر یہ تدبیر کی کہ حسان بن جراح سے پیام وسلام جاری کر کے اس سے وعدہ کیا کہ ہم ایک لاکھ دینار بہ طور رشوت آپ کو دینے کے لیے تیار ہیں۔ اگر آپ اعصم کو تنہا چھوڑ کر میدان

سے اپنی فوجوں کو واپس لے جائیں۔ چنانچہ حسان اس رشوت کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ قرارداد کے موافق جبکہ معز اپنی فوجیں لے کر میدان میں نکلا اور قرامطہ پر حملہ کیا تو حسان اپنے ہمراہیوں کو لے کر ہٹ گیا یعنی معرکہ جنگ گرم ہوتے ہی مع اپنی فوج کے میدان چھوڑ دیا۔ حسان اور اس کی فوج کے بھاگنے سے اعصم اور اس کی فوج کا دل ٹوٹ گیا۔ مگر تاہم انہوں نے جم کر مقابلہ کیا اور بالآخر شکست کھا کر بھاگے۔ قریباً ڈیڑھ ہزار قرامطہ گرفتار ہوئے۔ معز نے فوراً اپنے سپہ سالار ابومحمد کو دس ہزار فوج دے کر قرامطہ کے تعاقب پر مامور کیا۔ چنانچہ ابومحمد نے ان کو کسی جگہ ٹھہرنے نہیں دیا اور حدود مصر سے نکال کر احساء کی طرف چلے جانے پر مجبور کر دیا۔

دمشق پر قبضہ:

اس فتح کے بعد معز نے قرامطہ کے قیدیوں کو قتل کرا دیا اور دمشق کی حکومت پر ظالم بن موہوب عقیلی کو نامزد کر کے اس طرف روانہ کیا۔ ظالم نے دمشق پہنچ کر قراطہ کے عامل کو گرفتار کر کے مصر بھیج دیا، جہاں وہ جیل خانہ میں قید کر دیا گیا۔ سنہ ۳۶۴ھ تک دمشق پر دولت عبیدیہ کا پرچم لہرایا۔ اسی سال کے ایام حج میں مکہ و مدینہ کے لوگوں نے بھی مجبوراً معز کی حکومت تسلیم کی اور اس کے نام کا خطبہ وہاں پڑھا گیا۔ اہل دمشق عبیدیوں کی حکومت سے خوش نہ تھے۔ چنانچہ سنہ ۳۶۴ھ کے آخر اور سنہ ۳۶۵ھ کے شروع میں افتکین نے جو عزالدولہ بن بویہ کے خدام میں سے تھا، دمشق پر قبضہ کر کے معز کے عامل کو وہاں سے نکال دیا۔ اہل دمشق سب افتکین کی آمد سے بہت خوش ہوئے۔ معز کو جب یہ خبر پہنچی تو اس نے افتکین کو لکھا کہ تم دمشق پر حکومت کرتے رہو اور میں تمہارے پاس سند امارت بھیجے دیتا ہوں۔ میرے نام کا خطبہ پڑھو اور خلیفہ بغداد سے کوئی تعلق نہ رکھو۔ افتکین نے معز کی اس سفارت کو ناکام واپس کر دیا اور دمشق میں خلیفہ بغداد کے نام کا خطبہ بہ دستور جاری رہا اور معز کی حکومت کے تمام علامات کو مٹا دیا گیا۔ معز یہ سن کر سخت طیش میں آیا۔ خود فوج لے کر قاہرہ سے دمشق کی جانب روانہ ہوا۔

وفات:

ابھی مقام بلبیس ہی میں پہنچا تھا کہ ۱۵ ربیع الاول سنہ ۳۶۵ھ کو اس کے لیے پیغام مرگ آ پہنچا اور ۴۵ سال، ۶ مہینے کی عمر میں اپنی حکومت کے تیئیسویں سال فوت ہوا۔ یہ عبیدیوں میں سب سے

پہلا بادشاہ تھا جس نے مصر فتح کیا اور قاہرہ کو دارالسلطنت بنایا۔ یہ مقام مہدیہ میں ۱۱ رمضان سنہ ۳۱۹ھ کو پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نزار تخت نشین ہوا اور ''عزیز باللہ'' کا لقب اختیار کیا۔ اس نے کئی مہینے تک اپنے باپ کے انتقال کی خبر کو پوشیدہ رکھا اور عیدالاضحیٰ کے دن سنہ ۳۶۵ھ کو باپ کی وفات کا اعلان کر کے مراسم تخت نشینی ادا کیے۔

عزیز بن عبیدی

افتگین کی فوج کشی:

معز کی وفات کا حال سن کر افتگین نے فوجیں تیار کر کے حدود مصر پر فوج کشی کی اور مقام صیدا کا محاصرہ کر لیا۔ صیدا میں ظالم بن موہوب اور دوسرے عبیدی سردار موجود تھے۔ انہوں نے مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر بھاگے۔ افتگین نے بڑھ کر عکہ کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد طبریہ پر چڑھائی کی۔ اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد دمشق کی جانب واپس ہو گیا۔ عزیز بن معز نے اپنے وزیر یعقوب بن کلس کے مشورے کے موافق جوہر کاتب کو زبردست فوج دے کر افتگین کے مقابلہ اور دمشق کی فتح کے لیے روانہ کیا۔ جوہر نے ماہ ذیقعدہ سنہ ۳۶۵ھ میں دمشق کا محاصرہ کر لیا اور طرفین سے لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ افتگین نے طول محاصرہ سے تنگ آ کر اعصم بادشاہ قرامطہ کے پاس مقام احساء میں تمام حالات لکھ کر بھیجے اور امداد کی درخواست کی۔ اس خط کے پہنچتے ہی اعصم مع اپنی فوج کے دمشق کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کے قریب پہنچنے کی خبر سن کر جوہر دمشق سے محاصرہ اٹھا کر چل دیا۔ افتگین اور اعصم نے مل کر جوہر کا تعاقب کیا اور مقام رملہ میں جا کر جوہر کو گھیر لیا۔ جوہر رملہ کو مضبوط نہ پا کر عسقلان چلا گیا۔ افتگین اور اعصم نے عسقلان میں جوہر کا محاصرہ کر لیا۔ جوہر نے سخت عاجز ہو کر افتگین سے خط و کتابت شروع کی اور استدعا کی کہ مجھ کو اس محاصرہ سے نکل کر مصر پہنچ جانے دو۔ میں اپنے بادشاہ عزیز بن معز سے آپ کو کافی صلہ دلوا دوں گا۔ افتگین جوہر کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کا حال اعصم کو معلوم ہوا تو افتگین کو نصیحت کی اور کہا کہ جوہر کے دھوکے میں نہ آؤ۔ یہ مصر جا کر اور اپنے بادشاہ کو مع زبردست فوج کے لے کر ہمیں کچل ڈالنے کی کوشش کرے گا، مگر افتگین نہ مانا۔ اس نے جوہر کو نکل جانے کا موقع دے دیا۔ جوہر نے عزیز کے پاس

پہنچ کر اس کو آئندہ خطرات سے آگاہ کیا اور حملہ کی ترغیب دی۔ عزیز نے فوجیں آراستہ کر کے فوراً چڑھائی کی اور جوہر کو اپنی فوج کا مقدمۃ الجیش بنایا۔

افتکین کی گرفتاری اور وزارت:

محرم سنہ ۳۶۷ھ میں عزیز نے اعصم اور افتگین کے مقابل رمل میں مورچے قائم کر دیے۔ اور افتگین کے پاس پیغام بھیجا کہ تم اعصم سے جدا ہو کر میرے پاس چلے آؤ۔ میں تم کو اپنی افواج کا سپہ سالار اعظم بناؤں گا اور جس حصہ ملک کو تم پسند کرو گے، اس کی حکومت تم کو عطا کر دوں گا۔ افتگین نے عزیز کے اس پیغام کو منظور نہ کیا اور اس کی افواج پر حملہ آور ہوا۔ قریب تھا کہ عزیز کی فوج کو شکست ہو مگر اس نے سنبھل کر اور اپنی فوج کو سنبھال کر حملہ کیا۔ بڑی خون ریز جنگ ہوئی، آخر اعصم اور افتگین کی فوج کو شکست ہوئی۔ ان کی فوج کے بیس ہزار آدمی میدان جنگ میں مقتول ہوئے۔ عزیز نے فتح مند ہو کر اعلان کرایا کہ جو شخص افتگین کو زندہ گرفتار کر کے لائے گا، اس کو ایک لاکھ دینار دیے جائیں گے۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک شخص نے دھوکے سے افتگین کو گرفتار کرا کر ایک لاکھ دینار وصول کر لیے۔ عزیز کے سامنے جب افتگین پیش ہوا تو اس نے اس کی بڑی عزت کی اور نہ صرف اپنا مصاحب خاص بنایا بلکہ وزارت عظمیٰ کا عہدہ اس کو عطا کر کے اس کی خوب دل جوئی کی اور ایک شخص کو اعصم بادشاہ قرامطہ کے پاس مقام طبریہ میں بھیجا، جہاں وہ شکست کے بعد مقیم تھا اور پیغام دیا کہ تم میرے پاس آ کر مجھ سے مل جاؤ۔ اس نے جب انکار کیا تو عزیز نے بیس ہزار دینار اس کے پاس بھیجے اور لکھا کہ ہر سال تم کو اسی قدر روپیہ ملا کرے گا، مگر اعصم نے مصر جانے سے انکار کر دیا اور طبریہ سے رخصت ہو کر احساء چلا آیا۔ عزیز، افتگین کو لیے ہوئے قاہرہ چلا گیا۔ افتگین کی چونکہ سب سے زیادہ عزت وتوقیر ہوئی تھی اور وہ وزیر اعظم بن گیا تھا، لہٰذا سابق وزیر اعظم یعقوب بن کلس نے افتگین کو زہر دے کر مار ڈالا۔ عزیز کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے یعقوب کو گرفتار کر کے چالیس روز قید میں رکھا اور پانچ لاکھ دینار جرمانہ وصول کیا۔ اس کے بعد پھر یعقوب کو قلمدان وزارت عطا کر دیا۔

افتگین جب دمشق سے جوہر کے تعاقب میں روانہ ہوا تھا تو قسام نامی ایک شخص کو دمشق کی حکومت پر نیابتاً مقرر کر آیا تھا۔ اس کے بعد افتگین کو دمشق جانے کا موقع ہی نہ ملا۔ قسام کی حکومت وہاں خوب مضبوطی سے قائم ہوگئی تھی۔ جب قسام نے افتگین کے مصر جانے کی خبر سنی تو اس نے

دمشق میں عزیز کے نام کا خطبہ شروع کر دیا تھا۔ اب ان لڑائیوں سے فارغ ہو کر عزیز نے ابومحمود بن ابراہیم کو دمشق کا والی مقرر کر کے روانہ کیا۔ قسام نے ابومحمود کو دمشق میں داخل نہ ہونے دیا۔ عزیز نے قسام کی سرکوبی کے لیے اور فوج بھیجی۔ بکجور خادم سیف الدولہ نے جو حمص پر قابض و متصرف تھا، حاکم مصر کی فوجوں کو رسد پہنچائی۔ ادھر مفرج بن جراح قبیلہ طے کا سردار عربوں کی جمعیت لے کر برسر مقابلہ ہوا۔ چند سال کی معرکہ آرائیوں اور لڑائیوں کے بعد عزیز نے بکجور کو اپنی طرف سے دمشق کا والی مقرر کر دیا۔ بکجور نے دمشق پر قابض ہو کر یعقوب بن مکس وزیر السلطنت مصر کے آوردوں کو اس لیے دمشق سے نکال دیا کہ یعقوب نے بکجور کے والی دمشق بنائے جانے کی مخالفت کی تھی۔ چند روز کے بعد یعقوب نے بکجور کی شکایت کر کے اس کے خلاف عزیز کو آمادہ کر دیا۔ مصر سے فوج آئی اور بکجور نے بعد مقابلہ شکست کھائی۔ ادھر سیف الدولہ نے شام پر چڑھائی کی۔ دوسری طرف بادشاہ قسطنطنیہ نے فوج کشی کی۔ غرض دمشق کا علاقہ سنہ ۳۸۵ھ تک مسلسل لڑائیوں اور خون ریزیوں کا مرکز رہا۔

عزیز کی وفات:

رومی فوجوں کے دمشق کی طرف حرکت کرنے کا حال سن کر عزیز نے سنہ ۳۸۵ھ میں خود قاہرہ سے مع فوج دمشق کی جانب کوچ کیا اور رومیوں کے خلاف جہاد کی منادی کرائی مگر مقام بلبیس میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس کا باپ بھی جب دمشق کے ارادے سے روانہ ہوا تو اسی مقام پر پہنچ کر مرض الموت میں گرفتار ہوا تھا۔ غرض عزیز آخر رمضان سنہ ۳۸۶ھ میں کئی ماہ بیمار رہ کر فوت ہوا اور اس کا بیٹا ابومنصور باپ کی جگہ تخت نشین ہوا اور حاکم بامر اللہ کا لقب اختیار کیا۔

منصور حاکم بن عزیز عبیدی:

منصور الملقب بہ حاکم نے تخت نشین ہو کر امور سلطنت کا اختیار حسن بن عمار کتامی کے ہاتھ میں دے دیا۔ کتامیوں نے برسر اقتدار ہو کر ملک میں لوگوں کو بہت پریشان کیا۔ ادھر دمشق سے دیلمی خاندان کے بعض افراد بھی بہ وجہ شیعہ ہونے کے مصر پہنچ گئے تھے اور دولت عبیدین کی حمایت میں سرفروشی کا اظہار کرنے سے مشرقیوں کی ایک کافی تعداد مصر میں موجود تھی۔ بالآخر مشرقی اور مغربی گروہوں میں خانہ جنگی ہوئی۔ دمشق و حجاز وغیرہ میں بھی بغاوتیں ترقی پذیر رہیں۔ دمشق پر کبھی عرب

قابض ہو جاتے تھے، کبھی ترکی غلام، کبھی مصری سردار۔ غرض مصر، شام، حجاز اور افریقہ میں بدامنی وفساد کی خوب گرم بازاری رہی۔

ولید بن ہشام کا خروج اور اس کا قتل:

اسی اثناء میں ولید بن ہشام المعروف بہ ارکوہ نے خروج کیا۔ اس کا مختصر حال یہ ہے کہ جب اندلس میں منصور بن ابی عامر نے مستولی ومتصرف ہو کر شہزادگان بنو امیہ کی گرفتاری وقتل کا سلسلہ شروع کیا تو بنو امیہ کے آخری خلیفہ کا بیٹا ولید اپنی جان کے خوف سے چھپ کر قیروان چلا آیا تھا۔ یہاں چند روز رہ کر یمن، مکہ وغیرہ ہوتا ہوا شام کے ملک میں آ گیا۔ یہاں بدامنی کا دور دورہ تھا۔ اس نے موقع پا کا یہاں بنو امیہ کی خلافت کے لیے دعوت دینی شروع کی۔ کچھ لوگ اس کے ہم خیال ہو گئے۔ مگر یہاں پوری پوری کامیابی نہ دیکھ کر پھر ملک مصر کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے برقہ کے علاقے میں پہنچا۔ وہاں اس کو اچھی خاصی کامیابی ہوئی۔ حاکم عبیدی کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اول اول اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ چونکہ حاکم عبیدی کی حکومت سے لوگ ناخوش اور نالاں تھے، اس لیے ولید بن ہشام کے گرد قبائل آ آ کر جمع ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے برقہ پر قبضہ کر کے مصر پر چڑھائی کر دی۔ اب حاکم عبیدی کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے فوج مقابلہ کے لیے بھیجی مگر شکست حاصل ہوئی۔ اسی طرح بار بار مصر سے فوجیں گئیں اور شکست کھا کھا کر واپس آئیں۔ قریب تھا کہ تمام ملک افریقہ ومصر پر ولید بن ہشام کا قبضہ وحکومت قائم ہو جائے کہ حاکم عبیدی نے چالاکی سے اس کے بعض سرداروں کو لالچ دے کر اپنی جانب مائل کر لیا اور انہوں نے ولید بن ہشام کو دھوکا دے کر گرفتار کرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاکم عبیدی نے اس کو قتل کرا کر اس کی لاش کو تشہیر کرایا اور اس طرح سنہ ۳۹۷ھ میں اس ہنگامہ کا خاتمہ ہوا۔ چونکہ لوگوں کو عبیدی حکومت سے بہ وجہ اس کے شیعہ ہونے کے نفرت تھی، اس لیے حاکم عبیدی نے ولید بن ہشام کی ہنگامہ آرائیوں کے دوران میں لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے اور سنیوں کے دلوں سے اپنی نفرت دور کرنے کے لیے ایک فرمان اس مضمون کا جاری کیا کہ جس شخص کا جی چاہے، وہ سنی مذہب اختیار کرے اور جس کا جی چاہے، شیعہ مذہب قبول کرے۔ اسی طرح جس کا جی چاہے، اذان میں ''حی علی خیر العمل'' پکارے اور جس کا جی چاہے، نہ پکارے۔ مذہب کے معاملے میں کسی پر کسی قسم کا تشدد نہ کیا جائے گا۔

حاکم کی موت:

حاکم عبیدی تاثیر کواکب کا قائل اور علم نجوم کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اس نے کوہ مقطم (متصل قاہرہ) پر ایک مکان بنوا رکھا تھا۔ وہاں کواکب کی روحانیت جذب کرنے اور اعمال عبادت بجا لانے کے لیے تنہا جایا کرتا تھا۔ چنانچہ ۲۷ ماہ شوال سنہ ۴۱۱ھ کو حسب دستور رات کے وقت اپنے گدھے پر سوار ہو کر چلا، دو سوار ساتھ ہو لیے۔ اس نے تھوڑی دور چل کر یکے بعد دیگرے دونوں کو واپس کر دیا اور خود کوہ مقطم کی طرف تنہا چلا گیا۔ چند روز تک واپس نہ آیا۔ اراکین سلطنت واپسی کے انتظار میں رہے۔ جب کئی دن گزر گئے تو اراکین سلطنت اس کی تلاش میں نکلے۔ کوہ مقطم پر چڑھتے ہی اول اس کی سواری کا گدھا دست و پا بریدہ مردہ ملا۔ اس کے بعد آگے بڑھے تو اس کا لباس ملا جس میں خون اور چھریوں سے زخمی کرنے کی علامات موجود تھیں۔ اس کی لاش نہیں ملی۔ حاکم عبیدی کے قتل کی نسبت ایک دوسری روایت یہ ہے کہ حاکم کی بہن کا بعض غیر مردوں سے ناجائز تعلق تھا۔ اس کی اطلاع ہونے پر حاکم نے بہن کو ڈانٹا۔ اس نے اس کے جواب میں کتامی سرداروں کو بلا کر حاکم کے بدعقیدہ اور لا مذہب ہونے کی شکایت کر کے حاکم کے قتل کی سازش کی۔ چنانچہ کتامی سرداروں نے حاکم کو موقع پا کر قتل کر دیا۔ حاکم شب پنج شنبہ ۲۳ ربیع الاول سنہ ۳۷۵ھ کو پیدا ہوا تھا۔ چھتیس سال کی عمر میں فوت ہوا۔ حاکم کے قتل کا یقین ہو جانے کے بعد اراکین سلطنت نے حاکم کے نوعمر و نابالغ بیٹے علی کو تخت نشین کیا۔ علی کا لقب ظاہر لدین اللہ تجویز کیا گیا اور امور جہاں بانی ظاہر کی پھوپھی یعنی حاکم کی بہن کے ہاتھ میں آئے۔ حاکم متلون مزاج، سخت گیر شخص تھا۔

ظاہر بن حاکم عبیدی:

چار برس کے بعد ظاہر کی پھوپھی مر گئی اور ظاہر اراکین سلطنت کی مدد سے حکومت کرنے لگا۔ سنہ ۴۲۰ھ میں شام و دمشق پر صالح بن مرداس نے قبضہ کر کے عبیدی حکومت کو وہاں سے مٹا دیا۔ ظاہر نے زریری حاکم فلسطین کو اس طرف حملہ کرنے کا حکم دیا۔ زریری نے دمشق و شام پر قبضہ کیا مگر لڑائیوں اور بغاوتوں کا سلسلہ ملک شام میں برابر جاری رہا۔

وفات:

یہاں تک کہ ۱۵ شعبان سنہ ۴۲۷ھ کو ظاہر نے وفات پائی۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا ابوتمیم معد تخت

نشین ہوا۔ اس کا لقب مستنصر رکھا گیا۔ ظاہر کے زمانے میں ابوالقاسم علی بن احمد وزیر اعظم تھا۔ اب مستنصر کے تخت نشین ہونے پر ابوالقاسم وزیر السلطنت نے امور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

مستنصر بن ظاہر عبیدی:

مستنصر کے عہد حکومت میں سنہ ۴۳۳ھ میں شام و دمشق پر عرب قبائل نے قبضہ کر لیا اور یہ ملک حکومت عبیدیہ سے نکل گیا۔ سنہ ۴۴۰ھ میں معز بن بارلیس نے افریقہ میں علم بغاوت بلند کر کے خلیفہ بغداد کا خطبہ جاری کر دیا۔ اسی اثناء میں وزیر ابوالقاسم کو مستنصر نے معزول کر کے حسین بن علی تازوری کو قلمدان وزارت عطا کی اور عربوں کی ایک جمعیت کو جن میں رعبہ، رباح اور بطون ہلال کے افراد شامل تھے، افریقہ کی جانب روانہ کیا۔ ان لوگوں نے علاقہ برقہ میں پہنچ کر طرح اقامت ڈال دی اور افریقہ پر حملہ آور ہونے کا خیال ترک کر دیا۔ مستنصر نے یہ دیکھ کر غلاموں کی خریداری شروع کر دی اور تیئیس ہزار غلام خرید لیے۔ ادھر مذکورہ عرب قبائل نے برقہ میں طرح اقامت ڈالنے کے بعد بہ طور خود پیش قدمی کر کے سنہ ۴۴۶ھ میں طرابلس پر قبضہ کر لیا اور بنو رعبہ نے وہاں اپنی حکومت قائم کی۔ بنو رباح نے مقام اتیج میں اپنی حکومت قائم کی۔ بنو عدی نے تمام ملک افریقہ میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا، پھر ان عرب سرداروں نے ایک سفارت معز بن بارلیس کی خدمت میں بھیجی۔ معز نے اس سفارت کی خوب مدارات و خاطر کی اور اس کو امید ہوئی کہ اب یہ اپنی لوٹ مار اور قتل و فساد سے باز رہیں گے، مگر انہوں نے اپنے اس پیشہ کو ترک نہ کیا۔ چنانچہ معز بن بارلیس نے صنہاجہ وغیرہ قبائل بربر کے تیس ہزار آدمیوں کو ہمراہ لے کر ان عربوں کی سرکوبی کا عزم کیا۔ عرب جو اس کے مقابلے میں آئے، صرف تین ہزار تھے مگر لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ معز کو شکست فاش حاصل ہوئی۔ معز بن بارلیس نے فرار ہو کر قیروان میں پناہ لی۔ اس کے بعد معز نے پھر قبائل بربر کی زبردست فوج لے کر ۱۰ ذی الحجہ سنہ ۴۴۶ھ کو عید الاضحیٰ کے دن عربوں پر حملہ کیا۔ اس مرتبہ بھی اس کو شکست ہوئی۔ تیسری مرتبہ اس نے پھر حملہ کیا اور اس مرتبہ بھی عرب فتح مند ہوئے اور قیروان تک معز کا تعاقب کیا اور شہر باجہ پر عربوں کے سردار یونس بن یحییٰ کا قبضہ ہو گیا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ معز بن بارلیس سنہ ۴۴۹ھ میں قیروان کو چھوڑ کر مہدیہ چلا گیا اور یونس بن یحییٰ نے قیروان پر قبضہ کر لیا۔

خانہ جنگی:

ادھر قاہرہ کی یہ حالت تھی کہ مستنصر کی ماں اپنے بیٹے سے جو حکم چاہتی تھی، صادر کرا دیتی تھی۔ اس طرح اس کا اثر و اقتدار بہت ترقی کر گیا تھا۔ دوسری طرف وزرائے سلطنت اپنی حفاظت کو مدنظر رکھ کر شاہی فوج میں ترکوں کو بھرتی کرتے رہتے تھے۔ اس طرح فوج میں تین زبردست طاقتیں موجود تھیں۔ ایک جمع و دانی غلاموں کی طاقت تھی۔ یہ لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ دوسرے کتامی اور بربری لوگ تھے۔ ان کی تعداد کم تھی۔ تیسرا گروہ ترکوں کا تھا۔ یہ تعداد میں غلاموں سے کم تھے مگر جنگی استعداد ان میں زیادہ تھی۔ اتفاق سے ایک غلام ناصر الدولہ بن حمدان سودانی ترقی کر کے امراء وارا کین دولت کی حمایت سے سپہ سالاری کے درجہ تک پہنچ گیا اور ترکوں کا لیڈر اور سردار بن گیا۔ سلطنت کے اعضاء کٹ کٹ کر خود مختار ہو چکے تھے اور ارا کین سلطنت اور مستنصر کی والدہ اور مستنصر سب قاہرہ کے اندر ایک دوسرے کی طاقت کو گھٹانے اور زیر کرنے میں مصروف تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں اور غلاموں میں خانہ جنگی نمودار ہوئی اور مستنصر عبیدی کی فوج کے دو حصے ہو کر آپس میں لڑنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں کے ہاتھ سے ہزار ہا غلام مارے گئے اور ناصر الدولہ ترکوں کا سردار سب پر غالب ہو گیا اور اس نے مستنصر کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے حسب منشاء امور سلطنت طے کرنے شروع کیے۔ مستنصر نے اپنی حالت سقیم کو تبدیل کرنے کے لیے اپنے غلام بدر جمالی ارمنی الاصل کو جو عکہ میں برسر حکومت تھا، اشارہ کیا۔ بدر جمالی نے عکہ میں ارمنی لوگوں کی بھرتی جاری کر دیا اور ایک زبردست ارمنی فوج لے کر بہ راہ دریا جہازوں میں سوار ہو کر مصر میں داخل ہوا اور مستنصر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مستنصر نے اس کو قلم دان وزارت عطا کیا اور چند ترکوں کو سمجھایا کہ ناصر الدولہ نے تم کو بلا وجہ جنگ و جدل کی مصیبت میں پھنسایا ہے۔ ترکوں نے خلیفہ کا یہ اشارہ پا کر اور اپنی آئندہ بہبود منظر رکھ کر ناصر الدولہ کو خود ہی دھوکے سے قتل کر دیا۔ اب بدر جمالی ترکوں کا سردار بن گیا۔ بدر جمالی نے خوب طاقتور ہو کر سلطنت کے تمام شعبوں اور صیغوں پر مستولی ہونے کے بعد وفاداری کے ساتھ سلطنت کے اعتماد و وقار کو بڑھایا۔ باغی سرداروں کو اطاعت پر مجبور کیا۔ جو شہر قبضے سے نکل گئے تھے، ان کو واپس فتح کرنے کی تدبیروں میں مصروف ہوا۔ طرابلس کو بھی عربوں سے چھین لیا۔ فلسطین کے تمام علاقے کو بھی حکومت میں شامل کیا۔ دمشق کی حالت یہ تھی کہ

وہاں جو شخص قابو پاتا تھا، قابض ہو جاتا تھا، مگر خطبہ مصر کے بادشاہ عبیدی کا پڑھواتا تھا۔ دربار قاہرہ اسی کو غنیمت جانتا تھا۔ سنہ ۴۶۸ھ میں جبکہ بدر جمالی نے مستنصر کی حکومت کے بگڑے ہوئے کام کو بہت کچھ سنبھال دیا تھا، دمشق پر امیر اقدس نے حملہ کر کے اپنا قبضہ جمایا اور بجائے بادشاہ مصر کے خلیفہ بغداد کے نام کا خطبہ مصر میں پڑھا گیا۔ سنہ ۴۶۹ھ میں اتسز ابن افق نامی سردار نے جو سلجوقی لشکر کا ایک سپہ سالار تھا، دمشق پر حملہ کیا۔ یہ خبر سنتے ہی مصر سے بدر جمالی نے دمشق کی طرف فوج روانہ کی۔ اہل دمشق نے اتسز ا کی حکومت قبول کر لی تھی کہ اتنے میں مصری لشکر نے آ کر دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ سنہ ۴۷۰ھ میں سلطان ملک شام سلجوقی نے تتش سلجوقی کو بلاد شام کی حکومت سپرد کر کے یہ حکم دیا کہ تم ملک شام کا جس قدر حصہ فتح کر لو گے، وہ تمہارا ملک سمجھا جائے گا۔ چنانچہ تتش نے حدود شام میں داخل ہو کر حلب پر فوج کشی کی۔ اہل حلب نے مدافعت کی اور تتش نے حلب کا محاصرہ کر لیا۔ ادھر دمشق میں اتسز ا ابھی تک مصری لشکر کے محاصرے میں تھا۔ اس نے تتش کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ میرا مصری فوجوں نے محاصرہ کر رکھا ہے، اگر آپ میری مدد نہ کریں گے تو میں مجبوراً دمشق ان کے حوالے کر دوں گا۔ تتش نے فوراً دمشق کی جانب کوچ کر دیا۔ تتش کے آنے کی خبر سن کر مصری لشکر دمشق سے محاصرہ اٹھا کر مصر کی طرف بھاگ گیا۔ تتش نے دمشق پہنچ کر اتسز ا کو قتل کیا اور خود دمشق پر قابض و متصرف ہو گیا۔ یہ واقعہ سنہ ۴۷۱ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ اس کے بعد حلب پر بھی تتش کا قبضہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ تمام ملک شام اس کے قبضے میں آ گیا۔ یہ حالات سن کر بدر جمالی نے مصر میں فوجیں جمع کیں اور ایک لشکر جرار لے کر دمشق پر حملہ آور ہوا مگر تتش کے مقابلے میں ناکام رہ کر واپس ہوا۔ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ مصری فوجوں نے شام پر حملہ کیا مگر ناکام واپس گئیں۔ سنہ ۴۸۴ھ میں جزیرہ صقلیہ کو عیسائیوں نے مسلمانوں کے قبضے سے نکال لیا۔ ماہ ربیع الاول سنہ ۴۸۷ھ میں بدر جمالی نے اسّی سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کے بعد ۸ ذی الحجہ سنہ ۴۸۷ھ کو مستنصر عبیدی بھی فوت ہو گیا۔ مستنصر کا ابتدائی زمانہ بہت خطرناک تھا۔ اس کی سلطنت کے مٹنے اور دولت عبیدیین کے فنا ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی کہ بدر جمالی نے اس سلطنت کو برباد ہونے سے بچا لیا۔ مستنصر کے تین بیٹے تھے: احمد، نزار اور ابوالقاسم۔ مستنصر نے نزار کو اپنا ولی عہد بنایا تھا۔

حسن بن صباح کی مستنصر سے بیعت:

کہتے ہیں کہ مستنصر کے عہد حکومت میں حسن بن صباح عراق سے سوداگروں کے لباس میں وارد مصر ہوا اور مستنصر کی خدمت میں حاضر ہو کر مستنصر سے بیعت ہوا اور عرض کیا کہ میں آپ کے بعد کس کو امام مانوں؟ مستنصر نے کہا کہ میرے بعد میرا بیٹا نزار تمہارا امام ہوگا۔ اس کے بعد حسن بن صباح نے مستنصر سے اجازت طلب کی کہ ملک عراق میں آپ کی خلافت و امامت کی تبلیغ کروں۔ مستنصر نے اس کو اجازت دی اور اپنا داعی بنا کر روانہ کیا۔ حسن بن صباح نے عراق میں آ کر دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا اور رفتہ رفتہ قلعہ الموت پر قابض ہو گیا۔ حسن بن صباح اور اس کی قائم کی ہوئی سلطنت کا حال آگے اپنے موقع پر بیان ہوگا۔ مستنصر نے بدر جمالی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے محمد ملک کو وزارت کا عہدہ عطا کیا تھا۔ محمد ملک اور نزار کے درمیان ناراضی تھی۔ اس لیے مستنصر کی وفات کے بعد محمد ملک نے مستنصر کی بہن کو اس بات پر رضا مند کر لیا کہ تخت سلطنت پر ابوالقاسم کو بٹھایا جائے۔ چنانچہ مستنصر کی بہن نے محمد ملک کی خواہش کے موافق اراکین سلطنت کے سامنے اس بات کی گواہی دی کہ مستنصر نے اپنے بعد ابوالقاسم کے تخت نشین ہونے کی وصیت کی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے ابوالقاسم کے ہاتھ پر حکومت کی بیعت کی اور ''مستعلی باللہ'' کے لقب سے اس کو تخت پر بٹھایا۔

ابوالقاسم مستعلی عبیدی:

مستعلی کے تخت نشین ہونے سے تین روز بعد نزار قاہرہ سے روانہ ہو کر اسکندریہ چلا گیا۔ اسکندریہ میں بدر جمالی کا غلام نصیر الدولہ افتگین وہاں کا عامل و حکمراں تھا۔ وہ یہ سن کر کہ ابوالقاسم تخت نشین ہوا ہے، باغی ہو گیا اور نزار کو مستحق حکومت سمجھ کر اس کا موید بن گیا۔ نصیر الدولہ نے اسکندریہ میں نزار کو تخت نشین کرا کر اس کی بیعت کی اور ''مصطفیٰ لدین اللہ'' کا لقب مقرر کیا۔ یہ خبر قاہرہ میں پہنچی تو وزیر السلطنت محمد ملک فوج لے کر نزار کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا اور جا کر اسکندریہ کا محاصرہ کر لیا۔ شدت محاصرہ سے تنگ آ کر محصورین نے امن کی درخواست کی اور اسکندریہ محمد ملک کے سپرد کر دیا۔ وزیر السلطنت محمد ملک نے نزار کو گرفتار کر کے قاہرہ بھیج دیا۔ مستعلی نے نزار کو بلا توقف قتل کرا دیا۔ اس کے بعد وزیر السلطنت اپنے ہمراہ نصیر الدولہ افتگین کو لیے ہوئے قاہرہ پہنچا۔

مستعلی نے افتگین کو بھی قتل کرا دیا۔ اس کے بعد کسیلہ نامی ایک شخص جو شہر صور کا والی تھا، باغی ہو گیا۔ اس کی سرکوبی کے لیے فوج روانہ ہوئی۔ بڑی خون ریزی کے بعد کسیلہ گرفتار ہو کر قاہرہ آیا اور مستعلی کے حکم سے مقتول ہوا۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ شام کا تمام ملک تاج الدولہ تتش سلجوقی کے قبضے میں آ چکا تھا۔ تاج الدولہ تتش کی وفات کے بعد تتش کے دونوں لڑکوں وقاق اور رضوان میں خانہ جنگی برپا ہو گئی تھی۔ وقاق دمشق پر قابض تھا اور رضوان نے حلب پر قبضہ کر لیا تھا۔ بیت المقدس کی حکومت پر وقاق فی لانی کی طرف سے سلیمان بن ارتق مامور تھا۔ سنہ ۴۹۰ھ میں یورپ کے عیسائیوں نے جن میں بڑے بڑے بادشاہ بھی شامل تھے، متحد ہو کر بیت المقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے نکالنے کے لیے حملہ کیا۔ ان صلیبی حملہ آوروں نے آتے ہی انطاکیہ کا محاصرہ کیا۔ انطاکیہ میں ان دنوں ایک سلجوقی باغیسان نامی مامور تھا۔ وہ عیسائیوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور انطاکیہ کو چھوڑ کر فرار ہوا۔ راستے میں کسی ارمنی نے اس کو مار ڈالا اور سر اتار کر صلیبی لشکر میں لے آیا۔ انطاکیہ کے اس طرح نکل جانے اور باغیسان کے مارے جانے سے ملک شام میں ہلچل مچ گئی۔ کرلوقا نامی سلجوقی سردار جو موصل کا والی تھا، عیسائی حملہ آوروں کی طرف بڑھا اور مرج وابق میں پہنچ کر پڑاؤ کیا۔ یہ سن کر وقاق بن تتش، سلیمان بن راتق طغتگین والی حمص بھی اپنی اپنی فوجیں لے کر بوقا کے پاس پہنچ گئے اور سب مل کر انطاکیہ کی طرف عیسائیوں کے مقابلہ کو بڑھے۔ عیسائی لشکر کے مقابلہ میں ان مسلمان سرداروں کی متحدہ فوج بے حقیقت اور نہایت قلیل تھی، سخت معرکہ آرائی کے بعد مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ ہزارہا مسلمان شہید ہوئے۔ عیسائیوں نے ان کی لشکر گاہ کو لوٹ لیا۔ اس کے بعد عیسائیوں نے حمص پر قبضہ کیا، پھر عکہ کا محاصرہ کر لیا۔ عکہ کی ترکی سلجوقی فوج نے بڑی بڑی سختیاں برداشت کیں اور مدافعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

ابھی عیسائیوں نے عکہ کا محاصرہ کر رکھا تھا اور شام کے تمام مسلمانوں کی توجہ اس طرف منعطف تھی کہ زبردست مستعلی کے وزیر محمد ملک نے مصری فوج لے کر بیت المقدس پر حملہ کر دیا۔ شیعوں کا یہ حملہ عیسائیوں کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا اور شام کی اسلامی فوج بہ یک وقت ان دونوں زبردست حملہ وروں کا مقابلہ نہ کر سکی۔ سلیمان اور ایلغازی بیت المقدس میں شیعوں کی مصری فوج کے مقابلے میں مصروف ہو گئے اور عکہ پر عیسائیوں کے حملہ کی روک تھام میں کوئی مدد نہ پہنچا

سکے۔ ادھر جو لوگ عیسائیوں کے مقابلے پر ڈٹے ہوئے، وہ بیت المقدس والوں کے پاس کوئی کمک نہ بھیج سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیت المقدس پر مصر کے وزیر السلطنت کا قبضہ ہو گیا اور سلیمان وایلغازی وہاں سے مشرق کی جانب چلے گئے۔ مصریوں کو دیر تک بیت المقدس پر قبضہ رکھنا نصیب نہ ہوا۔

عیسائیوں نے ۲۳ شعبان سنہ ۴۹۲ھ کو چالیس روز کے محاصرے کے بعد بیت المقدس کو فتح کر لیا۔ شہر میں گھس کر عیسائی فتح مندوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا۔ مسلمانوں نے محراب عیسیٰ علیہ السلام میں پناہ لی کہ یہاں عیسائی قتل سے باز رہیں گے مگر انہوں نے وہاں بھی ان کو قتل کیا۔ مسجد اقصیٰ اور صخرہ سلیمان میں ستر ہزار مسلمان شہید کیے گئے۔ مسجد اقصیٰ کا تمام قیمتی سامان، قندیلیں جو چاندی اور سونے کی تھیں، سب لوٹ لیں۔ اس ہنگامہ میں لا تعداد مسلمان شہید ہوئے۔ بیت المقدس کے جس قدر مسلمان کسی نہ کسی طرح بچ کر بھاگ سکے، وہ بہ حالت پریشان بغداد پہنچے اور وہاں عیسائیوں کے ان مظالم اور مسلمانوں کی بربادی کا حال خلیفہ بغداد کو سنایا۔ خلیفہ نے برکیارق، محمد، سنجر وغیرہ سلاطین سلجوقیہ کے پاس پیغام بھیجا کہ ملک شام کو بچاؤ۔ مگر یہ آپس کی خانہ جنگیوں میں ایسے مصروف تھے کہ اس طرف متوجہ نہ ہو سکے اور ملک شام کو عیسائیوں نے خاک بنا ڈالا۔ وزیر السلطنت مصر جس نے مسلمانوں کے قبضے سے بیت المقدس کو لے کر عیسائیوں کے ہاتھ فتح کرایا، یہ خبر سن کر مصر سے فوج لے کر چلا کہ بیت المقدس کو عیسائیوں سے فتح کرے لیکن عیسائیوں نے اس کے آنے کی خبر سن کر آگے بڑھ کر مصری فوج کو شکست فاش دے کر بھگایا اور بھاگتے ہوؤں میں سے بھی کسی کو بچ کر نہ جانے دیا۔ چند آدمیوں کے ساتھ وزیر السلطنت مصر پہنچا۔ اس کے بعد عیسائیوں نے عسقلان کا محاصرہ کیا اور ایک ہزار دینار تاوان لے کر وہاں سے واپس ہوئے۔

وفات:

۱۵ ماہ صفر سنہ ۴۹۵ھ کو مستعلی نے وفات پائی اور اس کا بیٹا ابو علی جس کی عمر پانچ سال کی تھی، تخت سلطنت پر بٹھایا گیا اور ''آمر باحکام اللہ'' اس کا لقب مقرر کیا گیا۔

ابو علی آمر عبیدی:

ابو علی کی تخت نشینی کے بعد مہمات سلطنت تمام و کمال وزیر السلطنت کے ہاتھ میں گئیں، اگرچہ پہلے بھی وہ سیاہ و سفید کا مختار تھا اور مستعلی اس کے خلاف کچھ نہ کرتا تھا۔ سنہ ۴۹۶ھ میں

وزیرالسلطنت نے فوجیں آراستہ کر کے اپنے باپ بدر جمالی کے غلام سعدالدولہ کی سرداری میں عیسائیوں کے مقابلہ کو روانہ کیں۔ مقام رملہ اور یافہ کے درمیان جنگ ہوئی۔ مصریوں کی لشکرگاہ کو لوٹ لیا اور بہت سوں کو گرفتار کیا۔ وزیرالسلطنت کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے بیٹے شرف المعالی کو ایک نہایت زبردست فوج دے کر روانہ کیا۔ رملہ کے قریب لڑائی ہوئی۔ اس معرکہ میں عیسائیوں کو شکست ہوئی۔ شرف المعالی نے بڑھ کر رملہ کا محاصرہ کرلیا۔ پندرہ یوم کے محاصرے کے بعد رملہ فتح ہوا۔ چار سو عیسائی مقتول اور تین سو گرفتار ہوئے۔ عیسائی سردار رملہ سے یافہ چلا گیا اور بیت المقدس کی زیارت کے لیے جو عیسائی یورپ سے ابھی آئے تھے، ان کو ہمراہ لے کر شرف الملک کی طرف بڑھا۔ شرف الملک عیسائیوں کے حملہ کی خبر سن کر بلا جنگ مصر کی طرف چلا گیا۔ عیسائیوں نے آگے بڑھ کر عسقلان پر بلا مقابلہ ومقاتلہ قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد مصری فوج نے پھر حملہ کیا اور عسقلان کو عیسائیوں سے چھین لیا۔ یہ ذی الحجہ سنہ ۴۹۶ھ کا واقعہ ہے۔

اس کے بعد سنہ ۴۹۸ھ میں پھر ایک مرتبہ مصری فوجیوں نے عیسائیوں پر حملہ کیا اور دمشق کی ترکی فوج نے بھی مصری فوج کا ساتھ دیا، مگر اس لڑائی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ساحل شام کے شہروں میں طرابلس، صور، صیدا اور بیروت مصری حکومت کے ماتحت تھے۔ سنہ ۵۰۳ھ میں عیسائیوں کے جنگی بیڑے آئے اور انہوں نے ان تمام شہروں کو یکے بعد دیگرے فتح کر کے تمام ساحل شام پر اپنے قبضہ کو مکمل کرلیا۔ عیسائیوں نے بیت المقدس کو فتح کر کے وہاں اپنا ایک بادشاہ مقرر کیا اور ملک شام کا جس قدر علاقہ انہوں نے فتح کرلیا تھا، وہ سب بیت المقدس کی اس عیسائی سلطنت میں شامل ہوا۔ اس طرح ملک شام کے اندر ایک چھوٹی سی عیسائی سلطنت قائم ہوگئی تھی اور وہ اس لیے بہت زبردست تھی کہ اس کو مسلسل براعظم یورپ کے ملکوں سے فوجی ومالی امداد پہنچتی رہتی تھی۔ ان عیسائیوں کے مقابلے میں مصر کی سلطنت عبیدی سے کچھ نہ ہو سکا۔ حالانکہ عیسائیوں نے زیادہ تر انہیں شہروں اور اسی حصہ ملک پر قبضہ کیا تھا جو سلطنت مصر کے قبضے میں تھا۔ دمشق کو جو سلجوقی سرداروں کی حکومت میں تھا، عیسائی فتح نہ کر سکے اور نہ ان کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ ملک شام کے مشرقی حصے کی طمع کریں۔ سلجوقی سردار اور سلجوقی سلاطین اس زمانے میں خانہ جنگیوں میں مصروف تھے۔ اگر وہ اپنی خانہ جنگیوں کو ملتوی کر کے عیسائیوں کی طرف متوجہ ہو جاتے تو بڑی آسانی سے ان کو مار کر نکال دیتے اور بیت المقدس میں ان کے قدم نہ جمنے دیتے۔ بہرحال عیسائیوں کی سلطنت یا ریاست

شام کے مغربی ساحل پر اس لیے قائم ہو سکی کہ سلجوقی امراء آپس میں لڑ رہے تھے اور مصر کی دولت عبیدیہ نے اپنی کمزوری اور ناعاقبت اندیشی سے عیسائیوں کو چیرہ دستی کا موقع دیا۔

سنہ ۵۱۵ھ میں آمر عبیدی نے وزیر السلطنت کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو ناپسند کر کے اسے دھوکے سے قتل کر دیا اور ایک دوسرا وزیر مقرر کر کے اس کو جلال الاسلام کا خطاب دیا۔ چار سال کے بعد جلال الاسلام سے بھی ناراض ہوا اور سنہ ۵۱۹ھ میں جلال الاسلام، اس کے بھائی موتمن اور اس کے ہوا خواہ نجیب الدولہ کو بھی قتل کر دیا۔

آمر عبیدی کا قتل:

آخر سنہ ۵۲۴ھ میں قرامطہ یا فدائیوں کے ایک گروہ نے سواری کے وقت حملہ کر کے آمر عبیدی کو قتل کر دیا۔ چونکہ اس نے کوئی بیٹا نہ چھوڑا تھا، اس لیے اس کے چچازاد بھائی عبدالمجید نے تخت نشین ہو کر اپنا لقب ''حافظ لدین اللہ'' رکھا۔ لوگوں نے حافظ لدین اللہ کے ہاتھ پر اس شرط کے ساتھ بیعت کی کہ آمر کی حاملہ بیوی کے پیٹ سے اگر لڑکا پیدا ہوا تو وہ مستحق حکومت سمجھا جائے گا۔

حافظ عبیدی:

حافظ عبیدی نے تخت نشین ہو کر یکے بعد دیگرے بہت سے وزیروں کو قتل کیا۔ ہر ایک وزیر موقع پا کر اور امور سلطنت پر مستولی ہونے کے بعد مخالفت کا اظہار کرتا اور قتل ہوتا تھا۔ آخر اس نے اپنے بیٹے کو وزیر بنایا۔ اس نے بھی موقع پا کر باپ کے خلاف خود تخت نشین ہونے کی سازش و کوشش کی۔ آخر حافظ عبیدی نے رضوان نامی ایک سنی المذہب کو اپنا وزیر بنایا۔ کچھ دنوں کے بعد رضوان بھی شیعوں اور امامیوں کی مسلسل مخالفتوں کے باعث اس عہدے سے دست کش ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۵۴۳ھ کا ہے۔ اس کے بعد حافظ عبیدی نے کسی کو اپنا وزیر نہیں بنایا۔

وفات:

آخر سنہ ۵۴۴ھ میں حافظ لدین اللہ ستر سال کی عمر میں فوت ہوا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا ابو منصور اسماعیل تخت نشین ہوا اور ''ظافر باللہ'' اپنا لقب تجویز کیا۔

ظافر بن حافظ عبیدی:

ظافر نے تخت نشین ہو کر عادل بن سلار کو اپنا وزیر بنایا۔ عادل نے نظم و نسق سلطنت اپنے ہاتھ

میں لے کر ظافر کو شاہ شطرنج بنا دیا۔ سنہ ۵۴۸ھ میں عیسائیوں نے عسقلان کا محاصرہ کیا۔ اہل عسقلان نے محصور ہوکر دربار قاہرہ میں امداد و اعانت کی درخواست بھیجی۔ یہاں سے وزیرالسلطنت عادل نے اپنے ربیب عباس بن ابوالفتوح کو فوج دے کر عسقلان سے عیسائیوں کا محاصرہ اٹھانے کی غرض سے روانہ کیا۔ یہاں ظافر اور عباس میں یہ سازش ہوگئی تھی کہ عادل کو قتل کیا جائے۔ چنانچہ عباس خود فوج لے کر بلبیس میں جا کر مقیم ہوا۔ ادھر عباس کے نوعمر بیٹے نصیر نے عادل کا سوتے ہوئے کام تمام کردیا۔ عادل کے قتل کی خبرسن کر عباس قاہرہ میں واپس چلا آیا اور قلمدان وزارت اس کو سپرد ہوا۔ اہل عسقلان کی کسی نے خبر نہ لی۔ انہوں نے مجبور ہوکر اپنے آپ کو عیسائیوں کے حوالے کر دیا اور عیسائیوں نے عسقلان پر قابض ہوکر دولت عبیدیہ کی کمزوری و نالائقی کے راز کو اور بھی فاش کر دیا۔ نصیر بن عباس جس کا نام اوپر ابھی آ چکا ہے، ظافر عبیدی کا ندیم خاص اور روز و شب کا مصاحب و جلیس تھا۔ اس کے اور ظافر کے تعلقات کی نسبت لوگوں میں برے برے خیالات کا اظہار ہوتا تھا۔

ظافر کا قتل:

نصیر نے ایک روز ماہ محرم سنہ ۵۴۹ھ میں ظافر کی ضیافت کی۔ ظافر، نصیر کے یہاں آیا۔ نصیر نے ظافر اور اس کے ہمراہیوں کو قتل کرا کر اسی مکان میں دفن کردیا۔ دوسرے دن وزیرالسلطنت عباس بن ابوالفتوح حسب دستور قصر سلطنت میں گیا اور خدام سے بادشاہ ظافر کو دریافت کیا۔ انہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد عباس واپس چلا آیا۔ خدام محل سرائے عباس کے واپس جانے پر ظافر کے بھائی جبرئیل اور یوسف کے پاس گئے اور ظافر نے نصیر کے مکان پر جانے اور وہاں سے اب تک واپس نہ آنے کا حال بیان کیا۔ یوسف اور جبرئیل نے کہا کہ تم اس کیفیت کو وزیرالسلطنت عباس سے جا کر بیان کرو۔ خدام نے عباس کے پاس آ کر یہ حال سنایا۔ عباس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف اور جبرئیل کی سازش سے بادشاہ ظافر قتل کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً ظافر کے ان دونوں بھائیوں کو گرفتار کرا کر بلوایا اور فوراً قتل کرا دیا۔ ساتھ ہی حسن بن حافظ کے دونوں لڑکوں کو بھی قتل کرا دیا۔ اس کے بعد محل سرائے سلطانی میں جا کر ظافر کے بیٹے عیسیٰ ابوالقاسم کو زبردستی گود میں اٹھا لیا۔ تخت سلطنت پر لا کر بٹھا دیا اور ''فائز بنصراللہ'' کا لقب تجویز کر کے لوگوں سے

ان کے نام پر بیعت لی۔ خاندان سلطنت کے پانچ آدمیوں کے اس طرح مقتول ہونے پر بیگمات سلطنت نے صالح بن زریک کے پاس پوشیدہ طور پر ایلچی روانہ کیے جوان دنوں اشمونین و نبسہ کا عامل تھا اور تمام حالات سے اس کو اطلاع دے کر عباس کی بیخ کنی کی درخواست کی۔ چنانچہ صالح بن زریک فوجیں فراہم کرکے قاہرہ کی طرف روانہ ہوا۔ عباس یہ دیکھ کر کہ اہل قاہرہ بھی میرے مخالف ہو گئے ہیں، قاہرہ سے اپنے بیٹے نصیر اور اپنے دوست اسامہ بن منقذ کو ہمراہ لے کر اپنی خاص جمعیت کے ساتھ شام و عراق کے قصد سے روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں عیسائیوں سے مقابلہ ہو گیا۔ لڑائی میں عباس کام آیا، نصیر گرفتار ہوا اور اسامہ بچ کر نکل گیا اور ملک شام میں پہنچ گیا۔ عباس کے نکل جانے کے بعد صالح قاہرہ میں ماہ ربیع الثانی سنہ ۵۵۹ھ کو پہنچا۔ نصیر کے مکان میں سے ظافر کی لاش کو کھود کر نکالا اور شاہی قبرستان میں دفن کیا اور ظافر کے بیٹے فائز کی بیعت کی۔ فائز نے اس کو ''ملک الصالح'' کا خطاب دیا۔

فائز بن ظافر عبیدی:

صالح نے وزیر السلطنت ہو کر امور سلطنت کا بندوبست شروع کیا۔ اس کے بعد عیسائیوں سے خط و کتابت کر کے نصیر بن عباس کو زر معاوضہ دے کر حاصل کیا۔ جب نصیر کو عیسائیوں نے روپیہ لے کر قاہرہ میں پہنچا دیا تو صالح نے اس کو قتل کر کے اس کی لاش کو منظر عام پر لٹکا دیا۔ صالح امامیہ مذہب کا سختی سے پابند اور دولت عبیدیہ کا بڑا خیر خواہ تھا۔ اس نے نصیر کے قتل سے فارغ ہو کر ان سرکش سرداروں کی طرف توجہ مبذول کی جو مزاحمت و مخالفت کی جرأت رکھتے تھے۔ ان میں دو سردار خاص طور پر قابل توجہ تھے: ایک تاج الملوک قائماز، دوسرا ابن غالب۔ ان دونوں کی گرفتاری پر صالح نے فوجوں اور سرداروں کو مامور کیا۔ یہ دونوں قبل از وقت واقف ہو کر مصر سے فرار ہو گئے۔ ان کے مکانات لوٹ لیے گئے۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر دوسرے تمام سردار بھی سہم گئے اور سب نے اطاعت و فرماں برداری کی گردنیں جھکا دیں۔ صالح نے قصر سلطنت کے دربان، خدام اور تمام آدمی اپنے آوردے مقرر کیے اور پرانے آدمیوں کو ہٹا دیا۔ اس کے بعد تمام معاملات پر حاوی و مستولی ہونے کے بعد وہ قصر سلطانی کا قیمتی سامان بھی اپنے مکان میں لے آیا۔ فائز عبیدی کی پھوپھی نے صالح کے اقتدار کو حد سے زیادہ بڑھتا ہوا دیکھ کر صالح کی بیخ کنی اور قتل کی تدبیریں

سوچنی ضروری سمجھیں۔

صالح کو اس کا حال معلوم ہو گیا۔ اس نے خود قصر سلطنت میں جا کر فائز کی پھوپھی کو قتل کرا دیا۔ جس سال فائز تخت حکومت پر بٹھایا گیا، اسی سال ملک العادل سلطان نورالدین محمود زنگی نے دمشق کو بنوتتش کے قبضے سے نکال لیا تھا اور عیسائیوں کی سزا دہی کی کوشش میں مصروف تھا۔

وفات:

چھ مہینے کی برائے نام حکومت کے بعد بادشاہ فائز عبیدی نے سنہ ۵۵۵ھ میں وفات پائی۔ وزیر السلطنت صالح بن زریک نے خدام کو حکم دیا کہ وہ خاندان سلطنت کے لڑکوں کو پیش کریں تاکہ ان میں سے کسی ایک کو تخت سلطنت کے لیے منتخب کیا جائے۔ چنانچہ ابومحمد عبداللہ بن یوسف بن حافظ عبیدی کو تخت سلطنت پر بٹھا کر اس کا لقب ''عاضد لدین اللہ'' تجویز کیا۔ عاضد اس وقت سن بلوغ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ عاضد کو تخت سلطنت پر بٹھا کر وزیر السلطنت صالح نے اپنی بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا۔

عاضد بن یوسف عبیدی:

عاضد صالح کے ہاتھ میں تھا۔ عاضد برائے نام بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ حقیقتاً بادشاہی وزیر السلطنت صالح کے ہاتھ میں تھی۔ یہ بات امرائے سلطنت کو گراں گزرتی تھی۔ عاضد کی چھوٹی پھوپھی نے جو اپنی مقتول بہن کا انتقام صالح سے لینا چاہتی تھی، صالح کے قتل کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے امرائے سوڈانیہ کو صالح کے قتل پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ایک سردار نے موقع پا کر صالح پر نیزے کا وار کیا۔ وہ زخمی ہو کر گر پڑا اور اپنے مکان پر تھوڑی دیر کے بعد مر گیا۔ مرنے سے پہلے عاضد عبیدی کو وصیت کر گیا کہ میرے بیٹے زریک کو وزیر السلطنت بنانا۔ چنانچہ عاضد نے صالح کے بیٹے کو قلم دان وزارت سپرد کر کے ''عادل'' کا خطاب دیا۔ عادل نے وزیر ہو کر عاضد کی اجازت سے اپنے باپ کے قصاص میں عاضد کی پھوپھی اور سوڈانی سردار کو قتل کیا۔ اس کے بعد عادل امور سلطنت کی انجام دہی میں مصروف ہوا۔ اس نے صعید کے والی شادر سعدی کو معزول کر کے اس کی جگہ امیر بن رقعہ کو صعید کا والی مقرر کیا۔ شادر یہ خبر سن کر مقابلہ پر مستعد ہو گیا اور فوراً فوجیں لے کر قاہرہ کی طرف چل دیا۔ عادل اس کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور قاہرہ سے نکل بھاگا۔ شادر سنہ ۵۵۸ھ میں مظفر و

منصور قاہرہ کے اندر داخل ہوا۔ زریک عادل گرفتار ہوکر آیا اور ایک سالہ وزارت کے بعد مقتول ہوا۔ شادر آتے ہی دارالوزارت پر قابض ومتصرف ہوا۔ عاضد نے اس کو وزارت عظمیٰ کا عہدہ عطا کر دیا۔ نو مہینے کے بعد ضرغام نامی ایک شخص نے جو محل سرائے کا داروغہ تھا، قوت پا کر شادر کو قاہرہ سے نکال دیا اور خود دارالوزارت پر قابض ہو گیا۔ شادر مصر سے نکل کر شام کی طرف روانہ ہوا۔ ضرغام نے شادر کے بیٹے علی کو جو قاہرہ میں تھا، گرفتار کر کے قتل کر دیا اور بہت سے امیروں کو جن سے اس کو مخالفت کا اندیشہ تھا، قتل کیا۔

سلطان نورالدین محمد زنگی کی مصر کی طرف توجہ:

شادر نے شام میں پہنچ کر ملک العادل نورالدین محمود زنگی کے دربار میں حاضر ہو کر مصر کے تمام حالات بیان کیے اور امداد کی درخواست کر کے یہ وعدہ کیا کہ اگر مجھ کو مصر کی وزارت پر پھر بحال کر دیا گیا تو میں امرائے لشکر کی امدادی جاگیروں کے علاوہ مصر کے ایک حصے پر دولت نوریہ کا قبضہ کرا دوں گا۔ سلطان نورالدین نے بہت غور و تامل کے بعد اپنے سپہ سالار اسدالدین شیرکو کو ماہ جمادی الآخر سنہ ۵۵۹ھ میں شادر کے ساتھ مع ایک فوج کے بھیج دیا۔ اسدالدین کو ہدایت کی گئی کہ مصر پہنچ کر ضرغام کو معزول کر کے شادر کو وزارت کے عہدے پر بحال کر دیا جائے اور جو کوئی اس کام میں مزاحم ہو، اس سے جنگ کی جائے۔ شادر و شیرکوہ کو مصر کی جانب روانہ کر کے سلطان نورالدین خود عیسائیوں کی طرف فوج لے کر روانہ ہو گئے تاکہ عیسائی اپنی سرحد کے قریب شیرکوہ کی فوج پر حملہ آور نہ ہوں۔ شیرکوہ اور شادر بلبیس تک بڑھے چلے گئے۔ بلبیس کے مقام پر ضرغام کے بھائی ناصر الدین و فخرالدین مصری فوج کے مقابلہ پر آئے۔ شیرکوہ نے دونوں کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور فاتحانہ قاہرہ میں داخل ہوا۔ ضرغام وزارت چھوڑ کر بھاگ نکلا مگر راستہ میں گرفتار ہو کر مقتول ہوا۔ اسی طرح ناصرالدین و فخرالدین بھی قتل کر دیے گئے۔ شادر پھر وزیراعظم بن گیا۔ اب وزیراعظم بن جانے کے بعد شادر نے شیرکوہ کے ساتھ بدعہدی کی اور اپنا کوئی وعدہ پورا نہ کیا۔ مجبوراً شیرکوہ مصر سے شام کی طرف واپس ہوا اور شادر کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ شادر نے بہ جائے اس کے کہ اس احساس کا کوئی معاوضہ ادا کرتا یا کم از کم احسان مندی کا اظہار اخلاقی طور پر کرتا، دولت نوریہ کی مخالفت میں عیسائیوں سے سازباز شروع کر دی۔ یہ حالت دیکھ کر شیرکوہ نے سلطان نورالدین سے

اجازت لے کر سنہ ۵۶۲ھ میں مصر پر فوج کشی کی۔ مصر پر فوج کشی کرنا اس لیے دشوار کام تھا کہ راستے میں عیسائی مقبوضات میں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا مگر شیرکوہ اپنی فوجوں کو صاف نکال کر لے گیا اور مصر کے بعض شہروں پر قبضہ کر لیا۔

مصریوں کی عیسائیوں سے امداد طلبی:

شادر نے فوراً عیسائیوں سے امداد طلب کی۔ عیسائی تو ایسے زریں موقع کے منتظر ہی تھے۔ وہ فوراً شادر کی مدد کے لیے فوجیں لے کر پہنچ گئے۔ شادر اور عیسائیوں کی متفقہ فوج کے مقابلے میں اسد الدین شیرکوہ کی مٹھی بھر فوج جس کی تعداد دو ہزار سے بھی کم تھی، کوئی حقیقت ہی نہ رکھتی تھی، مگر اس نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے مقابلہ کیا اور دونوں فوجوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ شیرکوہ کی مصر میں پہلے سے دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے مقبوضہ علاقے پر مستقل بندوبست کرتا ہوا اسکندریہ کی طرف بڑھا۔ اہل شہر نے فوراً شہر حوالے کر دیا۔ شیرکوہ نے اسکندریہ میں اپنے بھتیجے صلاح الدین بن نجم الدین ایوب کو حاکم مقرر کیا اور خود صعید کی طرف بڑھا مصری فوجیں قاہرہ میں جمع ہو رہی تھیں۔ انہوں نے شیرکوہ کے اسکندریہ سے صعید کی طرف روانہ ہونے کی خبر سنتے ہی اسکندریہ پر حملہ کی تیاری کی اور قاہرہ سے کوچ کیا۔ شیرکوہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ مصریوں اور عیسائیوں نے متفقہ طور پر اسکندریہ پر حملہ کیا ہے تو وہ اپنے بھتیجے صلاح الدین کی امداد کے لیے فوراً سکندریہ کی طرف لوٹا۔ شادر نے اس عرصہ میں ایک خاص سازشی جال پھیلا کر شیرکوہ کی ہمراہی فوج کے بعض سرداروں کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا اور وہ سردار لڑائی میں سرد مہری سے کام لینے لگے تھے۔ شیرکوہ کو اس سازش کا حال معلوم ہو گیا۔ ادھر شادر کی طرف سے شیرکوہ کے پاس پیغام پہنچا کہ تم ہم سے تاوان جنگ وصول کر لو اور اسکندریہ کو چھوڑ کر اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ۔ تمام حالات اور نتائج و عواقب پر غور کرنے کے بعد شیرکوہ نے شادر کی اس درخواست کو قبول کر لینا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ وہ اسکندریہ چھوڑ کر اور تاوان جنگ لے کر شام کی طرف واپس ہوا۔

ناعاقبت اندیشی کے نتائج:

یہ واقعہ سنہ ۵۶۲ھ ماہ ذیقعدہ میں وقوع پذیر ہوا۔ شادر کی اس ناعاقبت اندیشی کے نتائج بہت برے نکلے جو اس نے عیسائیوں کو مصر میں بلا کر کی۔ شیرکوہ کے واپس چلے جانے کے بعد عیسائی لشکر

نے مصر میں مستقل قیام کرنے اور عیسائیوں نے مصر پر قبضہ کرنے کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ انہوں نے شادر کے سامنے مندرجہ ذیل شرائط پیش کیں اور شادر نیز عاضد عبیدی کو شرائط قبول ومنظور کرنی پڑیں:

1. عیسائی فوجیں قاہرہ میں مقیم رہیں گی۔
2. عیسائیوں کی طرف سے ایک ناظم قاہرہ میں رہا کرے گا۔
3. شہر پناہ کے دروازوں پر عیسائیوں کا قبضہ رہے گا۔
4. حکومت مصر ایک لاکھ دینار سالانہ بیت المقدس کے عیسائی بادشاہ کو ادا کیا کرے گی۔

جب اس طرح عیسائیوں نے مصر میں اپنے قدم جما لیے تو انہوں نے سلطنت مصر کے کاموں میں دخل اندازی شروع کی۔ بلبیس کو عیسائی حکومت میں شامل کر لیا، پھر دارالسلطنت قاہرہ پر قبضہ کرنے پر آمادہ ہو گئے اور شادر کو اپنا طرفدار بنا کر عیسائی فوجیں بڑی تعداد میں بلوائیں اور بہ جائے ایک لاکھ دینار کے دو لاکھ دینار اور بہ مقدار کثیر غلہ کا مطالبہ کیا۔ عاضد عبیدی بادشاہ مصر کو یہ رنگ دیکھ کر بہت فکر ہوئی۔

عاضد کی سلطان نورالدین زنگی سے امداد طلبی:

اس نے ایک قاصد سلطان نورالدین محمود کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ عیسائیوں کو جو مصر پر مستولی ہو گئے ہیں، خارج کرنے میں مدد کیجیے اور بلاتوقف فوجیں بھیجئے۔ شادر کو جب یہ حال معلوم ہوا کہ عاضد نے سلطان نورالدین سے امداد طلب کی ہے تو اس نے عاضد کو سمجھانے اور اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ ترکوں کے مقابلے میں عیسائیوں کا باج گزار بن جانا اچھا ہے۔ مگر عاضد نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سلطان نورالدین محمود نے اپنے سپہ سالار شیرکوہ کو تیاری کا حکم دیا اور اس کے ساتھ اس کے بھتیجے صلاح الدین اور دوسرے سرداروں کو بھی روانہ کیا۔ چنانچہ اسدالدین شیرکوہ مع لشکر وسرداران فوج مصر کی جانب روانہ ہوا۔ شیرکوہ نے عیسائی لشکرگاہ کو لوٹا اور بادشاہ عاضد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عاضد نے شیرکوہ کو خلعت عطا کیا اور بڑی عزت کے ساتھ پیش آیا۔ شیرکوہ اور اس کے لشکر کو مہمان رکھا اور ایک روز موقع پا کر شیرکوہ سے کہا کہ شادر چونکہ عیسائیوں کا خیرخواہ اور ہمارا دشمن ہے، اس کو قتل کر دو۔ چنانچہ شیرکوہ نے اپنے سرداروں کو شادر کو قتل کر دینے کا حکم دیا اور شادر کا سر اتار کر عاضد کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ عاضد نے شیرکوہ کو

وزارت کا عہدہ دے کر ''امیر الجیش'' اور ''منصور'' کا خطاب دیا۔ شیرکوہ کا تعلق سلطان نورالدین محمود سے بھی بہ دستور باقی تھا اور وہ سلطان نورالدین محمود کی اجازت ہی سے مصر میں بہ طور وزیر اعظم کام کرتا تھا۔ چند ہی مہینے کے بعد سنہ ۵۶۵ ھ میں شیرکوہ کا انتقال ہو گیا۔

صلاح الدین ایوبی بحیثیت وزیر اعظم مصر:

عاضد نے اس کے بھتیجے صلاح الدین کو عہدہ وزارت عطا کیا۔ صلاح الدین نے بھی اپنی وفاداری اور تعلقات کو سلطان نورالدین محمود سے برابر قائم رکھا۔ شیرکوہ کی وزارت سے عاضد بہت خوش تھا اور تمام سیاہ وسفید کا اختیار اس کو دے دیا تھا۔ اسی طرح صلاح الدین کو بھی کلی طور پر اختیارات حکمرانی حاصل تھے۔ شیرکوہ اور صلاح الدین دونوں امام شافعی رحمہ اللہ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے شیعہ قاضیوں کو موقوف کر کے شافعی قضاۃ مامور کیے۔ مدرسہ شافعیہ اور مدرسہ مالکیہ کی بنیاد رکھی ۔ سنہ ۵۶۵ ھ میں جب شیرکوہ نے عیسائی فوجوں کو مصر سے نکال کر خود بہ طور وزیر اعظم مصر کا انتظام شروع کیا تو عیسائیوں کو وہ خراج ملنا بھی بند ہو گیا جو وہ مصر سے حاصل کرنے لگے تھے۔ نیز عیسائیوں کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ دمشق وقاہرہ کی اسلامی حکومتوں میں جب اتحاد قائم ہو گیا ہے تو اب بیت المقدس پر قبضہ قائم رکھنا دشوار ہے۔ لہٰذا انہوں نے صقلیہ اور اندلس کے پادریوں کو پیغام بھیجا کہ بیت المقدس کو بچانے اور عیسائی حکومت کے یہاں قائم رکھنے کے لیے امداد کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ ان ملکوں میں پادریوں نے مقدس جنگ کے وعظ کہنے شروع کیے اور اندلس وغیرہ سے عیسائی فوجیں روانہ ہو کر ساحل شام پر آ آ کر اترنا شروع ہوئیں۔ عیسائیوں نے یورپ سے ہر قسم کی امداد پا کر اور خوب طاقتور ہو کر سنہ ۵۶۵ ھ میں دمیاط کا محاصرہ کر لیا۔ دمیاط کے عامل شمس الخواص منکور نامی نے صلاح الدین ایوبی کو مطلع کیا۔ ادھر مصر میں شیعہ لوگ وزیر السلطنت صلاح الدین ایوبی سے ناراض تھے۔ صلاح الدین نے ایک افسر بہاء الدین قراقوش کو فوج دے کر دمیاط کی طرف بھیجا اور سلطان نورالدین محمود کو لکھا کہ میں شیعوں اور سوڈانیوں کی وجہ سے مصر کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لیے خود دمیاط کی طرف نہیں جا سکا۔ آپ بھی دمیاط کی طرف التفات مبذول رکھیں۔ چنانچہ سلطان نورالدین محمود نے فوراً دمیاط کی جانب تھوڑی سی فوج بھیجی اور عیسائیوں کی توجہ اور طاقت کو تقسیم کرنے کے لیے ساحل شام کے عیسائی علاقوں پر حملہ آوری شروع

کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی یعنی صلیبی جنگجو پچاس دن کے محاصرے کے بعد دمیاط کو چھوڑ کر اپنے شہروں کی طرف واپس آئے تو ان کو بھی سلطان نورالدین کے حملوں سے خراب و ویران پایا۔ اس کے بعد سلطان صلاح الدین نے اپنے باپ نجم الدین ایوب کو ملک شام سے مصر میں بلوایا۔ بادشاہ عاضد خود نجم الدین ایوب سے ملنے آیا اور بہت کچھ تواضع و مدارات کی۔ بادشاہ عاضد ہمیشہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے کاموں کا مداح رہتا تھا اور خود اس نے امور سلطنت سے بے تعلقی اختیار کر لی تھی۔ مصر کے شیعوں کو صلاح الدین کا اقتدار و اعزاز اور اختیار و طاقت بے حد گراں گزرتی تھی۔ صلاح الدین کی وجہ سے مصر میں دم بہ دم شیعیت کو تنزل اور سنی مذہب کو ترقی تھی۔ آخر عمارہ، یمنی، زبیدہ، عویرش، قاضی القضاۃ معزول، عبدالصمد، کاتب، موتمن، الخلافتہ سردار، خدام قصر سلطانی وغیرہ نے مل کر ایک سازش کی اور یہ رائے قرار پائی کہ مصر کے ملک کو عیسائیوں کے سپرد کر دیا جائے اور عیسائی سفیر کو بلوا کر بادشاہ عاضد سے اس کی خفیہ ملاقات کرائی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایک طرف عاضد کو ہموار کرنے کی کوشش کی، دوسری طرف عیسائیوں سے خط و کتابت کر کے ان کے سفیر کو پوشیدہ طور پر بلوایا۔ اتفاقاً ان لوگوں کا ایک خط جو انہوں نے عیسائی بادشاہ کے پاس روانہ کیا تھا، راستے میں پکڑا گیا اور صلاح الدین کی خدمت میں پیش ہوا۔ صلاح الدین نے مجرموں کا نہایت احتیاط کے ساتھ پتہ لگایا اور سب کو گرفتار کر کے دربار عام میں ان کے اظہار قلم بند کیے۔ جب وہ سب مجرم ثابت ہوئے تو ان کو قتل کیا اور بہاء الدین قراقوش کو محل سرائے سلطانی کا داروغہ مقرر کیا۔

سلطان العادل یعنی سلطان نورالدین محمود پہلے سے صلاح الدین ایوبی کو لکھتے رہتے تھے کہ تم مصر میں خلیفہ بغداد کے نام کا خطبہ پڑھواؤ مگر صلاح الدین یہ معذرت کر دیا کرتا تھا کہ اگر عاضد عبیدی کا نام خطبہ سے نکال دیا گیا تو اندیشہ ہے کہ مصر میں سخت فساد اور فتنہ برپا ہو جائے۔ صلاح الدین کا یہ اندیشہ غیر معقول نہ تھا کیونکہ سوڈانیوں کی ایک بڑی تعداد مصر میں موجود تھی۔ جو ترکوں کی مخالفت اور سازشی شیعہ لوگوں کی حمایت پر مستعدی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ مذکورہ سازش کے شرکاء کو جب صلاح الدین نے قتل کیا تو ان سوڈانیوں نے جو پچاس ہزار کی تعداد میں تھے، صلاح الدین اور ترکوں کی فوج کے خلاف ہتھیار سنبھال لیے۔ قصر سلطنت اور قصر وزارت کے درمیان ترکوں اور سوڈانیوں میں جنگ عظیم برپا ہوئی، ترک غالب ہوئے۔ سوڈانی بہت سے مقتول اور باقی مفرور ہوئے۔ ان کے گھروں کو ترکوں نے لوٹ لیا۔ صلاح الدین نے سوڈانیوں کو امن عطا کر کے ان

کے گھروں میں آباد کرا دیا۔ اس طرح سوڈانیوں کا زور بھی ٹوٹ گیا۔ اب سلطان العادل نے پھر صلاح الدین کو لکھا کہ عاضد کے نام کا خطبہ موقوف کر کے خلیفہ مستضی عباسی کے نام کا خطبہ پڑھواؤ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بادشاہ عاضد بیمار اور مرض الموت میں گرفتار تھا۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں محرم سنہ ۵۶۷ھ کے پہلے جمعہ کو جامع مسجد قاہرہ کے منبر پر بغداد کے عباسی خلیفہ کا خطبہ پڑھا گیا اور کسی شخص نے اس کو ناپسند نہ کیا۔ اگلے جمعہ کو صلاح الدین کے گفتنی فرمان کے موافق تمام ملک مصر کی مسجدوں میں خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھا گیا۔

وفات:

اسی عرصہ میں ۱۰محرم سنہ ۵۶۷ھ کو بادشاہ عاضد عبیدی نے وفات پائی۔ صلاح الدین نے دربار تعزیت منعقد کیا اور قصر سلطانی کے تمام مال واسباب کا جائزہ لیا۔ اس کے ساتھ ہی دولت عبیدیین کا خاتمہ ہو گیا اور ملک مصر پھر خلافت عباسیہ بغداد کی حدود میں داخل ہوا۔ صلاح الدین ایوبی کے نام خلیفہ بغداد کی طرف سے حکومت مصر کی سند، خطاب سلطانی اور خلعت وعلم آ گیا اور دولت عبیدیین کے بعد مصر میں دولت ایوبیہ کی ابتدا ہوئی۔

دولت عبیدیہ پر تبصرہ:

دولت عبیدیین دو سو ستر سال تک قائم رہی۔ ابتداء میں عبیدیوں کی حکومت افریقہ یعنی ملک مغرب میں قائم ہوئی، پھر مصر پر قابض ہو کر انہوں نے قاہرہ کو دارالسلطنت بنایا۔ مراکش کی سلطنت ادریسیہ کو بھی لوگ عام طور پر علویوں اور شیعوں کی سلطنت سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ادریسیہ سلطنت نسباً بربری اور نیم شیعہ یا برائے نام شیعہ سلطنت تھی۔ ادریسیوں کے اعمال وعبادات و عقائد میں کوئی ایسی بات نہ تھی، جس کو سنیوں کے مقابلے میں مابہ الامتیاز قرار دیا جا سکے۔ نہ ادریسیوں کو سنیوں سے کوئی عداوت ونفرت تھی، نہ ان کے عقائد وعبادات میں کوئی فرق تھا۔ سوائے اس کے کہ اس سلطنت کی ابتداء ادریس اول سے ہوئی تھی، جس نے محبت اہل بیت کے مشہور ہتھیار سے کام لے کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کے بعد ادریسیوں میں کوئی شیعی خصوصیت نہیں دیکھی گئی۔ ہاں عبیدیین کی حکومت ضرور شیعی حکومت تھی لیکن نسباً وہ علوی حکومت ہرگز نہ تھی۔ عبیداللہ کا دادا تاریخ الخلفاء سیوطی کی روایت کے موافق مجوسی اور ذات کا لوہار و تیرگر تھا۔ عبیداللہ مہدی نے

ملک مغرب میں جا کر فاطمی ہونے کا دعویٰ کیا مگر علماء نسب نے اس کے دعوے کو تسلیم نہیں کیا۔ ایک مرتبہ عزیز عبیدی نے اندلس کے اموی خلیفہ کے نام ایک خط بھیجا جس میں ہجو و دشنام درج تھیں۔ خلیفہ اموی نے اس کے جواب میں عزیز عبیدی کو لکھا کہ تجھ کو چونکہ ہمارا نسب معلوم تھا، اس لیے تو نے ہجو کی۔ اگر ہم کو تیرا نسب معلوم ہوتا تو ہم بھی تیری طرح تیرے بزرگوں کی نسبت ہجو کرتے۔ عزیز کو یہ جواب بہت ہی گراں گزرا مگر کوئی جواب نہ دے سکا۔ عبیدیین کو عام طور پر لوگ فاطمین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بڑی جہالت اور غلطی ہے۔ عبیدیین عام طور پر اسماعیلی شیعہ تھے۔ انہیں کو باطنیہ بھی کہتے ہیں۔ انہیں کی ایک شاخ فارس کی وہ سلطنت تھی جو حسن بن صباح نے قائم کی تھی، جس کا دارالحکومت قلعہ الموت تھا۔ اسی کو فدائیوں کی حکومت بھی کہتے ہیں، وہ بھی علوی نہ تھے۔

عبیدیین کی حکومت میں ہزارہا صلحاء محض اس لیے مقتول ہوئے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا نہ کہتے تھے۔[1] عبیدیین سے اسلام کو کوئی نفع نہ پہنچا اور ان کا کوئی جنگی، علمی، اخلاقی کارنامہ ایسا نہیں جس پر فخر کیا جا سکے۔ بعض علماء نے عبیدیین کو خارج از اسلام اور مرتد بھی قرار دیا ہے۔ ان میں سے بعض مثلاً عزیز عبیدی نے عالم الغیب ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ شراب خوری کو یہ لوگ جائز سمجھتے تھے۔ اسی قسم کی بہت سی باتیں ان کے عہد حکومت میں پائی جاتی تھیں، جن کے سبب سے ان کو علماء اسلام نے ننگ اسلام سمجھا ہے۔ بہرحال عبیدیین کی سلطنت کے تاریخی حالات جو کچھ تھے، وہ بیان ہو چکے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرامطہ، بحرین اور ان کی دولت و حکومت کے حالات بھی عبیدیین کے بعد درج کر دیے جائیں۔

---

[1] اسی سے ان کی خباثت ذہن وفکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سب وشتم ایک مخصوص گروہ کا شعار تھا اور ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کو اللہ تعالیٰ نے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا خطاب مرحمت فرمایا تھا، ان کے بارے میں امت کو یہ تنبیہ اور نصیحت فرمائی تھی کہ میرے صحابہ کو برا نہ کہنا اور ان کو گالیاں نہ دینا یعنی ان پر سب وشتم نہ کرنا۔ (ترمذی به حواله مشكوٰة المصابيح المحقق الالبانی رحمہ اللہ، كتاب المناقب والفضائل، حديث ٦٠١٤)

اٹھارہواں باب

قرامطۂ بحرین

یحییٰ بن فرج قرمط:

بحرین ایک ملک کا نام ہے، جس کے مشرق میں خلیج فارس، جنوب میں عمان، مغرب میں ملک یمامہ اور شمال میں صوبہ بصرہ ہے۔ اس ملک میں بحرین نام کا ایک شہر ہے۔ اسی شہر کے نام سے اس ملک کا نام بحرین مشہور ہوا۔ اس ملک میں ایک دوسرا شہر ہجر ہے۔ لہٰذا کبھی ملک بحرین کو ملک ہجر کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ ایک تیسرا مشہور شہر اس ملک میں حفیر یہ تھا، جس کو قرامطہ نے ویران کر کے اس کی جگہ احساء آباد کیا۔ چنانچہ اس ملک کا نام احساء بھی لیا جاتا ہے۔ شہر احساء ہی قرامطہ کا مرکز و منبع تھا، جیسا کہ آگے بیان ہوتا ہے۔ قرامطہ کا تذکرہ دوسری جلد میں مجمل طور پر بیان ہو چکا ہے۔ عبیدیین اور قرامطہ کا ظہور ایک ہی زمانے میں ہوا۔ دونوں شیعہ اسماعیلیہ اور بہ ظاہر ایک جگہ ہی سے عقائد و اعمال کے وارث تھے۔ سنہ ۲۷۵ھ میں ایک شخص یحییٰ بن فرج مضافات کوفہ میں ظاہر ہوا۔ وہ اپنے آپ کو قرمط کے نام سے موسوم کرتا اور کہتا تھا کہ میں مہدی موعود کا ایلچی ہوں۔ اپنے اوقات زیادہ تر زہد و عبادت میں بسر کرتا اور لذات دنیوی سے دور و مہجور رہتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس کی طرف مائل ہونے لگے۔ وہ ہر ایک معتقد و مرید سے امام مہدی موعود کے لیے ایک دینار وصول کیا کرتا تھا۔ جب اس کے مریدین کی تعداد بڑھ گئی تو اس نے ان میں سے بعض کو اپنا نقیب مقرر کر کے ملک میں ادھر ادھر روانہ کیا کہ لوگوں کو اس کی طرف مائل و متوجہ کریں۔ گورنر کوفہ نے ان حالات سے مطلع ہو کر قرمط کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ چند روز کے بعد محافظین کو غافل پا کر قرمط جیل خانے سے بھاگ گیا اور کسی کو پتہ نہ چلا کہ کہاں گیا اور کیا ہوا؟ اس طرح غائب ہو جانے سے اس کے مریدین و معتقدین اس کے اور بھی زیادہ قائل ہو گئے اور ان کو یقین کامل ہو گیا کہ وہ ضرور امام مہدی موعود کا ایلچی تھا۔

قرمط نے اپنے معتقدین کو جن عقائد واعمال کی تعلیم دی تھی، وہ بہت ہی عجیب وغریب تھے۔ نماز بھی اور ہی قسم کی تھی۔ روزے بھی رمضان کے نہیں بلکہ سال کے خاص خاص مہینوں کے خاص خاص ایام میں رکھے جاتے تھے۔ شراب کو اس نے حلال بتا کر نبیذ کو حرام ٹھہرایا تھا۔ غسل جنابت کے لیے صرف وضو کافی تھا۔ دم دار اور پانچ انگلیوں والے جانور حرام تھے۔ چند روز کے بعد یحییٰ بن فرج یعنی قرمط پھر نمودار ہوا اور اپنے آپ کو ''قائم بالحق'' کے لقب سے ملقب کر کے لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے لگا۔ احمد بن محمد طائی والی کوفہ نے فوج لے کر اس پر حملہ کیا اور اس کی جمعیت کو منتشر وپریشان کر دیا۔ اس کے بعد بعض قبائل عرب اس کے معتقد ہو گئے اور سنہ ۲۹۰ھ میں اس جماعت نے دمشق پر حملہ کیا۔ دمشق کے حاکم بلخ نے متعدد لڑائیوں کے بعد یحییٰ کو قتل اور اس کی جماعت کو منتشر کر دیا۔

حسین مہدی:

یحییٰ کے بعد اس کے بھائی حسین نے اپنے آپ کو ''مہدی امیر المومنین'' کے لقب سے ملقب کر کے لوگوں کو فراہم کیا اور بادیہ نشین عربوں کی ایک جمعیت لے کر دمشق وشام کے مضافات میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ سرداران خلافت عباسیہ ان کی سرکوبی پر مامور ہوئے۔ اس کا ایک بیٹا ابوالقاسم بھاگ گیا اور خود ''مہدی امیر المومنین'' گرفتار ہو کر مقتول ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۲۹۱ھ کا ہے۔ حسین کا بھائی علی بھی فرار ہو کر بچ گیا تھا۔ اس نے اپنے گرد بادیہ نشینوں کی ایک جماعت جمع کر کے طبریہ کو لوٹ لیا۔ جب اس کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی گئی تو وہ یمن کی طرف بھاگ گیا اور وہاں اس نے یمن کے ایک علاقے پر قبضہ کر لیا اور شہر صنعاء کو لوٹا۔ اسی گروہ قرامطہ کے ایک شخص موسوم بہ ابوغانم نے طبریہ کے نواح میں لوٹ مار شروع کی۔ آخر سنہ ۲۹۳ھ میں ابوغانم بھی مارا گیا، ادھر قرامطہ نے یمن، حجاز اور شام میں بدامنی پھیلا رکھی تھی۔

یحییٰ ثانی:

ادھر قرمط یعنی یحییٰ بن فرج کے جیل خانے سے غائب ہونے کے بعد ایک اور شخص نے جس کا نام بھی یحییٰ تھا، شہر بحرین کے متصل موضع قطیف میں ظاہر ہو کر سنہ ۲۸۱ھ میں یہ دعویٰ کیا کہ میں امام مہدی موعود کا ایلچی ہوں اور بہت جلد امام مہدی ظاہر ہونے والے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے کہا کہ

میں امام مہدی کا ایک خط بھی لایا ہوں۔ یہ سن کر علی بن معلیٰ بن حمدان نے جو غالی شیعہ تھا، قطیف کے تمام شیعوں کو جمع کیا اور امام مہدی کے اس خط کو سنایا جو یحییٰ نے پیش کیا تھا۔ اس خط کو سن کر شیعہ لوگ بہت ہی خوش ہوئے۔ مضافات بحرین میں یہ خبر عام طور پر پھیل گئی اور لوگ امام مہدی کے ساتھ خروج کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ انہیں لوگوں میں ابوسعید حسن بن بہرام جنابی بھی تھا جو ایک معزز اور سربرآوردہ تھا۔ چند روز کے بعد یحییٰ غائب ہوگیا اور امام مہدی کا ایک دوسرا خط لیے ہوئے آیا، جس میں امام مہدی نے یہ حکم لکھا تھا کہ ہر شخص چھتیس چھتیس دینار یحییٰ کو ادا کرے۔ چنانچہ اس حکم کی سب نے بہ خوشی تعمیل کی۔ یہ روپیہ وصول کر کے یحییٰ پھر غائب ہو گیا اور چند روز کے بعد امام مہدی کا ایک تیسرا خط لے کر آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ ہر شخص امام زمان کے لیے اپنے مال کا پانچواں حصہ یحییٰ کے سپرد کرے۔ اس حکم کی بھی ان لوگوں نے بہ خوشی تعمیل کی۔

ابوسعید جنابی:

ابوسعید جنابی ایک سربرآوردہ شخص تھا۔ اس نے شہر بحرین میں بھی جا کر دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا اور لوگوں کو اپنا ہم خیال یعنی امام زمان کا منتظر بتایا۔ رفتہ رفتہ بادیہ نشین عربوں کا ایک گروہ کثیر ابوسعید کی طرف متوجہ ہو گیا اور وہ قرامطہ بھی جو یحییٰ قرمط کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے، آ آ کر یحییٰ کے گرد جمع ہونے لگے۔ ابوسعید نے اپنی تمام جماعت کو ایک باقاعدہ فوج کی شکل میں ترتیب دیا اور اس فوج کو ہمراہ لے کر قطیف سے بصرہ کی جانب روانہ ہوا۔ بصرہ کے عامل احمد بن محمد یحییٰ کو جب ابوسعید کی تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے آپ کو کمزور پا کر دربار خلافت کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ دربار خلافت سے عباس بن عمر غنوی والی فارس کے نام حکم پہنچا کہ بصرہ کو بچاؤ۔ چنانچہ عباس بن عمر غنوی دو ہزار سوار لے کر روانہ ہوا۔ جب عباس اور ابوسعید کا مقابلہ ہوا تو ابو سعید نے عباس کو گرفتار کر کے اس کی لشکر گاہ کو لوٹ لیا۔ چند روز کے بعد عباس کو تو رہا کر دیا مگر اس کے ہمراہیوں کو جو گرفتار ہوئے تھے، قتل کر دیا۔ اس کامیابی سے ابوسعید کا دل بڑھ گیا اور اس نے ہجر پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا اور اپنی حکومت کی بنیاد قائم کی۔ ابوسعید اور اس کی جماعت کے اعمال وعقائد بھی بہت کچھ وہی تھے جو اوپر یحییٰ قرمط کے بیان ہوئے۔ اس لیے یہ بھی قرمط ہی کے نام سے موسوم ہوئے۔ ابوسعید نے اپنی حکومت کی بنیاد قائم کر کے اپنے بیٹے سعید کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ یہ بات ابوسعید کے چھوٹے بھائی ابوطاہر سلیمان کو ناگوار گزری۔ اس نے ابوسعید کو قتل کر دیا اور خود

اس گروہ قرامطہ کا حکمران بن گیا۔

ابو طاہر:

ابو طاہر نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر سنہ ۲۸۸ھ میں بصرہ پر حملہ کیا اور بصرہ کو اچھی طرح لوٹ مار سے پامال کر کے بحرین کی طرف واپس ہوا۔ اس خبر کو سن کر دارالخلافہ بغداد میں بڑی تشویش پیدا ہوئی اور خلیفہ مقتدر نے بصرہ کی شہر پناہ کو درست کرنے کا حکم دیا۔ ابو طاہر کامیابی کے ساتھ علاقہ بحرین میں حکومت کرتا رہا۔ اسی دوران میں اس نے عبیداللہ مہدی سے بھی خط و کتابت کی اور عبیداللہ مہدی نے اس کی حکومت و سلطنت کو بہ نظر اطمینان دیکھا۔ سنہ ۳۱۱ھ میں ابو طاہر نے بصرہ پر دوبارہ حملہ کر کے اس کو ویران کر دیا۔ جامع مسجد بالکل منہدم کر دی گئی جو عرصہ تک مسمار پڑی رہی۔[1] بازاروں کو لوٹ کر خاک سیاہ کر دیا۔

ابو طاہر کی غارت گری:

سنہ ۳۱۲ھ میں ابو طاہر حاجیوں کے قافلے لوٹنے کے لیے نکلا۔ شاہی سپہ سالار ابوالہیجا بن حمدون کو جو قافلہ کے ہمراہ تھا، گرفتار کر لیا اور حاجیوں کو خوب لوٹا اور ہجر کی جانب واپس گیا۔ سنہ ۳۱۴ھ میں ابو طاہر نے عراق کی طرف فوج کشی کی اور نواح کوفہ کو بصرہ کی مانند قتل و غارت سے تباہ و برباد کر دیا۔ یہاں سے بحرین کی طرف واپس جا کر شہر احساء کی آبادی و تعمیر کا کام شروع کیا۔ اپنے اور اپنے ہمراہیوں کے لیے محلات و قصور تعمیر کرائے اور اس کو اپنا مستقل دارالسلطنت بنایا۔ سنہ ۳۱۵ھ میں ابو طاہر نے عمان پر حملہ کیا۔ حاکم عمان بھاگ کر بہ راہ دریا فارس چلا گیا اور ابو طاہر نے عمان کے صوبے کو اپنی مملکت میں شامل کیا۔ سنہ ۳۱۶ھ میں اس نے شمال کی جانب حملہ آوری شروع کی۔ خلیفہ مقتدر عباسی نے آذربائیجان سے یوسف بن ابی الساج کو طلب کر کے واسط کی سند حکومت عطا کی اور ابو طاہر سے جنگ کرنے کا حکم دیا۔ کوفہ کے باہر یوسف اور ابو طاہر کا سخت مقابلہ ہوا۔ سخت معرکہ آرائی کے بعد یوسف کی فوج کو شکست ہوئی اور یوسف کو ابو طاہر نے گرفتار کر لیا۔ بغداد میں اس خبر سے سخت پریشانی پیدا ہوئی۔ ابو طاہر کوفہ سے انبار کی جانب روانہ ہوا۔ دربار خلافت سے اس

---

[1] یہ قرامطی اس قدر خبیث اور گمراہ تھے کہ بیت اللہ شریف سے حجر اسود اٹھا لائے تھے اور اسے کئی سال اپنے پاس رکھا۔ بیت اللہ شریف کی بھی بے حرمتی کی۔ عام مساجد کا انہدام شائدان کے نزدیک معمولی بات تھی۔

کی روک تھام کے لیے مونس خادم، مظفر اور ہارون وغیرہ سردار مامور ہوئے مگر ابوطاہر کے مقابلے میں سب شکست کھا کر واپس بغداد آئے اور ابوطاہر رحبہ کی جانب بڑھا۔ رحبہ کو بھی خوب پامال و ویران کیا۔ اس کے بعد صوبہ جزیرہ کو متواتر اپنے حملوں سے پامال کرتا پھرا اور کوئی اس کو نہ روک سکا۔ اس کے بعد وہ جزیرہ کے اکثر قبائل پر سالانہ خراج مقرر کر کے احساء چلا گیا اور بہت سے لوگ قرمطی مذہب میں داخل ہو گئے۔

مکہ مکرمہ پر چڑھائی:

سنہ ۳۱۷ھ میں ابوطاہر نے مکہ مکرمہ پر چڑھائی کی۔ بہت سے حاجیوں کو قتل کیا اور مکہ کو خوب لوٹا۔ میزاب اور خانہ کعبہ کے دروازے کو اکھیڑ ڈالا۔ غلاف کعبہ اتار کر اپنے لشکر میں تقسیم کر دیا اور حجر اسود کو نکال کر اپنے ساتھ ہجر کی طرف لے گیا اور چلتے وقت اعلان کر گیا کہ آئندہ حج ہمارے یہاں ہوا کرے گا۔ حجر اسود کو واپس لینے کے لیے لوگوں نے ابوطاہر سے بہت خط و کتابت کی اور بعض سرداروں نے پچاس ہزار دینار اس کے معاوضے میں دینے چاہے مگر ابوطاہر نے اس کو واپس نہ کیا۔ ابوطاہر نے اس کے بعد مسلسل اپنی حملہ آوریوں کے سلسلے کو جاری رکھا اور عراق و شام کو اپنی تاخت و تاراج سے برباد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اہل دمشق پر بھی اس نے سالانہ ٹیکس مقرر کیا۔

ابوالمنصور:

اس کے بعد اس کا بڑا بھائی احمد قرامطہ کی سرداری و حکومت پر کامیاب ہوا۔ اس کو ابوالمنصور کی کنیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ قرامطہ کے ایک گروہ نے ابوالمنصور کی حکومت سے انکار کیا اور ابوطاہر کے بڑے بیٹے سابور کو مستحق حکومت قرار دیا۔ اس نزاع کو طے کرنے کے لیے قرامطہ نے ابوالقاسم عبیدی کے فیصلے کو قابل تسلیم سمجھ کر افریقہ کو ایلچی روانہ کیے۔ ابوالقاسم عبیدی نے اپنا فیصلہ لکھ کر بھیجا کہ ابومنصور احمد کو بادشاہ تسلیم کیا جائے اور ابومنصور احمد کے بعد سابور بن ابوطاہر تخت نشین ہوگا۔ قرامطہ چونکہ اپنے آپ کو مہدی کا ایلچی اور طرفدار کہتے اور عبیداللہ مہدی کو اس کے دعوے کے موافق امام اسماعیل بن جعفر صادق کی اولاد میں سمجھ کر اس کی تکریم کرتے تھے، اس لیے عبیدیین، قرامطہ کو اپنا دوست سمجھتے اور قرامطہ عبیدیین کی خلافت کو مانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ابوالقاسم کے فیصلے کو بہ خوشی تسلیم کر لیا اور احمد منصور قرامطہ کا بادشاہ بن گیا۔ اس کے بعد جب

سنہ ۳۳۴ھ میں ابوالقاسم عبیدی فوت ہوا اور اس کی جگہ اسماعیل عبیدی افریقہ میں تخت نشین ہوا تو ابومنصور احمد قرامطی نے مبارک باد اور اظہار عقیدت کے لیے ایلچی روانہ کیے۔ سنہ ۳۳۹ھ میں اسماعیل عبیدی نے قیروان سے بار بار ابومنصور کو لکھا کر حجر اسود خانہ کعبہ میں واپس بھیج دو تو ابومنصور احمد قرمطی نے حجر اسود کو خانہ کعبہ میں واپس بھیج دیا۔ ابومنصور کی حکومت میں بیرونی ملکوں پر قرامطہ کے حملے کم ہوئے اور اندرونی انتظامات میں وہ زیادہ مصروف رہا۔

سابور کا قتل:

سنہ ۳۵۸ھ سابور بن ابوطاہر نے اپنے بھائیوں اور ہواخواہوں کی مدد سے ابومنصور کو گرفتار کر کے قید کر دیا اور خود تخت نشین ہو گیا۔ مگر سابور کے بھائیوں نے سابور سے بھی مخالفت کی اور انہوں نے حملہ کر کے اپنے چچا ابومنصور کو جیل خانے سے نکال کر پھر تخت پر بٹھا دیا۔ ابومنصور نے دوبارہ تخت نشین ہو کر سابور کو قتل کیا اور اس کے ہواخواہوں کو جزیرہ اوال کی طرف جلاوطن کر دیا۔ سنہ ۳۵۹ھ میں ابومنصور نے وفات پائی۔ ابومنصور کے بعد اس کا بیٹا ابوعلی حسن بن احمد ملقب بہ ''اعظم'' تخت نشین ہوا۔ اس نے تخت نشین ہو کر ابوطاہر کے تمام لڑکوں کو جزیرہ اوال میں جلاوطن کر دیا۔

حسن اعظم قرمطی:

حسن اعظم قرمطی اپنے خیالات وعقائد میں بہت معتدل تھا۔ اس کو عبیدیین سے کوئی عقیدت نہ تھی اور خلافت عباسیہ سے کوئی نفرت یا عداوت نہ رکھتا تھا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ابوطاہر نے دمشق پر سالانہ خراج مقرر کر دیا تھا اور جو شخص دمشق کا والی ہوتا تھا، وہ خراج کی مقررہ رقم قرامطہ کے بادشاہ کی خدمت میں بھجوا تا رہتا تھا تا کہ قرامطہ کی حملہ آوری اور قتل وغارت سے محفوظ رہے۔ اعظم کی تخت نشینی کے وقت دمشق کو جعفر بن فلاح کتامی نے طنجہ سے فتح کر کے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ اعظم نے حسب معمول والی دمشق سے خراج سالانہ طلب کیا۔ چونکہ اب تک قرامطہ اور عبیدیہ حکومتوں میں محبت واتحاد قائم تھا، لہٰذا توقع یہ ہو سکتی تھی کہ دمشق جبکہ دولت عبیدیہ میں شامل ہو گیا تو بادشاہ قرامطہ دولت عبیدیہ کے سردار جعفر بن فلاح سے دمشق کا خراج طلب نہ کرے گا مگر اعظم نے سختی سے خراج کا مطالبہ کیا اور جعفر بن فلاح نے خراج دینے سے قطعی انکار کیا۔ چنانچہ اعظم نے دمشق کی جانب فوج بھیجی۔ ادھر معز عبیدی کو جو قیروان سے قاہرہ کی جانب آ رہا تھا، یہ حال معلوم ہوا

تو اس نے اراکین دولت قرامطہ کے نام خط بھیجا کہ تم اعظم کو سمجھاؤ کہ وہ دمشق سے متعرض نہ ہو ورنہ پھر ہم ابوطاہر کی اولاد کو تخت سلطنت کا وارث قرار دے کر اعظم کی معزولی کا اعلان کر دیں گے۔ اعظم کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے بلا تامل عبیدیین کی حکومت سے انکار کر کے علم مخالفت بلند کیا اور اپنے ممالک مقبوضہ میں خلافت عباسیہ کا خطبہ پڑھوایا۔ پہلی فوج جو اعظم نے دمشق کی جانب روانہ کی تھی، اس کو جعفر کتامی نے سنہ ۳۶۰ھ میں شکست دی۔ اس کے بعد سنہ ۳۶۱ھ میں اعظم خود فوج لے کر دمشق کی جانب متوجہ ہوا اور میدان جنگ میں جعفر کتامی کو قتل کر کے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ اہل دمشق کو امان دے کر ہر قسم کا انتظام کیا اور فوج لے کر حدود مصر کی طرف بڑھا۔ آئندہ جو واقعات حدود مصر میں پیش آئے اور اعظم کی معز عبیدی سے جو خط و کتابت ہوئی، اس کا حال اوپر معز عبیدی کے حالات میں بیان ہو چکا ہے۔ جس زمانے میں اعظم قرمطی شام و مصر کی طرف مصروف تھا، اس زمانے میں معز عبیدی نے خطوط بھیج کر ابوطاہر کے بیٹوں کو جو جزیرہ اوال میں نظر بند تھے، ترغیب دی کہ تم اس وقت بحرین میں آ کر احساء پر قبضہ کر لو اور خود بادشاہ بن جاؤ اور ایک اعلان اپنی طرف سے ملک بحرین میں شائع کرا دیا کہ ہم نے اعظم کو معزول کر کے ابوطاہر کے بیٹوں کو بحرین کی حکومت عطا کر دی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوطاہر کے بیٹوں نے آ کر احساء کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ یہ حال دیکھ کر بغداد کے خلیفہ طائع عباسی نے ابوطاہر کے بیٹوں کو خط لکھا کہ تم آپس میں فتنہ و فساد برپا نہ کرو اور ہمارے احکام کی تعمیل کرو اور اس بغاوت سے باز رہو، مگر اس کا کوئی اثر ان پر نہ ہوا۔ آخر اعظم نے احساء کی طرف واپس آ کر سب کو درست کیا اور خلیفہ طائع عباسی کے فرستادوں نے آ کر ان میں مصالحت کرا دی۔ سنہ ۳۶۳ھ میں معز عبیدی کی فوجوں نے تمام ملک شام پر قبضہ کر لیا۔ اعظم قرمطی فوجیں مرتب کر کے ملک شام کی طرف آیا۔ تمام ملک شام سے عبیدی فوجوں کو شکست دے دے کر بھگا دیا اور مصر پر حملہ آور ہو کر مقام بلبیس تک پہنچ گیا۔ معز عبیدی نے اعظم قرمطی کی فوج کے ایک بڑے حصے اور بعض عرب سرداروں کو لالچ دے کر اپنی طرف مائل کر لیا۔ اس لیے حسن اعظم کو شکست ہوئی اور وہ احساء کی طرف واپس چلا آیا اور شام پر عرب سرداروں کا قبضہ ہو گیا۔ دمشق پر بعض ترکی سردار قبضہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ معز عبیدی سنہ ۳۶۵ھ میں خود دمشق کی طرف روانہ ہوا۔ اتفاقاً راستے ہی میں فوت ہو گیا۔ اعظم قرمطی نے سنہ ۳۶۶ھ میں حملہ کر کے ملک شام کو پھر فتح کر لیا۔ اس حملہ میں افتگین نامی ترکی سردار اس کے

ساتھ تھا۔ آخر عزیز عبیدی سے حدود مصر میں معرکہ آرائی کی نوبت آئی، جیسا کہ اوپر عزیز عبیدی کے حالات میں بیان ہو چکا ہے۔ افتگین تو گرفتار ہو گیا اور اعظم اپنے دارالسلطنت احساء کی جانب چلا۔ چونکہ اعظم نے خلافت عباسیہ کی اطاعت قبول کر لی تھی اور اس کو عبیدیین سے سخت نفرت تھی، اس لیے قرامطہ اس سے کبیدہ خاطر اور افسردہ دل رہتے تھے۔ ادھر عبیدیوں کی طرف سے قرامطہ کے عام لوگوں میں غیر محسوس طور پر اعظم کے خلاف تبلیغی سلسلہ جاری تھا۔ لہٰذا قرامطہ نے اعظم کے خلاف ایک بغاوت برپا کر دی۔ یہ بغاوت اس لیے زیادہ کامیاب ہو سکی کہ اعظم اپنے دارالسلطنت سے دور ملک شام میں زیادہ مصروف رہا۔ اگر وہ دارالسلطنت کو نہ چھوڑتا تو کوئی بغاوت اس کے خلاف کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب اعظم شام کی طرف سے واپس احساء میں آیا تو تمام اہل شہر کو اپنا مخالف و سرکش پایا۔ اس کی رکابی فوج بھی باغیوں میں شامل ہو گئی۔ انہوں نے اعظم کو گرفتار کر کے ابوسعید جنابی کے تمام خاندان کو حکومت و سلطنت سے محروم کر کے اپنے گروہ میں سے جعفر و اسحاق دو شخصوں کو مشترکہ طور پر تخت حکومت پر بیٹھا دیا اور اعظم اور اس کی اولاد اور رشتہ داروں کو جزیرہ اوال میں جلاوطن کر دیا۔ اس جزیرہ میں ابوطاہر کی اولاد پہلے سے بہ حالت جلاوطنی موجود تھی اور ان کی تعداد زیادہ تھی۔ انہوں نے ان نئے جلاوطنوں کو جزیرہ میں قدم رکھتے ہی حملہ کر کے قتل کر ڈالا۔

جعفر واسحاق:

جعفر واسحاق مل کر قرامطہ پر حکومت کرنے لگے اور انہوں نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہی خلافت عباسیہ کی حکومت سے منحرف ہو کر عبیدیین کو تسلیم کیا اور عبیدی بادشاہ کا خطبہ اپنے مقبوضہ ممالک میں جاری کیا۔ اس کے بعد انہوں نے کوفہ پر حملہ کیا اور قابض ہو گئے۔ صمصام الدولہ بن بویہ نے ایک فوج قرامطہ کی سرکوبی کے لیے کوفہ کی طرف روانہ کی۔ قرامطہ نے اس فوج کو شکست دے کر بھگا دیا اور قادسیہ تک اس کا تعاقب کیا۔ اس کے بعد جعفر اور اسحاق کے درمیان نااتفاقی پیدا ہوئی اور ہر ایک اس کوشش میں مصروف ہوا کہ اپنے حریف کو مٹا کر تنہا بادشاہت کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرامطہ کے گروہ میں اضمحلال و کمزوری کے آثار نمایاں ہو گئے۔ آخر دوسرے قرامطہ سردار بھی اپنی بادشاہت قائم کرنے کی فکر میں مصروف ہو گئے اور نتیجہ

یہ ہوا کہ اصغر بن ابوالحسن تغلبی بحرین پر اور بنی مکرم عمان پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے خلافت عباسیہ کی اطاعت قبول کر لی اور تغلبی خاندان نے سنہ ۳۷۵ھ تک بحرین سے قرامطہ کا نام ونشان مٹا دیا۔

انیسواں باب

دولت قرامطہ باطنیہ (فارس)

قرامطۂ بحرین کا حال اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ ان کی سلطنت کے برباد ہونے کے بعد قرامطہ کے عقائد واعمال میں ایک خاص تبدیلی پیدا ہوئی۔ اگرچہ قرامطہ بحرین کے بادشاہ اعظم کے اعمال وعقائد دوسرے قرامطہ سے جدا تھے اور اس کو مصر کے عبیدی بادشاہ سے سخت نفرت تھی لیکن قرامطہ کی عام جماعت مصر کے عبیدی فرماں روا کو محبت وعقیدت کی نظر سے دیکھتی اور اس کو اپنا خلیفہ مانتی تھی۔ اب جبکہ بحرین کی حکومت ان کے قبضے سے نکل گئی اور عراق وشام میں ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہ رہی تو انہوں نے خفیہ طور پر اپنی انجمنیں قائم کیں اور بہ ظاہر مسلمانوں میں ملے جلے رہے۔ ان خفیہ جماعتوں کے ذریعہ سے انہوں نے اپنی تبلیغ اور اپنی جماعت کو ترقی دینے کا سلسلہ جاری کیا۔ عبیدیوں کی طرح انہوں نے جا بہ جا اپنے داعی مقرر کر دیے۔ ان داعیوں کی جماعت اپنے رازوں کو بہت محفوظ رکھتی تھی۔ زاہدوں اور پیروں کے لباس میں یہ لوگ نظر آتے اور لوگوں کو اپنا مرید بناتے پھرتے تھے۔ ان مریدوں میں جس شخص کو وہ اپنے ڈھب کا پاتے، اس کو رفیق کا خطاب دیتے اور اپنے مخصوص عقائد کی تعلیم کرتے رہتے تھے۔ اس طرح ان میں دو طبقے تھے: ایک داعیوں کا اور دوسرا رفیقوں کا۔ شام، عراق، فارس اور خراسان میں ہر جگہ داعی پھیل گئے۔ مصر کے عبیدی بادشاہ نے ان کی ہر قسم کی امداد کی۔ چنانچہ مصر سے ان داعیوں کے پاس خفیہ طور پر ہر قسم کی امداد پہنچتی رہتی تھی اور سلطنت اسلامیہ کی بربادی کے لیے عبیدیوں نے اسلامی ممالک میں قرامطہ کے داعیوں کا ایک جال غیر محسوس طریقہ پر پھیلا دیا تھا۔ ادھر سلجوقی خاندان ممالک اسلامیہ پر قابض و مسلط ہو رہا تھا اور اس پوشیدہ دشمن سے قطعاً بے خبر تھا۔ قرامطہ بحرین کی حکومت کے مٹنے کے بعد قرامطہ کی تمام تعلیم یافتہ اور ہوشیار جماعت داعیوں کے لباس میں تبدیل ہو گئی تھی اور اسی لیے عبیدی سلطنت کو مصر سے عراق (خراسان) کی طرف آدمیوں کے بھیجنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ چونکہ یہ

لوگ ایک مٹی ہوئی سلطنت کے سوگوار تھے، اس لیے موقع پا کر ڈاکہ ڈالنے اور لوگوں کو قتل کرنے میں انہیں کوئی باک نہ تھا۔ چنانچہ یہی داعی یا پیرا اپنے رفیقوں یعنی خاص مریدوں کی مدد سے رہزنوں اور ڈاکوؤں کے لباس میں بھی تبدیل ہو جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے مریدوں کو تعلیم دی تھی کہ ہر اس شخص کو جو ہمارا ہم عقیدہ نہیں، قتل کرنا کوئی جرم کا کام نہیں۔ اسی لیے ان کے وجود سے مسلمانوں کو سخت مصائب وشدائد میں مبتلا ہونا پڑا۔ چونکہ ان کی کماحقہ سرکوبی ابتدا میں نہ ہوسکی، اس لیے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے۔ مسلمان سرداروں کو چھپ چھپ کر قتل کرنا انہوں نے اپنا خاص شیوہ بنا لیا تھا۔ جس جگہ کوئی حاکم نہایت چست اور چوکس ہوتا، وہاں یہ بالکل خاموش اور روپوش رہتے لیکن جس جگہ انتظام سلطنت کو کسی قدر کمزور پاتے، وہاں قتل وغارت کے ہنگاموں سے تباہی برپا کر دیتے۔ چونکہ قرامطہ نے منافقت اور تقیہ کا لباس پہن لیا تھا اور مسلمانوں کو دھوکہ دینا وہ کارخیر سمجھتے تھے، اس لیے ان کو یہ بھی موقع مل جاتا تھا کہ وہ سلطنت وحکومت کی اہل کاریوں اور سرداریوں پر بھی فائز ہو جاتے تھے۔ چنانچہ نواح ہمدان میں ان کا ایک شخص کسی قلعہ کا قلعہ دار مقرر کر دیا گیا۔ انہوں نے اس قلعہ کو اپنا معاون بنا کر اس کے نواح میں خوب زور شور سے ڈاکہ زنی اور لوٹ مار شروع کر دی۔ چونکہ ان کی جماعت خفیہ طور پر اپنا کام کرتی تھی، اس لیے ان کو باطنیہ گروہ کہنے لگے۔ ان باطنیوں نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے اصفہان کے قلعہ شاہ ور پر قبضہ کر لیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ باطنیہ کے داعیوں میں عطاش نامی ایک مشہور اور ہوشیار شخص تھا، جو اپنے ہم چشموں میں علم وفضل کے اعتبار سے ممتاز تھا۔ اسی نے حسن بن صباح کو اپنے عقائد کی تعلیم دی اور اپنا شاگرد خاص بنایا تھا۔

احمد بن عطاش:

عطاش کا ایک بیٹا احمد نامی تھا جو باپ کی جگہ اور اپنے اور اپنی جماعت میں قابل تکریم سمجھا جاتا تھا۔ احمد اپنے گروہ سے رخصت ہو کر اور اپنی حالت امیر زادوں کی سی بنا کر قلعہ شاہ ور کے قلعہ دار کی خدمت میں گیا اور وہاں نوکر ہو گیا۔ چند ہی روز میں احمد نے ایسی شائستہ خدمات انجام دیں کہ قلعہ دار نے اس کو اپنا نائب بنا لیا اور تمام سیاہ وسفید کا اختیار اس کو سپرد کر دیا۔ چند روز کے بعد وہ قلعہ دار فوت ہو گیا تو احمد نے حکومت وقت سے قلعہ کی حکومت اور قلعہ داری اپنے نام حاصل کر لی۔ احمد بن عطاش نے قلعہ کا راستہ بند ہو جانے کے بعد باطنیہ گروہ کے تمام قیدیوں کو جو اس کے حلقہ حکومت

میں قید تھے، رہا کر دیا اور ان لوگوں نے رہا ہوتے ہی اصفہان کے علاقے میں لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا۔ ادھر احمد نے اصفہان کے قلعہ شاہ ور کی حکومت حاصل کی، ادھر انہیں ایام میں حسن بن صباح علاقہ طالقان وقزوین میں اپنی سازشوں کا جال پھیلا رہا تھا۔

حسن بن صباح:

حسن بن صباح، ملک شاہ بن الپ ارسلان سلجوقی کے وزیراعظم نظام الملک طوسی کا ہم سبق رہ چکا تھا۔ اس نے نظام الملک کے ذریعہ سے دربار سلطانی میں رسوخ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر پھر وہاں اپنا رہنا مناسب نہ سمجھ کر نظام الملک کے ایک رشتہ دار ابومسلم قلعہ دار رے کی خدمت میں چلا آیا اور اس کی مصاحبت میں داخل ہو کر اپنی سازشوں کا جال پھیلانا شروع کیا۔ اتفاقاً ابومسلم کو معلوم ہو گیا کہ حسن بن صباح کے پاس دولت عبیدیہ مصر کے جاسوس آتے جاتے ہیں۔ اس نے حسن بن صباح سے اس کے متعلق استفسار کیا۔ حسن بن صباح کو جب یہ معلوم ہو گیا کہ میری سازش کا راز افشا ہو چکا ہے تو وہ وہاں سے چھپ کر فرار ہو گیا اور مستنصر عبیدی کے پاس مصر پہنچا۔ مستنصر عبیدی نے حسن بن صباح کی خوب خاطر مدارات کی۔ حسن نے مستنصر کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مستنصر نے حسن کو داعی الکبیر کا عہدہ عطا کر کے فارس وعراق کی طرف روانہ کیا کہ وہاں جا کر لوگوں کو میری امامت وخلافت کی دعوت دو۔ مستنصر عبیدی کے تین بیٹے تھے: احمد، نزار اور ابوالقاسم۔ رخصت ہوتے وقت حسن بن صباح نے مستنصر سے دریافت کیا کہ آپ کے بعد میرا امام کون ہوگا؟ مستنصر نے جواب دیا کہ میرا بیٹا نزار تمہارا امام ہوگا۔ چنانچہ مستنصر نے نزار ہی کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔ مستنصر کی وفات کے بعد وزیرالسلطنت اور مستنصر کی بہن نے سازش کر کے ابوالقاسم کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا اور وہی مصر کا فرماں روا ہوا مگر حسن بن صباح نے اس کی امامت کو تسلیم نہ کیا اور نزار ہی کو مستحق امامت مانتا رہا۔ اسی لیے حسن بن صباح کی جماعت کو نزاریہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

حسن بن صباح مصر سے رخصت ہو کر ایشیائے کوچک اور موصل ہوتا ہوا خراسان پہنچا۔ یہاں علاقہ طالقان وقہستان کی حکومت پر جو گورنر مامور تھا، اس نے اپنی طرف سے قلعہ الموت کی حکومت ایک علوی کو سپرد کر رکھی تھی۔ حسن بن صباح اس علوی کے پاس پہنچا۔ اس نے حسن بن صباح کی بے حد تعظیم وتکریم کی اور اپنے پاس ٹھہرایا۔ حسن بن صباح ایک عزیز ومکرم مہمان کی حیثیت سے اور ایک

عابد وزاہد انسان کی حالت میں عرصہ دراز تک قلعہ الموت (الموت میں الف اور لام دونوں مفتوح ہیں) میں مقیم رہ کر درپردہ اس قلعہ پر قبضہ کرنے کی تدبیروں میں مصروف رہا اور جب اس کی تدبیریں مکمل ہوگئیں تو علوی کو قلعہ سے نکال کر خود قلعہ پر قابض ومتصرف ہوگیا۔ یہ زمانہ ملک شاہ سلجوقی کی حکومت کا تھا۔ ملک شاہ کے وزیر نظام الملک طوسی نے اس خبر کو سن کر ایک فوج حسن بن صباح کی سرکوبی اور قلعہ الموت کے محاصرہ پر روانہ کی۔ حسن بن صباح نے اپنے گروہ کے بہت سے آدمیوں کو فراہم کر کے کافی مضبوطی کر لی تھی۔ لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ ابھی یہ سلسلہ جنگ جاری ہی تھا کہ حسن بن صباح نے باطنیہ کے ایک گروہ کو نظام الملک کے قتل پر مامور کیا۔ چنانچہ اس گروہ نے موقع پا کر نظام الملک کو قتل کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فوج جو نظام الملک نے بھیجی تھی، واپس چلی گئی۔ اس کامیابی کے بعد حسن بن صباح اور اس کے دوستوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور بلاتامل اردگرد کے علاقے پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ انہیں ایام میں ایک شخص منور نامی جو سامانی خاندان سے تھا، قہستان کا گورنر یا ناظم تھا۔ اس کی ایک سلجوقی وائسرائے سے مخالفت ہوگئی۔ دونوں کے نزاع نے یہاں تک طول کھینچا کہ منور نے حسن بن صباح سے امداد طلب کی۔ حسن بن صباح نے بلاتامل اپنی فوج بھیج کر قہستان پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ حسن بن صباح کی طاقت وشوکت نے ترقی اختیار کی۔ ادھر ملک شاہ کی وفات کے بعد سلجوقی سرداروں میں خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بہ جائے اس کے کہ وہ حسن بن صباح کا استیصال کرتے، اپنی خانہ جنگیوں میں اس سے مدد طلب کرنے لگے۔ اس طرح حسن بن صباح کی حکومت وسلطنت کا سکہ جم گیا۔ سلطان برکیارق نے اپنے بھائی محمد کے مقابلہ میں ان باطنیوں سے امداد طلب کر کے ان کی عظمت کو اور بھی زیادہ بڑھا دیا مگر چند ہی روز کے بعد سلطان برکیارق کو ان باطنیوں کے قتل عام کا حکم دینا پڑا۔

ادھر احمد بن عطاش نے قلعہ شاہ ور پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ آخر سلجوقیوں نے احمد بن عطاش اور اس کے ساتھیوں کو ہر طرف سے محاصرہ کر کے مجبور کر دیا۔ بہت سے باطنیوں نے سلطان سلجوقی سے اس شرط پر امان کی درخواست کی کہ ہم سب حسن بن صباح کے پاس قلعہ الموت میں چلے جائیں گے اور نواح اصفہان کو بالکل خالی کر دیں گے۔ چنانچہ ان کو اسی شرط پر حسن بن صباح کے پاس جانے کی اجازت دی گئی۔ احمد بن عطاش کو گرفتار کر کے قتل کیا گیا اور اس کی کھال میں بھس بھرا گیا۔ اس کی بیوی نے خودکشی کر لی۔ اس طرح باطنیہ اصفہان کا تو خاتمہ ہوگیا مگر حسن

بن صباح کی طاقت وجمعیت میں خوب اضافہ ہوگیا کیونکہ اب وہی تمام باطنیوں کا مرکز توجہ رہ گیا تھا۔ باطنیوں کے ہزارہا افراد بہ حیثیت داعی شام وعراق وفارس میں پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں علانیہ بھی انہوں نے اپنی دعوت کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ بعض قلعوں پر بھی وہ قابض ومتصرف ہو گئے تھے مگر رفتہ رفتہ مسلمانوں نے ہر طرف سے ان پر حملہ آور ہو کر تمام قلعے ان سے چھین لیے اور حکومت وقوت ان سے جدا کر لی لیکن الموت اور اس کے نواح پر حسن بن صباح کا قبضہ برابر جاری رہا۔ حسن بن صباح کا صحیح نام ونسب اس طرح ہے: حسن بن علی بن احمد بن جعفر بن حسن بن صباح الحمیری۔ سلجوقیوں کی خانہ جنگی اور ضعف واختلال نے باطنیوں کی حکومت کو مستقل وپائیدار ہونے کا موقع دیا، جس کو بعد میں فدائیوں کی سلطنت، سلطنت اسماعیلیہ، سلطنت حشاشین وغیرہ ناموں سے یاد کیا گیا۔ حسن بن صباح جس طرح اس سلطنت وحکومت کا بانی تھا، اسی طرح وہ اپنے فرقہ اور مذہب کا بھی بانی سمجھا گیا۔ اس نے عام باطنیوں کے خلاف بعض نئے نئے طریقے اعمال وعبادات میں ایجاد کیے۔ اس کے تمام مریدین اس کو سیدنا کہتے تھے۔ عام طور پر وہ شیخ الجبل کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ ۳۵ سال قلعہ الموت پر قابض وحکمراں رہا۔ اس عرصہ میں ایک دن کے لیے بھی اس قلعہ سے باہر نہیں نکلا۔

حسن بن صباح کی وفات:

۹۰ سال کی عمر پا کر سنہ ۵۱۸ھ میں بہ تاریخ ۲۸ ربیع الآخر فوت ہوا۔ اس نے اپنے مریدوں میں وحشی اور پہاڑی لوگوں کی ایک ایسی جماعت بنائی تھی جو حسن بن صباح کے اشارے پر جان دینا اپنا مقصد زندگی تصور کرتے تھے۔ ان لوگوں کو فدائیوں کی جماعت کہا جاتا تھا۔ ان فدائیوں کے ذریعہ سے حسن بن صباح دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں، سپہ سالاروں اور اپنے مخالفوں کو ان کے گھروں میں قتل کرا دیتا تھا۔ اس طرح اس کی دھاک دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی اور بڑے بڑے بادشاہ اپنے محلوں اور دارالحکومتوں میں اطمینان کے ساتھ نہیں سو سکتے تھے۔ حسن بن صباح اور اس کی جماعت کو عام طور پر مسلمان نہیں سمجھا جاتا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ یہ ملحدوں کا ایک گروہ تھا، جس کو دین اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر حیرت ہے کہ ہمارے زمانے کا ایک احمق جو ایک دشمن اسلام فرقہ کا پیشوا اور لیڈر بھی سمجھا جاتا ہے، حسن بن صباح اور اس کے متبعین ملاحدہ کے اعمال وحرکات کو دین

اسلام سے منسوب کر کے تعریف کرتا اور اخباروں میں مضامین شائع کراتا ہے، مگر ذرا نہیں شرماتا اور اپنے جہل و نادانی کو علم قرار دے کر فخر ومباہات کو مونچھوں پر تاؤ دیتا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی غفلت بھی دیدنی ہے کہ وہ حسن بن صباح کے قائم کیے ہوئے نزاریہ گروہ کی حقیقت و ماہیت اور اعمال وعقائد سے بے خبر ہونے کی وجہ سے ان باطنیہ فدائیہ ظالموں کو بزرگان دین سمجھ کر حیران و ششدر اور اس دشمن اسلام مضمون نگار کے مضامین کو نعمت عظمیٰ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ ملحد و بے دین اور مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ بدچلن اور اوباش یا مادر پدر آزاد دہریوں کو موقع مل گیا تھا کہ وہ حکومت اسلامیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی ایک چھوٹی سی حکومت قائم کر سکیں اور اپنی بدمعاشیوں سے شرفائے زمانہ کو تنگ کرنے کا آزاد موقع پائیں۔ فدائیوں کی شہرت کا راز صرف اس بات میں مضمر ہے کہ وہ چھپ کر، دھوکہ دے کر، چوری سے یا جس طرح ممکن ہو بڑے آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ آج کل بھی ہم اخبارات میں یورپ کے انارکسٹوں اور نہلسٹوں کے اعمال وافعال کی حکایتیں کبھی کبھی پڑھتے ہیں۔ حسن بن صباح کی قائم کی ہوئی سلطنت کو انارکسٹوں کی سلطنت سمجھنا چاہیے۔

کیا بزرگ امید:

حسن بن صباح کی وفات کے بعد اس کے شاگردوں میں سے ایک شخص جس کا نام کیا بزرگ امید تھا، قلعہ الموت کا حاکم اور حسن بن صباح کا جانشین قرار دیا گیا۔ کیا بزرگ امید کے خاندان میں یہ حکومت سنہ ۶۵۵ھ تک قائم رہی۔ کیا بزرگ امید کے بعد اس کا بیٹا محمد بن کیا بزرگ امید، اس کے بعد اس کا بیٹا حسن بن محمد، اس کے بعد اس کا بیٹا محمد ثانی بن حسن، اس کے بعد جلال الدین محمد ثانی ملقب بہ حسن ثالث، اس کے بعد علاء الدین محمد بن جلال الدین محمد، اس کے بعد رکن الدین خورشاہ بن علاؤالدین حکمراں ہوا۔

رکن الدین خورشاہ:

رکن الدین خورشاہ فدائیوں کا آخری بادشاہ تھا۔ جس کو ہلاکو خان نے بربادی بغداد سے ایک سال پیشتر سنہ ۶۵۵ھ میں گرفتار کر کے فدائیوں کی دولت وحکومت کا خاتمہ کر دیا۔ حسن بن صباح کے بعد قلعہ الموت اور اس کے مضافات پر فدائیوں کی حکومت قائم رہی مگر سو سال تک وہ اپنی مملکت

میں کوئی ترقی اور وسعت پیدا نہیں کر سکے۔ جب چنگیز خاں تاتاریوں کے وحشی گروہ کو لے کر ممالک اسلامیہ کو تاخت و تاراج کرنے لگا تو ان فدائیوں نے بھی ہاتھ پاؤں نکالے اور اپنے رقبہ حکومت کو وسیع کرنا شروع کیا لیکن ابھی یہ پورے طور پر اپنے حوصلے نہ نکال چکے تھے کہ جلال الدین بن علاء الدین خوارزم شاہ نے ان پر چڑھائی کر کے ان کے زور و قوت کو توڑ دیا اور قلعہ الموت میں ان کو محصور کر کے تمام دوسرے قلعوں کو ان سے چھین کر ویران و منہدم کر دیا اور دولت فدائیہ کی حالت بہت ہی سقیم ہو گئی۔ آخر ہلاکو خان نے اس مریض نیم جان کو قید ہستی سے آزاد کیا۔

فدائیوں کے مقتولین:

ان ملحد فدائیوں کے ہاتھ سے جو لوگ قتل ہوئے، ان میں خواجہ نظام الملک طوسی، وزیر اعظم سلطان الپ ارسلان، ملک شاہ سلجوقی، فخر الملک بن خواجہ نظام الملک، شمس تبریزی، پیر طریقت مولوی رومی، نظام الملک معود بن علی وزیر خوارزم شاہ، سلطان شہاب الدین غوری اور بعض عیسائی سلاطین یورپ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اور امام فخر الدین رازی کو بھی ملاحدہ نے قتل کی دھمکی دی تھی مگر وہ بچ گئے، وللہ الحمد!

بیسواں باب

مغولان چنگیزی

ہلاکو خاں کی چڑھائی اور بغداد کی تباہی کا حال اوپر کسی باب میں بیان ہو چکا ہے۔ سلطنت اسلامیہ اندلس کے حالات بھی ہم ختم کر چکے ہیں۔ خلفائے عباسیہ مصر کا اجمالی تذکرہ بھی اوپر ہو چکا ہے۔ عبیدیین مصر کو بھی خلافت وامارت کا دعویٰ تھا۔ ان کے حالات بھی اس سے پہلے باب میں بیان ہو چکے ہیں۔ دسویں صدی ہجری کے ابتدائی حصے میں مصر کے آخری عباسی خلیفہ نے سلطان سلیم عثمانی کو خلافت سپرد کی اور اس کے بعد خاندان عثمانیہ کے سلاطین خلفائے اسلام کہلائے۔ اختصار کو مدنظر رکھنے اور خلافت اسلامیہ کو بیان کرنے والے مورخ کے لیے جائز تھا کہ وہ ناقابل التفات اور چھوٹی چھوٹی اسلامی حکومتوں کو چھوڑ کر خلافت عثمانیہ کا حال بیان کر کے اپنی تاریخ کو زمانہ موجود تک پہنچا دیتا لیکن میں نے سلطان سلیم عثمانی تک خلافت اسلامیہ کے پہنچنے کا حال بیان کر کے پھر عہد ماضی کی طرف واپس ہونا ضروری سمجھا اور بعض ان اسلامی حکومتوں کا ذکر لازمی خیال کیا جو کسی نہ کسی وجہ سے قابل التفات اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والے کے لیے ضروری سمجھی جا سکتی تھی۔ اس طرح ہم کو سلطنت عثمانیہ کی ابتدا سے پہلے کے تمام اہم اور ضروری حالات سے فارغ ہو جانا چاہیے۔ اس کے بعد سلطنت عثمانیہ روم اور اس کی معاصر سلطنتوں کے حالات بیان ہوں گے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی حکومت کا حال میں اس کتاب میں نہ لکھوں گا کیونکہ ہندوستان کی ایک الگ مستقل تاریخ لکھنے کا عزم ہے اور اس میں ہندوستان کی حکومت کے تفصیلی حالات بیان ہوں گے۔ اس وقت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کے خروج کا ذکر کیا جائے، جس کو مورخین نے فتنہ تاتار کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس طرح مغلوں کے تین سو سال کے ابتدائی حالات پڑھنے کے بعد اور شام و ایران کی بعض اسلامی سلطنتوں کے حالات سے فارغ ہو کر ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ سلطنت عثمانیہ کی تاریخ شروع کر دیں۔

ترک، مغول اور تاتار

ایک شبہ کا ازالہ:

تاریخ پڑھنے والے طالب علم کو تاریخی کتابوں کے مطالعہ میں سب سے بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ وہ ترک، مغل، تاتار، ترکمان، قراتاتار وغیرہ قوموں میں نہ امتیاز کر سکتا ہے، نہ ان کی تفریق اور اصلیت سے واقف ہو سکتا ہے۔ وہ کبھی تاریخ میں پڑھتا ہے کہ سلجوقی لوگ مثلاً الپ ارسلان و طغرل بیگ ترک تھے، پھر وہ چنگیز خاں کی نسبت پڑھتا ہے کہ وہ مغل تھا۔ دوسری جگہ اسی کی نسبت پڑھتا ہے کہ وہ ترک تھا پھر چنگیز خاں کے فتنہ کو وہ فتنہ تاتار کے نام سے موسوم دیکھ کر قیاس کرتا ہے کہ مغل، ترک اور تاتار ایک ہی قوم کا نام ہے لیکن آگے چل کر وہ مغلوں اور ترکوں کی مخالفت اور لڑائیوں کا حال پڑھتا ہے، جس سے یقین ہوتا ہے کہ مغل اور ترک دو الگ الگ قومیں ہیں، پھر وہ ہندوستان کے مغلوں کی تاریخ پڑھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ بعض سرداروں کو ترک کہا جاتا ہے اور وہ سلاطین مغلیہ سے رشتہ داریاں رکھتا ہے، پھر دیکھتا ہے کہ مغلوں کو مرزا کہا جاتا ہے اور ان کے نام کے ساتھ بیگ کا خطاب ضرور ہوتا ہے۔ دوسری طرف تیمور بایزید کو برسرپیکار دیکھتا ہے مگر ایران کے بادشاہوں کے نام تاریخ میں پڑھتا ہے تو وہاں بھی مرزا کا لفظ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ دوسری طرف ترکان عثمانی کے یہاں بھی بک یا بے یا بیگ کا خطاب موجود پایا جاتا ہے۔ یورپی مورخین کبھی کبھی ہندوستان کی سلطنت مغلیہ کو ترکی سلطنت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ غرض مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں اور مغلوں کی تفریق کے متعلق ایک بیان اس جگہ درج کیا جائے تاکہ تاریخ کے مطالعہ کرنے والے کو معاملات اور واقعات کو سمجھنے میں آئندہ آسانی ہو۔

ترک کا اطلاق:

آدم ثانی نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے، جن کے نام حام، سام اور یافث تھے۔ یافث کی اولاد بلاد مشرقیہ ملک چین وغیرہ میں آباد ہوئی۔ یافث کی اولاد میں ایک شخص ترک نامی ہوا۔ اس کی اولاد چین و ترکستان میں پھیل گئی اور وہ سب ترک کہلائے۔ بعض لوگ غلطی سے افراسیاب کو بھی ترک سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایران کے شاہی خاندان کیانی سے تعلق رکھتا اور فریدوں کی اولاد میں سے تھا۔

چونکہ وہ ترکستان کا بادشاہ تھا، اس لیے غلطی سے لوگوں نے اس کو ترک قوم میں شمار کیا۔ ترک بن یافث کی اولاد چین وترکستان وختن وغیرہ میں جب خوب پھیل گئی تو انہوں نے امن وامان اور نظام کو قائم رکھنے کے لیے ایک شخص کو اپنا سردار تجویز کرنا ضروری سمجھا۔ رفتہ رفتہ ان میں بہت سے قبیلے اور گروہ پیدا ہو گئے۔ ہر قبیلے اور ہر گروہ نے اپنا ایک ایک سردار بنایا اور یہ تمام سردار ایک سب سے بڑے سردار کے ماتحت سمجھے جاتے تھے۔ لہٰذا ترک بن یافث کی اولاد کے ہر قبیلے پر ترک کا لفظ بولا جاتا تھا اور تمام باشندگان چین وختن وترکستان ترک کہلائے جاتے تھے۔

ترکان غز:

انہیں ترک قبائل میں سے بعض قبائل نے دریائے جیحون کو عبور کر کے عہد اسلامیہ میں ملک فارس وخراسان وغیرہ کے اندر رہزنی وڈاکہ زنی اختیار کی۔ ان قبائل کو ترکان غز کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یورپ وافریقہ اور مراکش تک ان ترکان غز کے پہنچنے کا ثبوت ملتا ہے۔

سلجوقی:

انہیں ترک قبائل میں سے ایک قبیلہ وہ تھا جس کو سلجوقی کہا جاتا ہے۔ غالباً ترک بن یافث کی اولاد میں ترکوں کے اسی قبیلہ نے سب سے پہلے اسلام کو قبول کیا اور ان میں طغرل والپ ارسلان وغیرہ بڑے بڑے عالی جاہ سلاطین ہوئے، جن کی شہرت وعظمت نے تمام دنیا کا احاطہ کر لیا۔

مغول وتاتار:

سلجوقیوں کے مسلمان ہونے اور خراسان کی جانب خروج کرنے سے پہلے ترکوں کے درمیان دو اور نئے قبیلے دو حقیقی بھائیوں کے نام سے نامزد ہو چکے تھے، جن کے نام مغول اور تاتار تھے۔ سلجوقیوں کے مسلمان ہونے اور شہرت وعظمت حاصل کرنے کے وقت یہ دونوں قبیلے ناقابل التفات اور بہت ہی بے حقیقت اور کم حیثیت تھے۔ رفتہ رفتہ مغول وتاتار کی اولاد میں ترقی اور نفوس کی کثرت ہوئی اور دونوں قبیلوں نے الگ ملکوں اور صوبوں میں سکونت اختیار کی اور ان میں جدا جدا سرداریاں قائم ہوئیں۔ ترک بن یافث کی اولاد یعنی ترکوں میں ایک شخص النجہ خان نامی تھا۔ اس کے دو بیٹے توام ولد ہوئے۔ ایک کا نام مغول اور دوسرے کا نام تاتار رکھا گیا۔ ان دونوں سے مغول اور تاتار قومیں پیدا ہوئیں۔ مغول خان کا بیٹا قراخان اور قراخان کا بیٹا ارغون خان تھا، جو اپنے قبیلے

میں سردار سمجھا جاتا تھا۔ اسی ارغون خان کے عہد میں اس کے قبیلے کے ایک شخص نے گاڑی ایجاد کی جو بار برداری کے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی۔ ارغون خان نے اس ایجاد کو بہت پسند کیا اور اس کے موجد کو قانقلی کا خطاب دیا۔ چنانچہ ترکہ زبان میں گاڑی کو قانقلی کہا جاتا ہے اور اس شخص کی اولاد کو قبیلہ قانقلی سے نامزد کیا گیا ہے۔ ارغون خان کے بہت سے بیٹے پیدا ہوئے۔ ایک بیٹے کا نام تنگیز خاں تھا۔ تنگیز خان کا بیٹا منگلی خاں اور منگلی خاں کا بیٹا ایل خان تھا۔ ایل خان کے بیٹے کا نام قیان تھا۔ قیان خاں کی اولاد سے مغلوں کی قوم قیات نامزد ہوئی۔ قیان خان کے بعد اس کا بیٹا تیمور تاش باپ کا جانشین ہوا۔ تیمور تاش کا بیٹا منگلی خان اور منگلی خان کا بیٹا یلدوز خاں اور اس کا جونیہ بہادر تھا۔ جونیہ بہادر کے ایک بیٹی پیدا ہوئی، جس کا نام الان قوا رکھا گیا۔ الان قوا کی شادی اپنے چچازاد بھائی دوبو بیان نامی سے ہوئی۔ دوبو بیان کے نطفہ سے الان قوا کے دو بیٹے یلکدائی اور یک جدائی پیدا ہوئے۔ الان قوا کا شوہر دوبو بیان اپنے قبیلہ کا افسر اور حکمران تھا۔ ان دو بیٹوں کو کم سنی کی حالت میں چھوڑ کر دوبو بیان فوت ہوگیا۔ قبیلہ مغول نے اپنے سردار کے فوت ہونے پر اس کی بیوہ الان کو اپنے قبیلہ کی سرداری تفویض کی۔

ایک روز الان قوا اپنے کمرے میں تنہا رات کے وقت سونے کے لیے لیٹی۔ ابھی نیند نہ آنے پائی تھی کہ اس نے اپنے کمرہ کی کھڑکی یا روشن دان میں سے ایک روشنی داخل ہوتے ہوئے دیکھی۔ یہ روشنی قرص آفتاب کی شکل میں کمرہ میں داخل ہو کر فوراً الان قوا کے منہ میں داخل ہوگئی۔ الان قوا گھبرا کر اٹھی۔ اپنی ماں اور سہیلیوں کو اس واقعہ سے مطلع کیا۔ چند روز کے بعد آثار حمل نمایاں ہوئے۔ لوگوں کو جب حمل کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے طعن و تشنیع شروع کی۔ ملکہ الان قوا نے اکابر قوم کو جمع کیا اور کہا کہ تم چند روز رات کو میرے کمرے کے پاس قیام کرو، تم پر حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے دیکھا کہ ایک نور آسمان سے اترتا اور ملکہ کی خواب گاہ میں جاتا اور پھر شعلہ نور خرگاہ سے نکلتا اور آسمان کو چلا جاتا ہے۔ اس مشاہدے کے بعد سب کو ملکہ کی صداقت کا یقین آیا اور روح القدس سے اس کا حاملہ ہونا تسلیم کیا۔ ایام حمل پورے ہوئے تو الان قوا کے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ جن کے نام بوقون قیقی، بوسفین سالجی اور بوزبخر قاآن رکھے گئے۔ اس طرح الان قوا کے پانچ بیٹے ہوگئے۔ جن میں دو تو دوبو بیان کے نطفہ سے تھے اور تین بلا باپ کے پیدا ہوئے۔[1]

---

[1] یہ من گھڑت واقعہ ہے۔ کتب تاریخ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

یلکد ائی اور یلکجدائی کی اولاد تو قبیلہ درلیکن کے نام سے موسوم ہوئی۔ بوقون قیقی کی اولاد قوم قیقین کے نام سے اور یوسفین سالجی کی اولاد قوم سالجیوت کے نام سے مشہور ہوئی۔ بوز بخر قاآن کی اولاد بودبخری کہلائی۔ الان قوا کی وفات کے بعد بوز بخر اپنی ماں کا جانشین اور قبائل مغول کا حاکم ہوا۔ بوربخر اپنے آپ کو آفتاب کا بیٹا کہا کرتا تھا اور ابومسلم خراسانی مروی کے زمانہ میں موجود تھا۔ اسی بوز بخر کی اولاد میں چنگیز خاں اور تیمور اور مغلوں کے اکثر مشہور قبائل پیدا ہوئے۔ چنگیز خان اور تیمور کا نسبی تعلق معلوم کرنے کے لیے ذیل کے شجرہ پر نظر ڈالیں:

شجرہ نسب

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ترک بن یافث کی اولاد میں ایک شخص النجہ خان تھا، جس کے دو توام بیٹے مغول خان اور تاتار خان پیدا ہوئے تھے۔ انہیں دونوں بھائیوں کی اولاد مغول اور تاتاری دو قومیں بنیں۔ یہ بھی ذکر ہو چکا ہے کہ ان دونوں قوموں نے اپنے لیے الگ الگ مقام سکونت تجویز کیے۔ قبیلہ مغول تو چین کے ملک میں آباد ہوا اور اس کے نام سے ملک کا نام مغولستان یا منگولیا مشہور ہوا۔ قبیلہ تاتار نے دریائے جیحون کے کنارے سکونت اختیار کی اور اس کے نام سے ملک تاتار یا ترکستان کہلایا۔ اس ملک پر چونکہ فریدوں کے بیٹے تور کی حکومت تھی، اس لیے اس کو توران کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

اس کیانی حکمران خاندان میں افراسیاب بہت مشہور ہے اور فردوسی کے شاہنامے [1] میں اس کے حالات مذکور ہیں۔ کیانی خاندان کی یہ شاخ یعنی افراسیاب کی اولاد بھی اسی ملک ترکستان یا توران میں رہ کر ترکوں کے اس قبیلہ تاتار میں مل جل گئی۔ چونکہ ترکستان ممالک اسلامیہ سے زیادہ قریب تھا اور اسلامی فتوحات وہاں تک پہنچ گئی تھیں، لہٰذا ترکوں کے جس قبیلے نے سب سے پہلے ممالک اسلامیہ میں خروج کیا، وہ یہی قبیلہ تاتار تھا جو بہت سے چھوٹے چھوٹے قبائل پر مشتمل تھا۔ ان تاتاری قبائل میں غالباً وہ کیانی قبیلہ جو افراسیاب کی اولاد میں تھا، زیادہ ذی حوصلہ اور معزز سمجھا جاتا ہوگا کیونکہ وہ ایک باشوکت سلطنت کی یادگار تھا۔ لہٰذا سلجوق اعظم کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ہم افراسیاب کی اولاد میں سے ہیں۔ سب سے پہلے سلجوق نامی ایک شخص نے نواح بخارا میں اپنے

---

[1] صدیوں پہلے گزرے، ایران کے مشہور شاعر فردوسی کی مشہور کتاب جس میں اس نے بادشاہوں وغیرہ کے حالات کا ذکر کیا ہے۔

قبیلے کے ساتھ آ کر اسلام قبول کیا۔ اسی سلجوق کی اولاد کو ترکوں کا سلجوق قبیلہ کہتے ہیں۔ سلجوق کے پانچ بیٹے تھے۔ جن میں ایک بیٹے کا نام اسرائیل اور ایک کا نام میکائیل رکھا گیا۔ اسرائیل کو سلطان محمود غزنوی نے کالنجر کے قلعہ میں قید کر کے بھیج دیا تھا جو محمود غزنوی کے بیٹے سلطان مسعود کی تخت نشینی کے بعد رہا ہو کر اپنے قبیلہ میں واپس گیا۔ میکائیل کا بیٹا سلطان طغرل تھا اور طغرل کے دوسرے بھائی چغری بیگ کا بیٹا سلطان الپ ارسلان سلجوقی تھا، جن کے حالات اوپر کسی باب میں بیان ہو چکے ہیں۔ اس طرح سلجوقی قبیلہ کو اگر افراسیاب کی اولاد میں تسلیم کر لیا جائے تو وہ ترک نہ تھا بلکہ کیانی قبیلہ تھا۔ ترکستان میں رہنے والے ترکوں یعنی تاتاریوں نے بھی بار بار ایران و خراسان میں اپنی ترک تاز دکھائی۔ انہیں میں سے ایک قبیلہ وہ تھا جس نے سلطنت عثمانیہ کی بنیاد ڈالی اور جو ترکان عثمانی کے نام سے مشہور اور جن کے حالات آئندہ بیان ہونے والے ہیں، ان شاء اللہ!

لفظ مغول کی تحقیق:

اس جگہ یہ بھی بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ مغول نام ہے مغول خان کی اولاد کا اور ہر ایک فرد پر بھی مغول ہی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مغول کا مخفف مغل ہے۔ جو لوگ مغل کی جمع مغول سمجھتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ مغول جمع نہیں بلکہ واحد ہے۔

فراتاتار:

مغول و تاتار ایک دوسرے سے جدا ہو کر اور جدا جدا ملکوں میں سکونت اختیار کر کے ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے اور چڑھائیاں کرتے رہے۔ جب تک کیانی خاندان ملک توران پر حکمراں رہا، اس نے تاتاریوں کا ساتھ دیا اور مغول ہمیشہ مغلوب و مقتول ہوتے رہے اور ان کو کبھی تاتاریوں پر چیرہ دستی حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ان لڑائیوں میں مغلوں کی اکثر عورتیں تاتاریوں کے قبضے میں آ جاتی تھیں۔ ان عورتوں سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی، اس اولاد کو تاتاری لوگ باندی بچہ سمجھتے اور اپنے ترکہ کا وارث نہیں بناتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس قسم کے لوگوں کی کثرت ہوئی اور ان کی شادیاں اسی قسم کے پرستار زادوں میں ہونے لگیں۔ اس طرح ایک الگ قوم تیار ہو گئی، جس کو فراتاتار کا خطاب دیا گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ انہیں لوگوں کو ترکمان کہا جاتا ہے۔ یہ تاتاریوں کی مغلوں سے نفرت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے مغل عورتوں کی اولاد کو اپنا ہمسر نہ سمجھا ورنہ حقیقتاً مغل اور

تا تار ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

بعض لوگ غلطی سے قوم اوزبک کو تا تاری قوم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اوزبک چنگیز خاں کی اولاد میں سے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ یہ غلط فہمی غالباً اس لیے پیدا ہوئی کہ ہندوستان کے سلاطین مغلیہ کی قبیلہ اوزبک کے کئی فرماں رواؤں سے لڑائیاں ہوئی ہیں اور وہ اوزبک اس زمانے میں ملک ترکستان کے بادشاہ تھے۔ ان کو ترکستان کا بادشاہ دیکھ کر آج کل کے تاریخ دانوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ تا تاری تھے۔ ہاں تا تاری لوگوں کی سلطنت عثمانیہ سلطنت ہے۔ قبائل مغولیہ میں قچاق، ایغورر، خلج، قاچار، افشار، جلائر، ارلات، دوغلات، قنطرات، سلدوز، ارغون، قوچین، ترخانی، طغائی، قاقشال وغیرہ بہت سی شاخیں ہیں، جن کی تفصیل بیان کرنے کی اس جگہ ضرورت نہیں۔

یہ بات اب بہ خوبی سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ ترک ایک ایسا عام لفظ ہے جو مغلوں اور تا تاریوں کے ہر ایک قبیلہ پر بولا جا سکتا ہے کیونکہ تا تار اور مغل دونوں ایک ہی قبیلہ ترک کی دو شاخیں ہیں۔ مغلوں کا اصل وطن چین ومنگولیا تھا اور تا تاریوں کا وطن ترکستان تھا۔ بعد میں تا تاریوں کو ترک کہنے لگے اور لفظ ترک کی عمومیت محدود ہو کر تا تار کی مترادف رہ گئی۔ اس طرح تا تار کا لفظ عرف عام سے غائب ہو گیا اور ترک و مغل دونوں قوموں کے نام مشہور ہوئے۔ اب بعض مورخین نے اصلیت کی بناء پر مغلوں کو بھی ترک کے نام سے یاد کیا کیونکہ وہ ترک بن یافث کی اولاد سے ہیں۔ بعض نے سلجوقیوں کو بھی ترک کہا اور بعض نے سلاطین عثمانیہ کو بھی اسی وجہ سے مغلوں کا ہم قوم قرار دیا۔ غرض اوپر کے بیان کو اگر بہ غور پڑھ لیا جائے تو تاریخ کے مطالعہ کرنے والے کی بہت سی دقتیں حل ہو سکتی ہیں۔ اب ہم کو فتنہ مغولان چنگیزی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے لیکن اس سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ تا تاریوں کی قوم جو مغلوں سے زبردست ہونے کی وجہ سے مغلوں کو اپنے علاقے سے باہر قدم رکھنے کا موقع نہیں دیتی تھی، ترکستان سے نکل کر خراسان، ایران، عراق، شام، ایشیائے کوچک تک پھیل گئی تھی اور اس قوم کے بہادر اور اولوالعزم افراد وقبائل ممالک اسلامیہ میں بڑے بڑے مناصب اور عہدوں پر فائز ہو کر اپنے قدیمی وطن ترکستان کا خیال چھوڑ چکے تھے۔ ان میں ہر قسم کی تہذیب وشائستگی بھی آ گئی تھی اور مغول قوم کا پشتی دشمن ان کے راستے سے الگ ہو چکا تھا۔ لہٰذا وقت آ گیا تھا کہ یہ قوم بھی اپنے انتہائی جہل وبدتمیزی اور سفا کی و بدتمیزی کے ساتھ اپنے

کوہستانی مامن اور قدیمی وطن کو چھوڑ کر متمدن دنیا میں نکلے اور غافلوں کے لیے تازیانہ عبرت ثابت ہو۔

چنگیز خان

مغلوں کا حلیہ:

مورخین نے ان مغلوں کی تصویر جو الفاظ میں کھینچی ہے، اس طرح ہے کہ یہ لوگ ترکوں سے بہت مشابہ ہیں۔ ان کے چوڑے چکلے سینے، کشادہ چہرے، چھوٹے سرین اور گندمی رنگ ہیں۔ سریع الحرکت اور تیز زن ہیں۔ جب کسی اہم کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اپنی رائے کو ظاہر نہیں کرتے اور دفعتاً اپنی بے خبری کی حالت میں اپنے دشمن پر جا گرتے اور اس کو سنبھلنے کی مہلت نہیں دیتے۔ سینکڑوں حیلے جانتے ہیں اور دشمن کے لیے راہ فرار کو مسدود کر دیتے ہیں۔ ان کی عورتیں بھی مردوں کے ساتھ مل کر لڑتی ہیں اور شمشیر زنی میں کسی طرح مردوں سے کم نہیں ہیں۔ جس چیز کا گوشت ملتا ہے، کھا جاتے ہیں۔ کسی چیز سے پرہیز نہیں کرتے۔ کوئی شخص جاسوس بن کر ان کے ملک میں نہیں جا سکتا کیونکہ وہ اپنے حلیہ سے فوراً پہچان لیا جاتا ہے۔ قتل کرنے میں وہ مرد، عورت، بچے اور بوڑھے سب کو قتل کر دیتے ہیں۔ گویا قتل عام کا مفہوم انہیں کے قتل سے سمجھ میں آتا ہے۔ وہ حملہ کرتے وقت آبادیوں کو بالکل تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مال وزر کی طمع نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود دنیا کو ویران وتباہ کرنا ہے۔

مغلوں کا نظم ونسق:

مغلوں کا ملک چھ صوبوں یا حصوں میں منقسم تھا۔ ہر حصے پر ایک شخص حکمراں تھا اور یہ تمام حکمراں ایک بادشاہ کے ماتحت سمجھے جاتے تھے جو مقام طمغاآچ میں رہتا تھا۔ ان چھ صوبوں میں سے ایک صوبہ کی حکومت جوز بخر ابن الانقوا کے خاندان میں چلی آتی تھی۔ یہاں تک کہ تومنہ خاں ابن بایسنقر خاں تک نوبت پہنچی۔ تومنہ خاں کے گیارہ بیٹے تھے، جن میں سے نو ایک بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور دو دوسری بیوی کے پیٹ سے توام پیدا ہوئے تھے۔ ان دونوں توام بیٹوں کے نام اس نے قبل خان اور قاچولی بہادر رکھے۔

قاچولی کا خواب:

ایک رات قاچولی بہادر نے خواب میں دیکھا کہ اس کے بھائی قبل خان کے گریبان سے ایک ستارہ نکل کر آسمان پر پہنچا اور اپنی روشنی زمین پر ڈالنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ستارہ غائب ہوا اور اس جگہ دوسرا ستارہ پیدا ہو گیا، تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی غائب ہوا اور اس کی جگہ تیسرا ستارہ پیدا ہوا۔ اس تیسرے ستارے کے غائب ہونے پر جو چوتھا ستارہ نمودار ہوا، اس قدر بڑا اور تیز روشنی والا تھا کہ تمام جہان اس کی روشنی سے منور ہو گیا۔ اس بڑے اور روشن تر ستارے کے غائب ہونے پر کئی چھوٹے چھوٹے ستارے آسمان پر نمودار ہوئے اور قاچولی بہادر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس خواب کی تعبیر کے متعلق غور و فکر میں مصروف تھا کہ اس کو پھر نیند آ گئی۔ اب کی مرتبہ اس نے خواب میں دیکھا کہ خود اس کے گریبان سے ایک ستارہ نکلا اور آسمان پر چمکنے لگا۔ اس کے بعد دوسرا، اس کے بعد تیسرا۔ غرض یکے بعد دیگرے سات ستارے نمودار ہوئے۔ ساتویں ستارے کے بعد ایک بہت بڑا اور نہایت روشن ستارا نمودار ہوا، جس کی روشنی سے تمام جہان منور ہو گیا۔ اس بڑے اور روشن ستارے کے غائب ہونے پر کئی چھوٹے ستارے پیدا ہوئے۔ اس کے بعد قاچولی بہادر کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے ان دونوں خوابوں کو اپنے باپ سے بیان کیا۔

تومنہ خان کی تعبیر:

تومنہ خان نے سن کر کہا کہ قبل خان کی چوتھی پشت میں کوئی عظیم الشان بادشاہ پیدا ہو گا اور تیری آٹھویں پشت میں ایک عظیم الشان بادشاہ پیدا ہو گا اور میری نسل میں عرصہ دراز تک حکومت و سلطنت رہے گی۔ اس کے بعد تومنہ خان نے قبل خاں اور قاچولی بہادر دونوں کو آپس میں متحد و متفق رہنے کی نصیحت کی اور دونوں بیٹوں کے درمیان ایک عہد نامہ لکھوا کر دونوں کے دستخط کرائے اور اپنی مہر بھی لگا کر خزانچی کے سپرد کیا کہ یہ عہد نامہ نسلاً بعد نسل باقی اور محفوظ رہنا چاہیے۔ اس عہد نامہ میں لکھا گیا تھا کہ بادشاہت و حکومت قبل خان کی اولاد میں رہے گی اور فوج کی سپہ سالاری قاچولی بہادر کی اولاد سے مخصوص رہے گی۔ تومنہ خان کی وفات کے بعد قبل خان تخت حکومت پر بیٹھا۔ قبل خاں کے بعد قویلہ خان، قویلہ خان کے بعد برتان بہادر اور برتان بہادر کے بعد میسو کا بہادر تخت نشین ہوا۔

چنگیز خان کی ولادت:

۲۰ ذیقعدہ سنہ ۵۴۹ ھ کو میسور کا بہادر کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اسی سال مغولستان کے قاآن اکبر یعنی بادشاہ اعظم کا انتقال ہوا تھا، جس کا نام تموچین تھا۔ لہٰذا میسو کا بہادر نے اپنے اس بیٹے کا نام تموچین رکھا، جو بعد میں چنگیز خاں کے نام سے مشہور ہوا۔ سنہ ۵۶۲ ھ میں میسو کا بہادر فوت ہوا تو تموچین کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی۔ میسو کا بہادر کے بعد تموچین اپنے چھوٹے سے علاقے کا بادشاہ وفرماں روا قرار پایا مگر لوگوں نے اس کو کم عمر اور کم حیثیت سمجھ کر سرداری و سروری سے انکار کیا اور بغاوت وسرکشی کے آثار نمایاں ہوئے۔

چنگیز خاں کا خواب:

اسی حالت میں تموچین نے خواب میں دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں تلواریں ہیں۔ جب اس نے اپنے دونوں ہاتھ مشرق ومغرب کی طرف پھیلائے تو دونوں تلواروں کے سرے افق مشرق اور افق مغرب تک پہنچ گئے۔ یہ خواب اس نے اپنی ماں سے بیان کیا تو اس کو یقین ہو گیا کہ میرا یہ بیٹا مشرق ومغرب کے تمام لوگوں کو آگاہ کرے گا اور اس کے ہاتھ سے بڑی خون ریزی ہو گی۔ اسی طرح اس کی ماں کو معلوم تھا کہ پیدا ہونے کے وقت تموچین کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند تھیں۔ ان کو کھول کر دیکھا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں منجمد خون تھا۔ اس منجمد خون کو دیکھ کر اس وقت بھی سب نے یہی رائے قائم کی تھی کہ یہ لڑکا بڑا خون ریز ہوگا۔ لوگوں کی سرکشی یہاں تک پہنچی کہ سوائے ایک شخص امیر قراچا کے جو قاچولی بہادر کی اولاد سے تھا، باقی تمام اولاد قاچولی بہادر کی بھی تموچین سے باغی ہوگئی۔ تموچین نے اپنے ملک کے متصلہ ملک کے فرماں روا سے، جس کا نام اونگ خان تھا، امداد چاہی اور خود اس کی پناہ میں چلا گیا۔ اونگ خان نے تموچین کی خوب خاطر مدارات اور تسلی وتشفی کی اور اپنے بیٹوں کی طرح اس کی خبر گیری کرنے لگا مگر چند روز کے بعد کچھ جمعیت بہم پہنچا کر چنگیز خاں نے اپنے اس محسن اونگ خاں کے خلاف کارروائی شروع کی اور اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک درہ میں مضبوط ہو بیٹھا اور اپنی مخالفت کا اعلان کیا، آخر لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں اتفاقاً امیر قاچار کے تیر سے اونگ خان سخت زخمی ہوا اور ایک دوسرے سردار یانگ خان نے بہ حالت فرار اس کو قتل کرا دیا۔ اب توقع یہ تھی کہ یانگ خان اور تموچین کے درمیان صلح رہے گی کیونکہ

اونگ خان کو قتل کر کے یانگ خان نے تموچین کی امداد کی تھی مگر چنگیز خان نے اس فتح کے بعد اپنے گرد بہت جلد قبائل کو جمع کر لیا اور لوگوں نے اس کو بہادر دیکھ کر بہ خوشی اس کی سرداری تسلیم کرنی شروع کی۔ ایک شائستہ جمعیت لے کر چنگیز خاں نے یانگ خان کے علاقہ پر فوج کشی شروع کر دی۔ لڑائی میں یانگ خان بھی مقتول ہوا اور چنگیز خان نے ایک وسیع مملکت پر قبضہ کر لیا۔ ان فتوحات کے بعد یکا یک تموچین قبائل مغلیہ کا مرجع و مرکز بن گیا اور اس کی طاقت مغولستان کے قاآن اکبر کی مدمقابل بن گئی۔

نام کی تبدیلی:

اسی اثنا میں ایک شخص جس کا نام تنکیری تھا اور مغل اس کو بڑا عابد وزاہد اور قابل تکریم سمجھتے تھے، چنگیز خاں کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے ایک سرخ آدمی کو دیکھا جو سرخ لباس میں سرخ گھوڑے پر سوار تھا، اس نے مجھ سے کہا کہ تو میسوکا بہادر کے بیٹے سے جا کر کہہ دے کہ وہ آج کے بعد سے اپنا نام تموچین تبدیل کر کے اپنے آپ کو چنگیز خاں کے نام سے موسوم کرے۔ اللہ تعالیٰ کا منشا ہے کہ چنگیز خاں کو بہت سے ملکوں کا بادشاہ بنائے۔ تنکیری کے اس کلام کو سن کر چنگیز خاں نے اس کو دروغ گو تصور کیا مگر اس کی بات کو تسلیم کر لینا اس نے مناسب سمجھا اور اپنے آپ کو چنگیز خاں کے نام سے موسوم کیا۔ ترکی زبان میں چنگیز خاں کا معنٰی بادشاہ ہے، یا شاید چنگیز خاں کے بعد یہ نام بادشاہ کے مترادف قرار پایا۔ چند روز کے بعد تنکیری کا کسی بات پر چنگیز خاں کے ایک مصاحب سے جھگڑا ہو گیا۔ اس نے تنکیری کی گردن پکڑ کر اور اٹھا کر اس زور سے زمین پر پٹکا کہ تنکیری کا دم نکل گیا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ تمام قبائل مغلیہ اور مغولستان پر چنگیز خاں کا قبضہ ہو گیا اور قاآن اکبر بعد مقابلہ زخمی ہو کر مقتول ہوا۔ سب نے چنگیز خان کو قاآن اکبر تسلیم کیا۔ اس کے بعد چنگیز خاں قبائل تاتار کی طرف متوجہ ہوا۔ تاتاریوں کے بادشاہ نے مقابلہ میں اپنے آپ کو کمزور پایا اور اپنی لڑکی کی شادی چنگیز خاں سے کر کے صلح نامہ تحریر کر دیا۔ اس کے بعد تاتاری سرداروں نے اپنے بادشاہ سے بغاوت اختیار کی۔ اس نے مجبور ہو کر چنگیز خاں سے امداد طلب کی۔ بہت کشت وخون ہوا۔ تاتاری بادشاہ خود ہی زہر کھا کر مر گیا اور چنگیز خان کا ملک ختا کے اکثر حصے پر قبضہ ہو گیا۔ چنگیز خاں

درحقیقت مغلوں میں بڑا بیدار مغز اور بہادر آدمی تھا۔ اس کے کاموں سے جو اس نے اپنی مدت العمر میں انجام دیے، اس کی دانائی اور ذہانت کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ اپنی خون ریزی کے لیے شہرت عظیم رکھتا ہے مگر اس زمانے کے دنیا کے حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ وہ اپنے آپ کو خون ریزی سے نہ بچا سکا۔

مغلوں کا مذہب:

مغلوں کے دین و مذہب کا کوئی پتہ نہیں۔ صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ایک خالق و قادر ہستی کا تصور ضرور تھا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے قائل تھے۔ باقی عبادات بہت کچھ ہندوستان کے غیر آریہ یعنی قدیم باشندوں کی عبادات سے مشابہ تھیں۔ اس ملک میں ضرور کوئی نہ کوئی پیغمبر مبعوث ہوئے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نامہ لائے ہوں گے لیکن مرور ایام اور جہالت کے سبب سے مغل اپنے پیغمبر اور آسمانی ہدایت ناموں کو فراموش کر چکے تھے۔ ان میں حرام وحلال کی بھی کوئی قید نہیں تھی۔ ہر ایک چیز کھا لیتے تھے اور ہر ایک کام کر گزرتے تھے۔ کچھ ملک کی آب وہوا، کچھ قبائل کی عداوتیں مل ملا کر اس کا باعث ہوئی تھیں کہ مورخین نے مغلوں کے مذہب کی نسبت لکھ دیا ہے کہ ان کا مذہب انسانوں کو قتل کرنا تھا اور بس۔ ان میں ستارہ پرستی اور عناصر پرستی بھی پائی جاتی تھی۔ اگرچہ ان کو مجوسی نہیں کہہ سکتے تاہم آتش پرستی بھی ان میں موجود تھی۔ مذہب اور عقائد کے اعتبار سے ایسی پست اور جاہل قوم میں چنگیز خان کا وجود ایک مصلح کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے تمام مغولستان میں اپنی مضبوط سلطنت بہت ہی جلد قائم کر لی اور اس کے بعد وہ مغلوں کی اخلاقی و معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سلطان محمد خوارزم شاہ:

یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان محمد خوارزم شاہ ایران، خراسان، کابل، ترکستان وغیرہ ممالک پر قابض ومستولی ہو کر خلافت بغداد کے انہدام وبربادی کے ارادے کر رہا تھا اور براعظم ایشیا میں سب سے زیادہ طاقتور اور زبردست مسلمان بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ عباسی خلیفہ ناصر لدین اللہ اور محمد خوارزم شاہ کے درمیان ناچاقی نے جب یہاں تک نوبت پہنچائی کہ خوارزم شاہ نے بغداد پر چڑھائی کا ارادہ کیا تو خلیفہ نے شیخ شہاب الدین سہروردی کو سفیر بنا کر خوارزم شاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ شیخ ممدوح

نے سلطان کے دربار میں پہنچ کر مناسب تقریر کی اور اس کو بغداد پر چڑھائی کرنے سے باز رہنے کی نصیحت کی۔ خوارزم شاہ نے کہا کہ شیخ صاحب! آپ عباسیوں کے بہت مداح اور خیر خواہ ہیں۔ لہٰذا آپ بغداد کو واپس تشریف لے جائیے۔ میں تو علویوں کو عباسیوں پر ترجیح دیتا ہوں اور عباسی خلافت مٹا کر علویوں کی امداد کرنا چاہتا ہوں۔ میں ضرور بغداد پر چڑھائی کروں گا۔

خوارزم کے لیے تین بزرگوں کی بددعا:

شیخ شہاب الدین سہروردی وہاں سے ناکام واپس ہوئے اور خوارزم شاہ کے لیے بددعا کی کہ الٰہی! اس پر ظالموں کو مسلط کر دے۔ خوارزم شاہ نے فوج لے کر کوچ کیا مگر راستے میں اس قدر برف باری ہوئی کہ فوج کا راستہ بند ہو گیا اور سخت مجبوری کے عالم میں خوارزم شاہ نے چڑھائی کو دوسرے سال کے لیے ملتوی کیا اور راستے ہی سے لوٹ گیا۔ اتفاقاً ایک روز حالت بدمستی میں حکم دیا کہ شیخ مجدالدین کو قتل کر دو۔ چنانچہ وہ شہید کر دیے گئے۔ اگلے دن جب ہوش میں آیا تو اپنی اس حرکت پر پشیماں ہو کر خون بہا شیخ نجم الدین کبریٰ کی خدمت میں بھیجا۔ انہوں نے کہا کہ شیخ شہید کا خون بہا تو میرا اور تیرا سر ہے اور ساتھ ہی ہزارہا مسلمانوں کے سر اس خون بہا میں کاٹے جائیں گے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ مجدالدین اور نجم الدین کی بددعاؤں کا نتیجہ تھا کہ خوارزم شاہ پر آفت نازل ہوئی۔ [1]

چنگیز خان کا سلطان خوارزم سے اقدام صلح:

اس کی تفصیل یہ ہے کہ چنگیز خان نے مغلوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو مٹا کر ایک زبردست سلطنت قائم کر لی تو اس نے مناسب سمجھا کہ اپنے مدمقابل سلطان محمد خوارزم شاہ سے صلح اور دوستی قائم کر لوں کیونکہ دونوں کی حدود ایک دوسرے سے مل گئی تھیں۔ چنگیز خان نے اپنے ایلچیوں کے ہاتھ محمد خوارزم شاہ کی خدمت میں ایک خط بھیجا۔ جس میں لکھا تھا کہ میں نے اس قدر وسیع ممالک فتح کر لیے ہیں اور میرے زیر فرمان اس قدر جنگجو قبائل ہیں کہ اب مجھ کو دوسرے ملکوں

---

[1] اس واقعہ کی سند پتہ نہیں کیسی ہے؟ البتہ ایسے بہت سے واقعات تصوف کی دنیا میں ملتے ہیں جو صریحاً جھوٹے ہوتے ہیں اور مبالغہ آمیزی سے بھرپور۔ سیاق کلام میں ''لوگوں کا خیال ہے کہ......'' بتا رہا ہے کہ یہ واقعہ بھی من گھڑت ہے۔ مؤلف نے بھی بلاتحقیق درج کر دیا ہے۔

کے فتح کرنے کی آرزو اور تمنا نہیں ہے۔ اسی طرح تم بھی بہت سے ملکوں پر قابض و متصرف اور بہت بڑے بادشاہ ہو۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم تم دونوں آپس میں محبت و دوستی کا عہد کریں تاکہ ہر ایک دوستی کی طرف سے مطمئن رہیں اور صلاح وفلاح خلائق میں اطمینان کے ساتھ مصروف ہو جائیں۔ اس خط میں چنگیز خان نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں تم کو اپنے بیٹے کی طرح عزیز سمجھوں گا۔ اس خط کو پڑھ کر محمد خوارزم شاہ نے بہ ظاہر چنگیز خان کے سفیروں کی خاطر مدارات کی اور دوستی کا عہد نامہ لکھ دیا مگر خط کے اس آخری لفظ یعنی بیٹے والے فقرے کو اس نے ناپسند کیا اور اپنی تحقیر سمجھا۔ عہد نامہ میں طرفین نے تجارت کی آزادی کو تسلیم کیا اور تاجر ایک دوسرے کے ملک میں آنے جانے لگے۔ چنگیز خان اگرچہ کافر تھا مگر ہم کو اس کی اس دانائی کی داد دینی چاہیے کہ اس نے ایک زبردست بادشاہ کے خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے آشتی میں ابتداء کی۔ یہ بات بھی اس کی دانائی کی دلیل ہے کہ عہد نامہ صلح میں اسی کی خواہش سے تاجروں کے آنے جانے کی آزادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ بہ ظاہر اس وقت تک چنگیز خان کا کوئی ارادہ ممالک اسلامیہ پر تاخت وتاراج کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس صلح نامہ کے بعد خلیفہ ناصر لدین اللہ عباسی کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک شخص کا سر منڈوا کر اس پر ایک خط چنگیز خان کے نام نقش کیا یعنی جلد میں نوک نشتر سے گود کر سرمہ بھر دیا گیا تھا۔ اس عجیب وغریب خط میں لکھا تھا کہ تم سلطان محمد خوارزم شاہ پر حملہ کر دو اور ہم کو اپنا ہمدرد تصور کرو۔ اس طرح منڈے ہوئے سر پر جب خط لکھا گیا تو چند روز انتظار کے بعد بال سر پر جم آئے اور اس شخص کو چنگیز خان کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ جب وہ شخص چنگیز خان کے پاس پہنچا تو اس نے کہا کہ میں خلیفہ کا ایلچی ہوں اور خلیفہ کا پیغام میرے سر پر منقوش ہے۔ میرے سر کے بال منڈوا دو اور خلیفہ کا پیغام پڑھ لو۔ چنانچہ اس کا سر منڈوا کر چنگیز خان نے خلیفہ کا پیغام پڑھا اور ایلچی سے معذرت کی کہ میں صلح کر چکا ہوں۔ اس لیے اپنے عہد کے خلاف خوارزم شاہ سے چڑھائی اور لڑائی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ خلیفہ کا ایلچی سر منڈوا کر ناکام واپس چلا آیا اور چنگیز خان نے خوارزم شاہ کے نام دوستی ومحبت کو اور زیادہ پائیدار بنانے کے لیے ایک خط لکھا، جس میں خوب اظہار محبت کیا گیا۔ بات یہ تھی کہ خوارزم شاہ قریب تھا اور اس کے ملک کی حدود ملی ہوئی تھیں۔ اس لیے چنگیز خان، خوارزم شاہ سے بہت خائف اور ترساں تھا۔ چنگیز خاں اس بات کو بھی جانتا تھا کہ خلیفہ بغداد، خوارزم شاہ سے بھی زیادہ عظمت و طاقت رکھتا ہے لیکن خلیفہ بغداد کا اس کو کوئی خوف نہ تھا کیونکہ

بہت سے ملک درمیان میں حائل تھے۔

خوارزم شاہ کی غلطی:

اب خوارزم شاہ کی بدنصیبی دیکھئے کہ چنگیز خاں نے اپنا خط ایک ایلچی کو دیا اور اس ایلچی کو ان ساڑھے چارسو مسلمان سوداگروں کے قافلہ کے ساتھ کر دیا جو مغولستان میں بہ غرض تجارت آئے ہوئے تھے اور اب واپس جا رہے تھے۔ سوداگروں کے اس تمام قافلہ کو چنگیز خاں نے اپنا وفد سفارت قرار دیا کیونکہ ان سوداگروں میں بعض بڑے مرتبہ کے اور دربار رس تاجر تھے۔ جب یہ قافلہ مقام انزار میں پہنچا تو خوارزم شاہ کے نائب السلطنت نے جو وہاں موجود تھا، اس قافلہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ قافلہ والوں نے ہر چند کہا کہ ہم مسلمان ہیں۔ سوداگری کے لیے مغولستان گئے تھے، اب واپس آ رہے ہیں اور بادشاہ مغولستان کی طرف سے سفیر بن کر بھی آئے ہیں۔ مگر اس حاکم نے کچھ نہ سنا اور خوارزم شاہ کو لکھا کہ مغولستان سے کچھ جاسوس سوداگر اور سفیروں کے لباسوں میں آئے ہیں۔ میں نے ان کو گرفتار کر لیا ہے۔ ان کی نسبت آپ کا کیا حکم ہے؟ سلطان خوارزم شاہ نے لکھا کہ ان کو قتل کر دو۔ چنانچہ حاکم انزار نے ان ساڑھے چارسو آدمیوں کو بے دریغ تہ تیغ کر کے تمام مال واسباب پر قبضہ کر لیا۔ ان میں سے ایک شخص کسی طرح بچ کر نکل بھاگا اور اس نے جا کر چنگیز خاں کو قافلہ کے مقتول ہونے کا حال سنایا۔

چنگیز خاں نے ایک خط پھر خوارزم شاہ کے پاس نہایت اہتمام واحتیاط کے ساتھ بھیجا اور اس میں لکھا کہ حاکم انزار نے بڑی نالائقی کا کام کیا ہے اور بے گناہ لوگوں کو قتل کر کے جرم عظیم کا مرتکب ہوا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اس کو یا تو میرے سپرد کیا جائے یا آپ خود کوئی عبرت ناک سزا دیں۔ خوارزم شاہ نے اس خط کو پڑھتے ہی چنگیز خاں کے ایلچی کو جو یہ خط لے کر پہنچا تھا، قتل کر دیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ چنگیز خان نے اس کے بعد پھر ایک ایلچی بھیجا اور لکھا کہ ایلچی کو قتل کرنا بادشاہوں کا کام نہیں اور سوداگروں کی حفاظت کرنا بادشاہوں کا فرض ہے۔ میرے مطالبات پر آپ دوبارہ غور فرمائیں۔ جو ایلچی یہ پیغام لے کر گیا، اس کو بھی خوارزم شاہ نے قتل کر دیا۔

یہ حالات سن کر چنگیز خان نے مغولستان وترکستان کے جنگجو قبائل کی فوج مرتب کرنی شروع کی اور خوارزم شاہ کو بادشاہ کے نام سے یاد کرنا چھوڑ دیا بلکہ جب اس کا ذکر آتا تو کہتا کہ وہ بادشاہ نہیں

بلکہ چور ہے کیونکہ بادشاہ ایلچیوں کو قتل نہیں کرتے۔ اتفاق سے انہیں ایام میں ایک سرحدی سردار توق تغان نامی سے کچھ سرکشی کی علامات معائنہ کر کے چنگیز خان نے اپنے بیٹے جوجی خان کو اس کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ توق تغان ماوراء النہر کے علاقے میں چلا آیا، جہاں سلطان خوارزم شاہ بھی کسی سبب سے آیا ہوا تھا۔ جوجی خان نے توق تغان کا تعاقب کر کے اس کو گرفتار کر لیا۔ یہ دیکھ کر خوارزم شاہ نے جوجی خان کی طرف حرکت کی۔ جوجی خان نے خوارزم شاہ کے پاس خط بھیجا کہ آپ مجھ پر حملہ نہ کریں۔ میں آپ سے لڑنے پر مامور نہیں کیا گیا۔ میں تو صرف اپنے باغی کو گرفتار کرنے آیا تھا، میرا مقصد حاصل ہو چکا ہے اور میں واپس جا رہا ہوں۔ مگر خوارزم شاہ نے اس پر کوئی التفات نہ کیا اور جوجی خان پر حملہ آور ہوا۔ لڑائی ہوئی، شام تک زور آزمائی میں کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ رات کو جوجی خان اپنی لشکر گاہ میں آگ جلتی ہوئی چھوڑ کر مغولستان کی طرف کوچ کر گیا اور تمام حالات چنگیز خان کو سنائے۔ چنگیز خان یہ حالات سنتے ہی مغلوں کا لشکر عظیم لے کر ایران اور ممالک اسلامیہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس جگہ ہم کو سکون قلب کے ساتھ غور کر لینا چاہیے کہ ایک مسلمان بادشاہ سے کیسی نالائق حرکات سرزد ہوئیں اور ایک کافر بادشاہ کن حالات اور کن مجبوریوں میں ممالک اسلامیہ پر حملہ آور ہوتا ہے۔ جہاں تک عدل وانصاف سے کام لیا جائے گا، ابھی تک چنگیز خان کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

چنگیز خان کی ممالک اسلامیہ کی طرف توجہ:

سنہ ۶۱۵ھ میں چنگیز خان فوج لے کر ممالک اسلامیہ کی طرف متوجہ ہوا اور مقام انزار کے قریب پہنچ کر جوجی خان، اوکتائی خان اور چغتائی خان تینوں بیٹوں کو انزار کے محاصرے پر مامور کیا اور الاق نویان ومنکو بوقا کو خجند اور بناکت کی فوج دے کر روانہ کیا اور خود اپنے چھوٹے بیٹے تولی خان کو ہمراہ لے کر بخارا کی طرف متوجہ ہوا۔ مغلوں کے اس حملہ کا حال سن کر خوارزم شاہ نے ساٹھ ہزار فوج حاکم انزار کی مدد کے لیے روانہ کی اور تیس ہزار سوار بخارا کی طرف بھیجے۔ دو لاکھ دس ہزار فوج سمرقند کی حفاظت پر مامور کی اور ساٹھ ہزار آدمی برج اور قلعہ کی تعمیر واستحکام کے لیے مقرر کر کے خود سمرقند سے خراسان کی طرف روانہ ہوا۔

خوارزم شاہ کی بزدلی:

خوارزم شاہ سے بڑی غلطی یا بزدلی یہ ظاہر ہوئی کہ اس نے باوجود اتنی بڑی فوج کے خود چنگیز خان کا مقابلہ نہ کیا بلکہ میدان جنگ سے پیچھے ہٹ آیا۔ اپنے بادشاہ کو خراسان کا عازم دیکھ کر یقیناً فوج کے دل چھوٹ گئے ہوں گے۔ اس پر طرہ یہ کہ جب سمرقند سے چلنے لگا تو خندق پر پہنچ کر کہنے لگا کہ ہم پر اتنی بڑی قوم نے حملہ کیا ہے کہ اگر وہ صرف اپنے تازیانے ڈالیں تو سمرقند کی یہ خندق تمام وکمال پر ہو جائے۔ یہ سن کر سمرقند کے محافظ لشکر پر مغلوں کی اور بھی ہیبت طاری ہوگئی۔ خوارزم شاہ سمرقند سے روانہ ہوکر بلخ پہنچا اور اپنے اہل وعیال اور خزانے کو ماژندان بھیج دیا۔ بلخ میں آ کر امراء اور سرداروں سے مشورہ کیا کہ مغلوں کے مقابلے میں کیا تدابیر اختیار کرنی چاہیئیں؟ خوارزم شاہ کے سات بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک بیٹے نے، جس کا نام جلال الدین تھا، باپ کو خائف وترساں دیکھ کر کہا کہ آپ اگر عراق کی طرف جانا چاہتے ہیں تو شوق سے چلے جائیے، فوج کی سرداری مجھ کو عنایت کیجیے۔ میں فوج لے کر دشمن پر حملہ کرتا ہوں اور ان شاء اللہ تعالیٰ دریائے جیحون کے پار جا کر اپنا خیمہ نصب کروں گا۔ ماوراء النہر کی حفاظت میرے سپرد کیجیے اور آپ عراق وخراسان کو سنبھالیں۔ مگر خوارزم شاہ نے اس بات کو پسند نہ کیا۔ بلخ سے ہرات کی طرف روانہ ہوا۔ اسی اثناء میں خبر پہنچی کہ مغلوں نے بخارا فتح کر کے وہاں کے تمام باشندوں کو قتل کر دیا ہے۔ یہ سن کر خوارزم شاہ اور بھی زیادہ پریشان وہراساں ہوا اور ہرات سے نیشاپور جا کر مقیم ہوا۔ مغلوں نے ابھی تک دریائے جیحون کو عبور کرنے کی جرأت نہیں کی بلکہ وہ ماوراء النہر ہی میں مصروف تاخت وتاراج رہے اور خوارزم شاہ نیشاپور میں مصروف عیش ونشاط رہا۔

ماہ صفر سنہ ۶۱۷ھ میں چنگیز خان کے ایک سردار نے تیس ہزار فوج کے ساتھ دریائے جیحون کو عبور کیا۔ یہ خبر سن کر خوارزم شاہ سخت پریشان ہوا اور اپنے اہل وعیال اور خزانہ کو قلعہ قارون میں بھیج کر خود نیشاپور سے اسفراین چلا گیا۔ مغلوں نے جب دیکھا کہ خوارزم شاہ مقابلہ پر نہیں آتا اور ہمارے خوف سے بھاگتا پھرتا ہے تو ان کے حوصلے بہت بلند ہو گئے۔ انہوں نے بڑھ کر خوارزم شاہ کا تعاقب شروع کر دیا۔ خوارزم شاہ مغلوں کے آگے آگے بھاگتا ہوا قارون وژ میں جہاں اس کے اہل وعیال اور خزانہ موجود تھا، پہنچا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے دوسری طرف سے مغلوں نے اس کا

محاصرہ کرلیا تھا۔ وہاں سے خوارزم شاہ بھاگتا ہوا استرآباد اور استرآباد سے آمل پہنچا۔

خوارزم شاہ کی وفات:

وہاں سے ایک جزیرہ میں جا کر پناہ گزیں ہوا۔ یہاں اس کے پاس خبر پہنچی کہ مغلوں نے قلعہ قارون وژ فتح کر کے خزائن واموال اور اس کے اہل وعیال پر قبضہ کرلیا ہے۔ یہ خبر سن کر اس کو سخت صدمہ ہوا اور اسی رنج وملال میں فوت ہوگیا۔ جن کپڑوں کو پہنے ہوئے فوت ہوا تھا، انہیں میں دفن کر دیا گیا۔ کفن بھی میسر نہ ہوا۔ اب مغلوں نے تمام خراسان وایران میں اودھم مچا دی اور قتل وغارت سے ہولناک تباہی برپا کر دی۔ خوارزم شاہ کے بیٹے بھی جو جا بہ جا صوبوں کی حکومت پر مامور تھے، مغلوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ صرف ایک بیٹا جلال الدین جو سب بھائیوں میں بہادر اور ذی ہوش اور عالی حوصلہ تھا، باقی رہ گیا تھا۔

اس عرصہ میں بخارا، سمرقند وغیرہ مقامات کو مغلوں نے فتح کر کے خراسان میں ہر مقام پر خون کے دریا بہانے شروع کر دیے۔ آخر ربیع الاول سنہ ۶۱۷ھ میں چنگیز خاں نے جیحون کو عبور کر کے بلخ و ہرات میں قتل عام کیا۔ جب خوارزم شاہ کے اہل وعیال گرفتار ہو کر چنگیز خاں کے سامنے حاضر ہوئے تو اس سنگ دل نے عورتوں اور بچوں پر بھی رحم نہ کیا اور سب کو قتل کر دینے کا حکم دیا۔ بلخ وہرات کے بعد نیشاپور، ماژندران، آمل، رے، ہمدان، قم، قزوین اور دبیل، تبریز، طفلیس، مراغہ وغیرہ میں مغلوں نے اس طرح قتل عام کیا کہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو بھی امان نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے اس طرح قتل ہونے کا تماشا اس سے پہلے چونکہ کبھی نہیں دیکھا گیا تھا، لہٰذا عام طور پر مسلمانوں کے دلوں پر مغلوں کی ہیبت چھا گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مغلوں کی ایک عورت کسی گھر میں داخل ہو کر اس گھر کو لوٹتی اور کسی کو یہ جرأت نہ ہوتی کہ اس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھ سکے یا زبان سے کچھ کہہ سکے۔ اہل ہمدان نے جو مغلوں کی تیغ بے دریغ سے بچ رہے تھے، مجتمع ہو کر اور مغلوں کے عامل کو کمزور دیکھ کر علم بغاوت بلند کیا اور اس کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد مغلوں نے اہل ہمدان کو نہایت عبرت ناک اور سفاکانہ طریقہ سے قتل کیا، پھر کسی کو مقابلے اور مقاتلے کی جرأت نہ ہوئی۔

جلال الدین بن خوارزم:

جلال الدین بن خوارزم شاہ اپنے باپ کی وفات کے بعد بحیرہ کاسپین کے جزیرہ سے روانہ ہو

کر شہر تبریز میں آیا۔ یہاں بعض بہادر دوستوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ مغلوں نے اس کو گرفتار کرنا چاہا لیکن مغلوں کی صفوں کو چیر کر مع ہمراہیوں کے نکل گیا۔ وہاں سے روانہ ہو کر غزنین پہنچا۔ یہاں اس کو اپنے ہمدردوں اور دوستوں کی ایک جمعیت مل گئی۔ اس نواح میں جو مغلیہ فوج تھی، اس نے حملہ کیا۔ جلال الدین نے اس کو شکست دے کر بھگا دیا اور یہ غالباً پہلی شکست تھی جو چنگیزی فوج کو جلال الدین کے مقابلے میں حاصل ہوئی۔ اس خبر کو سن کر چنگیز خاں قلعہ طائفان سے روانہ ہو کر بامیان پہنچا۔ یہاں اس کا ایک پوتا یعنی چغتائی خان کا بیٹا ایک تیر کے لگنے سے ہلاک ہوا۔ چنگیز خان نے بامیان کے زن و مرد کے قتل عام کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی عورت حاملہ تھی تو اس کو قتل کر کے اس کے پیٹ میں سے بچے کو نکال کر اس بچہ کی بھی گردن کاٹی گئی۔ سلطان جلال الدین نے مغلوں کی فوج کو شکست فاش دے کر بہت جلد اپنی حالت کو درست اور مضبوط کر لیا اور چنگیز خان کے مقابلے کے لیے مستعد ہو گیا۔ اگر خوارزم شاہ کی جگہ جلال الدین ہوتا تو یقیناً مغلوں کو چیرہ دستی کا یہ موقع ہرگز نہ مل سکتا۔ مگر خوارزم شاہ کی پس ہمتی اور بے وقوفی نے اپنے عظیم الشان لشکر سے کوئی کام بھی نہ لینے دیا اور آبادشہروں کو مغلوں کی خون آشام تلوار سے قتل ہونے کے لیے بے گناہ چھوڑ دیا۔ سلطان جلال الدین جمعیت فراہم کر کے چنگیز خان کے مقابلہ پر مستعد ہو گیا۔ مگر بدقسمتی سے اس جمعیت میں بعض ایسے سردار موجود تھے جو عین وقت پر دھوکہ دے کر مغلوں سے جا ملے اور سلطان جلال الدین کے پاس صرف سات سو آدمی رہ گئے۔ انہیں سے لڑتا بھڑتا دریائے سندھ کے ساحل کی طرف سلطان جلال الدین متوجہ ہوا۔ چنگیز خان بھی اپنا لشکر عظیم لیے ہوئے وہاں پہنچ گیا۔ جلال الدین نے دریائے سندھ کو اپنی پشت پر رکھ کر لشکر مغول کا مقابلہ کیا۔ مغلوں نے کمان کی شکل میں محاصرہ کر کے ہنگامہ کارزار گرم کیا مگر جلال الدین نے اس بہادری اور جواں مردی سے مقابلہ کیا کہ چنگیز خاں اور اس کی لاتعداد فوج کے دانت کھٹے کر دیے۔ سلطان جلال الدین جب حملہ آور ہوتا تھا، مغلوں کی صفوں کو دور تک پیچھے ہٹا دیتا تھا مگر وہ پھر فراہم ہو کر بڑھتے اور پہلے سے زیادہ جوش کے ساتھ حملہ آور ہوتے تھے۔ اپنی جمعیت کی قلت اور دشمنوں کی کثرت کے سبب سے اس معرکہ آرائی میں سلطان جلال الدین کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ مگر سلطان جلال الدین کی شجاعت و بہادری کا سکہ چنگیز خان کے دل پر بیٹھ گیا۔ یہاں تک کہ ان سات سو بہادروں میں سے بھی جب صرف ایک سو کے قریب باقی رہ گئے تو سلطان جلال الدین نے اپنی زرہ اتار کر پھینک دی اور اپنا

تاج ہاتھ میں لے کر گھوڑا دریائے سندھ میں ڈال دیا۔ اس کے بقیہ ہمراہیوں نے بھی اپنے سلطان کی طرح کیا۔ چنگیز خان نے چاہا کہ مغلوں کا لشکر بھی اس کا تعاقب کرے اور اس بہادر شخص کو گرفتار کر کے لائے لیکن اس بحر ذخار میں گھوڑا ڈالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ چنانچہ چنگیز خان اور مغل دریائے سندھ کے کنارے پر رک گئے اور دریائے سندھ کے اندر ان مٹھی بھر بہادروں پر تیروں کا مینہ برساتے رہے۔ یہاں تک کہ صرف سات آدمی مع سلطان جلال الدین کے کنارے پر پہنچ گئے۔ باقی سب دریا کے اندر مغلوں کے تیروں سے شہید ہو گئے۔ سلطان جلال الدین نے دریا کے کنارے پر پہنچ کر اپنے کپڑے اتار کر جھاڑیوں پر سکھانے کے لیے ڈال دیے۔ نیزہ زمین پر گاڑ کر اس کی نوک پر اپنا تاج رکھ دیا اور اس کے نیچے دم لینے لگا اور گھوڑے کی زین کو اتار کر خشک ہونے کے لیے سامنے رکھ دیا۔

چنگیز خاں دوسرے کنارے پر کھڑا ہوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور حیران تھا۔ اپنے تمام بیٹوں اور سرداروں کو جو اس کے لشکر میں موجود تھے، سامنے بلا کر کہنے لگا کہ میں نے آج تک ایسا بہادر اور باہمت شخص نہیں دیکھا۔ اس کے ہمراہی بھی اس کی مانند بے نظیر بہادر ہیں۔ اتنے بڑے عظیم الشان دریا کو اس طرح عبور کرنا بھی انہیں کا کام تھا۔ اگر یہ شخص زندہ رہا تو مجھ کو اندیشہ ہے کہ دنیا سے مغلوں کا نام و نشان گم کر دے گا۔ جس طرح ممکن ہو، اس کو قتل کرنے کی تدبیر سوچی جائے مگر سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ چنگیز خاں متاسف و مغموم دریائے سندھ کے کنارے سے واپس چلا گیا۔ یہ واقعہ سنہ ۶۲۰ھ کو وقوع پذیر ہوا۔

اس کے بعد سلطان جلال الدین نے سندھ میں کچھ فتوحات حاصل کیں اور اس کے بہی خواہ یہاں آ آ کر اس کے ساتھ شامل ہوتے رہے۔ چند روز کے بعد سلطان جلال الدین دریا کو عبور کر کے کرمان کی جانب پہنچا، وہاں سے شیراز گیا۔ اسی عرصہ میں فدائیوں کو متواتر ہزیمتیں دے کر ان کے قریباً تمام قلعوں کو سوائے قلعہ الموت کے منہدم کر دیا۔ فدائی یا باطنی گروہ مغلوں کی اس حملہ آوری کے وقت بہت مطمئن اور مسرور تھا اور مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں سن سن کر یہ لوگ بہت خوش ہو رہے تھے۔ چونکہ یہ لوگ بھی مسلمانوں کے اسی طرح دشمن تھے جیسے کہ مغل، لہٰذا ان کو مغلوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کی تباہ حالت دیکھ کر اپنے مقبوضات کو بہت وسیع کر لیا۔ قرامطہ کی بیخ کنی سلطان جلال الدین کے قابل تذکرہ اور اہم کارناموں میں شمار ہونا چاہیے۔ اب

وہ زمانہ تھا کہ مغلوں کا سیلاب شمال کی جانب متوجہ تھا۔ سلطان جلال الدین نے موقع مناسب سمجھ کر بغداد کا رخ کیا کہ وہاں جا کر خلیفہ ناصرلدین اللہ عباسی کی خدمت میں حاضر ہوکر امداد طلب کروں تا کہ مغلوں کا ممالک اسلامیہ سے اخراج واستیصال بہ آسانی کیا جا سکے۔ خلیفہ کو چونکہ جلال الدین کے باپ سے نفرت تھی، لہٰذا اس نے جلال الدین کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھ کر فوراً امراء کو مامور کیا کہ جلال الدین کو آگے نہ بڑھنے دو اور ہماری مملکت سے باہر نکال دو۔ یہ رنگ دیکھ کر سلطان جلال الدین مقابلہ پر مستعد ہو گیا اور امرائے بغداد کو شکست دے کر بھگا دیا پھر خود وہاں سے بغداد کو چھوڑ کر تبریز کی طرف متوجہ ہوا۔ تبریز پر قابض ہوکر گرجستان کی طرف گیا۔ وہاں کے امراء نے بڑی عزت کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اس کی تشریف آوری کو بہت ہی غنیمت سمجھ کر سب نے اظہار کیا۔

اب سلطان جلال الدین کی حالت پھر درست ہو گئی۔ ادھر مغلوں کا عظیم الشان لشکر اس کے مقابلے پر آیا۔ اصفہان کے قریب معرکہ کارزار گرم ہوا۔ سلطان جلال الدین نے مغلوں کو شکست دے کر بھگا دیا اور فتح عظیم حاصل کر کے تمام ملک گرجستان اور اس کے نواحی علاقوں پر قابض ومتصرف ہو گیا۔ اس کے بعد مغلوں نے بہت تیاری اور عظیم الشان لشکر کے ساتھ سلطان جلال الدین پر حملہ کیا۔ اس حملہ کی تیاریوں کا حال سن کر سلطان جلال الدین نے بغداد اور دوسرے اسلامی درباروں کی طرف ایلچی روانہ کیے کہ اس وقت میری مدد کرو اور اس متفقہ دشمن کا سر کچل لینے دو۔ مگر چونکہ جلال الدین کی بہادری اور شجاعت کی شہرت دور دور تک ہو چکی تھی، اس لیے کسی نے بھی اس بات کو پسند نہ کیا کہ جلال الدین مغلوں پر فتح یاب ہو کر ہمارے لیے موجب خطرہ بنے۔ لہٰذا کوئی امداد جلال الدین کو کسی طرف سے نہ پہنچی۔ مجبوراً وہ خود ہی مقابلہ کے لیے مستعد ہوا اور ممکن تھا کہ وہ مغلوں کو شکست دے کر ان کے حوصلے پست کر دے اور آئندہ مصائب سے عالم اسلام نجات پائے مگر اللہ تعالیٰ کو یہ بات منظور نہ تھی۔ جلال الدین نے جو جاسوس مغلوں کے لشکر کی نقل وحرکت معلوم کرنے کے لیے مقرر کیے تھے، انہوں نے یہ غلط خبر سلطان کو پہنچائی کہ مغلوں کا لشکر ابھی بہت دور ہے۔ حالانکہ مغل لشکر بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ مغلوں نے آدھی رات کے وقت یکا یک ایسی حالت میں حملہ کیا کہ جلال الدین کو دشمن کے حملہ کی کوئی توقع نہ تھی۔ اس طرح یکا یک اپنے آپ کو دشمن کے پنجہ میں گرفتار دیکھ کر اول اس نے ہاتھ پاؤں مارے اور مصروف جدال وقتال ہوا لیکن جب مایوس ہو گیا تو اس ہنگامے سے نکل کر کسی سمت کو گھوڑا اڑا کر لے گیا۔ اس کے بعد کسی کو اس کا

حال معلوم نہ ہوا؟

سلطان جلال الدین کا انجام:

دو روایتیں سلطان جلال الدین کے انجام کی نسبت مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو کسی پہاڑی شخص نے جبکہ وہ پہاڑ میں کسی جگہ آرام کرنے کے لیے ٹھہرا ہوا تھا، اس کے گھوڑے اور لباس کے لالچ میں دھوکے سے قتل کر دیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ بہ تبدیل لباس اور مشائخ کی خدمت میں حاضر ہو کر عابدوں کی زندگی بسر کرنے لگا اور دور دراز ملکوں میں سفر کرتا رہا اور اسی زہد و عبادت کی حالت میں عرصہ دراز تک زندہ رہا، واللہ اعلم بالصواب۔

چنگیز خاں کی اسلام کے متعلق تحقیق:

چنگیز خاں سلطان جلال الدین خوارزمی کے ہنگامہ سے فارغ ہو کر اور اپنے بیٹے چغتائی خان کو مکران میں چھوڑ کر خود ترکستان ہوتا ہوا ذی الحجہ سنہ ۶۲۱ھ میں سات برس کے بعد مغولستان اپنے وطن میں واپس پہنچا۔ جاتے ہوئے راستہ میں جب بخارا پہنچا تو حکم دیا کہ مسلمانوں میں جو شخص سب سے زیادہ عالم اور اپنے مذہب سے واقف ہو، اس کو میرے سامنے لاؤ تاکہ میں اس سے مذہب اسلام کی حقیقت و ماہیت معلوم کروں۔ اس سات سال کی خون ریزی اور ممالک اسلامیہ کی کشت و گرداوی سے چنگیز خاں کو محسوس ہو گیا تھا کہ اگرچہ مسلمان اس وقت کمزور ہو گئے ہیں مگر اسلام فی نفسہ کوئی معمولی مذہب نہیں بلکہ وہ ایک عظیم الشان نظام اور اعلیٰ ترین اخلاقی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ اس کے حکم کی تعمیل میں قاضی اشرف اور ایک جید عالم اس کے دربار میں پیش کیے گئے۔ چنگیز خان کے دریافت کرنے پر ان دونوں مسلمانوں نے سب سے پہلے توحید باری تعالیٰ کا عقیدہ بالتفصیل بیان کیا۔ چنگیز خان نے کہا کہ میں اس عقیدہ کو تسلیم کرتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے رسالت کا عقیدہ بیان کیا۔ چنگیز خان نے کہا کہ میں اس بات کو بھی قابل قبول مانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی ہدایت کے لیے دنیا میں اپنے ایلچی اور پیغمبر بھیجا کرتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے نماز اور روزہ کے لازمی ہونے کا حال بیان کیا۔ چنگیز خاں نے کہا کہ اوقات معینہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور گیارہ مہینے کے بعد ایک مہینے کے روزے رکھنا بھی معقول بات ہے۔ اس کے بعد انہوں حج بیت اللہ کے فرض ہونے کا حال بیان کیا۔ چنگیز خان نے کہا کہ اس کی ضرورت کو میں تسلیم

نہیں کرتا۔ چنانچہ قاضی اشرف نے تو چنگیز خاں کی نسبت خیال ظاہر کیا کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے لیکن دوسرے عالم نے کہا کہ چونکہ اس نے حج بیت اللہ کا انکار کیا ہے، اس لیے وہ مسلمان نہیں ہوا۔ [1]

اس کے بعد چنگیز خاں سمرقند پہنچا اور وہاں کے مسلمانوں پر بہت مہربانیاں کیں۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ سات برس کے بعد جو فاتح بہت سے اسلامی ملکوں کو فتح کر کے اور لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی خون کی ندیاں بہا کر اپنے وطن کو واپس ہو رہا ہے، وہ اپنے عقیدہ کو اسلام کا ماتحت بنا چکا ہے اور مذہباً مفتوح و مغلوب ہو کر آیا ہے۔ چنگیز خان کے بیٹے تولی خان کے بیٹے قوبلا خان اور ہلاکو خان اس وقت دس سال اور نو سال کی عمر رکھتے تھے۔ چنگیز خان کے یہ دونوں پوتے دادا کے واپس آنے کی خبر سن کر استقبال کو آئے اور راستے میں انہوں نے ایک خرگوش اور ایک آہو کا شکار کیا۔ چونکہ ان لڑکوں کا یہ پہلا شکار تھا، لہٰذا چنگیز خاں نے اس خوشی میں ایک جشن ترتیب دیا اور بہت بڑی ضیافت اہل لشکر کو دی۔ چنگیز خاں کے مغولستان میں واپس آنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہاں بعض امرائے مغول نے مخالفت و سرکشی کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ مغولستان میں پہنچتے ہی چنگیز خان نے سرکش اور مخالف مغلوں کو قتل و غارت کے ذریعہ سے ٹھیک بنایا۔

جانشین کا انتخاب:

اس طرح تمام ہنگاموں سے فارغ ہو کر چنگیز خاں نے اپنے بیٹوں، پوتوں اور سرداروں کو جمع کر کے کہا کہ میرا وقت غالباً اب آخر ہو چکا ہے۔ میں نے تم لوگوں کے لیے بہت بڑا ملک فتح کر دیا ہے۔ تم بتاؤ کہ اب میں کس کو اپنا جانشین نامزد کروں تاکہ تم سب بہ خوشی اس کی اطاعت و فرماں برداری کرو۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ ہم آپ کے تابع فرمان ہیں۔ آپ جس کو اپنا جانشین بنائیں گے، ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ چنگیز خان نے کہا کہ اگر تم اس معاملہ کو میری رائے پر چھوڑتے ہو تو میں اپنا جانشین اوکتائی خان کو بنانا چاہتا ہوں۔ اب تمہارا فرض ہے کہ اس کی اطاعت و فرماں برداری کو ضروری سمجھو۔ اس کے بعد حکم دیا کہ قبل خان اور قاچولی بہادر کا عہد نامہ نکالو جس پر تومنہ خان کی مہر بھی ثبت ہے۔ اس عہد نامہ کو نکال کر سب کو دکھایا اور سب سے اس پر دستخط کرائے اور حکم دیا کہ دشت قبچاق، دشت خزر، الان، روس، بلغار پر جوجی خان کی حکومت رہے گی اور ماوراء

[1] چنگیز خاں کے مسلمان ہونے کے بارے میں کوئی ٹھوس شہادت یا روایت تاریخ میں نہیں ملتی۔ غالب رائے یہی ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہوا۔

النہر، خوارزم، کاشغر، بدخشاں، بلخ، غزنین اور دریائے سندھ تک کا علاقہ چغتائی خان کا ملک سمجھا جائے گا اورقراچار چغتائی خان اور امیر قراچار کے درمیان وہی تعلقات رہیں گے جو میرے اور قراچار کے درمیان تھے یعنی چغتائی خان بادشاہ اور امیر قراچار اس کا سپہ سالار رہے گا اور دونوں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری ملحوظ رکھیں گے۔ چنانچہ اسی مضمون کا ایک عہدنامہ چغتائی خان اورقراچار کے درمیان لکھوا کر اس پر دستخط کیے۔ امیر قراچار، قاچولی بہادر کا پڑپوتا تھا۔ تولی خان کی حکومت میں مغولستان کا ایک حصہ دیا اور حکم دیا کہ اوکتائی خان کی فوج کا اہتمام اور سپہ سالاری خان تولی خان سے متعلق رہے گی، پھر حکم دیا کہ تمام بھائی اپنے بڑے بھائی اوکتائی خان کو اپنا بادشاہ سمجھیں اور اس کی اطاعت وفرماں برداری سے انحراف کا خیال کبھی دل میں نہ لائیں۔ اس طرح چاروں بیٹوں کے متعلق وصیت وانتظام کر کے اپنے بھائیوں اوتگین وگوجین واذلجنکین وغیرہ کو ختا کا ملک دیا۔

چنگیز خاں کی وفات:

اس کے بعد ماہ رمضان سنہ ۶۲۴ھ میں چنگیز خاں نے ۷۳ سال کی عمر اور ۲۵ سال کی حکومت کے بعد وفات پائی۔ اس کی وصیت کے موافق ایک درخت کے نیچے اس کو دفن کیا گیا۔ اس کی قبر کے پاس تمام رقبہ میں پہلے ہی سال اس قدر کثرت سے درخت اگ آئے کہ وہ ایک ناقابل گزر جنگل بن گیا اور کسی کو یہ تمیز نہ رہی کہ اس کی قبر کس جگہ تھی؟ علاوہ مذکورہ چار بیٹوں کے اور بھی کئی بیٹے چنگیز خان کے تھے اور ان میں سے ہر ایک انہیں میں سے کسی نہ کسی کے زیر تربیت رہا۔ چنگیز خان نے ملک روس، ماسکو، بلکیر یا وغیرہ میں جو فتوحات کیں، ان کا مفصل ذکر اس جگہ ضروری معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس کو تاریخ اسلام سے کچھ زیادہ تعلق نہیں۔

چنگیز خاں کے عہد حکومت پر تبصرہ:

چنگیز خاں مغلوں کی قوم میں بڑا عقلمند اور دور اندیش شخص پیدا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے مغلوں کی غیر معروف قوم تمام دنیا میں مشہور ہوگئی۔ اس نے ملک گیری کے نہایت اچھے اور پختہ اصول ایجاد اور قائم کیے۔ وہ اس بات سے واقف تھا کہ مغلوں کی وحشی اور جاہل قوم کو کسی وقت بیکار نہیں چھوڑنا چاہیے، ورنہ پھر یہ آپس میں ایک دوسرے سے لڑ بھڑ کر تباہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس نے ایک

طرف مغلوں کو اتفاق واتحاد کی خوبیاں سمجھانے میں خاص توجہ اور کوشش سے کام لیا تو دوسری طرف ایسے آئین وقوانین قائم کیے کہ مغلوں کی فوج کسی وقت بیکار نہ رہے۔ چنانچہ اس نے ایک مجموعہ قوانین مرتب کیا۔ اس مجموعہ قوانین کا نام تورۂ چنگیزی رتعزیرات چنگیزی ہے۔ مغلوں میں عرصہ دراز تک تورۂ چنگیزی کا مرتبہ مذہبی اور آسمانی کتاب کی مانند سمجھا جاتا تھا۔ تورۂ چنگیزی میں شکار کے لیے بھی قوانین درج ہیں اور مغل بادشاہ کے لیے ضروری ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ جب فتوحات اور جنگ وپکار سے فارغ ہو تو آئین و دستور کے موافق مع فوج شکار میں مصروف ہو۔

چنگیز خاں کی خون ریزی کے ساتھ جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ وہ متکبرانہ الفاظ کم استعمال کرتا تھا تو تعجب ہوتا ہے۔ چنگیز خاں جب کسی بادشاہ کے نام خط لکھتا تو اس کو اول اپنی اطاعت پر آمادہ کرنا چاہتا اور آخر میں لکھتا کہ اگر تم نے اطاعت قبول نہ کی تو اللہ جانے انجام کیا ہو؟ یہ نہ لکھتا کہ میں بہت بڑی جرار فوج رکھتا ہوں اور تم کو ہلاک کر ڈالوں گا۔ اسی طرح وہ ملکوں کی فتوحات کو بھی اپنی یا اپنی فوج کی طرف منسوب نہ کرتا بلکہ یہ کہتا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے فتح عنایت کی اور اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بادشاہ بنایا ہے۔ اپنی نسبت لمبے چوڑے القاب اور مدح وستائش کے الفاظ نہ لکھنے دیتا۔ خود مثل دوسرے سپاہیوں کے تمام کام انجام دیتا۔ خود بھی گھوڑے پر سوار ہو کر لمبی لمبی مسافتیں طے کرتا اور اپنے ہمراہی سواروں سے بھی بڑی بڑی منزلیں طے کراتا۔ اس کا قول تھا کہ ہم کو ہمیشہ جفاکشی اور محنت کا عادی رہنا چاہیے۔ اسی میں ہماری سرداری اور فضیلت کا راز مضمر ہے۔

چنگیز خاں خود طویل القامت اور مضبوط جسم کا شخص تھا۔ وہ ہمیشہ لڑائی کے وقت صف اول میں نظر آتا اور جس طرف حملہ آور ہوتا، دشمن کی صفوں کو درہم برہم کر دیتا تھا۔ اس کی غیر معمولی فتوحات کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ اس کے بیٹے بھی اس کی طرح سپاہی منش اور بہادر جنگجو تھے۔ نیز اس نے مغلوں کی آپس کی رقابتیں دور کر کے اکثر قبائل میں جو اس کے معاون ومددگار تھے، اتفاق اور محبتیں پیدا کر دی تھیں۔

اس نے پانچ شادیاں کی تھیں۔ اس کی پانچوں بیویاں مختلف قبائل اور مختلف قوموں سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس طرح اس کے سسرالی قبائل بھی اس کو اپنا رشتہ دار سمجھ کر دل سے اس کی خیر خواہی میں مصروف تھے۔ تورۂ چنگیزی کے قواعد وقوانین میں ایک یہ بھی اصول بیان ہوا ہے کہ بادشاہ جب کسی نئے شہر کو فتح کرے تو اول وہاں قتل عام کا حکم ضرور دے۔ جب فوج کو آزادانہ قتل عام کا موقع مل

جائے اور اس شہر کی بہت سی آبادی قتل ہو جائے، تب امن وامان کا حکم دے کر با قاعدہ حاکم وہاں مقرر کرنا چاہیے۔اس میں غالباً مصلحت یہ ہوگی کہ وہاں کی رعایا فاتحین سے مرعوب ہو جائے اور پھر کبھی بغاوت وسرکشی کا ارادہ نہ کرے۔ اس قاعدے پر چنگیز خاں نے اپنی فتوحات میں ہمیشہ عمل کیا۔ اگر بہ نظرِغور دیکھا جائے تو اس زمانے کی متمدن دنیا میں سرکشی اور سازشی کوششوں کا اس قدر عام رواج ہوگیا تھا کہ کسی شہر کا کوئی حاکم اور کسی ملک کا کوئی بادشاہ باغیوں کے فتنوں سے محفوظ نظر نہ آتا تھا اور آئے دن بغاوتوں اور لڑائیوں کے ہنگاموں سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق سخت پریشان تھی۔ علویوں، ایرانیوں، شیعوں، فاطمیوں کے خروج کا سلسلہ کسی زمانے میں منقطع نہ ہو سکا تھا۔ عالم اسلام کے ان حالات اور دنیا کے ان واقعات سے چنگیز خاں کو جب واقفیت حاصل ہوئی تو اس نے لوگوں کو خوف زدہ اور مرعوب کرنے کے لیے اس اصول پر عمل کرنا ضروری سمجھا اور اس طرز عمل میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی۔

مغلوں نے سوائے بغداد وعراق اور عرب وہند کے تمام براعظم ایشیا اور کسی قدر براعظم یورپ پر قبضہ کرلیا تھا۔مغلوں کے ہاتھ سے اسلامی سلطنتیں زیادہ تباہ وبرباد ہوئیں اور مسلمان ہی ان کی تلواروں سے زیادہ شہید ہوئے۔ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ مغلوں کے ہاتھ سے اسلام کا نام ونشان گم ہو جائے گا مگر چونکہ اسلام کا محافظ خود اللہ تعالیٰ ہے اور شریعت اسلام ایسی چیز نہیں کہ کوئی مادی طاقت اس کو برباد یا مغلوب کر سکے، لہٰذا بداعمال مسلمان تو مغلوں کے ہاتھ سے تباہ ہو گئے اور مغلوں کی تلوار مسلمانوں کے لیے تازیانہ بن گئی، جس نے ان کو غفلت سے بیدار کیا۔لیکن مغل خود چند ہی روز کے بعد اسلام کے غلام اور خادم نظر آئے۔مغلوں کی اس بڑھی ہوئی طاقت اور سطوت کو دیکھ کر عیسائیوں نے بھی یہ کوشش کی کہ ہم مغلوں کو عیسائیت کی طرف متوجہ کر دیں لیکن عیسائیت کے اندر یہ جذب اور کشش کہاں سے آتی جو ایک فاتح اور جنگجو قوم کو اپنا گرویدہ اور خادم بنا لیتی۔مغل درحقیقت مذہب کے اعتبار سے سادہ لوح تھے۔ان کے آبائی مذہب میں جس کی تفصیلات آج ہم کو معلوم نہیں، کسی مذہب سے کوئی عناد اور خواہ مخواہ کی دشمنی نہ تھی۔اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے مغولستان کے پہاڑوں میں اسی لیے نکالا تھا کہ وہ فاتحانہ براعظم ایشیا میں نکلے اور دین اسلام کی روشنی سے منور وبہرہ یاب ہو۔چنگیز خاں اور اس کی قوم کا وجود بھی اسلام کی صداقت کا ایک عظیم الشان نشان ہے۔ جس طرح اسلام ایک مفتوح پر اپنا اثر ڈالتا ہے، اسی طرح وہ فاتح کو بھی متاثر کرتا ہے۔عربوں نے

تمام دنیا کو فتح کیا اور ہر ملک میں فاتحانہ داخل ہو کر اسلام کے معلم بنے لیکن مغلوں نے غافل مسلمانوں کو مفتوح و مغلوب و مقتول بنا کر اس اثر کو اخذ کیا اور اس دین کے آگے گردنیں جھکا دیں جو ان کے مسلمان مفتوحین کا مذہب تھا۔ اس اجمال کی تفصیل ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں آئے گی۔

اوکتائی خان:

چنگیز خاں کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا اوکتائی خان مغلوں کا بادشاہ تسلیم کیا گیا اور اس کے بھائی اپنے علاقوں اور ملکوں پر جو چنگیز خاں نے مقرر و نامزد کیے تھے، قابض و متصرف ہو گئے۔ دو برس کے بعد اوکتائی قاآن نے اپنے تمام بھائیوں کو طلب کیا اور ایک بہت بڑی ضیافت اور جشن کے سامان مرتب کیے۔ جب سب لوگ آ چکے تو اپنے بھائیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں قاآنی یعنی بادشاہی کے عہدے سے دست بردار ہوتا ہوں۔ آپ جس کو مناسب سمجھیں، اپنا بادشاہ بنا لیں مگر چغتائی خان اور دوسرے بھائیوں اور سرداروں نے بہ اصرار اس کو تخت پر بٹھایا اور مغلوں کی رسم کے موافق سب نے آفتاب کی پرستش کی۔[1] اس کے بعد جوجی خان کا بیٹا باتو خان اور پوتا کیوک خان اور تولی خان کا بیٹا منکو خان مامور کیے گئے کہ روس و بلغاریہ کی طرف فوج کشی کریں۔ چنانچہ ان شہزادوں نے سنہ ۶۳۳ھ میں سات برس کی کوشش کے بعد ان تمام ملکوں کو مفتوح و منقاد کر لیا۔ ارغون خان سپہ سالار کو خراسان کی حکومت و سرداری پر مامور کیا گیا اور حکم ہوا کہ خراسان کے ان شہروں کو جو مغلوں کی تاخت و تاراج سے ویران ہو گئے، از سر نو آباد کیا جائے۔

اوکتائی خان ابن چنگیز خان بہت سنجیدہ مزاج اور شریف طینت شخص تھا۔ اس نے ملکوں کی آبادی اور رفاہ رعایا کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی۔ اوکتائی خان کو مسلمانوں سے خاص طور پر محبت و انسیت تھی۔ وہ مسلمانوں کو قابل تکریم سمجھتا اور ان کو ہر قسم کی راحت پہنچانا چاہتا تھا۔ مغلوں کے دستور کے موافق غوطہ مار کر نہانا گناہ کبیرہ تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ اوکتائی خان اور چغتائی خان دونوں ہمراہ جا رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک مسلمان دریا میں نہا رہا ہے۔ چغتائی خان نے فوراً اس کے قتل کا حکم دیا۔ اوکتائی خان نے کہا کہ اس کو گرفتار کر لو اور مجمع عام میں اس کو قتل کیا جائے۔ اوکتائی خان نے چغتائی خان سے جدا ہو کر تنہائی میں اس مسلمان قیدی سے کہا کہ تو یہ کہہ دینا کہ میرے پاس اشرفیوں کی ایک تھیلی تھی اور مجھ کو ڈاکوؤں کے اندیشہ سے اس کو چھپانے کی

---

[1] یعنی چنگیز خاں اور اس کی اولاد و خاندان وغیرہ سورج کی پوجا کرتے تھے۔

ضرورت تھی۔ لہٰذا میں دریا میں اس کو چھپانے کے لیے داخل ہوا تھا۔ جب اس مسلمان کو مجمع عام میں حاضر کیا گیا تو اس نے اپنی بے گناہی کے ثبوت میں وہی بات کہی جو اوکتائی خان نے اس کو سمجھا دی تھی۔ یہ سن کر دریا میں اس مقام پر اشرفیوں کی تھیلی تلاش کرنے کے لیے آدمی بھیجے گئے۔ اوکتائی خان نے پہلے ہی وہاں تھیلی ڈال دی تھی۔ وہ برآمد ہوئی اور مسلمان کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ چنانچہ اس کو وہ اشرفیوں کی تھیلی اور چند اور تھیلیاں بہ طور انعام دے کر اوکتائی خان نے رہا کردیا۔ اسی طرح جہاں تک اس کو موقع ملتا تھا، وہ مسلمانوں کو نفع پہنچاتا تھا مگر دوسرے مغول مسلمانوں کے دشمن اور ان کو نقصان پہنچانے کے شائق تھے۔

ایک مرتبہ ایک شخص اوکتائی خان کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے رات خواب میں قاآن اعظم چنگیز خان کو دیکھا ہے۔ اس نے مجھ سے فرمایا ہے کہ میرے بیٹے اوکتائی خان سے جا کر میرا یہ پیغام کہو کہ میری خوشی اور خواہش یہ ہے کہ دنیا سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹا دیا جائے اور ان کے قتل کرنے میں ہرگز تامل روا نہ رکھا جائے۔ اوکتائی خان نے کہا کہ تو مغلی زبان جانتا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ میں صرف فارسی میں گفتگو کرسکتا ہوں اور فارسی ہی سمجھ سکتا ہوں۔ اوکتائی خان نے کہا کہ چنگیز خاں سوائے مغلی زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتا تھا اور فارسی قطعاً نہیں بول سکتا تھا۔ تو نے اس کے کلام کو کس طرح سمجھا؟ یہ کہہ کر حکم دیا کہ اس کو قتل کر دیا جائے، یہ جھوٹا آدمی ہے اور چنگیز خاں پر بہتان باندھتا ہے۔ چنانچہ اس کو فوراً قتل کر دیا گیا۔

اوکتائی خان کی نسبت عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اگرچہ علانیہ مسلمان نہ ہوا تھا لیکن پوشیدہ طور پر وہ اسلام کو سچا مذہب یقین کر کے مسلمان ہو چکا تھا۔ اس کا دارالسلطنت قراقورم تھا اور تمام دنیا کی لوٹ کا مال قراقورم میں جمع ہو کر زر و جواہر سے خزانہ معمور تھا۔ اوکتائی خان کی سخاوت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ خراسان اور شام تک لوگ اس کی سخاوت کا شہرہ سن کر قراقورم میں چلے آتے تھے اور مالا مال ہو کر واپس جاتے تھے۔ باپ نے جس طرح ظلم وخون ریزی کے ذریعہ سے دولت جمع کی تھی، بیٹے نے اسی طرح محبت وشفقت کی راہ سے اس کو لوگوں میں تقسیم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی زیادتی اور خشونت سے لوگ ابتداء میں وحشت زدہ اور متنفر تھے تو اوکتائی خان کی سخاوت اور داد و دہش کے سبب سے اس سے محبت کرنے لگے۔ مغلوں کی سلطنت کا بانی اگر چنگیز خاں تھا تو اس کی بنیادوں کو پائیدار و استوار بنانے والا اوکتائی خان تھا۔

کیوک خان:

جب اوکتائی خان کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا کیوک خان قراقورم یا قراقرم میں موجود نہ تھا۔ مغلوں نے اپنے دستور کے موافق اوکتائی خان کی بیوی تورکینا خاتون کو اپنا بادشاہ بنالیا تاکہ کیوک خان کے آنے تک نظام سلطنت میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہ ہو۔ جب کیوک خان قراقورم میں آیا تو اس نے مغلوں کے دستور اور تورۂ چنگیزی کے موافق تخت سلطنت کے متعلق کچھ نہ کہا اور معمولی حیثیت سے رہا۔ سلطانہ تورکینا خاتون نے خود تمام ملکوں میں دعوت نامے بھیجے اور دنیا کے سلاطین کو مدعو کیا۔ چنانچہ خراسان، ایران، قپچاق، روم، بغداد، شام وغیرہ ملکوں سے سلطان کے ایلچی قراقورم میں آئے۔ چنگیز خاں کی اولاد تو تمام موجود ہی ہوگی۔ بغداد کے خلیفہ نے اپنی طرف سے اس مجلس کی شرکت کے لیے قاضی القضاۃ فخرالدین کو بھیجا۔ خراسان سے امیرارغون بھی آیا۔ روم سے سلطان رکن الدین سلجوقی اور الموت وقہستان سے شہاب الدین وشمس اور یورپ کے عیسائی بادشاہوں کی طرف سے بھی ایلچی آئے۔ مسلمان سرداروں کے لیے دو ہزار خیمے کھڑے کے گئے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کیسا عظیم الشان مجمع ہوگا۔ اس کے بعد مجلس منعقد ہوئی اور بادشاہ کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا۔ سب نے کیوک خان کو منتخب کیا۔ منکو خان پسر تولی خان نے کیوک خان کو ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھایا اور تاج شاہی سر پر رکھا۔ کیوک خان کی بیوی ایک عیسائی عورت تھی۔ اس لیے یورپ کے عیسائی ایلچیوں کی خوب خاطر مدارات کی گئی۔ باطنیوں کے ایلچیوں کو کیوک خان نے ذلت کے ساتھ نکال دیا۔

مسلمانوں کے ساتھ بھی وہ مدارات سے پیش آیا مگر عیسائیوں نے کیوک خان کے مزاج میں دخیل ہوکر اس کو مسلمانوں کی طرف سے متنفر کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ کیوک خان سے ایک روز فرمان لکھوایا کہ مسلمانوں کو قتل کرنے اور ان کا نام ونشان دنیا سے مٹا دینے کے لیے تمام سردار آمادہ ومستعد ہو جائیں۔ اس حکم کو لکھوا کر جب وہ باہر نکلا تو اس کے شکاری کتوں نے یکا یک اس پر حملہ کیا اور اس کے خصیتین کو چبا ڈالا۔ کیوک خان کتوں کے اس حملہ سے مرا تو نہیں مگر سخت زخمی ہوا اور عیسائیوں کو اس کے بعد مسلمانوں کی مخالفت میں لب ہلانے کی جرأت نہ رہی۔ عام طور پر شہرت ہوگئی کہ مسلمانوں کی مخالفت پر آمادہ ہونے کی سزا میں کیوک خان کو

شکاری کتوں سے زخمی ہونا پڑا۔

کیوک خان کی موت:

چند روز کے بعد کیوک خان سمرقند جا کر فوت ہو گیا۔ جس زمانے میں اوکتائی خان زندہ تھا، اس کا چھوٹا بھائی تولی خان جو چنگیز خاں کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا، بھائی کے پاس رہتا اور اس کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ تولی خان کو اوکتائی خان کے ساتھ بہت محبت تھی۔ ایک مرتبہ اوکتائی خان بیمار ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اوکتائی خان بالکل تندرست ہو گیا اور تولی خان مر گیا۔ تولی خان کے چار بیٹے تھے: منکو خان، قویلا خان، ارتق بوقا اور ہلاکو خان۔ ان چاروں بھتیجوں کو اوکتائی خان بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس کے بعد کیوک خان بھی اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ بہت رعایت و مروت رکھتا تھا۔ کیوک خان کی وفات کے بعد خاندان چنگیزی میں باتو خان ابن جوجی خان بادشاہ قبچاق سب سے زیادہ طاقتور اور دانا سمجھا جاتا تھا۔ سب نے باتو خان کی طرف رجوع کیا کہ اب بتایئے! کس کو تخت سلطنت پر بٹھایا جائے؟ باتو خان نے فیصلہ کیا کہ کیوک خان کے بعد اب منکو خان سے زیادہ اور کوئی مستحق سلطنت نہیں۔ اکثر سرداروں نے اس کو پسند کیا لیکن بعض نے اس کی مخالفت کی مگر معمولی زد و خورد کے بعد منکو خان کی حکومت و سلطنت قائم ہو گئی۔

منکو خان:

منکو خان نے اپنے بھائی قویلا خان کو ختا کی حکومت سپرد کی اور اپنے دوسرے بھائی ہلاکو خان کو ایک عظیم الشان فوج دے کر ایران کی طرف روانہ کیا۔ منکو خان کی رسم تخت نشینی سنہ ۶۴۸ھ میں ادا ہوئی تھی۔ منکو خان مسلمانوں کے ساتھ بہت رعایت کرتا اور ان کو سب سے زیادہ محبوب رکھتا تھا۔

منکو خان کی وفات:

سات برس سلطنت کر کے سنہ ۶۵۵ھ میں فوت ہوا۔ اپنی سلطنت کے آخری سال میں منکو خان نے چین کے بادشاہ کو لکھا کہ تم اطاعت و فرماں برداری اختیار کرو۔ اس نے انکار کیا تو منکو خان نے چین کے ملک پر چڑھائی کی۔

قویلہ خان:

اسی سفر میں چنکد کے مقام پر منکو خان کا انتقال ہوا۔ اس کا بھائی قویلہ خان جو اس سفر میں بھائی

کے ساتھ تھا، امرائے لشکر کے اتفاق رائے سے مقام چنکد میں ہی تخت نشین کیا گیا لیکن اس خبر کے پہنچنے پر ارتق بوقا نے قراقورم میں تاج شاہی اپنے سر پر رکھا۔ قویلا خان جب قراقورم کی طرف متوجہ ہوا تو ادھر قراقورم سے ارتق بوقا بھی فوج لے کر مقابلہ کے لیے نکلا۔ مقام کلوران میں دونوں بھائیوں کا مقابلہ ہوا۔ سخت لڑائی کے بعد ارتق بوقا کو شکست فاش حاصل ہوئی مگر وہ میدان جنگ سے اپنی جان بچا کر لے گیا اور قویلہ خان نے قراقورم میں داخل ہو کر تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ ارتق بوقا نے ختا کی طرف جا کر فوج جمع کی اور پھر بھائی کے مقابلہ پر آیا۔ اس مرتبہ بھی شکست کھائی اور کاشغر کی طرف بھاگا۔ وہاں سے پھر اپنی حالت درست کر کے آیا۔ غرض چار سال تک ارتق بوقا اور قویلہ خان کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر ارتق بوقا گرفتار ہو کر قید ہوا اور اسی قید میں مر گیا۔

قویلہ خان نے سنہ ۶۵۵ھ میں تخت نشین ہوتے ہی ہلاکو خان کے پاس حکم بھیج دیا تھا کہ دریائے جیحون سے ملک شام تک کے علاقے کی حفاظت و نگرانی تمہارے ذمہ ہے اور تم کو اس علاقے کی حکومت سپرد کی جاتی ہے۔ ارتق بوقا اور قویلہ خان کی جنگ و پیکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی مرکزی حکومت اور دربار قراقورم کا رعب کم ہو گیا اور جہاں جہاں جو سردار مامور تھا، وہ اپنے آپ کو خود مختار اور آزاد بادشاہ سمجھنے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ چنگیزی خاندان کے کئی شہزادے اور سربرآوردہ لوگ علانیہ اسلام قبول کر چکے تھے اور اسلام نے مغلوں کے اندر پھیلنا شروع کر دیا تھا۔

قویلا خان نے ارتق بوقا کے فتنہ سے فارغ ہو کر ملک چین کی طرف فوج کشی کی اور چند سال کی لڑائیوں کے بعد تمام ملک چین کو فتح کر کے قراقورم کو چھوڑ کر ملک چین میں ایک نیا شہر خان بالیغ کے نام سے آباد کر کے اپنا دار السلطنت بنایا اور سیام و برہما و[1] جاپان وغیرہ ملکوں سے خراج وصول کیا۔

قویلا خان نے مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کے چار وزیر مقرر کیے، جن میں ایک مسلمان یعنی امیر احمد بناکتی بھی تھا۔ قویلا خان کی حکومت اور بادشاہی کو تمام مغل سلاطین تسلیم کرتے اور اس کے احکام کو مانتے تھے۔ مغلوں کی سلطنت چین سے لے کر یورپ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسلامی سلطنت بہت ہی ضعیف حالت میں تھی۔ لہٰذا عیسائی، مجوسی اور یہودی مغلوں کے دربار میں رسوخ حاصل کر کے اسلام اور مسلمانوں سے ان کو متنفر کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابا خان ابن ہلاکو خان نے خراسان سے قویلا خان کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ مجھ کو یہودیوں اور

---

[1] سیام و برہما سے مراد برما، تھائی لینڈ کا علاقہ ہے۔

مجوسیوں نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کی کتاب قرآن مجید میں لکھا ہے کہ مشرکوں کو جہاں پاؤ، قتل کرو۔ آپ کا اس تعلیم کے متعلق کیا خیال ہے؟ یعنی اگر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ ہم کو جہاں پائیں، قتل کریں تو اس حالت میں مسلمانوں کی قوم کا دنیا میں باقی رہنا اندیشہ سے خالی نہیں۔ قویلا خان نے اس عرض داشت کو پڑھ کر بعض مسلمان علماء کو بلایا اور پوچھا کہ کیا قرآن مجید میں ایسا حکم موجود ہے؟ انہوں نے کہا کہ "ہاں یہ حکم موجود ہے۔" قویلا خان نے کہا کہ پھر تم ہم کو قتل کیوں نہیں کرتے؟ انہوں نے کہا کہ ہم قوت نہیں رکھتے۔ جب قوت وقدرت پائیں گے، تم کو قتل کریں گے۔ قویلا خان نے کہا کہ اب چونکہ ہم قدرت رکھتے ہیں، لہٰذا ہم کو چاہیے کہ ہم تمہیں قتل کریں۔ یہ کہہ کر ان علماء کو قتل کرا دیا اور حکم جاری کیا کہ مسلمانوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ یہ سن کر بدرالدین بیہقی اور حمیدالدین سمرقندی قویلا خان کے دربار میں پہنچے اور کہا کہ آپ نے مسلمانوں کے قتل عام کا حکم کیوں جاری کیا؟ قویلا خان نے کہا کہ "اقتلوا المشرکین" کا کیا مطلب ہے؟ ان دونوں عالموں نے کہا کہ عرب کے بت پرست جو مسلمانوں کے قتل پر ہمہ تن آمادہ تھے، ان کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا تھا کہ اپنی حفاظت کے لیے ان کو قتل کرو لیکن یہ حکم تمہارے لیے تو نہیں ہے کیونکہ تم تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل ہو اور اپنے فرامین کی پیشانیوں پر اللہ تعالیٰ کا نام ہمیشہ لکھتے ہو۔ یہ سنتے ہی قویلا خان بے حد مسرور ہوا اور اسی وقت حکم صادر کیا کہ میرا پہلا حکم جو مسلمانوں کے قتل کی نسبت جاری ہوا ہے، منسوخ سمجھا جائے۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغلوں کی حالت مذہب کے مقابلے میں کس قدر نازک اور خطرناک تھی۔ جوں جوں ان میں تہذیب اور دماغی نشوونما نے ترقی کی، وہ اسلام سے واقف ہوتے اور اس کو قبول کرتے گئے۔ مغلوں کو اسلام سے روکنے کے لیے دوسرے تمام مذاہب کے پیروؤں نے خوب کوششیں کیں مگر چونکہ مغل خالی الذہن تھے اور ان کی نگاہ میں ہر ایک مذہب کا مرتبہ مساوی تھا، لہٰذا تحقیق کے معاملے میں وہ زیادہ دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ اسی لیے ان کے سمجھدار اور شریف طبقہ نے اسلام ہی کو قابل قبول مذہب پایا۔

قویلا خان کی موت:

قویلا خان ۷۳ سال کی عمر اور ۳۵ سال کی سلطنت کے بعد فوت ہوا۔ اس کی جگہ اس کا پوتا تیمور

خان ملک چین میں تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں انتظام سلطنت درہم برہم ہو گیا۔ سنہ ۷۰۰ھ میں قاآن تیمور خان فوت ہوا۔ اس کے بعد بھی اس خاندان کے چند شخصوں نے برائے نام حکومت کی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تیمور قاآن کے وقت سے قو یلا خان کے خاندان کی بادشاہی رخصت ہو گئی تھی۔ اب ہم کو ہلاکو خان بن تولی خان کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ جس کو ایران وخراسان کی حکومت حاصل تھی اور جس کے ہاتھوں سے خلافت بغداد برباد ہوئی۔

ہلاکو خان:

جب قراقورم میں منکو خان تخت سلطنت پر بیٹھا تو اس کے پاس شکایت پہنچی کہ گروہ باطنیہ اسماعیلیہ کی شرارتیں حد سے متجاوز ہو چکی ہیں اور یہ لوگ بلا قید مذہب وقوم ہر ایک اس شخص کے دشمن ہیں جو تخت وتاج کا مالک یا سرداری وسپہ سالاری کی عزت سے شرفیاب ہو۔ امراء وسرداران لشکر کو ان فدائیوں یعنی باطنیوں کے خوف سے راحت کی نیند نہیں آ سکتی۔ ساتھ ہی یہ اطلاعات بھی پہنچیں کہ خلیفہ بغداد اگرچہ بہ ظاہر کمزور سمجھا جاتا ہے مگر اس کی عظمت وشوکت اس قسم کی ہے کہ اگر وہ مغلوں کے مقابلے پر مستعد ہو گیا تو مغلوں کو اس سے عہدہ برآ ہونا دشوار ہو گا۔ منکو قاآن نے اپنے بھائی ہلاکو خان کو ایک لاکھ بیس ہزار مغلوں کی جرار فوج کے ساتھ روانہ کیا اور حکم دیا کہ دریائے جیحون سے مصر تک کا ملک تمہاری حفاظت اور نگرانی میں دیا جاتا ہے۔ اگر خلیفہ بغداد صلح وآشتی پر قائم رہے تو تم کو اس سے لڑنا نہیں چاہیے لیکن اگر خلیفہ کی نیت غیر ہو تو تمہارا فرض ہے کہ اس کے استیصال میں دریغ نہ کرو۔ ساتھ ہی الموت کے قلعہ میں اسماعیلیوں کا بادشاہ اقامت گزیں ہے، اس کا نام و نشان مٹا دو اور ان اسماعیلیوں کی اچھی طرح بیخ کنی کر دو۔ ہلاکو خان کے ہمراہ امیر آتچل ابن امیر قراچار سپہ سالار روانہ کیا گیا۔

ہلاکو خان سنہ ۶۵۱ھ میں وارد خراسان وایران ہوا۔ آذربائیجان، شروان اور گرجستان وغیرہ کے سلاطین ہلاکو خان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اظہار عقیدت ونیاز مندی کے بعد مورد مراحم خسروانہ ہوئے۔ ارغون آقا اویرات خراسان سے منکو خان قاآن کی خدمت میں روانہ ہوا۔ ہلاکو خان نے خراسان پہنچ کر اور یہاں کے حالات سے واقف وآگاہ ہو کر اول ملاحدہ اسماعیلیہ کی طرف توجہ کی اور یکے بعد دیگرے ان کے قلعوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ یکم ذیقعدہ سنہ ۶۵۶ھ

یکشنبہ کے دن قلعہ الموت فتح ہو گیا اور اسماعیلیوں کا بادشاہ رکن الدین خورشاہ ہلاکو خان کے سامنے گرفتار ہو کر حاضر ہوا۔ ہلاکو خان نے خورشاہ کو منکو خان کی خدمت میں قراقورم کی طرف روانہ کیا اور جن لوگوں کی حراست میں اس کو روانہ کیا تھا، ان کو حکم دیا کہ راستے ہی میں اس کا کام تمام کر دینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ رکن الدین خورشاہ کے اہل وعیال اور متعلقین سب قتل کیے گئے۔ مگر خواجہ نصیرالدین طوسی جو خورشاہ کی مصاحبت میں داخل تھا، اپنی زبان آوری اور ہوشیاری کے سبب سے ہلاکو خان کے مصاحبوں میں داخل ہو گیا۔ اسماعیلیوں کے تمام خزائن و دفائن مغلوں کے ہاتھ سے تاراج ہوئے اور ان کی سلطنت کا چراغ گل ہو گیا۔

اس کے بعد نصیرالدین طوسی نے ہلاکو خان کو بغداد پر فوج کشی کرنے کی ترغیب دی اور خلیفہ بغداد کے وزیر علقمی نے نمک حرامی کی راہ سے نصیرالدین کے ذریعہ سے ہلاکو خان سے ساز باز کی اور بغداد کی تباہی عمل میں آئی۔ بغداد کی بربادی کا مفصل حال اوپر دوسری جلد میں چونکہ بیان ہو چکا ہے، اس لیے اس دل خراش داستان کو یہاں دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ اموال وخزائن بے قیاس بغداد سے لے کر ہلاکو خان مراغہ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہاں سے زر و جواہر کے انبار اور لونڈی غلام قطار در قطار منکو خان کی خدمت میں قراقورم کی طرف روانہ کیے۔ اتابک سعد بن ابوبکر حاکم فارس اور بدرالدین لولو حاکم موصل اور سلطان عزیز الدین سلجوقی حاکم روم نے حاضر ہو کر اظہار اطاعت کیا۔ جمعہ ۲۰ رمضان المبارک سنہ ۶۵۷ھ کو ہلاکو خان نے کئی نامور سرداروں کو فوج دے کر بہ طور ہراول ملک شام کی طرف روانہ کیا اور نصیبین، حران، حلب وغیرہ شہروں کو فتح اور ان کے باشندوں کا قتل عام کرتا ہوا دمشق کی جانب پہنچا۔ دمشق کو بھی اسی طرح فتح کیا اور ملک شام پر قابض ہو کر اور وہاں اپنی طرف سے ایک حاکم کسوقا نامی کو مقرر کر کے ہلاکو خان خراسان کی طرف واپس آیا۔ مصری لشکر نے ملک شام پر حملہ کر کے مغلوں کی فوج کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اس خبر کو سن کر ہلاکو خان بہت رنجیدہ ہوا اور ارادہ کیا کہ ملک شام پر فوج کشی کر کے مصریوں کو شام سے نکالے۔ مگر اسی اثنا میں منکو خان کے فوت ہونے کی خبر پہنچی اور انہیں ایام میں ایک اور واقعہ پیش آیا کہ برکہ خان ابن جوجی خان بادشاہ قپچاق اور ہلاکو خان کے درمیان مخالفت اور نا چاقی پیدا ہوئی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہلاکو خان کے پاس برکہ خان کا کوئی قریبی رشتہ دار تھا۔ اس کو ہلاکو خان نے قتل کر دیا۔ برکہ خان نے سن کر کہا کہ ہلاکو خان نے خلیفہ بغداد کو قتل کیا اور بلاوجہ

لاکھوں مسلمانوں کا خون بہا دیا۔ میں اس سے ان تمام بے گناہوں کا انتقام لوں گا۔ یہ کہہ کر اس نے فوج روانہ کی۔ ادھر سے ہلاکو خان نے بھی اس کے مقابلہ کو فوج بھیجی۔ سنہ ۶۶۰ھ میں جنگ ہوئی اور ہلاکو خان کی فوج نے شکست پائی۔ اس کے بعد لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر سنہ ۶۶۱ھ میں ہلاکو خان خود فوج لے کر برکہ خان کے مقابلہ پر آیا۔ جنگ عظیم کے بعد برکہ خان کی فوج کو شکست ہوئی اور ہلاکو خان نے فتح پائی مگر چند ہی روز کے بعد برکہ خان نے ہلاکو خان پر حملہ کر کے اس کو شکست فاش دی۔ اس شکست سے ہلاکو خان بہت دل شکستہ ہوا۔ اسی عرصہ میں امیر اتچل نے مراغہ میں وفات پائی۔ جب مغلوں نے ملک شام کو فتح کر لیا تھا تو وہاں قوم فرا تاتار کے قبیلوں کو آباد کیا تھا۔

ہلاکو خان کی موت:

اب برکہ خان سے شکست کھانے کے بعد ہلاکو خان نے ایک سردار کو شام کی طرف روانہ کیا کہ وہ فرا تاتار کے قبائل کو ہمراہ لے کر آئے تاکہ ان لوگوں کی فوج برکہ خان کے مقابلہ پر روانہ کی جائے۔ وہ سردار شام میں جا کر اور فرا تاتار کے لوگوں کو اپنے ہمراہ لے کر ہلاکو خان سے باغی ہو گیا۔ یہ خبر مراغہ میں ہلاکو خان کو پہنچی تو وہ اس قدر غمگین وافسردہ ہوا کہ مرض سکتہ میں مبتلا ہو کر سنہ ۶۶۳ھ آخر ماہ ربیع الاول کو فوت ہوا۔ آٹھ سال حکومت کر کے ۴۸ سال کی عمر میں فوت ہوا۔ اس کا دارالحکومت شہر مراغہ تھا۔ اس نے مراغہ میں نصیر الدین طوسی اور دوسرے حکماء کی مدد سے ایک رصد گاہ بنوائی تھی۔ ہلاکو خان نے اپنے بیٹے ابا قاخان کو عراق وخراسان وغیرہ کی حکومت دی تھی۔ آذربائیجان کی حکومت دوسرے بیٹے کو اور دیار بکر و دیار ربیعہ کا حاکم توران سلدوز کو بنایا اور خواجہ شمس الدین محمد جوینی کو وزارت کے عہدے پر مامور کیا تھا۔ شمس الدین جوینی کے بھائی عطاء الملک علاء الدین کو حاکم بغداد بنایا تھا۔ ہلاکو خان کے فوت ہونے پر اس کی تجہیز و تکفین مغلوں کی رسم کے موافق عجیب طرح سے عمل میں آئی یعنی قبر نہ بنائی بلکہ ایک تہ خانہ تیار کیا گیا۔ اس میں ہلاکو خان کی لاش کو رکھ کر چند نوجوان لڑکیوں کو خوب زیور ولباس سے آراستہ و پیراستہ کر کے خدمت گاری کے لیے اس تہ خانہ میں داخل کیا گیا تاکہ وہ ہلاکو خان کی مونس تنہائی بنیں۔ اس کے بعد تہ خانہ کا منہ نہایت مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا گیا۔ ایک لاش کے ساتھ اس طرح بے گناہ زندہ لڑکیوں کا بند کرنا ایک ایسی وحشیانہ رسم ہے جس کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہلاکو خان کے زمانے

میں ہندوستان کے اندر سلطان غیاث الدین بلبن کی حکومت تھی۔ ہلاکو خان ہمیشہ سلطان بلبن کے حالات معلوم کرتا رہتا تھا مگر اس کو کبھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ ہندوستان پر حملہ کرے۔ بعض مغل سردار ہندوستان پر حملہ آور ہوئے مگر ہندوستان کے غلام بادشاہوں کا یہ کارنامہ بہت عظیم الشان ہے کہ انہوں نے ہر مرتبہ مغلوں کو شکست دے کر بھگا دیا اور بعد میں یہاں تک بھی نوبت پہنچی کہ مغل دارالسلطنت تک پہنچ گئے مگر ہندوستان میں ان کے قدم ہرگز نہ جم سکے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تمام عالم اسلام میں بدامنی اور پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ مغلوں کے خروج اور تاخت وتاراج کے زمانے میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک تھا، جہاں ایک زبردست اسلامی سلطنت قائم تھی اور جو مغلوں کی دست برد سے قریباً محفوظ و مامون رہی۔

ہلاکو خان کے وزیر اور مصاحبوں میں خواجہ نصیرالدین طوسی بہت مشہور شخص ہے۔ نصیرالدین طوسی علم ہیئت کا زبردست عالم تھا۔ اسماعیلیوں، باطنیوں کا تربیت کردہ تھا۔ اس کی ایک مشہور کتاب اخلاق ناصری ہے جو اس نے ناصرالدین بادشاہ الموت کے نام پر معنون کی تھی۔ مجسطی بھی اسی کی تصنیف ہے جو علم ہیئت کی مشہور کتاب ہے۔

اباقاخان:

جب ہلاکو خان مراغہ میں فوت ہوا تو امیروں نے ایک عظیم الشان مجلس منعقد کر کے ہلاکو خان کے بیٹے اباقاخان کو تخت سلطنت کے لیے منتخب کیا۔ اباقاخان نے تخت پر بیٹھنے سے انکار کیا اور کہا کہ قوبلا خان جو مغلوں کا بادشاہ ہے، جب تک اجازت نہ دے، میں کیسے تخت نشین ہوسکتا ہوں! مگر سرداروں نے اس کے عذر کو قبول نہیں کیا اور اصرار سے اس کو تخت سلطنت پر بٹھایا۔ اباقاخان ۲ رمضان سنہ ۶۶۳ھ کو تخت نشین ہوا۔ اس نے تخت نشین ہو کر فوج اور امیروں کو انعامات دیے۔ اپنے بھائی بشموت نامی کو شیروان کی حکومت عطا کی۔ دوسرے بھائی تیشین نامی کو ماژندران وخراسان کا حاکم مقرر کیا۔ توبان بہادر ابن سونجاق کو روم کا حاکم نامزد کیا۔ توران ابن ایلکان جلائر درلکین کو بھی روم ہی کی طرف کا ملک عطا ہوا۔ ارغون آقا کو وزیر مال اور خواجہ شمس الدین جوینی کو وزیراعظم بنایا اور اپنے بیٹے ارغون خان کی اتالیقی مہرتاق نویاں برلاس کو سپرد کی۔

اباقاخان نے تخت نشین ہونے کے بعد برکہ خان سے لڑائیوں کا سلسلہ جاری کیا۔ آخرانہیں

لڑائیوں کے درمیان برکہ خان نے وفات پائی اور اباقاخان کے ملک پر ہر طرف سے سرداروں اور رشتہ داروں نے دندان آز تیز کیے۔ براق خان چغتائی نے ملک خراسان پر قبضہ کرنا چاہا،لڑائیاں ہوئیں۔ آخر اباقاخان نے فتح پائی اور رفتہ رفتہ اس کا اقتدار قائم ہو گیا مگر مصری فوج کے مقابلہ پر جب بھی ملک شام میں فوج بھیجی،مغلوں کی فوج نے ہمیشہ شکست کھائی۔ عجیب اتفاق ہے کہ مصر اور ہندوستان دونوں ملک اپنی آب و ہوا اور باشندوں کے اعتبار سے بہادری میں کوئی بڑا مرتبہ نہ رکھتے تھے اور دونوں ملکوں میں غلاموں کی حکومت تھی لیکن مغلوں نے جنگجو ملکوں اور جنگجو قوموں کے مقابلے میں تو فتوحات حاصل کیں مگر مصر و ہندوستان میں ان کو ہمیشہ رذیل ہو کر شکست ہی کھانی پڑی۔

اباقاخان کی موت:

اباقاخان نے سنہ ۶۸۰ھ میں وفات پائی، ۱۷ سال حکومت کی۔ اباقاخان شیخ سعدی شیرازی اور جلال الدین رومی کا بہت معتقد تھا اور ان کی خدمت میں خود حاضر ہو کر ان سے ملاقات کرتا تھا۔ اباقاخان کے بعد اس کا بیٹا نکودار اغلن تخت نشین ہوا۔

نکودار اغلن موسوم بہ احمد خان:

نکودار اغلن زمانہ شہزادگی میں دولت اسلام سے مالامال ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنا لقب احمد خان رکھا اور شیخ کمال الدین عبدالرحمٰن الرافعی کو وزارت کا عہدہ عطا کیا۔ سلطان احمد خان نے مسلمانوں کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ ان کو بڑے بڑے عہدے عطا کیے۔ مغلوں کی کفریہ رسموں کو مٹایا اور آئین اسلام کو ترویج دینے کی کوشش کی۔ سلطان احمد خان کی وجہ سے بعض دوسرے مغول بھی اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ مغل سرداروں بالخصوص سلطان احمد خان کے بھائی ارغون خان نے جب دیکھا کہ سلطان احمد خان کی وجہ سے مغلوں کی عزت و سیادت کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے تو انہوں نے بغاوت کی سازش شروع کی۔

نکودار اغلن کی شہادت:

ارغون خان ابن اباقاخان نے رفتہ رفتہ فوج کے تمام سرداروں کو اپنی سازش میں شریک کر کے بغاوت کا اعلان کیا۔ تمام فوج ارغون خان سے جا ملی اور سلطان احمد خان تین سال کی حکومت کے بعد گرفتار ہو کر شہید ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ واقعہ سنہ ۶۸۳ھ میں وقوع پذیر ہوا۔

ارغون خان:

ارغون خان نے تخت نشین ہو کر سعد اللہ نامی ایک یہودی کو اپنا وزیر اعظم بنایا اور اس وزیر کے مشورے سے ہر شہر میں مسلمان علماء کے قتل کا حکم جاری کیا۔ اس طرح ہزار ہا علمائے اسلام قتل ہوئے۔ ارغون خان ایک ہندو جوگی کا بہت معتقد تھا۔ اسی ہندو جوگی نے ارغون کو ایک دوا کھلائی کہ اس کی تاثیر سے عمر بڑھ جائے گی مگر اس دوا کا یہ اثر ہوا کہ قسم قسم کے امراض پیدا ہونے لگے۔ آخر سنہ۶۹۰ھ میں ارغون خان نے وفات پائی۔

کیخاتو خان ابن ابا قاخان:

ارغون خان کے بعد اس کا بھائی کیخاتو خان تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد حکومت کا قابل تذکرہ اور مشہور واقعہ یہ ہے کہ اس نے سنہ۶۹۳ھ میں نوٹ ایجاد کیا جس کو مغل لوگ یوت کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ وہ ایک کاغذ ہوتا تھا جس کے دونوں طرف کلمہ طیبہ لکھا ہوتا تھا۔ کلمہ کے نیچے بادشاہ کا نام اور نوٹ کی قیمت درج ہوتی تھی۔ اس طرح کاغذ کا سکہ جاری ہونے سے تمام ملک میں شور فغاں برپا ہو گیا اور تجارت پر برا اثر پڑا۔ لوگ حیرت کے ساتھ اس کاغذ کو دیکھتے اور کہتے تھے کہ ہم روپیہ یا اشرفی کی جگہ پر اس کو کس طرح قبول کریں۔ جب اس ایجاد میں کیخاتو خان کو ناکامی ہوئی تو اس نے مجبوراً اس کے رواج کو روک دیا۔

کیخاتو خان کی شہادت:

سنہ۶۹۴ھ میں مغل امراء نے اسلام کے جرم میں اس بادشاہ کو بھی شہید کر دیا۔

بایدو خان ابن طراقائی ابن ہلاکو خان:

کیخاتو خان کے بعد اس کا چچازاد بھائی بایدو خان تخت نشین ہوا۔ سنہ۶۹۶ھ میں ارغون آقا اویرات جو قریباً تیس سال تک شاہان مغلیہ کی طرف سے خراسان وغیرہ علاقوں پر حکومت کرتا رہا تھا، فوت ہو گیا۔ اس کا بیٹا امیر نوروز بیگ، شہزادہ غازان خان ابن ارغون خان ابن اباقا خان کے پاس چلا گیا اور اسی کی مصاحبت میں داخل ہو کر غازان خان کو اسلام کے قبول کرنے کی ترغیب دی۔ غازان خان ان ایام میں خراسان کا حاکم تھا۔ بایدو خان اور غازان خان میں اس لیے ملال و مخالفت

پیدا ہوئی کہ غازان خان اپنے آپ کو زیادہ مستحق سلطنت سمجھتا تھا۔ غازان خان نے امیر نوروز بیگ کی رہبری وترغیب سے شیخ صدرالدین حموی کو بلا کر ان کے ہاتھ پر دین اسلام قبول کیا اور اسلامی نام محمود خان رکھا۔ غازان خان کے اسلام قبول کرتے ہی بہت سے مغل سرداروں نے دین اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد بایدو خان اور سلطان محمود خان (غازان خان) کے درمیان ناچاقی بڑھتی گئی اور نوبت محاربہ ومقاتلہ تک پہنچی۔

بایدو خان کا قتل:

سلطان محمود خان نے فتح حاصل کر کے بایدو خان کو قتل کرا دیا اور خود ذوالحجہ سنہ۶۹۴ھ میں تخت نشین ہوا۔

سلطان محمود غازان خان ابن ارغون خان ابن اباقا خان:

سلطان محمود خان نے تخت نشین ہو کر امیر نوروز بیگ اویرات کو اپنا وزیر وسپہ سالار بنایا اور سکوں پر کلمہ طیبہ نقش کرایا۔ اسی طرح مہر اور فرامین کی پیشانیوں پر اللہ اعلیٰ لکھنے کا حکم دیا۔ نوروز بیگ کو چند روز کے بعد خراسان کا حاکم مقرر کر کے روانہ کیا۔ ایستمیور وارسلان دو مغل سرداروں نے آپس میں عہد کیا کہ ہم میں سے ایک شخص سلطان محمود خان کو اور دوسرا امیر نوروز بیگ کو ایک ہی تاریخ میں قتل کرے۔ چنانچہ ان دونوں نے اپنے ارادے کو قوت سے فعل میں لانے کی کوشش کی۔ مگر عجیب اتفاق یہ ہوا کہ وہ اپنے ارادے میں کامیابی حاصل نہ کر سکے اور عین وقت پر دونوں سلطان محمود خان اور امیر نوروز بیگ کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اس کے بعض امراء ووزراء نے امیر نوروز بیگ کے متعلق بدگوئی اور چغل خوری سے کام لے کر بادشاہ کو بدگمان کر دیا اور ظاہر کیا کہ امیر نوروز بیگ خراسان میں بغاوت وخودمختاری کے اعلان کا عزم رکھتا ہے۔ ان پیہم سازشی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان محمود غازان خان امیر نوروز سے بدگمان ہو کر اس کے استیصال کے درپے ہوا اور یہ امیر بزرگ مع خاندان ہلاک وبرباد ہوا۔ اسی طرح خواجہ صدرالدین وزیر بھی امراء کی کوشش سے مقتول ہوا اور اس کی جگہ خواجہ رشید الدین مصنف جامع رشیدی کو قلمدان وزارت عطا ہوا۔ یہ واقعہ سنہ۶۹۹ کو وقوع پذیر ہوا۔

اس کے بعد سلطان محمود غازان خان نے سلطان مصر کو لکھا کہ میرے بزرگوں نے ملک شام کو

فتح کیا تھا اور شام کا ملک ہمارا موروثی مقبوضہ ہے۔ مصری فوجوں نے اس ملک پر غاصبانہ قبضہ جما رکھا ہے۔ میرے بزرگ چونکہ کافر تھے اور دین اسلام سے واقف نہ تھے، لہٰذا تمہاری مخالفت جو میرے بزرگوں نے تم سے کی، قابل معافی ہے۔ میں الحمدللہ! مسلمان ہوں اور تم کو مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنا بھائی سمجھتا ہوں، لہٰذا اب تمہارا فرض ہے کہ شام کا علاقہ میرے لیے خالی کردو اور میری بادشاہی و سرداری تسلیم کرو۔ مصر سے اس پیغام کا جواب نامناسب وصول ہوا۔ اسی خط و کتابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصریوں نے جو پہلے سے مغلوں پر چیرہ دست تھے، اپنی حدود سے نکل کر محمود غازان خان کے مقبوضہ علاقہ پر حملہ کیا اور ساتھ ہی اس مصری فوج نے مسجدوں کی بے حرمتی اور مسلمانوں کے قتل عام سے بھی کوئی دریغ نہ کیا۔ یہ سن کر سنہ ۶۹۹ھ میں سلطان محمود غازان خان نے نوے ہزار مغلوں کی فوج لے کر ملک شام پر حملہ کیا۔ سلطان مصر بھی فوج لے کر مقابلہ پر آیا۔ حمص کے قریب معرکہ کارزار گرم ہوا۔ سلطان محمود غازان خان نے مصریوں کو شکست دے کر بھگا دیا اور دمشق و شام پر قابض و متصرف ہو کر شام کے بڑے بڑے شہروں میں ایک ایک امیر بہ طور نائب السلطنت مقرر کیا اور خود واپس چلا آیا۔ سلطان مصر ناصر نے فوج لے کر دوبارہ ملک شام پر فوج کشی کی۔ شام کے مغل سرداروں نے خوب جم کر مقابلہ کیا مگر شکست یاب ہوئے اور امیر تیناق میدان جنگ میں شجاعت و بہادری کی داد دیتا ہوا گرفتار ہوا۔ یہ سن کر سلطان غازان خان نے پھر ملک شام پر حملہ کا قصد کیا لیکن انہیں ایام میں خبر پہنچی کہ جوجی خان کی اولاد جو قبچاق کی طرف برسر حکومت ہے، دعویٰ کرتی ہے کہ ہلاکو خان اور اس کی اولاد کا کوئی حق نہیں کہ وہ ایران و خراسان وغیرہ پر خود مختارانہ حکومت کرے۔ یہ حق ہمارا ہے اور ہم غازان خان کو ملک سے بے دخل کر دیں گے۔ اس کے بعد آپس کی مخالفتوں نے غازان خان کو شام کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ دیا۔

سلطان محمود غازان کی وفات:

یہاں تک کہ نواح قزوین میں ۱۱شوال یک شنبہ سنہ ۷۰۳ھ کو سلطان محمود غازان خان نے وفات پائی۔ اس سلطان کے عہد میں اسلام نے مغلوں کے اندر خوب رواج پایا اور مسلمانوں کو اس بادشاہ عالی جان سے بہت فائدہ پہنچا۔ مرتے وقت اس نے وصیت کی کہ میرے بعد میرا بھائی اولجائتو معروف بہ سلطان محمد تخت نشین ہوا۔

سلطان محمد اولجائتو اوغون خان ابن اباقا خان:

سلطان محمود خان کی وفات پر امیر مرقداق نے جو الجائتو سے ناخوش تھا، ایک دوسرے شہزادے الافرنگ کو تخت نشین کرنا چاہا۔ یہ حال جب امیر اسماعیل ترخان کو معلوم ہوا تو اس نے الجائتو کو اطلاع کی۔ اس نے فوراً الافرنگ اور مرقداق کو گرفتار کر کے قتل کیا اور ماہ ذوالحجہ سنہ ۷۰۳ھ میں تخت نشین ہوا اور اپنا لقب سلطان محمد رکھا۔ بڑے بڑے امراء مثلاً امیر قتلق شاہ، امیر چوپان سلدوز، امیر فولاد، امیر حسین بیگ، امیر سونج، امیر مولائی، امیر سلطان، امیر رمضان، امیر الغو نے تخت نشینی کے وقت نذریں دکھلائیں۔ سلطان محمد نے تخت نشین ہوتے ہی حکم دیا کہ شریعت اسلام کی پابندی کا تمام ملک میں خاص طور پر لحاظ رکھا جائے اور خلاف شرع تمام مراسم کو مٹا دیا جائے۔ سلطان محمد کی حکومت و سلطنت کو بہت جلد قبولیت عامہ حاصل ہوگئی اور روس، خوارزم، بلغاریہ، روم اور شاہ سے لے کر قراقورم، سندھ اور عراق تک تمام ممالک میں اس کی بادشاہی تسلیم کی گئی۔ سلطان محمد کے عہد حکومت میں سلطنت مغلیہ اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی اور اس کی سلطنت وحکومت سے مخالفت وانحراف کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔

سلطان محمد کی وفات:

آخر تیرہ سال حکومت کرنے کے بعد بہ عمر ۳۶ سال شب عیدالفطر سنہ ۷۱۶ھ کو اس نیک دل اور اللہ والے سلطان نے وفات پائی۔ اس نے خود ایک شہر سلطانیہ کے نام سے آباد کر کے اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔ مرنے کے بعد اسی شہر میں مدفون ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان ابوسعید بہادر خان تخت نشین ہوا۔

سلطان ابوسعید بہادر خان ابن سلطان محمد:

تخت نشینی کے وقت سلطان ابوسعید کی عمر ۱۴ سال کی تھی۔ مغل امراء میں نااتفاقی پیدا ہوئی مگر پھر نفاق وشقاق کے نتائج پر غور کر کے متفق ومتحد ہو گئے۔ سلطان ابوسعید بہادر خان نے امیر چوپان کو مدارالمہام سلطنت بنا کر اس کی عزت ومرتبہ کو بہت ترقی دی۔ امیر چوپان کے بیٹے امیر حسن جلائر کی شادی بغداد خاتون سے ہوئی۔ سلطان ابوسعید اس عورت پر عاشق ہو گیا تھا۔[1] سلطان نے چاہا کہ

---

[1] لفظ ''عاشق'' کا استعمال ترک کر دینا چاہیے۔ وہ لفظ کہ کوئی بھی باغیرت انسان اپنی ماں، بہن، بیٹی اور دیگر عزیز خواتین =

امیر حسن بغداد خاتون کو طلاق دے دے مگر امیر چوپان نے اس کو گوارا نہ کیا۔ آخر اس معاملے نے یہاں تک طول کھینچا کہ امیر چوپان نے بغاوت اختیار کر کے ملک خراسان پر قبضہ کر لینا چاہا۔ ہرات پر چغتائی خاندان کے لوگوں کی حکومت تھی جو ہلاکو خان کے خاندان سے کدورت رکھتے اور بہ ظاہر مطیع ومنقاد تھے۔ ان چغتائی سرداروں میں ایک شخص ترمہ شیرین خان تھا۔ اس کو امیر چوپان نے اپنی مدد پر آمادہ کر لیا۔ سلطان ابوسعید بہادر خان نے لڑائی کا سامان کیا۔ مقابلہ ہوا اور متعدد لڑائیوں کے بعد امیر چوپان گرفتار ہو کر مقتول ہوا۔ اس کے بیٹے امیر حسن جلائر نے بغداد خاتون کو طلاق دے کر سلطان ابوسعید کو اس سے نکاح کر لینے کا موقع دیا۔ سنہ ۷۳۵ھ میں اوزبک خان بادشاہ دشت قپچاق نے لشکر عظیم کے ساتھ ایران پر چڑھائی کی۔

سلطان ابوسعید کی وفات:

ادھر سے سلطان ابوسعید بھی فوج لے کر متوجہ ہوا۔ مقام شیروان میں پہنچ کر سلطان آب وہوا کی ناموافقت کے سبب سے بیمار ہو گیا۔ اسی بیماری کے ارتداد واشتداد سے ۱۳ ربیع الآخر سنہ ۷۳۶ھ میں فوت ہوا۔ چونکہ سلطان ابوسعید لاولد فوت ہوا، لہٰذا اس کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ میں طوائف الملوکی اور پریشانی رونما ہوئی۔

ارپا خان از اولاد ارتق بوقا ابن تولی خان:

سلطان ابوسعید کی وفات کے بعد بعض امراء کے اتفاق سے ارپا خان تخت نشین ہوا۔ اس نے تخت نشین ہو کر کہا کہ مجھ کو آرائش اور ناز ونعم کی مطلق ضرورت نہیں۔ میں کمر زریں کی جگہ پر تسمہ اور تاج مرصع کی جگہ پر کلاہ نمد کو کافی سمجھتا ہوں۔ چونکہ ازبک خان کی فوجوں سے مقابلہ درپیش تھا، لہٰذا ارپا خان نے مقابلہ کی تیاری میں ہمت صرف کی اور جابہ جا حملہ آوروں کی روک تھام کے واسطے فوجیں تعینات کیں۔ اسی اثناء میں اوزبک خان کے پاس خبر پہنچی کہ دشت قپچاق میں بغاوت وفتنہ پیدا ہونے والا ہے۔ وہ اسی وحشت ناک خبر کو سنتے ہی اس طرف روانہ ہوا۔ ادھر امیر علی نے اس کے خلاف خروج کیا۔ اس خروج میں امیر علی کو اس لیے اور بھی کامیابی ہوئی کہ ارپا خان نے اولاد

= کے لیے اس کا استعمال تو کیا اس کا سننا تک پسند نہیں کرتا، وہ لفظ کتب وغیرہ میں دوسروں کے بارے میں بے دھڑک استعمال ہوتا ہے، العیاذ باللہ!

ہلاکو خان کو جہاں کہیں پایا، قتل کیا اور اس خاندان کے استیصال سے اکثر امراء کو بددل بنا دیا۔

ارپا خان کا قتل:

آخر سنہ ۷۳۶ھ کے ماہ رمضان میں مقام مراغہ پر دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ اس لڑائی میں ارپا خان گرفتار و مقتول ہوا۔ امیر علی نے فتح یاب ہو کر موسیٰ خان ابن بایدو خان ابن طرقائی ابن ہلاکو خان کو تخت پر بٹھایا۔

موسیٰ خان ابن بایدو خان:

موسیٰ خان کے تخت نشین ہونے پر امیر علی اویران اور دوسرے امراء اویرات کے اقتدار نے خوب ترقی کی۔ امیر حسن جلائر جو ملک روم میں برسر حکومت تھا، اس نے موسیٰ خان پر چڑھائی کر کے میدان جنگ سے اس کو بھگا دیا اور امیر علی کو قتل کر دیا۔ موسیٰ خان شکست خوردہ بھاگ کر ضلع ہزارہ میں آیا اور یہاں گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ موسیٰ خان کے بعد سلطان محمد خان ابن قتلق خان ابن تیمور ابن انبارجی ابن منکور تیمور ابن ہلاکو خان تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت بھی موسیٰ خان کی طرح بہت کمزور تھی۔ اس کے بعد برائے نام چند اور افراد اور ہلاکو خان کی نسل سے تخت نشین ہوئے اور سنہ ۷۴۴ھ تک ہلاکو خان کی اولاد کا نام و نشان گم گیا اور ہلاکو خان کے مفتوحہ ممالک میں بہت سی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔

اولاد جوجی خان ابن چنگیز خان:

چنگیز خان کے بیٹوں میں جوجی خان سب سے بڑا بیٹا تھا۔ جوجی خان نے فتح خوارزم کے بعد دشت قبچاق کو فتح کر کے وہیں سکونت اختیار کی تھی۔ جوجی خان کے ساتھ چنگیز خان کے باقی بیٹوں کو محبت وانسیت نہ تھی اور وہ باقی بھائیوں سے کچھ الگ ہی الگ رہتا تھا۔ اسی مناسبت سے اس کا ملک بھی الگ اور ایک طرف ہی تھا۔ جوجی خان کی اولاد میں جو لوگ ہوئے، ان میں اکثر قوم اوزبک یا ازبک کے نام سے پکارے گئے۔ جوجی خان چنگیز کے سامنے ہی فوت ہو گیا تھا۔ لہٰذا چنگیز خان نے جوجی خان کا ملک اس کے بیٹے باتو خان کو دے دیا تھا۔ جوجی خان کے سات بیٹے تھے۔ باتو خان سب سے بڑا بیٹا تھا۔

باتو خان ابن جوجی خان:

باتو خان نے دشت قپچاق سے جب ممالک خزر، روس اور فرنگ وغیرہ کی طرف فوج کشی کی تو اوکتائی خان ابن چنگیز خان نے اپنے بیٹے کیوک خان اور تولی خان کے بیٹے منکو خان اور چغتائی خان کے ایک بیٹے کو مامور کیا کہ یہ لوگ باتو خان کے ساتھ رہ کر فتح ممالک میں اس کی امداد کریں۔ باتو خان نے روس کا تمام ملک فتح کر کے ماسکو پر حملہ کیا۔ اس کو فتح کرنے کے بعد پولینڈ کو اپنے قبضہ وتصرف میں لایا۔ یہ حالات سن کر تمام یورپ کے سلاطین ایک دوسرے کی اعانت پر آمادہ ہو کر ایک میدان میں اپنی فوجوں کو جمع کر کے مقابلہ پر آئے۔ باتو خان کی فوج میں بہت سے مسلمان بھی شامل تھے۔ جب باتو خان کو یہ معلوم ہوا کہ مغلیہ فوج سے کئی گنا زیادہ عیسائیوں کی فوجیں جمع ہو گئی ہیں تو اس نے حکم دیا کہ ہماری فوج کے تمام مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر دعا مانگیں۔ اس کے بعد لڑائی شروع ہوئی۔ اس لڑائی میں عیسائیوں کو شکست فاش حاصل ہوئی اور باتو خان نے تمام ملک ہنگری پر قبضہ کر لیا۔ باتو خان نے یورپ میں ایک شہر آباد کیا، جس کا نام سرائے تھا۔ باتو خان کا تمام زمانہ ملک فرنگ کی فتوحات وانتظامات میں بسر ہو گیا اور سنہ ۶۵۴ھ میں فوت ہوا۔

برکہ خان ابن جوجی خان:

باتو خان کی وفات کے بعد اس کا بھائی برکہ خان تخت نشین ہوا۔ باتو خان تو مثل چنگیز خان کے نام کا مسلمان تھا لیکن برکہ خان نے دین اسلام قبول کر لیا تھا۔ برکہ خان کے عہد حکومت میں مسلمانوں کو مغلوں کی زیادتی سے ہر قسم کا امن حاصل ہوا۔ برکہ خان کے ایک رشتہ دار کو ہلاکو خان نے ہلاک کر دیا تھا۔ اس لیے برکہ خان نے ناراض ہو کر بوقا خان کو تیس ہزار سوار دے کر ہلاکو خان کے ملک پر حملہ کرنے کو بھیجا۔ ہلاکو خان نے بھی مقابلہ پر ایک سردار کو روانہ کیا لیکن ہلاکو خان کو شکست ہوئی۔ سنہ ۶۶۱ھ میں ہلاکو خان خود فوج لے کر برکہ خان کے ملک پر حملہ آور ہوا۔ اباقا خان کو فوج دے کر آگے روانہ کیا۔ اول ہلاکو خان کی فوج کو شکست ہوئی لیکن پھر برکہ خان کا لشکر ہارا ہوا۔

برکہ خان کے بعد جوجی خان کی اولاد میں ۳۲ شخص تخت نشین ہوئے۔ برکہ خان کے بعد اس کا بیٹا منکور تیمور خان تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد توقتائی خان تخت نشین ہوا۔ سنہ ۷۰۳ھ میں توقتائی خان اور توقائی خان کے درمیان سخت جنگ واقع ہوئی۔ توقتائی خان نے فتح مند ہو کر اطمینان سے

حکمرانی وفرماں روائی شروع کی اور غازان خان کولکھا کہ ہلاکو خان اوراس کی اولاد نے غاصبانہ طور پر آذربائیجان کو اپنی حدود حکومت میں شامل کر لیا ہے۔ حالانکہ آذربائیجان کا ملک تقسیم چنگیزی کے موافق جوجی خان کی اولاد کا حق ہے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ آذربائیجان کا ملک ہمارے سپرد کر دیں۔ ورنہ پھر آپ کو معلوم ہو کہ ہم بہ زور شمشیر اس پر قبضہ کر لینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ غازان خان نے اس کا جواب نفی میں دیا اور مقابلہ پر آمادگی ظاہر کی مگر پھر جنگ وجدل تک نوبت نہیں پہنچی اور شروع ہونے والی جنگ رفت وگذشت ہوگئی اور توقائی خان نے آذربائیجان کا خیال چھوڑ دیا۔

توقائی خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا طغرل خان تخت نشین ہوا۔ طغرل خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا اوزبک خان تخت نشین ہوا۔ اوزبک خان بہت نامور شخص ہوا ہے۔ اس کی حکومت جوجی خان کی اولاد کے ساتوں قبیلوں پر تھی۔ اسی کے نام پر قوم اوزبک موسوم ہوئی۔ اوزبک خان کی اولاد بہت تھی اور وہ سب قوم اوزبک کے نام سے موسوم ہوئی۔ سنہ ۷۱۸ھ میں اوزبک نے سلطان ابوسعید بہادر خان بادشاہ ایران پر فوج کشی کی۔ ادھر سے سلطان ابوسعید بہادر خان بھی مقابلہ پر مستعد ہوا مگر اوزبک خان لوٹ مار کر کے فوراً واپس چلا گیا۔ سنہ ۷۳۵ھ میں اوزبک خان نے دوبارہ ایران پر فوج کشی کی۔ سلطان ابوسعید خان یہ خبر سن کر مقابلہ پر گیا۔ اسی سفر میں سلطان ابوسعید بہادر خان کا انتقال ہوا اور ارپا خان اس کی جگہ تخت نشین ہو کر مقابلہ پر آمادہ ہوا۔ اس کے بعد اوزبک خان واپس ہوا اور عرصہ تک حکومت کرنے کے بعد فوت ہوا۔

اس کے بعد جانی بیگ خان اوزبک تخت نشین ہوا۔ اس زمانے میں جوجی خان کی اولاد یعنی ازبک قبیلہ کے متعدد اشخاص نے اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کیں۔ جانی بیگ خان کے بعد اس کا بیٹا بیروی بیگ خان تخت نشین ہوا۔ سنہ ۸۰۹ھ میں تبریز میں ایک بادشاہ شادی خان ازبک برسر حکومت تھا۔ اسی طرح ارس خان ازبک تیمور صاحب قران کے زمانے میں موجود تھا۔ ارس خان ازبک کا بیٹا تیمور ملک خان ازبک تھا۔ اس کا جانشین توقتمش خان ازبک تھا جس کی دشت قبچاق پر حکومت تھی اور جس نے امیر تیمور صاحب قران سے جنگ کر کے شکست کھائی تھی۔ فولاد خان ازبک سنہ ۸۱۵ھ میں ترکستان پر قابض وحاکم تھا۔ سلطان سعید مرزا شاہ رخ نے اس کے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ فولاد خان کے بعد محمد خان ازبک تخت نشین ہوا۔ براق خان ازبک جوارس خان کی اولاد سے تھا، مرزا الغ بیگ تیموری سے مدد لے کر محمد خان ازبک پر حملہ آور ہوا اور سنہ ۸۲۸ھ میں فتح

یاب ہو کر ترکستان پر قابض اور تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد الغ بیگ کی فرستادہ فوج نے شکست کھائی۔ اس شکست کا حال سن کر سلطان سعید مرزا شاہ رخ نے خود فوج کشی کی اور الغ بیگ کو مورد عتاب بنایا۔ مرزا شاہ رخ کی فوج کشی کا حال سن کر براق خان سمرقند سے واپس چلا گیا اور مقابلہ پر مصلحت نہ سمجھی لیکن سنہ ۸۳۲ھ میں سلطان محمود خان اور براق خان مقتول ہوئے اور سلطنت ازبکیہ کا خاتمہ ہوا۔ لوگ چند روز تک پریشان و منتشر رہے۔

اس کے بعد سنہ ۸۵۵ھ میں سلطان ابوالخیر خان اور بداق خان ازبک نے سمرقند پر قبضہ کر کے اپنی حکومت و سلطنت قائم کی۔ ابوالخیر خان کا بیٹا بداق خان اور بداق خان کا بیٹا سلطان ابوالفتح محمد خان تھا، جو ظہیرالدین بابر کا ہم عصر تھا۔ اسی سلطان ابوالفتح محمد خان اوزبک کو شیبانی خان ازبک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ اسماعیل صفوی کے مقابلہ میں مقتول ہوا۔ بڑا صاحب داعیہ اور بہادر شخص تھا۔ اسی نے بابر کو ترکستان و فرغانہ سے بے دخل کر کے بھگا دیا تھا۔ اسی کے کاسہ سر کی ہڈی پر سونے کی پتری چڑھوا کر اسماعیل صفوی نے شراب خوری کا پیالہ بنوایا تھا۔[1] اس کو شیبانی خان اس لیے کہتے تھے کہ اس کے اجداد میں کسی شخص کا نام شیبانی خان تھا۔ سلطان ابوالفتح محمد خان ازبک سنہ ۹۱۷ھ میں مقتول ہوا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے تیمور سلطان کو ازبکوں نے اپنا بادشاہ بنایا۔ سنہ ۹۳۵ھ میں ازبکوں نے طہماسپ صفوی پر ایک سخت حملہ کر کے اس کو شکست دی تھی مگر شکست دینے کے بعد وہ لوٹ مار میں مصروف ہو گئے اور طہماسپ نے موقع پا کر بے خبری میں حملہ کر کے ازبکوں کی فتح کو شکست سے تبدیل کر دیا۔

جانی بیگ خان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ جانی بیگ خان کا بیٹا اسکندر خان تھا۔ اسکندر خان کا بیٹا عبداللہ خان تھا۔ عبداللہ خان ازبک نے ایرانیوں کو شکست فاش دی۔ عبداللہ خان ازبک ہندوستان کے بادشاہ اکبر کا معاصر تھا۔ اکبر کے ساتھ اس کی اکثر خط و کتابت رہتی تھی۔ عبداللہ خان نے سنہ ۱۰۰۶ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالمومن خان تخت نشین ہوا مگر چند روز کے بعد اپنے چچا رستم سلطان کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کے بعد سلطنت ازبکیہ کے ٹکڑے ہو گئے۔ عبداللہ

---

[1] تاریخ میں بادشاہوں نے مفتوح بادشاہوں اور اپنے دشمنوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، یہ واقعہ اس کی ایک معمولی مثال ہے۔ ایسے متکبر و رعونت پسند بادشاہ اگر مفتوح بادشاہوں و اقوام کے حال اور انجام پر اگر غور کرتے تو ان کے حالات زندگی اور انجام سے ان کو بہت کچھ سبق مل جاتا لیکن حکومت، طاقت اور شراب کے نشہ نے ان کو ایسے غور و فکر کا موقع ہی نہیں دیا۔

خان کے خواہرزادہ ولی محمد خان نے عبدالمومن خان کے بعد ترکستان پر قبضہ کر کے امام قلی خان کو بے دخل کیا۔ جسے چندروز کے بعد نذر محمد خان نے بے دخل کر دیا۔ اس نے ایران میں جا کر شاہ عباس کے یہاں پناہ لی۔ اسی طرح ازبکوں کی ایک سلطنت خوارزم میں بھی قائم تھی مگر وہ کچھ زیادہ قابل طاقتور اور قابل تذکرہ نہیں ہوئے۔ جوجی خان ابن چنگیز خان کی اولاد کے حالات مورخین نے مسلسل نہیں لکھے۔ اس جگہ ازبکوں کے ضروری اشخاص کا تذکرہ آ چکا ہے اور آئندہ ان کے ہم عصر سلاطین کے حالات میں جب ان لوگوں کے نام آئیں گے تو سمجھنے میں بہت آسانی ہوگی۔ اسی لیے ہم نے اس سلسلہ کو دور تک پہنچا دیا ہے۔ جوجی خان کی اولاد میں قبیلہ ازبک کے علاوہ ایک اور قبیلہ قوم قزاق کے نام سے مشہور تھا۔ قبیلہ قزاق کے بعض اشخاص نے دشت قبچاق یا اس کے بعض حصوں پر حکومت کی۔ چنانچہ اسی قبیلہ کے ایک بادشاہ قائم سلطان قزاق کی شیبانی خان یعنی سلطان محمد خان ازبک سے لڑائیاں ہوئی تھیں۔ اب ہم کو چنگیز خان کے بیٹے چغتائی خان کی اولاد کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

اولاد چغتائی خان ابن چنگیز خان:

چنگیز خان نے ترکستان، خراسان، بلخ، غزنین، تاحدود دریائے سندھ کا تمام علاقہ اپنے بیٹے چغتائی خان کو دیا تھا اور امیر قراچار برلاس کو امیر الامراء بنا کر اس کے ساتھ کیا تھا۔ چنگیز خان کی وفات کے بعد چغتائی خان اپنے بیٹے اوکتائی خان کی اطاعت وفرماں برداری کا ہمیشہ اقرار کرتا رہا۔ چغتائی خان بہت عقلمند اور بہادر شخص تھا۔ سنہ ۶۴۰ھ میں فوت ہوا۔ چغتائی خان کی وفات کے بعد امیر الامراء قراچار نے چغتائی خان کے پوتے قرابلا کو خان کو تخت نشین کیا۔ یہ خبر سن کر کیوک خان ابن اوکتائی خان نے کہا کہ چغتائی خان کا بیٹا میسو منکو خان جب موجود ہے تو پوتے کو کیوں جانشین بنایا گیا۔ چونکہ قراقورم کا دربار تمام مغلوں پر حکمران تھا، لہٰذا کیوک خان کے حکم کے موافق قرابلا کو خان کو تخت سے اتار کر میسو منکو خان کو تخت سلطنت پر بٹھایا گیا۔ مگر چندروز کے بعد میسو منکو خان فوت ہو گیا، تو امیر قراچار کی تجویز کے موافق قرابلا کو خان دوبارہ تخت نشین ہوا۔ سنہ ۶۵۲ھ میں امیر قراچار بھی فوت ہو گیا۔ اس کے چندروز بعد جب قرابلا کو خان فوت ہوا تو اس کی بیوی ورغنہ خاتون کو مغلوں نے تخت پر بٹھایا۔ اس کے بعد الغوخان کو قبیلہ چغتائیہ کی حکومت سپرد ہوئی مگر ایک سال حکومت کر کے

وہ بھی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مبارک شاہ چغتائی قبیلہ چغتائیہ کا سردار قرار پایا۔

قبیلہ چغتائیہ حکومت و سلطنت میں تولی خان کی اولاد کے ساتھ شریک رہا۔ ابتداءً ان دونوں قبیلوں میں رقابت بھی رہی۔ تولی خان ابن چنگیز خان کی اولاد میں ہلاکو خان کی وجہ سے عظمت وشوکت نے بہت ترقی کر لی تھی اور چغتائی خان کی اولاد اس کے مدمقابل نہ رہی تھی۔ چغتائیوں نے ہرات اور اس کے متعلقہ علاقہ پر ہمیشہ اپنا قبضہ جاری رکھا مگر کبھی وہ ہلاکو خان اور اس کی اولاد کی سیادت کو تسلیم کرتے اور اپنے آپ کو ان کا نائب السلطنت کہتے اور کبھی خود مختاری کا اعلان کرتے تھے۔ ان میں مبارک شاہ کے بعد سلطان غیاث الدین محمد براق خان ابن میسون توان خان ابن مواتو خان مشہور شخص ہوا۔ جس نے ابا خان کے ساتھ خراسان میں سخت معرکہ کارزار گرم کیا تھا۔ غیاث الدین محمد براق خان کا بیٹا دوا خان اور دوا خان کا بیٹا السینو خان اور السینو خان کا بیٹا کیک خان بھی خوب طاقتور اور صاحب داعیہ سلاطین تھے۔ دوا خان کے دوسرے بیٹے تیمور خان و ترمہ شیرین خان بھی برسر حکومت رہے۔ ترمہ شیرین خان نے قندھار پر حملہ کیا اور سنہ ۷۱۶ھ میں امیر حسن سلدوز اور ترمہ شیرین خان کی نواح غزنین میں سخت لڑائی ہوئی۔ جس میں ترمہ شیرین خان کو شکست ہوئی۔ ترمہ شیرین خان نے ہندوستان پر بھی ایک حملہ کیا تھا۔ ترمہ شیرین خان کے بعد غازان ابن میسور اغلن، بن دوا خان تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد دانشمند اغلن اس کے بعد قلی خان ابن سورغدا ابن دوا خان ابن براق خان چغتائی بادشاہ ہوا۔ پھر تو غلوق تیمور خان تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد خضر خواجہ خان تو غلوق تیمور خان تخت نشین ہوا۔ اس کے قبضہ سے خراسان کے تمام علاقے نکل گئے تھے لیکن مغولستان کے اکثر حصے پر اس کا قبضہ تھا۔

اسی کے عہد حکومت میں امیر تیمور صاحب قران نے خراسان میں تخت سلطنت پر جلوس کیا اور خضر خواجہ خان اور تیمور صاحب قران کے درمیان بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر خضر خواجہ، امیر تیمور کے مقابلہ سے عاجز ہوا اور اپنی بیٹی تعل خانم کی شادی امیر تیمور کے ساتھ کر کے صلح کی اور رشتہ داری قائم کی۔ امیر تیمور کو اسی شادی کے سبب سے گورکان کہنے لگے یعنی خاندان چنگیزی کے ساتھ امیر تیمور کو رشتہ دامادی حاصل ہوا۔ مغلوں کی زبان میں داماد کو گورکان کہتے تھے۔ خضر خواجہ خان تخت نشین ہوا۔ جہاں اغلن کے بعد شہر محمد خان ابن خضر خواجہ خان بادشاہ ہوا۔ شیر محمد خان بادشاہ مغلوستان اور الغ بیگ تیموری بادشاہ خراسان و ماوراء النہر کے درمیان سخت جنگ واقع ہوئی۔ جس

میں شیر محمد خان کو شکست ہوئی۔ شیر محمد خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا اویس خان، اس کے بعد اس کا بیٹا یونس خان ابن اویس خان تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ یونس خان کے بعد اس کے بیٹے محمود خان و احمد اولجہ خان حاکم مغولستان ہوئے۔ ان دونوں بھائیوں سے ظہیر الدین محمد بابر نے شیبانی خان ازبک کے مقابلہ میں مدد طلب کی۔ انہوں نے بابر کی مدد کی اور میدان جنگ میں لڑتے ہوئے دونوں بھائی اسیر ہو گئے۔ جب شیبانی خان کے سامنے پیش کیے گئے تو اس نے ان دونوں کو رہا کر دیا لیکن یہ دونوں آزاد ہوتے ہی خودکشی کر کے مر گئے اور چغتائی خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

ان کے بعد بھی منصور خان ابن سلطان احمد اولجہ خان برائے نام مغولستان کا بادشاہ ہوا مگر حقیقتاً مغولستان پر شیبان خان کی حکومت تھی۔ یہاں تک چنگیز خانی مغلوں کی حکومت وسلطنت کے مختصر حالات بیان کر چکے ہیں۔ اس کے بعد تیموری مغلوں کے کارنامے بیان ہوں گے۔ مغلوں کی حکومت وسلطنت کے دو حصے یا دو طبقے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ایک مغولان چنگیزی، دوسرے مغولان تیموری۔ ہم اس وقت مغولان چنگیزی کا حال بیان کر چکے ہیں۔ مغولان تیموری کا حال بیان کرنے سے پہلے چند اور ضروری حالات کا بیان کرنا از بس ضروری ہے تاکہ سلسلہ تاریخ اسلام میں ہم بہت دور آگے نہ نکل جائیں۔ حالات مذکورہ کے ذہن نشین کرنے اور آئندہ حالات کے سمجھنے میں آسانی پیدا کرنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خاندان چنگیزی کا شجرہ نسب اس جگہ درج کر دیا جائے۔ اوپر جو شجرہ درج ہو چکا ہے، اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ چنگیز خان اور امیر تیمور کئی پشتوں کے بعد اوپر جا کر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ اب چنگیز خان کی اولاد کس طرح متفرع ہوئی؟ اگلے صفحہ کے شجرہ سے ہویدا ہوگا۔

شجرۂ نسب

- شجرۂ نسب جوجی خان ابن چنگیز خان (قوم ازبک)
- شجرۂ نسب چغتائی خان ابن چنگیز خان
- شجرۂ نسب تولی خان ابن چنگیز خان

مغولان چنگیزی پر ایک نظر:

دنیائے اسلام کا نہایت عظیم الشان اور مشہور حادثہ بغداد کی تباہی ہے، جو ہلاکو خان کے

ہاتھوں سے ہوئی لیکن ہلاکو خان کا دادا چنگیز خان اس سے پہلے عالم اسلام بالخصوص ایران وخراسان میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا چکا تھا۔ چنگیز خان اور ہلاکو خان کے قتل و غارت نے مغولان چنگیزی کو عام طور پر مسلمانوں کی نگاہ میں مبغوض وملعون بنا رکھا ہے۔ مسلمانوں کا غصہ کچھ بے جا نہیں لیکن اگر پہلے زمانے کے مسلمانوں کو غور و تامل کا موقع نہیں ملا تو آج ہم کو یہ موقع خوب حاصل ہے۔ اس وقت تک جس قدر حالات کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ حکومت اسلامیہ میں وراثت اور خاندانی حقوق کے دخل پا جانے کی غلط روایت نے مسلمانوں کی حکومت وسلطنت کے تخت پر ایسے نالائقوں اور بدتمیزوں کو متمکن کر دیا تھا جو کسی طرح بھی مسلمانوں کی سلطنت کو سنبھالنے اور حکومت اسلامیہ کے وقار کو قائم رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ ان نالائقوں کی رہبری و سروری نے مسلمانوں کی قوم میں انواع و اقسام کے اخلاقی امراض اور بداعمالیاں پیدا کر دیں۔ ان بداعمالیوں میں اضافہ تو ہوتا رہا لیکن ان کے علاج اور اصلاح کے لیے بااثر کوشش ممکن نہ تھی۔

چھٹی صدی ہجری کے خاتمہ پر سلطنت اسلامیہ بالخصوص خلافت بغداد کی حالت یقیناً ناقابل اصلاح ہو چکی تھی اور دیلمی، سلجوقی وغیرہ سلاطین باوجود شوکت وعظمت وطاقت کے یہ جرأت نہ کر سکے تھے کہ خاندان خلافت کا قصہ پاک کر سکیں۔ مسلمانوں میں عام طور پر یہ بدعقیدگی راسخ اور جزو فکر بن چکی تھی کہ خاندان عباسیہ کے سوا کوئی اور شخص مسلمانوں کا خلیفہ اور بادشاہ نہیں بن سکتا۔ اس بدعقیدگی نے مسلمانوں کو بڑے بڑے نقصانات پہنچائے تھے اور دیر تک حکومت وسلطنت کے قائم رہنے سے خاندان عباسیہ میں لائق اور قابل حکمران اشخاص پیدا ہونے بالکل بند ہو چکے تھے۔ اولوالعزمی اور سپاہیانہ خصائل جو مسلمانوں کا خصوصی نشان ہے، بالکل ناپید تھے۔ اس خطرناک اور نازک ترین حالت کی اصلاح آخر اللہ تعالیٰ نے خود ہی کی کیونکہ مسلمانوں کی حالت انتہائی پستی کو پہنچ چکی تھی۔ چنگیز خان اور مغولان چنگیزی ایک ایسے ملک اور ایسی حالت میں رہتے تھے کہ ان کی طرف کسی کی بھی آنکھ نہیں اٹھ سکتی تھی یعنی وہ کسی قطار وشمار میں نہیں سمجھے جاتے تھے۔ ایسے جاہل اور وحشی لوگوں سے یہ توقع کسی طرح نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ متمدن دنیا اور عالم اسلام کے فاتح بن سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان وحشی مغلوں اور غیر متمدن لوگوں کو اپنی مشیت کے ماتحت ان کے وطن سے باہر نکالا اور ان کافر مغلوں کو فاجر مسلمانوں کا سزا دہندہ بنایا۔ چنگیز خان اور ہلاکو خان کی خون ریزیاں درحقیقت ایک ڈاکٹر جراح کی خون ریزی سے بہت مشابہ تھیں۔ جس طرح ایک ڈاکٹر نشتر

سے شگاف دے کر ماؤف مقام سے خون نکالتا اور مواد فاسد کو خارج کر کے صحت وتندرستی کو واپس لانے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح مغولان چنگیزی نے خلافت بغداد کے تختے کو الٹ کر اپنی سفا کی وخون ریزی سے رسم پرست اور بدعقیدہ مسلمانوں کو جو سلطنت اسلامیہ میں بلادلیل وراثت کو لازمی قرار دیتے اور خاص خاندان کو حکمرانی کا مستحق ٹھہراتے تھے، مرعوب ومبہوت بنا کر اپنی ایک آزاد و خودمختار سلطنت قائم کر لی۔

اسلام اس طاقت اور اس نظام سلطنت کا نام ہے جو عرب کے بے سروسامان اور غیر متمدن بدوؤں کو قیصر وکسریٰ کی سلطنتوں کا فاتح اور تمام دنیا کا معلم بنا سکتا ہے۔ مسلمانوں نے تعلیم اسلامی پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا اور یہ نام کے بھی مسلمان نہ رہے تھے۔ مسلمانوں کی نالائقی اور غفلت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ وہ مغلوں سے مغلوب ہو گئے۔ قرن اول کے مسلمانوں کو مغولان چنگیزی تو کیا فتح کرتے، ان سے بڑھ چڑھ کر اور زیادہ طاقتور تاتاری قبائل تھے، جو بڑی آسانی سے مسلمانوں کے مغلوب ومحکوم بن سکتے تھے۔ سلجوقی بھی اس ملک کے باشندے اور مغلوں کے حاکم وفرماں روا سمجھے جاتے تھے لیکن انہوں نے بھی اسلام قبول کرنے کے بعد ہی حکومت و فرماں روائی کا حوصلہ پایا تھا۔ چنگیز خان اور اس کی فوج کوئی غیر معمولی شائستگی اپنے اندر نہ رکھنے کے باوجود مسلمانوں پر اس لیے فتح پا سکے کہ اس زمانے کے مسلمان اسلامی اخلاق کھو چکے تھے۔ مغلوں کو فتوحات اس لیے حاصل نہیں ہوئیں کہ وہ فتوحات کے زیادہ اہل تھے بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے فاتح بنا دیا تھا کہ مسلمانوں کے غفلت کا علاج ہو جائے۔ مغلوں نے خلافت بغداد کو برباد کر کے مسلمانوں کی اس مذکورہ بدعقیدگی کو مٹایا اور اس بات کا موقع خود بخود پیدا ہو گیا کہ مسلمان اس مصیبت کے وقت میں مجبور ہو کر خالص اسلامی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں۔

مغلوں کو دین اسلام سے نہ کوئی خاص عداوت تھی نہ کوئی ہمدردی۔ مغل بادشاہوں نے اپنے محکوم مسلمانوں کے دین سے واقف ہونا چاہا تو جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئی، اس پر بے باکانہ معترض ہوئے اور جو بات سمجھ میں آ گئی، اس کی تعریف وستائش کی۔ مغلوں کا انکار ان کی رعایا کی طرف سے ان پر کوئی مصیبت وخفت نہیں لا سکتا تھا۔ مسلمانوں کی بعض بدعقیدگیوں اور رسم پرستیوں کے خلاف اگر کوئی مسلمان بادشاہ اس طرح معترض ہوتا تو مسلمان رعایا کی طرف سے اس کے خلاف ایک طوفان برپا ہوسکتا تھا لیکن مغلوں کو یہ اندیشہ نہ تھا۔ اس طرح مسلمان علماء اور دربار رس

مسلمانوں کو قدرتی طور پر یہ موقع ملا کہ وہ تمام پست خیالیوں، تنگ نظریوں اور تقلید پرستیوں سے بالاتر ہوکر اسلام کا وہی نقطہ نظر پیش کریں جو قرآن کریم پیش کرتا ہے اور جس کی نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعلیم دی تھی۔ اس خالص اسلام پر کوئی معقول اعتراض وارد ہی نہیں ہوسکتا اور جب یہ خالص اسلام کسی غیر جانبدار اور خالی الذہن شخص یا قوم کے سامنے پیش کیا جائے گا، اس کو ضرور اسلام کی صداقت کا اقرار کرنا پڑے گا۔ اسی طرح مغلوں کے چیرہ دست ہونے سے خود مسلمانوں کے اندر اسلام کا اصلی رنگ نکھر گیا اور بہ جا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ چنگیز خان اور ہلاکو خان کے ذریعہ سے مسلمانوں کو جس قدر نقصان پہنچا، اسی قدر اسلام اور مسلمانوں کو فائدہ بھی پہنچا۔ نقصان جس قدر پہنچا، وہ مادی اور جسمانی تھا لیکن فائدہ روحانی اور دینی پہنچا۔ اگر مغلوں کی حکومت قائم ہوکر اسلامی حکومت کا نام ونشان مٹ جاتا تو یقیناً اس سے بڑھ کر کوئی روحانی و دینی نقصان نہ تھا مگر چند ہی روز بعد یہ مغل مسلمان ہوکر خود اسلام کے خادم بن گئے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جن مغلوں نے خلافت بغداد کو ملیا میٹ کیا تھا، وہی سب سے زیادہ شعائر اسلام کو قائم کرنے والے اور اسلام کے لیے اپنی گردنیں کٹانے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔[1]

اس حقیقت کی طرف بہت ہی کم مورخین کی توجہ مبذول رہی ہوگی کہ مغولستان، چین اور ترکستان کی طرف اسلام نے ہمیشہ زیادہ اشاعت کا موقع پایا ہے۔ شام، روم، مصر، طرابلس، مراکش، چین، ایران، خراسان اور بلوچستان وغیرہ ممالک کے باشندوں نے اپنی جہالت وناواقفیت کے سبب سے قدم قدم پر مسلمانوں کو روکا ٹوکا اور مقابلہ کیا۔ اول اول ہر جگہ خون کے دریا بہانے کی نوبت آئی۔ اس کے بعد لوگوں نے اسلام کے سمجھنے اور سوچنے کا موقع پایا لیکن چین وترکستان میں جب اسلام پہنچا تو وہاں کے باشندوں نے اسلام کو سمجھنے میں دوسرے ملکوں کی نسبت زیادہ دانائی اور بصیرت کا اظہار کیا۔ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ماوراء النہر کے اکثر باشندے مسلمان ہو چکے تھے۔ مشرقی ترکستان اور تبت تک اسلام آچکا تھا۔ اسی کے قریب زمانے میں عرب لوگ چین کے اندر بہ طور تاجر اور بہ طور لشکر داخل ہو چکے تھے۔ ان مسلمان عربوں کی صحبت سے چینیوں میں اسلام کی

---

[1] مصنف نے یہاں مغلیہ دور حکومت کی بات کی ہے۔ اس دور میں سلاطین مغلیہ کے ہاں جہاں بعض اچھی روایات وامثال نظر آتی ہیں، وہیں بہت سے خلاف اسلام امور ریاستی سطح پر ہمیں نظر آتے ہیں، جیسے اکبر کے دین الٰہی کا کافرانہ نظام، جہانگیر کو دربار میں سجدۂ تعظیمی کا ہونا وغیرہ۔ حالانکہ سجدہ تو صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کو کیا جانا درست ہے۔

اشاعت شروع ہوگئی تھی۔ چین و ترکستان میں اسلام نہایت تیز رفتاری کے ساتھ شائع ہو کر پہلی ہی صدی ہجری میں ان ملکوں کے تمام باشندوں کو اسلام کا حلقہ بہ گوش بنا چکا ہوتا مگر علویوں کی سازشی تحریک اور بنو امیہ کی بربادی کے لیے کوششوں نے اسلام کی اشاعت کو نقصان پہنچایا اور عالموں کی ذاتی ونفسانی اغراض نے اشاعت اسلام کے کام کو روکا اور مسلمانوں کی آپس کی مخالفتوں اور خانہ جنگیوں نے غیر مسلموں کو غیر مسلم ہی رکھنا چاہا، ورنہ باشندگان چین و ترکستان میں اسلام کو قبول کرنے کی عام صلاحیت بہت زیادہ تھی۔ سلجوقیوں کے اولوالعزم قبیلے نے بلا کسی لالچ یا خوف کے بہ خوشی اسلام کو قبول کیا اور اسلام کا بہت بڑا خادم ثابت ہوا۔ ترکان غزنی نے جو ڈاکہ زن اور غارت گر کی حیثیت سے ممالک اسلامیہ میں داخل ہوئے تھے، بہ خوشی اسلام کو قبول کیا اور اس کے خادم ثابت ہوئے۔ آج بھی چین کے اندر آبادی کا بہت بڑا حصہ اسلام کا حلقہ بہ گوش اور خادم ہے۔ یہ تمام چینی مسلمان کسی جنگی مہم اور فوجی کارروائی کا نتیجہ نہیں ہیں اور سب کے سب چین کے قدیم باشندوں کی نسلیں ہیں۔ چنگیز خان اور اس کے ساتھی ممالک اسلامیہ میں فاتحانہ داخل ہوئے لیکن ان مغلوں نے اسلام کو سمجھنے اور اس کو تسلیم کرنے کی شروع ہی میں آمادگی ظاہر کی اور چند ہی روز کے بعد چنگیز خاں کی اولاد اسلام میں داخل ہو کر اسلام کی خادم بن گئی۔ عجیب اتفاق ہے کہ مغرب کے انتہائی ملکوں تک یعنی مراکش واندلس میں اسلام فاتحانہ تیغ وعلم کے سایہ میں پہنچا تو مشرق کے انتہائی ممالک یعنی چین اور بحرالکاہل کے جزیروں میں وہ بلا تیغ وعلم محض سوداگروں یا واعظوں اور مبلغوں کے ذریعہ پہنچا۔ مسلمانوں نے فاتح بن کر اپنے مفتوحوں کو اسلام کی دولت سے مالا مال کیا تو دوسری طرف انہوں نے مفتوح ہو کر اپنے فاتحین کو بھی اسلام کا خادم بنا لیا۔ اگر چنگیز خان اور ہلاکو خان کی ملک گیریاں اور خون ریزیاں ظہور میں نہ آتیں تو اسلام کی صداقت وعظمت کا یہ پہلو کہ وہ فاتحین کو بھی اپنا مفتوح بنا سکتا ہے، شائد کسی قدر مشتبہ رہتا۔ پس مغلوں کی ترک وتاز کو اگر ایک طرف عالم اسلام کے لیے مصیبت کبریٰ کہا جا سکتا ہے تو دوسری طرف اس کا نام رحمت عظمیٰ رکھا جا سکتا ہے ؎

ہر بلا کہ ایں قوم راحق دادہ است   زیر آن گنجِ کرم بنہادہ است

بنی نوع انسان کی فطرت ہے کہ جب تک اس میں جہالت و بے علمی کا زور شور ہوتا ہے، اس کے تمام کام شخصی حکومت کے ذریعہ سے ہی درست رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ مطلق العنان شخصی حکومتوں کے تصور کو انسان کی ابتدائی حالت اور زمانہ جاہلیت سے جدا نہیں کر سکتے۔ عہد

جاہلیت میں جمہوریت کے معانی سوائے فساد اور فتنہ کے اور کچھ ہو بھی نہیں سکتے۔ مغل لوگ بھی چین وتبت وترکستان کے پہاڑوں میں بدووانہ اور جاہلانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے یہاں قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کا تصور نہایت عظیم الشان تھا۔ سردار قبیلہ کے اختیارات اور اس کی عظمت وشوکت اس قدر بڑھی ہوئی ہوتی تھی کہ افراد قبائل اس کو معبود کا رتبہ دیتے تھے۔ ہندوستان میں بھی راجہ اور مہاراجہ کی یہی حالت تھی۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہ پرستی ممالک مشرقیہ کی خصوصیات میں داخل ہے۔ مغلوں نے چونکہ بہت جلد مشرقی ممالک کے تاجوں اور تختوں پر قبضہ کرلیا تھا، لہٰذا ان کی حکومت میں بادشاہ پرستی کا ابتدائی تصور بہ دستور موجود رہا اور متمدن وشائستہ ہونے کے باوجود بھی بادشاہ پرستی مغلوں کی شان میں باقی رہی۔ اسلام اور فطرت انسانی بادشاہ پسندی میں حد سے زیادہ ترقی کرنے کو مضر انسانیت قرار دیتی ہے۔ مگر مغلوں کی بادشاہ پرستی سے اسلام کو یہ عظیم الشان فائدہ پہنچا کہ مغلوں کے صرف چند بادشاہوں کا اسلام میں داخل ہونا تمام قوم کے اسلام میں داخل ہونے کا موجب ہو گیا۔ یکا یک ساری کی ساری قوم مسلمان ہوگئی۔ یہاں تک کہ مورخین نے صرف دو تین مغل سلاطین کے ابتداء اسلام قبول کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد ہر ایک مغل بادشاہ اور اس کے امراء مسلمان نظر آتے ہیں اور اس بات کو کہ کب کس نے اسلام کو قبول کیا؟ قابل تذکرہ نہیں سمجھا گیا کیونکہ سب کے سب ہی اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ صرف جوجی خان کی اولاد نے محض اس وجہ سے کہ وہ ممالک اسلامیہ سے دور دور رہے، کسی قدر دیر میں اسلام قبول کیا مگر آخرکار ازبکوں کی تمام قوم اسلام میں داخل ہوگئی تھی۔ یہ بھی کسی واقعہ سے ثابت نہیں ہو سکا کہ مغلوں نے اسلام کو قبول کرنے پر اپنے بادشاہ ہونے کی مخالفت یا بغاوت کی تو محض مادی اور دنیوی اغراض کی وجہ سے نہ کہ تبدیلی مذہب کے سبب سے مغلوں نے چونکہ حکمران اور فاتح ہونے کی حیثیت میں اسلام کو قبول کیا تھا، لہٰذا حکومت وسرداری نے ان کو اسلام سے کما حقہ واقف ہونے کا موقع نہیں دیا اور ان کی حالت کئی کئی پشتوں کے گزرنے تک بھی وہی رہی جو ابتداء میں ایک نومسلم کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مغلوں کے اندر یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوئی کہ دوسری قوموں کو دعوت اسلام دے سکیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغلوں کے اکثر گروہ اور اکثر سردار کچھ عرصہ تک حالت کفر میں رہے لیکن انہوں نے کبھی ان خاندانوں اور سرداروں کے ساتھ رہنے اور مل کر کام کرنے سے انکار نہیں کیا جو مسلمان ہو چکے تھے۔ چونکہ مغلوں میں صلاحیت تبلیغ اسلام پیدا نہیں ہوئی تھی، لہٰذا

غیر مسلم قبائل نے نہیں بلکہ قدیم مسلمانوں اور ان کی مسلم رعایا ہی نے اسلام کی طرف توجہ کی۔

اس مذکورہ حقیقت کو ذہن نشین رکھنے کے بعد ہندوستان کے بادشاہ اکبر کی بعض بداعمالیوں پر بھی تعجب باقی نہیں رہتا۔ مغلوں کے مقابلے میں تاتاری لوگ اسلام کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے اور ان کی واقفیت کسی زمانے میں بھی ایسی ناقص نہ تھی جیسی کہ مغلوں کی عرصہ دراز تک رہی۔ یہی وجہ تھی کہ تاتاریوں اور سلجوقیوں نے اسلام کی تبلیغ میں ایسی کوشش کی اور اسلام کے لیے ایسی غیرت دکھائی کہ مغلوں میں اس کی مثالیں بہت ہی کم دستیاب ہوسکتی ہیں۔ ترکوں، تاتاریوں اور مغلوں میں کیا فرق ہے اور کس قسم کی رقابت ہے؟ اس کے متعلق اوپر ذکر ہو چکا ہے، پھر مغلوں کے اندر مسماۃ الانقوا کے بیٹوں کی اولاد سے الگ الگ قومیں پیدا ہوئیں، اس کا ذکر بھی اوپر ہو چکا ہے۔ ان میں بوزنجر ابن الانقوا کی اولاد بوزنجری کہلائی اور وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں زیادہ مشہور اور پیش پیش رہی۔ اس بوزنجری قبیلہ میں تومنہ خان ایک شخص ہوا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک قبل خان، دوسرا قاچولی بہادر۔ قبل خان کی اولاد میں چنگیز خان تھا۔ جس کی اولاد مغولان چنگیزی کہلائی اور اس کے حالات ابھی ہم اوپر مطالعہ کر چکے ہیں۔ دوسرے بیٹے قاچولی بہادر کا بیٹا ایرومجی برلاس تھا۔ اس ایرومجی برلاس کی اولاد قوم برشام کے نام سے موسوم ہوئی۔ ایرومجی برلاس کا پوتا امیر قراچار تھا۔ جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، جو چنگیز خان کے بیٹے چغتائی خان کا امیر الامراء اور سپہ سالار تھا۔ اس امیر قراچار کی اولاد میں امیر تیمور گورکان صاحب قران پیدا ہوا۔ لہٰذا امیر تیمور قوم برلاس میں سے تھا۔ امیر تیمور کا لقب چونکہ گورکان تھا، اس لیے امیر تیمور کی اولاد گورکانیہ کہلائی اور ایک الگ قوم سمجھی گئی۔ مغولان بوزنجری میں اول قبل خان کی اولاد صاحب علم اور وارث تخت و تاج رہی۔ جب ان کا ستارہ اقبال غروب ہونے لگا تو قاچولی بہادر کی اولاد یعنی مغولان برلاس کی نوبت آئی اور امیر تیمور گورکان نے چنگیز خان کی فتوحات کو پھر تازہ کر دیا۔ مگر فرق صرف اس قدر تھا کہ چنگیز خان ایک غیر مسلم باپ کا غیر مسلم بیٹا تھا اور امیر تیمور ایک مسلمان باپ کا مسلمان بیٹا تھا۔ چنگیز خان جن لوگوں سے لڑا اور جن کو اس نے قتل کیا، وہ مذہب وعقیدے میں چنگیز خان کے موافق نہ تھے لیکن امیر تیمور کو اپنے ہی مسلمان بھائیوں سے زیادہ لڑنے کا موقع ملا۔ جس طرح چنگیز خان کی اولاد میں اس کے مرنے کے بعد ایشیا کے بہت بڑے حصے کی حکومت وسلطنت رہی، اسی طرح امیر تیمور کی اولاد میں بھی اس کے بعد ایشیا کے اکثر ملکوں کی بادشاہت باقی رہی۔ لہٰذا درست طور پر کہا جاسکتا ہے کہ تومنہ خان کی

اولاد نے قریباً چھ سو سال تک مسلسل براعظم ایشیا میں حکمرانی کی۔ مگر چونکہ امیر تیمور کا ذکر شروع کرنے سے ہم بہت دور آگے نکل جائیں گے، لہٰذا ہم کو اس وقت مغولان چنگیزی سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔

اکیسواں باب

ایران کی اسلامی تاریخ کا اجمالی تتمہ

تاریخ اسلام کے سلسلہ میں اب تک جس ترتیب کے ساتھ حالات بیان ہوئے ہیں، ان میں ایران کی تاریخ کا بہت بڑا اور ضروری حصہ بیان ہو چکا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے صرف ایران ہی کی اسلامی تاریخیں لکھی ہیں، انہوں نے واقعات کے قلمبند کرنے میں دوسری ترتیب ملحوظ رکھی ہے، جو ان کے لیے موزوں بھی تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دوسرے مسلم ممالک کے مقابلہ میں ایران کی تاریخ سے ہمیشہ خصوصی تعلق رہا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب تک بیان کردہ واقعات میں تفریق ترتیب کے سبب سے جو کمی رہ گئی ہے، اس کو نہایت اختصار کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔

دولت صفاریہ:

ایران کی تاریخوں میں خلفاء کی براہ راست حکومت کے بعد سب سے پہلے خاندان صفاریہ کی خودمختارانہ سلطنت کا بیان لکھا گیا ہے۔ اس خاندان کے حکمرانوں کا حال جو کچھ اوپر کے ابواب میں بیان ہو چکا ہے، اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر اس جگہ کسی اضافہ کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ ہاں اس قدر اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ خاندان عباسیہ نے خلافت کو حاصل کرنے میں چونکہ ایرانیوں سے زیادہ امداد حاصل کی تھی، لہٰذا انہوں نے ایرانیوں کے اقتدار و اثر کو بڑھانے اور عربوں پر چیرہ دست بنانے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوب ایرانیوں کو خود غلبہ پانے اور اپنی حکومت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور ابو مسلم خراسانی اور برامکہ وغیرہ کو شاہانہ اقتدار حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی لیکن جب تک عباسی خاندان میں فاتحانہ اور سپاہیانہ جذبات باقی رہے، ایرانی اپنے مقصد میں کما حقہ کامیاب نہ ہو سکے۔ خلفائے عباسیہ کی عیش پرستی و کمزوری نے جب ایرانیوں کے لیے ان کی اولوالعزمیوں کے پورا ہونے کا راستہ صاف کر دیا تو سب سے پہلے

یعقوب بن لیث جس کے خاندان میں ٹھٹھیرے کا پیشہ ہوتا تھا اور اسی لیے وہ صفار کے نام سے پکارا جاتا تھا، اپنی خودمختار حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یعقوب بن لیث صفار دوست نوازی، سخاوت اور سادہ زندگی بسر کرنے میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا اور اس کے انہیں صفات و اخلاق میں اس کی کامیابی کا راز مضمر تھا۔ اس کے پاس جو کچھ ہوتا تھا، اپنے دوستوں کو کھلا پلا دیتا تھا۔ خود تکلیف اٹھا کر دوستوں کو راحت پہنچانے کا شوق رکھتا تھا۔ اس لیے اس کو اپنے جانثاروں کی جمعیت فراہم کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اس نے اپنے لڑکپن کے دوستوں کو اپنی بادشاہت کے وقت مطلق فراموش نہیں کیا اور سب کو اعلیٰ مدارج پر پہنچایا۔ بادشاہت کی حالت میں بھی وہ ایک معمولی سپاہی کے لباس میں نظر آتا تھا۔ معمولی سپاہیوں کی طرح زمین پر سونے اور خندق کھودنے سے اس کو عار نہ تھا۔ اس کے خیمے اور ایک معمولی سپاہی کے خیمے میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ اس کو عیاشی و بدچلنی سے سخت نفرت تھی اور استقلال و اولوالعزمی اس کے ہر ایک کام اور ہر ایک بات سے ٹپکتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ نہایت پست اور ادنیٰ درجہ سے ترقی کر کے ملک ایران کے بہت بڑے حصے کا مطلق العنان فرماں روا بن گیا تھا اور بغداد کا دربار خلافت اس کے استیصال پر قادر نہ ہو سکا تھا۔

یعقوب بن لیث صفار کی وفات کے بعد اس کا بھائی عمرو بن لیث صفار اپنے بھائی کا جانشین بنا اور اس نے اپنی حدود حکومت کو اور بھی وسیع کر دیا۔ عمرو بن لیث میں اگرچہ اپنے بھائی کی نسبت عقل و دانائی زیادہ بیان کی جاتی ہے مگر وہ ان سپاہیانہ اخلاق اور سادہ زندگی بسر کرنے میں اپنے بھائی سے کمتر تھا۔ خلیفہ معتمد کے بھائی موفق نے ایک مرتبہ اس کو شکست بھی دی مگر اس نے جلد اپنی حالت کو پھر درست کر لیا اور دربار خلافت کے لیے وبال جان بن گیا۔ آخر خلیفہ نے ماوراء النہر کے حاکم اسماعیل سامانی کو عمرو بن لیث کے مقابلہ پر آمادہ کیا۔ عمرو بن لیث ستّر ہزار سوار لے کر اسماعیل سامانی کے استیصال پر آمادہ ہوا اور دریائے جیحون کو عبور کیا۔ اسماعیل سامانی صرف بیس ہزار سواروں کے ساتھ مقابلہ پر آیا۔ عین معرکہ جنگ کے وقت عمرو بن لیث کا گھوڑا اپنے سوار کی منشاء کے خلاف اس کو اسماعیل سامانی کے لشکر میں لے گیا اور وہاں وہ بڑی آسانی سے گرفتار کر لیا گیا۔

صید را چوں اجل آید، سوئے صیّاد رَوَد

اسماعیل سامانی نے عمرو کو گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا اور اس طرح دولت صفاریہ کی عظمت و شوکت کا قریباً خاتمہ ہو گیا۔ یعقوب بن لیث اور عمرو بن لیث میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ

یعقوب ایک صعوبت کش اور سوکھی روٹیاں چبا کر گزر کر لینے والا سپاہی تھا اور عمرو بن لیث ایک شان وشوکت اور سامان عیش کے ساتھ بسر کرنے والا بادشاہ تھا۔ اس جگہ ایک لطیفہ کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

جس روز عمرو بن لیث گرفتار ہوا، اس روز صبح کے وقت اس کے باورچی نے عرض کیا کہ باورچی خانہ کا سامان اٹھانے کے لیے تین سو اونٹ ناکافی ہیں۔ مجھ کو بار برداری کے کچھ اونٹ اور دیے جائیں۔ اسی شام کو جب کہ عمرو بن لیث گرفتار ہو چکا تھا، اس نے اپنے باورچی سے جو اس کے ساتھ قید خانہ میں موجود تھا، بھوک کی شکایت کی۔ باورچی نے گھوڑوں کا مہیلہ پکانے کی ایک ہانڈی میں، جو اتفاقاً وہاں موجود تھی، تھوڑا سا دلیا پانی ڈال کر پکنے کے لیے چولہے پر چڑھا دیا۔ اس کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ عمرو بن لیث دلیے کے پکنے کا انتظار نہایت بے صبری کے ساتھ کر رہا تھا۔ باورچی نے ہانڈی چولہے سے اتار کر رکھی اور کسی ضرورت سے دوسری طرف متوجہ ہوا کہ اتنے میں ایک کتا آیا۔ ہانڈی کا کنارہ منہ میں پکڑ کر اور اٹھا کر چل دیا۔ عمرو بن لیث نے جب کتے کو ہانڈی لے جاتے ہوئے دیکھا تو اپنے باورچی کو آواز دے کر کہا کہ صبح تو شکایت کر رہا تھا کہ باورچی خانہ کا سامان اٹھا کر لے چلنے کے لیے تین سو اونٹ ناکافی ہیں۔ اب دیکھ لے کہ ایک کتا میرا سارا باورچی خانہ اٹھائے ہوئے لے جا رہا ہے۔

عمرو بن لیث کے بعد اس کی اولاد نے چند سال تک علاقہ سیستان کے محدود رقبہ میں اپنی اپنی برائے نام حکومت قائم رکھی۔ یعقوب بن لیث صفار کا نواسا جس کا نام خلف تھا، محمود غزنوی کے زمانہ تک سیستان میں برسرِ حکومت رہا۔ خلف کے بیٹے نے باپ کے خلاف مخالفت کا علم بلند کیا۔ خلف نے اپنے آپ کو بیٹے کے مقابلے میں کمزور دیکھ کر اس کو دھوکہ سے قتل کیا۔ باشندگان سیستان نے سلطان محمود غزنوی کی خدمت میں خلف کے خلاف شکایت کی عرضیاں بھیجیں اور لکھا کہ آپ ہم کو خلف کے مظالم سے نجات دلائیے۔ سلطان محمود غزنوی نے چڑھائی کی۔ خلف نے مقابلہ میں اپنے آپ کو مغلوب اور اپنے قلعہ کو مفتوح دیکھ کر سلطان محمود کی خدمت میں حاضر ہو کر رکاب کا بوسہ دیا اور اپنی داڑھی سلطان کے پاؤں سے مل کر کہا کہ اے سلطان! مجھ کو معاف کر دے۔ محمود غزنوی کو خلف کی زبان سے اپنی نسبت لفظ ''سلطان'' پسند آیا اور آئندہ اس لفظ ''سلطان'' کو اپنا لقب قرار دیا۔ خلف کو اور کوئی سزا نہیں دی، اسی قدر کافی سمجھا کہ اس کو اپنے ہمراہ غزنین لے گیا۔ جہاں چار

سال رہ کر خلف نے وفات پائی۔ اس طرح دولت صفاریہ کا خاتمہ ہوا۔

دولت سامانیہ:

اسد بن سامان اپنے آپ کو بہرام چوبین کی اولاد میں بتاتا تھا۔ اسد بن سامان اپنے چاروں بیٹوں کو لے کر مامون الرشید عباسی کی خدمت میں مقام مرو میں حاضر ہوا تھا جبکہ مامون الرشید مرو میں مقیم تھا۔ مامون الرشید عباسی کو اپنے بھائی امین کے خلاف تخت خلافت حاصل کرنے میں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، اس میں سب سے زیادہ ایرانیوں کی امداد واعانت کو دخل تھا۔ مامون الرشید کا اسد بن سامان اور اس کی اولاد پر مہربان ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ سامانیوں کے اقتدار نے اسی زمانے سے تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی۔ چونکہ یہ خاندان ایران کے ایک مشہور سردار کی اولاد سے تھا، اس لیے ماوراء النہر، خراسان میں ان لوگوں کی سیادت کے خلاف آمادہ ہونے کا امکان اور بھی ضعیف ہو گیا تھا۔ اسماعیل سامانی جو اسد بن سامان کا پوتا تھا، عمرو بن لیث پر غالب آنے کے بعد بہت جلد بادشاہت کے مرتبہ کو پہنچ گیا۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ خاندان صفار خلافت بغداد کے خلاف اور معاندر ہا لیکن اسماعیل اور اس کے جانشین برائے نام دربار خلافت کی سیادت کو تسلیم کرتے رہے۔

اسماعیل سامانی نے ماوراء النہر، خراسان میں سات آٹھ سال حکومت وسلطنت کی۔ خلیفہ معتضد باللہ عباسی نے اس کو ملک خراسان کی سند حکومت عطا کی تھی۔ اسماعیل کی وفات کے بعد ابونظیر احمد بن اسماعیل سامانی باپ کا جانشین ہوا۔ اسماعیل سامانی اپنے عادات وخصائل کے اعتبار سے نہایت شریف، سیرچشم اور متوکل علی اللہ شخص تھا۔ جہانگیری کے ساتھ ہی جہاں داری کے اصولوں سے بھی خوب واقف تھا۔ رعایا اس سے خوش تھی اور اس نے اپنے طرز عمل سے اس بات کا کافی ثبوت بہم پہنچا دیا تھا کہ وہ ایران کے نہایت شریف اور سردار خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

احمد بن اسماعیل نے تخت نشین ہو کر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو اپنی بداخلاقی سے ناراض کر دیا۔ چھ سات سال تک اس نے حکومت کی مگر یہ تمام زمانہ اس نے دربار خلافت کے خلاف ریشہ دوانیوں اور اپنے رشتہ داروں کو ناراض رکھنے میں صرف کر دیا۔ آخر خود اپنے ہی غلاموں کے ہاتھ سے مقتول ہوا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا نصر بن احمد سامانی آٹھ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ یہ بالکل اپنے دادا اسماعیل کا نمونہ تھا۔ اس نے چند ہی روز کے بعد اپنی سلطنت کی حدود کو اسماعیل سامانی کی حدود سلطنت سے زیادہ وسیع کر لیا اور تیس سال سے زیادہ عرصہ تک بڑے زور شور اور ناموری کے ساتھ حکومت کی۔ اسی کے دربار میں رودکی شاعر جو نابینا تھا، بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رہتا تھا۔ نصر بن احمد اپنے دارالسلطنت بخارا میں فوت ہو کر مدفون ہوا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا نوح بن نصر تخت نشین ہوا۔ اس نے تیرہ سال حکومت کر کے سنہ ۳۴۳ھ میں وفات پائی۔

اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک بن نوح تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے ممالک مقبوضہ کے جنوبی حصے یعنی صوبہ خراسان کی گورنری پر اپنے ایک سردار الپتگین کو مامور کیا تھا۔ آخر سات سال حکومت کرنے کے بعد چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر فوت ہوا۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بھائی منصور بن نوح تخت نشین ہوا۔ اس نے رکن الدولہ دیلمی کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ اس لیے عراق و فارس کے صوبوں میں بھی اس کی سیادت تسلیم کی گئی۔ اسی کا وزیر ابوعلی بن محمد تھا، جس نے تاریخ طبری کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ منصور بن نوح نے پندرہ سال حکومت کی۔

اس کے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت بخارا یعنی دولت سامانیہ پر ادبار تنزل کی گھٹائیں چھا گئیں۔ اس کے درباریوں نے اس کے خلاف ملک میں بغاوتیں برپا کرائیں اور مغولستان کے بادشاہ بغرا خان کو اس پر حملہ آور کرایا۔ بخارا کے متصل لڑائی ہوئی۔ بغرا خان نے نوح ثانی کو شکست دے کر بخارا پر قبضہ کر لیا۔ مگر عجیب اتفاق یہ پیش آیا کہ بغرا خان اس فتح کے بعد ہی بخارا میں فوت ہو گیا اور اس کی فوج اپنے ملک کو واپس چلی گئی۔ نوح ثانی نے پھر بخارا پر قابض ہو کر اپنی سلطنت کو مضبوط کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ غزنین میں سبکتگین نے اپنی مستقل حکومت قائم کر لی تھی اور نوح ثانی کی تخت نشینی کے چند روز بعد الپتگین کا انتقال ہو چکا تھا۔ نوح ثانی نے سبکتگین کو اس خدمت کے صلہ میں کہ اس نے بغرا خان کے خلاف نوح ثانی کی مدد کی تھی، ناصر الدین کا خطاب دیا تھا۔ دقیقی شاعر اس کا معاصر تھا، جس نے داستان گشتاسپ کے ایک ہزار اشعار لکھے تھے۔ بغرا خان کے حملہ سے فارغ ہونے کے بعد نوح ثانی نے اپنے ان باغی اور بے وفا امیروں کو سزائیں دینی چاہیں، جنھوں

نے ملک میں بغاوتوں کے لیے ریشہ دوانیوں کا سلسلہ بچھا رکھا تھا۔ ان باغی امراء نے فرار ہو کر فخرالدولہ دیلمی کے پاس پناہ لی اور اس سے مدد لے کر سلطنت بخارا پر حملہ آور ہوئے۔ نوح ثانی نے سبکتگین سے پھر امداد طلب کی۔ سبکتگین نے ہرات کے قریب باغیوں کا مقابلہ کیا اور جنگ عظیم کے بعد ان کو شکست فاش دے کر بھگا دیا۔ اس لڑائی میں سبکتگین کے بیٹے محمود غزنوی نے بڑی بہادری دکھائی اور خوب بڑھ بڑھ کر تلوار چلائی۔ نوح ثانی نے خوش ہو کر محمود کو سیف الدولہ کا خطاب دیا۔ بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ اسی لڑائی میں سبکتگین کو ناصرالدین کا خطاب ملا تھا اور اسی لڑائی کے بعد سبکتگین ملک خراسان کی سند حکومت کو نوح ثانی کے دربار سے عطا ہوئی تھی۔ نوح ثانی نے ۲۲ سال حکومت کی مگر اس کا زمانہ اکثر لڑائی جھگڑوں اور بغاوتوں کو فرو کرنے میں بسر ہوا اور ملک کے صوبے یکے بعد دیگرے اس کے قبضے سے نکلتے گئے۔

نوح ثانی کے بعد اس کا بیٹا منصور ثانی باپ کا جانشین ہوا۔ ان امیروں نے جو اس کے باپ کے لیے موجب اذیت رہتے تھے، اس کو پریشان رکھا اور شکست دے کر بخارا سے بے دخل کیا، پھر انہوں نے اسی کو بادشاہ تسلیم کر کے امور سلطنت اپنے اختیار میں لے کر خراسان میں ایک نئے حاکم سے متعلق کیا۔ محمود غزنوی نے اس نئے حاکم کو خراسان سے بے دخل کر کے اپنا قبضہ کر لیا۔

اسی عرصہ میں امیروں نے منصور کو تخت سے اتار کر اندھا کیا اور اس کی جگہ اس کے بھائی عبدالملک ثانی بن نوح ثانی کو تخت پر بٹھایا اور اس کو ہمراہ لے کر محمود غزنوی پر حملہ آور ہوئے۔ محمود غزنوی نے عبدالملک ثانی اور اس کی فوج کو شکست دے کر بخارا کی طرف بھگا دیا۔ ادھر ایلیج خان حاکم کاشغر نے خوارزم پر قبضہ کر کے بخارا پر حملہ کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایلیج خان نے عبدالملک ثانی کو گرفتار کر کے بخارا پر قبضہ کیا اور عبدالملک ثانی کا تیسرا بھائی منتصر بھیس بدل کر بخارا سے فرار ہوا اور چند روز تک قزاقوں کی ایک جمعیت کے ساتھ آوارہ رہ کر ایک شخص کے ہاتھ سے مقتول ہوا۔ اسی طرح سامانی خاندان اور اس کی دولت وحکومت کا خاتمہ ہو گیا (ایلیج خان، ایلک خان اور علی تگین یہ تینوں ایک ہی شخص کے نام ہیں)۔

دولت دیلمیہ:

دیلمیوں کی حکومت وسلطنت کے حالات جس قدر خلفائے عباسیہ کے حالات یعنی باب نہم میں

بیان ہو چکے ہیں، وہ بہت کافی ہیں اور ان پر اس وقت کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دیلمیوں اور سامانیوں کی سلطنتوں کو ایک دوسرے کی معاصر اور رقیب سلطنت سمجھنا چاہیے۔ سامانیوں کا قبضہ ماوراء النہر اور خراسان وغیرہ شمالی ومشرقی ممالک پر رہا اور دیلمیوں کے تصرف میں فارس، عراق اور آذربائیجان وغیرہ غربی ممالک رہے۔ اس طرح تمام ملک ایران چند روز تک انہیں دونوں خاندانوں کے درمیان منقسم تھا۔ دیلمیوں کی حکومت سامانیوں کی بربادی کے بعد بھی نہایت کمزور حالت میں کچھ دنوں باقی رہی جبکہ سامانیوں کی جگہ مشرقی ایران میں غزنویوں کی زبردست سلطنت قائم ہو چکی تھی۔

دولت غزنویہ:

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ عبدالملک بن نوح نے الپتگین کو خراسان کی گورنری پر مامور کیا تھا۔ عبدالملک کے بعد جب اس کا بھائی منصور بن نوح سامانی سنہ ۳۵۰ھ میں تخت نشین ہوا تو الپتگین جو منصور بن نوح کی تخت نشینی کے خلاف رائے ظاہر کر چکا تھا، خراسان کے دارالامارت سے مقام غزنی میں چلا آیا، جو اس زمانے میں ایک معمولی سی بستی تھی۔ یہاں الپتگین مضبوط ہو کر بیٹھ گیا اور اپنی ایک خود مختار ریاست قائم کر کے حکومت کرنے لگا۔

سنہ ۳۶۷ھ میں الپتگین کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا اسحاق غزنی کا فرماں روا ہوا مگر چند ہی روز کے تجربہ سے نااہل ونالائق ثابت ہوا اور فوجی سرداروں نے اس کو معزول کر کے یا اس کے مر جانے پر سبکتگین کو جو الپتگین کا سپہ سالار اور داماد بھی تھا، اپنا بادشاہ بنا لیا۔

سبکتگین کی نسبت مشہور ہے کہ وہ الپتگین کا غلام تھا۔ مگر یہ غلامی محض اتفاقی طور پر وقوع میں آئی تھی یعنی بعض ڈاکوؤں نے اس کو راستے میں تنہا پا کر گرفتار کر لیا اور بخارا میں لے جا کر بہ طور غلام فروخت کر دیا۔ سبکتگین کا سلسلہ نسب ایران کے بادشاہ یزدجرد تک پہنچتا ہے یعنی سبکتگین بن جوق قرا تحکم بن قرا ارسلان بن قراملت بن قرانعمان بن فیروز بن یزدجرد۔ لیکن اس شجرہ نسب کی صحت کا ثبوت بہم پہنچانا دشوار ہے۔ بعض مورخین نے سبکتگین کو ترک بتایا ہے، بعض کا بیان یہ ہے کہ وہ باپ کی طرف سے ترک اور ماں کی طرف سے ایرانی تھا۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ وہ حسب ونسب کے اعتبار سے ایک شریف آدمی تھا۔ ایشیائی دستور کے موافق کسی بادشاہ کے امیر وسردار اور

بڑے بڑے اہل کار اپنے آپ کو بادشاہ کا غلام کہنے میں اپنی بے عزتی نہیں سمجھتے، اس لیے ممکن ہے کہ الپتگین کی فوج کا سپہ سالار ہونے کی وجہ سے سبکتگین نے خود کو الپتگین کا غلام کہا ہو (ملکم صاحب کا یہی خیال ہے) سبکتگین نے قریباً بیس سال غزنی کے تخت پر حکومت کی۔ شہر بست کو فتح کیا، جو غزنی سے کئی سو میل کے فاصلے پر دریائے ہیرمند کے دونوں کناروں پر آباد تھا۔ ہرات کی جنگ میں کامیابی حاصل کی۔ پنجاب و سندھ کے راجا جے پال نے اس ملک پر فوج کشی کی تو اس کو شکست فاش دے کر گرفتار و اسیر کیا اور خراج کے وعدے پر رہا کر دیا۔ جے پال نے بدعہدی کی اور دوبارہ تین لاکھ کے لشکر جرار سے سبکتگین کے ملک پر حملہ آور ہوا۔ مگر سبکتگین نے صرف چند ہزار سپاہیوں کی مدد سے اس کا مقابلہ کیا اور اس مرتبہ بھی اس کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور پھر اس سے اقرار اطاعت لے کر چھوڑ دیا (جے پال کی لڑائیوں کا حال تاریخ ہندوستان میں مفصل لکھا جائے گا، ان شاء اللہ)۔ نوح بن منصور نے اس کو ناصر الدین کا خطاب عطا کیا اور اس کے بیٹے محمود کو سیف الدولہ کے خطاب سے مخاطب فرمایا۔ سبکتگین نے غزنی کی سلطنت کو بہت وسیع کیا اور سنہ ۳۸۷ھ میں اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ سبکتگین کے بعد اس کا بیٹا امیر اسماعیل بلخ میں تخت نشین ہوا مگر چھ مہینے کے بعد اپنے بھائی سبکتگین سے لڑ کر مغلوب و معزول ہوا۔

سنہ ۳۸۷ھ میں محمود بن سبکتگین غزنی کے تخت پر بیٹھا۔ خلیفہ قادر باللہ عباسی نے اس کو یمین الدولہ اور امین الملت کا خطاب عطا کیا تھا۔ محمود غزنوی نے تخت نشین ہوتے ہی نہایت قابلیت کے ساتھ مہمات سلطنت کو انجام دینا شروع کیا۔ لوگوں نے عبدالملک سامانی بادشاہ بخارا کو محمود کے خلاف فوج کشی پر آمادہ کیا۔ محمود نے مجبوراً مقابلہ کیا اور عبدالملک شکست کھا کر بخارا کی طرف بھاگا۔ بخارا پر ایلج خان یا ایلک خان بادشاہ کاشغر نے حملہ کر کے قبضہ کیا۔ عبدالملک سامانی قید ہوا۔ محمود غزنوی نے ایلج خان بن بغرا خان پر حملہ کر کے اس کو بخارا سے بھگا دیا اور بخارا کو اپنی حدود مملکت میں داخل کیا۔ اس کے بعد مغلوں کے سردار طغا خان بن التوخان کو شکست دے کر اپنی سلطنت کی حدود کو بحر کاسپین (بحیرۂ اخضر) تک پہنچا دیا۔ ولایت خوارزم پر بھی قبضہ کیا۔ سیستان و خراسان کے علاقے سبکتگین کے زمانے سے سلطنت غزنی میں شامل تھے۔ مجد الدولہ دیلمی کو مغلوب و اسیر کر کے رے اور اصفہان کی ولایتوں پر بھی قبضہ کیا۔ ادھر ہندوستان پر بھی اس کو مجبوراً بہت سے حملے کرنے پڑے۔ جن کی اصل حقیقت اور تفصیلی کیفیت تاریخ ہند میں لکھی جائے گی، ان شاء اللہ!

غرض کہ محمود غزنوی نے بہت جلد دریائے ستلج سے لے کر بحیرہ کاسپین تک اور ماوراء النہر سے لے کر بلوچستان وعراق تک ایک نہایت وسیع سلطنت قائم کر لی۔

محمود غزنوی براعظم ایشیا کے نہایت نامور اور زبردست بادشاہوں میں شمار ہوتا ہے۔اس کے زمانے میں فارسی زبان کو خاص طور پر رونق حاصل ہوئی۔عربی زبانوں کی ترویج واشاعت میں جو مرتبہ حجاج بن یوسف ثقفی کو حاصل ہے، وہی مرتبہ فارسی زبان کی ترویج واشاعت میں محمود غزنوی کو حاصل ہے۔محمود غزنوی نہایت سچا پکا مسلمان، بے تعصب اور علم دوست شخص تھا۔لیکن تعجب ہے کہ بعض اغراض خاص یا موجودہ حکومت وسلطنت کی مصلحتوں نے اس کو ہمارے زمانے میں مذموم، متعصب، لالچی، ظالم، سفاک اور ہندوؤں کا جانی دشمن مشہور کر دیا ہے۔ان جھوٹی اور گمراہ کن باتوں کی حقیقت تاریخ ہند میں بے پردہ کی جائے گی،ان شاء اللہ تعالیٰ۔اسی کے زمانے میں فردوسی نے شاہنامہ لکھا تھا۔سنہ ۴۲۱ھ میں محمود غزنوی نے وفات پائی۔سبکتگین اور محمود غزنوی کو دربار سامانیہ سے امیر الامرائی کا خطاب حاصل تھا مگر سنہ ۳۸۹ھ میں محمود غزنوی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے عبدالملک سامانی کا نام خطبہ سے خارج کر دیا تھا۔اسی سال خلیفہ قادر باللہ عباسی نے اس کو یمین الدولہ کا خطاب عطا کیا تھا۔محمود غزنوی ۹ محرم سنہ ۳۶۱ھ کو پیدا ہوا تھا۔ساٹھ سال کی عمر میں فوت ہوا۔محمود غزنوی اپنے زمانے میں سب سے زیادہ طاقتور مسلمان بادشاہ تھا۔اس نے اپنی اس وسیع سلطنت کا اپنے دونوں بیٹوں کے لیے وہی انتظام کیا تھا، جو خلیفہ ہارون الرشید عباسی نے اپنے دونوں بیٹوں امین و مامون کے لیے کیا تھا۔محمود غزنوی کے دونوں بیٹے بھی آپس میں اسی طرح لڑے جیسے کہ امین و مامون لڑے تھے۔مگر جس طرح مامون الرشید اپنے بھائی امین الرشید پر غلبہ پا کر شوکت سلطنت کو باقی رکھ سکا،محمود کا بیٹا مسعود اپنے بھائی محمد پر غالب ہو کر سلطنت کی عظمت و شوکت کو باقی نہ رکھ سکا۔محمود غزنوی نے ماوراء النہر،خراسان،غزنی، پنجاب وغیرہ کی حکومت اپنے چھوٹے بیٹے محمد کو دی تھی اور خوارزم،عراق، فارس، اصفہان وغیرہ ممالک بڑے بیٹے مسعود کو دیے تھے۔محمود کے فوت ہوتے ہی دونوں بھائیوں میں جھگڑا شروع ہوا۔محمد،غزنی کے تخت پر بیٹھا اور مسعود نے رے میں جلوس کیا۔اول اس بات پر نزاع شروع ہوا کہ مسعود بڑا بھائی ہونے کی وجہ سے خواہاں تھا کہ میرا نام خطبہ میں محمد سے پہلے لیا جائے۔محمد کہتا تھا کہ میں باپ کے تخت پر بیٹھا ہوں، میرا نام تمام ممالک میں خطبہ کے اندر مسعود سے پہلے پڑھا جائے۔یہ تو صرف بہانہ تھا،

دونوں بھائی ایک دوسرے کو زیر کرنے پر آمادہ تھے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسعود نے حملہ کر کے غزنی کو فتح اور اپنے بھائی محمد کو قید کر لیا۔ قید کرنے کے بعد محمد کی دونوں آنکھوں کو بے بصارت کیا گیا۔

تخت غزنی پر جلوس کر کے مسعود نے بلوچستان ومکران پر حملہ کر کے اس علاقے کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ کسی سلطنت میں جب دو شہزادے تخت کے لیے لڑا کرتے ہیں تو ضرور سلطنت کے ہر حصے میں سرکش اور باغی طاقتیں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ چنانچہ محمد بن محمود کے اندھا ہونے کے بعد سلطان مسعود بن محمود کو اس وسیع اور عظیم الشان سلطنت کو سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ سلجوقی ترکوں نے بہ تدریج ترقی پا کر خوارزم کے علاقے میں لوٹ مار شروع کر دی۔ ادھر ہندوستان وپنجاب میں بھی یہاں کے بعض صوبہ داروں نے تمرد و سرکشی پر کمر باندھی اور یک لخت حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ سلطان مسعود نے بڑی ہمت اور استقلال سے کام لیا۔ خوارزم وخراسان میں سلجوقیوں کو متواتر شکستیں دیں اور انہیں حالات میں موقعہ نکال کر ہندوستان پر بھی حملہ آور ہوا اور سرستی وہانسی کے زبردست قلعوں کو فتح کر کے مسمار کیا۔ ہندوستان سے فوراً غزنی کی طرف واپس گیا تو دیکھا کہ سلجوقی پہلے سے بھی زیادہ تعداد کے ساتھ برسر مقابلہ ہیں۔ مسعود نے ان کو ہر مرتبہ شکست دی لیکن وہ بھی ہر مرتبہ سنبھل کر اور لوٹ لوٹ کر مقابلے پر آتے رہے۔ سلطان مسعود کی فوج میں ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد بھرتی ہو گئی تھی اور کئی ہندو اس کی فوج میں سپہ سالاری کے عہدے پر فائز تھے۔ جن کے ماتحت بہت سی ہندو پلٹنیں اور ہندو رسالے تھے۔ مسعود کو ہندوؤں کی فوجیں تیار کرنے اور ان کو فوجی تعلیم دے کر شائستہ بنانے کا خاص شوق تھا۔ چنانچہ اس نے کئی ہندو سرداروں کو محض اس لیے ہندوستان بھیجا کہ وہ ہندوستان سے اپنے بھائی بندوں کو فوج میں بھرتی کر کے لائیں۔ جب ہندوستان کے ہندو سپاہی غزنی پہنچے تو مسعود نے ایرانیوں اور افغانیوں سے زیادہ ان کی تنخواہیں مقرر کیں۔ ایک شخص مسمی تلک کو امیر الامرائی اور مہاراجگی کا خطاب دے کر سپہ سالار اعظم بنایا۔ یہ مہاراجہ تلک ایک ہندو حجام کا لڑکا تھا۔ لہٰذا اس کے مرتبہ کو سب سے زیادہ رفیع دیکھ کر اکثر امرائے دربار سلطان مسعود سے بددل ہو گئے اور انہوں نے حروف شکایت زبان پر لانا شروع کر دیا۔ سلطان مسعود کی اس ہندونوازی پر اس لیے اور بھی سب کو تعجب ہے کہ مکران کی لڑائی میں ہندو پلٹنوں نے سخت بزدلی اور نامردی دکھائی تھی اور اس امتحان کے بعد ہرگز کسی کو توقع نہ تھی کہ

سلطان مسعود اس طرح ہندوؤں کا گرویدہ ہو جائے گا۔ آخر خراسان کے ایک جنگل میں سلجوقیوں سے جب معرکہ آرائی ہوئی تو ان ہندو سپاہیوں نے سب سے پہلے فرار کی عار گوارا کر کے سلطان مسعود اور اس کی افغانی فوج کو خطرہ اور ہلاکت میں مبتلا کر دیا۔ چند جاں نثاروں کی پامردی سے سلطان مسعود اپنی جان تو بچا لایا مگر شکست فاش کی ندامت اپنے ہمراہ لایا۔ اس شکست کے بعد سلطان مسعود پر کچھ ایسی بددلی اور کم ہمتی طاری ہوئی کہ اس نے اپنے وزیر اور اپنے بیٹے مودود کو غزنین میں چھوڑ کر اور تمام اموال وخزائن اونٹوں، ہاتھیوں، چھکڑوں اور آدمیوں پر لدوا کر اور ہمراہ لے کر ہندو سرداروں کے ساتھ اس ارادے سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا کہ لاہور کو دارالسلطنت بناؤں گا اور وہیں قیام کروں گا۔ چونکہ سلطان مسعود نے اپنا یہ ارادہ پہلے ہی غزنین میں ظاہر کر دیا تھا، لہٰذا وہاں کے سرداروں اور امیروں نے سلطان کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور سمجھایا کہ اس شکست کا تدارک ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد ہو جائے گا اور ہم سلجوقیوں کو مار کر خراسان سے بھگا دیں گے۔ اپنے باپ کے دارالحکومت کو آپ نہ چھوڑیں۔ مگر مسعود پر کوئی اثر نہ ہوا اور غزنین کے خزانے میں جھاڑو دے کر اور تمام جواہرات، نقدی، زیورات حتیٰ کہ ظروف اور قیمتی کپڑے تک بھی سب کے سب لے کر غزنین سے چل دیا اور اپنے بیٹے مودود کو، جو ان دنوں بلخ وبدخشاں کی طرف تھا، خط لکھ کر بھیج دیا کہ ''میں تم کو غزنین وخراسان وغیرہ کا حاکم مقرر کرتا ہوں اور میرے پاس سے تمہارے نام احکام وفرامین اور مناسب ہدایات پہنچتی رہیں گی، ان پر عمل کرنا اور ترکوں سے ملک کو پاک کرنے کی کوشش میں مصروف رہنا۔'' یہاں تک کہ مع سامان جب دریائے سندھ کو عبور کیا تو اس طرف آتے ہی ہندو پلٹنوں اور ہندو سرداروں نے، جو ہمراہ تھے، آنکھیں بدلیں اور سب کے سب شاہی خزانے پر ٹوٹ پڑے۔ وہ تمام خزانہ جو سبکتگین اور محمود غزنوی نے چالیس پچاس سال کے عرصہ میں جمع کیا تھا، ذرا سی دیر میں دریائے سندھ کے کنارے ہندوؤں نے لوٹ لیا اور سلطان مسعود کو مسلمانوں کی اس مختصر جماعت کے ساتھ چھوڑ کر منتشر ہو گئے۔

اس دل شکن اور روح فرسا نظارہ کو دیکھ کر مسلمانوں کی اس مختصر جمعیت نے سلطان مسعود کو اس کے اختلال دماغی کے سبب سے معزول کر دیا اور اس کے بھائی محمد کو، جو نابینا اور اس سفر میں مسعود کے ہمراہ قید کی حالت میں تھا، آزاد کر کے اپنا بادشاہ بنایا۔ محمد کے بادشاہ ہونے کا حال سن کر ہندو فوج کے بہت سے آدمی پھر محمد کے گرد آ کر جمع ہو گئے کیونکہ ان کو اب اس بات کا خوف نہ تھا کہ

مسعود ہم سے انتقام لے سکے گا۔ مسعود جب گرفتار ہو کر محمد کے سامنے پیش کیا گیا تو محمد نے بھائی سے اپنی آنکھوں کا بدلہ نہیں لیا بلکہ صرف یہ دریافت کیا کہ تم اپنے لیے اب کیا پسند کرتے ہو؟ مسعود نے کہا کہ مجھ کو قلعہ کری میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ محمد نے اس کو قلعہ کری میں مع اہل وعیال بھجوا دیا اور اپنے نام کا سکہ اور خطبہ پنجاب اور سرحدی علاقہ میں جاری کیا۔ محمد کے بیٹے احمد نے باپ کی اجازت واطلاع کے بغیر قلعہ کری میں جا کر اپنے چچا مسعود سے اپنے باپ کی آنکھوں کا بدلہ اس طرح لیا کہ اس کو قتل کر دیا۔ یہ حال سن کر محمد کو ملال ہوا اور اپنے بھتیجے مودود کے پاس جو بلخ میں تھا، پیغام بھیجا کہ تیرے باپ مسعود کو میں نے اپنے حکم سے قتل نہیں کرایا بلکہ احمد نے میرے منشا کے خلاف یہ ناشائستہ حرکت کی ہے۔ مودود جو بلخ میں سلجوقیوں کے خلاف مہم تیار کر رہا تھا، اس خبر کو سنتے ہی فوج لے کر چلا۔ ادھر سے دریائے سندھ کے کنارے محمد کی فوج نے اس کو روکا۔ لڑائی ہوئی، جس میں مودود کو فتح ہوئی اور محمد اور اس کے تمام اہل وعیال کو مودود نے گرفتار کر کے اپنے باپ کے انتقام میں قتل کیا۔ اس کے بعد مودود غزنین جا کر سنہ ۴۳۵ھ میں تخت نشین ہوا۔

مودود بھی اپنے باپ مسعود کی طرح سلجوقیوں سے بہت سی لڑائیاں لڑا، مگر آخر کار مجبور ہو کر اس نے ماوراء النہر، غزنی اور ہندوستان کی حکومت پر اکتفا کیا۔ باقی تمام ممالک یعنی خراسان وخوارزم وعراق وغیرہ ہمیشہ کے لیے سلطنت غزنی سے نکل گئے اور سلجوقی ان ملکوں کے بادشاہ بن گئے۔

سنہ ۴۴۱ھ میں مودود بن مسعود نے وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا بیٹا علی تخت نشین ہوا۔ سنہ ۴۴۳ھ میں علی کے بعد عبدالرشید بن مودود تخت نشین ہوا مگر چند ہی روز کے بعد ایک سردار طغرل نامی نے عبدالرشید کو قتل کر کے تاج شاہی اپنے سر پر رکھا۔ مگر امرائے سلطنت نے بہت جلد متفق ہو کر طغرل کو قتل کیا اور سنہ ۴۴۴ھ میں فرخ زاد بن مسعود کو غزنی کے تخت سلطنت پر بٹھایا۔

فرخ زاد نے تخت نشین ہو کر ہمت وقابلیت کا اظہار کیا اور لشکر فراہم کر کے خراسان کو سلجوقیوں کے قبضے سے نکالنے کی کوشش کی۔ ابتداء میں کئی لڑائیوں میں فرخ زاد کو سلجوقیوں پر فتح حاصل ہوئی۔ مگر آخر کار جب الپ ارسلان سلجوقی سے مقابلہ ہوا تو غزنی کے لشکر کو شکست ہوئی اور خراسان کے ملک پر فرخ زاد کو قبضہ حاصل نہ ہوسکا۔

سنہ ۴۵۰ھ میں فرخ زاد کے بعد اس کا بھائی ابراہیم بن مسعود تخت نشین ہوا۔ سلطان ابراہیم غزنوی بڑا نیک، عابد، بہادر اور عقلمند شخص تھا۔ اس نے تخت نشین ہو کر یہی مناسب سمجھا کہ سلجوقیوں

کے ساتھ صلح کر لی جائے۔ چنانچہ سلجوقیوں نے نہایت خوشی کے ساتھ صلح کر لی۔ اس صلح کے بعد وہ اپنے آپ کو خراسان کا جائز حکمران سمجھنے لگے اور آئندہ کے لیے غزنویوں اور سلجوقیوں کے درمیان جنگ و پیکار کا سلسلہ بند ہوا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر سلطان ابراہیم نے ہندوستان کی طرف توجہ کی۔ اب تک غزنی کے سلاطین چونکہ اپنے مقامی جھگڑوں اور سلجوقیوں کی لڑائیوں میں مصروف تھے، لہٰذا عرصہ سے ہندوستان کی طرف توجہ نہیں ہوسکی تھی۔ اس عرصہ میں ہندوستان کے اکثر سردار اور راجے خود مختار ہو کر باج وخراج کی ادائیگی سے گریز کرنے لگے تھے۔ سلطان ابراہیم نے ہندوستان کے سرکشوں پر متعدد حملے کیے اور اس طرف اپنی حکومت کو خوب مضبوط اور مستقل بنایا۔ سلطان ابراہیم نے ۴۲ یا ۴۳ سال حکومت کی اور سنہ ۴۹۲ھ میں وفات پائی۔

اس کے بعد مسعود بن ابراہیم تخت نشین ہوا اور ۱۶ سال حکمران رہ کر سنہ ۵۰۹ھ میں فوت ہوا۔ مسعود بن ابراہیم نے کچھ عرصہ کے لیے لاہور کو بھی اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔

مسعود کے بعد اس کا بیٹا ارسلان تخت نشین ہوا اور تین سال تک حکومت کی۔ سنہ ۵۱۲ھ میں سلطان سنجر سلجوقی نے غزنین کو فتح کر کے ارسلان کے بھائی بہرام بن مسعود بن ابراہیم کو غزنی کے تخت پر بٹھایا۔

بہرام نے ۳۵ سال سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔ ہندوستان پر اس نے بھی باغیوں کی گوشمالی کے لیے متعدد حملے کیے اور لاہور میں اکثر مقیم رہا۔ اسی کے عہد حکومت میں کتاب کلیلہ دمنہ [1] لکھی گئی۔ خمسہ نظامی بھی اسی کے عہد کی تصنیف ہے۔ سلطان بہرام کے آخری عہد میں غوریوں نے غزنی پر حملہ کر کے بہرام کو غزنین میں بے دخل کر دیا۔ وہ بھاگ کر ہندوستان کی طرف چلا آیا اور لاہور میں سنہ ۵۴۷ھ میں فوت ہوا۔ اب غزنویوں کے قبضہ میں صرف ہندوستان یعنی پنجاب کا ملک رہ گیا تھا۔ غزنین وغیرہ پر غوریوں کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔

بہرام کی وفات کے بعد لاہور میں اس کا بیٹا خسرو شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے غزنین کو غوریوں کے قبضے سے نکالنے اور واپس لینے کی کوشش کی، مگر اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔ آخر آٹھ سال

---

[1] عبداللہ بن مقفع عربی و فارسی دونوں زبانوں کے ادیب تھے، کلیلہ دمنہ ان کی تصنیف ہے، جس کا انہوں نے فارسی سے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ اصل کتاب سنسکرت میں تھی، جس کا اب پتہ نہیں چلتا۔ ابن مقفع کو ۱۶۲ھ میں ۳۵ سال کی عمر میں منصور عباسی کے حکم سے قتل کیا گیا۔

پنجاب پر حکومت کرنے کے بعد لاہور میں فوت ہوا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا خسرو ملک بن خسرو شاہ سنہ ۵۵۵ھ میں بمقام لاہور تخت نشین ہوا۔ خسرو ملک کو غوریوں نے گرفتار کر کے پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح دولت غزنویہ کا خاتمہ ہو کر اس کا صرف افسانہ باقی رہ گیا۔

دولت سلجوقیہ:

سلجوقیوں کے مختصر حالات خلفائے عباسیہ کے سلسلہ میں بیان ہو چکے ہیں۔ بقیہ مختصر حالات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ ترکوں کی قوم کا ایک شخص جس کا نام وقاق اور لقب تیمور تالیغ تھا، ترکستان یعنی دشت قبچاق کے بادشاہ پیغو کے متوسلین میں تھا۔ اس کے بیٹے کا نام سلجوق تھا، جو اپنے آپ کو افراسیاب کی چونتیسویں پشت میں بتاتا تھا۔ وہ بھی اپنے باپ کے بعد پیغو کے دربار میں رسوخ رکھتا تھا۔ ایک روز کسی بات پر سلجوق پیغو سے خفا ہو کر مع اپنے بیٹوں کے سمرقند و بخارا کی طرف چلا آیا اور مقام جند کے قریب اس مختصر قافلہ نے قیام کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بخارا کے تخت پر نوح ثانی سامانی متمکن تھا۔ جند کے مسلمان عامل کی ترغیب سے سلجوق نے دین اسلام قبول کیا۔ یہ علاقہ اس زمانے میں پیغو بادشاہ ترکستان کا باج گزار تھا۔ چند روز کے بعد پیغو کے عمال زر خراج وصول کرنے آئے تو سلجوق نے وہاں کے حاکم سے کہا کہ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کفار آ کر مسلمانوں سے خراج وصول کریں۔ سلجوق کی اس ہمت کو دیکھ کر وہاں کے باشندے بھی آمادہ ہو گئے اور سلجوق کے ساتھ مل کر پیغو کے عمال پر حملہ آور ہوئے۔ اس حملہ میں سلجوق کو فتح حاصل ہوئی اور اس کی بہادری کی دور دور تک شہرت پھیل گئی اور اس کے قبیلہ کے لوگ آ آ کر اس کے ساتھ شامل ہوئے۔ جب ایلک خان نے نوح ثانی پر حملہ کیا تو سلجوق نے نوح ثانی کی طرف سے ایلک خان کے مقابلے میں بڑی بہادری دکھائی۔ اسی لڑائی میں سلجوق کا بیٹا میکائیل مارا گیا۔ میکائیل کے دو بیٹے طغرل بیگ اور چغر بیگ اپنے دادا سلجوق کے زیر تربیت پرورش پانے لگے۔ سلجوق کے چار بیٹے اور تھے، جن کے نام اسرائیل، یونس، ینال اور موسیٰ تھے۔ ترک اور مغول قبائل میں کسی شخص کا غیر معمولی بہادری دکھانا اس کو سردار قوم بنا دینے کے لیے کافی تھا۔ سلجوق اور اس کے بیٹوں کو بہت جلد ناموری اور سرداری حاصل ہو گئی تھی اور ان کے گرد ترکوں کی جمعیت کثیر فراہم ہو چکی تھی۔ ایلک

خان اور پیغو نے مل کر اس نئے قبیلہ کو جو قبیلہ سلجوق کے نام سے مشہور ہو چکا تھا، برباد کرنا چاہا۔ اس عرصہ میں سلجوق کا انتقال ہو گیا اور اس کے پوتے چغر بیگ نے ایک جمعیت لے کر ملک ارمینیا کی جانب عیسائیوں پر جہاد کرنے کے لیے جانا چاہا۔ راستے میں محمود غزنوی کا علاقہ یعنی صوبہ طوس پڑتا تھا۔ طوس کے عامل نے ایک مجاہد فی سبیل اللہ کو اپنی عملداری سے گزرنے دیا۔ سلطان محمود غزنوی بہت ذی ہوش اور مآل اندیش بادشاہ تھا۔ اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ سلجوقی گروہ اس کے علاقے میں ہو کر گزرا ہے تو اس نے عامل طوس سے جواب طلب کیا اور اندیشہ مند ہوا کہ کہیں یہ لٹیرا گروہ میری مملکت کو اپنی غارت گری کا تختہ مشق نہ بنائے۔ چغر بیگ ارمینیا کی طرف سے سالماً غانماً واپس آیا اور سلجوقیوں کی تعداد اور طاقت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اب انہوں نے نواح بلخ میں اپنے مویشیوں کو چرانا شروع کیا اور وہیں طرح اقامت ڈال دی۔ محمود غزنوی نے ان حالات سے مطلع ہو کر اپنے عامل کے ذریعہ سلجوقیوں کے سردار کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ عمر کے اعتبار سے اب سلجوق کا بیٹا اسرائیل سب سے بڑا اور ذی ہوش شخص تھا۔ چنانچہ اسی کو دربار محمودی میں روانہ کیا گیا۔ محمود غزنوی نے اسرائیل کو عزت کے ساتھ دربار میں جگہ دی اور بہت سی باتوں کے بعد دریافت کیا کہ اگر مجھ کو فوج کی ضرورت پڑے تو تم کتنے آدمیوں سے امداد کر سکتے ہو؟ اسرائیل نے اپنا تیر سامنے رکھ دیا اور کہا کہ اس تیر کو آپ ہمارے جنگلی قبائل میں بھیج دیجیے۔ ایک لاکھ آدمی حاضر ہو جائیں گے۔ محمود نے کہا کہ اگر اس سے زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہو تو اور کتنے آدمی دے سکتے ہو؟ اسرائیل نے اپنی کمان سامنے رکھ دی اور عرض کیا کہ اس کمان کو اگر آپ ہمارے قبائل میں بھیج دیں گے تو دو لاکھ آدمی تیار ہو کر آ جائیں گے۔ اس جواب کو سن کر محمود نے ان لوگوں کی کثرت تعداد کا اندازہ کیا اور اسرائیل کو بہ بطور یرغمال اور بہ طریق ضمانت امن روک کر ہندوستان کی طرف بھیج دیا۔ جہاں وہ سات سال تک کالنجر کے قلعہ میں محبوس رہا۔ سلجوقیوں کی سرداری طغرل بیگ اور چغر بیگ سے متعلق رہی۔ یہ دونوں بھائی آپس میں نہایت اتفاق واتحاد کے ساتھ اور مل کر اپنے قبائل متعلقہ پر حکومت کرتے تھے۔ محمود غزنوی نے سلجوقیوں کو اول ماوراء النہر میں کچھ زمین بہ طور چراگاہ دے دی اور پھر اس بات کی بھی اجازت دے دی کہ وہ دریائے جیحون کو عبور کر کے خراسان میں آباد ہو جائیں۔ اس پر ارسلان جاذب عامل طوس وبلخ نے اعتراض کیا کہ یہ جنگجو قوم ہے، کسی وقت باعث اذیت ہوں گے۔ آپ ان کو دریائے جیحون سے اس طرف آنے کی اجازت کیوں دیتے ہیں۔ مگر

محمود کو اپنی طاقت کا حال معلوم تھا۔ نیز وہ جانتا تھا کہ ان کو فوج میں بھرتی کر کے ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ادھر اس نے بہ طور یرغمال اسرائیل کو نظر بند کر رکھا تھا۔ جب محمود غزنوی کا انتقال ہوا تو سلطان مسعود نے اسرائیل کو کالنجر کے قلعہ سے فوراً آزاد کر دینے کا حکم صادر کیا۔ اسرائیل قید سے آزاد ہو کر اپنے بھتیجوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی سلجوقیوں نے زور پکڑا۔ ادھر سلطان مسعود اپنی تخت نشینی کے بعد مہمات سلطنت پر پورے طور پر مستولی نہ ہونے پایا تھا کہ ادھر چغر بیگ نے مرو اور ہرات پر قبضہ کر لیا اور طغرل بیگ نیشاپور پر قابض ہو کر مضبوط ہو بیٹھا۔ مسعود غزنوی جب ان کے استیصال کی طرف متوجہ ہوا تو دونوں بھائیوں نے مقابلہ کیا اور سلطان مسعود کو اس قدر پریشان کیا کہ انجام کار اس کی حکومت تمام ملک خراسان سے اٹھا دی۔

اس کے بعد طغرل بیگ نے اپنا دارالحکومت رے قرار دیا اور چغر بیگ مرو میں مقیم رہا۔ دونوں بھائیوں کا نام خطبہ میں پڑھا جانے لگا۔ طغر بیگ نے خراسان پر قابو پا کر خوارزم کے ملک کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد رومیوں پر حملہ آور ہو کر وہاں سے کامیاب واپس ہوا۔ اس کے بعد بغداد پہنچا، دیلمیوں کی حکومت کا خاتمہ کیا اور خلیفہ بغداد کا مدارالمہام اور حامی خلافت مقرر ہوا۔ خلیفہ کے دربار سے خلعت وخطاب پایا۔ سنہ ۴۴۷ھ میں بغداد کے اندر طغرل بیگ کا خطبہ پڑھا گیا۔ خاندان خلافت سے رشتہ دار کا شرف حاصل کر کے ۸ رمضان المبارک سنہ ۴۵۵ھ کو جمعہ کے دن ستّر برس کی عمر میں طغرل بیگ نے وفات پائی۔ چغر بیگ اس سے چار سال پہلے ۱۸ رجب سنہ ۴۵۱ھ کو فوت ہو چکا تھا۔

طغرل بیگ لاولد فوت ہوا۔ اس لیے اس کے بعد اس کا بھتیجا سلطان الپ ارسلان بن چغر بیگ اس کا جانشین اور مدارالمہام خلافت مقرر ہوا۔ سنہ ۴۶۵ھ میں ۱۰ ربیع الاول کو سلطان الپ ارسلان نو برس اور ڈھائی مہینے حکومت کرنے کے بعد فوت ہوا۔ سلطان الپ ارسلان بڑا ہی دیندار عالی جاہ اور اپنے زمانے کا سب سے بڑا زبردست بادشاہ تھا۔ الپ ارسلان نے ایک مرتبہ صرف بارہ ہزار سواروں سے عیسائیوں کی تین لاکھ جرار فوج کو شکست فاش دے کر روم کے قیصر کو گرفتار کر لیا تھا، جس کا ذکر گزشتہ ابواب میں گزر چکا ہے۔

الپ ارسلان کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ سلجوقی تخت نشین ہوا۔ الپ ارسلان کے بھائی قادرو نے بھتیجے کے خلاف علم مخالفت بلند کیا مگر آخر گرفتار ہو کر مقتول ہوا۔ اسی قادر بیگ کی اولاد میں

سلاجقہ کرمان کی حکومت کا سلسلہ جاری ہوا۔ ملک شاہ نے شام ومصر کو بھی اپنی حکومت میں شامل کیا۔ ادھر دریائے سیحون کے دوسری طرف اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ ملک شاہ کی حدود حکومت الپ ارسلان سے بھی زیادہ وسیع تھیں۔ ایک مورخ کا بیان ہے کہ دیوار چین سے بحر قلزم تک ملک شاہ کا حکم جاری اوراس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ سنہ ۴۸۴ھ ملک شاہ نے وفات پائی۔

اس کے بعد اس کا بیٹا برکیارق تخت نشین ہوا اور سلجوقیوں کا زوال شروع ہو گیا۔ برکیارق کے بعد اس کا بھائی محمد بن شاہ سنہ ۴۹۶ھ میں تخت نشین ہوا۔

اس کے بعد سنجر بن ملک شاہ سنہ ۵۰۹ھ میں تخت نشین ہوا اور سلطان السلاطین [1] کے نام سے موسوم ہوا۔ اسی سے سلطان بہرام غزنوی نے دب کر خراج گزاری گوارا کی تھی۔ جب سلطان علاء الدین غوری جہاں سوز نے بہرام کو بے دخل کر کے غزنین کو فتح کیا تو سلطان سنجر سلجوقی نے پہنچ کر علاؤ الدین غوری کو گرفتار کیا۔ ایک مرتبہ نواح بلخ میں ترکان غز نے موقع پا کر سلطان سنجر کو گرفتار کر لیا اور یہ چار سال تک ان کی قید میں رہا۔ اس عرصہ میں ترکان غز نے تمام ملک خراسان کو اپنی لوٹ مار سے تباہ و ویران کیا۔ آخر ان کی قید سے آزاد ہو کر پھر سلطان سنجر ملک خراسان پر قابض ہوا۔ اس کے بعد اس کے ایک خادم اور عامل خوارزم نے بغاوت وخود مختاری اختیار کی اور خوارزم میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس سلطنت کو دولت خوارزم شاہیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ خوارزم شاہیوں اور غوریوں کی سلطنت کے قائم ہونے کا زمانہ قریب ہی تھا۔ سلطان سنجر کی وفات کے بعد اس کا خواہرزادہ محمود خان نیشاپور میں تخت نشین ہوا۔ سلطان سنجر نے سنہ ۵۵۰ھ میں وفات پائی۔ اسی سال محمود خان تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں خراسان کے ایک حصہ پر غوریوں نے اور دوسرے حصے پر خوارزم شاہیوں نے قبضہ کر کے خراسان سے سلجوقیوں کی حکومت کا نام ونشان مٹا دیا۔

ملک شاہ سلجوقی کی اولاد جو عراق عرب میں حکمران اور خلافت بغداد سے متعلق رہی، اس کا

---

[1] حدیث میں ایسے القاب اور ناموں سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے ذلیل ترین نام، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شخص کا نام ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ رکھے۔'' (صحیح بخاری، کتاب الادب، حدیث ۶۲۰۵۔ صحیح مسلم، کتاب الآداب)۔ بنا بریں ملک الملوک یعنی بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات جلیلہ ہے۔

تفصیلی تذکرہ خلفائے بغداد کے سلسلہ میں آ چکا ہے، یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔

قادر بیگ کی اولاد میں دس بادشاہ جو سلاجقہ کرمانیہ کہلاتے ہیں، شہر ہمدان میں یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوتے رہے، جن کی تفصیل اس طرح ہے۔ قادر بیگ سنہ ۴۶۵ھ میں مسموم مقتول ہوا۔ اس کے بعد ملک شاہ ابن الپ ارسلان کے حکم سے اس کا بیٹا سلطان شاہ کرمان میں حکمران مقرر ہوا۔ بارہ سال حکومت کر کے جب وہ فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کا بھائی توران شاہ تخت نشین ہوا۔ توران شاہ نے ۱۳ سال حکومت کی، اس کے بعد اس کا بیٹا ایران شاہ تخت نشین ہوا، جس نے بیالیس سال حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مغیث الدین تخت نشین ہوا، جس نے ۱۴ سال حکومت کی۔ اس کے بعد محی ارسلان شاہ، اس کے بعد توران شاہ، اس کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہوئے۔ خوارزم شاہیوں کے عروج تک یہ لوگ کرمان میں حکمران رہے، اس کے بعد ان پر فنا وارد ہوگئی۔

سلیمان قتلمش بن اسرائیل بن سلجوق کو سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے ایشیائے کوچک کی طرف عامل بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے وہاں اپنی ایک جداگانہ حکومت قائم کی۔ اس کی اولاد میں چودہ بادشاہ ہوئے جو سلاجقہ روم کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا دارالسلطنت شہر قونیہ تھا۔ یہ لوگ ساتویں صدی ہجری کے آخر تک حکمران اور اکثر رومیوں سے برسر جنگ رہے۔ ان کے بعد ہی سلطنت عثمانیہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کا حال مناسب موقع پر بیان ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ سلجوقیوں اور غزنویوں کے حالات میں خوارزم شاہیوں اور غوریوں کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ان دونوں سلطنتوں کا بھی مختصر سا تذکرہ کر دیا جائے۔

دولت خوارزم شاہیہ:

ملک شاہ سلجوقی کا ایک ترکی غلام جس کا نام نوشتگین تھا، اس کا بیٹا قطب الدین بن نوشتگین سلطان سنجر کی خدمت میں رسوخ رکھتا تھا۔ سلطان سنجر سلجوقی نے اپنے نوکر قطب الدین مذکور کو خوارزم کا حاکم مقرر کیا۔ یہ قطب الدین جب کبھی سلطان سنجر کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اپنے اسی شاہانہ لباس میں خدمت گاری کے تمام کام حسب دستور سابق انجام دیتا۔ یہ عرصہ دراز تک علاقہ خوارزم کا حاکم رہا اور خوارزم کی مناسبت سے خوارزم شاہ مشہور ہوا۔ اس کے بعد اس کی اولاد بھی اسی نام سے مشہور ہوئی اور اس خاندان کے تمام فرماں روا خوارزم شاہی فرماں روا کہلائے۔ ابتداء میں

یہ سلطان سنجر کا فرماں بردار رہا لیکن جب سلطان سنجر کے اقبال کو زوال ہوا اور وہ ترکان غز کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا تو اس نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور ماوراء النہر کے علاقے پر چڑھائی کی۔ رشید الدین وطواط مشہور شاعر اس کے دربار میں رہتا تھا، جس طرح کہ انوری سلطان سنجر سلجوقی کا درباری شاعر تھا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا اتسز خوارزم شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے رشید الدین وطواط کو اپنے دارالانشاط کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا تھا۔

سنہ۵۴۰ھ کے قریب اتسز فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا ارسلان شاہ سنہ۵۵۷ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس میں اور اس کے بھائی تکش خان میں عرصہ دراز تک لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر تکش خان نے غالب ہو کر سنہ۵۸۳ھ میں تاج شاہی اپنے سر پر رکھا۔ اسماعیل بن حسن مصنف ذخیرہ خوارزم شاہی اور خاقانی شاعر اسی کے عہد میں ہوئے۔ اسی نے طغرل ثالث سلجوقی کو قتل کیا اور خراسان وعراق پر قابض ہو کر اپنی سلطنت کو بڑھایا۔

اس نے جب وفات پائی تو اس کی جگہ اس کا بیٹا سلطان محمد خوارزم شاہ سنہ۵۹۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس نے قریباً اکیس سال حکومت کی۔ اس نے اپنی حدود حکومت کو بہت وسیع کیا۔ اس کے اور خلیفہ بغداد کے درمیان کچھ بے لطفی ہو گئی تھی۔ شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد غور وغزنی تک اس کی حکومت کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ فارس کے بادشاہ اتابک سعد اور آذربائیجان کے بادشاہ اتابک ازبک کو بھی اس نے شکست دی اور خلیفہ بغداد سے سرتابی کر کے بغداد کی طرف ایک جرار فوج لے کر چلا تا کہ خلیفہ کو معزول کر کے اس کی جگہ اپنے پیر سید علاء الملک ترمذی کو تخت خلافت پر بٹھائے۔ خلیفہ نے شیخ شہاب الدین سہروردی کو اس کے پاس بھیجا کہ وہ نصیحت کر کے خوارزم شاہ کو اس ارادے سے باز رکھیں اور آپس میں صلح وآشتی پیدا ہو جائے مگر اس سفارت کا کوئی اثر نہ ہوا اور سلطان محمد خوارزم شاہ اپنے ارادے سے باز نہ آیا۔ آخر قدرتی رکاوٹ پیدا ہوئی اور برف باری سے سخت نقصان اٹھا کر خوارزم شاہ کو عراق سے واپس ہونا پڑا۔ ابھی یہ عراق ہی میں تھا کہ چنگیز خان نے اس کے ملک پر حملہ کیا۔ اوپر چنگیز خان کے حالات میں اس حملہ کی مفصل کیفیت گزر چکی ہے۔

سلطان محمد خوارزم شاہ اپنے زمانے میں بہت زبردست بادشاہ تھا۔ اس سے دور دور تک سلاطین ڈرتے تھے اور تمام دنیا میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی مگر اس برف باری کے واقعہ سے

اس کے اقبال و دولت میں مسلسل سرد بازاری نے ایسا دخل پایا کہ وہ دم بہ دم بربادی کی طرف ترقی کرتا رہا۔ آخر اس حالت میں فوت ہوا کہ اس کو کفن بھی میسر نہ ہو سکا۔ سلطان محمد خوارزم شاہ کے سات بیٹے تھے۔ جن میں رکن الدین، غیاث الدین، جلال الدین الگ الگ صوبوں کے حاکم مقرر تھے۔ باپ کی وفات اور تباہی کے بعد یہ تینوں آپس میں متفق ہو کر چنگیز خان کا مقابلہ نہ کر سکے بلکہ ان میں آپس میں بھی نا چاقی رہی اور الگ الگ مقابلوں میں انہوں نے ناکامی کا منہ دیکھا۔

ان میں جلال الدین خوارزم شاہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس نے سندھ کے کنارے چنگیز خان کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ ہندوستان کی حدود میں داخل ہو کر اور چند روز سندھ میں رہ کر پھر واپس چلا گیا اور واپسی میں الموت کے ملاحدہ یعنی فدائیوں کا بہت کچھ زور توڑتا گیا۔ ایک طرف مغلوں سے لڑا، دوسری طرف فرنگیوں یعنی رومیوں سے بھی خوب لڑا۔ عراق میں اس نے فتوحات حاصل کیں مگر حالات کچھ ایسے ناموافق تھے کہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ قائم نہ کر سکا اور گم نامی کے عالم میں مارا گیا یا فقیری لباس میں روپوش ہو گیا۔ مورخین نے جلال الدین خوارزم شاہ کا ذکر اس لیے محبت و عزت کے ساتھ کیا ہے کہ وہ ایک بہادر شخص تھا اور متعدد مقامات پر اس نے اپنی بہادری کا ثبوت پیش کر کے اپنے آپ کو مستحق ستائش بنا لیا تھا۔ اسی پر خاندان خوارزم شاہیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

دولت غوریہ:

ہرات کے مشرق کوہستان میں غور ایک وسیع خطہ کا نام ہے۔ محمود غزنوی نے اس علاقے کو فتح کر کے اپنی سلطنت کا ایک صوبہ بنا لیا تھا۔ غور کے باشندوں نے دوسری صدی ہجری کے شروع میں اسلام قبول کر لیا تھا اور یہاں سب افغانی قومیں آباد تھیں۔ محمود غزنوی نے غور کی صوبہ داری پر انہیں افغانوں کے ایک شریف شخص کو مامور کیا تھا، جس کے خاندان میں غور کی حکومت بہ طور صوبہ داری چلی آتی تھی۔ اتفاقاً سلطان بہرام غزنوی اور غور کے حاکم قطب الدین میں کسی بات پر ناچاقی ہوئی اور نوبت جنگ و پیکار تک پہنچی۔ اس لڑائی میں قطب الدین غوری مارا گیا۔ قطب الدین غوری کے بھائی سیف الدین نے اپنے بھائی کے انتقام میں غزنی پر فوج کشی کر کے بہرام غزنوی کو غزنی سے نکال دیا اور خود تخت غزنی پر متصرف ہوا۔ بہرام غزنوی نے اطراف ملک سے امداد حاصل کر کے غزنی

پر حملہ کیا اور سیف الدین کو گرفتار کر کے نہایت بے دردی اور سخت اذیتوں کے ساتھ قتل کیا۔

اس کا حال جب تیسرے بھائی علاء الدین غوری کو معلوم ہوا تو وہ اپنے دونوں مقتول بھائیوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے غزنی پر حملہ آور ہوا۔ علاؤ الدین غوری اور اس کے ہم وطن نہایت جوش وخروش کے ساتھ غزنی کی طرف بڑھے تو بہرام غزنوی نے ان کو زرو جواہر کا لالچ دے کر واپس کرنا چاہا اور صلح و آشتی کی تمہید ڈالی لیکن علاء الدین غوری اور اس کے ہمراہیوں کو جب یہ خیال آتا تھا کہ سیف الدین کو کس طرح بیل پر سوار کر کے غزنی کے گلی کوچوں میں تشہیر کیا گیا تھا اور نہایت ظالمانہ طور پر اس کی جان نکالی گئی تھی، تو وہ غیظ وغضب اور جوش انتقام میں دیوانے ہو جاتے تھے۔ اسی لیے بہرام کی تدبیر صلح کارگر نہ ہوئی۔ علاؤ الدین نے غزنی کو فتح کر لیا اور بہرام غزنوی ہندوستان کی طرف بھاگ آیا۔ علاؤالدین غوری نے اپنے بھائی کے انتقام میں باشندگان غزنی کا قتل عام کیا۔ سلاطین غزنی کے بعض مقبروں کو مسمار کیا۔ مکانوں کو آگ لگا دی اور ایک ہفتہ تک اس قتل وخون ریزی کے سلسلے کو جاری رکھا، جس کی وجہ سے وہ علاء الدین جہاں سوز کے نام سے مشہور ہوا۔ غزنی کے بہت سے لوگوں کو گرفتار کر کے لے گیا اور وہاں ان کو قتل کر کے ان کے خون سے گارا بنوا کر شہر پناہ کی تعمیر میں استعمال کیا۔ یہ واقعہ سنہ ۵۴۷ ھ کا ہے۔ علاء الدین غوری جہاں ساز نے غزنی کی فتح کے بعد غزنی میں اپنا ایک نائب السلطنت مقرر کیا اور خود غور کی جانب اپنے دارالحکومت فیروز کوہ کی جانب چلا گیا۔ اس طرح غزنی، غور کی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔ بہرام غزنوی چونکہ سلطان سنجر سلجوقی کی سیادت کو تسلیم کر چکا تھا، لہٰذا اس نے ہندوستان سے سلطان سنجر سلجوقی کے پاس فریادنامے بھیجے۔ سلطان سنجر سلجوقی نے دوسرے سال حملہ کر کے غور و غزنی کو فتح کر کے بہرام غزنوی کو پھر اپنی طرف سے غزنی پر قابض کر دیا اور علاؤالدین غوری جہاں سوز کو گرفتار کر کے اپنے ہمراہ لے گیا۔

علاؤ الدین غوری نے غزنی کی تباہی میں جو کچھ کیا، جوش انتقام سے کیا، ورنہ وہ بہت سمجھ دار، دوراندیش اور قابل شخص تھا۔ چنانچہ چند ہی روز کے بعد سلطان سنجر نے علاؤ الدین کی قابلیتوں سے واقف اور خوش ہو کر اس کو رہا کر دیا اور وہ اپنے وطن غور میں آ کر پھر حکومت کرنے لگ گیا۔ اس کے بعد ہی ترکان غز نے سلطان سنجر کو گرفتار کر لیا اور سلجوقیوں کا رعب واقتدار کم ہوا۔ سلطان سنجر چار سال تک ترکان غزنی کی قید میں رہا۔ یہ قید اسی قسم کی تھی، جیسے کہ ہندوستان کا بادشاہ جہانگیر، مہابت

خان کی قید میں تھا یعنی ترکان غز دن کے وقت سلطان سنجر کو تخت پر بٹھاتے اور اس کے سامنے مودبانہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے اور رات کے وقت اس کو ایک آہنی قفس میں بند کر دیتے۔ سلطان سنجر ہی کو اپنا بادشاہ اور سلطان مانتے اور جہاں چاہتے، اپنے ساتھ اس کو لیے پھرتے تھے۔ سلطان سنجر کے قید ہونے کے بعد علاؤ الدین غوری نے بہرام غزنوی کو بے دخل کر کے غزنی پر بھی قبضہ کر لیا اور چند روز کے بعد اپنی موت سے مر گیا۔

علاؤ الدین غوری کو دولت غوریہ کا پہلا خود مختار بادشاہ سمجھنا چاہیے۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سیف الدین ثانی غور کے تخت پر بیٹھا اور ڈیڑھ سال کے قریب حکومت کر کے ترکان غز کی ایک لڑائی میں اپنے ہی ایک سردار کے ہاتھ سے مارا گیا۔

اس کے بعد علاؤ الدین غوری کا بھتیجا غیاث الدین غوری کا ایک بھائی شہاب الدین غوری تھا، وہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ اسی طرح حکومت و سلطنت میں شریک تھا، جس طرح طغرل بیگ سلجوقی اور چغر بیگ سلجوقی دونوں بھائی مل کر حکومت کرتے تھے۔ غیاث الدین و شہاب الدین دونوں بڑے اتفاق و محبت سے رہتے تھے اور دونوں بادشاہ سمجھے جاتے تھے۔ شہاب الدین غوری اپنے بڑے بھائی غیاث الدین غوری کو اپنا آقا سمجھتا اور اس کے ہر ایک منشا کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ خراسان کے ملک کا اکثر حصہ اپنی حکومت میں شامل کرنے کے بعد غوریوں نے ہندوستان کی طرف توجہ کی کیونکہ وہ اپنے آپ کو سلطنت غزنوی کا جانشین سمجھتے اور جس قدر ملک سلطان غزنوی کے قبضے میں تھا، اس تمام ملک کو قبضہ میں لانا اپنا جائز حق تصور کرتے تھے۔ پنجاب میں بہرام غزنوی کی اولاد حکمراں تھی۔ چنانچہ اس سے پنجاب کا ملک چھین لینا انہوں نے ضروری سمجھا اور شہاب الدین غوری کے پاس غور کی طرف بھیج دیا اور خود دارالسلطنت لاہور پر قابض و متصرف ہوا۔

سنہ ۶۰۷ھ میں محمود غوری بھی مقتول ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بہاؤ الدین تخت نشین ہوا، جس کو خوارزم شاہ نے قید کر لیا۔ اس کے بعد اس خاندان کے متوسلین نے یکے بعد دیگرے برائے نام غور میں حکومت کی اور بہت جلد اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

اتابکان شیراز:

سلاطین سلجوقیہ اپنے شہزادوں کو تعلیم و تربیت اور اخلاق فاضلہ سکھانے کے لیے جن اتالیقوں

کے سپرد کرتے تھے، وہ اتابک کہلاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان اتالیقوں یا اتابکوں کو وزارت اور ملکوں کی حکومت ملنے لگی اور خاندان سلجوقیہ کے کمزور ہونے پر ان اتابکوں نے مختلف ملکوں اور صوبوں میں اپنی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ چنانچہ ان اتابکوں کے بہت سے خاندان شام، عراق، فارس وغیرہ میں برسر حکومت رہے اور بعض نے عالم اسلام میں بڑی ناموری حاصل کی۔ شام کے اتابکوں کا حال تو بعد میں بیان ہوگا، ان شاء اللہ! اس جگہ اتابکان شیراز کا تذکرہ ضروری ہے، جن کی حکومت کو دولت سلغریہ بھی کہا جاتا ہے اور جو تاریخ ایران کا ایک ضروری جزو ہے۔

سلطان سنجر سلجوقی کے عہد حکومت میں مظفر الدین سنقر بن مودود سلغری فارس کا عامل و حاکم تھا۔ سلطان سنجر کی وفات کے بعد اس نے اپنا خطاب اتابک تجویز کیا اور ملک فارس پر خود مختارانہ حکومت کرنے لگا۔ سنہ ۵۵۶ھ میں فوت ہوا۔

اس کے بعد اس کا بھائی مظفر الدین اتابک تخت نشین ہو کر سنہ ۵۷۱ھ تک فرماں روا رہا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہو کر بیس سال تک فرماں روائے فارس رہا۔ اس کے بعد اتابک سعد بن زنگی ۲۸ سال تک فرماں روا رہ کر سنہ ۶۲۲ھ میں فوت ہوا۔ اسی اتابک سعد کے نام پر شیخ مصلح الدین شیرازی نے اپنا تخلص سعدی رکھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا اتابک ابوبکر بن سعد زنگی تخت نشین ہوا۔ اسی کے عہد میں ہلاکو خان کے ہاتھ سے بغداد کی تباہی عمل میں آئی۔ اس نے مغلوں کی باج گزاری اختیار کر لی تھی۔

اس کے بعد اس کا پوتا اتابک محمد تخت نشین ہوا۔ غرض سنہ ۶۶۳ھ تک یہ خاندان شیراز و فارس میں برسر حکومت اور مغلوں کا خراج گزار رہا۔ اس کے بعد مغلوں کی طرف سے وائسرائے مقرر ہو کر شیراز کی حکومت پر مامور ہوتے رہے۔ چند روز کے بعد جب مغلوں کی حکومت میں ضعف و اختلاط کے آثار نمایاں ہوئے تو شیراز میں چند روز کے لیے پھر خود مختار سلطنت قائم ہوئی۔ اس کے بعد دَورِ تیموری آ گیا۔

شاہان سیستان:

سیستان کے ملک کو نیم روز بھی کہتے ہیں۔ سلطان سنجر سلجوقی نے اس ملک پر ایک شخص ابوالفضل تاج الدین کو عامل مقرر کیا۔ دولت سلجوقیہ کے اختلاط کو دیکھ کر اس نے علم استقلال بلند کیا۔ اس کے

بعد اس کا بیٹا شمس الدین محمد تخت نشین ہوا۔ اس کے ظلم و ستم سے ملک سیستان کی رعایا نالاں رہی۔ آخر لوگوں نے ہجوم کر کے اس کو قتل کردیا اور اسی خاندان کے ایک شخص تاج الدین حرب ابن عزالملک کو تخت نشین کیا۔ یہ نیک سیرت اور اچھا بادشاہ تھا۔ اس کے زمانے میں ملک خراسان، سلطنت غور میں شامل تھا۔ اس نے چھ سال حکومت کی۔ اس کے فوت ہونے پر اس کا بیٹا یمین الدین بہرام شاہ تخت نشین ہوا۔ مگر چند روز کے بعد ملحدوں کے ہاتھ سے مقتول ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نصرت الدین تخت نشین ہوا مگر اس کے دوسرے بیٹے رکن الدین نے اپنے بھائی کی مخالفت اور تخت سلطنت کا دعویٰ کیا۔ دونوں بھائیوں میں لڑائیاں ہوئیں۔ آخر نصرت الدین اپنے بھائی رکن الدین کے ہاتھ سے مارا گیا۔ رکن الدین کے عہد حکومت میں سیلاب چنگیزی آیا اور مغلوں کے ہاتھ سے یہ مارا گیا۔ اس کے بعد تاج الدین حرب کا بیٹا شہاب الدین محمد تخت نشین ہوا اور دو سال محصورہ رہ کر مغلوں کے ہاتھ سے مقتول ہو کر اس خاندان کا خاتمہ کر گیا۔

ملوک خاندان کرت / ہرات:

کہتے ہیں کہ عزالدین عمر نامی ایک شخص سلجوقی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور غیاث الدین غوری کا وزیر تھا۔ غیاث الدین غوری نے اس کو ہرات کا گورنر بنا کر بھیج دیا تھا۔ جہاں اس کے اہتمام سے بہت سی شاہی عمارات اور مساجد تعمیر ہوئیں۔ یہ عزالدین کرت کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے بعد سنہ ۶۴۳ھ میں رکن الدین کرت ہرات کا حاکم مقرر ہوا۔ دولت غوریہ کی بربادی کے بعد یہ لوگ ہرات کے مستقل بادشاہ سمجھے جاتے تھے۔ ملک رکن الدین کرت کی وفات کے بعد شمس الدین کرت ہرات کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے اور اس کے باپ نے بھی مثل اتابکان شیراز مغلوں کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اسی لیے ان کی حکومت و سلطنت کو مغلوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اپنی طرف سے بہ طور نائب السلطنت ان کو ہرات کا حکمران رہنے دیا۔

شمس الدین کرت کی وفات کے بعد اس کا بیٹا رکن الدین تخت ہرات پر بیٹھا۔ مغلوں کے بادشاہ ابا قاخان نے اس کو "شمس الدین کہین" کا خطاب دیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا فخر الدین باپ کا جانشین ہوا۔ فخر الدین کے بعد اس کا بھائی غیاث الدین اور غیاث الدین کے بعد اس کا بیٹا شمس الدین سنہ ۷۲۹ھ میں تخت نشین ہوا۔ شمس الدین کے بعد اس کا بھائی ملک حافظ اور

اس کے بعد دوسرا بھائی، اس کے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین ببر علی تخت نشین ہوا۔ اسی کے زمانے میں تیمور ہرات میں پہنچا۔ اس نے تیمور کی اطاعت قبول کی اور تیمور نے اپنی لڑکی کی شادی اس کے ساتھ کر دی۔

ایران کے دوسرے حصوں میں بھی اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں مثلاً اتابکان لرستان قائم ہو گئی تھیں، جو کچھ زیادہ مشہور نہیں ہیں۔

اتابکان آذربائیجان:

سلطان مسعود سلجوقی کے غلاموں میں ایک شخص ایلا کز نامی ترکی النسل تھا۔ وہ اول بہت ہی ادنیٰ درجہ کی خدمات پر مامور تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ترقی کر کے اتابکی کے درجہ تک پہنچ گیا اور معاملات سلطنت میں خوب دخیل اور قابو یافتہ ہو گیا۔ بالآخر سلطان طغرل ثانی کی بیوہ سے اس کی شادی ہو گئی اور وہ آذربائیجان کا گورنر مقرر ہو گیا۔ آخر وہ سلطنت سلجوقیہ کا وزیراعظم اور سپہ سالار بن گیا اور ملک ایران کی حکومت اس کے قبضہ اقتدار میں آ گئی۔ جب مقام ہمدان میں اس کا انتقال ہوا تو اس کا بڑا بیٹا محمد عطا بیگ باپ کی جگہ وزیراعظم اور طغرل سوم کا (جس کی عمر سات برس کی تھی) مربی ونگران قرار دیا گیا۔ عطا بیگ نے تیرہ سال ایران کی حکومت کا لطف اٹھایا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کا بھائی قزل ارسلان اس عہدہ جلیلہ پر مامور ہوا۔ قزل ارسلان نے طغرل سوم کو قتل کر کے خود تاج شاہی اپنے سر پر رکھنا چاہا مگر عین اس روز جبکہ یہ رسم ادا ہونے والی تھی، وہ خود بھی مر گیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے عطا بیگ ابوبکر نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس نے آذربائیجان کے ملک پر قناعت کر کے اپنی حکومت کو مضبوط کیا اور اطمینان سے حکومت کرنے لگا۔ اس وقت تک اس حکومت کا رعب اطراف وجوانب پر بیٹھا ہوا تھا۔ اتفاقاً ابوبکر کے بھائی قتلغ نے بھائی کے خلاف علم مخالفت بلند کیا، معرکہ جنگ میں قتلغ کو شکست ہوئی۔ اس نے فرار ہو کر خوارزم شاہ کے پاس پناہ لی اور اس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ آذربائیجان پر حملہ کر کے فتح کر لے مگر قتلغ، خوارزم شاہ کے ایک سردار کی تیغ خون آشام کا شکار ہوا اور چند روز کے بعد عطا بیگ ابوبکر کا انتقال ہوا تو اس کا دوسرا بھائی عطا بیگ مظفر بھائی کا جانشین ہوا۔ اس نے آذربائیجان کے علاوہ ملک عراق کے ایک حصہ پر قبضہ کیا اور پندرہ سال حکومت کرتا رہا۔ آخر سلطان جلال الدین خوارزم شاہ نے آذربائیجان پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا اور اس طرح سلطنت خوارزم شاہیہ اور آذربائیجان کی دولت

ایلا کزیہ کا ساتھ ہی ساتھ خاتمہ ہوا۔

دولت ملاحدہ الموت:

علاقہ قہستان میں الموت وقزوین وغیرہ کے قلعے حسن بن صباح نے اپنے قبضہ میں لے کر ایک سلطنت کی بنیاد، دولت سلجوقیہ کے عین عالم شباب میں قائم کی تھی۔ حسن بن صباح اور اس سلطنت کے ملاحدہ کا حال بالتفصیل پہلے کسی باب میں بیان ہو چکا ہے۔ اس جگہ بعض اور ضروری باتیں جو پہلے بیان میں رہ گئی تھیں، اضافہ کی جاتی ہیں تاکہ تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ بیان تکمیل کو پہنچ جائے۔ حسن بن صباح کی نسبت تو بہت سی باتیں مورخین نے بیان کی ہیں لیکن اس کے قوی الجسم اور مضبوط ہونے کا حال اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اس کے دو بیٹوں نے کسی کام میں اس کی نافرمانی کی تو حسن بن صباح نے ناراض ہو کر دونوں کو صرف ایک ایک طمانچہ مارا تو طمانچہ کی اس ضرب سے دونوں مر گئے۔

ایک مرتبہ حسن بن صباح کو سلجوقیوں کی حملہ آوری اور محاصرہ کے وقت اپنے بیوی بچوں کو ایک دوسرے قلعے میں احتیاطاً بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے قلعہ کے حاکم کو تاکید کر دی کہ میری بیوی خود ہی سوت کات کر اپنے خورد ونوش کے لیے سامان فراہم کرے گی، تم کو اس کی کوئی مہمان نوازی نہیں کرنی چاہیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن بن صباح نہ صرف خود ہی سادہ زندگی بسر کرتا تھا بلکہ وہ اپنے اہل وعیال کو بھی راحت طلبی سے دور ومہجور رکھنا چاہتا تھا۔

حسن بن صباح کی وفات کے بعد کیا بزرگ امید الموت میں تخت نشین ہوا۔ سلطان محمد سلجوقی اور کیا بزرگ امید کے درمیان محمد سلجوقی کی وفات تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ محمد سلجوقی کی وفات کے بعد کیا بزرگ امید نے سلجوقیوں کے کئی قلعوں کو اپنی حکومت میں شامل کیا اور گیلان کو خوب لوٹا۔

کیا بزرگ امید کے بعد اس کا بیٹا محمد نامی تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد حکومت میں فدائیوں نے جابجا بادشاہوں اور بڑے آدمیوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ جب قتل کی وارداتیں کثرت سے وقوع پذیر ہوئیں تو ایران کے لوگوں نے سلطان سنجر سلجوقی کی خدمت میں فریاد کی اور علماء نے ان فدائیوں کے خلاف قتل کے فتوے دیے، مگر سلطان سنجر نے ایلچی الموت میں بھیجے کہ وہ ان لوگوں کے اعمال

وعقائد کی نسبت صحیح حالات معلوم کر کے آئیں۔ چنانچہ مجلس مناظرہ منعقد ہوئی اور ان ملاحدہ نے اپنی بے گناہی کے ثبوت پیش کرنے کی خوب کوششیں کیں۔ آخر یہ افہام وتفہیم بلانتیجہ رہی اور سلطان سنجر نے ان ملاحدہ کے قتل عام کی نسبت حکم دینے میں تامل اور احتیاط کو ہی ضروری خیال کیا۔

تین سال کے بعد محمد بن کیا بزرگ امید فوت ہوا۔ اس کی جگہ حسن بن محمد تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے فرقہ میں دہریت اور بے دینی کو بہت ترقی دی۔ سنہ ۵۶۱ھ میں جب یہ فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا علاؤ الدین محمد تخت نشین ہوا۔ اس زمانے میں امام فخر الدین رازی نے آذربائیجان سے رے میں آ کر سلسلہ درس جاری کیا۔ وہ اپنے وعظ و درس میں فرقہ ملاحدہ کے خلاف اکثر فرمایا کرتے تھے تا کہ لوگ ان کی طرف یعنی فدائیوں کی طرف مائل نہ ہوں۔ فدائیوں نے رے میں پہنچ کر امام فخر الدین رازی کو قتل کی دھمکیاں دیں اور ان کو متنبہ کیا کہ اگر تم ہمارے خلاف باتیں کرنے سے باز نہ آؤ گے تو قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس کے بعد امام موصوف رے سے روانہ ہو کر غور میں غیاث الدین غوری اور اس کے بھائی شہاب الدین غوری کے پاس چلے آئے اور سلطان شہاب الدین کے ساتھ ہندوستان کے سفروں میں بھی شامل رہے۔ چنانچہ سلطان شہاب الدین غوری کی فوج میں آپ بہ طور امام مامور تھے یعنی نمازوں کی امامت آپ ہی فرماتے تھے۔ اسی سلسلہ میں سلطان شہاب الدین کی شہادت فدائیوں کے ہاتھ سے سنہ ۶۰۲ھ میں ہوئی، جس کے بعد امام فخر الدین رازی خوارزم شاہ کے پاس چلے گئے۔

علاؤ الدین محمد کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین حسن الموت میں تخت نشین ہوا۔ اس نے باپ اور دادا کے عقائد سے توبہ کی اور اپنی اس توبہ کا حال تمام سلاطین اسلام کے پاس لکھ کر بھیجا۔ چنانچہ یہ عالم اسلام میں جلال الدین نومسلم کے نام سے مشہور ہوا۔ خلیفہ ناصر عباسی بھی جلال الدین سے بہت خوش ہوا۔ چنانچہ جب جلال الدین حسن کی ماں حج کرنے کے لیے خانہ کعبہ میں گئی تو خلیفہ کے حکم سے سلطان محمد خوارزم شاہ کا رایت[1] جلال الدین حسن کی ماں کے رایت سے پیچھے رکھا گیا۔ اس طرح خلیفہ نے جلال الدین حسن کی ہمت افزائی کی مگر سلطان محمد خوارزم شاہ اس بات سے بے حد ناخوش ہوا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ خوارزم شاہ نے خلیفہ بغداد کے خلاف مہم تیار کی۔ جلال الدین حسن کی وفات کے بعد اس کا نوسالہ بیٹا علاؤ الدین محمد تخت نشین ہوا۔ چونکہ یہ لڑکا تھا، اس لیے اس کے

---

[1] یعنی جھنڈا

وقت میں سلطنت کے اندر بہت سے فتنے پیدا ہوئے اور مذہبی معاملات میں بھی تمسخر انگیز باتوں کا اظہار ہونے لگا۔ نصیر الدین طوسی بھی اسی کے عہد میں تھا۔ سنہ ۶۵۳ھ میں اس کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا رکن الدین خورشاہ تخت نشین ہوا۔ ہلاکو خان نے حملہ کر کے رکن الدین خورشاہ کو گرفتار اور اس کے قلعوں کو مسمار کر دیا۔ اس طرح اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں سر آغا خان جو بمبئی وغیرہ کی طرف بوہروں کی قوم[1] کا پیر سمجھا جاتا ہے، اسی خاندان کی یادگار ہے۔

---

❶ یعنی اسماعیلی شیعہ فرقہ

بائیسواں باب

مصر و شام کی اسلامی تاریخ کا اجمالی تتمہ

سلجوقیوں کی سلطنت کے ضعیف ہونے پر خود خاندان سلجوقیہ کے ٹکڑے ہو گئے اور انہوں نے اپنی اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کیں۔ اسی طرح اتابکوں کی بہت سی حکومتیں الگ الگ قائم ہوئیں اور اس طرح ایران، خراسان، عراق، فارس، شام اور ایشیائے کوچک میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی بہت سی سلطنتیں پیدا ہو گئیں، جن کا حال اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ انہیں میں سے خاندان سلجوقیہ کی ایک سلطنت ایشیائے کوچک میں قائم ہوئی جس کا دارالسلطنت شہر قونیہ تھا اور جو سلاجقہ روم کے نام سے موسوم ہے۔ یہ سلطنت ترکوں کی عثمانیہ سلطنت کے قائم ہونے تک باقی رہی۔ اسی طرح ملک شام میں اتابکوں کی ایک خود مختار سلطنت قائم ہوئی جس کو اتابکان شام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اتابکانِ شام:

سنہ ۵۲۱ھ میں اتابک عمادالدین زنگی نے ملک شام میں اپنی خود مختار حکومت کی بنیاد رکھی۔ اس عمادالدین زنگی کا حال اوپر خلفاء کے سلسلہ میں آ چکا ہے۔ سنہ ۵۴۴ھ میں جب عمادالدین زنگی نے وفات پائی تو اس کے تین بیٹے نورالدین زنگی، سیف الدین زنگی، قطب الدین زنگی موجود تھے۔ ان تینوں نے ملک شام میں الگ الگ شہروں میں حکومتیں قائم کر کے نورالدین زنگی کو اپنا سردار اور سلطان تسلیم کیا۔ جس طرح ایشیائے کوچک کے سلاجقہ روم عیسائیوں سے ہمیشہ برسر پیکار رہے، اسی طرح اتابکان شام بھی عیسائیوں ہی کے حملوں کی روک تھام میں مصروف تھے۔ خاص کر سلطان نورالدین نے عیسائیوں کے خلاف بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ حلب، موصل اور دمشق اس خاندان کے حاکم نشین شہر تھے۔ سلطان نورالدین زنگی بڑا بہادر، نیک طینت اور خشیت الٰہی رکھنے والا شخص تھا۔ سنہ ۴۹۰ھ سے بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے میں تھا اور انہوں نے وہاں اپنی ایک سلطنت قائم کر لی تھی۔ تمام براعظم یورپ بیت المقدس کی اس عیسائی سلطنت کا مدد و معاون

تھا۔ سلطان نورالدین کی تمام تر ہمت وتوجہ اس کی کوشش میں صرف ہوئی کہ بیت المقدس کو عیسائیوں کے قبضے سے نکالا جائے مگر سلطان نورالدین زنگی اپنی زندگی میں بیت المقدس کو آزاد نہ کرا سکا۔

اس کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس کام کو بہ حسن وخوبی انجام دیا۔ نورالدین کو بغداد کے عباسی خلیفہ نے سلطان کا خطاب اور ملک شام کی باقاعدہ سند حکومت عطا کر دی تھی۔ اسی سلطان کے عہد حکومت میں فرنگیوں نے مصر پر زور ڈالنا چاہا، جہاں خاندان عبیدی کا آخری فرماں روا عاضد برسر حکومت تھا۔ عاضد نے سلطان نورالدین سے امداد طلب کی اور نورالدین نے اپنے سپہ سالار شیرکوہ اور اس کے بھتیجے صلاح الدین کو مصر بھیجا۔ چند روز کے بعد عبیدی حاکم مصر فوت ہوا اور مصر پر صلاح الدین کی حکومت قائم ہوئی۔ اس کے چند روز بعد سلطان نورالدین زنگی کا بھی انتقال ہوا اور ملک شام میں دمشق کے تخت پر نورالدین کا بیٹا ملک صالح تخت نشین ہوا۔ چند روز کے بعد سیف الدین بن قطب الدین نے موصل میں اپنی الگ حکومت قائم کی اور انجام کار شام کے ملک پر بھی سلطان صلاح الدین ایوبی ہی کا قبضہ ہو گیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے سلطان نورالدین کی اولاد اور خاندان کے ساتھ بہت رعایت و مروت کا برتاؤ رکھا اور ملک شام میں اس خاندان کے افراد ہلاکو خان کے حملہ تک برسر حکومت واقتدار رہے لیکن ان کی حکومت برائے نام اور بہت محدود رقبہ پر تھی۔ حقیقتاً سلطان نورالدین کے بعد حکومت وسلطنت سلطان صلاح الدین ایوبی سے متعلق ہو گئی۔

دولت ایوبیہ مصر وشام:

نجم الدین ایوب قوم کے اعتبار سے کرد اور عمادالدین زنگی کی فوج میں سپہ سالاری کا عہدہ رکھتا تھا۔ نجم الدین ایوب کے بیٹے صلاح الدین پر عمادالدین زنگی بہت مہربان تھا اور اس نے صلاح الدین کی تعلیم وتربیت کا انتظام اپنے اہتمام سے کیا تھا۔ عمادالدین زنگی کی وفات کے بعد سلطان نورالدین زنگی نے نجم الدین ایوب کو دمشق کا قلعہ دار اور کوتوال مقرر کر کے اس کے بیٹے صلاح الدین کو بھی اس خدمت میں باپ کا کمکی مقرر کیا تھا۔ نجم الدین ایوب کی وفات کے بعد نورالدین زنگی نے اس کے بھائی شیرکوہ کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنایا اور صلاح الدین کو دمشق کا قلعہ دار رکھا۔ جب مصر کی جانب عاضد عبیدی کی درخواست پر فوج بھیجی گئی تو شیرکوہ کے ساتھ نورالدین نے اس کے بھتیجے

صلاح الدین کو بھی بھیجا، جس کا مفصل تذکرہ اوپر کسی باب میں آ چکا ہے۔ سنہ ۵۶۷ھ صلاح الدین بن نجم الدین ایوب عاضد عبیدی کے بعد مصر کا بادشاہ بن گیا۔ سنہ ۵۶۹ھ میں جب سلطان نورالدین زنگی کا انتقال ہوا تو یہاں ارکان سلطنت میں تخت نشینی کے متعلق اختلاف ہوا۔ صلاح الدین نے مصر سے دمشق میں آ کر سلطان نورالدین کے بیٹے ملک صالح کو تخت نشین کیا اور اسی تاریخ سے شام کی سلطنت بھی سلطان صلاح الدین کے زیر اثر اور زیر اقتدار آ گئی۔ اسی سال یمن اور حجاز میں بھی اس کی حکومت قائم ہوئی۔

یہ زمانہ عالم اسلام کے لیے بہت نازک تھا۔ یورپ کے عیسائیوں نے متفقہ طاقت سے شام و مصر پر حملہ آوری کی۔ اس حملہ آوری کی زد پر صلاح الدین ہی پہاڑ بن کر ڈٹ گیا تھا۔ دوسری طرف ملاحدہ الموت یعنی فدائیوں نے جو چھپ کر حملہ کرتے اور مسلمان امراء کو قتل کرنا ثواب جانتے تھے، ایک تہلکہ عظیم برپا کر رکھا تھا۔ ان فدائیوں سے لوگ بہت خائف و ترساں تھے۔ ان ظالموں نے سلطان صلاح الدین کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی، مگر وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بچ گئے۔

آخر شام کے تمام سرداروں نے مل کر صلاح الدین کو ملک شام کا باقاعدہ بادشاہ تسلیم کیا اور سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس کو عیسائیوں کے قبضے سے نکالنے کی کوشش شروع کی۔ سنہ ۵۸۳ھ میں سلطان صلاح الدین نے ایک جنگ عظیم کے بعد بیت المقدس کے عیسائی بادشاہ کو میدان جنگ میں گرفتار کر لیا اور پھر اس سے یہ اقرار لے کر کہ وہ سلطان کے مقابلے میں نہ آئے گا، چھوڑ دیا۔ اس کے بعد عکہ پر قبضہ کیا اور سنہ ۵۸۸ھ میں بیت المقدس کو فتح کر لیا۔ سنہ ۴۹۰ھ سے سنہ ۵۸۸ھ تک یعنی ۹۸ سال کے قریب بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے میں رہا۔ عیسائیوں نے جب بیت المقدس کو مسلمانوں سے فتح کیا تھا تو مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہادی تھیں لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی نے جب اس مقدس شہر کو عیسائیوں سے فتح کیا تو کسی عیسائی باشندے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بیت المقدس کی فتح کا حال سن کر تمام براعظم یورپ میں ایک حشر برپا ہو گیا اور گھر گھر کہرام مچ گیا۔ چنانچہ فلپ بادشاہ فرانس، رچرڈ شیر دل بادشاہ انگلستان، فریڈرک بادشاہ جرمنی اور بہت سے چھوٹے چھوٹے بادشاہ، نواب اور امراء لشکر عظیم لے کر متفقہ طور پر تمام براعظم ایشیا کو فتح کر کے اسلام کا نام و نشان مٹانے کے ارادے سے حملہ آور ہوئے۔ عیسائی افواج جرار کا یہ سمندر اس طرح متلاطم ہوا اور اس شان شوکت کے ساتھ ملک شام کی طرف بڑھا کہ بہ ظاہر

براعظم ایشیا کی خیر نظر نہیں آتی تھی مگر حیرت ہوتی ہے کہ سلطان صلاح الدین نے چار سال تک کئی سو لڑائیاں لڑ کر عیسائیوں کے اس بے پایاں لشکر کو خاک و خون میں ملایا اور اپنے سامنے سے بھگایا مگر بیت المقدس کی دیواروں تک نہیں پہنچنے دیا۔ آخر ناکام و نامراد یہ عیسائی سلاطین نہایت ذلت کے ساتھ واپس ہوئے، فللّٰہ الحمد! سلطان صلاح الدین نے عیسائیوں کو یہ رعایت عطا کی کہ وہ اگر بیت المقدس میں محض زیارت کے لیے آئیں تو عیسائیوں کو کسی قسم کی روک ٹوک نہ کی جائے گی۔

ان مذکورہ لڑائیوں میں صلاح الدین نے جس شرافت و انسانیت کا برتاؤ کیا اور جس شجاعت و جفاکشی کا اس سے اظہار ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تک بھی تمام یورپ سلطان صلاح الدین کو عزت و عظمت کے ساتھ یاد کرتا اور اس کے نام کو شجاعت و شرافت کا مترادف سمجھتا ہے۔ حالانکہ سلطان صلاح الدین ہی نے تمام براعظم یورپ کو اس کے مقصد وحید میں ناکام و نامراد رکھ کر واپس بھگایا تھا۔ سنہ ۵۸۹ھ میں سلطان صلاح الدین نے وفات پائی اور اپنے تقوے اور زہد و ورع کے سبب سے اولیاء اللہ میں اس کا شمار ہوا۔

صلاح الدین ایوبی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عثمان الملقب بہ ملک العزیز تخت نشین ہوا۔ اس نے چھ سال نہایت نیک نامی کے ساتھ حکومت کی۔ سنہ ۵۹۵ھ میں جب فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا ملک منصور تخت نشین ہوا۔ مگر ایک سال کے بعد معزول ہوا تو اس کے بعد ملک عادل سلطان صلاح الدین کا بھائی تخت نشین ہوا۔ یہ بڑا نیک اور قابل ستائش سلطان تھا۔ اس نے سنہ ۶۱۵ھ میں وفات پائی۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا ملک کامل تخت نشین ہوا۔ یہ بھی بہت نیک نام بادشاہ تھا۔ سنہ ۶۳۵ھ میں اس کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا ملک عادل ابوبکر تخت نشین ہوا۔ دو برس کے بعد امرائے مصر نے اس کو محبوس کر کے اس کے بھائی ملک صالح بن ملک کو مصر کے تخت پر بٹھایا۔ اس نے دس سال حکومت کی۔ آخر عیسائیوں کی لڑائی میں شہید ہوا۔ اس کے بعد ملک معظم توران شاہ بن ملک صالح سنہ ۶۴۷ھ میں تخت نشین ہوا مگر چند ہی مہینے کی حکومت کے بعد مقتول ہوا۔ اس کے بعد ملکہ شجرۃ البدر سنہ ۶۴۸ھ میں تخت نشین ہوئی اور چند مہینے کی حکومت کے بعد وہ بھی تخت سلطنت سے جدا ہوگئی۔ اس کے بعد ملک اشرف سنہ ۶۴۸ھ میں تخت نشین ہوا۔ سنہ ۶۵۲ھ میں اس کو اسی خاندان کے غلاموں نے معزول کیا اور خاندان ایوبیہ کردیہ کا خاتمہ ہوا۔

سلطان صلاح الدین کا تقریباً تمام عہد حکومت ملک شام اور شہر دمشق یا میدان جنگ میں گزرا۔

لیکن اس کے جانشینوں نے مصر ہی کو اپنا دارالسلطنت بنایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام کی حکومت ان کے ضعیف ہو جانے کے بعد دولت ایوبیہ سے خارج ہوگئی اور آخر میں وہ صرف ملک مصر ہی پر قابض رہے۔ اس سلطنت کے آخری فرماں رواؤں کی حکمت عملی یہ تھی کی خارجہ اور ارمینیا کے غلاموں کو خرید خرید کر ان غلاموں کی ایک زبردست فوج رکھی جائے تاکہ کسی سردار کو بغاوت وسرکشی کی جرأت نہ ہو سکے اور ان شاہی غلاموں کی فوج سے ہر سرکش کی سرکوبی کی جا سکے۔ مگر رفتہ رفتہ ان غلاموں نے جن کو مملوک کہا جاتا تھا، اس قدر قوت حاصل کر لی کہ وہی سلطنت مصر کے مالک ہو گئے۔

دولت مملوکہ مصر/طبقہ اول:

جب خاندان ایوبیہ کو زوال آیا اور غلاموں کے ہاتھ میں سلطنت کے تمام امور آ گئے تو انہوں نے انتخاب کے ذریعہ سے اپنے ہی لوگوں میں سے ایک شخص ملک معزعزیز الدین ایبک کو اپنا بادشاہ بنایا۔ ملک معز نے ملکہ شجرۃ البدر سے جو ملک صالح کی کنیز تھی اور چند مہینے بادشاہت کر چکی تھی، نکاح کیا۔ سنہ ۶۵۵ھ میں مقتول ہوا۔

اس کے بعد امرائے سلطنت نے اس کے بیٹے ملک منصور کو بادشاہت کے لیے منتخب کیا۔ یہ دو برس کے بعد سلطنت سے دست کش ہو گیا۔ اس کی جگہ ملک ظفر بادشاہت کے لیے منتخب ہوا اور گیارہ مہینے سلطنت وحکومت پر فائز رہا۔ اس کے عہد حکومت میں ہلاکو خان کی فوج نے حملہ کر کے مصری فوج سے شکست فاش کھائی۔ ملک مظفر کو قتل کر کے سنہ ۶۵۸ھ میں ملک الظاہر رکن الدین تخت نشین ہوا۔ اس نے سترہ سال تک بڑی کامیابی کے ساتھ حکومت کی اور سنہ ۶۷۶ھ میں اس کی وفات کے بعد ملک سعید ناصر الدین تخت نشین ہوا۔ ایک سال کے بعد اس کو بھی معزول کر دیا گیا۔ اس کے بعد ملک عادل بدرالدین تخت پر بٹھایا گیا۔ صرف چار مہینے سلطنت کرنے پایا تھا کہ معزول ہوا اور اس طرح سنہ ۶۷۸ھ میں دولت مملوکیہ مصر کے طبقہ اول کا خاتمہ ہوا۔ ان لوگوں کی مجموعی سلطنت صرف ۲۶ سال تک رہی۔ ان کی بعض خصوصیات قابل تذکرہ ہیں۔ اول یہ کہ انہوں نے انتخاب کا طریقہ جاری کیا یعنی کثرت رائے سے اپنا بادشاہ منتخب کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان مغلوں کو جو تمام متمدن دنیا کو تہ وبالا کر چکے تھے، انہوں نے ہمیشہ شکست دے کر بھگایا اور حدود مصر میں ان کو قدم نہ رکھنے دیا۔ ہاں! مغلوں کے بہت سے آدمیوں کو لڑائی میں گرفتار کر کے لے گئے اور

اپنا غلام بنا کر مصر میں رکھا۔ ان لوگوں کو غلامان ایوبیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دولت مملوکیہ مصر/طبقہ دوم یا دولت قلاؤنیہ:

ملک عادل بدرالدین کے بعد ابوالمعانی ملک منصور قلاؤن اسی سلسلہ انتخاب کے ذریعہ سے مصر کا بادشاہ منتخب ہوا۔ مگر اس کے بعد چونکہ اسی کے خاندان کو عرصہ دراز تک لوگوں نے حکومت مصر کے لیے منتخب کیا، اس لیے یہ مملوکیوں کے طبقہ دوم کا پہلا بادشاہ سمجھا گیا۔ اس نے سنہ ۶۷۸ھ سے سنہ ۶۸۹ھ تک گیارہ سال حکومت کی۔ اس کے زمانے میں سلطنت مصر کا رقبہ کسی قدر وسیع ہوا۔ اس کے بعد ملک اشرف صلاح الدین خلیل تخت نشین ہوا۔ اس نے چند روز کے بعد خود سلطنت سے دست کشی اختیار کی۔ مگر لوگوں نے مجبور کر کے اس کو پھر تخت سلطنت پر بٹھایا اور ۴۴ سال کی حکومت کے بعد سنہ ۷۴۳ھ میں فوت ہوا۔ اس کے بعد ملک عادل کتبغا منصوری تخت سلطنت کے لیے منتخب ہوا۔ مگر اس کو ایک مہینہ بھی حکومت کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد ملک منصور حسام الدین بادشاہ بنایا گیا۔ دو برس کے بعد وہ بھی مقتول ہوا۔ اس کے بعد ملک ظفر رکن الدین ایک سال کے لیے منتخب ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۷۴۱ھ میں ملک منصور ابوبکر بادشاہ بنایا گیا مگر دو ہی مہینے کے بعد اس کو جلاوطن کیا گیا۔ اس کے بعد ملک اشرف کو بادشاہ بنایا گیا مگر آٹھ مہینے کے بعد وہ بھی جلاوطن ہوا، پھر سنہ ۷۴۲ھ میں ملک ناصر احمد تخت نشین ہوا۔ سنہ ۷۴۵ھ میں اس کے مقتول ہونے پر ابوالفدا ملک صالح اسماعیل تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ اس نے صرف ایک سال حکومت کی۔ یہ وہی ابوالفدا ہے جس نے وہ مشہور تاریخ لکھی جو تاریخ ابوالفدا کے نام سے مشہور ہے اور نہایت معتبر و مستند سمجھی جاتی ہے۔ سنہ ۷۴۶ھ میں ملک کامل شعبانی تخت نشین ہو کر چند ماہ کے بعد معزول ہوا۔ سنہ ۷۴۷ھ میں ملک مظفر حاجی تخت نشین ہوا اور ایک ہی سال کے اندر قتل کیا گیا۔ سنہ ۷۴۸ھ میں ناصر حسن تخت نشین ہوا۔ قریباً چودہ سال حکومت کی۔ آخر یہ بھی مقتول ہوا۔ اس کے بعد ملک صالح سنہ ۷۶۲ھ میں تخت نشین ہو کر سنہ ۷۶۵ھ میں معزول کیا گیا اور اس کی جگہ ملک منصور بن حاجی کو تخت سلطنت ملا۔ دو برس کے بعد وہ بھی معزول ہوا اور تخت سلطنت ملک اشرف شعبان کے حصے میں آیا۔ گیارہ سال کے بعد وہ بھی مقتول ہوا اور اس کی جگہ ملک منصور علی سنہ ۷۷۸ھ میں تخت نشین ہو کر پانچ سال کے بعد فوت ہوا اور اس کے بعد سنہ ۷۸۳ھ میں صالح حاجی تخت نشین ہوا اور آٹھ نو سال کے بعد خود تخت سلطنت سے دست بردار ہو کر دولت قلاؤنیہ کا خاتمہ کر گیا۔ یہ سلطنت قریباً ۱۱۴ سال تک قائم

رہی۔ اس طبقہ اور طبقہ اول میں حکومت و سلطنت کے اعتبار سے کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

دولت مملوکیہ مصر/طبقہ سوم یا دولت چراکسہ:

ملک صالح حاجی کے بعد ملک طاہر برقوق تخت نشین ہوا، جو غلامان ایوبیہ میں قبیلہ چرکس سے تعلق رکھتا تھا۔ چونکہ آئندہ اسی قبیلہ کے لوگ حکومت مصر پر فائز ہوئے، اس لیے ملک طاہر برقوق غلامان ایوبیہ کے طبقہ سوم کا پہلا بادشاہ سمجھا گیا۔ اس نے سنہ۷۹۲ھ سے سنہ۸۰۱ھ تک نو سال حکومت کی۔ اس کے بعد ملک ناصر تخت نشین ہوا۔ ملک ناصر نے چار سال حکومت کی۔ اس کے زمانے میں تیمور نے مصر کی طرف فوج کشی کی مگر دولت مملوکیہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔ اسی ملک ناصر نے خانہ کعبہ میں حنفی،، شافعی، مالکی اور حنبلی چار مصلے قائم کیے۔ اول اول بعض علمائے اسلام نے اس کو بدعت قرار دیا مگر پھر اس کی زیادہ مخالفت نہیں کی کیونکہ اس کام سے کوئی فتنہ اور رخنہ دین میں پیدا نہیں ہوا۔[1] اس کے بعد ملک الظاہر ابوالفتح کا نمبر آیا۔ اس کے بعد ملک صالح محمد سنہ۸۲۲ھ میں تخت نشین ہوا۔ چار مہینے سلطنت کرنے کے بعد خود حکومت سے دست کش ہوا۔ اس کی جگہ ملک اشراف ابوالنصر کو بادشاہ بنایا گیا۔ یہ بہت دین دار اور اللہ والا شخص تھا۔ اس کی وفات کے بعد ابوالمحاسن عبدالعزیز تخت نشین ہوا مگر تین ہی مہینے کے بعد معزول ہوا۔ اس کے بعد ملک ابوسعید المعروف بہ ملک الظاہر تخت نشین ہوا۔ پندرہ سال کی حکومت کے بعد فوت ہوا۔ بڑا غریب پرور اور نیک طینت بادشاہ تھا۔ اس کے بعد ملک منصور عثمان تخت نشین ہوا مگر چند مہینے کے بعد سنہ۸۵۷ھ میں معزول ہوا۔

اس کے بعد ملک اشرف ابوالنصر تخت نشین ہو کر سنہ۸۶۵ھ تک برسر حکومت رہا۔ اس کے بعد ملک موید احمد تخت نشین ہو کر چند روز میں معزول کیا گیا۔ اس کے بعد ملک ظاہر ابوسعید خوش قدم سنہ۸۶۵ھ سے سنہ۸۹۲ھ تک تخت نشین رہا اور اپنی موت سے مرا۔ اس کے بعد ملک ظاہر ابوسعید ملیائی تخت نشین ہو کر چند مہینے کے بعد جلاوطن ہوا اور ملک ظاہر ابوسعید تمیر غا بھی تخت نشین ہو کر دو ہی مہینے کے اندر قید کیا گیا۔ اس کے بعد ملک اشرف ابوالنصر بادشاہ بنایا گیا، جس نے سنہ۹۰۲ھ تک

---

[1] یہ عمل بدعت بھی تھا اور مسلمانوں کی تفریق وتقسیم اور ان میں اختلافات کو وسیع سے وسیع تر کرنے کا باعث بھی۔ مسلمانوں کی نااتفاقی اور دینی بنیاد پر ان کے اختلافات کوئی کم فتنہ اور رخنہ دین ہیں! اس لیے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے کوئی فتنہ اور رخنہ دین پیدا نہیں ہوا۔

حکومت کی۔ اس کے بعد ملک ابوالسعادت تخت سلطنت پر متمکن ہوا اور ڈھائی سال حکومت کر کے مقتول ہوا۔ اس کے بعد سنہ۹۰۴ھ میں ملک اشرف قالضوہ تخت نشین ہوا، مگر گیارہ روز کے بعد گم ہو گیا اور کہیں پتہ نہ چلا کہ کہاں گیا؟ اس کے بعد ملک ظاہر ابوسعید قالضوہ سنہ۹۰۶ھ تک حکمران رہا۔ اس کے بعد ملک حنبلاط تخت نشین ہو کر ایک ہی سال میں جلاوطن کیا گیا۔ اس کے بعد ملک عادل سنہ۹۰۷ھ میں تخت نشین ہوا اور ساڑھے چار مہینے کے بعد مارا گیا۔ اس کے بعد ملک اشرف ابوالنصر قالضوہ تخت نشین ہوا۔ اس نے سنہ۹۲۲ھ تک پندرہ سال حکومت کی۔

سلطان سلیم اول عثمانی نے مصر پر سنہ۹۲۲ھ میں چڑھائی کی اور ملک اشرف طومان کو جو اسی سال تخت نشین ہوا تھا، شکست دے کر دولت چراکسہ کا خاتمہ کر دیا اور مصر حکومت عثمانیہ میں شامل ہو گیا۔ اس کے ساتھ خلافت عباسیہ کے اس سلسلہ کا بھی جو برائے نام مصر میں قائم تھا، خاتمہ ہو گیا۔ غلامان ایوبیہ کے اس تیسرے طبقہ نے جو دولت چراکسہ کے نام سے مشہور ہے، ۱۳۰ سال حکومت کی۔ خاندان ایوبیہ کے بعد مصر میں مملوکیوں کے تینوں طبقوں کی حکومت دو سو ستر سال تک قائم رہی۔ ان مملوکیوں کے ابتدائی زمانے میں ہلاکو خان نے بغداد کو برباد کر کے خلاف عباسیہ کا سلسلہ بغداد سے مٹا دیا تھا مگر چند ہی روز کے بعد جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، مصر کے اندر خلفائے عباسیہ کا سلسلہ ان مملوکیوں کے ساتھ شروع ہو گیا اور مملوکیوں کے خاتمے (سنہ۹۲۲ھ) تک باقی رہا۔ مصر کے اندر عباسی خلفاء کی حیثیت پیروں اور وظیفہ خواروں سے زیادہ نہ تھی مگر چونکہ تمام عالم اسلام میں ان عباسی خلفاء کی مذہبی حیثیت مسلم تھی اور وہ پیشوائے مذہب سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے ان کا وجود مملوکین کے لیے بھی مفید تھا کیونکہ تمام مسلمان سلاطین مملوکیوں کو خادم خلفاء سمجھ کر ان کی مخالفت کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی طرح عباسی خلفاء کے لیے مملوکیوں کا وجود غنیمت تھا کہ وہ ان کی حکومت میں بے غمی اور راحت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔

خلفاء مصر کا تذکرہ مجمل طور پر اوپر بھی ذکر ہو چکا ہے، اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان خلفاء کی ایک فہرست ذیل میں درج کر دی جائے جو مصر میں ہوئے ہیں تاکہ یہ بھی اندازہ ہو سکے کہ مصر کے کس بادشاہ کے زمانے میں کون سا عباسی خلیفہ مصر میں موجود تھا۔ یہ بھی یاد رہے کہ جس طرح ایک بادشاہ کے بعد دوسرے بادشاہ کی تخت نشینی پر عباسی خلیفہ سے تخت نشینی کی سند حاصل کرنی پڑتی تھی، اسی طرح ایک خلیفہ کے فوت ہونے پر دوسرے خلیفہ کی تخت نشینی میں شاہان مصر کو بہت کچھ

دخل وتصرف حاصل تھا۔ تاہم کبھی کبھی خلفاء کو مصر کے اندر ایسی شوکت واہمیت بھی حاصل ہو جاتی تھی کہ شاہ مصر مخالفت کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ خلفاء اور شاہان مصر میں کبھی کبھی ناچاقی وناراضی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ خلیفہ کو عام مسلمانوں کی ہمدردی پر اعتماد ہوتا تھا تو شاہ مصر کو اپنی شاہی طاقت وسطوت پر گھمنڈ تھا۔ بہرحال سلطان سلیم عثمانی نے اس کشمکش کو مٹا کر سلطنت وخلافت دونوں چیزوں کو اپنے وجود میں مجتمع کرلیا اور پونے تین سال کے بعد خلیفہ اسلام کی حیثیت ایک پیر یا سجادہ نشین سے تبدیل ہو کر اپنی اصلی حالت یعنی جامہ شہنشاہی میں نمودار ہوئی۔

خلفائے عباسیہ مصر

نمبر	خلیفہ کا نام	سنہ جلوس
۱	مستنصر باللہ بن ظاہر بامراللہ بن ناصرلدین اللہ	سنہ ۶۵۹ ھ
۲	حاکم بامراللہ بن مسترشد باللہ	سنہ ۶۶۰ ھ
۳	مستکفی باللہ بن حاکم بامراللہ	سنہ ۷۰۱ ھ
۴	واثق باللہ	سنہ ۷۰۴ ھ
۵	حاکم بامراللہ بن مستکفی باللہ	سنہ ۷۴۲ ھ
۶	مستعضد باللہ	سنہ ۷۵۳ ھ
۷	متوکل علی اللہ	سنہ ۷۶۲ ھ
۸	مستعصم باللہ بن محمد ابراہیم	سنہ ۷۷۸ ھ
۹	مستعین باللہ	سنہ ۸۰۸ ھ
۱۰	معتضد باللہ	سنہ ۸۱۵ ھ
۱۱	مستکفی باللہ	سنہ ۸۴۵ ھ
۱۲	قاسم بامراللہ بن متوکل	سنہ ۸۵۸ ھ
۱۳	مستعد باللہ بن متوکل	سنہ ۸۵۸ ھ
۱۴	متوکل علی بن یعقوب بن متوکل	سنہ ۸۷۲ ھ

۱۵ مستمسک باللہ سنہ۹۰۳ھ

سلطان سلیم عثمانی نے مصر کو فتح کیا تو مستمسک نے عصاء، چادر اور دوسرے تمام تبرکات جو اس کے پاس بطور نشان خلافت موجود تھے، سلطان سلیم کو دے دیئے اور خود بھی سلطان سلیم کے ساتھ پر بیعت خلافت کر لی۔ سلطان سلیم عثمانی مصر سے مستمسک کو اپنے ہمراہ قسطنطنیہ لے گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔

تیئیسواں باب

سلطنت عثمانیہ

اوپر کے باب میں ہم پھر دسویں صدی ہجری کے شروع تک پہنچ گئے تھے۔ سلسلہ مضامین کو مکمل رکھنے کی غرض سے ہم کو لوٹ کر پھر ساتویں صدی ہجری کے ابتدائی زمانے اور ایشیائے کوچک کے میدانوں میں واپس آنا چاہیے، جبکہ سلطنت عثمانیہ کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے ابتدائی تین سو سال کی تاریخ بیان کرنے کے بعد یعنی دسویں صدی ہجری کے شروع تک پہنچ کر ہم کو غالباً پھر پیچھے واپس ہونا پڑے گا تاکہ تیمور اور ایران کے صفوی خاندان کی تاریخ سے بھی فارغ ہو کر پھر دسویں صدی ہجری میں داخل ہوں اور سلطنت عثمانیہ کے بقیہ تین سو سال کی تاریخ کسی آئندہ باب میں ختم کریں، وباللہ التوفیق۔

ترکوں کے ان غارت گر قبائل نے جو ترکان غز اور غزان کے نام سے مشہور ہیں، خراسان و ایران میں داخل ہو کر سلطنت سلجوقیہ کے اعتبار و وقار کو صدمہ پہنچایا تھا۔ ان ترکان غز کی ترک وتاز کا پتہ ملک چین کے صوبہ منچوریا سے لے کر مراکش تک کی تاریخوں میں ملتا ہے۔ انہوں نے سلطان سنجر سلجوقی کو گرفتار کر کے بہت کچھ اپنی دہشت لوگوں کے دلوں میں بٹھا دی تھی۔ مگر جب چنگیز خان نے خروج کیا تو ان کا زور بہت کچھ گھٹ چکا تھا۔ رہا سہا رعب چنگیزی کشت وخون کے آگے مٹ گیا۔ پہلے بھی یہ لوگ مختلف قبائل پر منقسم تھے۔ جب گرم بازاری جاتی رہی تھی، اور بھی زیادہ تشتت اور پراگندگی نے ان میں راہ پائی۔ کوئی قبیلہ مصر کی طرف جا کر وہاں کی فوج میں بھرتی ہو گیا، کوئی شام میں اور کوئی ارمینیا وآذربائیجان میں رہنے لگا۔ چونکہ ان کے اندر کوئی ایک زبردست بادشاہ پیدا نہیں ہوا تھا، اس لیے ان لوگوں کے حالات تاریخوں میں بھی بالتفصیل نہیں لکھے گئے مگر ان کے اندر عرصہ دراز تک خراسان وایران میں فاتحانہ حیثیت سے رہنے کے سبب سے تہذیب وشائستگی نے ضرور ترقی کی تھی اور اولوالعزمی وبلند ہمتی کی شان ان کے ہر قبیلے اور خاندان میں موجود تھی۔ حکومت وفتح مندی کے عالم میں بھی انہوں نے اپنے ریوڑوں کی محبت نہیں چھوڑی تھی۔ اس لیے اب خروج

چنگیزی کے وقت کچھ تو چنگیز خان کی فوج میں داخل ہو گئے اور اکثر خراسان وایران اور دوسرے ملکوں کی سرسبز وشاداب چراگاہوں اور جنگلوں میں رہنے لگے۔ انہیں ترکان غز کا ایک قبیلہ خراسان میں اقامت گزیں تھا۔

ساتویں صدی ہجری کے شروع ہوتے ہی جبکہ چنگیزی مغلوں کی حملہ آوری خراسان پر شروع ہوئی، خراسان سے روانہ ہو کر وہ آرمینیا کے علاقے میں چلا آیا اور بیس پچیس سال تک آرمینیا میں مقیم رہا۔ اس قبیلہ کے سردار کا نام سلیمان خان اور اس کے ساتھی سلجوقیوں کی طرح نہایت سچے مسلمان تھے۔ سلیمان خان کی قابلیت اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اس کا سلوک دیکھ کر نتیجہ یہ ہوا کہ آرمینیا میں ترکان غز کے اور بھی آوارہ پریشان پھرنے والے افراد آ آ کر اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس جمعیت میں معتد بہ اضافہ ہوتا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ چنگیز خان کی ترک وتاز کے سبب سے ملکوں کا امن وامان معرض خطر میں تھا اور ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل وعیال واموال کی حفاظت کے لیے اپنے ہی قوت بازو پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا اور ہمہ اوقات آفتوں اور مصیبتوں کے مقابلہ پر مستعد رہنا ازبس ضروری تھا۔ لہٰذا سلیمان خان کے گروہ کو بھی جو آرمینیا کے پہاڑوں میں اقامت گزین تھا، اپنی طاقت وعصبیت کو محفوظ رکھنے کا خیال رہتا تھا۔ خلاصہ کلام یہ کہ آرمینیا کے زمانہ قیام میں جبکہ ہر طرف ہلاکت اور بربادی برپا تھی، سلیمان خان نے اپنی طاقت کو خوب بڑھایا اور اپنے گروہ کو بلا ضرورت نقصان پہنچنے سے بچایا۔ دولت خوارزم شاہیہ کی بربادی نے اور بھی سلیمان خان کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ جنگجو افراد اور جنگ جوئی کے سامانوں کو اپنے گرد آزادانہ فراہم کرے۔

ابھی چنگیز خان کے مرنے میں تین سال باقی تھے کہ اس نے سنہ ۶۲۱ ھ میں ایک زبردست فوج سلجوقیوں کی اس سلطنت پر، جس کا دارالسلطنت قونیہ تھا، حملہ آوری کے لیے روانہ کی۔ قونیہ میں علاؤالدین کیقباد سلجوقی فرماں روا تھا۔ اوپر کے صفحات میں ذکر آ چکا ہے کہ اس سلجوقی حکومت کے فرماں رواؤں یعنی سلاجقہ روم کو ہمیشہ رومیوں یعنی عیسائیوں سے برسرپیکار رہنا پڑتا تھا۔ اب امتداد زمانہ سے یہ سلطنت بہت ہی کمزور ہو چکی تھی۔ سلیمان خان کو جب یہ خبر پہنچی کہ مغلوں نے علاؤالدین کیقباد پر حملہ کیا ہے تو اس کو بہت ملال ہوا کیونکہ قونیہ کا سلطان مسلمان اور مغل کافر تھے۔ قونیہ کی سلطنت ہمیشہ عیسائیوں کے مقابلے میں برسر جہاد رہتی تھی اور مغلوں نے عالم اسلام کو تہ وبالا کر ڈالا تھا۔ سلیمان خان نے علاؤالدین کیقباد کو امداد پہنچانے اور اس لڑائی میں شریک ہو کر شہادت

حاصل کرنے کا بہترین موقع سمجھ کر اپنے قبیلہ کو کوچ کی تیاری کا حکم دیا۔ سلیمان خان کی اس جمعیت کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں ہو سکی مگر سلیمان خان نے اس جمعیت کا ایک حصہ جو اپنے بیٹے ارطغرل کو دے کر بہ طور ہراول آگے روانہ کیا تھا، اس کی تعداد ۴۴۴ تھی۔ دنیا کے بڑے بڑے اور اہم واقعات میں جس طرح حیرت انگیز طور پر حسن اتفاق کا معائنہ ہوتا رہا ہے، اسی طرح اس موقع پر بھی عجیب حسن اتفاق پیش آیا۔ ادھر ارمینیا کی جانب سے یہ مجاہدین کی فوج جا رہی تھی، ادھر مغلوں کی فوج علاؤ الدین کیقباد سلجوقی کی فوج کے مقابل پہنچ گئی تھی۔ عین اس وقت جبکہ سلجوقی لشکر اور مغلوں کی فوج میں ہنگامہ کارزار گرم تھا اور مغل بہت جلد علاؤ الدین کے لشکر کو مغلوب کرنا چاہتے تھے، سلیمان خان کا بیٹا ارطغرل اپنے ہمراہی دستہ کو لیے ہوئے نمودار ہوا۔ اس نے دیکھا کہ دو فوجیں برسر پیکار ہیں اور ایک فوج بہت جلد مغلوب ہو کر میدان کو خالی کرنے والی تھی۔ ارطغرل کو معلوم نہ تھا کہ دونوں لڑنے والے کون ہیں۔ لیکن اس نے یہی مناسب سمجھا کہ کمزور فریق کی مدد کروں۔ چنانچہ ارطغرل اپنے ۴۴۴ ہمراہیوں کو لے کر کمزور فریق کی طرف سے زبردست فریق پر ٹوٹ پڑا۔ یہ حملہ اس شدت اور بے جگری کے ساتھ کیا گیا کہ مغلوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور میدان میں اپنی بہت سی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ علاؤ الدین کیقباد سلجوقی ذرا دیر پہلے اپنی شکست اور ہلاکت کو یقینی سمجھ رہا تھا۔ اس غیر مترقبہ امداد اور فتح کو دیکھ کر بہت مسرور ہوا اور میدان جنگ میں ارطغرل سے جو فرشتہ رحمت بن کر نمودار ہوا تھا، بغل گیر ہو کر ملا۔ ارطغرل کو بھی بے حد مسرت حاصل ہوئی کہ وہ عین وقت پر پہنچا اور جس مقصد کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا، وہ بہ حسن وخوبی حاصل ہو گیا۔ ابھی ارطغرل اور علاؤ الدین کیقباد اس مسرت وشادمانی کا لطف اٹھا رہے تھے کہ سلیمان خان بھی اپنی جمعیت کے ساتھ اسی میدان میں پہنچ گیا۔ علاؤ الدین سلجوقی نے سلیمان خان اور اس کے بیٹے ارطغرل کو خلعت گراں بہا عطا کیے۔ ارطغرل کو شہر انگورہ کے قریب جاگیر عطا کی اور سلیمان خان کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنایا۔

علاؤ الدین سلجوقی کے فہم وفراست کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے ارطغرل کو جاگیر عطا کرنے کے لیے بہترین علاقہ کا انتخاب کیا۔ قونیہ کی سلطنت پہلے بہت وسیع تھی۔ اب صورت یہ پیدا ہو گئی تھی کہ ایشیائے کوچک کے شمالی ومغربی علاقے پر رومیوں نے چیرہ دست ہو کر قبضہ کر لیا تھا اور وہ بہ تدریج اس سلجوقی سلطنت کی حدود کو محدود کرتے اور آگے بڑھتے آتے تھے۔ دوسری طرف جنوبی

ومشرقی علاقے مغلوں کی دست برد نے جدا کر لیے تھے اور وہ دم بہ دم آگے بڑھ رہے تھے۔ اس طرح سلطنت قونیہ دو پاٹوں کے درمیان پسی جا رہی تھی اور محدود ہوتے ہوتے ایک ریاست کی شکل میں تبدیل ہو گئی تھی، جس کے بہت جلد فنا ہونے کی توقع تھی۔ اس بہادر گروہ اور ان بہادر سرداروں کو دیکھ کر علاؤ الدین نے سلیمان کے بیٹے کو ایسے موقع پر جاگیر دی جو رومی سلطنت کی سرحد پر واقع تھا اور باپ کو فوج کا سپہ سالار بنا کر مغرب کی جانب مغلوں کی روک تھام پر مامور کیا۔ چند روز کے بعد ارطغرل نے رومیوں کی ایک فوج کو شکست فاش دے کر اپنی جاگیر کو رومی علاقہ کی طرف وسیع کیا اور اس حسن خدمت کے صلے میں علاؤ الدین سلجوقی نے بھی اپنی طرف سے اسی نواح میں اور علاقہ عطا کر کے ارطغرل کی طاقت اور علاقے کو بڑھا دیا اور ارطغرل کے اس طرح طاقتور ہونے سے رومی سرحد کا خطرہ بالکل جاتا رہا۔ مگر چند روز کے بعد سلیمان خان دریائے فرات کو عبور کرتے ہوئے دریا میں غرق ہو کر راہی ملک بقا ہوا۔ ارطغرل اپنے علاقے پر برابر حکمراں اور دم بہ دم اپنی طاقت کو ترقی دینے میں مصروف رہا۔ چونکہ ارطغرل عیسائیوں کے ساتھ مسلسل جنگ میں مصروف رہا اور عیسائیوں کے علاقے چھین چھین کر اپنے ملک کو وسیع کر رہا تھا، لہٰذا اس کا اس نواح میں طاقتور ہونا شاہ قونیہ کے لیے بہت کچھ اطمینان کا باعث تھا اور وہ ارطغرل کی بڑھتی ہوئی طاقت کو بہ نظر اطمینان معائنہ کرتا تھا۔

سنہ ۶۳۴ھ میں علاؤ الدین کیقباد کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا غیاث الدین کیخسرو قونیہ میں تخت نشین ہوا۔ غیاث الدین کیخسرو کو مغلوں نے اپنی بار بار کی حملہ آوری سے بہت تنگ کیا اور سنہ ۶۴۱ھ میں غیاث الدین کیخسرو نے مغلوں کو خراج دینا منظور کر لیا۔ سلطنت قونیہ کے اس طرح باج گزار ہونے کا ارطغرل پر کوئی اثر نہ پڑا کیونکہ وہ ایک ایسے صوبہ کا گورنر اور فرماں روا تھا جو بہ ظاہر مغلوں کی دست برد سے محفوظ و مامون تھا۔ مغلوں کو اس کے بعد ایشیائے کوچک کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کی فرصت بھی نہ تھی۔ سنہ ۶۵۶ھ میں چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے بغداد کی خلافت عباسیہ کا چراغ گل کیا۔

سنہ ۶۵۷ھ میں ارطغرل جاگیردار انگورہ کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام عثمان خان رکھا گیا۔ یہی وہ عثمان خان ہے جس کے نام سے ترکوں کے بادشاہوں کو سلاطین عثمانیہ کہا گیا۔ سنہ ۶۸۷ھ میں جبکہ عثمان کی عمر تیس سال کی تھی، ارطغرل نے وفات پائی اور شاہ قونیہ نے ارطغرل کا

علاقہ عثمان خان کے نام مسلم رکھ کر سند حکومت بھیج دی۔ عثمان خان کی قابلیتوں سے واقف ہو کر اسی سال غیاث الدین کیخسرو بادشاہ قونیہ نے عثمان خان کو اپنی فوج کا رئیس العسکر بنا کر اپنی بیٹی کی شادی عثمان خان سے کر دی۔ اب عثمان خان شہر قونیہ میں رہنے لگا اور بہت جلد وہ وزیر اعظم اور مدار المہام سلطنت کے مرتبہ کو پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ جمعہ کے دن قونیہ کی جامع مسجد میں عثمان خان ہی غیاث الدین کیخسرو کی جگہ پر خطبہ بھی سنانے لگا۔

عثمان خان:

سنہ ۶۹۹ھ میں غیاث الدین کیخسرو مغلوں کے ایک ہنگامہ میں مقتول ہوا۔ اس کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ صرف ایک لڑکی تھی جو عثمان خان کے عقد میں تھی۔ لہٰذا اراکین سلطنت نے عثمان خاں کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔ یوں اسرائیل بن سلجوق کی اولاد نے جو سلطنت سنہ ۴۷۰ھ میں قائم کی تھی، وہ سنہ ۶۹۹ھ میں ختم ہو کر اس کی جگہ سلطنت عثمانیہ قائم ہوئی جو ہمارے اس زمانے تک قائم رہی۔ اسرائیل بن سلجوق وہی شخص تھا جس کو سلطان محمود غزنوی کے حکم سے ہندوستان کے قلعہ کالنجر میں قید رہنا پڑا تھا۔

عثمان خان کی تخت نشینی کے وقت سلطنت قونیہ کی بہت کمزور حالت تھی اور رومیوں، نیز مغلوں کے حملوں سے اس ضعیف تر اور برائے نام سلطنت کا مٹ جانا یقینی تھا لیکن عثمان خان کے تخت نشین ہوتے ہی اس تن بے جان میں جان پڑنی شروع ہوئی، جس کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ عثمان خان کے ساتھ اور اراکین سلطنت اور فوج کے سپاہی اور رعایا سب عثمان خان کے حسن سلوک سے خوش اور اس کو محبوب رکھتے تھے۔ عثمان خان میں ایک طرف دین داری اور دوسری طرف شجاعت بہ درجہ کمال موجود تھی۔ عثمان خان نے سب سے پہلے رومیوں سے شہر قراحصار کو فتح کر کے اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس نئی سلطنت کا نیا دارالسلطنت تجویز ہونا بھی بہت ہی مبارک ومیمون ثابت ہوا۔ عثمان خان کو اپنی تخت نشینی کے بعد ہی حاسدوں اور رقیبوں کی عداوت کا اور سازشوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا تھا، جن پر وہ انجام کار غالب آیا اور سب کو طاقت کے ذریعہ سے خاموش کر دیا۔ تاہم سلجوقیوں کے پرانے خاندان کے افراد عثمان خان کی حکومت کو رشک ورقابت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس پر کوئی تعجب بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر عثمان خان کسی موقع پر بھی اپنی کمزوری یا خوف کا

اظہار کرتا تو اس کے رقیب یقیناً اس کے خلاف فوراً اٹھ کھڑے ہوتے لیکن عثمان خان نے ہر موقع پر اپنے آپ کو بے خوف اور نڈر ثابت کیا۔ چنانچہ جب عیسائیوں نے شروع ہی میں قونیہ پر حملہ آوری کے لیے فوجیں فراہم کیں تو عثمان خان نے امرائے سلطنت کو جمع کر کے مجلس مشورت منعقد کی۔ اس موقعہ پر عثمان خان کا چچا یعنی ارطغرل کا بھائی بھی جو بہت بوڑھا تھا، موجود تھا۔ اس نے اپنی رائے ظاہر کی کہ عیسائیوں کے مقابلے میں ہم کو فوج کشی نہیں کرنی چاہیے بلکہ جہاں تک ممکن ہو، صلح و آشتی کے ذریعہ سے اس جنگ کو ٹال دینا چاہیے۔ اگر جنگ برپا ہوئی تو اندیشہ ہے کہ مغلوں اور دوسرے ترک سرداروں کی فوجیں بھی عیسائیوں کے حملہ کو کامیاب بنانے کے لیے ہمارے ملک پر چڑھائیاں کر دیں گی اور ہم ان سب کا بیک وقت مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ عثمان خان نے اپنے چچا کی زبان سے یہ پست ہمتی پیدا کرنے والا مشورہ سن کر فوراً بلا تامل اپنی کمان میں تیر جوڑ کر اس بوڑھے چچا کا کام تمام کر دیا۔ اس نظارہ کو دیکھ کر کسی کو بھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ جنگ اور حملہ آوری کے خلاف رائے ظاہر کرے۔ چنانچہ عثمان خان نے حملہ کیا اور عیسائیوں کو شکست فاش دے کر قرا حصار پر قابض و متصرف ہو گیا اور اس کے بعد بہ جائے قونیہ کی جگہ قرا حصار ہی کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس کے بعد عثمان نے پیہم عیسائی علاقوں پر حملے شروع کر دیے اور ایک کے بعد دوسرا شہر فتح کرتا اور عیسائیوں کو ایشیائے کوچک سے نکالتا گیا۔

عیسائیوں کے بادشاہ قیصر قسطنطنیہ نے جب دیکھا کہ عثمان خان کا سیلاب بڑھتا ہی چلا آتا ہے تو اس نے مغلوں سے خط و کتابت اور پیام سلام شروع کر کے اس بات کی کوشش شروع کی کہ مغل مشرق کی جانب سے عثمان خان پر حملہ آور ہوں تاکہ وہ عیسائیوں کی طرف سے منہ موڑ کر مغلوں کی طرف متوجہ ہو۔ چنانچہ قیصر کو ایک حد تک اپنی کوشش میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ مغلوں نے قیصر کے ابھارنے سے عثمان خان کے ملک پر حملے شروع کر دیے مگر چونکہ عثمان خان کو عیسائیوں کے مقابلے میں پیہم فتوحات حاصل ہوئی تھیں، اس لیے اس کی فوج کے دل خوب خوب بڑھ گئے تھے اور فتوحات ہی ایسی چیز ہیں جو جنگجو قوموں میں جوش اور ہمت پیدا کر دیا کرتی ہیں۔ چنانچہ عثمان خان نے اپنے بیٹے ارخان کو جو صف شکنی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا، اپنی فوج کا ایک حصہ دے کر مغلوں کے حملے کو روکنے پر مامور کیا اور خود بقیہ فوج لے کر رومیوں پر پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ

حملہ کرنے لگا۔ جنگجو اور سپاہی پیشہ قوموں کے لیے جنگ کے ایام عید کی خوشی لے کر آیا کرتے ہیں۔ رعایا نے بھی اپنے بہادر فرماں روا کا دل سے ساتھ دیا اور ارخان نے مغلوں کے ہر ایک حملہ کو بڑی خوبی کے ساتھ ہر مرتبہ ان کو شکست دے کر پیچھے ہٹایا۔ یہاں تک کہ مغل تھک کر بیٹھ رہے اور حملہ آوری کے اس ناستودہ مسئلہ کو ترک کر دیا۔ ارخان اس طرف کا انتظام کر کے باپ سے جا ملا۔ دونوں باپ بیٹوں نے عیسائیوں کو مار مار کر پیچھے ہٹانا اور بھگانا شروع کر دیا۔ عثمان خان ایشیائے کوچک کو فتح کرتا ہوا شمال میں بحر اسود کے ساحل تک پہنچ گیا۔ ادھر ارخان نے عیسائیوں کو مغرب کی طرف بھگاتے ہوئے بروصہ کو فتح کر لیا۔ بروصہ ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کے قریب قیصر روم کا ایک زبردست شہر تھا۔ اس شہر کو جب ارخان نے فتح کیا تو عثمان خان ساحل بحر اسود تک پہنچ کر قراحصار میں سالماً غانماً واپس آ گیا تھا اور اتفاق سے بیمار تھا۔ بروصہ کی فتح کا حال سن کر عثمان خان نے فوراً بروصہ کا قصد کیا اور اپنے سرداروں کو حکم دیا کہ اگر میں بروصہ پہنچنے سے پہلے راستہ ہی میں فوت ہو جاؤں تو تم میری لاش کو بروصہ لے جا کر دفن کرنا اور وہیں میرا مقبرہ بنانا اور آئندہ میرے بیٹے ارخان کو بروصہ ہی میں رہنا اور اسی شہر کو دارالسلطنت بنانا چاہیے۔ چنانچہ عثمان خان بروصہ پہنچ کر کئی روز کے بعد فوت ہوا اور اسی شہر میں اس کی وصیت کے موافق اس کا مقبرہ بنایا گیا۔ یہ واقعہ سنہ ۷۲۶ھ کا ہے۔

عثمان خان نے مرتے وقت اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ مجھ کو اپنے مرنے کا کوئی غم اس لیے نہیں کہ تجھ جیسا لائق بیٹا میرا جانشین ہو گا۔ تجھ کو چاہیے کہ دین داری، نیکی، رحم دلی اور عدل کو کبھی ترک نہ کرو۔ رعیت کی حفاظت کرنا اور احکام شرع کو رواج دینا تیرا سب سے ضروری اور مقدم کام ہونا چاہیے۔ آخر میں اس نے بیٹے کو تاکید کی کہ بروصہ ہی کو اپنا دارالسلطنت بنایا جائے۔ اس وصیت سے بھی عثمان خان کی مال اندیشی کا بہت بڑا ثبوت ملتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ قونیہ میں ایسے افراد موجود ہیں جو کسی نہ کسی وقت میرے خاندان کی بیخ کنی پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ ادھر اس کو معلوم تھا کہ مغلوں کو مسلمانوں سے محض اسلام کی وجہ سے کوئی دشمنی نہیں اور وہ خود اسلام قبول کرتے جاتے ہیں۔ اگر دارالسلطنت قونیہ رہا تو خواہ مخواہ مغلوں اور دوسرے سرداروں کے ساتھ جھگڑے برپا رہیں گے۔ حالانکہ مسلمانوں کے لیے سب سے بہتر میدان عیسائی ممالک ہیں۔ لہٰذا بروصہ کے دارالسلطنت

ہونے سے عیسائیوں کو لازماً ایشیائے کوچک کے خیال سے دست بردار ہونا پڑے گا اور وہ درہ دانیال سے اس طرف آنے کی کبھی جرأت نہ کر سکیں گے۔ نیز بروصہ کے بادشاہوں کو بہ آسانی یورپ پر حملہ آور ہونے اور بلقان کو فتح کرنے کا موقع ملے گا۔ عثمان کا یہ خیال بہت صحیح تھا۔ اس کے جانشینوں نے اس عثمانی اصول کو مدنظر رکھا اور اسی اصول پر کار بند رہنے کا نتیجہ تھا کہ چند روز کے بعد عثمانیوں کا دارالسلطنت اورنہ یعنی ایڈریانوپل ہوا۔ جس کے بعد وہ قسطنطنیہ پر قابض ہو سکے۔

عثمان خان کی نسبت مشہور ہے کہ وہ غیر معمولی بہادری رکھتا تھا۔ جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس کے ہاتھ جبکہ وہ سیدھا کھڑا ہوتا تھا تو گھٹنوں تک پہنچ جاتے تھے۔ وہ اعلیٰ درجہ کا شہسوار اور خوبصورت شخص تھا۔ اس کی قوت فیصلہ بہت زبردست تھی۔ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ اور اہم امور کے متعلق فوراً ایک رائے قائم کر لیتا تھا اور وہی رائے درست اور صائب ہوتی تھی۔ وہ بلا کا ذہین اور ذکی تھا۔ رحم دلی اور فیاضی کی صفات میں بھی وہ خاص طور پر بلند مرتبہ رکھتا تھا۔

قونیہ کے سلجوقی بادشاہوں کے جھنڈوں پر ہلال کی شکل بنی ہوئی تھی۔ اس ہلال کے نشان کو عثمان خان نے بھی بہ دستور اپنے فوجی جھنڈوں میں قائم رکھا اور یہی ہلال کا نشان عثمان سلاطین کا قومی نشان سمجھا گیا اور آج تک وہ مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ محبوب نشان ہے۔ عثمان خان ۶۹ سال اور چند مہینے کی عمر میں ۲۷ سال کی حکومت کے بعد فوت ہوا۔ اس کے زہد واتقا کا اندازہ شاید اس طرح ہو سکے کہ مرتے وقت عثمان خان کی ذاتی ملکیت میں زرہ، تلوار اور پٹکے کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ یہی وہ تلوار ہے جو ہر عثمانی سلطان کی تخت نشینی کے وقت اس کی کمر سے باندھی جاتی رہی ہے۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ عثمان خان نے جب قونیہ کو ترک کیا تو پرانے سلجوقی خاندان کے افراد کو قونیہ کا عامل اور حکمران مقرر کر کے ان مراسم واعزازات کو ان کے لیے جائز قرار دے دیا تھا، جو سلجوقی خاندان کے لیے مختص تھے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ قونیہ میں عثمان خان نے ایک ماتحت ریاست قائم کر دی تھی، جو عرصہ تک پرانے سلاجقہ روم کے خاندان میں سلطنت عثمانیہ کی ماتحت رہی۔ اس طرز عمل سے بھی عثمان خان کی شرافت اور پاک باطنی و مآل اندیشی کا ایک ثبوت بہم پہنچتا ہے۔

❀ ...... ❀ ...... ❀

چوبیسواں باب

رومی سلطنت

عثمان خان کے بعد اس کا بیٹا ارخان تخت نشین ہوا، جو دوسرا عثمانی سلطان ہے۔ ارخان کا تذکرہ لکھنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رومی سلطنت کا مجمل تذکرہ کر دیا جائے تاکہ ان حالات اور فتوحات کو سمجھنے میں آسانی ہو جو ارخان کے عہد حکومت میں وقوع پذیر ہوئے۔

عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پونے چھ سو سال پیشتر ملک اطالیہ کے اندر سلویا نامی ایک کنواری لڑکی کے پیٹ سے دو توام لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک کا نام رومولس اور دوسرے کا نام ریموس رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں بچے مریخ دیوتا کے نطفے سے پیدا ہوئے تھے۔ سلویا نامی کنواری لڑکی، ویسٹا دیوی کے مندر کی پجارن تھی۔ جہاں مریخ دیوتا نے آ کر اس کو حاملہ کیا تھا۔[1] رومولس اور ریموس کو پیدا ہونے کے بعد کسی کشتی یا ٹوکری میں رکھ کر دریا میں ڈال دیا گیا تھا۔ پانی کی موجوں نے ان کو جنگل یا پہاڑ کے دامن میں ساحل پر ڈال دیا۔ وہاں ایک مادہ گرگ نے آ کر ان کو دودھ پلایا اور ان کی حفاظت کرنے لگی۔ اس طرح بھیڑیئے کا دودھ پی پی کر ان دونوں بچوں نے پرورش پائی۔ اتفاقاً بادشاہ کا ایک گڈریا اس طرف کو آ نکلا اور اس نے ان دونوں بچوں کو دیکھ کر اٹھا لیا اور اپنے بادشاہ کے سامنے لایا۔ بادشاہ بیگم نے ان کو محبت کے ساتھ لے کر پرورش کیا۔ بڑے ہو کر ان دونوں بھائیوں نے ایک شہر کی بنیاد رکھی۔ یہ شہر روم یا روما کے نام سے موسوم ہوا اور ان کی اولاد میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی، جو دنیا کی عظیم و مہیب سلطنتوں میں شمار ہوتی ہے۔ شہر روما آج تک بھی ملک اٹلی کا دارالسلطنت ہے مگر رومولس اور ریموس کی قائم کی ہوئی رومی سلطنت کا اب نام و نشان باقی نہیں رہا۔

یہ سلطنت جب اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی تو اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک کو مشرقی روم اور

---

[1] ایسی ''دیو مالائی'' داستانیں تاریخ میں خصوصاً باطل مذاہب اور گمراہ فرقوں کی تاریخ میں بہت سی موجود ہیں، جن کی صحت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

دوسری کو مغربی روم کہتے ہیں۔ مغربی روم کا دارالسلطنت تو شہر روما ہی رہا اور مشرقی روم کا دارالسلطنت قسطنطنیہ قرار پایا۔ مغربی روم پر شمالی یورپ اور روس کی وحشی قوموں نے بار بار حملے کر کے اس کو بے حد کمزور و ناتوان بنا دیا اور بالآخر مغربی روم کی سلطنت محدود ہو کر دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ جنیوا اور وینس میں الگ الگ سلطنتیں قائم ہوئیں اور پھر وہ بھی مختلف صورتوں میں تبدیل ہو کر معدوم ہوئیں اور ان کی جگہ نئی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ مگر مشرقی روم پر شمالی حملہ آوروں کی آفتیں بہت ہی کم نازل ہوئیں اور اس کو یورپی وحشیوں کے ہاتھ سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ قسطنطنیہ کے بادشاہ کا شہر روما پر بھی عمل دخل ہو گیا تھا۔ عرب اور ایران والے مغربی روم سے ناواقف تھے، جس کے نام پر سلطنت روم موسوم تھی۔ وہ مشرقی یورپ یعنی قسطنطنیہ کے فرماں رواؤں نے عیسائی مذہب قبول کر کے اس کی اشاعت شروع کی تو یورپ کی وہ تمام قومیں جو عیسائی مذہب قبول کرتی تھیں، قسطنطنیہ کے بادشاہ کو عزت و عظمت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ قریباً تمام یورپ عیسائی ہو گیا اور اس کے مقبوضہ علاقے میں عیسوی مذہب پھیل گیا تو عرب اور ایران کے لوگ ہر ایک عیسائی کو رومی کے نام سے یاد کرنے لگے۔ قسطنطنیہ کے قیصر کی سلطنت چونکہ یونان کے بادشاہی کھنڈروں پر تعمیر ہوئی تھی اور قیصر روم سکندر یونانی کے مقبوضہ ممالک کا مالک تھا، لہٰذا قسطنطنیہ کی سلطنت کو یونانی سلطنت بھی کہا جاتا ہے۔ اسی لیے مورخین نے رومی اور یونانی دونوں الفاظ مترادف اور ہم معنٰی سمجھ کر استعمال کیے ہیں۔ قیصر قسطنطنیہ کی سلطنت میں چونکہ ایشیائے کوچک اور شام کا ملک بھی شامل تھا، اس لیے اسلام کے ابتدائی زمانے میں ایشیائے کوچک کو روم کا ملک کہا جاتا تھا۔ ملک شام سے تو عیسائی حکومت بہت جلد اٹھا دی گئی تھی مگر ایشیائے کوچک میں قیصر روم کی حکومت عہد اسلامیہ میں بھی عرصہ دراز تک قائم رہی۔ اس لیے ایشیائے کوچک کو عام طور پر ملک روم کہا جانے لگا۔ جب ایشیائے کوچک کے ایک حصہ میں سلجوقیوں کی ایک سلطنت قائم ہوئی تو اس کو ملک روم کی سلجوقی سلطنت کہا گیا اور اس سلطنت کے سلاطین سلاجقہ روم کے نام سے پکارے گئے۔ ان سلاجقہ روم کے بعد عثمان خان اول نے اپنی سلطنت ایشیائے کوچک میں قائم کی اور قریباً تمام ایشیائے کوچک پر قابض ہو گیا تو وہ بھی سلطان روم کہلایا، پھر اس کے بعد آج تک عثمانی سلاطین سلطان روم ہی کہلائے جاتے تھے۔

قسطنطنیہ کے قیصر نے جب عیسوی مذہب قبول کیا تو اس عیسوی سلطنت اور ایران کی مجوسی

سلطنت میں بار بار لڑائیاں ہوئیں۔ ان لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ملک عرب میں اسلامی سلطنت نے قائم ہو کر مجوسیوں اور عیسائیوں دونوں کو مبہوت کر دیا۔ مجوسی سلطنت تو پاش پاش ہو کر معدوم ہو گئی لیکن قسطنطنیہ کی عیسائی سلطنت عرصہ دراز تک قائم رہی۔ ہم جس زمانے کی تاریخ بیان کر رہے ہیں، اس زمانے میں بھی یہ عیسائی سلطنت موجود ہے۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد سعادت مند میں شام، فلسطین اور مصر سے قیصر روم کی عسائی حکومت بالکل مٹا دی گئی تھی۔ اس کے بعد خلفائے بنو امیہ اور خلفائے بنو عباس کے زمانے میں قیصر روم کے ساتھ برابر لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جس کا مختصر طور پر خلفاء کے حالات میں کہیں کہیں ذکر آتا رہا ہے۔ ایشیائے کوچک کا ایک ملک قریباً سات سو سال سے برابر مسلمانوں اور عیسائیوں کا میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ کسی زمانے میں مسلمان، عیسائیوں کو دھکیلتے ہوئے درہ دانیال اور بحیرہ مارموار تک لے جاتے تھے اور کبھی عیسائی، مسلمانوں کو ریلتے ہوئے ایران و کردستان تک چلے آتے تھے۔ عیسائیوں کی اس سلطنت کو قدرتی طور پر مسلمانوں کے مقابلے میں دیر تک زندہ رہنے کا اس لیے موقع مل گیا کہ آپس کی نااتفاقیوں اور خانہ جنگیوں سے مسلمانوں کو ایسا موقع میسر ہی نہ آیا کہ وہ اس عیسائی رومی سلطنت کا قصہ پاک کرتے۔

اس رہے سہے کام کو ترکان عثمانی نے پورا کیا اور اسی لیے وہ عالم اسلام کے محبوب و مقتدا سمجھے گئے۔ ہم جس زمانے کا ذکر کر رہے ہیں، یہ وہ زمانہ ہے کہ یورپ کے صلیبی سیلاب شام و فلسطین کے میدانوں میں بار بار موجزن ہو چکے ہیں۔ عیسائیوں کے مجاہدین مسلمانوں کے مقابلے میں شکست پا پا کر اور مسلمانوں کی علمی و اخلاقی ترقیات سے متاثر ہو ہو کر یورپ میں واپس جا کر اور یورپ کے تمام ملکوں میں پھیل کر عیسائی ممالک کو بیدار اور ترقی کی طرف مائل و متوجہ کر چکے ہیں۔ اس زمانہ کی نسبت عیسائیوں کا یہ کہنا کہ رومی سلطنت بہت ہی غافل اور کمزور تھی، سراسر غلط ہے۔ عیسائیوں میں مسلمانوں کی مخالفت کے لیے اتفاق اور جوش بہ درجہ اتم پیدا ہو چکا تھا۔ قسطنطنیہ کا دربار سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا۔ قسطنطنیہ کی سلطنت نسبتاً سب سے زیادہ طاقتور اور فنون جنگ سے واقف اور مقابلہ کی اہلیت رکھتی تھی۔ اس سے پہلے زمانے میں یورپ کی دوسری سلطنتیں قسطنطنیہ کی سلطنت سے رقابت بھی رکھتی تھیں لیکن صلیبی لڑائیوں کے بعد تمام یورپ کی ہمدردی قسطنطنیہ کے قیصر سے متعلق تھی۔ قیصر قسطنطنیہ کے تعلقات صرف یورپ کے سلاطین تک محدود نہ تھے، بلکہ وہ

مسلمانوں کے ہر ایک دشمن کو اپنا دوست سمجھ کر اس سے محبت و مودت کے تعلقات رکھتا تھا۔ چنگیز خان اور اس کی اولاد کو فاتح اور غیر مُسلم دیکھ کر قیصر قسطنطنیہ کے فرماں روا کو اس میں بھی تامل نہ تھا کہ وہ اپنے مدمقابل اور حریف کو اپنی بیٹی دے کر اپنا موافق بنانے کی کوشش کرے اور اس کے خطرے سے محفوظ ہو جائے اور اپنا کام نکال لے۔ مسلمانوں کی جمعیت میں پھوٹ ڈال کر ان کو کمزور و برباد کر دینے کی حکمت عملی کچھ ہمارے موجود زمانے کے عیسائیوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس حکمت عملی پر قیصر قسطنطنیہ نے بارہا عمل کیا ہے اور وہ ہر زمانے میں نہایت چوکس اور مستعد نظر آیا ہے۔[1] اگر مسلمان آپس کی خانہ جنگی کو چھوڑ دیں اور متفق ومتحد ہو کر دشمنان اسلام کے مقابلے پر مستعد ہو جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت مسلمانوں کے مقابلے پر قائم نہیں رہ سکتی اور اس کو لازماً مغلوب ومحکوم ہی ہونا پڑے گا۔ عثمان خان اور اس کی اولاد نے اس حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اسی لیے انہوں نے خانہ جنگی اور اپنے مسلمان رقیبوں کے مقابلے سے اپنا پہلو ہمیشہ بچایا اور اپنے آپ کو حتی المقدور عیسائیوں کے مقابلے کے لیے مستعد رکھا۔ چنانچہ وہ اس عظیم الشان کام کو انجام دے سکے جو ان کے مقدمین سے انجام پذیر نہ ہو سکا۔ اب ہم کو عثمان خان کے بیٹے ارخان کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

ارخان:

عثمان خان کا بڑا بیٹا علاؤ الدین تھا اور چھوٹا ارخان تھا۔ علاؤ الدین اگرچہ علم وفضل، عقل و بصیرت اور ہمت و استقلال میں بے نظیر تھا مگر ارخان کے فوجی اور جنگی کارنامے اس امر کی سب سے بڑی سفارش ہوئے کہ عثمان خان نے ارخان کو اپنا جانشین تجویز کیا۔ عثمان خان کی وفات کے بعد قوی احتمال ہو سکتا تھا کہ دونوں بھائی تخت وتاج کے لیے آپس میں لڑیں گے۔ مگر بڑے بھائی علاؤ الدین نے جو ہر طرح سلطنت کی قابلیت رکھتا تھا، اپنے بڑے ہونے کے حق فائق کو باپ کی وصیت کے مقابلے میں بالکل ہیچ سمجھا اور نہایت خوشی کے ساتھ بھائی کو تخت وتاج کی مبارک باد دے کر اس کے ہاتھ پر اطاعت کی بیعت کی اور اپنے لیے صرف اسی قدر کافی سمجھا کہ بروصہ کے

---

[1] عیسائیوں کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو زیر کرنے اور انہیں اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ہمیشہ سازشوں اور دھوکہ دہی سے کام لیا ہے۔ یہ باطل کی پہچان ہے کہ وہ دھوکہ وفریب اور سازشوں سے کام لے کر لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ حق اور طاقتور دلائل اپنا آپ منواتے ہیں اور یہ چیزیں عیسائیوں کے پاس موجود نہیں۔

متصل اس کو صرف ایک گاؤں گزارہ کے لیے بہ طور جاگیر دے دیا جائے۔ ارخان بھی اپنے بھائی کی قابلیت اور پاک باطنی سے واقف تھا۔ اس نے بہ منت عرض کیا اور اراکین سلطنت کو سفارشی بنایا کہ وزارت قبول فرما لیجیے۔ علاؤالدین کے لیے اپنے چھوٹے بھائی کا وزیر بننا موجب عزت نہ تھا لیکن اس نے بھائی کے اصرار پر اس عہدے کو قبول کر لیا اور اس خوبی اور نیک نیتی کے ساتھ مہمات سلطنت کو انجام دیا کہ دنیا کے پاک باطن اور عالی دماغ وزیروں کی فہرست میں اس کا نام اگر لکھا جائے تو کچھ بے جا نہیں۔

سلطان ارخان نے تخت نشین ہوتے ہی ایک سال کے اندر تمام ایشیائے کوچک کو فتح کر کے درہ دانیال کے ساحل تک اپنی سلطنت کو وسیع کر لیا اور ایشیائے کوچک کو بہ تمامہ عیسائی حکومت سے پاک کر کے اپنے بھائی علاؤالدین کے مشورے سے اپنی مملکت میں ایسے آئین وقوانین جاری کیے جس سے سلطنت کو استحکام حاصل ہوا۔ اس وقت تک یہ دستور تھا کہ بہادر و جنگجو سرداروں کو ملک کے چھوٹے چھوٹے قطعات بطور جاگیر دے دیے جاتے تھے۔ ان جاگیروں کا سرکاری محصول یا لگان یہی تھا کہ ضرورت کے وقت بادشاہ کے طلب کرنے پر مقررہ تعداد کی فوج لے کر بادشاہ کے ساتھ میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے نظر آتے اور جو سردار ایک وقت میں زمیندار یا جاگیردار ہوتے تھے، دوسرے وقت میں وہی سپہ سالار نظر آتے تھے۔ ایشیائے کوچک میں پہلے ہی سے مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد تھی اور ان میں ترک خاندانوں کا زیادہ حصہ شامل تھا کیونکہ معتصم باللہ عباسی کے زمانے سے ایشیائے کوچک کے اندر سرحدی شہروں میں ترکوں کو آباد کرنے کا سلسلہ جاری کر دیا گیا تھا۔ سلجوقیوں کے عہد حکومت میں بہت سے قبائل ترکستان سے آ آ کر ایشیائے کوچک میں آباد ہوئے تھے۔ سلاجقہ روم کی حکومت نے بھی اپنے بہت سے ہم وطنوں یعنی ترکوں کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ ترکان غز کی ترک تاز اور مغلوں کے حملوں نے بھی خراسان، ایران اور عراق کی طرف سے ترکوں کو اس طرف ریل دیا تھا۔ اس طرح ایشیائے کوچک کا تمام مشرقی حصہ جو اکثر مسلمانوں کے قبضہ میں رہا تھا، ترک قبائل سے پر تھا۔ صرف شمالی و مغربی ایشیائے کوچک میں عیسائیوں کی کثرت تھی۔

ینگ چری فوج:

اب جبکہ شمالی و مغربی حصہ بھی عیسائی حکومت سے پاک ہو گیا تو تمام ایشیائے کوچک میں ترکان

عثمانی کے ہوا خواہ اور ان کے ہمراہی مذکورہ جاگیر داریوں کے ذریعہ سے پھیل گئے اور عثمانی ترکوں نے ایسے وقت میں ایشیائے کوچک پر کامل تسلط پایا جبکہ اس ملک میں ان کے لیے بے حد موزونیت اور صلاحیت پیدا ہو چکی تھی۔ لڑائیوں میں بہت سے عیسائی قید ہو کر آئے تھے اور بہت سے عیسائی رعایا بن کر ذمیوں کی حیثیت سے ایشیائے کوچک میں زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ وزیر اعظم علاؤالدین نے بھائی کو سمجھایا کہ بڑے بڑے جاگیر دار جو بڑی بڑی فوج کے مالک ہوتے ہیں، سلطنت کے لیے موجب خطر بھی بن جایا کرتے ہیں اور ہماری مملکت کے جاگیر دار عیسائی رعایا، عیسائی ہمسایہ سلطنت کی ریشہ دوانیوں کے شکار بن کر ہماری مخالفت پر آمادہ ہو جانے کی استعداد اور بھی زیادہ رکھتے ہیں۔ اس لیے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی قیدیوں اور عیسائی رعایا میں سے نوجوان اور نو عمر لڑکوں کو لے کر سلطنت خود ان کی پرورش اور تربیت کی ذمہ دار بنے اور اس طرح ان کو اسلامی تعلیم دے کر اور مسلمان بنا کر ان کی ایک فوج بنائی جائے۔ یہ فوج خاص شاہی فوج سمجھی جائے۔ ان لوگوں سے بغاوت کی مطلق توقع نہ ہوگی اور ان نو مسلم نوجوانوں کے عزیز و اقارب بھی یقیناً سلطنت کی مخالفت پر ہرگز آمادہ نہ ہوں گے بلکہ ان کو مسلمان ہونے کی بہترین ترغیب ہو سکے گی۔ چنانچہ جب اس پر عمل درآمد شروع ہوا اور کئی ہزار عیسائی لڑکے لے کر ان کی تعلیم شروع کی گئی تو ان لڑکوں کی عزت و عظمت اور شان و شوکت دیکھ کر وہ سلطان عثمانی کے بیٹے سمجھے جاتے تھے۔ عیسائیوں نے خود کوششیں کر کے اپنے نو عمر لڑکوں کو داخل کرنا شروع کر دیا۔ ابتداء میں جب قریباً دو ہزار نوجوان تعلیم و تربیت پا کر فوجی تعلیم سے فارغ ہو کر سلطان کے باڈی گارڈ قرار دیے گئے تو سلطان ان کو لے کر ایک عالم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے دعا چاہی۔ اس عالم نے ایک جوان کے شانہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس فوج کے لیے دعائیہ کلمات کہے جو کامیابی کے لیے ایک نیک فال سمجھی گئی۔ یہ سب کے سب نہایت سچے پکے مسلمان اور سب سے زیادہ اسلحہ جنگ سے آراستہ اور شاہی فرزند قرار دیے گئے تھے۔ اسی فوج کا نام ینگ چری فوج مشہور ہے۔ ان لوگوں کو اپنے عزیزوں، رشتہ داروں سے کوئی تعلق نہیں رہتا تھا اور وہ سب کے سب اسلام کے سچے پکے خادم ہوتے تھے۔ اس طرح ہر سال ایک ہزار عیسائی بچے قیدیوں اور ذمیوں میں سے انتخاب کر کے داخل کیے جاتے اور تعلیم و تربیت کے بعد شاہی باڈی گارڈ میں شامل ہو جاتے تھے۔ اس عجیب و غریب قسم کی فوج نے سرداروں اور جاگیرداروں کی بغاوت کے خطرے کو سلاطین ترکی کے لیے مٹا دیا تھا۔

دوسری طرف وزیراعظم علاؤالدین نے ملک میں جا بہ جا مدارس جاری کیے۔ عیسائیوں کو قریباً وہی حقوق عطا کیے جو مسلمانوں کو حاصل تھے۔ تجارت کے لیے سہولتیں بہم پہنچائیں، گرجوں کے لیے معافیاں اور جاگیریں عطا کیں۔ رعایا کے آرام اور سہولت کو ہر حال میں مقدم رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی لوگ بہ خوشی خاطر اسلام میں داخل ہونے لگے۔ کیونکہ ان کو اطمینان کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ آج کل لوگ ینگ چری فوج کی نسبت یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ عیسائیوں پر ایک ظالمانہ ٹیکس تھا کہ ان کے بچوں کو ان سے زبردستی چھین کر مسلمان بنایا اور پھر عیسائیوں ہی کے مقابلہ پر استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔ ینگ چری فوج جس شان و شوکت کے ساتھ رہتی اور جس طرح سلطان کی منظور نظر تھی، اس کو دیکھ دیکھ کر عیسائیوں کو خود خواہش پیدا ہوتی تھی کہ ہم اپنے بیٹوں کو سلطانی تربیت گاہ میں داخل کر دیں کیونکہ داخل ہونے کے بعد ہمارے بچوں کو کسی قسم کا کوئی آزار نہیں پہنچایا جا سکتا اور ان کی طرف کوئی آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ سالانہ بھرتی کے موقع پر بلا جبر و کراہ یہ تعداد پوری ہو جاتی تھی اور بعض امیدواروں کو واپس کرنا پڑتا تھا۔

یہ ینگ چری فوج ایک جدید فوج تھی۔ اس کے علاوہ وہ قدیمی دستور بہ دستور موجود تھا۔ اس فوج میں بھی علاؤالدین وزیر نے بہت اصلاحیں کیں۔ فوج کی وردیاں مقرر کیں، ان کو تعداد کے اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم کر کے پابند آئین بنایا۔ صد پانصد، ہزار وغیرہ سردار مقرر کیے۔ پیادہ اور سواروں کی الگ الگ فوجیں بنائیں۔ ان کے علاوہ رضا کاروں کے لیے بھی قانون بنایا۔ اسی طرح مال کے محکمے میں اصلاحیں کیں۔ شہروں اور قصبوں میں فوج داری اور فصل خصومات کی کچہریاں قائم کیں۔ پولیس اور میونسپلٹی کے محکموں کی طرف بھی اس کی خصوصی توجہ مبذول تھی۔ ملک کے ایسے قبیلوں کو جو آوارہ گردی و قزاقی کے شوقین تھے، وزیر علاؤالدین نے ایسے کام پر لگا دیا جو ان کے لیے بہت ہی دل پسند کام تھا یعنی اس نے ان میں بھی ایک نظام پیدا کر کے ان کی فوجیں اور پلٹنیں بنا دیں۔ جن کا کام یہ تھا کہ جس ملک پر سلطنت عثمانی کی فوجیں حملہ آور ہوں، یہ پلٹنیں میدان جنگ کے اطراف اور دشمن کے ملک میں پھیل کر غارت گری کا سلسلہ جاری کر کے حریف کو مرعوب و خوف زدہ بنائیں۔

وزیراعظم علاؤالدین نے محکمہ تعمیرات کی طرف خاص طور پر توجہ مبذول فرمائی۔ جا بہ جا شہروں،

قصبوں اور قریوں میں مسجدیں، سرائیں، مدرسے اور شفا خانے تیار کرائے۔ بڑے بڑے شہروں میں عالی شان شاہی محلات، دریاؤں پر پل اور سڑکوں پر حفاظتی چوکیاں بنوائیں، نئی سڑکیں نکلوائیں تاکہ تجارت اور فوجوں کی نقل و حرکت میں آسانی ہو۔ غرض کہ ایشیائے کوچک کی آبادی و سرسبزی اور سلطنت عثمانیہ کے قیام و استحکام کے لیے ہر ایک ممکن تدبیر کو کام میں لایا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تک یہ ملک ترکوں کی جائے پناہ بنا ہوا ہے اور چھ سو سال گزرنے کے بعد بھی اس ملک کی حالت یہ ہے کہ وہاں سے اسلام اور ترکوں کو نکال دینے کی جرأت کسی قوم اور کسی سلطنت میں نظر نہیں آتی۔[1]

ارخان کی سلطنت کے تذکرے میں اس وزیر باتدبیر کے کارناموں کا خصوصی تذکرہ نہ کرنا ایک ظلم تھا اور چونکہ وہ ارخان کا بڑا بھائی تھا، اس لیے پہلے اسی کے کارناموں کی طرف اشارہ کرنا ضروری تھا۔ اب ارخان کی سلطنت کے واقعات پڑھو کہ اس کی تخت نشینی کے وقت اینڈرونیکوس نامی قیصر قسطنطنیہ تھا۔ وہ اپنے تمام ایشیائی مقبوضات چھنوا کر ایشیائے کوچک سے بالکل مایوس ہو گیا اور اس کو اس بات کا خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں ترک سمندر کو عبور کر کے یورپی ساحل پر نہ اتر آئیں۔ مگر ارخان نے یورپ کی سرزمین پر قدم رکھنے سے زیادہ اس کام کو زیادہ ضروری سمجھا کہ اپنے بھائی علاؤالدین کی اصلاحوں اور ایجادوں کو ایشیائے کوچک میں اچھی طرح جاری اور رائج کر کے فائدہ اٹھائے اور اپنے مقبوضہ ملک میں خوب مضبوط ہو جائے۔ چنانچہ اس نے قریباً بیس سال تک اپنی تمام تر ہمت اصلاح ملک اور ملک داری کے کاموں میں صرف کی۔ اگر باقی ترک سلاطین بھی ارخان اور اس کے بھائی علاؤالدین کے نومفتوحہ ملکوں کو اسی طرح درست بنانا ضروری سمجھتے تو جس طرح ایشیائے کوچک آج تک ترکوں کا مامن و امید گاہ بنا ہوا ہے، مصر، بلقان، حجاز، طرابلس وغیرہ بھی ان کے مامن و امید گاہ ہوتے۔

قیصر قسطنطنیہ کے پوتے اور شہزادہ کنٹاکوزینس نے قیصر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ یہ سنہ ۷۳۹ھ کا واقعہ ہے۔ عیسائیوں کی اس خانہ جنگی میں قدرتی طور پر عثمانیوں کے لیے ایک کامیابی کی صورت پیدا ہوئی۔ صوبہ ایدن کے ترکی گورنر شہزادہ عمر بے سے باغیوں نے امداد طلب کی۔ اس

---

[1] ترکی کی موجودہ حالت بہت افسوس ناک ہے۔ یورپ کی تہذیب وہاں چھائی ہوئی ہے۔ اسلام پر پابندی ہے۔ پارلیمنٹ میں اسلام کی طرف پیش رفت کرنے والا کوئی بل پیش یا پاس نہیں ہوسکتا کیونکہ فوج ایکشن لے لیتی ہے اور حکومت یا پارلیمنٹ معزول کر دی جاتی ہے۔ کم و بیش یہ صورت حال تقریباً تمام مسلم ممالک میں ہے۔

نے ۳۸۰ جہازوں کا بیڑہ اور ۲۸ ہزار فوج لے کر سمندر کو عبور کیا اور یورپ میں داخل ہو کر شہر ڈیموٹیکا پر سے محاصرہ اٹھا دیا۔ اس کے بعد دو ہزار چیدہ سوار لے کر سردیا میں یلغار کرتا ہوا داخل ہوا۔ قیصر نے عمر بے یا عمر پاشا کو زر کثیر دے کر باغیوں کی امداد سے باز رکھا اور ترکی گورنر عمر پاشا یورپ واپس ہو کر اپنے صوبہ میں چلا آیا۔ مگر اس کی اس یلغار کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیصر اینڈرونیکس کا پوتا اس قدر بے قابو ہو گیا کہ اس نے قیصر کو تخت سلطنت سے اتار کر خود تخت قیصری حاصل کر لیا۔ سنہ۷۴۲ھ میں اس کے فوت ہونے پر جان پلا لوگس قسطنطنیہ کے تخت پر متمکن ہوا مگر سنہ۷۴۸ھ میں کنٹا کوزینس نے جان پلالوگس کو معزول کر کے تخت حکومت حاصل کر لیا اور سنہ۷۹۴ھ تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے بعد دو اور قیصروں نے سنہ۸۵۷ھ تک حکومت کی۔ جس کے بعد قسطنطنیہ ترکوں کے قبضہ میں آ گیا۔

قیصر کنٹا کوزینس (کینٹکوزینی) نے تخت قیصری پر قدم رکھتے ہی سلطان ارخان کو ایشیائے کوچک کا سلطان اعظم تسلیم کر لیا اور ترکوں کی ترک و تاز سے یورپ علاقے کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری سمجھا کہ سلطان سے خصوصی تعلقات پیدا کیے جائیں۔ چنانچہ قیصر نے سلطان ارخان کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا کہ میں اپنی نہایت خوبصورت و حسین بیٹی تھیوڈورا کی شادی آپ کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔ قیصر کو معلوم تھا کہ سلطان کی عمر ساٹھ سال کی اور اس کی بیٹی نوجوان ہے۔ نیز وہ مذہب کے اختلاف سے بھی بے خبر نہ تھا۔ سلطان نے قیصر کی اس درخواست کو رد نہیں کیا اور بڑی دھوم دھام کے ساتھ ملکہ تھیوڈورا کی شادی سلطان ارخان کے ساتھ ہوئی۔ سلطان خود قسطنطنیہ گیا اور ملکہ کو بیاہ کر لایا۔ اس شادی کے بعد قیصر کو اطمینان ہو گیا کہ اب ترک میرے ملک پر حملہ آور نہ ہو سکیں گے اور میں اپنے آپ کو طاقتور بنانے کا بہ خوبی موقع پا سکوں گا۔ مگر اس کے آٹھ سال بعد ایک عجیب صورت ترکوں کے لیے یورپ میں داخل ہونے کے بعد پیدا ہوئی۔ سنہ۷۵۶ھ میں وینس اور جنیوا دونوں زبردست بحری طاقتیں تھیں اور ان دونوں نے تمام بحر روم پر اپنا قبضہ و اقتدار قائم رکھا تھا۔ جنیوا والوں کا علاقہ قیصر قسطنطنیہ کے مقبوضات سے متصل تھا۔ اس لیے قیصر قسطنطنیہ کو جنیوا والوں سے سخت نفرت و عداوت تھی اور وہ وینس والوں کی کامیابی کا خواہاں تھا۔ وینس والے بھی قیصر قسطنطنیہ کے ہوا خواہ و ہمدرد تھے۔ ادھر ارخان کو وینس والوں سے اس لیے نفرت تھی کہ وہ ایشیائے کوچک کے جنوبی ساحل پر اکثر باعث تکلیف ہوتے رہتے اور سلطان ارخان کی حکومت و سلطنت کو بہ نظر حقارت دیکھتے تھے۔ اس نفرت کا لازمی نتیجہ تھا کہ سلطان ارخان جنیوا والوں کا ہمدرد ہوا۔ چنانچہ جنیوا والے

بھی سلطان ارخان کے ساتھ دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ اتفاقاً آبنائے باسفورس کے قریب وینس اور جنیوا والوں میں معرکہ کا بازار گرم ہوا۔ اس طرف کے ساحلی صوبہ کا عامل و گورنر سلطان ارخان کا بیٹا سلیمان خان تھا۔

ایک روز سلیمان خان جنیوا والوں کی ایک کشتی میں صرف چالیس آدمیوں کے ہمراہ سوار ہو کر رات کے وقت درہ دانیال کو عبور کر کے یورپی ساحل پر اترا اور ساحل کے اس قلعہ کو جو وینس والوں کے لیے موجب تقویت تھا، فتح کر لیا۔ اس کے بعد فوراً کئی ہزار ترک اس قلعہ میں اپنے شہزادے کے پاس پہنچ گئے، جس سے جنیوا والوں کو بڑی مدد پہنچی۔ یہ حال معلوم کر کے قیصر قسطنطنیہ کو سخت ملال ہوا۔ وہ یہ ارادہ ہی کر رہا تھا کہ سلطان ارخان کو لکھے کہ سلیمان کو قلعہ چھوڑ دینے کا حکم دیں کہ اتنے میں خود قیصر کے دارالسلطنت میں اس کے دوسرے داماد نے علم بغاوت بلند کیا اور قیصر کو اپنا دارالسلطنت بچانا دشوار ہو گیا۔ اس نے فوراً سلطان ارخان سے امداد طلب کی۔ سلطان ارخان نے اپنے بیٹے سلیمان خان کو لکھا کہ روپیہ لے لو اور یہ قلعہ چھوڑ کر واپس چلے جاؤ۔ سلیمان خان اس پر آمادہ تھا کہ اتنے میں سخت زلزلہ آیا اور شہر گیلی پولی کی فصیل گر گئی اور شہر والے زلزلہ سے خائف و ترساں ہوئے۔ اس زلزلہ کو تائید غیبی سمجھ کر عضدی بیگ اور غازی فاضل دو سرداروں نے جو سلیمان خان کے ہمراہ تھے، گری ہوئی فصیل کو طے کر کے اور شہر میں داخل ہو کر گیلی پولی پر قبضہ کر لیا۔ گیلی پولی پر قبضہ کرنے کے بعد سلیمان خان نے فوراً فصیلوں کی مرمت کرائی اور ایک مضبوط ترکی فوج وہاں قائم کر دی۔ قیصر کو جب یہ خبر پہنچی تو اس نے ارخان کو شکایت لکھی۔ ارخان نے جواب میں لکھا کہ میرے بیٹے نے گیلی پولی کو بہ زور شمشیر فتح نہیں کیا بلکہ زلزلہ کے اتفاقی حادثہ نے اس کے لیے شہر پر قبضہ کرنے کا موقع پیدا کر دیا ہے اور میں اس کو وہاں سے واپس بلانے کے لیے لکھوں گا اور اصل واقعات کی بھی تحقیق کروں گا۔ قیصر کو چونکہ بار بار سلطان ارخان سے مدد طلب کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی اور خانگی جھگڑے ان ایام میں اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیے ہوئے تھے، لہٰذا قیصر نے گیلی پولی کے تخلیہ پر پھر اصرار نہیں کیا اور سلیمان خان نے اس کو نہیں چھوڑا۔ گیلی پولی کا قبضہ سلیمان خان کے لیے بھی بے حد ضروری تھا کہ وینس والوں کی دست برد سے ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کو محفوظ رکھنے میں وہ بہت معاون تھا۔ یہ واقعہ سنہ ۷۵۷ھ کا ہے۔ اس کے دو سال بعد سنہ ۷۵۹ھ میں ارخان کا بیٹا سلیمان خان باز کے شکار میں گھوڑے سے گر کر فوت ہوا۔

سلیمان خان بڑا ہونہار، بہادر اور عقلمند شہزادہ تھا۔ اس کے فوت ہونے کا ارخان کو سخت صدمہ ہوا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو ارخان کے بعد تخت نشین سلطنت ہوتا۔ اس صدمہ جان کاہ نے ارخان کو بہت مضمحل کیا اور وہ سنہ۷۶۱ھ میں ۳۸ سال سلطنت کرنے کے بعد ۷۵ سال کی عمر میں فوت ہوا۔

ارخان نے اپنے باپ کی وصیت اور حکمت عملی پر خوب احتیاط کے ساتھ عمل کیا۔ اس نے اپنے باپ کی قائم کی ہوئی سلطنت کو وسعت دے کر یورپ کے ساحل تک پہنچا دیا۔ ارخان کی تمام تر توجہ یورپ کی جانب مائل تھی۔ اس کا ایک ثبوت یہ واقعہ بھی ہے کہ جب اس کے بیٹے سلیمان خان کا بروصہ کے قریب باز کے شکار میں گھوڑے سے گر کر انتقال ہوا تو اس نے سلیمان خان کو بروصہ میں دفن نہیں کیا بلکہ اس کی لاش کو درہ دانیال کے اس طرف ساحل یورپ میں جو سلیمان خان کا فتح کیا ہوا عثمانیہ سلطنت کا مقبوضہ تھا، لے جا کر دفن کیا تاکہ ترکوں کو ساحل یورپ کو چھوڑنے اور وہاں سے پیچھے ہٹنے کا خیال پیدا نہ ہو۔

مراد خان اوّل:

اپنے بڑے بیٹے سلیمان خان کی وفات کے بعد سلطان ارخان نے اپنے چھوٹے بیٹے مراد خان کو اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ چنانچہ ارخان کی وفات کے بعد مراد خان جس کی عمر اس وقت چالیس سال کی تھی، سنہ۷۶۱ھ میں تخت نشین ہوا۔ مراد خان کی خواہش یہی تھی کہ یورپ میں اپنی سلطنت کو وسعت دے لیکن تخت نشینی کے بعد ہی قرمان کی ترکی سلجوقی ریاست کی بغاوت فرو کرنے میں اس کو ایشیائے کوچک کے مشرقی علاقے کی طرف مصروف رہنا پڑا۔ اس کے بعد سنہ۷۶۲ھ میں اپنی فوج لے کر ساحل یورپ پر اترا اور ایڈرنوایل (اورنہ) کو فتح کرکے اپنا سلطنت بنایا۔ اس وقت یعنی سنہ۷۶۳ھ سے فتح قسطنطنیہ تک جو سلطان محمد خان ثانی کے عہد میں ہوئی، ایڈریانوپل سلطنت عثمانیہ کا دارالسلطنت رہا۔ ایڈریانوپل کی فتح کا حال سن کر بلگیریا اور سردیا والوں کو فکر پیدا ہوئی۔ قسطنطنیہ کے قیصر نے پوپ روم کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ مقدس جنگ کا وعظ کریں اور مسلمانوں کی روک تھام کے لیے فوجیں بھیجیں۔ چنانچہ پوپ نے فوجیں روانہ کیں۔ ادھر ہنگری اور بوسنیا وغیرہ کے عیسائی سلاطین بھی سردیا اور بلگیریا کی طرح مستعد ہوگئے اور ان متحدہ عیسائی افواج نے سنہ۷۶۵ھ میں ایڈریانوپل کی طرف کوچ کیا۔ مراد خان نے اپنے سپہ سالار لالہ شاہین نامی کو بیس

ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ ایڈریانوپل سے دو منزل آگے عیسائی لشکر عظیم سے، جس کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی تھی، مقابلہ ہوا۔ اس معرکہ میں عیسائیوں کی اس متحدہ افواج نے مٹھی بھر مسلمانوں سے شکست فاش کھائی اور فرار کی عار کو قرار پر ترجیح دے کر بھاگتے ہوئے بہت سے مسلمانوں کی تلواروں سے مقتول اور بہت سے اسیر و دست گیر ہوئے۔ لالہ شاہین نے آگے بڑھ کر بہت سا ملک فتح کیا اور تھریس درومیلیا کے صوبوں میں فوجی جاگیرداری کے قدیمی دستور کے موافق اپنے ہم قوم ترکوں اور اپنی حکومت کو مستحکم بنانے میں مصروف رہا۔ جنگی قیدیوں اور عیسائی رعایا کے نو عمر لڑکوں کے ذریعہ سے ینگ چری فوج میں بھی اضافہ ہونے لگا۔

عیسائیوں نے جب یہ دیکھا کہ ترکی سلطان نے اپنی حکومت کو خوب مضبوط بنا کر ایڈریانوپل میں مستقل طور پر طرح اقامت ڈال دی ہے تو سنہ ۷۷۸ھ میں انہوں نے پھر سلطان مراد خان کے خلاف یورپ کی تمام طاقتوں کو متحد کیا۔ چنانچہ سردیا، بلگیریا، ہنگری، بوسنیا، پولینڈ، قسطنطنیہ، پوپ روم کی فوجیں سلطان مراد خان اور سلطنت عثمانیہ کو نیست و نابود کرنے کے لیے فراہم و مجتمع ہوئیں۔ مسلمانوں کی فوج اس مرتبہ بھی عیسائی لشکر کے مقابلہ میں پانچویں چھٹے حصے کے برابر تھی۔ اس لڑائی میں عیسائیوں کو حسب دستور شکست فاش ہوئی۔ سردیا کے بادشاہ نے بارہ من پختہ چاندی سالانہ اور عندالطلب ایک ہزار سواروں کا لشکر مدد کے لیے بھیجنے کا وعدہ کر کے اپنی جان بچائی اور بلگیریا کے بادشاہ نے اپنی بیٹی سلطان کی خدمت میں پیش کر کے آئندہ مطیع و منقاد رہنے کا وعدہ کیا۔ قیصر قسطنطنیہ نے اپنی تین خوبصورت لڑکیاں اس توقع میں پیش کیں کہ ایک سے سلطان مراد خان خود نکاح کرے اور دو اس کے دونوں بڑے بیٹوں کی بیویوں میں شامل کی جائیں۔ اس لڑائی کے بعد قیصر قسطنطنیہ سلطان مراد خان کو یورپ سے بے دخل اور واپس کرنے سے مایوس ہو کر اس کوشش میں مصروف رہنے لگا کہ سلطان سے اس کی صلح رہے اور اس کو اپنے مقبوضہ ملک اور قسطنطنیہ کے تخت پر حکمران رہنے دیا جائے۔ ایک طرف قیصر قسطنطنیہ، عثمانی سلطان کی خوشامد میں مصروف رہتا تھا، دوسری طرف وہ اندر ہی اندر سلطان کے خلاف کوششوں میں مصروف تھا۔ چنانچہ سنہ ۷۸۲ھ میں قیصر قسطنطنیہ وپلیلوگس نے کشود کار کی توقع میں قسطنطنیہ سے شہر روم میں پوپ کے پاس جانے اور اس کی اطاعت قبول کرنے کی ذلت محض اس وجہ سے اٹھائی کہ پوپ عیسائیوں کو مذہبی جنگ یعنی سلطان مراد خان کے خلاف جنگ پر آمادہ کر کے تمام براعظم یورپ کو میدان جنگ میں لے آئے۔

مگر اس تدبیر میں جبکہ اس کو کامیابی نظر نہ آئی تو وہ بہت خوفزدہ ہوا اور سلطان کے غضب سے محفوظ رہنے کے لیے اس نے اپنے بیٹے تھیوڈورس کو سلطان کی خدمت میں بھیج کر درخواست کی کہ اس کو ینگ چری فوج میں بھرتی ہونے کی عزت دی جائے۔ چنانچہ اس تدبیر سے اس نے سلطان کو بہت خوش اور اپنی طرف سے مطمئن کر دیا۔

انہیں ایام میں سلطان مراد خان کو ایشیائے کوچک میں بعض بغاوتوں اور سرکشیوں کے استیصال کی غرض سے جانے کی ضرورت پیش آئی اور اپنے یورپی مقبوضات کی حکومت ایڈریانوپل میں اپنے بیٹے سادجی کے سپرد کر گیا۔ سلطان کی اس غیر موجودگی میں قیصر قسطنطنیہ کا ایک اور بیٹا جس کا نام اینڈ ونیکس تھا، ایڈریانوپل میں آیا اور مراد خان کے بیٹے کا دوست اور رفیق بن کر اس کے مزاج میں دخیل ہوا۔ اس عیسائی شہزادہ نے مسلمان شہزادے کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی ایک عجیب کوشش کی۔ اس نے کہا کہ میرا باپ بھی حکومت کی قابلیت نہیں رکھتا اور میرے اوپر بہت ظلم کرتا ہے اور اسی طرح آپ کا باپ بھی آپ کی نسبت دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں عدل وانصاف سے کام نہیں لیتا۔ یہ موقع محض اتفاق سے ہاتھ آ گیا ہے۔ میں نے بھی اپنے لشکر کے ایک معقول حصہ کو اپنا شریک بنا لیا ہے۔ آپ بھی اپنے ہاتھ یہاں کافی فوج رکھتے ہیں۔ آؤ! پہلے ہم دونوں مل کر قسطنطنیہ کو فتح کر کے موجودہ قیصر کو اسیر کر لیں۔ اس طرح جب تخت قسطنطنیہ مجھ کو بہ آسانی مل جائے گا تو پھر ہم تخت نشین ہو کر ترکوں کے سلطان بن جائیں گے۔ یہ احمق شہزادہ عیسائی شہزادہ کے فریب میں آ گیا۔ اس نے بلا تامل اپنی فوج لے کر اور عیسائی شہزادے کے ساتھ ہو کر قسطنطنیہ کی طرف کوچ کر دیا اور دونوں نے جا کر قسطنطنیہ کا محاصرہ کر کے اپنی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مراد خان نے جب اس بغاوت وسرکشی کا حال سنا تو وہ بہت جلد ایشیائے کوچک سے فارغ ہو کر ایڈریانوپل آیا۔ یہ دونوں شہزادے قسطنطنیہ کے قریب سے ہٹ کر مغرب کی جانب ایک ندی پار جا پڑے اور سلطان مراد خان کے مقابلہ کی تیاریاں کرنے لگے۔ مراد خان نے ایڈریانوپل پہنچتے ہی قیصر پلیلوگس کو لکھا کہ فوراً میری خدمت میں حاضر ہو کر جواب دو کہ یہ نامعقول حرکت کیوں ظہور میں آئی اور تم نے اپنے بیٹے کو میرے بیٹے کے پاس بھیج کر کیوں یہ فتنہ برپا کرایا؟ قیصر اس سلطانی پیغام کے پہنچنے سے کانپ گیا اور اس نے خوف کی وجہ سے اپنی بے گناہی اور لاعلمی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ ان باغی شہزادوں کو گرفتار کرنے اور ان کو ان کی نالائقی کی سزا دینے میں ہر طرح آپ کا شریک

ہوں اور میری خواہش ہے کہ باغیوں کو گرفتار کر کے قتل کیا جائے۔اس جواب کو سن کر سلطان خود ان باغیوں کی طرف بڑھا اور ندی کے اس کنارے پر خیمہ زن ہو کر رات کے وقت تنہا اس طرف گیا اور باغیوں کے کیمپ میں پہنچ کر آواز دی کہ تم میں سے جو شخص باغیوں کا ساتھ چھوڑ کر اب بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جائے گا، اس کی خطا معاف کر دی جائے گی۔ سلطان کی آواز کو پہچان کر تمام سپاہی اور سرمایہ دار جو شہزادے کے ساتھ تھے، سلطان کے گرد آ کر جمع ہو گئے اور صرف چند ترکوں اور چند عیسائیوں کے ساتھ یہ دونوں شہزادے وہاں سے فرار ہوئے۔ آخر دونوں مع اپنے ہمراہیوں کے گرفتار ہو کر آئے اور سلطان کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ سلطان مراد خان نے اپنے بیٹے کو اپنے سامنے بلا کر اندھا کرا دیا اور پھر اس کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ قتل کر دیا گیا۔ قیصر کے بیٹے کو پابہ زنجیر قیصر کے پاس بھجوا دیا اور لکھا کہ اس کو اب تم خود اپنے ہاتھ سے سزا دو، جس طرح کہ میں نے اپنے بیٹے کو خود سزا دی ہے۔ قیصر کے لیے یہ بڑا نازک موقع تھا۔ اگر وہ بیٹے کو سزا دیتا ہے تو محبت پدری مانع ہوتی ہے اور اگر سزا نہیں دیتا تو سلطان کی ناراضگی کا موجب ہوتا ہے۔ آخر اس نے بیٹے کی آنکھوں میں تیزاب ڈلوا کر اندھا کرا دیا اور زندہ رہنے دیا۔ سلطان نے یہ سن کر کہ قیصر نے میرے حکم کی تعمیل میں بیٹے کو اندھا کرا دیا، خوشی کا اظہار کیا اور اس بات سے کوئی تعرض نہیں کیا کہ اس کو زندہ کیوں چھوڑ دیا گیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ قیصر نے بیٹے کو بالکل اندھا بھی نہیں کرایا بلکہ اس کی بینائی باقی رہی تھی اور چند روز کی تکلیف کے بعد آنکھیں اچھی ہو گئی تھیں۔

سنہ ۷۸۹ھ میں قراقونلو ترکمانوں نے ایشیائے کوچک کے مغربی حصے میں زور پکڑ کر سلطان مراد خان کے خلاف علم مخالفت بلند کیا۔ مقام قونیہ کے قریب میدان کارزار گرم ہوا۔ اس لڑائی میں سلطان مراد خان کے بیٹے بایزید خان نے نہایت شدت اور سرعت کے ساتھ حملہ کر کے حریف کی طاقت کو پامال کر دیا۔ بایزید خان کی اس جرأت و بہادری کے عوض میں سلطان نے اس کو یلدرم (برق) کا خطاب دیا۔ اسی روز سے وہ بایزید یلدرم کے نام سے مشہور ہوا۔ ترکمانوں کا سردار چونکہ سلطان مراد خان کا داماد بھی تھا، اس لیے بیٹی نے باپ سے سفارش کرا کرا اپنے خاوند کی جان بچوا دی اور اس حریف ریاست سے پھر صلح و آشتی کے تعلقات قائم ہوئے۔ اس کے بعد سلطان نے چند روز بروصہ میں رہ کر ایشیائے کوچک کے حالات کو معائنہ کرنا اور وہاں کے انتظام سلطنت کو پہلے سے زیادہ مضبوط بنانا ضروری سمجھا۔ ادھر یورپ میں مسلمانوں کی مخالفت اور مقدس جنگ کا جوش تو پہلے

ہی موجود تھا، صلیبی لڑائیوں اور پادریوں کے جنگی وعظوں نے تمام براعظم یورپ میں مسلمانوں کی ایک بڑی ہی مہیب اور قابل نفرت تصویر پیش کر کے نفرت کے سیلاب بہا رکھے تھے۔ اب جبکہ تھریس درومیلیا اوراس سے بھی آگے تک کا ملک سلطان مراد خان کے قبضے میں آ کر مسلمانوں کی نوآبادی بننے لگا تو تمام یورپ میں ہلچل کا پیدا ہو جانا لازمی وضروری تھا۔ ادھر شاہ سرویہ، قیصر قسطنطنیہ اور پوپ روم نے یورپ کے تمام ملکوں میں ترکوں کے خلاف جنگ کرنے کی ترغیب دینے کے لیے ایلچی اور مناد پھیلا دیے تھے۔ یہ بالکل اسی قسم کی کوشش تھی جو بیت المقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے چھیننے اور ملک شام میں صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ جاری کرنے کے لیے یورپ میں ہوئی تھی۔ ترکوں کے بلقان میں پہنچنے سے عیسائی لوگ ملک شام کو بھول گئے اوران کو اب اپنے ملکوں کو بچانا اور خطرہ سے محفوظ رہنے کی کوشش کرنا ضروری ولازمی ہو گیا۔ سلطان مراد خان ایشیائے کوچک میں بیٹھا ہوا ان حالات اوران تیاریوں سے بے خبر تھا کیونکہ اس زمانے میں خبر رسانی کے ایسے ذرائع نہ تھے کہ وہ عین وقت پر اس بات سے واقف ہو جاتا کہ اس کی مخالفت میں کس کس قسم کی کوششیں کہاں کہاں اورکس کس طرح ہورہی ہیں؟ سنہ ۷۹۱ھ میں سلطان مراد خان بروصہ میں مقیم تھا۔ اسی سال خواجہ حافظ شیرازی اور خواجہ نقش بند (بہاؤالدین) نے وفات پائی تھی۔ ادھر سرویہ، بلگیریا، البانیہ، ہنگری، گلیشیا، پولینڈ، جرمنی، آسٹریا، اٹلی، بوسنیا وغیرہ کی تمام طاقتیں اور قومیں متحد و متفق ہوکر سلطنت عثمانیہ کے استیصال پر مستعد ہو چکی تھیں۔ سنہ ۷۹۱ھ میں سلطان مراد خان کے پاس بروصہ میں خبر پہنچی کہ وہ فوج جو بیس ہزار کی تعداد میں رومیلیا کے اندر موجود تھی، عیسائی لشکر کے مقابلے میں برباد ہوگئی یعنی سرویا اور بلگیریا کی فوجوں نے حملہ کر کے اور عہد اطاعت کو بالائے طاق رکھ کر بیس ہزار ترکوں میں سے پندرہ ہزار کو جام شہادت پلا دیا ہے اور تمام یورپی علاقہ اور دارالسلطنت ایڈریانوپل خطرہ میں ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی سلطان مراد خان بروصہ سے چل کر سمندر کو عبور کر کے ایڈریانوپل پہنچا اور وہاں سے تیس ہزار کا ایک لشکر اپنے سپہ سالار علی پاشا کو دے کر آگے روانہ کیا کہ دشمنوں کے لشکر کی پیش قدمی کو روکے اور خود ایڈریانوپل میں ضروری انتظامات کی طرف متوجہ ہوا۔ سنہ ۷۹۲ھ میں علی پاشا نے بلگیریا کے بادشاہ سسوال کو مغلوب و مجبور کر کے دوبارہ اطاعت پر آمادہ کر لیا۔ عیسائی ممالک کے لشکروں کو سرویہ کے بادشاہ نے سرویہ اور بوسنیا کی سرحدوں پر مقام کسودا میں جمع کیا اور یورپ کے اس لشکر عظیم نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنا کیمپ قائم

کر کے سلطان مراد کو خود پیغام جنگ دیا۔ مراد خان بھی اب پورے طور پر ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ خود اپنی تمام فوج کا سپہ سالار بن کر ایڈریانوپل سے روانہ ہوا اور پہاڑی دشوار گزار دروں کو طے کرتا ہوا کسووا کے میدان میں نمودار ہوا۔ اس میدان میں ایک چھوٹی سی ندی شنتزا نامی بہتی تھی۔ اس کے شمالی جانب عیسائی کیمپ تھا۔ دوسری جانب ۲۶ اگست سنہ ۱۳۸۹ء مطابق سنہ ۷۹۲ھ کو سلطان مراد نے جا کر قیام کیا۔ عیسائیوں نے جب مسلمانوں کے لشکر کو اپنے آپ سے تعداد اور سامان میں چوتھائی کے قریب دیکھا تو ان کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ عیسائی اس میدان میں پہلے سے مقیم اور تازہ دم تھے۔ مسلمان یلغار کرتے ہوئے وہاں پہنچے تھے اور دشوار گزار راستوں نے ان کو تھکا دیا تھا۔ عیسائیوں کے لیے یہ علاقہ نیا اور اجنبی نہ تھا کیونکہ اس علاقے کے باشندے ان کے دوست اور ہم قوم و مذہب اور ہر طرح معین و مددگار تھے لیکن مسلمانوں کے لیے یہ ملک غیر اور اجنبی تھا۔ جس روز شام کو سلطانی لشکر میدان میں پہنچا، اس کی شب میں دونوں لشکریوں میں مجالس مشورت منعقد ہوتی رہیں۔ عیسائیوں میں سے بعض سرداروں کی رائے ہوئی کہ اسی وقت رات کو شب خون مار کر مسلمانوں کا کام تمام کر دیا جائے لیکن چونکہ عیسائیوں کو اپنی فتح کا کامل یقین تھا، اس لیے ان کے دوسرے سرداروں نے اس رائے کی محض اس لیے مخالفت کی کہ رات کی تاریکی میں مسلمانوں کے ایک بڑے حصے کو بچ کر نکل جانے اور بھاگنے کا موقع مل جائے گا۔ حالانکہ ہم ان میں سے ایک متنفس کو بھی زندہ چھوڑنا نہیں چاہتے اور یہ مقصد دن کی روشنی میں ہی خوب حاصل ہو سکے گا۔ ادھر عیسائیوں کی کثرت دیکھ کر مسلمان مرعوب تھے۔ سلطان نے مجلس مشورت منعقد کی تو بعض سرداروں نے مشورہ دیا کہ بار برداری کے اونٹوں کی قطار فوج کے سامنے نصب کی جائے تاکہ زندہ فصیل کا کام دے سکے۔ اس سے دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ دشمن جب حملہ آور ہوگا تو اس کے گھوڑے اونٹوں کو دیکھ کر بدکیں گے اور اس طرح ان کی صفوں کا نظام قائم نہ رہ سکے گا۔ اس رائے کو سن کر سلطان کے بڑے بیٹے بایزید یلدرم نے مخالفت کی اور کہا کہ یہ ضعف اور خوف کی علامت ہے۔ ہم ایسی کمزور اور پست ہمتی پیدا کرنے والی تدبیر پر عمل کرنا ہرگز مناسب نہیں سمجھتے۔ ہم کو دشمن سے کھلے میدان میں دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔ غرض اسی قسم کی باتیں پیش ہوتی رہیں اور سلطان اپنی کوئی مستقل رائے قائم نہ کر سکا۔ ادھر سلطان نے دیکھا کہ ہوا بڑے زور سے چل رہی ہے۔ دشمن کی پشت کی جانب سے ہوا کے جھونکے آتے ہیں اور مسلمانوں کے چہرے پر آندھی اور غبار کے

تھپیڑے لگتے ہیں۔ یہ علامت مسلمانوں کے لیے بے حد نقصان رساں تھی۔ اپنی قلت تعداد اور کمزوری کو دیکھ کر سلطان مراد خان نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں دعا والتجا کرنی شروع کی، صبح تک رو رو کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتا رہا کہ الٰہی! کفر و اسلام کا مقابلہ ہے۔ تو ہمارے گناہوں پر نظر نہ کر بلکہ اپنے رسول عربی ﷺ اور دین متین کی لاج رکھ لے۔ ان دعاؤں نے رحمت باری تعالیٰ کو اپنی طرف متوجہ کیا اور صبح ہوتے ہی بارش شروع ہوئی۔ گرد وغبار دب کر موسم نہایت خوشگوار ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بارش اور ہوا رکی، طرفین سے صفوف جنگ آراستہ ہوئیں۔ سلطان مراد خان نے اپنے یورپی علاقے کے جاگیرداروں کی فوج کے دستے میمنہ پر متعین کیے اور شہزادہ بایزید یلدرم کو ان کی سرداری سپرد کی۔ میسرہ میں ایشیائی علاقوں کی فوج متعین کر کے شہزادہ یعقوب کو اس کی سرداری پر مامور کیا۔ قلب میں سلطان مراد خان خود اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ قائم ہوا اور بے قاعدہ سواروں، پیدلوں اور قراولی جنگ کرنے والے دستوں کو آگے بہ طور ہراول مختلف ٹولیوں میں بڑھا دیا۔ ادھر عیسائی لشکر کے قلب کی فوج سرویا کے بادشاہ لازرس کے زیر کمان تھی اور اس کا بھتیجا دست راست کا افسر اور شاہ بوسنیا دست چپ کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ دونوں جانب کی فوجیں نہایت مستعدی اور جوش وخروش کے ساتھ آگے بڑھیں اور ایک دوسرے کے قریب پہنچ کر مصروف جنگ ہوئیں۔ دوپہر تک نہایت پامردی اور جواں مردی کے ساتھ طرفین نے جم کر داد شجاعت دی اور فتح وشکست کی نسبت کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر سلطان کے بیٹے یعقوب کی فوج میں آثار پریشانی ظاہر ہوئے اور وہ قلب کی جانب پسپا ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر سلطان مراد خان اس طرف خود متوجہ ہوا اور پراگندہ ہونے والی صفوں کو پھر درست کر کے مقابلہ پر جما دیا۔ اس روز سلطان مراد خان ایک آہنی گرز ہاتھ میں لیے ہوئے تھا اور وہ اپنے اسی گرز سے ہر مقابلہ پر آنے والے کو مار گرا دیتا تھا۔ مقابلہ خوب تیزی سے جاری تھا اور میدان میں کشتوں کے پشتے لگ رہے تھے کہ عیسائی لشکر پر شکست کی علامات ظاہر ہونی شروع ہوئیں اور اسلامی بہادروں کے سامنے عیسائی فوج کے قدم اکھڑے۔ مسلمانوں نے نہایت پر جوش حملے شروع کر دیے اور عیسائیوں کے سپہ سالار اعظم یعنی شاہ سرویا کو گرفتار کر لیا۔ اس میدان میں لاکھوں عیسائی مقتول اور قریباً ان کے بڑے بڑے تمام سردار گرفتار ہو گئے۔ شاہ سرویا جب مراد خان کے سامنے مقید لایا گیا تو سلطان نے اس کو بہ حفاظت قید رکھنے کا حکم دیا۔ عین اس حالت میں جبکہ عیسائی میدان کو خالی کر رہے تھے اور ان کو کامل شکست حاصل ہو چکی تھی، سرویا کے

ایک سردار کی روباہ بازی نے مسلمانوں کی اس فتح عظیم کی مسرت کو کرکرا کردیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرویا کے اس سردار نے مفرورین کے بھاگتے ہوئے انبوہ میں سے لوٹ کر اپنے گھوڑے کا رخ مسلمانوں کی طرف پھیرا اور تعاقب کرنے والے مسلمانوں سے کہا کہ مجھ کو زندہ گرفتار کرلو اور اپنے بادشاہ کے پاس لے چلو، میں خود عیسائیوں سے متنفر ہوکر اپنے آپ کو تمہارے ہاتھ میں گرفتار کراتا ہوں کیونکہ مجھ کو سلطان سے بعض اہم اور نہایت ضروری راز کی باتیں عرض کرنی اور دین اسلام قبول کرنا ہے۔ مسلمانوں نے اس کو زندہ گرفتار کرلیا اور بعد فتح جبکہ سلطان کے سامنے خاص خاص قیدی پیش ہورہے تھے، اس سردار کو بھی پیش کیا اور ساتھ ہی اس کی خواہش اور گرفتاری کے واقعہ کو بھی عرض کردیا۔ سلطان نے خوش ہوکر اس کو اپنے قریب بلایا۔ اس نے نہایت ادب کے ساتھ آگے بڑھ کر سلطان کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا۔ جس سے سلطان اور اس کے درباریوں کو اور بھی زیادہ اس کی اطاعت وفرماں برداری اور اس کے قول کی صداقت کا یقین ہوگیا۔ اس کے بعد اس عیسائی سردار نے سلطان کے پاؤں پر سے اپنا سر اٹھایا اور اپنے کپڑوں میں سے ایک پیش قبض نکال کر نہایت پھرتی کے ساتھ سلطان کے سینہ پر وار کیا، جس سے شدید زخم آیا اور حاضرین دربار نے فوراً اس سروین روباہ کو تکا بوٹی کر ڈالا۔ سلطان کو یقین ہوگیا کہ اس زخم شدید سے جانبری ممکن نہیں۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ شاہ سرویا کو قتل کردیا جائے۔ اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور ذرا ہی دیر کے بعد سلطان مراد خان نے جام شہادت نوش کیا۔ اس طرح ۱۲۷گست سنہ۱۳۸۹ء میں کسووا کے میدان میں یورپ کی متحدہ طاقت کو پامال کرنے کے بعد جبکہ سلطان مراد خان نے وفات پائی تو سرداران لشکر نے سلطان کے بڑے بیٹے بایزید خان یلدرم کے ہاتھ پر بیعت کرکے اس کو اپنا سلطان بنایا۔ جنگ کسووا نے صلیبی لڑائیوں اور چڑھائیوں کا بھی خاتمہ کردیا کیونکہ عیسائیوں کو اب اپنے ہی گھر کی فکر پڑ گئی اور شام کو فتح کرنے کا خیال ان کے دماغوں سے نکل گیا۔ اس لڑائی نے اس امر کو بھی ثابت کردیا کہ عیسائیوں کی کثرت تعداد، قلیل التعداد مسلمانوں کے جوش اور بہادری پر ہرگز غالب نہیں آسکتی۔ عیسائیوں کی یہ شکست دنیا کی عظیم الشان شکستوں میں شمار ہوتی ہے۔ سلطنت عثمانیہ کی اس فتح نے یورپ میں عثمانیوں کے قدم مستقل طور پر جمادیے۔ ادھر اسپین وفرانس کے عیسائی جو غرناطہ کی اسلامی سلطنت کو معدوم کرنے پر آمادہ تھے، کچھ سہم سے گئے اور غرناطہ کے مسلمانوں کو بعض سہولتیں خود بہ خود میسر ہوگئیں۔

سلطان مراد خان نے ۴۵ سال سلطنت کی اور ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کے بیٹے بایزید خاں یلدرم نے باپ کی لاش کو بروصہ میں لا کر دفن کیا۔ سلطان مراد خان نہایت عقلمند، باہمت، عالی حوصلہ، درویش سیرت، عابد، زاہد اور خشیت الٰہی کا پیکر شخص تھا۔

سلطان بایزید خان یلدرم:

بایزید خان یلدرم نے تخت نشین ہو کر اور اپنے باپ کی لاش کو بروصہ میں دفن کر کے ایشیائے کوچک میں چند روز تک قیام کیا اور ترکمانوں کے فسادات اور سرکشیوں کا علاج کرتا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ چنگیزی مغلوں کے ضعف و انحطاط کے بعد ایشیا میں ایک اور فاتح پیدا ہو چکا تھا، جس کا نام تیمور تھا اور جس کے حالات ان شاء اللہ آئندہ کسی موقع پر مفصل بیان ہونے والے ہیں۔ سنہ ۷۹۳ھ یعنی اپنی تخت نشینی کے دوسرے سال بایزید یلدرم نے سنا کہ یورپ میں ترکوں کے خلاف پھر کوشش شروع ہو رہی ہے اور سرویا و بوسنیا کے علاقوں میں سامان بغاوت پیدا ہو چکا ہے۔ چنانچہ بایزید خان یلدرم برق و باد کی طرح یورپ میں آیا اور بوسنیا سے لے کر دریائے ڈینوب تک کا تمام علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر کے دریائے فرات سے دریائے ڈینوب تک اپنی مملکت کو پھیلا دیا۔ والیشیا، سرویا اور بوسنیا وغیرہ سب سلطان بایزید خان کے باج گزار صوبے تھے۔ ادھر ایشیا یعنی ایران میں مغولان چنگیزی کا شیرازہ درہم برہم ہونے کے بعد جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں پیدا ہو کر آپس میں مصروف پیکار تھیں۔ انہوں نے تیمور کے لیے فتوحات کا میدان صاف کر رکھا تھا۔ بایزید خان یلدرم کی اس شوکت و عظمت اور قوت و طاقت کو دیکھ کر قسطنطنیہ کے قیصر نے بایزید خان کو خط لکھا کہ قسطنطنیہ اور صوبہ مقدونیہ نیز یونانی مجمع الجزائر کے چھوٹے چھوٹے چند جزیرے میرے پاس باقی رہ گئے ہیں۔ ان بچے کھچے ٹکڑوں کو آپ میرے پاس رہنے دیجیے اور مجھ کو اپنا ہوا خواہ اور مخلص تصور فرما کر میرے ساتھ پیمان صلح کو استوار رکھیے۔ بایزید خان یلدرم نے اپنی مہربانی سے قیصر کی اس درخواست کو منظور کر کے اس کو اس کے مقبوضات میں آزاد چھوڑ دیا اور وسط یورپ میں آگے بڑھنے اور اپنی فتوحات بڑھانے کی طرف متوجہ ہوا۔ بایزید کو اس طرح مطمئن کر کے قیصر قسطنطنیہ نے اپنی سازشی تدابیر کا جال بایزید خان یلدرم کے مخالف پھیلانا شروع کیا۔ اس نے اپنے ایلچی خفیہ طور پر ایران، خراسان اور فارس، شام اور عراق وغیرہ میں بھیجنے شروع کیے اور ایشیا کے مسلمان سلاطین سے مراسم اتحاد بڑھائے۔ ہمارے اس موجودہ زمانے میں تو اس قسم کی کارروائیاں فوراً ہی طشت از بام

ہو جاتی ہیں لیکن اس زمانے میں بایزید خان یلدرم کے بے خبر رہنے پر ہم کو کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے۔ ادھر قیصر قسطنطنیہ اپنی ان ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا، ادھر ارمینیا، کردستان اور آذربائیجان کے مسلمان فرماں روا خود بھی اس زمانے کی آب وہوا کے اثر سے ایشیائے کوچک کے مغربی حصے کو دھمکی دے رہے تھے۔ آخر یہ تمام اسباب مل ملا کر اس کا باعث ہوئے کہ ترکمانوں نے ایشیائے کوچک یعنی بایزید خان یلدرم کے ایشیائی علاقہ میں پیش قدمی شروع کر دی۔ بایزید خان یلدرم اگر چاہتا تو ایران وخراسان وغیرہ کی طرف متوجہ ہو کر کوچک میں فتوحات عظیم حاصل کر لیتا لیکن چونکہ عثمان خان اور اس کی اولاد میں دین داری بہ درجہ اتم موجود تھی، اس لیے وہ مسلمانوں سے لڑنے اور مسلمانوں کے مقبوضہ ممالک کو اپنے قبضہ میں لانے کو اچھا نہیں جانتے تھے۔ شروع ہی سے سلطنت عثمانیہ کی حکمت عملی یہ رہی تھی کہ عیسائیوں کے خلاف جہاد کر کے جہاں تک ممکن ہو، عیسائی ممالک کو فتح کیا جائے اور اسلامی تہذیب اور اسلامی مذہب کی اشاعت سے یورپ کو، جو اب تک مسلمانوں کے لیے باعث تکلیف بنا رہا تھا، شائستہ بنایا جائے۔ چنانچہ بایزید خان یلدرم بھی اپنے بزرگوں کی اس حکمت عملی پر کاربند تھا اور مسلمانوں سے لڑنے کا اس کو کوئی شوق نہ تھا۔ اب ایشیائے کوچک میں جبکہ ترکمانوں نے حملہ کر کے بروصہ وانگورہ کے درمیان بایزید کی مقامی ایشیائی فوج کو شکست دے کر فتنہ عظیم برپا کر دیا تو بایزید خان مجبوراً یورپ کے عیسائیوں کو چھوڑ کر سنہ ۷۹۵ھ میں ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوا اور یہاں آتے ہی دشمنوں کو شکست دے کر گرفتار واسیر اور قتل کیا۔ یہ فتنہ چونکہ ایشیائے کوچک کے جنوبی ومغربی علاقے کی طرف سے پیدا ہوا تھا، لہٰذا بایزید نے اس طرف کی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے بہ خوبی امن وامان قائم کیا اور اسی سال مصر کے عباسی خلیفہ مستعصم باللہ بن محمد ابراہیم کے پاس تحف وہدایا بھیج کر اس سے سلطان کا خطاب حاصل کیا۔ اس سے پہلے کے عثمانی فرماں رواؤں کو بھی اگرچہ مورخین نے سلطان ہی کے لقب سے یاد کیا ہے مگر درحقیقت وہ امیر کہلاتے تھے۔ مثلاً امیر عثمان خاں، امیر ارخان، امیر مراد خان وغیرہ۔ بایزید خان نے سنہ ۷۹۵ھ میں خلفائے عباسیہ کی مذہبی عظمت کو مدنظر رکھ کر جو تمام عالم اسلام میں مسلم تھی، عباسی خلیفہ سے خطاب حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ عباسی خلیفہ مصر کے مملوک فرماں روا کی حفاظت ونگرانی میں اپنے دن بسر کر رہا ہے۔ غرض یہ کہ بایزید خان یلدرم کو سلاطین عثمانیہ کا پہلا سلطان کہا جا سکتا ہے۔ یورپی مورخین کا خیال ہے کہ سلطان بایزید خان یلدرم

باوجود بہادر اور سپاہی منش انسان ہونے کے عثمانیوں میں سب سے پہلا فرماں روا ہے، جو یورپ کی بداعمالیوں اور برے مشیروں کی صحبت سے متاثر ہو کر شراب نوشی کے جرم کا مرتکب ہوا۔ اگر یہ بیان درست ہو تو ہم کو متعجب نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ بایزید خان یلدرم کے آخری کارنامہ جنگ انگورہ کی ناعاقب اندیشی کو دیکھنے سے اس کی شراب نوشی کا کچھ کچھ ثبوت بہم پہنچ جاتا ہے۔ یورپی مورخین سلطان بایزید خان کو عیاشی اور بدچلنی کا مجرم بھی بتاتے ہیں۔ ہم کو اس پر بھی حیرت زدہ نہ ہونا چاہیے کیونکہ شراب خوری اور عیاشی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک فاتح سلطان کی حیثیت سے وہ بے نظیر شخص تھا اور اپنی شمشیر خارا شگاف کی بہ دولت اس نے اپنے دشمنوں کو اپنے سامنے ترسان ولرزاں اور سرنگوں رکھا تھا۔ بایزید خان یلدرم کی شراب خوری اور عیاشی کی حکایت اگر صحیح ہے تو یہ بھی عیسائی سلاطین کی حکمت عملیوں اور خفیہ تدبیروں کا نتیجہ تھا، کیونکہ سلاطین عثمانیہ کے محلوں میں عیسائی سلاطین نے شروع ہی سے اپنی شہزادیاں داخل کرنے کا سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ بایزید خان یلدرم کے محل میں بھی شراب کی طرف متوجہ کرنے والی عیسائی شہزادیاں موجود تھیں۔ اس کے پیش رو سلاطین اپنی دینی عصبیت اور ایمانی قوت کے سبب سے حبائل الشیاطین اور عیسائی خبیثات کے فریب وکید سے آزاد رہے۔ مگر بایزید خان جو میدان جنگ میں طاقتور سے طاقتور دشمن کو خاطر میں نہ لاتا تھا، اپنے محلوں کے نرم و نازک حریفوں سے مغلوب ہو گیا۔

بایزید خان یلدرم سنہ ۷۹۵ھ سے سنہ ۷۹۹ھ تک اپنی پرانی دارالسلطنت ایڈریانوپل اور یورپی میدان جنگ سے غیر حاضر یعنی ایشیائے کوچک میں مقیم رہا۔ سنہ ۷۹۹ھ میں اس نے سنا کہ یورپ کی تمام طاقتیں ہنگری کے بادشاہ سجمنڈ کی تحریک وکوشش سے سلطنت عثمانیہ کے خلاف متحد ہو کر جنگ کی تیاریاں مکمل کر چکی ہیں اور فوجوں کی نقل وحرکت شروع ہو گئی ہے۔ اس مرتبہ علاوہ اور تمام عیسائی بادشاہوں اور قوموں کے فرانس وانگلستان بھی اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس اتحاد میں شامل تھے یعنی اٹلی، فرانس، انگلستان، آسٹریا، ہنگری، پولینڈ، جرمنی والیشیا، بوسنیا وغیرہ سب مکمل طور پر تیار ہو کر اس کئی سال کی مہلت میں بہ اطمینان میدان میں نکل سکے۔ قسطنطنیہ کا قیصر محض اس لیے کہ وہ ہمہ اوقات سلطان بایزید خان یلدرم کی ٹھوکروں میں تھا، علانیہ شوکت نہ کر سکا۔ مگر خفیہ طور پر اور معنوی حیثیت سے وہی اس جنگی تیاری کا باعث اور محرم اول تھا، کیونکہ ترکوں کی سلطنت کا سب سے زیادہ بدخواہ اور دشمن وہی ہو سکتا تھا۔ حالانکہ سلطان بایزید خان یلدرم برق اور آندھی کی طرح یورپ

پہنچا۔ اس نے یہاں پہنچ کر دیکھا کہ روما کے پوپ یونیفس نہم نے یورپ کے ملکوں میں اپنا فتویٰ شائع کیا ہے کہ جو عیسائی ہنگری کے ملک میں پہنچ کر مسلمانوں کے خلاف لڑائی میں شریک ہوگا، وہ گناہوں سے بالکل پاک ہو جائے گا۔ اس سے پہلے فرانس وانگلستان میں لڑائی چھڑی ہوئی تھی مگر پوپ اور دوسرے باا ثر عیسائیوں نے دونوں ملکوں کے سلاطین کو سمجھایا اور اس بات پر آمادہ کر لیا کہ بایزید خان یلدرم کا قصہ پاک کر لینے تک یہ لڑائی روکی جائے۔ چنانچہ کاؤنٹ دی نیورس ڈیوآف برگنڈی کے ماتحت علاقہ برگنڈی کے بہادروں کی ایک زبردست فوج ہنگری کے بادشاہ سجمنڈ کی اعانت کے لیے ہنگری کی جانب روانہ کی گئی۔ فرانس کے بہادروں کی ایک زبردست فوج بادشاہ فرانس کے تین چچیرے بھائیوں جیمس، فلپ اور ہنری کے ماتحت مرتب ہو کر ہنگری کی جانب روانہ ہوئی۔ اس فوج میں شہزادہ کاؤنٹ آف یوبھی شامل تھا۔ فرانس کے بہت سے نواب اور فخر ملک وقوم سپہ سالار اور فرانس کا امیر البحر بھی اپنی اپنی جمعیتیں لے کر ہنگری میں پہنچے۔ بومیریا کے بہادروں کی زبردست فوجیں ایکٹر پیلتن اور کاؤنٹ آف منسپل گریڈ کے ماتحت روانہ ہوئیں۔ آسٹریا کے سواروں کی ایک فوج کا افسر ہرمین اور دوسری زبردست فوج کا افسر کاؤنٹ دی لی تھا۔ اسی طرح اٹلی اور دور دراز کے جزیروں سے بھی آزمودہ کار اور بہادر عیسائیوں کی فوجیں ہنگری کی جانب روانہ ہوئیں۔ سینٹ جان یروشلم کے ماتحت بھی عیسائیوں کی ایک زبردست فوج آئی۔ اس طرح جب ہنگری میں عیسائیوں کی افواج قاہرہ کا جماؤ ہو گیا تو سجمنڈ شاہ ہنگری نے اپنی زبردست فوج کو بھی ہر طرف سے جمع کیا اور والیشیا کے عیسائی بادشاہ کو جو سلطان بایزید خان یلدرم کی اطاعت قبول کر چکا تھا، لکھا کہ اب تمہارے لیے مناسب یہی ہے کہ بایزید یلدرم کی اطاعت ترک کر کے مع اپنی پوری طاقت کے ہمارے شریک ہو جاؤ۔ اس نے بڑی خوشی سے اس پیغام کا خیر مقدم کیا اور جب عیسائی افواج کا یہ سیلاب اس کے ملک میں داخل ہو کر گزرنے لگا تو وہ بھی مع اپنی پوری طاقت کے اس عیسائی سیلاب عظیم میں شامل ہو گیا مگر سرویا کے بادشاہ نے احتیاط سے کام لیا جو پہلے بادشاہ کے مقام کسودا میں گرفتار ومقتول ہونے کے بعد تخت نشین ہو کر بایزید یلدرم کا باجگزار مطیع بنا تھا، اس نے عیسائی لشکر کی شرکت اختیار نہیں کی۔

عیسائیوں کی عظیم الشان فوج کی یہ خصوصیت قابل تذکرہ ہے کہ اس مرتبہ مختلف ملکوں کی جس قدر عیسائی افواج جمع ہوئیں تھیں، وہ سب کی سب ہی نہایت بہادر، تجربہ کار، بارہا کے جنگ آزمودہ

سپاہیوں اور سپہ سالار پر مشتمل تھیں۔ اس لشکر کے تمام سپاہی اور تمام سردار عیسائی دنیا کے بہترین اور منتخب جنگجو تھے۔ اس لشکر کے سپہ سالاروں کا قول تھا کہ اگر آسمان بھی ہمارے اوپر ٹوٹ پڑا تو ہم اپنے نیزوں کی نوک پر اس کو روک لیں گے۔[1] یہ عیسائی لشکر والیشیا اور سرویا کے دو مختلف راستوں سے حدود سلطنت عثمانیہ کی طرف بڑھا۔ سجمنڈ شاہ ہنگری نے جو سپہ سالار اعظم تھا، عثمانی سلطنت کی حدود پر پہنچ کر حملہ آوری کا حکم دیا اور بہت جلد ایک کے بعد دوسرا شہر فتح کرنا شروع کر دیا۔ ہر ایک قصبہ یا شہر جسے عیسائی فتح کرتے تھے، خاک سیاہ بنا دیا جاتا تھا۔ وہاں کے مسلمان باشندوں اور محافظ سپاہیوں کو نہایت بے رحمی سے قتل کیا جاتا تھا اور امن کی درخواست یا اطاعت کے اقرار پر بھی کسی کی جان بخشی نہیں ہوتی تھی۔ اس قتل عام میں مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ عیسائی لشکر ایک عام تباہی اور ہلاکت و بربادی بن کر عثمانیہ سلطنت کے علاقے کو بے چراغ اور خاک سیاہ بناتا ہوا جب بڑھنے لگا تو بایزید یلدرم کے پاس ایشیائے کوچک میں خبر پہنچی اور وہ وہاں سے بڑی عجلت کے ساتھ ایڈریانوپل پہنچا۔ سجمنڈ کو اس بات کا یقین تھا کہ میں درہ دانیال کے اس پار پہنچ کر ایشیائے کوچک کو فتح کرتا ہوا شام کے ملک میں پہنچ سکوں گا۔ ادھر قیصر قسطنطنیہ بھی اپنے دل میں خوش ہو رہا تھا کہ جو عظیم الشان کام کسووا کے میدان جنگ میں پورا نہیں ہو سکا تھا وہ اب بہ حسن وخوبی انجام کو پہنچ جائے گا اور ہمیشہ کے لیے عثمانیوں کے خطرہ سے نجات میسر ہو جائے گی۔ بہت زیادہ ممکن تھا کہ سلطان بایزید خان یلدرم کے ایڈریانوپل پہنچنے کے وقت دوسری طرف سے سجمنڈ بھی اس عظیم الشان لشکر کے ساتھ ایڈریانوپل پہنچ جاتا اور بایزید خان کو اپنے حواس بجا کرنے سے پہلے ہی سخت پریشانی اور مصیبت کا سامنا ہوتا لیکن عیسائی لشکر قتل و غارت کرتا ہوا جب شہر نکوپولس کے سامنے پہنچا تو وہاں کے صوبہ دار بوغلن بیگ نے بڑی ہمت و جواں مردی کے ساتھ مقابلہ کیا اور خوب مضبوطی کے ساتھ محصور ہو گیا۔ عیسائی لشکر نے نکوپولس کا محاصرہ کر لیا اور چند روز ستانے اور آرام کرنے کا موقع غنیمت سمجھا۔ اس طرح شہر نکوپولس کے محاصرہ نے سلطان بایزید خان کو موقع دیا کہ اس نے ایڈریانوپل میں پہنچ کر اس عجلت میں اپنی مناسب تیاری کی، پھر نکوپولس کی طرف کوچ کر دیا۔ عیسائیوں کو یہاں بھی توقع تھی کہ سلطان بایزید خان ایشیائے کوچک

---

[1] اللہ کی پناہ ایسی بدبختی کی سوچ اور متکبرانہ کلمات سے! اگر انھوں نے اللہ کے عذابوں کا نشانہ بننے والی اقوام وافراد کے انجام پر غور کیا ہوتا تو وہ ایسے کلمات زبان پر نہ لاتے۔

میں بیٹھا ہوا ہے اور ان کو یقین تھا کہ وہ ہماری کثرت و طاقت کا حال سن کر ساحل یورپ پر اترنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ آخر ۲۴ دسمبر سنہ ۱۳۹۶ء مطابق سنہ ۷۹۹ھ کہ کاؤنٹ دی نیورس ڈیوک آف برگنڈی اپنے خیمے میں کھانا کھا رہا تھا، اس کے پاس بعض جاسوسوں نے یہ خبر پہنچائی کہ ترکوں کا لشکر قریب پہنچ چکا ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی ڈیوک مذکور اور دوسرے فرانسیسی سردار فوراً کھڑے ہو گئے اور خوشی خوشی سجمنڈ کے پاس پہنچ کر کہنے لگے کہ ترکوں کے مقابلے میں ہم لوگ عیسائی لشکر کا ہراول قرار دیے جائیں تاکہ سب سے پہلے ہم کو بایزید کے لشکر پر تلوار چلانے کا فخر حاصل ہو۔ سجمنڈ جو ترکوں کے طریق جنگ سے واقف اور زیادہ تجربہ کار تھا، اس نے کہا کہ سب سے پہلے ترکوں کی بے قاعدہ اور نیم مسلح فوج کے دستے آگے بڑھیں گے۔ آپ لوگ جو عیسائی لشکر کے لیے مایہ ناز ہیں، اس لشکر کے مقابلہ پر تیار رہیں جو سلطان بایزید خان کے جاں نثار اور سب سے زیادہ بہادر سپاہیوں پر مشتمل ہے اور جو ابتدائی مقابلہ کے بعد زبردست حملہ کرے گا۔ ڈیوک آف برگنڈی یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ مگر فرانس کے سرداروں یعنی لارڈ دی کورسی اور امیر البحر اور مارشل بوسی وغیرہ نے اصرار کیا کہ ہم ہرگز اس بات کو گوارہ نہیں کر سکتے کہ فرانس والوں سے پہلے ہنگری والے جنگ میں پیش قدمی کریں۔ یہ پرغرور اور پرجوش الفاظ سن کر نوجوانوں نے خوشی کا ایک نعرہ بلند کیا اور اس جوش و غرور میں ان ترکی قیدیوں کو جو اب تک قتل نہیں کیے گئے تھے، فوراً قتل کر دیا لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ہم پر بہت جلد کیسی مصیبت وارد ہونے والی ہے۔

سلطان بایزید یلدرم نے عیسائی لشکر کے قریب پہنچ کر ایسے موقع پر قیام کیا کہ عیسائی لشکر اور سلطانی لشکر کے درمیان زمین کا ایک بلند پشتہ حائل تھا، جس کی وجہ سے عیسائی لشکر سلطانی لشکر کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ سلطان نے اپنی چالیس ہزار منتخب اور مسلح افواج کو میدان میں جما کر باقی بے قاعدہ فوج کے دستوں کو مختلف ٹولیوں میں آگے بڑھا دیا۔ ادھر سے فرانسیسی سواروں نے بہ طور ہراول پیش قدمی کی اور سجمنڈ باقی فوج لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ فرانسیسی فوج نے ترکی کے بے قاعدہ دستوں کو کچل ڈالا اور نہایت سرعت کے ساتھ آگے بڑھ کر اس مرتفع ٹیلہ کی بلندی پر پہنچ گئے، جہاں سلطان بایزید خان اپنی مسلح فوج کی خود سپہ سالاری کر رہا تھا۔ بے قاعدہ ترکی دستوں نے جو فرانسیسیوں کے حملہ سے اپنی ایک تعداد کو قتل کرا کر منتشر ہو گئے تھے، اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور فوراً مجتمع ہو کر اور اپنی صفوں کو درست کر کے ان حملہ آور فرانسیسیوں کے عقب میں پہنچ کر حملہ کیا

۔اس طرح عیسائی ہراول یعنی فرانسیسی فوج جو سجمنڈ کے بڑے لشکر سے بہت دور آگے نکل آئی تھی، اسلامی لشکر کے بیچ میں گھر گئی اور بہت زیادہ مقتول و اسیر ہوئی۔ بہت ہی تھوڑے آدمی کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل بھاگے اور انہوں نے عیسائی لشکر کلاں کو فرانسیسی لشکر کی اس مکمل تباہی کا حال سنایا، جس سے عیسائیوں پر مسلمانوں کی ہیبت طاری ہونے لگی۔ اس کے بعد سلطان بایزید خان نے عیسائیوں کے فوجی سمندر پر، جو میدان جنگ میں حد نگاہ تک اپنی نیستان کی شکل میں پھیلا ہوا تھا، حملہ کیا۔ مسلمانوں کا یہ حملہ جوش وخروش کے ساتھ ہوا، اس کا شایدان تجربہ کار اور منتخب جنگجو عیسائیوں کو پہلے سے اندازہ نہ تھا۔ درست طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بایزید یلدرم کا لشکر ایک آہنی گرز تھا، جس نے میلوں تک پھیلی ہوئی ریت کی دیواروں کو اپنی پیہم ضربوں سے ریزہ ریزہ کر کے خاک میں ملا دیا۔ بوریا، آسٹریا اور ہنگری کی فوجوں نے جم کر اور ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر سب کھیرے اور ککڑی کی طرح مسلمانوں کی خون آشام تلواروں سے کٹ کر خاک وخون میں مل گئے۔ اسی طرح جس نے قیام وقرار کو اختیار کیا، طعمہ تیغ ہوا۔ جو فرار پر آمادہ ہوا، یا تو بچ کر نکل گیا یا فتح مندوں کے تعاقب سے اسیر ہو کر اپنے وجود پر افسوس کرنے لگا۔ غرض بہت ہی جلد لڑائی کا فیصلہ ہو گیا اور سلطان بایزید خان نے نکوپولس کے میدان میں عیسائیوں کے ایک ایسے زبردست اور ہر ایک اعتبار سے مکمل ومضبوط لشکر کو شکست فاش دی کہ اس سے پہلے کسی میدان میں عیسائیوں کی ایسی زبردست طاقت جمع نہیں ہوسکی تھی۔ سجمنڈ شاہ ہنگری اپنی جان بچا کر لے گیا لیکن فرانس، آسٹریا، اٹلی اور ہنگری وغیرہ کے بڑے بڑے شہزادے، نواب اور سپہ سالار قید ہوئے اور بعض میدان میں مارے گئے۔ ڈیوک آف برگنڈی بھی انہیں قیدیوں میں تھا اور وہ تمام عیسائی سردار جن کے نام اوپر آ چکے ہیں، سب کے سب قیدیوں میں شامل تھے۔ نکوپولس کے اس معرکہ عظیم میں ڈیڑھ لاکھ کے قریب عیسائی مقتول ہوئے۔ فتح کے بعد سلطان نے میدان جنگ کے ہر حصہ کا خود جا کر معائنہ کیا، جو لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ چونکہ سلطان کو جابجا اپنی فوج کے شہداء بھی نظر آئے، اس لیے سلطان نے نہایت افسوس کے ساتھ کہا کہ یہ فتح ہم کو بہت مہنگی پڑی ہے۔ مجھ کو اپنے ان بہادروں کے خون کا بدلہ ہنگری سے لینا ہے۔ یہ کہہ کر سلطان نے حکم دیا کہ قیدیوں کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ ان قیدیوں کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ جن لوگوں کو معمولی سپاہی سمجھا گیا وہ تو غلام بنا کر فوج میں تقسیم کر دیے گئے اور کچھ جلادوں کے ذریعہ سے تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ایک حصہ جو سرداروں پر مشتمل تھا، الگ کیا

گیا۔ ان لوگوں کی مشکیں کسوا کر اور رسیوں میں باندھ کر بڑے بڑے شہروں میں تشہیر کے لیے بھیج دیا گیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ عیسائیوں پر مسلمانوں کو فتح عظیم حاصل ہوئی ہے۔ ایک حصہ جو صرف شہزادوں اور بڑے بڑے نوابوں اور خود مختار فرماں رواؤں پر مشتمل تھا، علیحدہ منتخب کیا گیا۔ یورپ کے ان شہزادوں اور فرماں رواؤں کی تعداد پچیس تھی۔ انہیں میں ڈیوک آف برگنڈی بھی شامل تھا۔ یہاں آ کر اس نے ان پچیس شہزادوں اور فرماں رواؤں کو اپنے سامنے بلا کر کہا کہ تم لوگوں نے ناحق میرے ملک پر حملہ کرنے کی تکلیف گوارا کی۔ میں خود ہنگری، آسٹریا، فرانس، جرمنی اور اٹلی کو فتح کرنے کا مصمم عزم رکھتا ہوں اور میرا ارادہ ہے کہ میں اٹلی کے شہر روما میں پہنچ کر سینٹ پیٹر کی قربان گاہ میں اپنے گھوڑے کو دانہ کھلاؤں۔ اس لیے تم لوگوں سے اب تمہارے ملکوں ہی میں ملاقات ہوگی اور میں بہت ہی زیادہ خوش ہوں گا جبکہ تم لوگ پہلے سے زیادہ فوج اور زیادہ تیاری کر کے میرے ساتھ مقابلہ پر میدان میں آؤ گے۔ مجھ کو اگر تمہاری طرف سے ذرا بھی اندیشہ یا خوف ہوتا تو میں اس وقت تم کو یہ اقرار لے کر رہا کرتا کہ آئندہ کبھی میرے مقابلے میں آنے کا ارادہ نہ کرو گے لیکن میں تم کو تاکید کرتا ہوں کہ تم اپنے اپنے ملکوں میں پہنچتے ہی فوج کی فراہمی اور لڑائی کی تیاری میں مصروف ہو جاؤ اور میرے مقابلے کے لیے پورے طور پر مستعد رہو۔ یہ کہہ کر سلطان بایزید خان نے ان تمام شہزادوں اور سرداروں کو رہا کر دیا۔

اس کے بعد وہ اپنی فوج لے کر یورپ پہنچا اور اپنے اس ارادے کی تکمیل میں مصروف ہوا، جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ سب سے پہلے اس نے یونان کا رخ کیا کیونکہ یونان کے عیسائی جنگجو خود مختارانہ طور پر یا قیصر قسطنطنیہ کے ایما سے نکوپولس کی لڑائی میں عیسائی لشکر میں شامل تھے۔ تھرموپلی کے درے میں سے فاتحانہ گزرتا ہوا ایتھنز کی دیواروں کے نیچے پہنچا اور سنہ ۸۰۰ھ میں ایتھنز کو فتح کر کے تیس ہزار یونانیوں کو ایشیائے کوچک میں آباد ہونے کے لیے روانہ کیا جبکہ سلطان خود فوج لے کر تھسلی کو فتح کرتا ہوا ایتھنز کی طرف گیا تو اس نے سپہ سالاروں کو آسٹریا اور ہنگری کی طرف فوجیں دے کر روانہ کر دیا تھا، جنہوں نے ان ملکوں کے اکثر حصوں کو فتح کر لیا تھا۔ اب سلطان بایزید خان کو قیصر قسطنطنیہ کی ریشہ دوانیوں اور نیش زنیوں کا بہ خوبی علم ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے ایتھنز کی فتح کے بعد قسطنطنیہ کو فتح کر لینے اور اس عیسائی سلطنت کو مٹا دینے کا ارادہ کیا لیکن قیصر نے اس مرتبہ بھی اپنی ہوشیاری سے کام لیا اور سلطان کا باج گزار بن کر وعدہ کیا کہ دس ہزار ڈاکٹ سالانہ بہ

طور خراج ادا کیا کروں گا۔ نیز قسطنطنیہ میں ایک مسجد مسلمانوں کے لیے بنوا دوں گا اور ایک قاضی مقرر کر دوں گا جو مسلمانوں کے تمام معاملات میں حاکم ہوگا۔ مسلمان تاجروں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے گی۔ ان شرائط پر سُلطان بایزید خان یلدرم رضا مند ہو گیا اور اس نے قسطنطنیہ چھوڑ دیا۔ ورنہ جو کام سلطان محمد خان ثانی فاتح قسطنطنیہ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوا، وہ سنہ ۸۰۰ھ میں بایزید یلدرم کے ہاتھوں سے پورا ہو چکتا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تیمور خراسان و ایران میں اپنی حکومت کی بنیاد مضبوط کر کے اور ترکمانوں کی گوشمالی سے فارغ ہو کر اور اپنے مقبوضات کی سرحد تک پہنچا کر ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا۔ قیصر قسطنطنیہ جو یورپ میں اپنی ریشہ دوانیوں اور عیسائیوں کی زور آزمائیوں کے نتائج جنگ کسووا اور جنگ نکوپولس میں دیکھ چکا تھا، اب اپنی اس مجبوری اور ذلت کو دیکھ کر ایک مرتبہ پھر آمادہ کوشش ہوا۔

سلطان بایزید خان یلدرم جب یونان اور ایتھنز کو فتح کر چکا اور قیصر کا حال بہت ہی پتلا ہونے لگا تو اس نے فوراً ایک قاصد تیمور کی خدمت میں روانہ کیا اور اس کو ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ میری سلطنت بہت پرانی ہے۔ نبی ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں بھی قسطنطنیہ کے اندر ہماری سلطنت موجود تھی۔ اس کے بعد بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانے میں بھی خلفاء سے بارہا ہماری صلح ہوئی اور کسی نے قسطنطنیہ کے لینے کا قصد نہیں فرمایا لیکن اب عثمانی سلطنت نے اکثر ہمارے مقبوضات چھین لیے ہیں اور ہمارے دارالسلطنت قسطنطنیہ پر اس کا دانت ہے۔ ایسی حالت میں سخت مجبور ہو کر ہم آپ سے امداد کے خواہاں ہیں اور ظاہر ہے کہ آپ کے سوا ہم اور کسی سے امداد کے خواہاں ہو بھی نہیں سکتے۔ آپ کو اگر بایزید خان یلدرم کے مسلمان اور ہمارے عیسائی ہونے کا خیال ہو تو آپ کو واضح رہے کہ بایزید خان کو اس طرف یورپ میں مسلسل فتوحات حاصل ہو رہی ہیں اور اس کی طاقت بڑی تیزی سے ترقی پذیر ہے۔ وہ بہت جلد اس طرف سے مطمئن اور فارغ ہو کر آپ کے مقبوضہ ممالک پر حملہ آور ہوگا اور اس وقت آپ کو اس کو زیر کرنے میں مشکلات کا سامنا ہوگا۔ بایزید خان نے سلطان احمد جلائر اور قرا یوسف ترکمان کو جو آپ کے مفرور باغی ہیں، اپنے یہاں عزت کے ساتھ مہمان رکھ چھوڑا ہے اور یہ دونوں باغی اس کو آپ کے خلاف جنگ کرنے اور مشورہ دینے میں برابر مصروف ہیں۔ یہ بات بھی آپ کے لیے کچھ کم بے عزتی کی نہیں کہ آپ کے باغی، سلطان بایزید خان کے پاس اس طرح عزت و اکرام کے ساتھ رہیں اور آپ ان کو واپس

طلب نہ کر سکیں۔ پس مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایشیائے کوچک پر حملہ کریں کیونکہ اس ملک کو قدرتی طور پر آپ کے قبضے میں رہنا چاہیے اور بایزید خان یلدرم کے فتنے سے ہم کو بچائیں۔ ہم سے جو کچھ ممکن ہوگا، آپ کی امداد کریں گے۔ قیصر کا یہ خط اگرچہ اپنی نفسانی اغراض پر مشتمل تھا اور تیمور ایسا بیوقوف نہ تھا کہ اس کی خودغرضانہ باتوں میں آ جاتا لیکن اس خط میں باغیوں کی پناہ دہی کا تذکرہ کچھ ایسے الفاظ میں کیا گیا تھا جن کا تیمور کے دل پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا۔ قیصر قسطنطنیہ کا یہ خط تیمور کے پاس اس وقت پہنچا جبکہ وہ دریائے گنگا کے کنارے پہنچ کر ہردوار میں مقیم اور ہندوستان کے مشرقی صوبوں کی طرف بڑھنے کا قصد کر رہا تھا۔ قیصر قسطنطنیہ کے اس خط کو پڑھ کر اس نے قاصد کو کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا بلکہ فوراً ہی اس کو رخصت کر دیا۔ مگر اس خط کے مضمون نے اندر ہی اندر اس کے دل پر ایسا اثر کیا کہ اس کا دل ہندوستان سے اچاٹ ہو گیا اور وہ ہندوستان کے اس نومفتوحہ ملک کو بلاکسی معقول انتظام کے ویسے ہی چھوڑ کر ہردوار سے جلد جلد منزلیں طے کرتا ہوا پنجاب اور پنجاب سے سمرقند کی جناب روانہ ہوا۔ ہندوستان کے ایک لاکھ قیدی جو اس کے ہمراہ تھے اور سفر میں گراں باری کا باعث تھے، اس نے راستے میں قتل کرا دیے۔ سمرقند پہنچ کر اس نے خوب تیاری کی اور اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ عثمانی سلطان سے اول دو دو ہاتھ کر کے اس بات کا فیصلہ کر لیا جائے کہ ہم دونوں میں سے کس کو دنیا کا فاتح بننا چاہیے؟ اس عرصہ میں تیمور کے پاس برابر یلدرم کی فتوحات کے حالات پہنچتے رہے اور وہ اپنے اس رقیب سے لڑنے پر مستعد ہوتا گیا۔ ادھر بایزید یلدرم قسطنطنیہ کے عیسائی قیصر کو اپنا باج گزار بنا کر اور ہنگری و آسٹریا کی فتوحات کو تکمیل تک پہنچا کر اپنے اس ارادے کی تکمیل پر آمادہ ہوا کہ شہر روما کو فتح کر کے سینٹ پیٹر کے مشہور گرجا میں اپنے گھوڑے کو دانہ کھلائے لیکن اس کو یہ خبر پہنچ گئی کہ قیصر قسطنطنیہ نے اس کے خلاف تیمور کے پاس سفارت بھیجی ہے اور وہ سلطان بایزید خان کی خراج گزاری کو اپنے لیے موجب ذلت سمجھ کر ہاتھ پاؤں مارنے میں مصروف ہے۔ سلطان بایزید خان یلدرم کو تیمور سے تو یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ وہ قیصر کا حمایتی بن کر مجھ سے لڑنے آئے گا اور نہ اس کو تیمور کا کچھ خوف تھا لیکن اس نے ضروری سمجھا کہ پہلے قیصر کا قصہ پاک کر دیا جائے۔ اس کے بعد اٹلی پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے قیصر سے جواب طلب کیا اور کوئی معقول جواب نہ پا کر قسطنطنیہ کے محاصرہ کی تیاری شروع کر دی۔

ادھر تیمور نے سمرقند سے روانہ ہو کر ایشیائے کوچک کی مغربی سرحد پر پہنچ کر آذربائیجان اور

ارمینیا میں قتل عام کے ذریعہ سے خون کے دریا بہائے اور اس علاقے پر اپنی ہیبت کے سکے بٹھائے۔ آذربائیجان وارمینیا کو فتح کرنے کے بعد تیمور کو سلطان بایزید یلدرم سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا بہ خوبی موقع مل گیا تھا کیونکہ اب اس کے سامنے سلطنت عثمانیہ کی حدود تھیں اور درمیان میں کوئی علاقہ حائل نہ تھا۔ آذربائیجان کے فرماں رواؤں کا طرز عمل ان دونوں مسلمان بادشاہوں کو ایک دوسرے سے جنگ آزما کرانے کا موجب ہو رہا تھا۔ یہ سرحدی حکام جب کبھی سلطنت عثمانیہ سے ناراض ہوتے تو تیمور سے امداد طلب کرتے اور جب تیمور سے ناراض ہوتے تو عثمانی سلطان سے مدد طلب کرتے۔ اسی سلسلہ میں قرایوسف ترکمان فرماں روائے آذربائیجان تیمور سے خائف وترساں اور آوارہ ہوکر سلطان بایزید یلدرم کے پاس چلا گیا تھا اور اس بات کا خواہاں تھا کہ عثمانی سلطان تیمور کے مقابلے میں اس کی مدد کر کے اس کے ملک میں اس کو تخت نشین کرا دے۔ تیمور نے جب آذربائیجان کو فتح کرلیا تو بایزید یلدرم نے ایک مختصر سی فوج کے ساتھ اپنے بیٹے ارطغرل نامی کو اپنے سرحدی شہر سیواس میں بھیج دیا کہ اگر تیمور اس طرف کو بڑھے تو اس کو روکے۔ تیمور نے عثمانی سلطان سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں عجلت سے کام نہیں لیا بلکہ بڑی احتیاط کے ساتھ تیاریوں میں مصروف رہا۔ اس نے اپنے تمام مقبوضات میں گشتی احکام روانہ کر کے تجربہ کار سپاہی اور منتخب فوجیں طلب کیں۔ ادھر جاسوسوں کی ایک بڑی تعداد فقیروں، درویشوں، صوفیوں، واعظوں، تاجروں اور سیاحوں کی شکل میں سلطنت عثمانیہ میں داخل کر دی اور تجربہ کار جاسوسوں کی ایک بڑی تعداد سلطان بایزید خان کے لشکر میں بھیجی کہ وہ جا کر ان مغلوں کو جوایشیائے کوچک میں بودوباش رکھنے کے سبب سے بایزید کے لشکر میں شامل اور اس کے لشکر کا جزو اعظم تھے، بہکائیں اور سمجھائیں کہ مغلوں کا قومی فرماں روا اور سردار تیمور ہے۔ تیمور کے مقابلے میں بایزید یلدرم ترکی سلطان کا ساتھ دینا قومی غداری اور بڑی بے عزتی کی بات ہے۔ چنانچہ تیمور کی یہ خفیہ حملہ آوری بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ بایزید یلدرم کی فوج کا ایک بڑا حصہ سلطان سے بددل اور بغاوت پر آمادہ رہنے لگا۔ تیمور کے ان جاسوسوں نے سلطان کے لشکر میں یہ خیال بھی پھیلا دیا کہ سلطان فوج کو بڑی بڑی تنخواہیں اور مال غنیمت میں زیادہ حصہ دینے میں بخل سے کام لیتا ہے۔ جبکہ تیمور کے سپاہی بہت آسودہ حال اور فارغ البال رہتے ہیں۔

اس انتظام سے فارغ ہوکر تیمور نے مناسب سمجھا کہ پہلے شام ومصر کا ملک فتح کرلوں۔ اس کو

معلوم تھا کہ مصر کا چرکسی بادشاہ فرج بن برقوق، بایزید خان یلدرم کا دوست ہے۔ جب ملک شام پر حملہ کیا جائے گا تو وہ دمشق کو بچانے کو ضرور ملک شام میں آ جائے گا اور چونکہ وہ تنہا کمزور ہے، اس لیے اس کو شکست دینا نہایت آسان کام ہے۔ کم از کم دمشق اور شام پر قبضہ ہو جانے سے بایزید خان یلدرم کو مصریوں اور شامیوں کی جانب سے کوئی امداد نہ پہنچ سکے گی۔ چنانچہ اس نے ادھر تو بایزید خان یلدرم کو خط لکھا کہ ہمارا باغی قرا یوسف ترکمان تمہارے پاس ہے، اس کو ہمارے پاس بھیج دو، ورنہ ہم تمہارے ملک پر چڑھائی کریں گے اور ادھر اپنی فوج لے کر سنہ ۸۰۳ھ میں حلب کے راستے ملک شام پر حملہ آور ہوا۔ تیمور کا خیال صحیح ثابت ہوا اور تیمور ابھی حلب ہی میں پہنچا تھا کہ شاہ مصر فوراً دمشق میں آ موجود ہوا۔ دمشق پر لڑائی ہوئی اور مصر کے چرکسی فرماں روا کو شکست کھا کر مصر کی طرف بھاگنا پڑا۔ مصری فوج، تیموری لشکر سے بہت مرعوب ہوگئی اور تیمور نے شام کے شہروں میں قتل عام کرا کر اور جا بجا کلہ مینار بنا کر لوگوں کو خوف زدہ بنا دیا۔ اس طرح اپنا مقصد پورا کر کے تیمور بغداد کی طرف متوجہ ہوا اور بغداد کو بھی بہ زور شمشیر فتح کر لیا۔ یہیں اس کے پاس سلطان بایزید خان یلدرم کے پاس سے خط کا جواب ملا، جس میں تیمور کی درخواست کو نہایت حقارت کے ساتھ روکا گیا تھا۔

تیمور پہلے سے جانتا تھا کہ بایزید یلدرم کیا جواب دے گا اور اسی لیے وہ ہر ایک ممکن تدبیر میں پہلے ہی سے مصروف تھا۔ اس جواب کو پا کر اس نے بغداد میں بھی زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اس تعداد سے سیدھا آذربائیجان کی طرف روانہ ہوا، جہاں اس نے اپنے دوسرے ملکوں سے وقتاً فوقتاً امدادیں طلب کی تھیں۔ یہاں پہنچ کر اس نے نہایت دوراندیشی اور ہوشیاری کے ساتھ رسد رسانی، خبر رسانی اور جاسوسی وغیرہ کے محکموں کو ترتیب دیا اور تمام ضروری مقامات پر پہلے سے سامان جنگ اور رسد رسانی کے لیے اہل کار اور زبردست عملہ مقرر و مامور کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بایزید خان یلدرم نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا تھا اور قسطنطنیہ کی فتح سے بہت ہی جلد فارغ ہونے والا تھا۔ اس نے شام کی فتح اور فرج بن برقوق شاہ مصر کی شکست کا حال سن کر قرا یوسف ترکمان کو ایک فوج دے کر روانہ کیا کہ بلاتامل شام میں پہنچ کر تیموری عاملوں کو قتل و اسیر کر کے ملک شام پر قبضہ کرے اور خود تیمور کے مقابلے کو روانہ ہوا۔ قسطنطنیہ کی فتح کو اس نے دوسرے وقت کے لیے ملتوی کر دیا۔ بہت زیادہ ممکن تھا کہ ملک شام کو چھین لینے پر اکتفا کر کے بایزید یلدرم خاموش ہو جاتا اور تیمور سے جنگ کرنا یعنی خود اس پر حملہ آور ہونا ضروری نہ جانتا کیونکہ وہ مسلمان بادشاہوں سے لڑنے کا شوق

نہ رکھتا تھا۔ اس کو تو ابھی یورپ کے رہے سہے ملکوں کے فتح کرنے کا خیال تھا اور وہ عیسائیوں ہی کو اپنی شمشیر خارا شگاف کے جوہر دکھانا چاہتا تھا، جن کو وہ جنگ نکوپولس میں سخت ہزیمت دے کر مرعوب بنا چکا تھا اور ہنگری و آسٹریا کی فتح کے بعد قسطنطنیہ و روما فتح کر کے گرجا میں اپنا گھوڑا باندھنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ مگر تیمور کئی سال سے نہایت سرگرمی کے ساتھ بایزید سے لڑنے اور اس کو شکست دینے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ بایزید یلدرم عیسائی طاقت کو دنیا سے نابود کرنے پر تلا ہوا تھا اور تیمور، بایزید کو نابود کرنے اور عیسائیوں کو بچانے پر آمادہ تھا۔

تیمور نے اپنے تمام سامان کو مکمل کر لینے کے بعد بایزید کے سرحدی شہر سیواس پر حملہ کر دیا۔ جہاں یزید کا بیٹا بہ طور قلعہ دار موجود تھا۔ بایزید کے بیٹے ارطغرل نے بڑی بہادری اور پامردی کے ساتھ قلعہ بند ہو کر مدافعت کی۔ تیمور نے سب سے پہلے اسی قلعے پر اپنی قلعہ گیری کے سامانوں کو آزمایا۔ اس نے قلعہ کا محاصرہ کر کے باہر سے قلعہ کی بنیادیں کھدوانی شروع کیں۔ تھوڑے فاصلہ پر عمیق گڑھے کھود کر اور بنیاد کے نیچے سے مٹی نکال کر لکڑی کے مضبوط شہتیر بنیاد کے نیچے کھڑے کر دیے، پھر ان گڑھوں اور شہتیروں پر معلق کر دیا گیا، پھر ان تمام شہتیروں میں آگ لگا دی گئی۔ شہتیروں کے جلنے سے قلعہ کی تمام دیوار یک لخت زمین میں دھنس گئی۔ اس طرح یکا یک اپنے آپ کو بے پناہ دیکھ کر محصورین نے ہتھیار ڈال دیے اور سب کے سب جن کی تعداد نے عجیب وغریب حلیہ اختیار کیا تھا، اسی طرح اس نے ان ترک قیدیوں کے ساتھ سفاکی و بے دردی کا سلوک بھی بہت ہی عجیب وغریب کیا یعنی اس نے بہ جائے اس کے کہ ان کو جان کی امان دیتا، سب کی مشکیں کسوائیں اور ان کے سروں کو ان کے گھٹنوں کے درمیان لے جا کر رسیوں سے جکڑ کر گٹھڑی کی طرح بندھوا دیا، پھر گہری گہری خندقیں کھدوا کر ان میں سب کو ڈال دیا۔ ان خندقوں یا یوں کہیے کہ قبروں پر تختے رکھا کر اوپر سے مٹی ڈال دی گئی۔ زندہ درگور کرنے کا جب اس ظالمانہ فعل کا تصور کیا جاتا ہے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

بایزید یلدرم نے جب اپنے بیٹے اور چار ہزار ہم قوم ترکوں کے اس طرح ہلاک ہونے کا حال سنا تو وہ اپنے ہوش میں نہ رہا۔ غالباً تیمور کا بھی یہی منشاء تھا کہ بایزید آپے سے باہر ہو کر عقل وخرد سے بیگانہ ہو جائے اور فوراً مقابلہ پر آ جائے۔ بایزید یلدرم سے اس کے بعد جو بداحتیاطی اور

ناعاقبت اندیشی ظہور میں آئی، اس کو غضب وغصہ کا نتیجہ سمجھ لیجیے یا اس الزام کا نتیجہ قرار دیجیے جو شراب خوری کے متعلق اس پر لگایا گیا ہے۔ بہرحال اس کے بعد جنگی حزم واحتیاط کے معاملہ میں تیمور ہر ایک اعتبار سے پورا اور بایزید ناقص ثابت ہوتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے تک بایزید یلدرم سے جنگی معاملات میں کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنے آپ کو بڑا قابل اور لائق تعریف ثابت کر چکا تھا۔ بایزید، تیمور کی طاقت سے واقف تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس ۶۹ سال کی عمر کے بوڑھے دشمن کی ساری عمر لڑائیوں میں صرف ہوئی ہے۔ اس کے پاس یہ خبر بھی پہنچ چکی تھی کہ تیمور کی رکاب میں پانچ لاکھ سے اوپر انتخابی فوج موجود ہے۔ بایزید اس عجلت میں جس قدر فوج جمع کر سکتا تھا، اس نے جمع کی اور سیواس کی طرف، جہاں اس کا بیٹا زندہ درگور کیا گیا تھا اور اس کا دشمن اپنی فوج لیے ہوئے پڑا تھا، بڑھا۔ اس کی فوج میں اس کی عیسائی بیوی کا بھائی شاہ سرویا اور بہ قول دیگر فرانسیسی بیوی کا بھائی ایک فرانسیسی سردار بھی موجود تھا، جو بیس ہزار سواروں کا افسر تھا۔ بایزید کو سرعت رفتار کے ساتھ آتا ہوا سن کر تیمور نے ایک نہایت ہی موثر سپاہیانہ چال چلی، جو اس نے پہلے ہی سے سوچ رکھی تھی اور اس کے متعلق پہلے سے ہر قسم کا انتظام کر لیا تھا۔ بایزید نے سیواس کی طرف اپنی فوج کے بعض حصے پہلے روانہ کر دیئے تھے اور ہر قسم کا ضروری سامان بھی ساتھ لے لیا تھا۔ تیمور اس وقت تک کہ بایزید کا لشکر سیواس کے قریب پہنچا، وہیں مقیم رہا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ بایزید جو پیچھے آرہا ہے، اپنا راستہ نہ بدل سکے گا تو وہ سیواس کو چھوڑ کر اور وہاں سے کترا کر جنوب کی طرف چل دیا اور مغرب کی جانب مڑ کر سیدھا شہر انگورہ کی طرف گیا اور جا کر شہر انگورہ کا محاصرہ کر لیا۔ بایزید یلدرم جب سیواس پہنچا تو اپنے بیٹے کے مقتل کو دیکھ کر غم وغصہ سے بیتاب ہو گیا لیکن اس نے تیمور اور اس کی فوج کو وہاں نہ پایا بلکہ اس کو معلوم ہوا کہ تیمور اپنی فوج لے کر سیواس سے دو سو پچاس میل مغرب کی جانب اندرون ملک یعنی شہر انگورہ میں جا پہنچا ہے۔ شہر انگورہ کی تباہی کا تصور بایزید یلدرم کے لیے سیواس کی تباہی سے بھی زیادہ رنج دہ تھا اور تیمور کے اس طرح ایشیائے کوچک کے عقب میں پہنچ جانے کو وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اب اس کے لیے مناسب یہی تھا کہ وہ چشم اندیشہ سوز کا مغلوب نہ ہوتا اور قرا یوسف ترکمان اور شامی ومصری سرداروں کو تیز رفتار قاصدوں کے ذریعہ سے اطلاع دے کر تیمور کی طرف بڑھنے کی طرف دعوت دیتا اور خود تیمور کو اپنے ملک میں ہر طرف سے گھیر کر بند کرنے اور اس کے ذرائع رسد رسانی کو منقطع ومسدود کرنے کی تدبیریں عمل میں

لاتا، اور تیمور اگر مغرب کی جانب بڑھتا اور شہروں کو برباد کرتا تو یہ کام اس کو کرنے دیتا کیونکہ اس کے چاروں طرف وہ علاقے تھے جہاں عثمانی جاگیردار اور سلطنت عثمانیہ کے فدائی ترک بہ کثرت آباد تھے اور چاروں طرف سے بڑی زبردست فوجیں مجتمع ہو کر تیمور کے لشکر کو اپنی حملہ آوریوں کا مرکز بنا سکتی تھیں۔ اس طرح تیمور کو جال میں پھنسا کر گرفتار کر لینا بایزید کے لیے کچھ بھی مشکل نہ تھا مگر تیمور بایزید کے مزاج سے یقیناً خوب واقف تھا اور وہ جانتا تھا کہ میرا حریف اس قدر مآل اندیشی کو ہرگز کام میں نہ لا سکے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بایزید جو بڑی آسانی سے چار لاکھ فوج سیواس کے میدان میں جمع کرنے کا اہتمام کر چکا تھا اور تیمور سے کسی طرح مغلوب ہونے والا نہ تھا، جوش غضب میں بلا تامل دو منزلہ وسہ منزلہ یلغار کرتا ہوا سیواس سے انگورہ کی طرف چلا۔ اس تیز رفتاری اور مسلسل سفر میں صرف ایک لاکھ بیس ہزار فوج اس کے ہمراہ رہ سکی۔ یہی عجلت بایزید یلدرم کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی غلطی تھی۔ بایزید یلدرم جب اپنی اس تھکی ماندی ایک لاکھ بیس ہزار فوج کو لے کر انگورہ کے متصل پہنچا تو تیمور اپنی پانچ لاکھ سے زیادہ فوج کو جو خوب تازہ دم اور ہر طرح مقابلہ کے لیے تیار تھی، لیے ہوئے بہترین مقام پر خیمہ زن تھا۔ تیمور نے اپنی فوج کے لیے شہر انگورہ کے شمال ومغرب میں بہتر سے بہتر موقع انتخاب کر لیا تھا اور جہاں جہاں خندق یا دمدمے کی ضرورت تھی، تیار کرا چکا تھا۔

بایزید یلدرم نے تیمور کی لشکر گاہ کے شمال کی جانب اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں تیمور کی اس عظیم الشان فوج کو بالکل خاطر میں نہیں لاتا، قریب کے ایک مرتفع پہاڑی علاقے میں لے جا کر اول شکار میں مصروف ہوا اور جنگ کا سپاہیوں سے محاصرہ کرا کر چنگیزی طریقہ سے دائرہ کو چھوٹا کرنا اور جنگلی جانوروں کو ایک مرکز کی طرف لانا شروع کیا، جہاں سلطان اور اس کے سردار جانوروں کے شکار کرنے میں مصروف تھے۔ اس شکار میں تھکی ماندی فوج کو پانی نہ ملنے کی سخت تکلیف برداشت کرنی پڑی اور جو وقت سپاہیوں کو آرام کرنے اور ستانے کے لیے ملنا چاہیے تھا، وہ اس محنت اور تشنگی کے عالم میں بسر ہوا۔ جس میں پانچ ہزار سپاہی پیاس کے مارے مر گئے اور فوج کے دل سے سلطان کی محبت کم ہو گئی۔ اب جو شکار سے اپنے کیمپ کی طرف واپس ہوا تو معلوم ہوا کہ کیمپ پر دشمن نے قبضہ کر لیا ہے۔ اس کے جس پانی کے چشمہ پر عثمانی لشکر کا گزر ممکن تھا، اس چشمہ کو اوپر سے بند لگا کر اور دوسری طرف سے اس کا رخ پھیر کر تیمور کی دوراندیشی اور تجربہ کاری نے پہلے ہی خشک کرا

دیا تھا۔ بایزید یلدرم اگرچہ خود بھی لڑائی میں دیر اور تامل کرنے والا نہ تھا مگر غالباً وہ اپنے کیمپ میں پہنچ کر اور کم از کم فوج کو پانی پینے کی مہلت دینے کے بعد ہی صفوف جنگ تیار کرتا مگر اب وہ تیمور کی ہوشیاری اور چالاکی کے سبب سے مجبور ہو گیا کہ اپنی فوج کو اسی خراب خستہ حالت میں لیے ہوئے بلا تامل دشمن پر حملہ آور ہو۔

جنگ انگورہ:

۱۹ ذی الحجہ سنہ ۸۰۴ھ مطابق ۲۰ جولائی سنہ ۱۴۰۲ء کو بایزید اور تیمور کی زور آزمائی شروع ہوئی اور مغرب کے وقت جبکہ رات شروع ہو گئی تھی، لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ بایزید یلدرم کے ساتھ جو فوج تھی، اس کی تعداد تو سب نے ایک لاکھ بیس ہزار بتائی ہے لیکن تیمور کی فوج عام طور پر پانچ لاکھ سے زیادہ اور بعض مورخین نے آٹھ لاکھ بیان کی ہے۔ بہرحال اگر تیمور کی فوج کو کم سے کم بھی مانا جائے، تب بھی وہ بایزید یلدرم کی فوج سے چوگنی ضرور تھی اور اگر اس بات کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ تیمور کی فوج ستائی ہوئی، تازہ دم اور بایزید کی فوج تھکی ماندی، بھوکی پیاسی تھی تو دونوں کی طاقت کے تناسب میں اور بھی زیادہ فرق ہو جاتا ہے۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر بایزید کی فوج کے مغلیہ دستوں نے عین معرکہ جنگ میں جو غداری دکھائی اور عیسائی سرداروں سے جو کمزوری ظہور میں آئی اس کا تصور بایزید اور تیمور کے مقابلہ کو شیر اور بکری کا مقابلہ ثابت کرتا ہے مگر یہ سب کچھ بایزید کی ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ سمجھنا چاہیے اور اس بات سے ہرگز انکار نہیں ہونا چاہیے کہ جنگ انگورہ میں بایزید کی بیوقوفی اور جاہلانہ جوش کی نمائش ہوئی اور تیمور کی جنگ مآل اندیشی اور دور بینی کا بخوبی اظہار ہوا۔ یہ ایک بالکل جدا بات ہے کہ ہم بایزید یلدرم کو شکست سے متاسف ہونے اور تیمور کو اس لڑائی میں خطاکار سمجھتے ہیں کیونکہ اس لڑائی کے نتائج عالم اسلام کے لیے بے حد نقصان رساں برآمد ہوئے اور یورپ جو اسلامی براعظم بننے والا تھا، عیسائی براعظم بن گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس لڑائی کے تفصیلی حالات اور مفصل کیفیت لکھنے کو اس لیے جی نہیں چاہتا کہ خاندان عثمانیہ کو جو ایک دین دار اور پابند دین خاندان تھا، اس لڑائی نے سوگوار بنا دیا لیکن فرائض تاریخ نگاری بھی ضرور پورے ہونے چاہییں، لہٰذا مختصر کیفیت پڑھیے:

امیر تیمور نے صفوف لشکر کو اس طرح آراستہ کیا کہ میمنہ پر شہزادہ مرزا شاہ رخ کو افسر مقرر کیا۔

میمنہ کی اس فوج میں جن سرداروں کی فوجیں شامل تھیں، ان کے نام یہ ہیں: امیر زادہ خلیل سلطان، امیر سلیمان شاہ، امیر رستم برلاس، سونجک بہادر، موسیٰ، توی بوغا، امیر یادگار وغیرہ۔ میمنہ کی فوج کے لیے امیر زادہ مرزا سلطان حسین کو ایک زبردست فوج کے ساتھ کمکی مقرر کیا۔

میسرہ میں امیر نورالدین جلائر، امیر برندق برلاس، علی توجین، امیر مبشر، سلطان سنجر برلاس، عمر ابن تابان وغیرہ اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ متعین تھے۔ میسرہ کی ان تمام فوجوں کا افسر اعلیٰ شہزادہ میراں شاہ کو مقرر کیا گیا تھا۔ میسرہ کی کمکی فوج امیر زادہ ابوبکر، امیر جہاں برلاس، پیر علی سلندوز کے سپرد کی گئی۔

قلب کی فوج کے دائیں حصے میں تاش تمور اغلن ازبک، امیر زادہ احمد، جلال باورچی یوسف، بابا حاجی سوجی، اسکندر ہندو بوغا، خواجہ علی اریوی، دولتمور، محمد قوجین، ادریس قورچی وغیرہ شامل تھے۔ ان سرداروں کی پشت پر بیگ ولی، ایلچکدائی ہری ملک، ارغون ملک صوفی خلیل، ایسن تمور، شیخ تمور، سنجر و حسین و عمر بیگ پسران نیک روزا، جون عربانی، بیری بیگ قوجین، امیر زبرک برلاس وغیرہ امراء بہ طور کمکی مقرر ہوئے۔

قلب کے بائیں حصے کی سرداری امیر توکل قراقرا، علی محمود، شاہ ولی، امیر سونجک تنکری، بیزش خواجہ، محمد خلیل، امیر لقمان، سلطان برلاس، میرک ایلچی، پیر محمد، شنکرم، شیخ اصلان الیاس، کپک خانی، دولت خواجہ برلاس، یوسف برلاس، علی قبچاق وغیرہ کو سپرد ہوئی۔ ان سرداروں کی کمکی فوج میں امیر زادہ محمد سلطان، امیرزادہ پیر محمد، اسکندر، شاہ ملک، الیاس خواجہ، امیر شمس الدین وغیرہ اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ شامل تھے۔

مذکورہ بالا تقسیم و ترتیب کے علاوہ نہایت زبردست چالیس دستے تیمور نے اپنی رکاب میں جدا محفوظ رکھے تاکہ لڑائی کے وقت جس حصہ فوج کو ضرورت ہو، فوراً امداد پہنچائی جا سکے۔ اس پانچ چھ لاکھ بلکہ آٹھ لاکھ فوج کے علاوہ فیلان کوہ پیکر کی بھی ایک بڑی تعداد جن کی صحیح گنتی معلوم نہیں، تیمور کے پاس اس جنگ میں موجود تھی۔ ان جنگی ہاتھیوں کی صف لشکر کے آگے ایستادہ کی گئی تھی۔ بایزید کے پاس کوئی جنگی ہاتھی نہ تھا۔

سلطان بایزید نے میسرہ کی فوج سلیمان چلپی کو سپرد کی۔ میمنہ کی فوج کا افسر اپنے عیسائی سالے یعنی برادر زن کو بنایا۔ خود قلب کو سنبھالا اور اپنے پیچھے موسیٰ و عیسیٰ و مصطفیٰ اپنے تینوں بیٹوں کو رکھا۔

طرفین سے طبل جنگ بجا اور شیران غزندہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ غزیو لشکر نے اردگرد کے ٹیلوں اور پہاڑوں کو لرزا دیا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے فرش زمین نے غبار ہوا گیر ہو کر ابر تیرہ کی صورت اختیار کر کے تمازت آفتاب کو کم کیا۔ مگر خود شمشیر اور سنان وزرہ نے ایک دوسرے سے ٹکرا کر چنگاریاں برسائیں۔ خون کے فواروں سے چھڑکاؤ شروع ہوا۔ بہادروں کی اگلی صفیں چشم زدن میں مردہ لاشیں بن کر بوریئے کی طرح زمین پر بچھی ہوئی نظر آنے لگیں۔ پچھلی صفوں کے سپاہی اپنے بھائیوں کی لاشوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھنے اور فوراً دوسروں کے لیے فرش راہ بننے لگے۔ تیروں کی سرسراہٹ، کمانوں کی چرچراہٹ، تلواروں کی چکاچخ، نیزوں کے زرہوں میں پھنس جانے کا شور، شمشیروں کے آپس میں لڑ کر ٹوٹ جانے کی جھنکار، ''باش کہ اینک می رسم، ہشیار باش، شاباش، کجا می روی، یکے ازمن بستان بگیر دبزن''۔ مردانہ پیش بیا کی آوازوں کا غل، تلواروں اور برچھیوں کی بجلیوں کا چمکنا، خون کا زمین پر برسنا، لاشوں اور سروں کا دھڑا دھڑ گرنا، زخمیوں کے منہ سے کبھی کبھی باوجود ضبط آہ کا نکل جانا، ہاتھیوں کا چنگھاڑنا، گھوڑوں کا ہنہنانا، یہ سب مل ملا کر ایک ایسا لطف انگیز اور مسرت خیز سماں تھا کہ خوش نصیبوں ہی کو مدت العمر میں کبھی ایک دو مرتبہ ایسے دلچسپ تماشوں کے دیکھنے یا ان میں شریک ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔ ایسے تماشوں اور ایسے نظاروں کی خواہش میں بہادروں کے دل بے چین اور نوجوانوں کی آنکھیں نگران رہا کرتی ہیں۔ ایسے دلچسپ اور خوں فشاں مناظر کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں سر ان کی رونق بڑھانے کے لیے جسم سے جدا ہو جاتے ہیں۔ جوش مسرت اور ہجوم شادمانی کا اس سے بڑھ کر اور کیا موقع ہو سکتا ہے کہ جسم انسانی کا تعلق لوہے کے ساتھ حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ تلواریں خشک چمڑے کے نیام میں قیام کرنا پسند نہیں کرتیں بلکہ انسان کے زندہ گوشت میں چلنا ان کو مرغوب ہوتا ہے، سنان کی خواہش میں سینے آگے بڑھتے ہیں اور برچھی کے پھل کی مشایعت میں خون کے فوارے محبت کی وجہ سے نکلتے ہیں۔ نامردوں نے سمجھ رکھا ہے کہ قیس عامری سب سے بڑا عاشق تھا جو لیلیٰ کی محبت میں مجنون بن گیا لیکن محبت کی حقیقت ان جواں مردوں سے پوچھو جو شمشیر دودم پر دم دیتے اور میدان جنگ میں جس طرح تلوار خون کے دریا میں نہاتی ہے، اسی طرح آپ بھی غرق خون ہونے کا شوق رکھتے ہیں۔ بہادروں سے ان باتوں کی تصدیق کرو، نامردوں کو یہ پرلطف و پرسکون باتیں نہ سناؤ کیونکہ وہ اپنا اور تمہارا وقت کج بحثی میں ضائع کر دیں گے۔

انگورہ کے میدان میں اس روز شام تک یہ دلچسپ تماشا ہوتا رہا اور آسمان و آفتاب دونوں کی حسرت رہی کہ غبار کے بادل نے حائل ہو کر ان کی بہادروں کی قابلیت جنگی اور جواں مردوں کی نہنگانہ فرہنگی کا اچھی طرح معائنہ نہ کرنے دیا۔ تیمور کی فوج میں سے شہزادہ ابوبکر نے سلیمان چلپی پر ایک نہایت سخت حملہ کر کے ترکوں کی صفوں کو درہم برہم کر دیا۔ ابوبکر کے بعد ہی سلطان حسین نے دوسرا حملہ سلیمان پر کیا۔ ان دونوں حملوں نے کچھ کم صدمہ نہیں پہنچایا تھا کہ تیسرا حملہ محمد سلطان نے کیا۔ سلطان بایزید یلدرم کے میسرہ کی ایسی نازک حالت دیکھ کر بایزید کا ایک سردار محمد خان چلپی سلیمان کی مدد کے لیے بڑھا۔ تیموری لشکر کے ان سخت و شدید حملوں کو ترکی فوج نے بڑی بہادری و مردانگی کے ساتھ روکا اور مغلوں کی اس کثیر التعداد حملہ آور فوج کو تھوڑی دیر کی شمشیر زنی کے بعد اپنی مقررہ جگہ پر جو ایک سطح مرتفع تھی، واپس آ جانا پڑا۔ سلطان بایزید کے میسرہ پر جب یہ مصیبت آ رہی تھی تو وہ اپنی فوج کے حصہ قلب کے ساتھ مغلوں کے اس عظیم و شدید حملہ کو روک رہا تھا جو مغلوں کے قلب نے جنگی ہاتھیوں کے ساتھ بایزید پر کیا تھا۔ بایزید اس معرکہ میں اپنے انتہائی تہور کے سبب سے یہ بھول گیا کہ میں اپنی تمام فوج کا سپہ سالار اعظم ہوں اور مجھ کو صفوف قتال سے جدا رہ کر میدان جنگ کے ہر حصہ پر نظر رکھنی چاہیے بلکہ اس نے ایک بہادر سپاہی کی طرح بہ ذات خود دشمن پر صفوف شکن حملے شروع کر دیے۔ اس کی بہادر فوج نے بھی اپنے سردار کی طرح صف شکنی و حریف افگنی کا خوب حق ادا کیا۔ چنانچہ بایزید نے مغلوں کے قلب کی فوج کو اپنے سامنے سے ہٹا دیا اور تیموری سرداروں کو بھگا دیا۔ اب بایزید کا فرض تھا کہ وہ اپنے یمین و یسار کی فوجوں کا بندوبست کرتا اور اپنی جمعیت کو بہ طریق احسن ترتیب دے کر آگے بڑھتا لیکن اس نے اپنے مقابل کی فوجوں کو بھگا کر بے تحاشا اسی سطح مرتفع پر حملہ کیا جہاں ابوبکر و سلطان حسین وغیرہ واپس ہو کر متمکن تھے۔ تیموری شہزادے اور تیموری سردار، بایزید کے اس حملہ کی تاب نہ لا سکے۔ بایزید نے چشم زدن میں دشمن کے چھ زبردست سرداروں کو بے دخل کر کے اس ٹیلہ پر قبضہ کر لیا۔ تیمور شروع سے آخر تک بہ ذات خود جنگ میں شریک نہیں ہوا لیکن میدان جنگ کے ہر گوشہ پر اس کی نظر تھی۔ اس نے اس بچھی ہوئی شطرنج میں اپنے جس مہرہ کو کمزور دیکھا، اسے زور پہنچایا اور جہاں سے جس مہرہ کو پیچھے ہٹانا مناسب سمجھا، فوراً پیچھے ہٹایا۔ غرض اس نے انتہائی دوراندیشی اور کمال حزم و احتیاط کے ساتھ میدان جنگ کا رنگ شام تک اپنے حسب منشا بنا لینے کی کوشش کی۔ بایزید کو اس طرح فاتحانہ آگے

بڑھا ہوا دیکھ کر اس نے اپنے تازہ دم دستوں کی مدد سے بایزید کے میمنہ اور میسرہ پر یک لخت حملہ کرا کر بایزید کو اس کی فوج کے بڑے حصے سے جدا کر دیا۔ عین اسی وقت بہت سے مغلیہ دستے جو یزید کی فوج میں شامل تھے، تیموری لشکر میں شامل ہو گئے، جس سے بایزید کے لشکر کو سخت نقصان پہنچا۔ اب تیمور نے اپنی فوج کی کثرت تعداد سے فائدہ اٹھانے کی نہایت باموقع کوشش کی یعنی قرنا کے ذریعہ سے تمام فوج کو دشمن پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ بایزید کا میمنہ اور میسرہ پہلے ہی مغلوں کی بے وفائی سے سخت مجروح اور کمزور ہو چکا تھا۔ اس حملہ آوری نے بایزید کے میمنہ اور میسرہ کو درہم برہم کر دیا۔ بایزید کا بیٹا مصطفیٰ مارا گیا۔ اس کا برادر زن یعنی عیسائی سردار بہ حالت تباہ فرار ہوا اور بایزید اپنے رکابی دستہ کے ساتھ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھر گیا۔ بایزید اور اس کے جاں نثاروں نے اس حالت میں شمشیر زنی کے جو جوہر دکھائے، وہ انہیں کا حصہ تھا۔ بایزید کی یہ کیفیت تھی کہ وہ جس طرف حملہ آور ہوتا تھا، مغلوں کے ٹڈی دل کو دور دور تک پیچھے دھکیل دیتا تھا۔ کئی مرتبہ ایسی نوبت پہنچی کہ بایزید حملہ آور ہو کر اور مغلوں کی صفوں کو چیر کر اس مقام تک پہنچ گیا جہاں تیمور کھڑا ہوا اپنی فوج کو حملہ کی ترغیب دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ رات کی تاریکی شروع ہو جانے پر جبکہ بایزید کے قریباً تمام جاں نثار مارے جا چکے تھے، یہ عثمانی شیر بھی کمندیں ڈال کر یا گھوڑے کے ٹھوکر کھانے سے گر جانے پر گرفتار کر لیا گیا اور میدان انگورہ میں اسلامی دنیا کی وہ تمام امیدیں جو یزید کی ذات سے وابستہ تھیں، دفن ہو گئیں۔

اگر فطرت مسخ نہ ہو گئی ہو تو انسان کا خاصہ ہے کہ وہ بہادری کی قدر کرتا اور بہادر انسان کو محبوب رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں شیر کو جو انسان کو ہلاک کرنے والا جانور ہے، عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور لوگ اس بات کے خواہاں رہتے ہیں کہ ان کو شیر سے تشبیہہ دی جائے۔ حالانکہ بیل اور گھوڑا انسان کے بہت کام آتے ہیں مگر کوئی شخص اپنے کو بیل یا گھوڑا کہلانا پسند نہیں کرتا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو جو عظمت دنیا میں حاصل ہے، اس کا سبب بھی وہی بہادری ہے جو فطرت انسانی کے لیے محبوب و مرغوب چیز ہے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، سلطان صلاح الدین رحمہ اللہ، پنولین، عثمان پاشا وغیرہ شیر دل انسانوں کو دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم میں یکساں عزت و عظمت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں یورپ کی جنگ عظیم کے زمانے میں جرمن کا ایک چھوٹا سا ایمڈن نامی جنگی جہاز بحر ہند اور بحر الکاہل کی طرف نکل آیا تھا۔ اس جہاز نے عرصہ تک غیر معمولی بہادری

اور جرأت کے نمونے دکھائے اور انگریزوں کو بہت سخت نقصان پہنچایا لیکن جب اس کا کپتان گرفتار ہو کر انگلستان پہنچا تو باشندگان انگلستان اس کی زیارت کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے اور اس کو نہایت عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہم جب شاہنامہ میں رستم [1] کی بہادریوں کے حالات پڑھتے پڑھتے اس مقام پر پہنچتے ہیں، جہاں رستم ایک پرستارزادہ شغاد نامی کے ہاتھ سے ہلاک ہوا ہے تو ہمارا دل حزن وملال سے لبریز ہو جاتا ہے۔ حسرت واندوہ کا سب سے زیادہ اہم اور عظیم الشان مظاہرہ اس وقت معائنہ ہوسکتا ہے جبکہ کسی بہت بڑے بہادر کا انجام ناکامی کی شکل میں نمودار ہو، غالباً سلطان بایلدرم کا انگورہ کے میدان میں گرفتار ہوجانا بھی دنیا کا ایسا ہی عظیم الشان واقعہ ہے جس کے تصور سے بے اختیار قلب پر حسرت واندوہ کا ہجوم چھا جاتا ہے۔

میدان انگورہ میں اگر تیمور کو شکست ہوتی تو یقیناً تیمور اور اس کے خاندان کو نقصان عظیم پہنچتا۔ لیکن عالم اسلام کو تیمور کی شکست سے کسی نقصان کا اندیشہ نہ تھا کیونکہ مشرقی ممالک جو تیمور کے قبضے میں تھے، وہ تیمور کے بعد بھی مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہتے، ان کی نسبت یہ اندیشہ ہرگز نہ تھا کہ مسلم ممالک کسی غیر مذہب کی حکومت میں شامل ہو جائیں گے لیکن بایزید کی شکست سے عالم اسلام کو سخت نقصان پہنچا۔ کیونکہ یورپ کی طرف اسلامی پیش قدمی رک گئی اور نیم مردہ یورپ پھر اطمینان وسکون کے سانس لینے لگا۔ بایزید یلدرم اور تیمور کی اس جنگ میں اگر بایزید یلدرم کو فتح حاصل ہوتی تو چونکہ بایزید کی فوج چوتھائی سے کم تھی، اس لیے یہ لڑائی سنہ ۴۶۳ھ کی اس لڑائی کی مانند سمجھی جاتی جو ایشیائے کوچک کے میدان ملاذکرد میں ہوئی، جس میں سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے مسلمانوں کی صرف بارہ ہزار فوج سے عیسائیوں کی دو تین لاکھ فوج کو شکست دی تھی یا پانی پت کی تیسری لڑائی سے مشابہ ہوتی جو سنہ ۱۱۷۴ھ میں ہوئی جس میں مسلمانوں کی صرف اسی نوے ہزار فوج نے ہندوؤں کی پانچ چھ لاکھ فوج کو شکست فاش دی یا جنگ کسووا اور جنگ نکوپلس کی فہرست میں داخل ہوتی کیونکہ ان تمام لڑائیوں میں تھوڑی تھوڑی فوجوں نے بڑی بڑی فوجوں کو شکست فاش دی تھی۔ غالباً جنگ نکوپلس پر ہی قیاس کر کے بایزید یلدرم نے اپنی قلت اور تیمور کی کثرت پر کوئی لحاظ نہیں کیا۔ مگر اس نے یہ نہ سوچا کہ تیمور اور اس کی فوج بھی تو مسلمان ہی ہے۔ جن لڑائیوں میں غیر معمولی کثرت

---

[1] ایران کا مشہور مجوسی بہادر اور پہلوان اور جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ایران کے ساتھ لڑی جانے والی مشہور لڑائی، جنگ قادسیہ میں ایرانی افواج کا سپہ سالار۔ رستم اس لڑائی میں ہلال بن علقمہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا۔

نے حیرت انگیز قلت سے شکست کھائی، ان میں ہمیشہ بڑی فوج کفار کی اور چھوٹی فوج مسلمانوں کی ہوا کرتی تھی۔ لیکن جنگ انگورہ میں چونکہ دونوں طرف مسلمان تھے، اس میں کثرت کو قلت پر غالب آنا چاہیے تھا، چنانچہ غالب ہوئی۔

تیمور بھی اگرچہ چنگیزی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور چنگیز خان ہی کی مانند بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ملک گیر وفتح مند تھا لیکن چونکہ مسلمان تھا، لہٰذا اس کا وجود اور اس کی ملک گیری باوجود اس کے کہ وہ مسلمانوں ہی سے زیادہ لڑا، چنداں قابل شکایت نہ تھی کیونکہ مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایک عظیم الشان بادشاہی میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ مسلمانوں کی اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی ہوسکتی تھی کہ ان کی ایک عظیم الشان بادشاہی مغرب میں اور ایک مشرق میں قائم ہوگئی تھی۔ مسلمانوں کا ایک بادشاہ مغرب میں فتوحات حاصل کرتا ہوا ساحل فرانس اور رود بار انگلستان تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اسی طرح دوسرا تیمور مشرق کی طرف متوجہ ہوکر ساحل چین اور بحیرہ جاپان تک فتوحات حاصل کرتا ہوا چلا جاتا تو تمام دنیا کے فتح ہو جانے اور اسلام کے زیر سایہ آ جانے میں کوئی کلام نہ تھا کیونکہ جس طرح مشرق میں کوئی تیمور کا مدمقابل نہ تھا، اسی طرح مغرب میں کوئی طاقت بایزید یلدرم کی ٹکر سنبھالنے والی نہ تھی۔ مگر افسوس ہے کہ انگورہ کے میدان نے ان دونوں مسلم بادشاہوں کو اپنی طرف کھینچا اور یہ دونوں آپس میں ٹکرائے۔ سمندر میں دو جہازوں کا ٹکرانا خشکی میں دو تیز رفتار ریل گاڑیوں کی حالت گرم رفتاری میں مقابل سمتوں سے آ کر متصادم ہونا، دو مست ہاتھیوں کا آپس میں ٹکرانا، دو خوں خوار ببر شیروں کا ایک دوسرے پر حملہ آور ہونا بلاشک بڑے ہی ہیبت ناک اور زہرہ شگاف مناظر ہوتے ہیں لیکن انگورہ کے میدان میں تیمور و بایزید دو مسلمان بادشاہوں، دنیا کے دو عظیم الشان فتح مندوں، دنیا کے دو سب سے بلند مرتبہ بہادروں کا ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونا سب سے بڑھ کر ہیبت ناک اور سب سے زیادہ زہرہ شگاف نظارہ تھا۔ دو پہاڑ اپنی اپنی جگہ سے حرکت کر کے ایک دوسرے کو ریزہ ریزہ کر دینے کے لیے میدان انگورہ کی طرف بڑھے تھے یا دو سمندر ایک دوسرے کو ریزہ ریزہ کر دینے کے لیے میدان انگورہ کی طرف بڑھے تھے یا دو سمندر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے جوش میں آ گئے تھے۔ بہرحال جنگ انگورہ دنیا کا ایک نہایت عظیم الشان اور بے نظیر واقعہ ہے۔

اس لڑائی میں بایزید یلدرم کا بیٹا موسیٰ بھی باپ کے ساتھ قید ہوگیا تھا۔ شہزادہ محمد اور شہزادہ عیسیٰ

میدان جنگ سے بھاگ کر اپنی جان بچا سکے تھے۔ تیمور نے سلطان بایزید کو ایک آہنی قفس میں قید کیا اور اس لڑائی کے بعد اسی حالت میں قید میں اس کو اپنے ساتھ ساتھ سفر میں لیے پھرا۔ سلطان بایزید یلدرم کو جو ایک عالی جاہ بادشاہ تھا، اس طرح ذلت کے ساتھ قید کرنا اور اس کی تشہیر ورسوائی سے لطف حاصل کرنا تیمور کے شریفانہ اخلاق پر ایک سیاہ اور مکروہ دھبہ ہے۔ بہادروں اور شریفوں کو جب اپنے دشمن پر پورا پورا قابو حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اس مجبور ومغلوب دشمن پر ہمیشہ احسان کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے جب قیصر قسطنطنیہ کو ملاذ کرد کے میدان جنگ میں گرفتار کیا تو اس کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ رخصت کیا اور اس کو اس کے مقبوضہ ملک کا پھر فرماں روا بنا دیا۔ سکندر یونانی کے سامنے جب پنجاب کا راجہ گرفتار ہو کر آیا تو اس نے نہ صرف یہ کہ پنجاب کا ملک ہی اس کو دیا بلکہ اس میں اور بھی ملک اپنی طرف سے اضافہ کر کے اس کو پنجاب کا فرماں روا بنا دیا۔ خود بایزید یلدرم نے نکوپولس کے میدان جنگ میں ۲۵ شہزادوں کو گرفتار کیا اور پھر سب کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ جاؤ اب دوبارہ اچھی طرح میرے مقابلے کے لیے تیاری کرو۔ افسوس کہ ایسے بے نظیر بہادر اور ایسے مجاہد اسلام پر قابو پا کر تیمور نے جو سلوک اس کے ساتھ کیا، اس سے تیمور کی بہادری وملک گیری کا مرتبہ نگاہوں سے گر جاتا ہے۔ تیمور نے بایزید یلدرم کو اس طرح کٹھرے میں رکھا جس طرح شیروں کو کٹھرے میں بند رکھا جاتا ہے۔ اس سے ایک شاعرانہ تسکین بخش تخیل ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس نے اس عثمانی شیر کو شیر ہی سمجھ کر قفس آہنی میں بند کیا تھا۔ لیکن اس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا کہ تیمور کی آدمیت انسان وحیوان میں کوئی فرق نہ دیکھ سکی۔

بایزید یلدرم کو جنگ انگورہ کے نتیجے میں جو ذلت سہنی پڑی، وہ معمولی نہ تھی اور اسی لیے وہ سخت وشدید قید میں آٹھ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ تمور نے بایزید یلدرم کے فوت ہو جانے پر صرف اس قدر انسانیت کا کام کیا کہ بایزید کی لاش اس کے بیٹے موسیٰ کو، جو قید میں موجود تھا، سپرد کی اور اس کو آزاد کر کے اجازت دی کہ اپنے باپ کی لاش کو بروصہ میں لے جا کر دفن کرے۔ تیمور کی تمام ترک وتاز اور فتح مندیاں مسلمان سلاطین کو زیر کرنے اور مسلمانوں کے شہروں میں قتل عام کرانے میں محدود رہیں اور اس کو یہ توفیق میسر نہ آ سکی کہ غیر مسلموں پر جہاد کرتا یا غیر مسلم علاقوں میں اسلام پھیلاتا۔ بایزید یلدرم کے فوت ہونے کے بعد تیمور بھی زیادہ دنوں تک نہیں جیا۔ وہ سمرقند پہنچ کر چین کے ملک پر چڑھائی کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا اور اس کی یہی چڑھائی ایسی تھی جو اس نے

غیر مسلم علاقے پر کی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو پورا نہ ہونے دیا اور راستے ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔

جنگ انگورہ کا ذکر خود تیمور نے بھی اپنی توزک میں کیا ہے مگر نہایت ہی مجمل و مختصر، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بایزید یلدرم کی وفات کے بعد تیمور کو اپنی اس حرکت پر سخت افسوس ہوا کہ اس نے عثمانی سلطنت کو کیوں تباہ و برباد کیا۔ اگر توزک تیموری کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ بایزید یلدرم کی گرفتاری کو اس زمانہ کے تمام مسلمانوں نے نہایت نفرت اور رنج کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ اسی لیے تیمور جنگ انگورہ کے متعلق تفصیل اور فخر و مباہات کے جملوں سے قطعاً احتراز کرتا ہے اور ممکن ہے کہ اسی جرم عظیم کی تلافی کے لیے اس نے ملک چین کی فتح کا ارادہ کیا ہو جو پورا نہیں ہو سکا، واللہ اعلم بالصواب۔

بایزید یلدرم کا بیان کسی قدر طویل ہو گیا ہے لیکن مجھ کو قارئین کرام سے توقع ہے کہ وہ اس بیان کے طویل ہو جانے میں مجھ کو زیادہ مجرم نہ ٹھہرائیں گے۔ بایزید یلدرم اور جنگ انگورہ کے حالات لکھتے ہوئے مجھ کو بار بار اس بات کا احساس ہوا ہے کہ اس موقع پر تاریخ اسلام کے اس اختصار و ایجاز کا تناسب بگڑا جا رہا ہے جو اس تاریخ کی نگارش میں مدنظر رہا ہے لیکن ان حالات کی اہمیت یقیناً اس طوالت کو جائز قرار دے رہی ہے۔

سلطان بایزید خان یلدرم کے بیٹوں کی خانہ جنگی:

جنگ انگورہ کے بعد سلطنت عثمانیہ کے تباہ و برباد ہو جانے میں بہ ظاہر کوئی کسر باقی معلوم نہیں ہوتی تھی کیونکہ تیمور نے ایشیائے کوچک کے بہت سے علاقے ان سلجوقی خاندانوں کے رئیسوں کو دے دیے تھے جو سلطنت عثمانیہ سے پہلے ایشیائے کوچک میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں رکھتے تھے۔ بعض علاقوں میں اس نے اپنی طرف سے نئی ریاستیں قائم کر دی تھیں۔ بایزید یلدرم جب ایشیائے کوچک کی طرف تیمور کے مقابلے کے لیے آیا تھا تو اپنے سب سے بڑے بیٹے سلیمان کو ایڈریانوپل میں اپنا قائم مقام بنا آیا تھا۔ جنگ انگورہ کے نتیجہ سے مطلع ہو کر عیسائیوں نے اپنے علاقوں کو پھر واپس لینے کی جرأت کی اور ایڈریانوپل اور اس کے نواحی علاقوں کے سوا یورپی مقبوضات کا باقی حصہ سلطنت عثمانیہ سے نکل گیا۔ قیصر قسطنطنیہ نے بھی جو اس جنگ کے نتیجے کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا، اپنے مقبوضات کو وسیع کیا اور یورپ کے عیسائیوں کو اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا۔ مگر عثمانیوں

کے ساتھ گزشتہ زمانے میں جو لڑائیاں ہو چکی تھیں، ان کا رعب پھر بھی عیسائیوں کے دلوں پر اس قدر غالب تھا کہ وہ عثمانیوں کو اڈریانوپل سے خارج کرنے پر فوراً آمادہ نہ ہو سکے۔ سلطنت عثمانیہ کا رقبہ بہت ہی محدود و مختصر رہ گیا تھا، جس میں ایک چھوٹا سا ٹکڑا یورپ کا اور ایک چھوٹا سا حصہ ایشیائے کوچک کا شامل تھا، پھر سب سے بڑی مصیبت یہ پیش آئی کہ بایزید یلدرم کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔

بایزید یلدرم کے سات یا آٹھ بیٹے تھے، جن میں سے پانچ چھ جنگ انگورہ کے بعد باقی رہے، جن کے نام یہ ہیں۔ سلیمان خان جو اڈریانوپل میں باپ کا قائم مقام تھا۔ موسیٰ جو باپ کے ہمراہ قید تھا۔ عیسیٰ جو جنگ انگورہ سے بچ کر بروصہ کی طرف بھاگ آیا اور یہاں کا حاکم بن بیٹھا تھا۔ محمد جو بایزید کا سب سے چھوٹا اور سب سے زیادہ لائق بیٹا تھا، یہ ایشیائے کوچک ہی کے ایک دوسرے شہر میں حکومت کرنے لگا۔ قاسم جو کوئی حوصلہ نہ رکھتا تھا اور محمد یا عیسیٰ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس طرح بایزید کی گرفتاری کے بعد ایشیا کے بچے ہوئے عثمانی علاقے میں محمد اور عیسیٰ دونوں الگ فرماں روائی کرنے لگے اور یورپی علاقے پر سلیمان قابض رہا۔ بہت ہی جلد عیسیٰ اور محمد میں لڑائی ہوئی تا کہ اس بات کا فیصلہ ہو سکے کہ ایشیائے کوچک کے عثمانی مقبوضہ پر ان دونوں میں سے کون فرماں روائی کرے گا؟ سخت خوں خوار جنگ کے بعد محمد نے عیسیٰ کو شکست دے کر بروصہ پر قبضہ کر لیا اور عیسیٰ ایشیائے کوچک سے بھاگ کر اپنے بھائی سلیمان کے پاس اڈریانوپل میں پہنچا کہ اس کو محمد کے اوپر ایشیائے کوچک میں چڑھا کر لائے۔ چنانچہ سلیمان اپنی فوج کو لے کر ایشیائے کوچک میں آیا اور بروصہ و انگورہ کو فتح کر لیا۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ بایزید یلدرم، تیمور کی قید میں سختی و ذلت برداشت کر رہا تھا اور اس کے بیٹے آپس میں مصروف جنگ تھے کہ سلطنت کے بچے ہوئے چھوٹے سے ٹکڑے پر کون فرماں روائی کرے؟ وہ جس وقت آپس میں چھری کٹاری ہو رہے تھے، تو ان کو یقیناً اپنے باپ کا مطلق خیال نہ آیا تھا اور وہ اس کی تکلیفوں اور ذلتوں کا کوئی تصور نہ کرتے تھے ورنہ اس طرح آپس میں ایک دوسرے کے خون کی خواہش نہ کرتے۔ انہیں ایام میں جبکہ سلیمان ایشیائے کوچک میں آ کر محمد سے لڑ رہا تھا، جنگ انگورہ کے آٹھ ماہ بعد بایزید یلدرم نے قید میں وفات پائی اور تیمور نے اس کے بیٹے موسیٰ کو قید سے رہا کر کے باپ کی لاش کو لے جانے کی اجازت دی۔ موسیٰ باپ کی لاش لیے ہوئے آ رہا تھا کہ راستہ میں قرمانیہ کے سلجوقی رئیس نے موسیٰ کو گرفتار کر لیا۔ محمد نے

جو سلیمان سے شکست کھا کر ملک میں آوارہ اور سلیمان کے مقابلے کے لیے طاقت بہم پہنچانے کی فکر میں تھا، اس خبر کو سن کر فرماں روائے قرمانیہ کو لکھا کہ آپ براہ کرم میرے بھائی موسیٰ کو رہا کر دیجیے تا کہ میں اور وہ دونوں مل کر سلیمان کا کچھ تدارک کر سکیں۔ حاکم قرمانیہ نے سلیمان اور اس کے بھائیوں میں معرکہ آرائی کو اس لیے غنیمت سمجھا کہ عثمانی سلطنت کی رہی سہی طاقت اس خانہ جنگی سے زائل ہو سکے گی۔ چنانچہ اس نے محمد خان کی سفارش کو فوراً قبول کر کے اس کے بھائی موسیٰ کو رہا کر دیا، جو باپ کی تدفین سے فارغ ہوتے ہی فوراً اپنے بھائی محمد خان سے آ ملا۔ موسیٰ چونکہ باپ کے ساتھ قید میں رہا تھا، اس لیے اس کی قبولیت عثمانی امراء اور سپاہیوں میں قدرتاً زیادہ تھی۔ اس کے شریک ہوتے ہی محمد خان کی طاقت بڑھ گئی اور بڑے زور شور سے ایشیائے کوچک کے میدانوں میں لڑائی کا سلسلہ جاری ہوا۔ ایک طرف محمد و موسیٰ اور دوسری طرف سلیمان و عیسیٰ تھے۔ آخر عیسیٰ تو انہیں لڑائیوں میں کام آیا مگر سلیمان نے اپنے دونوں مقابل بھائیوں کو اپنے اوپر چیرہ دست نہ ہونے دیا۔ کئی مرتبہ محمد و موسیٰ کو شکست بھی ہوئی۔ آخر موسیٰ نے اپنے بھائی سے کہا کہ آپ مجھ کو تھوڑی سی فوج دے کر یورپی علاقے میں بھیج دیجیے تا کہ میں وہاں جا کر قبضہ کروں اور سلیمان کو مجبوراً ایشیائے کوچک چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ محمد کو بھائی کی یہ رائے بہت پسند آئی۔ چنانچہ موسیٰ فوج لے کر ایڈریانوپل پہنچ گیا۔ یہ خبر سنتے ہی سلیمان بھی اس طرف متوجہ ہوا اور موسیٰ و سلیمان میں ایک خوں خوار جنگ ہوئی۔ سلیمان چونکہ بڑا بیٹا تھا اور اپنے آپ کو تمام سلطنت عثمانیہ کا واحد فرماں روا سمجھتا تھا، لہٰذا اس کو فوجی سرداروں کے ساتھ غیر معمولی رعایتیں کرنے اور ان کو خوش رکھنے کا زیادہ خیال نہ آتا تھا لیکن موسیٰ و محمد چونکہ سلیمان سے حکومت چھیننا چاہتے تھے اور چھوٹا ہونے کی وجہ سے اپنے حق کو خود بھی پست تر جانتے تھے، لہٰذا ان کا برتاؤ اپنی فوج کے ساتھ بہت ہی اچھا تھا اور یہ اپنے فوجی سرداروں کو خوش رکھنے اور ان کی عزتیں بڑھانے میں کسی موقع کو فروگزاشت نہ ہونے دیتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوجی سرداروں نے سلیمان پر موسیٰ کو ترجیح دی اور انہیں کی وجہ سے سلیمان کو موسیٰ کے مقابلے میں شکست فاش حاصل ہوئی۔ سلیمان شکست یاب اور مفرور ہو کر قسطنطنیہ کے قیصر کی خدمت میں جا رہا تھا کہ راستے میں سنہ ۱۸۱۳ء میں گرفتار ہو کر مقتول ہوا۔ اس کے صرف دو بھائی باقی رہ گئے یعنی محمد اور موسیٰ۔ سلطنت عثمانیہ کا یورپی حصہ موسیٰ کے قبضے میں آ گیا اور ایشیا کے حصے پر محمد قابض رہا۔

موسیٰ کو چونکہ یہ معلوم تھا کہ قیصر مینوٹل پلیولوگس فرماں روائے قسطنطنیہ، سلیمان کی طرف داری کرتا تھا اور اسی لیے سلیمان اس کے پاس بھاگ کر جانا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے ارادہ کر لیا کہ قیصر قسطنطنیہ کو بھی سزا دے مگر اس سے پہلے اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اسٹیفن حاکم سرویا کو سزا دے کیونکہ حاکم سرویا اسٹیفن نے علانیہ سلیمان کی حمایت کی تھی۔ لہٰذا اس نے اول سرویا پر چڑھائی کی اور سرویا کی فوج کو میدان جنگ میں ایسی شکست فاش دی کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی اور پھر سرحدی اضلاع میں عثمانیوں کا رعب اور عیسائیوں کے دلوں میں خوف طاری ہو گیا۔ موسیٰ کا یہ حملہ جو اس نے سرویا پر کیا، سلطنت عثمانیہ کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوا کیونکہ اس سے یورپ کے عیسائیوں کا وہ خیال کہ اب عثمانی بہت کمزور ہو گئے ہیں، بدل گیا۔ اس کے بعد موسیٰ نے قسطنطنیہ پر چڑھائی کر کے محاصرہ کر لیا اور قیصر قسطنطنیہ کو سزا دینا ضروری سمجھا۔ قیصر نیوٹل بھی بہت ہوشیار اور چوکس آدمی تھا۔ اس نے اس فرصت میں محمد خان کے ساتھ اپنے تعلقات بڑھا لیے تھے، جو ایشیائے کوچک میں تنہا قابض و فرماں روا ہو کر کافی طور پر مضبوط ہو چکا تھا اور ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو، جو تیمور نے قائم کر دی تھیں، اپنی حکومت میں شامل کر رہا تھا۔ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ موسیٰ و محمد دونوں بھائی اس تقسیم پر رضامند ہیں کہ موسیٰ یورپی علاقے پر قابض رہے اور محمد ایشیائی علاقے میں حکومت کرے۔ اگرچہ اس کے متعلق کوئی معاہدہ اور باقاعدہ فیصلہ نہ ہوا تھا مگر قیصر کی ریشہ دوانیوں اور چالاکیوں نے بہت ہی جلد ایک پیچیدگی پیدا کر دی۔

جب موسیٰ نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تو قیصر نے محمد خان سے امداد و اعانت طلب کی اور محمد خان نے بلا تامل اس محاصرہ کے اٹھانے کے لیے یورپ کے ساحل پر فوج لے کر جانا ضروری سمجھا۔ اس طرح قسطنطنیہ کے محاذ جنگ پر یورپی ترک اور ایشیائی ترک آپس میں مصروف جنگ ہوئے اور دونوں بھائیوں میں مخالفت کی بنیاد رکھی گئی۔ ابھی موسیٰ کا محاصرہ بہ دستور قائم تھا کہ محمد خان کو اپنے ایشیائی علاقے میں ایک ماتحت رئیس کے باغی ہونے کی خبر پہنچی اور فوراً ایشیائے کوچک میں بغاوت کو فرو کرنے چلا گیا۔ یہ بغاوت موسیٰ کے اشارے سے ہوئی تھی تاکہ محمد خان ایک عیسائی بادشاہ کی مدد نہ کر سکے۔ محمد خان بہت جلد بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب ہوا۔ ادھر اس کی غیر موجودگی میں موسیٰ نے محاصرہ میں سختی کی اور قیصر قسطنطنیہ کا حال بہت ہی پتلا ہونے لگا۔ محمد خان فارغ ہو کر دوبارہ قسطنطنیہ پہنچ گیا اور اس نے اسٹیفن شاہ سرویا کو لکھا کہ تم موسیٰ کے خلاف خروج کرو، ہم تمہاری مدد

کریں گے۔ محمد خان کا سہارا پا کر شاہ سرویا جو پہلے ہی سے موسیٰ کے ذریعہ سے آزار رسیدہ تھا، اٹھ کھڑا ہوا۔ موسیٰ کو جب شاہ سرویا کے خروج کا حال معلوم ہوا تو وہ قسطنطنیہ سے محاصرہ اٹھا کر سرویا کی طرف متوجہ ہوا۔ ادھر سے اس کے متعاقب محمد خان اپنی فوج لے کر پہنچا۔ سرویہ کی جنوبی سرحد پر مقام جرلی کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ موسیٰ لڑائی میں مارا گیا اور محمد خان ابن بایزید یلدرم مظفر و منصور ہو کر ایڈریانوپل میں تخت نشین ہوا اور تمام عثمانیہ مقبوضات میں وہی تنہا فرماں روا تسلیم کیا گیا۔ چونکہ اب بایزید کی اولاد میں وہی تنہا قابل حکومت شخص رہ گیا تھا، لہٰذا خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا۔ محمد خان نے ایڈریانوپل میں تخت نشین ہو کر اپنی رعایا، فوج اور سرداروں سے وفاداری کا حلف لیا اور سلیمان کے بیٹے کو جس سے بغاوت کا قوی اندیشہ تھا، نیز اپنے بھائی قاسم کو جو بروصہ میں مقیم تھا، محض اس لیے کہ آئندہ فتنہ برپا نہ ہو سکے، اندھا کرا دیا اور نابینا کرانے کے بعد ان کو نہایت آرام و عزت و آسائش سے رکھا۔ یہ واقعات سنہ ۸۱۶ھ میں وقوع پذیر ہوئے۔ اس طرح جنگ انگورہ کے بعد گیارہ سال تک خاندان عثمانیہ میں خانہ جنگی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس گیارہ سال کی خانہ جنگی میں سلطنت عثمانیہ کا قائم رہنا اور پھر ایک شاندار مضبوط بادشاہی کی شکل میں نمودار ہو جانا دنیا کے عجائبات میں سے شمار ہوتا ہے۔ تاریخ عالم میں بہت ہی کم ایسی مثالیں نظر آ سکتی ہیں کہ اتنے بڑے دھکے کو سہہ کر اور ایسے خطرناک حالات میں سے گزر کر اتنی جلد کسی خاندان یا کسی قوم نے اپنی حالت کو سنبھال لیا ہو۔

سلطان محمد خان اوّل:

سلطان محمد خان ابن بایزید یلدرم نے سنہ ۸۱۶ھ میں مقام ایڈریانوپل میں تخت نشین ہو کر نہایت ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ امور سلطنت کو انجام دینا شروع کیا۔ قسطنطنیہ کے عیسائی قیصر اور عیسائی بادشاہ سے پہلے ہی اس کی صلح ہو گئی تھی۔ اب اس کے تخت نشین ہونے پر ان دونوں نے اس کو مبارک باد دی اور قیمتی تحف و ہدایا بھیجے۔ محمد خان نے اس کے جواب میں اپنی طرف سے اپنے آشتی پسند ہونے کا اس طرح ثبوت دیا کہ اس نے شاہ سرویا کے لیے بہت سی رعایتیں منظور کیں اور شاہ قسطنطنیہ کو بھی تسلی کے وہ قلعے جو ترکوں کے قبضے میں چلے آتے تھے اور بحیرہ اسود کے ساحل پر بعض مقامات جن کے نکل جانے سے قیصر قسطنطنیہ سخت بے چین تھا، اس کو دے دیے۔ وینس کی جمہوری ریاست جو ایک زبردست بحری طاقت تھی، ترکوں سے برسر پرخاش رہتی تھی۔ سلطان محمد

خان نے بلا تامل ان سے صلح کر لی۔ ولیشیا، البانیہ، بوسنیا وغیرہ ترکی صوبے جنگ انگورہ کی خبر سنتے ہی خود مختار ہو گئے تھے اور ہر ملک میں عیسائیوں نے اپنی سلطنتیں قائم کر لی تھیں۔ ان سب کو اندیشہ تھا کہ عثمانی سلطان تخت نشینی کے بعد مطمئن ہو کر اپنے باپ کے صوبوں کو پھر اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہے گا اور ہمارے اوپر حملہ آور ہوگا۔ سلطان محمد خان کی اس کامیابی کا حال سن کر ان سب نے ڈرتے ڈرتے اپنے اپنے سفیر دربار سلطانی میں مبارکباد کے لیے روانہ کیے۔ سلطان محمد خان نے ان سفیروں سے نہایت تپاک کے ساتھ ملاقات کی اور رخصت کرتے وقت ان سفیروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم اپنے آقاؤں سے جا کر میری طرف سے یہ ضرور کہہ دینا: ''میں سب کو امن دیتا ہوں اور سب سے امن قبول کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ امن وامان کو پسند کرتا اور فساد کو برا جانتا ہے۔'' سلطان محمد خان کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں امن وامان قائم ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطنت عثمانیہ جو ابھی ایک مہلک اور خطرناک بیماری سے اٹھی تھی، اس کے لیے حرکت اور جسمانی ریاضت بے حد مضر تھی، اس کو چند روز آرام کرنے اور پرہیزی غذا کھانے کی سخت ضرورت تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ سلطان محمد خان نہایت ہی موزوں سلطان تخت عثمانی پر متمکن ہوا اور اس کا طرز عمل ہر ایک اعتبار سے سلطنت کی تقویت اور آئندہ ترقیات کا موجب ثابت ہوا۔

یورپ میں اس طرح سلطان محمد خان نے امن وامان قائم کر لیا مگر ایشیائے کوچک میں بغاوتوں کا سلسلہ موجود تھا۔ چنانچہ سلطان کو مع فوج خود ایشیائے کوچک میں جانا پڑا۔ وہاں اس نے اول سمرنا کی بغاوت فرو کی، اس کے بعد قرمانیہ کے باغیوں کو طاقت کے ذریعہ سے خاموش ومحکوم بنایا گیا۔ پھر سلطان نے یہ عاقلانہ تدبیر کی کہ ایشیائے کوچک کی مشرقی حدود کے متصل جو ریاستیں یا سلطنتیں تیمور کی وفات کے بعد قائم ہوئیں، ان سب سے دوستانہ تعلقات قائم کیے اور تمام ایشیائے کوچک کو اپنے قبضے میں لے کر اطمینان حاصل کیا کہ پھر کوئی حملہ تیموری حملہ کی مانند نہ ہو سکے۔

سنہ ۸۲۰ھ میں جبکہ سلطان محمد خان ایشیائے کوچک ایڈریانوپل میں آچکا تھا، تو درہ دانیال کے قریب بحیرہ انجین میں وینس کے جنگی بیڑہ سے سلطان کے جنگی بیڑہ کی سخت لڑائی ہوئی جس میں ترکی بیڑہ کو سخت نقصان برداشت کرنا پڑا، اس لڑائی کا باعث یہ تھا کہ بحیرہ انجین کے جزیروں کے رہنے والے برائے نام وینس کی جمہوری حکومت کے ماتحت تھے۔ یہ لوگ سلطان کے ساحلی علاقے مثلاً گیلی پولی وغیرہ پر چھاپے مارتے رہتے تھے۔ سلطان نے ان کی سرکوبی کے لیے اپنے جنگی بیڑہ

کو حکم دیا لیکن اس کا مقابلہ وینس کے بیڑہ سے ہو گیا، جو بہت طاقتور تھا۔ لہٰذا سلطان کی بحری فوج کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اس بحری لڑائی کے بعد بہت جلد پھر وینس کے ساتھ عہد نامہ صلح کی تجدید ہو گئی۔ وینس ایک بہت چھوٹی سی ریاست تھی جو جمہوری اصول پر قائم تھی لیکن بحر روم میں اس کی بحری طاقت سب پر فائق تھی۔ اس کے بعد سلطان کے لیے کوئی خطرہ اور کوئی جنگ بہ ظاہر موجود نہ تھی اور سلطان اپنی مملکت کو وسیع کرنے کے مقابلے میں اندرونی طور پر اس کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ سلطان نے جا بہ جا شہروں اور قصبوں میں مدرسے قائم کیے۔ علماء کی قدردانی کی، راستوں کے امن وامان اور تجارت کی گرم بازاری کا بندوبست کیا۔ غرض کہ سلطان نے وہ طرز عمل اختیار کیا جس کی وجہ سے دوستوں اور دشمنوں دونوں میں اس کی قبولیت بڑھ گئی اور سب کو اس کی تعریف کرنی پڑی۔ اس کی رعایا نے اس کو چلپی یعنی بہادر وسنجیدہ مزاج کا خطاب دیا اور تمام ملکوں میں وہ سلطان صلح جو مشہور ہوا۔ مگر باوجود اس کے اس کی عمل داری میں ایک فتنہ برپا ہوا، جو اس کی فوج کے قاضی بدرالدین نے برپا کیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک نومسلم یہودی مرتد ہو کر اس بات کا محرک ہوا کہ سلطان کو معزول کر کے جمہوری ریاست قائم کرنی چاہیے۔ قاضی بدرالدین اس کا ہم خیال ہو گیا اور ان دونوں نے ایک ترک مصطفیٰ نامی کو جو کوئی تعلیم یافتہ شخص نہ تھا، اپنا مذہبی پیشوا بنایا اور والیشیا دونوں علاقوں میں اپنے خیالات کی اشاعت شروع کر کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا شروع کیا۔ اس بغاوت نے ترقی کر کے خطرناک صورت اختیار کر لی اور سلطان محمد خان کو بڑی فکر پیدا ہوئی۔ اس بغاوت نے اندر ہی اندر اس کی رعایا کو ماؤف کرنا شروع کر دیا۔ یہ بغاوت اس لیے اور بھی جلد اور زیادہ کامیاب ہو سکی کہ سلطان محمد خان نے عیسائی سلاطین سے دوستی کے عہد نامے کر کے اچھے تعلقات قائم کیے تھے۔ اس کا دوستانہ برتاؤ جو عیسائیوں کے ساتھ تھا، عام طور پر اس کی مسلمان رعایا کو ناپسند اور گراں گزرتا تھا۔ عوام اس بات کو نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اس زمانے میں صلح و آشتی ہی کی حکمت عملی سلطنت عثمانیہ کے لیے زیادہ مفید ہے۔ چنانچہ جب ان کو مذکورہ باغیوں نے بھڑکایا تو وہ فوراً ان کی باتوں میں آ گئے۔ آخر سلطان محمد خان نے اس بغاوت کو فرو کرنے میں پوری ہمت اور مستعدی سے کام لے کر چند ہی روز میں اس کا خاتمہ کر دیا اور تینوں باغی مارے گئے۔ اس خطرہ سے نجات پا کر سلطان محمد خان کو ایک اور خطرناک باغی کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جنگ انگورہ میں سلطان بایزید خان یلدرم کا

ایک بیٹا مصطفیٰ نامی مارا گیا تھا مگر جنگ کے بعد اس کی لاش کا کوئی پتہ نہ ملا۔ تیمور نے بھی جنگ کے بعد مصطفیٰ کی لاش کو تلاش کرایا مگر کہیں دستیاب نہ ہوئی۔ اس لیے مصطفیٰ کا مارا جانا مشتبہ رہا تھا۔ اب سلطان محمد خان کے آخر عہد حکومت یعنی سنہ ۸۲۴ھ میں ایک شخص نے ایشیائے کوچک میں اس بات کا دعویٰ کیا کہ میں مصطفیٰ ابن بایزید یلدرم ہوں۔ وہ شکل وصورت میں مصطفیٰ سے مشابہ تھا، اس لیے بہت سے ترکوں نے اس کے اس دعوے کو تسلیم کر لیا اور سمرنا کے عامل جنید اور صوبہ دار ولیشیا کے اس دعوے کی اس لیے اور بھی تصدیق کی کہ وہ محمد خان سے خوش نہ تھے۔ چنانچہ مصطفیٰ مذکور ان صوبہ داروں کی امداد سے گیلی پولی میں پہنچ کر تھسلی کے قریبی علاقے پر قابض ہو گیا۔ سلطان محمد خان اس خبر کو سنتے ہی فوراً فوج لے کر مقابلے پر پہنچا اور سالونیکا کے قریب ایک سخت لڑائی کے بعد مصطفیٰ مذکور شکست فاش کھا کر بھاگا اور قیصر قسطنطنیہ کے پاس پہنچ کر پناہ گزیں ہوا۔ سلطان محمد خان نے قسطنطنیہ کے بادشاہ کو لکھا کہ مصطفیٰ ہمارا باغی ہے، اس کو ہمارے پاس بھیج دو لیکن قیصر نے اس کو واپس دینے سے انکار کر کے اس بات کا وعدہ کیا کہ میں اس کو نہایت احتیاط کے ساتھ قید اور نظر بند رکھوں گا۔ اگر آپ اس کے نان ونفقہ اور اخراجات کے معاوضہ میں ایک رقم میرے پاس بھجواتے رہیں۔ چونکہ ان دنوں مسلسل بغاوتوں سے سلطان محمد خان زیادہ فکر مند ہو گیا تھا، اسی لیے وہ اور بھی زیادہ اس حکمت عملی پر عمل کرنا ضروری سمجھتا تھا کہ قیصر یا دوسرے عیسائیوں سے لڑائیاں نہ چھیڑی جائیں۔ چنانچہ اس نے قیصر کی بات کو منظور کر لیا اور مصطفیٰ باغی کو قید ونظر بند رکھنے کے معاوضہ میں ایک مناسب رقم بھجوانی بھی منظور کر لی۔ اس بغاوت کو فرو ہونے کے بعد بھی سلطان محمد خان کو مصطفیٰ باغی کا زیادہ خیال رہا اور اس نے قسطنطنیہ کے قیصر سے اپنے تعلقات کو زیادہ خوشگوار واستوار بنانا ضروری سمجھ کر خود قسطنطنیہ جانے کا قصد کیا جبکہ وہ ایشیائے کوچک سے درہ دانیال کو عبور کر کے گیلی پولی ہوتا ہوا ایڈریانوپل کو آ رہا تھا۔ قیصر قسطنطنیہ نے سلطان محمد خان کی آمد کا حال سن کر بڑی آؤ بھگت کی اور اس کا نہایت شاندار استقبال کر کے قسطنطنیہ میں لایا۔ یہاں سلطان وقیصر میں دوبارہ عہد نامہ دوستی کی تجدید ہوئی۔ اس کے بعد سلطان کو پھر گیلی پولی کی طرف جانا پڑا، جہاں سنہ ۸۲۵ھ میں سلطان محمد خان کا سکتہ کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال ہوا۔

سلطان محمد خان کے عہد پر تبصرہ:

سلطان محمد خان جنگ انگورہ کے وقت ۲۷ سال کی عمر رکھتا تھا۔ جنگ انگورہ کے بعد وہ ایشیائے

کوچک کے قصبہ امیسیہ میں خود مختار حاکم بنا اور بھائیوں سے لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ گیارہ سال تک وہ بھائیوں کے ساتھ زور آزمائی میں مصروف رہ کر سب پر غالب اور عثمانی سلطنت کا مطلق العنان فرماں روا بن گیا۔ آٹھ سال تک اس نے بہ حیثیت سلطان حکومت وفرماں روائی کی۔ اس کا عہد حکومت فتنوں اور فسادوں سے لبریز تھا۔ اس نے ایسی معتدل اور مفید حکمت عملی اختیار کی جس سے سلطنت عثمانیہ، جو قریب المرگ ہو چکی تھی، پھر تندرست اور مضبوط ہو گئی۔ اسی لیے بعض مورخین نے اس کو نوح کا لقب بھی دیا ہے یعنی اس نے سلطنت عثمانیہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچا کر نجات کے ساحل پر لگا دیا۔

سلطان محمد خان اول سب سے پہلا عثمانی سلطان ہے جس نے اپنے شاہی خزانہ سے ایک معقول رقم خانہ کعبہ اور مکہ مکرمہ کے باشندوں کے لیے مخصوص کی جو سالانہ برابر مکہ مکرمہ میں پہنچ کر مستحقین میں تقسیم اور خانہ کعبہ کی حفاظت ونگرانی کے کاموں میں صرف ہوتی تھی۔ اسی لیے معتضد باللہ عباسی خلیفہ مصر نے اس سلطان کو خادم الحرمین شریفین کا خطاب دیا، جس کو اس سلطان نے اپنے لیے موجب عزت وافتخار تصور کیا۔ اسی خطاب نے آئندہ ایک زمانے میں ترقی کر کے عثمانیوں کو خلیفۃ المسلمین بنا کر چھوڑا۔

وفات کے وقت سلطان محمد خان کی عمر ۴۷ سال کی تھی۔ اس کا بڑا بیٹا مراد خان ثانی جس کی عمر اٹھارہ سال کی تھی، ایشیائے کوچک میں ایک فوج کی سپہ سالاری پر مامور تھا۔ وزرائے سلطنت نے چالیس روز تک سلطان محمد خان کی وفات کو چھپایا اور مراد خان ثانی کے پاس فوراً خبر بھیجی کہ تم بلا تامل دارالسلطنت میں پہنچ کر مراسم تخت نشینی ادا کرو۔ چالیس روز کے بعد سلطان کی لاش کو گیلی پولی سے بروصہ میں لا کر دفن کیا گیا۔

سلطان مراد خان ثانی:

سلطان مراد خان ثانی سنہ ۸۰۶ھ میں پیدا ہوا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں دارالسلطنت ایڈریا نوپل (اورنہ) میں باقاعدہ تخت نشین ہوتے ہی مشکلات وخطرات سے سابقہ پڑا یعنی قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ نے سلطان محمد خان کے فوت ہونے کی خبر سنتے ہی اپنے قیدی مصطفیٰ کو اپنے سامنے بلا کر اس سے اس بات کا اقرار نامہ لکھایا کہ اگر میں سلطنت عثمانیہ کا مالک ہو گیا تو بہت سے مضبوط

قلعے اور صوبے (جن کی اقرارنامہ میں تفصیل درج تھی) قیصر قسطنطنیہ کے سپرد کر دوں گا اور ہمیشہ قیصر کا ہوا خواہ رہوں گا۔ اس کے بعد قیصر قسطنطنیہ نے اپنے جہازوں میں اس کے ساتھ ایک فوج سوار کرا کر سب کو سلطنت عثمانیہ کے یورپی علاقے میں اتار دیا تاکہ وہ سلطان مراد خان کے خلاف ملک پر قبضہ کرے۔ چونکہ یہ مصطفیٰ اپنے آپ کو سلطان محمد خان کا بھائی اور بایزید یلدرم کا بیٹا بتاتا تھا اور اس کے اس دعوے کی تصدیق یا تکذیب میں ترک متردد تھے، لہٰذا بہت سے عثمانی سپاہی اس سے آ ملے اور اس کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ اس نے شہروں پر شہر فتح کرنے شروع کر دیے۔ مراد خان نے جو فوج اس کے مقابلہ کو بھیجی، اس کا اکثر حصہ مصطفیٰ سے آ ملا اور باقی شکست کھا کر بھاگ آیا۔ اس کے بعد سلطان مراد نے اپنے سپہ سالار بایزید پاشا کو ایک معقول جمعیت کے ساتھ اس باغی کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا لیکن معرکہ جنگ میں بایزید پاشا مارا گیا اور مراد کی فوج کو شکست فاش حاصل ہوئی۔ اس فتح و فیروزی کے بعد مصطفیٰ کی ہمت بڑھ گئی اور اس نے یہی مناسب سمجھا کہ میں پہلے تمام ایشیائے کوچک پر قابض ہو جاؤں کیونکہ یورپی علاقے میں اس کو توقع تھی کہ قیصر قسطنطنیہ اور مغربی حدود کے عیسائی سلاطین سے مجھ کو مراد خان کے خلاف ضروری امداد ملے گی اور ایشیا پر قابض ہونے کے بعد یورپی علاقے سے مراد خان کو بے دخل کرنا بہت آسان ہوگا۔ چنانچہ اس نے آبنائے کو عبور کر کے ایشیائے کوچک میں تاخت و تاراج شروع کر دی۔ مراد خان ثانی نے ان خطرناک حالات کو دیکھ کر تامل کرنا مناسب نہ سمجھ کر بہ ذات خود مصطفیٰ کا تعاقب کرنا ضروری سمجھا اور فوراً ایشیائے کوچک میں پہنچ کر اس کو شکست دینے میں کامیاب ہوا۔ مراد خان کے میدان جنگ میں آتے ہی ترکی سپاہی جن کو اس عرصہ میں مصطفیٰ کے دعوے میں جھوٹ اور افترا کا یقین ہو گیا تھا، اس کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر مراد خان کے پاس آنے لگے۔ مصطفیٰ اپنی نازک حالت دیکھ کر ایشیائے کوچک سے بھاگا اور گیلی پولی میں آ کر تھسلی وغیرہ پر قابض ہو گیا۔ مراد خان بھی اس کے پیچھے گیلی پولی پہنچا۔ یہاں معرکہ میں اس کو شکست فاش دے کر اس کی طاقت کا خاتمہ کر دیا۔ مصطفیٰ یہاں سے ایڈریانوپل کی طرف بھاگا تاکہ دارالسلطنت پر قابض ہو جائے مگر ایڈریانوپل میں وہ گرفتار کر لیا گیا اور شہر کے ایک برج میں پھانسی پر لٹکا کر اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔

اس کے بعد سلطان مراد خان نے جنیوا کی ریاست سے جو قیصر قسطنطنیہ سے رقابت رکھتی تھی، دوستی کا عہد نامہ کیا اور قسطنطنیہ پر اس لیے چڑھائی کی تیاریاں کیں کہ قیصر قسطنطنیہ نے ہی مصطفیٰ باغی

سے یہ فتنہ برپا کرایا تھا۔ قیصر پلیولوگس والی قسطنطنیہ نے جب یہ سنا کہ سلطان مراد خان ثانی قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے تو اس کو بہت فکر پیدا ہوئی اور اس نے اس فوری مصیبت کو ملتوی کرنے کے لیے قسم قسم کی تدابیر سوچیں۔ مینڈ ھے لڑانے اور سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوتیں برپا کرا دینے میں اس کو بہت کمال حاصل تھا اور اسی تدبیر سے وہ سلطنت عثمانیہ کو مشکلات میں مبتلا رکھ کر اپنی حکومت کو اب تک بچائے ہوئے تھا مگر اس مرتبہ وہ سوائے اس کے اور کچھ نہ کر سکا کہ اس نے اپنے سفیر سلطان کی خدمت میں روانہ کیے تاکہ قصور کی معافی طلب کر کے آئندہ صلح نامہ دب کر کرے۔ لیکن سلطان مراد خان نے ان سفیروں کو نہایت حقارت کے ساتھ واپس کر دیا اور اپنے دربار میں باریاب نہ ہونے دیا۔

اس کے بعد شروع جون سنہ ۱۴۲۲ء مطابق سنہ ۸۲۶ھ میں بیس ہزار انتخابی فوج لے کر سلطان مراد خان ثانی قسطنطنیہ کے سامنے آ موجود ہوا۔ بڑی سختی اور شدت سے شہر کا محاصرہ کیا گیا۔ خلیج قسطنطنیہ پر لکڑی کا ایک پل تیار کر کے محاصرہ کو مکمل کیا۔ شہر قسطنطنیہ کو فتح کرنا کوئی آسان کام نہ تھا مگر سلطان مراد خان نے ایسے عزم و ہمت سے کام لیا اور محاصرہ میں سرنگوں، منجنیقوں، دمدموں، متحرک میناروں کو اس طرح کام میں لایا کہ دم بہ دم فتح کی امید یقین سے تبدیل ہونے لگی۔ اس دوران محاصرہ میں قیصر بھی بے فکر نہ تھا۔ اس نے ایک طرف تو مدافعت میں ہر قسم کی کوشش شروع کی اور دوسری طرف ایشیائے کوچک میں فساد برپا کرانے اور مراد خان ثانی کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہا۔ قسطنطنیہ کے فتح ہونے میں ہفتوں نہیں بلکہ دنوں اور گھنٹوں کی دیر رہ گئی تھی کہ مراد خان ثانی کو محاصرہ اٹھا کر اور اب تک کی تمام کوشش کو بلا نتیجہ چھوڑ کر اسی طرح ایشیائے کوچک کی طرف جانا پڑا جس طرح کہ اس کا دادا بایزید خان یلدرم عین وقت پر قسطنطنیہ سے محاصرہ اٹھا کر ایشیائے کوچک کی طرف تیمور کے مقابلہ کو روانہ ہو گیا تھا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلطان محمد خان جب فوت ہوا تو اس نے چار بیٹے چھوڑے تھے، جن میں دو تو بہت ہی کم عمر اور چھوٹے بچے تھے اور دو نوجوان کہے جا سکتے ہیں جن میں ایک سب سے بڑا مراد خان ثانی تھا، جس کی عمر ۱۸ سال اور دوسرا مصطفیٰ نامی تھا جس کی عمر باپ کی وفات کے وقت پندرہ سال تھی۔ مراد خان ثانی نے تخت نشین ہو کر اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو تو بروصہ میں پرورش پانے کے لیے بھیج دیا تھا، جہاں ان کے لیے تعلیم و تربیت اور راحت و آرام کا ہر ایک سامان

موجود کر دیا تھا اور تیسرے بھائی مصطفیٰ کو جو مراد ثانی سے عمر میں تین سال چھوٹا تھا، ایشیائے کوچک میں بہ طور عامل یا بہ طور سپہ سالار عزت کے ساتھ مامور کیا تھا۔ مراد ثانی جب اپنے فرضی چچا مصطفیٰ کے فتنے کو فرو کر چکا اور مصطفیٰ ایڈریانوپل میں پھانسی پا چکا تو قیصر پلیولوگس نے اس دوسرے مصطفیٰ پر ڈورے ڈالنے شروع کیے اور اپنے جاسوسوں اور لائق سفیروں کے ذریعہ سے مراد ثانی کے بھائی مصطفیٰ کو مسلسل یہ توقع دلاتا رہا کہ میں تم کو زیادہ مستحق سلطنت سمجھتا ہوں اور اگر تم سلطنت کے مدعی بن کر کھڑے ہو جاؤ تو تمہاری ہر ایک قسم کی امداد کو موجود ہوں۔ ادھر اس نے ایشیائے کوچک کے سلجوقی سرداروں کو جواب تک قونیہ اور دوسرے شہروں میں سلطنت عثمانیہ کے جاگیرداروں کی حیثیت سے موجود اور خاندان سلطنت سے رشتہ داریاں بھی رکھتے تھے، مراد ثانی کے خلاف اور مصطفیٰ خان برادر مراد خان کی اعانت پر آمادہ کرنے کی خفیہ تدبیریں جاری کر دی تھیں۔ آخر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا۔

مصطفیٰ خان نے سلجوقی امیروں کی امداد سے خروج کر کے علم بغاوت بلند کیا اور ٹھیک اس وقت جبکہ ادھر مراد خان قسطنطنیہ کو فتح کرنے والا تھا، مصطفیٰ خان نے ایشیائے کوچک کے بہت سے شہروں اور ضروری مقاموں پر قبضہ کر کے بروصہ کے حاکم کا بروصہ میں محاصرہ کر لیا۔ یہ خبر سن کر کہ ایشیائے کوچک کی فوج باغی ہو کر مصطفیٰ کے ساتھ شامل ہو گئی اور ایشیائے کوچک قبضہ سے نکلا جاتا ہے، مراد ثانی سراسیمہ ہو گیا اور فوراً محاصرہ اٹھا کر اور مصطفیٰ کا تدارک ضروری سمجھ کر ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوا۔ مراد خان ثانی کے ایشیائے کوچک میں پہنچتے ہی فوج کے اکثر سپاہی مصطفیٰ خان کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر مراد خان کے پاس چلے آئے۔ مراد خان کی فوج نے مصطفیٰ خان کو شکست دے کر قتل کر دیا اور اس طرح بہت جلد ایشیائے کوچک کا فتنہ قابو میں آ گیا۔ اس کے بعد قریباً ایک سال تک مراد خان نے ایشیائے کوچک میں مقیم رہ کر وہاں کے تمام سرکش امراء کو قرار واقعی سزائیں دے کر اپنی حکومت و سلطنت کو مضبوط بنایا۔ سنہ ۸۲۸ھ میں سلطان مراد خان ثانی ایشیائے کوچک سے یورپ کی طرف آیا تو قیصر قسطنطنیہ سے تیس ہزار ڈاکٹ سالانہ بہ طور خراج اور کئی اہم مقامات لے کر صلح کر لی اور دوبارہ قسطنطنیہ کا محاصرہ نہیں کیا۔ اس کے بعد سلطان مراد خان اپنی سلطنت کے اندرونی انتظام اور فلاح و بہبود رعایا کے کاموں میں مصروف رہا اور کسی عیسائی یا غیر عیسائی ریاست کو مطلق نہیں چھیڑا۔ ہاں اپنے عہد ناموں کی پابندی ان سے ضرور کراتا رہا۔

سنہ۸۳۱ھ میں سرویا کا بادشاہ اسٹیفن جو سلطنت عثمانیہ کا باج گزار اور وفادار تھا، فوت ہوا۔ اس کی جگہ جارج برنیک وچ تخت نشین ہوا۔ سرویا کا یہ نیا بادشاہ جارج چونکہ اپنے پیش رو کی طرح مآل اندیش و سنجیدہ مزاج نہ تھا، اس لیے قیصر قسطنطنیہ کو اس طرف ریشہ دوانیوں کا موقع مل گیا اور وہ اندر ہی اندر جارج اور ہنگری والوں کو سلطان مراد خان کے خلاف برانگیختہ کرنے میں مصروف رہا۔ ہنگری والے بھی اب چونکہ نکوپولس کی شکست کے تلخ تجربہ کو بھول چکے تھے، لہٰذا وہ بھی عثمانی سلطنت کے خلاف تیاریاں کرنے لگے اور کئی سال تک ان تیاریوں کے سلسلے کو جاری رکھا۔ سلطان مراد خان ثانی نے سنہ۸۳۴ھ میں جزیرہ زانٹی اور یونان کا جنوبی حصہ اور سالونیکا کا علاقہ فتح کر کے وینس والوں کو شکست فاش دی اور وینس کی ریاست نے نہایت ذلیل شرطوں پر دب کر سلطان سے صلح کر لی۔ وینس چونکہ بادشاہ قسطنطنیہ کا طرفدار تھا، اس لیے شاہ قسطنطنیہ کو اور بھی زیادہ ملال ہوا اور وہ اپنے سازشی کاموں میں پہلے سے دوگنی توجہ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ ادھر سلطان مراد نے بہ تدریج اپنے مقبوضات کو یورپ میں ترقی دینی شروع کی۔ البانیہ اور بوسنیا والوں نے بھی سرویا اور ہنگری کی طرح سلطان کے خلاف عیسائیوں کی سازش میں شرکت اختیار کی۔ سرویا اور رومانیہ کے شمال میں صوبہ ٹرانسلونیا کے عیسائیوں نے سنہ۸۴۲ھ میں علم مخالفت بلند کیا تو سلطان نے اس طرف حملہ آور ہو کر ستّر ہزار عیسائیوں کو میدان جنگ میں قید کیا اور اپنی قوت و سطوت کی دھاک بٹھا کر وہاں سے واپس ہوا۔ وہ ترکوں کا سخت مخالف اور دشمن تھا۔ اس کے تخت نشین ہونے سے عیسائیوں کی سازش کو بہت تقویت پہنچی۔ انہیں ایام میں مغربی یورپ کی بعض لڑائیوں میں شریک رہنے اور تجربہ حاصل کرنے کے بعد جان ہنی ڈیزیا جان ہنی داس ایک شخص جو شاہ سجمنڈ کا ناجائز بیٹا تھا، ہنگری کی طرف واپس آیا۔ اس کا باپ سجمنڈ تھا اور اس کی ماں الزبتھ مارسی نامی ایک حسین اور فاحشہ عورت تھی۔ ہنی داس نے ہنگری میں آ کر فوراً سپہ سالاری کا منصب حاصل کر لیا اور ترکوں کے خلاف فوجیں لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے صوبہ ٹرانسلونیا سے ترکوں کو خارج کر دیا۔ ترکی جرنیل مزید بیگ جو اس نواح میں عامل و منتظم تھا، مع اپنے بیٹے کے مارا گیا اور تیس ہزار ترکی فوج میدان میں کھیت رہی۔ جو ترک زندہ قید ہوئے تھے، ان کے ساتھ ہنی داس نے یہ سلوک کیا کہ جب اس فتح کی خوشی میں ہنگری کے اندر ضیافتیں ہوتی تھیں، تو ضیافت کے موقع پر ان ترک قیدیوں کی ایک تعداد لے جا کر ان لوگوں کے سامنے قتل کی جاتی تھی جو اس خوشی کی تقریب میں شریک ہوتے تھے۔ اس طرح گویا خوشی کے

جلسوں میں ان ترک قیدیوں کو قتل کرنا ایک دلچسپ سامان تفریح سمجھا گیا تھا۔ سلطان مراد خان کے پاس ادھر اس مذکورہ شکست کی خبر پہنچی، ادھر ایشیائے کوچک سے خبر آئی کہ قونیہ میں بغاوت کا جھنڈا بلند ہو گیا ہے جو سلطان کے لیے بے حد موجب خطر ہے۔ سلطان مراد خان نے ہنی داس اور ہنگریوں سے بدلہ لینے کے لیے اسی (۸۰) ہزار فوج دے کر اپنے ایک سپہ سالار کو روانہ کیا اور خود ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۸۴۷ھ کا ہے۔

ترکوں کی اس فوج کو شکست دینے اور ترکوں کو براعظم یورپ سے نکالنے کے لیے یورپ میں اب کے مرتبہ ایسا جوش پیدا ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا گیا تھا۔ ہنگری کا بادشاہ لیڈ سلاس اور ہنگری کا سپہ سالار ہنی داس اس قدر مشہور ہو گئے تھے اور ان کی بہادری کے افسانے اس طرح یورپ میں ہر جگہ پہنچ گئے تھے کہ ہر ایک ملک کے عیسائی نے ان کی فوج میں شامل ہونے اور مجاہد کہلانے کا شوق ظاہر کیا۔ روما کے پوپ جان اور اس کے سفیروں کارڈنیل جولین نے جنگجو فوجیوں کو تیار کرنے اور اپنے وعظوں سے عیسائیوں کو اس لڑائی میں شریک کرنے کی بے حد ترغیب دی۔ ہنگری، سرویا، ولیشیا، پولینڈ، جرمنی، اٹلی، فرانس، آسٹریا، بوسنیا، البانیہ وغیرہ کی فوجیں ہنی داس کے جھنڈے کے نیچے آ کر جمع ہو گئیں۔ عثمانیوں کی فوج سے جب مقابلہ ہوا تو عیسائیوں کی اس بے شمار فوج نے ترکی فوج کو شکست دی۔ چار ہزار ترک گرفتار اور بہت سے شہید ہوئے۔ ہنی داس نے تعاقب کر کے شہر صوفیہ پر قبضہ کر لیا اور تمام رومیلیا کو تاخت وتاراج کر کے اور بے شمار مال غنیمت اور قیدی لے کر اپنے ملک کو واپس ہوا۔ حالانکہ اس کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ آگے بڑھ کر ایڈریانوپل پر قبضہ کر لیتا مگر ایڈریانوپل پر حملہ آور ہونے کی اس کو جرأت نہ ہوئی۔ سلطان مراد خان ثانی نے اس شکست اور اپنے علاقوں کی تباہی کا حال ایشیائے کوچک میں سنا۔ وہ بہت جلد سنہ ۸۴۷ھ میں ایشیائے کوچک کی بغاوت فرو کرنے کے بعد ایڈریانوپل میں آیا اور عیسائیوں سے انتقام لینے کی تدبیر سوچنے لگا۔ انہیں ایام میں سلطان کا بڑا بیٹا علاؤ الدین فوت ہوا، جس سے سلطان کو سخت صدمہ پہنچا اور اس کا دل سلطنت وحکومت سے برداشتہ ہو گیا۔ گزشتہ جنگ میں سلطان کا بہنوئی محمد چلپی، ہنی ڈیز (ہنی داس) کی لڑائی میں گرفتار ہو گیا تھا، لہٰذا اس کی بہن اور دوسرے عزیزوں نے سلطان کو مجبور کیا کہ جس طرح ہو، محمد چلپی کو آزاد کرایا جائے۔ چنانچہ سلطان کو ہنگری والوں کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ جاری کرنا پڑا۔ آخر اسی سلسلہ خط وکتابت نے یہ صورت اختیار کی کہ سلطان صلح پر آمادہ ہو گیا۔ سرویا

کی آزادی کو سلطان نے تسلیم کر لیا۔ وہاں کے بادشاہ جارج کو بادشاہ مان کر اپنے حقوق بادشاہی اس پر سے اٹھا لیے۔ ولیشیا کا صوبہ ہنگری کو دے دیا اور ساٹھ ہزار ڈاکٹ زر فدیہ بھیج کر محمد چلپی کو قید سے آزاد کرایا۔ یہ عہد نامہ ہنگری اور ترکی دونوں زبانوں میں لکھا گیا۔ سلطان مراد خان ثانی اور لیڈ سلاس بادشاہ ہنگری کے اس پر دستخط ہوئے اور دونوں بادشاہوں نے قسمیں کھائیں کہ اس عہد نامہ کی پابندی کو احکام مذہبی کی طرح ضروری سمجھیں گے۔ دریائے ڈینوب اس عہد نامہ کے بہ موجب سلطان کی عمل داری کی حد مقرر کیا گیا۔ اس طرح ۱۲ جولائی سنہ ۱۴۴۴ء مطابق سنہ ۸۴۸ھ کو دس برس کے لیے سلطان مراد خان ثانی اور عیسائیوں کے درمیان صلح قرار پا گئی۔ اس صلح نامہ کی تکمیل سے فارغ ہوتے ہی سلطان مراد خان نے یہ سمجھ کر کہ اب دس سال کے لیے امن وامان قائم رہے گا، اپنے بیٹے کی وفات کے سبب سے افسردہ خاطر ہو کر سلطنت کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے دوسرے بیٹے محمد خان کو ایڈریانوپل میں تخت نشین کیا۔ محمد خان چونکہ بہت ہی نو عمر تھا، اس لیے تجربہ کار اور بہادر وزیروں اور سپہ سالاروں کو اس کا مشیر بنایا اور خود ایشیائے کوچک میں جا کر درویشوں اور زاہدوں کی مجلس میں شریک ہوا اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگا۔

سلطان مراد خان ثانی کی تخت سلطنت سے دست برداری اور ایک نو عمر شہزادے محمد خان کی تخت نشینی کا حال سن کر عیسائیوں کے دہان حرص میں پانی بھر آیا اور انہوں نے اس موقع کو بہت ہی مناسب اور غنیمت سمجھ کر عہد شکنی پر آمادگی ظاہر کی اور ارادہ کیا کہ ترکوں کی نسلوں کو اس وقت یورپ سے نیست و نابود کر دیا جائے۔ ہنگری کا بادشاہ لیڈ سلاس جس نے ابھی چند روز ہوئے قسم کھائی تھی اور عہد نامہ پر دستخط کر کے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ اس کی پابندی مذہبی احکام کی طرح کروں گا، عہد شکنی پر متامل تھا لیکن پوپ اور اس کے نائب کارڈنل جولین نے اس کو یقین دلا کر کہ مسلمانوں کے ساتھ عہد و پیمان کو نباہنا گناہ ہے اور عہد شکنی موجب ثواب ہو گی، اس کو آمادہ کر لیا۔ ادھر ہنی داس سپہ سالار ہنگری بھی اس قدر جلد عہد نامہ کے توڑنے کو موجب رسوائی سمجھتا تھا لیکن اس کو دربار ہنگری کی طرف سے لالچ دیا گیا کہ بلگیریا کو فتح کر کے تم کو وہاں کا بادشاہ بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ بھی رضامند ہو گیا۔ ابھی صلح نامہ کو لکھے ہوئے ایک مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ اس کے توڑنے پر عیسائی متفق ہو گئے۔ سرویا سے ترک سپاہی عہد نامہ کی شرائط کے موافق جا رہے تھے اور سرویا کا تمام علاقہ ترکی سپاہ سے خالی ہو رہا تھا۔ اس تخلیہ کا چند روز انتظار کیا گیا اور عہد نامہ کی تحریر سے پورے پچاس

دن کے بعد یکم ستمبر سنہ ۱۴۴۴ء مطابق سنہ ۸۴۸ھ کو ہنگری کی فوج نے بڑھ کر بے خبر ترکی سرحدی چوکیوں کی فوج پر حملہ کیا اور بلگیریا کے راستے بحر اسود کے کنارے پہنچ کر وہاں سے جنوب کی جانب متوجہ ہو کر شہر دارنا کا محاصرہ کر لیا اور بالآخر دارنا کو ہنی داس نے فتح کر لیا۔ اس سے پہلے راستے میں بہت سی ترکی فوجیں سدراہ مقتول و مغلوب ہوتی رہیں اور تمام علاقے میں عیسائیوں نے مسلمانوں کے قتل عام میں بڑی بے رحمی اور سفاکی دکھائی۔ عیسائیوں کی اس فوج کشی اور عہد شکنی کا حال فوراً ایشیائے کوچک میں سلطان مراد ثانی سے جو ترک سلطنت کے بعد گوشہ نشین ہو چکا تھا، جا کر بیان کیا گیا اور اس سے استدعا کی گئی کہ آپ گوشہ عزلت سے قدم باہر نکالیں اور سلطنت عثمانیہ کو بچائیں۔ چنانچہ مراد خان ثانی بلا تامل ایڈریانوپل پہنچا اور وہاں سے دارنا کی طرف روانہ ہوا۔ عیسائی فتح مند لشکر دارنا کے قریب میدان میں خیمہ زن تھا اور اپنی فتح کا اس کو کامل یقین تھا کہ ہنی داس کے مخبروں نے آ کر اس کو خبر سنائی کہ سلطان مراد خان گوشہ عزلت سے نکل کر اور چالیس ہزار بہادر سپاہیوں کو لے کر خود مقابلہ پر آ پہنچا ہے اور یہاں سے چار میل کے فاصلہ پر آ کر خیمہ زن ہوا ہے۔ یہ سنتے ہی ہنی داس اور شاہ ہنگری نے مجلس مشورت منعقد کی اور اس کے بعد صفوف جنگ کی آراستگی میں مصروف ہو گئے۔ عیسائیوں کی فوج کے میسرہ میں ولیشیا کی فوج تھی۔ ہنگری کے انتخابی سپاہی میمنہ پر مامور کیے گئے۔ کارڈنل جولین کے زیر اہتمام عیسائی جنگجوؤں کا ایک لشکر عظیم تھا۔ بادشاہ ہنگری اپنے ملک کے سرداروں اور بہادر سواروں کے ساتھ قلب لشکر میں تھا۔ پولینڈ کی فوج سب سے پیچھے ایک مشہور بشپ کے زیر کمان تھی۔ ہنی داس اس تمام لشکر عظیم کا سپہ سالار اعظم تھا۔ سلطان مراد خان ثانی نے بھی اپنے میمنہ و میسرہ کو درست کیا اور اس صلح نامہ کی نقل کر کے نیزہ کی نوک پر رکھ کر اپنا علم بنایا جو شاہ ہنگری نے لکھ کر سلطان مراد خان کو دیا تھا۔ ۱۰ نومبر کو دارنا کے میدان میں یہ لڑائی شروع ہوئی جبکہ دو مہینے اور دس روز عیسائیوں کو عہد نامہ توڑے اور سلطنت عثمانیہ کے شہروں کو برباد کرتے ہوئے گزر چکے تھے۔ ہنی داس نے دائیں طرف سے عثمانی فوج کے ایشیائی دستوں پر اس زور شور کا حملہ کیا کہ ترکی لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے۔ دوسری طرف ولیشیا والوں نے بھی اسی طرح پر جوش حملہ کیا اور عثمانی فوج کا دوسرا بازو بھی قائم نہ رہ سکا۔ سلطان مراد خان ثانی جو اپنی رکابی فوج کے ساتھ پشت لشکر پر کھڑا یہ رنگ دیکھ رہا تھا، سخت مضطرب ہوا۔ اسی اثناء میں ہنگری کے بادشاہ لیڈ سلاس نے قلب عثمانی پر نہایت سخت حملہ کیا اور صفوں کو چیرتا ہوا اس مقام تک پہنچ گیا جہاں سلطان مراد خان

ابھی تک اپنی جگہ پر قائم اور اپنی فوج کے دستوں کی ہزیمت اور عیسائیوں کے زبردست حملوں کو پریشانی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ سلطان کو اپنی شکست فاش کا کامل یقین ہو چکا تھا اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ گھوڑا بھگا کر میدان جنگ سے اپنی جان بچا کر لے بھاگے یا دشمنوں کے لشکر پر حملہ آور ہو کر جام شہادت نوش کرے کہ سامنے سے لیڈ سلاس شاہ ہنگری سلطان کو بڑے کبر ونخوت کے ساتھ للکارتا ہوا نمودار ہوا۔ سلطان نے فوراً کمان میں ایک تیر جوڑ کر مارا جس سے شاہ ہنگری کا گھوڑا زخمی ہو کر گر پڑا اور ینگ چری فوج کے ایک بوڑھے سپہ سالار خواجہ خیر نے آگے بڑھ کر لیڈ سلاس کا سر کاٹ لیا اور ایک نیزہ کی انی پر رکھ کر اس عہد نامہ کے ساتھ ہی بلند کر دیا۔ شاہ ہنگری کے اس کٹے ہوئے سر کو دیکھ کر عیسائی لشکر میں ابتری اور ہلچل پیدا ہوگئی اور وہ ترک جو پسپا ہوتے چلے جا رہے تھے، اب ہمت کر کے آگے بڑھنے لگے۔ ہنی داس نے اس سر کو دیکھ کر اس کے چھیننے کی کوشش میں کئی زبردست حملے سلطانی لشکر کے اس حصے پر کیے جہاں شاہ ہنگری کا وہ سر نیزہ پر رکھا ہوا تھا مگر اس کو ہر مرتبہ شکست ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں نے عیسائیوں سے میدان خالی کرا لیا۔ اس لڑائی میں کارڈنل جولین بھی جو پوپ کا نائب اور عیسائی فوج کا سپہ سالار اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا، مارا گیا۔ بشپ اور دوسرے تمام سردار بھی اس لڑائی میں مقتول ہوئے۔ صرف ایک ہنی داس اپنی جان بچا کر میدان سے بھاگا۔ ہنگری کی تمام فوج ترکوں کے ہاتھ سے مقتول ہوئی۔

اس فتح مبین کے بعد عثمانی فوج نے سرویا کو فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کیا۔ اسی طرح بوسنیا بھی مفتوح اور وہاں کا شاہی خاندان نیست و نابود ہو کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوا۔ عیسائیوں کی اس عہد شکنی کا بعض عیسائی خاندانوں پر یہ اثر پڑا کہ سرویا اور بوسنیا میں بہت سے عیسائی خود بہ خود مسلمان ہو گئے۔ سلطان مراد خان نے اپنی طرف سے مذہب کے معاملے میں کسی کو مجبور نہیں کیا تھا بلکہ اس نے اپنے تمام تر عیسائی رعایا کو مثل دوسرے سلاطین عثمانی کے وہی آزادانہ حقوق دے رکھے تھے جو مسلمانوں کو حاصل تھے۔

چند مہینے کی کوشش کے بعد سلطان مراد ثانی نے عیسائی باغیوں کو قرار واقعی سزائیں دے کر حدود سلطنت کو پہلے سے زیادہ وسیع اور مضبوط کر کے دوبارہ خلوت نشینی اور زہد وعبادت اختیار کر کے اپنے بیٹے محمد خان کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔ محمد خان کے دوبارہ تخت نشین ہونے کے بعد ینگ چری فوج نے اپنی تنخواہوں اور وظیفوں کا مطالبہ کیا اور جب ان کے اس نامناسب مطالبہ کو پورا کرنے میں پس

وپیش ہوا تو انہوں نے بغاوت کی دھمکیاں دینی شروع کیں اور لوٹ مار پر اتر آئے۔ اس طرح فوج کے خودسر ہونے سے سلطنت عثمانیہ میں دوبارہ سخت خطرناک اور نہایت پیچیدہ حالات پیدا ہو گئے۔ اراکین سلطنت نے یہ رنگ دیکھ کر دوبارہ سلطان مراد خان کی خدمت میں حاضر ہو کر التجا کی کہ آپ کی توجہ کے بغیر حالات درست نہ ہوں گے۔ چنانچہ سلطان مراد خان کو مجبوراً پھر اپنے خلوت خانے سے نکلنا اور ایشیائے کوچک سے ایڈریانوپل آنا پڑا۔ یہ سنہ ۸۴۹ھ کا واقعہ ہے۔ جب سلطان مراد ثانی ایڈریانوپل پہنچا تو فوج اور رعایا نے اس کا نہایت شاندار اور پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس مرتبہ تخت سلطنت پر جلوس کرنے کے بعد سلطان مراد خان نے اپنے بیٹے محمد خان کو جو سال بھر کے اندر دو مرتبہ تخت نشین ہو چکا تھا، ایشیائے کوچک میں اس لیے بھیج دیا کہ وہ وہاں رہ کر سلطنت کے متعلق زیادہ تجربہ حاصل کرے۔ تخت پر جلوس فرمانے کے بعد سلطان مراد خان نے بغاوت وسرکشی کے اماموں کو خوب سزائیں دیں اور ملک کے نظم ونسق میں مصروف ہو کر اب تیسری مرتبہ تخت کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ مراد ثانی نے اس مرتبہ عنان سلطنت ہاتھ میں لے کر عیسائیوں کو پھر سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا لیکن بلاوجہ اس نے کسی کو ستایا بھی نہیں۔ شاہ قسطنطنیہ اگرچہ اپنی شرارتوں اور فساد انگیزیوں کے سبب سے عثمانیوں کا سب سے بڑا دشمن اور سب سے زیادہ منبع فساد تھا اور ساتھ ہی اس کا قلع قمع کر دینا بھی مراد کے لیے کچھ زیادہ دشوار نہ تھا لیکن اسے اس نے اس کے حال پر رہنے دیا اور کوئی تعرض نہیں کیا۔ سنہ ۸۵۲ھ میں ہنی داس مذکور نے عیسائی فوجیں فراہم کر کے ترکوں کے استیصال کی تیاریاں کیں اور اسی طرح عیسائی فوجیں فراہم ہوئیں جیسے کہ اس سے پہلے کئی مرتبہ ترکوں کے خلاف جمع ہو چکی تھیں۔ اس مرتبہ مقام کسووا میں معرکہ عظیم برپا ہوا اور سلطان مراد ثانی نے اپنے اس پرانے حریف کو تین دن کی لڑائی کے بعد شکست فاش دے کر بہت سے علاقے پر قبضہ کر لیا اور سلطنت عثمانیہ کی وسعت میں اور اضافہ ہوا۔

اس کے بعد سلطان مراد خان ثانی کا بہت سا وقت البانیہ کا فساد مٹانے میں صرف ہوا لیکن وہ اپنی وفات یعنی سنہ ۸۵۵ھ تک اس فساد کا مکمل استیصال نہ کر سکا۔ البانیہ کے اس فساد کا حال اس طرح ہے کہ صوبہ البانیہ کو اگرچہ ترکوں نے بہت عرصہ پہلے فتح کر لیا تھا مگر اس صوبہ پر وہیں کا قدیم فرماں روا خاندان حکومت کرتا تھا جو ترکوں کا خراج گزار اور ہر طرح ماتحت تھا۔ جان کسٹرائٹ والی البانیہ نے سلطان مراد خان ثانی کے تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد اپنے آپ کو مورد الطاف

سلطانی بنانے کے لیے اپنے چار خورد سال بیٹے سلطان کی خدمت میں اس لیے بھیج دیے تھے کہ وہ بہ طور یرغمال سلطان کے پاس رہیں اور سلطان ان کو اپنی ینگ چری فوج میں داخل کرنے کے لیے تربیت دے۔ ایڈریانوپل کی تربیت گاہ میں اتفاقاً تین چھوٹے لڑکے بیمار ہو کر مر گئے۔ یہ خبر سن کر جان کسٹرائٹ والی البانیہ نے اپنے بیٹوں کے اس طرح فوت ہونے کو شبہ کی نظر سے دیکھا اور سلطان کو لکھا کہ میرے بیٹوں کو ممکن ہے کہ کسی میرے دشمن نے زہر دیا ہو۔ سلطان مراد خان ثانی کو بھی ملال ہوا اور چھوتھے لڑکے کو جو سب سے بڑا تھا اور جس کا نام جارج کسکٹرائٹ تھا، بہ نظر احتیاط خاص اپنے سلطانی محل میں پرورش دینے لگا۔ سلطان کو اس کا بہت خیال رہتا تھا۔ چنانچہ اس کو بہ طور ایک اسلامی بچہ کے شہزادوں کی طرح تربیت دی گئی۔ جب یہ لڑکا جارج کسٹرائٹ اٹھارہ سال کا ہو گیا تھا تو سلطان نے اس کو ایک فوجی دستہ کی سرداری سپرد کی۔ اس نے نہایت ہوشیاری اور خوبی کے ساتھ اپنی مفوضہ خدمات کو انجام دیا۔ اب وہ ایک پر جوش مسلمان سردار تھا۔

سلطان نے جارج کسٹرائٹ کا نام سکندر بیگ رکھا اور وہ سکندر بیگ اور لارڈ سکندر بے کے نام سے مشہور ہوا۔ سنہ ۸۳۶ھ میں اس کے باپ کسٹرائٹ کا البانیہ میں انتقال ہوا۔ اس وقت سکندر بیگ سلطانی خدمات اور بعض اضلاع کی حکومت پر مامور تھا۔ سلطان نے اس کو باپ کی جگہ فرماں روائے البانیہ مقرر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ البانیہ کے حاکم کی حیثیت سے بہت زیادہ اچھی حالت میں تھا۔ سلطان اس کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا اور وہ بڑے بڑے صوبوں کی فرماں روائی پر سلطان کی طرف سے مامور رہتا تھا۔ سلطان مراد خان ثانی کو کبھی بھول کر بھی اس بات کا خیال نہ آتا تھا کہ سکندر بیگ کسی وقت بغاوت و سرکشی پر بھی آمادہ ہو سکتا ہے۔ لیکن سنہ ۸۴۷ھ میں ترکی فوج کو جب ہنی داس کے مقابلے میں شکست حاصل ہوئی تو سکندر بیگ نے اپنے آبائی ملک البانیہ پر بہ زور قبضہ کر لینے کا مصمم ارادہ کیا اور یکا یک سلطانی میر منشی کے خیمے میں گھس گیا اور اس کے گلے پر تلوار رکھ کر اس سے زبردستی البانیہ کے صوبہ دار کے نام اس مضمون کا فرمان لکھایا کہ تم سکندر بیگ کو جو سلطان کی طرف سے بہ طور وائسرائے تمہارے پاس پہنچتا ہے، البانیہ کے دار السلطنت اور تمام علاقے کا چارج دے دو۔ یہ فرمان لکھا کر اور مہر سلطانی سے بھی مزین کرا کر اس میر منشی کو قتل کر دیا اور وہاں سے نکل کر سیدھا البانیہ کے دار السلطنت کی طرف چل دیا۔ وہاں کے صوبہ دار نے بلا تامل اس کو البانیہ کی حکومت سپرد کر دی اور رعایا نے اطاعت قبول کر

لی۔ البانیہ پر اس طرح قابض ہونے کے بعد اس نے باشندگان البانیہ میں اعلان کیا کہ میں دین اسلام سے مرتد ہوکر دین عیسوی قبول کرتا ہوں اور آئندہ تمام تر کوشش اس امر میں صرف کروں گا کہ اپنے ملک کو ترکوں کی ماتحتی سے آزاد رکھوں۔ اس اعلان کے سنتے ہی عیسائیوں میں عید ہوگئی اور البانیہ کے اندر یک لخت ترکوں کا قتل عام شروع ہوگیا۔ جس قدر ترک وہاں موجود تھے، عیسائیوں نے سب کو قتل کر ڈالا اور سکندر بیگ البانیہ کا خودمختار فرماں روا بن گیا۔ سکندر بیگ نے خاص سلطانی محل میں رہ کر اعلیٰ سے اعلیٰ جنگی تربیت حاصل کی تھی اور سلطانی قرب نے اس کو ذی حوصلہ اور باہمت بنا دیا تھا، شہزادوں کی طرح رہنے کے سبب سے وہ ترکوں کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ خود نہایت ذہین وذکی اور جری بھی تھا۔ نیز البانیہ کے پہاڑی ملک ہونے کے سبب سے وہاں کے راستے بھی سخت دشوار گزار تھے اور حملہ آور فوج کا اس ملک میں داخل ہونا آسان کام نہ تھا۔ ان سب وجوہات نے جمع ہوکر سکندر بیگ کو البانیہ میں فرماں روا بنا دیا۔

ادھر سلطان مراد خان ثانی کو دوسری مصروفیات سے ایسی فرصت نہیں ملی کہ وہ اپنی مکمل توجہ کے ساتھ اس کے استیصال پر آمادہ ہوتا۔ کئی مرتبہ البانیہ پر چڑھائیاں ہوئیں لیکن سکندر بیگ کی غیر معمولی بہادری اور غیر معمولی جنگی قابلیت کے سبب سے سلطانی فوجوں کو ناکام واپس آنا پڑا۔ سکندر بیگ نے البانیہ میں سلطانی فوج کے مقابلے میں ایسی ایسی حیرت انگیز بہادریاں دکھائیں اور اپنے آپ کو ایسا قابل جرنیل ثابت کیا کہ خود ترکوں کی بہادر قوم نے اس کی بہادری وجنگی قابلیت کا اعتراف کیا۔ سلطان مراد خان ثانی کے عہد حکومت میں وہ مغلوب واسیر نہ ہوسکا اور البانیہ کے پہاڑوں نے اس کی خوب امداد واعانت کی۔ لیکن جب سنہ ۸۷۲ھ میں وہ وینس کے علاقے میں جا کر مر گیا تو ترکی سپاہیوں نے اس کی قبر کھود کر اس کی ہڈیوں کے ٹکڑوں کو محض اس لیے تلاش کیا کہ ان کو بہ طور تعویذ گلے میں ڈالا جائے تاکہ ویسی ہی بہادری اور جنگی قابلیت اس کی ہڈیوں کے اثر سے ہم میں پیدا ہوسکے۔ سلطان مراد نے چونکہ اس کو بیٹوں کی طرح پرورش کیا تھا، اس لیے وہ سکندر بیگ کا قتل یا بربادی نہیں چاہتا تھا اور سلطان کو توقع تھی کہ وہ کسی وقت راہ راست پر آکر اطاعت وفرماں برداری اختیار کرے گا۔ سلطان کی وفات کے بعد سلطان محمد خان ثانی تخت نشین ہوا۔ چونکہ وہ بھی سکندر بیگ کو بھائیوں کی طرح عزیز رکھتا تھا، اس لیے اس نے سکندر بیگ سے صلح کرکے اس کو البانیہ کا حاکم تسلیم کرلیا تھا۔ لیکن سکندر بیگ نے جب پھر بھی بغاوت اختیار کی تو سلطان محمد خان

ثانی نے حملہ آور ہو کر البانیہ کو فتح کر لیا اور سکندر ریاست وینس کے علاقے میں چلا گیا جہاں اس کا سنہ ۸۷۲ھ میں انتقال ہوا۔ اس کے بعد البانیہ سلطنت عثمانیہ کا صوبہ تھا۔

سکندر بیگ کا **چونکہ ذکر آ گیا** تھا، **اس** لیے **اس** کو **یہیں ختم کر** دیا گیا۔ سلطان **مراد خان ثانی نے** سنہ **۸۵۵ھ** میں **وفات پائی اور** لاش **بروصہ** میں **لے** کر **دفن کی گئی**۔ اس **سلطان نے** تیس **سال حکومت** کی۔ **اس** سلطان کے **عہد** حکومت **میں** بھی **بڑے بڑے عظیم الشان** واقعات رونما ہوئے اور **بہ** حیثیت **مجموعی سلطنت** عثمانیہ کی **بنیادیں پہلے** سے **زیادہ استوار** ہو گئیں۔ **یہ** سلطان بہت **نیک، اللہ تعالیٰ** کو **پوجنے والا اور** رحم دل **تھا**۔

سلطان محمد خان ثانی، فاتح قسطنطنیہ:

سلطان مراد خان کی وفات کے وقت اس کا بیٹا محمد خان ایشیائے کوچک میں تھا، جس کی عمر اس وقت اکیس سال، چند ماہ کی تھی۔ اس سے پیشتر محمد خان ثانی دو مرتبہ جبکہ اس کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی، باپ کی زندگی میں تخت نشین ہو چکا تھا، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ مراد خان ثانی کی وفات کے بعد ارا کین سلطنت نے ایشیائے کوچک میں محمد خان ثانی کے پاس خبر بھجی اور وہ بلا توقف وہاں سے روانہ ہو کر درہ دانیال کو عبور کر کے ایڈریانوپل پہنچا اور وہاں مراسم تخت نشینی ادا کیے گئے۔ شاہ سرویا کی بیٹی سے مراد ثانی کا ایک اور بیٹا تھا، جو ابھی صرف آٹھ مہینے کا بچہ تھا۔ جب محمد خان ثانی کی تخت نشینی کے مراسم ادا ہو رہے تھے اور ارا کین سلطنت اطاعت و فرماں برداری کی بیعت کر رہے تھے تو ینگ چری فوج کے سردار نے یہ حرکت کی کہ سلطان محمد خان ثانی کی اطلاع کے بغیر اس بچے کو حمام میں لے جا کر قتل کر دیا۔ غالباً یہ کام اس نو مسلم سردار نے محمد خان ثانی کی حمایت میں کیا اور اپنے نزدیک اچھی خدمت بجا لایا، کیونکہ یہ لڑکا جوان ہو کر اپنی ماں یعنی سروین شہزادی کے سبب سے سرویا والوں اور دوسرے عیسائیوں سے مدد پا کر سلطان محمد خان ثانی کے لیے باعث تکلیف ہو سکتا تھا۔ لیکن سلطان محمد خان ثانی نے ینگ چری سردار کے اس ظالمانہ و سفاکانہ فعل کو سخت ناپسند کیا اور اپنے اس سوتیلے بھائی کے قصاص میں اس کو قتل کیا۔ چونکہ چھ سال پہلے محمد خان ثانی اپنے باپ کے زمانے میں دو مرتبہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے لیے تخت نشین ہو کر کسی اولوالعزمی اور بلند ہمتی کا اظہار نہ کر سکا تھا، اس لیے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک کمزور اور سست رائے سلطان ثابت ہوگا۔ حالانکہ یہ

قیاس کرنا ایک غلطی تھی۔ اس زمانے میں وہ پندرہ سولہ سال کا لڑکا اور اب اکیس بائیس سال کا نوجوان تھا۔ یہ چھ سال اس نے کھیل کود میں نہیں گزارے تھے بلکہ وہ حکومت وسلطنت کی قابلیت بڑھانے میں برابر ترقی کرتا رہا تھا۔ عالموں اور روحانی لوگوں کی صحبتوں نے اس کے اخلاق اور قوت ارادہ کو بہت کچھ پختہ کر دیا تھا۔

یورپی مورخ عام طور پر اس کو اپنے صغیرسن سوتیلے بھائی کا قاتل بتاتے ہیں۔مگر وہ اپنی اس غلط بیانی میں اس لیے معذور ہیں کہ محمد خان ثانی قسطنطنیہ کا فاتح ہے اور اس کو ملزم قرار دینا شاید عیسائی مورخ ثواب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ ینگ چری فوج کے سردار نے اس بچے کو قتل کیا تھا۔ اس کا بھی سب کو اقرار ہے کہ سلطان محمد خان نے اس سردار کو قصاص میں قتل کرایا مگر وہ کہتے ہیں کہ اس سردار نے محمد خان ثانی کے حکم سے اس کو قتل کیا تھا لیکن سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ سلطان محمد خان کو سردست اس چھوٹے بچے سے کسی قسم کا بھی کوئی اندیشہ نہ تھا۔ وہ اپنی تخت نشینی کے مراسم سے فارغ ہونے کے بعد بھی اس لڑکے کی جان لینے کی تدابیر عمل میں لا سکتا تھا۔ اس شیر خوار بچے کو تخت نشین کرنے کا کسی رکن سلطنت کو مطلق خیال تک بھی نہیں آیا تھا بلکہ سب ایڈریانوپل میں محمد خان کا انتظار کر رہے تھے۔ ینگ چری فوج کا سردار ایشیائے کوچک میں سلطان محمد خان کے ساتھ نہیں آیا تھا بلکہ پہلے ہی سے ایڈریانوپل میں موجود تھا۔ اگر یہ کام سلطان محمد خان کو کرانا تھا تو وہ اپنے ان سرداروں میں سے کسی کو اس کام پر مامور کرتا جو اس کے ساتھ ایشیائے کوچک سے آئے تھے اور جن پر اس کو ہر طرح کا بھروسہ تھا۔ ایڈریانوپل میں آتے ہی ایک ایسے سردار کو جو اس کے لیے مانوس شخص نہ تھا، یہ ظالمانہ حکم دینا معمولی احتیاط کے بھی خلاف تھا، پھر یہ کہ وہ سردار جب اپنے اس ناشدنی کام کی پاداش میں قتل کیا گیا تو اس نے اپنی جان بچانے کے لیے اس راز کو فاش نہ کیا۔ سروین شہزادی یعنی محمد خان کی سوتیلی ماں خود ان لوگوں میں شامل تھی جو تخت نشینی کی مبارک باد دینے آئے۔ سلطان محمد خان ثانی کی آئندہ زندگی میں اس قسم کی کوئی مثال نظر نہیں آتی اور اس باحوصلہ، نیک دل اور باعظمت سلطان سے ہرگز اس قسم کی احمقانہ حرکت کی توقع نہیں ہوسکتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ ینگ چری فوج چونکہ سلطنت عثمانیہ کی بڑی لاڈلی فوج سمجھی جاتی تھی، اس لیے اس فوج اور اس فوج کے سرداروں میں عام طور پر خودرائی وخودسری کی علامات پیدا ہونے لگی تھیں۔ سلطان مراد خان ثانی کے زمانے میں بھی ان لوگوں سے اس قسم کی حرکات سرزد ہو

چکی تھیں۔ اس نوجوان سلطان کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے اس سردار نے اسی قسم کا احسان اس پر کرنا مناسب سمجھا۔ یہی دھوکا قسطنطنیہ کے قیصر قسطنطین کو ہوا، جس کی وجہ سے اس کو قسطنطنیہ اور اپنی جان دینی پڑی۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آئے گی، ان شاء اللہ۔

سنہ ۸۵۲ھ میں سلطان مراد خان ثانی سے تین سال پیشتر قیصر جان پلیلوگس کے فوت ہونے پر قیصر قسطنطین دوازدہم قسطنطنیہ میں تخت نشین ہوا۔ قسطنطین دوازدہم بھی اپنے پیش رو کی مانند خوب چالاک وچوکس آدمی تھا۔ اس نے سلطان مراد خان ثانی کی وفات اور سلطان محمد خان ثانی کی تخت نشینی پر ایشیائے کوچک کے سرکش اور باغیانہ خیالات رکھنے والے امیروں کو سہارا دے کر فوراً ایک بغاوت برپا کرا دی۔ جس کے سبب سے سلطان محمد خان کو ایشیائے کوچک میں جا کر باغیوں کو ٹھیک اور وہاں کے انتظام کو درست کرنا پڑا۔ ابھی سلطان محمد خان ایشیائے کوچک کے انتظام سے فارغ نہ ہوا تھا کہ قیصر قسطنطین نے سلطان کے پاس پیغام بھیجا کہ سلطان مراد خان ثانی کے زمانے سے خاندان عثمانیہ کا ایک شہزادہ ارخان نامی ہمارے پاس نظر بند ہے۔ اس کے اخراجات ضروریہ کے لیے جو رقم سلطانی خزانہ سے آتی ہے، اس میں اضافہ کرو، ورنہ ہم اس شہزادہ کو آزاد کر دیں گے اور وہ آزاد ہو کر تم سے ملک چھین لے گا۔ قیصر چونکہ سلطان محمد خان ثانی کو ایک کمزور طبیعت کا سلطان تصور کیے ہوئے تھا، اس لیے اس نے اس دھمکی کے ذریعہ سے سلطان سے روپیہ اینٹھنا اور اس کو دبانا چاہا۔ اگر واقعی سلطان محمد خان ایسا ہی کمزور اور پست ہمت ہوتا، جیسا کہ قیصر نے سمجھا تھا، تو وہ ضرور ہی اس دھمکی سے ڈر جاتا اور قیصر قسطنطین کے نہ صرف اسی بلکہ آئندہ مطالبات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن سلطان محمد خان ثانی سکندر یونانی اور نپولین فرانسیسی سے زیادہ قوی قلب وارادہ کا مالک تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس طرح کام نہ چلے گا اور جب تک اس عیسائی سلطنت کا قصہ پاک نہ کر دیا جائے گا، سلطنت عثمانیہ کا قیام واستحکام ہمیشہ معرض خطر ہی میں رہے گا۔ اس وقت سلطان نے قیصر کے ایلچیوں کو ٹال دیا اور کوئی صاف جواب نہ دیا۔

ایشیائے کوچک سے واپس آ کر سلطان محمد خان نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ہنی داس یا ہنی ڈیز بادشاہ ہنگری سے تین سال کے لیے صلح کا عہد نامہ کر لیا۔ اس عہد نامہ کے مکمل ہو جانے سے سلطان کو اپنی سلطنت کی شمالی حدود کی جانب سے اطمینان حاصل ہو گیا۔ اسی دوران میں ینگ چری فوج اور اس کے سرداروں کی طرف سے بدعنوانیاں ملاحظہ کر کے سلطان نے ان کو قرار واقعی سزائیں

دے کران کی اصلاح کی۔ قیصر قسطنطین نے دوبارہ اپنے ایلچی ایڈریانوپل میں سلطان کے پاس بھیجے اور پھر شہزادہ ارخان کے نفقہ کے اضافہ، ورنہ اس کے آزاد کر دینے کی دھمکی دی اور نہایت سفیہانہ انداز سے اصرار کیا کہ اس کا جواب سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا تھا کہ سلطان محمد خان ثانی نے ارخان کا نفقہ بالکل بند کر دیا اور قیصر کے سفیروں کو نہایت ذلت کے ساتھ اپنے دربار سے نکلوا کر قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ اب قیصر کی آنکھیں کھلیں اور اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ میں نے جس کو روباہ سمجھا تھا، وہ درحقیقت شیر ہے۔ چونکہ قیصر قسطنطین اپنی شجاعت اور ہوشیاری میں ممتاز اور بہت باہمت شخص تھا، اس نے یہ دیکھ کر کہ مجھ کو سلطان محمد خان سے ضرور دو دو ہاتھ کرنے پڑیں گے، بلاتوقف جنگی تیاریاں شروع کر دی۔ قسطنطین کی روشن خیالی اور مآل اندیشی کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے عیسائیوں کے دو بڑے بڑے گروہوں میں اتفاق پیدا کرنا ضرور سمجھا۔ اس زمانے تک عیسائیوں کا فرقہ پراٹسٹنٹ [1] پیدا نہ ہوا تھا، جس کو رومن کیتھولک [2] عیسائیوں سے بہت سخت اور اہم اختلاف ہے بلکہ اس زمانے میں تمام عالم عیسائیت عقیدہ کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم سمجھا جاتا تھا۔ ایک گروہ شہر روما کے پوپ کو اپنا پیشوا مانتا اور رومن چرچ کا ماتحت سمجھا جاتا تھا۔ دوسرا گروہ گریک چرچ یعنی یونانی گرجے کا پیرو اور قسطنطنیہ کے بشپ اعظم کو اپنا مذہبی پیشوا سمجھتا تھا، جس کی سرپرستی کا فخر قیصر قسطنطنیہ کو حاصل تھا۔ ان دونوں گروہوں میں عقیدہ کا کچھ بہت بڑا فرق نہ تھا۔ عشائے ربانی [3] میں رومن طریقے کے پیرو شراب کے ساتھ فطیری روٹی استعمال کرتے تھے اور قسطنطنیہ کے پیرو خمیری روٹی ضروری سمجھتے تھے۔ اس خمیری اور فطیری کے اختلاف سے دونوں گروہوں کے پادریوں کی وہی حالت تھی جو اس جہالت وتاریکی کے زمانہ میں ہم اپنے پیشہ ور مولویوں کی دیکھ رہے ہیں کہ ذرا ذرا سی باتوں مثلاً آمین اور رفع یدین پر بلاتامل کفر

---

1. اگرچہ یہ فرقہ بھی کفریہ تعلیمات کا پابند ہے لیکن یہ عیسائیوں کا اصلاحی یا اعتدال پسند فرقہ سمجھا جاتا ہے۔ جس کا آغاز ۱۵۱۷ء میں ہوا۔
2. CATHOLIC۔ قدیم رومی عیسائی مذہب کا پابند عیسائی فرقہ۔ یہ لوگ متشدد، کٹر اور راسخ العقیدہ کہلاتے ہیں۔ عیسائیوں کا تیسرا بڑا فرقہ آرتھوڈوکس کہلاتا ہے۔
3. وہ آخری کھانا جو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کے ساتھ کھایا تھا عشائے ربانی کہلاتا ہے۔ اب یہ عیسائیوں کے ہاں عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی یاد میں کھانے کی ایک رسم ہے جو بعض گرجوں میں ہفتہ میں ایک بار، بعض میں مہینہ میں ایک بار، بعض میں ہر تین ماہ کے بعد اور بعض میں سال بھر میں تین بار منائی جاتی ہے۔

کے فتوے قلعہ شکن توپوں کی طرح داغتے اور اپنی بہادری پر مسرور ہوتے ہیں۔ قیصر قسطنطین نے روما کے پوپ کو لکھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے مذہبی اختلاف کو مٹا دیں اور سب متحد و متفق ہو کر مسلمانوں کا مقابلہ کریں۔ میں بہ خوشی آپ کے عقائد کو تسلیم کرتا ہوں اور آئندہ قسطنطنیہ کا گرجا بھی آپ کے ہی ماتحت ہوگا۔ لہٰذا جس طرح بیت المقدس اور شام کی فتح کے لیے تمام براعظم یورپ میں مقدس جنگ کا اعلان کیا گیا تھا اور عیسائی فوجی جوق در جوق جمع ہو کر مسلمانوں کے مقابلے کو پہنچ گئے تھے، اسی اہتمام کے ساتھ اب قسطنطنیہ کو بچانے اور عثمانیہ سلطنت کو نیچا دکھانے کے لیے آپ کی طرف سے اعلان اور ترغیب ہونی چاہیے۔ قیصر قسطنطین کی یہ تجویز بہت کارگر اور مفید ثابت ہوئی۔ پوپ نے جس کا نام نکلسن پنجم تھا، پوری سرگرمی کے ساتھ عیسائیوں کو مقدس جنگ پر آمادہ ہونے کی ترغیب دی۔ چنانچہ ہسپانیہ (اندلس) کے شمالی صوبوں اراگون وقسطلہ سے عیسائی جنگجوؤں کی زبردست اور کارآزمودہ فوجیں قسطنطنیہ پہنچیں۔ اسی طرح پوپ نے خود ایک زبردست فوج اپنے ایک نائب کارڈنبل کی ماتحتی میں جہازوں پر روانہ کی۔ وینس اور جنیوا کی بحری طاقتیں اور بری فوجیں بھی قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوگئیں۔ ادھر قسطنطین نے شہر قسطنطنیہ کی فصیل کو مضبوط اور بندرگاہ کو حفاظتی سامانوں سے محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ خاص شہر قسطنطنیہ کی آبادی میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی موجود تھے۔ باشندوں سے چندے وصول کیے گئے اور عام طور پر عیسائیوں کو ترغیب دی گئی کہ اب وہ آرام طلبی چھوڑ کر شہر کی حفاظت اور دشمن کے حملہ کی مدافعت میں اپنی تمام طاقتیں صرف کر دیں۔ یورپ کے عیسائی مورخ حتیٰ کہ اڈمنڈ اولیور اور ای۔ ایس۔ کریسی بھی جو اپنی بے تعصبی اور راست گفتاری کے لیے شہرت رکھتے ہیں، فتح قسطنطنیہ کے حالات بیان کرتے ہوئے اپنے یورپی اور عیسائی تعصب سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح سلطان محمد خان ثانی کی ذات پر کوئی نہ کوئی الزام لگائیں۔ چنانچہ یہ لوگ قسطنطین کی فوج اور اس کی جنگی تیاریوں کو بیان کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کیونکہ اس طرح ان کو سلطان محمد خان ثانی کی غیر معمولی شجاعت اور حیرت انگیز استقلال کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال سلطان محمد خان ثانی کے آفتاب سے زیادہ روشن کارنامے ان منصف مزاج عیسائی مورخوں نے خون کے گھونٹ پی پی کر لکھے ہیں۔

سلطان محمد خان ثانی نے ایک ہوشیار آہنگر اربان نامی نومسلم کو جو ہنگری کا قدیم باشندہ اور اسلام قبول کرنے سے پیشتر قسطنطین کا نوکر رہ چکا تھا، حکم دیا کہ وہ بڑی بڑی زبردست مار کی توپیں

بنانا شروع کرے۔ چنانچہ متعدد توپیں تیار ہوئیں، جن میں بعض بہت ہی بڑی اور وزنی گولہ پھینکنے والی تھیں۔ چند سال پیشتر یعنی سلطان مراد خان ثانی کے عہد حکومت سے سلطنت عثمانیہ نے لڑائیوں میں توپوں کا استعمال شروع کر دیا تھا مگر ابھی یہ کوئی بہت کار آمد آلہ جنگ نہ تھا۔ قلعوں کی دیواریں مسمار کرنے میں توپ کا مرتبہ منجنیق سے کچھ زیادہ بلند نہ تھا۔ چنانچہ یہ توپیں جو سلطان محمد خان نے اربان سے تیار کرائیں اور جن کی نقل وحرکت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں بڑی دقت اور دشواری پیش آتی تھی، وہ ایسی تھیں کہ ایام محاصرہ میں صبح سے شام تک ان سے صرف سات آٹھ مرتبہ فائر ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اسی لیے محاصرہ قسطنطنیہ میں یہ کچھ بہت مفید ثابت نہیں ہوئیں۔ اسی طرح قسطنطین نے بھی اپنے توپ خانہ کو بہت مکمل و مضبوط بنا لیا تھا۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ یورپ کے عیسائی سلاطین اور سلاطین عثمانیہ نے لڑائیوں میں توپ کے استعمال کو بہت ترقی دی اور یہ بہترین آلہ جنگ متصور ہونے لگا۔

سلطان محمد خان ثانی نے اپنی سلطنت کے ہر ایک حصہ میں نظم وانتظام اور امن وامان قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے اپنی کوشش وتوجہ منعطف کی اور جب اس طرف سے کلی اطمینان حاصل ہو گیا تو قسطنطنیہ کے محاصرے کے لیے پچاس ہزار سوار اور بیس ہزار پیدل کی ایک پر جوش اور بہادر فوج منتخب کی۔ سلطان محمد خان ثانی کی فوج کا ستر ہزار ہونا کریسی نے بیان کیا ہے جو یقیناً مبالغہ سے خالی نہیں کیونکہ دوران محاصرہ میں جو ۱۶ اپریل سے ۲۹ مئی سنہ ۱۴۵۳ء تک یعنی سات ہفتے قائم رہا، اس ستر ہزار فوج کے لیے سامان رسد کا مہیا ہونا ان حالات میں کوئی آسان کام نہ تھا۔

سنہ ۸۵۶ھ مطابق سنہ ۱۴۵۲ء سے طرفین کی جنگی تیاریاں علانیہ شروع ہو گئی تھی۔ قیصر قسطنطین نے قسطنطنیہ کے اندر سامان رسد اور غلہ وغیرہ حد سے زیادہ جمع کر لیا تھا۔ یورپ کے ملکوں سے نہ صرف جنگجو لوگوں کے جہاز آ رہے تھے بلکہ اور دوسرے ملکوں سے معمار وانجینئر اور تجربہ کار جنگی سردار شہر قسطنطنیہ کی مضبوطی کے سامانوں کو مکمل کرنے کے لیے موجود ہو گئے تھے۔ سمندر کی جانب بندرگاہ کے دہانہ پر ایک مضبوط آہنی زنجیر اس طرح دونوں طرف باندھی گئی تھی کہ کسی جہاز کا بندرگاہ میں داخل ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ہاں جب شہر والے خود چاہتے تھے کہ جہاز کو اندر آنے دیں تو اس زنجیر کو سمندر کی گہرائی میں ڈھیلا کر کے ڈال دیتے تھے اور جہاز اندر داخل ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد زنجیر کو کھینچ دیا جاتا تھا اور پھر کسی غیر جہاز کا داخل ہو جانا غیر ممکن ہوتا تھا۔ شہر کی فصیل چودہ میل

قطر کے دائرہ میں نہایت مضبوط اور نا قابل تسخیر تھی۔ سمندر کی جانب یعنی جس طرف بندرگاہ تھی، فصیل کسی قدر نیچی اور کمزور تھی کیونکہ اس طرف سے کسی حملہ یا محاصرہ کی توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ فصیل کے چاروں طرف گہری خندق جو نا قابل گزر تھی، کھدی ہوئی تھی۔ فصیل کے باہر بھی جا بہ جا مضبوط برجوں کے ذریعہ سے خندق وفصیل کی حفاظت کے لیے توپیں اور مضبوط فوجی دستے تیراندازوں کے مامور تھے۔ پرانی تعمیر کے برجوں اور دیوار کے ان حصوں کو جو بھاری توپوں کے چڑھانے اور ان سے فائر کرنے کی حالت میں شکستہ ہو جانے کی استعداد رکھتے تھے، از سر نو مضبوط و مستحکم بنایا گیا۔ اس طرح قسطنطنیہ کی حفاظت کا جس قدر سامان اور اہتمام ہوسکتا تھا، وہ بہ درجہ اتم پورا کر لیا گیا تھا۔

سلطان بایزید یلدرم نے آبنائے باسفورس کے تنگ ترین مقام کے ایشیائی ساحل پر ایک قلعہ بنایا تھا۔ سلطان محمد خان ثانی نے جب قسطنطنیہ کی فتح کا ارادہ کیا تو اس قلعہ کے مقابل یورپی ساحل پر ایک قلعہ بنانا شروع کیا اور یہی گویا اس کی سب سے پہلی علی الاعلان جنگی تیاری تھی۔ یہ قلعہ بہت جلد بن کر تیار ہو گیا اور اس پر توپیں چڑھا دی گئیں، جیسا کہ مقابل کے ایشیائی قلعہ پر بھی توپیں موجود تھیں۔ اس طرح آبنائے باسفورس کا دروازہ سلطان محمد خان ثانی نے بند کر دیا اور بحر اسود کو بحر مارمورا سے جدا کر کے قیصر کے جہازوں کو بحر اسود میں آنے سے روک دیا لیکن اس سے قسطنطین کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ اس کو درہ دانیال کے ذریعہ سے یورپی ممالک یعنی اٹلی واسپین وغیرہ سے امداد پہنچ رہی تھی۔ سلطان محمد خان کے پاس کل تین سو کشتیاں بتائی جاتی ہیں، جو قریباً سب چھوٹی چھوٹی تھیں اور ان میں سے ایک بھی ایسی بڑی نہ تھی جو قسطنطین کے چودہ بڑے بڑے جنگی جہازوں میں کسی چھوٹے سے چھوٹے جہاز کے برابر ہو۔

فتح قسطنطنیہ

۶ اپریل سنہ ۱۴۵۳ء مطابق ۲۲ ربیع الاول سنہ ۸۵۷ھ کو سلطان محمد خان ثانی اپنی فوجیں لیے ہوئے خشکی کی جانب سے قسطنطنیہ کی فصیل کے سامنے نمودار ہوا۔ ادھر عثمانی جہازوں نے بحر مارمورا میں سمٹ کر بندرگاہ قسطنطنیہ یعنی گولڈن ہارن کے سامنے بحری محاصرہ شروع کیا۔ سلطانی بیڑہ کا امیر البحر بلوط اغلن نامی ایک سردار تھا۔ سلطان نے فصیل شہر کا محاصرہ کر کے جا بہ جا مناسب دستوں کو مامور کیا اور بیلداروں کو حکم دیا کہ ساباط اور سرنگوں کے بنانے میں مصروف ہوں اور تیز رفتاری کے

ساتھ ساباط اور دمدموں کو فصیل شہر کے نزدیک لے جائیں۔ مناسب موقعوں پر دمدمے تیار کر کے تیراندازوں کو مامور کیا گیا کہ جو شخص فصیل شہر سے سر ابھارے، اس کو تیر کا نشانہ بنائیں۔ اس محاصرے کے جاری کرنے میں سلطان محمد خان نے اپنی حیرت انگیز قابلیت کا اظہار کیا۔ محاصرین نے جلد جلد محاصرہ کے حلقہ کو تنگ اور فصیل شہر کے متصل پہنچنے کی کوشش کی۔ منجنیقوں اور توپوں کو مناسب موقعوں پر نصب کر کے فصیل شہر پر جابہ جا گولوں اور پتھروں کی بارش کی گئی۔

ادھر محصورین بھی مدافعت کے لیے پورے طور پر تیار اور مستعد تھے۔ جنیوا کے سپہ سالار جان اغطیاس اور یونانی سپہ سالار ڈیوک نوطارس نے بڑی قابلیت اور ہمت کے ساتھ مدافعت کے کاموں کو انجام دیا۔ پوپ نکلسن پنجم کے نائب کارڈنل نے اپنی شجاعت و تجربہ کاری کے نمایاں ثبوت پیش کرنے شروع کیے۔ ان تمام سپہ سالاروں اور فوجوں کی مجموعی طور پر نگرانی قیصر قسطنطین نے اپنے ہاتھ میں لی۔ وہ صبح سے شام تک اور رات کے وقت بھی پشت زین سے بہت کم جدا ہوتا تھا۔ ہر ایک مورچہ اور ہر ایک مقام پر خود پہنچتا۔ سپاہیوں کے دل بڑھاتا اور سپہ سالاروں کے کاموں کا معائنہ کر کے ان کو داد دیتا تھا۔ محاصرہ کے شروع ہوتے ہی باشندگان شہر اور عیسائی فوجوں میں انتہا درجہ کا جوش پیدا ہو گیا تھا۔ لڑائی کی ترغیب دینے اور شہید ہونے کے فضائل بیان کرنے کے لیے بڑے پادری اور بشپ وعظ و نصیحت کرتے اور لوگوں کو لڑ کر جان دینے پر آمادہ بناتے تھے۔

سلطان محمد خان ثانی نے اپنا خیمہ شہر کے دروازہ سینٹ رومانوس کے سامنے نصب کرایا تھا اور اسی دروازے پر محاصرین نے زیادہ زور صرف کرنا شروع کیا تھا۔ اول اول محصورین نے فصیل شہر اور خندق سے باہر نکل کر محاصرین پر حملے شروع کیے۔ لیکن جب اس طرح وہ عثمانی لشکر کے ہاتھ سے زیادہ مقتول ہونے لگے تو قسطنطین نے حکم دیا کہ کوئی شخص فصیل شہر سے باہر جانے کا قصد نہ کرے۔ قلعہ، فصیل اور برجوں سے توپوں اور منجنیقوں کے ذریعہ سے محصورین نے محاصرین کو ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کیا۔ آخر چند روز کے بعد فصیل شہر میں کہیں کہیں رخنے نمودار ہوئے لیکن محصورین کی قابلیت و مستعدی نے فوراً ان کو بند کر کے پہلے سے بھی زیادہ مضبوط بنا لیا۔ سلطان محمد خان ثانی نے اپنی فوج کو خندق کے کنارے تک لے جا کر کئی جگہ خندق کو پاٹ کر راستے بنائے اور اس طرح عثمانی فوج فصیل تک پہنچی لیکن فصیل کے اوپر ان کا کوئی بس نہ چل سکا۔ اوپر سے عیسائیوں نے روغن نفط جلا جلا کر ان پر پھینکنا شروع کیا۔ مجبوراً ان کو واپس آنا پڑا۔ اب سلطان نے ایک اور تدبیر

سوچی اور لکڑی کے اونچے اونچے مینار بنوائے جو فصیل شہر کے برابر بلند تھے اور ان کے نیچے پہیے لگے ہوئے تھے، جن کی وجہ سے بہ آسانی ان کو حرکت میں لا سکتے تھے۔ ان میناروں کے ساتھ ایک ایک لمبی سیڑھی کو اوپر اٹھا کر دوسرا سرا قلعہ کی دیوار پر رکھ دیا۔ اس طرح خندق کے اوپر ایک پل بندھ جاتا تھا۔ عثمانی سپاہی اس مینار پر چڑھ کر سیڑھی کے اوپر ہوتے ہوئے فصیل شہر پر پہنچنے کی کوشش میں لگے رہے مگر محصورین نے نہایت مستعدی اور چابک دستی کے ساتھ ان میناروں پر رال کے جلتے ہوئے گولے پھینک کر ان میں آگ لگا دی اور اس طرح ان میناروں اور سیڑھیوں کے جلنے سے قلعہ کشائی کی یہ تدبیر بھی کامیاب نہ ہوسکی۔

۱۵ اپریل کو یعنی محاصرہ شروع ہونے سے نویں روز خبر پہنچی کہ جنیوا کے چار جہاز غلہ اور گولہ بارود کا سامان لیے ہوئے ترکی جہازوں کی صفوں کو چیرتے پھاڑتے ہوئے صاف بچ کر نکل گئے اور گولڈن ہارن یعنی قسطنطنیہ کی بندرگاہ میں داخل ہو کر شہر والوں کو یہ گراں قدر امداد پہنچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ سلطان بہ ذات خود گھوڑے پر سوار سمندر کے کنارے پہنچا اور دیکھا کہ پانچ جہاز اسی طرح بحر مارمورا میں دشمنوں کے اور آ رہے ہیں۔ سلطان نے فوراً اپنے امیرالبحر اور بحری فوج کو حکم دیا کہ ان کو روکو اور بندرگاہ میں داخل نہ ہونے دو۔ سلطان اور عثمانی بری فوج کنارے پر اس بحری جنگ کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ ادھر عیسائی لوگ بھی فصیل شہر کے اوپر چڑھے ہوئے اس تماشے کے معائنہ میں مشغول تھے۔ عثمانی جہازوں نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ ان جہازوں پر حملہ کر کے ان کی لمبی قطار کو توڑ دیا اور وہ ایک جگہ آگے پیچھے اور پہلو بہ پہلو اکٹھے ہو گئے۔ عثمانی جہازوں نے چاروں طرف سے ان کو گھیر لیا اور ان کے قریب پہنچ کر ہر چند کوشش کی کہ ان پر چڑھ کر ان کے ملاحوں کو قتل کریں اور قابض ہو جائیں مگر وہ جہاز اس قدر بڑے اور بلند تھے کہ عثمانی سپاہی اپنے چھوٹے اور پست جہازوں سے ان پر کسی طرح نہ چڑھ سکے۔ اول جبکہ عثمانی جہازوں نے ان کا محاصرہ کر لیا تھا تو دیکھنے والوں کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ پانچوں جہاز ضرور گرفتار ہو جائیں گے لیکن اسی کشمکش میں تھوڑی دیر بعد دیکھا گیا کہ وہ تیزی سے عثمانی کشتیوں کے بیچ میں سے نکل کر بندرگاہ کی طرف چلے۔ محصورین نے فوراً زنجیر نیچی کر دی اور وہ گولڈن ہارن میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد زنجیر کو پھر کھینچ لیا گیا اور عثمانی جہازوں کے حملہ کا کوئی خوف ان کو نہ رہا۔ سلطان محمد خان نے اپنی بحری فوج کی اس ناکامی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کو سخت ملال ہوا۔ اس نے اپنے

امیر البحر کو بلا کر اپنے ہاتھ سے خوب مارا اور آئندہ کے لیے اس کو زیادہ مستعد رہنے کا حکم دیا۔ مگر امیر البحر بیچارے کی کوئی خطا نہ تھی اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے جہازوں سے دیوہیکل جہازوں پر کس طرح قبضہ کر سکتا تھا۔ مگر سلطان کی تنبیہ اور امیر البحر کی بیش از پیش مستعدی کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ اس کے بعد کسی اور جہاز کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ درہ دانیال کو عبور کر کے بحر مارمورا میں داخل ہو سکے۔ ان پانچ جہازوں میں جو فوج سوار ہو کر آئی تھی، یہ گویا قسطنطنیہ کے لیے آخری بیرونی امداد تھی۔ سلطان نے محاصرہ کے کام میں انتہا درجہ کی مستعدی دکھائی۔ بار بار نقصان اٹھانا پڑا۔ بار بار حملے ناکام اور بلا نتیجہ ثابت ہوئے۔ محصورین کی ہمتیں اپنی کامیابیوں کو دیکھ دیکھ کر اور بھی زیادہ بڑھ گئیں۔ شہر کے اندر سامان مدافعت اور رسد کی مطلق کمی نہ تھی۔ وہ برسوں محصور رہ کر ثابت قدم رہنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ ان کو یہ بھی توقع تھی کہ ہنگری کا بادشاہ ہنی داس اپنے عہد نامہ صلح کو توڑ کر ضرور شمال کی جانب سے حملہ آور ہوگا اور قسطنطنیہ کا محاصرہ اٹھ جائے گا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے سلطان محمد خان ثانی کی جگہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ضرور محاصرہ اٹھا کر چل دیتا اور اس کام کو کسی دوسرے وقت پر ٹال دیتا۔ مگر سلطان محمد خاں اپنے ارادہ کا پختہ اور ہمت کا دھنی تھا۔ اس کے عزم و استقلال میں مطلق کمی نہ آئی اور وہ ہر ایک ناکامی کو دیکھ کر اور بھی زیادہ اپنے ارادہ میں مضبوط ہوتا گیا۔

سلطان محمد خان جب قسطنطنیہ کے ارادے سے فوج لے کر چلا تھا تو اس نے علماء و فضلا اور عابدوں، زاہدوں کی ایک جماعت بھی اپنے ہمراہ لی تھی۔ ان نیک لوگوں کی صحبت سے مستفیض ہونے کا اس کو ابتدا ہی سے بہت شوق تھا۔ وہ اپنے باپ کی زندگی کے آخری چھ سال انہیں لوگوں کے پاس رہا تھا اور انہیں کے فیض محبت سے اس کے ارادے میں استقلال اور حوصلے میں بلندی پیدا ہوئی تھی۔ دوران محاصرہ میں بھی وہ انہیں روحانی اور نیک لوگوں سے مشورہ لینا کافی سمجھتا تھا۔ رفتہ رفتہ جب محاصرہ کو طول ہوا تو اس جوان العمر و جواں بخت سلطان کو وہ تدبیر سوجھی جو اس وقت تک کسی کو نہ سوجھی تھی۔ شہر کی ایک سمت جو سمندر یعنی گولڈن ہارن (شاخ زریں) سے محفوظ تھی، اس پر محاصرے کی کوئی زد نہیں پڑ سکتی تھی۔ محاصرین کی تمام ہمت خشکی کی جانب صرف ہو رہی تھی۔ خاص سینٹ رومانس والے دروازے کی جانب آلات قلعہ کشائی زیادہ کام میں لائے جا رہے تھے۔ لہٰذا شہر والے بھی اور اطراف سے بے فکر ہو کر اسی جانب اپنی پوری قوت مدافعت صرف کر رہے تھے۔ سلطان نے سوچا کہ شاخ زرین کی جانب یعنی سمندر کی طرف سے اگر شہر پر حملہ ہو سکے تو ان کی توجہ

دو طرف تقسیم ہو سکے گی اور اس طرح فصیل شہر کو توڑ کر اس میں داخل ہونا ممکن ہو گا۔ مگر سمندر کی جانب حملہ اس وقت ہو سکتا تھا کہ گولڈن ہارن (شاخ زریں) کے دہانہ پر آہنی زنجیر نہ ہوتی اور جہاز اس میں داخل ہو سکتے۔ گولڈن ہارن سے مشرق کی جانب قریباً دس میل چوڑی خشکی گردن تھی، جس کے دوسری طرف آبنائے باسفورس کا سمندر تھا اور اس میں سلطانی جہاز آزادی سے چلتے پھرتے تھے۔ سلطان نے ماہ جمادی الاول کی چودھویں تاریخ جبکہ ساری رات کی چاندنی تھی، باسفورس سے لے کر بندرگاہ گولڈن ہارن تک برابر لکڑی کے تخت بچھوا دیے۔ باسفورس کے کنارے خشکی پر اسی (۸۰) جہازوں کو چڑھا لیا۔ ان اسّی جہازوں کی ٹرین جب خشکی پر چڑھ آئی تو ان میں باقاعدہ ملاحوں اور سپاہیوں کو سوار کر دیا، پھر ہزار ہا آدمیوں نے دونوں طرف سے ان جہازوں کو دھکیلنا شروع کیا۔ اس طرف سے ہوا بھی موافق تھی۔ چنانچہ جہازوں کے بادبان کھول دیے گئے اور وہ لکڑی کے تختوں پر آدمیوں کے زیادہ زور لگائے بغیر خود بہ خود بھی چلنے لگے۔ اس چاندنی رات میں ہزار ہا آدمیوں کا شور و غل، خوشی کے نعرے اور فوجی گیت اور باجے شہر والے سنتے تھے اور کچھ نہ سمجھ سکتے تھے کہ آج عثمانی لشکر میں یہ کیا ہو رہا ہے؟ آخر صبح ہونے سے پہلے یہ دس میل کی مسافت خشکی میں طے کرا کر ان جہازوں کو بندرگاہ گولڈن ہارن میں لا کر ڈال دیا گیا۔ قسطنطین کے جہاز جو گولڈن ہارن میں موجود تھے، وہ سب گولڈن ہارن کے دہانہ کے قریب اور اس آہنی زنجیر کے متصل صف بستہ تھے تاکہ کسی کو اندر داخل نہ ہونے دیں۔ شہر کے متصل اور بندرگاہ کی نوک پر ان کو رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ صبح ہونے پر شہر والوں نے دیکھا کہ عثمانی جہازوں نے فصیل شہر کے نیچے ایک پل بنا دیا ہے اور توپوں کو مناسب موقعوں پر رکھ کر اس طرف کی کمزور فصیل پر گولہ باری کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر عیسائیوں کے حواس جاتے رہے، ادھر عیسائی جہازوں نے گولڈن ہارن کے دہانہ کی طرف سے اندر کی جانب آنا اور عثمانی جہازوں پر حملہ کرنا چاہا تو بندرگاہ کے دونوں کنارے کے توپ خانے نے جو اسی غرض سے نصب کر دیا گیا تھا، ان پر گولہ باری کی اور جو جہاز آگے بڑھا، اسی کو گولہ کا نشانہ بنا کر ڈبو دیا۔ شاید اسی موقع پر سلطان محمد خان ثانی کے توپ خانے نے سب سے زیادہ مفید خدمت انجام دی۔ اس طرح یکایک سمندر کی جانب سے حملہ ہونے پر عیسائیوں کو اپنی طاقت تقسیم کرنی پڑی اور وہ مجبور ہو گئے کہ شہر کی اس جانب مدافعت اور حفاظت کے لیے زبردست فوج متعین کریں۔

اسی روز یعنی ۲۴ مئی کو قسطنطین نے سلطان کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ جس قدر خراج مجھ پر مقرر کریں، میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔ مجھ کو باج گزار بنا کر قسطنطنیہ میرے ہی پاس رہنے دیجیے۔ سلطان نے جبکہ اس کو شہر کے مفتوح ہونے کا یقین ہو چکا تھا، جواباً کہلا بھجوایا کہ اگر تم اطاعت کرتے ہو تو تم کو یونان کا جنوبی حصہ دیا جا سکتا ہے لیکن میں قسطنطنیہ کو اپنے مقبوضہ ممالک میں شامل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سلطان محمد خان جانتا تھا کہ قسطنطنیہ کی عیسائی سلطنت جو سلطنت عثمانیہ کے بیچ میں واقع ہے، جب تک قائم رہے گی، خطرات اور مصائب کا سد باب نہ ہوگا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ قسطنطنیہ سلطنت عثمانیہ کا بہترین دارالسلطنت ہوسکتا ہے۔ وہ قسطنطین اور اس کے پیش رو قیاصرہ کی مسلسل شرارتوں سے بھی بہ خوبی واقف تھا۔ وہ اس قدر طویل محاصرہ اور محنت کے بعد اب کامیابی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ایسی حالت میں قسطنطین کی درخواست پر اس کا جنوبی یونان کے دے دینے پر آمادہ ہو جانا بڑی ہی عظیم الشان شاہانہ فیاضی تھی لیکن قیصر قسطنطین کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ مشرقی روم کی اس عظیم الشان اور پرانی سلطنت کا آخری فرماں روا ہو۔ چنانچہ اس نے سلطان کی اس مہربانی سے کوئی فائدہ اٹھانا نہ چاہا اور پہلے سے چہار چند زیادہ جان فشانی و جاں فروشی کے ساتھ سلطان کی مخالفت میں مصروف ہوگیا۔

۱۹ جمادی الاول سنہ ۸۵۷ھ مطابق ۲۸ مئی سنہ ۱۴۵۳ء کو سلطان محمد خان ثانی نے اپنی تمام فوج میں اعلان کرا دیا کہ کل علی الصبح شہر پر ہر طرف سے آخری حملہ ہوگا۔ فوج کو شہر میں تاخت و تاراج کی اجازت دی جائے گی مگر اس شرط پر کہ وہ سرکاری عمارات کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں اور غیر مضافی رعایا جو اطاعت کے ساتھ امن طلب کرے اور ضعیفوں و بچوں وغیرہ کو ہاتھ نہ لگائیں۔ یہ خبر سنتے ہی کہ صبح کو فیصلہ کن حملہ ہوگا، مسلمانوں کے لشکر میں رات بھر خوشی کے نعرے بلند ہوتے رہے۔ ادھر شہر کے اندر قصر شاہی میں قسطنطین نے سپہ سالاران فوج، عمائد سلطنت اور امرائے شہر کو مدعو کر کے ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ صبح فیصلہ کن حملہ ہونے والا ہے۔ اس نے شہر والوں کو آخر تک لڑنے اور مارنے کی ترغیب دی اور خود بھی اسی طرح قسمیں کھا کھا کر اپنے اپنے مورچوں کی طرف پہرہ دینے چلے گئے۔ قیصر اس جلسہ سے فارغ ہو کر سینٹ ایا صوفیہ کے گرجا میں آ کر اپنی آخری عبادت میں مصروف ہوا۔ اس کے بعد اپنے محل میں آیا جہاں یاس و ہراس چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ وہاں چند لمحہ آرام کر کے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور سینٹ رومانس کی طرف آیا، جہاں

محاصرین کے حملہ کا بہت زور تھا۔

ادھر سلطان محمد خان ثانی بھی نماز فجر سے فارغ ہو کر اور مجمع علماء اور نیک لوگوں سے دعا کی فرمائش کر کے اپنی رکاب میں دس ہزار چیدہ چیدہ سوار لے کر حملہ آوری کے کام میں مصروف ہوا۔ سلطان کے قریبی عالم نے جو اس کے ساتھ مجمع علماء میں موجود تھے، اس روز اپنے لیے ایک الگ چھولداری نصب کرائی اور باہر ایک دربان کو بٹھا دیا کہ کسی شخص کو اندر نہ آنے دیا جائے اور خود دعا میں مصروف ہو گئے۔ حملہ ہر طرف سے شروع ہوا، توپوں اور منجنیقوں نے جا بہ جا شہر کی فصیل میں سوراخ کر دیے اور محاصرین نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ ان رخنوں کے ذریعہ سے شہر کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی مگر وہ ہر مرتبہ نہایت سختی کے ساتھ لوٹا دیے گئے۔ کئی مرتبہ عثمانی لشکر کے بہادر شہر کے برجوں اور فصیل کے شکستہ حصوں پر چڑھ جانے میں کامیاب ہوئے مگر اندر سے شہری سپاہی اور ان کی عورتیں اور بچے تک بھی لڑنے اور مدافعت کرنے میں مصروف تھے۔ ہر طرف یہی حالت تھی اور سمندر و خشکی ہر طرف سے جوش و خروش کے ساتھ حملہ جاری تھا۔ ایک عجیب ہنگامہ رست خیز برپا تھا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے تھے مگر محاصر و محصور دونوں میں سے کوئی بھی ہمت نہ ہارتا تھا۔ دوپہر کے قریب ہنگامہ کارزار میں سخت شدت پیدا ہو گئی اور سلطان نے اپنے ایک وزیر یا مصاحب کو اپنے علماء کی خدمت میں روانہ کیا کہ یہ وقت خاص طور پر دعا کا ہے۔ محصورین کی ہمت اور سخت مدافعت کو دیکھ کر حملہ آوروں کے دل چھوٹے جاتے تھے اور سلطان کو اندیشہ تھا کہ اگر آج شہر فتح نہ ہوا تو پھر اس کا فتح ہونا سخت دشوار ہو گا کیونکہ حملہ آور اپنی پوری ہمت اور طاقت صرف کر چکے تھے۔ بادشاہ کا فرستادہ جب اس اللہ والے کی چھولداری کے قریب پہنچا تو دربان مانع ہوا، تو اس نے سختی کے ساتھ دربان کو ڈانٹا اور کہا کہ میں ضرور حاضر خدمت ہو کر سلطانی پیغام پہنچاؤں گا کیونکہ یہ بڑا نازک وقت اور خطرہ کا مقام ہے۔ یہ کہہ کر سلطانی فرستادہ چھولداری میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ بزرگ سربسجود اور دعا میں مصروف ہیں۔ اس کے داخل ہونے پر انہوں نے سر اٹھایا اور کہا کہ شہر قسطنطنیہ فتح ہو چکا۔ اس کو اس بات کا یقین نہ آتا تھا۔ مگر وہاں سے واپس ہو کر دیکھا تو واقعی فصیل شہر پر سلطان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ بات یہ ہوئی کہ جس وقت سلطان نے استمداد دعا کے لیے اپنے وزیر کو روانہ کیا، وہ نہایت نازک وقت تھا۔ ٹھیک اسی وقت فصیل شہر کا وہ حصہ جو سلطان کے سامنے تھا، یکا یک خود بہ خود گر پڑا اور اس کے گرنے سے خندق پر ہو کر شہر میں داخل

ہونے کے لیے میدان صاف ہو گیا۔ ادھر فصیل کا یہ حصہ گرا، ادھر عین اسی وقت بندرگاہ کی طرف سے بحری فوج نے ایک برج پر قبضہ کر کے سلطانی علم بلند کیا۔ اس علم کو بلند اور سامنے کی دیوار کو منہدم دیکھ کر ادھر سے بلا تامل سلطان کی رکابی فوج نے حملہ کر دیا۔ عیسائیوں نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مگر وہ دست بہ دست لڑائی میں مسلمانوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ ساتھ ہی ہر طرف سے حملہ آوروں نے شہر میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ دروازوں کو توڑ توڑ کر اندر گھس گئے اور شہر کے چاروں طرف فصیل کے اندرونی جانب عیسائیوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے۔ سلطان اپنے گھوڑے پر سوار اسی منہدمہ فصیل کے راستے شہر میں داخل ہو کر سیدھا سینٹ آیا۔ صوفیہ کے گرجے کی طرف روانہ ہوا۔ اس گرجے میں پہنچتے ہی اس نے اذان دی اور پہلی مرتبہ اس جگہ اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔ یہاں اس نے اور اس کے ہمراہیوں نے نماز ظہر ادا کی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد قسطنطین کی تلاش میں لوگوں کو بھیجا۔ سینٹ رومانس کے قریب جس طرف فصیل منہدم ہوئی تھی، وہاں عیسائیوں نے حملہ آوروں کا خوب جم کر مقابلہ کیا تھا اور سب سے زیادہ کشت وخون وہیں ہوا تھا۔ اسی جگہ لاشوں کے درمیان قسطنطین کی لاش ملی، جس کے جسم پر صرف دو زخم آئے تھے۔ قسطنطین کا سر کاٹ کر لوگ سلطان کی خدمت میں لے آئے۔ اس طرح فتح قسطنطنیہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ سلطان اس کے بعد قیصر شاہی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہاں اس نے دیکھا تو ہو کا عالم تھا۔ اس خاموشی و ویرانی کو دیکھ کر بے اختیار سلطان کی زبان سے نکلا کہ ؎

پردہ داری می کند برقصر قیصر عنکبوت
بوم نوبت می زَند بر گنبدِ افراسیاب

یہ فتح ۲۰ جمادی الاول سنہ ۸۵۷ھ مطابق ۲۹ مئی سنہ ۱۴۵۳ء کو وقوع پذیر ہوئی۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ فصیل قسطنطنیہ کا گرنا اسی نیک بندے کی دعا کا نتیجہ تھا اور اسی لیے مشہور ہے کہ قسطنطنیہ دعا کے ذریعہ سے فتح ہوئی تھی، واللہ اعلم! اسی تاریخ سے سلطان محمد خان ثانی سلطان محمد فاتح کے لقب سے مشہور ہوا۔ چالیس ہزار عیسائی مسلمانوں کے ہاتھ سے مقتول ہوئے اور ساٹھ ہزار جنگجو عیسائیوں کو مسلمانوں نے گرفتار کیا۔ بہت تھوڑے ایسے تھے جو فتح قسطنطنیہ کے بعد کسی نہ کسی طرح خشکی یا سمندر کے راستے بچ کر نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ اکثر اٹلی میں اور کمتر دوسرے مقامات میں جا کر آباد و پناہ گزین ہوئے۔ قیصر قسطنطین کا ایک پوتا چند روز کے بعد مسلمان

ہو گیا تھا اور قسطنطنیہ میں آ کر رہنے لگا تھا۔ بالآخر بہت جلد اس خاندان کا نام ونشان گم ہو گیا۔

قسطنطنیہ کے باشندوں کو سلطان محمد فاتح نے امن وامان عطا کی۔ جو لوگ اپنے مکانوں اور جائیدادوں پر قابض رہے اور بہ خوشی اطاعت قبول کی، ان کو اور ان کے اموال کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ عیسائیوں کے معبدوں اور گرجوں کو (سوائے ایاصوفیہ کے) علیٰ حالہ قائم اور عیسائیوں کے تصرف میں رکھا۔ قسطنطنیہ کے بشپ اعظم کو سلطان نے اپنی خدمت میں بلا کر خوشخبری سنائی کہ آپ بہ دستور یونانی چرچ کے پیشوا رہیں گے۔ آپ کے مذہبی اختیارات میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ سلطان محمد خان فاتح نے خود یونانی چرچ کی سرپرستی قبول کی اور بشپ اعظم اور پادریوں کو وہ اختیارات حاصل ہوگئے جو عیسائی سلطنت میں بھی ان کو حاصل نہ تھے۔ عیسائیوں کو کامل مذہبی آزادی عطا کی گئی۔ گرجوں کے مصارف اور چرچ کے اخراجات پورا کرنے کے لیے بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں۔ جنگی اسیروں کو جو فتح مند فوج نے گرفتار کیے تھے، سلطان محمد فاتح نے خود اپنے سپاہیوں سے خرید کر آزاد کیا اور ان کو شہر قسطنطنیہ کے ایک خاص محلّہ میں آباد کیا۔ اس فتح کے بعد سلطان محمد فاتح نے دیکھا کہ قسطنطنیہ کے اکثر گھر ویران اور غیر آباد ہو گئے ہیں۔ شہر کی رونق کو واپس لانے اور اس کی آبادی کو بڑھانے کے لیے سلطان محمد فاتح نے ایشیائے کوچک سے پانچ ہزار مسلمان خاندانوں کو قسطنطنیہ میں لا کر آباد کرنے کا انتظام کیا۔ ماہ رمضان سنہ ۸۵۷ھ تک یہ پانچ ہزار مسلم خاندان قسطنطنیہ میں آ کر آباد ہو گئے اور قسطنطنیہ پہلے سے زیادہ بارونق شہر بن گیا۔

شہر قسطنطنیہ کی تاریخ:

قسطنطنیہ کی یہ فتح دنیا کا نہایت ہی اہم اور عظیم الشان واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی فتح قسطنطنیہ پر یورپی مورخین کی اصطلاح میں مڈل ایجیز یعنی زمانہ وسطیٰ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد روشنی کا زمانہ یعنی دور جدید شروع ہوتا ہے۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ کے مختصر تاریخی حالات بیان کر دیے جائیں۔ جس موقع پر قسطنطنیہ آباد ہے، اسی موقع پر سنہ عیسوی سے ۶۶۷ سال پہلے بائی زینتم نامی ایک شہر کسی خانہ بدوش قبیلے نے آباد کیا تھا۔ اس شہر پر بہت سے حادثے گزرے اور وہ اپنے اردگرد کے علاقے کا مرکزی شہر اور ایک مختصر سی ریاست کا دارالصدر بن گیا۔ سکندر یونانی کے باپ فلیقوس نے اس شہر پر حملہ کر کے اس کو اپنے قبضہ میں لانا چاہا۔ اس نے رات کی تاریکی میں اپنی فوجوں کو شہر بائی زینتم تک پہنچانا اور شہر پر اچانک قبضہ کرنا چاہا۔ اسی رات کی تاریکی میں جبکہ فیلقوس

کی فوج شہر کی فصیل تک پہنچ گئی تھی، شمال کی جانب سے ایک روشنی نمودار ہوئی اور اس روشنی میں شہر والوں نے حملہ آور فوج کو دیکھ لیا اور فوراً مقابلہ کی تیاری اور مدافعت پر آمادہ ہو گئے۔ فیلقوس شہر والوں کو مستعد دیکھ کر واپس ہو گیا اور شہر اس طرح بچ گیا۔ شہر والوں نے آئی بلا کے ٹل جانے کو ڈائنا دیبی کا کمال وتصرف تصور کیا اور اس خوشی میں دیبی مذکور کا مندر تعمیر کر کے ہلال کو اپنے شہر کا نشان مقرر کیا۔

اس کے چند روز بعد سکندر نے اس شہر کو فتح کر کے اپنے باپ کی ناکامی کا بدلہ لے لیا۔ سکندر کے بعد بائی زینتم کو مختلف قوموں نے اپنی تاخت وتاراج کا تختہ مشق بنایا۔ اس کے بعد قیصر قسطنطین اول نے اس علاقے کو فتح کیا تو وہ شہر بائی زینتم کے خوش فضا محل وقوع کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے اس شہر اور اس کے متصلہ رقبہ کو شامل کر کے شہر آباد کیا تاکہ اس کو اپنا دارالحکومت بنائے۔ اس جدید شہر کا نام اس نے روما جدید رکھا مگر وہ قسطنطین اپنے بانی کے نام پر قسطنطنیہ مشہور ہوا۔

قسطنطین اول نے قسطنطنیہ کو سنہ ۳۲۷ء میں آباد کیا۔ اس سے پہلے تک قسطنطین اور اس کے باپ دادا بت پرست اور لامذہب تھے لیکن قسطنطین نے خود دین عیسوی قبول کر کے قسطنطنیہ کو اس کی آبادی کے تین سال بعد مریم علیہا السلام کی نذر کیا اور خوب خوشی منائی۔ لہٰذا مئی سنہ ۳۳۰ء سے قسطنطنیہ مخصوص عیسائی شہر سمجھا جانے لگا۔ اس کے بعد سلطنت روما جب دو حصوں میں تقسیم ہوئی تو قسطنطنیہ مشرقی سلطنت کا مستقل دارالسلطنت قرار پایا۔ اس سلطنت یعنی مشرقی روم کو کامل عروج قیصر جسٹین کے عہد حکومت میں حاصل ہوا، جس نے سنہ ۵۲۷ء سے سنہ ۵۶۵ء تک حکومت کی۔ اس قیصر نے قسطنطنیہ کی تعمیر و رونق میں بہت اضافہ کیا۔ اس شہر پر مختلف قوموں نے مختلف اوقات میں چڑھائیاں کیں مگر وہ نقصان و بربادی سے محفوظ رہا۔ مسلمانوں نے اول ہی اول عہد بنوامیہ میں اس پر چڑھائی کی اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اسی معرکہ میں شہید ہو کر فصیل شہر کے نیچے مدفون ہوئے۔ اس مرتبہ یہ شہر فتح ہوتے ہوتے رہ گیا۔ عیسائیوں نے کئی مرتبہ چاہا کہ ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر کو اکھیڑ کر پھینک دیں مگر وہ ہمیشہ مسلمانوں کی ناراضگی کے خوف سے اس ارادہ کو پورا نہ کر سکے۔ سلطان محمد خان فاتح نے فتح قسطنطنیہ کے بعد ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر کے متصل ایک مسجد بنوا دی تھی جو جامع ایوب کے نام سے مشہور ہے۔

خلفاء عباسیہ کے دور حکومت میں کئی مرتبہ قسطنطنیہ کے فتح کرنے کی تیاریاں ہوئیں۔ مگر ہر

مرتبہ کوئی نہ کوئی ایسا مانع ہوا کہ یہ کام ناتمام ہی رہ گیا۔ اس کے بعد سنہ ۶۰۰ھ میں جبکہ صلیبی لڑائیوں کی سرگرمیاں بڑے زور شور سے جاری تھیں، وینس کی ایک فوج نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے لاطینی سلطنت قائم کی جو روما کے پوپ کو مذہبی پیشوا مانتی تھی۔ ساٹھ سال تک یہ حکومت قائم رہی۔ اس کے بعد سنہ ۶۶۰ھ میں یونانیوں یعنی مشرقی رومیوں نے پھر قسطنطنیہ کو فتح کر کے اپنی مشرقی حکومت دوبارہ قائم کر لی جو اسی پرانے خمیری عقیدے پر قائم اور پوپ روما کی اطاعت سے آزاد تھی۔

دو سو برس کے بعد سلطان محمد خان فاتح نے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور ایڈریانوپل کی جگہ قسطنطنیہ عثمانیہ سلطنت کا دارالسلطنت بنا۔ قسطنطنیہ سوا گیارہ سال تک عیسائی حکومت کا دارالسلطنت رہ کر اسلامی حکومت کا دارالسلطنت بنا اور پونے پانچ سو سال سے زیادہ عرصہ تک اسلامی حکومت وخلافت کا دارالسلطنت اور دارالخلافہ رہنے کے بعد ہمارے اس زمانے میں جبکہ خلافت عثمانیہ کا سلسلہ ختم ہونے پر انگورہ [1] ترکوں کی مسلم جمہوری حکومت کا دارالحکومت قرار پایا۔ قسطنطنیہ [2] کی دارالحکومت ہونے کی خصوصیت جاتی رہی، تاہم وہ دنیا کا ایک نہایت عظیم الشان شہر اور مسلمانوں کا مایہ ناز مقام ہے۔

سلطان محمد فاتح کے بقیہ کارنامے:

قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان محمد فاتح نے چند روز تک اپنی توجہ قسطنطنیہ کی آبادی اور رونق بڑھانے میں صرف کی۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بات بھی سوچتا رہا کہ یونان کا جنوبی حصہ جو ایک جزیرہ نما کی صورت میں بحر روم میں چلا گیا ہے، تمام وکمال سلطنت عثمانیہ میں شامل ہونا چاہیے تاکہ آئندہ کے لیے بہت سے خرخشے جو اٹلی وغیرہ کی بحری ترک وتاز سے پیدا ہو سکتے ہیں، مٹ جائیں۔ لہٰذا فتح قسطنطنیہ سے اگلے سال سلطان محمد فاتح نے جنوبی یونان کی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کو فتح کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا۔ اسی جنوبی یونان میں ایک چھوٹی سی ریاست قیصر قسطنطین کی اولاد نے قسطنطنیہ سے فرار ہو کر قائم کی تھی۔ اس فتح کے بعد قیصر قسطنطین کے بعض ارکان خاندان نے جو یہاں موجود تھے، اسلام قبول کر لیا تھا۔ اوپر یہ بات بیان ہونے سے رہ گئی تھی کہ جب مسلمانوں کی فوج نے قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تھا اور تمام ملاح فتح کی خوشی میں اپنی کشتیوں کو چھوڑ چھوڑ

---

1. اسے اردو میں زیادہ تر انقرہ لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔
2. استنبول جو ترکی کا سب سے بڑا اور بین الاقوامی شہر ہے، اس کا پرانا نام قسطنطنیہ ہے۔

کر شہر میں داخل ہوئے تو شہر کے عیسائیوں نے جو باہر نکل سکے، بندرگاہ میں پہنچ کر ان عثمانی کشتیوں کو جو بندرگاہ میں کھڑی تھیں، اپنے فرار کا ذریعہ بنایا اور انہیں عثمانی کشتیوں میں سوار ہو ہو کر درہ دانیال کے راستے جنوبی یونان اور اٹلی کی جانب بھاگ گئے۔ جنوبی یونان کی فتح سے فارغ ہو کر سلطان نے ریاست وینس کی طرف توجہ کی۔ مگر اس ریاست نے دب کر سلطان سے صلح کا عہد نامہ کر لیا۔ سنہ ۶۰۱ھ میں قسطنطنیہ کے شاہی خاندان کا ایک شخص مسمی کوم نینی جو صلیبی حملہ آوروں کے مذکورہ ہنگامہ میں قسطنطنیہ سے نکال دیا گیا تھا، اس نے بحر اسود کے جنوبی ساحل پر مقام ابزون میں مقیم ہو کر اپنی جداگانہ چھوٹی سی عیسائی ریاست قائم کر لی تھی۔ اس ساحلی ریاست کی طرف کسی نے زیادہ التفات نہیں کیا اور اڑھائی سو سال تک وہ اس طرح قائم رہی کہ جب کسی مسلمان فرماں روا نے اس کی طرف توجہ کی، اس نے فوراً انقیاد و فرماں برداری کی گردن جھکا دی اور جب مسلمانوں کو خانہ جنگی میں مصروف ہونے کا اتفاق ہوا، وہ باج و خراج کی قید سے آزاد ہو گئی۔ ایشیائے کوچک پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن طرابزون کو انہوں نے اس کے حال پر قائم رہنے دیا تھا جو ان کے مقبوضہ علاقے کی شمالی و مشرقی سرحد تھی۔ اب فتح قسطنطنیہ کا واقعہ ایسا نہیں تھا کہ اس کا اثر طرابزون کے عیسائی فرماں روا کے دل پر نہ ہوا ہو، جو قیصر قسطنطین کا رشتہ دار اور اس سے کامل ہمدردی رکھتا تھا۔ طرابزون کا یہ عیسائی فرماں روا اس لیے اور بھی زیادہ مخدوش ہو گیا تھا کہ وہ ایران کے ترکمان بادشاہ حسن طویل کا خسر تھا۔ حسن طویل نے تمام ملک ایران اور ارمینیا پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ ایک طاقتور بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا ایران کی ترکمان سلطنت ایشیاء کوچک کی عثمانیہ سلطنت کے لیے کسی وقت موجب خطر بن سکتی تھی اور طرابزون کی عیسائی ریاست کو کافی موقع میسر تھا کہ وہ عثمانی سلطنت کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی تدابیر سوچے۔ سلطان محمد فاتح عیسائی قیصر کی ریشہ دوانیوں سے واقف تھا، اس لیے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اس ناسور کو پہلے ہی شگاف دے دیا جائے اور جو کچھ ہونا ہو، وہ ابھی ہو جائے۔ چنانچہ اس نے یونان و وینس سے فارغ ہو کر سنہ ۸۶۰ھ میں طرابزون پر حملہ کیا اور اس ریاست کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ طرابزون کی ریاست اگرچہ خود مختار تھی لیکن وہ سلطنت ایران کا ایک حصہ سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے ایران کے بادشاہ حسن طویل کو طرابزون کا سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو جانا سخت ناگوار گزرا۔ مگر چونکہ سلطان محمد فاتح نے طرابزون کی عیسائی ریاست کو اپنی حکومت میں شامل کر کے حسن طویل شاہ ایران کی حدود میں کوئی مداخلت نہیں کی، اس

لیے اس وقت سلطنت ایران سے کوئی جھگڑا نہ ہوا مگر بعد میں دلوں کی کدورت کا اظہار تیر و شمشیر کے ذریعہ سے ہوا۔

بہر حال یونان اور ایشیائے کوچک کی طرف سے فارغ ہو کر سلطان محمد فاتح سنہ ۸۶۰ھ میں قسطنطنیہ واپس آیا اور یہاں آتے ہی سرویا اور اس کے بعد بوسنیا کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ علاقے پہلے بھی حکومت عثمانیہ میں شامل ہو گئے تھے لیکن آج کل ان کے باج گزار فرماں رواؤں سے علامات سرکشی ظاہر ہونے لگی تھیں۔ لہٰذا سلطان محمد فاتح نے ان روز روز کے جھگڑوں کا فیصلہ کر دینا مناسب خیال کیا۔ چنانچہ سرویا اور بوسنیا کو فتح کر کے سلطنت عثمانیہ کے صوبے قرار دے کر وہاں اپنی طرف سے عامل مقرر کر دیے۔ چونکہ ہنی داس بادشاہ ہنگری کے ساتھ معاہدہ صلح کی میعاد ختم ہو چکی تھی اور وہ سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف اور یورپ کی دوسری عیسائی طاقتوں سے امداد طلب کر چکا تھا۔ اس لیے سلطان محمد فاتح نے ضروری سمجھا کہ ہنگری پر خود ہی حملہ آور ہو۔ چنانچہ سنہ ۸۶۱ھ مطابق جولائی سنہ ۱۴۵۶ء میں عثمانی فوجیں ہنگری کی جانب بڑھیں۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد تمام عیسائی سلاطین اور عالم عیسائیت سلطنت عثمانیہ کی نسبت غیظ و غضب کے جذبات سے لبریز تھا۔ ساتھ ہی سب کو خیال تھا کہ اگر سلطان محمد فاتح نے بلگریڈ دارالسلطنت ہنگری کو بھی قسطنطنیہ کی طرح فتح کر لیا تو پھر مغربی یورپ کی خیر نہیں۔ لہٰذا ہر ایک ملک سے عیسائی فوجیں بلگریڈ کو بچانے کے لیے آ آ کر جمع ہو گئیں۔ سلطان محمد فاتح راستے کے شہروں اور قصبوں کو فتح کرتا ہوا بلگریڈ تک اپنی فوج کو لے گیا اور جاتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ادھر ہنی داس یا ہنی ڈیز بھی بہت تجربہ کار سپہ سالار تھا۔ اس نے بڑی قابلیت کے ساتھ مدافعت شروع کی۔ آخر بہت کشت و خون اور جنگ و جدل کے بعد عثمانی لشکر شہر کے ایک حصہ میں داخل ہو گیا۔ یہ حصہ شہر کا زیریں حصہ کہلاتا تھا۔ عیسائی سپہ سالاروں نے یہ حالت دیکھ کر ہمت نہیں ہاری بلکہ شہر کے بالائی حصہ میں اپنی طاقت کو مجتمع کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔ شہر میں داخل ہونے والے اسلامی دستہ نے شہر کے اندر خوب جم کر مقابلہ کیا اور چھ گھنٹہ کی مسلسل شمشیر زنی کے بعد اپنے آپ کو رات کے وقت شہر کے اندر خطرہ میں دیکھ کر شام ہونے پر پسپا ہوئے اور شہر سے نکل کر اپنے کیمپ میں آ گئے۔ عیسائیوں نے فوراً اس حصہ شہر پر قابض ہو کر خوب مضبوطی کر لی۔ یہ واقعہ ۲۱ جولائی کو ظہور پذیر ہوا۔ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ مسلمانوں نے فصیل شہر کو عبور کر کے شہر کے محلوں کو لوٹا لیکن محصورین کی خوش انتظامی اور تجربہ کاری نے شہر کو مکمل طور پر فتح نہ

ہونے دیا اور ہر مرتبہ مقبوضہ شہر کو چھوڑ ہی دینا پڑا۔ آخر ۱۶ اگست کو سلطان محمد فاتح نے بہ ذات خود شہر پر ایک فیصلہ کن حملہ کیا۔ اس روز شہر کے فتح ہونے میں کوئی کسر باقی نہ تھی کہ ایک موقع پر جہاں سلطان خود مصروف شمشیر زنی تھا اور بہت سے عیسائی سرداروں کے سر اپنی شمشیر خارا شگاف سے اڑا چکا تھا اور ہنگری کے بادشاہ ہنی ڈیز کو بھی زخمی کر کے اپنے سامنے سے بھگا چکا تھا، ایک عیسائی کے ہاتھ سے زخمی ہوا۔ عیسائی کی تلوار نے سلطان محمد فاتح کی ران کو زخمی کیا۔ زخم چونکہ شدید تھا اور سلطان گھوڑے کی سواری یا پیدل چلنے سے معذور ہو گیا، اس کو پالکی میں ڈال کر اس جگہ سے واپس لے آئے۔ سلطان کے اس طرح زخمی ہو کر اور پالکی میں پڑ کر خیمے کی طرف واپس ہونے سے فوج میں بددلی پھیل گئی اور اس کا زخمی ہونا فوج سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ لہٰذا عثمانی لشکر جو قدم قدم پر عیسائیوں سے لڑتا اور ان کو پیچھے ہٹاتا ہوا شہر کے اندر بڑھ رہا تھا، اب خود پسپا ہونے لگا۔ یہ رنگ دیکھ کر عیسائیوں کی ہمت بڑھ گئی اور انہوں نے پورے جوش وخروش کے ساتھ حملے شروع کر دیے۔ ان کا بادشاہ ہنی داس بھی اگرچہ سلطان کے ہاتھ سے زخمی ہو کر پہلے فرار ہو چکا تھا لیکن اس کے زخمی ہونے کا علم تمام عیسائی لشکر کو نہیں ہوا تھا۔ نیز یہ کہ ہنی داس کے سوا اور بھی کئی زبردست سپہ سالار جو غیر ملکی فوجوں کے افسر تھے، لڑائی کی ذمہ داری اپنے اوپر محسوس کرتے تھے۔ ادھر سلطان محمد فاتح خود ہی تمام لشکر کا سپہ سالار اعظم تھا۔ اس کا زخمی ہونا لشکر پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس مرتبہ عیسائیوں کا حملہ اس قدر سخت تھا کہ مسلمان شہر سے نکل کر بھی اپنے کیمپ میں قائم نہ رہ سکے اور زخمی سلطان کو لے کر قسطنطنیہ کی جانب چل دیے۔ اس طرح مسلمانوں کی فتح مبدل بہ شکست ہو گئی اور شہر بلگریڈ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ لشکر عثمانیہ کی اس پسپائی یا شکست کا یورپ پر بہت اثر پڑا اور تمام عیسائی ممالک میں خوشی کے جشن منائے گئے۔ لیکن اس واقعہ کے اکیس روز بعد ہنی داس اپنے زخموں سے جاں بر نہ ہو سکا۔ ادھر ہنی داس شاہ ہنگری فوت ہوا، ادھر سلطان محمد فاتح نے اپنے زخم کے اچھا ہونے پر غسل صحت کیا۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ سکندر بیگ البانیہ پر قابض تھا اور سلطان محمد فاتح نے تخت نشین ہو کر ان تعلقات و مراسم کی وجہ سے جو ایوان سلطانی میں پرورش پانے کے سبب سے سکندر بیگ کے ساتھ تھے، سکندر بیگ کی حکومت کو البانیہ پر باقاعدہ تسلیم کر لیا تھا اور کسی قسم کا آزار پہنچانے یا اس کو البانیہ سے بے دخل کرنے کا خیال سلطان محمد فاتح کو نہ تھا مگر حادثہ بلگریڈ کے بعد جہاں دوسرے عیسائی

سلاطین کی ہمتیں بڑھ گئیں، سکندر بیگ نے بھی سرکشی و بغاوت کے نشانات ظاہر کرنے شروع کیے۔ سلطان محمد فاتح نے اول اول اغماض وچشم پوشی سے کام لیا لیکن جب اس کی حرکات نے خطرناک صورت اختیار کی تو سلطان محمد فاتح نے البانیہ پر فوج کشی کی۔ سکندر بیگ بہت بہادر اور تجربہ کار شخص تھا۔ البانیہ چونکہ پہاڑی ملک اور سکندر بیگ کا وطن تھا، وہاں کی رعایا اس پر جان و دل سے نثار تھی، لہٰذا ایک سلسلہ جنگ شروع ہو گیا اور البانیہ کا ملک جلد فتح نہ ہو سکا۔

آخر سنہ ۸۶۶ھ میں سکندر بیگ نے خود صلح کی درخواست پیش کی اور آئندہ باوفا رہنے کا اقرار کیا۔ سلطان نے اس کی درخواست منظور کر لی اور البانیہ سے اپنی فوجیں ہٹا لیں لیکن سکندر بیگ نے پھر مخالفت کا اظہار کیا اور سلطان کو دوبارہ خود فوج لے کر البانیہ جانا پڑا۔ اس مرتبہ سکندر بیگ سلطانی حملہ کی ٹکر نہ سنبھال سکا اور اس کو البانیہ سے حدود ریاست وینس کی طرف پناہ گزین ہونا پڑا، جہاں اس کو بڑی آؤ بھگت کے ساتھ لیا گیا۔ وہیں سکندر بیگ کا انتقال ہوا اور البانیہ مستقل طور پر سلطانی قبضہ میں آ گیا۔ بلگریڈ کے حملہ کی ناکامی اور سکندر بیگ کے عرصہ دراز تک برسر مقابلہ رہنے کے سبب سے عیسائیوں کے دلوں سے سلطان محمد فاتح کی وہ ہیبت جو فتح قسطنطنیہ کے بعد پیدا ہو گئی تھی، کم ہونے لگی اور ان کی ہمتیں پھر سلطانی مقابلہ کے لیے بڑھ گئیں۔ وینس کی ریاست جس نے چند روز پہلے دب کر صلح کی تھی، پھر طاقت کے اظہار پر آمادہ ہونے لگی۔ سلطان نے اس کی سرکوبی بھی ضروری سمجھی اور سمندر کے کنارے دور تک وینس کے علاقے کو فتح کر کے بہت سے شہروں کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ یہاں تک کہ ریاست وینس نے شہر سقوطری خود سلطان کی نذر کر کے نہایت ذلیل شرطوں پر سلطان سے صلح کی اور بحیرہ ایڈریاٹک میں سلطانی سیادت قائم ہو گئی۔

سنہ ۸۷۸ھ میں سلطان محمد فاتح نے اپنے سپہ سالار احمد قیدوق کو اپنا وزیراعظم بنایا اور بحیرہ یونان کے جزیروں پر قبضہ کرنے میں مصروف رہا۔ اس فرصت میں ایران کا بادشاہ حسن اوزون یا حسن طویل ترکمان بھی اپنی طاقت کو بڑھا رہا تھا اور سنہ ۸۷۳ھ میں سلطان ابوسعید مرزا تیموری کو گرفتار کر کے قتل کر چکا تھا۔ اب اس کا ارادہ تھا کہ ایشیائے کوچک میں سلطان محمد فاتح کے خلاف مشکلات پیدا کرے اور فتح طرابزون کا بدلہ سلطنت عثمانیہ سے لے۔ چنانچہ اس کی پشت گری سے ایشیائے کوچک میں کئی مرتبہ بغاوتیں برپا ہوئیں اور ہر مرتبہ سلطان محمد فاتح کے سپہ سالاروں نے ان کو فرو کر دیا۔ سلطان محمد فاتح ایران کی مسلمان سلطنت سے لڑنا نہیں چاہتا تھا، اس کی تمام تر توجہ اس

طرف منعطف تھی کہ سلطان بایزید یلدرم کی اس خواہش کو پورا کرے جو اس نے اٹلی کے شہر روما کو فتح کرنے کی نسبت ظاہر کی تھی۔ اسی لیے اس نے نہایت پائیدار اور مستحکم طریقہ سے اپنی حدود سلطنت کو اٹلی کی طرف بڑھایا اور دوسری سمتوں سے بھی غافل نہیں رہا۔ اس نے حادثہ بلگریڈ کے بعد دریائے ڈینوب کے شمالی صوبوں پر بلگریڈ تک اپنا قبضہ وتسلط مضبوطی سے جما لیا اور بلگریڈ کی فتح کو کسی دوسرے وقت پر ملتوی کر کے جزائر یونان اور وینس وغیرہ کے علاقوں کو فتح کیا۔ ایشیائے کوچک اور ایران کی طرف سلطان محمد فاتح کی توجہ منعطف ہونے والی نہ تھی، مگر قدرتی طور پر ایک سامان پیدا ہوا اور سنہ ۸۷۹ھ میں سلطان نے اپنے وزیراعظم احمد قیدوق کو فتح کریمیا کے لیے بحر اسود کی جانب روانہ کیا۔ جزیرہ نما کریمیا عرصہ دراز سے چنگیزی نسل کے خوانین کی حکومت میں تھا۔ کچھ دنوں سے جنیوا والوں نے کریمیا کے جنوبی ساحل پر بندرگاہ یافہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور اپنے جنگی جہازوں کی مدد سے یافہ پر اپنا مستقل قبضہ جما کر خان کریمیا کے لیے باعث تکلیف ہو گئے۔ خان کریمیا نے مجبور ہو کر سلطان محمد فاتح کو امداد کے لیے لکھا کہ جنیوا والوں کو یافہ سے بے دخل کر دیجیے اور مجھ کو اپنی سرپرستی میں لے لیجیے۔ سلطان نے خان کریمیا کی اس درخواست پر ہمدردانہ توجہ مبذول کی اور احمد قیدوق کو زبردست جنگی بیڑہ کے ساتھ اس طرف روانہ کیا۔ احمد قیدوق اپنے ساتھ چالیس ہزار فوج لے گیا اور چار دن کے محاصرہ کے بعد یافہ کو فتح کر کے چالیس ہزار جنیوا والوں کو جو وہاں موجود تھے، گرفتار کر لیا۔ یافہ سے بے شمار مال غنیمت اور جنیوا والوں کے جنگی جہاز احمد قیدوق کے ہاتھ آئے۔ خان کریمیا نے سلطان عثمانی کی اطاعت قبول کی اور اسی تاریخ سے تین سو سال تک خوانین کریمیا، سلطان قسطنطنیہ کے باوفا اور فرماں بردار رہے۔ یافہ کی بندرگاہ دوسرا قسطنطنیہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کا قبضہ میں آ جانا سلطنت عثمانیہ کے مشرقی صوبوں اور بحر اسود میں اپنی سیادت قائم رکھنے کے لیے نہایت مفید اور ضروری تھا۔ اس موقع پر شاید یہ بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ اسی سال یعنی سنہ ۸۷۹ھ میں روس کے اندر زار کا وہ خاندان برسر حکومت ہوا، جس نے ہمارے زمانہ کی مشہور جنگ عظیم تک روس میں زور شور کے ساتھ حکومت کی اور آخری زار دوران جنگ میں معزول ہو کر مقتول ہوا اور اس کے بعد روس میں سوویت حکومت یعنی جمہوری سلطنت قائم ہوئی۔ کریمیا اور یافہ کا حکومت عثمانیہ میں شامل ہو جانا ایران کے بادشاہ حسن طویل کو بہت ہی ناگوار گزرا اور اب اس نے علانیہ سلطنت عثمانیہ کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔

سنہ۸۸۰ء میں سلطان محمد فاتح نے اپنے بیٹے بایزید کو ایشیائے کوچک کی فوجوں کا سپہ سالار بنا کر بھیج دیا کہ اس طرف کے معاملات کا نگران رہے اور خود یورپی علاقے کی طرف مصروف رہا۔ البانیہ اور بوسنیا ہر بز یگونیا پر سلطان کا قبضہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب سلطان نے جنیوا اور وینس کے قبضے سے بحر روم کے جزیروں کو یکے بعد دیگرے فتح کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد سنہ۸۸۲ھ میں سلطان محمد فاتح کا سپہ سالار عمر پاشا اپنی فتح مند فوج لیے ہوئے وینس کے دارالسلطنت تک پہنچ گیا اور وہاں کی پارلیمنٹ نے ترکی کی فوجوں کو اپنے شہر کی دیواروں کے نیچے دیکھ کر نہایت الحاح و عاجزی کے ساتھ صلح کی درخواست پیش کی اور وعدہ کیا کہ سلطان کو جب ضرورت ہو گی تو ہم سو جہازوں کے بیڑے سے سلطانی فوج کی مدد کریں گے۔ چنانچہ عمر پاشا اپنے حسب منشا شرائط پر صلح کر کے سالماً غانماً وینس سے واپس آیا۔

سنہ۷۱۱ھ سے جزیرہ روڈس میں صلیبی افواج کے ایک گروہ نے قبضہ کر کے ایک خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ قریباً ڈیڑھ سو سال سے یہ لوگ اس جزیرہ پر قابض و متصرف اور ارد گرد کے جزیروں اور شام و ایشیائے کوچک کے بندرگاہوں پر بحری ڈاکے ڈالتے رہا کرتے تھے۔ وینس و جنیوا والوں نے بھی ان کو کبھی نہیں چھیڑا تھا بلکہ ان کو صلیبی افواج کی یادگار سمجھ کر ان سے اتحاد رکھنے، ان کی ڈاکہ زینوں کو جو عموماً مسلمانوں کے لیے باعث تکلیف ہوتی تھیں، بہ نظر استحسان دیکھتے تھے۔ اب جبکہ ساحل شام سے لے کر بحیرہ ایڈریاٹک تک سلطان کی حکومت و سیادت قائم ہو چکی تھی اور قریباً تمام جزیرے سلطان کے قبضے میں آ چکے تھے تو روڈس کی عیسائی حکومت کا وجود سخت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ چنانچہ سنہ۸۸۵ھ میں سلطان نے اس جزیرہ کو فتح کرنے کے لیے ایک بحری جنگی مہم روانہ کی مگر یہ مہم ناکام واپس آئی۔ اس کے بعد سلطان محمد فاتح نے دوسری مہم روانہ کی جس کا سپہ سالار ایک تجربہ کار شخص تھا۔ جزیرہ کے تمام مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد اس کے دارالسلطنت کا محاصرہ کیا گیا۔ شہر فتح ہو چکا تھا مگر عین اس وقت جبکہ سلطانی فوج شہر میں داخل ہو کر لوٹ مار میں مصروف ہونا چاہتی تھی، سپہ سالار نے حکم جاری کیا کہ کوئی شخص رتی برابر چیز پر تصرف کرنے کا حق دار نہیں۔ اس سے فوج میں بد دلی پیدا ہوئی اور لوگوں نے خدمات کو انجام دینے میں پہلو تہی اختیار کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج اور اس کے سپہ سالار کی ناچاقی نے وہ صورت اختیار کی کہ جزیرہ کو چھوڑ کر واپس آنا پڑا اور روڈس سلطانی مقبوضات میں شامل ہوتے ہوتے بچ گیا۔

جب روڈس کی جانب مہم روانہ کی گئی تھی تو اس کے ساتھ ہی سلطان نے اپنے وزیراعظم احمد قیدوق فاتح کریمیا کو ایک فوج دے کر جہازوں کے ذریعہ سے اٹلی کے جنوب کی جانب روانہ کیا کہ وہ ملک اٹلی میں داخل ہو کر وہاں فتوحات شروع کرے۔ چنانچہ احمد قیدوق نے ساحل اٹلی پر اتر کر متعدد مقامات کو فتح کر کے اٹلی کے شہر آرٹینٹو کا محاصرہ کر لیا جو اٹلی کا باب الفتح کہلاتا تھا یعنی اس شہر کے فتح ہونے کے بعد ملک اٹلی اور شہر روما کو فتح کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ آخر سنہ ۸۸۵ھ مطابق ۱۱ اگست سنہ ۱۴۸۰ء احمد قیدوق نے اس شہر کو بہ زور شمشیر فتح کر لیا اور بیس ہزار کے قریب محصورین کو گرفتار و قتل کیا۔ اس مستحکم مقام کے قبضے میں آ جانے کے بعد شہر روما کو فتح کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ تمام ملک اٹلی میں گھبراہٹ اور سراسیمگی طاری ہو گئی۔ یہاں تک کہ روما کا پوپ اپنا بوریا بستر باندھ کر ملک اٹلی سے بھاگ جانے پر آمادہ ہو گیا۔ شہر آرٹینٹو یا ٹرانٹو کی فتح اور روڈس کی مہم کے ناکام ہونے کا حال سلطان محمد فاتح کو معلوم ہوا تو اس نے فوراً فوجوں کے فراہم کرنے اور سامان جنگ کی تیاری کا اہتمام کیا۔ بہ ظاہر سلطان بایزید یلدرم کی اس خواہش کے پورا ہونے میں کوئی امر اب مانع نہ رہا تھا کہ عثمانی سلطان محمد فاتحانہ شہر روما میں داخل ہو کر اپنے گھوڑے کو روما کے بڑے گرجا میں دانہ کھلائے۔ اس مرتبہ سلطان محمد فاتح نے بڑی سرگرمی کے ساتھ فوجی تیاری کی اور آبنائے باسفورس پر سمندر کے کنارے فوجی علم نصب کرا دیے، جو اس بات کی علامت تھی کہ سلطان اپنی جرار فوج کے ساتھ بہت جلد روانہ ہونے والا ہے۔

اس وقت سلطان کے سامنے تین مہمیں موجود تھیں۔ ایک ایران کے بادشاہ حسن طویل کو سزا دینا کیونکہ اس نے شہزادہ بایزید کے مقابلہ میں چھیڑ چھاڑ اور لڑائی شروع کر دی تھی۔ دوسرے جزیرہ روڈس کو فتح کرنا۔ تیسرے ملک اٹلی کو تمام و کمال فتح کر کے شہر روم میں فاتحانہ داخل ہونا۔ سلطان نے کسی دوسرے شخص کو یہ نہیں بتایا کہ وہ اول کس طرف متوجہ ہوگا؟ سلطان محمد فاتح کی یہ عادت تھی کہ وہ جب کسی مہم پر خود روانہ ہوتا تو فوج کے کسی افسر حتیٰ کہ اس کے وزیراعظم تک کو بھی یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ اس کا ارادہ کس طرف کا ہے؟ ایک مرتبہ کسی سپہ سالار نے سلطان سے پوچھا تھا کہ آپ کا ارادہ کس طرف کا ہے؟ اور آپ کا مقصد کیا ہے؟ تو سلطان نے اس کو جواب دیا تھا کہ اگر مجھ کو یہ معلوم ہو جائے کہ میری داڑھی کے ایک بال کو میرے ارادے کی اطلاع ہو گئی ہے تو میں اپنی داڑھی

کے اس بال کو نوچ کر فوراً آگ میں ڈال دوں۔[1] اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سلطان کو جنگی معاملات میں کس قدر احتیاط ملحوظ تھی۔ بہرحال قسطنطنیہ میں ہر طرف سے فوجیں آ آ کر جمع ہو رہی تھیں اور سلطان محمد فاتح سامان جنگ اور ضروریات لشکر کی فراہمی میں مصروف تھا۔ یہ تیاری بہت ہی عظیم الشان اور غیر معمولی تھی، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بہت جلد براعظم یورپ اور براعظم ایشیا میں عظیم الشان فتوحات سلطنت عثمانیہ کو حاصل ہونے والی ہیں۔ ان تیاریوں میں سنہ ۸۸۶ھ شروع ہوگیا اور لشکر کے کوچ کرنے کا وقت قریب آ گیا۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ سے کوچ کیا۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اول شاہ ایران کو سزا دے کر بہت جلد وہاں سے واپس ہوکر روڈس کو فتح کرے گا اور روڈس سے فارغ ہوکر ملک اٹلی میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ داخل ہوگا، جہاں شہر ٹرانٹو پر اس کا بہادر سپہ سالار احمد قیدوق قابض و متصرف اور اپنے سلطان کی تشریف آوری کا منتظر تھا اور پوپ سکٹس چہارم روما میں منتظر تھا کہ سلطان کے حدود اٹلی میں داخل ہونے کی خبر سنتے ہی وہ روما سے فرار ہو جائے۔ مگر قضا و قدر کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔

سلطان محمد خان ثانی کی وفات:

اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ یورپی ممالک سے عیسائیوں کا نام و نشان گم ہو۔ لہٰذا قسطنطنیہ سے روانہ ہوتے ہی سلطان پر درد نقرس کا حملہ ہوا اور اسی مرض میں بہ روز پنج شنبہ کے دن بہ تاریخ ۳ ربیع الاول سنہ ۸۸۶ھ مطابق ۳ مئی سنہ ۱۴۸۱ء سلطان محمد فاتح نے وفات پائی اور یہ عظیم الشان فوج کشی ملتوی رہ گئی۔ سلطان کی لاش کو قسطنطنیہ میں لا کر دفن کیا گیا۔ یوم یوم الخمیس مادہ تاریخ وفات ہے۔ ۵۲ یا ۵۳ سال کی عمر پائی اور قریباً ۳۱ سال حکمرانی کی۔ سلطان محمد فاتح کی وفات سلطنت عثمانیہ کے لیے بے حد مضر ثابت ہوئی۔ سلطان محمد فاتح جس سال ایڈریانوپل میں اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا، اسی سال ہندوستان میں بہلول لودھی تخت نشین ہوا تھا۔ بہلول لودھی اور سلطان محمد فاتح دونوں ہم عصر تھے۔ بہلول لودھی نے سلطان محمد فاتح کی وفات کے بعد بھی چند سال تک ہندوستان میں حکومت کی۔ کشمیر کا مشہور علم دوست اور روشن خیال بادشاہ زین العابدین بھی

---

[1] اسلام میں داڑھی کا ایک خاص مقام ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو داڑھی رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے اگر یہ واقعہ درست ہے تو سلطان محمد خاں ثانی کی یہ بات داڑھی کے بارے میں ایک گستاخانہ کلمہ اور داڑھی کی تحقیر ہے۔

سلطان محمد فاتح کا ہم عصر تھا مگر وہ کئی سال پہلے فوت ہو چکا تھا۔ اسی سال یعنی ۵ صفر سنہ ۸۸۶ھ کو ملک دکن میں ملک التجار خواجہ جہاں محمود گاوان وزیر سلطان محمد شاہ بہمنی مقتول ہوا۔ سلطان محمد فاتح کی وفات سے پورے گیارہ سال بعد یعنی یکم ربیع الاول سنہ ۸۹۷ھ کو اندلس میں اسلامی حکومت کا چراغ گل ہوا اور غرناطہ پر عیسائیوں نے قبضہ پایا، یا یوں سمجھنا چاہیے کہ جب سلطان محمد فاتح کا انتقال ہوا تو اندلس میں اسلامی حکومت دم توڑ رہی تھی۔ کاش سلطان محمد فاتح اور چند سال زندہ رہتا اور اٹلی کا ملک فتح ہو کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو جاتا تو پھر یقیناً عیسائیوں کو یہ موقع نہیں مل سکتا تھا کہ وہ غرناطہ کی اسلامی سلطنت کا نام ونشان مٹا سکتے بلکہ غرناطہ کی اسلامی سلطنت جو دم بہ دم کمزور ہوتی چلی جاتی تھی، عثمانیہ سلطنت سے امداد پا کر یکایک تمام جزیرہ نمائے اسپین پر چھا جاتی اور پھر تمام براعظم یورپ اسلامی جھنڈے کے سایہ میں ہوتا۔ غرض کہ سلطان محمد فاتح کی وفات عالم اسلام کے لیے مصیبت عظمیٰ تھی، انا للہ وانا الیہ راجعون!

سلطان محمد خان ثانی کے عہد حکومت پر تبصرہ:

سلطان محمد خان ثانی فاتح قسطنطنیہ کا عہد حکومت مسلسل جنگ و پیکار کے ہنگاموں سے پر ہے۔ اس نے اپنے عہد سلطنت میں بارہ ریاستیں اور دو سو سے زیادہ شہر و قلعے فتح کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیے۔ سلطان محمد فاتح کے عہد سلطنت میں آٹھ لاکھ مسلمان سپاہی شہید ہوئے مگر اس کی باقاعدہ فوج کی تعداد سوا لاکھ سے زیادہ کبھی نہیں ہوئی۔ اس نے ینگ چری یعنی فوج جاں نثار کی ترتیب و تنظیم کی طرف بھی خصوصی توجہ مبذول کی، جو سلطان کی باڈی گارڈ کی فوج کہلاتی تھی اور اس کی تعداد عموماً بارہ ہزار کے قریب ہوتی تھی۔ اس نے ایسے قوانین جاری کیے جس سے ہر قسم کی بدنظمی فوجی اور انتظامی محکموں سے دور ہو گئی۔ سلطان محمد فاتح نے جو قوانین جاری کیے، ان سے سلطنت عثمانیہ کو بہت نفع پہنچا۔ ایک ایسے سلطان سے جس کا تمام عہد حکومت لڑائیوں اور چڑھائیوں میں گزرا ہو، ہرگز یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک اعلیٰ درجہ کا مقنن بھی ہوگا۔ مگر اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سلطان محمد خان فاتح ایک اعلیٰ درجہ کا منتظم تھا۔ اس نے اپنے دربار میں وزراء، سپہ سالار، پیش کار وغیرہ اراکین سلطنت کے ساتھ علماء دین کی ایک جماعت کو لازمی قرار دے کر ان کا مرتبہ اراکین سلطنت میں سب سے بالا قرار دیا۔

تمام ممالک محروسہ میں شہروں، قصبوں اور گاؤں کے اندر مدرسے جاری کیے۔ ان مدارس کے تمام مصارف سلطنت کے خزانے سے پورے کیے جاتے تھے۔ ان مدرسوں کا نصاب تعلیم بھی خود سلطان محمد فاتح ہی نے مقرر و تجویز کیا۔ ہر مدرسہ میں باقاعدہ امتحان ہوتے تھے اور کامیاب طلباء کو سندیں دی جاتی تھیں۔ ان سندوں کے ذریعہ سے ہر شخص کی قابلیت کا اندازہ کیا جاتا تھا اور اس کی قابلیت کے موافق ہی اس کو نوکری یا جاگیرداری دی جاتی تھی۔ نصاب تعلیم میں تمام ضروری اور دین و دنیا کے لیے مفید و نفع رساں علوم شامل تھے۔ سلطان محمد خان خود ایک زبردست اور جید عالم تھا۔ قرآن و حدیث اور تاریخ و سیر نیز ریاضی وطبیعات میں اس کو کامل دست گاہ حاصل تھی۔ اسی لیے اس نے بہترین نصاب تعلیم مدارس میں جاری کیا۔ عربی، فارسی، ترکی، لاطینی، یونانی، بلگیرین وغیرہ بہت سی زبانوں میں سلطان محمد فاتح بلا تکلف نہایت فصاحت کے ساتھ گفتگو کر سکتا تھا۔

اس نے اپنی قلمرو کے اندر جو قانون جاری کیا تھا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ سب سے پہلے قرآن مجید کے موافق عمل درآمد ہو، اس کے بعد سنت ثابتہ اور احادیث صحیحہ کی پیروی کی جائے۔ اس کے بعد فقہائے اربعہ سے امداد لی جائے۔ ان تینوں مرحلوں کے بعد چوتھا مرتبہ احکام سلطانی کا تھا۔ سلطان اگر کوئی حکم جاری کرتا اور وہ حکم قرآن وحدیث کے خلاف ہوتا تو علماء کو اجازت تھی کہ وہ بلا تامل اس حکم کا خلاف شرع ہونا ثابت کر دیں تاکہ سلطان فوراً اپنے حکم کو واپس لے لے۔

اس نے اپنے ممالک مقبوضہ کو صوبوں، کمشنریوں اور ضلعوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ضلع کے کلکٹر کو بیلر بیگ اور کمشنر کو سنجق اور صوبہ دار کو پاشا کا لقب دیا گیا تھا۔ اسی سلطان نے قسطنطنیہ یعنی دربار سلطنت کو باب عالی کے نام سے موسوم کیا، جو ہمارے اس زمانے تک باب عالی کے نام سے مشہور رہا۔ سخت حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسا جنگجو اور فاتح سلطان علمی مشاغل کے لیے کس طرح وقت نکال لیتا تھا۔ سلطان محمد فاتح کو اپنے وقار اور رعب کو قائم رکھنے کا یہاں تک خیال تھا کہ اپنے وزیراعظم سے بھی کبھی خوش طبعی یا بے تکلفی کی گفتگو نہ کرتا تھا۔ ضرورت کے بغیر کبھی دربار یا مجلس جما کر نہیں بیٹھتا تھا بلکہ اس کو اپنی فرصت کے اوقات کا بالکل تنہائی میں گزارنا بہت محبوب تھا۔ لغو باتوں سے اجتناب کرتا تھا ایک طرف وہ علماء کا بے حد قدردان اور ان کی عزت و وقار کے بڑھانے کا خواہاں تھا لیکن دوسری طرف وہ عالم نما جاہلوں اور کٹھ ملاؤں سے سخت متنفر تھا۔ نماز روزے کا سخت پابند اور باجماعت نمازیں ادا کرتا تھا۔ قرآن مجید سے اس کو بے حد محبت تھی۔ عیسائیوں اور دوسرے غیر

مذاہب والوں کے ساتھ اس کا برتاؤ نہایت کریمانہ اور روادارانہ تھا۔ پابندی شرع میں بے جا سختی اس کو پسند نہ تھی۔ ''الدین یسر'' اس کا خصوصی عقیدہ تھا۔

وہ اس راز سے واقف تھا کہ کٹھ ملاؤں نے دین کے معاملہ میں بے جا سختی اور تشدد کو کام میں لا کر اور ذرا ذرا سی بے حقیقت باتوں پر نامناسب زور دے کر دین اسلام کو لوگوں کے لیے موجب وحشت بنا دیا ہے۔ اس لیے وہ دین اسلام کی ہر ایک رخصت سے فائدہ اٹھا لینے کو جائز جانتا تھا۔ چنانچہ اس کے دربار میں وینس سے ایک مشہور مصور و نقاش آیا اور اپنے کمال کا اظہار کرنے کے لیے سلطان کے دربار کی کئی تصویریں تیار کیں۔ سلطان نے اس کو اجازت دے دی اور پھر اس کی تصویروں کو دیکھ کر ان کے نقائص اس کو بتائے۔ اس قسم کی معمولی آزاد خیالیوں کو دیکھ کر اس زمانے کی فتوے باز پیداوار یعنی پیشہ ور مولویوں نے سلطان محمد خان ثانی فاتح قسطنطنیہ پر کفر کا فتویٰ لگایا اور سلطان کو لا مذہب اور دہریہ ٹھہرایا۔ ان تنگ خیال، پست حوصلہ، تہی ظرف، دشمن اسلام فتوے بازوں کی نسل بہت پرانی ہے۔ یہ لوگ کچھ اس زمانے یا سلطان محمد فاتح ہی کے زمانے میں نہ تھے بلکہ اس سے بہت پہلے بھی دنیا میں موجود تھے، جن کا ذکر اسی تاریخ کی گزشتہ جلد میں غالباً آ چکا ہے۔ سلطان محمد فاتح کی نظر اپنی سلطنت کے ہر ایک صیغے اور ہر محکمے پر رہتی تھی۔ مجرموں کو سزا دینے میں وہ بہت چست اور کارگزار اہل کاروں کی قدردانی میں بہت مستعد تھا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سلطان محمد فاتح کو اپنا وقار قائم رکھنے اور تنہائی میں رہنے کا بہت شوق تھا لیکن لڑائی کے ہنگامے میں وہ اپنے معمولی سپاہیوں کی مدد کرنے اور دل سوزی کے ساتھ ان کا ہاتھ بٹانے میں بالکل بے تکلف دوست اور معمولی لشکری کی مانند نظر آتا تھا۔ اس کے سپاہی اس پر جان قربان کرتے اور اس کو اپنا شفیق باپ جانتے تھے۔

سلطان محمد فاتح کا قد درمیانہ، رنگ گندمی اور چہرہ عموماً اداس نظر آتا تھا۔ مگر غصہ و غضب کے وقت نہایت وحشت ناک ہوتا تھا۔ دیانت و امانت اور عدل و انصاف کے خلاف کوئی حرکت کسی اہلکار سے سرزد ہوتی تو اس کو عبرت ناک سزا دیتا۔ سلطان محمد فاتح کی حدود سلطنت میں چوری اور ڈاکہ زنی کا نام و نشان تک باقی نہ تھا۔ اس قدر عظیم الشان سلطنت اور وسیع مملکت میں سرکشی و بغاوت کے تمام فاسد مادوں اور بدامنی و بدچلنی کے تمام امکانات کا فنا ہو جانا سلطان محمد فاتح کو ایک اعلیٰ درجہ کا مدبر و ملک دار فرماں روا ثابت کرتا ہے۔ حالانکہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا فاتح اور جنگجو سپہ

سالار بھی تھا، پھر تعجب اور بھی بڑھ جاتا ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد فاتح کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا اور وہ مختلف و متعدد زبانوں میں بلند پایہ اشعار کہہ لیتا تھا۔

پچیسواں باب

سلطان محمد فاتح کے بعد خانہ جنگی اور شہزادہ جمشید کی حیرتناک داستان

سلطان محمد فاتح کی وفات کے وقت اس کے دو بیٹے بایزید و جمشید تھے۔ بایزید ایشیائے کوچک کے صوبہ کا گورنر اور مقام اماسیہ میں مقیم تھا۔ جمشید کریمیا کی گورنری پر مامور تھا۔ سلطان محمد فاتح کی وفات کے وقت بایزید کی عمر ۳۵ سال کی اور جمشید کی ۲۲ سال کی تھی۔ بایزید کسی قدر سست اور دھیمی طبیعت رکھتا تھا۔ بہ خلاف اس کے جمشید نہایت چست اور مستعد و جفاکش شہزادہ تھا۔ سلطان محمد فاتح کی وفات کے وقت ان دونوں شہزادوں میں سے ایک بھی قسطنطنیہ میں موجود نہ تھا۔ سلطان محمد فاتح نے اپنے وزیراعظم احمد قیدوق فاتح کریمیا کو اٹلی کی جانب فوج کشی کرنے سے پیشتر سپہ سالاری پر مامور کر کے اس جگہ محمد پاشا کو وزیراعظم بنا لیا تھا۔ محمد پاشا وزیراعظم کی خواہش تھی کہ سلطان محمد فاتح کے بعد شہزادہ جمشید کو تخت پر بٹھایا جائے۔ چنانچہ اس نے سلطان محمد فاتح کی وفات کا حال پوشیدہ رکھنا چاہا اور جمشید کے پاس خبر بھیجی کہ فوراً قسطنطنیہ کی طرف آؤ، مگر یہ خبر پوشیدہ نہ رہ سکی۔ جاں نثار فوج نے فوراً بغاوت کر کے وزیراعظم محمد پاشا کو قتل کر دیا اور اس کی جگہ اسحاق پاشا کو وزیراعظم بنایا اور بایزید کے پاس خبر بھیجی کہ سلطان محمد فاتح کا انتقال ہو چکا ہے، فوراً قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ اس ینگ چری یعنی جاں نثار فوج نے خودسری کی راہ سے قسطنطنیہ میں بڑی بدنظمی پیدا کر دی۔ سوداگروں اور مالداروں لوگوں سے زبردستی روپیہ حاصل کیا اور تمام محکموں پر قابض و متصرف ہو گئے۔ ادھر سپہ سالار احمد قیدوق جو اٹلی کے شہر اوٹرانٹو پر قابض و متصرف ہو کر آئندہ موسم بہار میں روما پر فوج کشی کی تیاریاں کر چکا تھا اور اوٹرانٹو کو ہر طرح قلعہ بند اور مضبوط بنا چکا تھا تاکہ آئندہ چڑھائیوں اور لڑائیوں کے وقت یہ شہر ایک مستقل اور مضبوط مرکزی مقام کا کام دے سکے، سلطان کی خبر وفات کو سن کر بہت مغموم ہوا۔ اس نے فوراً اوٹرانٹو میں ہر قسم کی ضروریات فراہم کر کے اپنے ایک ماتحت

سردار کو اوٹرانٹو کا حاکم اور وہاں کی فوج کا سپہ سالار بنایا، مناسب ہدایات کیں اور خود قسطنطنیہ کی جانب روانہ ہوا تاکہ وہاں کے نئے سلطان کی خدمت میں اٹلی کی فتح کے متعلق تمام باتیں عرض کر کے اور اجازت لے کر واپس آئے یا خود سلطان ہی کو اٹلی کی طرف لائے۔

سلطان محمد فاتح کی وفات کا حال بایزید کو اماسیہ میں پہلے معلوم ہو گیا اور وہاں سے صرف چار ہزار فوج لے کر دو منزلہ اور سہ منزلہ یلغار کرتا ہوا قسطنطنیہ پہنچ گیا۔ یہاں آتے ہی تخت سلطنت پر جلوس کیا مگر جاں نثار فوج نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور اس کے سرداروں نے سلطان سے عرض کیا کہ ہماری تنخواہوں اور جاگیروں میں بیش قرار اضافہ کیا جائے اور خوب انعام واکرام دلوایے، ورنہ ہم ابھی آپ کو قتل کر دیں گے۔ بایزید فوج کے اس خودسرانہ رویہ سے مرعوب ہو گیا اور اس نے جاں نثار فوج کے مطالبات کو منظور کر کے آئندہ کے لیے اس رسم کی بنیاد رکھ دی کہ جب کوئی نیا سلطان تخت نشین ہو تو فوج کو انعام واکرام دے کر شاہی خزانہ کا ایک بڑا حصہ اس طرح ضائع کر دے۔ بایزید کی اس پہلی کمزوری نے بتا دیا تھا کہ وہ کوئی زبردست اور قوی بازو سلطان اور اپنے باپ کا نمونہ نہ ہو سکے گا۔ لیکن ایک طرف اس کا اپنے بھائی جمشید سے عمر میں بڑا ہونا، دوسرے وزیر اسحاق پاشا اور جاں نثار فوج کا طرفدار ہونا اس کا باعث ہوا کہ اراکین سلطنت کو باوجود اس احساس کے کہ وہ قوی دل سلطان نہیں، اس کی مخالفت کی جرأت نہ ہو سکی۔ چند ہی روز کے بعد سپہ سالار احمد قیدوق بھی اٹلی سے قسطنطنیہ پہنچ گیا۔ چونکہ اس کا رقیب وزیراعظم محمد پاشا، بایزید کا مخالف اور جمشید کا طرفدار تھا، لہٰذا قیدوق نے بھی بلا پس وپیش آتے ہی سلطان بایزید ثانی کی بیعت کر لی۔

جمشید کو باپ کے مرنے کی خبر کسی قدر دیر سے پہنچی۔ اس وقت بایزید ثانی قسطنطنیہ میں آ کر تخت نشین ہو چکا تھا۔ جمشید نے ایشیائے کوچک میں شہروں پر قبضہ کرنا شروع کیا اور شہر بروصہ پر قابض ہو کر اپنے بھائی بایزید کو لکھا کہ سلطان محمد فاتح نے آپ کو اپنا ولی عہد نہیں بنایا تھا، اس لیے آپ کا تنہا کوئی حق نہیں کہ تمام سلطنت کے مالک اور فرماں روا بن جائیں۔ مناسب یہ ہے کہ ایشیائی مقبوضات میرے تخت حکومت میں رہیں اور یورپی ملکوں پر آپ حکمرانی کریں۔ بایزید نے اس درخواست کو رد کر دیا اور جواباً کہا کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ قسطنطنیہ میں سلطان محمد فاتح کی بہن اور ان دونوں بھائیوں کی پھوپھی موجود تھی۔ اس نے اپنے بھتیجے سلطان بایزید ثانی کے پاس جا کر اس کو سمجھایا کہ دونوں بھائیوں کا لڑنا اچھا نہیں اور مناسب یہی ہے کہ جمشید کو ایشیائے

کوچک کا تمام علاقہ دے دیا جائے۔ مگر بایزید نے پھوپھی کی نصیحت پر کوئی التفات نہ کیا اور یہی جواب دیا کہ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ جمشید مع اہل وعیال بیت المقدس میں جا کر سکونت اختیار کرے اور میں اس کے پاس صوبہ کریمیا کی آمدنی کا ایک حصہ اس کے گزارہ کے لیے بھجواتا رہوں گا۔ بہرحال مصالحت کی کوئی شکل پیدا نہ ہوسکی۔ جمشید اس بات سے واقف تھا کہ اگر میں سلطنت حاصل نہ کر سکا تو بایزید مجھ کو ہرگز زندہ نہ چھوڑے گا۔ لہٰذا وہ اپنی جان کی حفاظت کے لیے بھی مجبور ہو گیا کہ بایزید کا مقابلہ کرے اور تخت سلطنت کے حصول کی کوشش میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔ غرض سلطان بایزید نے اپنے سپہ سالار احمد قیدوق کی قابلیت وتجربہ کاری سے فائدہ اٹھایا اور اپنے بھائی جمشید کے مقابلے پر مستعد ہو گیا۔ چنانچہ سنہ ۸۸۶ھ مطابق ۲ جون سنہ ۱۴۸۱ء دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ جمشید کی فوج کے اکثر سردار مع اپنی اپنی جمعیتوں کے عین معرکہ جنگ میں بایزید کی طرف چلے آئے اور اس طرح جمشید کو بایزید کی فوج سے شکست کھانی پڑی۔

ادھر یہ دونوں بھائی ایشیائے کوچک میں مصروف جنگ تھے، ادھر روما کا پوپ جو روما سے بھاگنے کی تیاریاں کر چکا تھا، سلطان محمد فاتح کی خبر وفات سن کر روما میں ٹھہرا رہا اور پوپ کے عیسائی ملکوں سے صلیبی جنگجوؤں کو دعوت دی کہ آ کر اٹلی کو بچاؤ اور اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر اٹرانٹو سے ترکوں کو نکال دو۔ چنانچہ ہسپانیہ، فرانس اور آسٹریا تک کے عیسائی دوڑ پڑے اور عیسائی فوجوں نے اٹرانٹو پر چڑھائی کر کے اس کا محاصرہ کر لیا۔ ایشیائے کوچک میں جب بایزید و جمشید کی فوجیں ایک دوسرے کے مدمقابل پہنچ چکی تھیں تو اسی زمانہ میں انٹرانٹو پر عیسائیوں نے حملہ آوری کی تیاریاں کر لی تھیں۔ قسطنطنیہ سے انٹرانٹو کی فوج کو کوئی مدد نہ مل سکی۔ ترکوں نے خوب جم کر عیسائی فوجوں کا مقابلہ کیا لیکن جب ان کو قسطنطنیہ کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو انہوں نے عیسائیوں کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم مدافعت کی پوری طاقت رکھتے ہیں اور ہم کو مغلوب کرنا تمہارے لیے آسان کام نہیں ہے، مگر ہم اب دیر تک لڑنا اور خون بہانا مناسب نہیں سمجھتے۔ اگر تم صلح کے ساتھ اس شہر کو لینا چاہتے ہو تو ہم تمہارے سپرد کرنے کو تیار ہیں، اگر ہم کو یہاں سے عزت و اطمینان کے ساتھ قسطنطنیہ کی طرف چلے جانے کی اجازت دو۔ عیسائیوں نے فوراً اس پیغام کو منظور کر کے شرائط صلح کی دستاویز لکھ کر ترکی سردار کے پاس بھیج دی۔ جس کی رو سے عثمانی لشکر کے ہر فرد کی جان و مال کو امن دی گئی تھی۔ اس طرح صلح نامہ کی تکمیل کے بعد ترکوں نے شہر کا دروازہ کھول دیا اور عیسائیوں کا قبضہ شہر پر

کرا کر خود وہاں سے روانہ ہونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ لیکن عیسائی سرداروں نے بدعہدی کر کے ہر طرف سے گھیر کر نہایت ہی ظالمانہ اور غیر شریفانہ طور پر قریباً تمام ترکوں کو قتل کر ڈالا اور اٹرانٹو کی گلیاں ترکوں کے خون سے لالہ زار بن گئیں۔ بایزید ثانی کی تخت نشینی کے بعد ہی سلطنت عثمانیہ کو یہ نہایت سخت و شدید نقصان پہنچا کہ جو میخ ملک اٹلی میں گڑ گئی تھی، وہ اکھڑ گئی اور ملک اٹلی کی فتح کا دروازہ جو ترکوں نے کھول دیا تھا، وہ پھر بند ہو گیا اور روما کے گرجے پر جو حسرت و مایوسی کے بادل چھا گئے تھے، وہ یک لخت دور ہو گئے اور اندلس کے ضعیف مسلمانوں کو جو زبردست امداد پہنچنے والی تھی، اس کا امکان جاتا رہا۔ احمد قیدوق کو پھر اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ وہ بایزید سے رخصت ہو کر اس طرف آتا اور اٹلی والوں سے اپنے مقتول سپاہیوں کا انتقام لیتا، انا للہ وانا الیہ راجعون!

جمشید شکست کھا کر ایشیائے کوچک میں نہیں ٹھہرا اور اپنے ہمراہیوں کی غداری کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے ایشیائے کوچک کے کسی ترکی سردار اور صوبہ دار پر بھی اعتماد کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ اس کی مآل اندیش نظر نے اپنی حفاظت اور آئندہ مقابلہ پر مستعد ہونے کے لیے سلطنت مصر کو سب سے بہتر خیال کیا۔ مصر میں مملوکیوں کی حکومت تھی اور خاندان چراکسہ کا بادشاہ ابوسعید قائد بیگ حکمران تھا۔ چونکہ مصر میں عباسی خلیفہ بھی رہتا تھا، اس لیے عالم اسلام میں مصر کی سلطنت خاص طور پر تعظیم وتکریم کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ بایزید سے شکست کھا کر چند جاں نثار ہمراہیوں اور اپنی والدہ اور بیوی کے ساتھ جمشید مصر کی جانب روانہ ہوا۔ ابھی حدود سلطنت عثمانیہ سے باہر نہیں نکلا تھا کہ ایک ترک سردار نے اس کے قافلے پر چھاپہ مارا اور تمام ساز وسامان جو جمشید کے ساتھ تھا، لوٹ لیا۔ جمشید اپنا سامان لٹوا کر جلد حدود عثمانیہ سے نکل گیا اور وہ ترک سردار اس کا لوٹا ہوا سامان لے کر اس امید پر قسطنطنیہ پہنچا کہ بایزید خوش ہو گا۔ اس نے جب بایزید کی خدمت میں لوٹا ہوا سامان پیش کیا تو بایزید نے اس ترک سردار کو جس نے ایک شکست خوردہ اور تباہ حال قافلہ کو لوٹا تھا، قتل کرا دیا۔ جمشید کے قریب پہنچنے کا حال جب مصر کے چرکسی سلطان نے سنا تو اس نے نہایت عزت اور احترام کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بادشاہوں کی طرح اپنا مہمان رکھ کر اس کی تسلی و دل جوئی کی۔ جمشید چار مہینے ابوسعید قائد بیگ کا مہمان رہا۔ اس کے بعد وہ مصر سے حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوا۔ حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر اور مکہ و مدینہ کی حاضری سے سعادت اندوز ہو کر جمشید مصر میں آیا۔ اس عرصہ میں بایزید اور سلطان مصر کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا اور

سلطان مصر اپنے مہمان شہزادہ کے خلاف کوئی حرکت کرنے پر مطلق رضامند نہ ہوا بلکہ اس نے جمشید کو ہر قسم کی امداد دینا اپنا اخلاقی فرض سمجھا۔ آخر جمشید نے مصر پہنچ کر جنگی تیاری شروع کی اور سلطان مصر نے اس کو فوج اور روپیہ سے مدد دی۔ جمشید اپنی حالت درست کر کے اپنی ماں اور بیوی کو مصر ہی میں چھوڑ کر بایزید کے مقابلے کو روانہ ہوا۔ فلسطین اور شام کے ملک میں ہوتا ہوا ایشیائے کوچک کے جنوبی و مغربی حصہ سے داخل ہوا۔ بایزید خبر سنتے ہی اپنے تجربہ کار سپہ سالار احمد قیدوق کو ہمراہ لے کر مقابلہ کے لیے روانہ ہوا۔ اس مرتبہ خوب زور شور کی لڑائی ہوئی مگر جمشید کو پھر شکست اٹھانی پڑی۔ یہ لڑائی سنہ ۸۸۷ھ مطابق جون سنہ ۱۴۸۲ء میں ہوئی۔ اس لڑائی میں جمشید کو ایشیائے کوچک ہی کے بعض سرداروں کی وجہ سے شکست ہوئی۔ ان لوگوں نے جمشید کے ساتھ مل کر بایزید سے لڑنے کا وعدہ کر کے جمشید کو مصر سے بلایا تھا اور اس کے ساتھ مل کر میدان جنگ میں آئے تھے لیکن لڑائی کے وقت بایزید سے جا ملے اور اس طرح اس کی باقی فوج کو بھی بددل کر کے بایزید کی فتح کا موجب ہو گئے۔ اس مرتبہ شکست کھا کر جمشید کو مصر کی طرف جاتے ہوئے شرم دامن گیر ہوئی اور اس نے کہا کہ اب سلطان مصر اور اپنی بیوی اور والدہ کو منہ دکھانے کا موقع نہیں رہا۔ اگر وہ مصر چلا جاتا تو یقیناً چند ہی روز کے بعد ایسا وقت آ جاتا کہ سلطنت عثمانیہ کے تمام سپہ سالاران افواج متفقہ طور پر اس کو مصر سے قسطنطنیہ لے جانے کی کوشش کرتے اور تخت سلطنت پر بٹھاتے۔ مگر قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جمشید نے بجائے مصر کے اس بات کی کوشش کی کہ کسی طرح سلطنت عثمانیہ کے یورپی حصہ میں پہنچ کر اور وہاں کے سرداروں نیز سرحد کے عیسائی سلاطین سے امداد حاصل کر کے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری کروں۔ اس شکست کے بعد بھی اس کی حالت بہت نازک ہوگئی تھی اور تیس چالیس سے زیادہ رفیق اس کے ساتھ نہ تھے۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ کسی جگہ دم لینے اور اپنی حالت کو درست کرنے کا موقع ملے۔ یہ موقع اس کو مصر ہی میں خوب مل سکتا تھا۔ جہاں سلطان مصر اس کی ہر طرح مدد کرنے کو تیار تھا مگر اس نے روڈس کے حکمران عیسائیوں کی پارلیمنٹ کو لکھا کہ کیا تم اس بات کی اجازت دے سکتے ہو کہ اس تمہارے جزیرے میں چند روز قیام کر کے پھر یونان اور البانیہ کی طرف چلا جاؤں اور اپنے ملک کو حاصل کرنے کی کوشش کروں؟ اس پیغام کو سنتے ہی روڈس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ان مقدس عیسائیوں نے جمشید کے اس ارادہ کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر عیسائی سلاطین کے چہروں

پر رذالت و کمینگی کا سیاہ پوڈر ملنے کے لیے ایک شیطانی منصوبہ سوچا۔ جمشید ممکن تھا کہ اپنے روڈس جانے کے ارادے پر نظر ثانی کرتا اور ملک شام میں مقیم رہ کر چند روز انجام اور عواقب امور کو سوچتا اور اس عرصہ میں سلطان مصر بہ اصرار اس کو مصر بلاتا اور اس کی ماں اور بیوی کی محبت اس کو مصر کی طرف کھینچتی لیکن روڈس کی پارلیمنٹ کے صدر مسمی ڈابسن نے فوراً جمشید کو لکھا کہ ہم آپ کو سلطنت عثمانیہ کا سلطان تسلیم کرتے ہیں اور آپ کی تشریف آوری ہمارے لیے موجب عزت وافتخار ہوگی اور میں اپنی پارلیمنٹ کی جانب سے آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ہماری عزت افزائی کے لیے ضرور روڈس میں قدم رنجہ فرمائیں۔ ہماری تمام فوج، تمام جہاز، تمام خزانہ اور تمام طاقتیں آپ کی خدمت گزاری اور اعانت کے لیے وقف ہیں اور یہاں آپ کے لیے ہر قسم کا ضروری سامان اور طاقت موجود و مہیا کر دی جائے گی۔ اس جواب کو سن کر جمشید تامل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بلاتوقف تیس آدمیوں کو ہمراہ لے کر روڈس کی طرف چل دیا۔ جزیرہ کے ساحل پر اتر کر اس نے دیکھا کہ استقبال کے لیے آدمی موجود ہیں۔ وہاں سے وہ تزک واحتشام کے ساتھ دارالسلطنت میں پہنچایا گیا۔ ڈی۔ آبسن یا ڈابسن نے جو پارلیمنٹ کا پریزیڈنٹ تھا، فوج کے ساتھ شاندار استقبال کیا اور شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرایا لیکن بہت جلد شہزادہ جمشید کو معلوم ہوگیا کہ وہ مہمان نہیں بلکہ ایک قیدی ہے۔ ڈابسن نے سب سے پہلے جمشید سے ایک اقرارنامہ اس مضمون کا لکھایا کہ اگر میں سلطنت عثمانیہ کا سلطان ہوگیا تو فرقہ نائٹس یعنی روڈس کے حاکموں کو ہر قسم کی مراعات عطا کروں گا۔ اس کے بعد اس نے سلطان بایزید کو لکھا کہ جمشید تو ہمارے قبضہ میں موجود ہے۔ اگر آپ ہم سے صلح رکھنا چاہتے ہیں تو ہم کو اپنی تمام بندرگاہوں میں آنے جانے اور تجارت کرنے کی آزادی دیجیے۔ ہر قسم کے محصول ہم کو معاف کیے جائیں اور آپ کا کوئی اہل کار ہم سے کسی جگہ کا محصول طلب نہ کرے۔ نیز پینتالیس ہزار عثمانی سکے سالانہ ہم کو دیے جائیں تاکہ ہم جمشید کو اپنی حفاظت اور قید میں رکھیں اور اگر آپ نے ہماری ان شرائط کو منظور نہ کیا تو ہم اس شہزادے کو چھوڑ دیں گے تاکہ وہ آپ سے تخت سلطنت کو چھین لینے کی کوشش کر سکے۔ بایزید نے بلاتامل ڈی۔ آبسن کے تمام مطالبات کو منظور کر لیا اور ۴۵ ہزار ڈاکٹ یعنی تین لاکھ روپیہ سے بھی زیادہ سالانہ رقم روڈس والوں کے پاس بھجواتا رہا۔ ادھر ڈی۔ آبسن پریسیڈنٹ روڈس نے مصر میں جمشید کی دکھیا غریب الوطن ماں کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ ہمارے پاس بھیجتی رہو گی تو ہم تمہارے بیٹے جمشید کو بایزید کے سپرد نہ

کریں گے اور اس کو بہ حفاظت آرام سے اپنے پاس رکھیں گے، ورنہ سلطان بایزید اس سے بھی زیادہ روپیہ ہم کو دینا چاہتا ہے۔ ہم مجبوراً اس کے سپرد کر دیں گے اور ظاہر ہے کہ وہ جمشید کو قتل کر کے اطمینان حاصل کرے گا۔ اس پیغام کو سنتے ہی جمشید کی ماں نے جس طرح ممکن ہوا، ڈیڑھ لاکھ روپیہ ڈی۔ آبسن کے پاس بھیج دیا اور لکھا کہ میں ہمیشہ یہ رقم بھیجتی رہوں گی۔ غرض کہ روڈس والوں نے جمشید کو جلب منفعت کا بہترین ذریعہ بنایا اور اس کے ذریعہ سے فائدہ اٹھانے میں جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے سے مطلق پرہیز نہ کیا۔ اس طرح جلب منفعت کی تدابیر کام میں لا کر روڈس والوں نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بایزید یا سلطان مصر، جمشید کو حاصل کرنے کے لیے ہمارے ملک پر حملہ کر دیں اور یہ سونے کی چڑیا ہاتھ سے جاتی رہے۔ لہٰذا انہوں نے جمشید کو روڈس میں رکھنا مناسب سمجھا اور اس کو سلطنت فرانس کی حدود میں شہر نائس کی طرف روانہ کر دیا اور ایک جمعیت اس کی نگرانی اور دیکھ بھال پر مامور کر دی۔ نائس سے پھر دوسرے مختلف شہروں میں اس کو تبدیل کرتے رہے اور اس عرصہ میں شہزادہ کے ہمراہیوں کو یکے بعد دیگرے جدا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جمشید تنہا رہ گیا۔ فرانس کے ایک شہر میں جب جمشید ٹھہرایا گیا تو اتفاقاً حاکم شہر کی لڑکی فلپائن لنیا اس پر عاشق ہو گئی۔ چند روز کے بعد اس شہر سے بھی اس کو جدا کر کے اس کو ایک خاص مکان میں جو اسی کے لیے فرانس کے بادشاہ نے تعمیر کرایا تھا، لے جا کر رکھا۔ اب گویا شہزادہ پر بادشاہ فرانس نے اپنا قبضہ کر لیا کیونکہ وہ ایک نہایت قیمتی مال تھا اور ہر شخص اس پر قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ یہ مکان کئی منزل کا تھا۔ نیچے اور اوپر کی منزل میں تو محافظ اور چوکیدار رہتے تھے، بیچ کی منزل میں شہزادے کو رکھا جاتا تھا۔ اس عرصہ میں شاہ فرانس، پوپ روما اور دوسرے عیسائی سلاطین نے ڈی۔ آبسن سے خط و کتابت کر کے شہزادہ کو اپنے اپنے قبضہ میں لینے کی درخواست کی۔ شہزادہ گویا ایسا مال تھا جو نیلام کے میدان میں رکھا ہوا اور ہر شخص اس پر بولی بول رہا ہو۔ ڈی۔ آبسن چونکہ شہزادہ کے ذریعہ سے خوب نفع اٹھا رہا تھا اور وہ اس کو اپنے قبضہ میں رکھنے کی قیمت پہچانتا تھا، لہٰذا اس نے نہ تو کسی کو صاف جواب دیا نہ اس کے دینے پر رضا مند ہوا، بلکہ خط و کتابت کو طول دینے اور شرائط طے کرنے میں وقت کو ٹالتا رہا۔ سنہ ۸۹۵ھ تک شہزادہ جمشید ملک فرانس میں رہا اور روڈس والے برابر سلطان بایزید ثانی سے روپیہ وصول کرتے رہے۔ جب ڈی۔ آبسن کو یقین ہو گیا کہ عیسائی سلاطین بالخصوص فرانس کا بادشاہ جمشید پر قبضہ کر لے گا کیونکہ وہ اسی کے ملک میں فروکش تھا، تو اس نے جمشید کو بلا لینے کی تجویز کی اور ادھر

جمشید کی ماں کو لکھا کہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ سفر کے لیے بھیج دو تو میں تمہارے بیٹے کو فرانس سے بلا کر تمہارے پاس مصر میں پہنچا دوں گا۔ اس بے چاری نے فوراً یہ روپیہ بھجوا دیا اور ڈی۔ آبسن نے اپنے آدمیوں کو لکھا کہ جمشید کو فرانس کے ملک سے اب اٹلی میں لے آؤ۔ یہ حال جب فرانس کے بادشاہ چارلس ہفتم کو معلوم ہوا تو اس نے مخالفت کی اور کہا کہ میں جمشید کو ہرگز اپنی محل داری سے باہر نہ جانے دوں گا۔ آخر بڑی ردوکد کے بعد چارلس ہشتم نے اس شرط پر جمشید کو اٹلی جانے کی اجازت دی کہ پوپ دس ہزار روپیہ بہ طور ضمانت جمع کرے کہ اگر دربار فرانس کی اجازت کے بغیر جمشید کو اٹلی سے باہر جانے دیا تو یہ دس ہزار روپے ضبط ہو جائیں گے۔ ادھر پوپ نے ایک ضمانت روڈس کے حاکموں کو دی جس کا منشاء یہ تھا کہ اگر وہ فوائد جو روڈس کی حکومت کو جمشید کے ذریعہ سے پہنچ رہے ہیں، جمشید کے اٹلی آنے سے رک گئے تو پوپ ان نقصانات کی تلافی کرے گا۔

غرض سنہ ۸۹۵ھ میں شہزادہ جمشید شہر روما میں داخل ہوا اور یہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا اور پوپ کے شاہی محل میں اس کو ٹھہرایا گیا۔ فرانسیسی سفیر شہزادہ کے ہمراہ تھا۔ جب فرانسیسی سفیر اور جمشید پوپ سے ملنے گئے تو وہاں پوپ کے نائبوں نے جو دربار میں تھے، شہزادہ کو پوپ کے سامنے اسی طرح جھکنے کے لیے بار بار کہا جس طرح فرانسیسی سفیر اور دوسرے عیسائی سردار پوپ کے سامنے جھکتے تھے لیکن سلطان محمد فاتح کے بیٹے نے یہ ذلت کسی طرح گوارا نہ کی اور وہ نہایت بے پرواہی اور فاتحانہ انداز سے پوپ کے پاس جا بیٹھا اور نہایت بے پرواہی اور شاہانہ جرأت کے ساتھ پوپ سے گفتگو کی اور اسی گفتگو میں کہا کہ میں آپ سے کچھ باتیں تخلیہ میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔ پوپ نے اس بات کو منظور کیا اور جب تخلیہ ہو گیا تو جمشید نے عیسائی سرداروں کی بدعہدی اور غیر شریفانہ برتاؤ کی شکایت کی اور اپنے مصائب کی داستان سنائی اور اپنی ماں اور بیوی کی جدائی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس داستان غم کو سن کر پوپ کے دل پر بھی بڑا اثر ہوا اور وہ بھی چشم پر آب ہو گیا۔ مگر کچھ سوچ کر اس نے کہا کہ تمہارا مصر جانا تمہارے لیے مفید نہ ہوگا اور تم اپنے باپ کا تخت حاصل نہ کر سکو گے۔ تم کو شاہ ہنگری نے بھی بلایا ہے۔ اگر تم ہنگری کی طرف چلے جاؤ گے تو تمہارا مقصد بہ آسانی پورا ہو سکے گا اور سب سے بہتر تو تمہارے لیے یہ بات ہے کہ تم دین اسلام کو چھوڑ کر دین عیسوی قبول کر لو۔ پھر تمام یورپ تمہارے ساتھ ہوگا اور نہایت آسانی سے تم قسطنطنیہ کے تخت پر جلوس کر کے سلطنت عثمانیہ کے بادشاہ بن جاؤ گے۔ پوپ اسی قدر کہنے پایا تھا کہ جمشید

نے فوراً اس کو روک کر کہا کہ ایک سلطنت عثمانیہ کیا اگر ساری دنیا کی حکومت و بادشاہی بھی مجھ کو ملنے والی ہو تو میں اس پر ٹھوکر ماردوں گا لیکن دین اسلام کو ترک کرنے کا خیال تک بھی دل نہ لاؤں گا۔ پوپ نے یہ سنتے ہی اپنے کلام کا پیرایہ بدل دیا اور معمولی دل جوئی کی باتیں کر کے جمشید کو رخصت کردیا اور وہ جس طرح فرانس میں زیرحراست رہتا تھا، اسی طرح روما میں بہ طور قیدی رہنے لگا۔ جمشید کے روما میں آ جانے کا حال سن کر سلطان مصر نے اپنا ایلچی روما میں بھیجا۔ اس کو یقین تھا کہ روما سے جمشید اب مصر پہنچایا جائے گا۔ اس لیے یہ ایلچی استقبال کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ادھر سلطان بایزید ثانی نے جمشید کے اٹلی آنے کی خبر سن کر اپنا سفیر تحائف ونذرانے کے ساتھ پوپ کی خدمت میں روانہ کیا کہ پوپ سے معاملہ طے کرے۔ کیونکہ پوپ کی نسبت خیال تھا کہ وہ اپنے اختیار سے جمشید کو جہاں چاہے بھیج سکتا ہے اور روڈس والوں کی منشاء کو پورا کرنا پوپ کے لیے ضروری نہیں۔ شاہ مصر کے سفیر نے روما میں داخل ہو کر اول جمشید کو تلاش کیا اور جب اس کی خدمت میں پہنچا تو اسی طرح آداب بجا لایا جیسے کہ سلطان قسطنطنیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر آداب بجا لاتا۔ اس سفیر نے جمشید کو یہ حال بھی سنایا کہ آپ کی والدہ سے کس قدر روپیہ سفر خرچ کے لیے ڈی۔ آبسن نے منگوایا ہے۔ یہ سن کر جمشید پوپ کی خدمت میں مع سفیر پہنچا اور اس دھوکہ بازی کا استغاثہ کیا۔ پوپ نے بہت ہی تھوڑے سے روپے ڈی۔ آبسن کے وکیل سے جمشید کو دلوا کر اس قصے کو ختم کر دیا۔ مصر کا سفیر ناکام مصر کو واپس چلا گیا۔ بایزید کے سفیر نے پوپ سے مل کر قریباً اسی قدر رقم پر جو ڈی۔ آبسن کو بایزید دیا کرتا تھا، معاملہ طے کرلیا اور اس طرف سے اطمینان حاصل کر کے قسطنطنیہ کو واپس چلا گیا اور پوپ نے جمشید کی نگرانی کا معقول انتظام کر دیا اور وہ بہ دستور قیدیوں کی طرح رہنے لگا۔ اس کے تین سال بعد پوپ جس کا نام شنیوس تھا، فوت ہو گیا اور اس کی جگہ اسکندر نامی پوپ مقرر ہوا۔ یہ جدید پوپ پہلے پوپ سے شرارت میں بہ درجہا فائق تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی سلطان بایزید کے دربار میں ایلچی روانہ کیا اور پیغام بھیجا کہ چالیس ہزار ڈاکٹ سالانہ جو پہلے سے مقرر ہے، وہ آپ بہ دستور بھیجتے رہیں اور تین لاکھ ڈاکٹ یک مشت اب بھیج دیں تو میں ہمیشہ کے لیے آپ کو جمشید کے خطرے سے نجات دے سکتا ہوں یعنی اس کو ہلاک کرسکتا ہوں۔ پوپ اسکندر کے اس سفیر کا نام جارج تھا۔ جارج نے دربار قسطنطنیہ میں بڑے سلیقے کے ساتھ گفتگو کی اور اپنی قابلیت کا اس خوبی کے ساتھ اظہار کیا کہ سلطان بایزید نے پوپ کو اس سفیر کی سفارش لکھی کہ یہ ایسا

لائق ہے کہ اس کو اپنا نائب بنائیں۔ یہ سفیر ابھی قسطنطنیہ میں مقیم تھا کہ سنہ ۹۰۱ھ میں فرانس کے بادشاہ چارلس ہشتم نے اٹلی پر حملہ کیا۔ اس حملہ آوری کا سبب بھی سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ شہزادہ جمشید کو اب جدید پوپ اسکندر کے قبضے میں نہ رہنے دیا جائے اور اس گوہر گراں مایہ کو اپنے قبضے میں لے لیا جائے۔ چارلس ہشتم کے حملہ آور ہونے پر پوپ اسکندر نے روما سے بھاگ کر سینٹ اینجلو کے قلعہ میں پناہ لی اور بھاگتے ہوئے شہزادہ جمشید کو بھی، جسے وہ خزانہ سے زیادہ قیمتی سمجھتا تھا، اپنے ساتھ لیتا گیا۔ گیارہ روز کے بعد پوپ اور شاہ فرانس کے درمیان شرائط صلح نامہ کے طے کرنے کے لیے ایک مجلس منعقد ہوئی۔ سب سے پہلی شرط جو چارلس نے پیش کی، وہ یہ تھی کہ جمشید میرے قبضے میں رہے گا۔ آخر ایک مکان میں پوپ، چارلس اور جمشید صرف تین شخص جمع ہوئے اور پوپ نے جمشید کو مخاطب کر کے دریافت کیا کہ کیوں شہزادے! تم یہاں رہنا چاہتے ہو یا بادشاہ فرانس کے پاس؟ جمشید نے کہا میں شہزادہ نہیں رہا بلکہ ایک قیدی ہوں۔ مجھ کو جہاں پر چاہو رکھو، میں کچھ نہیں کہتا۔ بہر حال چارلس ہشتم شاہ فرانس، جمشید کو اپنے ساتھ نیپلز میں لے آیا اور وہاں اس کو رکھ کر ایک سردار مناسب جمعیت کے ساتھ اس کا نگران مقرر کیا گیا۔ اب پوپ اسکندر کی بایزید سے روپیہ وصول کرنے کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ حالانکہ سلطان بایزید تین لاکھ ڈاکٹ ادا کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا اور پوپ کے سفیر سے معاملہ طے کر لیا تھا۔ پوپ کو چونکہ روپیہ کا لالچ تھا، اس لیے اس نے سلطان کو لکھا کہ اگرچہ جمشید یہاں سے نیپلز چلا گیا ہے مگر میں ضرور اس کا کام تمام کرا دوں گا اور آپ سے روپیہ پانے کا مستحق ہوں گا جیسا کہ طے ہو چکا ہے۔ اس کے بعد پوپ اسکندر نے ایک یونانی حجام کا اس کام کے لیے انتخاب کیا۔ یہ یونانی حجام اول مسلمان ہو چکا تھا اور اس کا نام مصطفیٰ رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ مرتد ہو گیا اور اٹلی میں آ کر اپنے پیشہ حجامی کی بہ دولت پوپ تک پہنچ گیا۔ پوپ نے اس مصطفیٰ حجام کو نیپلز کی جانب روانہ کیا اور زہر کی ایک پڑیا دی کہ کسی طرح یہ پڑیا جمشید کو کھلا دی جائے۔ اس زہر کا اثر یہ تھا کہ آدمی فوراً نہیں مرتا تھا بلکہ چند روز کے بعد بیمار ہو کر مرتا تھا اور کوئی دوا کارگر نہ ہو سکتی تھی۔ مصطفیٰ نیپلز میں پہنچا اور رفتہ رفتہ رسوخ پیدا کر کے شہزادہ جمشید تک پہنچنے لگا۔ ایک حجام کو ایسے معزز قیدی تک پہنچنے سے پاسبانوں نے بھی روکنا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ اس سے کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر مصطفیٰ نے موقع پا کر وہ زہر کی پڑیا شہزادہ جمشید کو کسی طرح دھوکے سے کھلا دی اور شہزادہ لاعلاج بیماری میں مبتلا ہو گیا اور اس قدر کمزور

وناتواں ہو گیا کہ اسی حالت میں مصر سے اس کی ماں کا خط اس کے پاس پہنچا تو وہ اس خط کو کھول کر پڑھ بھی نہ سکا اور اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے کہ ''الٰہی! اگر یہ کفار میرے ذریعہ سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں تو مجھ کو آج ہی اٹھا لے اور مسلمانوں کو ان کے شر سے بچا لے۔'' مصطفیٰ اگرچہ نامعلوم طریقے سے زہر کھلا چکا تھا مگر اس نے اس پر اکتفا نہ کر کے یہ بھی مزید کارروائی کی کہ زہر میں بجھے ہوئے استرے سے جمشید کی حجامت بنائی اور اس طرح بھی اس کی جلد کے نیچے زہر کا اثر پہنچا دیا تھا۔ جس روز جمشید نے یہ مذکورہ دعا مانگی، اسی روز اس کی روح نے اس جسم خاکی کو چھوڑ کر عالم باقی کی طرف پرواز کی۔ یہ واقعہ سنہ ۹۰۱ھ کا ہے۔ جمشید نے ۳۶ سال کی عمر میں تیرہ برس قید فرنگ کے مصائب جھیل کر وفات پائی۔ اس کی لاش بایزید کی درخواست کے موافق عیسائیوں نے بایزید کے پاس بھیج دی اور بایزید نے اس کو بروصہ میں دفن کرایا۔ سلطان بایزید نے پوپ اسکندر کو بھی وعدہ کے موافق روپیہ ادا کر دیا اور اس حجام مصطفیٰ نامی کو بلا کر اپنے یہاں رکھا اور پھر ترقی دے کر اس کو وزارت کے عہدہ جلیلہ تک پہنچا دیا۔ تعجب ہے کہ بایزید نے ابتدائی ایام میں تو اس ترکی سردار کو قتل کرا دیا تھا جس نے جمشید کو راستے میں لوٹ لیا تھا مگر اب بارہ تیرہ سال کے بعد اس نے اس حجام کی ایسی قدر و عزت بڑھائی جس نے جمشید کو قتل کر کے اس ترکی سردار سے زیادہ سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ سلاطین عثمانیہ کے سلسلے میں شہزادہ جمشید کی دلخراش داستان کو اس لیے مناسب تفصیل کے ساتھ اس جگہ درج کر دیا گیا ہے کہ اس داستان سے اس زمانے کے عیسائی بادشاہوں کی اخلاقی حالت پر ایک تیز روشنی پڑتی ہے اور صاف طور پر ان عیسائی فرماں رواؤں کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس طرح شہزادہ جمشید پر انہوں نے قبضہ کیا اور کس طرح اس سے فوائد حاصل کیے اور کس طرح اس کے قابو میں رکھنے پر حریص تھے اور اپنے ان مادی اور نفسانی اغراض کو پورا کرنے میں کسی کو شرافت، انسانیت اور اپنے شاہانہ مرتبہ کے وقار کی پرواہ نہ تھی۔ ان کے دل میں رحم کا مادہ بھی نہ تھا اور ان پر سلطنت عثمانیہ کا اس قدر رعب طاری تھا اور وہ ایسے خائف و ترساں تھے کہ شہزادہ جمشید کے ذریعہ سے سلطان عثمانی کو اپنے اوپر فوج کشی کرنے سے روکنے کی ذلت آمیز کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ شہزادہ جمشید کی داستان کو یہاں ختم کر کے اب ہم کو سلطان بایزید ثانی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جو اپنے باپ سلطان محمد خان ثانی فاتح قسطنطنیہ کے بعد تخت نشین ہوا۔

سلطان بایزید ثانی:

سلطان بایزید ثانی کی تخت نشینی کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اس سلطان نے سنہ ۸۸۶ھ میں تخت نشین ہو کر سنہ ۹۱۸ھ تک یعنی ۳۲ سال حکومت کی۔ اس کو تخت نشین ہوتے ہی اپنے بھائی جمشید کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دو مرتبہ جمشید سے لڑائی ہوئی اور دونوں مرتبہ بایزید کامیاب ہوا لیکن یہ کامیابی سلطنت عثمانیہ کے لیے کچھ مفید ثابت نہیں ہوئی۔ جمشید کا عیسائیوں کی قید اور قبضہ میں چلا جانا اس کا باعث ہوا کہ بایزید ثانی کو ملک اٹلی اور روڈس پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ادھر مصر کی مملوکی سلطنت سے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ شہزادہ جمشید چونکہ اول مصر ہی کی سلطنت میں پناہ گزین ہوا تھا اور جمشید کے متعلقین آخر تک مصر میں موجود تھے، لہٰذا مملوکیوں نے ایشیائے کوچک کے جنوبی و مشرقی حصہ پر حملہ آوری کا سلسلہ جاری کر دیا اور سنہ ۸۹۰ھ میں بایزید کی فوج کو شکست فاش دے کر بعض سرحدی مقامات پر قبضہ کر لیا۔ آخر بایزید نے مملوکیوں سے متواتر شکستیں کھانے کے بعد صلح کی اور اس صلح میں بایزید کا دب جانا اس طرح ثابت ہوا کہ اس نے وہ قلعے اور وہ شہر جن پر مملوکی قبضہ کر چکے تھے، انہیں کے قبضے میں رہنے دیے۔ مگر یہ اقرار مملوکیوں سے ضرور لے لیا کہ اس نومفتوحہ علاقے کی تمام آمدنی حرمین شریفین کی خدمت گزاری میں صرف کی جائے گی۔ سلطان بایزید کے پاس احمد قیدوق ایک نہایت قیمتی اور تجربہ کار سپہ سالار تھا۔ اگر بایزید چاہتا تو اس سے خوب کام لے سکتا تھا۔ مگر اس نے اس جوہر قابل سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ احمد قیدوق فوج میں بہت ہردلعزیز تھا اور بایزید ثانی کو اس کی غلط کاریوں پر نصیحت کرتا رہتا تھا۔ وہ اپنی صاف بیانی اور فاش گفتاری میں کسی شاہی سطوت اور سلطانی رعب کی مطلق پرواہ نہ کرتا تھا۔ حقیقتاً ایسا نصیحت گر جو محبت کی وجہ سے غلطیوں پر تنبیہ کرے، بہت ہی غنیمت ہوتا ہے لیکن بایزید زیادہ برداشت نہ کر سکا۔ سنہ ۸۹۵ھ میں بایزید ثانی نے جاں نثار فوج کے بڑھتے ہوئے زور کو توڑنا چاہا اور اس فوج کے خلاف سخت احکام صادر کرنے پر آمادہ ہوا۔ فوج میں پہلے ہی سے شورش برپا تھی۔ احمد قیدوق نے بایزید کو برسر دربار سمجھایا کہ آپ اس زمانہ میں جبکہ ہم کو ہر طرف فوج سے کام لینے کی ضرورت ہے، فوج کو بددل اور افسردہ خاطر نہ کریں۔ اس کام کو کسی دوسرے وقت پر ملتوی رکھیں ورنہ پھر اندیشہ ہے کہ مشکلات پر قابو پانا دشوار ہوگا اور اپنی سلطنت کو بچانا آپ کے لیے آسان نہ رہے گا۔ بہ ظاہر بایزید نے احمد قیدوق کی بات کو مان لیا مگر اس کو احمد قیدوق کا اس طرح دخل در معقولات ہونا سخت گراں گزرا۔ اس

نے چند روز کے بعد احمد قیدوق کے قتل کا ارادہ کیا۔ چنانچہ احمد قیدوق کو اسی لیے گرفتار کرلیا گیا۔ فوج نے اپنے ہردل عزیز سردار کے قتل کی خبر سن کر ایوان سلطانی کا محاصرہ کرلیا اور سلطان کو دھمکی دی کہ اگر ہمارے سردار احمد قیدوق کو قتل کر دیا گیا تو ہم اس کے معاوضے میں سلطان بایزید کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ بایزید نے مجبور ہو کر احمد قیدوق کو جو ابھی تک قتل نہیں کیا گیا تھا، جاں نثار فوج کے سپرد کر دیا اور بہ ظاہر اس کی عزت و تکریم بھی کی مگر چند ہی روز کے بعد تمام جاں نثار فوج کو کسی مہم کے بہانے سے دور دراز کے سرحدی مقام پر بھیج کر اور دارالسلطنت کو فوج سے خالی پا کر احمد قیدوق کو قتل کر دیا۔ اس سردار کا قتل ہونا سلطنت عثمانیہ کے لیے نہایت مضر ثابت ہوا۔

سنہ ۸۹۶ھ میں سلطنت عثمانیہ اور سلطنت روس کے درمیان تعلقات قائم ہوئے یعنی زار ماسکو نے اپنا سفیر مناسب تحف وہدایا کے ساتھ سلطان کی خدمت میں قسطنطنیہ کی جانب روانہ کیا۔ اس سفیر کے ساتھ دربار قسطنطنیہ میں معمولی برتاؤ ہوا اور وہ چند روز رہ کر ماسکو کی جانب رخصت ہوا۔ سلطان بایزید کے عہد حکومت میں سلطنت عثمانیہ کی بحری طاقت میں بہت ترقی ہوئی۔ سلطان کی توجہ بحری طاقت کو بڑھانے کی طرف اس لیے زیادہ منعطف ہوئی کہ اس کو شہزادہ جمشید کی طرف سے اندیشہ تھا کہ روڈس، اٹلی اور فرانس کی حکومتیں مل کر بحری حملہ کی تیاری پر آمادہ ہوں گی۔ ایک طرف اس نے ان سلطنتوں اور دوسری عیسائی حکومتوں سے صلح قائم کر رکھی اور دوسری طرف ان کے حملہ سے محفوظ رہنے کی تدابیر سے بھی غافل نہ رہا اور اپنی بحری طاقت کو بڑھانے میں مصروف رہا۔

جس زمانے میں جمشید عیسائیوں کے قبضے میں پہنچ چکا تھا، اندلس کے مسلمانوں یعنی شاہ غرناطہ نے سلطان بایزید سے امداد طلب کی کہ بحری فوج اور جنگی بیڑے سے ہماری مدد کی جائے۔ بایزید اندلسی مسلمانوں کی درخواست پر ان کو بہت بڑی مدد دے سکتا تھا لیکن وہ محض اس وجہ سے کہ کہیں پوپ اور دوسرے عیسائی سلاطین جمشید کو آزاد کر کے میرے مقابلے پر کھڑا نہ کر دیں، متامل رہا اور جیسی کہ چاہیے تھی، اندلس والوں کی ویسی مدد نہ کر سکا۔ بایزید کی یہ کوتاہی ضرور قابل شکایت اور موجب افسوس ہے۔ تاہم ہم کو یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اس نے ایک معمولی سا بیڑہ جس میں چند جنگی جہاز شامل تھے، اپنے امیرالبحر کمال نامی کی قیادت میں اسپین کی طرف روانہ کیا تھا۔ اس بیڑہ نے ساحل اسپین پر پہنچ کر عیسائیوں کا تھوڑا سا نقصان کیا مگر کوئی ایسا کارنمایاں انجام نہ دے سکا، جس سے اسپین کے مسلمانوں کو کوئی قابل تذکرہ امداد پہنچتی۔ جب جمشید کا کام تمام ہو گیا

اور بایزید کو اس کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا تو اس نے ان جزیروں اور ان ساحلی مقاموں پر جو یونان اور اٹلی کے درمیان ریاست وینس کے تصرف میں تھے، قبضہ کرنے کی کوشش کی اور وینس کے ساتھ بحری لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ سنہ ۹۰۵ھ میں وینس کی بحری طاقت کو ترکی بیڑے نے شکست فاش دی اور تمام جزیرے اس کے قبضے سے چھین لیے۔ سنہ ۹۰۶ھ میں وینس، پوپ روما، اسپین اور فرانس کے متحدہ بیڑے سے عثمانیہ بیڑے کا مقابلہ ہوا۔ ان مذکورہ عیسائی طاقتوں نے عثمانی بحری طاقت کی ترقی دیکھ کر آپس میں اتفاق کر کے یہ فیصلہ کیا کہ بحر روم سے ترکی اثر کو بالکل فنا کر دینا چاہیے۔ ترکی بیڑہ کا افسر یعنی امیر البحر کمال تھا، جو سلطان بایزید کا غلام تھا۔ اس بحری لڑائی میں کمال نے وہ کمال دکھایا کہ متحدہ عیسائی بیڑے کو شکست فاش دی۔ بہت سے جہازوں کو غرق کیا، بعض کو گرفتار کیا اور باقی فرار ہونے پر مجبور ہوئے۔ اس بحری معرکہ کے بعد کمال کی بہت شہرت ہو گئی اور بحر روم میں ترکی بیڑے کی دھاک بیٹھ گئی۔ مگر افسوس ہے کہ ترکی بیڑے کی نمایاں فتح سے چند سال پہلے یعنی سنہ ۸۹۷ھ میں اندلس سے اسلامی حکومت کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ بایزید ثانی کی ہنگری اور پولینڈ والوں سے بھی متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ مگر وہ کچھ زیادہ مشہور اور قابل تذکرہ نہیں۔ ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولینڈ والوں نے سلطان سے صلح کر لی اور پولینڈ کے بعض شہروں پر جو سرحد پر واقع تھے، ترکوں نے قبضہ کر لیا۔ چونکہ سلطان بایزید ثانی صلح کی جانب زیادہ مائل تھا، لہٰذا سلطنت عثمانیہ کی وسعت اور شوکت میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ سلطان محمد خان فاتح کے زمانے میں عیسائیوں کے دل پر اس قدر دھاک بیٹھ گئی تھی کہ انہوں نے سلطنت عثمانیہ کے اس صلح پسند طرز عمل کو بہت غنیمت سمجھا اور خود حملہ آوری کی جرأت نہ کر سکے۔ سلطان بایزید ثانی کی ہم زیادہ مذمت بھی نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے عہد حکومت میں سلطنت عثمانیہ کی بحری طاقت بہت بڑھ گئی تھی اور بعض جزیرے اور ساحلی مقامات ترکوں کے قبضے میں آ گئے تھے۔ جنہوں نے اس کی تلافی کر دی جو بری معرکہ آرائیوں کے کم اور بلا نتیجہ ہونے کے سبب سے ظاہر ہوئی۔ سلطان بایزید ثانی نے کوئی ایسا عظیم الشان کام بھی نہیں کیا جس کی وجہ سے وہ خاص طور پر مدح و ستائش کا حق دار سمجھا جائے۔ اس کی نسبت مشہور ہے کہ صلح جو اور نیک طینت شخص تھا لیکن عام طور پر کند ذہن اور سست مزاج لوگوں کی نسبت ایسا ہی مشہور ہو جایا کرتا ہے۔

جس سال سلطان بایزید ثانی تخت نشین ہوا، اسی سال عبدالرحمٰن جامی نے اپنی کتاب سلسلۃ

الذہب کی تصنیف کر کے سلطان بایزید کے نام پر معنون کیا۔ جامی اسی بادشاہ کے زمانے میں ۱۸ محرم سنہ ۸۹۸ھ کو فوت ہو کر ہرات میں مدفون ہوئے۔ اسی سال کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا۔

حالانکہ اس سے پہلے مسلمانان اندلس امریکہ کو دریافت کر چکے تھے۔ مگر یہ شہرت کولمبس ہی کے حصے کی تھی۔ بایزید ثانی کے زمانے میں سنہ ۹۰۲ھ میں پرتگال کے بادشاہ عمانویل نے اپنے دارالسلطنت سے بس واسکوڈی گاما کو تین جہاز دے کر ہندوستان کو تلاش کرنے کے لیے روانہ کیا۔ وہ ۲۰ رمضان سنہ ۹۰۳ھ کو مالابار کی بندرگاہ قندرینہ علاقہ کالی کٹ میں پہنچ کر لنگر انداز ہوا۔ اسی سلطان کے عہد حکومت یعنی سنہ ۹۰۶ھ میں اسماعیل صفوی بانی خاندان صفویہ چودہ سال کی عمر میں ایران کے تخت پر بیٹھا۔ ''مذہب حق'' اس کی تاریخ جلوس ہے۔ سلطان بایزید خان ثانی کا ہم عصر ہندوستان میں سکندر لودھی تھا مگر سلطان سکندر لودھی، بایزید ثانی سے تین سال پیشتر یعنی سنہ ۹۱۵ھ میں فوت ہو گیا تھا۔ ۲۹ شعبان سنہ ۹۱۶ھ کو شیبانی خان بادشاہ ترکستان، اسماعیل صفوی بادشاہ ایران کے مقابلہ میں مارا گیا اور اس سے ایک ماہ بعد سلطان محمود بیکر بادشاہ گجرات احمد آباد میں فوت ہوا۔ سلطان بایزید خان ثانی کا ۳۳ سالہ عہد حکومت چونکہ اہم اور دلچسپ واقعات سے خالی تھا، لہٰذا دوسرے ملکوں کے واقعات جو اس کے زمانہ میں ہوئے، قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے لکھ دیے گئے ہیں۔ اسی سلسلہ میں سلطان بایزید ثانی کے عہد کا ایک اور واقعہ بھی قابل تذکرہ ہے، جس سے اس زمانے کے عیسائیوں کی سنگ دلی اور نامردی پر تیز روشنی پڑتی ہے۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ہنگری کے ساتھ بھی سلطان بایزید کی فوجوں کی معرکہ آرائی ہوئی تھی۔ ان لڑائیوں کے سلسلہ میں ایک مرتبہ سلطان بایزید ثانی کا ایک سپہ سالار مسمی غازی مصطفیٰ اور اس کا حقیقی بھائی ہنگری کی فوج کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا۔ ہنگری کے سردار نے ان بہادر سرداروں کے ساتھ یہ شریفانہ سلوک کیا کہ غازی مصطفیٰ کے بھائی کو لوہے کی سیخ سے چھید کر درآں حالیکہ وہ زندہ تھا، نرم آنچ پر رکھ کر کباب کی طرح بھنوایا۔ سب سے بڑھ کر قابل ''تعریف'' بات یہ تھی کہ غازی مصطفیٰ کو سیخ کے پھیرتے رہنے اور اپنے بھائی کو خود اپنے ہاتھ سے کباب بنانے پر مجبور کیا گیا تھا۔ اس کے بعد غازی مصطفیٰ کے تمام دانت توڑ کر اور انواع واقسام کی اذیتیں پہنچا کر اور فدیہ لے کر چھوڑا۔ چند برس بعد وہی ہنگری سردار جس نے یہ ظلم وستم روا رکھا تھا، غازی مصطفیٰ کے قبضے میں آ گیا تو غازی مصطفیٰ نے اس کو قتل کر دیا مگر اور کسی قسم کا عذاب نہیں پہنچایا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ عیسائیوں کی قساوت قلبی کس حد تک پہنچی

ہوئی تھی اور ترکوں میں کس قدر شرافت اور پابندی مذہب موجود تھی۔

سلطان بایزید ثانی کے آخر عہد حکومت میں کچھ اندرونی بدنظمی اور پیچیدگی پیدا ہوئی۔ یہ پیچیدگی ولی عہدی کے مسئلہ کی وجہ سے تھی، جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ سلطان بایزید ثانی کے آٹھ بیٹے تھے جن میں سے پانچ تو چھوٹی عمر میں فوت ہو گئے، تین بیٹے جوان ہوئے جن کے نام احمد، قرقود اور سلیم تھے۔ ان میں قرقود سب سے بڑا اور سلیم سب سے چھوٹا تھا۔ سلطان بایزید منجھلے بیٹے احمد کی طرف زیادہ مائل تھا اور اسی کو اپنا ولی عہد بنانا چاہتا تھا۔ احمد اور قرقود اور ان کے بیٹے ایشیائے کوچک میں عامل وفرماں روا تھے۔ علاقہ طرابزون کی حکومت سلیم سے تعلق رکھتی تھی۔ سلیم اپنے دونوں بھائیوں سے زیادہ بہادر وجفاکش اور سلیم الفطرت تھا۔ اس کی بہادری وجفاکشی کے سبب سے تمام فوج اور فوجی سردار سلیم کو سب پر ترجیح دیتے تھے۔ اسماعیل صفوی شاہ ایران نے ایران پر قابض ومسلط ہو کر شیعوں کے گروہ ایشیائے کوچک یعنی عثمانی سلطنت میں پھیلا دیے تھے کہ وہ لوگوں کو شیعیت کی تعلیم دے کر شاہ ایران کے ہمدرد ومعاون بنائیں۔ اس تدبیر کا اثر خاطر خواہ اثر پذیر ہوا اور ایشیائے کوچک میں واقعہ پسند لوگ شاہ ایران کی شہ پا کر قزقی وغارت گری پر مستعد ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس بدامنی وغارت گری کو فرو کرنے کے لیے قرقود، احمد نے، جو ایشیائے کوچک کے غالب حصوں پر حکمران تھے، فوجیں استعمال کیں اور غارت گر گروہوں سے بار بار لڑائیاں ہوئیں۔ رفتہ رفتہ ان قزاقوں اور باغیوں کی ٹولیاں شاہ قلی نام کے ایک شخص کی قیادت میں مجتمع ومنتظم ہو کر ایک زبردست فوج کی شکل میں تبدیل ہو گئیں۔ شاہ قلی، ایران کے بادشاہ اسماعیل صفوی کا مرید وہوا خواہ تھا۔ اس نے سلطنت عثمانیہ کو مشکلات میں مبتلا کرنے کی کوشش میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ بالآخر جب قسطنطنیہ میں ایشیائے کوچک کی بدامنی کے حالات مشہور ہوئے تو سلطان بایزید اس امر پر مجبور ہوا کہ اپنے وزیراعظم کو فوج دے کر مقابلے کے لیے بھیجے۔ چنانچہ وزیراعظم نے پہنچ کر مقام سریمشک پر شاہ قلی (جس کو ترک شیطان قلی کہتے تھے) کا مقابلہ کیا۔ سخت خون ریز جنگ ہوئی اور لڑائی میں سلطانی وزیراعظم اور شاہ قلی دونوں مارے گئے۔ یہ واقعہ سنہ ۹۱۷ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ اس بغاوت اور بدنظمی کا اثر اس علاقے میں زیادہ تھا، جو قرقود اور احمد کے زیر حکومت تھا۔

سلیم جس صوبے کا حاکم تھا، اس صوبہ یعنی طرابزون کے علاقے میں باغیوں کو بدامنی پھیلانے کا کوئی موقع نہیں ملا جو اس بات کی دلیل تھی کہ سلیم بہت مستعد اور مآل اندیش تھا۔ سلیم نے اپنے

علاقے میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے زائد فوج بھرتی کر لی تھی اور جب باغیوں کی طرف سے اس کو اطمینان حاصل ہوا تو اس نے اس فوج کو لے کر سرکیشیا کے علاقے پر حملہ کیا اور فتوحات حاصل کیں۔ یہ خبر سن کر بایزید ثانی نے قسطنطنیہ سے حکم امتناعی جاری کیا کہ تم غیر علاقے پر حملہ آور ہو کر اپنے دائرہ حکومت کو وسعت نہ دو۔ سلیم نے لکھا کہ اگر مجھ کو اس طرف فتوحات حاصل کرنے کی اجازت نہیں تو یہاں سے تبدیل کر کے کسی یورپی صوبے کی حکومت پر نامزد فرما دیجیے تاکہ اس طرف عیسائیوں پر جہاد کرنے کا موقع ملے۔ میں خاموش بیٹھنا اور میدان جنگ سے جدا رہنا پسند نہیں کرتا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ سلطان بایزید ثانی، احمد کو اپنی جانشینی اور قائم مقامی پر نامزد کرنے اور ولی عہد بنانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ سلطان کے اس ارادے سے مطلع ہو کر جاں نثار فوج اور دوسرے فوجی افسروں نے مخالفت کا اظہار کیا۔ ان میں سے بعض تو قرقود کو اس لیے ترجیح دیتے تھے کہ وہ بڑا بیٹا ہے اور بعض سلیم کو اس لیے ولی عہدی کا مستحق جانتے تھے کہ وہ بہادر اور مآل اندیش ہے۔ اس کشمکش کی احمد اور قرقود کو اطلاع ہوئی تو وہ بہ جائے خود اس فکر میں مبتلا ہوئے کہ کس طرح تخت حکومت حاصل کیا جائے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تینوں بھائی الگ الگ اپنی طاقتوں کو بڑھانے اور ایک دوسرے کی مخالفت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ سلطان بایزید ثانی نے اراکین سلطنت اور خود سلیم کی خواہش کے موافق سلیم کو ایک یورپی صوبے موسومہ سمندرا پر نامزد کر دیا۔ سلطان بایزید کے بیٹے چونکہ آپس میں مصروف مسابقت ہو چکے تھے، لہٰذا سلیم نے بھی اپنے بھائیوں کے خلاف سلطنت کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی ضروری سمجھی اور وہ اراکین سلطنت اور فوج کے سرداروں کے ایما پر یورپ میں داخل ہو کر ایڈریانوپل پر قابض ہو گیا۔ سلیم کے ایڈریانوپل آنے کی خبر سن کر بایزید مقابلہ کے لیے روانہ ہوا۔ جب سلطان بایزید مقابلے پر پہنچ گیا تو سلیم کی ہمراہی فوج کے بہت سے آدمی اس کا ساتھ چھوڑ کر سلطان کی فوج میں شامل ہو گئے۔ بایزید کی فوج نے سلیم کو شکست دی اور وہ بہ مشکل جان بچا کر اور ساحل سمندر پر پہنچ کر بہ ذریعہ جہاز اپنے خسر خان کریمیا کے پاس چلا گیا اور وہاں تاتاریوں اور ترکوں کی فوجیں فراہم کرنی شروع کیں۔

ادھر ایشیائے کوچک میں احمد نے فوجیں فراہم کر کے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے اور بایزید کو تخت سلطنت سے اتار دینے کی تیاری کر لی تھی۔ سلطان بایزید اپنے چھوٹے بیٹے سلیم کو ایڈریانوپل سے بھگا کر قسطنطنیہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ احمد حملہ آور ہونے والا ہے۔ یہ حالت دیکھ کر بایزید بہت گھبرایا

اور اراکین سلطنت میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ سلطان واقعی اس قابل نہیں رہا کہ تخت حکومت پر قائم رہے۔ اراکین سلطنت کے مشورے سے یا خود ہی بایزید نے سلیم کے پاس پیغام بھیجا کہ تم اپنی فوج لے کر قسطنطنیہ چلے آؤ اور احمد کے حملے کو روکنے میں سلطانی فوج کے شریک ہو جاؤ۔ سلیم اس حکم کے پہنچنے سے بہت خوش ہوا اور تین چار ہزار آدمی ہمراہ لے کر نہایت سخت مقامات اور دروں کو طے کرتا ہوا بحیرہ اسود کے کنارے چل کر ایڈریانوپل اور وہاں سے قسطنطنیہ کی جانب روانہ ہوا۔ سلیم کے اس طرح پہنچنے کی خبر سن کر بایزید نے اس کے پاس حکم بھیجا کہ اب تمہاری ضرورت نہیں۔ تم کو چاہیے کہ جہاں تک پہنچ چکے ہو، وہیں سے واپس ہو کر صوبہ سمندرا کی طرف چلے جاؤ، جس پر تم نامزد کیے گئے ہو۔ ادھر سے اراکین سلطنت اور فوجی افسروں کے پیغام پہنچے کہ اب آپ ہرگز واپس نہ ہوں بلکہ سیدھے قسطنطنیہ چلے آئیں۔ اس سے بہتر موقع پھر کبھی آپ کے ہاتھ نہ آئے گا۔ چنانچہ سلیم قسطنطنیہ پہنچ گیا۔ سلیم کے قسطنطنیہ پہنچتے ہی تمام رعایا، اراکین سلطنت اور سپہ سالاران افواج نے اس کا استقبال کیا اور قصر سلطانی کے دروازے پر پہنچ کر سب نے بایزید ثانی کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ دربار عام میں ہماری درخواست سن لیں۔ چنانچہ بایزید ثانی نے تخت پر بیٹھ کر دربار عام منعقد کیا۔ اراکین سلطنت، علماء وفقہاء، رعایا کے وکلا، فوج کے سردار سب نے مل کر عرض کیا کہ ہمارا سلطان اب بوڑھا، ضعیف اور ناتواں ہو گیا ہے۔ ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ آپ اب شہزادہ سلیم کو موقع دیں۔ سلطان بایزید نے یہ سنتے ہی بلا تامل کہا کہ میں نے تم سب کی درخواست کو منظور کر لیا اور میں سلیم کے حق میں تخت سے دست بردار ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر تخت سے اتر آیا۔ سلیم نے فوراً آگے بڑھ کر بادشاہ کے شانہ کو بوسہ دیا۔ بایزید نے اس کو مناسب نصیحتیں کیں اور پالکی میں سوار ہو کر چلا۔ سلیم پالکی کا پایہ پکڑے ساتھ ساتھ چلا۔ بایزید اپنی خواہش کے مطابق شہر ڈیموٹیکا میں رہنے اور قیام کرنے کے ارادے سے قسطنطنیہ کو چھوڑ کر روانہ ہوا کہ بقیہ ایام زندگی اسی شہر میں عبادت و خاموشی کی حالت میں گزار دے۔ سلیم شہر کے دروازے تک بہ طریق مشایعت پیدل آیا اور باپ سے رخصت ہو کر واپس ہوا اور تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ بایزید ابھی شہر ڈیموٹیکا تک نہ پہنچا تھا کہ راستے ہی میں فوت ہو گیا۔ سلطان بایزید نے اپنی وفات کے وقت تین بیٹے اور نو پوتے چھوڑے۔ ان پوتوں میں سلیم کا اکلوتا بیٹا سلیمان بھی شامل تھا۔ بایزید نے ۲۵ اپریل سنہ ۱۵۱۲ء مطابق سنہ ۹۱۰ھ میں تخت سلطنت کو چھوڑا اور ۲۹ اپریل سنہ ۱۵۱۲ء کو فوت ہوا۔ سلطان سلیم ابن بایزید ثانی نے قسطنطنیہ

میں تخت سلطنت پر جلوس کیا۔

سلطان سلیم عثمانی:

سلطان سلیم جب قسطنطنیہ میں فوج اور رعایا کی خوشی اور رضا مندی سے تخت نشین ہوا تو اس کے دونوں بھائیوں کو جو ایشیائے کوچک میں برسر اقتدار تھے، مخالفت کی جرأت نہ ہوئی اور انہوں نے بہ ظاہر اپنی رضا مندی کا اظہار کیا اور سلیم کی اطاعت کا اقرار کیا مگر در پردہ مخالفت اور مقابلہ کی تیاری میں مصروف رہے۔ سلیم بھی ایسا بیوقوف نہ تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کے عزائم اور خیالات سے بے خبر رہتا۔ مگر اس نے خود ان کے خلاف کوئی جنگی کارروائی کی ابتداء نہیں کی، یہاں تک کہ احمد نے اماسیہ میں فوجیں فراہم کیں اور رعایا پر بڑے بڑے محصول لگا کر خزانہ فراہم کیا۔ ادھر اس کے بیٹے علاؤالدین نے بروصہ میں باپ کے ایما پر اسی قسم کی تیاریاں کر کے خود مختاری کا اعلان کیا۔ سلطان سلیم نے یہ خبریں سن کر ضروری سمجھا کہ خود ایشیائے کوچک میں جا کر اس بغاوت و سرکشی کا اعلان کرے۔ چنانچہ وہ خود فوج لے کر ایشیائے کوچک میں آبنائے باسفورس کو عبور کر کے داخل ہوا اور بعض جنگی جہاز سمندر کے کنارے کنارے روانہ کیے۔ بروصہ کے قریب علاؤالدین کو مغلوب و گرفتار کر کے بروصہ پر قبضہ کیا اور علاؤالدین اور اس کے بھائی کو قتل کیا۔ یہاں اور بھی شہزادے یعنی سلطان سلیم کے بھتیجے موجود تھے، وہ بھی گرفتار ہو کر مقتول ہوئے۔ یہ خبر سنتے ہی احمد فوج لے کر مقابلہ پر آیا۔ اس لڑائی میں احمد، سلیم سے شکست کھا کر فرار ہوا۔ احمد نے اس شکست کے بعد اپنے دو بیٹوں کو ایران کے بادشاہ اسماعیل صفوی کے پاس بھیج دیا کہ وہاں حفاظت سے رہ سکیں گے اور خود ایشیائے کوچک میں ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا پھرا۔ احمد اور اس کے بیٹے کا یہ انجام دیکھ کر بڑا بھائی قرقود بھی جو ایشیائے کوچک کے شمالی و مشرقی حصے پر حکمران تھا، چوکس ہو گیا۔ سلطان سلیم نے تامل و تساہل کو ضروری نہ سمجھ کر دس ہزار سواروں کے ساتھ اچانک قرقود کے علاقہ پر حملہ کیا۔ قرقود معمولی مقابلے کے بعد گرفتار ہو گیا۔ سلطان سلیم نے اس تخت سلطنت کے دعوے دار کو زندہ رکھنا مناسب نہ سمجھ کر قتل کرا دیا لیکن اس کو اپنے بھائی کے اس طرح مقتول ہونے کا سخت صدمہ ہوا۔ کئی روز تک سوگوار رہا اور کھانا پینا ترک رکھا۔

عثمانی خاندان کے شہزادوں کا اس طرح قتل ہونا عام طور پر لوگوں کے جذبات و ہمدردی کو بھڑکا سکتا تھا۔ اسی لیے اس عرصہ میں احمد نے ایک جمعیت کثیر فراہم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی اور

سلیم کے مقابلہ پر صف آرا ہو کر کئی مرتبہ اس کی فوج کو شکست بھی دی لیکن وہ اپنے بھائیوں کی طرح جلد ہمت ہارنے اور استقلال کا دامن چھوڑنے والا نہ تھا۔ اس نے ایک طرف فوج کی بھرتی جاری کر دی اور دوسری طرف اپنے فوجی نظام کو مضبوط کرنے اور فتح حاصل کرنے کی تدابیر کو کام میں لانے کے لیے مصروف عمل رہا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ احمد کو بھی مغلوب ہو کر گرفتار ہونا پڑا۔ یہ آخری لڑائی جس میں احمد ہزیمت پا کر گرفتار ہوا، سلیم کی تخت نشینی سے پورے ایک سال بعد یعنی ۲۴ اپریل سنہ ۱۵۱۳ء مطابق سنہ ۹۱۹ھ کو ہوئی۔ احمد بھی گرفتار ہو کر قتل کیا گیا۔

سلطان سلیم کے عادات واطوار اور طرز عمل سے یہ بات پورے طور پر ثابت ہو چکی تھی کہ وہ اپنے باپ سے زیادہ بہادر اور اپنے دادا کی طرح اولوالعزم اور بہادر شخص ہے۔ عیسائی سلاطین خود خائف وترساں تھے کہ دیکھئے یہ نیا سلطان ہمارے سر پر کیسی مصیبت لائے؟ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ سلطان سلیم عیسائیوں کی طرف متوجہ ہونے کی نسبت اپنے ہم قوم مسلمانوں کی طرف زیادہ مصروف ومتوجہ رہنا چاہتا ہے تو انہوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ صلح کے عہدناموں پر عمل درآمد جاری رکھا اور سلطان کی مغربی حدود سلطنت پر کسی قسم کی کشمکش پیدا نہ ہوئی۔ سلطان سلیم کو اپنے بھائیوں سے فارغ ہوتے ہی ایران کی سلطنت اور ایشیائے کوچک کے لوگوں سے الجھنا پڑا اور حقیقت یہ ہے کہ سلطان سلیم اگر ایران کی سلطنت کے خلاف مستعدی کا اظہار نہ کرتا تو سلطنت عثمانیہ کے درہم برہم ہو جانے میں کوئی کسر باقی نہ تھی۔ اسماعیل صفوی اپنے آپ کو امام جعفر صادق کی اولاد میں بتاتا تھا۔ اس لیے ایرانی رعایا اس کی اور بھی زیادہ گرویدہ ہو گئی تھی۔ شام اور ایشیائے کوچک میں بھی شیعہ، سنی کے ہنگامے کم نہیں ہوئے تھے۔ ان ملکوں میں شیعہ مذہب کو قبول کرنے کا کچھ نہ کچھ مادہ موجود تھا۔ نیز بہت سے شیعہ ان ملکوں میں سکونت پذیر تھے۔ اسماعیل صفوی کی نانی ایک عیسائی عورت اور طرابزون کے عیسائی بادشاہ کی بیٹی اور حسن طویل کی بیوی تھی۔ لہٰذا اسماعیل صفوی کی خواہش تھی کہ طرابزون میرے قبضے میں آئے۔ حالانکہ وہ عرصہ سے سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا۔ اسماعیل صفوی جیسے اولوالعزم اور زبردست بادشاہ کا سلطنت عثمانیہ کو نفرت و عداوت کی نظر سے دیکھنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اس نے ایران کا تخت حاصل کرنے کے بعد بایزید ثانی کے عہد حکومت میں ایشیائے کوچک کے اندر بدامنی پھیلانے اور شیعہ مذہب کی تلقین کر کے لوگوں کو خفیہ طور پر اپنی طرف مائل کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ ان کارروائیوں کا پورا پورا سدباب بایزید ثانی کی

حکومت نے نہیں کیا اور اس کے دونوں بیٹوں نے جو ایشیائے کوچک میں بہ طور عامل حکمران تھے، اس خفیہ اشاعتی کام کا مطلق احساس نہیں کیا۔ مگر سلیم جو طرابزون کا حاکم تھا، اسماعیل صفوی کی ریشہ دوانیوں کو خوب محسوس کر چکا تھا اور اسی لیے اس نے اپنے ماتحت صوبے میں اسماعیل صفوی کی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔ اسماعیل صفوی، سلطان بایزید ثانی ہی کے عہد حکومت میں بعض سرحدی علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا اور عثمانی سلطنت کے عمال جب ان علاقوں کو واپس نہ لے سکے تو بایزید ثانی نے اس طرف کچھ زیادہ التفات نہیں کیا۔ جب سلطان سلیم اپنے بھائیوں اور بھتیجوں سے ایشیائے کوچک میں برسرِ پیکار تھا تو شاہ اسماعیل صفوی اس خانہ جنگی کو بڑے اطمینان سے دیکھ رہا تھا اور اس نے شہزادہ احمد برادر سلطان سلیم کو سلیم کے خلاف اپنے ان داعیوں کے ذریعہ جو ایشیائے کوچک میں کام کر رہے تھے، خوب امداد پہنچائی تھی۔ اسی لیے احمد اس قابل ہو گیا تھا کہ اس نے سلطان سلیم کی فوج کو شکست بھی دے دی تھی۔ اب سلطان سلیم نے دیکھا کہ اسماعیل صفوی کے پاس شہزادہ احمد کا بیٹا مراد یعنی سلیم کا بھتیجا موجود ہے اور اسماعیل اس کوشش میں مصروف ہے کہ مراد کو اپنی زبردست فوج دے کر ایشیائے کوچک پر حملہ کرائے اور خود اس کے ساتھ شریک ہو کر اس کو قسطنطنیہ کے تخت پر بٹھائے، تو وہ اس خطرے سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ دوسری طرف اس نے دیکھا کہ ایشیائے کوچک کے قصبوں، شہروں اور گاؤں میں بڑے زور شور سے شیعہ، سنی مذہب کے جھگڑے برپا ہیں جو اسماعیل صفوی کے پیدا کیے ہوئے تھے۔ سلطان سلیم نے بھائیوں کے قتل سے فارغ ہو کر اور قسطنطنیہ واپس آ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایشیائے کوچک میں ایک زبردست خفیہ محکمہ قائم کیا اور حکم دیا کہ ان لوگوں کی نہایت صحیح اور مکمل فہرست تیار کی جائے جو اسماعیل صفوی کے منادوں کی تعلیم سے اپنے پرانے عقیدے کو ترک کر کے شیعہ مذہب اختیار کر چکے ہیں اور ساتھ ہی اسماعیل صفوی کو اپنا مذہبی پیشوا مانتے اور اس پر نثار ہونے کے لیے تیار ہیں۔ یہ فہرست بہت جلد تیار ہو کر سلطان کی خدمت میں پیش ہوئی تو معلوم ہوا کہ ایشیائے کوچک میں ستّر ہزار آدمی ایسے موجود ہیں جو اسماعیل صفوی کے حملہ آور ہوتے ہی بلا توقف مسلح ہو کر بغاوت پر آمادہ اور سلطان عثمانی کے خلاف شمشیر زنی میں مطلق کوتاہی نہ کریں گے۔ جب اس عظیم الشان سازش اور اس کے خطرناک نتائج پر سلیم نے نظر ڈالی تو اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور مطلق اظہار بیتابی نہ کیا بلکہ نہایت احتیاط اور انتظام کے ساتھ ان تمام مرکزی مقاموں پر

جہاں جہاں ان غدار اور باغی لوگوں کی کثرت تھی، باغیوں کی تعداد کے مساوی فوج بھیج دی اور ہر جگہ کی فوج کے افسروں کو وہاں کے غداروں کی فہرست دے کر حکم دیا کہ فلاں تاریخ کو ہر ایک باغی کے لیے ایک ایک سپاہی کو نامزد کر دو اور سمجھا دو کہ تاریخ و وقت مقررہ پر اس شخص کو قتل کر دینا تمہارا فرض ہے۔ ساتھ ہی اس بات کی بھی سخت تاکید کی کہ قبل از وقت یہ راز افشا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ اس حکم کی بڑی احتیاط کے ساتھ تعمیل ہوئی اور ایک ہی تاریخ اور ایک ہی وقت مقررہ پر ایشیائے کوچک کے طول و عرض میں چالیس پچاس ہزار کے قریب باغی اس طرح قتل ہوئے کہ کسی عثمانی سپاہی کو کوئی چشم زخم نہیں پہنچا۔ ان لوگوں کا بیک وقت اس طرح ہلاک ہونا شیعوں کے لیے بڑا ہیبت ناک واقعہ تھا۔ جو لوگ باقی رہ گئے ہوں گے، ان کی ہمتیں پست ہو گئیں اور وہ مرعوب و خائف ہو کر اپنے فاسد خیالات سے خود بہ خود ہی تائب ہو گئے۔ اسماعیل صفوی کی سازش کو اس طرح ناکام بنانا سلطان سلیم کی بڑی عظیم الشان فتح تھی لیکن اسماعیل صفوی اس خبر کو سن کر بہت ہی پیچ و تاب میں آیا مگر صاف لفظوں میں کوئی شکایت نہ کر سکا۔ آخر وہ ضبط نہ کر سکا اور اس نے فوجوں کی فراہمی اور سامان جنگ کی درستی کا حکم عام جاری کر کے اعلان کیا کہ ہم ایشیائے کوچک پر اس لیے حملہ آور ہونے والے ہیں کہ شہزادہ مراد بن احمد عثمانی کو اس کا آبائی تخت دلائیں اور سلیم عثمانی کو گرفتار کر کے معزول کر دیں۔ یہ خبر سن کر سلیم عثمانی نے دربار عام میں اپنے اراکین سلطنت اور فوجی سرداروں کو مخاطب کر کے کہا کہ ہم ملک ایران پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ اس زمانے میں اسماعیل صفوی کی طاقت و ہیبت کے افسانے اس قدر مشہور ہو چکے تھے کہ خود ترکی فوج بھی اس سے شکست پائی ہوئی تھی۔ نیز ترکستان کے بادشاہ شیبانی خان کو اسماعیل صفوی قتل کر چکا تھا۔ لہٰذا حاضرین دربار اسماعیل صفوی پر چڑھائی کرنے کو بہت ہی خطرناک اقدام تصور کرتے تھے۔ چنانچہ سب کے سب خاموش اور دم بہ خود رہے۔ سلطان نے تین مرتبہ یہی لفظ کہے اور ہر مرتبہ خموشی کے سوا کوئی لفظ کسی سے نہ سنا۔ آخر اس خموشی کو عبداللہ نامی ایک دربان نے جو سامنے خدمت پر مامور و موجود تھا، اس طرح قطع کیا کہ وہ آگے بڑھا اور سلطان کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر مودبانہ عرض کیا کہ میں اور میرے ساتھی سلطانی جھنڈے کے نیچے ایران کے بادشاہ سے لڑیں گے اور خوب داد شجاعت دے کر ایرانیوں کو شکست فاش دیں گے یا میدان میں مارے جائیں گے۔ سلطان، عبداللہ کے اس کلام کو سن کر بہت خوش ہوا اور اسی وقت اس کو دربانی کے عہدے سے ترقی دے کر ایک ضلع کا کلکٹر بنا دیا۔

اس کے بعد دوسرے سرداروں کو بھی جرأت ہوئی اورانہوں نے اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔ شاہ اسماعیل صفوی اور سلطان سلیم عثمانی کی لڑائیوں کا حال لکھنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیل صفوی اوراس کے بادشاہت تک پہنچنے کا حال بیان کردیا جائے۔

اسماعیل صفوی کا حال:

اسماعیل صفوی کا سلسلہ نسب اس طرح ہے: اسماعیل بن حیدر بن جنید بن ابراہیم بن خواجہ علی بن صدرالدین بن شیخ صفی الدین بن جبرئیل۔ اس خاندان میں سب سے پہلے جس شخص نے شہرت و ناموری حاصل کی، وہ شیخ صفی الدین تھا جواردبیل میں سکونت پذیر اور پیری مریدی کرتا تھا۔ اسی کے نام سے اس خاندان کا نام صفوی خاندان مشہور ہوا۔ جب شیخ صفی الدین کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے صدرالدین نے باپ کا خرقہ سنبھالا اور اپنے باپ کے مریدین اور حلقہ اثر میں پیرطریقت تسلیم کیا گیا۔ شیخ صدرالدین، سلطان بایزید یلدرم اور تیمور کا ہم عصر تھا۔ تیمور نے سنہ ۸۰۴ھ میں سلطان بایزید یلدرم کو شکست دے کر گرفتار کیا تو اس کے ساتھ اور بھی بہت سے ترک سپاہی اس لڑائی میں قید ہوئے۔ تیمور اس فتح کے بعد اردبیل پہنچا تو وہاں عقیدتاً یا مصلحتاً شیخ صدرالدین کی خانقاہ میں بھی گیا اور شیخ سے کہا کہ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو یا کوئی کام میرے کرنے کا ہو تو فرمائیے، میں اس کو ضرور پورا کروں گا۔ شیخ صدرالدین نے کہا کہ جنگ انگورہ میں جس قدر ترک سپاہی تم نے قید کیے ہیں، ان سب کو رہا کردو۔ تیمور نے فوراً ان کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔ یہ ترک قیدی آزاد ہوتے ہی شیخ کے مرید ہوگئے اور اردبیل ہی میں طرح اقامت ڈال کر شیخ صدرالدین کی خدمت گزاری میں مصروف رہنے لگے۔ شیخ صدرالدین نے چونکہ سفارش کرکے ان کو آزاد کرایا تھا، اس لیے انہوں نے احسان کا بدلہ یہی مناسب سمجھا کہ شیخ کے مریدوں میں شامل ہوکر اپنی بقیہ زندگی شیخ کی خدمت میں گزاریں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، ان ترک قیدیوں کی اولاد بڑھتی گئی اور ساتھ ہی ان کی عقیدت وفرماں برداری شیخ اور شیخ کی اولاد کے ساتھ ترقی کرتی گئی۔ تیمور کی وفات کے بعد تیموری سلطنت اس کی اولاد میں تقسیم ہوکر پارہ پارہ ہوگئی تھی۔ بحیرہ قزوین اور بحیرہ اسود کے درمیانی علاقے یعنی آذربائیجان میں ترکمانوں کے قبیلہ قراقونیلو نے تیمور کے بعد ہی اپنی حکومت دوبارہ قائم کر لی تھی۔ اس طرح کردستان یعنی عراق کا شمالی حصہ ترکمانوں کے دوسرے قبیلہ آق قونیلو کے حصہ میں آ گیا۔ ترکمان آق قونیلو کردستان میں تیمور ہی کے زمانہ سے بہ طور باج گزار فرماں روا تھے۔

قراقونیلو کا سردار قرا یوسف ترکمان تیمور سے برسر پرخاش اور اس کی زندگی میں مصر وغیرہ کی طرف فرار رہا۔ تیمور کی وفات کا حال سنتے ہی واپس آ کر آسانی سے آذربائیجان پر قابض ومتصرف ہو گیا۔اردبیل آذربائیجان کا حاکم نشین شہر تھا اور کردستان کا دارالسلطنت دیار بکر تھا۔ شیخ صدرالدین کا پڑپوتا شیخ جنید تھا۔ شیخ جنید کے زمانے میں مریدوں کی اس قدر کثرت ہوئی کہ جہاں شاہ ابن قرا یوسف ترکمان بادشاہ آذربائیجان نے متوہم ہو کر شیخ جنید کو حکم دیا کہ آپ اردبیل سے چلے جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں شیخ جنید اپنے مریدوں کے ساتھ جو قریباً سب انہیں مذکورہ ترک قیدیوں کی اولاد تھے، اردبیل سے رخصت ہو کر دیار بکر کی طرف روانہ ہوا۔ دیار بکر یعنی کردستان کا بادشاہ اس زمانے میں حسن طویل آق قونیلو تھا۔ اس نے جب شیخ جنید کے اس طرح آنے کا حال سنا تو بہت خوش ہوا اور نہایت عزت واحترام کے ساتھ شیخ کا استقبال کیا اور عزت وآرام کے ساتھ شیخ اور اس کے مریدوں کو ٹھہرایا۔

چند روز کے بعد حسن طویل نے اپنی بہن کی شادی شیخ جنید سے کر دی۔ ترکمانوں کے ان دونوں قبیلوں یعنی آق قونیلو اور قراقونیلو میں قدیمی رقابت چلی آتی تھی۔ اب چونکہ شیخ جنید ایک درویش گوشہ نشین کی حیثیت سے تبدیل ہو کر شاہی خاندان کے قریبی رشتہ دار بن چکا تھا اور ریاست وحکومت اس کے گھر میں داخل ہو چکی تھی، لہٰذا اس نے اپنے مریدوں کو جو ترک سپاہیوں کی اولاد تھے، درویشوں سے سپاہیوں کی شکل میں تبدیل کر دیا اور ایک فوج ترتیب دے کر حسن طویل کے مشورے سے اردبیل پر حملہ کیا۔ چونکہ اردبیل کے بادشاہ نے شیخ کو اردبیل سے خارج کیا تھا، اس لیے یہ حملہ آوری اور فوج کشی انتقاماً سمجھی گئی اور شیخ کے مریدوں یا دوسرے لوگوں کو زیادہ عجیب معلوم نہ ہوئی۔ شیخ کا جب جہان شاہ سے مقابلہ ہوا تو شیخ کو جو ایک ناتجربہ کار سپہ سالار تھا، فرار ہونا پڑا۔ وہاں سے فرار ہو کر شیخ حاکم شیروان پر جا چڑھا جو جہان شاہ کا حلیف اور دوست تھا مگر جب شاہ شیروان کی فوج سے مقابلہ ہوا تو شیخ کو پھر شکست ہوئی اور اسی افراتفری میں کہ شیخ اپنی جان بچا کر لے جانے کی فکر میں تھا، ایک تیر آ کر لگا اور شیخ نے سفر آخرت اختیار کیا۔

شیخ جنید کے مارے جانے پر اس کا بیٹا حیدر جو سلطان حسن طویل کا بھانجا تھا، باپ کی جگہ گدی نشین اور زہد وارشاد کے سلسلے کا پیر تسلیم کیا گیا۔ حیدر ماں کی جانب سے شہزادہ اور باپ کی جانب سے درویش تھا۔ اس میں امارت اور طریقت دونوں چیزیں جمع ہو گئیں۔ اس کے گرد شیخ جنید سے بھی

زیادہ مریدوں کا ہجوم ہو گیا۔ شیخ جنید کی وفات کے بعد امیر حسن طویل نے جہان شاہ سے عارضی صلح کر لی اور مرزا ابوسعید تیموری کو قتل کر کے خراسان کا ملک اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد ہی امیر حسن طویل نے جہان شاہ سے آذر بائیجان کا ملک بھی چھین لیا اور تمام ملک ایران کا ایک زبردست بادشاہ بن گیا۔ اس کے بعد حسن طویل بادشاہ ایران نے اپنی بیٹی کی شادی اپنے بھانجے شیخ حیدر سے کر دی۔ اس طرح شیخ حیدر شاہ ایران کا ہمشیر زادہ تھا۔ اب داماد بھی بن گیا۔ حسن طویل نے طرابزون کے عیسائی بادشاہ کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ طرابزون کی حکومت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس عیسائی حکومت کو سلطان محمد خان ثانی فاتح قسطنطنیہ نے سنہ ۸۶۶ھ میں فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ حسن طویل کی اس عیسائی بیوی کے پیٹ سے یہ لڑکی پیدا ہوئی تھی جس کا نام پارسا اور بقول بعض شاہ بیگم رکھا گیا تھا۔ اسی کی شادی شیخ حیدر سے کی گئی تھی۔ جس کے پیٹ سے شیخ حیدر کے تین بیٹے علی، ابراہیم اور اسماعیل پیدا ہوئے۔ حسن طویل کی زندگی میں شیخ حیدر بالکل خاموش رہا لیکن جب حسن طویل فوت ہوا اور اس کا بیٹا امیر یعقوب ایران کے تخت پر بیٹھا تو شیخ حیدر نے اپنے مریدوں کی ایک فوج تیار کی اور دوسرے لوگوں کو بھی اپنی فوج میں بھرتی کرنے کے لیے ترغیب دی تاکہ شاہ شیروان سے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لے۔ حسن طویل کی زندگی میں خاموش رہنے کا سبب یہ تھا کہ شیخ جنید کے مارے جانے پر حسن طویل نے جس طرح جہان شاہ سے صلح کر لی تھی، اسی طرح شاہ شیروان سے بھی اس نے صلح کی تھی اور شاہ شیروان نے ابوسعید مرزا تیموری کو قتل کرنے میں حسن طویل کی بہت مدد کی تھی۔ اس لیے حسن طویل کی زندگی تک شیروان کے بادشاہ سے اس کی صلح قائم رہی اور اسی لیے شیخ حیدر، شاہ شیروان کے خلاف کسی کارروائی پر آمادہ نہ ہو سکا۔ اب شیخ حیدر نے شیروان پر حملہ کیا۔ شیروان میں کئی سو سال سے ایک ایرانی خاندان کی حکومت چلی آتی تھی، جو اپنے آپ کو بہرام چوبین کی اولاد میں بتاتے تھے۔ شیروان کے بادشاہ کا نام فرخ یسار تھا۔ فرخ یسار نے جب سنا کہ شیخ حیدر اپنے خون کا بدلہ لینے آیا ہے تو وہ بھی مقابلہ پر مستعد ہو گیا اور سنہ ۸۹۳ھ میں جب دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا تو شیخ حیدر بھی باپ کی ہزیمت پا کر مارا گیا۔ اس کی لاش کو لوگوں نے اردبیل میں لے جا کر دفن کر دیا۔

شیخ حیدر کے بعد اس کے مریدوں نے اس کے بڑے لڑکے علی کو جو جوان ہو چکا تھا، اپنا پیر بنایا اور باپ کی گدی پر بٹھایا۔ علی کے گرد بھی مریدوں کا بہت ہجوم رہنے لگا۔ امیر یعقوب نے جو حسن

طویل کے بعد ایران کا فرماں روا تھا، یہ دیکھ کر کہ علی بھی اپنے باپ اور دادا کی طرح شیروان پر چڑھائی کرنے کی تیاری کرے گا اور اس طرح ملک میں خواہ مخواہ فتنہ پیدا ہوگا، فرخ یسار شاہ شیروان سے حسن طویل کے زمانے کی صلح کو قائم رکھنا مناسب سمجھا اور علی اور اس کے بھائیوں کو اصطخر کے علاقے میں ایک قلعہ کے اندر نظر بند کر دیا۔ یہ تینوں بھائی چار سال سے زیادہ عرصہ تک اس قلعہ میں قید رہے۔ جب امیر یعقوب بیگ فرماں روائے ایران فوت ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا الوند بیگ تخت نشین ہوا تو علی مع اپنے بھائیوں کے قید خانہ سے فرار ہوا اور اردبیل پہنچ کر مریدین کی فراہمی میں مصروف ہوا۔ الوند بیگ نے یہ خبر سن کر اور علی کو آمادہ بغاوت دیکھ کر اس کی تادیب اور گرفتاری کے لیے فوج بھیجی۔ علی نے اس فوج کا مقابلہ کیا اور باپ دادا کی طرح شکست کھا کر مارا گیا۔

اس کے دونوں چھوٹے بھائی ابراہیم اور اسماعیل لباس بدل کر اردبل سے گیلان کی طرف بھاگے۔ ابراہیم گیلان پہنچ کر فوت ہو گیا۔ صرف اسماعیل جو سب سے چھوٹا اور ابھی بچہ ہی تھا، باقی رہ گیا۔ الوند بیگ نے اسماعیل کو کم عمر اور کم حوصلہ سمجھ کر اس کے حال سے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ آزاد رہنے دیا۔ اسماعیل کے گرد اس کے خاندان کے باوفا مرید پھر آ کر جمع ہو گئے۔ سنہ ۹۰۶ھ میں جبکہ اسماعیل کی عمر چودہ سال کی تھی، اس کے مریدوں کا جو ہمہ اوقات مسلح رہتے تھے، اس پر ہجوم ہو گیا کہ ایک نہایت زبردست اور شائستہ فوج مرتب ہوگئی۔ اسماعیل اپنے مریدوں کی اس زبردست فوج کو لے کر یکا یک شیروان پر حملہ آور ہوا اور اتفاقاً فرخ یسار فرماں روائے شیروان لڑائی میں مارا گیا۔ اسماعیل اور اس کے ساتھیوں کے حوصلے اب دو چند ہو گئے۔ اسماعیل کی اس فتح کا حال الوند بیگ نے سنا تو وہ چونک پڑا اور اس نے اسماعیل کے خطرے کو فوراً دور کرنا ضروری سمجھ کر اپنی حاضر رکاب تھوڑی سی فوج لے کر بلاتوقف کوچ کر دیا۔ الوند بیگ سے یہ بہت بڑی غلطی ہوئی کہ اس نے اسماعیل کی طاقت کا صحیح اندازہ کرنے اور اپنی طاقت کو مجتمع کرنے کے لیے مطلق توقف نہیں کیا۔ اس عجلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اسماعیل سے مقابلہ ہوا تو الوند بیگ بھی مارا گیا۔ اس کے بعد قبیلہ آق قونیلو کے ایک اور سردار مراد بیگ نے ہمدان کے قریب اسماعیل کا مقابلہ کیا مگر وہ بھی مغلوب ہوا۔ ان پیہم فتوحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمام عراق وایران اور آذربائیجان وغیرہ اسماعیل کے قبضے میں آ گئے۔ چار برس پہلے سنہ ۹۰۳ھ میں جو شخص گیلان کے اندر ایک خستہ حال فقیر کی زندگی بسر کرتا تھا، اب صاحب گنج واورنگ اور مالک ملک ولشکر ہو گیا۔ ترکی سپاہیوں کی اولاد نے بھی خوب

ہی حق وفاداری ادا کیا اور اپنے محسن صدرالدین اردبیلی کی اولاد کو بادشاہ ہی بنا کر چھوڑا۔ کس قدر حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ جن لوگوں کی مسلسل پامردی و جواں مردی نے اسماعیل بن حیدر صفوی کو ایران کا بادشاہ بنایا، انہیں کی ہم قوم سلطنت عثمانیہ کا اسماعیل صفوی بلا وجہ دشمن بن گیا۔ اسماعیل صفوی کو چونکہ ابتداء ہی سے پیہم فتوحات حاصل ہوئی تھیں، اس لیے آئندہ فتوحات اور لڑائیوں میں یہ شہرت بہت مفید ثابت ہوئی اور دوسرے بادشاہ عام طور پر اس سے مرعوب نظر آنے لگے۔ اگر اسماعیل صفوی، سلطان سلیم ثانی کے ملک میں اپنی خفیہ سازشوں کا جال نہ پھیلاتا اور سلطان عثمانی ثانی سے صلح و صفائی رکھنا ضروری سمجھتا تو یقیناً سلیم یورپ کی طرف متوجہ ہوتا اور اس طویل زمانے کی مہلت جو بایزید ثانی کے عہد حکومت میں عیسائی بادشاہوں کو حاصل رہی، ختم کر کے تمام یورپ کو فتح کرتا ہوا اندلس تک جا پہنچتا لیکن اسماعیل صفوی نے سلیم کو یورپ والوں کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس نے عیسائی سلاطین کے ساتھ صلح کے عہد ناموں کی تجدید کر کے اس طرف سے اطمیان حاصل کیا اور یورپ والوں کو اور بھی آٹھ دس سال کی مہلت مل گئی، جس میں وہ اپنے آپ کو خوب طاقتور بنا کر اپنی حفاظت کی تدابیر سوچ سکے۔

جنگ خالدران:

اسماعیل صفوی کی جنگی تیاریوں کا حال سن کر یوم پنج شنبہ ماہ ربیع الاول سنہ ۹۲۰ھ مطابق ۲۰ اپریل سنہ ۱۵۱۴ء کو سلطان سلیم نے مقام ینی شہر سے جہاں فوجیں جمع ہوئی تھیں، مع فوج کوچ کیا۔ ینی شہر، درہ دانیال کے یورپی ساحل پر ایک مقام کا نام ہے۔ ایشیائے کوچک میں داخل ہو کر ایک ہفتہ کے بعد ۲۷ اپریل کو سلطان سلیم کی خفیہ پولیس نے شاہ اسماعیل صفوی کے ایک جاسوس کو گرفتار کیا۔ یہ جاسوس جب سلطان سلیم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اس نے اس کو کوئی سزا نہ دی بلکہ ایک خط شاہ اسماعیل کے نام لکھ کر اس جاسوس کو دیا کہ یہ خط اپنے بادشاہ کے پاس پہنچا دو۔ اسی کے ساتھ اپنا ایلچی بھی ایران کی طرف روانہ کیا۔ سلطان سلیم نے اس خط میں حمد و نعت کے بعد لکھا تھا کہ:

> ''میں سلطنت عثمانیہ کا سلطان'' بہادروں کا سردار، بت پرستوں اور سچے مذہب کے دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے والا سلیم خان بن سلطان بایزید خان بن سلطان محمد خان بن سلطان مراد خان، تجھ لشکر ایران کے سردار امیر اسماعیل سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام تغیر

اور سفاہت سے بری ہے مگر اس میں بے انتہا راز ہیں جس کو انسانی عقل نہیں سمجھ سکتی۔ اس باری تعالیٰ نے انسان کو زمین پر خلیفہ بنایا کیونکہ انسان ہی میں روحانی و جسمانی قوتیں مجتمع ہیں اور انسان ہی ایسا حیوان ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کو سمجھ سکتا ہے اور اس کی اعلیٰ خوبیوں کی وجہ سے پرستش کرتا ہے۔ انسان کو سوائے دین اسلام کے اور کسی مذہب میں سچا اور صحیح علم حاصل نہیں ہوسکتا اور نبی ﷺ کی پیروی واطاعت کے بغیر کامیابی کا راستہ ہاتھ نہیں آ سکتا۔ اے امیر اسماعیل! یاد رکھ! تو ہرگز فوز وفلاح کو نہیں پہنچ سکتا کیونکہ تو نے طریقہ نجات کو چھوڑ کر اور احکام شرع کی خلاف ورزی کر کے اسلام کے پاک اصولوں کو ناپاک کر دیا ہے۔ تو نے عبادت گاہوں کو مسمار کر دیا۔ ناجائز اور خلاف شرع تدبیروں سے تو نے مشرق میں تخت حکومت حاصل کیا، تو صرف مکر اور حیلوں سے اس مرتبہ کو پہنچا ہے، تو نہایت ذلیل حالت سے اس جاہ وحشمت تک پہنچا ہے، تو نے مسلمانوں پر بے رحمی اور ظلم کے دروازے کھول دیے۔ تو نہ صرف جھوٹا بے رحم اور مرتد ہے بلکہ بے انصاف، بدعتی اور کلام الٰہی کی بے عزتی کرنے والا ہے۔ تو نے کلام الٰہی میں ناجائز تاویل کو دخل دے کر اسلام میں نفاق اور تفرقہ ڈالا ہے، تو نے ریاکاری کے پردہ میں ہر طرف فتنہ وفساد اور مصیبت کے بیج بو دیے اور بے دینی کا علم بلند کر دیا ہے۔ تو نے نفس امارہ سے مغلوب ہو کر بہت بڑی زیادتیاں اور معیوب باتیں کی ہیں اور سچے خلفاء یعنی ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم پر تبرا کہنے کی تو نے سب کو اجازت دے رکھی ہے۔ ہمارے علماء دین نے تیرے قتل کا فتویٰ دے دیا ہے کیونکہ تو کفریہ کلمات اور کفریہ حرکات کا مرتکب ہے۔ علماء دین نے یہ بھی فتویٰ دیا ہے کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ حفاظت دین کے لیے مستعد ہو اور تجھ میں اور تیرے معتقدین میں جو ناپاکی ہے، وہ نیست و نابود کر دی جائے۔ علمائے دین کے اس ارشاد پر جو عین قرآن کے مطابق ہے، نیز اس خیال سے کہ دین اسلام کو تقویت ہو اور ان ملکوں اور ان لوگوں کو جو تیرے ہاتھوں سے نالاں ہیں، کس طرح رہائی ملے؟ ہم نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ لباس شاہانہ کو اتار کر زرہ بکتر پہن لیں اور اپنے جھنڈے کو جو آج تک ہمیشہ فتح یاب رہا ہے، میدان جنگ میں نصب کر دیں اور انتقام لینے والی تلوار کو غیظ وغضب کے میان سے نکالیں اور ان سپاہیوں کو لے کر جن کی تلواریں زخم کاری لگاتی اور جن کے نیزے اعداء کے جگر کو

توڑ کر پار نکل جاتے ہیں، تجھ پر حملہ آور ہوں۔ ہم نے آبنائے کو عبور کر لیا ہے اور امید کامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دستگیری سے تیرے ظلم و فساد کو بہت جلد فرو کر دیں گے اور فخر اور رعونت کی بو جو تیرے دماغ میں سمائی ہے اور جس کے سبب سے تو آوارگیوں میں مبتلا اور کبائر کا مرتکب ہوا ہے، نکال باہر کریں گے۔ تیری خوف زدہ رعایا کو تیرے ظلم سے بچائیں گے اور تیرے برپا کیے ہوئے فتنہ و فساد کے بگولوں میں تجھ کو برباد کر دیں گے۔ مگر باوجود اس کے چونکہ ہم لوگ احکام شرع کے پابند ہیں، اس لیے ہم نے ضروری سمجھا کہ لڑائی کے شروع ہونے سے پہلے تیرے سامنے قرآن مجید رکھیں اور تجھ کو سچا دین قبول کرنے کی نصیحت کریں۔ اس لیے ہم یہ خط تجھ کو تحریر کر رہے ہیں۔ برائی سے بچنے کا سب سے اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اعمال کا خود محاسبہ کر کے صدق دل سے تائب ہو اور آئندہ کے لیے اپنی بداعمالیاں ترک کر دے۔ نیز جو ملک تو نے ہماری سلطنت سے نکال کر اپنی سلطنت میں ملا لیا ہے، اس سے دست بردار ہو کر ہمارے صوبہ داروں کو اس پر قبضہ دلا دے۔ اگر تجھ کو اپنی حفاظت اور اپنا آرام منظور ہے تو ان احکام کو تعمیل کرنے میں ہرگز تاخیر نہ کر لیکن اگر تو شامت اعمال کی وجہ سے اپنے باپ دادا کی طرح ان بدافعال اور غلط طریقہ کو نہ چھوڑے گا اور اپنی بہادری اور قوت کے گھمنڈ میں شیوہ ظلم و ناانصافی کو ترک نہ کرے گا تو دیکھ لینا! تھوڑے دنوں میں تمام میدان ہمارے خیموں سے پٹ جائیں گے اور ہم اپنی شجاعت کے عجیب و غریب تماشے تجھے دکھائیں گے۔ اس وقت دنیا دیکھ لے گی کہ اللہ تعالیٰ جو سب سے بڑا منصف ہے، کیا فیصلہ صادر فرماتا ہے، وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔"

جیسا کہ سلطان سلیم کے اس خط میں اشارہ موجود ہے کہ شاہ اسماعیل نے یہ بھی سخت نامعقول حرکت کی تھی کہ اپنی رعایا کے تمام سنی لوگوں کے مقبرے اور مسجدیں مسمار کرا کر سنیوں کو حد سے زیادہ ذلیل اور تنگ کر رکھا تھا۔ خود اسماعیل کے باپ دادا شیعہ نہ تھے بلکہ وہ عثمانیوں کی طرح اہل سُنّت والجماعت طریقے پر عامل تھے۔ شیخ جنید کے زمانہ سے جبکہ جنگی کارروائیوں کا سلسلہ اس خاندان نے شروع کیا تو لوگوں کو محبت اہل بیت کی ترغیب دینی شروع کی کیونکہ اس طرح ان کو کامیابی کی زیادہ توقع تھی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ بہت جلد اسی شیعہ مسلک پر سیاسی اغراض کی وجہ سے قائم ہو گئے، جو ان سے پہلے شیعوں نے اپنا دستور العمل بنایا تھا۔ اسماعیل صفوی نے اس معاملے میں سب

سے زیادہ غلو اختیار کیا اور بادشاہ ہو کر اپنی تمام قلمرو میں شیعہ مذہب کی اشاعت شروع کر دی۔ چونکہ ایرانیوں میں پہلے سے اس مذہب کو قبول کرنے کا مادہ موجود تھا، اس لیے اس کو بڑی کامیابی ہوئی۔ جن راسخ العقیدہ مسلمانوں نے شیعیت سے انکار کیا، ان پر مصائب کے پہاڑ توڑ دیے گئے اور ساتھ ہی یہ اشاعتی کام قلمرو عثمانی میں بھی شروع کر دیا۔ سلطان بایزید نے تو کوئی انتظام نہ کیا لیکن سلطان سلیم نے اس طرف فوری توجہ مبذول کر کے اس فتنہ کا استیصال کر دیا، جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ سلطان سلیم عثمانی نے مذکورہ خط کے ساتھ اپنا ایک ایلچی بھی بھیجا اور اس کو سمجھا دیا کہ اگر شاہ اسماعیل راہ راست پر آ جائے اور ہماری باتوں کو مان لے تو اس سے کہا جائے کہ وہ شہزادہ مراد کو جو اس کے پاس پناہ گزیں ہے، ہمارے پاس بھیج دے۔ اسماعیل صفوی نے اس خط کو پڑھ کر سلطان سلیم کے ایلچی کو فوراً شہزادہ مراد کے سپرد کر دیا اور اس نے اسماعیل صفوی کے اشارے کے موافق اس ایلچی کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ یہ حرکت اسماعیل صفوی کی بہت ظالمانہ اور مراسم شاہانہ کے خلاف تھی۔ پھر اسماعیل نے سلطان سلیم کے خط کا جواب لکھ کر اس کے پاس روانہ کیا۔ اس خط میں اسماعیل صفوی نے لکھا کہ:

> ''میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ اس قدر ناخوش اور برافروختہ کیوں ہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افیم کے نشے میں یہ خط لکھا گیا ہے۔ آپ کو اگر لڑنا ہی منظور ہے تو میں بھی ہر طرح سے تیار ہوں۔ جو کچھ اللہ کی مرضی ہے، اس کا بہت جلد ظہور ہو جائے گا اور جب میدان میں مقابلہ ہو گا، تب آپ کو قدر و عافیت معلوم ہو گی۔''

اس خط کے ساتھ اسماعیل صفوی نے افیون کا ایک ڈبہ بہ طور تحفہ سلطان سلیم کے پاس بھیجا جس سے مقصود یہ تھا کہ تم افیون کھانے کے عادی ہو اور اسی کے نشے میں ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ لہٰذا افیون کے تحفے کو بہت پسند کرو گے۔ سلطان سلیم اس خط اور افیون کو دیکھ کر بہت غیظ و غضب میں آیا اور اپنے ایلچی کے قصاص میں اس نے اسماعیل صفوی کے ایلچی کو قتل کرا دیا اور اپنے لشکر کا خوب بندوبست کر کے تبریز کی جانب (جو اسماعیل صفوی کا دارالسلطنت تھا) روانہ ہوا۔ شہر سیواس میں پہنچ کر سلیم نے اپنی فوج کی موجودات لی تو اسی ہزار سوار اور چالیس ہزار پیدل تھے۔ اس نے سیواس سے قیصریہ تک چالیس ہزار پیدلوں کو تقسیم کر کے ہر منزل پر ایک مناسب تعداد متعین کر دی اور حکم دیا کہ جب سلطانی لشکر قیصریہ سے ایک منزل آگے بڑھے تو ہر منزل کی متعینہ فوج ایک ایک

منزل آگے بڑھ جائے اور سب سے پچھلا دستہ جو سیواس میں متعین ہے، سیواس کو چھوڑ کر اگلی منزل میں پہنچ جائے۔ یہ انتظام اس نے اس لیے کیا کہ سامان رسد کے پہنچنے میں آسانی رہے لیکن جوں ہی سلطان سلیم اپنی حدود سلطنت سے نکل کر ایرانی قلمرو میں داخل ہوا، اس نے دیکھا کہ اسماعیل صفوی کے حکم سے ایرانیوں نے تمام علاقے کو ویران اور کھیتوں کو برباد کر دیا ہے۔ اسماعیل صفوی نے بڑے اہتمام اور انتظام کے ساتھ اپنے علاقے کو ویران کرانا شروع کر دیا تھا تاکہ عثمانی لشکر کو گھاس کا ایک تنا اور غلہ کا ایک دانہ نہ مل سکے۔ سبز درختوں اور ہر قسم کی نباتات کو جلا کر خاک سیاہ بنا دینے کے کام پر اس نے بہت بڑی فوج متعین کر دی تھی۔ اس فوج کا یہی کام تھا کہ عثمانی لشکر کے آگے آگے ملک کو برباد اور خاک سیاہ بناتی جائے۔ پہلے سے ان علاقوں میں اشتہار دے دیا گیا تھا کہ تمام باشندے اپنے اپنے سامان کو جو اٹھا سکتے ہیں، اٹھا کر اور باقی کو آگ لگا کر اندرون ملک کی طرف چلے جائیں ورنہ شاہی فوج ان کو زبردستی جلا وطن کر دے گی اور ان کی تمام املاک و سامان کو جلا ڈالے گی۔ اسماعیل صفوی کے اس انتظام و اہتمام کا اثر یہ ہوا کہ مملکت ایران کی حدود میں داخل ہوتے ہی سلطان سلیم عثمانی کو مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اگرچہ سلطان سلیم عثمانی نے پہلے ہی سے یہ بھی انتظام کر لیا تھا کہ طرابزون کی بندرگاہ پر قسطنطنیہ اور یورپی صوبوں سے سامان رسد کے جہاز آتے رہیں اور وہاں سے خچروں اور اونٹوں پر لاد لاد کر لشکر سلطانی میں سامان رسد کے پہنچنے کا انتظام رہے۔ اس کام کے لیے اس نے پانچ ہزار سپاہی اور بہت سے اونٹ اور خچر مقرر کر دیے تھے مگر پھر بھی جس علاقہ میں اس کو سفر کرنا پڑ رہا تھا، اس علاقے سے کسی چیز کا بھی دستیاب نہ ہونا بے حد موجب تکلیف تھا۔ شاہ اسماعیل صفوی خود بھی فوج لے کر اپنے صوبوں کی اس مکمل بربادی میں مصروف تھا اور پیچھے ہٹتا چلا جاتا تھا۔ سلیم عثمانی کو توقع تھی کہ اسماعیل صفوی اپنے ملک کی سرحد پر سدراہ ہوگا لیکن اس نے یہ تدبیر سوچی تھی کہ سلیم عثمانی خود ہی اتنے بڑے لشکر کو دور تک نہ لا سکے گا اور تنگ آ کر پیچھے ہٹ جائے گا۔ اسماعیل صفوی کا یہ منصوبہ بلانتیجہ نہ رہا۔ سلطان کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کیا اور سرداران لشکر نے سلطان کو رائے دی کہ اسماعیل صفوی چونکہ مقابلہ پر نہیں آتا اور پیچھے بھاگتا جاتا ہے، لہٰذا اب ہم کو بھی واپس ہو جانا چاہیے۔ مگر سلطان سلیم نے اس بات کو ناپسند کیا اور آگے ہی بڑھتا گیا۔ اس حالت میں سلطان نے فوج کے لیے ضروریات مہیا کرنے اور رسد رسانی کے انتظام کی طرف توجہ مبذول رکھنے میں بڑی قابلیت کا اظہار کیا۔ سلطان دیار بکر ہوتا

ہوا آذربائیجان کے علاقے میں داخل ہوا۔ ایک منزل پر سلطان کے سپہ سالار ہمدان پاشا کو جو سلطان کا بچپنے کا دوست اور ہم سبق بھی تھا، دوسرے سرداروں نے ترغیب دی کہ آپ سلطان کو واپس ہونے پر آمادہ کر دیں۔ ہمدان پاشا نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ آپ اس حملہ آوری میں اپنی فوج کو ناراض نہ کریں اور موجودہ حالات اس کے متقاضی ہیں کہ اب واپس چلیں۔ سلطان سلیم نے یہ سنتے ہی ہمدان پاشا کی گردن اڑا دی اور کسی کو چون و چرا کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر ایک منزل پر جاں نثار فوج نے جو سب سے زیادہ جری اور باحوصلہ سمجھی جاتی تھی، متفقہ آواز بلند کی کہ ہم اب ہرگز آگے قدم نہ بڑھائیں گے اور یہیں سے واپس ہونا چاہتے ہیں۔ سلطان سلیم نے جب دیکھا کہ ساری کی ساری فوج سرکشی پر آمادہ ہے تو وہ اگلے دن صبح کو گھوڑے پر سوار ہو کر جاں نثار فوج کے درمیان آ کھڑا ہوا اور تمام فوج کو اپنے گرد جمع کر کے ایک تقریر کی کہ:

> ”میں اس لیے یہاں نہیں آیا ہوں کہ ناکام واپس جاؤں۔ جو لوگ بہادر ہیں اور اپنی شرافت کی وجہ سے بزدلی و نامردی کے عیب کو اپنے لیے گوارا نہیں کرتے اور تیر و شمشیر کے زخموں سے نہیں ڈرتے، وہ یقیناً میرا ساتھ دیں گے لیکن جو لوگ نامرد ہیں اور اپنی جان کو اپنی عزت سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں، وہ اپنے گھروں کو واپس ہونا چاہتے ہیں اور صعوبات کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ میری طرف سے ان کو اجازت ہے کہ وہ اسی وقت بہادروں اور جواں مردوں کی صفوں سے جدا ہو جائیں اور اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ اگر تم میں سے ایک شخص نے بھی میرا ساتھ نہ دیا اور تم سب کے سب ہی نامردوں میں شامل ہو گئے تو تنہا آگے بڑھوں گا اور بغیر معرکہ قتال و جدال گرم کیے ہوئے ہرگز واپس نہ ہوں گا۔“

یہ کہہ کر سلطان سلیم نے حکم دیا کہ نامرد لوگ ہمارا ساتھ چھوڑ دیں اور جو بہادر و غیرت مند ہیں، وہ اسی وقت کوچ پر آمادہ ہو جائیں۔ چنانچہ فوراً تمام فوج وہاں سے سلطان کے ساتھ چل پڑی اور ایک شخص بھی ایسا نہ نکلا جو وہاں سے واپس ہونے کی جرأت کرتا۔ سلطان کی اس ہمت مردانہ کی برکت تھی کہ اگلی منزل پر فوج جا کر مقیم ہوئی تو گرجستان یعنی کا کیشیا کے ایک عیسائی سردار کی طرف سے بہ افراط سامان رسد سلطانی فوج کے لیے پہنچا جو سلطان کی خوشنودی مزاج کے لیے بہ طور مہمان نوازی بھجوایا گیا تھا۔ اب اسماعیل صفوی کا دارالسلطنت تبریز کچھ زیادہ دور نہ رہا تھا۔ سلطان سلیم کوچ

ومقام کرتا ہوا وادی خالدران میں پہنچا اور اس وادی کے مغربی جانب کے ایک ٹیلہ پر چڑھا تو سامنے میدان میں اس کو ایرانی فوج نظر آئی جس کو دیکھ کر وہ بہت ہی خوش ہوا۔ اب تک دوران سفر میں سلیم نظم ونثر کے کئی خطوط اسماعیل صفوی کے نام بھیج چکا تھا، جن میں سے ہر ایک خط میں اس نے کوشش کی تھی کہ اسماعیل صفوی کو غیرت دلا کر مقابلہ پر آنے کی ترغیب دے۔ سلطان سلیم، شاہ صفوی کے مقابلہ پر نہ آنے سے بہت ہی افسردہ خاطر اور رنجیدہ تھا اور اسی لیے وہ جلد جلد منزلیں طے کرتا ہوا بڑھتا چلا جاتا تھا کہ اسماعیل صفوی کو اس کے دارالسلطنت میں پہنچ کر للکارے۔ اسماعیل صفوی اگر اپنے دارالسلطنت کو بھی چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتا تو ممکن تھا کہ اس کا منصوبہ کارگر ثابت ہو جاتا اور سلطان سلیم تبریز سے آگے نہ بڑھتا لیکن وہ سلطان سلیم کی پیش قدمی کو اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکا۔ وادی خالدران، تبریز سے بیس کوس کے فاصلے پر تھی اور اسماعیل صفوی نے مقابلہ کے اسی مقام کو سب سے زیادہ موزوں مقام سمجھا تھا۔ اسماعیل صفوی کی فوج سلطان سلیم کی فوج کے برابر ہی تھی مگر اس فرق کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ سلطان سلیم کی فوج پیہم بڑی بڑی کڑی منزلیں طے کرتی ہوئی پہنچی تھی اور بہت ہی تھکی ہاری ہوئی تھی لیکن اسماعیل صفوی کی فوج خوب تازہ دم اور ہر طرح ہر قسم کے سامان سے آراستہ وپیراستہ تھی۔ اسماعیل صفوی اور اس کی فوج کو کامل یقین تھا کہ ہم سلیم عثمانی اور اس کی فوج کو ضرور شکست فاش دیں گے۔ اسماعیل صفوی نے مقابلہ کرنے میں جو دیر اور توقف کیا، وہ اس کی نہایت ہی زبردست سپاہیانہ چال تھی اور اس کی تجربہ کاری نے عثمانی لشکر کو صعوبات سفر سے کمزور کر کے ایسے مقام پر لا ڈالا تھا، جہاں وہ تمام وکمال برباد ہونے کے لیے گویا صفوی لشکر یا موت کے منہ میں پہنچ چکا تھا۔ اس موقع پر پہنچ کر سلطان سلیم کا فرض تھا کہ وہ اپنے لشکر کو کم از کم ایک دن یا چند ہی گھنٹے آرام دینے کی کوشش کرتا اور ستانے کا موقع دیتا لیکن وہ چونکہ تمام سفر میں اس بات کی دعائیں مانگتا ہوا آیا تھا کہ کسی طرح اسماعیل صفوی مقابلہ پر آ جائے۔ لہٰذا خالدران کے میدان میں اسماعیل صفوی اور اس کے لشکر کو سامنے دیکھ کر وہ تامل نہ کر سکتا تھا۔ ادھر اسماعیل صفوی کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے پہلے سے معلوم تھا کہ عثمانی لشکر سامنے سے نمودار ہونے والا ہے۔ لہٰذا وہ پہلے ہی سے حملہ آوری پر مستعد اور اپنے میمنہ ومیسرہ کو درست کر چکا تھا اور اس بات پر مستعد تھا کہ عثمانی لشکر کو جو تھکا ہوا آ رہا ہے، آرام کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ اسماعیل صفوی کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ سلطان سلیم کے ساتھ ایک ہلکا توپ خانہ بھی ہے۔ اس کو سلطانی فوج

کی تعداد اور ہر حصہ فوج کی حالت سے بہ خوبی آ گاہی حاصل تھی۔ شاہ صفوی نے اپنے اسی ہزار سواروں کے دو حصے کیے۔ایک حصہ تو اپنی ماتحتی میں رکھا اور دوسرا حصہ اپنے سپہ سالار ابوعلی کے سپرد کیا اور یہ دونوں حصے جو چالیس چالیس ہزار سواروں پر مشتمل تھے، دائیں بائیں جانب کترا کر اور گھوم کر عثمانی فوج کے عقب میں پہنچ جائیں اور پیچھے سے حملہ کر کے ترکوں کا قافیہ تنگ کر دیں۔ادھر سلطان سلیم نے ایرانی فوج کو سامنے مستعد دیکھتے ہی ایشیائے کوچک کی تمام فوج اپنے سپہ سالار سنان پاشا کے سپرد کی اور یورپی علاقے کی فوج حسین پاشا کو دی۔ سنان پاشا کو میمنہ پر اور حسین پاشا کو میسرہ پر رکھا۔ خود اپنے جاں نثار دستہ کو لے کر قلب میں قائم ہوا اور آگے جاگیرداروں اور رضا کاروں کے غول کو بہ طور ہراول بڑھایا۔ توپ خانہ ایک مناسب موقع پر نصب کر دیا گیا۔ اسماعیل صفوی کو چونکہ توپ خانہ کا حال معلوم تھا اور وہ جانتا تھا کہ لڑائی شروع ہونے کے بعد توپوں کا رخ جلد نہیں بدلا جا سکے گا، لہٰذا اس نے ترکوں کی توپوں کو بیکار کرنے کے لیے ہی اپنے اسی ہزار سواروں سے وہ کام لینا چاہا تھا جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اسماعیل صفوی کی یہ تدبیر جنگ بڑی عاقلانہ اور قابل تعریف تھی۔ چنانچہ طرفین سے فوجیں بڑھیں اور معرکہ کارزار کے گرم ہوتے ہی اسماعیل صفوی نے اپنے چالیس ہزار سوار لے کر عثمانیہ لشکر کے میمنہ کی سمت کو کتراتے اور گھومتے ہوئے حملہ کیا۔ دوسری طرف ابوعلی نے اپنے چالیس ہزار سواروں سے ترکی لشکر کے میسرہ کا ارادہ کیا۔لڑائی کے شروع ہوتے ہی عثمانی لشکر سے تکبیر کی آوازیں بلند تھیں اور ایران لشکر سے ''شاہ شاہ'' کی آوازیں آ رہی تھیں یعنی ایرانیوں کا نعرہ جنگ اپنے بادشاہ اسماعیل صفوی کا نام لینا تھا اور عثمانی لشکر کا نعرہ جنگ اللہ اکبر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دونوں لشکروں کی ان آوازوں نے صاف طور پر بتا دیا تھا کہ ان میں کون موحد ہے اور کون مشرک۔ بہرحال اسماعیل صفوی توپوں کی زد سے صاف بچ کر اپنے ارادے میں کامیاب ہوا یعنی اس نے حسین پاشا کی فوج کے عقب سے پہنچ کر سخت حملہ کیا اور یورپی دستوں کے اکثر سردار سپاہی اس معرکہ عظیم میں مارے گئے۔ دوسری طرف ابوعلی نے سنان پاشا کی فوج پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی لیکن ابوعلی اپنے منصوبے میں پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکا بلکہ اس کی فوج کا ایک حصہ توپ خانہ کی زد میں آ گیا اور ابوعلی مارا گیا۔ سنان پاشا نے بہ آسانی ابوعلی کی فوج کو مغلوب کر لیا لیکن حسین پاشا کی حالت بہت نازک ہوگئی کیونکہ اس طرف ایرانی بہت چیرہ دستی دکھا رہے تھے۔ سلطان سلیم بڑی احتیاط کے ساتھ میدان کا نگران تھا۔ اس نے اس بات کی کوشش نہیں

کی کہ وہ سلطان بایزید یلدرم کی طرح اپنے سپہ سالاری کے منصب کو فراموش کر کے ایک شمشیر زن سپاہی کی حالت میں تبدیل ہو جائے۔ جب سلطان سلیم کو یہ یقین ہو گیا کہ سنان پاشا کو کسی امداد کی ضرورت نہیں بلکہ وہ اپنے حریف کو مغلوب کر چکا ہے تو اپنے رکابی دستہ کو لے کر فوراً حسین پاشا کی مدد کو پہنچا اور ایک ایسا زبردست حملہ کیا کہ ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اسماعیل صفوی نے فرار کی عار گوارا کی۔

اسماعیل کو عثمانی سپاہی گرفتار ہی کر چکے تھے کہ اسماعیل کے ایک ہمراہی مرزا سلطان علی نے کہا کہ میں شاہ اسماعیل ہوں۔ عثمانی سپاہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور اسماعیل صفوی کو بھاگ کر جان بچانے کا موقع مل گیا۔ تمام میدان ایرانیوں سے خالی ہو گیا اور سلطان سلیم کو فتح مبین حاصل ہوئی۔ سلطان نے آگے بڑھ کر اسماعیل صفوی کی لشکر گاہ پر قبضہ کیا تو معلوم ہوا کہ اسماعیل اس سراسیمگی کے ساتھ فرار ہوا ہے کہ اپنا سفری خزانہ اور اپنی پیاری بیوی بھی اپنے خیمہ ہی میں چھوڑ گیا ہے۔ سلطان سلیم نے عورتوں اور بچوں کو قید و حراست میں رکھ کر جنگی قیدیوں کو قتل کر دیا اور میدان جنگ کا معائنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ اس لڑائی میں چودہ عثمانی اور چودہ ہی ایرانی صاحب علم سپہ سالار مارے گئے۔ سلیم کو اپنے سرداروں کے مارے جانے کا سخت ملال ہوا اور اس نے بڑی عزت کے ساتھ ان کی تجہیز و تکفین سے فراغت پا کر تبریز کا ارادہ کیا۔ یہ لڑائی مقام خالدران میں ۲۳ اگست سنہ ۱۵۱۴ء مطابق ۲۰ ماہ رجب سنہ ۹۲۰ھ کو ہوئی۔ اس لڑائی سے تیرہ دن کے بعد سلطان سلیم تبریز دارالسلطنت ایران میں داخل ہوا۔ اسماعیل صفوی خالدران سے بھاگ کر تبریز میں پہنچا تھا لیکن جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ سلطان سلیم تبریز کی طرف آ رہا ہے تو وہ تبریز سے خراسان کی طرف بھاگ گیا اور اپنی سلطنت کے مشرقی حصہ پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ سلطان نے تبریز میں آٹھ روز قیام کیا۔ اس کے بعد قرہ باغ کی طرف بڑھا۔ جب سلطان تبریز میں مقیم تھا تو اس کے پاس مرزا بدیع الزماں جو تیموری نسل کا شہزادہ تھا، ملنے آیا۔ سلطان نے اس کی بہت عزت و تکریم کی۔ سلطان سلیم کا ارادہ تھا کہ قرہ باغ سے آگے بڑھ کر آذربائیجان کے میدانوں میں موسم سرما بسر کرے اور موسم بہار کے شروع ہونے پر مشرقی ممالک کی فتوحات کے لیے بڑھے لیکن اس کی فوج نے اب پھر سرکشی پر آمادگی ظاہر کی اور سلطان کو مجبور کیا کہ وطن کی طرف واپس ہو۔ یہ واپسی سلطان کی ایسی ہی تھی جیسی کہ سکندر کی واپسی دریائے ستلج کے کنارے سے مجبوراً ہوئی تھی۔ سکندر کو بھی اس کی فوج ہی نے واپس ہونے پر

مجبور کر دیا تھا۔ سلطان سلیم قرہ باغ سے واپس تو ہوا مگر وہ سیدھا قسطنطنیہ نہیں چلا گیا بلکہ اس نے واپس ہو کر ایشیائے کوچک کے شہر اماسیہ میں مقام کیا اور یہیں موسم سرما بسر کر کے موسم بہار کے شروع ہونے پر پھر فوج کشی کر کے آرمینیا و جارجیہ اور کوہ قاف کا علاقہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ آذربائیجان کا صوبہ پہلے ہی اس کے قبضہ میں آ چکا تھا۔ اب اس کے بعد سلطان کا ارادہ تھا کہ کردستان اور عراق یعنی دوآبہ دجلہ وفرات کو بھی فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کرے جس پر اب تک اسماعیل صفوی کا اقتدار باقی تھا لیکن سلطان کے پاس قسطنطنیہ سے خبر پہنچی کہ وہاں کی فوج سرکشی پر آمادہ ہے اور قسطنطنیہ کے وائسرائے کے ساتھ گستاخی سے پیش آئی ہے۔ اس لیے اس کو مجبوراً اپنے دارالسلطنت قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ لیکن اس طرف جنگی کارروائیاں اور فتوحات کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے اس نے تجربہ کار سردار مامور کیے جنھوں نے چند ہی روز کے بعد کردستان، عراق اور ساحل خلیج فارس تک کے تمام صوبے فتح کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر دیے اور اسماعیل صفوی کی قریباً آدھی سلطنت سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گئی۔ اسماعیل صفوی نے بار بار پاؤں مارے لیکن عثمانی سرداروں سے ہمیشہ شکست کھائی۔

سلطان سلیم فتح خالدران کے بعد جب تبریز میں داخل ہوا تو اس نے تبریز سے جو سب سے بڑا فائدہ حاصل کیا، وہ یہ تھا کہ وہاں کے ایک ہزار معماروں اور کاریگروں کو بیش قرار روز ینے اور جاگیریں دے کر قسطنطنیہ میں آباد ہونے کے لیے بھیج دیا۔ اس زمانے میں تبریز کے معمار ساری دنیا میں مشہور اور اپنے فن میں بے نظیر سمجھے جاتے تھے۔ سلطان نے ان لوگوں کو قسطنطنیہ بھیج کر قسطنطنیہ کی ایک بڑی واہم ضرورت کو پورا کر دیا۔ شاہ اسماعیل صفوی نے اس شکست کے بعد کئی مرتبہ سلطان سلیم کے پاس صلح کی درخواستیں بھیجیں اور بہت کوشش کی کہ کسی طرح سلطان سلیم اس کی طرف سے مطمئن ہو لیکن سلطان کو اسماعیل صفوی سے ایسی نفرت تھی کہ اس نے اس طرف مطلق التفات نہ کیا اور حالت جنگ کو اس کے ساتھ قائم رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ اگر اس کے بعد سلطان سلیم کو شام و مصر کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ ملتا تو وہ ضرور ایک مرتبہ پھر ایران پر فوج کشی کر کے اسماعیل صفوی سے بقیہ ملک بھی چھین لیتا اور ترکستان تک فتح کے ساتھ چلا جاتا مگر اس کے بعد سلیم کو خود ایران کی طرف آنے کا موقع نہیں ملا اور اس کے سرداروں نے مفتوحہ ملک کو اپنے قبضے سے نہیں نکلنے دیا۔ اس حملہ اور اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرق کی جانب سلطنت عثمانیہ کی حدود بہت وسیع ہو گئیں اور نہایت

زرخیز اور سیر حاصل صوبوں کا اضافہ ہوا اور آئندہ کے لیے مشرق کی جانب سے کسی حملہ کا خطرہ باقی نہ رہا۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی بیان کر دینے کے قابل ہے کہ اسماعیل صفوی کی چہیتی بیوی جب سلطان سلیم کے قبضے میں آ گئی تو شاہ اسماعیل نے سلطان سلیم کے پاس اپنے ایلچی بھیجے کہ میری بیوی کو میرے پاس بھیج دو۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ سلیم ایشیائے کوچک کے شہر اماسیہ میں قرہ باغ سے آ کر مقیم اور موسم سرما کا زمانہ بسر کر رہا تھا۔ سلطان سلیم سے یہی توقع تھی کہ وہ شاہ صفوی کی بیوی کو اس کے پاس بھیج دے گا لیکن سلطان چونکہ شاہ صفوی کو مرتد اور بے دین خیال کرتا تھا اور اس کے اعمال ناشائستہ کی وجہ سے بہت ناراض تھا، لہٰذا سلطان نے اس کے ساتھ کسی قسم کی مروت کا برتاؤ کرنا نہیں چاہا۔ اب تک شاہ صفوی کی بیوی عزت و احترام کے ساتھ نظر بند تھی۔ سلطان نے اس کو بھیجنے سے صاف انکار کر دیا اور جنگ خالدران سے پانچ چھ مہینے کے بعد شاہ اسماعیل کی بیگم کا نکاح اپنے ایک سپاہی جعفر چلپی کے ساتھ کر دیا۔ اسماعیل صفوی کو یہ سن کر کہ اس کی بیوی ایک ترک سپاہی کی بیوی بن کر اس کے گھر میں مسرت و شادمانی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے، سخت صدمہ ہوا اور جب تک زندہ رہا، اسی حسرت اور حزن و ملال میں مبتلا رہا۔

فتح مصر و شام:

اوپر کسی باب میں ذکر آ چکا ہے کہ خاندان ایوبیہ کے ساتویں بادشاہ ملک الصالح نے مصر میں مملوکی فوج قائم کی تھی، جس کو غلاموں کی فوج کہنا چاہیے۔ بہت جلد ان غلاموں نے مصر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اسی زمانہ کے قریب ہندوستان میں بھی غلاموں کا خاندان فرماں روا تھا لیکن یہاں ہندوستان میں غلاموں کے خاندان کے صرف دو بادشاہ غلام تھے، باقی انہیں غلاموں کی اولاد نسلاً بعد نسل تخت نشین ہوتی رہی۔ مصر میں اس کے خلاف یہ دستور قائم ہوا تھا کہ ایک فرماں روا کے فوت ہونے پر غلاموں ہی میں سے کسی کو منتخب کر کے تخت حکومت پر بٹھایا جائے۔ مصر کے یہ غلام بادشاہ مملوکی کہلاتے تھے۔ سلطان سلیم کے زمانہ تک ان کی سلطنت مصر میں قائم تھی اور انہیں سلاطین مصر کی حفاظت میں عباسی خلفا مصر کے اندر رہتے تھے۔ مصر کی مملوکی سلطنت بھی بڑی معزز اور شاندار سلطنت تھی۔ ان مملوکیوں نے عالم اسلام کی دو سب سے بڑی اور اہم خدمات انجام دی تھیں۔ ایک تو انہوں نے فلسطین و شام کو اسلام کے خلاف حملوں سے بچایا اور ہمیشہ کے لیے صلیبی چڑھائیوں کا

استیصال کر دیا۔ دوسرے انہوں نے مغلوں کے سیلاب عظیم کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور چنگیز وہلاکو وغیرہ کی فوجوں کو شکست دے دے کر بھگا دیا۔ عجیب بات ہے کہ ان فتح مند مغلوں نے مصر کے غلاموں یعنی مملوکیوں سے جس طرح شکست کھائی، اسی طرح ہندوستان کے غلام خاندان سے انہوں نے ہمیشہ نیچا دیکھا۔ گویا ان کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ مسلمانوں کے معزز ترین اور اعلیٰ خاندانوں کو برباد کر دیں لیکن جب مسلمانوں کے غلاموں سے معرکہ آراء ہوں تو شکست کھا کر بھاگیں۔

بہرحال مصر کی مملوکی سلطنت مصر، شام اور حجاز پر حکمراں اور قدیم سے سلاطین عثمانیہ کے ساتھ کوئی پرخاش نہیں رکھتی تھی۔ سلطان محمد فاتح کی وفات کے بعد جب سلطان بایزید ثانی تخت نشین ہوا اور شہزادہ جمشید شکست کھا کر مصر پہنچا تو دربار قاہرہ کے تعلقات دربار قسطنطنیہ کے ساتھ پہلی مرتبہ کشیدہ ہوئے اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جنگ و پیکار تک نوبت پہنچی۔ اس موقع پر سلطنت عثمانیہ کو مملوکیوں سے نیچا دیکھنا اور نقصان اٹھانا پڑا تھا، جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اب سلطان سلیم کے تخت نشین ہونے کے بعد مثل دوسری سلطنتوں کے مملوکی بھی اس نئے سلطان کی حرکات کو بہ غور دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جب اسماعیل صفوی کی شکست اور سلیم کی فتوحات کا حال سنا تو ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ سلیم اب ہم سے چھیڑ چھاڑ کیے بغیر نہ رہے گا۔ اس لیے کہ دیار بکر وغیرہ صوبے جو سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکے تھے، انہوں نے مملوکیوں کے مقبوضہ ملک یعنی شام کو سلطنت عثمانیہ سے اور بھی قریب کر دیا تھا۔ ان کو یہ بھی محسوس ہو چکا تھا کہ سلطان سلیم ضرور ان شہروں اور قلعوں کو واپس لینے کی کوشش کرے گا جو مملوکیوں نے سلطان بایزید ثانی سے چھین لیے تھے۔ ادھر شاہ اسماعیل صفوی نے سلطان سلیم سے شکست فاش کھانے کے بعد اپنے ایلچی مصر کے سلطان قالضوغازی کے پاس بھیجے اور عہدنامہ صلح قائم کرنا چاہا۔ مملوکی امیر کو اسماعیل صفوی کے سفیر کی مدارات کرنے اور معاہدہ صلح قائم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ اسماعیل کے سفیر نے قالضو غازی کو اور بھی زیادہ ان خطرات کی طرف توجہ دلائی جو سلطان سلیم سے سلطنت مصر کے لیے پیدا ہو سکتے تھے۔ ان مذکورہ وجوہات سے یا اور کسی سبب سے یہ ضرور ہوا کہ امیر کبیر قالضو غازی سلطان مصر خود شہر حلب میں آ کر مقیم ہوا اور اس نے سرحد شام پر مناسب فوجیں فراہم و متعین کر دیں، جس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ سلطان سلیم ملک شام پر حملہ نہ کر دے اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ موقع پا کر مملوکی سلطنت خود

ایشیائے کوچک کے مشرقی حصے پر حملہ آور ہو۔ بہرحال سلطان سلیم کا غالبًا یہ خیال نہ تھا کہ وہ مملوکی سلطنت پر حملہ کرے کیونکہ مملوکی بہت پابند شرع اور سلطان سلیم کے ہم عقیدہ و ہم مذہب تھے۔ مگر اسماعیل صفوی کی خفیہ تدابیر نے اس جگہ بہ خوبی کامیابی حاصل کی اور مملوکی بے چارے شاہ ایران کی چالاکی کے فریب میں آ کر ناحق مارے گئے۔

سلطان سلیم ایران کی طرف سے واپس آ کر قسطنطنیہ میں مقیم اور اندرونی انتظامات میں مصروف تھا۔ اب اس کے لیے سوائے مغربی حدود اور عیسائی سلطنتوں کے اور کوئی چیز جاذب توجہ نہ تھی۔ اس کے باپ دادا کئی پشتوں سے یورپ کے عیسائیوں سے دست و گریباں چلے آتے تھے۔ سلیم کے لیے سوائے یورپی ممالک کے اور کوئی علاقہ اب ایسا نہ تھا کہ وہ اس کا لالچ کرتا۔ سنہ ۹۲۲ھ میں اس کے پاس یکایک اس کے گورنر سنان پاشا کی ایک تحریر پہنچی (سنان پاشا ایشیائے کوچک کے مغربی حصہ کا حاکم وسپہ سالار تھا) کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل میں وادی فرات کی جانب فوج لے جانے سے اس لیے قاصر ہوں کہ سرحد شام پر مملوکی فوجیں موجود ہیں اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ میرے یہاں سے غیر حاضر ہوتے ہی وہ شاید ایشیائے کوچک کے مشرقی حصہ پر حملہ آور ہو جائیں۔ اس تحریر کو پڑھ کر سلطان سلیم نے قسطنطنیہ میں اپنے تمام سرداروں، عالموں اور وزیروں کو جمع کر کے ایک مجلس مشورت منعقد کی اور ان سے پوچھا کہ ہم کو مملوکیوں کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے؟ اس مسئلہ پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ آخر اس کے میر منشی محمد پاشا نے ایک پرجوش اور زبردست تقریر میں بیان کیا کہ سلطان عثمانی کو ضرور اپنی طاقت کا اظہار کرنا چاہیے اور حقیقت یہ ہے کہ مملوکی سلطان عثمانی کے سامنے ہرگز اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ وہ حرمین شریفین کے خادم ہوں اور ملک حجاز کو اپنے قبضہ میں رکھیں۔ سلطان عثمانی کو یہ شرف ضرور حاصل کر لینا چاہیے اور اس کا حاصل کرنا عین خدمت اسلامی ہے اور اس کے لیے مملوکیوں سے لڑنا بالکل جائز اور مناسب ہے۔ چنانچہ سلطان نے اس رائے کو بہت ہی پسند کیا اور اپنے میر منشی کو اسی وقت وزیر اعظم بنا دیا۔

سلطان سلیم نے مصر کی سلطنت مملوکیہ سے جنگ کا مصمم ارادہ کر کے اول ایک سفارت امیر قالضو غازی کے پاس روانہ کی اور پیغام بھیجا کہ تم ہماری اطاعت و فرماں برداری قبول کر کے اظہار اطاعت کے لیے خراج گزاری قبول کرو ورنہ ہم فوج کشی کر کے تم سے ملک چھین لیں گے۔ سلطان کے سفیر جب حلب میں قالضو غازی کے پاس پہنچے تو وہ بہت برافروختہ ہوا اور سفیروں کو قید کر لیا۔

بس اتنا بہانہ فوج کشی کے لیے کافی تھا۔ سلطان فوراً قسطنطنیہ سے فوج لے کر روانہ ہوا۔ جب عثمانی لشکر قریب پہنچا تو مملوکی سلطان گھبرایا اور اس نے مصلحت و مصالحت میں ہی دیکھی۔ چنانچہ عثمانی سفیروں کو آزاد کر کے ان کے ہاتھ صلح کا پیغام بھیجا مگر اب یہ کوشش بے سود تھی۔ سلطان سلیم برابر بڑھتا چلا گیا۔ حلب کے قریب میدان مرج وابق میں جہاں جناب داؤد علیہ السلام کی قبر ہے، دونوں فوجیں جنگ خالدران سے پورے دو سال بعد ۲۴ اگست سنہ ۱۵۱۶ء مطابق سنہ ۹۲۲ھ کو ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں۔ مملوکی اپنی شجاعت اور بہادری میں ہرگز عثمانیوں سے کم نہ تھے۔ ان کی بہادری کی عام طور پر ہر ملک کے مورخین نے تعریف کی ہے۔ لیکن اس زمانے میں ان کے اندر آپس کے اختلافات پیدا ہو چکے تھے اور اندرونی رقابتوں نے ان کی مشہور و مسلم بہادری کے اظہار کا موقع ضائع کر دیا تھا۔ چنانچہ سلطان سلیم کی کثیر التعداد فوج کے مقابلہ میں مملوکی لشکر پر آثار ہزیمت نمایاں ہوئے اور مملوکی سلطان جو بہت بوڑھا شخص تھا، نہایت جرأت و ہمت کے ساتھ لڑتا ہوا میدان جنگ میں مارا گیا۔ مملوکی سلطان کے مارے جانے کی خبر جب مملوکی لشکر میں مشہور ہوئی تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور سلطان سلیم آگے بڑھ کر حلب پر قابض ہو گیا۔

اس شکست سے مملوکیوں کی ہمت مطلق پست نہیں ہوئی کیونکہ وہ عثمانیوں کو اپنے برابر بہادر نہیں جانتے تھے۔ قانصوہ غازی کے مارے جانے پر تمام سرداران لشکر قاہرہ کی طرف اس لیے چلے گئے کہ وہاں جدید سلطان کا انتخاب کریں۔ مملوکیوں میں چوبیس سردار اعلیٰ درجہ کے ہوا کرتے تھے، جو اس بات کا حق رکھتے تھے کہ ایک سلطان کے فوت ہونے پر اتفاق رائے سے کسی شخص کو اپنا سلطان منتخب کریں اور چوبیس سرداروں کا ایسے انتخاب کے موقع پر دارالسلطنت قاہرہ میں موجود ہونا ضروری تھا۔ لہٰذا مملوکیوں کے ایسے بڑے بڑے تمام سرداروں کو فوراً قاہرہ کی طرف جانا ضروری ہو گیا کہ جلد از جلد نیا سلطان منتخب ہو سکے۔ بڑے بڑے سرداروں کی غیر موجودگی میں شام کا ملک سلطان سلیم کے لیے خود بہ خود خالی تھا۔ لہٰذا اس کو اس فرصت میں شام کے شہروں پر قبضہ کرنے کا موقع مل گیا اور دمشق و بیت المقدس وغیرہ سب سلطان کے قبضے میں آ گئے۔ جنگ حلب کے بعد کوئی بڑی مزاحمت مملوکیوں کی طرف سے ملک شام میں نہ ہو سکی۔

ادھر قاہرہ میں مملوکیوں نے طومان بے کو اپنا سلطان منتخب کیا۔ اس نے سلطان منتخب ہوتے ہی

ایک زبردست فوج مصر وشام کے سرحدی مقام قلعہ غزا کی طرف بھیج دی کہ سلیم کو مصر کی طرف پیش قدمی کرنے سے روکے اور خود قاہرہ کے قریب تمام افواج کو فراہم کرنے میں مصروف ہوا۔ اس فرصت میں سلطان سلیم کی خوش قسمتی کا دمشق وشام میں یہ اظہار ہوا کہ مصری سلطنت کا ایک بہت بڑا خزانہ جو شہر دمشق میں جمع تھا، سلطان کے ہاتھ آ گیا۔ بڑے بڑے شہروں سے جو مال غنیمت سلطان کے ہاتھ آیا تھا، اس کے علاوہ صرف دمشق کے اس خزانہ میں ستر لاکھ روپیہ سے زیادہ موجود تھا۔ یہ خزانہ سلطان کی آئندہ فتوحات کے لیے بہت مفید ثابت ہوا اور سلطان نے اس سے فائدہ اٹھانے اور اس کے صحیح استعمال کرنے میں کسی بخل و کنجوسی کو مطلق دخل نہیں دیا۔ اہل شام کے قلوب کو اپنی طرف مائل کرنے کی سلطان نے بہت ہی باموقع کوشش کی اور عالموں، خطیبوں، درویشوں اور قاضیوں کو انعام واکرام سے مالا مال کر دیا۔ مساجد، مدارس، پل اور رفاہ رعایا کے لیے بڑی بڑی رقمیں عطا کیں اور مصر پر حملہ آور ہونے کے لیے بار برداری کے اونٹ اور ہر قسم کا ضروری سامان فراہم کر لیا۔ مصریوں کی فوج شہر غازہ پر آ گئی، جو مصر کی سرحد سمجھا جاتا تھا۔ ادھر سلطان سلیم اپنی فوج کے لیے ہوئے شام کے آباد اور سرسبز مقامات سے گزرتا ہوا جب ریگستان میں داخل ہونے لگا تو بڑی احتیاط اور دوراندیشی کے ساتھ اونٹوں پر پانی لاد کر ساتھ لیا اور سپاہیوں کو انعامات تقسیم کر کے ان کا دل بڑھایا۔ سنان پاشاہ کو توپ خانہ دے کر ایک زبردست حصہ فوج کا سپاہ سالار بنایا اور بہ طور ہراول آگے روانہ کیا اور خود بقیہ تمام فوج لے کر بڑے اہتمام وانتظام کے ساتھ روانہ ہوا۔ یہ ریگستان کا سفر دس روز کا تھا، جو بہ حسن وخوبی طے ہوا۔ سنان پاشا نے مقام غزہ میں پہنچ کر سرسری فوج کا جو سپہ سالار غزالی کے ماتحت صف آرا تھی، مقابلہ کیا۔ مملوکی لشکر بڑی بے جگری اور بہادری کے ساتھ حملہ آور ہوا مگر سنان پاشا نے اپنی توپوں کو میدان میں جما کر ایسی سخت گولہ باری کی اور اس طرح توپوں میں گراپ بھر بھر کر چلایا کہ مصری لشکر، عثمانی لشکر تک پہنچنے سے پہلے ہی میدان میں بھون ڈالا گیا۔ مملوکی توپوں کے استعمال سے ناواقف اور اپنے پاس کوئی توپ خانہ نہ رکھتے تھے۔ اس طرح جب کہ بارود کی طاقت جواں مردوں کے قلب کی طاقت یعنی بہادری پر غالب آ گئی اور میدان عثمانی لشکر کے ہاتھ آیا تو ان کے دل بہت بڑھ گئے اور مملوکیوں کی جو ہیبت عثمانی لشکر پر چھائی ہوئی تھی، یک لخت دور ہو گئی۔

مصر میں مملوکیوں اور عثمانیوں کی معرکہ آرائی:

غزہ کے معرکہ میں غزالی بے شکست کھا کر قاہرہ کی طرف واپس آیا اور طومان بے نے ترکی توپ خانہ کی ہلاکت آفرینی کے حالات سنے تو اس کی ہمت اور شجاعت میں بہ جائے اس کے کہ کمی ہوتی اور بھی اضافہ ہوگیا۔ اس نے قاہرہ کے متصل شام کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے موضع رضوانیہ کے قریب فوج کو جمع کیا اور سلیم کی فوج کا انتظار کرنے لگا۔ سلطان طومان بے ایک اعلیٰ درجہ کا بہادر اور شریف شخص تھا مگر بعض اوقات نہایت شریف اور نیک آدمیوں کے خلاف بھی سازشیں بارآور ہو جایا کرتی ہیں اور بھلے آدمیوں کے خلاف حاسدوں اور شریروں کی ایک جماعت ضرور ہی مصروف کار رہا کرتی ہے۔ چنانچہ طومان بے جو بڑا ہی لائق فائق، بہادر، پاک طینت اور ہر طرح قابل تعریف شخص تھا، جب مصر کا سلطان منتخب ہوا تو مملوکی سرداروں ہی میں سے بعض سرداروں کو یہ انتخاب ناپسند ہوا مگر وہ کچھ نہ کہہ سکے اور دل ہی دل میں کڑھتے رہے۔ اگر طومان بے کو اطمینان کا زمانہ میسر ہوتا تو وہ اپنے اخلاق فاضلہ سے رفتہ رفتہ ان لوگوں کی سوزش قلبی کو فرو کر دیتا لیکن اس کو برسر حکومت ہوتے ہی لڑائیوں کا بندوبست کرنا پڑا۔

ان حسد پیشہ سرداروں میں دو شخص خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں: ایک غزالی بے اور دوسرا خیری بے۔ ان دونوں نے طومان بے کو مصر کو بچانے اور عثمانیہ لشکر کو شکست دینے کی کوششوں میں مصروف دیکھ کر یہ کوشش درپردہ شروع کر دی کہ طومان بے کو اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل نہ ہو۔ چنانچہ ان غداروں نے سلطان سلیم سے خفیہ سلام پیام اور خط و کتابت کا سلسلہ شروع کر کے طومان بے کی تمام تیاریوں اور تدبیروں سے سلطان عثمانی کو مطلع کر دیا۔ طومان بے نے سلیم کے توپ خانہ کو بیکار کر دینے کے لیے یہ بہترین تدبیر سوچی تھی کہ جس وقت سلیم کا لشکر کوچ کرتا ہوا قریب پہنچے تو اسی حالت میں اس کے فروکش ہونے سے پہلے اس کے بازوؤں کی طرف سے مصری سواروں کے دستے حملہ آور ہوں اور توپ خانہ پر قابض ہو کر دست بہ دست تلوار و خنجر کی لڑائی شروع کر دیں۔ ان دونوں غداروں نے سلیم کو طومان بے کے اس ارادے کی بھی عین وقت پر اطلاع کر دی اور طومان بے کی یہ تدبیر بھی پوری نہ ہونے پائی۔ سلطان سلیم عثمانی کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ خود مملوکیوں کے سرداروں میں اس کے ہوا خواہ پیدا ہو گئے۔

۲۲ جنوری سنہ ۱۵۱۷ء مطابق سنہ ۹۲۲ھ میں مقام رضوانیہ کے متصل جہاں مصری فوج خیمہ زن تھی، دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ چونکہ سلیم پہلے ہی سے واقف ہو چکا تھا، لہٰذا طومان بے کو اپنی سوچی ہوئی تدبیر کے موافق لڑائی کے لیے اچھا موقع نہ مل سکا اور اس کو عین توپ خانہ کے مقابل ہو کر لڑنا پڑا۔ لڑائی کے شروع ہوتے ہی خیری بے اور غزالی بے دونوں غدار مملوکی سلطان سلیم کے پاس فوراً چلے آئے۔ توپوں کے گولوں کی بارش اور بندوقوں کی گولیوں کی بوچھاڑ میں مملوکیوں نے اس بے جگری کے ساتھ حملے کیے اور اس طرح حق شجاعت و مردانگی ادا کیا کہ اس کے بعد شاید کسی کو اس طرح بہادری کے ساتھ جان قربان کرنے کا موقع نہیں ملا ہو گا۔ طومان بے نے اپنے مملوک شہ سواروں کی ایک جماعت لے کر، جو خود، زرہ اور جوشن وغیرہ میں سر سے پاؤں تک غرق فولاد تھی، ایک حملہ یونانیوں کے قلب لشکر پر کیا۔ سلطان طومان بے کے ہمراہ دو اور بہادر مملوکی سردار لان بے اور قرط بے بھی تھے۔ ان دونوں سرداروں نے قسم کھائی کہ ہم سلطان سلیم کو یا تو زندہ گرفتار کر لیں گے ورنہ اس کو قتل کر دیں گے۔

مملوکیوں کی اس مختصر جماعت کا یہ حملہ ایک زلزلہ تھا، جس نے تمام عثمانی لشکر میں تزلزل برپا کر دیا۔ مملوکیوں کا سلطان طومان بے اور اس کے مٹھی بھر ہمراہی گویا شیر تھے جو بکریوں کے گلے میں داخل ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کو قلب لشکر تک پہنچنے سے عثمانیہ لشکر کی کوئی طاقت نہ روک سکی۔ کائی سی پھاڑتے ہوئے اور کشتوں کے پشتے لگاتے ہوئے یہ لوگ ٹھیک اس مقام تک پہنچ گئے جہاں سلیم کھڑا ہوا اپنی فوج کے مختلف دستوں کو احکام بھیج رہا تھا مگر حسن اتفاق سے طومان بے نے سنان پاشا کو جو سلطان سلیم کے قریب کھڑا تھا، سلیم سمجھا اور اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے آتے ہی سنان پاشا کو سلیم کہہ کر للکارا اور ایک ایسا جچا تلا نیزہ کا وار کیا کہ نیزہ سنان پاشا کو چھید کر پار نکل گیا اور بغیر اس کے کہ وہ خود کوئی حرکت کر سکے یا کوئی اس کو بچانے کی کوشش کرے، مردہ ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اسی طرح الان بے اور قراط بے نے بھی دو اور عثمانی سپہ سالاروں کو قتل کیا مگر سلطان سلیم کو کوئی شناخت نہ کر سکا۔ اس طرح یہ تینوں مملوکی سردار تین عثمانی سپہ سالاروں کو سلطان سلیم کے سامنے عین قلب لشکر میں قتل کر کے صاف نکل گئے اور کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ ان کو روک سکے۔ اپنے پندار میں وہ سلطان سلیم کو قتل کر کے قصہ پاک کر چکے تھے مگر خوش قسمتی سے سلطان سلیم بچ گیا اور میدان کارزار بہ دستور گرم رہا۔ اس حملہ میں صرف الان بے کے پاؤں میں بندوق کی ایک گولی لگی، جس

سے وہ زخمی ہوا مگر کوئی اس کو گرفتار نہ کر سکا، صاف بچ کر نکل گیا۔

سلطان سلیم مملوکیوں کی اس بہادری کو دیکھ کر حیران و ششدر تھا اور اپنے دل میں کہتا تھا کہ اگر آج میرے پاس توپ خانہ اور بندوقوں سے مسلح دستے نہ ہوتے تو مملوکیوں کے مقابلے میں لشکر کی کثرت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی۔ سلطان سلیم نے بڑی ہوشیاری اور مستعدی کے ساتھ برق انداز دستوں اور توپوں کو مصروف کار رکھا۔ مملوکیوں کی حالت یہ تھی کہ ان کا ایک ایک سردار اپنا اپنا ماتحت دستہ لے کر حملہ آور ہوتا تھا اور گولوں اور گولیوں کی بارش میں عثمانیوں کی صف اول تک پہنچنے سے پہلے پہلے یہ سب ختم ہو جاتے تھے مگر ان میں سے کوئی شخص پیچھے ہٹنے اور بھاگنے کا نام نہ لیتا تھا۔ یہ لڑائی اس اعتبار سے دنیا کی بے نظیر لڑائی تھی کہ اس میں مملوکیوں نے محض اپنی بہادری کا ثبوت پیش کرنے کے لیے دیدہ و دانستہ اپنے آپ کو توپوں اور بندوقوں کے منہ میں جھونک دیا۔ مگر اس عار کو گوارا نہ کیا کہ بارود کی طاقت بہادروں کی بہادری کو بزدلی سے تبدیل کر سکتی ہے۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ پچیس ہزار مملوک رضوانیہ کے میدان میں کھیت رہے اور صرف چند شخص باقی رہے جو بہ اصرار تمام سلطان طومان بے کو اس میدان سے لوٹا کر مقام عضوبیہ کی طرف لے گئے۔ اس لڑائی میں جس قدر مملوک مارے گئے، وہ سب کے سب توپ کے گولوں اور بندوق کی گولیوں سے مرے لیکن عثمانی لشکر کے جس قدر آدمی کام آئے، وہ سب تلواروں اور برچھوں سے مارے گئے کیونکہ مملوکیوں کے پاس ایک بھی بندوق نہ تھی اور وہ بندوق کو ہاتھ لگانا بھی نامردی کی بات سمجھتے تھے۔ چونکہ سلطان طومان بے میدان رضوانیہ سے مقام عضوبیہ میں چلا گیا تھا اور قاہرہ خالی تھا، لہٰذا جنگ رضوانیہ سے ساتویں روز سلطان سلیم نے قاہرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس عرصہ میں مملوکی سپاہی جو ادھر ادھر ملک میں منتشر تھے، آ آ کر عضوبیہ میں طومان بے کے پاس جمع ہوئے اور ایک مختصر سی فوج پھر طومان بے کے ماتحت فراہم ہو گئی۔

یہ سن کر کہ سلطان سلیم نے قاہرہ پر قبضہ کر لیا ہے، طومان بے نے اس مختصر سی فوج کو لے کر قاہرہ پر حملہ کیا۔ سلیم احتیاطاً شہر سے باہر اپنے فوجی کیمپ میں مقیم تھا۔ طومان بے نے دوسری طرف سے یکا یک شہر میں داخل ہو کر ترکوں کو جو فاتحانہ شہر پر قابض اور متصرف ہو گئے تھے، قتل کرنا شروع کیا۔ اس دار و گیر میں ایک بھی عثمانی سپاہی جو اس وقت شہر کے اندر تھا، زندہ نہ بچا۔ سب کے سب قتل کر دیے گئے اور طومان بے نے شہر پر دوبارہ قابض ہو کر کوچوں گلیوں اور شہر کے مکانوں کے

ذریعہ سے مورچہ بندی کی۔ شہر قاہرہ کی کوئی فصیل نہ تھی جو اس حالت میں مدد پہنچاتی۔ سلطان سلیم نے اپنی فوج لے کر شہر میں داخل ہونا چاہا تو ہر ایک گلی کوچہ مورچہ بند اور سدراہ نظر آیا۔ سلیم کو اب بڑی مشکلات کا سامنا تھا اور ایک ایسا شہر بھی جو اپنی کوئی فصیل نہیں رکھتا، فتح نہیں ہوسکتا یہ سلطان سلیم کے لیے بڑی ہی ذلت کی بات تھی اور اس کی شہرت کو یقیناً سخت صدمہ پہنچتا، اگر وہ قاہرہ کو چھوڑ کر واپس چلا جاتا۔ یہ ایسا گرم دودھ تھا جس کو نہ نگل سکتا تھا، نہ اگل سکتا تھا۔ تین دن تک برابر قاہرہ کی گلیوں یعنی بیرونی محلوں میں جنگ و پیکار کا بازار گرم رہا مگر سلیم قاہرہ کے کسی محلّہ میں اپنے قدم نہ جما سکا۔ سلطان سلیم نے جب دیکھا کہ طوفان بے کو قاہرہ سے بے دخل کرنا دشوار ہے اور مشکلات بڑھتی چلی جاتی ہیں تو اس نے مملوکی سردار خیری بے کو جو جنگ رضوانیہ ہی میں اس کے پاس چلا گیا تھا، بلوایا اور کہا کہ اب تم ہی کوئی تدبیر بتاؤ؟ خیری بے نے کہا کہ آپ اب یہ اعلان کرا دیجیے کہ جو مملوکی ہتھیار رکھ دے گا اور ہمارے پاس چلا آئے گا، اس کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور اس کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا جائے گا۔ اس اعلان کے ہوتے ہی لڑائی رک گئی اور سلیم نے بھی اپنی فوج شہر کے اطراف سے واپس اپنے کیمپ میں بلا لی۔ بعض مملوکی خود اس معافی کے وعدے پر اعتماد کر کے سلیم کے لشکر میں آ کر حاضر ہو گئے اور بعض کو شہر والوں نے بہ اصرار لشکر سلطانی میں حاضر ہو جانے پر مجبور کیا۔ اس طرح آٹھ سو مملوکی سلطان سلیم کے لشکر میں حاضر ہو کر سلطان کے قیدی بن گئے۔ ان کو توقع تھی کہ اپنے وعدے کے موافق سلطان ہمارے ساتھ نیک سلوک کرے گا لیکن جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہی آٹھ سو مملوکی سردار قاہرہ کی سب سے بڑی طاقت تھے تو خیری بے کے مشورہ کے موافق سلطان سلیم نے ان سب کو قتل کرا دیا اور اس کے بعد شہر قاہرہ میں قتل عام کا حکم دیا۔

طومان بے یہ دیکھ کر کہ اب مقادمت اور مدافعت کی طاقت موجود نہیں رہی، قاہرہ سے نکل کر ریگستان کی طرف عربی قبائل میں چلا گیا اور سلطانی فوج نے شہر میں قتل عام شروع کیا۔ اس قتل میں پچاس ہزار آدمی مارے گئے۔ قرط بے جو طومان بے کا دست راست اور بڑا ہی بہادر شخص تھا، قاہرہ کے اندر ایک مکان میں روپوش رہا۔ قتل عام سے فارغ ہو کر اور شہر والوں کو کافی طور پر کمزور و خائف بنا کر سلطان نے طومان بے اور قرط بے کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔ آخر معلوم ہوا کہ طومان بے تو قاہرہ سے نکل گیا ہے لیکن قرط بے ابھی تک قاہرہ میں موجود اور روپوش ہے۔ سلیم نے قرط بے کے پاس

پیغام بھیجا کہ اب مملوکیوں کی طاقت ٹوٹ چکی ہے۔ ہم تمہاری بہادری دیکھ چکے ہیں۔ تم بلا تامل ہمارے پاس چلے آؤ۔ تم کو جان کی امان دی جاتی ہے۔ قرط بے نے جب دیکھا کہ اب اگر سلیم کے اس وعدہ معافی کو قبول نہیں کرتا ہوں، تب بھی گرفتار ہو کر اس کے سامنے پیش ہوں گا۔ چنانچہ فوراً سلطان سلیم کے پاس چلا آیا۔

سلیم نے اس کو دیکھ کر کہا کہ جنگ رضوانیہ کے دن میں نے تجھ کو گھوڑے پر سوار دیکھا تھا۔ تو بڑی بہادری اور بے باکی کا اظہار کرتا تھا مگر اس وقت تو تو بہت خاموش نظر آتا ہے۔ قرط بے نے کہا کہ میں اب بھی ویسا ہی بہادر ہوں لیکن تم عثمانی بڑے بزدل اور نامرد ہو۔ تمہاری ساری بہادری اور فتح مندی بندوق کی بہ دولت ہے۔ ہمارے سلطان قالضو غازی کے زمانے میں ایک فرنگی بندوق لے کر آیا اور اس نے سلطان قالضو غازی کی خدمت میں عرض کیا کہ تمام مملوکی فوج کو بندوقیں فراہم کر دی جائیں تو یہ مفید ہوگا۔ ہمارے سلطان اور تمام اراکین دربار نے کہا کہ لڑائی میں بندوق سے کام لینا بڑی نامردی کی بات ہے۔ ہم اس کو ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتے۔ اس وقت اس فرنگی نے سردربار یہ کہا تھا کہ تم دیکھ لوگے کہ ایک روز انہیں بندوقوں کی بہ دولت سلطنت مصر تمہارے قبضے سے نکل جائے گی۔ ہم نے آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ تم نے بڑی نامردی کے ساتھ محض ان بندوقوں کی بہ دولت ہم پر فتح پا لی لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ بندوق فتح و شکست کا اصل سبب ہرگز نہیں ہوسکتی۔ فتح و شکست کے لیے تلوار و تیر ہی سب سے زیادہ موثر چیزیں ہیں۔ ہم کو یہ شکست اس لیے ہوئی ہے کہ ہماری حکومت وسلطنت اللہ تعالیٰ کو اس سے زیادہ رکھنی منظور نہ تھی۔ اسی طرح تمہاری حکومت وسلطنت بھی ایک روز ضرور ختم ہو جائے گی۔ دنیا میں جس طرح انسانوں کی عمریں محدود ہوتیں ہیں، اسی طرح سلطنتوں اور حکومتوں کی بھی ایک عمر ہوتی ہے، جس کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ تم ہرگز ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ ہم سے زیادہ بہادر ہونے کی وجہ سے تم نے فتح پائی۔ سلطان سلیم نے کہا کہ اگر تو ایسا ہی بہادر ہے تو اس وقت میرے سامنے ایک قیدی کی حیثیت سے کیوں موجود ہے؟ قرط بے نے کہا کہ اللہ کی قسم! میں اپنے آپ کو تیرا قیدی نہیں سمجھتا۔ میں تو تیرے وعدے پر ہی اعتماد کر کے اپنی خوشی سے تیرے پاس چلا آیا ہوں اور اپنے آپ کو بالکل آزاد سمجھ رہا ہوں۔ سلطان سلیم اور قرط بے کی گفتگو یہیں تک ہونے پائی تھی کہ قرط بے کی نظر خیری بے پر پڑی جو سلیم کے ہواخواہوں اور امیروں میں شامل ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً خیری بے کی طرف متوجہ ہو کر اس

کو سخت لعنت وملامت کی، جس سے اس کی اس مجلس میں بڑی بے عزتی ہوئی اور پھر سلطان سلیم سے مخاطب ہو کر کہا کہ تیرے لیے مناسب یہی ہے کہ اس دغا باز کا سر اڑا دے اور اس کو اس کی مکاری کی سخت سزا دے ورنہ یہ تجھ کو بھی اپنے ساتھ جہنم میں لے جائے گا۔ یہ سن کر سلطان سلیم نے طیش اور غصہ کے لہجہ میں جواب دیا کہ میرا ارادہ تھا کہ تجھ کو آزاد کر کے کوئی بڑا جنگی عہدہ تجھ کو عطا کروں مگر تو نے اب تک بڑی ہی بدتہذیبی کی گفتگو کی ہے اور آداب دربار سلطانی کو مطلق ملحوظ نہیں رکھا۔ تو نہیں جانتا کہ جو شخص دربار سلطانی میں بدتہذیبی کا مرتکب ہوتا ہے، وہ ذلت ونقصان اٹھاتا ہے۔ قرط بے نے نہایت آزادانہ اور بے باکانہ لہجہ میں جواب دیا کہ اللہ وہ دن نہ لائے کہ میں تیرے نوکروں اور ہوا خواہوں میں شامل ہوں۔ یہ سنتے ہی سلطان کا طیش وغضب بھڑک اٹھا اور اس نے جلادوں کو آواز دی۔ قرط بے نے کہا کہ تو تنہا میرے سر کو کٹوا کر کیا کرے گا جب کہ مجھ جیسے اور بھی ہزاروں بہادر ابھی تیرے سر کی تلاش اور فکر میں موجود ہیں۔ اور طومان بے بھی زندہ اور تجھ سے بدلہ لینے کی کوشش میں مصروف ہے۔ جلاد آئے اور انہوں نے تلوار نکال کر قرط بے کی طرف اس کا سر اڑانے کے لیے حملہ کیا تو قرط بے نے خیری بے کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ لے اب میرے سر کو لے جا کر اپنی جورو کی گود میں رکھ دے۔ یہ الفاظ اس کی زبان سے نکل رہے تھے کہ تلوار نے اس بہادر کے سر کو جسم سے جدا کر دیا۔

طومان بے نے قاہرہ کے دوبارہ مفتوح ہونے پر قاہرہ سے نکل کر عربی قبائل کو بھرتی کرنا شروع کیا اور ایک معقول جمعیت فراہم کر کے سلیم کی فوج پر حملے شروع کیے۔ سلیم نے فوج کے دستے اس کے مقابلہ پر روانہ کرنے شروع کیے اور طومان بے نے ہمیشہ ان کو شکست دے دے کر بھگا دیا۔ طومان بے کی فوج دو حصوں میں منقسم تھی یعنی کچھ تو بقیۃ السیف مملوکی اس کے پاس آ گئے تھے اور کچھ عرب قبائل شامل ہو گئے تھے۔ مملوکیوں اور عربوں کو عثمانیوں یعنی اپنے نئے فاتحوں سے یکساں نفرت تھی اور اسی لیے وہ مل کر عثمانی فوج کے دستوں کو بار بار شکست دے چکے تھے۔ لیکن خود عربوں اور مملوکیوں کے درمیان بھی رقابت موجود تھی اور یہ طومان بے کے لیے سب سے بڑی مصیبت تھی۔

سلطان سلیم نے طومان بے کی بار بار کی حملہ آوریوں سے مجبور ہو کر اس کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر تم اطاعت وفرماں برداری کا اقرار کرو تو میں تم کو ملک مصر کا بادشاہ تسلیم کر کے یہاں سے چلا جاؤں گا اور اس ملک کی حکومت تمہارے لیے چھوڑ دوں گا۔ لیکن چونکہ سلطان سلیم مملوکیوں کے

نہایت محبوب سردار قرط بے کو قتل کرا چکا تھا اور اس نے قاہرہ میں قتل عام کرایا تھا، لہٰذا سلطان سلیم کا سفیر مصطفیٰ پاشا جب یہ پیغام لے کر طومان بے کے پاس پہنچا تو مملوکیوں نے سلیم کے اس سفیر اور اس کے ہمراہیوں کو جوش غضب میں فوراً ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ سلطان کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے اس کے عوض میں تین ہزار قیدیوں کو قتل کرا دیا اور طومان بے کے مقابلے کو ایک نہایت زبردست فوج مع توپ خانہ روانہ کی۔ طرفین میں اہرام مصر کے قریب جنگ عظیم برپا ہوئی۔ عین معرکہ جنگ میں مملوکی اور عرب لوگ ایک دوسرے سے لڑ پڑے۔ ادھر مملوکی، عربوں کو اور عرب، مملوکیوں کو قتل کر رہے تھے، ادھر عثمانی توپ خانہ دونوں کی صفائی کر رہا تھا۔ لہٰذا طومان بے کی فوج کے برباد ہونے میں کچھ زیادہ وقت صرف نہیں ہوا۔ اس طرح اس فوج کی بربادی کے بعد طومان بے وہاں سے ایک عرب سردار کے پاس جس پر اس نے بڑے بڑے احسانات کیے تھے، چلا گیا۔ اس محسن کش نے اس بہادر اور شریف مملوکی سلطان کو گرفتار کر کے سلطان سلیم کے پاس بھیج دیا۔

جس وقت سلطان سلیم کے پاس یہ خبر پہنچی کہ طومان بے گرفتار ہو گیا ہے تو اس نے جوش مسرت میں کہا کہ اب مصر کا ملک فتح ہو گیا۔ جس وقت طومان بے قریب پہنچا تو سلطان سلیم نے اس کا بادشاہوں کی طرح استقبال کیا اور بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آیا اور نہایت عزت و توقیر کے ساتھ بہ طور ایک معزز مہمان کے ٹھہرایا۔ سلطان سلیم کا یہ برتاؤ طومان بے کے ساتھ دیکھ کر خیری بے اور غزالی بے کو سخت فکر ہوئی۔ یہ دونوں غدار طومان بے کے جانی دشمن تھے۔ ادھر سلطان سلیم کا یہ ارادہ تھا کہ طومان بے کو بہ دستور ملک مصر کا بادشاہ بنا کر اس پر احسان کرے اور اس ملک کی حکومت اس کو سپرد کرے اور خود قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو جائے۔ غزالی بے اور خیری بے نے اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ انہوں نے نہایت چالاکی کے ساتھ سلطان تک ایسی خبریں پہنچائیں اور پہنچوائیں کہ ایک بڑی زبردست سازش طومان بے کو چھڑانے اور مصر کا سلطان بنانے کے لیے ہو رہی ہے اور طومان بے بہت جلد آزاد ہو کر سلطان کے لیے سخت خطرے کا موجب بننے والا ہے۔ چونکہ سلطان سلیم اب تک طومان بے کی وجہ سے سخت مشکلات کا مقابلہ کر چکا تھا، اس لیے اس نے فوراً طومان بے کے قتل کیے جانے کا حکم دے دیا اور اس طرح ۱۷ اپریل سنہ ۱۵۱۷ء مطابق سنہ ۹۲۲ھ کو مملوکیوں کا یہ آخری سلطان مقتول ہوا۔

طومان بے کے قتل ہونے پر سلطان سلیم کو مصر کی حکومت کے متعلق کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا لیکن

وہ جانتا تھا کہ مصر کو فتح کر لینے کے بعد اس پر قبضہ رکھنا آسان کام نہیں۔ کئی سو برس سے مملوکی مصر پر فرماں روا تھے۔ مملوکی مصر کے اصلی باشندے نہ تھے۔ وہ ہمیشہ سرکیشیا وکوہ قاف کے علاقوں سے غلام خرید خرید کر منگواتے اور اپنی تعداد کو پورا رکھتے تھے۔ مصر میں ان کی نسلیں بھی بڑھ گئی تھیں اور اب وہ ایک حکمران قوم کی حیثیت سے مصر میں کافی اقتدار رکھتے تھے۔ دوسری طرف عربوں کی تعداد بھی مصر میں اس قدر موجود تھی کہ مصر کا ملک ایک عربی ملک سمجھا جاتا تھا۔ دینی اعتبار سے عربوں کی عزت و سرداری عام طور پر مسلم تھی اور مصر کے عرب باشندے شام وحجاز کے عربوں سے تعلقات رکھنے کے سبب سے ایک زبردست سیاسی اہمیت رکھتے تھے۔ مصر کے قدیم باشندے یعنی قبطی قوم اور یہودی نسلیں بھی زراعت پیشہ اور دفتروں میں حساب کے کاموں پر مامور ہونے کی وجہ سے بہت کچھ اثر رکھتے تھے۔ ادھر مصر کے مغربی وجنوبی سمتوں کے سرحدی صوبوں اور علاقوں کی قومیں بھی مصر پر چڑھائی کرنے اور قابض ہونے کی استعداد رکھتی تھیں۔ اندریں صورت اگر سلطان سلیم کسی گورنر کو مصر کی حکومت پر مامور کرتا تو وہ موقع رکھتا تھا کہ شام وحجاز اور مغربی ممالک کی قوموں کو اپنے ساتھ شریک کر کے خود مختاری کا اعلان کر دے۔ اگر ایسا حاکم مقرر کرتا جو عالی حوصلہ اور اولوالعزم نہ ہوتا اور بغاوت کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتا تو اس سے ملک کے اندر امن وامان قائم نہ رہ سکتا تھا۔ سلطان سلیم اگر مصر کو فتح کرنے کے بعد فوراً ہی واپس چلا جاتا تو یقیناً ملک مصر فوراً اپنی خود مختاری کا پھر اعلان کر دیتا اور دوبارہ سلطان کو پھر اسی قدر زحمت گوارا کرنی پڑتی۔ سلطان نے مصر کو فتح کرنے کے بعد مصر میں بہت دنوں تک قیام رکھا اور یہاں کے حالات کا بہ غور مطالعہ کرتا رہا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ طرابلس وغیرہ کی طرف بڑھ کر تمام شمالی افریقہ کو مراکش تک فتح کر لے۔ اگر ایسا ہوتا تو بہت خوب ہوتا کیونکہ پھر اندلس کو فتح کر لینا کوئی بڑی بات نہ تھی مگر اس کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کیا اور سلطان سلیم کو مجبوراً قسطنطنیہ کی طرف واپس آنا پڑا۔

مملوکیوں سے مصر کی حکومت چھین لینے کے بعد سلطان سلیم کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ مملوکیوں کی قوم کو مصر سے نیست و نابود کرنے کی کوشش کرتا لیکن اس نے بڑی دانائی اور نہایت عقلمندی کے ساتھ مملوکیوں کی طاقت و تعداد کو قائم رکھا اور اپنی طرف سے مملوکیوں کے سردار یعنی غدار خیری بے کو مصر کی گورنری پر مامور کیا اور اجازت دی کہ جس طرح مملوکیوں کی کونسل یا پارلیمنٹ چوبیس سرداروں پر مشتمل ہوا کرتی تھی، وہ اب بھی اسی طرح قائم ہو۔ مملوکیوں میں دستور تھا کہ

چوبیس مملوکی سردار جو اعلیٰ عہدوں پر معمور ہوا کرتے تھے، اپنے سلطان کے فوت یا قتل یا معزول ہونے پر اپنی کثرت رائے سے کسی ایک سردار کو سلطان منتخب کر لیا کرتے تھے۔ ان سرداروں کی تعداد بہ دستور قائم رکھی گئی اور ان کے عہدے بھی بہ دستور بحال رہے مگر مصر کے عہدے سلطان عثمانی کی منظوری سے مقرر ہونا تجویز ہوا۔ ساتھ ہی یہ اصلاح بہت معقول کی گئی کہ قاضی القضاۃ اور مفتی وغیرہ کے تمام دینی عہدے عرب سرداروں کے ساتھ مخصوص کیے گئے۔ روپیہ کی تحصیل و وصولی کا کام اور مالی عہدے قبطیوں اور یہودیوں کو دیے گئے۔ اس طرح دوعملی بلکہ سہ عملی نظام قائم کر کے سلطان سلیم نے اپنی فوج میں سے پانچ ہزار سوار اور پانچ سو پیدل قاہرہ میں تعینات کیے اور خیرالدین نامی سردار کو اس فوج کا سپہ سالار مقرر کر کے حکم دیا کہ شہر قاہرہ اور مرکزی قلعوں پر تمہارا قبضہ رہنا چاہیے اور کسی حالت میں بھی تم کو شہر یا قلعہ سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ اس طرح تمام خطرات کا سدباب ہو گیا۔

سلطان نے مصر کی فتح کے بعد جبکہ جمعہ کا دن آیا تو قاہرہ کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی۔ سلطان کے لیے پہلے سے نہایت قیمتی قالین مسجد میں بچھا دیا گیا تھا۔ جب سلطان سلیم مسجد میں پہنچا تو اس نے اس امتیازی مصلے کو فوراً اٹھوا دیا اور عام نمازیوں کی طرح نماز ادا کی اور نماز میں سلطان پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ اس کے آنسوؤں سے زمین تر ہو گئی۔ فتح مصر کے بعد سلطان نے مصر سے اعلیٰ درجہ کے معماروں اور صناعوں کی ایک تعداد بہ ذریعہ جہاز قسطنطنیہ روانہ کر دی تھی، جیسا کہ اس نے تبریز سے بھی بہت سے کاریگروں کو قسطنطنیہ بھیج دیا تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سلطان سلیم کی نظر کس قدر وسیع اور عمیق تھی اور اپنے دارالسلطنت کی رونق اور عظمت کو بڑھانے کا اس کو کس قدر خیال تھا۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ مصر میں اس قدر زیادہ مدت رہنے کے باوجود اس نے اہرام مصر کی طرف مطلق التفات نہ کیا، نہ ان کی سیر کے لیے گیا۔ ہاں اس نے مصر کی مساجد اور مدرسوں کی طرف خصوصی توجہ مبذول رکھی۔ علماء کی عزت بڑھائی، ان کے روزینوں میں اضافہ کیا۔ سلطان نے مصر ہی میں اس بات کو سوچ لیا تھا کہ ملک عرب پر بھی قبضہ و تسلط ہونا ضروری ہے۔ ملک عرب کے مقدس شہروں مثلاً مکہ و مدینہ وغیرہ میں عرب سرداروں کی سیادت قائم تھی۔ ان شہروں میں کسی جنگی نمائش اور فوجی کارروائیوں کی مطلق ضرورت نہ تھی بلکہ سب سے زیادہ ضرورت ان شہروں کے باشندوں کو رضامند کرنے اور ان کے قلوب پر قبضہ کرنے کی تھی۔ چنانچہ سلطان سلیم نے اس مقصد کو

حاصل کرنے میں مطلق دھوکا نہیں کھایا اور اس نے احسانات کی بارشوں سے عرب سرداروں کے قلوب کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس سے پیشتر عرب یعنی حجاز کے بادشاہ مملوکی سمجھے جاتے تھے۔ اب ان کی حکومت مٹ جانے کے بعد سلطان سلیم ملک حجاز کا بادشاہ سمجھا گیا۔ لیکن اگر عرب سردار چاہتے تو سلطان سلیم کو اپنا بادشاہ تسلیم نہ کرتے اور مقابلہ سے پیش آتے مگر سلطان سلیم کو عربوں پر مہربان دیکھ کر عرب سرداروں نے خود بہ خود اس کے پاس مبارک باد کے پیغام بھیجے اور اس کو خادم الحرمین الشریفین کا خطاب دیا، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ مصر میں عباسی خلیفہ مملوکیوں کے پاس اسی طرح شان و شوکت اور اخوت کے ساتھ رہتے تھے جیسے روما میں پوپ یا دہلی میں اکبر ثانی اور بہادر شاہ ظفر آخری سلاطین مغلیہ رہا کرتے تھے۔ ان عباسی خلفاء کی حکومت تو کچھ نہ تھی، نہ کسی ملک پر ان کا قبضہ تھا، نہ کوئی فوج ان کے ماتحت تھی مگر نہ صرف مصر کے مملوکی سلاطین بلکہ دوسرے مسلم ممالک کے فرماں روا بھی ان سے خطابات اور سند حکومت حاصل کرنے کو موجب فخر جانتے تھے اور وہ دینی پیشوا سمجھے جاتے تھے۔

سلطان سلیم نے خلفائے عباسیہ کی اس اہمیت اور عہدہ خلافت کے اثر کو بہ خوبی محسوس کر لیا تھا۔ اس نے مصر کے موجودہ آخری خلیفہ کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ خود ہی عہدہ خلافت سے دست بردار ہو کر ان چند تبرکات کو جن کو وہ بہ طور نشان خلافت وراثتاً اپنے قبضہ میں رکھتا تھا، سلطان سلیم کے سپرد کرے اور سلطان سلیم کو مسلمانوں کا خلیفہ مان لے۔ ان تبرکات میں ایک علم، ایک تلوار اور ایک چادر تھی۔ یہ چیزیں عباسی خلیفہ نے سلطان سلیم کو دے کر اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اس طرح مسلمانوں میں ایک نام کے خلیفہ کی جگہ حقیقی معنوں میں خلیفہ موجود ہو گیا۔ خلیفہ کے معانی درحقیقت مسلمانوں کے سب سے بڑے سلطان اور بادشاہ کے ہیں۔ سلطان سلیم کے سوا اس وقت کی اسلامی دنیا میں کوئی شخص خلافت کا مستحق بھی نہ تھا۔ سنہ ۹۲۳ھ کے آخر ایام میں سلطان سلیم مصر سے ایک ہزار اونٹ چاندی سونے سے لدے ہوئے لے کر روانہ ہوا اور آخری عباسی خلیفہ کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ روانگی کے وقت جب کہ ابھی سلطان کے لشکر نے قاہرہ سے کوچ کر کے چند ہی میل کا فاصلہ طے کیا تھا، سلیم عثمانی نے اپنے وزیراعظم یونس سے، جو اس کے برابر گھوڑے پر سوار باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا، کہا کہ اب بہت جلد ہم سرحد شام میں پہنچ جائیں گے۔ وزیر نے کہا کہ ہم اس سفر میں نصف فوج ضائع کر کے واپس ہو رہے ہیں اور مصر کا ملک پھر انہیں لوگوں کو دیے جاتے ہیں

جن سے اس قدر محنت کے بعد فتح کیا تھا۔ وزیر نے یہ بھی کہا کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ مصر پر حملہ آور ہو کر ہم نے کیا نفع حاصل کیا؟ یہ سنتے ہی سلطان نے اپنے ہمراہی سواروں کو حکم دیا کہ اس کا سر اڑا دو۔ چنانچہ فوراً یونس پاشا کا سر اڑا دیا گیا۔ سلطان سلیم اپنے وزیروں اور مصاحبوں کے لیے بڑا سخت گیر تھا مگر بہ خلاف اس کے وہ علماء کی ہر گستاخی اور سختی کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یونس شروع ہی سے مصر کی فتح کے خلاف تھا اور اس نے مصر پر حملہ آوری کے خلاف اپنی رائے ظاہر کی تھی۔ اب بھی اس نے اپنی اسی رائے کا اظہار کیا۔ حالانکہ سلطان سلیم نے مصر کو فتح کر کے سلطنت عثمانیہ کی عظمت کو بہت ترقی دے دی تھی۔ اس حملہ آوری اور مصر سے واپس آنے تک سلطان سلیم کے قریباً دو سال صرف ہوئے لیکن سلطنت عثمانیہ میں شام، عرب اور مصر تین ملکوں کا اضافہ ہو گیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ نفع حاصل ہوا کہ سلطان سلیم عثمانی حملہ آوری کے وقت محض سلطان سلیم تھا اور اب واپسی کے وقت وہ خلیفۃ المسلمین سلیم تھا اور خلیفۃ المسلمین ہونے کی وجہ سے تمام عالم اسلامی میں وہ مقتدا اور پیشوا سمجھے جانے کا استحقاق حاصل کر چکا تھا۔

مصر سے واپس آ کر سلطان سلیم نے دمشق میں کئی مہینے قیام کیا۔ بعض روایتوں کے موافق وہ دمشق سے حج بیت اللہ کے لیے گیا مگر عام طور پر یہی مشہور ہے کہ سلطان سلیم یا اور کوئی عثمانی سلطان حج بیت اللہ کے لیے کبھی نہیں گیا۔ دمشق میں رہ کر سلطان سلیم نے عرب سرداروں سے اطاعت کے اقرار لیے اور ان کے ساتھ تعلقات بڑھائے۔ دمشق سے روانہ ہو کر حلب میں آیا اور یہاں بھی بہت دنوں تک مقیم رہا۔ اس سفر یعنی واپسی میں اس نے حجاز و شام کے متعلق اپنی حکومت و سلطنت کے استحکام کی تدبیروں سے کام لیا اور ملک شام کو بہت سے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کمشنری یا ضلع میں الگ الگ عامل مقرر کیے، جس سے کسی خطرناک بغاوت کا امکان جاتا رہا۔ یہاں سے فارغ ہو کر سنہ ۹۲۴ھ میں سلطان سلیم قسطنطنیہ واپس پہنچا۔

سلطان سلیم نے قسطنطنیہ واپس آ کر ریاست وینس سے جزیرہ قبرص/سائپرس کا خراج وصول کیا۔ وینس والے اس جزیرے کا خراج مصر کے مملوکی سردار کو ادا کیا کرتے تھے۔ اب جبکہ مصر سلطان عثمانی کے قبضے میں آ گیا تو سلطان نے ان سے وہ خراج وصول کرنا شروع کیا اور وینس والوں نے اقرار کیا کہ ہم ہمیشہ سلطان عثمانی کی خدمت میں خراج ادا کرتے رہیں گے۔

اندلس کی عیسائی سلطنت نے سلطان کی خدمت میں ایک سفارت بھیج کر استدعا کی کہ جو

عیسائی شام وفلسطین کے مقدس شہروں کی زیارت کو جائیں، ان کی حفاظت کی جائے۔ سلطان سلیم نے اس درخواست کو فوراً منظور کر لیا اور وعدہ کیا کہ عیسائی زائرین کو میری حدود سلطنت میں کوئی آزار نہ پہنچایا جائے گا۔ شاہ ہنگری سے جو صلح قائم تھی، اس کی میعاد قریب الختم ہونے کے سبب سے شاہ ہنگری نے میعاد صلح کی توسیع چاہی اور سلطان نے اس درخواست کو بلا تامل منظور کر لیا۔ سلطان سلیم کی فتوحات جو اسے ایشیا وافریقہ میں حاصل ہوئی تھیں، ایسی نہ تھیں کہ ان کا اثر یورپ والوں پر نہ ہوتا۔ سلطان سلیم نے ایک طرف اپنی حدود سلطنت کو بہت وسیع کیا، دوسری طرف خلیفۃ المسلمین ہو جانے کی وجہ سے اس کی عظمت وشوکت میں بہت ترقی ہو گئی تھی۔ یورپ کے تمام سلاطین لرز رہے تھے کہ یہ ابر بارندہ کہیں ہم پر نہ برس پڑے اور یہ برق جہندہ کہیں یورپ میں ہمارے خرمن ہستی کو نہ جلا دے۔ سلطان سلیم کے مصر سے واپس آنے کے بعد ہی عیسائی سلاطین نے پیغامات صلح بھیجنے شروع کیے اور سفارش کے ذریعہ سے اپنی نیاز مندی کا یقین دلانے لگے۔ سلطان سلیم اگرچہ بے حد سخت گیر وغضب ناک شخص تھا مگر انتہا درجہ کا مآل اندیش اور دور بین بھی تھا۔ وہ ایسا بے وقوف نہ تھا کہ ان خوشامدی لوگوں کی باتوں میں آ کر عواقب امور سے غافل رہتا۔ وہ عیسائیوں کی شرارتوں اور ریشہ دوانیوں سے خوب واقف تھا۔ اس نے مصر، شام، حجاز، عراق اور مغربی ایران کو اپنی حدود حکومت میں داخل کر کے ایک عظیم الشان بادشاہی قائم کر لی تھی جو ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اب اس کے لیے یورپی عیسائی ممالک ہی باقی تھے اور وہ ان ملکوں کی فتح کے خیال سے ہرگز غافل نہیں رہ سکتا تھا، جن کی فتح کے لیے اس کے بزرگوں نے مسلسل کوششیں جاری رکھیں تھیں۔ سلطان سلیم کے بزرگوں کی اکثر زور آزمائیاں عیسائی سلاطین کے ساتھ رہی تھیں۔ تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ سلطان سلیم اعلیٰ درجہ کا دین پسند شخص تھا اور اس میں دینی غیرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ سلطان سلیم نے اب تک مسلمانوں ہی سے لڑائیاں کیں اور مسلمانوں ہی کے قبضہ سے ملک نکالے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ سلیم نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں کے اندر خالص دینی جذبہ بہت کمزور ہو گیا ہے اور رذائل نے مسلمانوں کے اخلاق میں دخل پا کر دینی مصالح کو برباد کر دیا ہے۔ تیمور و بایزید کی جنگ اس خطرے کا سب سے بڑا اعلان تھا۔ سلطان محمد خان ثانی فاتح قسطنطنیہ نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے اور عیسائی سلطنت کو مٹا کر ایک حد تک اطمینان کی شکل پیدا کر دی تھی لیکن پھر بھی ایشیائے کوچک کی

بغاوتیں سلاطین عثمانی کو پریشان رکھتی تھیں۔ اسماعیل صفوی کی ریشہ دوانیوں اور شرانگیزیوں نے سلیم عثمانی کو تخت نشین ہوتے ہی اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ لہٰذا اس نے سب سے پہلے تو ایران کی شیعہ سلطنت کو سزا دے کر اور اس کے ضروری صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے مشرقی خطرے کا بندوبست کیا۔ اب ایرانیوں کی طرف سے کسی حملہ آوری کا کوئی خوف و اندیشہ باقی نہ تھا اور شیعوں کو ایشیائے کوچک میں قتل کرا دینے سے کسی خطرناک سازش کا بھی اندیشہ نہ رہا۔ مصر کی اسلامی سلطنت نے چونکہ شہزادہ مصطفیٰ کے معاملے میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف طاقت کا استعمال کیا تھا، اس لیے مصر کا خطرہ بھی ایرانی خطرے سے کم نہ تھا۔ سلطان سلیم نے مناسب نہ سمجھا کہ مصریوں کو نیچا دکھائے بغیر عیسائی ممالک پر حملہ آور ہو کیونکہ عیسائی سلاطین، مصری سلاطین کو عثمانیہ سلطنت کے خلاف ابھارنے کی کوششیں کر سکتے تھے۔ مصر کو فتح کرنے کے بعد سلطان سلیم کے لیے اصل کام یعنی یورپ کو فتح کرنا باقی تھا۔ سلطان سلیم کی مآل اندیشی ودوربینی بے حد قابل تعریف ہے کہ اس نے مصر سے واپس آ کر عیسائی ممالک پر حملہ آور ہونے میں جلدی نہیں کی بلکہ سلطنت کے اندرونی انتظام واستحکام میں مصروف ہو کر ساتھ ہی ساتھ جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا اور اس حالت میں جس عیسائی بادشاہ نے صلح کی خواہش ظاہر کی، فوراً اس سے صلح کر لی مگر جنگی تیاریاں اس سرگرمی اور عجلت کے ساتھ جاری تھیں کہ اس سے پیشتر ایسی تیاریاں کبھی نہ دیکھی گئی تھیں۔ مصر سے واپس آ کر سلطان سلیم نے جنگی جہازوں کے بنانے کا حکم دیا۔ جہاز سازی کے کئی کارخانے قائم کیے گئے۔ چنانچہ ڈیڑھ سو جنگی جہاز جن میں سے ہر ایک کا وزن سات سات سوٹن تھا، تیار ہو گئے۔ ان کے علاوہ ایک سو چھوٹے جہاز بھی تیار ہوئے۔ ان جہازوں کو تیار ہونے کے بعد باہر سمندر میں نکلنے اور گشت لگانے کی سخت ممانعت تھی بلکہ تیار ہو کر کارخانے ہی میں بند رکھے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ سلطان نے ایک جنگی جہاز کو ساحل قسطنطنیہ کے قریب سمندر میں گشت لگاتے اور چلتے پھرتے ہوئے دیکھا تو سخت ناراض ہوا اور قریب تھا کہ وہ امیر البحر کو قتل کرنے کا حکم دیتا مگر دوسرے سرداروں نے اور وزیروں نے بہ مشکل سلطان کے غصہ کو یہ کہہ کر فرو کیا کہ یہ جہاز ابھی تیار ہو کر تکمیل کو پہنچا ہے اور قاعدہ کے موافق اس کو سمندر میں چلا کر دیکھنا اور اس کی رفتار کا اندازہ کرنا ضروری تھا، اس لیے اس کو سمندر میں نکالا گیا ہے۔

جہازوں کے علاوہ سلطان سلیم نے توپوں اور بندوقوں کے بہت سے کارخانے قائم کیے۔ بارود

سازی کے کارخانے بھی بڑی تیزی اور مستعدی سے اپنے کام میں مصروف تھے۔ فوجی بھرتی بھی برابر جاری تھی۔ ایشیائے کوچک میں ایک جدید مسلح فوج اس طرح مستعد رکھی گئی تھی کہ حکم سنتے ہی ایک منٹ کا توقف کیے بغیر کوچ یا جنگ میں مصروف ہو جائے۔ سلطان سلیم کے وزراء اس بحری وبری طاقت کی روز افزوں ترقی کو دیکھ دیکھ کر منتظر تھے کہ کوئی بڑی مہم پیش آنے والی ہے مگر ان کو مطلق اطلاع نہ تھی کہ یہ تیاریاں کس لیے ہو رہی ہیں؟ سلطان سلیم اپنے وزیروں اور مشیروں سے مشورے بھی لیتا تھا لیکن وہ اپنے خاص الخاص اور اہم ارادوں کی کسی کو اطلاع نہ دیتا تھا۔ وہ جلد بازی کے ساتھ کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا لیکن جب کوئی مصمم ارادہ کر لیتا تو پھر نسخ عزم کرنا اور قدم پیچھے ہٹانا ممکن نہ تھا۔ وہ اپنے ارادے کا پختہ اور ہمت وشجاعت کا دھنی تھا۔ جو کوئی اس کو فسخ عزم پر مجبور کرنا چاہتا تھا، وہ اپنی جان گنوا دیتا تھا۔ اس ذی حوصلہ، باہمت سلطان نے اپنے مسلمان بھائیوں کو نیچا دکھانے اور ان کے خطرے کو مٹانے کے بعد اب یہ جنگی تیاریاں یقیناً عیسائیوں کے خلاف شروع کی تھیں اور اس کے نزدیک یہ تیاریاں ابھی بہت ناقص ونا تمام تھیں کیونکہ وہ یورپ پر ایک ایسا حملہ کرنا چاہتا تھا، جس میں شکست ونا کامی کو مطلق دخل نہ مل سکے۔

سلطان سلیم اپنی جنگی تیاریوں میں بڑی مستعدی کے ساتھ مصروف تھا کہ ۶ شوال سنہ ۹۲۶ھ مطابق ۲۲ ستمبر سنہ ۱۵۱۶ء شب جمعہ کو اس نے وفات پائی اور عیسائی ملکوں کی فتح کا کام اپنے بیٹے سلطان سلیمان اعظم کے لیے چھوڑ گیا۔ سلطان سلیم نے یکم شوال سنہ ۹۲۶ھ کو قسطنطنیہ سے ایڈریانوپل کی طرف کوچ کیا۔ ابھی وہ ایڈریانوپل تک نہیں پہنچا تھا بلکہ راستے میں اس مقام پر خیمہ زن تھا، جہاں وہ ایک مرتبہ اپنے باپ سے لڑا تھا کہ مرض کی شدّت سے آگے نہ بڑھ سکا اور وہیں فوت ہو گیا۔ سلطان سلیم کی ران میں ایک پھوڑا نکلا تھا۔ طبیبوں نے گھوڑے کی سواری سے منع کیا لیکن سلطان سلیم نے گھوڑے کی سواری ترک نہ کی اور پھوڑا دم بہ دم خطرناک شکل اختیار کرتا گیا حتیٰ کہ سلطان کی موت کا باعث ہوا۔

سلطان سلیم کے عہد حکومت پر تبصرہ:

سلطان سلیم نے صرف آٹھ سال، آٹھ مہینے اور آٹھ دن حکومت کی۔ اس قلیل مدت میں اس نے جس قدر فتوحات حاصل کیں، کسی بڑے سے بڑے سلطان کو بھی حاصل نہیں ہو سکیں۔ سلطان کی

خصوصیات میں سب سے بڑی قابل تذکرہ بات یہ ہے کہ وہ انتہائی طیش وغضب کے عالم میں بھی علمائے دین کی تکریم کو مدنظر رکھتا تھا۔ وزیروں اور سپہ سالاروں کو معمولی لغزشوں پر قتل کر دینا اس کے لیے معمولی بات تھی اور اسی لیے اراکین سلطنت اس سے خائف وترساں رہتے تھے۔ لیکن دینی پیشوا اور علماء اس کے طیش وغضب سے بے خوف اور آزاد تھے۔ خلیفہ سلیم کا خیال تھا کہ ملک کے اندر سخت گیری اور سیادت کے ذریعہ سے ہی امن وامان قائم رہ سکتا ہے اور ایک حد تک اس کا یہ خیال درست بھی تھا۔ لیکن چونکہ وہ اعلیٰ درجہ کا دین دار شخص تھا، اس لیے علمائے دین کی تحقیر وتذلیل وہ کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ ایک مرتبہ سلطان سلیم نے محکمہ مال کے ڈیڑھ سو اہل کاروں کو کسی بات پر ناراض ہو کر گرفتار کرایا اور حکم دیا کہ سب کے سر قلم کر دیے جائیں۔ قسطنطنیہ کے قاضی جمالی نے یہ حکم سنا تو فوراً سلطان سے کہا کہ آپ نے یہ حکم غلطی سے دیا ہے۔ آپ اس حکم کو واپس لے لیں اور ان لوگوں کا سر قلم نہ کرائیں کیونکہ وہ مستحق قتل نہیں ہیں۔ سلطان نے کہا کہ ملکی انتظام میں آپ کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ آپ اس دنیا کے ملک کی بہتری کو مدنظر رکھتے ہیں اور میں آپ کی عالم آخرت میں بھلائی چاہتا ہوں۔ چاہے آپ کا یہ ملک کیسے ہی ملکی مصالح پر مبنی ہو لیکن عالم آخرت میں آپ کے نقصان و زیاں اور خسران و ہلاکت کا موجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ رحم کرنے والے پر انعام وبخشش کرتا اور ظالم کو سخت عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ سلطان کو قاضی جمالی کے منشا کے موافق سب کو معاف وآزاد کرنا پڑا اور نہ صرف ان کو آزاد ہی کیا بلکہ ان کے عہدوں پر ان کو بہ دستور مامور کر دیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ سلطان سلیم نے حکم دیا کہ ہمارے ملک سے ایران کے ملک میں ریشم قطعی نہ جانے پائے۔ ساتھ ہی ان سوداگروں کو جو قسطنطنیہ میں موجود اور ایران کے ملک میں ریشم لے جانے والے تھے، گرفتار کرالیا۔ ان سوداگروں کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ ان کی تمام جائیداد ضبط کر لینے اور ان کی گردنیں اڑانے کا حکم دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان سلیم ایڈریانوپل کی طرف روانہ ہو رہا تھا اور قاضی جمالی بھی سلطان کے ساتھ تھا۔ اس نے سلطان سے ان سوداگروں کی سفارش کی۔ سلطان نے جواب دیا کہ دنیا کے دو تہائی باشندوں کی بہتری اور بھلائی کے لیے ایک تہائی کو قتل کر دینا جائز ہے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ اس وقت جبکہ یہ ایک تہائی موجب فساد ہوں۔ سلطان نے کہا کہ اس سے بڑھ کر اور کیا فساد ہوسکتا ہے کہ اپنے بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کی جائے۔

قاضی صاحب نے فرمایا کہ ان لوگوں تک حکم سلطانی ابھی نہیں پہنچا تھا، اس لیے یہ مجرم قرار نہیں پا سکتے۔ اگر اس قسم کی گفتگو کوئی وزیراعظم کرتا تو فوراً قتل ہو چکا ہوتا مگر سلطان نے نہایت غصہ کی حالت میں صرف یہ کہا کہ تم معاملات سلطنت میں دخل نہ دو۔ قاضی صاحب یہ جواب سن کر بہت برہم ہوئے اور بلا آداب بجا لائے اور بلا رخصت طلب کیے ہوئے ناراضگی کے ساتھ چل دیے اور سلطان سلیم سخت حیرت کے عالم میں خاموش اپنے گھوڑے پر کھڑا رہ گیا۔ سلطان نے اپنا سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر حکم دیا کہ اچھا سوداگروں کو رہا کر دیا جائے اور ان کا تمام مال و اسباب واپس دے دیا جائے۔ اس کے بعد قاضی صاحب کے پاس پیغام بھیجا کہ میں نے اپنی تمام مملکت یعنی ایشیا و یورپ کے علاقوں کا آپ کو قاضی القضاۃ بنا دیا مگر قاضی صاحب نے اس عہدہ جلیلہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ تاہم سلطان نے ان کے حال پر بہت مہربانیاں کیں۔

سلطان سلیم کا عہد حکومت دنیا میں مذاہب کے لیے بھی خصوصی زمانہ تھا۔ اسی زمانہ میں خلافت اسلامیہ خاندان عباسیہ سے نکل کر خاندان عثمانیہ میں آ گئی اور مجبور نام کے خلفاء کی جگہ صاحب ملک ولشکر خلفاء اسلام میں ہونے لگے۔ اسی زمانے میں لوتھر نے عیسائی مذہب میں اصلاح اور عقائد کی ترمیم و تنسیخ کا کام شروع کیا جو درحقیقت عثمانیوں کے یورپ میں داخل ہونے کا نتیجہ تھا۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے اندر کبیر داس نے اپنا ایک پنتھ جاری کر دیا تھا۔ کبیر گورکھ پور کے قریب بہ مقام مگھر سنہ ۹۲۴ھ میں فوت ہوا تھا جو سلطان سکندر لودھی کا ہم عصر تھا۔ اسی سلطان کے عہد حکومت یعنی سنہ ۹۲۲ھ میں جیب والی گھڑی ایجاد ہوئی۔

سلطان سلیم عثمانی نے چاہا تھا کہ عیسائی ممالک پر حملہ آور ہونے سے اپنی حدود سلطنت کے رہنے والے تمام عیسائیوں کو اول مسلمان بنا کر اپنے ملک کو غیر ملکی عنصر سے قطعاً پاک و صاف کر دے۔ چنانچہ اس نے عیسائیوں کے گرجوں کو مسجدیں بنا لینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ خبر جب عیسائیوں کو پہنچی تو وہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ سلطان محمد فاتح نے فتح قسطنطنیہ کے وقت ہم کو ہر قسم کی مذہبی آزادی عطا کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ تمہارے گرجوں کی حفاظت کی جائے گی اور تمہارے مذہبی معاملات میں قطعاً مداخلت نہ ہوگی۔ عیسائیوں کے اس بیان کی علمائے دربار نے تائید کی اور قاضی جمالی بھی عیسائیوں کے سفارشی ہوئے۔ چنانچہ سلطان کو مجبوراً اس ارادے سے باز رہنا پڑا۔ عیسائی مورخ سلطان سلیم سے بہت ناراض معلوم ہوتے ہیں اور وہ سلطان کی دینی

دلچسپی کو ایک عیب بتاتے ہیں۔مگر یہ ان کی نابینائی اور تعصب ہے۔ سلطان سلیم کے باعظمت اور نیک ہونے کی ایک یہ بھی سب سے بڑی دلیل ہے کہ جس قدر مما لک پر سلطان سلیم نے قبضہ کیا تھا، وہ تمام ملک سب سے آخر تک ترکوں کے قبضے یا کم از کم ان کی سیادت میں رہے۔اس سلطان نے حکومت کا زیادہ موقع نہ پایا اور بہت جلد ۲ ۵ سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔اگر کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو یقیناً تمام یورپ کو فتح کیے بغیر نہ رہتا۔سلطان سلیم خاندان عثمانیہ میں سب سے پہلا خلیفہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ قلم کی گردش پوری ہو چکی اور ہم تاریخ کے طویل سلسلے کو اس جلد پر ختم کر رہے ہیں۔